

# علی پور کا ایلی

PDFBOOKSFREE.PK

مستاز مفتی

## فہرست

۲۱	علی پور کا اہلی ،
۳۷	بچپن ،
۷۹	بیداریاں
۱۴۰	شہزاد
۱۸۱	سانوری
۲۲۰	تیم اور نیم
۲۷۹	سفینہ اور نور
۳۲۷	شہزاد
۳۷۶	دیوانگی
۴۲۳	فرار
۴۷۸	تیاگ
۵۵۲	گوریاں

## دیباچہ برائے بازپنجم

۱۹۹۵ء

۶۵۰

۷۶۲

۸۶۶

۹۵۲

۱۰۲۷

۱۱۱۶

۱۱۵۳

۱۲۲۹

سادہ

چھ لڑکیاں

بن باہی

تجدید

بھگوڑے

انجام

پاکستان

علی پور کابلی (ڈاکٹر محمد احسن فاروقی)

میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ اس کتاب کی اتنی ایڈیشن شائع ہوں گی اور اس کی مانگ اس قدر بڑھ جائے گی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مشاعرہ اردو ادب اس کتاب کو تسلیم کر لیں گے اور اردو ادب میں اسے ایک مقام بخش دیں گے۔ میں اردو ادب کے وسعت قلب کا مرہون منت ہوں، چونکہ یہ میری کوششوں یا جدوجہد کی وجہ سے نہیں ہوا۔

مجھ میں کبھی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ادیب بنوں۔ کس برتنے پر ہوتی نہ تو میں اردو زبان سے واقف تھا نہ ہی میں نے کبھی اردو ادب کا مطالعہ کیا تھا۔

میں اس زمانے کی پیداوار ہوں جب اردو زبان پنجاب میں در نہیں آئی تھی۔ ہم لوگ گھروں میں محلوں میں مدرسوں میں کالجوں میں دفاتروں میں ہر جگہ بے تکلف پنجابی بولتے تھے۔ مدرسوں میں صرف آٹھویں جماعت تک اردو پڑھائی جاتی تھی۔ کالجوں میں اردو کا وجود نہ تھا۔ اور نیشنل یونکوائج کے لئے الگ کالج بنائے گئے تھے۔ ان کی حیثیت ایسی تھی جیسے براہمنوں کے آشرم کے قریب ہر بچن کنیا بنی ہو۔ اور نیشنل کالج کے طلباء کو اجازت تھی کہ تحصیل علم کے بعد صرف انگریزی کا پرچہ دے کر وہ گریجویٹ ڈگری کے حقدار ہو سکتے تھے۔ ایسے گریجویٹ کو عرف عام میں تحقیر سے دایا، ٹھنڈا کہا جاتا تھا۔

ان دنوں میں یکسر مغرب زدہ نوجوان تھا ان حالات میں میں اردو ادب بننے کی خواہش کیسے کر سکتا تھا۔

## پیش لفظ

### (تیسرا ایڈیشن)

یہ کتاب میری آپ بیتی کا پہلا حصہ ہے۔

پہلے مجھ میں اتنی جرات نہ تھی کہ اپنی خامیوں، کیوں اور بے راہ رویوں کو اپناؤں۔ اس لئے میں نے اسے روئیدلو کا نام دے دیا۔

یہ آپ بیتی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۴۷ء تک مشتمل ہے۔ اس آپ بیتی میں ہر واقعہ، ہر کردار حقیقت پر مبنی ہے۔ افسانہ نگاری اسلوب میں ہو تو ہو واقعات میں حقیقت گوئی سے ہم لیا گیا ہے۔ یہی اس کتاب کی امتیازی خصوصیت ہے۔

ارلود تھا کہ سوانح کا دوسرا حصہ ”ایلی اور الگھ گھری“ کے عنوان سے پیش کروں گا، لیکن الگھ گھری والوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پردہ دری بند نہیں۔ لہذا معذور ہوں۔

ممتاز مفتی

درخ ۲۶ نومبر ۱۹۸۳ء

### دوسرا ایڈیشن

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں چھپا تھا جو دو سو پچاس جلدوں پر مشتمل تھا۔ یہ ایڈیشن انقروی میں چھپا۔ یہ انقروی آدم جی انعام سے متعلق تھی۔ ”اب یہ کتاب اس لئے مشہور کہ اس پر آدم جی انعام نہ ملا۔“ (ابن انشا)

اس زمانے میں میں کیوں اردو میں لکھتا رہا بظاہر اس کی صرف ایک وجہ تھی، ضد۔ میرا موقف یہ تھا کہ صرف ادیب ہی کو لکھنے کا حق نہیں ہے غیر ادیب بھی لکھ سکتا ہے آپ اسے ادیب نہ ماننے کا لیکن لکھنے کا حق تو دیکھئے نہ۔  
دراصل یہ سارا گورکھ دھندا تقدیر کا چلایا ہوا تھا۔ اپنا راستہ ہموار کرنے کے لئے تقدیر کو کیا کیا گمن گمیریاں چلائی پڑتی ہیں۔

علی پور کا ایلی میں نے اردو ادب کے خلاف احتجاج کے طور پر لکھی تھی۔ اردو ادب کئی ایک پہلوؤں میں بڑا اجلا تھا بڑا مذہب تھا بڑا اخلاق زدہ تھا، اس حد تک کہ حقیقت پسندی سے بے گانہ ہو جاتا تھا۔ اردو ادب کی خود نوشیں بڑی دھلی دھلائی، کلف زدہ اور استری کی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا ایک سچی خودنوشت پیش کروں۔ اخلاق اور مذہب سے بے نیاز۔  
دراصل یہ کتاب میں نے اردو ادب پر طنز کی حیثیت سے لکھی تھی اور میرا خیال تھا کہ یہ کتاب چھینٹے اڑائے گی شورشوری پیدا کرے گی اور پھر ٹائیس ٹائیس فٹ ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن یہ کتاب تو جل نکل۔ اپنی سچائی اور اردو ادب کی وسعت قلب کی وجہ سے۔ تقدیر کے بھید کس نے پائے ہیں۔

### ممتاز مفتی

جون ۱۹۹۵ء



صرف دو سو پچاس جلدیں چھپنے کے باوجود اس کتاب کو اتنے افراد نے پڑھا ہے کہ جان کر حیرت ہوتی ہے۔ اب سعادت، فرزانہ اور چودھری بشیر احمد کی تحریک پر اس کا دوسرا ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے۔

بیشتر لوگ جنہوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اس بات پر مصر ہیں کہ یہ ناول ہے۔ محمود ایلا کہتے ہیں کہ ”یہ تلاش ذات کا ناول ہے۔“ ابن انشا کا کہنا ہے کہ ”یہ ناولوں کا گرنٹھ صاحب ہے۔“ سعادت اور فرزانہ کا خیال ہے کہ ”اس ناول میں ایسے کلوے بھی ہیں جنہیں پڑھ کر پھر سے جینے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔“ ایسے قاری بھی ہیں جو کہتے ہیں کاش یہ ناول ہوتا اور رومان کے نقطہ عروج کے بعد ختم ہو جاتا۔ ایسے قاری بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ اسے ایسا ہی ہونا چاہئے تھا جیسے کہ ہے۔

خوشی اور تعجب کی بات ہے کہ اس طویل کتاب کو کئی ایک اعلیٰ افسروں نے بھی پڑھا ہے جن کی ہدیم الفرستی کا یہ عالم ہے کہ بیگم کے پاس بیٹھ کر پڑوسیوں کی بدخویاں کرنے کی عشرت سے بھی محروم ہیں اور ان کی رائے اس کتاب کے متعلق خاصی مختلف ہے۔

اپنی دانست میں میں نے ناول نہیں بلکہ ایلی کی سرگزشت لکھی تھی۔ مقصد تھا کہ ایلی کی شخصیت کا ارتقا پیش کروں۔ اسی لئے چند ایک بظاہر غلیظ تفصیلات پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ایلی ایسا کردار ہے جو مشاہدات کے سمندر میں ڈبکیں کھاتا ہے۔ لیکن جب کنارے لگتا ہے تو پنچھی کی طرح پر جھاڑ کر پھر سے جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے۔ شاید ہم سب پنچھی ہوں اور کنارے لگنے کے بعد پر جھاڑ کر جوں کے توں خشک ہو جاتے ہوں۔

بہر حال اردو لوب میں کوئی کہانی ایسی نہ ملے گی، جس کی تفصیلات براہ راست زندگی سے اخذ کی گئی ہوں اور چٹاؤ کئے بغیر ایک جگہ دھیر کر دی گئی ہوں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب آپ جیتی ہے۔

ایلی کا کہنا ہے کہ یہ کتاب ہی نہیں بلکہ ایک خط ہے جو اس نے سادی اور عالی کے نام لکھا ہے۔ بری الذمہ ہونے کے لئے نہیں بلکہ اعتراف جرم کے لئے۔

مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے دوسرے حصے ”ایلی اور الکھ عمری“ کی تکمیل کے بعد یہ کتاب ارتقا کی ایک اہم کڑی کی حیثیت اختیار کر لے گی اور اس کے دھواں دار اندھیرے، آنے

والی کرن کو، مزید چمک بخشیں گے۔ اور دوں حصے مل کر تلاش ذات کا ناول بن جائے گا۔ لیکن بارہ سال الکھ عمری کی دہلیز پر بیٹھنے کے بعد مجھے شک پڑنے لگا ہے کہ شاید الکھ عمری ایک دہلیز کے سوا کچھ بھی نہ ہو جسے پار کر کے آپ مڑ کر اپنے ہی دل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جہاں ایک عظیم نزاکات سرسبز ہے۔

راولپنڈی۔ جنوری ۱۹۶۹ء

مستار مفتی

(پہلا ایڈیشن)

۱۹۳۶ء میں میں نے اپنا پہلا افسانہ ”جھکی جھکی آنکھیں“ پیش کیا تھا، آج میں اپنی پہلی مسلسل کتاب ”علی پور کا ایلی“ پیش کر رہا ہوں۔ یہ روئیداد ہے۔

ایک ایسے شخص کی جس کا تعلیم کچھ نہ بگاڑ سکی۔

جس نے تجربے سے کچھ نہ سیکھا۔

جس کا ذہن اور دل ایک دوسرے سے اجنبی رہے۔

جو پروان چڑھا اور باپ بننے کے باوجود بچہ ہی رہا۔

جس نے کئی ایک محبتیں کیں، لیکن محبت نہ کر سکا، جس نے محبت کی پھلجڑیاں اپنی انا کی تسکین کے لئے چلائیں، لیکن سپردگی کے عظیم جذبے سے بیگانہ رہا اور شعلہ جوالہ پیدا نہ کر سکا۔

جو زندگی بھر اپنی انا کی دھندلی بھول، عیالوں میں کھویا رہا، حتیٰ کہ بلا آخر نہ جانے کہاں سے

ایک کرن چمکی اور اسے نہ جانے کدھر کو لے جانے والا ایک راستہ مل گیا۔

اس داستان کے بیشتر واقعات اور مرکزی کردار حقیقت پر مبنی ہیں۔ باقی کردار حقیقت اور

افسانہ کی آمیزش ہیں۔ حقیقت سے گریز کی وجہ میرا عجز ہے۔ ان کرداروں کی عظمت کو اجاگر کرنا

میرے بس کی بات نہ تھی۔ لہذا افسانوی رنگ شامل کر کے میں نے اپنے عجز کو چھپانے کی

کوشش کی ہے۔

اس کتاب کا مقصد صرف ایلی کی داستان حیات پیش کرنا ہے۔ کسی متعلقہ یا ضمنی کردار کی

دل آزاری، تضحیک یا تذلیل نہیں۔ اگر اس کتاب کے کسی حصے سے ایسا پہلو نکلتا ہے۔ تو وہ

میری تحریر کے خام ہونے اور وسعت نگاہ کی کمی کی وجہ سے ہے۔

شاید آپ علی پور کے ایلی کی رویداد پسند کریں — تو شاید میں بھی کبھی دوسری کتاب میں اس ”نہ جانے کہاں سے چپکنے والی کرن“ اور ”نہ جانے کدھر کو لے جانے والے راستے“ تذکرہ کروں، جس کے اشارے پر اس کتاب کا اختتام ہوتا ہے اور جس پر گامزن ہونے کے ایلی پر قول رہا ہے۔

ممتاز مفت

راولپنڈی ۵ مارچ ۱۹۸۱ء

بانو قدسیہ

اگر آپ کو غزل الغزلات پڑھنے کا شوق ہے اور آپ عورتوں سے باتیں کر کے مسرت حاصل کرتے ہیں تو ”علی پور کا ایلی“ ضرور پڑھئے۔

اگر آپ جانتے ہیں کہ مرد بطح کی مانند ہے، ہمیشہ اوپر سے پانیوں میں تیرتا ہے اور پھلجھلج کی طرح نچلے پانیوں میں نہیں جاسکتا تو بھی ”علی پور کا ایلی“ آپ کے لئے مسرت کا باعث ہوگی۔  
اگر آپ میں تجسس کا مادہ ہے اور آپ بچپن میں بھول بھلیاں اور پھیلیاں بوجھتے رہے ہیں تو آپ کے لئے ”علی پور کا ایلی“ وہ سنہری پوستین ہے جو ہزار منزلوں کے بعد شہزادہ کو ملی تھی۔

اگر آپ لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں اور مکمل طور پر مردم بیزار نہیں ہوئے تو ”علی پور کا ایلی“ ضرور پڑھئے، اس میں اک بنان آبلہ ہے — لیکن — اگر آپ بچپن میں پوری کہانی کو چار سطروں میں بیان کرنے کا فن سیکھ چکے ہیں، جوانی میں آپ نے صرف وہ کتابیں پڑھی ہیں جن کے آخر میں سری درج ہوتی ہے اور اگر بچھا ”آپ کم گو“ درست بات کرنے والے اور لکھیوں پر گن گن کر غصہ کرنے کے علوی رہے ہیں تو یہ کتاب آپ کے لئے بے کار ہے۔ اس سے بہتر ہو گا کہ آپ اس کی سری کسی ایسے دوست سے سن لیں جس نے اسے غور سے پڑھا ہو اور اس سے لطیف اندوز نہ ہو سکا ہو۔

اور ادرہرں ”چلی“ سے جمع نہیں کی گئی، خود مصنف کے خون جگر سے صورت پذیر ہوئی ہے۔

### کرنل محمد خان

جب ممتاز مفتی کی کتاب — ”علی پور کا ایلی“ — کو آدم جی انعام نے مل سکا تو معاً نہیں احساس ہوا کہ یہ ضرور کام کی کتاب ہوگی، اسے پڑھنا چاہئے اور پڑھی تو ہمارا وہی حال ہوا جو ”ان“ کی تقریر سن کر غالب کا ہوا تھا، یعنی:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی ادب پارے کی عظمت پر کھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی کسوٹی نہیں — ظاہر ہے کہ ممتاز مفتی کے منکروں کے بھی دل تو مومن ہوں گے، صرف دماغ کافر ہیں۔

### قدرت اللہ شہاب

مفتی اگر ادیب نہ ہوتا تو جرائم پیشہ ہوتا۔ چونکہ لاشعور اس کی تحریروں کا موضوع ہے اور انسانی لاشعور میں نہ جانے کتنے عمر خاں اور بھوبت ڈاکو چھپے بیٹھے ہیں۔

مفتی عقیدے کا روگ نہیں پالتا، ہاں عقیدت کا شکار ضرور ہوتا ہے جب وہ عقیدت طاری کرے تو اس شخص کی زندگی حرام ہو جاتی ہے جس سے مفتی کو عقیدت ہو۔ اس وجہ سے مفتی کی دوستی ایک ایسے پھوڑے کی طرح ہے جس کی ٹیسوں میں لذت ہے — ”علی پور کا ایلی“ میں مفتی بدرجہ محبت سے عقیدت کی جانب بڑھ رہا ہے۔ شہزاد، مفتی کی محبت کے پھوڑے کی ٹیسوں اور لذت کی دو دھاری چھری تلے تڑپ رہی ہے۔

مفتی کی زندگی پر صوفی کی گہری چھاپ ہے۔ اس کی تحریروں شعور اور لاشعور کے تصادم کو سلجھاتے ہوئے تصوف اور سلوک پر ختم ہوتی ہیں۔ ”علی پور کے ایلی“ میں مفتی نے افسانوں میں لاشعور کے تجرباتی نظام کو تصوف کی ابتدا کے پہلے موڑ پر پہنچا دیا ہے۔

اگر مفتی ”علی پور کا ایلی“ کا دوسرا حصہ لکھنے میں کامیاب ہو گیا تو اندازہ ہے کہ محبت اور عقیدت کا دوا آتش ہو کر یہ کتاب ایک خصوصی اہمیت حاصل کر لے گی۔

### اشفاق احمد

جب ”علی پور کا ایلی“ شائع ہوا تو میں اسے اردو زبان کا ایک عظیم ناول تصور کیا کرتا تھا۔ انہی دنوں ناشر نے اسے آدم جی پرائز کے لئے گلڈ کے دفتر میں گزارا۔ جنوں نے اسے ”پڑھو اور اس پر ”غور“ کیا۔ پھر فیصلہ دیا کہ ”علی پور کا ایلی“ اس قابل نہیں کہ اسے آدم جی انعام سے نوازا جائے۔ چونکہ یہ ملک کے پانچ بیروں کا فیصلہ تھا اس لئے مجھے بھی اپنی رائے میں تبدیلی کرنی پڑی۔ اس وقت سے لے کر اب تک میری رائے ویسی ہی چلی آ رہی ہے کہ پچھلے دنوں ان ناول کو پھر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چونکہ بزرگوں کی عزت کرنے کا حکم مجھے بچپن سے ملا ہے، اس لئے میں ان کے فیصلے پر قائم رہنے پر مجبور ہوں۔

ویسے میرا دل پکار پکار کر کہتا ہے کہ ”فسانہ آزاد“ اور ”علی پور کا ایلی“ اردو کے دو عظیم ناول ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے دل کی آواز مجھ ہی تک محدود ہے۔ ورنہ بڑا ہنگامہ مچا جاتا۔

آپ اس ناول کو پڑھئے لیکن اپنی رائے قائم کرنے کے بجائے فاضل جنوں کے فیصلے کو پابند رہئے کیونکہ یہ اردو ادب کی تاریخ کا اہم فیصلہ ہے اور اس کو بنیاد بنا کر مستقبل کے ادب کے بارے میں اقوال فیعل دیئے جانے چاہئیں۔

### ضمیر جعفری

ممتاز مفتی اردو ادب میں اسلوب دیگر کے الگ داستان کے خالق ہیں۔ ان کے فن اور فکر میں ایک ایسے جوان رعنا سے تشبیہ دوں گا جو دیکھنے میں بہت البرکمر سوچنے میں نہایت پختہ ہے۔ آپ اس سے پیار بھی کر سکتے ہیں اور بےیت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ مفتی کا ادب نہ ہی نہیں ہمیشہ جوان بھی رہے گا۔ سوچتا ہوں اگر ممتاز مفتی پیدا نہ ہوتا تو زندگی کئی رعنائیوں اور دلچسپیوں سے محروم رہ جاتی۔

”علی پور کے ایلی“ کو میں اس دور کا ایک اہم ادبی کارنامہ سمجھتا ہوں اور زندگی کے قدر و سبب معجزہ یہ کارنامہ شاید ممتاز مفتی ہی سرانجام دے سکتا تھا۔ کتاب کی ”فراہم

آدم جی ادبی انعام کی ایک مجلس منصفین ہوتی ہے۔ میں پہلے سال سے اس کا معتد اعزازی ہوں، میرا کام انتظامی ہے اور ضابطے کی رو سے میں کتابوں کے بارے میں حق رائے دی نہیں رکھتا۔

جب اس کتاب (علی پور کالہ) پر غور ہوا، اس مجلس کے صدر تھے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور اراکین تھے پروفیسر ممتاز حسن، پروفیسر وقار عظیم اور دیگر مشاہیر جن کے نام شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب (علی پور کالہ) کو بہترین نہ سمجھا، بلکہ جمیلہ ہاشمی کی ”تلاش ہماراں“ کو انعام کا مستحق قرار دیا۔ منصفین نے اپنی رائے وے دی جس کا احترام کیا گیا اور انتظامی پابندی بھی کی گئی۔ مجلس منصفین کی کارروائی خفیہ رکھی جاتی ہے صرف متفقہ یا اکثریتی رائے کی تشریح کی جاتی ہے۔ اس لئے میں اس کارروائی کا حال نہیں بتا سکتا۔ لیکن ایک قاری کی حیثیت سے مجھے ہمیشہ یہ کہنے کا حق ہے کہ یہ فیصلہ اردو ادب کے ساتھ کم از کم ایک ناانصافی کے مترادف تھا۔

### ابن انشا

”علی پور کالہ“ ممتاز مفتی کا بڑا بھاری کارنامہ ہے۔ حجم اور وزن کے اعتبار سے ہی نہیں مضمون، پلاٹ اور اسلوب کے لحاظ سے بھی، کچھ لوگ اسے اردو ناولوں کا گرو گرنتھ صاحب بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ ہاتھ میں اٹھا کر مطالعہ کرنے کی چیز نہیں بلکہ اسے چوکی پر رکھ کر مورچل ہلاتے ہوئے پڑھنا پڑتا ہے۔ اسے نئے ادب کی طلسم ہو شرما بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ قدم قدم پر ہفتیوں آتے ہیں جن سے گزرتے ہوئے ہیرو کے اور قاری کے ہوش گم ہوتے ہیں۔ کردار کردار چڑھا ہوا ہے، طلسم میں طلسم گرفتار ہے، اور افسانہ از افسانہ می خیزد۔ اس کا سائل بھی افسانے سے زیادہ داستان کا ہے۔ کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے۔ زبان و مکان کی زقندیں نہیں ہیں، جن سے پائے نگاہ میں موج آنے کا اندیشہ ہو، یہ ناول قلم سے کم کیرے سے زیادہ کڑا ہے اور اس کا فوکس ایلی پر رہتا ہے۔ اس ناول کے دو نمایاں پہلو ہیں، راست بازی کردار تراشی۔ راست بازی روسو کی سی نہیں کہ غلو کی وجہ سے ریا بن جائے، بلکہ سادہ غیر جفا اور سلوہارن قسم کی۔ کردار بنانے میں مفتی جلدی نہیں کرتے، سچ کچے سوٹھا ہو۔ ایک

کی تشکیل میں پچاسوں صفحے اور دسیوں برس صرف ہو جاتے ہیں لیکن پھر وہ ایسا ہوتا ہے کہ ٹن ٹن بچتا ہے۔ پتھر پر نقش ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ ناول پڑھے بہت دن ہوئے، لیکن آج بھی علی احمد ہو یا شہزاد، ساوی ہو یا انصار، منصر، تسلیم ہو کہ ارشد، ذہن میں اپنی اپنی جگہ قطب نما بنے کھڑے ہیں۔ ہر ایک کی ج جھج اگ، خمیر جدا، دو لہا اس بارات کا ایلی سہی، لیکن آگے چل کر شہزاد اسے بچاڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ پاپن جویوں جلی نہ کوئلہ بنی نہ راکھ، اردو ادب کے لازوال کردار کے طور پر زندہ رہے گی۔ پھر ساوی ہے جس نے اس قصے میں شوخی اور رومان کا رنگ بھرا ہے ایک تتلی جو ہاتھ نہیں آتی، ایک غزال جو وحشت کرتا ہے۔ ایلی پر تو اس ناول میں ناحق کو خود مختاری کی تمت ہے وہ تو ان تین جشیوں۔ علی احمد (باپ) شہزاد اور ساوی کے درمیان کوڑے کھاتا پابجولاں چلا جا رہا ہے، چلا جا رہا ہے۔ بارہ سو صفحے کے اس ناول کو شروع کر کے ختم کئے بغیر رکھنا مشکل ہے، جس نے پڑھا ایسے پڑھا کہ کام سے یا دفتر سے چار دن کی چھٹی لی، اتنے دن کی رسد اور پانی کی ایک مٹکی پاس رکھ لی۔ بیٹوں اور تاجروں اور ان لوگوں کے پڑھنے کی یہ چیز نہیں جن کا لمحہ لمحہ بڑا قیمتی ہوتا ہے اور جو صرف منڈیوں کے بھاؤ اور سینما کے اشتہار پڑھنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، غالباً انہیں طباقوں کا مفاد نظر تھا کہ آدم جی انعام کے فاضل جنوں نے انعام نہ دے کر قوم کو اس ناول سے بچانے کی کوشش کی لیکن تقدیر پر کس کا بس چلتا ہے۔ سنا ہے اب یہ دوبارہ شائع ہو رہا ہے۔

## علی پور کا ایلی

### ایلی

اس کا نام الیاس تھا۔ لیکن گھر میں سبھی اسے ایلی کہا کرتے تھے۔ ”ایلی —“ اس کے ابا آواز دیتے۔ ابا کی آواز سن کر اس کا دل دھک سے رہ جاتا۔ ”ایلی۔ حقہ بھر دو۔“ وہ چپ چاپ اٹھ بیٹھتا۔ ابا کے کمرے کا دروازہ بند دیکھ کر ایک ساعت کے لئے ہچکچاتا، محسوس کرتا کہ اس بند کمرے میں داخل ہونا ٹھیک نہیں۔ دبی آواز میں کھانسنے کی کوشش کرتا تاکہ کمرے کے لوگ اس کی آمد سے مطلع ہو جائیں۔ لیکن اس کی آواز حلق میں سوکھ جاتی۔ پھر وہ بڑی کوشش سے چلاتا۔ ”آیا جی“ اور جرائت کر کے دروازہ کھولتا لیکن دروازہ کھولنے سے پہلے اپنی نگاہیں جھکا لیتا اور ایسا انداز اختیار کر لیتا۔ جس سے ظاہر ہو کہ حقہ کے علاوہ اسے کمرے کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ کمرے میں ابا کو اکیلے دیکھ کر اس کے دل سے بوجھ اتر جاتا پھر وہ بے فکری سے حقہ کی طرف بڑھتا۔

اس کے ابا عام طور پر چٹائی پر بیٹھے ڈیمک پر رکھے ہوئے رجسٹر میں لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ وہ قنیں اتار کر بیٹھا کرتے تھے۔ ان کی دھوتی میلی ہونے کے علاوہ پٹی ہوئی تھی اور اس کے پلوں کو ادھر ادھر سر کے رہنے کی بری عادت تھی جو ایلی پر بے حد گراں گزرتی۔ ”ہوں — کیا ہے۔“ ابا گھور کر اس کی طرف یوں دیکھتے جیسے وہ خواہ مخواہ کمرے میں آگھسا ہو۔ ”جی۔ جی۔ چلم“ ایلی ان کی دھوتی کی طرف نہ دیکھنے کی شدید کوشش کرتے ہوئے جواب دیتا اور پھر چلم اٹھا کر دروازے کی طرف بھاگتا۔





ابھار ہاجرہ کے سر پر آکھڑی ہوتی۔ ”ہاجرہ یہ کرو وہ کرو اور یہ تو تم نے ابھی تک کیا ہی نہیں اور وہ کام جو میں نے کل تمہیں دیا تھا وہ۔“ صنفیہ کی باتیں سنتے ہوئے الماں کی عجیب حالت ہوتی۔ اس کی نگاہیں صنفیہ کے چہرے پر لگی ہوتیں۔ جسم میں گویا جان نہ ہوتی۔ نس نس حاضر ہوتی۔ ایللی کو تو شک پڑتا تھا کہ الماں اس پر قریبان ہوئی جا رہی ہے اور اس کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو یوں اٹھاتی جیسے قرآن شریف کا ورق ہو۔

آصفی محلے والیاں سب یک زبان ہو کر کہا کرتی تھیں۔ ہے ہاجرہ بیچاری تو مظلوم ہے۔ جسے سوکن کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن بہن سچ پوچھو تو ہمارے لئے تو گھر والی وہی ہے اور یہ کالے منہ والیاں جو گھر میں آ جاتی ہیں۔ ہمیں ان سے کیا۔

محله والیاں بکتی تھیں صنفیہ کا منہ کالا کہیں تھا۔ الٹا وہ تو سرخ اور سفید تھا نہ صنفیہ سوکن تھی۔ نہ الماں مظلوم۔ پھر وہ کیا تھیں اس ابھن کو بھولنے کے لئے ایللی نیچے محلے کے لٹلے میں اتر جاتا۔ اس کا اپنا گھر ایک معمہ تھا۔ وہ مندی والے ہاتھوں ملل کے ابھاروں والی صنفیہ۔ سوکن کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے والی ہاجرہ۔ سنی بھری بولتی گوگنی فرحت اور بند کمرے میں بیٹھنے کے شوقین علی احمد۔

آصفی محلے کے چوگان میں پہنچ کر وہ اپنے گھر کو بھول جاتا حتیٰ کہ چوگان میں کھیلتے ہوئے اسے ابا کی آواز سنائی دیتی ایللی۔ ایللی۔ ابا کا حقہ بھرنے کے بعد وہ ان کاموں سے بچنے کے لئے احاطہ چھوڑ کر علی پور کے بازاروں یا کھیتوں میں چلا جاتا اور کھیل کھیل کر تھک جاتا تو کسی درخت کے تلے بیٹھ کر سوپنے لگتا۔ ان کا گھر ایسا کیوں ہے۔ ابا ایسے کیوں ہیں۔ صنفیہ کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے۔

### علی پور

علی پور چھوٹا اور بے حد پرانا قصبہ تھا۔ اس کی وضع قطع وہاں رہنے والوں کی نفسیات کی آئینہ دار تھی۔ قصبہ کے ارد گرد چاروں طرف ٹانگ چندری اینٹوں کی فصیل بنی ہوئی تھی۔ جو اب جگہ جگہ سے گری جا رہی تھی۔ جس میں جگہ جگہ بڑے بڑے شکاف پڑ چکے تھے۔ فصیل میں آٹھ دروازے اور دو موریات تھیں۔ اس چار دیواری کے باہر گول سڑک بنی ہوئی تھی جو قصبہ کے گرد گھومتی تھی۔ جس کے پرے سرسبز کھیتوں میں یہاں وہاں قدیم باغات

الماں کے قرب کی وجہ سے وہ فرحت سے جلتا تھا اور اپنے آپ کو فرحت سے بہتر سمجھتا تھا۔ فرحت کی اس گھر میں حیثیت ہی کیا تھی نہ تو ابا نے اسے کبھی بلایا تھا۔ نہ اسے چلم بھرنے کے لئے کہا تھا اور ایللی کو تو وہ اکثر بلاتے تھے۔ وہ جب کھانا کھانے لگتے تو ”ایللی“ کو آواز دیتے ایللی اور جب ایللی جاتا تو دو انگلیوں سے بوٹی اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیتے ”ایللی بوٹی۔“ اور ایللی اسے ہاتھ میں اٹھائے یوں اپنے کمرے میں داخل ہوتا جیسے کوئی تہنہ ہو۔ وہ فخریہ انداز سے فرحت کی طرف دیکھتا۔ لیکن فرحت یوں ناک چڑھا کر منہ پھیر لیتی جیسے ایللی کے ہاتھ میں گوشت کی بوٹی نہیں بلکہ مرا ہوا چوہا ہو۔ ہونہ ایللی غصے سے پھنکارتا ”بڑی آئی ہے۔ جیسے بوٹیاں کھا کھا کر آتا چکی ہو۔“

پھر جب صنفیہ پھلوں کی ٹوکری نکال کر انہیں چھانفتی اور گلے سڑے پھل الگ کرتی تو ابا ایللی کو آواز دیتے اور جب وہ ان میں سے کم گلا سڑا کیلا یا سیب ایللی کی طرف بڑھاتے تو صنفیہ بول اٹھتی۔

”لو یہ تو ابھی اچھا بھلا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ عجیب سی مسکراہٹ، مسکراتی اس مسکراہٹ سے سارا کرا بھر جاتا اور ایللی خود محسوس کرتا جیسے واقعی وہ پھل ابھی اچھا بھلا ہو اور اس قابل نہ ہو کہ کسی کو دیا جائے۔ علی احمد حیرت سے صنفیہ کی طرف دیکھتے اور پھر کھیانی ہنسی ہنس کر دوسرے گلے سڑے پھلوں سے چٹاؤ کرنے میں مصروف ہو جاتے۔

اگر کبھی ابا کوئی پھل فرحت کو دیتے تو وہ اسے یوں ایک طرف رکھ دیتی جیسے وہ کھانے کی چیز ہی نہ ہو۔

بڑا بچی تھی فرحت اور الماں اس کی ان حرکتوں پر خفا ہونے کی بجائے فخر اور مسرت سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی۔ الماں کی اس مسکراہٹ پر ایللی محسوس کرتا جیسے فرحت اور الماں نے چوری چوری آپس میں سمجھوتا کر رکھا ہو۔ اسے غصہ آتا کہ الماں اس سے سمجھوتہ کیوں نہ کرتی تھی۔ اول تو ایللی اپنے حصے کا پھل رکھ دینے کا قائل ہی نہ تھا اور کبھی رکھ دیتا تو الماں نیچے جھاکر اس کے پیچھے پڑ جاتی۔

”اے اب کھا بھی لے ایسے پڑا رہے گا خراب ہو جائے گا۔“ الماں یہ بات فرحت سے کیوں نہیں کہتی وہ سوچتا۔ وہ ہم سے ایک سا بڑا کیوں نہیں کرتی۔

فرحت کی بات چھوڑے خود صنفیہ سے الماں کا بڑا عجیب سا تھا۔ صنفیہ گردن اٹھا، چھاتی

بیوی کی آنکھیں اتنی شکم کیوں ہیں۔

نھو تمباکو فروش کی دوکان پر چوٹ کا کھیل چلتا۔ بولے حکیم کی دوکان پر شریعت سے متعلق مسائل پر گرما گرم بحث ہوتی۔ معراج لنگڑے کی دوکان پر ترپ کی بازی کھیلی جاتی اور چاند حلوائی کے تخت پوش پر آنے والے سیاسی دور کا تذکرہ رہتا۔

ہر دوکان پر ایک نہ ایک خصوصی قسم کا مجمع لگا رہتا۔ یہ لوگ ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھتے۔ کہاں سے آیا ہے کہاں جا رہا ہے کیوں آیا ہے کس لئے جا رہا ہے اور اس کے گزر جانے کے بعد دیر تک ان تفصیل پر اپنی رائے کا اظہار کرتے رہتے۔ اجنبی کی آمد پر پہلے تو ان کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں اور اس کا احاطہ کر لیتیں پھر اس کا تعاقب کرتیں۔ ایک گروپ کی نگاہوں کی زد سے نکلنے کے بعد وہ دوسرے گروہ کی نگاہوں پر چڑھ جاتا۔ اس کے خدوخال، لباس، انداز، چال، گفتگو اور سرسری حرکات کا مفصل جائزہ لیا جاتا پھر ان جملہ تفصیلات پر اظہار خیال کیا جاتا اور پھر تنقید و تبصرہ کے بعد اس کی شخصیت اور طور اطوار پر آخری فیصلہ سنا دیا جاتا جس کے خلاف اپیل کرنے کی گنجائش نہ ہوتی اور جس کو بدلنے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔

### آصفی محلہ

علی پور کے جنوب مغرب میں ہاتھی دروازے کے قریب بڑی ڈیوڑھی کے عقب میں آصفی محلہ تھا جس میں ایلی کے عزیز و اقربا رہتے تھے۔ بڑی ڈیوڑھی کے پٹ رنگ آلود ہو چکے تھے اور چولیس بے کار۔ ڈیوڑھی کی پیشانی پر دھندلے حروف میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اندر ڈیوڑھی کے پہلو میں آصفیہ مسجد تھی جس کے قریب شاہ ولی کا مزار تھا۔ مزار سے آگے آصفی محلہ تھا۔ چاروں طرف چار منزلہ مکانات ۱۔ ستادہ تھے جن کے درمیان ایک وسیع احاطہ تھا۔ جس میں کمیٹی کی ایک خیمہ لال ٹین لگی ہوئی تھی۔ احاطے کے ایک طرف رنگ محل تھا جس کی چونے لگی دیواروں پر رنگ کے نقش و نگار کی بجائے میل جما ہوا تھا۔ دوسری طرف شیش محل تھا جس میں نہ تو کوئی شیش لگا ہوا تھا اور نہ بلور دونوں کی وضع قطعی طور پر محل کی سی نہ تھی۔ اس کے باوجود محلے والے انہیں رنگ محل اور شیش محل کہتے تھے۔ شیش محل کے نیچے ایک فراخ نہ خانہ تھا جس میں ایک مسجد اور ایک کنواں تھا۔

کے شکستہ مکرواضح آثار پھیلے ہوئے تھے۔ کچی پگڈنڈیاں قرب و جوار کے گاؤں کی طرف نکل گئی تھیں۔ جہاں سے علی پور کا شہریوں دکھائی دیتا تھا، جیسے قدیم عمارتوں کا ایک ڈھیر ہو۔

شہر کے اندر ٹانک چندی اینٹوں کی بنی ہوئی سڑکیں گلیاں اور عمارتیں تھیں۔ بازاروں میں تنگ سڑکوں کے ارد گرد دکانوں میں تھیلیاں لٹکتی تھیں۔ مٹی کی ہنڈیاں نیچے اوپر رکھی تھیں۔ حکیم کی دوکان میں سیاہ رنگ کی بوتلوں پر رنگ آلود ٹین کے ڈھکنے چڑھے تھے۔ جن پر کھیاں بجنھنا تیں۔ بازاروں سے تنگ گلیاں گھومتی ہوئی نکل جاتیں۔ جن کے دونوں طرف چھوٹی اینٹوں کی دیواریں ۱۔ ستادہ تھیں۔ ان بوسیدہ ریختی دیواروں میں کہیں کہیں اکا دکا کھڑکی کھلتی۔ تنگ و تاریک کھڑکی۔ ان اونچے ترچھے ٹانک چندی مکانات کو دیکھ کر دل پر ایک بوجھ سا پڑ جاتا۔ دیواروں پر بدرنگ ٹانک چندی اینٹوں کو دیکھ کر سر میں درد ہونے لگتا۔ طبیعت پر ان جلدی اداسی چھا جاتی۔ یہاں وہاں اندھیری ڈیوڑھیوں سے دیرانی جھانکتی۔ منڈیروں اور چھتوں پر سائے سے حرکت کرتے۔ جیسے بھوت پریت چل پھر رہے ہوں۔ گلیاں گھومتے گھومتے دفعتاً آگے سے بند ہو جاتیں یا گلی کے اختتام پر محلے کا احاطہ شروع ہو جاتا۔ جہاں بچے فرش پر ریختے۔ عورتیں چرخہ کاتنے یا ازار بند بننے میں مصروف نظر آتیں یا کھڑکیوں سے سر نکال کر ایک دوسری سے لڑتیں ہاتھ چلا کر کوسنے دیتیں۔

قدیم شہروں کی طرح علی پور بھی ایک ٹیلے پر آباد تھا۔ جس کے عین وسط میں ٹیلے کی پوٹی تھی۔ جس پر اک مسمار شدہ قلعے کے آثار تھے جو شاید کسی زمانے میں شہر کی حفاظت کے لئے بنایا گیا تھا اس اونچے مقام کو جبہ کہتے تھے۔ بٹے کے پاس ہی قصبے کی عالی شان جامع مسجد تھی۔ جس کے قریب بڑا بازار تھا۔ جس میں کپڑے اور غنیمت کی دکانیں تھیں۔ بڑے ازار کے چاروں طرف گمری تاریک گلیوں کا جال بچھا ہوا تھا اور ان سے پرے شہر کی فصیل دور دروازے اور اس سے پرے گول سرسبز کھیت اور پرانے بامنت کے مسمار شدہ آثار۔

علی پور کے بازاروں میں لوگ دکانوں پر بیٹھ کر حقہ پیا کرتے دنیاوی اور مذہبی مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے۔ کوئی اس اہم بات پر روشنی ڈالتا کہ شیخ عظمت بیگ کے گھر اولاد کیوں نہیں ہوتی۔ کوئی یہ نقطہ سمجھاتا کہ آصف علی کی بیگم دراصل کس خاندان سے ہے۔ ایک اس امر کی وضاحت کرتا کہ نورے حجام کے پاس وہ کونسا بے نظیر نسخہ ہے جو جنکوں کے سبب سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک یہ راز فاش کرتا کہ بابو سمیع کے لڑکے اعظم بیگ کی

## علی احمد

ایلی کے والد علی احمد کا گھر محلے بھر میں بڑے گھرانوں میں گنا جاتا تھا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ محلے بھر میں احمد واحد شخص تھے جنہوں نے چودہ جماعتوں تک تعلیم پائی تھی۔ اگرچہ وہ بی اے کی ڈگری حاصل نہ کر سکے تھے، لیکن اس زمانے میں بی اے فیل ہونا بڑی بات تھی۔ بی۔ اے میں فیل ہونے کے بعد علی احمد کو ایک مقتول آسامی مل گئی تھی اور اس آسامی کی وجہ سے محلے بھر میں ان کی عزت تھی۔

اپنے والد کی طرح علی احمد کی طبیعت میں بھی عاشقانہ چمک کا عنصر تھا۔ لیکن ان کی طبعی رنگین مزاجی اور جرأت رندانہ عاشقانہ عنصر پر حاوی رہتی، جو انہیں آپس بھرنے اور فراق میں تڑپنے کی بجائے جینے کی طرف مائل رکھتی۔ دراصل علی احمد کو افراد کی بجائے زندگی سے عشق تھا۔

علی احمد کا قد درمیانہ تھا بدن چھریا، رنگ سانولا ان کی پیشانی فراخ تھی۔ خدوخال میں کوئی خصوصی جاذبیت نہ تھی مگر اس کے باوجود نہ جانے اس فراخ پیشانی میں ان سادہ سیاہ آنکھوں میں یا جانے کہاں وہ بے نام اثر تھا، جسے محسوس کر کے راہ چلتی عورت اپنے راستے سے ہٹ جاتی۔ اس کے پاؤں آپ ہی آپ ٹھیکنے لگتے۔ پلو سر سے سرک کر شانوں پر جا گرتا۔ پھر برقعہ کے پٹ کھلنے اور درز سے ایک بڑی سی چمکیلی آنکھ ظہور ہو جاتی۔

علی احمد کی چال میں ایک خصوصی جاذبیت تھی ان کے شانے کبھی خم سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ ان کی چھاتی تہی رہتی نگاہیں ہمیشہ اوپر کو اٹھی رہتیں۔ وہ دیکھ کر راہ چلنے کے عادی نہ تھے بلکہ انہیں راہ چلنے ہوئے دیکھنے میں دلچسپی تھی۔ علی احمد کے انداز میں ایک وقار تھا۔ ان کی طبیعت میں منساری کے علاوہ ایک رنگینی تھی۔ گفتار میں شوخی اور شرارت تھی اور ان کی نگاہوں میں نصرت اور کامیابی کا پیغام جھلکتا تھا۔

بیویوں کے متعلق علی احمد کے خیالات نہ تو محدود تھے اور نہ رسمی۔ انہیں بیویوں سے یہ گلہ تھا کہ انہیں جلدی ہی عام ہو جانے کی عادت ہوتی ہے۔ چاہے کتنے چاؤ چوٹلوں سے بیاہ کر لاؤ۔ کتنے ہی رکھ رکھاؤ سے رکھو لیکن جلد ہی وہ پلورچی خانے میں بیٹھی آلو چھیل رہی ہو گی یا راکھ بھرے چولے میں پھونکیں مار رہی ہو گی۔ اس طرح چند ہی روز میں وہ

اس تہ خانے کے متعلق مختلف قسم کی روایات مشہور تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ یہ تہ خانہ بندے کے حملوں سے بچنے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ جب سکھ لیرے شہر پر ہلا بولتے تو آصفی محلہ کے مرد عورتیں اور بچے تہ خانے میں پناہ لیتے۔ مسجد میں نماز پڑھتے اپنی سلامتی کی دعائیں مانگتے اور کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پی پی کر اللہ کا شکر بجالاتے۔

محلے میں کئی ایک ڈبوڑھیاں اور کمرے ایسے تھے جن میں سورج کی روشنی کبھی داخل نہ ہوئی تھی۔ دوپہر کے وقت بھی محلے والے ہاتھوں سے ٹٹول کر یا دیاسلائی جلا کر ان ڈبوڑھیوں اور کمروں سے گزرا کرتے تھے۔ ان پرانے محلات میں چوٹے گچے کمرے تھے۔ جن کی کھڑکیاں اک زمانے سے بند پڑی تھیں چھبے خیدہ ہو چکے تھے۔ کمروں میں جالے تے ہوئے تھے۔ چھتوں میں چمگادڑیں رہتی تھیں اور خمیدہ دیواروں میں شکاف پڑ چکے تھے۔ ان مکانات میں نت نئے اکشافات ہوتے رہتے تھے۔ کسی اندھیرے کمرے میں کسی بوسیدہ صندوق سے کوئی قلمی مسودہ برآمد ہو جاتا۔ کسی چوٹے گچی دیوار پر کسی پرانے کتبے کا ازسرنو اکشاف ہوتا یا کسی طاق کے اندر ایک مزید چھپے ہوئے طاق کا پتہ چلتا۔ شاید اسی وجہ سے ہر آصفی کے دل میں ایک پرائیویٹ خیال جاگزیں رہتا کہ محلے کے کسی نہ کسی کوٹے میں کیس نہ کیس دبا ہوا خزانہ موجود ہے۔ لیکن ہر آصفی نے اس امید افزا خیال کو دل میں چھپا رکھا تھا۔ وہاں کسی دبے ہوئے خزانے کا ہونا بعید از قیاس نہ تھا کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ شہنشاہوں کے زمانے میں جب آصفی برسر اقتدار تھے تو ان کی تنخواہ سرکاری خزانے سے گدھوں پر لد کر آتی تھی۔

پرانے زمانے میں آصفیوں کی عظمت مسلم تھی لیکن اب وہ باتیں محض قصے تھے۔ خوش کن تھے۔ اب آصفی اور ان کے رنگ محل اور شیش محل کے ارد گرد بسنے والے خدنگار اور کمین سب خلط ملط ہو چکے تھے۔ سارے محلے میں صرف چند افراد ایسے تھے جو مکتب سے تحصیل یافتہ تھے۔ اس لئے زیادہ تر آصفیوں کا شغل دوکانداری، مزدوری اور بے کاری پر مشتمل تھا۔ یہ آصفیوں کے انحطاط کا زمانہ تھا، اس لئے وہ اپنی عظمت کا احساس پدرم سلطان بود سے اخذ کرتے تھے۔ گذشتہ جاہ و حشمت کی کہانیاں ان کے نزدیک حال کی تاریخ البالی سے کہیں زیادہ وقعت رکھتی تھیں، جنہیں سننے میں آصفی محلے کی بوڑھیاں بچل سے کام نہ لیتی تھیں۔

بیوی سے بلورچن بن کر رہ جائے گی۔ بیوی کی اس بری عادت کے خلاف انہیں بہت شکایت تھی۔

والدین نے چھوٹی عمر ہی میں علی احمد کو باجرہ سے بیاہ دیا تھا وہ ابھی جوان ہی تھے کہ ان کے گھر دو بچے بھی ہو گئے۔ بڑی لڑکی فرحت اور چھوٹا ایل۔ ایل کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد علی احمد کے سر سے ان کے دادا اولاد علی کا سایہ اٹھ گیا۔ اس وقت علی احمد نوجوان تھے برسرِ اقتدار تھے اور اپنی پیشانی اور رنگین نگاہوں کے بے نام سحر سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے گرد پیش ایک حسین و دلکش دنیا پھیلی ہوئی تھی اور دل میں تسخیر کا بے پناہ جذبہ موجیں مار رہا تھا۔

علی احمد کو باجرہ سے چنداں دلچسپی نہ تھی، اس کی کئی ایک وجوہات تھیں اول تو باجرہ کے نام میں اتنی تقدیس تھی۔ ایسے مقدس نام کی لڑکی سے کوئی شوخ یا رنگین قسم کی حرکت کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ دوسرے اعمال کے لحاظ سے بھی وہ باجرہ ہی تھی۔ اس لئے باجرہ کا نام ہی علی احمد کے رنگین مزاج پر بار تھا۔ جسمانی طور پر بھی وہ چنداں قابل قبول نہ تھی قد چھوٹا بناوٹ میں نزاکت کا عنصر قطعی طور پر مفقود۔

باجرہ ان بیویوں میں سے تھی جو خاوند کی آمد پر تسلیم و رضا کی شدت سے بے جان ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے برعکس علی احمد کو عمل تسخیر سے عشق تھا اور تسخیر جہی ممکن ہے جب سرکشی کا عنصر غالب دکھائی دے۔ چاہے وہ فریب نظر ہی کیوں نہ ہو جو تسخیر کے جذبے کو ابھارے تسخیر کرنے والے کو مائل بہ عمل کرے اور پھر مطمئن کرنے چل نکلے۔ وہ اپنی استادہ چال، ابھری ہوئی چھاتی، فراخ پیشانی اور رنگین تبسم نگاہوں سے مردانہ وار تسخیر کرتے پھر ننھیلے میں ڈان کو ہٹے کی سی پر جوش لڑائی لڑنے کے بعد اس میدان کا رزار کی دہلیز پر بچے کی طرح اس امید پر گر پڑتے کہ انہیں کوئی شفقت بھرا ہاتھ تھپک تھپک کر سلاوے۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت کے جملہ پہلوؤں پر حاوی تھا اس لئے یہ آمیزش درحقیقت ان کی تمام تر زندگی کا تار و پود تھا۔ بچہ ٹین کا سپاہی۔ جنگجو سورما۔

جنسی پہلو کے علاوہ علی احمد میں مجلسی زندگی کی جملہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ ان کی گفتگو میں طنز اور مزاح کی شیرینی تھی۔ لطائف اور روایات کے علاوہ انہیں شجرہ نسب اور دیگر تاریخی واقعات کو بیان کرنے میں بے حد مہارت تھی۔ محفل میں وہ اپنے تاریخی علم کا

اظہار کچھ اس انداز سے کرتے کہ ذرا کوفت نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ لکھنے سے تو انہیں عشق تھا عشق۔ اپنا بیشتر وقت وہ لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ شاید یہ آصفیوں کی بد قسمتی تھی یا شاید خوش قسمتی ہو کہ ان کی توجہ تصنیف و تالیف کی طرف مائل نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی احمد کی یہ قابلیت گھر کا حساب اور پیدائش و موت کی تاریخوں کے نوٹ کرنے پر محدود ہو کر رہ گئی۔ لیکن نظر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ کام بھی ایک بہت بڑی مصروفیت تھا۔ علی احمد کے ڈسک پر بڑے بڑے ضخیم رجسٹر پڑے رہتے تھے۔ جن کے ساتھ المونیم کی تھالی میں ایک دوات اور دو موٹی نبوں کے قلم رکھے رہتے۔ اپنی مخصوص میلی اور پھٹی ہوئی دھوتی پہن کر قبض اتار کر کیمبل یا چٹائی پر اکڑوں بیٹھ کر وہ فرصت کے اوقات میں ان بھاری بھر کم رجسٹروں میں مختلف نوعیت کے اندراج کرنے میں شدت سے مصروف رہا کرتے تھے۔

علی احمد کے کردار میں روپے پیسے کی احتیاط کا پہلو بے حد اہم تھا۔ وہ پیسوں کو احتیاط سے رکھتے تھے اور ہر قسم کے خرچ کو فصول خرچ کے مترادف سمجھتے تھے حتیٰ کہ عورت پر بھی روپیہ خرچ کرنے کے قائل نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عورت کو تسخیر کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز وعدے ہیں۔ روپے کا تصرف نہیں۔ ان کا ایمان تھا کہ عورت کی خوشی حقیقت سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ محض تخیل سے وابستہ ہے اور اسے روپے پیسے جیسی ملوی چیز سے کوئی تعلق نہیں۔

نوجوانی ہی میں علی احمد عظیم الشان کامیابیوں سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ ابتدائی دور میں چانناں کے التفات نے ان میں خود اعتمادی کی بنا ڈالی تھی۔ پھر صفیہ کی ڈر لمائی شکست نے تو انہیں ہیرو بنا دیا تھا۔

### صفیہ

صفیہ شام کوٹ کی ایک بیار تھی۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر عجب وقار تھا۔ اس کا لانا قد کشادہ پیشانی اور استادہ چال دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے قدرت نے شام کوٹ میں ایک قلوپترہ پیدا کر دی ہو۔ صفیہ کو دیکھ کر علاقہ کا پولیس الیکٹر شاپ الدین اپنے اوسان کھو بیٹھا تھا۔ لیکن پولیس کا افسر اعلیٰ ہونے کے باوجود وہ شام کوٹ کی اس بیار حسینہ کو اپنی جانب متوجہ نہ کر سکا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاب الدین کے دل میں صفیہ کی آرزو نے

میں اہلی تھا وہ ایک نحیف و نحیفہ تھا۔ اکثر بیمار رہتا۔ ہاجرہ کے لئے یہ بھی بہت تھا کہ اس کے پاس فرحت اور اہلی تھے جن کے سارے وہ زندگی بسر کر سکتی۔ اس لئے اس کی تمام تر توجہ اہلی کے علاج معالجے کی طرف مبذول ہو گئی۔ اہلی زندہ رہے۔ اہلی صحت مند ہو جائے، چاہے گھر میں بیسیوں صفائیں آجائیں۔ پڑی اس۔ اپنے نصیب میں بہن۔ مقدر کے خلاف کیا شکوہ۔ ہاجرہ کے آنسو خشک ہو گئے۔ اس کے بالوں اور دھپے سے عطر کی خوشبو آنے کی بجائے ہسپتال کی آویڑیں اور پنساری کے کسر آئل کی بو آنے لگی۔ اس کے خیالات میں اپنے گھر کی بجائے اہلی کا گھر بس گیا۔ جب اہلی جوان ہو گا۔ جب اہلی کی بیوی آئے گی۔ جب اجڑا ہوا گھر پھر سے آباد ہو گا۔ جب لٹا ہوا سہاگ لوٹ آئے گا۔ ہاجرہ نے بستر پر پڑے ہوئے بیمار اہلی کی طرف دیکھا اور فرط محبت سے اس کے قریب تر ہو گئی۔ ننھی فرحت حیران کھوئی کھوئی نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ ہاجرہ فرحت اور اہلی یہ ان کی دنیا تھی۔ ہاجرہ اہلی کی طرف دیکھتی رہی فرحت ہاجرہ کا سارا ڈھونڈتی رہی اور اہلی بے بس نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھا کیا اور ساتھ والے کمرے میں روغنی کجری اور ٹین کا سپاہی محبت کا میدان جنگ گمرانے میں مصروف رہے اور علی احمد کی بوڑھی ماں جائے نماز پر یوں بیٹھی رہی جیسے کچھ نہ سن رہی ہو، کچھ نہ دیکھ رہی ہو۔

### انوکھا انتقام

اہلی جے گیا بچپن کی لمبی پہاری کے چنگل میں پڑا وہ آخری سانس لیتا رہا۔ مگر لیتا رہا، اس کی لاغری اور ناتوانی کی وجہ سے بیماری اسے ہلاک نہ کر سکی اور بالآخر چھوڑ گئی۔ وہ رو بہ صحت ہونے لگا۔

ہاجرہ نے اسے رو بہ صحت ہوتے دیکھا تو اس کے دل سے ایک بوجھ اتر گیا۔ اہلی زندہ رہے گا۔ اہلی کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ایک بار پھر ہاجرہ کی توجہ اپنے لئے ہوئے سہاگ کی طرف مبذول ہو گئی۔ خاوند کے لئے جو دلی چھپی محبت اس کے دل میں تھی وہ پھر سے ابھر آئی لیکن اظہار کو کون روک سکتا ہے۔ اصلی روپ میں نہ سہی، کسی بہروپ میں سہی۔ ہاجرہ کے دل میں بھڑکتی ہوئی پیار کی آگ نے نفرت کا روپ دھار لیا تاکہ اظہار تو ہو سکے۔ لیکن نفرت جتانے کا بھی کوئی ذریعہ نہ تھا وہ تو خود علی احمد کی محتاج تھی۔ اس کی نفرت

عشق کا رنگ اختیار کر لیا اور عالم مجبوری میں وہ مصیہ کو اغوا کرنے پر مجبور ہو گیا۔ چونکہ شباب الدین کے ذرائع وسیع تھے اس لئے وہ مصیہ کو لے کر امرتسر پہنچ گیا اور اسے اپنے موروثی مکان کے دیوان خانے میں بٹھا کر خود والدین کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے اندر گیا تاکہ مصیہ کے لئے اپنے مکان میں دائمی جگہ پیدا کر سکے۔

علی احمد اسی وقت اتفاق سے اپنے دوست شباب الدین سے ملنے اس کے مکان پر جا پہنچے۔ مصیہ کو دیکھ کر وہ جھوسنے لگے۔ مصیہ کی بے پردہ اور بھرپور جوانی نے ان کی قوت تسخیر کو لٹکرا۔ نہ جانے اس مختصر سے وقفہ میں شباب الدین کے دیوان خانے میں ٹین کے سپاہی نے اس سرخ و سپید ثیار کو کیا جوہر دکھائے کہ شباب الدین کی آمد سے پہلے ہی مصیہ علی احمد کی ہو کر رہ گئی اور ایک بچے کی طرح علی احمد کی انگلی پکڑے دیوان خانے سے باہر نکل آئی۔

آصفی محلے میں مصیہ کو چھپائے رکھنا مشکل کام نہ تھا اس لئے پولیس کی مصیہ کو ڈھونڈھ نکالنے کی کوششیں اکارت گئیں اور مصیہ چپکے سے علی احمد کی بیوی بن گئی۔

مصیہ کے آنے پر محلے میں کافی ہلچل پیدا ہوئی مگر بیچارے محلے والے معمولی احتجاج کرنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتے تھے۔ ہاجرہ اس نئی آمد پر شگفتگی۔ رد کی پٹی لیکن ہاجرہ کی سنتا ہی کون تھا۔ اس کے علاوہ وہ خوب جانتی تھی کہ علی احمد کے گھر میں اس کی حیثیت نوکرانی سے زیادہ نہیں۔ چاہے مصیہ آئی یا نہ آئی۔ اس لئے جلد ہی وہ خاموش ہو گئی۔ علی احمد کی والدہ جانتی تھی کہ بیٹا اپنے باپ کی طرح جذباتی واقع ہوا ہے۔ خاوند کے جذبہ محبت کی وجہ سے اس نے عمر بھر رٹا پے میں بسر کی تھی۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں بیٹا بھی اسی جذبہ کے تحت اسے داغ مفارقت نہ دے جائے، اس لئے وہ بھی چپ چپ ہو رہی کہ چلو بیٹے کے صدمے کی نسبت دوسری ہو گا گھر میں آنا برا نہیں۔ محلے والے بھی خاموش ہو رہے کیونکہ صدائے احتجاج بلند کرنا تو آسان ہے مگر اسے قائم رکھنا محنت طلب بات ہے۔ انہیں صرف یہ گلہ تھا کہ مصیہ شام کوٹ کی ترکھانی تھی۔ ایک ترکھانی کا آئینوں میں آئینا ہونا تکلیف دہ امر تھا مگر اس کا کیا کیا جاتا کہ شریعت اس بات کی اجازت دیتی تھی اور کھلے بندوں شریعت کے خلاف آواز اٹھانا مناسب نہ تھا۔

مصیہ کے آنے پر ہاجرہ کی حیثیت محض ایک نوکرانی کی رہ گئی۔ اس وقت ہاجرہ کی گود

بھوکے سو جاتے۔ پھولدار پلنگ پر بیٹھے بیٹھے صفیہ انتظار سے آگاہ کر چلائی۔ ”ہاجرہ جب تک وہ نہ آئیں، تم باورچی خانے سے نہیں جانا سونا نہیں۔“ اور ہاجرہ چوکی پر بیٹھی انتظار کرتی کہ کب علی احمد آئیں اور وہ انہیں کھانا کھلانے سے فارغ ہو کر اپنا چولہا جلائے۔ ایللی اور فرحت کے لئے چاول پکائے۔

علی احمد واپس آتے تو چپکے سے دبے پاؤں اپنے کمرے میں داخل ہو جاتے تاکہ صفیہ کو معلوم نہ ہو کہ وہ اتنی دیر سے لوٹے ہیں۔ لیکن ان کی آہٹ پا کر صفیہ جاگ اٹھتی۔ وہ علی احمد سے بگڑتی۔ علی احمد اسے مناتے لیکن وہ بگڑے چلی جاتی۔ پھر کمرے سے دھینگا مشتی کی آوازیں آنے لگتیں چونکہ معاملے کی نزاکت دیکھ کر ڈان کو بٹے میدان میں آ نکلتا۔ ٹین کا سپاہی اپنے واؤ دکھاتا بلاخر شام کوٹ کا وہ مضبوط مگر حسین قلعہ سر ہو جاتا اور صفیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ علی احمد خوب جانتے تھے کہ ٹین کا سپاہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا سکتا ہے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جائے تو ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہاجرہ کو آواز دی جاتی۔ ہاجرہ کھانا کھلاؤ۔ کھانا کھانے کے بعد ٹین کا سپاہی تازہ دم ہو کر پھر سے میدان کارزار میں شام کوٹ کے قلعے کو لٹکارتا اور ہاجرہ چپکے سے اپنا چولہا جلا کر سوئے ہوئے بچوں کے لئے کھانے پینے کا سامان تیار کرنا شروع کر دیتی۔

پھر صفیہ کو ایک نئی بات سوچھی ایک نیا امتحان۔ ”ہاجرہ“ صفیہ بولی! ”دیکھو تو میری ہانہوں میں سونے کے کڑے ہوں تو کیسا رہے۔“ وہ آنکھ پچا کر مسکرائی۔ اسی دن ہاجرہ کی زندگی میں ایک نئی بات پیدا ہو گئی روپیہ بچانا۔ صفیہ کے کڑوں کے لئے روپیہ بچانا۔ صفیہ کے لئے ر۔ تھیں کپڑے میا کرنا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہاجرہ صفیہ کو اپنا نہ سکی۔ صفیہ فرحت اور ایللی کو دیکھ کر خوش نہ ہوتی تھی لہذا اس کی تیوری چڑھ جاتی۔ نگاہیں خشمگین ہو جاتیں کیونکہ اس کے اپنے یہاں کوئی بچہ نہ تھا۔

علی احمد کبھی کبھار حیرانی سے ان دو بچوں کی طرف دیکھتے جیسے ان کے وجود سے پہلی مرتبہ واقف ہو رہے ہوں۔ انہیں یاد آتے کہ وہ ان کے اپنے بچے ہیں اور پھر وہ بچے خواہ مخواہ ان کو اچھے لگتے اور وہ کھانا کھاتے ہوئے آواز دیتے۔ ”ایللی۔ یہاں۔ یہاں آؤ ایللی۔ یہ لوبوٹی۔“ جسے ہاتھ میں پکڑ کر ایللی وہ بے حد مسرور ہوتا اور یوں فخر سے اٹھائے پھرتا جیسے وہ ترفہ ہو۔

یا محبت کو کون خاطر میں لاتا تھا۔ وہ بیچاری کر ہی کیا سکتی تھی اور اظہار تو جیسی اظہار ہوتا ہے جب دوسرے اسے محسوس کریں۔ ہاجرہ نے اسی اظہار محبت یا نفرت کا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کر لیا۔ ایسا انوکھا طریقہ جو صرف عورت ہی کو سوجھ سکتا ہے جسے عمل میں لانے کی جرأت صرف عورت ہی کر سکتی ہے۔ اس نے اپنی سوکن صفیہ سے عشق لگا لیا۔ اس لئے کہ اس طرح وہ علی احمد کی حریف بن سکتی تھی اسے رقابت کی آگ میں جلا سکتی تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ علی احمد کے گھر کی نوکرانی ہاجرہ اب علی احمد کی نوکرانی نہیں تھی بلکہ اس کی حریف تھی۔ وہ صفیہ کی نوکرانی بھی نہ تھی۔ عشاق نوکر نہیں ہوتے۔ اگر صفیہ کے دل میں ہم جنسی کا ذرا سا بھی پہلو ہوتا تو ہاجرہ کی کامیابی یقینی ہو جاتی اور علی احمد ہاجرہ کے وجود کو ماننے پر مجبور ہو جاتے لیکن ایسا ہونا تھا نہ ہوا۔ صفیہ اپنے فطری مردانہ جاہ و جلال کے باوجود اپنی سرشت میں ہم جنسی کا پہلو نہ رکھتی تھی۔ اس لئے ہاجرہ کے اس انوکھے تسلیم و رضا کے جذبے کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر طہر بھری مسکراہٹ جھلکنے لگی۔ اچھا تو میں آزما دیکھوں۔ اس نے سوچا اور وہ ہاجرہ کو آزمانے کے دلچسپ مشغلے میں کھو گئی۔ ہاجرہ قدم آگے اٹھا چکی تھی اب وہ پیچھے نہ ہٹ سکتی تھی۔ صفیہ کیا کہے گی کہ وہ

اظہار محبت محض ایک دکھلاوا تھا۔ اس خیال سے ہاجرہ کے احساس خودداری پر پھیس لگتی تھی اس لئے وہ اندھا دھند اس راہ پر آگے بڑھنے لگی۔ ایک قدم اور شاید اب صفیہ کو یقین آ جائے ایک قدم اور شاید اب صفیہ قائل ہو جائے۔ وہ آگے بڑھتی گئی۔ صفیہ کی جانب قدم اٹھاتی گئی اور فرحت اور ایللی پیچھے رہتے گئے۔ پیچھے رہتے گئے۔ ”صفیہ صفیہ۔“ ہاجرہ کی آواز میں وہ لٹاکر تھی جو صرف احساس شکست ہی پیدا کر سکتا ہے۔ ”صفیہ۔ آزما دیکھو۔ صفیہ۔“ دور ایللی پڑا چارپائی پر رو رہا تھا۔ فرحت گریا کھیلتے کھیلتے آگاہ تھی۔ گھر کے اس چھوٹے سے دیران کمرے میں جو ہاجرہ کے لئے مخصوص تھا۔ فرحت اور ایللی تنہا رہ گئے۔

## نرالا امتحان

باورچی خانے میں ہاجرہ صبح و شام صفیہ کی خوشنودی کے لئے مصروف کار رہتی۔ صفیہ پھولدار پلنگ پوش پر بظاہر بے نیاز بیٹھی علی احمد کا انتظار کرتی اور علی احمد گھر سے باہر اپنی قوت تفسیر کے امتحان میں، مصروف رہتے۔ ہاجرہ کے کمرے میں ایللی اور فرحت رو رو کر



## بچپن

### مندی رنگے ہاتھ

ایلی برا ہوتا جا رہا تھا۔ گرد و پیش کے حالات کو سمجھے بغیر ان سے متاثر ہو رہا تھا۔ پٹنگ پر بیٹھی ہوئی صفیہ اس کی توجہ کا مرکز بنی جا رہی تھی۔ وہ صفیہ جس کے مندی رپے ہاتھ ہر وقت حرکت میں رہتے تھے۔ جس کے ہاتھوں کی میلی زرد انگوٹھیاں گھومتی تھیں۔ جس کی مہین لمبل کی فیض ہر وقت ابھری رہتی تھی۔ وہ صفیہ..... جس کے حکم کو بجالانے کے لئے اس کی ماں ہر وقت کمر بستہ رہتی تھی۔ جس نے ماں کو بچوں سے چھین لیا تھا جس نے اس کے باپ کو اپنے جادو کے زور سے نین کے سپاہی میں تبدیل کر رکھا تھا۔ وہ صفیہ، وہ اس صفیہ سے ڈرتا تھا اس کے خونیں ہاتھوں سے ڈرتا تھا۔ اس کے بالوں کے جوڑے سے ڈرتا تھا۔ اس کی مہین فیض سے ڈرتا تھا۔ چوری چوری اس کی طرف دیکھتا اس کی بے نام طاقت کو محسوس کرتا۔ جسم کے بل کھڑے ہو جاتے۔ کانوں کی لوہیں گرم ہو جاتیں۔ تنفس تیز ہو جاتا پھر اس کی روح کی گمراہیوں سے ایک طوفان اٹھتا۔ صفیہ کے خون سے بھیکے ہوئے ہاتھ اس کی طرف لپکتے۔ زرد میلی انگوٹھیاں گھومتیں۔ اس کا سر چکرانے لگتا طبیعت ہاش کرنے لگتی اور وہ دیوانہ وار بھاگتا۔ دور صفیہ کے کمرے سے دور، ان تمام چیزوں سے جنہیں صفیہ کے خون آلود ہاتھوں نے چھوا ہو۔

صفیہ کو معلوم تھا کہ ایلی مندی والے ہاتھوں سے چڑتا ہے اور انگوٹھیوں سے گھن کھاتا ہے۔ اس لئے وہ جان بوجھ کر ہر کھانے کی چیز کو ہاتھ لگا دیتی تھی اور اسے آواز دیتی: ”ایلی یہ لو

ہاجرہ اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی کہ بچے یہ محسوس نہ کریں کہ جو چیزیں علی احمد اور صفیہ کو میسر تھیں، وہ انہیں نصیب نہیں۔ اس لئے وہ انہیں ہر قسم کی تھوڑی تھوڑی چیز منگوا دیا کرتی تھی۔ اگر علی احمد کے لئے پلاؤ تیار ہوتا تو وہ انہیں نمکین چاول پکا دیا کرتی اور کہتی ”لو یہ بہترین قسم کا پلاؤ ہے اور ایلی اور فرحت خوشی خوشی وہ بہترین قسم کا پلاؤ کھاتے۔“ لیکن اس کے باوجود جب وہ دیکھتے کہ ان کی ماں گھر میں برتن مانگنے اور صفیہ کا کھانا پکانے میں صبح و شام مصروف رہتی ہے اور صفیہ کو پٹنگ پر بیٹھ کر حکم چلانے کے سوا اور کوئی کام نہیں تو وہ محسوس کرتے کہ ان کی ماں محض نوکرانی ہے اور علی احمد ان کے آقا ہیں۔ لا نہیں۔

صفیہ کے آنے پر علی احمد کو وہ آزادی نہ رہی تھی۔ تسخیر کا شوق تو ان کے دل میں جوں کا توں قائم تھا۔ لیکن اس کے مواقع کم ہو چکے تھے۔ دو ایک مرتبہ انہوں نے عورتوں کو گھر بلانے کی کوشش کی تھی لیکن صفیہ اس بات کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ علی احمد کو مجبوراً اپنی اس دلچسپی کو گھر سے باہر تک ہی محدود رکھنا پڑا۔ اب وہ راتیں باہر گزارنے لگے اور آدمی آدمی رات گئے گھر آنے لگے تھے۔ صفیہ نے اس پر صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن علی احمد صدائے احتجاج سے نہ ڈرتے تھے کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ صفیہ کی بڑی سے بڑی صدائے احتجاج کو نین کا سپاہی مسکراہٹ میں بدل سکتا ہے۔

\*\*\*

چکا ہو۔ جیسے وہ اپنے اس فعل کی وجہ سے ننگا ہو گیا ہو۔

”ہوں۔ تم یہاں ہو۔“ سارے دن کی تلاش کے بعد علی احمد نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ ”چلو گھر چلو۔ چلو“ اور وہ گھر کی طرف چل پڑے۔ گھر پہنچ کر علی احمد نے اس کے کپڑے اتروا دیئے۔ فیض پانچامہ جوتے اور اسے گھر سے باہر نکل کر اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

گلی ویران پڑی تھی لیکن ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے لوگ کھڑکیوں کے پیچھے سے چھپ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ منڈیروں کے پیچھے کھڑے ہنس رہے تھے۔ منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا شور مچا رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر دفعتاً گلی کے ٹانگ چندی اینٹوں کے فرش پر پاؤں کی چاپ گونجی۔ کوئی آ رہا تھا اسے یوں لگا۔ جیسے کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا دے مارا ہو۔ ہتھوڑے کی ضربیں قریب تر ہوئی جا رہی تھیں۔ ایلی دیوار میں منہ دے کر کھڑا ہو گیا۔ چھپانے کے لئے اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ منڈی کی بو کا رپلا آیا۔ تڑپ کر وہ ٹالی میں گر پڑا، جیسے ناگ نے ڈس لیا ہو۔ بے بسی میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

نہ جانے کتنا عرصہ ایلی نے اپنا بایاں ہاتھ بغل میں چھپائے رکھا۔ وہ ایک ہاتھ سے روٹی کھاتا تھا۔ ایک ہاتھ سے منہ دھوتا اور سارے کام اسی ایک ہاتھ سے کرتا تھا۔ جب کبھی مجبوری کی وجہ سے وہ منڈی رنگا ہاتھ بغل سے نکالتا تو اسے محسوس ہوتا جیسے ابانے کپڑے اترا کر اسے گلی میں نکل رکھا ہو۔ جہاں وہ ٹالی میں منہ دے کر رو رہا ہو۔

### انو کھا باب

اس زمانے میں وہ رہنک میں رہتے تھے جہاں اس کے ابلا لازم تھے۔ روہنگ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ گلیاں ویران تھیں۔ دکانوں میں سرخ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے لٹکے رہتے تھے اور مضبوط ہانموں والے پست قد قصائی کھانڑیوں سے ان ٹکڑوں کو کاٹنے میں مصروف رہتے۔ موٹی موٹی عورتیں یوں کچر کچر باتیں کرتیں جیسے چارہ کاٹنے کی مشینیں چل رہی ہوں۔ پھر علی احمد سیر کے لئے دلی گئے تو ایلی کو بھی ساتھ لے گئے۔ دلی کو دیکھ کر ایلی دنگ رہ گیا۔ اتنا بڑا شہر دیکھنے کا اسے پہلے کبھی اتفاق نہ ہوا تھا بازاروں کی بھیڑ، دوکانوں کی قطاریں۔ خواہنے والوں کا شور اور تانگوں اور گاڑیوں کا تسلسل دیکھ کر اس کے دل میں نئی بیداریوں نے کروٹ لی۔ دلی میں ماموں شمس علی کا گھر جہاں وہ ٹھہرے تھے، بذات خود ایلی کے لئے اجنبی کی چیز تھی۔ وہاں کی ہر بات

مٹھائی۔۔۔“ اور پھر مٹھائی کو اپنے ہاتھوں سے اچھی طرح مل کر اسے دیتی۔ ایلی اسے یوں پکڑتا جیسے وہ مٹھائی نہیں بلکہ چوہا ہو اور پھر اپنے کمرے میں آکر غصہ سے کھولتا۔ ”بڑا بد دلغ ہو گیا ہے تو“ صفیہ اسے ڈانٹتی۔ کیا ہے ”منڈی رنگے ہاتھ کو۔ یہ دیکھ ایسے اچھے لگتے ہیں۔ منڈی لگے ہاتھ۔ دیکھ تو“ وہ اس کے منہ پر ہاتھ مل دیتی اور ایلی آؤ آؤ کرتا بھاگتا اس کی ناک میں منڈی کی بو بس جاتی۔ مٹھی مٹھی ننگے پنڈے کی بو، اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا گرد و پیش میں انجالی پچکاریاں چلتیں۔ برہنہ صورتیں چاروں طرف سے یورش کرتیں۔ آخ تھو۔ آخ تھو۔

صفیہ نے ایک دن ایلی کو ستانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب وہ سو رہا تھا تو اس کے ایک ہاتھ پر منڈی مل کر اسے باندھ دیا۔ باہرہ نے فٹیں کیں۔ ”نہ صفیہ اسے کچھ نہ کہہ۔“ صفیہ بولی۔ ”منڈی ملنے سے کیا ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ کا پا کھنڈ مچا رکھا ہے اس لڑکے نے۔ دیکھوں کیا کرے گا۔ اپنا ہاتھ کٹ کر پھینک دے گا کیا۔“ یہ سن کر باہرہ خاموش ہو گئی۔ وہ بیچاری خود مجبور تھی۔ جب اگلے روز ایلی جاگا اپنا منڈی رنگا ہاتھ دیکھ کر اس نے سر پیٹ لیا۔ جسم کے بند بند سے مٹھی مٹھی بو آرہی تھی۔ نگاہ میں ہر چیز سرخ دکھائی دے رہی تھی۔ اس روز اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ننگا ہو۔ جیسے اس کا جسم غلاط سے لٹھڑا ہوا۔ باہر صحن میں سفید ململ کی باریک کرتی پہنے صفیہ کھڑی بل بناتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ نہ جانے ایلی کو کیا ہوا۔ اس کی نظر میں وہ سفید کرتی سرخ دکھائی دینے لگی۔ سرخ، خونیں سرخ۔ جیسے وہ فیض منڈی سے رنگی ہو۔ وہ بھاگا۔ لپکا اور آن کی آن میں صفیہ کی کرتی پر بل پڑا۔ اس کے ناخون سفید ململ میں دھنس گئے۔ فیض کی دھجیاں صحن میں اڑنے لگیں۔ ”مجھے برا ہو لینے دے۔ مجھے دسویں پاس کر لینے دے پھر۔ پھر“ وہ دیوانہ وار چلا رہا تھا۔ نہ جانے بڑے ہو جانے کو اس ننگے پنڈے کی بو اور مہین فیض سے کیا تعلق تھا نہ جانے دسویں پاس کر لینے کو اس سرخ رنگ سے کیا تعلق تھا۔ مگر وہ اپنی دھن میں سوچے سمجھے بغیر چننا چلاتا رہا ململ کی دھجیوں کو بکھیرتا رہا۔ اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں گویا ابل کر باہر نکل آئی تھیں۔ جسم کانپ رہا تھا۔ ”ہاں۔“ وہ چلایا۔ ”بڑا ہو جاؤں پھر۔“ اس کے حلق میں آواز سوکھ گئی۔

صفیہ حیران کھڑی تھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ پھر ایلی بھاگ گیا۔ گھر سے باہر۔ دیوان خانے سے باہر۔ سکول میں جا کر چھپ گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ جرم کا مرتکب ہو

## اجمل کے بل

جہل سے مل کر اسے کئی ایک باتوں کا پتہ چلا۔ عجیب و غریب باتوں کا مثلاً یہ کہ اس کے بڑے بھائی صفدر کو تھپڑ کی ایک پارسی لڑکی سے عشق تھا۔ پارسی لڑکی۔ ایللی کا جی چاہتا تھا کہ وہ تھپڑ میں جا کر دیکھے کہ پارسی لڑکی کیسی ہوتی ہے اور اس سے عشق کیسے لگتا ہے، لیکن جلد ہی وہ ہمایوں کے مقربے اور قطب صاحب کی لاٹ پر جا پہنچے اور وہ ان عالیشان عمارتوں میں کھو گیا۔ پھر رہنگ میں واپس آنے کے بعد اسے پارسی لڑکی کا خیال آیا اور وہ چوری چوری خواہش کرنے لگا کہ کبھی وہ بھی پارسی لڑکی کو دیکھے لیکن رہنگ میں تو ہر طرف پورنی عورتیں تھیں جو پتھر کوٹنے

میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔“

پھر ایک رات کٹ پٹیوں کا تماشا شدت اختیار کر گیا۔ شام کوٹ کے قلعے سے طبل جنگ بجنے لگا اور نین کے سپاہی نے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیئے اور بند کمرے پر موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔ اگلی صبح جو نئی علی احمد بیدار ہوئے تو گھر پر ایک مصیبت ٹوٹ پڑی۔ ”یہ چیز یہاں کیوں رکھی ہے؟ وہ وہاں کیوں گیا ہے؟“ ایلی حیران تھا کہ اس بند کمرے کے سپاہی کو کیا ہوا کہ اپنی سر زمین چھوڑ کر گھر کے ویرانے میں گھومنا شروع کر دیا۔ لیکن جلد حیرت مصیبت میں بدل گئی۔ جب علی احمد نے لکار کر کہا ”تم پڑھتے کیوں نہیں ہر وقت کھیلتا ہے۔ لنڈور۔ ادھر آؤ۔“ اور آخر کار تن اجمل پر آٹوٹی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حجام بلوا کر اجمل اور ایلی دونوں کے بل کٹوا دیئے گئے اور علی احمد فاتحانہ تقہم لگا کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس رات ایلی رضائی میں منہ ڈھانپ کر روتا رہا کہ ابا ہائے اجمل کے بل ہائے اجمل کے بل۔

اس کے بعد علی احمد نے اجمل کے باہر جانے اور شامیں باہر بسر کرنے پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ حتیٰ کہ ایک روز اجمل دیر سے گھر آیا تو انہوں نے اجمل کے منہ پر تھپڑ جمادیا ”بڑا بنتا ہے تو“ اور اجمل رونے لگا۔ اندر صغیہ مسکرا رہی تھی۔ مسکرائے جا رہی تھی۔ وہ ہاتھ کی انگوٹھیاں گھما رہی تھی اور رضائی میں منہ ڈال کر ایلی نہ جانے کیوں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا ”میں بڑا ہوں۔ میں دسویں پاس کر لوں۔“

اگلے روز اجمل مدرسے سے واپس نہ آیا شام کے وقت ایک آدمی ایک رقعہ لایا۔ لکھا تھا ”میں گھر جا رہا ہوں۔ میرا انتظار نہ کریں۔ اجمل کے جانے کے بعد ایلی اکیلا رہ گیا۔ اگر انہی دنوں ابا کا جالہ دورا ہے نہ ہو جاتا تو ایلی کے لئے وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا۔ بہر حال وہ رہنگ چھوڑ کر دورا ہے چلے گئے۔“

اس نئے شہر میں ان کے مکان کے سامنے ایک گندہ ٹالہ بٹتا تھا جس کے ارد گرد بچے کھیلا کرتے تھے۔ ایلی کے لئے یہ ٹالہ ایک بہت بڑی نعمت تھی جہاں کھیل کر وہ ابا کی بے بسی اور صغیہ کے غلیظ ہاتھوں کو بھول سکتا تھا۔

**خانم**

ایک روز جب وہ گندے ٹالے کے قریب کھیل رہا تھا تو اس کے ابا باہر نکلے۔ ایلی انہیں

دیکھ کر سہم گیا۔ علی احمد رک گئے چاروں طرف دیکھا اور پھر ایلی کو اشارہ کر کے بلایا۔ وہ ڈر گیا نہ جانے ابا اسے کیوں بلا رہے تھے۔ اس سے پہلے تو انہوں نے اسے یوں کبھی بلایا نہ تھا یا تو وہ خاموشی سے پاس سے گزر جایا کرتے تھے اور یا اسے دیکھ کر کہتے ”تو یہاں کھیل رہا ہے۔ دوڑ گھر جانا لائق سارا سارا دن کھیلتا رہتا ہے۔“ اور ایلی چپکے سے دوڑ کر گھر میں جا چھپتا۔ اس روز ان کے بلانے پر ایلی ڈرتا ہوا پاس آیا۔ اس کا خیال تھا کہ پاس بلا کر ابا گھوریں گے اور اسے گھر جانے کو کہیں گے۔ لیکن ایلی قریب آیا تو وہ بولے ”ادھر آ۔ ہمارے ساتھ۔“ اسے اپنی آنکھوں اور کانوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ضرور کوئی غلطی ہو گئی ہے شاید اس نے ان کا اشارہ غلط سمجھا ہو لیکن پھر وہ چپ چاپ آگے آگے کیوں چل پڑے تھے۔ پھر اسے خیال آیا شاید وہ اسے گھر کے لئے کوئی چیز خرید کر دینے کے لئے ساتھ لے جا رہے تھے۔ بہر حال ساری بات عجیب سی تھی۔ ایلی ان کے پیچھے خاموشی سے چلنے لگا بازار آیا اور ختم بھی ہو گیا لیکن خاموش چلتے گئے۔

بازار کے اختتام پر علی احمد ایک گلی میں گھوم گئے اور دیر تک پر بیچ گلیوں میں چلتے رہے۔ حتیٰ کہ گلیاں بھی ختم ہو گئیں اور وہ شہر کے باہر کالی سڑک پر جا پہنچے۔ سڑک کے دوسرے سرے پر وہ اس مختصر سی آبادی میں جا داخل ہوئے جو ریل کے پل کے پار تھی اور از سر نو گلیوں میں جا گھسے جہاں چھوٹے چھوٹے گھروندے بنے ہوئے تھے۔ بالا خروہ ایک دروازے پر رکے جہاں علی احمد نے دروازے پر دستک دی کچھ دیر کے بعد دروازے کی درز میں ایک موٹی سی اتنی بڑی کالی آنکھ دکھائی دی ”خانم“ علی احمد نے آہستہ سے کہا۔ اندر سے گویا چاندی کی گھنٹیاں بجنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور ایک سرخ و سفید چہرہ ظلع ہو کر چاروں طرف چھا گیا۔

خانم کو دیکھ کر ایلی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ چوڑے گورے چٹے چہرے پر دو موٹی موٹی کالی آنکھیں مسکرا رہی تھیں ”آؤ بیٹھو۔“ اس نے چارپائی کھینچ کر کہا ”بیٹھ جاؤ۔“ علی احمد نے ایلی کو حکم دیا اور وہ خود بے تکلف چارپائی پر لیٹ گئے ”حقہ بھرتا ذرا خانم“ علی احمد نے یوں کہا جیسے وہ ان کا اپنا گھر ہو۔ خانم نے جلدی سے چلم میں دو کوئلے ڈالے اور پھر علی احمد کے پاس بیٹھ کر ان سے بے تکلف باتیں کرنے لگی۔ جلد ہی وہ دونوں ایلی کے وجود سے بے خبر ہو کر ایک دوسرے میں کھو گئے۔ ایلی حیران تھا کہ خانم کون ہے اور اس کا منہ اتنا چوڑا اور سرخ و سفید کیوں ہے اور اس کی آنکھیں اتنی شوخ کیوں ہیں اور زعب بھرے چہرے کے باوجود اس قدر مسکراتی کیوں ہے

خانم کے گھر کی طرف اڑ لیتا اور پھر خانم کا چٹا سفید ہاتھ پیار سے اس کے منہ کو چھکتا اور اس کے ہونٹ سلاتا وہ مٹی کا گھروند اس کی آنکھوں تلے کانپتا اور اس کے دل میں کچھ کچھ ہوتا نہ جانے کیا ہوتا۔

پھر ایک روز خانم ان کے اپنے گھر آگئی۔ ایللی نے اسے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ خانم نے راز دارانہ نگاہ ایللی پر ڈالی۔ اندر سے ابا بھاگے بھاگے باہر آئے۔ ”صفیہ یہ استانی ہیں۔ اسلامیہ سکول کی بڑی استانی تم سے ملنے آئی ہیں۔ بیٹھ جاؤ۔ استانی صاحبہ۔ ایللی ان کے لئے کچھ لاؤنا بھی۔ اتنی دور سے آئی ہیں۔ کتنی دور ہے آپ کا سکول، ہاں آٹھ کوس مجھے یاد آگیا اور نام کیا ہے۔ سلاں والی نہیں نہیں۔ سیل آباد ٹھیک“ اور علی احمد کو دیکھ کر خانم نے اتنا بڑا گھونٹ نکال لیا اور ان کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔ پھر وہ ایللی کی طرف دیکھ کر راز دارانہ انداز سے مسکرانے لگی۔ لیکن وہ ابا سے پردہ کیوں کر رہی تھی؟ اس نے گھونٹ کیوں نکال رکھا تھا کیا وہ استانی تھی؟ لیکن وہ تو وہیں رہتی تھی۔ شرمیں، پھر ابا کیوں کہہ رہے تھے کہ وہ سیل آباد سے آئی ہے ایللی کی سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔ مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ خانم عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے بلا رہی ہو جیسے ہاتھ کی بجائے نگاہوں سے اسے تھپک رہی ہو۔

\_\_\_\_\_ سلا رہی ہو۔

”نہیں۔ نہیں۔“ علی احمد کہہ رہے تھے ”اگر آپ کو میرا یہاں آنا ناگوار ہے تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔ ہاں ہاں اچھا تو آپ کے سکول میں کتنی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں؟ آپ کے سکول کا بڑا چرچا ہے۔“ خانم مسکرائے جارہی تھی۔ مسکرائے جارہی تھی۔ صفیہ گھور گھور کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور باہر اندر سبز رنگ کی میٹھی بوتلیں کھولنے میں مصروف تھی تاکہ سیل آباد کی استانی کی تواضع کی جاسکے۔

### تین بچے

اس روز ایللی کو ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ تین بچے عجیب و غریب کھیل کھیل رہے ہوں۔ علی احمد، خانم اور ایللی۔ ابا تو یوں سنجیدگی سے باتیں کئے جارہے تھے۔ جیسے وہ علی احمد ہی نہ ہوں۔ مگر ان کی آنکھوں کی چمک ان کے سروپ کی چٹائی کھا رہی تھی اور خانم یوں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی، جیسے واقعی ہی علی احمد اس کے لئے ایک بیگانہ شخص ہوں۔ لیکن وہ ہر بار ایللی

اور اس کی طرف دیکھنے کو جی کیوں چاہتا ہے۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھا کہ ابا وہاں یوں لیٹ کر حقہ پی رہے ہیں۔ جیسے وہ ان کا اپنا گھر ہو اور خانم یوں ان کے پاس بیٹھی تھی جیسے صفیہ گھر میں ان کے پاس بیٹھا کرتی تھی۔ صفیہ اور خانم کا کوئی مقابلہ بھی تو نہ تھا اگرچہ صفیہ کا رنگ بھی کافی سفید تھا۔ اس کے چہرے سے بھی رعب برستا تھا۔ لیکن صفیہ کے ہاتھ پر تو ہر وقت شکن پڑی رہتی تھی۔ اس کے برعکس خانم مسکرائے جارہی تھی۔ وہ ایللی کو دیکھ کر ویسے ہی مسکراتی تھی۔ جیسے علی احمد کو دیکھ کر جیسے ان دونوں میں کوئی فرق ہی نہ ہو۔ صفیہ تو صرف علی احمد کی طرف دیکھ کر مسکرایا کرتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خانم کے ہاتھ مندی رنگے نہ تھے۔ کتنے صاف ستھرے ہاتھ تھے اور انگلیوں میں انگوٹھیاں بھی تو نہ تھیں۔

وہ باتیں کرنے میں مشغول تھے کہ اندر کوئی بچہ رونے لگا۔ بچے کے رونے کی آواز سن کر ایللی گھبرا گیا نہ جانے کہاں سے ایک شخص میلی سی چادر میں لپٹا ہوا آمو جودہ ہوا ”دیکھ تو سراب رو رہا ہے۔“ خانم بولی اور پھر علی احمد سے باتوں میں مشغول ہو گئی اور وہ چادر میں لپٹا ہوا عورت نما شخص اندر جا کر بچے کو تھپکنے لگا۔ نہ جانے وہ شخص کون تھا۔ نوکر تو نہیں معلوم ہوتا تھا وہ خانم کا خاوند بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر کون تھا وہ۔ ایللی کے لئے وہ مکان

ایک راز محسوس ہونے لگا وہ بے تکلف مسکرانے والی عورت۔ وہ عورت نما مرد اور وہ روتا بچہ۔ ”اچھا تو یہ لڑکا ہے۔“ خانم نے اپنے ہاتھ سے ایللی کے منہ کو تھپکتے ہوئے کہا۔ اس کی اس تھپک میں کتنا پیار تھا۔ ایللی کے جسم میں ایک جھرجھری سی ناچنے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ خانم کا ہاتھ اسے تھپکتا رہے اور وہ بڑی بڑی کالی آنکھیں دیے ہی مسکاتی رہیں اور اس کے سامنے وہ بڑا سا سرخ و سپید چرو پونہی معلق رہے اور وہ ابا کے ساتھ ہمیشہ وہیں اس مٹی کے گھروند سے

\_\_\_\_\_ میں رہے اور اور۔

اس کے بعد گندے نالے کے پاس کھیلتے ہوئے وہ چوری چوری دعائیں مانگتا کہ ابا گھر سے نکل کر اسے اشارہ کریں۔ ایللی اور آؤ ہمارے ساتھ چلو وہ اسی طرح خانم کے گھر جائے اور اس دروازے۔ خانم کی سیاہ آنکھ انہیں دیکھے اور بلا سرخ اس کا ہاتھ اسے تھپکے۔ کبھی کبھی اس کی خواہش پوری ہو جاتی۔ ابا باہر نکل کر انگلی کے اشارے سے بلاتے اور پھر کہتے ”اس مکان میں جہاں تم اس روز گئے تھے۔ تمہیں یاد ہے نا وہاں جاؤ اور خانم کو یہ دے آؤ۔“ اور وہ چپکے سے ایک گٹھڑی سی اس کی بغل میں تھما دیتے۔ ”کسی سے کتنا نہیں سمجھے۔“ وہ زیر لب کہتے اور ایللی

کی طرف دیکھ کر یوں آنکھ چمکائی کہ اسے اس انوکھے کھیل کا لطف آجاتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ کھیل ہمیشہ کے لئے جاری رہے۔ اور خانم اس کی طرف دیکھ مسکاتی رہے ایللی کا جی چاہتا تھا کہ وہ قلعہ مار کر فرس دے۔

پھر جلد ہی چند ایک ماہ کے اندر اس استانی کا راز کھل گیا جو سیل آباد کے سکول میں پڑھاتی تھی اور علی احمد سے گھونٹ نکالنے میں احتیاط سے کام لیتی تھی اور صفیہ کا منہ غصے سے لال ہو گیا اور اس کی آواز سارے محلے میں گونجنے لگی۔ حالات بگڑتے دیکھ کر علی احمد تو گھر سے باہر چلے گئے اور جان بوجھ کر دیر سے آئے۔ حقیقت یہ تھی کہ روز بروز علی احمد کی طبیعت صفیہ سے ہتی جا رہی تھی اور صفیہ کو خود اس کا احساس ہوتا جا رہا تھا کہ اس کا اثر ختم ہو چکا ہے۔ اپنے اثر کو قائم رکھنے کے لئے اس نے از سرنو ہاتھوں پر مندی لگائی۔ باریک ریشم قیص پہنی، سیاہ کناری والے دوپٹے اوڑھے لیکن ان کو ششوں کے باوجود اس کا رنگ زرد پڑتا گیا اس کی آواز مرجھا گئی۔ یہ محسوس کر کے صفیہ نے نئے پہلو سے اپنی اہمیت کا احساس اخذ کرنے کی کوششیں کیں۔ علی احمد نہیں تو نہ سہی باہرہ جو ہے جس پر وہ حکومت کر سکتی تھی۔

علی احمد مزاج کے بہت شکستہ واقع ہوئے تھے۔ وہ صفیہ کے غصے کو دیکھ کر چوری چوری مسکراتے اور پھر سنجیدگی سے ان بگڑے ہوئے حالات پر بات کرنے کی بجائے جھٹ ٹین کا سپاہی بن جاتے۔ اس پر صفیہ چڑ جاتی اور بے بسی اور غصہ میں ہاتھ چلاتی لیکن ٹین کا سپاہی ہنسے جاتا لڑے جاتا حتیٰ کہ صفیہ کا غصہ ختم ہو جاتا اور وہ مسکرانے لگتی اور ٹین کا سپاہی فاتحانہ طور پر قلعہ لگاتا اور سب ٹھیک ہو جاتا۔ لیکن اس کے باوجود اب سب ٹھیک نہ ہوتا تھا۔ صفیہ کے دل کی پھانس نہ نکلتی تھی اور اس کا رنگ روز بروز زرد ہوتا جا رہا تھا۔ خانم روز آموچہ ہوتی تھی اس کی موجودگی سے صفیہ کا رنگ اور بھی پیکا پڑ جاتا اور گھر میں خانم کے قلعے گونجنے اور اس کی کالی آنکھیں مسکاتیں اور علی احمد دبلی دبلی خوشی سے بے تاب ہو کر جھومتے اور چلاتے ”ایللی اب تم ذرا سراب کو کھلاؤ باہر جا کر کھلاؤ اسے۔ اسے باجناؤ۔“ اور ایللی بڑی مسرت سے سراب کو اٹھا لیتا اور خانم کے چیمبر دینے والے ہاتھ ایللی کے منہ کو تھپکتے اور اس کا جسم جھنجھنے کی طرح بچتا اور رگ دپے پر پیر ہوٹیاں سی چلتیں اور خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہ نکلتے اور وہ محسوس کرتا جیسے ہوا میں اڑا جا رہا ہو۔ خانم کی نگاہیں علی احمد کو جھنجھناتیں اور علی احمد فرط اس سے یا نہ جانے کیوں صحن میں ادھر ادھر گھومنے نکلتے اور صفیہ ہزار ہو کر پٹنگ پر جا بیٹھتی اور منہ دیوار

کی طرف موڑ لیتی۔

خانم کے آنے سے صفیہ ایللی سے اور بھی چڑنے لگی ”ہوں تو تو ابا کے پیغام لے کر جاتا ہے شرم نہیں آتی۔“ اور شرم آنے کی بجائے ایللی کی ایڑیاں اونچی ہو جاتیں اور اس کی چھاتی تن جاتی اور وہ ابا سے گھرے تعلقات رکھنے کے خیال سے فخر محسوس کرتا۔

اباب تقریباً ہر روز کھانا کھاتے ہوئے اسے آواز دیتے ”ایللی“ اور پھر دو انگلیوں میں لٹکتا ہوا گوشت کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ اب وہ اسے مرے ہوئے چوہے کی طرح نہ پکڑتا تھا بلکہ یوں لٹکائے چلا جاتا جیسے وہ کوئی تمنغہ ہو اور پھر روٹی پر رکھ کر اسے یوں کھاتا کہ فرحت دیکھ لے تو جل کر راکھ ہو جائے۔

صفیہ اب عام طور پر چپ چاپ ایللی پڑی رہتی اور تمنائی میں کھانستی رہتی تھی۔ ادھر علی احمد کے کمرے میں خانم کے قلعے گونجنے۔ سراب کو ہلانے کے لئے ایللی گراموفون پر پرانے ریکارڈ لگاتا اور خانم کی سریلی آواز کے ساتھ ساتھ موسیقی کا ساز چھڑ جاتا ادھر باورچی خانے میں باجرہ خانم کے لئے چائے بنانے میں مصروف رہتی۔ پھر دفعتاً ”علی احمد چلائے“ ایللی سراب کو باہر لے جاؤ۔ وہاں بمل جائے گا۔“ سراب کو اٹھا کر ایللی باہر نکل آتا اندر خانم کی سریلی سروں پر ٹین کا سپاہی رزمیہ انداز سے رقص کرتا اور ایللی کا جی چاہتا کہ وہ چھپ چھپ کر اس رقص کو دیکھے۔ بیچاری صفیہ کا بیشتر وقت اب تمنائی میں گزرتا تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے خاموشی سے آکٹا کر یا تو وہ باجرہ کو کوستی رہتی یا کھانستی رہتی۔

باجرہ نے کئی ایک بار ایللی کو بتایا تھا کہ صفیہ بیمار ہے اسے سل کا عارضہ ہو گیا ہے مگر ایللی کو اعتبار نہ آتا تھا۔ صفیہ بیماری یا کسی اور درد سے عاجز آجائے ایللی اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ صفیہ کو کوئی عارضہ ہو جائے۔ اونہوں۔ یہ تو محض تمنائی کی وجہ سے تھا ابا جو باہر رہتے تھے اور پھر خانم جو آجاتی تھی وہاں

خانم آتی تو گھر میں ایک شور مچ جاتا۔ خانم کتنا شور مچاتی تھی۔ اس کا ایللی کو مسکا کر دیکھنا نگاہ سے ایللی کا منہ سلانا اور اس کے منہ کو ”جھنجھنے کی طرح بجانا۔ اب ایللی کو معلوم ہو چکا تھا کہ خانم استانی نہ تھیں یہ جان کر اسے بہت دکھ ہوا تھا اگر وہ استانی ہوتی تو خوب رہتا۔ وہ دل میں سوچتا تھا نہ جانے استانی کیسی ہوتی ہو گی وہ تو فر فر انگریزی بولتی ہو گی اور پھر اونچی ایڑی کی جوتی پہن کر ٹپ ٹپ چلتی ہو گی بالکل جیسے بازاروں میں میسین چلتی ہیں۔



خوبصورت اور رنگین ہوگی اس کی آنکھوں میں شہرت چمک رہی ہوگی اور مڑگاں اشاروں سے لدی ہوں گی اور اس کے ہاتھ خانم کے ہاتھوں سے زیادہ بے تکلف ہوں گے جو اسے جھنجھٹائیں گے۔ اس استانی کے چہرہ پر تو نحوست چھائی ہوئی تھی۔ اس کی حرکات بے حد بے حدی تھیں اور پھر شلوار کی جگہ چادر باندھ رکھی تھی۔ عورت اور چادر۔ لاجول ولا قوت۔ ایللی کے دل میں نفرت کھولنے لگی۔ یہ کیسی استانی کے ہاں لے آئے تھے۔ ابا شاید وہ غلطی سے وہاں آ گئے ہوں۔ لیکن اس معاملے میں ابا غلطی نہیں کر سکتے تھے اور اب بھی وہ چارپائی پر مطمئن اور متوقع انداز سے لیٹے ہوئے تھے۔ ایللی حیران تھا۔

استانی کی نگاہیں علی احمد پر کئی ہوئی تھیں۔ جیسے انہیں جانچ رہی ہوں تول رہی ہوں۔ تو یہ تھیں استانی، ہیڈ معلم ”یہ لو مٹھائی۔“ اس نے ایللی کے سامنے مٹھائی کی تھالی رکھ دی اور خود پھر سے پردے کے پیچھے آکھڑی ہوئی وہ پھر سے علی احمد سے باتیں کرنے لگی ”ثمیم تو ان دنوں کشمیر میں ہے وہ وہیں رہتی ہے کیوں نہ رہے لڑکی کے کھانے پینے کے دن ہیں اور پھر وہ تو کشمیر کے میوؤں پر پلی ہوئی ہے۔ یہ سرخ چہرہ اللہ جھوٹ نہ بلائے کوئی جوانی آئی ہے لڑکی پر! آنکھیں پھنپھتی ہیں دیکھ کر اور پھر اوپر سے دسویں پاس۔“

”اچھا دسویں بھی کر لی ہے؟“ علی احمد نے قہقہہ مار کر پوچھا۔

”پچھلے سال جو کی تھی میں نے بتایا تو تھا۔“

”اچھا“ علی احمد بولے ”لیکن تم بھی تو آج تک باتیں ہی کرتی رہی ہو کبھی ملایا تو نہیں ثمیم سے۔“

”ہے بچی ہے ابھی۔“ استانی نے ذرا تنک کر جواب دیا ”عمر ہی کیا ہے اس کی افسروں کے سامنے کھل آتی ہے۔“

”بیگم ادر دیکھو۔“ علی احمد بولے ”ہم کیا غیر ہیں؟“

”نہیں غیر تو نہیں۔“ وہ بولی ”پھر بھی جب تک بات طے نہ ہو جائے“ ”بھئی واہ۔“ وہ ہنسنے لگی ”کیا کوئی کسریاتی ہے۔ بات طے ہی سمجھو۔“ نہ جانے وہ کس کی باتیں کر رہے تھے۔ ثمیم کون تھی وہ کشمیر میں کیوں پل رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں کیوں پھنپھتی تھیں اور وہ بات کیا تھی جسے طے سمجھا جا رہا تھا۔ ایللی ان کی باتوں سے اکتا گیا اور مٹھائی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ استانی سے تو مٹھائی ہی کیس اچھی تھی۔

## استانی

پھر ایک روز علی احمد دورے پر جانے لگے تو انہوں نے ایللی کو پاس بلایا ”چلو ایللی“ وہ بولے۔ ”تمہیں ساتھ لئے چلتے ہیں۔“ ایللی گھبرا گیا نہ جانے علی احمد اسے کہاں لے جائیں گے۔ ہاجرہ نے یہ بات تعجب سے سنی اور صفیہ نے ناک چڑھائی۔ ”نہیں نہیں گھبرانے کی کیا بات ہے۔“ علی احمد بولے ”وہاں سکول کی استانی ایللی کا خیال رکھے گی۔“ استانی ایللی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

جب وہ ابا کے ساتھ نانگہ میں بیٹھا تو خانم کا ہاتھ لگے بغیر ہی اس کے گل جھنجھنے کی طرح بچ رہے تھے اور دل دھک دھک کر رہا تھا۔ استانی۔ استانی اس محلے کی چکی خوشی سے جچ رہی تھی۔ نانگہ میں بیٹھے ہوئے وہ چاروں طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا وہ کھیت وہ سڑک وہ پیرسب دھندلائے ہوئے تھے دور افتی پر۔

ٹیلوں کے پیچھے سے ایک حسینہ جھانک رہی تھی۔ جب وہ منزل پر پہنچے تو انہیں ایک صاف ستھرے کمرے میں بٹھا دیا گیا اور پھر انکی تواضع کے لئے دودھ کی ایک بھری ہوئی گاگر آگئی۔ اتنا سارا دودھ اور سکول میں اس کے اپنے مدرسے میں تو دودھ دیکھنے میں نہیں آیا تھا کبھی البتہ خوانچے والے مدرسے کے باہر پڑ اور پکوڑے بیچا کرتے تھے دودھ تو نہیں بیچتے تھے وہ شاید زنانہ مدرسوں میں دودھ بکتا ہو۔ ہر صورت وہ حیران تھا وہ اونچے لمبے گلاس رکھ کر نوکر چلا گیا۔ پلنگ پر علی احمد تکیہ لگائے حقہ پی رہے تھے۔ جیسے وہ خانم کے گھریا کرتے تھے۔ ایللی نے ان کی طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

”سلام و علیکم“ عورت کی آواز سن کر ایللی چونکا۔ اس نے مڑ کر دیکھا پیچھے لٹکے ہوئے پردے سے ایک حنائی ہاتھ نکل آیا ”بچے کو اندر بھیج دیجئے۔ کیسے اچھے تو ہیں آپ؟“

”شکر ہے۔“ ایللی“ علی احمد بولے۔ اندر جاؤ استانی جی بلا رہی ہیں تمہیں۔“ ایللی ہچکچاتا رہا لیکن علی احمد کی نگاہ میں سنجیدگی کی جھلک تھی ”آؤ تا بیٹا۔“ اندر سے آواز آئی اور ایللی جھجکا ہچکچاتا ہوا اندر چلا گیا۔ ارے استانی کی طرف دیکھ کر وہ بھونچا رہ گیا۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ جسم بھرا اور منہ پر ہنسی چھائی ہوئی تھی۔

ایللی کے تخیل میں تو استانی نہ جانے کیا تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ استانی خانم سے کیسی زیادہ

سر پر تو عورتوں کا بھوت سوار ہے۔ بس عورتیں ہوں۔ اللہ ماری رنگ رکھیلی۔ ان کے نخرے نسے اور چھڑ چھاڑ ہو اور میاں پریوں کے درمیان میں اندر بن کے بیٹھے رہیں دفع کر علی احمد کو۔“ ہاجرہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ ”نہ بیٹی تو اپنا آپ کیوں ہلکان کرتی ہے۔ تیری بلا سے جو تو ہے وہ اور کون ہو سکتی ہے۔ محلہ والوں کی نگاہ میں۔ آپ جھک مار مار کر تھک جائے گا۔ اللہ کرے یہ تیرا ایللی جئے زندگی دراز ہو۔“

کئی ایک روز تو محلہ والیوں کا تاتا بندھا جا رہا اور ہاجرہ بات بات پر آنسو بہاتی رہی اور محلے والیاں اسے دلا سے دیتی رہیں ایللی حیران تھا کہ اہل بات بات پر رو کیوں دیتی ہے۔ رونے کی تو کوئی بات نہ تھی نہ جانے پھر وہ کیوں روئے جا رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ صغیر سے جدا ہو گئی تھی۔ مگر محلے میں پہنچ کر تو اس کا انداز ہی بدل گیا تھا۔ جیسے وہ صغیر سے بیزار ہو۔ جیسے وہ خوشی سے اس کے خدمت نہ کرتی ہو مگر باہر جا کر تو وہ صغیر صغیر کرتے تھکتی نہ تھی۔ ایللی کو کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

نیچے احاطے میں محلے کی بوڑھیاں چرنے رکھے باتوں میں مشغول تھیں۔ سب انہیں کی باتیں کر رہی تھیں۔ علی احمد کے قصے۔ ہاجرہ کی مظلومیت۔ چاروں طرف لوگ ہاجرہ فرحت اور ایللی سے ہمدردی جتا رہے تھے اور ہاجرہ کی نیکی اور خدمت گزاری کا تذکرہ کر رہے تھے اور ہاجرہ ڈھلکتے آنسوؤں کے باوجود پھولے نہ سار رہی تھی۔ آنسوؤں کے علاوہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ ایللی نے اس چمک کو پہلے کبھی اس کی آنکھوں میں نہ دیکھا تھا۔

گھر میں صرف دادی اہل خاموش تھی وہ ایللی کی طرف دیکھتی مسکراتی اور پھر تلخ انداز سے کہتی ”ایللی اب تو سارا دن آوارہ گردی ہی کرتا رہے گا کیلا۔“ اور ایللی کو محسوس ہوتا جیسے وہ اسے گھورنے کی بجائے پیار کر رہی ہو۔ ”اوہر آ۔“ وہ چلاتی اور ایللی دیکھنے کی بجائے اس کے کندھوں پر جا سوار ہوتا اور پھر بڑھیا ہنستی۔ ”تو تو میرے کندھے توڑ دے گا۔ ہٹ اب مجھے نماز پڑھنی ہے۔ دفع ہو۔“ اور ایللی اس کے کندھوں سے اور بھی چمٹ جاتا۔

ہاجرہ کو روتے دیکھ کر دادی اہل ہاتھ چلا کر کہتی ”تو تو پاگل ہے لڑکی خواہ مخواہ جان کھپا رہی ہے۔ علی احمد کا کیا ہے۔ ہو جائے گا ٹھیک آپ ہی مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

کئی ایک دن تو یونی روئے دھونے کا سلسلہ جاری رہا پھر ایللی آتا کر باہر نکل گیا اور چوگان میں کھیلنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ محلے کے لڑکوں سے واقف ہوتا گیا اور دھیرے دھیرے اس کی

دورے سے واپسی پر علی احمد نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے کہا ”دیکھو ایللی گھر میں کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے باپ کی طرف دیکھا اور بات سمجھے بغیر ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ سوچتا رہا کہ نہ کرنے کی بات ہی کوئی تھی۔ کوئی بھی تو نہیں وہ تو وہاں دودھ پینے کے علاوہ مٹھائی کھاتا رہا تھا اور وہ شمیم کی باتیں کرتے رہے تھے اور پردہ ہوا سے اڑتا رہا تھا۔ ”ہائیں!“ دھنسا۔ اسے خیال آیا۔ استانی نے تو شلوار کی جگہ چادر باندھی ہوئی تھی۔ جیسے جان باندھتے ہیں رنگدار چادر، ساڑھی نہیں، رنگدار چادر اور قیص، آخر استانی نے چادر کیوں باندھی ہوئی تھی۔ شاید ابا کا بات نہ کرنے سے یہی مطلب ہو گا کہ گھر والوں کو پتہ نہ چلے کہ استانیاں شلوار پہننے کی بجائے چادر باندھتی ہیں۔ لیکن وہ شمیم کون تھی۔ جو کشمیر کے پھلوں پر پل رہی تھی اور جس پر جوانی ٹوٹ کر آ رہی تھی۔ شاید علی احمد شمیم کی بات کو چھپانا چاہتے تھے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ بہر حال اس پر استانی کی حقیقت تو کھل چکی تھی۔ استانی سے مایوس ہو کر وہ ایک دفعہ پھر خانم کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن جلد ہی خانم کا قرب بھی اس سے چھین لیا گیا اور علی احمد نے کسی وجہ سے انہیں علی پور بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ہاجرہ فرحت اور ایللی علی پور آگئے۔

## چوگان اور پیڑے

پہلی مرتبہ محلہ میں آکر اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ محلے والے اسے علی احمد کا وارث سمجھتے ہیں اور اس کی ماں کو گھر کا نوکر نہیں سمجھتے اور پٹنگ پر بیٹھنے والی صغیر کو گھر کی مالک نہیں مانتے ”تم آگئے بیٹا۔“ چچی جان نے اسے دیکھ کر پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا ”اچھا ہوا تم آگئے۔ تمہیں کیا ضرورت ہے کہ جگہ جگہ علی احمد کے ساتھ جوتے چٹاؤ۔ تم اپنے گھر میں رہو۔ یہ گھر تمہارا ہی ہے۔ جو تم ہو وہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اور وہ صغیر کالے منہ والی چڑیل اسے کون جانتا ہے اچھا کھیلو بیٹا کھیلو۔“

بوڑھی جانیں چلائی ”خدا کا شکر ہے۔ میرا بیٹا ایللی گھر آیا۔ جانے دو علی احمد کو درد کی خاک چھانٹتے تم کیا اس کے نوکر ہو جو اس کی چاکری کرتے پھرتے ہو۔ تم اللہ کے فضل سے اس گھر کا چاند ہو۔“

”آگئی تو ہاجرہ۔“ برکتے بولی۔ ”سوار آؤ تمہارا اپنا گھر ہے بیٹی۔ علی احمد کا کیا ہے اس کے

کر پڑا۔  
چار ایک دن تو اس کے لئے گھر سے باہر نکلتا مشکل ہو گیا۔ لیکن چھپے رہتا بھی تو ممکن نہ تھا۔ اس لئے اسے باہر نکلتا ہی پڑا اور اسے معلوم ہوا کہ رضا، ضیا، بالا اور ارجمند بھی جمیل سے پیڑے کھاتے ہیں اور جمیل روز چوکی سرکا کر روپے نکال لاتا ہے۔ اور وہ سب اس راز سے واقف ہیں یہ جان کر اس کے دل سے وہ بوجھ اتر گیا اور وہ لڑکوں میں شامل ہو کر کھیلنے لگا۔

### انکرا اینڈی ماباؤں

پھر اسے مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ مگر اس کا سکول محلے کے باقی لڑکوں کے سکول سے بہت دور تھا۔ محلے کے قریبی سکول والوں نے ایللی کو داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا ایک تو وہ پڑھائی میں کمزور تھا دوسرے اس مدرسے میں جگہ نہ تھی۔ لیکن داخل ہونے کے بعد اسے اطمینان سا ہو گیا کیونکہ جلد ہی اسے معلوم ہوا کہ اس اسکول میں بھی محلے کے چند ایک لڑکے تعلیم پا رہے تھے ان لڑکوں میں ارجمند سب سے زیادہ تیز تھا۔ ارجمند ڈاکٹر ڈاکر کا بیٹا تھا وہ سب مل کر پانچ بھائی تھے۔ سب اونچے لمبے پتلے بچپن کا زیادہ تر زمانہ پانی پت میں بسر کر کے وہ پہلی مرتبہ علی پور آئے تھے۔ ان کے والد اب بھی پانی پت میں ڈاکٹر تھے۔ جہاں ڈھپنری میں انہوں نے اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ بسر کیا تھا۔

ارجمند بے حد لمبا تھا حالانکہ وہ ایللی کے ساتھ نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس کے قد و قامت اور برتاؤ سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے عرصہ دراز سے فارغ التحصیل ہو چکا ہو۔ پانی پت میں رہنے کی وجہ سے ارجمند فر فر اردو بولتا تھا۔ جہاں کوئی اجنبی آیا اس نے چار ایک خوبصورت فقرے چلا دیئے۔

”آئیے تشریف لائیے۔ فرمائیے۔ خاکسار کیا خدمت کر سکتا ہے۔“ اور ادھر وہ گیا ادھر انپ شاپ بولنا شروع کر دیا۔ ویسے تو ارجمند کو سینکڑوں چیزیں یاد تھیں۔ ایکٹر اینڈی ماباؤں۔ کیلے ریو، ریو پیتے ریو پریم سندیس، پریم ٹونا اور نہ جانے کیا کیا لیکن ایللی کو اس کی انکرا اینڈی ماباؤں بہت پسند تھی ”دیکھو ایللی“ ارجمند چلاتا ”انکرا اینڈی ماباؤں کے لئے ریو ریو پیتے ریو ریو“ کیا سمجھے۔“ اور ایللی حیران ہو کر اس کی طرف دیکھتا۔ ہم سمجھاتے ہیں۔ ہم سمجھاتے ہیں مطلب ہے لڑکی پھنسا کر کیا مشکل ہے کچھ مشکل نہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ یہاں محلے داری ہے۔ اگر ڈھپنری

جھک کم ہوتی تھی۔ جمیل سے مل کر وہ بے حد خوش ہوا اسے دلی کی یاد آگئی جہاں وہ پارسی لڑکی رہتی تھی اور اٹھنی دیئے بغیر انہوں نے حلوہ خریدا تھا۔ جمیل نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”آؤ ایللی چلو پیڑے کھائیں۔“ ”پیڑے“ ایللی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ”لیکن کیسے۔ تمہارے پاس اٹھنی ہے کیا؟“ ”نہیں“ جمیل بولا۔ ”روپے۔ بہت سے روپے آؤ دکھاؤں تمہیں۔“ جمیل نے لکڑی کی چوکی اٹھائی اور اس کے پاؤں تلے دو روپے پڑے تھے۔ ایللی حیران رہ گیا ان کے گھر میں تو ایسی کوئی چوکی نہیں تھی جس کے پاؤں تلے روپے ملتے ہوں۔ چوکی تلے روپے، اس نے حیرانی سے جمیل کی طرف دیکھا۔ ”ہاں۔“ جمیل نے لا پرواہی سے کہا۔  
”اماں کے ہیں۔ میں نے اٹھا کر چوکی تلے چھپا دیئے تھے۔“

اتنے پیڑے ایللی نے کبھی زندگی بھر نہ دیکھے تھے۔ اس نے چار ایک تو بڑے شوق سے کھائے۔ پھر وہ آگیا اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس نے کدہ کیا ہے جرم کیا ہے۔ اتنے پیڑے خریدا تا جرم نہیں تو اور کیا ہے۔ اس نے شدت سے محسوس کیا کہ چاند حلوائی کو معلوم تھا کہ وہ روپے اس نے چوکی تلے سے نکالے ہیں۔ وہ مسکرا رہا تھا خاموش مگر چالاک مسکراہٹ اور ایللی جھینپ رہا تھا۔ نہیں۔ نہیں میں نہیں۔ میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔

پیڑے کھانے کے بعد ایللی پر بھرانہ خاموشی طاری ہو گئی اور وہ واپس چلے آئے۔ ٹھک ٹھک ٹھک، ایللی نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ ہاتیں وہ گھبرا گیا۔ رضا لکڑی ٹیکتا اور لکڑی ٹانگ سمھاتا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے انہیں لٹکارا۔ ”اماں سے آئے ہو تم۔“ بک نہیں بے جمیل ہنسنے لگا۔ ایللی کا دل دھک دھک کر رہا تھا ضرور اس لکڑے کو جمیل کی ماں نے بھیجا ہو گا۔ ”بے۔“ رضا چلایا۔ ”اکیلے اکیلے پیڑے کھاتا ہے تو اور اسے کھلاتا ہے۔ ہوں۔ یہ پیڑے اکیلے ہضم نہیں ہوئے۔ بتا دوں میں۔“

جب وہ دونوں بڑی ڈیوڑھی کے پاس پہنچے تو جمیل کو دیکھ کر سب چلانے لگے ”کیوں بھی پیڑے۔“ ایللی کا رنگ فاق ہو گیا اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی اور وہ سب شور مچائے جا رہے تھے۔ ”رضاء، بالا اور پھر کلن پر ہاتھ رکھ کر چلایا۔“ بازار بکینڈی بنی۔ ”آبا بھائی واہ وا۔ رضا نے لکڑی ٹانگ کھا کر داؤدینی شروع کی اور ان سب کی توجہ پیڑوں سے ہٹ کر بالے کے گھنے کی طرف مبذول ہو گئی اور ایللی چپکے سے وہاں سے سرک آیا اور داوی اماں کی رضائی میں چھپ

جھا لیتی تھیں۔ دور سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھیں خواہ مخواہ ہنس جاتی تھیں۔ بے کار بے مصرف۔ اگر ارجمند کو لڑکیاں اچھی لگتی تھیں تو ٹھیک تھا۔ لیکن وہ سب گورکھ دھند۔ انکرایڈی ماپاؤں کیا تھا۔ فضول ہونہ ہو۔ ارجمند جانتا ہی کیا تھا۔ نہ تو اس نے خانم کو دیکھا تھا اور نہ کسی اور کو بانی پت کے ہسپتال میں مریضوں کے ساتھ رہنے سے کیا ہوتا ہے۔

### ہکوری ڈکوری

ایک روز ارجمند دوڑا دوڑا ایللی کے گھر آیا۔ اسے ادھر ادھر آؤ بھاگ کے آؤ بھاگ کے آؤ۔ آؤ۔ درنہ پچھتاؤ گے۔ ساری عمر پچھتاؤ گے۔ وہ ایللی کو اپنے گھر کی طرف گھینے لگا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ دوست نے ہکوری ڈکوری بھی نہیں دکھایا۔ چلے آؤ آج گھر میں کوئی نہیں ہے۔ وہ سب پیر جی کے یہاں گئے ہیں۔ آؤ اب و نیاز کے لئے اور ہم رہ گئے ہیں یہاں انداز و ناز کے لئے۔“

گھر پہنچ کر اس نے ایللی کو بند کھڑکی میں دھکیل کر کہا۔ ”اب یہاں بیٹھ جاؤ۔ چپ شور نہ مچانا کھڑکی کی ان درزوں سے دیکھو ہکوری ڈکوری۔“ اور وہ دونوں بیٹھ کر بند کھڑکیوں کی درزوں میں سے دیکھنے لگے۔ ایللی کو کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ مگر ارجمند چلائے جا رہا تھا۔ ”وہ سامنے بالکونی دکھائی دیتی ہے نا۔ بس اس میں کھیل ہوتا ہے ہکوری ڈکوری کا۔“ ایللی نے نظر نہیں اٹھایا۔ ”نہیں ابھی نہیں انتظار کرو ابھی آئے گا۔“

سامنے سبز رنگ کا جنگلہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے اندر دو دروازے ایک کمرے میں کھلتے تھے۔ جنگلے سے نیچے محلے کا بازار تھا۔ سامنے دوکان پر عمو حلوائی دودھ کی کڑاہی صاف کر رہا تھا۔ ساتھ ہی حکیم صاحب مریضوں کے انتظار میں بیٹھے داڑھی کو سلا رہے تھے ”آہا“ ارجمند نے چٹکی بجائی ”وہ رہا“ ایللی نے شوق سے جنگلے کی طرف دیکھا۔ جنگلے کے پچھلے کمرے میں ایک دھندلی سی شکل دکھائی دی۔ ”ابھی ادھر آئیں گے۔ کچے دھاگے سے کھینچی آئے گی سرکار مری۔“

زن سے ایللی کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اس کے سر میں بہن بہن سا ہونے لگا جیسے دفعتاً سر کھینوں کے چھتے میں بدل گیا ہو۔ دل گھڑی کی طرح بجنے لگا۔ جنگلے کے پچھلے دروازے میں ایک عورت کھڑی تھی۔ اس نے جسم پر ایک تولیہ لپیٹ رکھا تھا۔ ایک طرف گلابی جسم پر

ہو تو یوں پھنسی ہے یوں جیسے چٹکی بجتی ہے اور پھر ڈھنری پانی پت میں ہو تو \_\_\_\_\_ تو کیا بات ہے۔ آئی پھنسی، آئی پھنسی۔ خیر کچھ پروا نہیں۔ یہ دیکھو یہ ر۔ شمس رومال کا ہوتا ہے حد ضروری ہے۔ اسے کہتے ہیں۔ کیلے ریوریو۔ سمجھ کیا سمجھ۔ صرف ہوتا ہی نہیں طریقہ استعمال بھی جانتا چاہئے۔ ”ہاں“ اور وہ رومال ہلا کر کتا ”لنڈا ہم بتائیں گے تو دیکھو۔ اسے تھانے کی مشق کرو پہلے یوں نہیں بلکہ یوں ہاتھ میں مرے ہوئے چوہے کی طرح نہ پڑا رہے بلکہ ہر چند منٹ کے بعد جنبش میں آئے۔ اب منہ پونچھو گرد جھاڑو۔ ذرا احتیاط سے جنبش کی خوبصورتی ہی میں سارا جاو ہے۔ کیا سمجھ۔ لیکن ٹھہرو یہ کیلے ریوریو ہی کافی نہیں۔ اس پر سینٹ یعنی خوشبو کا چمڑکنا لازمی ہے۔ یہ دیکھو شیشی چار آنے کی یہ شیشی بیسیوں لڑکیوں کو پھنسانے کے لئے کافی ہے ہاں تو اس رومال سے گالوں کو سلاؤ۔ بالوں کو جھاڑو گردن پر لگا لو۔ ہاتھ میں رکھو۔ لڑکی دور کھڑی ہو تو منہ پر جھکا دے کر یعنی سلام عرض کرتا ہوں اور یوں ہلایا تو مطلب ہے اب آؤ بھی تاجان من اور یوں چھاتی پر پھینک لیا تو مطلب ہے ظالم سینے سے لگا جا اس کے استعمال کے کئی انداز ہیں۔ لیکن فی الحال یہی کافی ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھو۔“ اس نے جیب سے ایک بانسری نکالی اور نچلا ہونٹ لٹکا کر اس میں پھونکیں مارنے لگا ”یہ ہے پریم سندیس کہیں اندر بند کمرے میں بیٹھی ہے تو یہ چیز اسے منڈیر پر لے آئے گی اور آخری چیز یہ ہے پریم ٹونا۔ دیکھا۔“ اس نے ایک چھوٹی سی کتاب جیب سے نکالی۔ ”اس میں سب کچھ لکھا ہے محبت کے خطوط، غزلیں، گیت ہر موقع کے لئے۔“ مثلاً یہ دیکھو“ اور وہ گانے لگا ”جب سے تم پر ہوا ہوں شیدا ناٹھ سیدینگ چھوڑ دیا۔“ بڑی لا جواب چیز ہے۔ سنتے ہی لڑکی ہنسی اور ہنسی تو سمجھو پھنسی اور یہ سب کچھ کیا ہے انکرایڈی ماپاؤں۔“

ایللی اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور بے حد کتر محسوس کر رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لڑکی پھنسانے کا مقصد کیا ہے۔ آخر اتنے بڑے انکرایڈی ماپاؤں کا کچھ تو مقصد ہو گا لڑکیاں نہیں۔ اسے تو تیار عورتیں اچھی لگتی تھیں۔ لڑکیاں خاصی لگتی تھیں۔ لیکن کوئی خاص اچھی نہ لگتی تھیں اور اچھی لگتی بھی تو بھی انہیں پھنسانے کا مطلب۔ اچھی لگتی تھیں۔ نہیں اچھی لگتی تھیں تو نہیں اچھی لگتی تھیں۔ لیکن وہ ر۔ شمس رومال اور بانسری اور پریم ٹونا پریم سندیس وہ سب کس لئے تھے۔ خانم کی بات تو اور تھی نا۔ وہ تو بہت ہی اچھی تھی اور اس کا ہاتھ سے ایللی کو تھپکنا۔ منہ سلا نا۔ کتنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن چھوٹی چھوٹی لڑکیاں۔ وہ تو شرم سے آنکھیں

سیاہ بال لنگ رہے تھے جنہیں بنانے میں وہ مصروف تھی۔ دو بازو بھرے بھرے سفید بازو۔ ایللی نے محسوس کیا جیسے اس کے ہاتھ بال بنانے کے بہانے اس کا منہ سہلا رہے ہوں۔ چھن چھن چھن جھنجھٹا بجتے لگا ارجمند جانے کیا کیا کئے جا رہا تھا۔

دفعتا! ہالوں کو جنبش ہوئی اور۔ اور۔ ایک بڑا سا چہرہ دکھائی دینے لگا۔ چوڑا۔ چٹا سفید۔ دو مخروطی بانیں لٹکنے لگیں۔ ”انہوں“ ارجمند چلایا۔ ”یہ تو دو سرائیڈیشن ہے یہ نہیں بڑا والا ایڈیشن نہیں بالکل نہیں ہمیں تو چھوٹا والا چاہیے چھوٹا والا چلو ایللی یہ سب غلط ہے۔ یہ بکوری ڈکوری نہیں۔ یہ تو کورا ڈکورا ہے۔ چلو۔“

ایللی کا جی نہ چاہتا تھا کہ وہاں سے ہٹے مگر ارجمند نے اس کا بازو کھینچ لیا اور اسے باہر لے گیا۔ سب غسل فرماتی ہیں۔ سب چھوٹا بڑا سائز پھر غسل فرمانے کے بعد اس کمرے میں ضرور آتی ہیں۔ تولیہ لپیٹے، کپے دھاگے کا معجزہ ہے۔ بڑی چیز ہے کچا دھاگا ”لیکن یہ گھر کس کا ہے؟“ ایللی نے پوچھا کیونکہ وہ گھر محلے سے باہر تھا اور ایللی کو معلوم نہ تھا کہ وہاں کون رہتا ہے ”کسی کا بھی ہو۔“ ارجمند نے کہا ”ہمیں تو آم سے مطلب ہے پیڑ سے نہیں اور آم بھی وہ جو آم ہوں حلوہ کدو نہیں۔ سمجھ ہمارے پاس آیا کرو گے تو یونی عیش کرائیں گے۔“

## ہم جولی ٹولی

محلے میں ہر عمر کے لڑکے تھے اور عمر کے مطابق وہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے مثلاً ایک تو جلیل یوسف اور رفیق کی ٹولی تھی جو عمر میں اس سے بڑے تھے۔ جلیل اس کی خالہ زاد بہن کا بیٹا تھا۔ رفیق اس کا ماموں زاد اور لطیف خالہ زاد بھائی۔ والدہ کی طرف سے اس کا قریبی رشتہ دار کوئی نہ تھا اور بوتا بھی تو کیا تھا۔ علی احمد پرانے رشتہ داروں کو خوش رکھنے کی نیت نئے رشتے پیدا کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

رفیق جلیل کا بڑا بھائی تھا۔ لیکن وہ جلیل سے قطعی طور پر مختلف تھا۔ نہ تو اسے چوکی تلے روپے رکھنے کا شوق تھا نہ حلوائی سے پیڑے کھانے کا اور نہ ہی بھیڑ والی دوکان سے اٹھنی کا سودا خریدنے کا جلیل کی طرح نہ تو وہ شوخ تھا نہ دلا پتلا۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ تھا۔ جسم فریبی پر مائل تھا۔ طبیعت میں خاموشی اور محاسن نمایاں تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بے حد منسار تھا۔ ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ لوگوں کے کلام آئے۔ رفیق مزاج کا رہتا تھا۔

تھا۔ لیکن یہ رنگ ہلکا ہلکا تھا، مدھم مدھم سا، کبھی شوخی سے نہ چکا تھا۔ نہ ہی اس کی طبیعت میں جرأت تھی کہ آگے بڑھ کر کچھ کہہ سکے اس کے برعکس وہ ذہنی طور پر محسوس کئے جاتا اور اظہار کرنے کے وقت پیچھے ہٹ کر جھجک جاتا اس کے باوجود اس کے پاس ہر وقت انگریزی مایاؤں کا سب ساہن میا رہتا تھا۔ جب میں ایک آنے والی غزلوں کی کتاب ہاتھ میں خوشبو دار ریٹھی روہل اور آنکھوں میں چوری چوری دیکھنے اور جھجکنے والی نگاہیں۔

جلیل اس کے برعکس شن قلندری کا قائل تھا۔ آنکھوں میں رندانہ جھٹک تھی۔ انداز میں والہانہ پن تھا اور یوسف پیچارہ تو ان معاملات سے قطعی ناواقف تھا۔ سپاہیوں کے سکول ماسٹر کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے وہ کئی ایک سال فوجی پلٹنوں میں رہا تھا اور نتیجتاً ”بھانٹا، دوڑنا، کودنا، ہاٹ اور کونک مارچ کے کھیلوں کو دنیا کی سب سے بڑی لذت سمجھتا تھا۔ اس کی طبیعت ڈر سے خالی تھی اور وہ کسی عظیم الشان کارنامے کا متلاشی تھا۔ رفیق کی طبیعت میں بھی کسی کارنامے کی خواہش کی جھٹک تھی۔ لیکن اس خواہش سے ریٹھی ملبوسات عطریات اور حنائی ہاتھوں کی بو آتی تھی۔ یہ تینوں لڑکے ایللی کے قریبی رشتہ دار تھے اور ایللی کا زیادہ وقت انہی کے پاس گزرتا تھا۔ لیکن وہ تینوں عمر میں ایللی سے بڑے تھے اور ایللی سے چھپ چھپ باتیں کرتے تھے۔ رفیق اور جلیل آپس میں راز دارانہ طور پر کچھ طے کرتے یوسف ان کی ایسی باتوں سے اکتا کر دیوار پر چڑھنے میں مصروف ہو جاتا اور ایللی ایک طرف کھڑا شدت سے محسوس کرتا کہ کاش وہ بھی ان کی باتوں میں شامل ہوتا۔

ارجمند کے گھر سے فارغ ہو کر ایللی رفیق اور جلیل کے یہاں چلا جاتا جہاں رفیق کے دوست اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ جلیل کا گھر محلے میں نہ تھا۔ یہ بہت خوبی تھی۔ کیونکہ وہاں وہ محلے والیوں کی نگاہوں سے دور جو جی چاہے کر سکتے تھے گھر میں جلیل کو ایک علیحدہ کمرہ ملا ہوا تھا۔ اس کمرے کی کھڑکی ایک گلی میں کھلتی تھی جس میں بوڑھی عورتیں چوکیوں پر بیٹھی رہتی تھیں۔ جب وہ وہاں سے سرکتیں تو جلیل اور رفیق چوری چوری باہر جھانکنے لگتے اور ان کا ریٹھی روہل کھڑکی سے باہر لہرائے لگتا۔ جسے دیکھ کر ایک ایک لڑکی جھاڑو دینے کے بہانے باہر گلی میں نکل آتی اور با آواز بلند کسی چچی یا خالہ سے باتیں کرتے ہوئے خواہ مخواہ مسکرائے جاتی اور پھر دہلیز پر جھاڑو دیتے دیتے وہ آدمی سے زیادہ گلی صاف کر دیتی۔ اس وقت جلیل کھڑکی میں بیٹھ کر عجیب سی آنکھوں سے مسکراتا اور رفیق بے تابانہ اٹھ بیٹھتا اور عالم اضطراب میں غزلوں کی کتاب سے

کچھ گنگنائے لگت۔

نہ جانے وہ لڑکی گلی میں جھاڑو کیوں دیا کرتی تھی اور یا آواز بلند باتیں کیوں کیا کرتی تھی۔ اس کی آواز میں لوج کیوں پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کے انداز میں اس قدر شوخی کیوں تھی اور جلیل اس وقت ایسی آنکھیں کیوں بنا لیا کرتا تھا۔ جس میں بیک وقت مسکراہٹ بھی ہوتی اور وحشت بھی اور اس وقت رفتی کی آنکھوں میں بوند باندی سی کیوں ہو ا کرتی تھی؟

یہ تو ظاہر تھا کہ وہ سب کھیل اس لڑکی سے متعلق تھا مگر اس کا مقصد کیا تھا یہ باتیں ایلی کیلئے حیران کن ہونے کے باوجود بے حد دلچسپ تھیں۔ رفتی اور جلیل میں یہ عیب تھا کہ وہ ایلی کو بات سمجھانے کی بجائے اس سے بات چھپانے کی کوشش کرتے۔ اسی لئے ایلی ان کے ہاں بیٹھا بیٹھا آتا جاتا اور ان کو چھوڑ کر ارجمند کی طرف بھاگتا۔

ارجمند اسے دیکھ کر چلاتا ”ایلی ایلی۔ چلو ایلی۔ بڑی ڈیوڑھی میں چلیں۔“ اور وہ اپنا تمام تر انگریزی ملباؤں اٹھا کر ڈیوڑھی میں چلے جاتے جہاں چورستہ بنا تھا لوگ آتے جاتے رہتے۔ ارجمند وہاں کھڑے ہو کر بانسری بجاتا اور آتی جاتی لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکراتا۔ مذاق کرتا اور وہ جھینب کر مسکرا کر چلی جاتی۔ ”لا جواب چیز ہے ایلی۔ مگر ابھی نہیں کچھ سال کے بعد دیکھنا۔ وہ دیکھو ٹاٹ کے پیچھے۔ ارے تم تو اندھوں کی طرح کھڑے رہتے ہو۔“ اور ایلی کا دل دھک دھک کرنے لگتا اگر کسی نے دیکھ لیا تو محلے کا بڑا بوڑھا دھر سے گزرتا تو ایلی یوں کسی اڑتی ہوئی چڑیا کو دیکھنے لگ جاتا جیسے وہاں کھڑے ہونے سے اس کا مقصد صرف چڑیا دیکھنا ہو۔ ارجمند آنکھیں بند کر کے بانسری بجانے لگتا۔ محلے کے سب لوگ انہیں گھورتے ”ارے لڑکی یہاں کیا کر رہے ہو۔ خواہ مخواہ رستہ نہ روکو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“ یہ سن کر ایلی کو پسینہ آ جاتا اور ارجمند چپکے سے جواب دیتا۔ ”اچھا صاحب ابھی چلے جاتے ہیں۔ ذرا انتظار کر رہے ہیں بھائی صاحب کا۔“ ارجمند کو بات ٹالنے میں کمال حاصل تھا۔

جلیل اور رفتی کے علاوہ محلے میں ایک اور ٹولی تھی۔ اجمل، صفدر، اکرم، دین محمد اور غلام بخش کی۔ یہ ٹولی محلے کے جوانوں کی تھی۔ وہ جلیل اور رفتی سے بھی الگ تھلک رہتے تھے۔ جوانوں کی اس ٹولی کے مشاغل تنہائی میں ترتیب دیئے جاتے تھے۔ وہ منظر عام پر کوئی ایسی حرکت سرزد نہ کرتے تھے جس پر محلے والیوں کو ان پر نکتہ چینی کرنے کا موقع ملے چونکہ محلے والیوں کو جوانوں سے چڑ تھی۔ وہ چھوٹے بچوں سے پیار کرتیں لیکن جوں

جوں وہ بڑا ہوتا جاتا توں توں وہ ان کی نظروں میں کھٹکتا۔ حتیٰ کہ جوان ہو کر وہ محکوک ہو جاتا اور اس کے ہر فعل پر حملہ والیاں چونک کر دیکھتیں اور چہ میگوئیاں کرتیں۔ اس ٹولی کا کوئی فرد جب باہر چوگان میں نکلتا تو محلے والیوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں جیسے وہ کوئی خطرناک ارادہ رکھتا ہو۔ محلے میں جوان ہونا جرم سمجھا جاتا تھا اور جوانوں کو اس بات کا پورا احساس تھا۔ لیکن وہ مجبور تھے ان کا احتجاج دبا دیا رہتا اور ان کی بیشتر قوتیں بزرگوں کے خلاف احتجاج اور سازش کرنے میں صرف ہو جاتیں۔

اجمل دسویں جماعت پاس کر کے اب کالج میں پڑھتا تھا اور کبھی کبھی چھٹی پر محلے میں آ جاتا تھا۔ اکرم، ارجمند کا بڑا بھائی تھا اور وہ اتنا لمبا تھا کہ بڑی ڈیوڑھی کے علاوہ کسی دروازے سے جھکے بغیر گزر نہ سکتا تھا۔ وہ شملے میں نوکر تھا اور کبھی کبھار چھٹی لے کر محلے میں آیا کرتا تھا۔ دین محمد کی علی پور میں دکان تھی اور وہ پتلا دھلا ہونے کے باوجود بڑا معزز بنا پھرتا۔

صفدر کو دیکھ کر تو ایلی بڑا مایوس ہوا تھا کیا یہ وہی صفدر تھا جو دلی میں پارسی لڑکی سے محبت کیا کرتا تھا اور صبح شام پارسی تھیٹر میں رہا کرتا تھا۔ وہ تو بالکل ایک سیدھا سادا نوجوان تھا۔ جس میں ذرا بھی پارسی تھلک نہ تھی۔ بہر حال اس میں ایک خوبی ضروری تھی۔ جب وہ کوئی تھیٹر کی دھن گنگنائے تو اس کی آنکھوں میں عجیب بوند باندی سی ہوتی گلابی گلابی بوندیوں کی پھور پڑتی۔ اس کی چوڑی کلائی پر نیلے رنگ کی سیاہی میں نہ جانے کیا کھدا تھا جسے وہ اکثر دیکھتا اور پھر کسی خیال میں کھو جاتا۔ اس کی طبیعت بہت رنگین تھی۔ رفتی کی طرح دلی دلی رنگینی نہیں بلکہ چھلکتی ہوئی رنگینی ابلتا ہوا جوش لیکن جسمانی طور پر اس پر ہمد طاری رہتا تھا۔ جیسے وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا ہو۔ غلام بخش کی آنکھیں اکثر چھتوں تلے کچھ ڈھونڈنے میں مصروف رہتیں اور اس کی چھاتی تتی رہتی۔

کبھی کبھار محلے کی ان تینوں ٹولیوں کا میل بھی ہو جایا کرتا۔ سب سے بڑی ٹولی یعنی محلے کے جوان محلے کے نوجوانوں کو بلاتے چلو بھی آج کرکٹ کا کھیل رہے گا۔ محلے کے نوجوان محلے کے لڑکوں کو مطلع کر دیتے۔ کھیل کی خبر سن کر لڑکوں کی باچھیں کھل جاتیں اور وہ گیند بلا اور وکٹیں اٹھا کر قصبے سے باہر تالاب والے میدان کو چل پڑتے۔ پھر جب وہ میدان میں وکٹیں گاڑ کر سنٹرناپ کرتا رہتے تو محلے کے جوان آہنچتے ان کے آتے ہی نوجوانوں کی حکومت کا دور ختم ہو جاتا۔ رفتی اپنا خوشبودار ریٹھی رومال چپکے سے گردن سے ہٹا کر جیب میں ڈال لیتا اور



اور لعل کا ٹکرتا ہے۔ لعل کہاں ہے۔ آؤ بھائی ایللی ہے۔ آجاؤ بھائی ایللی میرے سر آنکھوں پر۔ ہی ہی میں دیکھ رہا تھا کہ لعل کہاں ہے۔ پکھراج یوں چمک رہا ہو گا یوں جیسے پالش کر رکھا ہو۔ یہ قیمتی پتھر حساب کے مطابق چمکتے اور پھٹکے پڑتے ہیں۔ ہاں تو ہل کہاں ہے۔ ہی ہی ہی اٹھا کے لے جاتے ہیں۔ بڑا تنگ کرتے ہیں۔ پیچارے بڑے اچھے ہیں۔ ہی ہی ہی ابھی مجھے ڈیوڑھی میں ملا تھا ایک کسے لگا۔ نیچے کنوئیں کے پاس ایک دیگ نیلم اور پکھراج کی بھری ہے۔ وہ تو ہمیں پتہ ہے سبھی جانتے ہیں اور وہ روزانہ دیگوں کو ادھر ادھر کرتے رہتے ہیں۔ رات بھر آوازیں آتی رہتی ہیں وہ انہیں ادھر ادھر کرنے میں ساری رات، ساری رات چھن چھن ہوتا رہتا ہے۔ قہقہے مارتے ہیں روتے ہیں چیختے ہیں اچھا تاش کھیلو گے آؤ بھلا تمہیں جاگنی پائی کا ریکارڈ سنائیں۔ بیاں موری مروڑی، ہی ہی بڑا اچھا ہے۔ ہائیں یہ گردا، گرد پڑ جائے تو ریکارڈ خراب ہو جاتے ہیں۔ ت ت ت ت، ہی ہی لو سنو۔“

ایللی بالے کو دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔ اسے یہ چیزیں کون دیتا تھا۔ وہ کون تھے جو اس کے گھر میں رہا کرتے تھے اور اسے تنگ کرتے تھے اور اسے بالکل تنگ نہ کرتے تھے اور کنوئیں والے کمرے کے نیچے کیا دیا ہوا تھا اور وہ دیکھیں کس کی تھیں۔

سارے محلے میں مشہور تھا کہ بالے کا گھر آسیب زدہ ہے اس لئے کہ مائی عمدہ نے وہاں چلہ کانا تھا۔ اور جب وہ آخری رات اکیلی وہاں بیٹھی ہوئی تھی تو دو کئے ہوئے بازو اس کے سامنے اُگرے تھے اور پھر سارے کا سارا دھڑدھم سے اُگرا اور سر کھڑا ہو گیا اور پھر وہ بھاگی۔ ڈر کر بھاگی اور لوگوں کے دروازے کھٹکھٹانے لگی۔ اس کے پیچھے قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لوگوں نے ڈر کے مارے دروازے بند کر لئے۔ پھر عمدہ کی چیخیں سنائی دیں اور پھر خاموشی چھا گئی اور صبح عمدہ بے ہوش پڑی ملی اور اس کے گرد گندگی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

آصفی محلے میں کئی ایک مکانات اور مقامات کے متعلق ایسی ہی باتیں مشہور تھیں۔ چچی عظمت کے چوبارے کی کھڑکی آپ ہی آپ کھل جاتی تھی اور اس میں سے بے موسم کے میوے گرتے تھے۔ شیخ کی حویلی کی سب سے اوپر والی منزل سے رات بھر آوازیں آتی تھیں۔ حسن دین کی ڈیوڑھی میں کوئی بزرگ رہتا تھا وہاں ہر جمعرات کو دیا جلایا جاتا تھا۔ ایللی کے گھر کا چوبارہ بھی آسیب زدہ تھا اور رحمت بی بی کے کونے پر تو لوگوں نے آگ جلتی دیکھی تھی۔ محلے میں عمدہ کے علاوہ کئی اور لوگوں نے بھی وظائف پڑھے تھے اور وہ چلہ پورا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے

ارجند اپنا شوخ انداز ترک کر کے مودبانہ کھڑا ہو جاتا۔ صفدر اور اکرام آکر ایک نظر میدان پر ڈالتے۔ صفدر ہاتھ میں گیند اٹھاتا اور قبض کی آستینیں چڑھاتے ہوئے ایک بار بازو پر کھدے ہوئے حرف کی طرف دیکھ کر سر جھٹکتا اور تھپڑ کی دھن گنگٹانے لگتا۔ ”حافظ خدا تمہارا۔“ اس وقت ایللی کی آنکھوں سے وہ میدان او جھل ہو جاتا اور تھپڑ کے منظر پر ایک پارسی لڑکی آنکھری ہوتی۔ ”اے دلربا میں ہوں ندا۔“ صفدر کے مضبوط بازو اس کی جانب بڑھتے اور وہ جھپٹتی۔

”ایللی تم ادھر جاؤ شاپ کے پاس۔“ ایللی چونک پڑتا۔ ”سنا تم نے“ اکرم گردن جھکائے چلاتا اور غلام بخش خاموش ہنسی ہنسنے لگتا۔ ایللی کو اس وقت معلوم ہوتا کہ وہ میدان میں کھڑا ہے۔ تھپڑ میں نہیں اور کھیل شروع ہونے والا ہے۔

آصفی لڑکے کرکٹ کھیلنے کے بہت شوقین تھے لڑکے تو محلے ہی میں گیند اور خنٹی سے کرکٹ کھیل لیا کرتے تھے۔ مگر جوان اور نوجوان صرف میدان میں گیند بیٹ سے کھیلتے تھے۔ صفدر گیند پھینکنے کا بے حد شوقین تھا اکرم لمبا ہونے کی وجہ سے بہت زور سے ہٹ لگاتا تھا اور غلام بخش صرف گیند روکنے کا مشاق تھا۔ اکثر میچ بھی ہو جاتے تھے۔ جس میں ایللی کا کام صرف کھلاڑیوں کی چیزوں کی رکھوالی کرنا ہوتا تھا۔ بہر حال اسے میچ میں شامل ہونے سے بڑی دلچسپی تھی۔

بالا

ان دلچسپیوں کے علاوہ محلے میں ایک اور دلچسپی تھی اور وہ بالا تھا جو بذات خود ایک ٹولی تھا اپنے آپ میں اس قدر مگن رہتا تھا کہ اسے کسی کے ساتھ مل بیٹھنے کی خواہش ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ بالا ایللی کا ہم عمر تھا اور اس مکان میں رہتا تھا جو ایللی کے مکان کے عین سامنے واقع تھا۔ صبح سویرے ہی بالا اٹھ کر اپنے بہت بڑے تخت پوش پر چڑھ جاتا شروع کر دیتا۔ یہ گرامو فون ہے یہ ریکارڈ ہیں۔ یہ منہ سے بجانے والا ہارمونیم ہے اور یہ تاش کی گڈیاں ایک دو تین۔ تخت پوش پر چڑھ جاتے کے بعد وہ ان کے درمیان بیٹھ جاتا اور پھر چیزوں کو بتانے سنوارنے اور ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر رکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ ”یہ نیلم ہیں اور یہ زمرہ، وہ اس ڈبیا میں ہونے چاہیں۔“ وہ آپ ہی آپ گنگٹاتا رہتا۔ ”یہ۔ ہائیں۔“ آج اس کا رنگ مدھم کیوں پڑ گیا۔ ہاں آج بدھ ہے نا، بدھ، ت ت ت ت بدھ کو پکھراج کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے

دادی اہل کو چننے سن کر صفدر کو عجیب سی روحانی مسرت حاصل ہوتی وہ اطمینان سے مچنے لگتا۔ ”اے دلربا میں ہوں جدا۔“ ان تمام باتوں کے باوجود اہلی کو یقین نہ آیا کہ دادی اہل سخت مزاج ہیں حالانکہ جب بھی وہ گھر جاتا تو دادی دور سے اسے دیکھ کر برس پڑتی ”بس تو بھی اب کیس کا نہ رہا۔ ان محلے کے لڑکوں میں کھیل کر تو بھی بگڑ گیا۔“ لیکن اہلی اس کی جھڑکیوں کی پروا نہ کرتا اور اس کے کندھوں پر سوار ہو جاتا اور وہ تنگ آکر کہتی: ”کتنی دیر سے بیٹھی انتظار کر رہی ہوں کہ تو آئے تو مچھلی کھاٹے۔ صبح سے تیرے لئے پکا کر بیٹھی راہ تک رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کڑائی کلاہکتا اٹھتا۔ کڑائی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں سے بھری ہوتی۔ اہلی کو چھوٹی مچھلیاں کھانے کا بہت شوق تھا۔ وہ کڑائی اٹھا کر بھاگ جاتا اور دادی پھر سے اسے کونے لگتی اور چوری چوری منہ پر پلہ لے کر مسکاتی، بڑا شیطان ہو گیا ہے نکما کیس کا۔

دادی اہل کے ساتھ اہلی کی چھوٹی زاد بہن سیدہ رہا کرتی تھی، جو ہر وقت دادی کے پاس بیٹھی رہتی اور دادی اہل کے کام کیا کرتی تھی۔ سیدہ کو دیکھ کر اہلی حیران ہوتا کہ وہ نوجوان ہونے کے باوجود دادی اہل کی طرح سر لٹکائے بیٹھی رہتی ہے۔ شادی ہو جانے کے باوجود اپنے میاں کے پاس کیوں نہیں رہتی اور اس کی شکل اتنی غم آلود کیوں ہے اور اس کے میاں کہاں رہتے ہیں اور وہ وہاں آتے کیوں نہیں؟

سیدہ کو دیکھ کر اہلی سوچ میں پڑ جاتا۔ لیکن اسے سیدہ سے یہ باتیں پوچھنے کی کبھی جرات نہ ہوتی تھی۔ اوہر اونچے چوہارے میں سیدہ کی بہن نیاز اپنے تینوں بچوں کے ساتھ رہتی۔ اس کی حالت سیدہ سے بھی بدتر تھی۔ یا تو وہ چپ چاپ پڑی رہتی اور یا اٹھتی تو نماز پڑھنے کھڑی ہو جاتی۔ محلے کی بہت سی عورتیں اسی طرح رہتی تھیں جیسے پیپ سے بھرے پھوڑے ہوں جیسے ان کے دل دکھتے دکھتے پھوڑے بن چکے ہوں۔ اس کی اپنی ماں تو ان سب سے مختلف تھی۔ وہ دن بھر بیسیوں کام کیا کرتی تھی۔ کبھی کپڑے سیتی کبھی گونا گاتی۔ کبھی بچوں کے لئے گڑیا بنانے لگتی۔ کبھی کسی دولہا کے لئے عروسی گڑی تیار کرتی اور اہلی کو چنگ اڑا کر بھی تو دہی دیتی تھی۔ اہلی کو چنگ اڑانا نہیں آتا تھا۔ باہر اسے خود چنگ بنا کر دیا کرتی تھی۔ اس کی کتابوں پر خود ہی جلد چڑھایا کرتی تھی۔ باہر کو دنیا بھر کے سب کام کرنے آتے تھے نہ جانے اس نے اتنے سارے کام کہاں سے سیکھ رکھے تھے۔

تھے۔

## محلہ والیاں

اس کے باوجود بچے آزادانہ ہر جگہ کھیلتے تھے اور محلے کی بوڑھی عورتیں انہیں گھورتی تھیں۔ ”کھیل کود کا وقت ہونا چاہئے۔ ہر وقت اللہ مارا گیند بلا اور پھر ہر وقت چیچ پکار اور اس پلید گیند کے چھیننے ان لڑکوں کو تو اللہ ہی سمجھے۔ دیکھو تو کیا حال بنا رکھا ہے۔“ دوسری کھڑی سے جھانکتی ”ٹھیک ہے بہن کیا زمانہ آیا ہے۔ بڑے بات کریں تو یہ منہ چڑاتے ہیں۔“ تیسری بولتی ”اب تو زمانہ ہی بدل گیا نہ بڑے کا خوف نہ بوڑھے کا لحاظ۔“ بچے انہیں دیکھ کر بھاگ جاتے اور وہ وہاں کھڑی گھنٹوں نئے زمانے پر لیکچر دیتی رہتیں اور چپے ہوئے لڑکے ان کا منہ چڑاتے، ”ہوں بڑی آئی ہیں!“

محلے کی بوڑھیاں محلے کے نوجوانوں، بچوں اور بوڑھوں پر آکاش نیل کی طرح چھائی ہوئی تھیں حتیٰ کہ محلے کے تمام مرد بھی ان سے دبتے تھے۔

## بوڑھی چڑیل

لڑکے سب سے زیادہ اہلی کی دادی سے ڈرتے تھے کیونکہ وہ ہر بات پر انہیں ڈانٹتی تھی۔ ایک بار بات شروع کرتی تو پھر مسلسل لیکچر دینے لگتی۔ حتیٰ کہ اس کے منہ سے کف جاری ہو جاتے۔ اس کی آواز سن کر سب بھاگ لیتے تھے اور پھر کسی تنگ گلی میں چھپ کر اس کا منہ چڑاتے۔ نوجوان اسے چڑیل سمجھتے تھے۔ جوانوں میں صفدر کو تو اس کے نام سے وحشت ہوتی تھی۔ ”مجھ سے تو میرے اس بڑھیا کو خواہ خواہ ہر بات میں میرا نام گھسیٹ لیتی ہے۔“ اہلی کی دادی کو محلے کے لڑکوں سے سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ اس کی دیوار کے ساتھ گیند کھیلتے تھے۔ جس سے دیوار کمزور ہوئی جا رہی تھی۔ اس پر صفدر کو اتنا غصہ آتا تھا کہ وہ گھر بیٹھ کر بڑے اہتمام اور محنت سے پوناش کا ایک اتا بڑا پٹاخہ تیار کرتا تاکہ تہوار کے دن دادی اہل کی دیوار پر مارے۔ پٹاخہ چھوٹتے ہی زنانے کی آواز آتی اور دادی اہل کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی۔ ”اے ہے جوانوں کے سر پر تو بہت سوار ہے۔ خون چڑھا ہوا ہے۔ یہ تو محلے کو تباہ کر کے رہیں گے۔“

ہوئی اسے کوٹھے پر لے جاتی تاکہ کھلی ہوا میں سو سکے۔ ایک رات جب وہ سب کوٹھے پر سو رہے تھے تو آندھی چلنے لگی۔ بوند باندی ہونے لگی۔ باجرہ کا خیال تھا کہ جلد ہی آندھی ختم جائے گی، اس لئے وہ صنفیہ کو اٹھا کر برساتی میں لے گئی تاکہ اسے نیچے گرمی میں تکلیف نہ ہو۔ یہ آندھی ایک عام آندھی تھی۔ آندھیاں اکثر آیا کرتی تھیں۔ چند ایک منٹ کے لئے تیز ہوا چلتی بادل مگر جتنے جیسے پڑتے اور پھر مطلع صاف ہو جاتا۔ علی احمد سیدہ اور داوی اماں کے نیچے چلے جانے کے بعد وہ آندھی طوفانی صورت اختیار کر گئی۔ باجرہ گھبرا گئی۔ باجرہ کے لئے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کی مدد سے صنفیہ کو نیچے لے جانا مشکل تھا۔ طوفان اور بھی تیز ہوتا گیا۔ ہوا مکانون اور دکانوں سے ٹکرا کر اکیڑوں پر چبھنے لگی، جیسے جنگل میں شیر دھاڑتا ہے۔ آسمان پر سیاہ رنگ کی گھٹا چھا گئی۔ بجلی کی کڑک سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ ایلی اور فرحت جاگ پڑے۔ وہ دونوں ڈر کر رونے لگے۔ ”اماں، اماں، اماں۔“ ادھر مریضہ کراہ رہی تھی۔ برساتی میں دو کھلے عراب تھے، جن پر پٹ نہیں لگے ہوئے تھے۔ ان عرابوں میں ہوا چنگھاڑ رہی تھی۔ باجرہ نے چلا چلا کر علی احمد، داوی اماں اور سیدہ کو آوازیں دیں، لیکن طوفان کی شدت کی وجہ سے اس کی آواز بھلی منزل تک نہ پہنچ سکی۔ طوفان کی شدت کے ساتھ مریضہ کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ باجرہ گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ مریضہ کراہ رہی تھی۔ بچے رو رہے تھے۔ ہوا سے محفوظ رکھنے کے لئے اس نے چارپائیاں مریضہ کی گرد کھڑی کر دیں اور ایلی اور فرحت سے کہا کہ انہیں تھامے رکھیں مگر ہوا کے جھونکوں نے چارپائیوں کو اٹھا کر پھینک دیا۔ دونوں بچے چارپائیوں کے ساتھ دیوار سے ٹکرائے۔ بچے ڈر کر جھپٹیں مارنے لگے۔ پھر دھننا۔ ان کی نگاہ مریضہ پر جا پڑی۔ مریضہ دیواروں کی طرح سر چلا رہی تھی۔ اس کا سر اور آنکھیں گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہل رہی تھیں۔ آنکھیں پتھرائی جا رہی تھیں۔ دم اکڑ رہا تھا۔ باجرہ گھبرا گئی۔ روتے ہوئے بچے سم گئے۔ بلدیاراں کے اس طوفان کی نسبت وہ طوفان جو مریضہ کے سینے اور آنکھوں میں چلتا ہوا محسوس ہوتا تھا، کہیں زیادہ بھیانک تھا۔ ان کی توجہ بیرونی طوفان سے ہٹ کر صنفیہ کی طرف مبذول ہو گئی۔ ”میں جاتی ہوں۔ میں کسی کو بلاتی ہوں۔“ باجرہ گھبرا کر چلائی۔ صنفیہ کا سر انکار میں اور بھی شدت سے ہلنے لگا۔ پھر ایک ساعت کے لئے صنفیہ کا سر ختم گیا۔ اس کی آنکھوں کی وہ بھیانک مرنی کم ہو گئی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ صنفیہ نے باجرہ کا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے تیری قدر نہ کی۔ اس کی نگاہ میں بے بسی کی ایک عجیب جھلک تھی۔ چند ساعت کے لئے اس نے

## طوفان

ابھی وہ محلے کی زندگی سے پورے طور پر محفوظ نہ ہونے پایا تھا کہ ایک روز علی احمد اور صنفیہ آگئے۔ داوی اماں انہیں دیکھ کر چلائی ”علی احمد تو۔“ ”ہاں“ انہوں نے لا پرواہی سے کہا۔ ”یہ بیمار ہے۔“ باجرہ نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ ”اللہ بخیر کرے۔ کون بیمار ہے کہیں صنفیہ تو۔“

صنفیہ کے آنے پر سارا محلہ ان کے گھر جمع ہو گیا۔

”اے کیا ہوا صنفیہ کو؟“

”لو خواہ خواہ۔ اچھی بھلی تو ہے صنفیہ۔“

”کیوں صنفیہ کیا بات ہے۔ کون سی تکلیف ہو گئی تھی؟“

صنفیہ کا رنگ زرد ہو چکا تھا اور وہ پلنگ پر پڑی کھانسی رہتی تھی۔

”آرام آجائے گا۔ تو خواہ خواہ فکر کرتی ہے۔“

ایلی نے صنفیہ کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ کی مندی بالکل اڑ چکی تھی۔ انگوٹھیاں اور بھی میلی ہو گئی تھیں۔ مگر اس کا جسم ویسے کا ویسا ہی تھا۔ ماتھے پر شکن اسی طرح پڑی تھی۔ ایلی کو یقین نہ آتا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ وہ اس کے قریب جاتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں ایک دم سے اس پر جھپٹ نہ پڑے۔ اگر وہ بیمار تھی تو اسکی تیوری کیوں چڑھی۔ بیمار تو گھورا نہیں کرتے۔ نہیں نہیں صنفیہ بیمار نہیں اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔

اس کے باوجود صنفیہ بیمار تھی اور لوگ روزانہ اس کی عیادت کے لئے ان کے گھر آیا کرتے تھے۔ وہ چپ چاپ چارپائی پر پڑی رہتی اور نہت کی طرف دیکھتی رہتی۔ ”اے ہے تو کس فکر میں پڑی ہے۔ لڑکی۔“ محلہ والیاں اسے پیار سے گھورتیں۔ ”انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ذرا پرہیز کا خیال رکھ اور بس۔!“

لیکن ان باتوں کے باوجود صنفیہ کا چھت کو گھورتا نہ گیا۔ سارا دن وہ چھت کو گھورتی رہتی اور باجرہ اس کی چارپائی کے گرد یوں گھومتی رہتی۔ جیسے باجرہ شہنشاہ بار ہو اور صنفیہ اس کا بیمار بیٹا ہاں۔

پھر شام کے وقت جب گرمی بڑھ جاتی تو باجرہ صنفیہ کو سارا دیتی اور وہ آہستہ آہستہ چلتی

ہاجرہ اسی طرح سارا دن باورچی خانے میں برتن مانتھتی۔ کھانا پکاتی اور علی احمد کی چلیں بھرتی رہی اور فرحت حسب معمول گھر کے کام کرنے کے علاوہ سیلیوں کے گھروں کے پتھر لگاتی رہتی اور داوی اہل اسی طرح گھٹنوں میں سر دیئے چولے کے پاس بیٹھی رہی اور اس کے پاس سیدہ خاموشی سے نیکیوں سے زمین کریدتی رہی اور علی احمد وہی پھٹی ہوئی میلی دھوتی باندھے ڈیک کے رجڑ میں لکھتے رہے اور محلہ کی چمکادڑیں رات کو احاطے پر چیخ چیخ کر منڈلاتی رہیں۔ بچے کھیلتے رہے۔ بوڑھیاں انہیں گھورتی رہیں اور محلے کے بوڑھے نماز ادا کرنے کے بعد کھانے ہوئے سر لٹکائے گھروں کے دروازے کھٹکھٹاتے رہے اور صندل داوی اہل کی دیوار پر پھینکنے کے لئے منجھل پوناش کے پٹائے تیار کرتے ہوئے گنگھٹا تارہا۔ ”حافظ خدا تمہارا۔ اے دلربا ہوں میں خدا۔“

### سارہ صبورہ

پھر ایک دن علی احمد کے یہاں مہمان آئے۔  
”ہاں یہی مکان تو ہے۔“

”تم آگے چلی جاؤ۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اے ہے تمہارا اپنا محلہ ہے۔“ چاچی حاجیاں کی آواز آئی۔

”کون آیا ہے۔ چاچی؟“ ماں جیواں بولی۔

”اپنے علی احمد کے مہمان آئے ہیں۔“

”کون مہمان آئے ہیں۔ چاچی کن کے گھر آئے ہیں؟“

”مہمان آئے ہیں۔“ داوی اہل نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ”دیکھ تو لڑکی کون مہمان آئے ہیں۔ شام کوٹ سے تو نہیں آئے۔“

”کون آیا ہے؟“ علی احمد قلم ڈیک پر رکھتے ہوئے بولے اور پھر حسب عادت جلدی سے فیض پینے لگے۔ ہاجرہ باورچی خانے سے نکل کر چپ چاپ دروازے میں آکھڑی ہوئی اس کی آنکھیں ابھی سے پر غم ہو رہی تھیں کہ شاید مہمانوں کے آتے ہی صفیہ کی موت پر اظہار افسوس کرنا پڑے۔ شاید وہ آئے ہی اسی غرض سے ہوں۔ ایلی سہم کر کھڑا ہو گیا۔ فرحت اپنا دوپٹہ سنبھالنے لگی۔ سب بیڑھیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بیڑھیوں سے ہلکے ہلکے قہقہوں کی

اپنی نگاہیں ہاجرہ پر جمائے رکھیں پھر اس کی آنکھ سے ایک موٹا سا آنسو ڈھلک آیا اور گلے سے پھسل کر بالوں میں کھو گیا۔ پھر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور بازو گر کر ٹکٹنے لگا اور سر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گیا۔ ”اہلی“ اہلی نے چیخ ماری۔ ہاجرہ نے سر پیٹ لیا ”صفیہ“ صفیہ۔“

### ایک فقیر

طوفان تھم چکا تھا۔ نیچے بڑے کمرے میں پٹنگ پر صفیہ کی لاش پڑی تھی اور اس کے گرد محلہ والیاں بیٹھی باتوں میں مشغول تھیں۔ صفیہ کا جسم چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن اس کا ہاتھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اہلی نے دو ایک بار صفیہ کی طرف دیکھا، اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ موت کا بہانہ کر کے پڑی ہو۔ جیسے ابھی جاگ اٹھے گی۔ کہے گی ”ایلی بازار سے دو روہ دو۔ ہاجرہ تو میری بیماری کا بہانہ کر کے آرام سے بیٹھی ہے۔ چل اٹھ برتن صاف کر چل اٹھ۔“ لاش میں جنبش ہوئی۔ اہلی کا دل ڈوب گیا۔ صفیہ کا جو ہڈا کھل کر ٹکٹنے لگا۔ محلہ والیوں نے با آواز بلند کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اہلی چیخ مار کر بھاگا ”داوی اہل، داوی اہل۔“ داوی نے اسے قہ لیا۔ ”تو کیوں بیٹھا ہے۔ یہاں ادھر آ میں تجھے سلا دوں۔“ داوی اہل نے اسے بازو سے کچے ہوئے کہا۔

صفیہ کی وفات پر ہاجرہ کئی دن تک روتی رہی۔ وہ رہ کر صفیہ کا وہ فقرہ یاد آتا تھا۔ ”میں نے تمہاری قدر نہ کی۔“ اس وقت اس کی آنکھوں میں فخر بھری چمک لہراتی اور گالوں پر آنہ بنے گلتے۔ برسوں کی خدمت گزاری اور عشق کے بدلے اسے ایک فقرہ ملا تھا۔ ”میں نے تمہاری قدر نہ کی۔“ ہاجرہ اس فقرے کو تھنے کی طرح سینے پر لگائے پھرتی تھی۔ اس ایک فقرہ کی وجہ سے برتری میں بدل گیا تھا۔ وہ اس ایک فقرے کی خاطر ایک بار پھر عمر بھر کسی خدمت گزاری میں بسر کر سکتی تھی۔

صفیہ کی موت سے علی احمد کے گھر کے روز مرہ میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ اہلی اسی طرح ار حند سے انگریزی باباؤں کی تفصیلات سمجھتا رہا اگرچہ عملی طور پر ان تفصیلات کا کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ کبھی کبھار کھڑکی کی درز سے وہ بکوری ڈکوری کے مختلف ساز دیکھتا رہا۔ محلے کے جوان کے ساتھ کرکٹ کے میدان میں جاتا رہا جلیل اور رفیق کے ساتھ قاضی دروازے کے پاس تنگ گلی میں جھاڑو دینے والی کی شوخیوں کو بغور دیکھتا اور داوی اہل کے ساتھ لپٹ کر سوتا رہا۔

والا مکان تھا وہاں ————— ہوں تو اپنے قاضی انظر حسین کی بیٹیاں ہیں۔ لو تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ وہ تو بالکل اپنے ہی ہیں۔ ہی ہی ہی۔ جب ہم دورا ہے دورے پر جایا کرتے تھے تو قاضی انظر ہی کے گھر رہا کرتے تھے۔ بڑے اچھے تعلقات تھے قاضی جی سے ہی ہی ہی ہی۔ ان کی باتوں کے دوران وادی اماں ان کی فیض کو گھور گھور کر دیکھتی اور موہوم آئیں بھرتی۔ اہلی بھی ان کی فیض کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کسی کے آنے پر وہ فیض ضرور پہنا کرتے تھے۔ مگر جلد ہی مطمئن ہو کر آثار بھی دیتے تھے اور پھر اپنے کام میں لگ جایا کرتے تھے۔ لیکن نہ جانے سارہ صبورہ کے آنے پر انہوں نے فیض اتاری کیوں نہ تھی۔ پھر کچھ ویر کے بعد وہ چلم اٹھائے خود باہر چولے کی طرف آرہے تھے۔ وہ تو چلم بھرنے کیلئے اہلی یا کسی اور کو آواز دیا کرتے تھے۔

”ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگے اور با آواز بلند بولے ”اپنے قاضی اظہر کی بیٹیاں ہیں۔ ایک مرتبہ ہم قاضی صاحب سے ملنے گئے۔ ہی ہی ہی ہی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کمرے کی طرف چل دیئے جس میں لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ قاضی صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ ”وہ سبز کھڑکیوں والا مکان تھا نا پھانک محلے میں۔“ وہ اندر گھس گئے۔ ”اچھا تو تم بڑی لڑکی ہو ان کی۔ ہی ہی ہی۔ سارہ ہو۔ تم فرحت کی ہم جماعت ہو۔ اور یہ صبورہ ہے۔ ہی ہی ہی۔“

باہر چولہے کے پاس داوی اماں چٹے سے زمین کرید رہی تھی اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ سیدہ کی آنکھوں میں چمک لہرا رہی تھی اور وہ حسرت ناک نگاہوں سے تیل کی کڑاہی کو گھورنے کی بجائے غور سے اس تنکے کا جائزہ لے رہی تھی جو چولہے کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کلاں سے دوپٹہ سر کائے جا رہی تھی۔

[illegible]

ہاجرہ مسکرا رہی تھی۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں بلا کا اضطراب تھا اور فرحت کے ماتھے پر تل پڑ رہے تھے۔ علی احمد کی مسلسل ہی ہی کی آواز آرہی تھی۔ وادی کا ہاتھ کانپے چلا جا رہا تھا اور سیدہ کا کلن بالکل نیچا ہو چکا تھا۔

آوازیں سنائی دیں۔ کوئی ہنس رہی تھی۔ جیسے سکول کی لڑکیاں ہنستی ہیں۔ ایک کمرہ رہی تھی۔ تم چلو آؤ۔ چلو بھی نا۔ دوسری بولی "تو خواہ مخواہ جھینپتی ہے۔" پھر کوئی آوازیں میں پہنچی جیسے گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

”اے ہے کون ہے؟“ داوی اماں بولی۔ ”آجاؤ تااد پر۔“

”سلام کہتی ہوں۔“ وہ دونوں دروازے میں آکھڑی ہوئیں۔ ”فرحت کہاں ہے؟“

”ہائے۔“ فرحت چلائی۔ ”یہ تو سارا صبورہ ہیں۔“ اور بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ ”کون

ہیں۔ داوی اماں؟“ احاطے سے عورتوں نے پوچھنا شروع کر دیا۔

”کون آیا ہے؟“

”لڑکیاں ہیں۔“ دادی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ ”اپنی فرحت سے ملنے آئی ہیں۔“

”اپنی ہی بچیاں ہیں اللہ عمر دراز کرے۔“

”بڑی دور سے آئی ہیں۔ خیر ہے۔“

”ہاں چاچی سہیلیاں جو ہو تمہیں۔“

”اچھا کیا جو ملنے آگئیں۔“

”کیا نام ہیں لڑکیوں کے؟“

چند ایک ساعت میں محلہ بھر میں یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ جیسے تالاب میں پتھر پھینکتے ہی چھوٹی چھوٹی لہریں چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔

دیر تک محلے میں وہ لہرس نہتی رہیں پھر سکون طاری ہو گیا۔ لیکن علی احمد کے گھر میں ایک دبا دبا طوفان ابھر رہا تھا۔ ادھر بڑے کمرے میں باجرہ، 'فرحت'، 'سارہ'، 'صبورہ' بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ کمرے سے ہلکے لطیف قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ ایسے رنگین قہقہے جو محلے کے کسی گھر سے کبھی سنائی نہ دیئے تھے۔ باہر دادی اہل چولے پر گھنٹوں میں سردیے بیٹھی تھی اور اس کے پاس سیدہ سر ہاتھوں میں تھامے تیل سے بھری کڑائی کو حسرت ناک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اندر علی احمد قہقہے پنے بار بار چورنگاہوں سے جھانکتے اور پھر حقے کے کش لیٹا شروع کر دیتے اور کھانتے۔ پھر وہ ایک دم اضطراب سے آواز دیتے "ایلی کی ماں حقہ بھر دو۔" پھر قلم اٹھا کر لکھنے کی کوشش کرتے اور پھر کھانے لگتے۔ "ایلی کی ماں کون آئی ہیں؟ لڑکیاں ہیں۔ اچھا تو دورا ہے سے آئی ہیں۔ دورا ہے میں یہ لوگ رہتے کہاں ہیں؟ چھانک والے محلے میں۔ اچھا وہ جو سبز کھڑکیوں

تو میں اُمید خیر خیر! اس کی آنکھوں میں گلابی چھینے اڑ رہے تھے۔

## ہائے اللہ

ہی ہی ہی۔ اندر علی احمد ہنس رہے تھے۔ ”وہ بات بتانا تو میں بھول ہی گیا جب۔“ کہتے ہوئے وہ جلم اٹھائے چلے آئے اور چولے کے قریب جانے کی بجائے سیدھے ڈالان میں گھس گئے۔ ”ہی ہی ہی جب ہم سب قاضی صاحب کے مکان پر گئے تھے۔ ہی ہی ہی اوھر آؤ نا سارہ صبورہ تمہیں بات سنائیں۔ اس کمرے میں آؤ نا۔ تم شرابی کیوں ہو۔ یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ ہی ہی ہی۔ قاضی صاحب کے گھر کو تو ہم اپنا ہی گھر سمجھا کرتے تھے۔ تم کیوں شرابی ہو۔ آجاؤ آجاؤ۔“

وہ کھڑے ہنسنے جا رہے تھے وادی اماں کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ سیدہ کا ڈوپٹہ کان سے گرنا جا رہا تھا۔

”بھئی فرحت یہ تمہارے کہنے کے بغیر نہیں آئیں گی۔ ٹھیک تو ہے۔ بھئی یہ آداب طور طریقہ کیسے چھوڑیں۔ جب تک میزبان خود نہ کہے کیسے آئیں اور بھی فرحت تو ان کی میزبان ٹھہری۔ کیوں فرحت یہی بات ہے نا ہی ہی ہی۔ آخر بڑے گھرانے کی لڑکیاں ہیں۔ بہت بڑا گھرانہ ہے ان کا، کون نہیں جانتا ان کے گھرانے کو دورا ہے میں۔ اچھا تو فرحت تم انہیں ساتھ لے آؤ۔ اوھر ہی ہی۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔

رات پڑ چکی تھی۔ لیکن ہاجرہ ابھی باورچی خانے میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی کہ علی احمد کھانا کھالیں تو وہ فارغ ہو۔ صبورہ فرحت کے ساتھ گئیں مارنے میں مشغول تھی۔ وادی اماں جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ سیدہ بستر میں لیٹی ہوئی تھی۔ امیلی وادی اماں کی چارپائی پر اونڈھا پڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ علی احمد اپنے کمرے میں سارہ کو وہ قصہ سنا رہے تھے، جب وہ قاضی صاحب سے پہلی مرتبہ ملے تھے۔

”ہی ہی ہی اور قاضی صاحب نے سمجھا۔ یہاں قریب ہو کر سنا نا۔ انہوں نے سمجھا کہ ہی ہی ہی اندر میرے میں نہ جانے کون ہے۔ ہی ہی ہی۔ ہاتھ چلانے شروع کر دیئے یوں۔ یوں ہی ہی ہی۔“ ہلکی سی باریک ہنسی کی آواز سنائی دی۔ ”ہی ہی ہی۔“ علی احمد بے تماشائے چلے جا رہے تھے۔ ان کے کمرے میں نہ جانے کیا گڈمڈ ہو رہا تھا۔ جیسے واقعی قاضی صاحب پکڑ دھکڑ کر

شام کو ارجمند نے آواز دی۔ ”آیا“ امیلی چلائی۔ لیکن نہ جانے کیوں ارجمند امیلی کا انتظار کرنے کے بجائے چپ چاپ اوپر آگیا۔ حالانکہ وہ عام طور پر امیلی کے گھر آئے سے گریز کیا کرتا تھا ”وادی اماں سلام امیلی گھر ہے کیا؟“ اس نے چوری چوری ڈالان کی طرف دیکھا جہاں سارہ اور صبورہ بیٹھی تھیں اور پھر دروازے سے باہر اس مقام پر کھڑا ہو گیا، جہاں ڈالان میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں اسے اچھی طرح دیکھ سکتی تھیں۔ اس نے جیب سے ریشمیں روپے نکالا اور اسے گروں پر پھیرنے لگا پھر وہ ایک انداز سے کھڑا ہو گیا۔ ”بیٹھ جا۔“ وادی اماں بولی نہیں وادی اماں میں ٹھیک ہوں۔“ ارجمند نے چوری چوری کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا اور پھر آواز نکالے بغیر کوئی شہر گنگنا نہ لگا۔ امیلی سامنے حیران کھڑا تھا۔ کیونکہ ارجمند جان بوجھ کر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ کچھ دیر تو امیلی دیکھتا رہا پھر چپکے سے اس کے قریب آکھڑا ہوا اسے یوں قریب دیکھ کر ارجمند بولا ”امیلی وہ کتاب تمہارے پاس ہے نا؟“

”کوئی کیسی کتاب؟“ امیلی نے پوچھا۔

”بھئی وہی۔“ وہ با آواز بلند بولا۔ ”جو ماسٹر صاحب کل پڑھا رہے تھے کیا نام ہے اس کا۔“ وہ پھر دبلی دبی آواز میں امیلی سے کہنے لگا۔ واہ وا کیا چیزیں ہیں۔ کیا بکوری ڈکوری ہیں۔ ہاں بھئی تو وہ کتاب ہے جس میں سے آج سوال کرنے ہیں۔“ وہ پھر وادی اماں کو سانے کے لئے چلایا۔ ”بڑا والا نہیں چھوٹا والا ایڈیشن وہ گلابی گلابی سی۔“ اس نے اندر ڈالان کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیا چیز ہے واہ۔“ امیلی کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ وادی اماں ارجمند کو گھور رہی تھی۔ اس کے ریشمیں رومال کو گھور رہی تھی۔ دھنستا اس نے وادی اماں کی کڑی نگاہوں کو محسوس کیا۔ ”اچھا۔“ وہ بولا ”زرا ہمارے گھر آؤ نا امیلی۔ وہ چھوٹی گلابی گلابی۔ چھوٹا والا ایڈیشن۔ آؤ گے نا۔“ اس نے اندر ڈالان کی طرف دیکھا۔ ”میں انتظار کروں گا۔ ہائے کیا چڑ ہے۔“ اور وہ چلا گیا۔

ارجمند کے جانے کے بعد رفیق آگیا اس کی نگاہیں یوں مطمئن تھیں، جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ ”پھوپھی کہاں ہے؟“ اس نے زیر لب کہا ”شاید اوھر ہو۔“ وہ اپنے آپ ہی بولا اور ڈالان میں داخل ہو گیا۔ پھر وہ ٹھٹھکا ”اوہ۔ مجھے تو پتہ ہی نہ تھا۔“ اس نے گویا دیوار سے مخاطب ہو کر معذرت کی اور واپس جانے لگا۔ ”رفیق ہے۔“ ہاجرہ نے آواز دی۔ وہ رک گیا۔ ایک سرسری مگر بھیگی نظر سارہ اور صبورہ پر ڈالی ایک ہلکی سی آہ بھری۔ ”وہ کہا تھا نا پھوپھی جی نے سودا لانا“



چاپ گھنٹوں میں سردیے بیٹھی تھی۔

اس نے پہلی مرتبہ داوی اماں پر غصہ محسوس کیا۔ کیا وہ گھنٹوں میں سردیے اور سجدے کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ ویسے محلے کے لڑکوں کے خلاف تو اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ جب صفر اس کے مکان کی دیوار پر پٹاخہ چلاتا تو اس وقت وہ کیوں جینتی تھی۔ اے ہے مکان کی دیواریں بل گئی ہیں۔“ اب کیا مکان کی دیواریں نہیں بل رہی تھیں۔ پھر وہ یوں چاپ کیوں بیٹھی تھی اور فرحت کے پاس بیٹھی ہوئی وہ بھیگی بلی سارہ جھکی جھکی نگاہوں سے گھر والوں کو منڈل رہی تھی۔ اور صبورہ یوں چاپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کچھ کھو گیا ہو۔ ایللی نے پہلی مرتبہ سارہ کی طرف نگاہ بھر کر دیکھا۔ بھیگی بلی کیسی چور نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اسے واضح طور پر معلوم نہ تھا کہ وہ اسے بری کیوں لگ رہی ہے۔ لیکن وہ اسے بری لگ رہی تھی۔

ادھر سے ابا کے حقے کی گڑگڑاہٹ سن کر اس نے منہ بنایا۔ بڑے علی احمد بنے پھرتے ہیں۔ ہی ہی ہی۔ فضول دانت نکالتے رہنا۔ باہر داوی اماں بیٹھی بار بار دالان کی طرف دیکھ کر آہیں بھر رہی تھی۔ اور سیدہ چپ چاپ بیٹھی آلو چھیل رہی تھی۔ باہرہ تو خیر برتن دھونے کے سوا کچھ کر ہی نہ سکتی تھی۔ ایللی دل ہی دل میں مل کھاتا رہا اگرچہ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیوں مل کھا رہا ہے۔

پھر گھر میں یہ دستور ہو گیا علی احمد سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھے رہتے۔ اگرچہ دن میں چار ایک مرتبہ خود حقہ کی چلم اٹھا کر دالان کی طرف چلے آتے حالانکہ انہوں نے کبھی خود چلم نہ بھری تھی اور پھر باہرہ کے کمرے میں جھانکتے۔ ”ہی ہی ہی کیا ہو رہا ہے۔ بھئی۔“

سارہ صبورہ ”گپیں چل رہی ہیں۔ خوب خوب۔ صبورہ کو گپیں بڑی پسند ہیں۔“  
دن میں دو ایک بار ارحند آجاتا۔ ”ایللی، ایللی بھی وہ سوال چھٹی مشق کا پندرہواں سوال وہ کیسے ہو گا۔ اپن سے تو نہیں ہوتا۔ بھئی واہ آج تو صندی پیرا ان، زیب تن ہے۔ یہ آج معلوم ہوا کہ چاہ غب غب صندی پیرا ان پر کیا ہمار دیتا ہے۔“

رفیق آکر پوچھتا ”پوچھی آج مچھلی بہت کستی بک رہی ہے، کیا خریدو گی؟“ اور چھپ چھپ کر اندر جھانکتا آہیں بھرتا۔

رات پڑتی کو علی احمد آتے۔ ”ہی ہی ہی صبورہ سو گئی کیا ابھی نہیں سوئی یہی عمر تو ہے گپیں ہانکنے کی ہی ہی ہی اور سارہ۔ سارہ تو دیر تک

رہے ہوں۔ ہنسی کی ہلکی آواز آئی پھر بند ہو گئی۔ ”ہی ہی ہی۔“ بھاری آواز بھی بند ہو گئی۔ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر دفعتاً ”ہائے اللہ کی آواز آئی اور پھر علی احمد کے کمرے پر موت سی خاموشی چھا گئی۔

جائے نماز پر بیٹھے ہوئے دعا مانگتے مانگتے داوی اماں کے ہاتھ لرزے جیسے دفعتاً ”اسے تم کا عارضہ ہو گیا ہو پھر وہ دھپ سے سجدے میں گر گئی۔ سیدہ نے آہ بھر کر رضائی منہ پر لے لی۔ مشین پر کپڑا سینے سے باہرہ کا ہاتھ کلپا اور دستہ مشین کی چرخی سے باہر نکل آیا اور باہرہ کی پھٹی نگاہوں سے صبورہ اور فرحت کی طرف دیکھنے لگی۔ فرحت نے ماں کی طرف دیکھا اس رنگ زرد پڑ گیا۔ لیکن صبورہ اسی طرح خوشی سے چلاتی رہی ہنسی رہی پھر دفعتاً ”اس نے عمر کیا۔ جیسے کچھ ہو گیا ہو اور وہ خاموش ہو گئی۔

ایللی نے سر اٹھایا۔ چاروں طرف گھبرا کر دیکھا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ جیسے بہت کچھ ہو تھا۔ اس کے دل پر ایک بوجھ سا پڑ گیا۔

## کچھ بھی تو نہیں

چواؤں۔ ٹھک علی احمد کے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ تمام گھر پر بھیانک سکوت طاری تھا۔ موت کا سکوت، موت! ایللی کانپ گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے صفیہ آگئی۔ جیسے وہ اس روز چارپائی پر پڑی دم توڑ رہی تھی۔ ایللی نے محسوس کیا کہ علی احمد کے ساتھ سارہ کمرے میں اسی طرح سر پٹک رہی تھی۔ ادھر سے ادھر۔ ادھر سے ادھر۔ آنکھیں پھرائے جا رہی تھیں۔ اس کی وجہ سے اس کی چیخ نکل گئی۔ داوی اماں اچک کر اس کے پاس آگئی۔ ”کیا ہے داوی اماں۔ وہ زیر لب گنگناتا۔ ”کچھ نہیں ایللی۔“ داوی اماں نے کہا ”کچھ بھی تو نہیں۔ سو جا تو۔“ اور اسے کانپتے ہوئے ہاتھ سے تھپکنے لگی۔

اگلے روز جب ایللی بیدار ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ گھر پر وہی بھیانک خاموشی چھا ہوئی ہے۔ اس صبح وہ تمام دنیا کے خلاف غصہ محسوس کر رہا تھا وہ کمرہ غلاطت سے بھرا تھا۔ وہ وہ محلہ وہ شہر سب گندگی سے بھرے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ محلے والے بھی اندھے اندھے اور لالچ۔ ایللی کا جی چاہتا تھا کہ وہ گھر وہ محلہ وہ شہر چھوڑ کر کہیں چلا جائے جہاں غلاطت ہو جہاں گندگی نہ ہو جہاں بھیانک خاموشی نہ چھائی ہو۔ اس کی نگاہ داوی اماں پر جا پڑی جو

ہوں۔

داوی امں نے صبورہ کا نام سنا تو اس نے پہلی ہی رکعت میں سلام پھیر دیا۔

”کس نے بلایا ہے مجھے؟“ صبورہ اٹھ بیٹھی ”مجھے بلایا ہے مجھے؟ چچا نے بلایا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی ”مجھے بلایا ہے۔ مجھے۔“ اور وہ شور مچاتی چلاتی ہوئی بولتی ”آ تو رہی ہوں میں۔“ اور پھر آپ ہی آپ علی احمد کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ یہ دیکھ کر سارہ بیٹھی بیٹھی چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ جیسے کوئی گھنڈی گر کر اوندھی ہو گئی ہو اور فرحت نے منہ موڑ کر اوپر کبل لے لیا اور باجرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

چراؤں ٹھک دروازہ بند ہو گیا۔ گھر پر سناٹا چھا گیا۔ ایللی نے دانت پیس کر رضائی پر گھونٹ مارا۔ اس روز داوی امں اسے تھپکنا بھول گئی۔ اس نے یہ بھی نہ کہا ”سو جا ایللی۔“ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔“

لولیٹر

اگلے روز ایللی ارجمند کے گھر بیٹھا تھا اور ارجمند اسے سمجھا رہا تھا ”بڑی والی کو نہیں چھوٹی والی کو۔ وہ جو گلابی گلابی سی ہے۔“ ”اچھا“ ایللی نے سمجھے بغیر کچھ کہنے کی غرض سے کہا۔ ارجمند نے زیر لب کہا ”سب بڑی والیاں بے کار ہوتی ہیں۔ ان سے عشق نہیں ہو سکتا۔ اور اس لئے انہیں لولیٹر نہیں لکھا جا سکتا اور اگر لکھو بھی تو بیکار ہے، پوچھو کیوں؟ اس لئے کہ ان کا دل دھک دھک نہیں کر سکتا اور دل دھک دھک نہ کرے تو پھر عشق کیونکر ہو سکتا ہے۔ سمجھے کیا سمجھے۔ تو جان من لولیٹر چھوٹی والی کو لکھا جائے بکوری ڈکوری کو۔“

”لولیٹر۔“ ایللی نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”ہاں۔“ ارجمند چلایا۔ ”بالکل موزوں ہے عمر اس کی لولیٹر کے لئے اور اگر ہم نے لولیٹر نہ لکھا تو وہ خفا ہو جائے گی کہ لولیٹر بھی نہ لکھا مجھے بڑے عاشق بنے پھرتے تھے اور اس کا دل دکھے گا۔ سمجھے۔“

لیکن ایللی گھبرا رہا تھا۔ ”اگر اس نے علی احمد سے کہہ دیا تو۔“ ”انہوں“ ارجمند بولا ”تم انہیں نہیں جانتے۔“ ارجمند اسے سمجھانے لگا۔ ”انکر اینڈی باباؤں لولیٹر کے سہارے جیتی ہیں جب تک لولیٹر نہ پڑھ لیس طبیعت کو چین نہیں پڑتا تازہ موصول نہ ہو تو پرانے پڑھ کر وقت

جاننے کی عادی ہے۔ کیوں سارا۔ اچھا بھئی۔“

یہ کہہ کر وہ باہر نکل آتے۔ اور پھر دالان سے آواز دیتے ”فرحت کی ماں صبورہ سو جائے تو مجھے آج کا حساب لکھوا دینا۔ اور۔ اور۔“ اور وہ عجیب انداز سے ہنسنے لگتے۔

اس پر باجرہ کہتی ”ہائے لڑکیو اتنی دیر ہو گئی ہے اب سو جاؤ۔“ اور فرحت فوراً لیٹ کر کہتی۔ ”بھئی ہم تو اب سو رہے ہیں۔ نیند آگئی۔ آؤ صبورہ تم بھی جاؤ۔“ اور وہ زبردستی صبورہ کو لٹا لیتی اور پھر آنکھیں بند کر کے یوں پڑ جاتی جیسے نہ جانے کب کی سوئی ہوئی ہو۔

سارہ چپ چاپ اپنی چارپائی پر چلی جاتی مگر وہ لیٹتی نہ تھی۔ ایک طرف چپ چاپ بیٹھ رہتی۔ اس پر باجرہ محسوس کرتی۔ جیسے کمرے میں گھنٹن پھیل رہی ہو اور وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر کوئی بات چھڑنے کی کوشش کرتی مگر سارہ چپ چاپ بیٹھی رہتی۔

پھر جب صبورہ سو جاتی تو علی احمد کی آواز آتی ”فرحت کی ماں۔ فرحت کی ماں آج کا حساب تو لکھوا دو اگر۔ صبورہ سو گئی ہے نا۔“

علی احمد کی آواز سن کر داوی امں کا سر ہلنے لگتا اور وہ رکوع کے بغیر ہی سجدے میں گر جاتی۔ ادھر سارہ آنکھوں سے باجرہ کی طرف دیکھتی۔ باجرہ اٹھ بیٹھتی اور سارہ چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑتی۔ جب وہ صحن سے گزرتی تو سیدہ اپنا منہ رضائی میں لپیٹ لیتی۔ ایللی گھبرا کر اٹھ بیٹھا لیکن داوی امں نماز پڑھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اسے تھپکنے لگتی۔ پھر کچھ دیر کے بعد باجرہ ان کے کمرے میں جھانکتی۔ ”سو گیا؟“ ایللی کو جگاتے دیکھ کر گھبرا کر بات بدل لیتی اور باجرہ کے جانے کے بعد گھر پر ہنگامہ خیز سکوت چھا جاتا۔

پھر ایک رات جب صبورہ اور فرحت حسب معمول باتیں کرتے کرتے لیٹ گئی تھیں اور سارہ دوپٹہ اوڑھے یوں صبورہ کی چارپائی کے کونے پر بیٹھی تھی۔ جیسے اسے ابھی اٹھ کر کہیں جانا ہو اور باجرہ منظر کھڑی تھی کہ کب آواز پڑے اور وہ سارہ کو راستہ دکھا کر اپنے فرض سے فارغ ہو جائے کہ دفعتاً علی احمد کی آواز سنائی دی۔ جیسے وہ بالکل ہی بدلی ہوئی ہو۔ ”صبورہ جاگ رہی ہے۔“ انہوں نے سر تکل میں کہا۔

صبورہ! باجرہ کے ہونٹ ہلے۔ اس نے حیرت سے چھوٹی سی بچی کی طرف دیکھا۔ جس نے ابھی غنغوان شباب میں قدم رکھا ہی تھا۔

صبورہ! سیدہ کی آنکھیں یوں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جیسے دفعتاً بینائی سے محروم ہو گئی

کاٹتی ہیں۔ ان کے ٹریک لویٹروں سے بھرے ہوتے ہیں اور چاہے کوئی لکھ دے انہیں۔ پڑھتی ضرور ہیں اور پھر کیا مجال جو کسی کو بتائیں۔ انہوں بالکل نہیں جانتیں۔“

”بالکل نہیں۔“

”انہیں کیا ضرورت ہے۔“

”تو پھر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”پھر کیا۔ پھر پھر، اڑ اور ایک لویٹر۔“ ارجمند بولا۔

”اچھا۔“ ایلی نے تھوک نکلنے کی بے کار کوشش کی۔ ”کس چیز سے لکھیں۔ میں بتاؤں

آنسوؤں سے لکھیں۔“

”مگر آنسو آئیں گے کہاں سے۔ ہم تو بھی بننے کے قائل ہیں۔ رونے کے نہیں۔ البتہ

خون سے لکھنا آسان رہے گا۔“

”وہ کیسے؟“

”پن جھبولیں گے کیا؟“

”تکلیف نہ ہوگی کیا؟“

”واہ اس میں کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے لڑکیاں خون پسند نہیں کرتیں۔ اس لئے سیاہی

سے لکھ دو۔“

”اچھا لیکن لکھیں کیا؟“ ایلی نے پوچھا ”یہ مسئلہ تو چنگی بجانے میں حل ہو جائے گا ہاں۔“

ارجمند نے کہا ”یہ اتنے پریم شاستر پڑے ہیں۔ ان میں سے جن لو۔“ ارجمند نے کشمیری بازار کی چھپی ہوئی چار ورتی کتابوں کا ایلی کے سامنے ڈھیر لگا دیا۔

سارا دن وہ خط کا مضمون چھانٹتے رہے۔ آخر شام کے چار بجے کے قریب خط مکمل ہو

گیا۔ اس میں زیادہ تر شعر لکھے ہوئے تھے۔ ”مائی ڈیرٹی لکھوں، میری جان لکھوں یا دلہا

لکھوں۔ اے جان من میں تم کو القاب کیا لکھوں۔“ یہ شعر تو القاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ نفس

مضمون کا شعر یہ تھا ”اس حسن ترے کی بیوی نے مرے جینٹل ہارٹ کو توڑ دیا۔ جب سے تم

پر ہوا ہوں شیدا ناٹ سلیٹنگ چھوڑ دیا۔“ اس شعر کے چناؤ میں بڑی لے دے ہوئی تھی مگر

ارجمند نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ اگر یہ شعر نہ لکھا گیا تو لیٹر ادھورا رہ جائے گا۔ کیونکہ سکول

کی لڑکیاں صرف انہی شعروں کو پسند کرتی ہیں۔ جن میں انگریزی کی چاشنی ہو ورنہ وہ اپنا لویٹر

مسی سہیلی کو بھی نہیں دکھا سکتیں کہ وہ یہ نہ سمجھ لے کہ اسے کسی گنوار نے لویٹر لکھا ہے۔

ارجمند کی بات معقول تھی اور نہ بھی ہوتی تو بھی ایلی لکھنے پر مجبور تھا کیونکہ اسے تو لویٹر

کے متعلق علم ہی نہ تھا۔ وہ یہ نہ جانتا تھا کہ لویٹر لکھنے سے ہو گا کیا۔ شام تک لویٹر تو مکمل ہو

گیا لیکن اسے صبرہ تک پہنچانا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ ایلی کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کی فیض کی وہ

جیب جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جس میں اس نے لویٹر اس کی جیب میں ڈال دینا اور جیب

میں نہ ڈال سکو تو اسے دور سے دکھانا۔ دیکھ کر وہ بے قرار ہو جائے گی اور خود ہی منت کر کے

بانگ لے گی۔

دوسری تجویز تو ایلی کے لئے قطعی طور پر ناقابل قبول تھی دکھانا بڑی جرأت کا کام تھا۔

البتہ چوری چوری اس کی جیب میں رکھنا شاید ممکن ہو۔ لیکن دقت یہ تھی کہ اس کی فیض میں

جب نہ تھی۔ عجیب فیض پہنتی تھی۔ وہ اس نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ اس کی فیض شروع سے

لے کر آخر تک انوکھی تھی۔ جا بجا ہنسی پڑی ہوئی تھیں کہیں کھلی کہیں تنگ کہیں کچھ کہیں کچھ

ایسی فیض تو محلہ بھر میں کسی کی نہ تھی۔

پھر جب دونوں ہمیش بیٹھی باتیں کر رہی تھیں تو دفعتاً اسے لویٹر کا خیال آیا اور پسند

آگیا۔ دل دھڑکنے لگا لیکن ہمت کر کے اس نے وہ دفعہ اس کے جوتے میں ڈال دیا۔ جلدی میں

اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ جوتا کس کا تھا۔ سارہ کا یا صبرہ کا۔

اگلے دن وہ علی احمد کے روبرو سر لٹکائے کھڑا تھا۔ ”بول“ وہ کہہ رہے تھے ”سچ بچ بتا

دے۔“ اور سارہ ان کے قریب کھڑی مسکرا رہی تھی ”بتا“ وہ گرج رہے تھے ”ہوں تو تمہیں

نے شرارت کی ہے شرم نہیں آتی۔“

”شرم نہیں آتی شرم نہیں آتی۔“ چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔ غصے بھری

آوازیں، اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ دیوانہ وار چلانے لگے۔ شرم نہیں آتی اور علی احمد کے سامنے

تن کر کھڑا ہو جائے شرم نہیں آتی۔ ہی ہی ہی اور باہر نکل جائے اس مکان سے دور۔ اس شر

سے دور۔

”دفع ہو جاؤ ہماری نظروں سے دوڑو جاؤ۔“ علی احمد گرجے اور ایلی چپ چاپ آکر چارپائی

پر پڑ گیا۔

تمام گھر میں چاروں طرف شور مچا ہوا تھا۔

## بیداریاں

### بام آباد

چھٹی ختم ہونے پر علی احمد کا تبادلہ بام آباد ہو گیا، لیکن علی احمد تن تنہا بام آباد جانے کے لئے تیار نہ تھے۔

علی احمد تنہائی سے ڈرتے تھے شاید وہ اپنے آپ سے خائف تھے وہ کمرے میں اکیلے سونہ سکتے تھے۔ اگر سوتے میں ان کے کمرے سے لوگ چپ چاپ نکل آتے تو جو نبی آخری آدمی باہر نکلتا، وہ گھبرا کر جاگ اٹھتے۔ اسی وجہ سے ان کا کسی کمرے یا مکان میں اکیلے رہنا ممکن نہ تھا۔ تنہائی کے علاوہ خاموشی بھی ان پر گراں گزرتی تھی۔ رات کے وقت اگر ان کی آنکھ کھل جاتی تو وہ اسی چھائی ہوئی خاموشی سے ڈر کر اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتے تاکہ اپنی آواز کا شمارا لیں یا وہ اپنی بیوی کو پکارتے اور یا حقہ بھر کر اس کی گڑگڑ سے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ لہذا بام آباد تنہا جانا کیسے ممکن تھا۔ ایسا کی ماں ان کے ساتھ جانے کی خواہشمند نہ تھی وہ جانتی تھی کہ اسے ساتھ لے جانے سے علی احمد کا مقصد صرف یہی تھا کہ اپنا کمرہ آباد رکھنے کے لئے گھر میں ایک عورت کی موجودگی کا بہانہ قائم ہے۔

اس روز علی احمد دادی اماں کے پاس چپ چاپ بیٹھے تھے۔ دادی اماں کہہ رہی تھیں ”اے ہے۔ لڑکی اگر تو ساتھ چلی جائے تو کم از کم علی احمد کو روٹی کی تکلیف تو نہ ہوگی۔“ اور دروازے سے گئی ہوئی باجرہ رو رہی تھی۔ اس کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

”اللہ رکھے تیرے بال بچے ہیں تو ہی تو اس گھر کی مالکہ ہے تو ساتھ جائے گی تو ہی گھر بے کانا۔“

ہی ہی ہی ہی۔ شرم نہیں آتی۔  
قاضی صاحب تو سمجھ لو ہمارے بھائی تھے۔ ذرا قریب ہو جاؤ نا۔ شرم نہیں آتی۔  
شرم نہیں آتی۔ شرم نہیں آتی۔ محلے کے کوئے چلا رہے تھے۔  
چراؤں، ٹھک، علی احمد کا دروازہ بند ہوتے ہوئے کراہ رہا تھا شرم نہیں آتی۔  
غصے میں بھنا کر ایلی نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ منہ سوجھا ہوا تھا۔  
کنپٹیاں تھرک رہی تھیں۔ ”شرم نہیں آتی۔“ وہ بہ آواز بلند چلایا لیکن گھیس گھیس کے علاوہ  
اس کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔ بے بسی اور لا چاری کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

ہام آباد ایک ویرانہ تھا، وسیع ویرانہ۔ اس کی سڑکیں بے تحاشہ چوڑی تھیں کہ سڑک پار کرنا مشکل ہو جاتا۔ پختہ سڑکیں تو درحقیقت بہت چھوٹی تھیں مگر ان کے ارد گرد بہت ساری زمین خالی پڑی ہوئی تھی۔ بازاروں کے دونوں طرف دکانوں کی جگہ جھونپڑیاں بنی تھیں۔ جن میں عجیب سی دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ سڑک کے درمیان دو چوک آتے تھے۔ وہ چوک اتنے وسیع تھے کہ ایک طرف سے دوسری طرف چلتے چلتے اپلی تھک جایا کرتا۔ علی پور کا آصفی محلہ اس ایک چوک میں سا سکتا تھا۔ سڑک ختم ہوتے ہی ویرانہ شروع ہو جاتا پھر ہسپتال کی عمارت آتی جس پر ہر وقت موت کا ماسکوت طاری رہتا۔ دائیں طرف ہائی سکول کی عمارت تھی۔ ایک بہت بڑی پختہ اور خوبصورت عمارت شکل و صورت میں وہ انگریزی کے حرف ای (E) سے ملتی تھی۔ بڑی عمارت سے ہٹ کر کچے کمروں کی ایک لمبی قطار تھی اور اس سے مغرب کی طرف ایک مربع بلڈنگ تھی جس کے سامنے بہت بڑا چھانگ لگا ہوا تھا۔ یہ سکول کا بورڈنگ ہاؤس تھا۔ سکول کے ارد گرد وسیع میدان تھے۔ جن میں ریت اڑتی تھی۔ ریت میں کہیں کہیں جھانپاں لگی ہوئی تھیں۔ سکول سے پرے یہاں کھجور کے درخت لگے ہوتے تھے اور سڑک پر اونٹوں کے قافلے آتے جاتے رہتے تھے۔

سکول سے بہت دور شہر کے دوسرے سرے پر علی احمد کا مکان ایک گلی میں واقع تھا۔ اس مکان میں چار کمرے تھے۔ ایک بہت بڑا صحن جس میں ایک کونے پر خاردار درخت لگا تھا۔ مکان کے ایک طرف کئی ایک غریب کنبے آباد تھے۔ وہیں ایک کوٹھڑی میں مائی رنیکل اور اس کا بیٹا گل رہتے تھے۔ دوسری طرف ایک گھوڑا ڈاکٹر رہتے تھے، جن کا رنگ بے حد کالا تھا مگر جن کی پیشانی عراب دار تھی۔ ڈاکٹر کا بیٹا فرید بھرپور جوان تھا۔ اس کا منہ کتنا چوڑا تھا اور اس کا جسم کس قدر پھیلا پھیلا سا تھا۔ ڈاکٹر کے گھر میں دو جوان لڑکیاں تھیں۔ زاہدہ اور عابدہ، جو ہر وقت نمازیں پڑھنے میں لگی رہتی تھیں۔ ان کی آنکھیں موٹی موٹی تھیں۔ لیکن وہ اس قدر کالی کیوں تھیں۔ ان کی آوازیں یوں سنائی دیتی تھیں جیسے گھنٹیں بج رہی ہوں۔ وہ دونوں فرحت کی سیلیں بن گئیں۔ اس بات پر ایلی کو بڑا غصہ آیا۔ اسے فرحت کی سیلیوں سے بے حد چڑھو مٹی تھی۔ فرحت کی سیلیوں کا خیال آتے ہی اس کی نگاہوں تلے سارہ اور صبوحہ آجاتیں اور پھر آواز آتی، ”سارہ سو گئی ہے کیا“۔ اور پھر چڑاؤں، ٹھک دروازہ بند ہو جاتا۔ ”ہونہ، سیلیں!“ ایلی کے دل میں غصے کی ایک لہر اٹھتی اور وہ ہوا میں ایک گھونٹہ چلا دیتا۔

”نہ میں نہیں بنتی مالکہ اس گھر کی“۔ ہاجرہ نے ہنسی لے کر کہا۔ ”بہت چاکری کر دیکھی ہے۔“  
داوی بولی۔ ”آخر تو نہ جائے گی تو مگر زاہہ کیسے ہو گا۔“ ”ہاجرہ نے کہا۔ میرے بغیر انہیں کسی چیز کی کمی ہے کیا۔“  
”چل چھوڑا اب۔“ داوی اماں بولی۔  
پھر نہ جانے کیسے چند ہی منٹوں میں محلہ والیاں آپہنچیں جیسے انہوں نے پہلے ہی سے پروگرام بنا رکھا ہو۔

”اے ہے کیوں نہ جائے گی تو“ چاچی حاجاں ہاتھ چلا کر بولی ”اللہ رکھے تو اس گھر کی مالک ہے۔“

”لو یہ سنو۔“ اماں جیواں نے ہاجرہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”اللہ عمر دراز کرے تیرے بچوں کی تو نہ جائے گی اپنے گھر تو ہو گا کیا۔“

”تو ان آنے جانے والیوں کی کیا پروا کرتی ہے آتی ہیں تو آجائیں۔ آئیں گی اور چلی جائیں گی۔ ان کل مونیوں کا کیا ہے جی۔ گھر تو تیرا ہی ہے نا۔ اپنے لئے نہیں تو ان بچوں کے لئے تجھے ضرور جانا چاہئے۔“

محلے کی بوڑھیاں ہاجرہ کے گرد چیلوں کی طرح منڈلانے لگیں۔ ان کی چیخیں سن کر ایلی نے محسوس کیا کہ ہام پور کا طوفان آیا ہی چاہتا ہے۔ پہلے تو ہاجرہ نے جلی کئی شانے کی کوشش کی پھر اس نے بچکیوں سے احتجاج کیا اور بالاخر خاموش ہو گئی اور اس کی خاموشی پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔

”ہاجرہ جائے گی، ہاجرہ جائے گی۔“

”اے ہے کیوں نہ جائے اپنے گھر۔“

”ہی ہی ہی۔“ علی احمد ہنسنے لگے ”تو سامان باندھ دو نا اس کا۔“ اور سامان باندھا جانے لگا

اور دو روز میں وہ سب ہام آباد پہنچے۔

ہام آباد ایک نیا شہر تھا۔ لیکن جب ایلی نے اسے دیکھا تو اس میں کوئی ایسا نیا پن دکھائی نہ دیا۔ ایلی کا خیال تھا کہ نیا شہر بھی ویسا ہی ہو گا جیسے نیا گھر ہوتا ہے لیکن اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ نیا شہر نے گھر سے قطعی طور پر مختلف ہوتا ہے۔

اب کہتی ”اونہوں۔ ان تلوں میں تیل نہیں ریتقال ایسی نہیں۔ سب عورتیں ایک سی نہیں ہوتیں کہ بلاوے کی خطر بلاوے کی خطر ہوں۔“ یہ سن کر ریتقال مسکرائے جاتی اور ایلی مبسم طور پر محسوس کرتا۔ جیسے ریتقال کا جی کچھ اور چاہتا ہے اور وہ کچھ اور کر رہی اور ایلی کی نگاہ میں ریتقال کی مسکراہٹ دودھاری چھری کی طرح محسوس ہوتی تھی اور وہ ریتقال سے نفرت کرتا اور یہ نفرت روز بروز شدید تر ہوتی جاتی تھی۔

لیکن ہاجرہ ریتقال کے گمن گاتی تھی۔ بات بات پر ریتقال کی تعریف، ریتقال کی شرافت اور نیکی کی گھر میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ شاید اسی دھوم کی وجہ سے ریتقال قطعی طور پر مجبور ہو گئی تھی کہ علی احمد کی آواز سننے کے باوجود اور ان کی متبسم آنکھوں کے اشارے کے باوجود چپ چاپ بیٹھی رہے۔ اس کے باوجود جب وہ علی احمد کے کمرے کے دروازے کے قریب سے گزرتی تو اس کی گردن تن جاتی۔ گھگھرایوں کھلتا اور بند ہوتا کہ عجیب سے دائرے بنتے چلے جاتے اور ایلی محسوس کرتا جیسے اس کا جی چاہتا ہو کہ رک جائے اور چوری چوری مسکرانے کی بجائے قہقہہ مار کر ہنس دے۔ کیوں بلایا ہے مجھے۔ کس نے بلایا ہے مجھے، مگر وہ چلے جاتی چلے جاتی۔ ایلی سمجھتا تھا کہ ہاجرہ کی توقعات نے اس کا دہاں رکنا ناممکن کر دیا اور ہاجرہ کے ان محبت بھرے جذبات سے جو اس نے ریتقال سے وابستہ کر رکھے تھے۔ صفیہ کی بو آتی تھی اور ایلی کو محسوس ہوتا تھا جیسے ریتقال صفیہ کی جانشین ہو۔ ایلی کو اس بات پر اور بھی غصہ آتا تھا۔

علی احمد کا گھر ایک عجیب گھر تھا۔ اس میں دو طاقیتیں برسرِ پیکار تھیں۔ علی احمد اور ہاجرہ ہر نوواردہ کو دیکھ کر دونوں طاقیتیں اسے اپنی طرف کھینچیں۔ علی احمد کے کمرے کا کھلا دروازہ اسے اپنی طرف بلاتا اور باورچی خانے کی محراب اسے اپنی طرف کھینچتی۔ علی احمد کے دروازے سے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی اور باورچی خانے سے دبی دبی آہوں کی۔ وہ کمرہ اور باورچی خانہ دونوں ہی مظلوم تھے۔ کمرہ ہی ہی کرنے پر مجبور تھا اور باورچی خانہ آہیں بھرنے پر۔ فطرت ان دونوں کی مجبوریوں پر مسکراتی تھی۔ جیسے وہ ان دونوں کے راز سے واقف ہو اور ان دونوں کی شکایت سے دور ایلی اور فرحت ایک دیوانے میں اکیلے زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ تن تنہا۔

ہر نوواردہ کے پاؤں کے آہٹ سن کر دونوں بھائی بہنوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔ اب کیا ہو گا۔ وہ اشتیاق بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگتے۔ نوواردہ کمرے اور باورچی خانے کے

زادہ اور عابدہ نے صحن کی درمیانی دیوار سے ایک اینٹ نکال رکھی تھی تاکہ آپس میں باتیں کر سکیں اور علی احمد آتے جاتے دزدیدہ اور حسرت بھری نگاہوں سے اس سوراخ کی طرف دیکھا کرتے اور ہاجرہ علی احمد کی نگاہوں کو دیکھ کر اپنا سینہ تھام لیا کرتی ہائے اللہ اب کیا ہو گا اور ایلی محسوس کرتا کہ اب وہ سوراخ بڑا ہو جائے گا۔ بڑھتے بڑھتے دروازہ بن جائے اور پھر ایک دروازہ آواز آئے گی۔ زادہ سو گئی کیا اور عابدہ چپکے سے دروازے سے نکل کر گھر میں آجائے گی اور پھر علی احمد کے کمرے میں کھس جائے گی۔ پھر دروازہ بند ہو جائے گا اور پھر۔ پھر۔ لیکن غصے سے اس کا منہ اس قدر سرخ ہو جاتا کہ ”پھر“ کے متعلق اسے کوئی دلچسپی نہ رہتی۔

## ریتقال

ہام آباد میں سب سے پہلی عورت جو ان کے گھر آئی ریتقال تھی۔ ”بی بی کوئی کم ہووے تیں ڈسوتا“ اس کے انداز میں بے بسی کی جھلک نمایاں تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں ایلی نے محسوس کیا کہ اس کی جھکی جھکی آنکھیں نہ دیکھنے والی نظر آنے کے باوجود دیکھتی تھیں۔

ہاجرہ پہلے ہی روز ریتقال کی دکھ بھری کہانی سن رہی تھی اور اس کا پلو بھیگا ہوا تھا۔ ایلی نے ایک نظر دونوں کو دیکھا اور پھر غصے سے بے تاب ہو کر باہر چلا گیا۔

ریتقال روزان کے یہاں آنے لگی۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بیٹا گلاں بھی ہوتا تھا۔ اگر گھر کے کام کاج میں ہاجرہ کا ہاتھ بٹاتی اور اس دوران میں علی احمد خلاف معمول خود ہم اشائے باورچی خانے میں آجایا کرتے۔

”اوہ۔ ریتقال ہے۔ کیا حال ہے ریتقال۔ اچھی تو ہے تو۔ بڑی دیر کے بعد دیکھا۔“ اور ریتقال مسکراہٹ بھینچنے کی کوشش کرتی اور نظریں جھکا لیتی اور علی احمد اپنے آپ باتیں کرتے کرتے تھک جاتے اور پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے اور وہاں پہنچ کر آواز دینے ریتقال ذرا آتا تو۔“ اس پر ہاجرہ کی تیوری چڑھ جاتی اور ریتقال مسکرا کر سر جھکا لیتی جیسے سب سمجھتی ہو اور چپ چاپ بیٹھی کام کئے جاتی۔

لیکن ایلی کو محسوس ہوتا جیسے اس کی خاموشی میں ہاں کی جھلک ہو جیسے اس کا جی چاہتا کہ اٹھ کر علی احمد کے کمرے میں چلی جائے اور پوچھے آپ نے بلایا ہے جی لیکن وہ بیٹھے رہے۔ پر مجبور تھی۔ بی بی کیا کہے گی اور بی بی بات بات پر کچھ نہ کچھ کہا کرتی تھی آواز پڑنے پر وہ





گھمے کو ہاتھوں پر لپیٹی ہوئی چل پڑی۔ اب آسب سے آگے تھا پیچھے اس کی ماں اور سب سے پیچھے کور تھی۔

انہیں جاتے دیکھ کر ایللی باہر نکلا۔ مضطربانہ گھر میں گھومنے لگا۔ باورچی خانے میں داخل ہوا تو دفعتاً ”سرگوشیوں کی آوازیں بند ہو گئیں۔ ہاجرہ چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔ اس سے ذرا پرے ریفٹاں گھمے پر بوٹیاں بنا رہی تھیں۔

ظاہر تھا کہ وہ دونوں کور کے متعلق باتیں کر رہی تھیں۔ لیکن کیوں ایللی کے آنے پر وہ دفعتاً ”چپ کیوں ہو جایا کرتی تھیں۔ یوں سر سے سر جوڑ کر دبی دبی آواز میں یہاں سے وہاں کرتے رہتا اور ریفٹاں کے ہونٹوں پر وہ دبی دبی مسکراہٹ جیسے وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو جیسے وہ ہاجرہ کو فریب دے رہی ہو۔ اماں اسے اس قدر اچھا کیوں سمجھتی تھیں اور وہ چلتے وقت جان بوجھ کر اس طرح قدم کیوں اٹھاتی تھی کہ اس کے گھمے میں دائرے پڑیں اور علی احمد کے کمرے کے پاس سے گذرتے ہوئے اس کی گردن موڑنی کی طرح تن کیوں جاتی تھی۔ ایللی کو ان سب باتوں کی وجہ سے ریفٹاں سے نفرت تھی۔

شدید نفرت ایسی نفرت جو اسے کور سے بھی نہ تھی۔

### نوکرانی کے ہاں بچہ

چند ہی دنوں بعد ان کے یہاں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک روز وہ گلی میں کھیلنے کے بعد جب گھر میں داخل ہوا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو فرحت نے اسے روک دیا۔

”اونہوں اندر نہ جانا۔“

وہ اس بات پر حیران رہ گیا ”کیوں اندر کیا ہے“

”اماں بیمار ہیں۔“ فرحت نے کہا۔

”تو کیا ہوا۔“ ایللی نے کہا۔ وہ تو ان کا اپنا کمرہ تھا۔ علی احمد کا کمرہ تو نہ تھا جس میں جانے سے ہمیشہ گھبرایا کرتا تھا اور داخل ہونے سے پہلے ان جانے میں کھانتا اور پھر نگاہیں جھکا کر داخل ہوتا جیسے کوئی جرم یا گناہ ہو مگر یہ تو ان کا اپنا کمرہ تھا۔ پھر فرحت کا اسے روکنے سے کیا مطلب تھا۔ اگر اماں بیمار تھیں تو کیا تھا۔ بیماری کی وجہ سے کمرے میں جانے کی ممانعت تو نہیں ہو سکتی۔ اماں دفعتاً ”میم تو نہیں بن گئی تھیں کہ بیماری میں لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا تھا یہ سب فرحت اپنی

اس کا جسم لٹا ہوا تھا۔ نگاہ حرص آلود تھی۔ اسے دیکھ کر انتہائی غلاطت کا احساس ہوتا تھا۔ کور سیاہ فام گوشت تھا۔ کور سیاہ فام گوشت کا ایک گول منول لو تھڑا تھی۔ جس پر بھڑکیلے کپڑے لٹے ہوئے تھے۔ جو اس لو تھڑے کو اور بھی بد نما بنا رہے تھے۔ اس کا قد ٹھٹھکا تھا۔ سر چھوٹا اور گول جس میں چھوٹی چھوٹی آنکھیں ریتیتیں اور سفید دانت رضا مندی کی چمک سے روشن تھے۔ آسا ایک اونچا لمبا لڑکا تھا۔ اس کا چہرہ ذہنی چمک سے کورا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حلقہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اس کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کور کے پیچھے پیچھے چلنے کا عادی ہے۔

یہ قافلہ چمکے سے مکان میں داخل ہوا اور علی احمد کے متعلق ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بعد باہر صحن میں اسی مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔ جہاں سے اندر کام میں منہمک علی احمد پورے طور پر دکھائی دیتے تھے۔ علی احمد نے باہر دیکھا۔ کور کے دانت چمکے۔ انہوں نے جلد ہی سر جھکا کر لکھنا شروع کر دیا۔ کور اپنے گھمے اور چولی کو ٹھیک کر کے علی احمد کی طرف منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ بڑھیا نے اس کی طرف پیٹھ کر لی۔ آسا آسمان کی طرف اڑتی ہوئی جیلوں کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ کور کے دانت پھر چمکے اس نے ایک بھر پور انگڑائی لی۔ علی احمد کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر رجرش پر جاگرا۔ ”کون ہے؟“ وہ بولے۔ جواب میں دانت چمکے اور بغیر کسی تمہید کے کور اٹھ کر علی احمد کے کمرے میں جا داخل ہوئی۔ اس پر بڑھیا اس خاردار درخت کو دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ جو صحن میں پھیلا ہوا تھا اور آساتھ سے زمین پر تیل بوٹے بنائے لگا۔

اس روز علی احمد کے کمرے سے ٹین کے سپاہی کی ہی ہی سنائی دینے کی بجائے ربوکی گزیا کی چپیں چپیں سنائی دے رہی تھیں۔ اور ایللی حیران تھا اور فرحت یوں خلا میں گھور رہی تھی جیسے کچھ بھی نہ ہو۔

دفعتاً ”دروازہ کھلا اور کور ہنسی ہوئی نکل۔“ ”ماں۔ ماں آسا فیل تو نہیں۔ آسا تو پاس ہے۔ نہ جانے کس نے اس سے کہہ دیا ہے کہ تو فیل ہے خواہ مخواہ وہ تو پاس ہے۔ میں نے خود نیچہ دیکھا ہے۔ تو نے کہا نہیں تھا۔“ اس نے آسا کو مخاطب کر کے کہا۔

”یہ تو پاگل ہے۔“ آسا کی ماں بولی۔

آسا پاگلوں کی طرح ہنسا اور پھر خاموش ہو گیا کور کے دانت چمکے علی احمد سر کھانے لگے۔ ”آؤں گی۔ ضرور آؤں گی۔ بابو جی۔“ وہ بولی ”چل ماں“ اور مڑ مڑ کر دانت چمکاتی ہوئی

بچے کی مبارکباد دینے کے لئے مختلف قسم کے لوگ آتے تھے۔ کچھ تو ہاجرہ کی کوٹھڑی میں جا کر ٹھس جاتے اور کچھ علی احمد کے کمرے سے آگے نہ جاسکتے۔ کور ان لوگوں میں پیش پیش تھی۔ ”باوجی مبارخ ہو۔“ وہ دور سے چلاتی ہوئی آئی اور پھر علی احمد کے کمرے میں داخل ہو کر یوں مطمئن ہو گئی۔ جیسے علی احمد ہی زچہ اور بچہ ہوں۔

علی احمد کا کمرہ کور کے لئے مخصوص ہوا جا رہا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ دانت چکاتی گھگھرا جھلاتی آمو جو ہوتی۔ ”کو باوجی کیا حال چال ہے ننھا کیسا ہے۔ اس کے سفید دانت سیاہ رنگ میں چمکتے۔“ ”آگئی تو“ علی احمد اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔

”اچھا تو ابھی یقین نہیں آیا۔“ وہ نگلے کی رسی ہاتھ میں پکڑ کر چابک کی طرح جھلاتے ہوئے چلاتی۔

یہ دیکھ کر نین کا سپاہی جوش میں آجاتا ”اچھا یہ جرأت۔“

پھر کمرے میں اودھم مچ جاتا اور ایللی غصے میں مٹھیاں بھیجتا ہے ”کتنی کمروہ آواز ہے کور کی، انداز کس قدر ننگا ہے۔ ننگا اور غلیظ“ اسے کور سے نفرت تھی اور وہ آسا کو دیکھ کر غصے میں کھولنے لگتا تھا۔ کیونکہ وہ محسوس کرتا جیسے خود آسا ہو اور کھڑکی کا امتحان پاس کرنے کے لئے ہاجرہ کو لے کر آیا ہو۔

ایللی بڑی محنت سے اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتا مگر ان کی آوازیں اس کے کانوں پر ہتھوڑوں کی طرح پڑتیں۔ پھر دفعتاً ”علی احمد کے کمرے کا دروازہ کھلتا اور علی احمد کی آواز سنائی دیتی ”ایللی، ایللی۔“

### دھرم بھر شٹ

اس وقت ایللی کا علی احمد کے کمرے میں جانا کس قدر دشوار اور پر لذت ہوا کرتا اور وہ دروازے پر جا کر رک جاتا۔ اندر جانے کی ہمت نہ پڑتی۔ پھر وہ انتظار کرتا کہ ایک بار پھر آواز پڑے تو اندر جائے۔ باہر چلچلاتی دھوپ میں اسے کافی دیر تک کھڑا رہنا پڑتا۔ اندر ریز کی گزریا نہ جانے کیا کیا تماشے کرتی۔ ان تماشاؤں میں وہ دونوں بھول جاتے کہ انہوں نے ایللی کو آواز دی تھی۔

”ایللی“ دوسری مرتبہ آواز پڑنے پر وہ ڈرتا ڈرتا اندر داخل ہوتا اکثر دونوں ایک دوسرے

طرف سے کہہ رہی تھی۔ ایللی نے سوچ کر سینہ تن لیا۔ ”نہیں نہیں میں جاؤں گا۔“ وہ بولا۔ عین اس وقت ریفٹاں دوڑتی ہوئی باہر نکلی ”تمہیں مبارک ہو۔ تمہارے ہاں ایک نوا بھائی ہوا ہے۔“ بھائی ہوا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ بھائی کیسے ہو سکتا تھا۔ ریفٹاں کا مطلب کیا تھا۔ اہل کے یہاں بیٹا لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ اہل تو اس گھر کی نوکرانی تھی۔ نوکرانی کے کمر بیٹا۔ اہل تو علی احمد کے کمرے میں کبھی نہ گئی تھی۔ اہل کو تو کبھی آواز پڑتی تھی۔ ہاجرہ سو گئی کیا۔ اہل تو ایسی نہ تھی۔ پھر اہل کے ہاں بیٹا نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ گناہ تھا بے عزتی تھی۔ نوکرانی کی بے عزتی۔ اہل نے تو کسی کلرک کو بھرتی نہ کرانا تھا۔ پھر یقیناً ”ریفٹاں کچی تھی۔ وہ دوڑ کر اندر گیا اور ننھے ننھے بچے کو دیکھ کر شرم سے زمین میں گڑ کے رہ گیا۔ پھر وہ باہر آ بیٹھا اور محسوس کرنے لگا۔ جیسے وہ آسا ہو۔ جیسے علی احمد نے اس کی ماں کو بھی کھلونا بنایا ہو اس خیال پر اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔

وہ صحن میں خاردار درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ دور تک کچی اینٹوں کی منڈیروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور اس سے پرے ریت کے ٹیلے او اس کھڑے تھے۔ آسا۔ آسا درخت پر بیٹھا ہوا کوا چلایا۔ اس نے غصہ میں ایک پتھر اٹھا کر اس کی طرف پھینک دیا۔

ہاجرہ کے کمرے میں شور مچا ہوا تھا۔ مٹلے والیاں اونچی آواز میں چلا رہی تھیں۔ ”ہن تمہیں مبارک ہو۔“

وہ ہاجرہ کو مبارکباد کیوں دے رہی تھیں۔ لوگ کیوں ہاجرہ کے کمرے میں جمع ہوتے رہے تھے۔ کیوں لوگوں کو تو چاہئے تھا کہ اس سے نفرت کریں جو نوکرانی ہونے کے باوجود گود میں بچہ لئے پڑی تھی۔ لیکن اہل کو بھی احساس نہ تھا۔ کس بے شری سے مسکرا رہی تھی۔ اسے شرم نہ آتی تھی۔ مگر اہل تو ایسی نہ تھی۔

ایللی شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ اب وہ لوگوں کو کیسے منہ دکھائے گا اب وہ اپنی ماں کے سامنے کیسے جائے گا اور فرحت۔۔۔۔۔۔ فرحت کو اس بات پر کتنا دکھ ہو گا۔ مگر فرحت تو خوشی سے پھولے نہ سہا رہی تھی۔ کیا فرحت کو یہ بات گوارا تھی۔ کیا اس حادثہ پر اسے دکھ نہ ہوا تھا۔ ادھر ابا اپنے کمرے میں آقاؤں کی طرح اطمینان سے بیٹھے لکھ رہے تھے۔ جیسے انہیں نوکرانی اور اس کے نواز سیدہ بچے کی خبر ہی نہ ہو۔

ایک روز کنوئیں سے پانی لاتے ہوئے اسے ایک خوفناک خیال آیا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ دوسری کڑکتی دھوپ میں بامِ آبد کا وہ ریتا میدانِ ویران پڑا تھا۔ دور تک گلیوں میں کوئی نہ تھا۔ اس نے بوتل کی طرف دیکھا ایک بار پھر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مطمئن ہونے کے بعد ایلچی نے منہ میں تھوک بھرا اور پھر دھڑکتے ہوئے بوتل میں تھوک دیا۔

اس روز پانی لاتے ہوئے وہ بے حد مسرور تھا۔ جیسے اس نے اپنے دشمن کو ہمیشہ کے لئے زیر کر لیا ہو۔ جیسے اس کا انتقام پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہو۔ پھر دفعتاً اسے ایک اور خیال آیا وہ رک گیا اور بوتل زمین پر رکھ کر سوچنے لگا۔ اس کا دل دھک دھک بج رہا تھا۔ منہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور بدن پر چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ لیکن وہ ڈر گیا اس میں اس قدر جرأت نہ تھی اس کے علاوہ اس کھلے میدان میں کوئی جگہ نہ تھی۔ جہاں وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا سکتا۔ لیکن یو یو ڈمی میں پہنچ کر دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ وہاں اسے کوئی بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ کوئی نہیں۔ ٹوٹھی سے اس کا چہرہ تہمتا اٹھا وہ خوش تھا۔ اس کا انتقام ادا ہو رہا ہے گا۔ اس نے بوتل ایک کونے میں رکھ دی۔ دروازے کی کڑی چڑھا دی اور پھر ————— بوتل میں پانی کی سطح ابھر رہی تھی۔

اس روز کور کو بوتل سے پانی پیتا دیکھ کر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ خوشی اس کے دل میں یوں چھلک رہی تھی، جیسے سوڈے کی بوتل میں جھاگ اچھلتی ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ فخرت اور باجرہ دونوں کو اپنی مسرت میں شریک کر لے۔ محلے کے ہر دروازے کو جا کر کھٹکھٹائے اور انہیں اپنا راز بتائے اور پھر ان کو اپنے ساتھ علی احمد کے کمرے میں لے آئے تا کہ وہاں سب کور کو بوتل سے پانی پیتے دیکھیں۔

الہ کو بتانا بے کار تھا۔ اہاں تو نصیحتیں کرنے کے سوا کچھ جانتی ہی نہ تھی اہلی کوئی نصیحت بھی کرتا۔ وہ جو اب میں نصیحت فرما دیتی کما کرتی تھی کوئی برا کرتا ہے تو کرنے دو لیکن تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو۔ اس پر اہلی محسوس کرتا۔ جیسے اہاں عیسائی ہو جو ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا پیش کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ہونہ اہاں تو خواہ مخواہ بنتی تھیں۔ اس کے علاوہ جب سے

سے یوں باتوں میں مشغول ہوتے ایک دوسرے میں اس حد تک کھوئے ہوتے کہ ویر تک قریب کمرے ایلی کی طرف ان کی توجہ مبذول نہ ہوتی۔ پھر علی احمد چونک کر کہتے ”اوہ تو آگیا ایلی۔ وہ میز پر بوتل پڑی ہے۔ اس میں پانی لے آ۔ کور کو پیاس لگی ہے۔“ ایلی غصہ سے تنگ منہ دلالی بوتل کو دیکھتا ————— گردن مروڑ کر اسے اٹھا لیتا۔

”ایلی۔“ کور چلاتی ”کنوئیں سے لانا۔“

ایلی کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ کنوئیں سے لانا۔ بڑی آگ دھرم والی چاہے خود روڑ  
بھرٹ ہوتی رہے۔ پر دھرم بھرٹ نہ ہو۔ اس گھر کا پانی نہ پئے گی۔ منکے کا پانی نہ پئے گی۔  
دھرم بھرٹ ہوتا ہے۔ لیکن بند کرے میں خون چونے سے دھرم برٹ نہیں ہوتا۔ مسلمان  
سے کشتی لڑنے سے دھرم بھرٹ نہیں ہوتا۔ تھیلی پر دو روپے رکھوانے سے دھرم بھرٹ  
نہیں ہوتا۔ بڑی دھرم دالی بنی پھرتی ہے۔ کنوئیں سے لانا غصے میں وہ بل کھاتا۔ لیکن بل کھانے  
کے علاوہ وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں چلتا ہوا، غصے کی آگ میں کھولتا ہوا وہ کنوئیں پر  
پنچتا راستے میں وہ بار بار دانت پیس پیس کر بوتل کی گردن مروڑتا۔ جیسے وہ کور ہو بوتل کی گردن  
مروڑنے سے اس کی ایک گونہ تسلی ہو جاتی تھی۔

ہام آبو میں کنوئیں نہیں تھے۔ جن میں ڈول ڈال کر پانی نکالا جاسکتا۔ وہاں سب کنوئیں راہٹ والے تھے۔ چلچلاتی دھوپ میں ایلی کو تن تھارہٹ کو تیل کی طرح کھینچتا پڑتا اور تو اس کے چلانے سے رہٹ کا چکر ہلتا بھی نہ تھا۔ دم لینے کے بعد وہ پھر سے رہٹ کو دھکیلتا اور پھر تھک کر رک جاتا تاکہ تازہ دم ہو کر اسے چلا سکے اور جب چلتا پانی کا اتنا بڑا دھارا بوتل پر گرنا تو بوتل گر کر اوندھی ہو جاتی۔ اوندھی نہ بھی ہوتی تو بھی پانی اوھر اوھر بہ جاتا اور بوتل خالی رہ جاتی۔ اس نے کئی بار علی احمد سے کہا تھا کہ کنوئیں پر بوتل نہیں بھرتی لیکن کور نے شیشے کی بوتل کے علاوہ کسی اور برتن میں پانی پینے سے انکار کر دیا تھا۔ شیشے کی بوتل میں پانی پینے سے دھرم بھرٹ نہ ہوتا تھا اور علی احمد کے گھر میں کور کے نزدیک اور کوئی برتن نہ تھا جس میں دھرم بھرٹ کئے بغیر پانی پیا جاسکتا ہو۔ علی احمد پچارے کر بھی کیا سکتے تھے وہ کور کی بات سن کر انہیں دیتے اور کور انہیں ہنستا دیکھ کر کمرے میں لگے ہوئے پنکھے کی رسی معنی خیز انداز سے سمھاتی جیسا کہ علی احمد اور بھی ہنسنے لگتے اور بات شروع ہوئے بغیر ہی ختم ہو جاتی۔

علی احمد رسی کا سٹنل دیکھتے ہی ٹین کے سپاہی میں بدل کر ربڑ کی گڑیا پروار کرنا شروع کی۔

اس کی چھٹی پٹی آواز سن کر ایلی محسوس کرتا۔ جیسے اس پر پٹنازم کر دیا گیا ہو۔ وہ کیفیت کس قدر پر لذت محسوس ہوتی تھی۔

روز شام کے وقت ایلی اس طرف نکل جاتا۔ جس طرف گھنٹام کا گھر تھا اور گھنٹوں گلیوں اور بازاروں میں اس امید پر آوارہ پھرنا کہ شاید گھنٹام کسی کام کے لئے باہر نکلے اور پھر۔ پھر اسے دیکھ کر رک جائے۔ کھڑا ہو جائے اسی طرح جس طرح سکول کے برآمدے میں کھڑا ہو جائے اسی طرح جس طرح سکول کے برآمدے میں کھڑا رہتا تھا۔ ایک ٹانگ سیدھی اور دوسری میں خم، پھر وہ دونوں پاؤں ملا لیتا اور پنچوں کے بل کھڑا ہو کر ایڑیاں اٹھا لیتا اور پھر پنچوں پر جھولنے لگتا۔ ایلی کو یوں لگتا جیسے کوئی ننھا سا فرشتہ فضا میں تیر رہا ہو۔ اس کے ہونٹ کلی سے بنے رہتے تھے۔ نہ جانے ہونٹ کیوں کلی سے بن جاتے تھے۔ جیسے اس نے کوئی بڑی شگفتہ بات سنی ہو یا کہنے والا ہو۔

بٹھے بٹھائے ایلی کے دل میں اضطراب سا پیدا ہو جاتا اس کا جی چاہتا کہ وہ ایٹور لال کی باتیں سنے یا گھنٹام کے سامنے کھڑا ہو اور فضا میں کوئی پیارا فرشتہ جھول رہا ہو یا پرکاش کا گول چہرہ اس کی نگاہوں میں سا جاتا اور وہ بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھتا اور باہر گلی میں جا کر ٹھٹھٹھ لگتا۔ لیکن گلی میں ٹھٹھٹھ بھی تو مشکل ہوا جا رہا تھا۔ وہاں ٹھٹھٹھ تو پڑوس والے گھر سے زائدہ، عابدہ کی آوازیں کن میں پڑتیں کس قدر سریلی آوازیں تھیں۔ دل میں تیرکی طرح چھ جاتی تھیں اور پھر اندر جا کر ڈولنے لگتیں جیسے دل میں کوئی فرشتہ پنچوں کے بل کھڑا جھول رہا ہو۔ آوازوں میں کیسا جادو تھا۔ کیوں۔ شکلیں تو بالکل سیدھی سادھی تھیں۔ رنگ بھی کالا اور ان میں کچھ بھی تو جاذب نظر نہ تھا۔ لیکن آوازیں ایلی کو بیتاب کر دیتی تھیں۔ تنکھی سریلی اور لودھار آوازیں۔

پھر دفعتاً اسے خیال آتا کہ قریب ہی وہ چنی سفید نرس میز کے مقابل کھڑی آپ ہی آپ شرارہی ہوگی۔ جیسے اس کی عادت تھی۔ مسکراتے ہوئے اس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے تھے۔ لیکن وہ مسکراتی کیوں تھی۔ مسکرائے کی کوئی وجہ بھی تو معلوم نہ ہوتی تھی۔ زرد رنگ کے مزہبوں کے مرتبوں اور کڑوی دوائیوں کی بوتلوں کے درمیان کھڑے ہو کر مسکرائے۔ ایلی کے لئے یہ عقدہ ناقابل حل تھا۔ پھر اس کی چال۔ کس پھین سے چلتی تھی۔ مسکراتی تو جیسے چراغ روشن ہو جایا کرتے۔ مگر وہ ایلی کو دیکھ کر قطعاً نہ مسکراتی تھی۔

ہاں اس روز جس روز ماں نے اسے بلایا تھا۔ جب ان کے گھر ننھا ہوا تھا اس روز۔

اس کے یہاں بچہ ہوا تھا۔ ایلی کی اس کے متعلق رائے بدل چکی تھی۔ اس لئے وہ خاموش رہا۔ اس نے بوتل کے پانی کا راز کسی کو نہ بتایا البتہ اس روز کے بعد اسے بوتل بھرنے کی کوفت سے نجات مل گئی۔

اس سے پہلے وہ کور کی آمد کی خبر سن کر گھبرا جاتا تھا۔ اب اسے بوتل بھرنے کے لئے جانا پڑے گا۔ چلچلاتی دھوپ میں کنوئیں کا بھاری چکر دھکیلنا پڑے گا لیکن اب جو نئی وہ گھر میں داخل ہوتی ایلی کا جی چاہتا کہ وہ جلدی پانی مانگے اور ایلی بوتل میں نفرت کا زہر بھر کر لادے۔ اب اسے کنوئیں چکر چلانے اور بوتل بھرنے میں کوفت کی بجائے مسرت ہوتی اور پھر جب چوگھن میں بیٹھ کر وہ منہ میں تھوک اکٹھا کرتا تو اس کا چہرہ خوشی سے لال ہو جاتا پھر ڈیوڑھی کی طرف بھاگتا اور بالآخر بوتل اٹھائے خوشی خوشی علی احمد کے کمرے کی طرف چل پڑتا۔ اس خوشی میں یہ قطعی طور پر بھول جاتا کہ علی احمد کے کمرے میں کھانسی کر داخل ہونا چاہئے اور وہاں جانے سے پہلے سرجھکا لیتا چاہئے۔

## انوکھے جذبات

اس زمانے میں وہ محبت کے اولین جذبات سے واقف ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں نئے انوکھے جذبات ابھر رہے تھے۔ اسے بلاوجہ سکول کے دو ایک لڑکے اچھے لگنے لگے تھے۔ حالانکہ اچھا لگنے کی کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی۔ پھر بھی وہ اسے اچھے لگتے تھے۔ مثلاً اس کے ہم جماعتوں میں ایٹور لال، پرکاش اور گھنٹام تھے۔ مثلاً اسے گھنٹام کا چپ چاپ کھڑا ہونا۔ وہ ایک عجیب انداز سے کھڑا ہوتا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ سیدھی ہوتی۔ دوسری یوں خیدہ رہتی جیسے ازلی طور پر اس میں سیدھا ہونے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ ہونٹ یوں آپس میں چٹکی سی بنائے رہتے جیسے ابھی کوئی بات کرنے والے ہوں، مگر ہونٹوں پر آتی ہوئی وہ بات ہونٹوں میں دبی رہتی۔

پھر وہ پرکاش تھا۔ پرکاش کا پھولا پھولا چہرہ اور اس کے رخسار پر وہ سیاہ تل اسے بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا اور ایٹور لال کا وہ تقبہ۔ اس کا بے تکلف انداز۔ اس کا لبہا سامنے اور میلے دانت اسے بڑے اچھے لگتے تھے۔ ایلی صبح شام ایٹور لال کے ساتھ رہتا تھا اور شوق سے اس کی باتیں سنتا رہتا۔ حالانکہ ایٹور لال کے دانت بڑے بھدے اور زرد تھے اور اس کے منہ سے بو آتی تھی مگر وہ بو کتنی اچھی لگتی تھی اسے ایٹور لال کا بولے جانا بولے جانا۔ اونچی آواز میں شور مچانا۔

اب تو اب ننھے میں کھوپکی تھیں۔ صبح و شام، دن رات وہ ننھے کی دیکھ بھال میں وقت بسر کرتی اور باقی تمامہ وقت بلورچی خانے میں گزارتی۔ فرحت بھی ہر وقت ننھے کو کھلانے میں لگی رہتی تھی۔ رفیقان اسے کھلاتی تو نہ تھی۔ مگر بڑے شوق سے دیکھتی۔ آتے ہی سیدھی ننھے کی طرف جا کر اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہتی ”یہ ننھا بال ہے۔ یہ مینڈھا سا میں ہے۔“ اور پھر بلورچی خانے میں بیٹھ کر گھگھرے پردھاگے سے بوتیاں بنانے میں مصروف ہو جاتی۔

علی احمد اب بھی سارا دن حساب کتاب لکھنے میں وقت صرف کرتے تھے اور کور بھی مینے میں صرف چار ایک مرتبہ آتی تھی۔ اب تو ایلی کو کور میں چنداں دلچسپی نہیں رہی تھی وہ اس کی بوتل میں تھوکنے سے بھی اکتا چکا تھا۔ جب کبھی علی احمد اس سے پانی لانے کو کہتے تو وہ چپکے سے بوتل اٹھا کر باہر نکل آتا اور پھر گھر سے پانی بھر لیتا۔ پھر کچھ دیر گلی میں کھیلنے کے بعد بوتل اٹھا کر نپا کے کمرے کی طرف چل پڑتا اور کور سمجھتی کہ وہ پانی کنوئیں کا ہے۔ کور کو پانی کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی وہ تو بند کمرے میں ربو کی گڑیا کی طرح چپیں چپیں کرتی اور جاتے وقت دو روپوں کے لئے علی احمد سے جھگڑا کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ علی احمد کا بھی کور سے دل بھر چکا تھا کیونکہ اب وہ اس کے آنے پر بھی کام میں لگے رہتے تھے اور اس کے جانے سے پہلے ہی پھر سے لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ نہ جانے ان دنوں وہ کسے چٹھیاں لکھ رہے تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ ایک چھٹی لکھ کر ایلی کو دیتے ”لو بھی اسے لیٹر بکس میں ڈال آؤ۔“

پہلی مرتبہ جب ایلی نے لفافے کا پتہ پڑھا تو وہ حیران رہ گیا۔ استانی کے نام چٹھی اور وہ بھی شاکوٹ والی کیا وہی جس نے شلوار کی جگہ چور لیٹ رکھی تھی؟ وہ تو شاید اس بات کو اہمیت نہ دیتا لیکن گلی میں فرید نے اسے پکڑ لیا ”ہوں استانی کو خط جا رہا ہے۔ کون ہے یہ استانی۔ دال میں کچھ کالا ہے دوست!“ اس وقت ایلی نے بھی محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ دال کون تھی اور کالا کون تھا۔ استانی تو دال نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر فرید نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ ”ایلی“ اس نے معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھا ایلی کے جسم میں جھنجھناہٹ سی دوڑ گئی۔ ”ایلی“ فرید نے اس پر بھرپور نگاہ ڈالی۔ ایلی کی اینٹیاں ہوا میں معلق ہو گئیں اور وہ فضا میں جھولنے لگا جیسے وہ کوئی ننھا فرشتہ ہو۔ وہ محسوس کرنے لگا جیسے وہ خود گھنٹام ہو اور کوئی ایلی اس کی طرف دیکھ رہا ہو۔ اس کے جسم میں چوٹیاں

علی احمد بار بار نرس سے باتیں کرتے رہے تھے۔ نرس مسکراتی تھی اور منہ موڑ لیتی تھی پھر منہ موڑ کر مسکراتی تھی اور علی احمد گھوم کر پھر اس کے سامنے اکھڑے ہوتے تھے۔

زاہدہ اور عابدہ کے خیال سے بچنے کی کوشش میں ایلی نرس کے خیال میں کھو جاتا مگر ڈسپنری کی کھڑکی تک جانے کی اس میں ہمت نہ پڑتی۔ پھر اس کے خیالات کا رخ زاہدہ کے بھائی فرید کی طرف منعطف ہو جاتا کتنا شوق تھا اسے نرس کو دیکھنے کا۔ فرید بھرپور جوان تھا۔ اس کا جسم کتنا بڑا تھا۔ موٹے موٹے ہاتھ۔ پھولی پھولی پنڈلیاں اور بھرے بھرے بازو۔ وہ نرس کے لئے ہر وقت مضطرب رہتا تھا۔ ”ایلی“ وہ اسے گلی میں دیکھ کر رک جاتا۔ ”ایلی ذرا جانا تو ہسپتال کی کھڑکی سے جھانکنا ہے یا چلی گئی۔ خدا کے لئے ابھی جاؤ۔ یار ہم تو مر گئے۔ تباہ ہو گئے۔ اس کے لئے اور پھر وہ مضطرب گلی میں گھومنے لگتا۔ بار بار جسم کھجاتا اور ڈسپنری کی کھڑکی سے نرس اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر منہ موڑ لیتی اور اپنے کام میں لگ جاتی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو کہ باہر کون کھڑا ہے۔

نرس مسکراتی کیوں تھی۔ مسکرانے کے بعد منہ کیوں موڑ لیتی تھی۔ ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ پھر وہ ہسپتال کی طرف جاتا۔ کھڑکی میں سے دھڑکتے دل سے جھانکتا۔ کتنی سفید تھی وہ چٹنی سفید ایلی کو گورا رنگ بے حد پسند تھا۔ لیکن نرس اس کی طرف دیکھتی بھی نہ تھی۔ مسکراتی بھی تو اسے محسوس ہوتا۔ جیسے وہ مسکراہٹ بالکل روکھی پھسکی ہو۔ نہ جانے ایلی کے دروہو نرس وہ مسکراہٹ کیوں نہ مسکراتی تھی جو وہ فرید کے سامنے مسکرایا کرتی تھی اور ایلی کو دیکھ کر وہ منہ بھی تو نہ موڑتی تھی۔ اس پر ایلی کو بے حد دکھ ہوتا اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی کو نے میں جا کر دروازے چنچیں مار مار کر روئے۔ مگر رو نہ بھی تو نہ آتا تھا اسے۔

اس روکھی مسکراہٹ والی نرس سے مایوس ہو کر وہ از سر نو گھنٹام کے خیال کی طرف متوجہ ہو جاتا اور ہسپتال کی کھڑکی کو چھوڑ کر بازار کی طرف چل پڑتا۔ شاید گھنٹام کیس بازار میں کھڑا ہو۔ شاید ایٹور گلی میں کھیل رہا ہو۔ یا شاید پر کاشت۔

ایلی کے دل میں انوکھی بیداریاں پیدا ہو رہی تھیں۔ جوں جوں اس کے دل میں نئی آرزوئیں تشکیل پائے جاتیں توں توں اس کے دل میں علی احمد کے کمرے سے نفرت بڑھتی جاتی اور اس کمرے میں جانے والیوں کے خلاف بغض شدید تر ہوتا جاتا اور اماں اور رفیقان کے متعلق شبہات تقویت پکڑتے جاتے۔



ہوئی چارپائی پر ہاتھوں میں سرھام کر لیٹ جاتے۔ دیر تک چپ چاپ لیٹے حقہ پیتے رہتے پھر دفعتاً "جوش میں اٹھ بیٹھے اور کسی نہ کسی ہمارے کشمیر کی بات شروع کر دیتے۔" "ابھی کیا بات ہے کشمیر کی۔ اللہ تعالیٰ نے زمین پر جنت کا نمونہ اتار رکھا ہے۔ رہنے کا مزمہ ہے تو کشمیر میں۔" وہ کسی کو مخاطب کئے بغیر کہتے "سرو قد درخت ٹھنڈی نہریں پھل بے اندازہ۔ پھل کھاؤ، چشموں کا ٹھنڈا پانی پیو،" ابھی وہاں کے رہنے والے حسین نہیں ہوں گے تو کون ہو گا۔" یہ محسوس کر کے کہ ان کی بات کوئی نہیں سن رہا علی احمد کبھی نہ گھبراتے تھے۔ "جنہوں نے صبح شام سیب کھائے ہوں ان کی شکل سیب سی نہ ہوگی تو پھر کیسی ہوگی۔ سیدھی بات ہے کیوں ریفٹاں جو سیب کھا کر پلے گا وہ بڑا ہو کر سیب بن جائے گا۔ ہی ہی ہی۔ کیا کہتی ہے۔" اندر باورچی خانے میں ریفٹاں چپ چاپ بیٹھی مسکراتی رہتی۔ "کیا بات ہے کشمیر کی۔ واہ وا کسی شاعر نے کہا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمیں است وہیں است وہیں است

ایلی میاں آؤ۔ ادھر تمہیں اس شعر کا مطلب آتا ہے کیا؟" وہ شعر پھر سے دہراتے اور ایلی کی خاموشی پر کہتے "آؤ تمہیں اس کا مطلب سمجھائیں لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ کشمیر ہے کہاں — وہ تو ٹھیک ہے یہ بتاؤ کہ وہاں گرمی کیوں نہیں پڑتی اور وہاں چشمے کیوں پھوٹتے ہیں۔ شاباش ٹھیک پہاڑ تو ہے لیکن پہاڑ پر رہنے والے۔ ریفٹاں تم جانتی ہر پہاڑ پر رہنے والوں کے چرے سیب کی طرح کیوں ہوتے ہیں۔ ایلی کی ماں تم نے دیکھا ہے کسی کو جو برسوں کشمیر میں رہا ہو۔ سبحان اللہ کیا رنگ روپ ہوتا ہے۔ میسین بیچاری کیا مقابلہ کریں گی۔ انگریز تو بد صورت ہوتے ہیں۔ ان کے منہ پر تو نحوست برستی ہے۔ لیکن کشمیر والے۔ واہ واسبحان اللہ"

گھر میں کسی کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ علی احمد بام آباد کے ویرانے میں بیٹھے بیٹھے دفعتاً "کشمیر کیسے جا پہنچے۔ ہاجرہ نے یہ عالم دیکھا تو ایک دن چپکے سے ریفٹاں کے کان میں بولی "کوئی بات ہے ضرور کوئی بات ہے میں جھوٹ نہیں کہتی۔ میری بات یاد رکھو۔ اگر بات نہ نکلی تو میرا زہد اور بات ٹکسنے میں دیر بھی نہیں لگے گی ہاں۔ میں تو تیرور پہچانتی ہوں ان کے۔"

ریفٹاں ہونٹ پر انگلی رکھ کر حیرانی سے ہاجرہ کی طرف دیکھتی "اچھا۔ لو میں بیچاری کیا جانوں۔"

بڑی بیچاری تو دیکھو۔ ایلی گھورتا۔

کی دوڑنے لگیں۔

اس روز ایلی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑا رہا۔ لیکن وہاں ایک بھدے کالے اور بھونڈے لڑکے کے سوا کچھ نہ تھا پھر اس نے باہر جا کر صابن سے منہ دھویا شاید وہ پہلا دن تھا۔ جب اس نے اس شدت سے محسوس کیا تھا کہ وہ بد صورت ہے۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ فرید اسے ایسی نگاہوں سے کیوں دیکھتا تھا۔ نہ جانے وہ ایسی آنکھیں کیونکر بنا لیا کرتا تھا اور پھر اس کا "ایلی" کہہ کر خاموش ہو جاتا۔ جیسے اس کی آواز حلق میں خشک ہو گئی ہو۔ لیکن اس کے اپنے جسم پر چیونٹیاں سی کیوں ریگینے لگتی تھیں۔ وہ چیونٹیاں گدگدی کیوں کرتی تھیں۔ جس سے دل میں کچھ کچھ ہوتا تھا۔ عجیب سا احساس تھا وہ ان جانے میں ایلی کو فرید سے ڈر لگنا شروع ہو گیا اور اس نے فرید کے گھر کی طرف جانا چھوڑ دیا۔ لیکن کیوں۔ وہ یہ نہ جان سکا۔ اس کے باوجود جب کبھی وہ کپڑے بدلتا یا نیا جوڑا پہنتا۔ تو اسے کوئی نہ کوئی ضروری کام پڑ جاتا اور مجبوراً اسے گلی میں اس سمت کو جانا پڑتا۔ جہاں فرید کا گھر تھا۔ جاتے ہوئے اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ہر آہٹ پر اس کے دل پر عجیب سا دباؤ محسوس ہوتا۔ جیسے کسی نے اسے پکڑ لیا ہو۔ "ایلی" اسے خواہ مخواہ آوازیں سنائی دیتیں اور پھر جسم پر چیونٹیاں ریگینے لگتیں۔ گلی میں فرید نہ ملتا تو وہ اطمینان کا سانس لیتا لیکن دل میں دبی دبی سی نخل کاٹنے کی طرح لگی رہتی اور بالاخر مایوس ہو کر گھنٹام کے گھر کی طرف چل پڑتا۔ شاید گھنٹام بازار میں کھڑا ہو۔ اس کی نگاہ تلے گھنٹام آکھڑا ہوتا۔ جس کے پاس ہی فرید کھڑا ہنس رہا ہوتا فرید اور گھنٹام۔ اب اس کے ذہن میں لازم و ملزوم ہوئے جا رہے تھے۔ روز بروز بے تاب ہوا جا رہا تھا۔ بات بات پر اس کا دل دھڑکتا ایک اضطراب چاروں طرف سے اس پر یورش کرتا اور اس اضطراب کے تعاقب میں وہ آوارہ پھرتا۔ گلی میں میدان میں بازاروں میں اور گھر میں بھی وہ مختصر سا گھر دفعتاً اس قدر وسیع کیوں ہو گیا تھا اور علی احمد کا کمرہ روز بروز سکڑ کر چھوٹا کیوں ہوتا چلا جا رہا تھا۔ خود علی احمد بھی تو اب اس کی نگاہوں میں اتنے عظیم نہ رہے تھے۔ اب انہیں اور ان کے کمرے کو آسانی ہے نظر انداز کر سکتا تھا۔

کشمیر کا سیب

ان دنوں علی احمد مضطرب رہنے لگے تھے۔ لکھتے لکھتے وہ قلم رکھ کر باہر آ جاتے اور کسی ٹٹلی

پھر دفعتاً ”نخا بیمار پڑ گیا اور سب کی توجہ ننھے کی طرف مبذول ہو گئی۔ ہاجرہ ریفقال اور فرحت ہاجرہ کے پاس بیٹھی رہیں۔ ایللی کو دن میں دو تین بار ڈسپنری جانا پڑتا۔ وہ نرس تک پہنچ تو جاتا لیکن اس سے براہ راست بات کرنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا۔ کئی بار وہ بات کرنے کے لئے فرید کو ساتھ لے جاتا اور نرس فرید کی طرف دیکھے بغیر جھپٹتی۔

نرس کی آمد پر علی احمد قیص پن لیتے اور ننھے کی چارپائی کے قریب آکھڑے ہوتے۔ ”ہی ہی ہی ہی۔“ وہ نرس سے اپنی بات شروع کر دیتے۔

نرس کے جانے کے بعد علی احمد ان سب کو تسلی دیتے۔

”گھبراؤ نہیں ٹھیک ہو جائے گا۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گا سب کھلاؤ اسے سبب — لیکن سبب کشمیر کا ہو۔ کلو کا نہ ہو۔ ایللی بھاگ کر ایک سبب لے آؤ۔ وہ دو آنے جیب سے نکل کر کہتے۔ بس سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایللی کی ماں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مگر ایللی کلو کا نہ لانا تھوڑا سارس نکال کر بچے کو دو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ کہتے ہیں نا انگریز۔ این اپیل اسے ڈے۔ کیپس دی ڈاکٹر آوے، کیا سمجھ ایللی۔ اچھا تم آؤ گے تو تمہیں سمجھا دیں گے۔“

ریفقال آتی تو علی احمد اسے روک لیتے ”ریفقال ٹھہر تو سی۔ تو تو بام آباد کا سکندر اعظم معلوم ہوتی ہے۔ آندھی کی طرح آتی ہے، گبولے کی طرح چلی جاتی ہے۔ اس طرح بھاگے دوڑنے سے فائدہ اور پھر بام آباد میں یہ کوئی جگہ ہے کیا بالکل فضول بے کار، یہاں تو اچھا خاصا آدمی بیمار پڑ جاتا ہے۔ اب دیکھو اندر نخا بیمار پڑا ہے۔ میری اپنی صحت تباہ ہو چکی ہے۔ تم بھی تو زرد پڑ رہی ہوں۔ کیوں“ ریفقال آنکھیں جھکائے مسکرائے جاتی۔ اچھا تو سکندر اعظم اب کی گرمیوں میں ہم تمہیں کشمیر لے چلیں گے۔ تم بھی اور نخا بھی وہاں جا کر یوں سرخ ہو جاؤ گے۔ جیسے جیسے —

کور کی آمد پر وہ قہقہہ مار کر صحن سے اٹھ بیٹھے ”آئیے ماراج لو بھی یہ راجپوتانے کے شہدہ سا نہی بھی آگئے۔ تم چاہے جا کر ساری عمر کشمیر رہو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔“ اور کور بات سن کر ہنسنے کی رسی کی چابک بالیتی اور اسے گھمانے لگتی۔ علی احمد ہنسنے لگتے۔

اوسر کور اور علی احمد کے درمیان ہنگامہ شروع ہوتا اوسر ساتھ والے کمرے میں ننھے کی حالت بد سے بدتر ہوئی جاتی۔ ننھے پر ہاجرہ کا سر جھکا ہوتا۔ گالوں پر آنسو رواں ہوتے اور چارپائی کے پاس ریفقال چپ چاپ کھڑی ہوتی۔ اس پر ایللی نرس کو بلانے کے لئے بھاگتا۔

نرس کو گھر آنا دیکھ کر ٹین کا سپاہی چونکتا اور اپنی رزم گاہ کو چھوڑ کر نکل آتا پھر دفعتاً ”یہ محسوس کر کے کہ اس نے قیص نہیں پسنی ہوئی علی احمد لپک کر اندر داخل ہوتے اور قیص پن کر نرس کے روبرو آکھڑے ہوتے۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ وہ کہتے ”خیریت تو ہے کیا بچے کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے کہ آپ تشریف لائی ہیں۔ آپ کے آنے پر ہر شخص کا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ نرس۔“ وہ مسکراتے۔

دفعتاً ”انہیں خیال آتا۔ کہتے“ اگر آپ برا نہ مائیں نرس تو پوچھوں کیا آپ کشمیر کی رہنے والی ہیں۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہی ہی ہی۔“

ان کی باتیں سن کر ہاجرہ اندر ننھے کو گود میں لئے بیٹھی آنسو بہائے جاتی اور ریفقال اسے سمجھاتی تسلی دیتی۔ ایللی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہاجرہ روتی کیوں تھی۔ وہ کیوں توقع کرتی تھی کہ علی احمد اس کے بچے میں دلچسپی لیں۔

دلچسپی تو وہ لیتے تھے۔ اکثر آکر دیکھتے بھی ”گھبراؤ نہیں۔“ مسکرا کر کہتے ”ٹھیک ہو جائے گا۔ گرمیوں میں اسے کشمیر لے چلیں گے۔“ لیکن ہاجرہ چاہتی تھی کہ نوکرانی کے بچے کی بیماری کی وجہ سے آقا اپنی زندگی حرام کر لیں۔ نرس سے باتیں نہ کریں۔ کور سے کشتی نہ لڑیں۔ یہ سوچ کر ایللی کو آقا پر نہیں بلکہ نوکرانی پر غصہ آتا تھا۔

پھر ایک روز علی احمد کو ایک ضروری خط موصول ہوا۔ خط پڑھتے ہی وہ اٹھ بیٹھے اور جلدی سے تیاری کرنے لگے۔ پھر وہ ہاجرہ کے کمرے کے دروازہ پر آکھڑے ہوئے۔ ہاجرہ اور سب عورتیں بچے کے اوپر جھکی ہوئی تھیں۔

”کیا حال ہے؟“ وہ بولے۔ ”واہ تم تو ویسے ہی گھبرا جاتی ہو فضول۔ آخر بیماری جاتے جاتے ہی جائے گی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں بچے بیمار ہوا ہی کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اچھا تو میں دو دن کے لئے سرکاری کام پر جا رہا ہوں۔ گھبراتا نہیں دو روز کے بعد آجاؤں گا ہاں ہاں — ایللی، ایللی یہ لو۔“ انہوں نے چند پیسے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے ”خرچ کر لینا۔ اچھا بھائی میں جاتا ہوں۔“

ننھے کی حالت خراب ہوتی چلی جا رہی تھی۔ سانس اکھڑ رہا تھا۔ منہ سوچ رہا تھا۔ ہاجرہ کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ ریفقال کے ہونٹوں پر وہی مبسم سی شرارت آسیر نہی تھی۔

کے منہ کا نشان مٹ گیا۔ اب اسے کوئی یاد دلانے والا نہ تھا کہ وہ آسا ہے۔

علی پور جانے کی خبر سن کر ایلی کی توجہ اپنے ساتھیوں کی طرف مبذول ہو گئی اور وہ یوں ہل گیا جیسے کوئی بچہ کھلونا ملنے پر ہل جاتا ہے۔ نویں جماعت کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے علی پور جانے کی خبر اس کے لئے بے حد خوش کن تھی۔

### شہ بالا

علی پور پہنچنے ہی محلے والوں نے ایلی پر سوالوں کی بوچھاڑ کر ڈالی۔

”کیوں ایلی کیا باپ کی شادی پر آئے ہو۔ کیا کتا ہے۔“

”ایلی شہ بالا بنے گا اپنے ابا کا ہے نا“ — ”کیوں میاں تمہاری نظر میں بھی کوئی کشمیر کا

سیب ہے۔ ابھی سے چنناؤ کرلو میاں پھر بچتاؤ گے۔“

”اے ہے ایلی بیٹے سے مذاق کیوں کرتے ہو۔ وہ کیوں بنے شہ بالا کسی کا۔ اس کے تو دو لہما

بننے کے دن آرہے ہیں۔ بھئی اسے دق نہ کرو۔“

”کیوں بھئی اللہ کو ڈولی میں بٹھا کر کب لائے گا۔ ایلی۔“

ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ ویسے وہ کوشش تو کرتا تھا کہ کوئی چٹکیلی بات

کرے لیکن نہ جانے کیوں اسے اس بات پر شرم محسوس ہونے لگتی اور اس کی آواز گلے میں

خنک ہو کر رہ جاتی۔ اس پر عورتیں اسے چھیڑتی۔

”لے لڑکے کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔“

”اے ہے اس کے گلے میں تو آواز خنک ہو گئی۔“

”نہ بیٹے ایلی برا نہ من۔ اس کا کیا ہے علی احمد تو ہے ہی ایسا۔“

”عورتوں کے بغیر اس کا وقت کتنا مشکل ہے۔ مگر بیٹا چاہے کوئی آئے کوئی جائے گھر کا مالک

تو ہی ہے اور گھر کی مالک تیری ماں باجرہ۔“

”ان آنے جانے والیوں کو کون پوچھتا ہے ماں۔“

ادھر علی احمد کے گرد لوگوں نے حلقہ باندھ رکھا تھا۔ ”کیوں علی احمد نہ رہ سکا تو بنی شادی

کے بغیر شرم نہیں آتی علی احمد۔ یہ کیا تیرے دو لہما بننے کا وقت ہے۔ گھر بیٹی جوان ہو چکی ہے۔

لڑکا دسویں پاس کر چکا ہے۔“ ”علی احمد کوئی کشمیر کا سیب ہمیں بھی لا دو۔“

فرحت چپ چاپ بیٹھی ابا کو جاتے ہوئے حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور علی احمد بڑے اطمینان سے انہیں الوداع کہتے ہوئے تسلی دے رہے تھے ”کوئی بات نہیں میں جلد آجاؤں گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

آٹھ دن کے بعد علی احمد لوٹے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی چلانے لگے۔ ”ایلی کی ماں تمہیں مبارک ہو۔ اب تم تھانہ رہو گی۔ تمہارا ایک ساتھی گھر میں آجائے گا۔“

”ہائیں تم اس قدر خاموش کیوں ہو۔“ انہوں نے گھر پر چھائی ہوئی خاموشی کو محسوس کر کے کہا اور پھر جیسے یک دم کچھ یاد آجائے پر بولے۔

”ہاں ننھے کا کیا حال ہے؟“

باجرہ کے منہ سے ایک دہی ہوئی چیخ سن کر وہ گھبرا گئے۔

”اوہ۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں مجھے تار دے دیا ہوتا کوئی آدمی بھیج دیا ہوتا۔ ت ت ت

ت۔ کتنا پیارا بچہ تھا۔ بے حد افسوس ہے۔“ انہوں نے آہ بھری۔ ”مگر اللہ کے کاموں میں کس

کو دخل ہو سکتا ہے۔ صبر کے سوا چارہ نہیں اس طرح رونے سے کیا ہوتا ہے۔ رونا دکھونا بے کار

ہے۔ بالکل بیکار قسمت میں یونہی لکھا تھا۔“ قسمت! باجرہ نے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا اور

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس شام علی احمد صحن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے ”وہ اپنی استثنیٰ شام کوٹ کی ہے نا۔ تم

جانتی ہو نا۔ نہیں جانتی۔ ہاں ایلی جانتا ہے، کیوں ایلی جب تم میرے ساتھ دورے پر گئے تھے اور

اس نے تمہیں مٹھائی کھلائی تھی یاد ہے نا۔ اس کی لڑکی ہے۔ سولہ سال کی عمر ہو گی۔ کشمیر میں

پرورش پائی ہے۔ رنگ اتار سا ہے۔ آخر کیوں نہ ہو۔ جس نے اناج کی جگہ پھلوں پر پرورش پائی

ہو۔ اس کا رنگ اتار سا کیوں نہ ہو گا۔ ساری بات طے ہو گئی ہے تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ میں

نے سوچا تھا۔ ایلی کی ماں اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ کوئی تو ساتھی ہونا چاہئے۔ لو بس

اب تیار ہو جاؤ۔ ایلی کی ماں۔ ہم سب علی پور جا رہے ہیں۔ ایلی کی دادی نے بلایا ہے۔ سارا

انتظام تمہیں کو کرنا ہو گا ایلی کی ماں۔ تمہارے سوا گھر میں اور کون ہے۔ ہی ہی ہی“ وہ ہنسنے

لگے۔

باجرہ کی آنکھیں بالکل ہی پتھرا گئیں۔ رقیق مسکراتے لگی اور ایلی علی پور جانے کی خوشی

میں ناچنے لگا۔ ایلی کو بھائی کی موت پر چنداں غم نہ ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اچھا ہی ہوا کہ نوکرانی

لیکن علی احمد کے حلق میں آواز خشک نہ ہوتی تھی نہ ان کا چہرہ زور پڑتا اور نہ ہی ان کی زبان لڑکھڑاتی اور وہ سب کو کوئی نہ کوئی جواب دے کر خاموش کر دیتے۔ واروغہ سے کہتے بھلا واروغہ کشمیر کے سیب لانے کی چیزیں نہیں۔ یعنی وہ تو ڈال سے توڑ کر کھانے کی چیز ہے۔ اسے ہے تو ہاتھ بڑھاؤ۔“

جانوں مائی سے کہتے ”لومائی اللہ نہ کرے میں کیوں رہوں شادی کے بغیر مرد ہوں میں اور وہ بھی تیرا بیٹا۔“

پھر جیواں آکر چلائی۔ ”علی احمد تیرے تو بال بھی سفید ہو گئے۔“  
 ”ہاں مائی۔“ وہ جواب دیتے ”دل سفید نہیں ہوا۔ ابھی ایمان کی روشنی سے منور ہے اور اللہ رسول کی سنت کا لحاظ ہے۔“

”اے ہے۔ علی احمد۔“ جیواں ہنس کر دو تہتر مارتی ”تو تو بھانڈ ہی رہے گا۔ ساری عمر۔“ اور علی احمد ہنسنے اور جیواں چلائی اور ان کا گھر قہقہوں سے گونجنے لگتا۔ اس وقت ایللی کو علی احمد سے عقیدت سی محسوس ہونے لگتی۔ ان کی باتیں سن کر وہ ان کے تمام قصور بخش دیتا۔ اس کا مئی چاہتا کہ وہ بھی علی احمد کی طرح باتیں کر سکے لیکن بات کرتے وقت اس کی زبان انک جاتی تھی۔ گلہ بیٹھ جاتا۔ دل کو کچھ کچھ ہونے لگتا تھا اور اس کا مئی چاہتا تھا کہ بھاگ جائے دور جہاں کوئی نہ ہو۔ کوئی نہ ہو۔

علی پور پہنچ کر پہلے تو ہاجرہ بہت روئی تھی رو رو کر اس نے برا حال کر لیا۔ وہ ننھے کی ہانڈ کرتے ہوئے آنسو بہاتی رہتی۔ ”اور پھر ایسا سمجھدار اور متحمل مزاج۔ رونا تو جانتا ہی نہ تھا۔ ہائے اتنی تکلیف وہ بیماری لگی اسے کہ توبہ ہے۔ زہر یاد کوئی معمولی بیماری نہیں بہن۔ لیکن اگر بچہ نے آف تک نہ کی۔ رویا ہی نہیں۔ بس حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا کہ کمال آیا جہاں میری کسی کو قدر نہیں۔ جہاں کسی کو میرے دکھ کی خبر نہیں۔“

ہاجرہ کے آنسو از سر نو ٹپکنے لگتے اور وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو جاتی۔ ”بیماری میں اس کا مسکراتا نہ گیا۔ یوں مسکراتا۔ جیسے سیانے لوگ مسکراتے ہیں۔ میں روئی تھی اور وہ مسکراتا۔ بیماری نے اسے ذرا بھی ہمت نہ دی۔“ ہاجرہ وہ رو رو کر بچے کی باتیں کرتی رہتی اور اسے آنسو پونچھتی رہتی۔

ہاجرہ بار بار علی احمد کے بے حسی کا قصہ بیان کرتی رہی۔ ”انہیں اپنے شغل سے کام۔“

مرے یا جئے ان کی بلا ہے۔ انہیں تو کشمیری سیب کا عشق لگا تھا۔ کہتے تھے۔ کشمیری پھلوں پر پلے ہے۔ دسویں پاس ہے۔ انگریزی فر فر بوتی ہے۔ اچھا ہے بہن ہم بھی اس سے اٹھنا بیٹھنا۔ چلنا پھرنا بات کرنا سیکھیں گے۔ مجھے تو خوشی ہے بہن کہ گھر میں میم آئے گی۔ سچ کہتی ہوں۔ میرا خدا شاہد ہے۔ بہن مجھے گلے کی قسم مجھے کوئی دکھ نہیں۔ بس یہی دکھ ہے کہ ننھا تڑپ تڑپ کر مر رہا تھا اور میاں کو کشمیری سیب کی دھن لگی تھی۔ دو پیسے کی دوا تک نہ منگوائی۔ زس دیکھنے آتی تھی تو اس سے ٹھنڈے کئے جاتے تھے توبہ ہے۔ گھر میں کوئی دم توڑ رہا ہو اور لوگ اپنی حرص و ہوس میں کھوئے ہوئے ہوں۔ کیا زمانہ آیا ہے۔ مجھے سو کن کا دکھ تو نہیں۔ اس ننھے پھول سے بچے کا دکھ ہے۔“ اور وہ از سر نو رونے لگتی۔ اس وقت ایللی کو محسوس ہوتا کہ ہاجرہ بچے کا نام لے کر نہ جانے کس دکھ کی وجہ سے رو رہی ہے۔ سو کن کا دکھ نہ تھا تو وہ اتنی قسمیں کیوں کھاتی تھی۔ کلمہ کیوں پڑھتی تھی۔

پہلے تو ہاجرہ ننھے کے لئے روتی رہی اور علی احمد کی بے وفائی کا گلہ کر کے آنسو بہاتی رہی پھر دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ لوگ یہ نہ سمجھ رہے ہوں کہ وہ سو کن کی آمد کی وجہ سے رو رہی ہے اور بیٹے کے بہانے اپنے لئے ہوئے سہاگ پر آنسو بہا رہی ہے۔ ہاجرہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی۔

یہ نہیں کہ لوگ اس کی قوت برداشت کا مذاق اڑائیں۔ اس پر خاوند پسندی کا جرم عائد کریں۔ اس لئے وہ خاموش ہو گئی اور اٹھ کر علی احمد کے بیاہ کی تیاری میں لگ گئی اور یوں شوق سے انتظامات کرنے لگی، جیسے خاوند کی بجائے اس کے بیٹے کی شادی ہو رہی تھی۔ انتظامات پر وہ بات بات پر اعتراض کرتی ”نہیں نہیں یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں دولہن کو یہ پہننے نہ دوں گی۔ دولہن کیا کہے گی۔ سرال والے کیا سمجھیں گے۔ اور یہ زیور تو اب پرانا ہو گیا ہے۔ دولہن کے لئے نئی طرز کی چیز ہونی چاہئے۔“

اہل کے اس انہماک اور شوق کو دیکھ کر ایللی حیران ہوتا تھا۔ لوگ حیران ہوتے تھے اور حیرانی کا اظہار بھی کرتے تھے۔ ”ہاجرہ تم کیوں جان مار رہی ہو۔ لو خواہ مخواہ۔ چھوڑو کرنے دو آپ ہی اسے۔ تمہیں کیا پڑی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہونا چاہئے انسان کو۔“

یہ سن کر ہاجرہ کی آنکھ میں چمک سی لہرائی۔ ”اے ہے بہن اس میں کیا ہے۔ سو کن آئی ہے توبہ شک آئے۔ اپنے اپنے نصیب ہیں۔ جو اللہ نے نصیب میں لکھ دیا ہم اللہ۔“

اور چھ سو چھپیس یہ ہوئے کل —

دولہن

دولہن کی آمد پر محلے میں ایک شور مچ گیا۔ چاروں طرف سے عورتوں نے علی احمد کے گھر کی طرف یورش کر دی۔

”آؤ بہن دولہن کو دیکھ آئیں۔“

”دولہن آگئی کیا؟“

”ابھی آئی ہے ابھی۔“

”ہائے میرا دل پہنچ گیا ہے؟“

”کتے ہیں کشمیر میں بلی ہے۔“

”سنا ہے وہ تو انگریزی فر فر بولتی ہے۔“ اور وہ دوپٹے سنبھل کر علی احمد کے گھر کی طرف چل پڑیں۔

دولہن کی آمد کی خبر سن کر ایللی نے جھرجھری لی۔ اس کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی اور وہ چپ چاپ کھڑے کا کھڑا رہ گیا نہ جانے کیوں وہ گھر جانے سے ڈرتا تھا۔

”اے ہے تو یہاں کھڑا ہے۔ ایللی۔“ وہ اسے سہا ہوا کھڑا دیکھ کر بولیں ”اور تمہارے گھر میں اللہ کے فضل سے نئی دولہن آئی ہے۔“

دوسری بولی بن اللہ کے فضل سے کیوں کہو۔ یوں کہو کہ علی احمد کے شوق کی وجہ سے۔“ پہلی بولی: ”اب جو آگئی ہے تو اس پر اللہ کا فضل ہو۔ خوشیاں دیکھے۔“

ایللی حیرانی سے ان کی باتیں سنتا تھا۔ عجیب باتیں تھیں ان کی۔ وہ علی احمد پر غصے سے بل کھاتیں اور ساتھ ہی ان کی رنگیں مزاحی کی وجہ سے ان کی جانب کھینچی جاتیں۔ ہاجرہ سے ہمدردی کا اظہار کرتیں اور ساتھ ہی اسے مورد الزام بھی سمجھتیں۔ کتنی عجیب بات تھی۔

دولہن کو دیکھتے سارا محلہ علی احمد کے گھر اکٹھا ہو رہا تھا مگر ایللی محسوس کرتا تھا جیسے اسے گھر میں جانا چاہئے۔ اس میں گھر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی، لیکن آخر اسے گھر جانا ہی پڑا اور وہ چپکے سے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ بڑے کمرے میں عورتوں کے جھوم کے درمیان پٹنگ پر ایک سرخ رنگ کی ٹنڈی سی لپٹی پڑی تھی دو تاملیدہ ہاتھ لگ رہے تھے۔ کتنی رنگدار مندی تھی

اس پر لوگ اس کی طرف عجیب نگاہوں سے دیکھتے۔ حیرانی شکوک میں بدل جاتی اور وہ سوچتے ضرور اس میں کوئی بھید ہے۔ ایللی بھی ان شکوک کو شدت سے محسوس کرتا اور اسے دل پر غصہ آتا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ غصہ کیوں محسوس کر رہا ہے اور اس کے اپنے دل میں شکوک کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ اس گھر کی تمام تر باتیں ہی عجیب تھیں۔ صرف ایک داوی الماں تھیں جو گھر کی الجھنوں سے دور بیٹھ کر مسکراتی رہتی تھیں۔

ایللی کو صرف داوی الماں پر بھروسہ تھا جو کسی بات میں دخل نہ دیتی تھی اور کھری کھری بنا دیتی تھی۔ ”علی احمد رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔“ اس نے علی احمد کی شادی کے متعلق صرف یہی ایک جملہ کہا تھا اور پھر خاموش ہو کر جائے نماز پر جا بیٹھی۔

گھر کے باقی تمام لوگ عجیب تھے۔ ابا اپنی دھن میں کھوئے ہوئے تھے۔ الماں یوں نکلے کی حاجن بنی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہو۔ صرف دو پردوں کی کسر تھی اور سیدہ۔ کیسی چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔ مسکراتی بھی تو ہونٹوں کے کونوں سے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔

گھر کی ان الجھنوں سے آٹا کر ایللی باہر نکل جاتا اور محلے کے لڑکوں کو بلا کر سب کچھ بھول جاتا یا تو وہ ارجمند کے چوہارے میں جا کر کھڑکی کی درز سے کوراڑو دیکھتا رہتا یا محلے کے کونوں کے پاس کھڑے ہو کر انگریزی لہجوں کو آزماتا یا جمیل کے ساتھ جا کر تنگ گلی میں بیڑے کھاتا یا رضا کی دوکان پر بیٹھ کر اس کی اناپے شنبابتوں پر ہنستا یا بلا کے ہاں جا کر گراموفون سنتا اور یا محلے کے سب لڑکوں کو اکٹھا کر کے میدان میں گیند بیٹ کھیلنے میں مصروف ہو جاتا۔ ان مصروفیتوں میں دن بیت جاتا اور شام پڑ جاتی اور پھر داوی الماں کی آواز محلے میں گونجتی۔ ”ایللی اب تو آئے گا کہ نہیں سارا دن لنڈوروں کی طرح پھرتا ہے۔ آ اب رات ہو گئی۔ ایللی۔“ پھر وہ چپکے سے دبے پاؤں بیڑھیاں چڑھتا اور داوی الماں اسے دیکھ کر غصے سے چیختی اور وہ بے خوف آگے بڑھ کر اس کے کندھوں پر چڑھ جاتا اور وہ ہنس پڑتی اور پھر وہ دونوں ایک چارپائی پر سو جاتے اور داوی الماں اسے تھپکتی۔ ”سو جا اب لنڈور کہیں گا۔“ اس وقت ابا لپ کی روشنی میں مہاجنوں کی طرح حساب ملانے میں مصروف ہوتے۔ دو اور تین پانچ، آٹھ۔ تیرہ یہ ہوئے دو سو تیرہ اور ہاجرہ چیزیں دیکھتے ہوئے بڑ بڑاتی ”لو یہ قیص کا کپڑا تو بالکل بے کار ہے۔ دولہن کیا کہے گی۔“ اور علی احمد چلاتے ”تو تو پاگل ہو گئی ہے۔ اٹھارہ روپے گز کا ہے۔ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ دو سو تیرہ

”مسکرا کر کہتی ”علی احمد پہلے تو ہمیشہ مٹی پر گرا کرتا تھا۔ اب کی بار توجیت گیا ہے۔“  
 ”ہند ہے تمہیں چاچی؟“  
 ”اچھی ہے۔ اپنی لڑکیوں کی طرح ہی ہے۔ بیچاری، ناک نقشہ برا نہیں رنگ سفید ہے۔  
 آنکھیں کالی تو ہیں پر ذرا کھلی کھلی ہیں۔ ہر حال ناک نقشہ برا نہیں۔“  
 ”تیرے ناک نقشے کی طرح ہے کیا۔“ علی احمد نے مسکرا کر پوچھا۔  
 ”چل دفعہ ہو منہ کالا۔“

”کیوں چاچی میں کیا بات کہتا ہوں۔“ چاچی نے جاری تھی۔  
 کھانے سے فارغ ہو کر اہلی پھر دولہن کے کمرے میں جا داخل ہوا اور چوری چوری اسے  
 دیکھنے لگا۔ سفید جسم سے چارپائی بھری ہوئی تھی۔ اسے سفید رنگ بہت پیارا لگتا تھا اور ان جانے  
 میں وہ بھرے جسم کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ عورتیں ایک ایک کر کے چلی گئیں۔ پھر وہ  
 دولہن کے پاس جا بیٹھا۔ دفعتاً دوپٹے میں حرکت ہوئی اور ایک بڑا سا سفید منہ نکلا ہو گیا اور وہ  
 چوری چوری اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہائیں۔“ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی امیدوں کے عالی شان محل کو پاؤں کی  
 ٹھوکر سے چور چور کر دیا ہو۔ دولہن کی آنکھوں میں فرق تھا اور اس کا چہرہ خالی ورق کی طرح  
 سرا سر کور تھا۔ اہلی نے محسوس کیا جیسے اسے دھوکا دیا گیا ہو۔ جیسے اس کی توقعات کو ٹھکرایا گیا ہو  
 اسے جان بوجھ کر غلط فہمی میں مبتلا رکھنے سے علی احمد کا کوئی خاص مقصد ہو گا۔ غصے سے اس کی  
 کنپٹیاں جتنے لگتیں اور وہ بھاگا۔ دور دور دولہن سے دور اس جیتے دھوکے سے دور باہر  
 صحن میں پہنچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ کئی دن تو اس صدمہ کی وجہ سے وہ سخت  
 اواس رہا پھر اس نے اپنے آپ کو محلے کی زندگی میں کھو دیا تاکہ گھر کے واقعات کو دل سے بھلا کر  
 اپنی خوشی کو محفوظ کر سکے۔

### نماز کیلٹی

اس زمانے میں علی پور میں خلافت تحریک کے تحت نماز کیلٹیوں کا دور دورہ تھا۔ مسلمانوں  
 میں اسلام کے متعلق بڑا جوش تھا ہر محلے میں نماز کیلٹیاں قائم ہو رہی تھیں۔ نوجوان لڑکے علی  
 الصبح منہ اندھیرے جاگ پڑتے اور سردی میں ٹھہرتے ہوئے ایک دوسرے کو جگاتے۔ پھر

نہ جانے مونگیا فیض کی وجہ سے وہ اور بھی سرخ دکھائی دے رہی تھی یا شاید اس لئے کہ  
 بہت سفید تھے۔ اہلی نے نفرت بھری جھرجھری محسوس کی اور منہ موڑ لیا۔  
 لودھو عورتوں نے اسے دیکھ کر شور مچایا ”اہلی یہاں آ۔ اپنی امی کو سلام کر آکر۔“  
 ”سلام جی۔“ اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور پھر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔  
 ”بھگے ہے لڑکا سلام کہتا ہے۔ اسے پیار تو کر لے دولہن۔“  
 ”اللہ رکھے تیرا بیٹا ہے۔“

”پلا پلایا بیٹا مل گیا تجھے یہ بھی کسی کسی کے نصیب میں ہوتا ہے۔“  
 مونگیا چادر تلے سے حنائی ہاتھ اہلی کی طرف بڑھا۔ اس نے سر جھکا دیا اور منہ مڑا  
 سانس بند کر کے کھڑا ہو گیا تاکہ اسے حنا کا رنگ دکھائی نہ دے۔ بونہ آئے۔ سر تھپکنے کے  
 وہ حنائی ہاتھ اس کے منہ پر آنکا۔ مندی کی بو کا ایک طوفان اٹھ آیا۔ اس کی آنکھوں میں  
 ڈورے دوڑ گئے۔ نہ جانے اس بو میں کیا تھا۔ اہلی کے جسم کا بند بند ٹوٹنے لگتا تھا۔ تار تار  
 لگتے گھبرا کر اس نے اپنا آپ چھڑا لیا اور صحن کی طرف بھاگا۔  
 ”شرماتا ہے۔“ مٹی جیواں چلائی۔ ”بڑا شرمیلا لڑکا ہے۔“

دوسری بولی ”ایسا اچھا بیٹا ملا ہے تجھے۔“  
 اہلی دادی اہل کے تخت تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا دل مالتا رہا تھا۔ سر گھوم رہا تھا اور  
 سب ہنس رہی تھیں۔

”دیکھ آیا اہل کو۔“ دادی اہل نے کہا ”بیٹھ جا۔“ دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔  
 ”میں نے تیرے لئے کچھ رکھا ہوا ہے۔ وہاں مٹی کی ہڈیاں ہیں۔“ دادی اہل اس کے  
 پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

دوسرے کمرے میں علی احمد مضطربانہ طور پر ٹہل رہے تھے۔ بار بار وہ باہر نکلتے ”مائی چ  
 تجھ پر تو پھر سے جوانی آرہی ہے۔ ہلدی کا برتن کھاتی ہے کیا؟“  
 ”شرم کر علی احمد۔“ مائی جیواں ہنستی۔ ”شرم کر“ لیکن اس کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے  
 اس کی بے شرمی پر بے حد مسرور ہو۔

چاچی حاجاں چلائی ”لے آگیا تیرا کشمیر کا سبب۔ تجھے مبارک ہو علی احمد۔“  
 ”کیوں چاچی؟“ وہ جواب میں پوچھتے ”خسارے کا سودا تو نہیں کیا ہم نے۔“



سے لے لے کر کھڑکیوں منڈیوں اور چٹوں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے اور ساتھ ہی ٹولی کو ہدایات دیتے رہتے۔ درپچوں سے ہمیں آوازیں سنائی دیتیں۔ ”اگر دیکھو تو نماز کمیٹی والے ہیں۔ دیکھ تو۔“

### مسجد کے زیرِ سایہ

دوپہر کے وقت وہ ارجمند کے یہاں چلا جاتا اور وہ دونوں ”اگر اینڈی مایاؤں“ کے تمام مسلمان سے لیس ہو کر کنوئیں کے قریب جا کھڑے ہوتے اور ہر آتی جاتی لڑکی پر اگر اینڈی چلائے۔ ارجمند ریشمیں رومال لہراتا۔ اس کے ہونٹ بانسری پر رکھے ہوتے لیکن بانسری بجانے کی بجائے وہ کچھ اور ہی ظاہر کرتے اور وہ دبی زبان سے کتا ”اف! غضب ہے۔ قیامت ہے۔ اب لڑکچن چھوڑ دے ظالم شایب آنے کو ہے۔“

ان دنوں کو وہاں کھڑا دیکھ کر کنوئیں کے پاس والے مکان سے برتن بجنے کی آوازیں آنا شروع ہو جاتیں پھر کوئی قہقہہ مار کر ہنستی اور با آواز بلند کسی کو پکارتی ”عائش! آئے گی بھی یا نہیں۔ ہی ہی ہی۔“ اس کے قہقہے سن کر ایللی کو علی احمد کا کمرہ یاد آ جاتا اور وہ سوچنے لگتا ”کیا ہر مکان میں علی احمد کا کمرہ ہوتا ہے، کیا ہر بند دروازے کے پیچھے ٹین کے سپاہی چھپے ہوتے ہیں۔“

پھر دفعتاً ”ٹاٹ کا پردہ ہلتا اور ایک بصرے جسم کی لڑکی سامنے آکھڑی ہوتی۔ ارجمند کا رومال ہلتا بانسری فٹیں کرتی۔ آنکھیں چمک چمک کر دیکھتیں۔ بازو بغل گیر ہونے کے اشارے کرتے۔ اس وقت ایللی کے ماتھے پر پسینہ آ جاتا۔ آنکھیں جھک جاتیں۔ دل دھک دھک کرنے لگتا۔ کوئی آنکھلا تو وہ اس انداز سے ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ جیسے کسی اور کام میں مصروف ہو۔ جیسے اسے ارجمند سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے وہ راہ چلتے چلتے ٹوک گیا ہو۔ اور ٹاٹ کے پردے سے مسکراتی ہوئی نوجوان لڑکی کی موجودگی کا اسے قطعی علم نہ ہو جیسے وہ اگر اینڈی مایاؤں کے عمل سے قطعی عواقف ہو۔

ادھر ارجمند کا ریشمیں رومال اس کی گردن پر اُگرتا بانسری کا زاویہ بدل اور وہ یوں آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔ جیسے اللہ سے لو لگا کر اس کی حمد و ثناء میں کوئی دھن بجا رہا ہو۔ اس کے باوجود آتے جاتے شکوک بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتے اور پھر مسکرا کر آگے نکل

جلوس کی شکل میں شرکاک چکر لگاتے۔ محلے محلے پھرتے اور گاگا کر لوگوں کو جگاتے۔ نماز پڑھنے، تلقین کرتے۔ لڑکوں کو نماز پڑھنے سے اس قدر دلچسپی نہ تھی۔ البتہ اکٹھے ہو کر گاتے ہوئے ہر جگہ جاتا۔ مجاہدانہ انداز سے گھومنا اور مجاہدانہ شن سے لکار لکار کر گانا یا غازی مصطفیٰ پاشا کمال! شن میں قصیدے پڑھنا اور امان اللہ خان کے گن گانا اور علی برادران کو سراہنا۔ ایللی کو شغل بے حد پسند آیا۔ کیوں نہ پسند آتا محلے کے جوان اس بات میں شان امتیاز سمجھتے تھے۔ جہر وہ باہر نکلتے تو ان کا انداز عجیب ہوتا جیسے ہیرو ہوں۔ جیسے مصطفیٰ پاشا کا گیت گانے والے نو مصطفیٰ کمال ہوں۔ جنہوں نے زمانے کی نگاہوں سے بچنے کے لیے بھیس بدل رکھا ہو۔ اگر شغل میں بھی شریک ہوتے تھے۔ رفتی، اعظم، غلام علی، ضیاء اور صفدر لیکن صفدر اور غلام علی کی حیثیت صرف منتظمین کی سی تھی۔ وہ صبح جاگتے لال دینوں کا انتظام کرتے۔ انہیں جانا پھر نعمتوں کی کاپیاں نکال کر گیتوں کی دھنیں قائم کرتے اور بالا خرچھوٹے لڑکوں کو گلے کا سوپ کر خود سگریٹ سگاکر جلوس کے ساتھ چل پڑتے۔

بڑے لڑکوں میں صرف اعظم تھا جو انتظامات کرنے کے علاوہ گلے میں بھی پیش پیش ہوتا تھا۔ ایللی اعظم کو دیکھ کر فخر سے پھولے نہ سہا۔ اس کالے، گلے کا انداز، گردن اٹھا کر چلنے کا عادت اور گاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے کا انداز ایللی کو بے حد جاذب معلوم ہوتے تھے۔ اس کے گلے میں یا کندھوں پر ایک شان بے نیازی سے رومال پڑا ہوتا تھا۔ جس پر کبیل بڑی شان سے نکلتا اور پھر گاتے ہوئے اس کی گردن کا زاویہ کس قدر خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ایللی کا خیال تھا کہ وہ بھی اعظم کی طرح بے نیازی سے چلے اور شان استغنیٰ سے گلے اور اس کا کبیل دھپے ہی لٹکے۔ لیکن سردی کی وجہ سے وہ کبیل میں ٹھسٹا ہوا چلتا اور گاتے ہوئے اس کی گردن پھول جاتی اور آواز چیختی اور کنپٹیاں درد کرنے لگتیں۔ ایللی کی آواز تو بہت بلند تھی لیکن اس گلے میں بیٹھاس نہ تھی۔ عام طور پر وہ آواز بہت اونچی نکالتا اور ابتدا ہی میں ایسی سر قائم کر لے جسے بھٹانا مشکل ہو جاتا۔ پھر وہ سب اصرار کر کے اسے گلے والوں کے گروپ کا سردار بنا دیتے یہ بہت بڑا امتیاز تھا۔ اسی امتیاز کی وجہ سے وہ بہت سویرے جاگ اٹھتا اور باہر نکل جاتا کہ کمیٹی کے لئے لیٹ نہ ہو جائے۔

علی پور میں جب وہ جلوس کی صورت میں چلتے تو بند کھڑکیاں کھل جاتیں۔ چھتوں سے آلود چہرے جھانکتے، منڈیوں سے انگریزائی لیتے ہوئے بازو دکھائی دیتے، بڑے لڑکے سگریٹ

دبے پاؤں چلتی جیسے پاؤں کی آہٹ ان کی دشمن ہو۔ بچی نگاہوں سے دیکھتیں۔ بند ہونٹوں سے مسکراتیں اور یوں آہستہ بولتیں جیسے وہ لڑکیاں نہیں بلکہ چلتے پھرتے سائے ہوں اور پھر منڈی میں ہر آہٹ پر بوڑھیوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔

”ہون ہے۔ اے ہے شریفوں کے بیٹے بھی اب بانسریاں بجانے لگے۔ میرائی بن گئے۔ کیا توبہ ہے کیا زائد آیا ہے۔“

”ریشی رومل لہراتے ہوئے شرم نہیں آتی کیا۔“ چاروں طرف سے بوڑھیاں کھڑکیوں میں آجھ ہوتیں۔ ”یہ ذرا دیکھنا مل برکتے۔ چاچی حاجیل ذرا آؤ تو۔“

سارے محلے میں انگریزی مایاؤں کے لئے صرف دو مناسب مقامات تھے ایک تو کونوئیں کے پاس مسجد کے قریب جہاں بڑی ڈیوڑھی تھی اور دوسرے پرانی حویلی کے میدان میں بڑی لائٹین کے نیچے۔

### کپ اور کیپ

جب وہ دونوں لائٹین کے نیچے کھڑے ہوتے اور ارجمند بانسری کی سروں کو چھینتا تو دفعتاً عصمت اللہ کے مکان کی کھڑکی کی جتن کو حرکت ہوتی جسے دیکھ کر ارجمند زیر لب کہتا ”وہ مارا دیکھا۔ جلد وہ جو سر چڑھ کر بولے۔“ پھر وہ جتن کی طرف دیکھ کر آنکھیں چمکاتا اور ایللی سے مخاطب ہو کر کہتا ”دیکھا ادھر بین بچا ادھر سانپ ناچنے لگا۔ اسے کہتے ہیں انگریزی مایاؤں۔“

ارجمند کی باتیں سن کر ایللی فخر محسوس کرتا کیونکہ ارجمند کی فتح اس کی اپنی فتح تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سانپ کون ہے۔ کہہ رہا ہے اور اس کے ناچنے کا مطلب کیا ہے۔ جتن کی طرف تو وہ بھی دیکھتا تھا۔ مگر اتنی دور سے جتن کے پیچھے اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا پھر وہ دوسری جانب دیکھنے لگتا شاید سانپ ادھر ناچ رہا ہو۔

اسے یوں کھوئے ہوئے دیکھ کر ارجمند چلاتا ”نہیں یار۔ کیپ کیپ سمجھ کیپ کھڑکی میں آ بیٹھی ہے وہ ملی جتن“ وہ اب دیکھا۔ اف یار کس غضب کی چیز ہے بس سمجھ لو بالکل تیار ہے۔ ذرا سی کسر ہے ایک آنچ کی اگر ہماری ڈپنری یہاں علی پور میں ہوتی اور کیپ کسی روز دوا لینے آگئی تو سب ٹھیک ہو جاتا۔ معاملہ صاف ہو جاتا۔ لیکن اب یہاں ڈپنری جو نہیں کیا کیا جائے۔“

جاتے۔ ان کے جانے کے بعد ٹاٹ کے پردے کی اوٹ سے چھپی ہوئی لڑکی کا بازو یا آنکھ پھرے باہر نکل آتی اور ارجمند کا رومل پھر سے لہرانے لگتا۔ ایللی کا دل پھر سے دھڑکنے لگتا اور اس کی پیشانی پھر سے پسینے سے بھجک جاتی۔ اس خطرناک کھیل میں وہ زیادہ دیر مشغول نہ رہ سکتے تھے اس لئے کہ آتے جاتے لوگ انہیں وہاں اس طور کھڑے دیکھ کر گھورتے تھے۔ شاید خطرناک ہونے کی وجہ سے یہ کھیل ان کے لئے بے حد دلچسپ تھا۔ حالانکہ ایللی کو کبھی اتنی مہلت ملی تھی کہ وہ ٹاٹ سے جھانکتے ہوئے چہرے کو نظر بھر کر دیکھ سکے وہ صرف یہی جانتا تھا کہ وہ بڑا سا چہرہ سفید سفید ہے اور وہ بانسریاں غمخیز گوشت سے لبالب بھری ہیں اور وہ آنکھیں بے ہوشی اور شوخ ہیں۔

پھر وہ دونوں کونوئیں کو چھوڑ کر پرانی حویلی کے میدان میں آکھڑے ہوتے۔ اس میدان میں کسی زمانے میں ایک حویلی تھی، جو اب منہدم ہو چکی تھی۔ مشرق کی طرف چند ایک پختہ مکانات تھے۔ شمال کی سمت میں ایک گلی نکل گئی تھی جس میں دور تک کچے مکانات بنے ہوئے تھے۔ گلی آصفی محلے سے تعلق نہ رکھتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ پرانے زمانے میں آصفیوں کا کام کار کرنے والے کیں، یہ گلی انہیں کی تھی اگرچہ اب ان کی مجلسی حیثیت آصفیوں سے کم صورت کم نہ تھی۔

پرانی حویلی کے میدان کے پرے مشرق میں شیخوں کے چند ایک مکانات تھے۔ کونوئیں پاس ایک مکان میں سید آکر آباد ہو گئے تھے اور اس کے قریب چند کشمیری آئے تھے۔ اب آصفی محلہ صرف مغربی حصہ تک محدود تھا۔ وہ پختہ وسیع میدان جسے منڈی کہتے تھے اس مرکزی حصہ تھا۔ آصفی لڑکے عام طور پر اس مرکزی حصے میں کھیلنے سے گھبرایا کرتے تھے۔ کیونکہ وہاں کھیلنے سے انہیں محلے کی عورتوں کی نگاہوں تلے رہنا پڑتا تھا اور وہ بات بات پر اعتراض کرتیں ”اے مائی کا گند اچھالتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ سارا دن ٹپاک چھینے اڑا رہتے ہو۔ چھوڑو اس گندے کھیل کو۔“ گلی میں کھیلنے پر وہ چلاتیں۔ ”کسی کا سر پھوڑ کر اٹھایا کا سانس لو گے تم یہ کیا شریفوں کا کھیل ہے۔“ منڈی میں انگریزی مایاؤں کا کھیل تو بالکل بایا تھا۔ وہاں تو ریشی رومل تک لہرایا نہ جاسکتا تھا۔ بانسری بجانا تو الگ چیز تھی۔ اگر وہاں ریشی رومل لہرایا بھی جاسکتا تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا کیونکہ منڈی کے گرد رہنے والی لڑکیاں کھڑکیوں میں نہیں آسکتی تھیں۔ یا تو ان میں اس قدر جرات نہ تھی اور یا شاید حس ہی نہ تھی

سکول — اور دھاتی بجے ختم ہو گا۔“

اس پر ارجمند چلاتا ”نوٹڈ“ ”نوٹڈ“ اور پھر زیر لب گنگنا ”ڈارنگ ما بدولت تین بجے ڈیوڑھی پر ڈیوٹی دیا کریں گے تاکہ حضور کا باقاعدہ استقبال کیا جائے جو حضور کے شایان شان ہو۔“ اتنے میں کپ کے گھر سے ایک چھوٹی سی لڑکی مسکراتی ہوئی نکل آتی۔

ارجمند چلاتا ”کپ کپ“ مدھ بھری پیالی۔“

وہ خواہ مخواہ شرابی اور مسکاتی اور ان کے پاس سے گزر جاتی۔

”مدھ بھری پیالی۔“ ارجمند با آواز بلند کہتا ”چند سال کے بعد کیا غضب ہو گا۔ کیا قیامت ٹوٹے گی۔ کیا فتنہ بیدار ہو گا۔ اف پیالی پیالہ بن جائے گی۔ پتی پھول بن جائے گی۔ پتی پھول بن جائے گی۔ پتی پھول بن جائے گی کھل کر چن ہو جائے گی کیا سمجھے ایللی۔“

ایللی حیرت سے ارجمند کی طرف دیکھتا۔ ارجمند کی باتیں کس قدر دلفریب تھیں۔ اسے کیسے اچھے فقرے یاد تھے اور وہ اردو کس بے تکلفی سے بولتا تھا۔ ”کاش“ ایللی سوچتا ”میں بھی پانی پت جاتا اور دہلی سے خوبصورت زبان سیکھ آتا اور پھر میں بھی ایسے جملے بول سکتا۔“ لیکن ایللی تو سیدھی سلامی بات کرتے ہوئے بھی جھینپ جاتا تھا پاگوں کی طرح وہ کپ کی طرف دیکھ تو سکتا تھا لیکن بات نہ کر سکتا تھا اور وہ پیالی تھی بھی تو بے حد خوبصورت۔ کس قدر سفید رنگ تھا اور اس پر سرنی جھلکتی تھی۔ ایللی اسے دیکھ کر دم بخود رہ جایا کرتا تھا مگر وہ پیالی بہت ہی چھوٹی تھی اور اس کی سیاہ اور شفاف آنکھیں خوبصورت ہونے کے باوجود ان نگاہوں سے خالی تھیں جو بڑی لڑکیوں کی آنکھوں سے جھلکتی تھیں نہ جانے ان میں کس چیز کی کمی تھی کپ میں مدھ تو بھری تھی اور وہ جھلکتی بھی تھی مگر وہ مدھ اس مدھ سے کس قدر مختلف تھی جو کپ سے چھلکا کرتی تھی۔ حالانکہ کپ رعنائی اور حسن میں کپ کے مقابلے میں بیچ تھی۔

جب کپ لپاتی ہوئی ان کے پاس سے گزرتی تو ارجمند ہنس کے کہتا ”جان من کیا دو سال کے بعد بھی ہمیں یاد رکھو گی بھلا نہ دینا خاکسار کو۔“

کپ کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور ایللی کا دل گویا کھل کر پھول بن جاتا۔

ارجمند کہتا ”چلو بھی اب کوری ڈکوری کی باری ہے۔ دعا کو ساز بڑا نہ ہو۔“ پھر وہ ارجمند کے گھر بند کھڑکیوں کی درزوں سے جھانکتے رہتے۔ لیکن عام طور پر ان کا شوق پورا نہ ہوتا اور سائے کا والان دیران رہتا۔ اگر کبھی کوئی عورت غسل کرنے آتی بھی تو ایللی کی آنکھیں آپ ہی

ایللی محسوس کرتا کہ انگریزی مایاؤں میں ایک ڈھنسی کا ہونا اشد ضروری ہوتا ہے۔ سوچنے پر اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ ڈھنسی اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتی ہے۔ ڈھنسیاں تو طبل میں بھی تھیں۔ جہاں لمبی میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ میزوں پر روٹی کے چھاپے پڑے ہوئے کپوٹر فینچی لئے کھڑا رہتا۔ پھر بڑی بڑی بوتلیں اور وہ عجیب سی بو جسے سو گھنٹے سے انسان بخواہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ بیمار ہے اور وہ ڈاکٹر جس کے ماتھے پر شکنیں پڑی رہتیں۔ ہاتھ میں بڑی ٹوٹیاں لگتیں۔ جو نہایت خشک آواز میں باتیں کرتا تھا۔ اور مریضوں کی بات یوں پروائی سے سنتا تھا۔ جیسے سن ہی نہ رہا ہو۔ ایسی جگہ کے ہونے سے بھلا کیا فائدہ ہو سکتا تھا فائدے سے ارجمند کا مطلب کیا تھا۔

”کپ کپ۔“ ارجمند کی آواز سن کر ایللی پھر چونکا اور کھڑکی کی طرف دیکھتا کھڑکی میں زرد رو لڑکی کا چہرہ دیکھ کر اس کا دل دھڑکنے لگتا اور وہ نگاہیں پھیر لیتا پھر ارجمند کا رومل ہلاتا اس کے بالوں اور گالوں سے مس کرتا ہوا چھاتی پر آگرتا اور ارجمند اسے یوں گلے لگا لیتا جیسے جاندار چیز ہو۔ یہ دیکھ کر کپ مسکراتی اور لوچدار آواز سے پڑوسن کو بلاتی۔ ”سیکنہ“ ”سیکنہ۔“ وہ دونوں اسے کپ کہا کرتے تھے۔ یہ نام ارجمند نے تجویز کیا تھا تاکہ سننے والوں کو ملنا نہ ہو کہ وہ کس کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ ایللی جب چوگن میں لڑکوں کے ساتھ کھڑا ہو ارجمند اس کے پاس آکر بہانے سے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیتا۔ جس سے ایللی کو معلوم ہو جاتا کپ کے متعلق کوئی بات ہے یا کپ کھڑکی میں کھڑی ہے یا وہ چوگن کی طرف آ رہی ہے یا کے سکول سے آنے کا وقت ہو چکا ہے۔

اگر کسی خاص مصروفیت کی وجہ سے ایللی ارجمند کا اشارہ نہ سمجھتا تو ارجمند ٹوپی کے منہ کوئی بات کر دیتا۔ ایللی ہم نے ایک کپ خریدی ہے آؤ دکھائیں۔ غضب کی چیز ہے۔ خوبصورت رنگ ہے کہ ہمیں کیا بتائیں۔ واہ واہ دیکھو اور پھرک جاؤ۔“

اس پر ایللی کی سمجھ میں آ جاتا کہ کوئی بات ہے اور پھر ایللی کسی بہانے کھیل چھوڑ کر ان کے ساتھ چل پڑتا اور وہ دونوں پرانی حویلی کے میدان میں جا کھڑے ہوتے اور کپ کھڑکی آکر سیکنہ کو آوازیں دیتی اور با آواز بلند ہنستی یا انگریزی پڑھتی یا ویسے ہی کھڑکی میں کھڑی ہوتی۔

”کل چھٹی ہے۔ پتہ پر سوں سے سکول کا وقت بدل جائے گا۔ پرسوں سے نوبے ہے۔“

جب وہ گھر کی سیڑھیوں کے قریب پہنچتا تو نذیراں اسے دیکھ کر کسی بہانے اپنا کام چھوڑ کر ان کی ڈیوڑھی میں آجاتی ”کہاں سے آئے ہو؟“ وہ اس کے قریب آکر مسکراتے ہوئے پوچھتی اور اس قدر قریب آجاتی کہ اس کے جسم کی بو ایل کی ناک پر یورش کر دیتی اور نذیراں کا سانس اس کے منہ سے نکلنا ہوا محسوس ہوتا اور نذیراں ٹٹنگی باندھ کر اس کی طرف دیکھتی اور اس کی بانیں ایل کی طرف بڑھتی اور گھبرا کر ایل کی پیچھے ہٹ جاتا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“ وہ اس کی طرف بڑھنے لگتی۔

”ہیں۔ ہیں۔ ذرا باہر گیا تھا۔“ وہ کئی کترا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھتا اور پھر بھاگ کر اوپر چڑھ جاتا۔ اسے یوں اوپر چڑھتے ہوئے دیکھ کر داوی اماں پوچھتی۔

”کیا ہے تمہیں ایل۔ یوں بھاگ کر کیوں چڑھتے ہو سیڑھیاں جیسے کوئی پیچھا کر رہا ہو۔“

ایل ڈر کر پیچھے دیکھتا کہیں وہ پیچھے تو نہیں آ رہی؟

”کیا ہے ان سیڑھیوں میں؟“ وہ پھر پوچھتی۔

”کچھ نہیں داوی اماں کچھ نہیں۔“

نذیراں کو دیکھ کر اسے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ انگریزی ماماؤں کا کھیل کھیل سکتا ہے اور ڈسپنری کے بغیر ہی کامیابی حاصل کر سکتا ہے نہ اسے ریشمی رومال کی ضرورت ہے اور نہ شعروں کی کتاب کی۔ لیکن اس کے ذہن میں کامیابی کی نہ تو آرزو تھی اور نہ یہ شعور تھا کہ کامیابی کا مطلب کیا ہے۔ اسے وہ لڑکیاں بے حد پیاری لگتی تھیں جو دور کسی کھڑکی سے جھانکتیں اور مسکراہٹ بھری نگاہ چمکا کر کھڑکی بند کر لیتیں۔ اسے وہ لڑکیاں پسند تھیں۔ جن کے چروں پر اداسی چھائی ہوتی۔ ایسی لڑکیاں جن کی صورت روئی روئی ہوتی جو بوائے اللہ کہہ کر بھاگ جاتیں وہ نہیں جو آگے بڑھ کر اسے گھیر لیتیں اور پوچھتیں کہاں سے آئے ہو۔

مکمل وا

ایک دن جب وہ حسب معمول نذیراں سے خوف زدہ ہو کر سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو ابا نے اسے آواز دی۔ ”ایل!“ وہ گھبرا گیا نہ جانے ابا نے کیوں بلایا تھا کہیں وہ سیڑھیوں کی بات سے واقف تو نہ تھے۔

ایل ڈرتے ڈرتے قریب گیا ”آج تم ٹیم کے ساتھ شام کوٹ جا رہے ہو سمجھتے جاؤ تیاری

آپ بند ہو جاتیں اور وہ محسوس کرتا۔ جیسے وہ جرم کر رہا ہو لیکن اس وقت اس کا دل وہ نہیں تھرتھرتا اور سانس مشکل سے آتا۔ یہ کیفیت تکلیف دہ ہونے کے ساتھ ساتھ پر لڑتے تھی ایل کی تمام تردیجی اس کیفیت سے وابستہ تھی۔ اس منظر سے نہیں وہ منظر صرف اس ضروری تھا کہ اس کی موجودگی سے ایل کو یہ کیفیت حاصل ہوتی تھی۔

## نسا نذیراں

مکوری ڈکوری سے فارغ ہو کر ایل جمیل کے یہاں چلا جاتا اور وہ دونوں مل کر روپے جو جمیل نے ماں کی صندوقچی سے چرائے ہوتے ایک دو تین چار — پھر وہ مل کر منہ بناتے۔ منصوبے بناتے وقت سامنے چوبارے میں ایک لڑکی آجاتی انہیں دیکھ کر لڑکی کو نہ کیا ہو جاتا۔ وہ اٹھ بیٹھی چار ایک قدم چلتی پھرتی آتی پھر کھڑکی میں کھڑی ہو کر انگڑائیاں پھر سر ہانڈ اٹھا کر اسے سینے سے لگاتی۔ گود میں بٹھاتی پھر وہ ناچنا شروع کر دیتی۔ ناچ ختم ہوتا وہ پھر سے انگڑائیاں لینا شروع کر دیتی۔ از سر نو کھڑکی میں آجاتی۔ دوپٹہ اتار کر پھینک دیا ہالوں کو لپیٹ لیتی پھر انہیں کھول دیتی۔ پھر دوپٹہ اوڑھ لیتی اور از سر نو ناچنے لگتی۔ ایل نے مرتبہ اسے دیکھا تھا۔ لیکن اس نے جمیل سے بات نہ کی تھی۔ نہ ہی اسے خیال آیا تھا کہ انگریزی ماماؤں کا کھیل کھیلایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک وہ کھیل تو ارجمند کی موجود محتاج تھا۔ جمیل کو ایسی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ فی الحال وہ تو ماں کی گٹھڑی میں سے چرانے اور دوستوں کو پیڑے کھلانے کے دلچسپ مشغلے میں کھویا ہوا تھا۔

لیکن ایک روز جمیل نے اس سیماب صفت لڑکی کو دیکھ لیا اور دیر تک اسے دیکھا رہا۔ کھیل اسے بہت پسند آیا اور وہ دونوں شدت سے اس جوان لڑکی کی طرف دیکھنے لگے جو وہ چوبارے میں نہ جانے کیا کھیل کھیل رہی تھی۔ کیسا ناچ ناچ رہی تھی۔ پھر ان کا یہ معمول اور ایل کے لئے جمیل کے چوبارے میں انگریزی ماماؤں کا ایک نیا باب کھل گیا۔ انگریزی اس باب میں ایک عجیب و غریب خصوصیت تھی نہ تو اس میں ریشمی رومال ہلانا پڑتا تھا نہ بانسری بجانے کی ضرورت تھی۔ نہ پریم پتروں کی کتاب کھولنی پڑتی تھی۔ بس وہ صرف کھول کر اس میں بیٹھ جاتے باقی سب کچھ وہ لڑکی خود کیا کرتی تھی۔ جب ایل آتا جاتا تو وہ آتا

کو متنبہ کرتی کہ اس کی بیٹی کو احتیاط سے گھر میں رکھیں۔ پھر اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔  
 ”قاسم“ اور ایک جوان لڑکا باہر آگیا۔ ”یہ تیرا ماموں ہے۔“ وہ بولی۔ ایللی نے ماموں کو سلام کیا  
 لیکن وہ حیران تھا کہ جس قدر استانی کا چہرہ اور انداز نسائیت سے خلی تھا، اس قدر قاسم کا مردانہ  
 پن سے محروم تھا۔

### دو ناگ

اس گھر میں سب سے زیادہ قابل قبول شخصیت اس کی ننی امی شمیم کی ہی تھی۔ شمیم میں  
 نہ تو استانی کی سی بیدبالی تھی اور نہ قاسم کی سی مجبولیت۔ البتہ ایللی کو ایک تکلیف ضرور تھی۔  
 جب بھی شمیم اس کے پاس آتی تو اس کی چادر سے دو حنا ملیدہ ہاتھ نکل آتے۔ جن کی سفیدی  
 کی وجہ سے حنائی سرنی اور بھی شوخ دکھائی دیتی اور حنا کی سرنی کی وجہ سے ہاتھوں کی سفیدی  
 اور بھی دودھی۔ ان ہاتھوں کو دیکھ کر ان جلنے میں وہ محسوس کرتا جیسے کوئی جرم ہو، گنہگار رہا  
 ہو۔ شمیم محبت جتانے کے لئے اپنے حنا ملیدہ ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی اور ایللی انہیں اپنی جانب  
 بڑھاتا ہوا دیکھ کر گھبرا کر سسم جاتا اور دور ہٹنے کی شدید کوشش کرتا مگر بالآخر وہ دو حنائی ناگ اسے  
 اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔ حنا کی بو سے اس کے ذہن میں ایک طوفان سا اٹھتا۔ گرد و پیش دھندلا  
 جاتے اور پھر — شرم سے اس کا سر جھک جاتا وہ اپنی نگاہ میں ننگا ہو جاتا۔ ننگا اور شرمسار۔

اس طرح اس کی زندگی ہمیشہ ہاتھوں کی اہمیت بڑھتی گئی۔ ماں کی اہمیت بڑھتی گئی اور اس کے  
 ذہن میں حنائی رنگ کا جنسی زندگی سے تعلق استوار ہوتا گیا۔ ان کے گھر میں جو عورت آتی  
 تھی۔ اسے براہ راست یا باپ سے تعلق ہوتا تھا اگر وہ ان کے بند کمرے میں جا پہنچتی تو بھی اور  
 اگر وہ اس کی زد سے بچنے کی کوشش کرتی تو بھی۔ ہر صورت ہر عورت جو اس مکان میں آتی  
 تھی اسے علی احمد سے تعلق ہوتا تھا یا حنفی تعلق۔

لیکن اس زمانے میں اسے اثبات نفی کا شعور نہ تھا۔ اس کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو جاتا کہ  
 بند کمرے کے طلسم کو توڑ کر ٹین کے سپاہی کے چنگل میں پھنسی ہوئی عورت کو نجات دلائے  
 لیکن اس خیال کے ساتھ ہی خواہ مخواہ چند ایک خیالی تصاویر اس کے ذہن میں اتر آئیں اور وہ  
 لاعلم پڑھنے سے غلصہ نہ ہوتی۔ پھر وہ اس خیال کو بھولنے کی کوشش میں لگ جاتا۔ لیکن ٹین  
 کے سپاہی سے غلصہ پانے والی حسین ماں جسے چھوڑ کر وہ بھاگ رہا ہوتا اپنی گود سے حنائی ہاتھ

کر لو۔“ علی احمد نے کہا۔ خوشی سے ایللی کی باجھیں کھل گئیں۔ وہ ایک نئی جگہ جائے گا  
 شام کوٹ۔

شام کوٹ کے نام سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ چونکہ صغیر شام کوٹ کی رہنے والی  
 اگرچہ اسے وہاں جانے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ اسی روز وہ شام کوٹ کو روانہ ہو گیا۔ شام کوٹ  
 نئے محلے میں اپنی نئی ماں کا گھر دیکھ کر اسے بے حد ہلایا ہوئی ایک ڈیوڑھی کے پیچھے ایک چم  
 سانگ و تارک محسن تھا جس کے پیچھے دو کوٹھڑیاں تھیں۔ ڈیوڑھی میں ایک بوڑھی عورت ہاتھ  
 باندھے بیٹھی تھی۔ چادر میں وہ کس قدر بھدی لگ رہی تھی۔ اس کا بیٹھنے کا انداز بھی تو بچہ  
 تھا۔ جیسے وہ عورت ہی نہ ہو بلکہ کوئی بے حس گنوار مرد بیٹھا ہو۔

ایللی کو دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھی۔ ”خیر سے بسم اللہ“ اور وہ اس کے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگی  
 ”بیٹھ جا۔ سنا علی احمد کا کیا حال ہے۔ آپ کیوں نہیں آیا وہ۔ بہت بننے لگا ہے اب پہلے تو یہ یاد  
 نہ تھی۔ دو سال میری منتیں کرتا رہا۔ میری دہلیز پر بیٹھا رہا۔ میری بیٹی کشمیر میں چلی ہے ہاں  
 نازک ہے وہ۔ اسے کوئی دکھ نہ ہو۔ ورنہ وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ میں نے بھی ساری  
 سرکاری نوکری کی ہے۔ عمر بھر استانی کا کام کیا ہے۔ تم آئے ہی تھے نا۔ ہمارے سکول میں یاد۔  
 نا تمہیں۔“

دھنکا“ ایللی کو یاد آیا۔ ہوں! یہ تو وہی استانی تھی۔ جو اس روز پردے کے پیچھے کھڑی  
 احمد سے باتیں کر رہی تھی۔ ایللی نے گھن سی محسوس کی۔ کیا سبھی استائیاں اسی قسم کی ہوتی ہیں  
 کیا ان میں ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی۔ کیا وہ مردوں کی طرح چادریں باندھتی ہیں۔

”لڑکے ذرا حقہ تو بھرنا“ استانی نے کسی کو آواز دی اور پھر اپنی تقریر جاری کر دی۔ ”م  
 نے پورے پندرہ سال ملازمت کی ہے اللہ نہ کرے کوئی ضرورت نہ تھی۔ نوکری کرنے کا  
 شوق تھا پڑھانے کا شوق۔“

اس کے لہجے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے محکمہ تعلیم کی بجائے پولیس کی نوکری  
 ہو۔ علی احمد کی بات کرتے ہوئے اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس سے کما  
 واقف ہو۔ جیسے علی احمد کے متعلق بات کرتے ہوئے اسے تکلفات کی ضرورت نہ ہو۔  
 کے باوجود یا شاید اسی لئے اس کی گفتگو میں نفرت کی جھلک تھی۔ بات بات پر وہ اپنے گھرانے  
 عظمت کا ذکر چھیڑ دیتی اپنی بڑائی جاتی اور بالا خراہی بیٹی کی نزاکت طبع کی طرف اشارہ کر کے

ویسے سعیدہ کے گھر میں تو روز ہی ہنگامہ رہتا تھا۔ لیکن کبھی کبھار وہ خصوصی طور پر مولود شریف کا اہتمام کیا کرتی تھی۔ فرش پر سفید چادریں بچھائی جاتیں۔ گلاب چھڑکا جاتا۔ کھانے کو الائچیاں اور پان مہیا کئے جاتے۔ شام کو عورتیں اکٹھی ہو کر نعتیں پڑھتیں اور مرد دور کسی جگہ

حنائی ہاتھوں کے سحر سے نیچے کے لئے وہ گھر سے باہر نکلتا اور گھومتا پھرتا۔ ارجمند، جمیل



اچھا لڑکا ہے۔ لیکن اب محلے کے لڑکوں کے ساتھ مل کر تو بھی بگڑتا جا رہا ہے۔ اچھا جا کھیل جا۔“  
 ارجمند ایللی کو دیکھ کر ریشمیں رولال لہراتا ”ارے یار بس تم تو سوئے ہی رہتے ہو۔ ابھی  
 ابھی کپ اور کپ سکول جا رہی تھیں۔ کیا بتاؤں آج کیا ٹھاٹھ تھے۔ غضب ہو گیا۔ سرخ قمیص  
 جیسے خون سے رنگی ہو۔“ دفعتاً پاؤں کی آہٹ سن کر وہ چونکتا۔ ”آخا“ وہ بات کٹ کر کہتا  
 ”ارے وہ دیکھو تو میاں پہلوان بھی آگئے وہ دیکھو کنوئیں کے پاس۔“

”وہ دیکھا سلام کا جواب دیا جا رہا ہے۔ کیا سمجھتے یہ ماتھے سے مکھی نہیں اڑائی جا رہی۔ اس  
 وقت کبھی کہیں۔ کیوں ایللی ہے نا اور ذرا اکھرا ڈکورا تو دیکھو جب تک اس کلاک پر ماؤس نہیں  
 چڑھے گا۔ یہ ٹن ٹن ہی کرتی رہے گی۔“ اور پھر وہ ننھے چوڑوں کی طرح سر جوڑ کر کپ کپ کی  
 باتیں کرنے میں دیر تک مصروف رہتے۔

ارجمند سے ملنے کے بعد وہ رفتی اور جلیل کے یہاں چلا جاتا۔ رفتی تو زیادہ وقت سودا  
 خریدنے میں مصروف رہتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ صبح سویرے اٹھ کر چچی پھوپھا اور خالہ کے گھر  
 جا کر پوچھتا۔ ”خالہ جی کوئی چیز منگوانی ہو تو بتا دیجئے۔“ ”چچی بازار سے کچھ منگواتا ہے کیا۔“  
 پھوپھا جی میں بازار جا رہا ہوں۔ دیر تک وہ بازار جانے کا ڈھنڈورہ پیٹتا رہتا ساتھ ہی اس کی  
 آنکھوں سے گلابی پھوار اڑتی رہتی اور نگاہیں چوری چوری گرد و بیش کا جائزہ لیتی رہتیں پھر وہ  
 سوے اکٹھے کر کے اپنا ریشمی رولال جیب میں ڈال اور غزلوں کی کاپی تمام کر بازار چلا جاتا جب  
 سودا سلف سے فارغ ہوتا تو وہ جلیل کی طرف جا پہنچتا اور پھر وہ تنگ گلی کی لڑکی اپنے گھر کی دہلیز  
 اور گلی میں جھاڑو دیتی اور چلا چلا کر باتیں کرتی اور رفتی کی آنکھوں میں بوندا باندی ہوتی اور  
 جلیل وحشت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتا اور لڑکی مسکرائے جاتی اور ایللی  
 محسوس کرتا جیسے وہ کوئی دلچسپ سازش کر رہے ہوں۔

پھر یوسف آکٹا یوسف کے آنے پر نقشہ ہی بدل جاتا کیونکہ یوسف لڑکیوں کے وجود سے  
 بے نیاز تھا وہ ان مسکاتے ہوئے جھانکتے ہوئے جلاتے ہوئے چٹے سفید چروں کی طرف آنکھ اٹھا کر  
 بھی نہ دیکھتا تھا۔ اس کے آتے ہی تسخارنہ حرکات کا طوفان اڑ آتا۔ جلیل اور رفتی اسے بناتے  
 اور وہ جان بوجھ کر بنتا۔ جیسے کسی کارٹون میں جان پڑ گئی ہو۔ ایللی محسوس کرتا۔ جیسے یوسف کو  
 بنانے سے جلیل کا مقصد صرف اس لڑکی کو محظوظ کرنا ہوتا تھا جو نہ جانے کیوں گلی کے ایک  
 سرے سے دوسرے سرے تک جھاڑو دینے پر تلی رہتی تھی۔

بیٹھ کر سنتے یا قریب ہی کسی مقام پر چھپ کر دیکھتے۔ گلنے کے علاوہ سعیدہ کو ٹاپنے کا بھی سہرا  
 شوق تھا۔ اکثر وہ چند ایک قریبی بہنوں اور بھائیوں کو بلا کر گلنے کی محفل جمالیتی اور پھر  
 ظلے دار ٹوپی پہن کر ڈھولک کے ساتھ ناچتی اور اپنے حنائی ہاتھوں کو عجیب انداز سے لہرائی  
 ایللی محسوس کرتا جیسے وہ کوئی جادو گرینی ہو اور حنائی ہاتھ کوئی جیتا جاگتا طلسم ہوں اس وقت اس  
 نگاہ میں گرد و پیش دھندلانے لگتے اور وہ چپکے سے وہاں اٹھ کر اپنے گھر داوی ایللی کے پاس  
 لینے کے لئے آجاتا۔

داوی ایللی اسے تھپک کر سلاتی ”کچھ بھی تو نہیں ایللی۔ کچھ بھی نہیں سو جا اب“ لیکن  
 ایللی کی تسلیوں کے باوجود یا شاید ان تسلیوں کی وجہ سے وہ محسوس کرتا کہ کچھ ہے۔ نہ جلا  
 کہاں کچھ نہ کچھ ہے ضرور ہے جو اسے پریشان کر رہا ہے۔ اس کے دل کے نچلے پردوں میں لہر  
 لے رہا ہے۔ طوفان بپا کر رہا ہے۔ لیکن داوی اسے تھپکے جاتی۔ ”سو جا۔ کچھ بھی تو نہیں۔“  
 جا۔“ اور بلا خروہ سو جاتا اور پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ اس کے سامنے حنائی ناگ لپکتے اور ایک بازار  
 بھر کم جسم ناچتا ناچتا اس کی طرف بوہتا اور پھر دھڑام سے اس کی چھاتی پر آگرتا اور اس کا دم رگڑ  
 جاتا اور وہ چیخ مار کر جاگ اٹھتا۔ داوی ایللی اٹھ بیٹھتیں۔ ”کیا ہے تجھے ایللی۔ ڈر گیا ہے کیلا۔“  
 جانے سارا دن کہاں کہاں کھیلتا ہے۔ کس کس مقام پر بیٹھتا ہے تو۔ تجھے جو کہا ہے میں نے  
 سخت مقام پر نہ جایا کر۔ رات کو تو ڈرنا ہی ہوا اس وجہ سے ”اب سو جا۔“ داوی ایللی کو کیا  
 تھا کہ وہ عمر کے کیسے سخت مقام پر آ پہنچا ہے۔

صبح سویرے ایللی پھر باہر نکل جاتا اور محلے کی زندگی کی گھما گھمی میں کھو جاتا بوڑھی عورت  
 اس کی طرف اپنے چھلی دار پنچے بوہاتیں۔ ”ایللی ہے جیتا رہ بیٹے۔ خدا اعمرد راز کرے۔ تیری ماں  
 کا کلیجہ ٹھنڈہ رہے میں کہتی ہوں۔“ وہ راز دارانہ طور پر ایللی پر جھک جاتیں۔ ”اللہ رکھے جانے  
 کا وارث تو ہی ہے۔ تو ہی گھر کا مالک ہے اور یہ جو آتی جاتی ہیں۔ کلمو نہیں یہ سب چڑیل  
 ہیں۔ سب دفعان ہو جائیں گی۔ انشاء اللہ تو ہی گھر کا مالک بنے گا۔ کھیلنے جا رہا ہے۔ تو جانے  
 دو گھڑی کھیلنا اچھا ہی ہوتا ہے۔“ عورتوں سے بچ کر وہ محلے کے کسی بوڑھے کے جے چڑھ جاتا  
 ”میاں ایللی کہاں ہیں وہ تیرے ابا آج کل۔“ نیا بیاہ کرنے کی تو نہیں سوچ رہا۔ وہ دماغ  
 ہے اس کا لیکن بھی ایک خوبی ضرور ہے۔ اس میں محلے میں کبھی ایسی بات نہیں کی۔ خیر  
 اعمال کا ہر کوئی خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ لیکن یاد رکھ۔ اپنے ابا کے نقش قدم پر نہ چلنا۔ سمجھنا۔

گوئے اور سر کا پلو سنبھالنے میں شدت سے مصروف رہیں۔ اس تاریک اور گھٹی گھٹی فضا کی وجہ سے ان کے رنگ زرد تھے۔ چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور انداز سے بے حسی بیٹھتی تھی۔ اگر کبھی کبھار ان کے چہرے پر جوانی کی چمک لہراتی بھی تو وہ کوئے کی طرف منہ موڑ کر اپنا آپ سنبھال لیتیں اور پھر آنا گوندھنے میں یا برتن مانگنے میں مصروف ہو جاتیں۔

آصفی۔ محلے میں صرف چند ایک مخصوص قسم کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ محلے کی بوڑھیوں کی آوازیں ان کے چرخوں کی گھم گھم، تاریک دالانوں میں برتنوں کی کھنک، چوگان میں بچوں کا دبا دبا شور محلے کی مسجد سے بکسیریں مردوں کی کھنکھاریں اور دبے پاؤں چلنے کی آوازیں۔ بند ہوتے ہوئے ٹانگ چندی دروازوں کی چراؤں ٹھک چمکاوڑوں کی چنچیں جو شام کو چوگان پر منڈلایا کرتیں اور پھر ضعیفوں کے خراٹے۔

ان جملہ آوازوں میں صرف ایک آواز ایسی تھی جو محلے کی نصیبت سے مختلف تھی۔ وہ بالا کا گرامو فون تھا۔ جو کبھی کبھار بالا کے آسیب زدہ کمرے میں گانے کی کوشش کیا کرتا تھا اگرچہ اس ماحول میں اس کی آواز گھٹ کر رہ جاتا تھا۔

جب پہلی مرتبہ بالا کے گرامو فون پر جاگی بائی الہ آبادی کے گیت کی آواز محلے میں سنائی دی تو محلے کی گدھیں جھپٹ کر کھڑکیوں میں آگئیں۔

”میں پوچھتی ہوں یہ کون چلا رہا ہے۔“

”نہ جانے کہاں سے آواز آرہی ہے۔“

”اے ہے یہ تو عورت ہے کوئی۔“

”لو چاہی وہ تو بلانے لگایا ہے کوئی رکٹ۔ اے ہے محلے میں باجے بجاتا۔“

”تو ہے ماں آج تک تو یہ بات سننے میں آئی نہیں تھی۔“

”میں کتنی ہوں اس لڑکے کا دل غ چل گیا ہے۔“

”لڑکے کا کیوں بس۔ قصور تو داڑھی والے کا ہے۔ جس نے اسے باجا خرید کے دیا۔“

اس روز محلے کی گدھیں دیر تک سر اٹھا کر پر پھڑپھڑاتی رہیں۔ لیکن بالا سے کچھ کہنا ممکن بھی ہوتا؟ بڑی سے بڑی جھاڑ جھپٹ کر بالا ہنس دینے کا عادی تھا۔

”ہی ہی ہی ہی۔ چاچی سنا تم نے یہ توؤں والا باجا ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔ اچھا ہے نا۔ پورے دو سو میں لیا ہے اور یہ ریکارڈ جاگی بائی الہ آباد والی کا ہے۔ بڑا اچھا گاتی ہے۔ ماں جی ہی ہی ہی۔“

دوپہر کے وقت جلیل اور ایللی محلے میں لوٹ آتے۔ اس وقت محلے کی بوڑھی عورتیں چوگان میں بیٹھ کر کوئی نہ کوئی کام کیا کرتی تھیں۔ کوئی ازار بند بنتی۔ کوئی تانگے کے گولے بناتی۔ چوگان سے گزرتے ہوئے رفتی کی گردن جھک جاتی۔ اس کی آنکھوں کی بوند باندی ختم ہو جاتی۔ اس کے ہونٹوں کا گیت ختم ہو جاتا اور اس کے چہرے پاس جا بیٹھتا صفدر کی گردن تو ہمیشہ اگڑی رہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت عجب سی سرخی پھیلی رہتی اس کے بازو عجیب انداز سے لٹکتے رہتے اور ہونٹوں پر تبسم گیت کا سہل طاری رہتا۔ وہ مضطربانہ طور پر ادھر ادھر ٹھٹھا ادھر ادھر دیکھتا اور پھر تھپڑ کے گیت کا کوئی بول ان جانے میں اس کے منہ سے نکل جاتا ”حافظ خدا تمہارا۔“ اس وقت ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کسی سے رخصت ہو رہا ہو۔ اس پر ایللی کی نگاہوں تلے ایک پارسی حسینہ آکھڑی ہوتی اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ایللی کا جی چاہتا تھا کہ وہ صفدر سے پوچھے کہ وہ پارسی لڑکی کیا ہوئی اور وہ گیت کیا پارسی لڑکی گایا کرتی تھی اور صفدر کی آنکھیں سرخ کیوں رہا کرتی تھیں اور اس کے بازو لہرایا کیوں کرتے تھے مگر ایللی کو صفدر سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ صفدر محلے کے بڑے لڑکوں میں سے تھا اور چھوٹے لڑکے بڑے لڑکوں سے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے تھے۔ اگرچہ صفدر کے انداز میں وہ معزز پن نہ تھا جو عام طور پر بڑے لڑکوں میں پایا جاتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس صفدر میں بے باکی تھی۔ خلوص تھا پھر بھی ایللی کو یہ باتیں پوچھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

صفدر کی اسی بے باکی کی وجہ سے محلہ والیاں اسے بہت برا سمجھتی تھیں اور دادی الہ تو صفدر کا نام سننے ہی غصے سے چلانے لگتی۔ ”بد معاش کہیں کا شرابی۔ دفع کرا۔ نام نہ لے۔“ مردود کہیں کا۔“ اور صفدر بھی دادی الہ کے نام سے چڑتا تھا۔ ”مردود بڑھیا۔ کھڑکی میں گدھ کا طرح بیٹھی رہتی ہے مرنی بھی نہیں۔“ اور منجھل پوناش کا پٹانہ بناتے وقت اس کی آنکھوں میں یوں مسرت لہراتی جیسے بڑھیا کو وہ اس پٹانے تلے ترپتے ہوئے دیکھ رہا ہو اور دیوار پر پٹانہ یوں مارنا کہ ایللی محسوس کرتا۔ جیسے دیوار کی بجائے بڑھیا کے سینے پر پھینک رہا ہو۔

آصفی محلے کی زندگی محلے کی تنگ و تاریک گلیوں، کوٹھڑیوں اور ٹانگ چندی اینٹوں کی ریختی ہوئی اونچی دیواروں سے گھرے ہوئے احاطے میں مخصوص انداز سے دھڑکتی تھی۔

محلے کی بوڑھیاں صبح سویرے ہی بیدار ہو جاتیں اور کھڑکیوں میں چوکیوں پر گدھوں کی طرح آ بیٹھتیں۔ جوان لڑکیاں کوٹھڑیوں کی گھٹی گھٹی فضا میں تاریک دالانوں میں برتن مانگنے آ

سنو تو ابھی اپنا نام بولے گی میں ہوں جاگتی، بانی الہ آباد والی۔ ہاں۔“

بلا کی بات پر بوڑھیوں کے ہونٹوں پر ہنسی آجاتی۔ ”اے چھوڑو چاچی۔ اس لڑکے پر تو آسیب کا سایہ ہے ساری رات جنوں کی محفل گئی رہتی ہے اس کے تخت پر۔“

”ہاں میں اس کے بس کی بات بھی ہو۔ انگلیاں تو سونگھو اس کی پلاؤ کی خوشبو آتی ہے۔“

بلا کی جگہ اگر اور گراموفون خریدتا تو شاید اسے بجانے کی کبھی اجازت نہ ملتی۔ لیکن بلا کون روکتا۔ آسیب زدہ بلا کو محلے میں خصوصی درجہ حاصل تھا۔

بیابا

بلا کے گراموفون کے علاوہ کبھی کبھار بیابا شادی کے موقعوں پر محلے کی فضا میں تبدیلی دانتی ہوتی، لیکن اس میں بھی آوازوں کی نوعیت نہ بدلتی تھی۔ ڈھولک تو بجتی تھی اور ڈھولک کی ضرب میں جوان لڑکی کی مضطرب انگلیوں کی تڑپ بھی گونجتی لیکن گانے زیادہ تر بوڑھیاں ہی گاتیں اور ان کی دھنیں اس قسم کی ہوتیں۔ وہ گانے معلوم ہی نہ ہوتے تھے۔ انہیں سن کر محسوس ہوتا جیسے بہت سی چگادڑیں بھیانک آواز میں چیخ رہی ہوں۔ جیسے کسی کی موت پر کوئی بین کر رہا ہو۔ دھیمی آواز میں لمبے سرگونجے اور محلے کی فضا کو اور بھی تاریک کر دیتے۔

اگر کوئی نوجوان لڑکی کوئی گیت گانے کی کوشش کرتی تو اس کی آواز اس قدر بیگانگی سنائی دیتی تھی کہ وہ جلد ہی شرما کر یا گھبرا کر اس ناکام کوشش کو چھوڑ دیتی اور بوڑھیاں اپنی عظمت کو از سر نو محسوس کر کے پھر سے لمبی اداس سروں میں روئے لگتیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود شادی کے موقع پر کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور وقوع پذیر ہوتی۔ ناک چند دیواروں کی سیاہی کھل کر صاف ہو جاتی۔ کھڑکیوں میں سرخ دوپٹے لہراتے اور علی پور کا بینڈ باجا چکی حویلی میں نغمے بجا لگتے۔ اس روز محلے کے لڑکے بوڑھی گدھوں کے منوس سائے کو اپنے سروں پر محسوس نہ کرتے۔ گیس کی روشنی میں لڑکوں کے ریشمیں رومال لہراتے۔ سیاہ بودے چمکتے۔ جیبوں سے پم سندیس۔ کتابیں باہر نکل آتیں لڑکوں کی نگاہیں کھڑکیوں کے ارد گرد ناکام منزلات میں لیکن یہ سب باتیں بیکار تھیں۔ کیونکہ محلے کی لڑکیوں کی مجال نہ تھی کہ وہ کھڑکیوں یا دروازوں میں آگیاں

ہوں۔

لڑکے کچھ دینے کچھ لینے کچھ کہنے کے بہانے بیاہ والے گھر میں جا داخل ہوتے۔ تاریک ڈیوڑھیوں میں چھپ کر انتظار کرتے بھیڑ میں راستے بنانے کے بہانے اندھیرے میں چٹکیاں بھرنے کی کوشش کرتے۔ اس افزائش میں چوڑیاں کھنکیتیں۔ مندی والے ہاتھ کپڑوں میں لپٹ جاتے۔ جسم سینے ”ہائے میں مرگئی۔“ کی نحیف آوازیں سنائی دیتیں ”لیکن ان معمولی مگر دلچسپ باتوں کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا۔

بیابا شادی کے موقع پر ایلی کے لئے گھر جانا مشکل ہو جاتا تھا۔ جب وہ اپنی اندھیری ڈیوڑھی میں پانچپتا تو ایک دھندلی سی شکل ڈیوڑھی کے کسی کونے سے نکل آتی۔ گھبرا کر وہ رک جاتا اور دھندلی شکل گھوم کر اس کا راستہ روک لیتی۔

”کون ہے؟“ وہ چلاتا۔

بھدی سی ہنسی سنائی دیتی۔ ”ڈر گئے۔“ نذیراں کی آواز آتی اور وہ مڑ کر ڈیوڑھی سے باہر نکل جاتا اور ارجمند کو ڈھونڈھ نکالتا۔

”ہیلو ایلی ہے۔“ ارجمند چلاتا ”سراسر بے معنی ہے۔ ایلی۔ برات والے گھر جانا بے معنی ہے۔ بیکار ہے بالکل بیکار میں نے چٹکی بھری تو ظالم کہنے لگی۔ کون چاچی سے۔ ہاتھ جوڑ کر جان چھڑائی پھر مسکرانے سے بھی باز نہیں آتیں۔ اگر واقعی کے سے جج کر کے آئی ہیں یہ لڑکیاں تو پھر دیکھ کر مسکراتی کیوں ہیں اور مسکراہٹ بھی خالص ڈپسری والی اور چٹکی بھرو تو چاچی سے کہہ دوں گی۔ لا حول ولا قوۃ۔ چلوپ اور کیپ کی طرف چلیں۔ محلے سے بات بنتی ہے۔ آج بانسری پر ایک دھن سیکھ کر آیا ہوں۔ واہ کیا دھن ہے۔ بس سمجھ لو کچا دھاگا ہے جس سے سرکار بندھی آئے گی۔ آؤ سنائیں تمہیں۔“

نہ جانے کیوں ایلی نے نذیراں کی بات کبھی ارجمند سے نہ کی تھی۔ بلکہ وہ ڈرتا تھا کہ ارجمند کو نذیراں کی بات کا پتہ نہ چل جائے۔ تاکہ وہ رنگین انگریزی باباؤں کا کھیل حقیقت کا روپ نہ دھارے ایلی کو بھتی ہوئی چٹوں سے دلچسپی تھی۔ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دلچسپی تھی۔ معنی خیز انداز سے حرکت کرتے ہاتھوں کو دیکھنے کا شوق تھا۔ لیکن عورت یا لڑکیوں کا قرب اس کے لئے سولہاں روح تھا۔ اسے ڈرتا تھا کہ نذیراں کی بات سن کر ارجمند کی توجہ اس طرف منعطف ہو گئی تو وہ رنگین ختم ہو جائے گی۔ اور نہ جانے کیا شروع ہو جائے۔ اس کے ذہن میں قرب کا مفہوم تاریکی تھا۔ پر اسرار خوفناک تاریکی۔

اور دوسری طرف انتظامات میں مشغول تھی۔ جیسے بہت دلچسپی لے رہی ہو۔ فرحت کے کپڑے سبھی دولہا کی چیزیں بھی تیار کرتی جاتی۔ علی احمد کے احکامات بھی دوڑ دوڑ کر سنتی اور ساتھ ساتھ آنسو بھی چھلائے جاتی۔ عجیب عادت تھی اماں کی پھر ہر آتی جاتی سے شکایت بھی کرتی جاتی کہ فرحت کا بیاہ زبردستی کیا جا رہا ہے۔

ادھر فرحت کو بھی احساس نہ تھا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ فرحت کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی اس نے آٹھویں جماعت تک مدرسے میں تعلیم پائی تھی پھر علی احمد نے دفعتاً اعلان کر دیا تھا کہ اسے سکول جانے کی اجازت نہیں بیچیوں کے لئے اتنی ہی تعلیم کافی ہے۔ اس پر فرحت پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور ہاجرہ نے اس کے ساتھ مل کر آنسو بہائے تھے۔

مگر علی احمد کا حکم اٹل تھا ان دونوں کے آنسو کام نہ آئے اور فرحت کی تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ آٹھ سال سکول میں پڑھنے کے باوجود فرحت ابھی بچی ہی تو تھی وہ اکثر محلے کے چوگان میں جا کر کھلکی کلبیسر دی ناچتی رہتی۔ ساتھ ساتھ کچھ گنگنائی اور محلے کے بزرگ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔ ”فرحتو گھومنی۔“ اور بوڑھیاں مسکرا کر کہتیں ”فرحت تو فرحتو ہی رہی۔“ ایللی نے کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ فرحت بڑی ہو گئی ہے اسے بھی وہ فرحتو ہی دکھائی دیتی تھی۔ اس میں عورت کا نام و نشان تک نہ تھا۔

اپنے بیاہ کی بات سن کر فرحت نے چوگان میں جانا بند کر دیا۔ اب وہ خالہ کے گھر بھی نہ جاتی تھی۔ لیکن اس تبدیلی کے باوجود اس میں وہ بات پیدا نہ ہوئی تھی جو جوان لڑکیوں میں ہوتی ہے۔

پھر وہ دن آپہنچا جب ان کے گھر کے امانے باجے بجنے لگے اور گھر میں مہمان آجے ہوئے اور ہاجرہ کام کاج میں اس قدر مصروف ہو گئی کہ آنسو بہاتا بھی بھول گئی اور محلے کے لڑکوں نے بہانے بہانے ان کے گھر آنا شروع کر دیا اور برتن بجنے لگے۔ حنائی ہاتھ ریٹھی وہ بنوں میں سے باہر نکلے اور چھپنے لگے اور گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور بالاخر فرحت کو ڈولی میں بٹھادیا گیا اور ایللی اور ہاجرہ دونوں ڈولی کے ساتھ ایک نئے گھر میں چلے گئے۔ یہ نیا گھر اجمل کا گھر تھا۔ چونکہ اجمل کی ماں مدت سے فوت ہو چکی تھی۔ اور بہنیں سب اپنے اپنے گھر اور بچوں والی تھیں اس لئے فرحت کی خدمت کرنے کے لئے خود ہاجرہ کو اجمل کے ہاں جانا پڑا۔

اجمل کا گھر ایللی کے گھر کے پاس ہی تھا۔ چوگان کے شمال کی طرف ایک چھتی مٹی، جسے

ایللی کے گھر میں تیاریاں ہونے لگیں۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ بات سمجھ میں نہ آئی تھی۔ لیکن کچھ ہونے والا ضرور تھا۔ اسی لئے تو علی احمد چھٹی لے کر علی پور آگئے تھے۔ اور دادی اماں کو پاس بٹھا کر اس سے پوچھ پوچھ کر نہ جانے رجسٹر میں کیا لکھ رہے تھے اور ہاجرہ کو ٹھڑی میں کھڑی رو رہی تھی۔ نہ جانے اسے کیا ہوا تھا۔ وہ یوں رونے کی عادی نہ تھی۔

علی احمد نے تو کبھی دادی اماں سے بات نہ کی تھی۔ ماں بیٹے اس مکان میں اجنبیوں کی طرح زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ دادی اماں سارا دن سیدہ کے قریب اکڑوں بیٹھی رہا کرتی تھی اور علی احمد اندر بیٹھ کر حقہ پیا کرتے تھے اور رجسٹروں میں لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ دونوں کی اکثر باتیں کبھی بات نہ ہوتی تھی۔ ایللی اکثر حیران ہوا کرتا کہ یہ کیسے ماں بیٹے ہیں ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کرتے۔ اگر کوئی دادی اماں سے علی احمد کی شکایت کرتا تو وہ اطمینان سے جواب دیتیں۔ ”علی احمد کی تو عادت ہی ایسی ہے۔“ اور پھر مسکرا دیتیں جیسے اظہار ناراضگی کے بارے میں انہیں علی احمد کی وہ بات پسند ہو اور علی احمد کبھی دادی اماں کو بلاتے بھی تو پوچھتے۔ ”بھئی وہ ظالم کام کرنا ہے کیا کیا رسمیں ادا کرنی ہوں گی۔“ اس کے سوا انہوں نے کبھی دادی اماں کو نہ بلایا تھا۔ اندر دادی اماں کپڑوں اور زیور کی بات کر رہی تھی نہ جانے کس کے کپڑوں اور زیور کی بات ہو رہی تھی۔ لیکن اماں ان کی بات سن سن کر روکیوں رہی تھی۔ کپڑے اور زیور کی بات رونے کا کیا مطلب۔ پھر اتفاق سے سعیدہ آگئی اور اماں پھوٹ پڑیں۔

”لو لڑکی کی قسمت ہی پھوٹ گئی میں تو جانتی ہی تھی وہ اپنے رشتہ داروں کے گھر میری پھینک دے گا۔ سو وہی ہوا۔ میری بچی کو فیروز کے بیٹے اجمل کے پلے باندھ رہے ہیں۔ ایللی میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔“

اجمل ایللی کی پھوپھی کا لڑکا تھا وہی اجمل جو روہنگ میں چند ایک ماہ کے لئے ان کے ہاں ٹھہرا تھا۔ جسے علی احمد نے ہاں بنانے اور بن ٹھن کر رہنے پر مار کر نکال دیا تھا۔ ایللی کو جیسی۔ اجمل سے ہمدردی تھی۔ اس کی شکل و صورت بھی ایللی کو بہت بھاتی تھی اور پھر اس کا لڑکا سے میل جول اور باہمی ربط بھی ایللی کو بے حد پسند تھا اور اب تو وہ بہت بڑا ہو چکا تھا اور وہ آٹھ سال ایران میں نوکری کرنے کے بعد لوٹا تھا۔ نہ جانے اماں کو اجمل کیوں ناپسند تھا نہ جانے لڑکیوں کیوں تھیں۔ آخر اجمل میں کیا برائی تھی۔ اماں کا مسلسل روئے جانا ایللی کے لئے ہاجرہ حیرانی تھا! اماں بھی تو عجیب باتیں کیا کرتی تھیں۔ ایک طرف تو اس بات پر اس قدر ناخوش

ملاقات شریف سے ہوئی تھی۔

### شریف

شریف ایک پتا دلا کمزور اور اداس شخص تھا۔ وہ چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ کر حقہ پینے کا عادی تھا۔ دیوار سے سر لگائے کبیل اوڑھے وہ حقہ پینے میں مصروف رہتا۔ اس کی آنکھیں نہ جانے کہاں لگی رہتی تھیں جیسے کہیں لگی ہوں اور وہ خلا کو حسرت بھیر نگاہوں سے گھورتا رہتا۔ کچھ دیر کے بعد ایک مہووم سی آہ بھر کر ایک نگاہ غلط انداز سے گرد و پیش کی طرف دیکھتا اور پھر اپنی دنیائے خیال میں لوٹ جاتا۔ اس کا سردیوار پر ٹک جاتا اور نگاہیں اسی طرح خلا کو گھورنے لگتیں۔

”آؤ ایلے۔“ شریف نے اسے سرسری طور پر بلایا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ ایک نظر اس نے ایلے کی طرف دیکھا اس کی نگاہ میں عجیب سی چمک تھی جو آن کی آن میں لہرا کر غائب ہو جاتی تھی۔ اس ایک ہی چمک میں سب کچھ تھا۔ خلوص، محبت، سادگی، ناکافی، وہ چمک کبھی عیاں ہوتی تھی جیسے ابر آلود رات کو کبھی کبھار چاند ایک ساعت کے لئے مسکرا کر منہ چھپا لیتا ہے۔

وہ ایک چمک نہ جانے ایلے سے کیا کہہ گئی۔ جیسے ہمیشہ کے لئے محبت کا بیان کر گئی۔ ایلے بیٹھ گیا۔ شریف بیگانہ ہونے کے باوجود بیگانہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا اسے جیسے وہ شریف سے مدتوں سے واقف ہو۔ جیسے وہ دونوں پرانے دوست ہوں۔

”ایلے۔“ شریف نے آہ بھری ”کیا وہ ڈائن ابھی تک جیتی ہے بتا۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

”ڈائن“ ایلے نے حیرانی سے دہرایا ”ہاں وہ بڑھیا۔ تمہاری دادی۔“ شریف نے کہا۔ ایلے کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔

”کیا وہ ڈائن کبھی نہ مرے گی۔ کیا وہ اسی طرح دوسروں کی زندگی تباہ کرتی رہے گی۔“ شریف کے چہرے سے حسرت و بربادی چمکتی تھی۔ ایلے کے دل میں شریف کے لئے جذبہ ہمدردی ابھر آیا۔ اس نے ان جانے میں محسوس کیا کہ شریف مظلوم تھا۔ اس پر ظلم توڑے گئے تھے۔

نہ جانے لوگ دادی اماں کو ڈائن کیوں کہا کرتے تھے نہ جانے صفر اس کے سینے میں

گلیارہ کہتے تھے سے گزر کر ایک اندھیری ڈیوڑھی کو پار کر کے اس نے گھر کی سیڑھیاں آتی تھیں لیکن اس اندھیری ڈیوڑھی کو پار کرنا آسان نہ تھا۔ کیوں کہ دوپہر کی کڑکتی دھوپ میں بھی اس ڈیوڑھی میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ اس گھر کے ایک طرف ایلے کے ماموں شمس علی رہتے تھے اور دوسری طرف اس کی خالہ کا کنبہ آباد تھا۔ یہ تینوں گھر دراصل ایک ہی بڑی حویلی کے حصے تھے جسے کسی زمانے میں آصفی بزرگوں نے تعمیر کیا تھا۔ اگر چوبارے سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا کہ نیا گھر علی احمد کے مکان سے ملحق تھا۔ درمیان میں صرف ایک چھت پڑتی تھی۔ اس لئے ایلے عام طور پر ملحقہ کوٹھے سے گزر کر دیوار پھاند کر نئے گھر چلا جایا کرتا تھا تاکہ اسے اندھیری ڈیوڑھی سے گزرنا نہ پڑے۔

اجمل کے والد کسی زمانے میں اکرم ٹیکس کے دفتر میں افسر تھے اب بھی ان کے بھرے اور انداز سے تحکمانہ جاہ و جلال کے آثار ہویدا تھے ان کے چہرے پر حکومت اور صحت کی سرخی جھلکتی تھی۔ اگرچہ انہیں عمدہ چھوڑے کئی سال گزر چکے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ انہیں ایک طوائف جاگلی سے محبت تھی۔ جس کے عشق میں انہوں نے سبھی کچھ کھو دیا تھا اور نوکری سے فارغ ہو کر جاگلی کے یہاں جا متیم ہوئے تھے۔ اجمل کی والدہ بھی عرصہ دراز سے لقمہ اجل ہو چکی تھیں۔ اجمل کی تین بہنیں بقید حیات تھیں۔ سیدہ، رابعہ اور انور، سیدہ نہ جانے کس سے بیابانی ہوئی تھی۔ مگر دادی کے پاس رہتی تھی۔ رابعہ ایلے کے خالہ زاد بھائی پرویز کی بیوی تھی اور انور کی شادی ہمدانی سے ہو چکی تھی جو کسی دور دراز مقام پر کسی مدرسے میں اتالیق تھے۔ ان حالات میں اجمل کا گھرویران پڑا تھا۔ اس کے بیاہ پر اس کے والد آئے۔ بہنیں بھی اکٹھی ہوئیں لیکن جلد ہی وہ سب اپنے اپنے گھر لوٹ گئے اور اجمل کے گھر میں صرف فرحت ہاجرہ اور ایلے رہ گئے تھے۔ اسی لئے ایلے نے محسوس نہ کیا کہ وہ گھر بیگانہ ہے۔ اکثر وہ والدہ کے ساتھ وہیں رہتا رابعہ سے باتیں کرتا رہتا یا پڑوس میں رفیق کے گھر بیٹا جاتا اور یا دوسری طرف پرویز کے والد محسن علی کے پاس جا بیٹھتا۔

”آؤ ایلے آؤ۔“ محسن اسے دیکھ کر چلاتے۔ ”کو علی احمد کیسے ہیں۔ کوئی نئی شادی کرنے تو نہیں سوچ رہے۔“ اور وہ ہنسنے لگتے۔

ایلے کو محسن علی بے حد پسند تھے ان کی باتوں سے سچائی اور خلوص ٹپکتا تھا۔ بزرگ ہونے کے باوجود ان میں قنصع نام کو نہ تھا۔ محسن علی کے مکان سے ملحق دالان میں پہلی مرتبہ اس

نے یہ بول کہاں سے سن رکھے تھے۔ ایللی کو اس کا گانا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ کر بغور سننے میں مشغول رہتا مگر بار بار اس کی توجہ شریف کی طرف منعطف ہو جاتی جو چارپائی پر بیٹھا حقہ تھا۔ بار بار آپس بھرتا کروٹیں بدلتا اور محروم نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھے جاتا۔

### بکھری ہوئی کہانی

نئے گھر میں آنے سے ایللی کا دائرہ ملاقات وسیع ہو گیا تھا اس لحاظ سے وہ نیا گھر اس کے لئے باعث فرحت ثابت ہوا تھا۔ وہاں اسے بہت سے لوگوں سے ملنے کے مواقع میسر آتے رہتے تھے۔ سعیدہ اور شریف سے تو وہ روز ہی ملتا تھا۔ اسے شریف کے متعلق عجیب و غریب تفصیلات کا علم ہوتا جا رہا تھا۔ اکھڑے اکھڑے واقعات بکھری بکھری تفصیلات۔ محلے کی عورتیں بھی تو شریف کے متعلق دبی دبی آواز میں باتیں کیا کرتی تھیں۔ اگرچہ شریف میں وہ خصوصی دلچسپی نہیں لیتی تھیں۔ پھر بھی کبھی کبھار کوئی نہ کوئی بات منہ سے نکل ہی جاتی۔ سانپ تو گزر چکا تھا لیکن لکیر ابھی باقی تھی اور محلہ والیوں کو سانپ کی نسبت لکیر سے زیادہ دلچسپی تھی۔ جب ایللی کسی کے منہ سے شریف کے متعلق کوئی بات سنتا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے اور وہ اس بات کو احتیاط سے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا کرتا اور پھر جب وہ رات کے وقت بستر پر لیٹتا تو سنی ہوئی باتوں کے ٹکڑے جوڑنے میں مصروف ہو جاتا۔

سعیدہ آہ بھر کر بولی ”شریف نے تو جان بوجھ کر اپنی زندگی تباہ کر رکھی ہے۔ جوانی کو روگ لگا رکھا ہے۔ ایسا بھی کیا کہ کوئی اپنا آپ تباہ کرے۔ لو خالہ بھلا اس بڑھیا سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ ہماری تکلیف کا احساس کرے وہ تو بلکہ ہماری بربادی میں خوش ہے۔ اسے تو موقع ہاتھ آیا تھا اور اب کان پھڑوا کر میاں رانجھایا بیٹھا ہے۔ ہر وقت اپنی ہیر کے خیال میں غرق رہتا ہے اور کھڑے ہیر کو کب سے لے بھی گئے بات ختم ہو چکی۔ لیکن اس نے اپنی زندگی تباہ کر رکھی ہے۔ اسے کون سمجھائے۔“

راجہ بولی ”ویسے نام کا شریف ہے لیکن کر توت دیکھو۔ خواہ مخواہ اس بھولی بھالی لڑکی کو بھرا لیا۔ اس بچاری معصوم کو کیا پتہ تھا کہ یہ چال صرف اسے بدنام کرنے کے لئے چلی جا رہی ہے۔ بچاری کو کیا پتہ تھا کہ اس کے ماتھے پر کلک کا ٹیکہ لگانے کے لئے یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ توبہ ہے ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ وہ تو داوی اماں نے بچا لیا ورنہ جانے کیا ہوتا۔“

پناٹے کیوں پھینکا کرتا تھا اور محلے کے تمام لڑکے اس سے خائف کیوں تھے۔ یہ تو ایک حقیقت تھی کہ وہ بچوں کا شور سن کر کھڑکی میں آتی تھیں اور انہیں جھاڑ جھاڑ کیا کرتی تھیں۔ لیکن مرز اس بات پر اسے ڈانٹ کہتا تو روانہ تھا وہ اس کے کردار کے دوسرے پہلو سے کیوں واقف تھے۔ انہیں اس کی بناوٹی تیوری کے نیچے دبی دبی مسکراہٹ کیوں نہ دکھائی دیتی تھی۔ ایللی نے وہ بوڑھی ڈانٹ گھر کے پھلے ہوئے صحرا میں واحد نخلستان تھی۔ محبت کا چھوٹا سا ڈھکچہ چشمہ جو شور مچا کر اپنے وجود کے اعلان کرنے کا عادی نہ تھا بلکہ چپ چاپ بے آواز بیٹھ جاتا تھا۔ ”نہیں۔ نہیں۔ وہ نہیں مرے گی۔“ شریف نے یاس بھری نگاہ ایللی پر ڈالی۔ ”ابھی اے نہ جانے کن کن کے درمیان دیوار بنتا ہے۔“ شریف کی باتوں سے ظاہر تھا جیسے شریف کی زندگی تباہ کرنے میں صرف داوی اماں کا ہاتھ ہو مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ شریف کی زندگی کس انتہا سے برباد ہو چکی تھی اس نے صرف یہ محسوس کیا کہ شریف اس چینی کی پیالی کی مانند تھا، جو میں بال آچکا ہو۔

پہلی ہی نشست میں ایللی شریف کا دوست بن گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ شریف کا دان ہے اگرچہ اسے شریف کے راز کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ شریف سعیدہ کا دیور تھا اور جب کبھی علی پور آتا تو وہ سعیدہ کے یہاں ٹھہرتا کھیل و تفریح کی اس محفل میں جو اکثر سعیدہ کے یہاں لگتی تھی۔ شریف کی موجودگی عجیب سی لگتی جیسے طرہ راگ میں بے برجست سر لگا ہو۔ ایک بات بہر طور واضح تھی کہ شریف عشق کا مارا ہوا تھا۔ اب کو عشق کے منہموم سے پورے طور پر واقفیت نہ تھی۔

عشق بھی عجیب چیز ہے۔ ایللی سوچتا جو شریف کی آنکھوں سے حزن و ملال بن کر جھڈ ہے۔ صدف کی آنکھوں سے رنگ کے چھینٹے بن کر اڑتا ہے۔ اور ارمند کی آنکھوں میں شرارت بن کر کوندتا ہے۔ آخر یہ چیز کیا ہے؟

پھر احاطے کی بند کھڑکی سے داوی اماں کی آواز گونجتی۔ ”اے ہے آج تم نے یہ کیا محفل رکھی ہے۔“ اور شریف سرد آہ بھر کر کہتا ”وہ گدھ بولی۔ چلا رہی ہے۔ اسے زندگی بھر آوازیں اچھی نہیں لگتیں اسے ویرانہ پسند ہے۔“ اس پر باہرہ خود کھڑکی کھول کر کہتی ”مجھے نے آج مولود شریف کو لایا ہے۔“ یہ سن کر داوی اماں بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی۔ پھر سب اصرار پر سعیدہ ٹوپی پہن لیتی اور لگنے لگتی۔ مدینے میں مورے سیاں بالا ہے رے۔ نہ جانے



بھی کی تھی مگر اس کی بیوی شریف کے گھر کے دیرانے میں رہ کر تپ دق کا شکار ہو کر مر گئی تھی یہ کوائف تو اہلی کو معلوم تھے۔ مگر ان جزئیات سے کیا ہوتا ہے اسے توکل سے دلچسپی تھی۔

ہر وقت حقے کی ٹٹی منہ میں دبائے شریف دیوار سے ٹیک لگائے چھت کو گھورتا رہتا اور ساتھ ساتھ مودوم آپس بھرتا اس کی آنکھیں ایک عجیب و غریب خمار سے چھلکتیں اور اس کے منہ سے رال گرتی رہتی۔ ”آؤ اہلی آؤ بیٹھ جاؤ۔“ وہ اہلی کی طرف دیکھ کر اسی محروم انداز سے کہتا اور پھر اہلی کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر اسی طرح دیوار سے ٹیک لگا کر چھت کی طرف ٹٹلی ہاتھ کر دیکھنے میں کھو جاتا۔ اہلی بیٹھے بیٹھے کسی نامعلوم جذبہ کی شدت سے بھیگ جاتا۔ وہ محسوس کرتا جیسے وہ کمرہ شریف کے خلوص سے بھرا ہوا ہو۔ جیسے کمرے کی دیواریں احساس احترام سے کھڑی ہو گئی ہوں۔ جیسے کھڑکیاں منہ کھولے حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی ہوں۔ شریف کی آمد سے اہلی کو انگریزی لمباؤں سے خاص دلچسپی نہ رہی تھی وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ زندگی کی سب سے بڑی عظمت عشق ہے۔ پاکیزہ عشق۔ محروم عشق اور چلتی لڑکیوں کو دیکھنا تو بچوں کا کھیل ہے۔ اگرچہ اسے معلوم نہ تھا کہ عشق کا مطلب کیا ہے۔ مرد عورت سے کیوں محبت کرتا ہے مگر نہ جانے کیسے اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ عشق سے بڑھ کر اور کوئی چیز قاتل حصول نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کس سے عشق کرے۔ کیسے عشق کرے لیکن ان دنوں اس کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ وہ کسی سے عشق شروع کر دے اور پھر ناکام ہو کر شریف کی سی جاویدت پیدا کر لے اور دیوار سے ٹیک لگا کر چھت کو گھورنے میں زندگی صرف کر دے۔ اسے شریف کی زندگی کا یہ پہلو بے حد پیارا لگتا تھا لیکن اس سے ہٹ کر شریف کی باقی ماندہ شخصیت سے اسے گھن آتی تھی۔ مثلاً شریف کا ڈھیلا ڈھیلا پن۔ اس کی چال ڈھال اسے قطعی پسند نہ تھے اور اس کے منہ سے رال سی ٹپکتی دیکھ کر تو وہ کراہت سے منہ موڑ لیتا تھا۔ اس کے لئے شریف کی تین خصوصیات بے حد پیاری تھیں۔ شریف کی محبت بھری نگاہیں، غمناک نگاہیں جن میں ایک مٹھاس اور محرومیت بھرا نشہ رواں دواں رہتا تھا۔ شریف کا بے پناہ خلوص اور شریف کی دوست نوازی۔

حاجی شریف کی رخصت ختم ہو گئی اور وہ واپس اپنی نوکری پر چلا گیا۔ شریف کے جانے کے بعد اہلی کو ایک دن اکھڑا کھڑا رہا۔ ارجمند کے اصرار کے باوجود کپ اور کپ کی طرف متوجہ نہ ہوا نہ ہی اس نے انگریزی لمباؤں کے کھیل میں حصہ لیا۔ اسے صرف ایک دھن گئی تھی کہ وہ

چچی کہنے لگی۔ ”ہن آہستہ بات کر۔ یہاں تو عشق لگا ہوا ہے۔ اس شریف کو دیکھا ہے نے یہ تو پاگل ہو رہا ہے اس کے عشق میں۔ اس لڑکی نے پاگل کر دیا ہے سامنے کھڑی ہو کے۔ دیوانی ہو رہی تھی وہ تو نہ کسی کی شرم نہ لحاظ اور اب یہ لڑکا کسی کو گھر بسائے گا اونٹوں تو بے بہن دیکھ لو اپنی بیوی کو رلا رلا کے مار دیا۔ بیچاری کی خبر تک نہ پوچھی۔ اب کون دے گا اپنی لڑکی۔ اسے تو انوری کی دھن لگی ہے۔ سارا دن آپس بھرتا رہتا ہے اور آنکھیں موند کر پڑا رہتا ہے اسے تو انوری کھا گئی اسے ہے۔ کیسا جوان نکلا تھا۔ پر اب تو دیکھا ہی ہے۔“

داوی اماں نے اہلی کو پاس بٹھالیا ”اے ہے اہلی اب تو ادھر آتا ہی نہیں ایسا ہی جی لگا ہے تیرا اس گھر میں۔ اللہ رکھے یہ تیرا اپنا گھر ہے۔ لوگ اپنے ہی گھر میں رہتے ہی اچھے لگتے ہیں اہلی تو ادھر نہ جایا کر۔ شریف کی بری صحبت میں نہ بیٹھا کر سنا تو نے۔ چھوڑ اس کلمو ہے کو۔ م بھی نہیں۔ وہ تو ہمارا دشمن ہے۔ دشمن نے ہماری عزت کو تباہ کر کے رکھ دیا۔“

شریف نے آہ بھر کر کہا ”لاہور جاؤ گے اہلی۔“ اس نے چھت کی طرف دیکھ کر ایک لمبی بھری۔ ”اس شرم میں رہو گے تم۔ جہاں وہ رہتی ہے۔ آہ۔ اس کے قریب رہو گے۔ اس نے ملنے جایا کرو گے کتنے خوش نصیب ہو تم۔ انہوں نے اسے زبردستی ہمدانی سے بیاہ دیا۔ زبردستی اسے ڈولی میں ڈال دیا۔ روتی چیختی چلاتی ہوئی کو ڈولی میں ڈال دیا۔ اہلی ان ڈانٹوں نے اسے جی مار دیا۔ لیکن پھر بھی وہ میری ہے اس کی منور روشنی میرے لئے ہی مخصوص ہے۔ کتنی ہے اس میں کتنی پاکیزگی ہے۔ تم وہاں رہو گے جہاں وہ رہتی ہے۔ کتنے خوش نصیب ہو تم۔ اس نے لمبی آہ بھری اور آنکھیں موند لیں۔

محلے میں شریف کی داستان کے ٹکڑے جا بجا بکھرے تھے اور اہلی انہیں جوڑنے پر مصروف تھا۔ نہ جانے انوری کون تھی۔ جس سے شریف کو عشق تھا نہ جانے وہ حسینہ کون تھی جس نے خاندان کے ننگ و ناموس کو تباہ کر دیا تھا۔ بہر حال اسے شریف سے ہمدردی تھی۔ چاہتا تھا کہ شریف اسے اپنا قصہ سنائے مگر شریف کے سامنے اس خواہش کا اظہار کرنے کی بات نہ پڑتی تھی۔ بہر حال شریف کی آنکھوں کی چمک اور اس کا دکھی انداز اسے بے حد پیارا معلوم ہوتے تھے۔

ظاہر تھا کہ شریف اپنے گزشتہ ناکام عشق کی محرومی میں ابھی تک ڈوبا ہوا تھا اس نے

یا بھی مہربان ہوتے تو دونوں انگلیوں میں گوشت کا ٹکڑا یا کوئی اور کھانے کی چیز پکڑ کر چلاتے ”ایلی یہ لے۔ ایلی۔“ اس کے علاوہ کبھی ایلی کی طلبی نہ ہوئی تھی اور نہ ہی انہوں نے محسوس کیا تھا کہ وہاں ان کے قریب چند ایک گز کے فاصلے پر ایک لڑکا ایلی بھی رہتا تھا۔

ٹھیم کے آنے کے بعد چند ایک دن کے لئے تو علی احمد کے کمرے میں ٹھیم ٹھیم کی آوازیں گونجتی رہیں اور ٹھیم کی آواز مدھم سرگوشیاں کرتی رہی۔ پھر وہ سرگوشیاں معدوم ہوتی گئیں اور بالاخر ایلی کو اس کمرے سے سسکیں سنائی دینے لگیں اور ٹھیم کا انداز محرومیت کا غماز ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑتی گئی اور علی احمد کی کھنکھار میں درشتی کا انداز واضح ہوتا گیا۔ جلد ہی کور پھر سے آ موجودہ ہوئی اور بند کمرے کے پیچھے اس کے دانت چمکنے لگے۔ ”باہو جی کے مزاج ٹھیک ہونے والے ہیں۔“ وہ پتھے کی رسی گھما کر کتہی اور ٹھیم باورچی خانے میں حیران نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی جیسے کہیں کھو گئی ہو۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس پر دوسرے کمرے میں ہاجرہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی رفیقہ مسکراتی اور اپنا بدن سیلا کر ہاجرہ سے کہتی ”ہائے اب کیا ہو گا۔“ اور ایلی غصے سے کھولتا اور اس کا جی چاہتا کہ چلا چلا کر کہے ”اب میں دسویں جماعت میں ہوں۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اب میں دیکھوں گا کہ یہاں کون آتی ہے۔“

”ایلی کور کے لئے پانی لاؤ۔ ایلی“ علی احمد کی کھنکھار سن کر اس پر سکتے کا عالم چھا جاتا۔ جسم پر سویاں سی جلنے لگتیں اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ ”آیا جی۔“ اس وقت وہ یہ حقیقت بھول جاتا کہ وہ دسویں میں ہے اور گھر میں عورتوں کا آنا جانا برداشت نہیں کر سکتا اور وہ بوتل اٹھا کر باہر نکل جاتا۔

کنوئیں کے پاس پہنچ کر اس کے حواس درست ہوتے۔ دھند لکا دور ہو جاتا اور ٹھیم کے حنا ملیدہ ہاتھ فضا میں لٹکتے دکھائی دیتے اور اس کی آنکھوں کا فرق اس قدر نمایاں ہو جاتا کہ وہ چونک پڑتا اور محسوس کرتا۔ جیسے وہ ایلی کی مدد مانگ رہی ہو۔ جیسے وہ ایلی کی پناہ لے رہی ہو۔ اس خیال پر وہ کنوئیں پر بوتل رکھ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا۔ ”میں دسویں جماعت میں ہوں۔ میں اب بچہ نہیں میں دیکھوں گا اس گھر کو کون تپاک کرتا ہے۔“ پاؤں کی ٹھوک سے وہ بوتل کو گرا دیتا جو کنوئیں کی منڈیر پر لڑھک لڑھک کر نیچے جا گرتی ”مجھے دسویں پاس کرنا ہے۔ مجھے ضرور دسویں پاس کرنا چاہئے۔ ورنہ یہ گھر کبھی پاک صاف نہ ہو سکے گا۔ مجھے دسویں پاس کرنا ہی ہو گا۔“

کسی سے باقاعدہ عشق کرے کسی سے عہد و بیان کرے اور پھر اسے نبھانے کے لئے زندگی وقف کر دے۔ لیکن کوئی بھی تو نہ تھی جو اس سے عہد و بیان کرنے پر مائل نظر آتی ہو کوئی اسے غلام میں نہ لاتی تھی۔ بڑی عورتیں اسے قابل التفات نہ سمجھتی تھیں اور چھوٹی لڑکیوں میں اسے فحاش کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بہر حال کچھ دیر کے بعد ہی شریف کا وہ اثر معدوم ہو گیا اور ایلی پھر سے ارجمند کے راجہ کھیل میں حصہ لینے لگا۔ لیکن یہ شمولیت محض ایک قریب تھا ایک دکھاوا تھا دراصل ایلی کی حشر کرنے کی خواہش سمٹ کر اس کے دل کی گہرائیوں میں بیٹھ گئی تھی۔

## میٹرکولیشن

پھر دسویں کے امتحانات قریب آ گئے اور ایلی کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی اور وہ پھر آباد کیلئے عازم سفر ہو گئے۔ بام آباد پہنچ کر آہستہ آہستہ شریف اس کے ذہن سے خارج ہو گیا۔ بام آباد میں اب وہ اکیلے نہ تھے۔ ان کے ساتھ ٹھیم تھی۔ اس کے حنا ملیدہ ہاتھ۔ فیروز کی چادر اور چٹے سفید چوڑے چرے سے سارا گھر بھرا ہوا تھا کبھی کبھار اس کے حنا ملیدہ ہاتھوں کو دیکھ کر ایلی محسوس کرتا جیسے صفیہ پھر سے جی اٹھی ہو۔ اس خیال پر وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ ٹھیم کے خوابیدہ چرے کو دیکھ کر۔ اس کی نیم مردہ آنکھوں کو دیکھ کر جن میں عجیب سی بے ربطی تھی، ایلی مایوس ہو جاتا ”نہیں یہ صفیہ تو نہیں۔ اس میں وہ بات ہی نہیں۔“ اس احساس کو شدت سے محسوس کر کے ایلی کی نگاہ میں ٹھیم کے ہاتھوں کا رنگ اڑ جاتا اور اسے محسوس ہوتا جیسے وہ ہاتھ سفید نہیں بلکہ پیلے ہیں اور وہ پیلا پن رنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ بے جان ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس کے بعد اس کے لئے گھر میں رہنا مشکل ہو جاتا اور وہ باہر گھنٹام اور ایشر لال لال طرف نکل جاتا اور پڑھنے کے بہانے ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتا رہتا اور یہ محسوس کرتا کی کوشش کرتا کہ اسے ان سے عشق ہے، عشق پیارا۔ دن وہ ایشر لال یا گھنٹام کے پاس گزرتا اور پھر شام کو کتابیں اٹھا کر گھر کی طرف چل پڑتا۔

گھر کے قریب پہنچتے ہی وہ رک جاتا۔ کہیں علی احمد نہ دیکھ لیں کہیں وہ نہ پوچھ لیں کہ ”آج کیا پڑھا، علی احمد کا ڈر اس کے دل پر بوجھ بن جاتا حالانکہ گھر میں علی احمد نے اسے کچھ نہ کہا تھا۔ کبھی چلم بھرنے کے لئے اسے بلاتے یا بازار سے سودا لاتا ہو تو اسے آواز دیتے“

اور اس کی بومحسوس کر کے اس کی طبیعت ماش کرنے لگتی تھی اور جسم کا بند بند لرز جاتا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں حنائی ہاتھ لگتے تھے۔ اس کی جانب بڑھتے۔ وہ گھبرا کر سمٹتا اور پھر ایک جھرجھری اسے جھنجھوڑتی ایک ہوائی سی چل جاتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کیوں۔ اس کا دل چوری چوری خواہش کرتا کہ وہ ہاتھ اسے تھپک تھپک تھپک کر سلا دیں اور ایک بھرا ہوا جسم اس پر جھک جائے۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ کیپ کی بجائے کوئی بڑے سے جسم اور گدے جیسے گول گول رنگین ہاتھوں والی اس جتن کے پیچھے کھڑی ہو اور وہ محسوس کرے کہ ایلی اس کی طرف دیکھ رہا ہے لیکن بھرے جسم والیاں تو اسے خاطر ہی میں نہ لاتی تھیں نہ جانے کیا سوچتی رہتی تھیں وہ ایلی۔ چوری چوری ان کی طرف دیکھتا اور پھر گھبرا کر ان کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا اور بلاخر ان کے پاؤں کو گھورتا لیکن انہیں احساس ہی نہ ہوتا کہ کوئی دیکھ رہا ہے کن نظروں سے دیکھ رہا ہے انہیں کام کاج سے اتنی فرصت ہی نہ ہوتی کہ ایلی کی نگاہوں یا اس کی موجودگی کو محسوس کریں۔ ایلی چاہتا تھا کہ وہ اس کی موجودگی کو محسوس کریں۔ ایلی چاہتا تھا کہ وہ اس کی نگاہوں کو محسوس کر کے لے جائیں۔ اپنا آپ سمیٹیں۔

### ہاکی سنک

اسے چپ دیکھ کر داوی اماں چلائی۔ ”ایلی کیا ہے تجھے یوں گم سم بیٹھ رہتا ہے تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے تجھے یا تو سارا دن اللہ مارے لڑکوں کے ساتھ لگا رہتا ہے یا گھر میں آکر یوں گم سم بیٹھ رہتا ہے۔“ ایلی یہ سن کر داوی اماں سے لپٹ جاتا۔ انہیں دیکھ کر سر گھٹنوں میں دے کر مسکراتی اور داوی اماں چیختی۔ ”اے ہے اب تجھ سے لڑائی کون لڑے تو یہ — کتنا بڑا ہو گیا ہے تو — ابھی کل اتنا سا تھا اور آج دیکھو — شرم تو نہیں آتی۔ تجھے بوڑھی جان کی ہڈیاں توڑتے ہوئے۔ جا — کھیل جا کے اس سے تو کھیلنا ہی اچھا۔“

داوی اماں کو چھوڑ کر وہ سیدھا رضا کی دوکان پر جا پہنچا۔ اب رضا اس کا دوست بن چکا تھا۔ رضا کی دوکان محلے کے اونچے بازار میں تھی میلے سے دروازوں کے پاس دھندلی دیواروں کے درمیان کئی ایک گتے کے ڈبے رکھے ہوئے تھے، جن میں مختلف اشیاء پڑی تھیں۔ ایک میں ربو کے گیند تھے، ایک میں بچوں کے چوڑے کی مٹائی۔ ایک میں لڑکیوں کے بالوں کے لئے پینیں اور

اگر ایلی کو گھر کی ہلاکی کا خیال نہ ہوتا اگر شمیم کے حنا ملید ہاتھ اس کے سامنے فضا میں محرومیت سے نہ لگتے اگر کور کے سفید دانتوں سے اسے شدید نفرت نہ ہوتی تو شاید ایلی کو دسویں پاس کرنے میں کامیاب نہ ہوتا۔ سکول میں وہ ایک تالائق لڑکا تھا نہ تو اسے پڑھنے کا شوق تھا نہ وہ ذہن تھا جماعت کے لڑکے اس کی باتوں پر ہنسا کرتے تھے اور استاد اس کی تالائق پر غور لگایا کرتے تھے۔

جوں جوں امتحان قریب آتا گیا، شمیم کی نگاہیں اور بھی محروم ہوتی گئیں۔ کور کے دانت ابھی چپکیلے ہوتے گئے۔ علی احمد کی کھسکار میں اور بھی درشتی پیدا ہوتی مٹی اور ایلی کا عزم اور کثرت حاصل کر گیا۔ اب وہ رات کو چپکے سے کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور چوری چوری اسے کرتا رہتا۔ علی احمد کی الماری میں بہت سی کتابیں تھیں۔ گرائمر، یو سی، پریپوزیشنز، ہر چیز پر طبع کتاب تھی اور وہ باری باری انہیں الماری میں سے نکالتا اور چوری چوری پڑھتا۔

اس کے باوجود وہ امتحان کا نتیجہ سن کر حیران رہ گیا اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ پاس ہو گیا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس نے پرچے بھی تو اچھے نہ کئے تھے لیکن زیادہ تعجب کن بات یہ تھی کہ دسویں جماعت پاس کرنے کے باوجود وہ وہی ایلی تھا۔ جیسے پہلے تھا۔ اس میں ذرا بھی توفیق آیا تھا کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ علی احمد کی کھسکار سن کر اس کا حلق ویسے ہی سوکھ جاتا تھا۔ جسم پر ویسے ہی چوٹیاں ریگنے لگتی تھیں اور جی ہاں کہہ کر وہ اسی طرح بوتل اٹھا کر کنوئیں کی طرف چل پڑتا تھا۔ اس کی آنکھوں تلے شمیم کے حنا ملید ہاتھ اسی طرح بے بسی سے لگتے تھے اس کے سوا وہ کیا کر سکتا تھا کہ کور کی بوتل کو ٹھوکر مار کر گرا دے اور کور کی بوتل میں تو

دسویں پاس کرنے کے بعد وہ علی پور آگیا اور پھر داوی اماں کے پاس رہنے لگا۔ داوی اماں کے پاس رہنے میں کس قدر آرام تھا۔ اسے نماز پڑھتے اور تسبیح کے دانے پھیرتے دیکھ کر اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ داوی اماں کا گھر کس قدر پاکیزہ تھا۔

داوی اماں کے گھر کی پاکیزگی پر مسرور ہونے کے باوجود وہ ارجحند سے انکراینڈی اماں، مصروف ہو جاتا اور جب وہ کنوئیں کے پاس جا کر ریشمی ردال ہلاتے اور بانسری بجاتے تو کب کبھی کی جتن میں ہلکی سی لرزش پیدا ہو جاتی۔ ایک آنکھ ابھرتی مگر ایلی کو نہ جانے کیوں سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اس کے ذہن میں تو حنائی ہاتھ رقصاں تھے۔ اگرچہ حنا کا رنگ دیکھ

مٹائی فڈ کا نام سن کر جمیل غصے سے گھونہ گھاتا۔ ”لنگڑے دوسری ٹانگ کی جانا۔ اے چاہنے۔“ جمیل اندر داخل ہوتا۔

پھر وہ تاش کی بازی شروع کر دیتے اور دیر تک تاش کھیلتے رہتے۔ حتیٰ کہ کوئی آکر ایلی خروار کر دیتا کہ دادی اماں کھڑکی میں بیٹھی ہر آتے جاتے سے اس کے متعلق پوچھ رہی ہے اور ملے کے تمام لڑکوں کو گالیاں دے رہی ہے۔ پھر ایلی چپ چاپ اٹھ کر گھر کی طرف چل پڑتا۔ راستے میں کنوئیں کے قریب یا لالٹین کے پاس ارچند اسے دیکھ کر چلاتا۔

”ارے یار غضب ہو گیا۔ ایلی آج تو وہ ہمارے گھر آگئی۔ ظالم نے نیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ نیلا سوٹ اور سفید رنگ۔ توبہ ہے۔“

”میں ذرا گھر جا رہا ہوں۔“ ایلی جواب دیتا۔

”پاگل ہو۔“ ارچند چلاتا ”آج — اور گھر وہی بات ہوئی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا۔ بھی آج خاص دن ہے۔ آج نہیں جا سکتے تم تمہیں پتہ نہیں اس کی سہیلی آئی ہوئی ہے۔ وہ دیکھو وہ — سبحان اللہ کیا سہیلی ہے۔ کجخت۔ اندر کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔ یہ گھر آج آہا۔ وہ دیکھو۔ چاند سا کھڑا نکل آیا۔ ذرا جتن اٹھا کر میری جان۔ منہ دھوئے بغیر کیا پھین ہے۔“ بلم کریں توری اکھیاں۔“

نہ جانے کیوں ایلی محسوس کرنے لگا تھا کہ ارچند محض گزریوں کا کھیل کھیل رہا ہے۔ بے جان گڑیاں جو لپائیں جھینپتیں، ظاہر ہوتیں اور چھپ جاتیں اور پھر کھلکھلا کر ہنستیں اور چلا چلا کر باتیں کرتیں۔ اس وقت ایلی کی نگاہوں تلے دو بھرے بھرے بازو نکلتے۔ مخروطی بانسوں کی بلندی نضا پر چھا جاتی۔ اور بھرے بھرے جسم میں خاموش بجلیاں سی رواں دواں ہوتیں۔ یوں مکھ میں صبح سے شام ہو جاتی اور رات کو بستر پر پڑے پڑے وہ سوچتا۔ کس سے عشق کدوں۔ کس سے۔

\*\*\*

کلب تھے۔ دو ایک گتوں پر چمکدار بیٹن لگے ہوئے تھے۔ ایک گتے پر لوہے کی چوٹیاں چٹنی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں مٹی اور ربڑ کے چند کھلونے رکھے ہوئے تھے۔ ان ڈبوں کے پاس رونا بوریے پر بیٹھا رہتا تھا۔ جس کے قریب ہی اس کا پلڑا کر چلنے والا سونا پڑا ہوتا تھا اور سونے کے پاس اس کا مضحکہ خیز جوتا۔ اس جوتے کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آجاتی کیونکہ اس کا ایک پاؤں تو عام جوتے کے سائز کا تھا اور دوسرا ٹیڑھا اور بچکانہ۔ رضا کی ٹانگوں کو دیکھ کر ایک ساعت کے لئے ہر نوار دچو نکتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اپنی ٹانگ کے پاس اس نے لنگڑی کی ایک مڑی ہوئی کھوئی ڈال رکھی ہو۔ لوگوں کو اپنی ٹانگ کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ چلاتا۔ ”میری طرف دیکھو باہو۔ میری طرف۔ یہ کھوئی بکاؤ نہیں۔“ اور پھر منہ پکا کر لیتا یا ہنس کر کہتا ”پسند ہے یہ؟ ایک تم کو بھی دلا دوں۔“ رضا اپنی لنگڑی ٹانگ پر شرمندگی محسوس کرنے کے بجائے فخر محسوس کرتا تھا ”یار“ وہ دوستوں کے درمیان کھونٹے کے سارے کھڑا ہو کر لنگڑی ٹانگ کو گھما کر کہتا ”اللہ میاں نے مجھے تو ایک ہاکی دے رکھی ہے کیا سمجھا ہے تم نے اسے کسی سے لڑتے وقت رضا کو اپنے حریف کو پچھاڑتے ہوئے دیکھ کر ایلی محسوس کرتا جیسے لنگڑا ہونا خصوصی نعمت ہو۔ رضا یوں حریف سے چٹ جاتا۔ جیسے جزیرے کا بڈھا پیر قسمہ پا ہو اور پھر اس مڑی ہوئی کھوئی سے واقعی یوں کام لیتا گویا وہ ہاکی سنگ ہو۔

لیکن رضا بعد ”لڑنے سے گریز کرتا تھا ہر بات کو مذاق میں اڑا دینے کی قابلیت گویا اس نے ورثے میں پائی تھی اور پھر اس کی باتیں سن سن کر محلے کے لڑکے ہنس ہنس کر پاگل ہو جایا کرتے تھے۔

ایلی رضا کے پاس جاتا تو وہ اٹھ بیٹھتا ”آؤ ایلی آؤ۔ میاں بیٹھو“ وہ دکان کے اندر ایک بورا بچھا دیتا۔ ”تاش کھیلیں۔ سیر کرو گے تو چلتے ہیں دکان بند کر کے چلتے ہیں۔ چلو۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ ایلی چلاتا ”میں تو ویسے ہی آیا تھا بیٹھنے کے لئے۔“

”اچھا تو ٹھیک ہے۔“ اور وہ دونوں بیٹھ جاتے انہیں پاس بیٹھ کر باتیں کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ چپ چاپ دونوں بیٹھے رہتے اور رضا حسب معمول ساتھ دلا حکیم تمباکو فروش اور بیڑی فروش پر بچتیاں کستا رہتا اور ایلی ہنستا رہتا۔ پھر جمیل اوھر نکلتا۔

”اے بھائی جمیل۔ جمیل۔ کہاں جا رہے ہو۔“ رضا چلاتا۔ ”کچھ مٹائی فڈ ہے نا آج ہم بھی چلتے ہیں۔ ایلی بھی بیٹھا ہے۔ میاں اندر دکان میں ہے۔“

”داوی اماں پوچھ رہی تھیں۔“ لڑکے میٹھی روٹیاں پکا دوں تجھے۔ ساتھ لے جانا۔ اے ہے گاڑی میں بھوک لگے گی تو کیا کرے گا۔“

چند ایک گھنٹوں میں ایلی کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے پاس تھا ہی کیا کہ سنبھالنے میں دیر لگتی۔ دو قیص چار ایک پا جائے ایک پرانا کوٹ اور ایک گھسا ہوا جوتا۔

لاہور پہنچ کر علی احمد نے اسے تانگے پر بٹھایا وہ تانگہ اٹھیں گندے اور بھیڑ سے بھرے بازاروں میں سے گھماتا ہوا بھلائی دروازے لے گیا۔ یہ کیسا لاہور تھا۔ کیا یہ وہی لاہور تھا۔ جہاں موتی نے اسے سیر کرائی تھی۔ یہ لاہور اس لاہور سے کس قدر مختلف تھا۔

ایلی کی سمجھ میں نہ آیا پھر بھی اسے تسلی تھی کہ وہ لاہور آگیا ہے اب اسے گھر میں دیک کر رہنے کی کوفت سے نجات مل جائے گی۔ اب اس سے کوئی نہ کہے گا ”ایلی حقہ بھر دو۔“ اب اسے کونئیں سے بول میں پانی بھرنا نہیں پڑے گا اور علی احمد کا کمرہ دور ہو گا۔ بہت دور۔ اب کوئی آسا محن میں بیٹھ کر تنکے سے زمین پر لکھنے میں مصروف دکھائی نہ دے گا اور نیم وا دروازے سے رضامندی بھرے سفید دانت نہ چمکیں گے۔ اب اسے ہر چیز خریدنے کے لئے علی احمد کے سامنے ہاتھ پھیلانے نہ پڑیں گے۔ جب وہ علی احمد سے پیسے مانگتا تھا تو —تو یہ ہے وہ ایک جملہ کتنا دو بھر ہو جاتا تھا اور —اور جب وہ کچھ کہہ چکتا تو علی احمد کے جواب دینے سے پہلے دنیا پر سناٹا چھایا رہتا۔ زندگی گویا جم کو برف کی سل بن جاتی اور پھر جب علی احمد اچھا کہتے تو گویا ”کن“ کی آواز آتی اور وہ ابجد اور قحط ختم ہو جاتا اور چاروں طرف زندگی از سر نو بیدار ہو جاتی۔ لیکن علی احمد اچھا کہاں کہتے تھے۔ اب اس کی اپنی جیب میں پیسے ہوں گے اور وہ مونگ پھلی خرید سکے گا اور گڑ کی ریوٹیاں — کتنی کڑا کے دار ہوتی ہیں گڑ کی ریوٹیاں۔ عیش خالص عیش۔ اتنی آزادی۔ اتنی آزادی اسے مل جائے گی کیا۔ وہ حیران تھا۔

### گلیاں ہی گلیاں

رات علی احمد اور ایلی نے ایک عزیز کے یہاں بسر کی اور صبح سویرے ایلی کو ساتھ لے کر علی احمد کالج کی طرف چل پڑے — ”ہائیں یہ ابا کدھر جا رہے تھے۔“ ایلی سوچنے لگا۔ یہ تو گلیاں ہیں۔ تنگ و تاریک گلیاں — کیا کالج گلیوں میں ہوتے ہیں اور گلیاں فضول گھومے جا رہی تھیں۔ لیکن وہاں کالج تو نہ تھا کوئی۔ وہاں تو عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ کھڑکیوں سے لٹکتی

## شہزاد

### لاہور

ایلی کو علی پور میں رہتے ہوئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ علی احمد آگئے اور آئے ہی بولے ”ایلی کالج میں داخل ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ کل ہم جا رہے ہیں۔“ ایلی کے جہ میں ایک ہوائی سی چھوٹ گئی۔ لاہور وہ لاہور جہاں وہ اپنے ماموں قیوم کے ساتھ گیا تھا وہاں یہ اخبار محلے میں جہاں قیوم رہتا تھا۔

شام کے وقت جب قیوم اسے تانگے میں بٹھا کر سیر کو لے گیا تھا۔ سفید گھوڑی والا تانگہ جس کا کوچوان بوڑھا ہونے کے باوجود اس قدر زندہ دل تھا ”موتی بیٹی۔ آج بابو جی کو سیل کر رہے ہیں۔“ چل بیٹی دولہن کی چال چلیو۔ چل۔“ اور موتی یوں چلنے لگی تھی جیسے اس کی ہاتھ تلے چھوٹے چھوٹے پیرے لگے ہوئے ہوں۔ گردن کے بال لہرا رہے تھے۔ نیچے سڑک پانی دھارے کی طرح بہہ رہی تھی اور یہ دھارا چوڑا ہوتا جا رہا تھا اور چوڑا۔ اور چوڑا۔ سڑک دونوں کناروں پر سرسبز درخت اور اونچی عمارتیں ناچ رہی تھیں۔

پھر مکانات اور عمارتیں کم ہوتے گئے۔ ان کی جگہ دونوں طرف گھاس کے سبز قطعے بن گئے جن میں سے رنگ رنگ کے پھول سر اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے۔ سرسبز درخت جھوم رہے تھے۔ خاکستری ٹیلے لڑھک رہے تھے۔ سڑک بھورے فیتے کی طرح چل رہی تھی۔ سبز چمن کھبوں پر بتیاں یوں ٹٹمنا رہی تھیں جیسے جگنو چمک رہے ہوں۔ وہ لاہور!

لاہور کا نام سنتے ہی وہ اٹھ بھاگا۔ ”داوی اماں میری قیص کہاں ہے داوی اماں میرا“

”جی۔ جی۔ جی۔“ ایللی گھبرا گیا۔  
”جی جی کیا۔ سیدھی بات کرو۔“

وہ چلا گیا تو ایللی اٹھ بیٹھا۔ اس کے ارد گرد دیواریں گھوم رہی تھیں۔ ہوٹل میں ہر طرف اونچے لمبے جاٹ قسم کے لڑکے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ”ٹھہراؤ لوٹو۔“ کہاں جا رہا ہے تو مار رہے تھے۔ منہ پڑا رہے تھے۔ ”ایللی بھاگنے لگا۔ ایک بھدی سی آواز پیچھے سے چلا رہی تھی۔“ ٹھہراؤ لوٹو۔“

ارے یہ لڑکیاں کہاں سے آگئیں۔ ”ایک لڑکا ایللی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے زبردستی ایللی کی ٹھوڑی پکڑ لی اور اس کے منہ کو چاروں طرف گھما کر بولا ”یہ دیکھو ماں کالا۔“ ابھی ماں کا دودھ پینا نہیں چھوڑا اور آئے ہیں یہاں کالج میں داخل ہونے کے لئے۔ ماں کے پیٹ ہی سے دسویں کر کے آتے ہیں۔“

خوف سے ایللی کی حرکت قلب بند ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی کپٹیاں تھرک رہی تھیں ”جا اپنی ماں کی گود میں جا کر بیٹھ۔“ اس نے دھمکی دے کر کہا ”دوڑائی کی گود میں جا کر بیٹھ۔“ پھر ایللی کو کچھ معلوم نہیں۔ وہ بھاگ رہا تھا۔ سڑکوں پر بھاگ رہا تھا۔ بھیڑ کو چرتا ہوا جا رہا تھا۔ لوگ اس کی طرف منہ اٹھا ٹھاکر دیکھ رہے تھے وہ زیر لب ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ ”ماں کی پیٹ سے دسویں پاس کر کے آتے ہیں۔“ ”یہ دیکھو ماں کالا۔ باہا۔“

سارا لاہور اس کے راز سے واقف تھا۔ بسبھی اس پر ہنس رہے تھے ”پکڑ لو۔ پکڑ لو۔“ وہ پھر بھاگ اٹھا۔ لڑکیاں نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتیں۔ عورتیں ہاتھ چلا کر باتیں کرتیں۔ تانگے والے اس کا منہ اڑا رہے تھے۔ ”ہٹ باہو۔“

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بھاگ کر دادی امں کے پاس جا پہنچے اور وہ اسے تھپک تھپک کر سلا دے۔ ”کیا ہے تجھے ایللی۔ سو جا۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ اور پھر مطمئن ہو کر وہ رضا کی دکان میں جا بیٹھے۔ ”آؤ پاؤ ایللی۔ بیٹھ جاؤ۔“ اور وہ پر وقار انداز سے بیٹھ جائے یا ارجند کے پاس جا کھڑا ہو۔ ”ایللی وہ دیکھو بین جی اور ناگ مست ہوا ہے نا۔“ وہاں اس کی اہمیت تھی۔ وہاں لوگ اسے ماں کالا نہیں سمجھتے تھے وہاں اس کی باتیں ایک حیثیت رکھتی تھیں۔

بازار میں جگہ جگہ چھابڑی والے مونگ پھلی، ریوڑیاں اور پنے بچ رہے تھے لیکن اسے کچھ بھی تو دکھائی نہ دے رہا تھا۔ چاروں طرف بھیانک دھند لگا چھایا ہوا تھا اونچے اونچے کھجے سروں پر

ہوئی عورتیں۔ منڈیروں سے جھانکتی ہوئی عورتیں۔ چوکیوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں۔ بل بلاتی ہوئی۔ دانتوں پر دنداسہ لیتی ہوئی دوپٹے سنبھالتی ہوئی۔ لجاتی ہوئی۔ گھورتی ہوئی۔ چپ ہوئی۔ چلاتی ہوئی عورتیں۔ اور وہ گلیاں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں ایک ختم ہوئی اور دوسری شروع ہو جاتی۔ ایک مڑ جاتی تو دوسری کھل جاتی۔ گلیاں ہی گلیاں۔ تنگ کھلی۔ پور گلیاں۔ جہاں علی احمد کے سوامر گردن جھکائے گزرتے تھے اور میاں سید اجمار کر چل رہے تھے۔ وہ تھک گیا مگر گلیاں چلے جا رہی تھیں اور ان میں علی احمد سر اٹھائے منڈیروں کی طرف دیکھتے ہوئے شانہ انداز سے یوں چل رہے تھے جیسے باغ میں ٹہل رہے۔ دفعتاً ”گپ ختم ہو گئیں۔ چوڑی سڑک آگئی۔“ ”وہ تمہارا کالج ہے۔ ایللی“ علی احمد نے سامنے والی سڑک کی طرف اشارہ کیا ”اور دیکھا یہ۔“ وہ گلیوں کی طرف اشارہ کر کے بولے ”یہ لاہور ہے لاہور۔“

## ماں کالا

علی احمد دو دن وہاں ٹھہرے۔ ایللی دعائیں مانگتا رہا کہ وہ جلد رخصت ہوں اور اسے آزادی حاصل ہو لیکن جب سب کام مکمل ہو گیا۔ فیس ادا کر دی گئیں۔ کتابیں میا کر دی گئیں۔ بورڈنگ میں 17 نمبر کے کمرے میں اس کی چارپائی رکھوا دی گئی اور علی احمد رخصت ہونے لگا تو نہ جانے کیوں وہ گھبرا گیا۔

بورڈنگ میں لڑکے ہی لڑکے بھرے پڑے تھے۔ بڑے بڑے لڑکے۔ اونچے لمبے بھرے جسم کے مرد نما لڑکے عجیب سے چروں والے لڑکے بڑی رعوت سے گھورنے کے لیے بھرے تھے۔ جو ڈانٹ کریوں بات کرتے جیسے تھانے دار ہوں۔ ”اے لڑکا۔ ادھر آؤ۔“ اور ”اے کون ہو۔ کون ہو تم۔“ وہ ہر وقت مونچھیں مروڑتے۔ اپنے تہ بند جھاڑتے رہتے۔ کیا پاجاموں کی جگہ انہوں نے بڑی بڑی چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ جن کے تلے طلائی جوتے تھے جن کی نوکیں نکلی رہتی تھیں۔ ان لڑکوں کے ساتھ عمر رسیدہ نوکر تھے جو انہیں حقہ پلاتے۔ علاوہ مٹھی چانی میں مصروف رہتے۔ ایللی انہیں دیکھ کر ڈر گیا اور پھر سم کر سترہ نمبر کے کمرے میں دیک کر بیٹھ گیا۔

”اے تو کون ہے؟“ ایک لبا ترنگ لڑکا کمرے میں آگھا ”کون ہے تو؟“



”جی جی نہیں۔ میں تو۔“

”بھاگ جا یہاں سے ورنہ پولیس کو بلائیں گے۔ دوڑ۔“

ایلی پھر بھاگ رہا تھا۔ نہ جانے کہاں کس طرف۔ لوگ اسے مشتبه نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پولیس مین کے سامنے پہنچ کر وہ گھبرا جاتا اور آنکھ پجاکر نکل جانے کی کوشش کرتا۔ نہ جانے کیوں وہ اپنے آپ کو چور سمجھنے لگا تھا۔ آوارہ۔ چور پلیٹ فارم پر وہ ایک بچہ پر پڑ گیا۔ اسے مسافر خانے کے بچہ پر پڑے دیکھ کر پولیس والا آدھمکا۔

”ہے۔ کون ہے۔ تو۔ کہاں جائے گا؟“

”جی جی۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔

”کہیں بھی نہیں۔“ وہ بولا

”تو یہاں کیوں پڑا ہے؟“

”میں۔ میں۔“ وہ گھبرا گیا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔ نہ جانے اسے کیا کرنا چاہیے تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

”بھاگ یہاں سے۔“ حوالدار نے مونچھوں کو تآؤ دیتے ہوئے کہا۔

ایک بار پھر وہ دیران لاہور کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ جہاں خوفناک شکلوں والے کتے بھونک رہے تھے۔ ہر قدم پر وہ محض ٹھک جاتا۔ رک جاتا۔ نہ جانے کہاں سے کوئی آنکھ لگا۔ کتا بھونکے گا یا کوئی حوالدار مونچھے مروڑ کر اسے گھورے گا۔ تو بہ کس قدر دیران شہر تھا وہ کتنی چوڑی سڑکیں تھیں وہاں اور وہ کھبیوں پر ٹنگی ہوئی بتیاں یوں ٹٹاری تھیں۔ جیسے کسی ڈائن کی آنکھوں کی پتلیاں ہوں۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا آخر وہ پولیس والا یہی پوچھتا تھا تاکہ کہاں جائے گا۔ ٹکٹ کہاں ہے تیرا۔ اس خیال پر وہ پھر سٹیشن کی طرف مڑ گیا۔ بنگ آفس سے اس نے ٹکٹ خریدا اور ونگ روم کی طرف چل پڑا۔

پھر جو اسے ہوش آیا تو وہ گاڑی میں بیٹھا تھا اور گاڑی علی پور کی طرف فرارے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔

پناہ گاہ

علی پور پہنچ کر وہ اپنی تمام گزشتہ تکلیف کو بھول گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے ویرانی ختم ہو

ٹٹماتی ہوئی بتیاں اٹھائے ناچ رہے تھے۔

نہ جانے کب تک وہ بازاروں میں آوارہ گھومتا رہا لیکن آخر کار اسے واپس ہوٹل میں ہی پڑا۔ واپس آنے کو اس کا جی تو نہ چاہتا تھا۔ اس گنوار خانے کی نسبت سٹیشن کے پلیٹ فارم بیٹھ کر وقت کاٹنا کہیں بہتر تھا۔ لیکن سٹیشن بھی تو ایک اجنبی مقام تھا جہاں پولیس کے سپاہی بیٹھے اور لیٹے ہوئے مسافر کو شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اسے کسی عزیز کے گھر کا راستہ بچہ معلوم نہ تھا۔

ڈرتے ڈرتے وہ بورڈنگ میں جا داخل ہوا وہاں برآمدوں میں گراؤنڈ میں جگہ جگہ چارپائے بچھی ہوئی تھیں۔ حقے گڑا گڑا رہے تھے۔ سفید چادریں جھاڑی جاری تھیں۔ ”او نڈرے۔“ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

چپ چاپ وہ کمرہ نمبر سترہ میں جا پہنچا۔ ہائیں وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ نہ اس کا ٹرک۔ نہ سوٹ کیس۔ نہ بستر نہ چارپائی کمرے کے دروازے کے قریب برآمدے میں ایک جاٹ کو بڑ دیکھ کر وہ اس کی جانب بڑھا۔

”جی جی۔“ اس کا دل دھڑک رہا تھا ”یہاں اس کمرے میں یعنی کمرہ نمبر سترہ میں یہ میرا سامان بستر۔“

جاٹ نے بے پروائی سے اس کی طرف دیکھا اور کھانس کر بولا ”معلوم نہیں۔“ دو مونچھوں والے جوان سامنے کوٹھے پر چارپائیوں پر پڑے تھے۔ وہ ان کے قریب چلا گیا لیکن ان سے بات کرنا کچھ آسان نہ تھا۔

”کیوں بھی۔ کیا دیکھتا ہے۔“ ایک نے چلا کر کہا۔

”کچھ نہیں جی۔ کچھ نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”ہوں۔ کون ہے۔ یہاں کیوں گھوم رہا ہے۔“

”جی میں سترہ نمبر میں فرسٹ ایئر میں۔ میں۔ میں۔“ اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

”جی میرا بستر چارپائی۔ ٹرک۔ سب غائب ہیں۔“

”ہائیں۔ کیا مطلب کیا ہم چور ہیں۔“ ایک نے مونچھے مروڑتے ہوئے پوچھا۔

”جی جی۔ نہیں۔“ ایلی نے جھٹ انہیں یقین دلانے کی کوشش کی ”یہ تو اپنے ہوٹل

نہیں ہے۔“ ایک نے اسے گھسٹھا کر کہا ”ادھر آجے۔“ ”چوری کرنے آیا ہے تو۔“

گئی ہو اور وہ پھر سے ایک حیثیت سے مالک ہو گیا ہو۔

”ایلی۔ ایلی۔ ایلی۔“ چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔

”ایلی۔“ داوی اہل چلا رہی تھی۔ ”تیرا دل لگ گیا تھا وہاں لاہور میں۔ تو بہ اتنی دور تنہا جانا۔ نہ بھی میں تو نہیں چاہتی تو وہاں اکیلا جائے۔“

”ایلی۔“ ارچند چلا رہا تھا۔ ”تم آگئے۔ اچھا ہوا تم آگئے۔ تم چلے جاتے ہو تو سب گڑبڑ جاتا ہے۔ اسٹنٹ نہ ہو تو پیچھا ہیڈ کیا کرے۔ بڑی چیز ہوتی ہے اسٹنٹ۔ ہاں تم نہیں جانتے دفاتروں میں اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے اور پھر یہاں انکرائیڈی آفس ہے۔“

”آگے بابو۔“ رضائے اپنی لنگڑی ٹانگ کو گھماتے ہوئے کہا ”آؤ بیٹھو۔ اب تو کالج والا بن گئے۔ بابو بن گئے تم۔“

”ایلی۔“ جیل اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ”آؤ اوپنی گلی میں آؤ وہاں آج لالہ نے لکھاب جاسن بنائے ہیں۔ آؤ۔“

”تو آگیا ایلی۔“ سعیدہ نے اپنا خوشبودار دوپٹہ سر پر لیتے ہوئے کہا ”آجا“ آج رات کو مپاہی کی بازی لگے گی۔ آئے گا نا تو۔“

”ہاں۔ ہاں۔“ ایلی نے کہا ”ضرور آؤں گا۔“

”ایلی۔“ اب تو کالج کے ٹھاٹھ ہیں نا۔“ حکیم صاحب اسے دیکھ کر طنزاً ”مسکرائے چودھری یہ سن کر بولا ”کیا فرق ہے حکیم صاحب۔ یہ تو جیسے پہلے تھا ویسے ہی اب ہے۔“

”وہی رضا کی دوکان۔ وہی تاش کی گڈی۔“ تاش کھیلنے کے علاوہ ان لٹریچر چچا عظمت رک گئے ”کیا کہا چودھری۔ تاش کی گڈی۔ تاش کھیلنے کے علاوہ ان لٹریچر

آتا ہی کیا ہے۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔“ رضا ہنسا ”یہی میں کہہ رہا تھا۔ چچا عظمت۔“ عظمت نے رضا کی طرف انگلی سے یوں شست باندھی جیسے اسے گولی کا نشانہ بنا رہے ہوں

نے تو لچ پنے کا لڑہا بنا رکھا ہے۔ یہ دکان تو محض ایک بہانہ ہے۔“

”ہاں۔“ رضا ہنسا ”چچا جی یہی بتا رہا تھا میں انہیں۔ لیکن ان احمقوں کی سمجھ میں آئے بات بالکل بھس بھرے ہیں یہ سب اور اور یہ ایلی۔“

علی پور آجانے سے ایلی کی ایک حیثیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اگرچہ محلے کے بزرگ

بوڑھیاں اکثر پنچے جھاڑ کر پیچھے پڑے رہتے پھر بھی علی پور تھا اور لاہور۔ لاجل ولا قوت وہ تو ایک دیرانہ تھا۔ کھوے سے کھوا چھلنے کے باوجود دیرانہ۔

لاہور کا خیال آتے ہی ایلی گھبرا جاتا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ چھوٹ جاتا۔ لیکن وہ دل ہی دل میں جانتا تھا کہ اسے لاہور جانا ہی ہو گا۔ علی پور میں رہنا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی جتنے دن وہ علی پور رہ سکتا تھا۔ غنیمت تھا۔

”اے ہے تیری چھٹی ابھی ختم نہیں ہوئی کیا۔“ داوی اہل اسے چوتھے ہی روز گھورنے لگی۔ ”اب تو واپس بھی جائے گا یا بیس آوارہ گردی کرتا رہے گا۔ میں تیرے ابا کو کیا جواب دوں گی۔“

”لیکن میں وہاں بورڈنگ میں جا کر بھوکوں مروں۔“ ایلی کو سوچھی ”لو وہاں تو بلکہ کھانے کو میوے ملتے ہیں تیرے ابا کہہ رہے تھے اس روز تو بھی پاس ہی تھا۔“ داوی اہل نے جواب دیا۔

”ہونہ میوے۔ وہاں تو روٹی بھی نہیں ملتی۔ بڑے لڑکے سب کچھ کھا جاتے ہیں۔ فرسٹ انیروالوں کو کون پوچھتا ہے۔“

پہلے تو داوی اہل نے ایلی کی بات کا اعتبار نہ کیا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاہور کے نام پر ایلی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں تو اسے یقین آ گیا۔

”نہ بھی میں تو ایلی کو بورڈنگ میں نہ بھیجوں گی۔ اے ہے اپنا فیروز جو رہتا ہے۔ وہاں لاہور میں پھر لڑکا بورڈنگ میں بھوکوں کیوں مرے۔ نہیں بھی میرا ایلی وہاں نہ رہے گا کبھی بھی۔ اپنا گھر نہ ہو تو بھلا مجبوری ہوئی۔ لیکن فیروز کے ہوتے ہوئے لڑکے کو بھوکوں مارنا۔“

### تقصیر اور نعرہ

فیروز کی جوانی دیر سے ڈھل چکی تھی۔ لیکن اس کے رخساروں پر سرخی کی جھلک ابھی تک نمایاں تھی۔ جسم بھرا ہوا تھا۔ چہرہ پروقار ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں بے جان سا محسوس ہوتا تھا۔ شانے چوڑے تھے چال ایستادہ تھی اور جسم تھومند اور مضبوط تھا۔ لیکن اس کے باوجود فیروز کو دیکھ کر محسوس ہوتا جیسے اس کی عظمت ماضی سے تعلق رکھتی ہو۔ جیسے وہ گزشتہ جاہ و شہرت اور عیش و عشرت کی ایک داستان ہو۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور وقار دونوں خصوصیات بہ یک وقت موجود تھیں۔ لیکن ان میں ایک بے نام سی بے حسی کی جھلک تھی۔

جیسے بہار آگئی ہو۔

اوپر والی منزل میں انور اور اس کی بیٹی مینا رہتے تھے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں انور چولے کے سامنے بیٹھی دیوار کی طرف نکلتی رہتی۔ جیسے دیوار کے پار دور — بہت دور نہ جانے کیا دیکھ رہی ہو۔ اس کی لٹ جھٹک کر منہ پر آگرتی آنکھوں میں ان بے آنسو تھلکتے اور وہ بار بار آہ بھرتی اور ننھی مینا گڑیا تھا جسے کبھی ماں کی طرف دیکھتی اور کبھی دیوار کی طرف۔ یہ وہ مکان تھا جہاں لاہور میں اہلی کو قیام کرنا تھا۔

فیروز اہلی کا چھوٹا بھائی تھا۔ چھوٹے بچے کی طرح تھی اور اب فیروز تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ابتدائی زندگی میں وہ محکمہ پولیس میں اچھے عہدے پر فائز تھا پھر شاید وہ مسلسل حکومت سے الٹا گیا اور اس کے دل میں حکومت کی آرزو چٹکیاں لینے لگی یا شاید یہ سب راگ رنگ اور رقص کا اعجاز ہو۔ مسلسل عیش و طرب انسان کے دل میں نسائی آرزوئیں پیدا کر دیتا ہے۔ بہر حال اسے ایک رقامہ سے محبت ہو گئی اور ایک روز شراب کے نشے میں خود کشی کی عملی مگر ناکام کوشش کی وجہ سے وہ ملازمت سے برطرف کر دیا گیا اور بالآخر ظہور اس رقامہ کے چوبارے پر جا بیٹھا۔ بالی نے کئی ایک سال اس کی خدمت کی۔ پھر بالی کی اچانک موت پر وہ اپنی ہمیشہ کے گھر آنے پر مجبور ہو گیا تھا اور اب وہ سب اکٹھے ایک مکان میں رہتے تھے۔ فیروز خاموشی سے میز پر بیٹھا رہتا یا چارپائی پر لیٹ کر ماضی کی یاد میں کھو جاتا۔ لمحہ کمرے میں صابرہ بیٹی تسبیح کے دانے کتنی رہتی اور کبھی کبھار ایک بے نیاز اور بے جلال ثقبہ لگاتی۔ ساتھ ایک نعرہ بھی ”داتا۔“ اس قہقہے میں بے نیازی اور زندگی تھی اس نعرے میں جذبہ اور جوش تھا۔ وقار سے بھرپور زندگی احترام سے بھرپور جذبہ۔

اوپر والی منزل میں انور ڈیڈ بالی ہوئی آنکھوں سے دیوار کی طرف دیکھتی اور پھر آہ بھر کر کہتی ”اہلی تم نہیں جانتے ساس اور مندوں نے مینا کے ابا کو ہاتھ میں لے رکھا ہے اور میاں آپ بھی تو جانے کس منی کے بنے ہیں کہ انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں راجہ اندر بنے بیٹھے ہیں۔ ہائے اہلی ماں باپ نے مجھے کہاں جھونک دیا۔ میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔“ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے اور وہ انہیں پلو سے پونچھ کر پھر دیوار کی طرف ٹٹکتی باندھ کر دیکھنے لگتی۔ اس پر ننھی مینا اور بھی سہم جاتی اور اُسے گڑیا کا کھیل بھول جاتا اور اہلی سوچنے لگتا یا اللہ یہ سب کیا ہے؟ یہ روٹی روٹی خوبصورت عورت، وہ سننے دیکھنے والا سرخ و سپید بزرگ، اور ایک

بہم سی آکٹھٹ اور محرومی۔

فیروز کی زندگی اس دیرانی اور محرومی کے باوجود متوازن تھی۔ جسے پابندی اوقات سے خصوصی تعلق تھا۔ وہ صبح سویرے جاگ اٹھتا۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کے بعد کپڑے پہن کر چل قدمی کے لئے باہر نکل جاتا۔ واپسی پر چائے پینے کے بعد تھوڑا سا مطالعہ کرتا اور پھر کھانا کھا کر کپڑے اتار کر آرام کرتا حتیٰ کہ چائے کا وقت ہو جاتا اور چائے پینے کے بعد وہ پھر کپڑے پہن کر باہر سر کو چلا جاتا اور واپسی پر کھانا کھا کے لیٹ جاتا۔

فیروز کو باتیں کرنے سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی خاموشی کسی دلخراش المیہ کی شہر تھی۔ فیروز کے کمرے کے قریب ہی ایک کوٹھڑی میں اس کی ہمیشہ صابرہ رہتی تھی۔ وہ ہر وقت چارپائی پر بیٹھی تسبیح پڑھتی رہتی تھی۔ اس کے سر پر ایک خاکستری رنگ کی چادر پڑی رہتی۔ جس میں اس کا سرخ و سپید چہرہ یوں دکھتا۔ جیسے کسی نے اندھیری کوٹھڑی میں کوئلے دہکا رکھے ہوں۔ اس کے سیاہ لمبے بال عام طور پر کھلے لٹکے رہتے۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ وہ نووارد کی طرف مسکرا کر دیکھتی اور بڑے اخلاق سے اس سے باتیں کرتی اور پھر دفعتاً ”اس کا قہقہہ گو بھتا ایک بے پروا بے نیاز پروقار قہقہہ۔ وہ ہر تکلیف اور پریشانی پر قہقہہ مار کر ہنستی اور نووارد محسوس کرتا جیسے وہ دیوانی نظرات پر خندہ زن ہو۔ صابرہ کا چہرہ بڑا پر وقار اور بارعب تھا۔ اس کا انداز بے حد پر اثر تھا۔ اس کوٹھڑی کے ارد گرد کئی ایک کوٹھڑیوں میں صابرہ کی بیٹیاں رہتی تھیں۔ سب سے چھوٹا لڑکی فیضہ کی شادی کسی سید سے ہونے والی تھی جو کسی گاؤں میں زمیندار تھا۔ سرور کا خاندان ایک معمولی دوکاندار تھا جس کی دوکان لوہے کے کباڑ خانے پر مشتمل تھی وہ روز حسرت زدہ انداز سے خاوند کا انتظار کرتی کہ کب دوکان سے چار پیسے کما کر لائے اور وہ ہانڈی روٹی کا انتظام کرے سرور دن بھر کپڑے دھوتی بچوں کو بیٹھتی اور خاوند کو زیر لب برا بھلا کہتی رہتی۔ بچے چپ چاپ حیران نگاہوں سے کبھی ماں اور کبھی بیٹیوں کی طرف دیکھتے۔

ایک کوٹھڑی میں خاوند اچلے کپڑے پہنے کوئی کتاب پڑھتی رہتی یا سرور کے بچوں کی طرف دیکھ کر ناک بھونچ رہتی۔ فیضہ کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس گھر کی فروغ ہو۔ اس کے انداز میں نہ تو باپوسی تھی اور نہ بے نیازی اس دیرانے میں فیضہ ایک سرسبز خطے کی طرح تھی۔ اس کے ہاتھ حنا کے رنگ سے چمکتے تھے۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے کھلے رہتے۔ لہجوں پر کسی ناکسی ڈھونک گیت کی دھن نہ تھی۔ جب وہ ڈھونک کے ساتھ گاتی تو ایسا معلوم

یہی اس کی نگاہوں میں دو حنائی ہاتھ لٹکنے لگتے اور وہ از سر نو مضطرب ہو جاتا۔ اس اضطراب سے مجلسی پانے کے لئے اس نے کئی ایک طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ وہ مونگ پھلی اور ریوڑیاں کمانے میں مصروف ہو جاتا لیکن مونگ پھلی اور ریوڑیاں ایسی چیزیں صرف وقتی مصروفیت بہم پہنچا سکتی تھیں۔ اس نے اس سلسلے میں سگریٹ کو بھی آزمایا تھا۔ مگر سگریٹ بھی مفید ثابت نہ ہوئے تھے الٹا وہ تھکے میں کھرکھری سی پیدا کرتے تھے۔ جس سے اس کا اضطراب اور بھی بڑھ جاتا تھا ان سب باتوں سے اکتا کر سڑکوں پر بھٹکتے پھرنے سے تھک کر وہ کسی سینما ہل میں چلا جاتا اور چار آنے کا ٹکٹ خرید کر دو ڈھائی گھنٹے تک ایلمو اور پیڈرو بھلور کے کارنامے دیکھنے میں کھو جاتا۔ سینما ہل کا اندھیرا اسے لوگوں کی نٹولتی ہوئی جاچتی ہوئی پریشانی کن نگاہوں سے محفوظ کر لیتا اور پھر اطمینان سے پیڈرو بھلور کا روپ دھار کر وہ بد معاشی کو پینتا اور بالا خر حنائی ہاتھوں والی حینہ کو گھوڑی پر چڑھا کر ہوا ہو جاتا۔

لیکن سینما سے فارغ ہو کر جب وہ گھر پہنچتا تو وہ حنائی ہاتھ شہ نشین کو تھامے ہوتے۔ جھکی جلی نگاہوں سے وہ انہیں دیکھتا اور پھر چپ چاپ نگاہ اٹھائے بغیر چوبارے میں جا پہنچتا جہاں انور چارباہی پر بیٹھی فضا کو گھور رہی ہوتی۔

اسے قریب بیٹھے دیکھ کر وہ چونکتی۔ ”ہائے ایللی میری قسمت ہی پھوٹ گئی۔ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ ایللی — انہوں نے اس قدر ظلم کیوں کیا مجھ پر۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔“ اور وہ ٹپ ٹپ رونے لگتی۔

پھر صابرہ کے قہقہے کی آواز سنائی دیتی اور وہی نعرہ ”داتا“ اور پھر متصل کوٹھڑیوں سے بھنگوں کی ڈھولک اور گیت کی آوازیں بلند ہوتیں۔ ”اگ بیل کے دھوئیں دے چ روواں لکواں دکھ جہاں دا۔ ہائے جہاں دا۔“

لاہور کی زندگی عجیب زندگی تھی۔ ایللی محسوس کرتا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ یہ عالم خواب چند روزہ ہو۔

وہ دھندلا جواں نے اپنے گرد و پیش بکھیر رکھا تھا۔ اس کے لئے کس قدر اطمینان بخش تھا۔ کیونکہ اس دھندلکے کے وجہ سے وہ دلخراش حقائق سے بیگانہ رہ سکتا تھا۔ لوگوں کی نگاہوں سے بچ سکتا تھا۔ لوگوں کو تو ہر آتے جاتے کو نگاہوں سے کریدنے کی بری عادت تھی۔ ایللی کے لئے سب سے بڑی مشکل لوگوں کی نگاہیں تھیں۔ بازار میں چلتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ

دوسرے سے بے خبر بے نیاز، ہمیش اور ان کے جلتے ہوئے بچے — وہ حیران ہوتا اور پھر سوچ میں کھو جاتا۔ پھر دفعتاً ”صابرہ کا قہقہہ گو بخت اور داتا کا نعرہ بلند ہوتا جیسے وہ غربت اور ان مصائب کا جو اس گھر پر مسلط و محیط تھے۔ تسخیر اڑا رہی ہو۔

فیروز کے مکان کے متصل بھٹی رچے تھے۔ جن کی لڑکیاں گایا کرتی تھیں۔ ان کے یہاں روز ایک نہ ایک قریب رہتی۔ نہ جانے کیوں۔ ہفتے میں دو چار مرتبہ ڈھولک بھتی اور عورتیں دیر تک گاتیں۔ جسے سن کر فیروز چپ چاپ پتھر کی طرح چارباہی پر پڑا رہتا اور صابرہ کی تسبیح اور بھی تیزی سے چلتی اور انور کے دوپٹے کا پلو بالکل ہی تر ہو جاتا اور خاور ناک سیکڑ کر کستی ”تہہ ہے کس قدر چینی ہیں یہ بھنگیں۔ کیسا دواہیات محلہ ہے یہ۔“ اور فیض شوق سے شہ نشین پر ہا بیٹھی اور ان کے گیت سننے میں محو ہو جاتی یا مسور ہو کر چلانے لگتی ”ہائے آپا کیسی اچھی ڈھولک بجاتی ہیں یہ ہائے میں کیا کروں۔“

## دھندلا

صبح سویرے ایللی منہ ہاتھ دھو کر کالج کی طرف چل پڑتا۔ لیکن نہ جانے کیا تھا اسے جولا جوں وہ کالج کے قریب پہنچتا اس کے دل میں ہول اٹھنے لگتے۔ دہلی دہلی گھبراہٹ ابھرتی اور اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی۔ کالج کی طرف چلتے ہوئے ہر قدم پر اس کی حیثیت کم تر ہو جاتی۔ نہ کہ کالج میں پہنچ کر وہ ایک ٹھٹھکنے میں بدل جاتا اور پھر چاروں طرف بڑے بڑے گلیور اس کے گرد گھومتے اسے گھورتے اور اس کا تسخیر اڑاتے۔ ایللی کی نگاہیں جھک جاتیں اس کا جی چاہتا کہ کہہ بھاگ جائے دور — بہت دور جہاں کوئی نہ ہو۔ جہاں کوئی اس کا تسخیر نہ اڑائے۔ کوئی نہ دھمکی نہ دے جہاں لوگ اس قدر اونچے لمبے اور بہت ناک نہ ہوں پھر نہ جانے کیا ہوتا اس کے گرد و پیش لایک دھندلا سا چھا جاتا اور وہ دھندلا ان گلیوروں کو ایللی کی نظروں سے چھپا دیتا۔ ان کے تسخیر بھرے قہقہے مدھم پڑ جاتے۔ پھر وہ دیکھتا کہ وہ بازاروں میں گھوم رہا ہے۔ ان جلا بازاروں میں۔ نئی نئی سڑکوں پر یہ دیکھ کر اس کے دل کو اطمینان سا ہو جاتا۔ جیسے اس نے اپنا اور اپنی زندگی محفوظ کر لی ہو۔ جیسے وہ کسی بہت بڑے خطرے سے نکل آیا ہو۔

اس کے باوجود اس کے دل میں ٹھٹھکی سی لگی رہتی کہ وہ کالج میں حاضری نہیں دے گا۔ کلاسز انڈ نہیں کر رہا۔ بلکہ آوارہ گردی کر رہا ہے۔ گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے۔ گناہ کا خیال

دھندلی دھندلی تصاویر اسے اپنی آغوش میں پناہ دے دیتیں۔

### پیڈرو بہادر

دیے تو اس زمانے کے لاہور میں بھی خوبصورت عمارات اور سڑکیں تھیں خوشنما دکانیں اور ہوٹل بھی تھے۔ اگرچہ تعداد میں بہت کم تھے۔ لیکن جس لاہور میں ایلی رہتا تھا وہ لاہور عظیم الشان عمارتوں بڑے بڑے ہوٹلوں اور دوکانوں سے سجے ہوئے بلقات اور خوبصورت سڑکوں سے قطعی طور پر خالی تھا۔ فیشن اہل علاقے میں جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس نے کئی ایک مرتبہ بڑی دوکان میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اور پیشانی پینے سے بھیگ گئی تھی اور وہ چپ چاپ سر جھکائے وہاں سے چلا آیا تھا۔ مل روڈ پر جانا اس کے لئے قطعی طور پر ناممکن تھا۔ وہاں لوگ اکڑ کر چلتے تھے اور انہیں دیکھ کر ایلی محسوس کرتا جیسے اس کی ڈولتی ہوئی ناؤ کسی عظیم الشان جہاز سے ٹکرانے لگی ہو۔ وہ سہم جاتا۔ پنسری پر چڑھ جاتا اور پنسری سے اتر کر سڑک کے کونے پر سہٹ کر کھڑا ہو جاتا۔ سینما دیکھنے کے لئے وہ اس ہال میں جاتا جو عام سا ہو اور جہاں عام سے لوگ جاتے ہوں۔ جس کی عمارت عظیم الشان نہ ہو جس میں داخل ہوتے ہوئے وہ گھبراہٹ محسوس نہ کرے۔

اس زمانے میں لاہور میں صرف چار ایک سینما ہال تھے ایک بھائی دروازے کے باہر ایک ہیرا منڈی میں اور ایک شاہ عالی کے باہر اور یہ تینوں ہال معمولی اور گھٹیا قسم کے تھے جہاں وہ آسانی سے جاسکتا تھا۔

میکلوڈ روڈ اس زمانے میں ایک ویران سڑک تھی۔ جس پر ایک بیٹھی سی عمارت میں ایمرن سینما تھا۔ یہ عمارت اگرچہ چنداں عظیم الشان نہ تھی مگر وہاں جانے والے تماشائی قطعی طور پر مختلف تھے اور سینما کے ماحول سے انگریزیت اور فیشن کی بو آتی تھی۔ وہاں جانا ایلی کے بس کی بات نہ تھی۔ گیا تو وہ کئی ایک بار تھا۔ ایک روپے کا ٹکٹ خریدنے کے لئے ٹکٹ گھر تک پہنچ بھی تھا۔ مگر پھر وہی دھندلا چھا گیا تھا اور پھر جب وہ دھندلا چھٹا تھا تو وہ شاہ عالی گیٹ سینما کے ٹین ہال میں بیٹھا مسٹر آف مارہ دیکھتے ہوئے مونگ پھلی کھا رہا تھا۔ ان دنوں فلم خاموش ہوا کرتے تھے۔ ایک فلم مہینوں چلا کرتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں سیریل فلم دکھائے جاتے تھے۔ ممکن ہے برٹ انشی چیوٹ اور ایپار ہال میں ایسے فلم بھی دکھائے جاتے ہوں جو

وہ اپنی لگتی ہوئی ہانسیوں کو کیسے سنبھالے اور اکھڑی اکھڑی گردن کو کیسے قائم رکھے کہ لوگ اسے متفرغ نہ نہیں۔

چار ایک لوگوں کے قریب سے گزرتا یا ان کے پاس کھڑا ہوتا یا ان سے باتیں کرتا ایلی نے بے حد مشکل تھا۔ بازار کے لوگ تو خیر اکثر بے پروائی اور بے توجہی سے اس کے پاس گزر جاتے لیکن کالج کا ہر لڑکا اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگتا اور لڑکوں کے گرد اس کا ہوا اڑاتے۔

اس زمانے میں کالج کے لڑکے بھی تو عجیب سے تھے۔ لڑکے معلوم ہی نہ ہوتے تھے۔ لگتا جیسے بڑے بڑے زمیندار اور رئیس ہوں — جو پنچائت کے اجلاس پر آئے ہوں۔

جب وہ گاؤں سے لاہور آتے اور پھر شیٹن سے بورڈنگ تک مانگے میں پہنچتے تو عجیب منظر نظر آتا۔ مانگے کے پائیدان پر ان کا نوکر غلام علی۔ قنایا کریمیا بیٹھا ہوتا جو ایک ہاتھ تمباکو کا تھیلا دوسرے میں کھی کا پتھا تھامے ہوتا۔ چودھری سیٹ پر یوں اکڑنوں بیٹھا ہوتا جیسے رئیس مانگے ہو۔ ایک ہاتھ سے مونچھ مروڑتا دوسرے سے سر کھچاتا۔ سیٹ پر ایک طرف ہر کامرتیان ہوتا اور دوسری طرف فرشی حقہ جس کی نے بے حد لمبی اور چمکدار ہوتی تھی۔ ان کے قد اونچے لمبے ہوتے تھے۔ انہوں نے کالے اپکن اور بھاری بھر کم شلواریں پہنی ہوتی تھیں اور ان کے سر کی گچڑی کا طرہ گویا مانگے کی چھت کو اٹھائے ہوتا۔

اس کے برعکس ایلی کا چھوٹا اور پرانا کوٹ جو علی احمد کو الٹا کر بنایا گیا تھا۔ اس کی سسٹا مختصر سی پتلون اور معمولی سا جوتا۔ یہ تمام چیزیں صاف مانگے کی معلوم ہوتی تھیں اور ایلی کا قد اور پندرہ سال کی عمر — شاید انہیں باتوں پر کالج کے لڑکے اسے دیکھ کر ہنستے تھے۔ وہ نہ بھی ہنستے تو بھی ایلی کے لئے کالج جانا مشکل ہوتا کیونکہ اس کے دل پر کتنی کا احساس اور محیط رہتا تھا۔ جو اس نے اپنی والدہ سے ورثے میں پایا تھا اور جسے علی احمد کے گھر کے اندر نے پالا پوسا تھا مگر یہ احساس کسی وقت دب بھی جاتا۔ لیکن مناسب وقت پر نہ دھتکا۔ دل کوئوں سے نکل کر اس پر زور کر دیتا اس وقت اس کی انبا کی ناؤ ڈولنے لگتی اور پھر وہ گما ہستی سے معدوم ہو جاتا۔ عین اس وقت اس کے گرد وہی دھندلا چھا جاتا جو اسے لوگوں کا رحم نگاہوں سے محفوظ کر لیتا تھا اور اس دھندلے میں گھومتا گھومتا وہ سینما ہال میں جا پہنچتا

ہو مثلاً گھر میں ان کے لکھنے کے سامان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ علی احمد میز پر بیٹھ کر نہیں لکھ سکتے تھے۔ لکھنے کے لئے انہیں فرش پر بیٹھنے کی ضرورت پڑتی۔ ان کی دوات ہمیشہ تھالی میں رکھی ہوتی۔ قلم کی نیس گھس گھس کر اس قدر موٹی ہو جاتیں کہ دیکھنے والا شناخت نہ کر سکتا تھا کہ خرخر کلک سے لکھی گئی ہے۔ یا ریلیف کے نب سے لیکن علی احمد کو گھسی ہوئی نب سے لکھنے کا شوق تھا وہ ہر نئی نب کو گھس کر یا جانے کیسے موٹا کر لیا کرتے اور پھر اطمینان سے فرش پر بیٹھ کر لکھا کرتے اور اس شغل میں اس قدر کھو جاتے کہ انہیں گرد و پیش کا احساس ہی نہ رہتا۔ یہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ لکھنے کے سلسلے میں ان کی توجہ حساب کتاب اور تاریخ پیدائش و وفات اور شادی بیاہ تک محدود رہ گئی تھی۔ ورنہ اگر وہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دیتے تو نہ جانے کیا نیک ظہور میں آتے۔

خط لکھنے کے معاملے میں ان کی قابلیت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایک تو خط میں وہ مناسب القابات اور معقول انداز تحریر کے شدت سے قائل تھے۔ ہر بات کو مناسب جزئیات اور حصوں میں تقسیم کرتے اور پھر باقاعدہ طور پر انہیں نمبر وار تحریر کرتے۔ ایلی اپنے خط میں چلاتا ”جناب والا! آپ نے ابھی تک خرچ نہیں بھیجا میں سخت تکلیف میں ہوں۔ کلج کی فیس ادا کرنا ہے۔ جسم پر کپڑا نہیں۔ جیب میں پائی نہیں۔ ازراہ کرم واپسی ڈاک خرچ بھیجئے تاکہ مزید ہے میں سخت تکلیف میں ہوں۔“

بواپسی ڈاک ان کا گرامی نامہ ایک کارڈ پر موصول ہوتا کیونکہ وہ لفافہ لکھنے کے قائل نہ تھے ”برخوردار الیاس تمہارا خط ملا۔ حالات سے آگاہی ہوئی یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ تم خیریت سے ہو اور خوش و خرم ہو۔ یہاں سب خیریت سے ہیں اور ہم سب تمہاری خیریت کی خبر کے طالب ہیں۔ علی احمد۔“

علی احمد کا خط پڑھ کر ایلی کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ غصے میں وہ پھر سے ایک لمبا چوڑا خط لکھتا ”یہاں بالکل خیریت نہیں، حالات بالکل ناسامد ہیں۔ میں مرا جا رہا ہوں۔ میری خبر لیجئے اگر آپ نے خرچ نہ بھیجا تو نہ جانے کیا ہو جائے گا۔ بواپسی ڈاک خرچ روانہ کیجئے۔“

بواپسی ڈاک علی احمد کی طرف سے کارڈ موصول ہوتا۔ برخوردار تمہارا خیریت نامہ ملا۔ اسی طرح ہر دوسرے دن اپنی خیریت کی خبر بھیجتے رہا کرو تاکہ باعث فکر نہ ہو۔

صرف دس بارہ ریلوں میں ختم ہو جاتے ہوں۔ لیکن اس تفصیل کے متعلق ایلی کو کچھ معلوم تھا۔ بہر حال شہر کے سینما گھر میں بارہ پندرہ اسی سوڑ دکھائے جاتے تھے۔ جن کے اختتام پر ہر کسی بہت بڑی مشکل میں پھنس جاتا تھا اور بد معاشوں کے زرنے میں ہیروئن اپنی عزت اور ہار بچانے کی خاطر ہیرو کی امداد کے لئے دعائیں مانگ مانگ کر اس کا انتظار کرتے کرتے بار کر مایوس ہو جاتی تھی۔

خاموش فلم دیکھنے میں ایک خوبی ضرور تھی۔ ہر چند ایک منٹ کے بعد چادر پر انگریزی پر مکالمے یا بیانیہ عبارت آجاتی تھی اور ہال کے پچھلے حصے سے سنگٹا ہٹ سی بلند ہوتی یہ مکالمے اور عبارتیں ایلی کے لئے واحد ذریعہ تعلیم تھیں۔ کیونکہ کلج میں لیکچر میں حاضر ہونا یا سبق حاصل کرنا اس کے لئے ممکن نہ رہا تھا نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ جماعتیں کہاں بیٹھتی ہیں اور کون پروفیسر انہیں پڑھاتے ہیں۔

پہلے دو سال کے دوران میں ایلی کا نام کئی ایک مرتبہ کلج سے خارج ہوا لیکن ہر بار کسی کسی طرح علی احمد کو خبر مل جاتی اور وہ علی پور کے کسی عزیز کو اطلاع دے دیتے اور جلد ہی کلج کا کوئی بزرگ علی پور سے آپہنچتا اور دو ایک دن لمبے چوڑے لیکچر پلا کر اور ایلی کی فیس ادا کر کے واپس چلا جاتا اور ایلی کا نام ایک بار پھر کلج کے رجسٹر میں درج ہو جاتا۔ ایک مرتبہ تو خود علی احمد اسے داخل کرانے کے لئے آگئے اور انہوں نے ایلی کو لیکچر پلانے کی جگہ ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ وہ باری باری ایلی کے تمام پروفیسروں اور کلرکوں سے ملے اور ایلی کو ان سب سے متعارف کرایا۔ پروفیسر حیران تھے کہ یہ کون لڑکا ہے کیونکہ انہوں نے ایلی کو جماعت میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس واقعہ سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ایلی کی جھجک کسی حد تک دور ہو گئی۔ وہ دھندلا کلاب صرف کلج کے برآمدوں بیڑھیوں اور میدان تک محدود رہ گیا اور کلاس روم کا مطلع کھل گیا اب وہ بھاگ کر برآمدے سے گزرتا اور کلاس روم کی آخری بچ پر بیٹھ جاتا اور پھر جب جماعت ایک لیکچر سے فارغ ہو کر دوسرے کمرے کی طرف جاتی تو وہ پہلے ہی بھاگ کر کسی کونے میں جا کھڑا ہوتا تاکہ لڑکوں کی نگاہیں اس پر نہ پڑیں۔ لیکن اس کے باوجود حاضری کے رجسٹر سے اس کا نام کتنا بند نہ ہوا۔

## طالب خیریت

خط لکھنے میں علی احمد کو کمال حاصل تھا انہیں ہر اس بات پر دلچسپی تھی جو لکھنے سے متعلق



یاری لگتی تھیں جو اسے دیکھ کر فوراً منہ موڑ لیا کرتی تھیں۔ عجیب مصیبت تھی۔ اس مسئلہ میں اسے مشورہ دینے والا بھی تو کوئی نہ تھا۔ صرف ایک ارجمند تھا۔ لیکن وہ تو اس معاملہ میں ایللی کی ہانک مہر کر سکتا تھا۔ وہ تو انگریزی ماباؤں کو ایک کھیل سمجھتا تھا اور لڑکیوں سے یوں کھیلتا تھا۔ جیسے وہ کھلونے ہوں انہیں لہجاتا۔ چھیڑتا ان کا مذاق اڑاتا۔

اس کے برعکس ایللی ان کی عزت کرتا تھا۔ انہیں پاکیزہ سمجھتا تھا اور خاموشی سے ان کی پرستش کرنا چاہتا تھا۔ وہ عشق کو ایک بلند و بالا چیز سمجھتا تھا ایک ایسا تعلق جسے جسم سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ لیکن وہ تعلق کیسے قائم کیا جائے اس کے بارے میں اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔

دو سال کالج میں گزارنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ حاضرین کی کمی کی وجہ سے اسے امتحان میں نہیں بھیجا جاسکتا۔ یہ خبر سن کر گھبراہٹ تو ضرور ہوئی لیکن صرف اس خیال پر کہ علی احمد کو کیا جواب دے گا، ویسے دل ہی دل میں اس نے خوشی محسوس کی کہ امتحان کی مصیبت سے چھٹکارہ ہوا اور وہ فوراً گاڑی میں سوار ہو کر علی پور روانہ ہو گیا۔ امتحان کے لئے نام نہیں جاسکتا تو پھر لاہور میں رہنے کا فائدہ؟

والیسی

ایللی کے احاطے میں قدم رکھتے ہی محلے والیوں نے شور مچا دیا۔ ”کون آیا ہے؟“

”اے ہے ایللی ہے ہاں جی اپنی ہاجرہ کا بیٹا۔“

”اچھا ہاجرہ کا بیٹا آیا ہے اللہ زندگی دراز کرے۔“

”اب تو بمن باو صاحب بن گیا ہے۔“

”بڑا لائق لڑکا ہے یہ ہاں میں تو پہلے سے ہی جانتی تھی۔ اے ہے اور تو آڑکے شرما تو کس سے ہے۔ تیری خلائیں اور پھو جھیاں بیٹھی ہیں کوئی غیر تو نہیں۔“

”چلانی بڑا شرمیلا لڑکا ہے۔ بڑا اچھا ہے اور یہ محلے کے چھو کرے۔ توبہ طوفان مچا رکھا ہے۔ انہوں نے۔“

”ابھی پیدا ہو ہی نہیں پاتے اور شرارتیں پہلے ہی شروع کر دیتے ہیں۔“

”لیکن ایللی ان لڑکوں سانہیں۔“ ”اے ہے ہن“ ”چلانی بولی۔“ ”ہاں کے گھر کا چراغ اور وہ علی احمد وہ تو بمن اپنی ہی دھن میں لگا ہے۔ بس ہر سال نئی نویلی طے پرانی تو باسی ہو جاتی ہے۔“

اس زمانے میں ایللی کو علی احمد کی فنکاری کا احساس نہ تھا۔ ان خطوط سے محفوظ دہر بجائے چڑ جاتا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ایللی کو مضحکہ خیز باتوں پر ہنسا نہیں آتا تھا۔ وہ لڑکیوں پر اپنا توازن کھو بیٹھتا تھا اس کی شخصیت میں توازن اور وضع داری سرے سے مفقود تھی۔

علی احمد ایللی کو خرچ ضرور بھیجا کرتے تھے اس کی ضروریات سے زیادہ بھیجتے مگر ایللی پر انہیں تنگ بخشی کی علت تھی وہ خرچ اقساط میں بھیجتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ چلانی جیب میں اس امید پر اٹھائے پھر تاکہ دوسری قسط آنے پر فیس ادا کر دے گا۔ لیکن جب دوسری قسط موصول ہوتی تو پہلی خرچ ہو چکی ہوتی اور اسے تیسری قسط کا انتظار کرنا پڑتا۔ اس کے علی احمد کے خطوط سے جو دھند لکا پیدا ہو جاتا اسے صاف کرنے کے لئے بھی تو کافی خرچ ہوتا تھا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کے مالی حالات ہمیشہ گہرے رہتے اور اس کا سینا گنڈیریاں چوسنا مونگ پھلی اور ریوڑیاں کھانا اور بھی ضروری ہو جاتا۔

ان مسائل سے آگاہ ہو کر وہ انور کے پاس جا بیٹھتا۔ انور ہاں کھولے آنکھیں بنائے اور طرف گھورتے ہوئے کہتی ”ہائے ایللی کیا ہو گیا۔“ ایللی کا دل چاہتا کہ وہ بھی کسی سے عشق کر بیٹھ جائے اور علی احمد کے خطوط اور کالج کے دھندلکے سے نجات حاصل کر لے لیکن سمجھ میں نہ آتا کہ عشق میں انور کی یہ کیفیت دیکھ کر کیسے عشق لگائے اتنی کوششوں کے باوجود کسی سے عشق نہ لگا سکتا تھا۔ کسی کے سامنے جا کر تو اس کی نگاہیں جھک جاتی تھیں۔ دل دھک کرنے لگتا تھا اور زبان بند ہو جاتی تھی۔ پھر عشق کیسے لگتا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کرے۔

پھر اسے خیال آتا کیوں نہ نذیراں سے عشق لگا لوں۔ وہ نذیراں جو علی پور کی اس لڑکی ڈیورہ میں اس کا انتظار کیا کرتی تھی اور جب وہ داخل ہوتا تو کھلکھلا کر ہنس پڑتی ”توڑ“ میں ہوں۔ ایللی میں ہوں۔“ اور پھر ایک خوشبودار جسم اس کی طرف بڑھتا دوسرا آنکھ موٹے ہونٹ اور بھدا چہرہ اور وہ گھبرا کر بھاگتا۔

نہ جانے اسے نذیراں سے عشق کیوں نہ ہوتا تھا۔ نذیراں واحد لڑکی تھی جو اسے داک اس کی طرف ہاتھ بڑھایا کرتی تھی۔ باقی لڑکیاں تو اس کے وجود ہی سے منکر تھیں۔ اسے بھی کرتیں تو صرف ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتیں۔ مصیبت کہ ایللی کو ان لڑکیوں سے ڈر لگتا تھا جو اسے دیکھ کر آگے بڑھتی تھیں اور وہ تمام لڑکیاں

مکہ شریف نے ایللی کی طرف دیکھا اور اپنی نیم وا آنکھیں ایللی کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ایللی نے جرنی سے شریف کی طرف دیکھا۔ اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ دیے ہی چپ چاپ اس کے منہ کی طرف نکلتا رہا۔ حتیٰ کہ ایللی محسوس کرنے لگا۔ جیسے اس کی نگاہیں چوٹیوں کی طرح اس کے جسم میں دھنسی جا رہی ہیں۔ اس کی نس نس میں ریگ رہی ہیں۔

شریف کے ہونٹوں پر تبسم چھلکا ”گھبرا گئے۔“ وہ بولا ”ابھی سے گھبرا گئے۔“ اور وہ پھر اس طرح ٹکلی باندھ کر ایللی کی طرف دیکھنے لگا اس کی نگاہوں میں عجیب سی مستی تھی۔

”مجھے جانا ہے۔“ ایللی نے گھبرا کر ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش کی۔

”تم نہیں جاسکتے ایللی۔“ شریف مسکرایا ”تم میری نگاہوں سے اوچھل نہیں ہو سکتے۔ یہیں بیٹھے رہنا ہو گا۔ میرے روبرو میری نگاہوں کے سامنے اور میں تمہیں دیکھتا رہوں گا۔ حتیٰ کہ میری آنکھیں پانی ہو کر بہ جائیں۔ تم نے اس کو دیکھا ہے؟ تم اس کے پاس رہے ہو۔ یوں ہی تم اس کے روبرو بیٹھا کرتے ہو گے اور وہ تمہیں دیکھا کرتی ہو گی۔ تم نے اس مکان میں دو سال برکے جس میں وہ رہتی ہے۔ تم اس فضا میں سانس لیا کرتے تھے۔ کتنا خوش قسمت ہوں میں جو تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“ شریف کی آنکھوں سے پانی بہ رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں اسی طرح ایللی کو گھورے جا رہی تھیں۔ اس کے منہ سے حسب معمول رال بہ رہی تھی۔ چہرے پر حسرت ویاس کی دبیز تہ چڑھی ہوئی تھی اور وہ اپنی روئیداد کو جا رہا تھا۔

”کیا وہاں تن تنہا رہتی ہے۔ اتنی بھڑ میں تن تنہا رہتی ہے خالوں نے اسے وہاں قید کر رکھا ہے۔ انہوں نے اس کے بازو کٹ دیے اور وہ تڑپ تڑپ کر وقت گزار رہی ہے۔ اس نے تم سے کچھ کہا تھا میرے بارے میں۔“ ریف رک گیا۔

ایللی کو نفی میں سر ہلاتے ہوئے دیکھ کر شریف نے لمبی آہ بھری ”وہ کسی سے بات نہیں کرے گی۔ انہوں نے اسے اس قدر ڈرا دیا ہے کہ وہ گھٹ کر مر جائے گی مگر کسی سے دل کی بات نہ کہے گی اور — اور —“ وہ جوش میں اٹھ بیٹھا ”یہ سب اس ڈائن کی شرارت ہے۔ جیسے تم داوی لالہ کہتے ہو۔ اس خبیث بڑھیا کی۔ وہ ہم دونوں کے درمیان دیوار بن کر حائل ہو گئی۔ اس نے وہ کھڑکیاں کیوں سے بند کر دیں جو اس طرف کھلتی تھیں۔ وہ روزانہ انٹوں سے بھر دے دیتے تھے۔ جن سے اس کی آواز مجھ تک پہنچ سکتی تھی۔“ شریف بولے جا رہا

نہ جانے محلے میں جب بھی ایللی کی بات شروع ہوتی تو جلد ہی علی احمد اور اس کے تذکرہ کیوں چھڑ جاتا اور پھر لوگ مسلسل طور پر علی احمد کی باتیں کرتے رہتے جیسے ایللی کا محض علی احمد کی بات چھیڑنے کیلئے ایک بہانہ ہو یا محض ایک تمہید۔ محلے کی عورتیں جب علی احمد کی بات چھڑتیں تو ایللی ان کی بات اور انداز میں عجیب تضاد محسوس کرتا۔ کہنے کو تو وہ علی کے خلاف شکایات کرتیں اور ان کی بری عادت پر ہاتھ دھرتیں مگر ان کے انداز سے معلوم ہوتا جیسے وہ علی احمد کو سراہ رہی ہوں جیسے ان کی وہ خصوصیت بے حد پیاری ہو اور علی احمد کا شروع کرنے کے بعد وہ اسے جاری رکھنے پر مجبور ہوں۔ اسے برا بھلا کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں چمک لراتی ہونٹ مسکراہٹ کی وجہ سے کھل جاتے اور ہلکی سی سرخی نہ جانے کہاں سے کر رخساروں پر جھلکتی۔ ایللی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیسی نکتہ چینی تھی۔ کتنی کچھ اور کڑ کچھ اور سمجھاتی کچھ تھیں۔ اثر کچھ اور لیتی تھیں۔

ہاجرہ سے جب وہ ہمدردی جتائیں تو ایللی کو محسوس ہوتا کہ وہ ہمدردی کے پردے پر درحقیقت اس پر ترس کھا رہی ہیں ”ہائے بچاری ہاجرہ۔“ ایللی کہتی ”لیکن اس کو کیا پوچھنا احمد جو چاہے کرے۔ اس کی بلا سے لگتا پھرے عشق جہاں اس کا جی چاہے۔“

”وہ تو رنگیلا راجہ ہے۔“ دوسری مسکراتی۔

اس پر ایللی محسوس کرنا کہ جیسے وہ درپردہ ہاجرہ پر نفیس رہی ہوں اور علی احمد کی اس خاص خصوصیت پر پھولے نہ ساتی ہوں۔ اس مرتبہ ایللی نے پہلی دفعہ محلے والیوں کی اس دورانی شدت سے محسوس کیا۔ ایللی کے احساسات میں عجیب قسم کی گہرائی پیدا ہو رہی تھی۔ روز بروز زود حس ہوتا جا رہا تھا۔ ایسی باتیں اسے چھینے لگی تھیں۔

پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ محلے والیوں نے ان کا مذاق بنا رکھا ہے۔ انکا ہاجرہ۔

سستی ہمدردی جتنا درحقیقت اپنی عفت کا اظہار کرنے کا ایک ذریعہ تھا وہ ہاجرہ کے لئے کچھ کر سکتی تھیں نہ ہی وہ علی احمد سے شکایت کر سکتیں۔ شکایت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ انہیں اٹان کی یہ عادت پسند تھی۔ علی احمد کی شخصیت پسند تھی اور اخلاق کے متعلق تو وہ صرف فرمانا جانتی تھیں۔ یہ سوچ کر اس نے محلے والیوں کی باتوں سے اپنی توجہ ہٹا لی۔

**شریف کی وہ**

اتفاق سے انہیں دنوں رخصت لے کر شریف علی پور آگیا اور وہ پھر سے شریف

رہا تھا۔ نہ جانے وہ اس سے کیا کئے والی تھیں۔

ایلی۔ ”وہ بولی۔ ”میری عزت تیرے ہاتھ میں ہے اگر تو میری بات مان لے تو میں سرخرو ہو جاؤں گی اور اگر تو نے انکار کر دیا تو بس سمجھ لے کہ آئندہ سے تو ماں کا نہیں باپ کا بیٹا ہو جائیگی۔“

ایلی حیران تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ماں کی عزت کیسے بچا سکتا تھا۔ آخر وہ کوئی بات تھی۔ جس پر ماں کی عزت کا دار و مدار تھا اور اس کی عزت ہی کیا تھی گھر میں۔ اس کی حیثیت تو نوکروں کی سی تھی۔ پھر عزت کی بات کرنا اور عزت بچانے کا سوال، ایلی کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔

ہاجرہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”پھر تم جو چاہے کر لیتا ایلی اپنی بات پر قائم رہنا یا بدل جانا لیکن اس وقت ماں کر دو اگر تم نے ماں نہ کی تو تمہارے ابا تمہیں اپنے رشتہ داروں کی جھولی میں ڈال دیں گے اور تم مجھ سے دور ہو جاؤ گے۔“

”لیکن ماں یہ سب کیا ہے؟“ ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کچھ بتاؤ تو مجھے پتہ چلے۔“

”تمہارے بھلے کی کستی ہوں بیٹا۔“ وہ بولی ”اگر میں نے ابھی ابھی کچھ نہ کیا تو وہ نہ جانے کیا کر دیں گے۔ تو تو انہیں جانتا ہی ہے۔ وہ اچھے لوگ نہیں تو تو جانتا ہی ہے بیٹا۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

”لیکن بات کیا ہے ماں۔“ وہ گھبرا گیا۔

”تو وعدہ کرے گا تو میں بتاؤں گی۔“ ماں نے جواب دیا۔ ”بس سمجھ لے کہ تیری بہتری ہی کی بات ہے۔“

بھلا میں کوئی ایسی بات کر سکتی ہوں جو تیرے لئے اچھی نہ ہو۔ بس تو ایک بار ماں کہہ دے۔“

”اچھا ماں جو آپ کی مرضی۔“ اس نے بات سمجھ بغیر ہی نکلتی سے نجات حاصل کرنے کے لئے کہہ دیا جو اس پر مسلط ہوئی جارہی تھی۔

”انہ عمر دراز کرے۔ خوشی نصیب کرے۔“ ہاجرہ کی باچھیں کھل گئیں۔ ”میں جانتی تھی تو میری بات رد نہ کرے گا۔ میں جانتی تھی تو مجھے چھوڑ کر ابا کی طرف نہ جائے گا۔ تو دیکھ لہجہ تیرے لئے ایسی اچھی دوا سن چنی ہے میں نے جو لاکھوں میں ایک ہے۔ لاکھوں میں مجھے

تھا اور ایلی حیران اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے۔ کیا کرے کس طرح اپنی ہمدردی کا اظہار کرے۔

دفعہ ”سعیدہ داخل ہوئی۔ ”شرم نہیں آتی تھی۔“ اس نے حنا ملیدہ ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ ”اس بچے کو سامنے بٹھا کر روتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اس بیچارے کو کیا سنا رہا ہے تو قصہ۔ اسے کیا معلوم کیا ہوتی ہیں یہ باتیں۔ خواہ مخواہ کا پاکھنڈ بچا رکھا ہے۔ تو تو عورتوں سے ہو گیا۔ اے ہے مرد ہزاروں جگہ آنکھیں لڑاتے ہیں اور پھر اپنے اپنے دھندے میں لگ جاتے ہیں۔ مگر یہ میاں ہیں کہ مجنوں بنے ہوئے ہیں۔ چاہے دوسرے کو ذرا احساس نہ ہو۔ یہ اپنا ہلکان کئے جائے گا۔ جا ایلی تو اپنے گھر۔“ اس نے حنا ملیدہ ہاتھ سے اس کا منہ سلاتے ہوئے ”یہ میاں تو مجنوں بننے کی قسم کھائے ہوئے ہیں۔“

اس وقت ایلی کو سعیدہ کے ہاتھ کا لمس ناگوار گزرا۔ اسے شریف کے پاس سے چلے آئے سے دکھ بھی ہوا۔ لیکن اس دکھ میں خوشی کا دبا دبا عنصر بھی تھا۔ کیونکہ شریف کی باتیں سن کر اس کے دل میں جذبات کا ایک طوفان اٹھا ہو چکا تھا۔ جو اسے مضطرب کئے جا رہا تھا۔ وہ چاہتا کہ کہیں اکیلے میں جا کر رو دے۔ شریف کے دکھ پر نہیں بلکہ اپنے دکھ پر اپنی بد قسمتی پر کہ کسی سے محبت نہ کر سکا۔

## ماں کا آنسو

اگلے روز جب وہ شریف کی طرف جانے کو تیار ہوا تو ماں نے اس کا بازو تھام لیا ”ایلی تم جا مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے۔“ ایلی گھبرا گیا۔ کیا ماں بھی شریف کے خلاف ہیں۔ کیا وہ بھی نیند چاہتیں۔ کہ میں اس سے ملوں۔

”ذرا ٹھہر جا۔“ ماں بولی۔ ”بیٹھ یہاں ابھی میں بھی چلتی ہوں تیرے ساتھ۔“ وہاں پہنچ کر وہاں جانے لے اسے وہاں کیوں بٹھایا تھا نہ جانے وہ اس سے کیا کہنا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ تو ہمیشہ بات کہہ دیا کرتی تھیں۔ یوں تو انہوں نے کبھی نہ کہا تھا۔ ایلی ٹھہر جا مجھے تجھ سے کہنا ہے۔

کچھ دیر کے بعد ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے نیچے لے گئی۔ چلی منزل میں اس ایک کمرے میں جا کر اندر سے کنڈی لٹکی پھر وہ ایلی کی طرف بڑھی۔ ایلی کا دل دھک دھک

اس پر رضائے ہنستے ہوئے چھپے ہوئے ایلی کی طرف دیکھا اور بظاہر بڑی سادگی سے با آواز بلند کہا ”اور چچا جی لڑکا بھی تو گدڑی میں لعل ہے۔“

”لیکن وہ چھپا کہاں ہے آج دکھائی نہیں دیتا۔“ چچا مسکرائے۔ ”تمہاری دوکان کی گدڑی میں تو نہیں چھپا ہوا۔“ چچا نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر پردہ اٹھا دیا اور ایلی کو چھپا دیکھ کر ہنسنے لگے۔ ”بہنسی واہ ایلی تم یہاں چھپے ہو اور محلے میں تمہاری منگنی کے چرچے ہیں۔ واہ بھی واہ عجب معاملہ ہے باپ شادی کا شوقین ہے اور بیٹا منگنی پر شرم کے مارے چھپا ہوا ہے۔“

ایلی کا دل دھک دھک کرنے لگا اور وہ سٹ کر پرانے ڈبوں کے انبار کے پچھے سرک گیا اور چچا ہنستے ہوئے چل پڑے۔

پھر رضائے شور مچا دیا۔ ”سن لیا گدڑی کے لعل اب چھپے ہی رہو گے کیا۔“ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ رضا کو گالیاں دے لیکن گالی دینا اس کے نزدیک جائز نہ تھا۔ وہ گالی دینے کی جرات نہ رکھتا تھا ”بہت برے ہو تم۔ بہت برے جو راز کھول دیتے ہو۔“ وہ غصے میں چلا یا۔

رضائے قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ”شریلو میاں راز تو ہوتے ہیں اس لئے کہ انہیں کھولا جائے اور لڑکیاں ہوتی ہیں اس لئے کہ انہیں پھانسا جائے آج تو تمہیں مونچھوں پر تاؤ دے کر چلنا چاہئے آج تم — لیکن تمہارے منہ پر مونچھ بھی ہو۔“

پھر کوئی محلے والی آنکلی ادھر ”ہائیں تو یہاں بیٹھا ہے۔“ اس نے رضا سے کہا ”یہاں بیٹھا ہے تو اور تیرے دوست کی منگنی ہو رہی ہے آج تو تیری پانچوں سہیلیوں میں ہونی چاہیں ”فنی الحال تو سری کڑھائی میں ہے۔ اہل۔“ رضائے سنجیدگی سے جواب دیا ”اے ہے۔“ اہل مسکراتے ہوئے بولی۔ ”بات کرنے سے نہ چو کے گا تو۔ ایک رگ زیادہ ہے نا۔ سچ کہا ہے کسی نے لنگڑے کی ایک رگ زیادہ ہوتی ہے۔“

”ایک نہیں اہل میں تو کئی زیادہ ہیں۔“ رضائے جواب دیا اور بڑھیا ہاتھ چلاتی آنکھوں سے گھورتی اور ہونٹوں سے مسکراتی چلی گئی۔

پھر ارجمند آکر چلانے لگا ”ارے لنگڑے کہاں چھپایا ہے اس گدڑی کے لعل کو۔ نہیں تائے گامالے تو دوسری بھی لنگڑی کر دوں گا۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ لپٹنے کے لئے لنگڑی لاجواب ہے۔“ رضائے جواب دیا۔

”یہ لپٹن دپٹن سب نکال دوں گا بتا کہاں ہے۔“

میں اس سے بہتر لڑکی نہیں مل سکتی۔ کل تیری منگنی ہو جائے گی اور پھر تیرے ابا کے لئے ہاں ہو جائے گا کہ وہ تجھے اپنے رشتہ داروں کے باندھ دیں۔“

ایلی حیرانی سے اہل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر اہل اس بات کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی تھیں۔ اتنی سی بات کو اس قدر اہم کیوں سمجھ رہی تھیں۔ اس ذہن میں تو ان دنوں اس معاملے کی اہمیت نہ تھی۔ اس کا ذہن ایک سادہ ورق تھا جس پر اور از دو اجنبی زندگی کا کوئی مبہم نقش بھی مرقوم نہ تھا۔

”لیکن اہل۔“ اس نے بھد مشکل کہا ”میں مندی نہیں لگاؤں گا۔ میں انگوٹھی پہنوں گا۔“ اس کے ذہن میں منگنی اور شادی کے متعلق سب سے بڑی مشکل مندی اور انگوٹھی تھی۔

”تو کچھ بھی نہ کیجیو۔ جیسے تیرا دل چاہے۔ میں کوئی رسم بھی نہ ہونے دوں گی۔ مجھے تو صرف تجھے نامزد کرنا ہے۔ تیرے ابا کے رشتہ داروں سے بچانا ہے اور میرا کوئی منہ نہیں۔“

چند دنوں کے بعد محلے کے چوگان میں علی پور کا بہترین بینڈ بج رہا تھا۔ ایلی اور کلثوم گھروں کے درمیان آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ عورتیں مرصع اور ریشمیں پہنے اپنے اوھر سے اوھر منک رہی تھیں۔ لڑکیاں لڑکوں کو دیکھ کر ”اوئی اللہ“ کہہ کر گھونکتی چھپ جاتیں۔ بوڑھیوں نے شاید تبسم کو چھپانے کے لئے ہونٹوں پر انگلیاں رکھی ہوئی غیر محلے کی چودھرائیاں مٹھائی کے تھال اٹھائے گھر گھر لڈو بانٹ رہی تھیں۔ محلے میں منگنی کا مرتبہ بتاؤں کی بجائے موتی چور کے لڈو بانٹے جا رہے تھے اور ایلی اس ہنگامے سے دور نہ دوکان کے پچھلے حصے میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے لوگوں کے رد و رد جاتے ہوئے شرم تھی۔ اس کے باوجود آتے جاتے لوگ رضا کی دوکان پر رک جاتے اور ایلی کی منگنی کی بات دیتے۔

منگنی

”بڑی دھوم سے منگنی کی ہے ہاجرہ نے کیوں نہ ہو بھی اکلوتا بیٹا ہے اہل کی کوئی خواہش آج تک پوری نہیں ہوئی تو اسی بہانے سے۔ مطلب تو خوشی دیکھنا ہے نا بھئی۔“

دیا۔ تمہاری قسمت پر بھی مرثبت کر دی۔“ اس نے لمبی آہ بھری ”ان کی خوشی اسی میں ہے کہ لوگوں کی تقدیروں سے کھیلیں۔“ ایلی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ معنی کرنے میں تقدیر سے کھیلنے کی کیا بات تھی۔

”نہیں۔ نہیں۔“ وہ دہی آواز سے بولا ”اماں نے تو مجھے صرف نامزد کیا ہے تاکہ ابا اپنے رشتہ داروں کی بھولی میں نہ ڈال دیں۔“

”وہ یونہی کہا کرتے ہیں۔ ایلی وہ یونہی کہا کرتے ہیں۔ وہ یونہی بھولے نوجوانوں کو دام میں پھنسا کر رہے ہیں اور تم ان کے دام میں پھنس گئے ہو۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ ایلی چلایا۔ اسے یہ جان کر صدمہ ہوا کہ شریف اسے بچہ سمجھتا ہے۔ ایلی کی خواہش تھی کہ شریف اسے دوست سمجھے اور کھل کر اس سے باتیں کرے۔ اپنی زندگی کے راز بتائے۔ یوں مشورے دے جیسے کہ دوستوں کو دیئے جاتے ہیں۔

”نہیں۔ نہیں۔“ وہ بولا ”اماں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔“

شریف قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ حقے کی نے اس کے منہ سے نکل کر نیچے گر پڑی —  
”اماں کے آنسو۔“ وہ ہنسناقصائی کی چھری تو مفت میں بدنام ہے۔ وہ ذبح کرتی ہے ایلی مگر اس نے کبھی روپ نہیں بدلا۔ اپنے آپ کو کسی اور شکل میں پیش نہیں کیا۔ لیکن ماؤں کے آنسو۔“  
اس نے دانت بھینچ کر کہا ”وہ اسی طرح ہاتھ جوڑتی ہیں۔ آنسو بہاتی ہیں اور پھر جرب شکار پھنس جاتا ہے تو اس پر سواری کرتی ہیں۔ اماں کے آنسو۔“ شریف نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔

عین اس وقت سعیدہ آگئی۔ ”ہائیں تو یہاں بیٹھا ہے ایلی۔“ وہ چلائی۔ ”خدا کے واسطے۔“  
اس نے شریف کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ”خدا کے لئے اب ایلی کی زندگی کو تباہ نہ کر۔ اپنی تو برباد کر لی۔ اب اس پر رحم کر۔ تجھے نہیں معلوم خالہ کی تمام امیدیں اور امتگیں ایلی سے وابستہ ہیں۔“ سعیدہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”میری طرف دیکھ۔“ شریف نے ایک دیوانہ وار قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا ”اماں کی آرزوئیں پوری ہوں۔ بہنوں کی امتگیں پوری ہوں مگر۔“ بات ختم کے بغیر وہ خاموش ہو گیا اور چھت کی طرف گھورنے لگا۔

”تم نے اس کی اماں کے آنسو نہیں دیکھے۔“ سعیدہ غصے میں چلائی۔  
”تمہارے بھی دیکھ رہا ہوں۔“ شریف نے مسکرا کر کہا ”کیا فرق پڑتا ہے۔“

”یہیں کہیں ہو گا شرم سے منہ چھپائے ہوئے۔“ رضائے اشارہ کیا۔

”یہ پلٹن وپٹن سب نکال دوں گا جتا کہاں ہے۔“

”ابے تو یہاں ہے۔“ ارجمند اندر آکر بولا ”بس ٹاس کر دیا تو نے یہ لیبل لگا کے ستیا پاس کر گیا۔ اینٹ الجھر کی قسم تمہاری اس حرکت نے سارا انکرایڈی ختم کر کے رکھ دیا۔ اب نہ پریم کام آئے گا نہ پریم سندیس اور نہ پریم پتر سب بدک کر بھاگ جائیں گی خیرے اس لیبل کو روک کر۔ دوست تو ہمیں بھی لے ڈوبا آئے کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ چل میاں چھپ کے گھر بیٹھا ہے۔ چل وہ کپ کیپ اور کوری ڈوری جمع ہیں۔ بھئی واہ کیا پھن ہے چل اب پھنس کر تو پھر کن کیا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“

عین اس وقت جمیل آگیا ”چلو بھائی۔“ وہ چلایا ”کیا یاد کرو گے کہ دوست کی معافی پر کچھ

کھلایا۔ آج جو جی چاہے کھاؤ۔ چلو تنگ گلی کے حلوائی نے تازہ پیڑے بنائے ہیں۔“

”ارجمند کو تو کپ کپ کی لگی ہے۔ چلو ہم تینوں چلتے ہیں۔“ رضائے شرارت سے لڑکھائی کی ہانکی جھلا کر کہا۔

”اچھا بھئی اگر بچوں کی یہی مرضی ہے تو آج کے دن ہم بھی پیڑے کھا کر گزارہ کر لیں

گے کیا کیا جائے۔“ ارجمند بولا۔

مجبوراً ایلی ان کے ساتھ چل پڑا مگر اسے وہ رہ کے خیال آتا کہ اگر کسی نے اسے مل کھاتے ہوئے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے لوگ کہ اپنی معنی کی خوشی منا رہا ہے۔ بلانہ بنا کر اس جست لگائی تاکہ رستے میں وہ اس کا مذاق نہ اڑائیں۔

ارجمند ہنسا ”بڑی بے صبری ہے بھئی آج — پیارے کو کیا معلوم کہ ابھی تو

سیٹ ریڑرو ہوئی ہے۔ ریشمیں گھڑی تو نصیب سے ملے گی۔“

رضا — ارجمند اور جمیل سے کئی کلاٹ کر وہ چھپتا چھپتا سیدھا شریف کے پاس

تاکہ وہاں اطمینان سے بیٹھ سکے۔ شریف اسی طرح منہ میں حقے کی نے لئے چھت کی طرف رہا تھا۔ گھر کے سب افراد کلثوم کے یہاں تقریب منانے کے لئے جا چکے تھے۔ اس لئے

سنان پڑا تھا۔

”آگئے تم۔“ شریف مسکرایا ”مجھے معلوم تھا۔ تم آؤ گے۔ ان ظالموں نے تمہیں

بہاں کر چھپ جایا کرتے تھے۔ مگر ایللی کے لئے گویا وہ تیوری محض دکھاوے کی ہوتی تھی۔ تیوری ہونے کے باوجود وہ تیوری سختی کی حامل نہ ہوتی تھی اور ایللی اسے دیکھ کر ہنس دیا کرتا تھا لیکن اس روز دادی ایللی تیوری چڑھانے کے بغیر ہی گھور رہی تھی۔ جیسے اپنے آپ کو گھور رہی ہو۔ اپنی بے بسی پر تمللا رہی ہو۔

باہر بیڈنچ رہا تھا۔ دور کلثوم کے گھر میں لڑکیاں ڈھولک پر گیت گارہی تھیں۔  
”نی متھار اچند در گاودی کنڈلاں والی او۔“

ایللی کی منسوبہ ثمرہ اس کی خالہ زاد بہن کلثوم کی لڑکی تھی۔ کلثوم کے گھر وہ اکثر جایا کرتا تھا اور دیر تک وہاں بیٹھ کر باتیں کیا کرتا تھا۔ اس دوران کئی بار ثمرہ بھی وہاں آتی یا ادھر ادھر کلام میں مصروف رہتی۔ اس کے باوجود اسے ثمرہ کی شکل و صورت کے متعلق کچھ اندازہ نہ تھا۔ منگنی کے روز ایللی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ اس نے ثمرہ کو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ ثمرہ کو غور سے دیکھے۔ کیسی ہے۔ لیکن کسی کے گھر جا کر لڑکی کو غور سے دیکھنا ایللی کے لئے ممکن نہ تھا۔ اسے نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی اور لڑکیاں بھی تو عجیب ہوتی ہیں پاس جا کر دیکھو تو یوں جزی سنبھال کر بیٹھ جاتی ہیں جیسے بے جان گڑیاں ہوں۔ دور سے کمر کی میں کھڑے ہو کر دیکھو تو مورتیوں کی طرح دم پھیلا پھیلا کر ٹانہتی ہیں۔ چڑیوں کی طرح پھدکتی ہیں۔ دور سے دیکھنے میں کس قدر لطف آتا تھا۔ لیکن قریب سے اب تو ثمرہ کو قریب سے دیکھنا بالکل ہی ممکن نہ رہا تھا۔ اب تو اس گھر میں پاؤں دھونا بھی مشکل تھا۔

ایللی کی نظر میں کلثوم کے گھر کے مناظر یوں چلنے لگے جیسے فلم چلتی ہے۔ دم پھیلا کر ٹانہتی ہوئی ثمرہ سرخی اور پاؤں سے تھپے ہوئے چہرے والی کلثوم جس کے گلے میں پھولوں کے ہار لٹکا کرتے تھے اور مرجھائے ہوئے چہرے والا رحم علی جو کلثوم کا خالوند تھا۔ جسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ مظلوم ہو۔ جیسے وہ کلثوم کا میاں نہیں بلکہ نوکر ہو۔ دفعتاً ایللی کی نگاہوں تلے روغنی چہرے والی ثمرہ گلے میں ہار ڈالے آکر چوکی پر بیٹھ گئی۔ اس کے اپنے چہرے میں تبدیلی رونما ہوئی۔ گل پچک گئے منہ پر جھریاں پڑ گئیں اور صورت رحم علی کی سی ہو گئی اور وہ ثمرہ کی چوکی کے قریب یوں جا کھڑا ہوا جیسے رحم علی ہو۔ ایک مظلوم فرد، نوکر، ایللی چونکا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”کیا ہے بچھے۔“ دادی ایللی چلائی ”انتا بے قرار کیوں ہے تو۔ لیٹ جا آرام سے۔ لیٹ جا“

”ادھر آ ایللی۔“ سعیدہ نے ایللی کا بازو پکڑ کر اسے کھینچ لیا ”جا گھر جا۔ میں تیرا انتظار کر رہی ہے۔ یہاں بیٹھ کر کیا حاصل ہو گا بچھے۔ جا گھر جا۔“  
ایللی چپ چاپ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اندھیری ڈیوڑھی میں وہ رکاباہر عورتیں باتیں رہی تھیں۔  
”اچھا ہی کیا چاچی باجرہ نے جو بیٹے کو ابھی سے جکڑ لیا ورنہ بڑے ہو کر یہ قابو میں آتے کیا۔“

”توبہ کر لڑکی کوئی زمانہ آیا ہے۔“

”پر میں کہتی ہوں چچی بات بگڑتی ہو تو بگڑ کر ہی رہتی ہے۔ چاہے جو کر لو آخر اس کے بیاہ بھی تو جھپٹپٹن میں ہی ہوا تھا۔ باجرہ سے۔ اب دیکھ لو اس نے کیا کر دکھایا۔“  
”ٹھیک کہتی ہے تو غیب کی بات کون جانے پر میں کہتی ہوں آخر ہے اسی کا بیٹا۔ یہ کیا گل کھلائے گا۔“

ایللی سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کونسی بات سچی تھی۔ ایللی کے آنسو یا شریف کا قہقہہ۔  
ڈیوڑھی سے نکل کر وہ چپکے سے دادی ایللی کے پاس چلا گیا۔ دادی نے اسے دیکھ کر تیرا چڑھالی۔

”اے ہے کہاں بھٹکتا پھرتا ہے تو۔ ادھر تیری ماں اپنا چاؤ پورا کر رہی ہے۔ آخر وہ تیرا باپ ہے۔ اس کی رضامندی تو ہی ہوتی تیری ماں نے۔ رضامندی نہ سہی اس سے بات کیا ہوتی آخر گھر کے مرد سے بات کرنی ہی چاہیے تھی۔ باجرہ کی یہ سینہ زوری توبہ کیا زمانہ آیا ہے یہ دیکھ لو علی احمد کی چٹھی۔ میرے خط کے جواب میں کیا لکھا ہے۔ اس نے۔“ دادی ایللی۔  
تحت سے چٹھی اٹھا کر اسے دی۔ بولی ”وہ تو لکھتا ہے ہمیں معلوم نہیں کہ ایللی کی منگنی ہو رہی ہے۔ کہاں ہو رہی ہے۔ ایللی کی ماں ہی جانتی ہو گی۔“ وہ اپنی مرضی کر رہا ہے یہ اپنی مرضی رہی ہے اور تو میرے لال تو خواہ مخواہ ان چکی کے پاؤں میں پسا جا رہا ہے۔ آ بیٹھ یہاں پاس۔ دیکھ تو میں نے تیرے لئے کیا منگوایا ہے۔ غضب خدا کا ادھر علی احمد آنکھیں دکھا رہا۔ ادھر یہ بی بی آنسو چھلکا رہی ہے۔ ابھی باب۔“

یہ پہلا دن تھا جب اس نے محسوس کیا کہ دادی ایللی پریشان ہے۔ اس کے ماتھے پر ہاتھ چڑھی ہوئی تھی۔ ویسے وہ گھورتی تو وہ روز ہی تھی۔ جب محلے کے لڑکوں، رگر جتی تھی تو وہ



”شادی“۔ وہ ہنسنے لگا۔ عجیب سی ہنسی تھی وہ اس میں مسرت کی بجائے دھمکی تھی خوفناک دھمکی جیسے وہ شادی کی بجائے انتقام لے رہا ہو۔ اس کے قہقہے میں ایک تسلسل پیدا ہوتا گیا خوفناک تسلسل اور آواز بتدریج بلند ہوتی گئی۔ اس قدر بلند ہو گئی کہ گھر کے سب لوگ بھاگ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ”کیا ہوا۔ کیا ہوا۔ کیا بات ہے۔“ مگر شریف کسی کو جواب دیے بغیر اسی طرح قہقہہ مار کر ہنسنے بارہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بننے لگا تھا۔ منہ سے رال کے تار نکل رہے تھے۔ چرا سرخ ہو رہا تھا۔

”اب کیا محلے والوں کو تماشا دکھانا ہے۔“ سعیدہ چلائی۔ ”یا کوئی نیا کھیل ہے۔“  
 ”اللہ رکھے اگلے ہفتہ برات لے کے جانا ہے۔ بہن شادی کی خوشی ہے ہنس لینے دو۔“  
 رابعہ نے بات ٹالنے کے لئے کہا اور پھر ایلی کا ہاتھ پکڑ کر بولی ”آج تجھے دکھاؤں کیسے اچھے کپڑے بنوائے ہیں اس کی دولہن کے لئے۔“ وہ گھسیٹ کر ایلی کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔  
 ”لیکن خالہ۔“ اس نے رابعہ اور سعیدہ سے پوچھا ”کہاں ہو رہی ہے شریف کی شادی؟“  
 ”بہت دور“ رابعہ نے کہا ”بہت دور جہاں وہ نوکر ہے وہاں نہ جانے کیا نام ہے اس جگہ

کا۔“

”مگر بہن۔“ سعیدہ نے کہا ”ہیں تو وہ خرم آباد کے رہنے والے نوکری نور پور میں کرتے ہیں ٹائڈز کے ابا بہت بڑے افسر ہیں۔ غلام علی نام ہے۔“ دوسرے کمرے میں شریف کا قہقہہ ختم ہو چکا تھا اور اب وہ کھانسی رہا تھا جیسے تھک کر ہار گیا ہو۔

”دیکھا۔“ رابعہ نے زیر لب مسکرا کر کہا ”اکیلے میں سب ٹھیک ہو گیا۔ اب وہ کھانسی رہا ہے تم تو بہن اس کی دیوانگی کو اور بھی ہوا دیتی ہو۔“

”لو مجھے کیا معلوم کہ ایسی ہوتی ہیں یہ باتیں۔“ سعیدہ بولی ”میں ذرا جا کر دیکھوں۔“ ایلی نے دلی زبان سے کہا اور پھر چپکے سے شریف کے پاس جا بیٹھا۔ شریف آنکھیں موندے ٹیک لگائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔

بمجرد رفتن اس کی نگاہ ایلی پر پڑی۔ ہونٹوں پر تبسم لہرایا ”شادی“ وہ مدھم آواز میں بولا ”اب شادی کیا ہوگی۔ جب شادی کی آرزو تھی۔ تب تو یہ سب میرے راتے میں دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ انور اور شریف کی شادی ہو سکتی نہیں ہو سکتی۔ خالموں نے مجھے قید کر لیا اور اسے شر سے دور نہ جانے کہاں لے گئے۔ اب کیا ہے۔“ اس نے لمبی آہ

پھر ایلی کی نگاہوں تلے چچا ہنسنے لگے ”بڑی دھوم سے منگنی کی ہے ہاجرہ نے۔“  
 ”ستیا ناس کر دیا۔ سوا ستیا ناس۔“ ارجمند چلایا۔ ”لیل لگا کے کیوں مری مٹی خراب ساری انگریزی ملیا میٹ ہو گئی۔“  
 پھر ہاجرہ اس کے روبرو آکھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”میری عزت ہاتھ ہے۔“

اچھا کیا پھٹپھٹن میں ہی جکڑ لیا۔ ”ایک عورت بولی۔“  
 ماں کے آنسو۔ ہا ہا ہا۔ شریف کا قہقہہ سنائی دیا۔ ماں کے آنسو وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔  
 ”کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ دادی اماں نے گویا شریف کی ہاں میں ہاں ملائی ہے تجھے۔“ وہ بولی۔  
 دور لڑکیاں گارہی تھیں۔ ”بیٹھی بنجواں دے ہار پرواں۔“

## تھیلی میں مینڈک

اگلے روز ہاجرہ ایلی کو اکیلے میں لے گئی۔ کہنے لگی ”شریف کی باتوں میں نہ وہ تو خواہ مخواہ تجھے گمراہ کر رہا ہے۔ لو کوئی بات ہے بڑا ایدیشک دیکھ لو۔ شادی کے خلاف کرتا ہے۔ بھلا خود کیوں اپنی شادی کروا رہا ہے۔ سعیدہ سے منتیں کیوں کرتا ہے۔ کیوں سامنے ہاتھ جوڑتا ہے۔“

”ہاتھ جوڑتا ہے؟“ ایلی نے حیرانی سے پوچھا ”وہ کس لئے؟“  
 ”کہتا ہے میرا بیاہ کرادو۔ میں اپنا گھر بساؤں گا۔ دیکھ لو۔ خود تو اتنا چاؤ ہے دوسرا پالا اور تمہیں منگنی کے خلاف اکسار رہا ہے۔ توبہ کوئی حد ہوتی ہے زمانہ سازی کی۔“  
 زمانہ سازی اور شریف۔ ایلی کو یقین نہیں آ رہا تھا ”نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ اٹھ بیٹھا ”نہیں اماں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ چلایا ”پوچھ دیکھ تو اس سے چمک کر بولی۔“ میں کیا غلط کہہ رہی ہوں۔“

ہاجرہ کے جانے کے بعد وہ سیدھا شریف کے گھر پہنچا اور جاتے ہی بات چیت شروع کر دی۔  
 شادی ہو رہی ہے کیا؟ اس نے شریف سے پوچھا۔  
 شریف کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا جھست کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے

لو کے چوہن میں کھڑے ہو کر ریشمیں روہل ہلاتے ہلاتے اور بال ٹھیک کرنے کے بہانے سلام کرتے کرتے تھک جاتے مگر وہ یوں بے حس و حرکت کھڑی رہتیں۔ جیسے پتھر کی بنی ہوئی ہوں چند ایک جن پر محلے کا اثر زیادہ نہ تھا لڑکوں کو دیکھ کر دوڑتیں بھاگتیں۔ ایک دوسری کو پکڑتیں۔ پل جھکتیں۔ اسے سنبھالتیں سبھی کچھ کرتیں مگر اظہار محبت کرنا تو کیا انہیں پینالٹ محبت کو مناسب طور پر وصول کرنے تک کا شعور نہ تھا۔

جس دن سے شریف نے ایللی کو اپنا راز بتایا تھا اسی دن سے بیٹھے بٹھائے ایللی کی نگاہوں تلے ایک شوخ متبسم حینہ آکھڑی ہوتی۔ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی اور ایللی کا جی چاہتا کہ وہ دلہیز سے باہر نکل آئے اور پھر تھیلی میں سلا ہوا مینڈک دھپ سے اس کے سینے پر آگرے اور وہ گہرا کر اٹھ بیٹھے اور فضا میں ایک مدہم مگر رنگین قلعہ یوں گونجے جیسے گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

اس روز برات کے ساتھ نور پور جاتے ہوئے وہ غیر معمول طور پر خاموش تھا۔ کھڑکی سے باہر ٹیلے ٹیلے دوڑ رہے تھے۔ کبھی کوئی گہرا کھڈ منہ پھاڑے آٹھٹا جس کے تلے دور پانی کی ندی بہتی۔ پھر وہی ٹیلے اور ان پر یہاں وہاں خشک ٹنڈ منڈ درخت۔ ایللی کی نگاہیں اس گلابی افق میں کھوئی ہوئی تھیں جو اس کے اندازے کے مطابق ان کی منزل تھا اور وہاں گلابی متبسم چہرہ اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

ڈبے میں بیٹھے ہوئے براتی اپنی باتوں میں گمن تھے۔ ہر چند منٹ کے بعد ایک قلعہ گونجتا۔ کسی پر آوازہ کسا جاتا اور ایللی چونک کر اوھر دیکھتا۔

ایک طرف محلے کے بزرگ تھے دوسری طرف جوان اور تیسری طرف اس کے اپنے ساتھی۔ ارجمند، رضا اور رفیق۔ ہر گروہ اپنے اپنے مشاغل میں منہمک تھا۔ صرف دو فرد اکیلے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں شریف تھا جو مسلسل گاڑی کی چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ دوسری طرف ایللی تھا۔ جو کھڑکی سے باہر کسی رنگین افق کو دیکھنے میں کھویا ہوا تھا۔ ممکن ہے۔ ریل کی چھت میں شریف بھی وہی رنگین افق دیکھ رہا ہو۔ ان دونوں کو منزل کا خیال لگا ہوا تھا۔ دونوں کے سینوں میں مینڈک کو در رہے تھے دونوں کی نگاہوں میں رنگین تبسم جھللا رہے تھے۔

ہر چند منٹ کے بعد غالباً اپنے تخیل اور محسوسات کی نوعیت سمجھ کر ایللی احساس ندامت سے گہرا جاکہ اس خیال پر ندامت محسوس کرنا کہ اپنے دوست کی بیوی کو نامک رہا ہے۔ محسوس کرنا کہ وہ مجرم ہے پھر گہرا کر لاجول پڑھتا اور کسی اور بات کی طرف متوجہ ہونے کی ناکام کوشش

بھری۔ ”یہ سمجھتے ہیں میں شادی کر رہا ہوں۔ ان کو کیا معلوم ایللی۔ ان میں احساس نہیں سمجھیں گے۔“ پھر وہ ایللی کے قریب تر ہو گیا اور راز دارانہ انداز میں بولا ”انہیں نہیں معلوم ایللی کہ میں صرف اس لئے شادی کر رہا ہوں کہ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ اس کی زندگی بچاؤ جیسے میری زندگی تباہ ہوئی تھی اور وہ کتنی معصوم ہے تم دیکھو گے تو اندازہ ہو گا تمہیں اس کو کیا معلوم کہ محبت کسے کہتے ہیں۔“ شریف نے جھرجھری لی۔ ”نہ جانے اسے کیا نظر آیا مجھ میں۔ نہ جانے اسے کیا خوش فہمی ہے۔ کاش وہ کسی جیتے جاگتے نوجوان کو چنتی۔ مجھ ایسے شخص میں اب کیا رہ گیا ہے۔ جو تھا وہ لوگوں کے ظلم کی بھیٹ چڑھ گیا۔ اب کیا دھرا ہے؟ اسے کون سمجھائے۔ جو ابھی دلہیز پر کھڑی مسکرا رہی ہو اسے کیا معلوم کہ زندگی کیا چیز ہے جانے محبت نے اس پر کیا جالو کر دیا ہے۔ واقعی ہی وہ شہزادی ہے۔ اسم با مسمیٰ ہے۔ چھپ چھپ کر دیکھنے کے بعد ایک روز وہ مکان کی دلہیز سے باہر آگئی۔ میرے روبرو اور اس ایک مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت کر دیا۔“

”مینڈک کے ذریعے محبت۔“ ایللی نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت۔“ شریف ہنسنے لگا۔ ”اس نے مینڈک کو ایک تھیلی ہی رکھا تھا جب میں سو رہا تھا تو اس نے وہ تھیلی مجھ پر پھینک دی۔ میں ڈر کر اٹھ بیٹھا ہوں۔“ شریف نے ہنسنے ہوئے کہا ”محبت بھی اظہار کے انوکھے طریقے پیدا کرتی ہے۔ انوکھے وہ رک گیا اور طویل خاموشی کے بعد بولا ”مجھے اس کی محبت کا احترام ہے اسے تو شاید میں دیتا۔ مگر محبت کو کیسے ٹھکرا سکتا ہوں۔ میں نے خود محبت کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ محبت کیا ہے۔ عجیب چیز ہے محبت۔ عجیب، تم محبت کرو ایللی۔ کسی سے کرو مگر محبت کرو۔“ اس نے ایللی کی طرف طویل آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔

آٹھ روز کے بعد وہ سب برات لے کر نور پور جا رہے تھے۔ اس انوکھی لڑکی کو وہاں کے لانے کیلئے جس میں اتنی جرأت تھی کہ گھر کی دلہیز سے باہر نکل کر شریف پر مینڈک پھینک سکتی تھی۔ وہ لڑکی جسے ایسا انوکھا اظہار محبت سوجھ سکتا تھا۔

محلے میں تو ایک بھی لڑکی ایسی نہ تھی جس میں مذاق کرنے کی صلاحیت ہو یا جس میں جرأت ہو۔ انہیں تو دبے پاؤں چلنے۔ چھپ چھپ کر جھانکنے اور منہ پر پلو لے کر مسکراتے۔ سوا کچھ نہ آتا تھا۔

چوڑائی اور لمبائی عام پلیٹ فارموں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ سٹیشن کے احاطے کے چاروں طرف قد آدم فسیل تھی۔ جس میں ایک پھانک لگا تھا۔ جس سے ریل اندر داخل ہوتی ایک طرف سرخ رنگ کا ایک اونچا قلعہ بنا ہوا تھا جس کی دیواروں میں ہندوق کی ٹالیوں کے لئے سوراخ چھوڑے ہوئے تھے۔ دوسری جانب سٹیشن کے شاف کے رہائشی کوارٹر تھے۔ بیٹھے بیٹھے سے معمولی کوارٹر اور قلعہ کے پیچھے اونچے سیاہ پہاڑا۔ ستادہ تھے۔

ایلی نے تعجب سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس کی نگاہیں ان کوارٹروں کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے مینڈکوں سے بھری ہوئی تھیلیاں رکھی ہوں۔

باہر سٹیشن کے احاطے میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں سے مینڈک دستیاب ہو سکتے ہوں۔ مینڈک کیا وہاں تو تلاب یا چھپر کا نام و نشان تک نہ تھا۔

پھر وہ ایک بہت بڑے کمرے میں کھانا کھا رہے تھے۔ بھنے اور تلے ہوئے مرغ مسلم رکابیوں میں پڑے تھے۔ قسم قسم کے چاول اور گوشت۔ وہ حیرانی سے ان بھرے قابوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو گوشت سے لدے ہوئے تھے۔ علی احمد قلعہ مار کر ہنس رہے تھے۔ محلے والوں کی باجیس کھلی ہوئی تھیں اور شہزاد کے والد کی آنکھوں میں گویا پھلجھڑیاں چل رہی تھیں۔

”کیا جوڑی ہے۔“ پچھا چلانے لگے۔ ”بھائی غلام علی اور علی احمد کی واہ وا۔“

”وہ کہتے ہیں نا“ کسی نے آواز دے کر ”ساجن سے ساجن ملے کر کر لے باتھ۔“

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر بھائی غلام علی۔“ علی احمد ہنسے اور پھر مسلم مرغ پر چل پڑے۔

پھر ایک نوکرانی آکر چلانے لگی ”ایلی کو اندر بلایا ہے۔“ اندر بلا رہے ہیں ایلی کو۔ ایلی کو اندر بلایا ہے۔ چاروں طرف سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک بھیانک دف بجتے لگی۔ ایلی کی رگوں میں کوئی دھمکی بجانے لگا تھا ہوں میں ارد گرد کی چیزیں دھندلا گئیں۔

اندر جاتے ہی نہ جانے اسے کیا ہوا اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ حلق آواز سے خالی ہو گیا۔ بازو لٹکتے لگے۔ چاروں طرف سے جھنجھٹا ہٹ سی سنائی دے رہی تھی مگر وہ گردن نہ اٹھا سکتا تھا۔ ”لے علی احمد کا ایلی ہے“ محلے والی کی مکروہ آواز سنائی دی۔

”اچھا بس بیٹا رہے۔“ دو بڑے بڑے ہاتھوں نے اس کے سر کو گرفت میں لے لیا اور پھر

کرتا۔ پھر دفعتاً اس کے تخیل میں شہزادی پیچھے ہٹ جاتی اور اس کی چھوٹی بسن آگے بڑھتا۔ شاید اس میں بھی دہلیز پار کرنے کی جرات ہو۔ شاید اسے بھی مینڈک پھینکنے سے دلچسپی ہو۔ خیال پر وہ اطمینان کا سانس لیتا اور پھر سے اپنے رنگین خواب میں کھو جاتا۔

ایلی کے ذہن میں ایک نئی امید کوٹ لے رہی تھی۔ ایک نئی دنیا ابھر رہی تھی۔ سامنے ٹیلے کی اوٹ میں مینڈکوں کی جھیل کے کنارے ایک دو شیزہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ اشارے کرتی ایلی کے جسم پر چوئیاں ریختیں سینے میں مینڈک پھدکتے اور دل میں نہ جلا کیا ہوتا۔

شریف بھی بار بار چونکتا جیسے وہ بھی خود کو مجرم سمجھ رہا ہو۔ جب وہ اس رنگین منظر خیال میں کھویا ہوا ہوتا تو ایک سوگوار چہرہ اس کے روبرو آکھڑا ہوتا۔ ستا ہوا منہ کھلے پڑا ہونٹوں پر زہر خند۔ اسے دیکھ کر شریف کو احساس ہوتا کہ وہ انور سے بے وفائی کر رہا ہے۔ کی زندگی تباہ کر کے خود رنگین افق آباؤ کر رہا ہے۔ اس خیال پر وہ گھبرا جاتا۔ پھر اس کی آنکھ میں حزن و ملال کی گھٹائیں ابھرنے لگتیں دل سے آواز بلند ہوتی۔ نہیں نہیں میرا کیا ہے سب تو اس لئے ہے کہ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ اس کی زندگی تباہ نہ ہو۔

براتی دولہا میاں کی حالت کو دیکھ کر مسکراتے۔

”دیکھ لو بھئی یہ دولہا میاں ہیں یوں اپنی برات لئے جا رہے ہیں۔ جیسے کوئی دار پر چڑھ

ہو۔“

علی احمد قلعہ لگاتے ”میاں دار ہی تو ہے۔ اس حقیقت کو کوئی کوئی سمجھتا ہے۔“

جوان قلعہ لگاتے ”جیسی تو علی احمد دار پر چڑھتے چڑھتے نہیں جھکتے۔“

نوجوان چھپ چھپ کر مسکراتے سرگوشیاں کرتے اور پھر ارجمند با آواز بلند کہتا ”میل

تم تو یوں بیٹھے ہو جیسے کوئی دار پر چڑھنے والا ہو۔“

”کیوں میاں اسے شوق نہیں کیا۔ بیٹا کس کا ہے۔“

اور سب علی احمد کی طرف دیکھ کر ہنسنے اور گاڑی چیختی چلاتی ہوئی دوڑے جاتی۔

بالآخر ایک وسیع و عریض پلیٹ فارم پر گاڑی رک گئی۔ ”لو بھئی نور پور آگیا۔“

ایلی کا دل اچھل کر حلق میں آ پھنسا۔

وہ ایک عجیب سا سٹیشن تھا۔ جیسے ایک وسیع و عریض ریس کورس ہو۔ پلیٹ فارم

وہ بھاگا۔

نہ جانے ایسا کیوں ہوتا تھا۔ کیوں جب وہ منزل پر پہنچتا تو اس کے پاؤں میں چلنے کی سُر رہتی۔ اس کے بازو شل ہو جاتے۔ نگاہیں احساسِ ندامت سے دھندلا جاتیں۔ ایسا کیوں قدام جب وہ تنہیلے میں اپنے تخیل کی دنیا میں واپس پہنچتا تو اندھے کی طرح منزل سے چٹ ہا اس کی گرفت میں دیوانگی کا عنصر پیدا ہو جاتا تھا۔

## مونگیا گٹھڑی

پھر وہ نور پور سے واپس آرہے تھے اور ایللی احساسِ ناکامی کی وجہ سے خاموشی اس کے تخیل کے پر گویا کٹ چکے تھے۔ بازوؤں میں طاقت پرواز نہ رہی تھی۔ اس کے سارے کوئی افق نہ تھا۔ مٹا لے ٹیلے۔ ٹنڈ منڈ درخت اور پھیلی ہوئی ویرانی۔

پھر ارجمند اسے جھنجھوڑ رہا۔ ”ابے او مردے۔“ وہ چلایا۔ ”تو پہلے ہی فوت ہو گیا بدادہ ہوا۔ ورنہ آج ہماری طرح حرام موت مرتا بیچ گیا یار۔ تو ہمیشہ ہی بیچ جاتا ہے۔“

ارجمند کی بات سن کر ایللی حیران ہوا۔ ارجمند نے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی۔ اس کے اندر میں کبھی مایوسی نہ دیکھی تھی۔ پھر اسے کیا ہوا۔ وہ یوں سر کو ہاتھ سے تھامے بیٹھا تھا۔ جیسے قلم طور پر تباہ ہو چکا ہو۔

”بیٹا ہمارا تو کلیان ہو گیا۔“ وہ دلی آواز میں بولا۔

”آخر بات کیا ہے۔“ ایللی نے پوچھا۔

”بات۔“ ارجمند ہنسا۔ ”دیکھ لو رفیق کی آنکھوں میں۔ دیکھ لو وہ بات۔ دیکھ لو کیا بتی ہم یار ہم اس لائق تو نہ تھے۔“ ایللی نے رفیق کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گویا ہیر ہیر ریگ رہی تھیں۔

”ہے ہے۔“ ارجمند بولا ”بس سمجھ لو وہ منظر جو کپ نے چھ سال کے بعد جھلک کر دکھا آج دیکھ لیا ہے میں کیا کروں۔“ اس نے لمبی آہ بھری۔ ”اب تو یہی ہے کہ چوہے کی طرح ا نکلے کو کترتے رہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے سوکھے ہوئے کیک کا ایک ٹکڑا نکالا اسے کترنے لگا۔ پھر ایللی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ”ہے ہے دے تو دوں تجھے بیٹا مگر جو ڈال توڑ کر کھائے میں بات ہے وہ کہاں اور پھر اپن کے یہ ہاتھ بھی دیکھ لے جیسے کوہڑی کے ہوں ا

وہ ہاتھ جن سے اس بھکاری کو یہ ٹکڑا ملا ہے۔ ہے ہے۔ اچھا چل تو بھی کرے دیوی کے درشن۔ کیا تجھے ہے خدا کی قسم۔ آتو بھی کیا یاد کرے گا۔“ وہ اسے گھسیٹ کر ڈبے سے باہر لے گیا اور پھر لمحہ زندہ ڈبے میں اسے زبردستی ٹھونس کر چلانے لگا ”یہ آیا ہے ایللی خالہ سعیدہ کستا ہے میں خالہ سے ملوں گا۔“

”آ ایللی“ خالہ بڑے تپاک سے بولی ”میں تو کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔ یہ ایللی ہے۔ میری خالہ ہاجرہ کا بیٹا۔“ اس نے مونگیا گٹھڑی سے کہا جو پاس ہی سیٹ پر دھری تھی۔

مونگیا گٹھڑی میں جنبش ہوئی دو سفید خون میں بھیکے ہوئے ہاتھ ایللی کی طرف لپکے۔ تازہ خون کی بو کا ایک رپلا آیا۔ ایللی بھاگنے کی سوچ رہا تھا کہ گٹھڑی کے پٹ کھل گئے۔ دو گلابی جھیلیں چھلکیں جن میں سیاہ گلاب ابھر رہے تھے۔ سارے منہ پر غمگینی پیر ہوئی اس ریگ رہی تھیں۔ پھر ایک چھلکا ہوا تبسم۔ ایللی کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ گردو پیش جھلکا کر معدوم ہو گیا۔

سعیدہ نہ جانے ہاتھ ہلا ہلا کر کیا کہہ رہی تھی۔ باہر پلیٹ فارم پر ارجمند آنکھ بچا کر چھاتی پیٹ رہا تھا۔ رفیق رشمیں رومال ہلا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بوند باندی ہو رہی تھی۔ پرے علی احمد حسب دستور کولہوں پر ہاتھ رکھے ڈبے پر نگاہیں گاڑے کھڑے تھے جیسے کوئی چیل پر تول رہی ہو۔ ان کے قریب ہی صفدر انگلیوں میں سگریٹ تھامے چٹکی بجا بجا کر گنگنا رہا تھا۔ ”اے دلربا میں ہوں فدا۔“ ایللی خاموش کھڑا تھا۔ نہ جانے کب تک ویسے ہی کھڑا رہا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ کب مونگیا گٹھڑی کے پٹ بند ہوئے۔

پھر اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ کھڑکی کے باہر ٹیلے بھاگ رہے تھے۔ یا سرسبز میدان پھیلے ہوئے تھے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ لوگ باتیں کر رہے ہیں یا نہیں رہے ہیں۔ دل میں ایک شور برپا تھا۔ رگوں میں لہرس اٹھ رہی تھیں۔ سینے میں دھکیلی بیج رہی تھی۔ سامنے ایک لق و دوق ویرانہ پھیلا ہوا تھا اور اس ویرانے میں ایک مونگیا گٹھڑی پڑی تھی۔ اور دو خون آلود ہاتھ — اور گاڑی ہوکتی ہوئی جاری تھی۔

شہزاد

محلے میں شہزاد کی آمد یوں اثر انداز ہوئی جیسے جوہڑ میں پتھر گرنا ہے۔ محلے کے بند پانی میں دھاروں طرف چھیننے اڑے جیسے سوڈے میں کسی نے نمک کی چٹکی ڈال دی ہو۔ پھر لہرس جوہڑ کے

طول و عرض تک دوڑ گئیں۔

عورتوں نے اسے دیکھا اور ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر خاموش ہو گئیں۔ بوڑھوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مردوں کی آنکھیں پٹی رہ گئیں۔ بوڑھے اسے دیکھ کر چپ چاپ مسجد کی طرف چل پڑے اور وہاں جا کر سبحان اللہ کا ورد کرنے لگے۔

محلے کے بڑوں میں صرف دو رنگیلے آدمی تھے جو عمر میں بڑے ہونے کے باوجود خیر مزاج تھے اور زندگی میں لہریں پیدا کرنے کے قائل تھے۔ علی احمد اور محمد اعظم، انہیں لڑ پڑھنے۔ گردن جھکانے کھانے یا مسجد میں جا کر سبحان اللہ کا ورد کرنے سے قطعاً دلچسپی نہ تھی منہ سے گنگنائے کی بجائے سبحان اللہ، ان کی آنکھوں میں منعکس ہو جاتا۔ جبکہ کر پیچھے ہر جانے کی بجائے وہ آگے بڑھ کر کوئی بات چھیڑ دیتے۔

”لڑکی تو اداس تو نہیں ہو گئی یہاں آکر۔“ محمد اعظم مسکراتے۔ ”گھبرا نہیں دل لگ جا گا۔“ اور پھر ان کی نگاہوں سے ظاہر ہوتا کہ دل لگ کر سب ٹھیک ہو گیا ہے۔

صبح سویرے ہی محمد اعظم آہنچتے۔ ”کیوں شہزاد کچھ پکانے کھانے کا بھی فکر ہے یا نہیں۔“ خولی شہزادگی نہیں چلے گی یہاں، بول کیا منگوانا ہے بازار سے۔ ہائیں بیٹنگن کھائے گی۔ آج بیٹنگن اونٹوں بیٹنگن نہیں کھایا کرتے گرمی ہو جاتی ہے۔ اچھا شریف کو کھلائے گی بیٹنگن۔ اس طرح کب تک گزارا ہو گا۔“ اور وہ قہقہہ مار کر ہنستے۔ ”اچھا چائے کا پیالہ تو پلا ایک کمیشن ادا کرنے کے بغیر نہیں لایا جاتا سمجھی، ہائیں تو بروک بانڈ پیتی ہے۔ اونٹوں لڑکی چا۔ لپٹن کی۔“ اور ان کی متبسم نگاہیں کسی رنگین پیالی سے لپٹ جاتیں اور انداز سے معلوم جیسے بیٹنگن کھا کے آئے ہوں۔

محمد اعظم کا طریق کار گھریلو انداز کا حامل تھا۔ ان کی باتوں میں اپنا لینے کا پہلو واضح ہوتا۔ کر کے پہلو بدلتے۔ پہلو بدل کر پھر بات کرتے اور اس دوران میں نگاہوں سے جانچتے۔ اسلئے علی احمد چل کر جانے کے قائل نہ تھے نہ انہیں سودا لاکر دینے کی بات پسند تھی اور نہ ہی چائے کا پیالہ مانگنے کے قائل تھے۔ ان کی باتوں میں اشارت کا پہلو ہوتا تھا۔ وہ دور کھڑے چل چیل کی طرح منزل لاتے پھر آواز دیتے۔ باتوں سے رجھاتے اور تمام تر بات زبان کی مدد سے نگاہوں ہی میں طے کر لیتے اور بالاخر برسبیل تذکرہ آواز دیتے۔ ”میں نے کہا چاچی۔ آجائیں گے بچا۔ مسجد ہی میں گئے ہیں تو کیوں پریشان ہو رہی ہے۔“ اور جب چاچی ہنس کر

جھپٹ کرتی تو کہتے میں نے کہا۔ یہ شریف کے گھر کی کھڑکی میں کون کھڑی ہے۔ کوئی اندھی سری معلوم ہوتی ہے نہ سلام نہ دعا نہ بات نہ چیت — اچھا تو تو ہے شہزاد میں سمجھا شاید اندر ہمیں جلا رکھا ہے۔ تو آئی نہیں کبھی۔ دکھائی ہی نہیں دیتی۔ نہ جانے کن مشاغل میں کھوئی رہتی ہے۔“

علی احمد شہزاد کی آواز سنتے تو خیم کے چوبارے سے ملحقہ جنگلے میں نکل آتے اور خیم کو یوں آواز دیتے جیسے خیم سے بے حد ضروری کام پڑ گیا ہو۔ جب سے شہزاد نے محلے میں قدم رکھا تھا علی احمد کو بار بار خیم سے کام پڑ رہا تھا۔ گھر کے تمام لوگ ان کے اس ضروری کام کی نوعیت سے واقف تھے۔ ایسے وقت سیدہ گھٹنوں میں منہ دے کر ہنسی۔ داوی اماں مسکرا کر کہتی۔ ”تو یہ اس لڑکے کو تو اپنی سُدھ بڈھ نہیں رہتی۔“ خیم چوبارے میں ان کی آوازیں سنتی اور تیوری چڑھا کر اپنے آپ سے کہتی۔ ”میں جانتی ہوں ان کے ضروری کام کو اچھی طرح معلوم ہے مجھے۔ کون نہیں جانتا۔“ شہزاد جنگلے کے سامنے کھڑی ہوتی تو فوراً اسے آواز دیتے۔ ”شہزاد ہے۔“ وہ جنگلے سے چلاتے۔ ”سنا کیا حال ہے۔ نور پور تو نہیں یاد آتا۔ کھلے میدانوں میں کیلیں کرنے والیاں جب گھر میں قید ہو جاتی ہیں تو جی گھبراتا ہے ٹہ ٹہ ہی ہی۔“ اور وہ اپنی بات پر ہنسنے لگتے اور دیر تک ہنس جاتے۔

شہزاد کو دیکھ کر صفدر اپنے کھدے ہوئے بازو کو بھول جاتا۔ اسے بل جھٹک کر سر ملانا بھی یاد نہ رہتا اور اپنا محبوب گیت حافظ خدا تمہارا جو وہ پارسی لڑکی کے ساتھ سٹیج پر گایا کرتا تھا قطعی طور پر بھول جاتا اور پٹی پٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے میں کھو جاتا۔

محلے کے جوان تو شہزاد کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ اس کی ہر بات زالی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا انداز بے حد انوکھا تھا۔ جتنی کی آڑ میں کھڑی ہونے کی بجائے وہ جتنی کو لپیٹ دیتی اور چمپ کر دیکھنے کی بجائے اطمینان سے کھڑکی کے زیریں سارے پر پاؤں رکھ کے بے تکلفی سے ادھر ادھر دیکھتی۔ وہ محلے والیوں کی طرح میلے اور سادہ کپڑے پہنتا پسند نہ کرتی تھی۔ اس کا دوشہ لٹلائیے شالوں پر گرا رہتا۔ جیسے وہ سر کی جگہ شالوں سے متعلقہ لباس ہو۔ اس کے بل نیم کھلے رتے اور آنکھوں کے کونوں میں دور کشیوں تک سرے کی دھار صاف دکھائی دیتی۔

رفش اسے دیکھ کر گھبرا جیلا کرتا۔ اس کی گردن جھک جاتی۔ اس کی نگاہیں اماٹے کے فرش پر آوارہ ہو جاتیں اگرچہ ان میں ہوائیاں سی چلتی رہتیں۔ اور اس کے ہونٹ نہ جانے کیا

طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا جرم ہو۔ اس لئے گھر کے کسی کو نے میں بیٹھ کر مسکراتی ہوئی شہزادی کی طرف حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتا اور اس کے قریب تر جانے کی آرزو کو دل میں باک سمجھتوں طرف اس کے قدموں میں بیٹھ رہتا۔ اسے یہ بھی تو معلوم نہ تھا کہ آرزو کرنے کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ اسے تو بس شہزاد کے قرب کی آرزو تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے قریب تر ہو جائے اور اسے دیکھ کر شہزادی آنکھوں میں ایسی پھلجھریاں چلیں جیسے شریف کو دیکھتے ہوئے چلا کرتی تھیں۔ مگر یہ ناممکن تھا اور ممکن ہوتا بھی تو لیکن کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے دوست کی بیوی کی آرزو کرے۔ کتنی بری بات تھی۔ کتنی ناجائز۔ اس بات کو بھلانے کے لئے اس نے اپنی توجہ دوسری باتوں کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔

چند ایک دنوں کے بعد ارجمند نے بھی محلے کے چوگان میں کھڑا ہونا موقوف کر دیا۔ ”نہ ہجی۔“ وہ چلانے لگا۔ ”اپنے بس کی بات نہیں۔ اپنے تو پر جلتے ہیں اور بھی ایللی بات یہ ہے کہ پکا پکا کھانا اپنے نصیب میں نہیں۔ اپنے نصیب میں تو انتظار کرنا لکھا ہے۔ بس چھ سال کی بات ہے۔ صرف چھ سال۔ بھر کپ کو بھلکے دیکھنا۔ اف غضب ہو جائے گا اور دوست رام تو ہم پہلے ہی کر لیں گے۔ اگر مناسب وقت پر رام نہ کر لیا جائے بھائی تو یہ بلا قابو میں نہیں آئیں۔ بس جہاں کی کٹوریوں میں گلاب آیا تو سمجھ لو کہ دنیا ہی بدل گئی۔ یوں آنکھیں پھیر لیتی ہیں جیسے جانتی ہی نہ ہوں اور وہ شہزاد۔ ارے وہ تو ظالم بے عزتی کر دیتی ہے بالکل بے عزتی۔ اس روز مجھ سے پوچھنے لگی۔ ”کس داؤ پر کھڑا ہے تو۔“ کچھ کامیابی کی بھی امید ہے یا ایسے ہی ظالم نے مجھے کٹ کر رکھ دیا اللہ بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ ہم کسی گنتی میں شمار نہیں اور پھر یوں کٹ کے رکھ دیتا۔ بھئی واہ۔ نہ بھئی اپنے بس کی بات نہیں۔ لیکن تم آزادی سے آجاسکتے ہو۔ دوست تم مزے میں ہو۔“

ارجمند اور ایللی دونوں اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے کپ اور کپ میں دلچسپی کا اظہار کرتے لگتے۔ ایللی کہتا ”چلو وہاں چلیں تمہارے گھر میں کھوری ڈکوری دیکھیں گے۔“ ارجمند مسکرا کر چلاتا ”کیوں دوست ابھی سے چوہا گھڑی پر چڑھنے لگا۔“ اور وہ دونوں کھڑکی کی دوزلوں سے منزل کے گھر میں جھانکتے۔ سبز جھیلے کا دروازہ کھلتا اور ایللی محسوس کرتا جیسے کسی مونگیا گھڑی کے پت کھل گئے ہوں۔ اس کے شانوں پر بوجھ پڑ جاتا۔ بند بند میں دھکی سی بجتے لگتی اور وہ گہرا کر کھڑکی سے ہٹ جاتا۔

منگتا تے۔ پھر وہ چپکے سے شہزادی کی سیڑھیاں چڑھ جاتا۔ ”چچی کوئی سودا تو نہیں منگوانا“ اور اس آنکھوں سے گلابی شرارے پھوٹتے اور ہونٹوں سے اف اف کی آواز پیدا ہوتی۔ جیسے اسے ہر کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہو اور شہزاد بے نیازی سے اس کی طرف دیکھتی اور ”نہیں“ کہہ کر بے پروائی سے کسی کلام میں لگ جاتی جیسے پڑ ہی نہ ہو کہ رفیق کو اتنا کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ ارجمند انگریزی کا تمام تر سلاسل لے کر چوگان میں کھڑا ہو جاتا اور ہلنے ہلانے شروع کر دیتی کی طرف دیکھتا۔ شمس ردیل ہاتھوں میں اچھالتا۔ احتیاط سے ہٹائے ہوئے ہالوں اور شمس ردیل سے سنبھالتا اور پھر بائیں ہونٹوں تلے رکھ کر سر اٹھا کر یوں اوپر کی طرف دیکھتا جیسے سپرے کے ٹوکے سے سانپ نکلنے والا ہو۔

لیکن نہ جانے شہزاد کس مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ اس نے ارجمند کی حرکات کو کبھی درجہ اعتدال سمجھا تھا۔ وہ کھڑکی میں آتی ہر راہ چلتی ہوئی محلے والی سے کوئی بات چھیڑ لیتی۔ ہر گز جاتے سے ہنس نہ کر بات کرتی مگر اس نے کبھی ارجمند کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ ارجمند کی ساری کی ساری انگریزی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ پھر وہ آتا کر کچی حویلی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ جہاں کپ اسے دیکھ کر چھلکتی اور کپ یوں جھدکتی جیسے پارے کو آگ لگا گئی ہو۔ کچی حویلی میں پہنچ کر اس کے انگریزی میں از سر نو تاثر ہو جاتا تھا اور چہرے پر داغ آجاتی۔

احاطے میں ایللی کے کھڑے ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اول تو اس میں اتنی جرات تھی کہ ارجمند سے سیکھے ہوئے داؤ کو آزما سکے۔ لیکن کبھی ارجمند کے ساتھ کھڑا بھی ہوتا تو حویلی یا باہر کوئیں کے قریب محلے کے احاطے میں کھڑے ہونا ایللی کے لئے ناممکن تھا اور پھر شہزاد کے لئے کھڑے ہو۔

جب سے ایللی نے ریل گاڑی میں اس مونگیا گھڑی کے پت کھول کر اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر شہزاد کا اس قدر رعب پڑ گیا تھا کہ اس کی آواز سن کر نگاہیں جھک جاتیں اور وہ اسے بھاگ لیتا۔ شہزاد کے رو بہ جانا تو الگ بات تھی۔

شہزاد کے سامنے ایللی کے شانوں پر منوں بوجھ پڑ جاتا۔ نگوں میں گویا خون جم جاتا۔ دھک دھک کرتا۔ جی چاہتا کہ دوڑ کر کسی کو نے میں جا بیٹھے اور اپنے آپ کو محفوظ کرے۔ تو یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی اور دنیا کی مخلوق ہو۔ جیسے وہ ایک ایسی پاکیزہ ہستی ہو جس



”ارے کیا ہے تجھے۔“ ارجمند اسے یوں بے توجہی برتتے ہوئے دیکھ کر کہتا ”میاں بھو  
موقع پر میدان چھوڑنا مردوں کا کلمہ نہیں۔“

اس پر ایلی لا جواب ہو کر بھاگ آتا اور اپنے چوہارے کے کونے میں بیٹھ کر اپنی کٹی  
شدت سے محسوس کرتا۔ اس کی نگاہوں میں فرار کی رنگین راہیں کھلتیں اور وہ ان میں کھو جاتا



## سانوری

### دولت پور

کچھ روز کے بعد دولت پور سے علی احمد کا خط موصول ہوا۔ جس میں ایلی کو ہدایت کی گئی  
تھی کہ خط کو دیکھتے ہی وہ فوراً دولت پور آ جائے۔ خط پڑھ کر ایلی چونکا اسے ڈر تھا کہیں ابا اسے  
دولت پور کے کالج میں داخل ہونے پر مجبور نہ کریں۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے پھر سے لاہور  
کے کسی کالج میں داخل کیا جائے۔ کیونکہ لاہور میں وہ آزادانہ زندگی بسر کر سکتا تھا۔ لیکن جب  
سے علی احمد کا تبادلہ دولت پور نہیں ہوا تھا ایلی کو یہ فکر دامن گیر ہو گیا تھا کہ کہیں علی احمد اسے  
دولت پور کے کالج میں داخل ہونے پر مجبور نہ کریں۔ علی احمد کے مکان سے ایک مرتبہ چھٹکارہ  
حاصل کرنے کے بعد وہ از سر نو وہاں مقید نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ علی احمد کے کمرے سے ڈرتا  
تھا اسے کشمیر کے سیبوں پر پلّی ہوئی ماں کی حنا مالیدہ ہاتھوں سے وحشت ہوتی تھی۔ سب سے  
بڑھ کر اسے علی احمد کے کمرے سے نفرت تھی۔ جہاں کوئی نہ کوئی کوریا خانم موجود رہتی تھی۔

لیکن علی پور میں رہ کر اپنی زندگی تباہ کرنا بھی تو اسے گراں ہو رہا تھا۔ ایک ان جانی کشمکش  
اسے جگی کے پاؤں کی طرح پیس رہی تھی۔ اس لئے اس نے دولت پور جانا منظور کر لیا۔ کیونکہ  
علی پور سے مخلصی پانے کا یہی ایک واحد طریقہ تھا اور وہ مانگے کے سوٹ کیس میں اپنی چند ایک  
لوہمیائے کی قمیض ڈال کر دولت پور کی طرف چل پڑا۔

دولت پور میں علی احمد کے مکان کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ وہ ایک پختہ چوہارہ تھا جو ایک جنگلے

شہر میں پٹی ہوئی عورتوں کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ ایللی کی نظروں میں عیش کی آنکھوں کا فرق زیادہ نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ عیش کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار واضح تھے۔ رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ ”سچاری۔“ وہ سوچنے لگا ”اس کی زندگی عام بیویوں سے کس قدر مختلف ہے اسے کیا کیا برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ جب چینی کی گڑیا آکر چینی ہوگی اور ٹین کا سپاہی میدان کار زور گرم کرتا ہو گا تو عیش اس بنگلی کمرے کی چار پائی پر بیٹھ کر کیا سوچتی ہوگی۔“ اس کے دل میں پہلی مرتبہ عیش کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی لیکن اس جذبہ ہمدردی میں ترس کا عنصر نمایاں تھا۔

سارا دن ایللی پریشان رہتا۔ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ صحن میں عیش کو روٹی پکاتے ہوئے دیکھ کر اس کی طبیعت ماش کرنے لگتی اور وہ دیوار کی طرف منہ موڑ لیتا۔ کھڑکی سے کور جھانکتی۔ ”بابو جی کہاں ہیں۔“ دروازے سے استانی تہہ بند جھاڑتی ہوئی داخل ہوتی۔ ادھر سے خانم مسکراتی۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ بالآخر وہ بنگلی کمرے کی کھڑکی سے اس بے قرار نوجوان کو دیکھنے میں کھو جاتا جو نہ جانے کس کے لئے دن بھر چھت پر بلادیہ پینائی کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ پھر وہ گھبرا کر گھر سے باہر نکل جاتا اور دولت پور کے بازاروں میں بے مصرف گھومتا۔

دولت پور دوسرے شہروں سے کس قدر مختلف تھا۔ ہاں آباد کی تو اور بات تھی وہ تو شہر تھا ہی نہیں بلکہ محض ایک نو آبادی تھی۔ جہاں غریب لوگ رہتے تھے۔ لیکن دولت پور تو پرانا شہر تھا پھر اس کے بازاروں میں اس قدر ویرانی کیوں تھی۔ اس کی دوکانوں میں وہ بھڑک نہ تھی جو بڑے شہروں کی دوکانوں میں ہوتی ہے۔

بازاروں میں آتے جاتے لوگ ساوہ طبیعت کے تھے۔ ان کے لباس میں دکھلوے کا عنصر نہ تھا۔ ان کی گفتگو میں ایک عجیب قسم کی معصومیت تھی۔ وہ اپنی غرور کا اظہار کرنے سے گھبراتے نہ تھے۔ ایک پیسے کا سودا لینے کو عار نہ سمجھتے تھے۔ دولت پور لاہور سے کس قدر مختلف تھا۔

### سلفر اور پٹاخہ

دولت پور کی زندگی کا مرکز پنواڑی کی دوکان تھی جو عوام کے جذبات کی عکاسی کرتی تھی۔ ہر دوکان پر چار ایک نوجوان جمع رہتے جو پان کھاتے۔ ایک دوسرے پر فقرے کہتے اور پھر سیٹھ گرد عاری لال یا مدن لال بھابھڑ کے تازہ ترین معاشرے پر ہنس کر باتیں کرتے گتے۔ ایللی دور

دو کروں اور ایک کمرہ نما صحن پر مشتمل تھا۔ ایللی نے محسوس کیا کہ وہ مکان گھر نہیں تھا بلکہ تر علی احمد کا کمرہ تھا۔ گھر تو ہاں آباد میں تھا۔ جہاں ایک وسیع و عریض صحن تھا۔ جس کے پہلوؤں میں چار کمرے تھے۔ ایک دوسرے سے الگ۔ ایک دوسرے سے دور جہاں علی احمد کے بچے رہتے ہوئے بھی ان سے دور رہتا ممکن تھا۔ جہاں ایللی ٹین کے سپاہی کے میدان جنگ کی باتوں سے دور رہ سکتا تھا۔ جہاں وہ اپنی انفرادیت کو بحال رکھ سکتا تھا اور پائی کی بوتل بھرنے کے اپنے ذہن کو اس کمرے کے تاثرات سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ لیکن دولت پور کا گھر تو سب سے سب ایک کمرہ تھا۔ جسے بہت سے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جیسے کبوتروں کے رہنے کے لئے ڈربے بنے ہوتے ہیں۔ اگرچہ دیواروں کے پردے کھڑے تھے۔ اس کے باوجود کسی کمرہ کی انفرادی حیثیت نہ تھی۔

دولت پور کا چوبارہ دیکھ کر وہ لرز گیا۔ اسے ٹین کے سپاہی اور ربڑ کی چیخنے والی گڑیاں ساتھ رہنا پڑے۔ گد نہیں نہیں وہ دولت پور کے کالج میں تعلیم نہیں پائے۔ گد کبھی نہیں۔ صحن میں چولے کے سامنے عیش بیٹھی تھی۔ کشمیر کا وہ سیب جو پکتنے سے پہلے ہی سڑا ہوا تھا۔ وہ عیش۔ اس کے گرد کباڑی کی دوکان کی مانند کھانے پینے کی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ کی مضی پچی کی ناک بہہ رہی تھی۔ قریب ہی بڑی لڑکی حواج سے فارغ ہونے میں مشغول تھی۔ عیش روٹیاں پکاتے ہوئے مضی کی ناک پونچھتی۔ بڑی لڑکی کے جسم کو کپڑے سے صاف کرتا۔ پھر انہیں ہاتھوں میں آنے کا پیرا اٹھا کر روٹی پکانے میں مصروف ہو جاتی۔ ساتھ والے کمرے میں علی احمد میکی سی دھوئی ہاتھ ایک بڑے سے رجسٹر میں آلو اور پیاز کا حساب لکھنے میں مصروف تھے۔ بنگلی کمرے میں چیزیں گڈمڈ پڑی تھیں۔

ایللی پر ایک گھبراہٹ طاری ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس مکان سے نکلے۔ اس لئے وہ عقی کھڑکی میں کھڑا ہو کر پچھواڑے کے مکانات کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ سامنے کوٹھے پر کوئی شخص خنجر نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں ایللی کی کرن واضح تھی۔ اس کے انداز سے بے مبری عیاں تھی۔ چند لمحات کے لئے وہ کوٹھے پر رہا۔ پردے کے قریب آکر کھڑا ہو جاتا۔ نگاہیں اس کھڑکی پر مرکوز ہو جاتیں جس میں ایللی کھڑا تھا۔ چند منٹ ایللی وہاں کھڑا رہا پھر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور عیش کی طرف متوجہ ہو گیا۔ عیش کے رہنے بسنے کا انداز دیکھ کر اسے غصہ آنے لگا کیا میٹرکولیٹ ایسی ہوتی ہیں۔

بیٹہ کروہام کیا کرتے تھے۔ دوسرے دن ابلی اطمینان سے ان کے دفتر جا پہنچا اور بے تکلفی سے اسلام و عیلم کہہ کر کرسی پر بیٹھ گیا جو علی احمد کے میز کی دوسری جانب رکھی تھی۔

”ہوں۔“ علی احمد بولے ”تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔“

”جی ہاں۔“ ایللی نے جواب دیا۔ ”مجھے لاہور داخل کروا دیجئے کیونکہ لاہور میں۔“

”ہوں۔“ انہوں نے ایلچی کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے بید کی چھڑی اٹھائی جو پاس دیوار کے سہارے کھڑی تھی۔

”تو تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے زن سے سوئی اس کے سر پر دے ماری۔

”ارے۔“ وہ گھبرا گیا۔ اسے اس سلوک کی توقع نہ تھی۔

”ہوں۔“ علی احمد نے کہا۔ ”تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔“ اور سوئی کی ایک اور ضرب لگائی۔ ابلی گھبرا گیا۔

”دیکھئے آپ مجھے مجبور نہ کریں۔“ وہ بولا۔

”ہوں تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔“ انہوں نے ایک اور ضرب لگائی۔ ”میں کہتا ہوں آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ۔“

زن سے ایک اور ضرب بڑی۔ نہ جانے اس وقت ایللی کو کیا ہوا وہ یہ بھول گیا کہ وہ ایللی ہے اور علی احمد اس کے والد ہیں۔ اس نے ایک جست لگائی اور اس میز پر چڑھ گیا جو باپ اور بیٹے کے درمیان پٹھی ہوئی تھی۔ جھپٹ کر علی احمد کے ہاتھ کی سوئی کو پکڑ لیا۔ ایک کھولتی ہوئی نگاہ باپ پر ڈالی۔

”تو تم دولت پور کے کالج میں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔“ علی احمد نے وہی فقرا پھر دہرایا اہلی نے ایک جھٹکا دے کر بید کی سوئی علی احمد کے ہاتھ سے چھین لی اور اسے توڑ موڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ چند ساعت کے لئے وہ علی احمد کے رو برو کھڑا رہا۔ جیسے ان کا حریف ہو اور پھر میز سے اتر کر چپکے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

لا ایک گھنٹے نہ جانے وہ کہاں گھومتا رہا۔ بھاگ جانے کے خوفناک منصوبے بناتا رہا۔ سوچتا رہا کہ کس طرح وہ سمندری جہاز میں داخل ہو کر چھپ جائے گا اور جب جہاز مگرے سمندر میں

سے ان کی باتیں سنتا اور پھر آگے نکل جاتا اس کے لئے ایسی دوکان پر جانا ممکن نہ تھا۔ ہر لوگ کا تنگناک ہو۔ پان خریدنے کے لئے وہ ایسی دوکان پر جایا کرتا تھا جس کوئی گاہک نہ ہو۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا کہ سودا خریدنے کے دوران میں گاہک آجاتے اور مجمع لگ جاتا۔ یہ مواقع کی اسے دولت پور کی مجلسی زندگی کے متعلق چند ایک باتوں کا علم ہو گیا تھا۔ مثلاً یہ معلوم تھا کہ سیٹھ گردھاری لال کی حیثیت اب وہ نہیں رہی تھی جو کبھی پہلے تھی اور اب اس نے ساجو سے تعلقات پیدا کر رکھے تھے۔ اور ساجو ان کی یہاں آتی جاتی تھی اور دولت پور میں ایسا کون تھا جو ساجو سے واقف نہ ہو۔ کون نہیں جانتا تھا کہ وہ سلفے کی چلم ہے اگرچہ اب ہا میں راکھ رہ گئی ہے۔ لیکن پھر بھی شوقین اسے چوستے تھے اور اس کا دھندا چلتا تھا۔

اسے یہ معلوم نہ تھا کہ سیٹھ گردھاری لال کون ہے اور ساجو کس کا نام ہے اور وہ منٹا چلم کیوں ہے۔ وہ تو صرف یہ جانتا تھا کہ ساجو کوئی ہے۔ ہوگی کوئی اور سیٹھ گردھاری لال اے چوس رہے تھے۔ لیکن اسے اس بات سے کیا تعلق۔

کئی مرتبہ حلوائی بازار کی طرف جاتے ہوئے جب وہ گلی میں سے گزرتا تو اسے خیال آتا کہ شاید یہی مکان ہو سیٹھ گردھاری لال کا۔ شاید یہی شخص جو چلا آ رہا ہے سیٹھ گردھاری لال ہے کیونکہ دولت پور کے سیٹھوں اور عوام میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک سے بڑا معلوم ہوتے تھے۔

پھر اسے معلوم ہوا کہ دولت پور میں ایک نیا قلعہ بیدار ہوا ہے۔ جس کی شکل پانچ سیڑ  
اور جو مست ہاتھی کی طرح چلتی ہے اور شوقین راستے میں کھڑے ہو کر گھنٹوں اس کا انتظار  
کرتے ہیں۔

اس سلفے کی چلم اور اس نئے فتنے کے باوجود اہلی کو دولت پور میں رہنے سے کوئی دلچسپی نہ ہوئی اور بالآخر مجبور ہو کر علی احمد سے کہنے لگا "میں یہاں داخل نہیں ہوں گا۔ میں تو لاہور میں پڑھوں گا۔" علی احمد نے ایک ساعت کے لئے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر بولے "اس وقت اس موضوع پر بات کرنا بیکار ہے اس لئے کہ ہمیں فرصت نہیں ہے کل دفتر آجائے وہاں یہ مسئلہ طے کر لیں گے۔"

واخله

دفتر میں علی احمد کی حیثیت انفر کی تھی۔ ان کے لئے ایک علیحدہ کمرہ مخصوص تھا۔ جس میں

تھی۔ ”سلام کتا ہوں جی۔“ بلا شیم سے مخاطب ہو کر بولا ”اپنے پھوپھا جان کہل گئے ہیں۔ ہوں گے! ہوں گے! باہر سیر کرو۔“ ہمیں ایلی بھائی بھی یہاں ہیں۔ مزاج تو بخیر ہے تا۔ شکر اللہ کا میں تو بالکل خیریت سے ہوں۔ علی پور میں سبھی خیریت سے ہیں ہاں۔“ اس نے یوں کہا جیسے یہ ایک ایسوی ناک امر ہو۔ ”بھئی یاد کرتے ہیں آپ کو۔“ وہ اپنے آپ سے باتیں کئے جا رہا تھا جیسا کہ اس کی عادت تھی۔ خود ہی سوال کرتا۔ پھر خود ہی اس کا جواب دینے لگتا۔ اس کی نگاہیں نہ جانے کس طرف دیکھنے میں کھوئی رہتی تھیں۔ جیسے دیواروں کے پار کچھ دیکھ رہا ہو۔ اس کی چچی بلا کی طرف دیکھنے میں کھوئی رہتی جیسے ڈرتی ہو کہ کہیں بلا اس کی نگاہ سے اوجھل ہوئے دیا گیا تو وہ پر اسرار طریقے سے گم ہو جائے گا۔

جلد ہی شیم اور ایلی کو معلوم ہو گیا کہ بلا اور اس کی چچی وہاں دو ایک مہینے ٹھہرنے کے لئے آئے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ شاید علی احمد کے زیر اثر رہنے سے بلا میں دسویں پاس کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اگرچہ علی احمد نے ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا تھا مگر ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ انہیں قطعی طور پر خوشی نہیں ہوئی بلکہ ان کے آنے سے کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

بلا اپنے جواہرات کے ڈبے کھول کر بیٹھ جاتا۔ ”یہ دیکھو ایلی۔“ وہ اسے آکھاتا۔ ”یہ نلیم جو ہے یہ کوہ سفید کے سوا اور کسی جگہ سے نہیں ملتا ہاں۔ کیونکہ وہی ایک پہاڑ ہے جہاں پریوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ پریوں کو نلیم سے محبت ہوتی ہے۔ ہاں۔ پھر جب چودھویں رات کا چاند چمکتا ہے نا تو اس کا رنگ اور بھی گہرا ہو جاتا ہے اور۔“

ایلی کو اب بلا کے قیمتی پتھروں سے وہ دلچسپی نہ تھی جو کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ ایلی اس کی باتیں سن کر مسکراتا اور پھر سوچتا کہ کس طرح بلا کے طلسمی پتھروں سے مخلصی پائے لیکن اعلانیہ بلا کی بات کٹ کر چلے جاتا یہ اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ بہر حال وہ بلا کی باتیں سنتا جتا یاں لیتا اور نہ سننے کی آرزو کرتا۔

پھر مدھمتا بلا اٹھ بیٹھتا اور آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔ جیسے کوئی اسے بلا رہا ہو۔ ”ابھی آتا ہوں۔ بھئی۔ ابھی آیا میں۔ وہ بلا رہے ہیں نا مجھے۔“ اس کے اشاروں میں راز و دار نہ اور پر اسرار انداز جھلکتا۔ اس کی مسکراہٹ میں احساس برتری کی جھلک ہوتی۔ جیسے وہ حالات کو بہتر

بچ جائے گا تو وہ باہر نکلے گا۔ اور جہاز والے بلا خراسے رکابیاں دھونے پر ملازم رکھ لیں گے۔ کہ جہاز بصرہ کی بندرگاہ میں نگر انداز ہو جائے گا۔ پھر چپکے سے جہاز سے باہر نکل جائے گا۔ اس کے ایک عزیز نے کیا تھا۔

لیکن یہ دلچسپ تفصیلات سوچنے کے بعد وہ گھر لوٹ آیا۔ اس میں بھاگ جانے کی جرات تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ بھاگ جانے کی تفصیلات بھی نہ سوچے۔ جب وہ واپس پہنچا تو علی احمد اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ”غلام محمد“ انہوں نے نوکر کو آواز دی۔ ”اگر ڈاکٹر رام داس کے پاس لے جاؤ۔“

ڈاکٹر سے دو الگوانے کے بعد وہ چارپائی پر لیٹ کر فیصلہ کرتا رہا کہ دولت پور کے کلینک داخل نہیں ہو گا چاہے کچھ ہو جائے لیکن تیسرے روز جب علی احمد نے اپنے ہیڈ کلرک کے ساتھ اسے دولت پور کینٹ کلج میں داخل ہونے کے لئے بھیجا تو وہ یوں چپکے سے اس کے راز چل پڑا۔ جیسے دولت پور کلج میں داخل نہ ہونے کا اس نے فیصلہ ہی نہ کیا ہو۔

چند ایک دن تو ایلی جو بارے کے ان دونوں کمروں میں پریشان حال گھومتا رہا پھر قلعہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ جب شام کے وقت شیم کھانا پکانے لگتی اور نانہہ حواج میں مصروف جاتی اور انجم کی ناک بہتی تو وہ چپکے سے باہر نکل جاتا اور دولت پور کی گلیوں میں گھومتے ہوئے سوچتا کہ یہ مکان سیٹھ گردھاری لال کا تو نہیں اور یہ عورت جو کھڑکی میں کھڑی ہے۔ دولت پور کا نیا فتنہ ہے یا سلنے کی چلم۔

وہ یونہی گھومتا رہتا تاکہ وہ شیم کو کھانا پکاتے ہوئے نہ دیکھے۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ سوچے لگتا کہ کس طرح وہ جہاز میں چھپنے میں کامیاب ہو سکے گا۔ اور پھر کس طرح جہاز کا کپتان لے رکابیاں دھونے پر نوکر رکھنا منظور کر لے گا اور پھر بصرہ کی بندرگاہ میں کس طرح سے چوریا چوری جہاز سے اترے گا۔ وہ مسلسل طور پر کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا تاکہ کھانے کے دوران یہ خیال نہ آئے کہ یہ وہی کھانا ہے جسے شیم نے پکایا ہے۔

### جمعہ شہ

پھر ایک روز علی احمد کے یہاں بلا اور اس کی چچی آگئے۔ آگے آگے بلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا اور اس کے پیچھے اس کی چچی دیواروں کا سہارا لیتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔

یوں بکرجائیں۔ جیسے معاملے سے بنے ہوئے بلوے کا اندرونی ٹاکا لوٹ گیا ہو۔

اس پر دفعتاً کپڑوں کی گٹھڑی میں حرکت پیدا ہوتی اور چچی اٹھ کر بلا کے بکھرے ہوئے اعضا کو سمیٹتی اور بعد مشکل اس لاش کو گھسیٹ کر چارپائی پر ڈال دیتی۔ اس وقت ایلی سوچتا کیا یہ وہی بلا ہے جو فطرت کے تمام رازوں سے کما حقہ واقف ہے۔ کیا یہ بے ہوشی بھی کوئی راز ہے۔ یہ سوچتے سوچتے ایلی اوجھنے لگتا اور پھر چپکے سے اٹھ کر بستر لیٹ جاتا اور علی احمد کے قلم کی چراؤں چراؤں کو غور سے سننے میں مصروف ہو جاتا جو لمحہ کرے میں حسابات کے رجسٹر پر کرنے میں مصروف رہے۔ ایلی کو خوف دامن گیر رہتا تھا کہ کہیں علی احمد یہ نہ پوچھ لیں۔ "ایلی تم ابھی سے سو گئے کیا سارا دن آوارہ پھرتے ہو اور سرشام ہی پڑ کر سو جاتے ہو کیا وجہ ہے۔" لیکن علی احمد کو حساب کتب لکھنے میں اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ رجسٹر سامنے رکھ کر دنیا و مانیہ سے بے خبر ہو جاتے تھے۔

### آتشیں میزائل

رات کو خواب میں عجیب و غریب اشکال ایلی کے پیچھے دوڑتیں اور وہ ڈر کر بھاگتا۔ خوف سے اس کے روتھکنے کھڑے ہو جاتے۔ دل دھڑکتا۔ مگر وہ دوڑے جاتا۔ پھر بلا نہ جانے کہاں سے اس کے سامنے آکھڑا ہوتا اور مسکراتا۔ اس کی مسکراہٹ کو دیکھ کر عجیب قسم کی ہمدردی سی محسوس ہوتی تھی۔ کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔ "بلا مسکرا کر کتا ٹھیک ہو جائے گا۔ بلا کا چٹنا سفید ہاتھ ایلی کی طرف بڑھتا اور اسے تھپکنے لگتا۔ ایلی جاگ اٹھتا اور اپنے آپ کو کمرے میں دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتا۔ پھر آہستہ آہستہ از سر نو اس پر خوف مسلط ہونا شروع ہو جاتا۔ اندھیرے میں اس کا دم گھٹنے لگتا اور وہ آنکھیں بند کر کے پڑ جاتا۔ "دفعتاً" اسے محسوس ہوتا کہ کوئی چیز اس کے جسم سے چھو رہی ہے۔ آہستہ آہستہ حرکت کر رہی ہے۔

پہلی مرتبہ جب اس نے یہ محسوس کیا تھا تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ صرف بلا کا بازو چارپائی تلے یوں لٹک رہا تھا۔ جیسے قصائی کی دوکان پر بکھرے لٹکا کرتے ہیں۔ یہ بات تعجب خیز نہ تھی۔ کیونکہ اکثر بلا کے اعضا چارپائی سے لٹکا کرتے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ اس کا بازو اور ٹانگ چارپائی تلے دیکھے تھے اور بلا کی چچی تو اکثر رات کے وقت چلایا کرتی۔ "بلا تیری دوسری ٹانگ کہاں ہے۔ بلا کہاں ہے۔ تیری دوسری ٹانگ۔ پھر وہ اٹھ کر بلا کی دوسری ٹانگ

طور پر سمجھتا ہو جیسے وہ فطرت کے راز سے کما حقہ واقف ہو۔ "ذرا انتظار کرو میں ہو آؤں۔" ایلی سے کتا اور پھر چپ چاپ کوٹھے کی میز پر چڑھنے لگتا۔ اس کے جانے کے بعد کوٹھے پر زیر لب باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ پھر وہ لوٹ آتا لیکن میز پر اترتے وقت دفعتاً رکنا جیسے کسی نے اسے پھر بلایا ہو اور نہ جانے کس سے مخاطب ہو کر کتا۔ "نہیں نہیں یار نہیں۔ جیسے میں نے کہا اسے پھر بلایا ہو اور نہ جانے کس سے مخاطب ہو کر کتا۔" نہیں نہیں یوں نہیں۔ جیسے میں نے کہا تھا دیے۔" اور پھر مسکراتا ہوا نیچے اتر آتا۔ ٹھیس اور ایلی حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے رہتے۔ اسے آتا دیکھ کر ٹھیس گھبرا کر اٹھ بیٹھتی اور انجم کو کیچے سے لگا کر ٹانگہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر گویا انہیں محفوظ کر لیتی۔

پھر وہ گھبرا کر پوچھتی۔ "بلا تم کس سے باتیں کیا کرتے ہو۔"

بلا مسکراتا ہے۔ "آپ نہیں جانتی پھو بھی۔ آپ انہیں نہیں جانتیں۔ اپنی ہی باتیں بڑے اچھے ہیں بیچارے۔"

بلا جواب دیتا۔ "کہاں نہیں ہیں۔ ان کے لئے کوئی حد مقرر نہیں وہ ہر جگہ موجود ہیں۔ مکان میں جنگل میں میدان میں۔ لیکن بڑے اچھے ہیں وہ بیچارے بار بار مجھے بلا لیتے ہیں۔ بی بی۔" وہ ہنستا۔

"اس وقت تو اپنے جمعہ شاہ کو نہیں جاننے بڑے زبردست ہیں وہ جو چاہیں کر دیں۔ چاہیں جسے چاہیں بلا لیں تو یہ بھی کس میں ہمت ہے کہ ان کی بات رد کرے۔ لیکن میں بی بی۔" وہ ہنسنے لگتا "میری اور بات ہے۔ میرا ہم زاد بڑا زبردست ہے نا۔ اس لئے۔ لیکن تمہیں کیا معلوم پھو بھی میں نے کئی بار کہا ہے انہیں کہ۔"

اور بلا اسی طرح ایک قصہ چھیڑ دیتا۔ جس کے دوران میں وہ بار بار مسکراتا اور انہیں بلا سمجھانے کی کوشش کرتا جیسے دونوں بچے ہوں پھر جب رات پڑ جاتی تو وہ کتاب سامنے رکھ کر دیوار کے پار دیکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب قسم کی دیوانگی جھلکتی۔

ایلی کو بلا کی طرف دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ اس لئے وہ کوشش کیا کرتا کہ اس کی طرف نہ دیکھے۔ دوسری جانب بلا کی چچی یوں بیٹھی رہتی جیسے کپڑوں کی گٹھڑی پر کسی ڈائن کا سر کٹ کر رکھ دیا گیا ہو۔ اس کی نگاہیں بلا پر مرکوز رہتیں اور وہ مسلسل طور پر پیار بھری سیاہ ڈار نگاہوں سے اسے گھورتی رہتی۔ حتیٰ کہ بلا کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور سر کتاب پر جھک جاتا اور

نہیں۔ ستارے ٹوٹ رہے تھے۔ پھر گھٹا ٹوٹ اندر چھا گیا اور ایلہی نے محسوس کیا جیسے وہ ایک طویل و عریض سمندر پر ایک ٹوٹی ہوئی کشتی میں بنے جا رہا ہو اور چاروں طرف تھکی ہاری لہریں رینگ رہی ہوں۔

اس روز پہلی مرتبہ اسے اس تلاطم کا تجربہ ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی اپنی شخصیت میں رتین طوفان نہیں ہیں۔ اگلے روز وہ بلا کے ہاتھ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کتنا شفاف ہاتھ تھا وہ کس قدر نمکیں۔ اسے دیکھ کر ایلہی کو بیک وقت نفرت اور دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ نفرت کا احساس غالب تھا۔ مگر اس نفرت کے باوجود رات کی تاریکی میں اس چھائی ہوئی خاموشی کے پس منظر پر وہ محفل لمس رواں دواں ہو جاتا تو اسے محسوس ہوتا گویا کسی بربط کے تار لرز رہے ہوں۔ اس وقت وہ پہلو بدل کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا۔ لیکن جلد ہی ان جانے میں وہ بھر کوٹ بدلتا۔ اور پھر نمکی لہریں بڑھ کر طوفان کی شکل اختیار کر لیتیں افاق پر خمیں جھینے اڑتے ایک میزائل شوں سے آسمان کی طرف پلٹک۔ پھر دیر تک طوفان زدہ سمندر کی دیرانی میں وہ لکڑی کے ٹوٹے ہوئے تختوں پر پڑا ڈبکیں کھاتا اور کسی ان جانے احساس سے شربور ہو جاتا۔ دن بھر وہ کلچ سے متعلقہ مشاغل میں مصروف رہتا۔ شدت سے مصروف رہتا تاکہ اس کے ذہن میں بلا کا خیال نہ آجائے۔ بلا کے رو بہو جانے سے بھی اسے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ روحانی تکلیف۔ بلا اس کے ذہن میں ایک رستے نامور کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ لیکن —

### پیش میموریل

دولت پور کا کلچ ایک وسیع احاطے میں طویل نما عمارت میں واقع تھا۔ احاطے کے چاروں طرف ایک منزلہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن کے ساتھ ساتھ ایک برآمدہ چلا گیا تھا اور درمیان میں ایک وسیع و عریض صحن تھا۔ جس میں دو ایک پلاٹ دو ایک ٹینس اور بیڈمنٹن کے کورٹ تھے اور درمیان میں کنکر بچے ہوئے راستے بنے ہوئے تھے۔

احاطے کا شرقی پہلو تعلیم و تدریس کے لئے مخصوص تھا اور باقی تین پہلوؤں میں بورڈنگ طلباء کے رہائشی کمرے تھے جو زیادہ تر خالی پڑے رہتے۔

اس کلچ کی حیثیت محض ایک سکول کی سی تھی۔ احاطے کے دونوں پھانکوں میں سٹولوں پر

سینیتی اور رستمی بن کر بلا کی پابندی کی طرف پڑ جاتی اور بلا اسی طرح سویا رہتا یا زیر لب مگر کر آنکھیں یوں بند کر لیتا جیسے نیند میں ہو۔

بلا کے جسم کے متعلق ایلہی کے لئے دو تین باتیں عجیب تھیں۔ ایک تو اس کا جسم سفید ملائم تھا۔ جیسے عورتوں کا ہوتا ہے۔ دوسرے وہ بالوں سے خالی تھا۔ اس کے ہاتھ اس قدر خوب تھے کہ ایلہی کو حیرت ہوتی تھی۔ انگلیاں مخروطی تھیں اور جلد پریوں گلابی جھل سی چمکتی تھی چچ نالوں کی باریک جھلی چڑھا رکھی ہو۔

اس روز بلا کا ہاتھ چارپائی سے لٹکتے دیکھ کر ایلہی کو تعجب نہ ہوا تھا۔ بلکہ اس نے آنکھیں نہ کر کے سو جانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے نیند نہ آتی تھی۔ نہ جانے نیند کو کیا ہو گیا کہ کمرے کے اندر میرے سے نجات پانے کے لئے اس نے سینہ گردھاری لال کے متعلق شروع کر دیا تھا۔ نہ جانے سینہ گردھاری لال کیسا ہو گا۔ اس کے سنے کی چلم سا جو اور دو ہاتھ نہ جانے کون تھی۔ وہ — جو دولت پور میں پانچ سبھی جاتی تھی۔ کوئی ہو گی۔ پڑی ہو کرے۔ ایلہی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دفعتاً اس نے پھر وہی لمس محسوس کیا۔ وہی چیز جیسے کوئی محفل بیر ہوئی چل رہی ہو۔ وہ پھر چونکا۔ بیر ہوئی رک گئی۔ لیکن کچھ دیر کے بعد پھر چلنے لگی۔ اگرچہ وہ جنبش چونکا دیتی تھی۔ لیکن اس قدر مدہم تھی۔ وہ لمس اس قدر محفل تھا ایلہی میں عجیب سی لذت بیدار ہو رہی تھی۔ جیسے رنگین جھولنے چپکے سے اس کی رضائی پر کھس گئے ہوں۔ بیر ہوئی کی ہر جنبش پر وہ بدکتا اور اس کے بدکتے ہی وہ جھولا رک جاتا۔ دم جلد ہو کر رہ جاتا لیکن اس گھبراہٹ کے باوجود ایلہی کا جی چاہتا کہ وہ جنبش پھر رواں ہو جائے وہ بیر ہوئی پھر چلنے لگے۔ اس لمس کی وجہ جاننے کے لئے اس نے رضائی سے باہر دیکھنے کی خواہش محسوس کی تاکہ اسے معلوم ہو کہ بلا کا بازو کیا وہیں لٹک رہا ہے۔ لیکن جین اس وقت وہ چہ پھر رواں ہو چکی تھی۔ ایلہی نے رضائی سے منہ نکال کر باہر دیکھنے کی خواہش کو دبایا کہ اپنے وجہ سے وہ بیر ہوئی رک نہ جائے۔

بیر ہوئی سرک رہی تھی۔ سرک رہی تھی۔ اس کے جسم کے ایک ان جانے مرکز چاروں طرف لہریں اٹھ رہی تھیں۔ وقت گویا ختم چکا تھا۔

پھر دفعتاً ایک گرواب اٹھا۔ وہ ہلکی ہلکی لہریں ایک عجیب سے طوفان میں بدل گئیں۔ آتشی میزائل فضا میں بلند ہوا اور پھر انہم بم کی طرح پھٹ گیا۔ چاروں طرف چنگاریاں اڑا



ہاتھ دوسرا علی احمد کی طرح میدان میں آگودتا۔  
 ایک کہتا "کیوں میری جان دیکھو گے یا مار ہی ڈالو گے۔"  
 دوسرا کہتا۔ "کیوں بے سالے ہماری ہی ملی اور ہمیں سے میاؤں۔"  
 "کیوں سالے۔ ہم سے تو چھپتا ہے اور دوسروں سے آنکھیں لڑاتا ہے۔"  
 "بھئی ہم تو سرکار کے نوکر ٹھہرے۔"  
 "تو مشق ناز کر بے خون دو عالم ہماری گردن پر۔"  
 "ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ جان من۔"

ہر کسی کو شوق تھا کہ وہ عاشق کا رول ادا کرے اور دوسرے کو معشوق بنا کر رکھ دے۔  
 دولت پور کے لڑکوں کا صرف یہی ایک مذاق تھا۔ ان کے پاس بات کرنے کے لئے صرف یہی  
 ایک موضوع تھا۔ جسے بات کرنی آتی تھی۔ جو چوٹ کر سکتا تھا۔ فی البدیہہ جست جواب دے  
 سکتا تھا وہ ہیرو بن جاتا اور جو لڑکے ازلی طور پر لگے تھے وہ نگوین کر رہ جاتے۔  
 اہلی ازلی طور پر ایک گونگا لڑکا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے لئے ان کی باتیں بے حد پریشان  
 کن ہوتی تھیں۔ اور وہ جلوس خاصہ اذیت دہ۔ اس لئے وہ اکثر کوشش کرتا کہ ایسے وقت کالج  
 جائے جب لڑکوں کے جلوس میں شامل ہونے کا ڈر نہ ہو۔

یہ جلوس جب کالج کے دروازے پر پہنچتا تو اور بھی شور مچاتا۔ لیکن ان کا وہ شور بے جان  
 ہو کر رہ جاتا کوشش کے باوجود اس میں تسلسل پیدا نہ ہو سکتا۔ اس راہب خانہ نما احاطے میں  
 عجیب خصوصیت تھی۔

اس احاطے میں بڑی سے بڑی شوخ بات بے جان ہو کر رہ جاتی۔ بڑی سے بڑی پھبتی فلیٹ  
 ہو جاتی جیسے محرام میں جھانڈیوں کی سبزی خشک ہو کر اڑ جاتی ہے۔  
 یہ جلوس احاطے میں داخل ہوتے ہی بے جان ہو جاتا۔ لڑکوں کے ہونٹ خشک ہو جاتے۔  
 ان کے حلق کی آوازیں جم جاتیں اور وہ چپ چاپ کلاس روم میں بیٹھ کر اوٹھنے لگتے اور چھٹی کا  
 انتظار کرتے تاکہ ایک بار پھر حرکت کر سکیں۔

پس میوریل کے پروفیسر بھی عجب تھے۔ ان میں شوخی یا بانگن نام کو نہ تھا ان کے لباس  
 بڑبڑکے نہیں بلکہ بد رنگ تھے۔ ان کی حرکات اس حد تک مدہم تھیں جیسے سلومونٹ پر فلم  
 چل رہا ہو۔ ان کی آوازیں احاطے کی خاموشی کو تقویت دیتی تھیں۔ ان کے لیکچروں میں بھی علمی

بیٹھے چوکیدار اونگھتے۔ کالج دنگ کے برآمدے میں ڈھیلے ڈھالے چڑاسی ہاتھوں میں کھڑے  
 ننگے پاؤں یوں گھومتے پھرتے جیسے ہشکو چل رہے ہوں۔ دفتر میں لالہ رام لال بیڈ کلرک چڑ  
 ناک کی چونچ پر رکھے بڑے بڑے رجسٹروں میں اندراج کرنے میں مصروف دکھائی دیتے۔ اور  
 ارد گرد کم سن کلرک حساب کتاب کے کھاتے کھولے بیٹھے رہتے۔

جماعتوں میں پروفیسر رنگنی آواز سے پڑھاتے اور لڑکے۔ بچوں پر بیٹھ کر اونگھتے۔ پورائے  
 کے دیران کمروں میں الیکٹریکس پر دھوٹیاں لٹکوتیاں اور پرے سوکھتے۔ رسوئی میں دل  
 کڑاہیں بجتیں۔ چولے سے پھلے اڑتے اور باہر بھیجی ہوئی ڈائیٹنگ ٹیبل پر لڑکوں کے  
 مبرے ہاتھ انہیں کچھ کرنے کے لئے بڑھتے۔

دولت پور کالج کا نام پس میوریل کالج تھا جو کسی بڑے سینٹھ نے لوک رکشا کے لئے چار  
 کیا تھا۔ شاید اسی لئے کالج میں پس صلح اور شانتی کے سوا کچھ نہ تھا۔ لڑکے شانتی سے کوئی  
 چڑاسی آواز پیدا کئے بغیر آمدوں سے چلتے پھرتے۔ دفتر میں بیڈ کلرک کے قلم کے چلنے  
 چڑاؤں کے سوا کوئی آواز پیدا نہ ہوتی۔

اس پس میوریل کالج میں صرف ایک گروپ ایسا تھا جو اس چھائی ہوئی خاموشی کو ڈر  
 کی کوشش کرتا۔ لیکن بسا اوقات ان کی یہ کوشش بری طرح سے ناکام ہو جاتی۔ یہ گروپ وہ  
 پور کے شہر کے مسلمان لڑکوں کا تھا۔

شہر کے لڑکے صبح سویرے اپنے بائیکل سنبھالتے اور چھائی کی طرف چل پڑتے جہاں  
 واقع تھا شہر سے نکلنے تو تعداد کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا جیسے سائیکلوں کا ایک جلوس  
 سائیکلوں کی ریس ہو رہی ہو۔ یہ جلوس گپیں اڑاتا۔ شور مچاتا۔ شاخوں پر ہاتھ رکھ کر  
 چھوڑے قطار در قطار چلے جاتا۔ ان کے اس طور پر چلنے سے چھائی اور شہر کے درمیان  
 سڑک کا ٹریفک رک جاتا۔ تانگے والے چیخے رہے۔ باؤ۔ بیج کے پلو۔ تیل گاڑی والے چلنے  
 ٹریفک کے سپاہی میٹیاں بجاتے۔ دیران کو ٹیبلوں میں سے صاحبوں کے کتے نکل کر بھٹتے  
 لیکن وہ جلوس بے نیازی اور بے پروائی سے چلے جاتا۔

ان کی زبانیں قہقہوں کی طرح چلتی تھیں۔ نگاہیں گوند کی طرح چپک جاتیں۔ چروا  
 شوخیان جھلکتیں بھوڑوں میں مستیاں لہراتیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹیں ابھرتیں۔ ایک دوسرے کو  
 ہانپنے کی کوشش کرتا۔ دوسرا دل چھینک عاشق کا روپ دھار لیتا۔ ایک شریف کی سی

بھی تو چمن چھری ہے نری۔“  
 ”ہونہ دیکھنے میں تو وہ ہے جو آج کل شرکی آنکھ کا تارہ بنی ہوئی اے اور بھی ہے بھی یوں سمجھ لو کچی گری۔ رضائی میں پڑ کر چلتے رہو۔ ہاں۔“  
 پھر وہ سب اس کچی گری کو چبٹے اور اپنی تخیل میں کھو کر پان کی پیک نگل جاتے اور پھر کھاتے اور چلاتے۔

”کیوں بھی غلام محمد براج ہے۔ تیرا تمباخو کمال سے منگولیا ہے اب کی مرتبہ۔“  
 غلام محمد ایک شان بے نیازی سے چلاتا ”اے کیا سمجھا ہے تو نے اپنی دوکان پر جج وہ آتی ہے۔ جو اول درزے کی ہو۔ ہاں۔“  
 میلے کے دن شہر میں گھومتے ہوئے راج چوک میں مرزا کی دوکان کے قریب ایلی ان کی بات سن کر ٹھسکا۔

”اے وہ سامنے تو ہے وہ شیخ کی دوکان کے اوپر جھرمٹ لگا ہے نا اس میں تو غور سے تو دیکھ۔ آنکھیں ہیں تیری یا بن جو کہ دیکھنے کی سچ رکھتی ہی نہیں۔“  
 ”وہ تو اپنی بالیاں والی ہے۔ پناخہ کہاں رکھتا خود کو نہیں الٹا ہمیں جھٹلاتے ہے۔“  
 ”ہاں ہاں بالیاں والی کے ساتھ ہی تو ہے۔ بائیں ہاتھ کو اے کیا ابھی سے آنکھوں پر چٹا لپٹا کما جو ہے تجھ سے بیسیوں بار چھوڑ دے یہ جیادیتاں۔ اندھا ہو کر راج چوک میں لاشی نہ لگی تو نے تو اپنا نام مرجا نہیں۔“

ایلی غور سے دوکان کی چھت پر بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں بھڑکیلے سے کپڑے پہنے چند ساتویں عورتیں بیٹھی تھیں۔ جن کے انداز میں نمائش کے علاوہ عریانی کی جھلک تھی۔  
 ان نے محسوس کیا۔ جیسے وہ سب بکاؤ ہوں۔ جنہیں سے داموں خریداجا سکتا ہو۔ تو کیا یہی تھی دولت پور کی پناخہ جو ہوائی بن کر چھوٹی ہوئی تھی شہر میں۔  
 ”دیکھ لیا۔“ مرزا قلعہ مار کر ہنسا ”بڑے جوڑوں میں ہے آج کل یہ لٹلیا۔ اپنی لطیفن کی

باسے یہ اے دی لطیفن جو منڈی میں دانے چھاتی ہے۔ اپنے سیٹھ مجید الرحیم کی دوکان پر بیٹھیں ہیں۔ بڑی نے سیٹھ گردھاری لال کو سنبھال رکھا ہے اور“  
 ”اور کیا بے سلفی کی لاث کو کون نہیں جانتا۔ جانتا ہوں اسے اچھی طرح یوں۔“

”پیارے اس جالم پناخہ نے چکر دیا ہے سارے شہر کو۔“

نمائش مفتوحہ تھی۔ لیکچر دیتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے معلومات کا پرچار کرنے کے بجائے وہ علم کے عجز کا اظہار کر رہے ہوں۔ لڑکے ان کے اس انداز پر تمسخر سے ہنستے تھے۔ اگرچہ چار چوڑی ہنستے تھے۔ لیکن پروفیسروں کے برتاؤ کو محسوس کر کے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کالج کی بکری ایک بودھی راہب خانہ ہو جہاں لوگ علم کی بجائے شانتی کا پدیش سیکھ رہے ہوں۔

ایلی کے لئے وہ کالج خوش کن نہ تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہاں احساس کتری کی وجہ سے بھاگنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس لئے وہ کالج میں باقاعدہ جاتا۔ اگرچہ اس نے کبھی پروفیسر کے لیکچر کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ جماعت میں وہ اونگھتا۔ ریس میں لڑکوں کی باتیں سنتا اور خلی پیڑ میں انہیں کسی دیران کمرے میں تاش کھیلنے ہوئے دیکھتا رہتا یا کالج سے نکل کر چھاؤنی کے بازاروں میں گھومتا۔

کالج کے بند ہونے کے بعد وہ سیدھا گھر آتا۔ لیکن جوں جوں وہ گھر کے قریب پہنچتا اس دل بیٹھنے لگتا نہ جانے علی احمد کے کمرے میں کون ہوگی۔ نہ جانے شیم کی بچیاں صحن میں بگیا کیا کر رہی ہوں گی۔ سارے گھر میں کوئی کونہ بھی تو ایسا نہ تھا جہاں وہ الگ تہائی میں بیٹھ سکتا ہو۔

## کچی گری

پھر دولت پور میں پچھلے کے میلے کا دن آگیا۔ شہر کے ہوازیوں کی دوکانوں پر بھیڑ لگ گئی۔ لوگ پان کھاتے بیکیں تھوکتے ایک دوسرے پر فقرے کہتے۔ مذاق اڑاتے اور بلاخر شہر۔ سیٹھوں اور پناخوں کے متعلق بات شروع کر دیتے۔

”کیوں بھی غلام محمد کون کون آرہی ہے اب کے پچھلے کے میلے میں۔“

”اپنی زہر ہے دلی والی۔ علی جان ہے اور پٹیلے کی زالی بانو ہے۔“

”بڑی اچھی اچھی آئیں گی۔ اب کی بار بڑا ٹھانڈا رہے گا۔ تو دیکھو تو۔“

”کیوں رے بڑا تن سین آیا ہے تو سمجھنے والا راگ دیا کا۔“

”اچھا خاصہ تو گاتی ہے وہ اور جب ہاتھ اٹھا کر کو لے منکاتی ہے تو دیکھ لیجو تیرے چہرے

کے دل کو نہ ہوا کچھ کچھ تو کہتا۔“

”ارے یار تو بھی بس لفٹاؤ ہی رہا۔ یہاں گانے میں اپنی زہر کا جواب نہیں اور پھر دیکھو۔“

کوٹھے پر چڑھا کرتی تھی اور پردوں کے پیچھے چھپ چھپ کر بیٹھا کرتی تھی اس کا رنگ کتنا سفید تھا۔ اس کے انداز میں نمائش کا نشان تک نہ تھا۔ پہلی مرتبہ جب ایللی نے اسے دیکھا تھا تو وہ حیران رہ گیا تھا۔ پردے کی جالیوں کے پیچھے دو بلوری پاؤں گویا بڑی نفاست سے چار پائی پر رکھے ہوئے تھے اور ان کے رو برو دو مخروطی ٹانگیں جو میلے لٹھے کے پاجامے میں ملبوس تھیں۔ ایللی نے پہلی مرتبہ پاجامے کے حسن کو محسوس کیا تھا۔ چوڑی دار پائجامہ تو اس نے اکثر دیکھا تھا مگر اسے دیکھ کر نفرت محسوس ہوئی تھی۔ جیسے وہ پتلے پتلے پانسوں پر چڑھا ہو۔

دولت پور کی عورتوں کا انداز اتنا بھدا تھا۔ ان کی حرکات اس قدر بے ڈھب تھیں۔ ان کی نگاہیں حجاب سے اس قدر بے برہ تھیں کہ ایللی نے ان کے لباس کی خوبی پر کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ اسی لئے اس روز اس لڑکی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔ کتنی متناسب ٹانگیں تھیں اور پھر بلوری پاؤں پھر دفعتاً ایک سریلی دبی دبی آواز میں گونجتی۔ ”آتی ہوں۔“ اور وہ جھک کر چھپتے چھپتے پردوں کی اوٹ لیتی ہوئی غائب ہو گئی تھی۔

ایللی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس اندھیری گلی میں ان آتے جاتے جامنی سایوں کو دیکھنے سے علی احمد کا ہمت کیا تھا۔ وہ وہاں کس لئے کھڑے ہر آتے جاتے کو تانے کی بے معنی کوشش میں مشغول تھے۔

میلہ

”تم ہو بلا جی۔“ ”قرب ہی سے آواز آئی۔ ایللی چونکا۔

اندھیرے میں علی احمد کے دانت چمکے۔ ”تم آگئیں۔ ہی ہی ہی۔“ ٹین کا سپاہی اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔

”پھر تم نے جو اشارہ کیا تھا۔“ ریڑ کی گڑیا کی آنکھوں کی سفیدیاں چمکیں۔

”ہی ہی ہی۔“ تو تو نے دیکھ لیا۔“ وہ بولے۔ ”میں تو سمجھا تھا شاید۔ ہی ہی۔“

”کیسے نہ دیکھتی۔“ وہ چمک کر بولی۔

اس کا دھیان تو تھماری طرف ہی لگا رہتا ہے۔ قریب ہی چادر میں لپٹا ہوا ایک مرد گنگنا یا۔

اس کی آواز سے سیڑ میں شب کی بو آتی تھی۔

ایللی حیرانی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوگ کس دم سے انہیں پرکھتے تھے۔ نہ جانے کس نقطہ نظر سے انہیں عورتیں حسین نظر آتی تھیں۔ پور کے پنواڑیوں کی بات تو خیر الگ تھی۔ اپنے علی احمد کے خیالات بھی اس سلسلے میں پر تھے۔ ایللی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر ان عورتوں کو گھور رہا تھا جو شیشے کی پر بیٹھی پنکھوں کے جلوس کا انتظار کر رہی تھیں۔

”تو یہاں کیا دیکھ رہا ہے؟“ علی احمد کی آواز سن کر وہ چونکا۔

”جی۔ جی۔ یونہی دیکھ رہا تھا۔“

”اس طرح پاگلوں کی طرح ادھر ادھر نہیں دیکھا کرتے۔“ علی احمد نے کوہلوں پر ہاتھ رکھا۔

”اچھا تو ابھی جلوس یہاں نہیں پہنچا ہوں۔“ انہوں نے ایللی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

ویر میں پہنچے گا یہاں ہوں۔“

پھر وہ اسی طرح کوہلوں پر ہاتھ رکھے وہاں ٹہلنے لگے۔ علی احمد نے نہ جانے کیا کیا کر دوکان پر بیٹھی عورتوں میں سے ایک نے بامعنی انداز سے دوسری کو کہنی ماری اور پھر سکران بیٹھی۔ اسے اٹھتے دیکھ کر علی احمد بولے۔ ”آؤ ایللی ذرا ادھر سے ہو آئیں۔ اس طرف۔“ ایللی کو لے کر چوک کے عقب کی اندھیری گلیوں میں گھس گئے اور ایک جگہ رک کر گہرا انتظار کرنے لگے۔

ان گلیوں میں عورتوں کے گروہ ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں ایللی کو پور کی عورتوں سے گھن آتی تھی۔ ان کا انداز چال ڈھال، طور طریقہ گھٹیا قسم کا تھا۔ کپڑے پستی تھیں۔ سستے اور بھڑکیلے ان کی حرکات میں کوئی حسن نہ تھا۔ ان کا انداز تو بالکل ہی گنوار پن کا مظہر ہوتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا رنگ عموماً کالا تھا اور کلا سے ایللی کو قطعی دلچسپی نہ تھی۔

بلوری پاؤں

دولت پور میں کہیں کہیں سفید رنگ کے لوگ بھی نظر آتے تھے مگر ان کی تعداد بہت کم تھی مثلاً علی احمد کے چوبارے کے سامنے جو بیٹھا بیٹھا سا کچا گھر تھا۔ اس میں وہ لڑکی جو ہمیشہ

اور کا نام سن کر شیم تڑپ اٹھی۔ اس کی ناک پر حقارت آمیز جنبش ہوئی اور وہ گویا انتقام بھجھاڑے کی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ جس کے عقب میں کونٹے پر وہ نوجوان کھڑا انتظار کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنا دوپٹہ جھنجھوڑ کر پھینک دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بامعنی مسکراہٹ پھیل گئی۔ باہر میاں کھائیں رہے تھے۔ کھڑکی میں بیگم مسکرا رہی تھی۔ پلنگ پر پڑی ہوئی بچی میں کی طرف دیکھ کر رو رہی تھی اور منہی فاطمہ چاروں طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے گرد و پیش کے حالات سے آشنا ہونے کی کوشش کر رہی ہو اور ایلی اچھلتے ہوئے دل سے میڑھیاں اتر رہا تھا۔

### جو نکلیں اور جسم

بازاروں اور گلیوں کا ایک لمبا چکر کاٹ کر ایلی کا رہبر ایک معمولی سے مکان میں داخل ہوا۔ صحن میں ایک سیاہ فام بڑھیا جھاڑو دے رہی تھی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ چہرہ ابلے ہوئے انڈے کی طرح جامد و ساکت تھا۔ پیشانی پر شکن تھے۔ انہیں داخل ہوتے دیکھ کر وہ رک گئی اور بے یاکانہ طور پر انہیں گھورنے لگی۔ پھر کولوں پر ہاتھ رکھ کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے ہاتھ کی جھاڑو سے تواضع کرنے کیلئے تیار ہو۔

”آگے تم۔“ بڑھیا غرائی۔

”کون ہے میں“ اندر سے آواز آئی۔ میں۔ ایلی گھبرا گیا کیا یہ اس کی ماں تھی۔ میں۔

”تیرے ہی کچھ ہوں گے مجھے کیا مالوم۔“ وہ غرائی۔

”اے گرمی کیوں کھا رہی ہے تو میں۔“

”گرمی تو تیری ٹھنڈی ہونے میں نہیں آتی۔“

”تو تجھے کیا تنگی بھٹ ہے تو کئے کی حاجن بن کر بیٹھ رہ آرام سے۔“

”لو لگا ہے تجھے لو، اندھی ہو رہی ہے ہر آتے جاتے سے، غرلائی ہے۔“ بڑھیا چیخنے لگی۔

”وہ غلام محمد تو ہے۔ آجا۔ اندر آجا۔“ کمرے سے کسی نے جھانک کر کہا۔

”بس لگاتی جا تو سینے سے۔“ بڑھیا غرائی۔ ”اور تیرا کام ہی کیا ہے مجھے کیا معلوم تھا کہ گود میں کیسیں پال رہی ہوں۔ کتیا یہ سب اس حرای سا جو کا کام ہے اس شکارن نے سب کے منہ لو لگا دیا۔ لہو چوختی ہیں۔ لیکن کب تک۔“ اس کے منہ سے کف جاری تھا۔

”تو خواہ مخواہ۔۔۔۔۔“ وہ لاڈ سے غرائی۔ ”تو نہ بول بچ میں۔“

علی احمد یوں ہنسنے جا رہے تھے۔ جیسے ان کی شان میں قصیدہ پڑھا جا رہا ہو۔ ”اچھا تو۔۔۔“ وہ بولے ”چلے گی اب۔“

”اب۔۔۔۔۔“ وہ چونکی۔ ”نہ بھی ہم تو پنکھا دیکھ کر جاویں گے۔“

”بڑی متوالی ہے پنکھے کی۔“ سیز مین ہنسا۔

”متوالی ہی تو ہے۔“ نین کے سپاہی نے گویا پھر وار کیا۔

”میلہ دیکھ کر پنچوں گی۔ ہاں۔ سچی بات کوں گی۔“

”میلہ تو تم خود ہو۔“ علی احمد قہقہہ مار کر ہنسے۔ ”دنیا دیکھ رہی ہے۔“

”اوں۔ جھوٹ۔“ اس نے لاڈ سے گویا شکایت ”کما“ کوئی بھی تو نہیں دیکھتا۔

”ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسے۔ ”وہ تو انگلیاں اٹھا رہے تھے۔ تمہاری طرف۔“

”پڑے اٹھائیں۔ اپنی بلا سے۔۔۔۔۔ اور وہ میری ججج لائے ہو۔“

نین کے سپاہی کا قہقہہ یک قلم موقف ہو گیا۔ ”اود مجھے یاد نہیں رہا۔“ وہ سنجیدہ۔

بولے۔

”وہ کیوں یاد رہنے لگا۔“ وہ بگڑ کر بولی۔

”بھیج دیں گے۔ بگڑتی کیوں ہو۔“

”کیوں نہ بگڑوں بس ایک ہی بات یاد رہتی ہے تمہیں۔“

”ایلی کے ہاتھ بھیج دوں گا۔ یہ ایلی ہے میرا لڑکا۔“

”اچھا تو یہ ہے ایلی۔“ وہ لاڈ سے چلائی۔ ”پڑھتا اے تو۔“

”صبح مل لینا اس سے اپنی چیز بھی لے لینا۔“ علی احمد بولے۔ ”چلو ایلی۔“

اس کے جانے کے بعد وہ بولے ”چلو تمہیں میلہ دکھادیں۔ دیکھو گے نا۔“

اگلے روز صبح سویرے ہی علی احمد نے ایلی کو آواز دی اور اس کے ہاتھ میں ایک دا

نوٹ دے کر ایک ٹھنڈی سی تھادی۔ ”یہ اودھ لے جا۔“ وہ بولے۔ ”غلام محمد چہرہ اسی ہا

ہے وہ تمہیں ساتھ لے جائے گا۔ نوٹ جیب میں ڈال لو مگر نہ جائے اود یہ ٹھنڈی اسے دے

غلام محمد کو وہ اٹھا لے گا۔ سمجھ۔ غلام محمد۔“ انہوں نے چہرہ اسی کو آواز دی۔ ”ایلی کو لودھ

جاؤ۔“

”اور ہمارا نام ہی نہیں لیتا کوئی۔“ زمین پر بیٹھے ہوئے سبز مین نے اپنی چادر اتار کر مسکرا کر کہا۔

”برا سیٹھ مارا ہے نا اس لئے۔“ ساہو نے ہاتھ چلا کر نفرت بھرے انداز میں کہا۔  
 وفتا ”ایلی کو یاد آیا ساہو۔“ سلفے کی لٹ ساہو۔ سیٹھ گردھاری لال کی ساہو۔ اور اس نے پھر سے غور سے ساہو کی طرف دیکھا۔ کیا سیٹھ اس طرح کی داشتہ رکھتے ہیں۔ جو عام لوگوں کے سامنے نکلی بیٹھنے سے نہیں گھبراتے۔ پھر اس نے راجو کی طرف دیکھا۔ دولت پور کی پٹانہ راجو۔ اس کی دانست میں تو وہ چلا ہوا پٹانہ تھی اور اس کی حرکات و سکنات۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ لے اور صحن میں جا کر اس بڑھیا کے ساتھ مل کر چلائے۔

وہ اٹھ بیٹھا ”میں اب جاتا ہوں۔“  
 ”لے پان تو کھا جا۔“ ساہو نے بازاری انداز میں لٹکارا۔  
 آج سہم کر کوٹے میں لگ گئی اور راجو مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ ”یہاں آیا کرنا تیرا اپنا گھر ہے یہ۔“

باہر بڑھیا چیخ رہی تھی۔ ”حرام کاری کی لت پڑی ہے۔ انہیں خون چوسنے کا مزہ پڑ گیا ہے۔ جو گئیں ہیں جو گئیں۔“

نہ جانے بڑھیا کی بات نے ایلی پر کیا اثر کر دیا کہ گھر لوٹتے ہوئے تمام منظر ہی اس کی نگاہوں میں بدلا ہوا تھا۔ دوکانوں پر بیٹھے ہوئے لالے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے کڑے شکار کی ٹانگ میں بیٹھے ہوں۔ سودا بیچتے ہوئے بھابڑے چادر میں لپٹے ہوئے سبز مین کی طرح مسکرا رہے تھے۔ تماش بینوں نے اپنی نگاہوں کے جال بچھا رکھے تھے۔

ہواؤں کی دوکان پر مسکراتے ہوئے کھاتے ہوئے انسان پلپلے کینڑوں کی طرح ایک دوسرے کو اپنے لعاب وہن میں پھنسا رہے تھے۔ گھر میں علی احمد حساب کے رجسٹروں کا خون چوس رہے تھے اور کھڑکی میں کھڑی خیم یوں حسرت سے ان دیران کوٹھوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو جو بارے کے عقب میں صحرا کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے وہ اسی بات کی متنی ہو کہ کوئی جو تک اپنے ہونٹ اس پر گاڑ دے۔ اس کے سر پر آسمان نیلے بازو پھیلائے ایک عظیم گدھ کی طرح چھایا ہوا تھا۔ ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خود ایک جو تک ہو جسے خون چوسنے کے لئے کسی جسم کی تلاش ہو۔

”بڑی گرم ہے بڑھیا آج راجو۔“ غلام محمد نے آنکھیں چھپا کر کہا۔

”اس کا کیا ہے۔ یونہی بولتی بکتی رہتی ہے۔“ راجو نے نخرے سے جواب دیا۔ غلام محمد سے قریب تر ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سی چمک تھی۔ ایسی چمک جو کسی چہرہ کی آنکھوں میں نہیں ہوتی۔

”ساہو کو کوستی ہے۔“ وہ ہنسا ”تجھے نہیں۔“

راجو نے ایک انداز سے زبان ہونٹوں میں لے لی اور دوسرے کوٹے میں بیٹھی ہوئی عورت کی طرف دیکھا۔

دوسرے کوٹے میں ایک پست قد فریہ سیاہ فام عورت چارپائی پر بیٹھی پان لگا رہی تھی۔ ام کی انگلیاں انگوٹھیوں سے لدی ہوئی تھیں۔ ابھرے ابھرے گالوں میں یوں رینگ رہی تھیں۔ جیسے ڈبل روٹی میں سیاہ دراڑیں پڑی ہوں۔

”ابھی ساہو کا کیا دیکھا ہے اس بڑھیا نے۔“ وہ بولی ”ابھی تو دیکھے گی۔ غضب خدا کا۔“

گھی کی روٹی ہضم نہیں ہوتی۔ سوکھے ٹکڑوں کے بغیر جی نہیں سکتی یہ۔“  
 ساہو کے ابھرے ہوئے گالوں اور موٹی انگلیوں پر گویا جلی حروف میں حرص و ہوس کو تھا۔ اس کے ہونٹوں کو دیکھ کر ایلی محسوس کر رہا تھا۔ جیسے جو نکلیں ہوں۔ نہ جانے کیوں ایلی لگ رہا تھا۔ جیسے ساہو سرخ گوشت کا ایک لوتھڑا ہو۔

اس کے قریب ہی سب سے چھوٹی بہن آج بیٹھی تھی۔ جیسے کسی سوکھے درخت سے ہوئی شاخ ہو۔ اس کے چہرے پر اداسی برس رہی تھی۔ خدو خال سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی ہاتھ ہو۔ ہاتھ ٹنڈ سے تھے۔ جیسے انگلیاں ٹوٹی ہوں۔ عمر بہت چھوٹی تھی لیکن چہرہ معصومیت سے تھا۔

ان تینوں میں سے صرف راجو ہی کو برداشت کیا جاسکتا تھا۔ لیکن پھر بھی جوانی کے سوا میں کیا تھا اور جوانی بھی وہ جو نسائیت اور معصومیت سے یکسر خالی تھی۔ ایلی نے وہ نوٹ جیب نکال کر راجو کے سامنے رکھ دیا۔ ساہو نے نوٹ دیکھ کر سر اٹھایا اور پھر منہ بنا کر بیٹھ گئی۔

غلام محمد نوٹ دیکھ کر مسکرایا بولا ”میرا حصہ ری۔“

”تیرا حصہ۔“ راجو نے پیار بھری نظر اس کی طرف ڈالی اور پھر اپنی طرف یوں دیکھا۔  
 اس کا حصہ سمجھا رہی ہو۔

گھونٹے پھرنے کے بعد جب وہ بڑے ڈاک خانے کی طرف سے مڑے تو وہ سوچنے لگا کہ اوپر جانے کا مطلب۔ وہ تو گھونٹے پھرنے کی جگہ نہ تھی۔ وہاں تو وہ بازار تھا۔ جہاں لوگ دیکھے جانا پسند نہیں کرتے۔

وہ ایک دودھ کی دوکان پر رک گئے۔ ”دودھ پو کے ایلے۔“ رفیق نے پوچھا۔  
”نہیں۔“ ایلے نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”اچھا بھئی۔“ رفیق بولا ”بیویا نہ پو گھر جا کر بتانا نہیں۔“

”اور بتا بھی دو گے تو کیا ہے۔“ یوسف اپنے سپاہیانہ انداز میں چلایا۔ ”میرا تو بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔ ڈالنا میاں آدھ سیر دودھ میں دو بن۔“ اور وہ دونوں اپنے اپنے پیالے لے کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر رفیق نے یوسف کو اشارہ کیا۔

”توبہ ہے۔“ یوسف چلایا ”شیم کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کیسے کھا لیتے ہو تم ایلے۔“

”اسی ہاتھ سے بچوں کو پونچھتی ہے اور اسی ہاتھ سے آٹے کا بیڑا اٹھا لیتی ہے۔“ رفیق نے آہ بھری۔

”اب کیا دودھ بھی حرام کرو گے تم۔“ یوسف چلایا۔

اس کے بعد ایلے کے لئے بھی شیم کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا مشکل ہو گیا اور وہ تینوں جھوٹ موٹ گھونٹے پھرنے کا بہانہ کر کے رات کے اندھیرے میں پہلوان کی دوکان پر جا کر دودھ بن کھاتے اس وقت ایلے کے کلن ملحق بازار پر لگے رہتے۔ جہاں سے سارنگی کے سرگونجے اور طبلے کی تھاپ کے ساتھ ساتھ ایلے کا دل دھک دھک کرتا اور وہ حسرت سے ان چوہاروں کی طرف دیکھتا جہاں جانا اس کے لئے ممنوع تھا اور جہاں جانے کی تمنا روز بہ روز اس کے دل میں بڑھتی جا رہی تھی۔

سکڑ سارہ

رفیق اور یوسف کی ٹریننگ کلاس میں چار ایک عیسائی لڑکے بھی تھے جن سے ان کی راہ و رسم تھی۔ خصوصاً دکنز اور جان سے تو ان کی دوستی کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ وہ دولت پور کی عیسائی لڑکیوں کی باتیں کیا کرتے تھے اور رفیق لڑکیوں کی باتوں میں دلچسپی لیتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ انہیں اکثر دودھ پلانے کے لئے سہارا دیتا تھا۔

جب ایلے گھر پہنچا تو بلا قیستی پتھروں کا ڈبا کھولے بیٹھا تھا۔ ”ہاں بھائی صاحب یہ لعل ہے چاندنی میں یہ پکھراج بدل جاتا ہے اور پھر بندر اس کی چمک کو دیکھ کر اسے اٹھلاتے ہیں۔“ شیم کے سفید مخملیں ہاتھ لعل کو یوں تھک رہے تھے۔ جیسے اس کی سرخی چوس رہے ہوں اور لعل کے قریب وہ بوڑھی جو تک اس کی چچی بلا پر نگاہیں گاڑے بیٹھی تھی۔ کتنی عجیب تھی وہ جو تکس جو تکس اور اجسام اور ارد گرد پھیلا ہوا اچھایا ہوا دیرانہ۔

پھر ایلے کی زندگی کے بھیا تک جمود میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے ماموں زاد بھائی اور یوسف تار کا کام سیکھنے کے لئے دو ماہ کے لئے دولت پور آگئے۔ ان کے آنے سے ایلے نے اس صحرا میں ایک چھوٹا سا نخلستان بن گیا۔

کچھ اور بھی

سیٹھ جمنواس کے یتیم خانے میں ایلے دن گزارتا۔ جس کا نام کالج رکھ دیا گیا تھا۔ شام کے وقت کالج سے سائیکل پر پاؤں مارتا ہوا گھر پہنچتا پھر رفیق اور یوسف کے مہرلوہ بازار کے چکر کاٹتا اور رات کو گھر آکر پڑا رہتا۔ اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ دنیا صرف جو تک اور کے اجتماع کا نام نہ تھا وہاں جو تکوں اور جسموں کے علاوہ اور بھی کچھ تھا۔ بے نام سا کچھ جس کی پاکیزگی کی جھلک تھی۔ مثلاً رفیق اور یوسف مثلاً سامنے چوہارے میں دو بلوریں پاؤں چست پاؤں یا وہ سیاہ آنکھ جو کبھی کبھار ان جنگلوں میں سے ظلوغ ہوتی تھی۔ جس کا مقصد نہ دیکھنا تھا نہ دیکھنا جسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ حسین ہے کیف آور ہے اور جھلکتی ہے۔ ایلے اسے دیکھتا تھا جتنے بغیر دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے اسے اپنے طرف مائل کرنے کی کوشش کے بغیر اسے دیکھتا تھا۔ اور پھر اس اضطراب سے بچنے کے لئے جو اسے دیکھنے سے ایلے پر طاری ہو جاتا وہ رفیق اور یوسف کو دیوانہ وار تلاش کرتا تھا۔

رفیق اور یوسف کے آنے سے اسے ایک نقصان بھی ہوا۔ انہوں نے ان جانے میں ایلے علی احمد کے گھر سے رہا سہا تعلق بھی توڑ دیا۔

شام کو کھانے کے بعد وہ چپکے سے ایلے سے کہتے ایلے چلو ذرا گھوم آئیں۔ پہلی مرتبہ انہوں نے ایلے کو گھونٹنے کی دعوت دی تھی تو اس کا جی چاہتا تھا کہ انکار کر دے لیکن ایلے نے اس کے خلاف وہ ان کے ساتھ چل پڑا تھا۔





اس لحاظ سے محلہ ہر سال موسم گرما میں کیٹیجی بولا کرتا تھا۔ جس طرح خزاں میں درخت پرانے پتے گرا دیتے ہیں اور نیا سبز جامہ اوڑھ لیتے ہیں۔ اس کے بلوجود آصفی محلے کی زندگی بنیادی طور پر ویسے ہی اپنے صدیوں پرانے محور پر گھومتی رہتی محلے میں تبدیلی آتی تو نمی۔ لیکن کچوا چال سے کسی کیڑے کے ریگنے کے مترادف تھی۔ درحقیقت اپنی مخصوص کہنہ کج رفتاری کی وجہ سے وہ محلہ لوگوں کو پیارا تھا۔ چونکہ وہاں جا کر وہ اپنے عظمت جتا سکتے تھے۔ نئے حاصل شدہ خیالات سے محلے والوں کو مستفید کرنے کے عمل میں یہ خوش فہمی دل میں رچا سکتے تھے کہ وہ نئے خیالات سے کماحقہ واقف ہیں۔ درحقیقت آصفی محلہ وہ اندھا کتو آں تھا۔ جہاں کوئی سمندری مینڈک داخل نہ ہوا تھا۔ جہاں جوہڑ کے مینڈک پھدکتے تھے اور وہ کبھی اس قدر نہ پھولے تھے کہ اپنے آپ میں سانہ سکیں۔

شیش کے قریب انہیں رضائل گیا۔ ”بھئی واہ۔“ وہ چلایا۔ ”آگے جناب۔ بھئی کیوں نہ آتے۔ اب بھی نہ آتے تو کب آتے سلون آیا اور مینڈک نہ ٹرائیں۔“

یہ کہہ کر وہ ایلے سے بات کئے بغیر لالھی گھماتا ہوا کچری کی طرف چل پڑا۔ ابھی آتا ہوں ذرا کچری جاتا ہے۔ ”وہ کھٹ کھٹ چلتے ہوئے چلایا۔ ”ہوگی ملاقات دوکان پر۔“

برساتی نالے کے پل پر انہیں چچا عمو ملے ”ہوں۔“ انہوں نے آنکھیں پچکاتے ہوئے کہا ”آگئی یہ بھجن منڈلی۔ چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ کب سے مندر میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔“ یہ کہہ کر ذریعہ لالہ پڑھتے ہوئے وہ شیش کی طرف چل دیئے۔

”اس اللہ لوگ کو مندر کی گھنٹیوں کی آبا سو جی۔“ ایلے نے رفتی سے کہا۔

”بس جو منہ میں آیا چلا دیا۔“ یوسف۔ نے بے پروائی سے کہا۔

”کوئی بات ضرور ہے۔“ رفتی اپنے بھیکے بھیکے انداز میں بولا۔

چوراہے کے قریب چچی ایلے کو دیکھ کر ایلے نے جھک کر سلام کیا۔ ”جیتے رہو۔“ وہ بولی چمچی پر آئے ہوئے اچھا ہے۔ اچھا کیا۔ دیکھ لو تم بھی رفتی چار دن کے لئے دن ہیں ملا۔“

کھانگی ایلے کی بات سن کر ان کا ماتھا ٹٹکا ضرور کوئی بات ہے۔ نہ جانے کیا ہے۔ مگر ہے اور جی تو وہ سب اشارتا ”انہیں سمجھا رہے تھے کچھ رفتی بھی گھبرا گیا۔ لیکن یوسف قہقہے مار رہا تھا۔“ اسے یار خواخواہ ڈرتے ہو۔“

آنکھوں سے دو آنسو گالوں پر ڈھلک آئے۔ پھر اس نے سر جھکا لیا۔ سسٹرنے آکر اسے قہر لیا۔

## اندھا کتو

پھر گرمی کی تعطیلات کی وجہ سے کالج بند ہو گیا۔ یوسف اور رفتی کی ٹرننگ بھی ختم ہو چکی تھی۔ علی احمد سے اجازت لے کر ایلے رفتی اور یوسف کے ساتھ علی پور آ گیا۔

گرمی کی چھٹیوں میں محلے کی زندگی میں ایک عجیب و غریب گہما گہمی پیدا ہو جاتی تھی۔ ملے کے ملازم پیشہ لوگ انہی دنوں چھٹی لے کر آیا کرتے تھے تاکہ محلے والوں سے میل ملاپ قائم رہے۔ اگر وہ خود چھٹی پر نہ آ سکتے تو وہ ایک ماہ کے لئے بچوں کو ضرور علی پور بھیج دیتے۔ اتنی دیر باہر رہنے کے بعد عورتیں زرا لیج دھج کے ساتھ علی پور میں داخل ہوتیں اور اپنے بے حاصل کردہ فیشن اور خیالات کو اک شان سے محلے کے عوام کے سامنے پیش کرتیں۔ اپنی عظمت کا رعب ڈالنے کی کوشش کرتیں۔

”نہ بہن بچے کو ڈرایا نہیں کرتے اس طرح بچے کے دل میں ڈر بیٹھ جاتا ہے۔ ہاں میں تو پیٹ لیتی ہوں۔ اپنے سیدی کو لیکن ڈرانا۔۔۔ انہوں!“

دوسری بولتی نہ بہن یہ چند ارسائل نہ چلے گی اس شلوار کے ساتھ۔ اب تو بہن چمکدار چیز کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ میں نے جی بوسکی کی قمیضیں سلوائی ہیں۔

جوان لڑکیاں کھڑکیوں میں کھڑی ہو کر محلے کی کھڑکیوں کے سامنے اپنے لباس کی نمائش کرتیں۔ لڑکے اپنے دوستوں سے مل کر نئی سیکھی ہوئی باتوں کا ریکارڈ چلاتے۔

محلے کے بوڑھے ان کی باتیں سن کر مسکراتے جیسے پاگل خانے سے چھوٹ کر آئے ہوں پھر وہ کھنکارتے اور ذریعہ لالہ پڑھتے ہوئے مسجد کا رخ کرتے۔

بوڑھیاں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ارد گرد دیکھتیں اور پھر ”توبہ ہے کیا زمانہ آیا ہے۔“ کہتی ہوئیں اپنے اپنے کام میں لگ جاتیں۔

محلے کی جوان لڑکیاں حسرت بھری نگاہوں سے ان نوداردوں کی طرف دیکھتیں۔ کاجی چاہتا کہ باتیں کرتی رہیں اور وہ سنتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں گویا شوق کے دیئے روشن جاتے۔

واسطہ ہے غلاموں کی بات سمجھنا لائن سے پوچھو۔“ ضیا حسب معمول آنکھوں میں مسکرانے لگا۔  
 ”ہن کی پانچوں سہمی میں ہیں آج کل۔“ ارجمند بولا ”اور ہمارا سرگزشتی میں ہے۔“  
 ”کیوں بھی یہ ٹھیک کہتا ہے ارجمند۔“ ایللی نے بات سمجھے بغیر ضیا سے پوچھا۔  
 ”کیا ہے۔“ ضیا ہنسا ”وہ تو میرا بھائی بن گیا ہے۔ ایمان سے۔“ اور پھر چوگان کی طرف چل

پڑا۔  
 ”ہے۔“ ارجمند نے چھاتی پر ہاتھ مارا۔ ”وہ ہماری بہن ہی بن جاتی۔“ وہ ضیا کی طرف دیکھ  
 کر چلایا۔ پھر ایللی سے مخاطب ہو کر بولا ”اچھا بیٹا تو جاؤ دادی اہل کے چرن چھو آؤ۔ خاکسار کچی  
 حویلی کی لائین کے نیچے ڈیوٹی دے رہا ہو گا۔ دادی اہل کے بنے ہوئے لڈو کھانے نہ بیٹھ جانا  
 ورنہ خاکسار کی آہ پڑے گی تم پر۔“

ایللی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر وہ کون تھی اور وہ کون تھا اور محلے والوں کے اوسان  
 کیوں خطا ہو رہے تھے ارجمند اور ضیا کی تو اور بات تھی مگر چچی اہل اور بچا عملہ ظاہر تھا کہ بچا عملہ  
 بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ ایسا کون تھا وہ۔

چوگان میں پہنچ کر اس نے ڈرتے ہوئے چاروں طرف دیکھا مگر محلے والیوں کے سوا وہاں  
 کوئی نہ تھا اور محلے والیاں حسب دستور اسے دعائیں دے رہی تھیں۔

”اللہ بڑا مرجہ نصیب کرے۔“

”کون آیا ہے چاچی۔“

”اے ہے اپنا ایللی آیا ہے۔“

”جیتا رہے بی بی اہل کے کلیجے کی ٹھنڈک ہے۔“

ڈیوڑھی میں جا کر وہ ڈر گیا اس کے سامنے نذیراں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ”تم آ گئے۔ اب  
 پلے نہ جانا۔“

”ہائے کون ہے؟“ دادی اہل چلائی۔ ”دیکھ تو سیر میوں میں لڑکی جیسے کسی کی پٹائی ہو رہی  
 ہو۔ ہائیں ایللی تو ہے۔ تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ کیا ایسے چڑھا کرتے ہیں سیر میاں۔ کب آیا تو۔  
 راضی تو رہا۔ علی احمد کیسا ہے۔ بچے کیسے ہیں۔ وہ خود نہیں آیا چھٹیاں کب ہوں گی اسے؟“

سعیدہ اسی طرح گھٹنوں میں سر دیئے دادی اہل کے پاس بیٹھی تھی۔ ”اہل سے ملا تو دادی  
 اہل نے کلمہ۔“ وہ اوسہری رہتی ہے۔ فرحت کے پاس۔ اچھا مل لیجو جا کر ذرا بیٹھ تو۔ اب تو اتنا

ڈیوڑھی میں ارجمند نے اسے پکڑ لیا ”ارے تم ہو ایللی تم۔ ارے پٹ گئے۔ پتہ ہو کر  
 بریلو ہو گئے۔“ پھر اس نے رفیق اور یوسف کو دیکھا اور دفعتاً ”پہلو بدلا۔ پہلو بدلنے میں اور  
 مکمل حاصل تھا۔

”السلام علیکم بھائی صاحب مزاج اچھے ہیں صاحب اپنا حال تو بتا رہا ہے اس ایللی کے  
 کم بخت منہ موڑتا ہے تو پھر ادھر دیکھنے کا نام ہی نہیں لیتا اور فرمائیے آپ تو خیریت سے  
 ہیں۔“  
 رفیق مسکرا کر آگے کو چل دیا۔ تو ارجمند نے ایللی کو رکنے کا اشارہ کیا ”ابے ٹھہر جا  
 سے ملے بغیر دادی اہل کی جھولی میں کیسے جاسکے گا تو۔“

### وہ اور وہ

رفیق اور یوسف کے جانے کے بعد ارجمند نے اپنے سینے پر دو ہتھ مارنے شروع کر دیے۔  
 ”بتائی بریلوی۔ بتائی بریلوی۔ ارے یار وہ سارا اینٹ البحر کا دفتر بے معنی ہو کر رہ گیا وہ انگریز  
 خاک میں مل گیا اور یہ پریم ٹوٹا اور پریم پھرا۔ اس نے اپنی بانسری اور ریشمیں روپل کی  
 اشارہ کر کے کہا ”سب قیل“ وہ تو نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی نہ جانے وہ ناگ کس بین پر مت  
 ارے ارے کوئی ناگ سا ناگ ہے۔ اف، اف، اف کی بھین ہے۔ کیا دم خم ہے۔ کیا  
 ہے۔ ایک نگاہ دیکھ لے تو دن بھر سرور نہیں جاتا۔ اور سانہوا رنگ جیسی گوگل کا کتیا ہو۔  
 بولو وہاں اس خاکسار کی بانسری کیا کر سکتی ہے۔ پیچاری“ ”آخر بات بھی کرو گے۔“ ایللی نے  
 کر پوچھا۔

”لو بھی۔“ ارجمند نے سر پیٹ لیا ”اور یہ کیا بکواس کر رہا ہوں۔ میاں دیکھو گے وہ  
 اڑ جائیں گے وہ چیز ہے جو دیکھے بنا تصور میں نہیں لائی جاسکتی۔ اللہ اللہ کیا چیز ہے۔ خدا کا  
 اس مسجد پر ایک۔۔۔ بھر پور نگاہ ڈال دے تو ایک آن میں سلی آپ ہی بت بن جائے  
 لو جو کرتا ہے۔ ہے۔ ہے۔“

ضیا کو آتے ہوئے دیکھ کر ارجمند ایک ساعت کے لئے خاموش ہو گیا۔ ”لو بھی۔“  
 لب بولا۔ ”آگئی، ٹھنڈا لائن لہذا اپنی گاڑی رک گئی۔“

اپن کی تو مین لائن ہے بھائی۔ سیدھے روٹ پر چلنا جانتے ہیں ہم۔ ہمیں تو حوصلہ

کی کسی عورت یا لڑکی میں نہ تھی۔ شہزاد میں بچپن کی ایک ایسی جھلک تھی جو دوسروں کو کھینچنے پر آکھاتی تھی۔  
ایلی نے شہزاد کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔ ”جی ہاں۔“ وہ بولا۔ شہزاد کے رو برو اس کے جسم و روح کا رواں رواں جی ہاں کہہ کر سر جھکا لیا کرتا تھا۔  
”وہ بلائے ہیں تم کو چائے پر۔“ شہزاد مسکرائی۔ ”چلو میرے ساتھ۔“ اور ایلی چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔

”تم آگئے“ شریف اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی آنکھیں اسی طرح چھت پر لگی ہوئی تھیں۔ البتہ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔ ایلی کی نگاہ میں شریف کس قدر خوش نصیب تھا۔ جسے شہزاد نے اپنا تھا۔ جس کی زندگی شہزاد کی روشنی سے منور تھی۔ لیکن بظاہر شریف پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ اب بھی انور کے خیال میں ویسے ہی مست رہتا تھا۔ کتنا وفا شعار سچا عاشق ہے۔ اس کی محبت کو کوئی چیز متزلزل نہیں کر سکتی۔ جس کی زندگی میں شہزاد سی موتیا گھڑی کھل کر بھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی۔

”ہوں تم کیسے ہو ایلی۔“ ایک بلو قار حسین عورت اس کے رو برو آکھڑی ہوئی۔  
ایلی اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”سلام کتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔  
”یہ ایلی ہے الل۔“ شہزاد نے اس عورت سے کہا۔

”مجھے یاد ہے۔“ وہ بولی۔ ”برات کے دن اندر آیا تھا۔ وہی تو ہے۔“ ایلی نے اس کی طرف ڈرتے ہوئے دیکھا۔ اونچا لبہ اُتار دیا۔ فریہ جسم اور پر وقار چہرہ۔ اس کے خدو خال میں حسن و وقار کی عجیب آمیزش تھی۔ آنکھوں میں حکومت کی چمک تھی۔ آواز میں دبدبہ تھا۔ اس کی انگلیوں میں عجیب قسم کی انگوٹھیاں تھیں۔ جن میں تک کلی کی طرح ابھرے ہوئے تھے۔  
”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے گویا ایلی کو ڈانٹا۔ تیرے باپ کا کیا حال ہے۔ اب تو کشمیر کے سیب سے بھر گیا ہو گا اس کا دل کوئی نئی نویلی چیز میں ہے نگاہ میں۔“

”جی جی۔“ ایلی بن سوچے سمجھے کہے جا رہا تھا۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا وہ اس کے رو برو بیٹھا رہے اور تنکھیں سے اس کی طرف دیکھتا رہے۔ اس وقت وہ شہزاد کو بھی بھول چکا تھا۔ اور شریف تو بالکل ہی ذہن سے اتر چکا تھا۔

پھر لمحہ کمرے سے کسی نے آواز دی اور بیگم بولی ”پھر بیٹھوں گی کسی وقت تیرے پاس۔“

بڑا ہو گیا ہے تو منہ پر داڑھی نکل رہی ہے۔“ دادی الل نے حیرانی سے اس کا جائزہ لیا۔  
کھائے گاہ تیرے لئے بہت کچھ رکھا ہوا ہے۔ میں نے ہاں۔ اے حمیدہ رشیدہ لڑکیو تم کچھ  
رہی ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“ وہ ان دو لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی جو دروازے میں کھڑی  
غور سے ایلی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

رشیدہ اور حمیدہ سیدہ کی بہن نیاز کی بیٹیاں تھیں۔ ان کی والدہ فوت ہو چکی تھی اور نہ  
دونوں دادی الل کے پاس آگئی تھیں ”جار رشیدہ جا کر وہ کمرہ صاف کر دے۔ حمیدہ تجھے توہم  
ہے ابھی برتن مانجھنے ہیں۔“

”اچھا ایلی۔“ دادی الل بولی ”علی احمد نے میرا خرچ نہ بھیجا۔ کیا اسے خود خیال نہیں آتا  
اے ہے میں کیوں یاد کر آؤں۔ خدا نہ کرے۔ مجھے کوئی بے اعتباری ہے۔“ ایلی نے بیٹھ کر  
الل کو گود میں لے لیا۔ ”اے ہے چھوڑ۔“ وہ چلائی۔ ”جیسے کوئی دس سال کی بچی ہو تو توہم  
ہڈیاں توڑ دے گا۔ توبہ ہے۔ دیکھتے دیکھتے کتنے بڑے ہو جاتے ہیں یہ ہاتھوں کے چنے۔ اچھا  
اور بات سننا۔ وہاں کیسے رہتا ہے تو۔“ وہ بولے جا رہی تھی اور ایلی سوچ رہا تھا کتنی پیاری ہے  
دادی الل۔ اس کے پاس آکر یوں لگتا ہے کہ جیسے بچہ گھونسلے میں آگیا ہو۔ دادی الل کے پاس  
کر وہ بھول جاتا کہ ارجمند کچی حویلی میں اس کا انتظار کر رہا ہے اور وہ کون تھا جسے ضیاء نے بھلا  
لیا ہے۔ وہ سانوری کون ہے جو کسی بین پر مست نہیں ہوتی۔

بیگم

نہ جانے وہ کب تک دادی الل کی ہڈیوں سے چٹ کر بیٹھا رہا حتیٰ کہ ہاجرہ آگئی۔  
”ایلی آیا ہے۔“ ہاجرہ کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں ”ایلی آفرحت تیرا انتظار کر رہی ہے۔“  
”جابل آ۔“ دادی الل بولی۔ اور وہ اٹھ کر الل کے ساتھ فرحت کی طرف چل پڑا۔  
ابھی وہ فرحت سے بات کرنے ہی لگا تھا کہ اوپر کی سیڑھیوں میں شور ہوا۔ ”سننا ہے ایلی  
ہے۔“ شہزاد کی آواز دور سے گونجی۔ شہزاد کی آواز کی سرتل ہی زلزلہ تھی۔ اس کا ہر انداز  
والیوں سے مختلف تھا۔ ایلی نے شوق سے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ سامنے شہزاد کھڑی مسکرا  
تھی۔ موتیا گھڑی کے پٹ پورے طور پر کھل چکے تھے۔

شہزاد کی ہر بات میں عورت اور لڑکی کی عجیب و غریب آمیزش تھی۔ ایسی آمیزش جو

اللہ حساس اور سمجھدار۔ ہلکی سی جنبش بھی نوٹ کئے بغیر نہیں رہتی۔ رومل کی ہلکی سی جنبش کی بول۔ مطلب خاکسار ابھی حاضر ہوا۔ فوراً بات پالی لیکن کیا عجل کہ چوتن سے ظاہر ہو۔ صرف ایک لطف مسکراہٹ اور پھر فوراً جتا بھی دیا۔ ہم سمجھ گئے۔ خاکسار ہو آئے اجازت ہے جب تک ہمیں چوگن سے کوئی دلچسپی نہیں ”اور پھر چوگن سے کوئی دلچسپی نہیں“ اور پھر چوگن سے منہ موڑ کر کھڑے ہو گئے اور جب تک خاکسار واپس نہ آیا ویسے ہی کھڑے رہے۔ واہ واہ کیا ذہانت ہے۔ جتنی بڑی بے پروا ہے۔ اتنی ہی چھوٹی حساس ہے۔ واہ واہ اپنا انگریزی وہ چلا ہے کہ بس کیا بتاؤں۔“ وہ رک گیا۔

”لیکن سب بیکار ہے۔“ اس نے پینتزا بدلا ”سب بیکار انگریزی کا ہوش بھی رہا ہو۔ کس کافر کو ہوش رہے گا۔ میاں کب تک مچھلی کانٹے پر لگی تڑپتی رہے اب تو وقت ہے کہ سرکار ڈوری کھینچیں۔ لیکن سرکار بھی کیا کریں ایللی وہ تو خود مہمان کی حیثیت سے آئے ہوئے ہیں وہ کیسے کھینچیں اور خاکسار کے لئے یہ رنگ محل ممنوع ہوا۔ وہاں جائے تو کس بہانے جائے اسی فکر میں تھا خاکسار کہ اللہ نے رحمت کافر شہر بھیج دیا یعنی تم آگے اور تم یہاں پہنچتے ہی یزید بن کر رہ گئے۔ بے ہے۔“

### سانورے کنہیا

”ہا ہا ہا“ دقتاً ”ارجمند چیخ کر بولا۔ ”ہم اپنی رام کہانی میں لگے ہیں اور وہ دیکھو وہ۔ اس کمر کی میں ارے اندھے وہ والی جو اندھیری ڈیوڑھی کے اوپر کھلتی ہے۔ نہ جانے سانورے کنہیا کب سے اپنی گویوں کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ اے ٹھہرتو۔ اتنا بے صبر کیوں ہوا جا رہا ہے۔ مجھے پرہم تو کر لینے دے۔“ اور وہ درشن کے بن ترس گئی اکیاں گنگناٹے اور رومل ہلانے لگا۔ کمر کی میں ایک اونچی لمبی لڑکی لمبی لمبی پلکوں سے سیاہ خوابیدہ آنکھوں کو ڈھانپنے کھڑی تھی۔ اس کے نقوش ستواں تھے۔ چہرے پر انوکھی سی ر۔ شمس ملاحظت کا شفاف سا نقاب پڑا تھا۔ جیسے کوئی سنڈلا ہاتھ میں شیشے کا سپر لے حیران کھڑی ہو۔ ”لیکن یہ ہے کون؟“ ایللی چلا یا۔

”کیا واقعی۔“ ارجمند نے حیرانی سے ایللی کی طرف دیکھا۔ ”ہم تو سمجھ رہے تھے کہ بتا رہا ہے ہمیں۔ ارے بھائی یہ سب تمہاری اس موٹگیا گٹھڑی سے نکلے ہوئے فتنے ہیں۔ جب سے وہ پنڈورا میل آئی ہے رنگین مصیبتوں کا ایک صندوق کھل گیا ہے۔ اب کر لو جو کرنا ہے اور ابھی

یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور طلسم ٹوٹ گیا۔

لمحہ کمرے سے شہزاد کی سی کئی ایک آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور وہ محسوس کر تھا۔ جیسے چمن میں ہمار آگئی ہو۔ لیکن وہ چمن ایللی کے لئے ممنوع تھا۔ ممنوع نہ بھی ہوتا تو اس کی جرات نہ ہوتی کہ وہاں جا کر دیکھتا کہ وہ آوازیں کن کی تھیں۔ جرات ہوتی بھی کیسے اس میں کوئی بھی خوبی نہ تھی۔ چہرہ کارٹون سا تھا۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھائی دیتا تھا۔ رنگ تھا۔ کوئی بھی تو ایسی خصوصیت نہ تھی جس کے بل بوتے پر وہ اپنے آپ کو درخور اعتنا سمجھ امید رکھتا اور جرات کو کلام میں لاتا۔

سانے شریف لیٹا ہوا نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ وہ اپنے ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ نگاہیں ہمار کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ ایللی دنیا میں کھویا ہوا ہے۔ اور اس کی ہڈ نہیں سن رہا۔ اسے اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی اس کی بات سنے۔ اسے تو کہنے سے غرض نہ اور بات کہنے کے لئے اس نے ایللی کو چن لیا تھا اور ایللی سننے کا انداز قائم کئے کچھ سوچ رہا تھا اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے کیا محسوس کر رہا ہے۔ اپنے محسوسات کو اپنا لے شاید اسے ندامت ہوتی اس لئے اس نے اپنے محسوسات کو واضح طور پر کبھی نہ اپنایا تھا اور نہ ہی کسی چمن میں رنگین چیزیاں چمک رہی تھیں دور کچی حویلی کی لائٹین کے نیچے انگریزی کی شیدائی پریم سندس تھامے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

### کار اور خاکسار

اگلے روز صبح سویرے ہی ارجمند آگیا۔ ”اوزید کے چیلے۔“ وہ آتے ہی چلایا ”کل سارا دن مجھے کچی حویلی کے صحرا میں پیسا مارا اور خود کو کل کے بن میں سانوری سے سانوری سے رنگ پکڑا کھیلنے میں مصروف رہا۔ تف ہے تیری دوستی پر۔“

جب ایللی نے سانوری کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو ارجمند قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ”ہمیں بتانا ہے یار ہمیں جنہوں نے پریم دو یا پر باپن ہی میں عبور حاصل کر لیا تھا۔ اپن ہا ہا جنہوں نے پانی پت کی ڈھنری کی میزوں پر پریکٹیکل ٹریننگ حاصل کی ہوئی ہے۔ کو تو سند دیا دیں۔ سند یافتہ لوگوں کو چٹکیوں میں اڑانا آسان نہیں۔ اچھا تو بیٹا کل کی رپورٹ دو۔ کونے مراحل طے کر لئے اور کون کونے باقی ہیں۔ لیکن یار کیا رنگ ہے کیا انداز پایا ہے۔ اور پھر

دوران میں اہلی اس آئینہ کی طرف دیکھتا رہتا جو جیل نے ایسے زاویے پر لگا رکھا تھا کہ نیچے سے آتا ہوا ہر شخص پہلے ہی نظر آجائے۔

جیل شوکت سے باتوں میں مشغول رہتا۔ شوکت نہایت معصومیت سے جیل کی طرف دیکھتا اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ روز اسے اتنی مٹھائی کیوں کھلاتا ہے اور اہلی اس آئینہ پر کیوں جھکا رہتا ہے۔

دوپہر کے وقت شنوار کی والدہ آجاتی جسے سب بیگم کہتے تھے اور وہ تھی بھی تو بیگم۔ اہلی اکثر عوس کرتا تھا کہ اس کے سر پر چھوٹا سا تاج بھی ہونا چاہئے تھا جیسے بیگمات پہنتی ہیں۔ اس کے انداز میں بلا کار ع تھا اور اس کی نگاہوں میں ایک عجیب شان بے نیازی تھی۔

بیگم کو آصفی محلہ بالکل ناپسند تھا ”یہ کیا ہیں تمہارے محلے کے مکانات۔“ وہ اہلی سے کہتی ”اندھیرے کوئے اجڑے ہوئے چوہارے جیسے گلی سڑی پیاز کے چھلکے ہوں ایک دوسرے کے اوپر۔ دوسرا تیرنے کے اوپر توبہ ہے ہمارے یہاں تو صاف سترے کمرے ہوتے ہیں اور شنوار کے اہل تو ایک دن بھی نہ ٹھہریں یہاں بڑے صفائی پسند ہیں وہ اور یہ جو تمہاری محلہ والیاں پکاتی ہیں۔ جسے تم لوگ کھانا کہتے ہو۔ ان کے سامنے رکھا جائے تو طوفان اٹھا دیں۔ تمہارے محلے کے مروت بد جو نہیں بد جو۔ مردوں کی سی بات نہیں ان میں۔ کبھی ہمارے یہاں آؤ تو تمہیں دکھاؤں میں۔“

اہلی مسرور ہو کر بیگم کی باتیں سنتا۔ اس وقت اسکی نگاہوں میں نور پور کا وسیع میدان پھیل جاتا اور قلعے کے برج ابھرتے اور وسیع فراخ کمرے کھلتے اور بالآخر ایک زرد مینڈک اور دو حنائی انگلیاں اس کی طرف بڑھتی۔

پھر شام کے وقت جب سورج غروب ہونے کے لئے مغرب میں اترتا تو اہلی کوٹھے پر چڑھ جاتا اور کتب ہاتھ میں لے کر وہاں ٹھٹھا جیسے سبق یاد کر رہا ہوتا کہ متصل کوٹھے پر سانوری کو دیکھ سکے اور متصل کوٹھے پر ہلکے رنگوں میں لمبوس سانوری یوں شلتی جیسے اسے اہلی کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔

اس کی بڑی بڑی آنکھیں دور کسی افق پر مرکوز ہو جاتیں۔ اس کا دوپٹہ یوں لٹکتا جیسے تاج پوشی کی تصاویر میں شنوار یوں کے پیچھے رہے۔ شمس کپڑے لٹکتے ہیں۔ ٹک ٹک ٹک۔ اس کی اونچی ایڑی والی گرگلی ہلمپت لے میں تل دیتی اور پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ گرد پیش کے دھندلے

دیکھا گیا ہے ابھی تو وہ گلاب کا پھول اور رس گھا بھی ہیں۔ اف! وہ گلاب کی کلی جب کلی دینا پر رنگ کی وہ قیامت ٹوٹے گی کہ آنکھیں پھٹ جائیں گی۔ چھ سال کی عمر میں یہ کیفیت کہ مسکراتی ہے تو فضا میں قدیلیں روشن ہو جاتی ہیں اور وہ ان کا بھائی شوکت جیسے موم ہو۔ فیا تو اسے دیکھ کر ہمیشہ کے لئے بد معاشی سے توبہ کر چکا ہے اور جیل بیڑے کھلے بغیر شغل کو بھول چکا ہے خیر اپنے کو تو بھٹھنڈا لائن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اپن کو تو بار بار سڑنے کنبیا لے ڈوبے اور حضور گاتے بھی ہیں واہ وا کیا گاتے ہیں۔ چار ایک دن ہوئے بھجن منڈلی براجمن ہوئے تھے۔ وہ رنگ بنایا کہ بس کیا پوچھتے ہو۔ محلے کے لڑکوں کے دل کالوں میں خم ہو گئے اور نفسوں نے وہ تل دی کہ بس اسے ہے۔“ وہ چھاتی پر دو ہنر مارنے لگا۔

عین اس وقت میڑھیوں سے پاؤں کی چاپ سنائی دی جیسے کوئی نیزے پر تلج رہا ہو اور جمجم سے شنوار داخل ہوئی۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ دوپٹہ کندھوں پر اڑ رہا تھا۔ منہ پر راز جھللا رہی تھی۔ ”اہلی اہلی۔“ وہ بولی ”کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ چائے سامنے رکھا۔ چلو۔ جلدی آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ واپس دوڑ گئی۔

ارجمند از سر نو سرپٹنے لگا ”ہائے اللہ کیا کریں ہم کدھر جائیں ہمیں کوئی نہیں بلاتا چائے کوئی پوچھتا ہی نہیں کہ میاں کون ہو۔ سیر ہو یا پاؤ ہو۔ اچھا بھئی جاؤ۔ مزے اڑاؤ۔ اپن کا ہے۔ جیسے تیسے وقت بتالیں گے بس یہی فرق ہے تاکہ تم سنگ ساتھی ہو اور ہم پر دسکی۔ پرا رکھو دوست۔ سنگ ساتھی کو کبھی وہ رتبہ نہیں ملا جو پر دسکی کو ملتا ہے۔ آخر میں بازی پر دسکا کے ہاتھ میں رہتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک حریفانہ سلوٹ مارا اور چلا گیا۔

اس کے بعد یہ معمول ہو گیا۔ روز صبح سویرے چائے کیلئے شریف کی طرف سے بلا آئے پہلے فضا میں ٹھٹھکو رنجتے پھر جمجم سے شنوار اتر آئی۔ دوپٹہ اس کے شانوں پر یوں لٹکتا جیسے گواہائی ڈاک کا اشتہار ہو۔ بائیں فضا میں لہرائیں جیسے رفتار ظاہر کرنے کے لئے مصور نے گلاب خطوط لگا دیئے ہوں۔ ”وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ ہنستی — گھینٹیں بچتیں۔

چائے پر شریف اسی طرح چھت پر نگاہیں گاڑے رہتا اور ہر دو منٹ کے بعد ایک لمبا بھرتا اور پھر جوش میں دبی آواز سے کہتا ”کسی سے محبت کرو اہلی۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو بس محبت کرو۔“

دوپہر کو جیل شوکت کو بلا لاتا ہے۔ وہ تینوں برساتی میں بیٹھ کر کہیں اڑاتے۔ جس کا



”میں کہتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”اگر ہم ایک ڈرامہ کھیلیں تو۔“  
 ”ڈرامہ۔“ ایلی کے دل میں گویا ایک رتکین ہوئی چل گئی۔  
 ”ڈرامہ آپ کیا بات ہے۔“ ارجمند چلایا۔ کرشن کنیا ٹھیک رہے گا۔ آپلا اور گائیاں اور  
 گویاں اور بچ۔ میں بند راہن کا گوکل۔“  
 ”ڈرامہ۔“ صفر نے ایک لمبی آہ بھری اور سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر شائے پھیلا کر گنگنائے  
 لگا۔ ”حافظ خدا تمہارا۔“

یوسف سپاہیانہ ہنسی ہنسا ”یہ بھی کر دیکھو۔“ وہ بولا

رضانے اپنی لنگڑی ٹانگ جھلا کر کہا ”میاں کوئی بلاشلہ کا پارٹ ہو تو ہمیں دے دیتا۔ باقی  
 سب خیریت ہے۔“

صفر کے دالان میں پردوں کی جگہ کھیس اور چادریں لٹکائی گئیں۔ کیونکہ اس کے سامنے  
 صحن کے اوپر کی چھت گیلری کا کام دے سکتی تھی۔ جہاں سے محلے کی عورتیں ڈرامہ دیکھ سکتی  
 تھیں۔ آٹا حشر کے کھیل ”خوبصورت بلا“ کا ایک رتکین نکلا کھیلنے کے لئے چٹا گیا۔ رفیق نے  
 گلغنیبرو کا پارٹ سنبھال لیا۔ ارجمند کو زینک کا کام ملا اور اسی طرح سب ہی پارٹ محلے کے  
 بڑے لڑکوں نے سنبھال لئے اور وہ سب شدت سے سیرسل میں مصروف ہو گئے۔

اس رات صحن کھپا کھچ لڑکوں سے بھرا تھا اوپر گیلری میں بیس بیس عورتیں بیٹھی تھیں۔  
 بستر کے لئے ہوئے کھیسوں اور چادروں کے پیچھے گلغنیبرو کی آنکھوں میں گلابی رنگ کی  
 بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ارجمند زینک کے بھیس میں پریم پتر اور پریم ٹوٹا سنبھالے کھڑا تھا۔ صفر  
 ہدایت کار کی حیثیت سے شائے پھیلائے۔ ”اے دلربا میں ہوں فدا۔“ گنگنائے رہا تھا۔

کھیل شروع ہوا۔ ایکٹروں منہ اٹھا کر باتیں کر رہے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ سے ہم کلام  
 ہوں۔ گلغنیبرو نے کبوتر کی طرح سینے کو دھرا کئے کھڑا تھا۔ زینک چھت سے باتیں کر رہا تھا۔  
 پارٹ کرتے والوں کے لئے کتاب پر نظریں جمائے رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ پٹاخہ بجا بھی دیتے تو  
 پردہ کھینچنے والے کو معلوم ہی نہ ہوتا کہ اسے پردہ کھینچنا چاہیے۔

لوہر زینک سامنے منظر کی وجہ سے اس حد تک مست ہو گیا تھا کہ ان جانے میں اس نے  
 ڈنڈے کو یوں تھام لیا تھا جیسے وہ ایک بانسری ہو۔ صرف ایلی کی نگاہیں جھکی جھکی تھیں۔ اسے  
 زائد پارٹ کرنے میں شرم محسوس ہو رہی تھی۔

مکانات سبز پیراہن پہن لیتے اور چوبارے یوں دکھائی دیتے جیسے تنکوں سے بنے ہوئے  
 جھونپڑے ہوں اور پھر دور سے بانسری کی سرس بلند ہوتیں اور کرشن کنیا گوکل کے ہنسنے  
 ٹپٹنے اور ان کے چہرے کے ر۔ شمس سانولے پن میں اشیر بلا کی مدھم روشنی چمکتی اور  
 چوگن میں کوئی راکشش ارجمند کے روپ میں چلاتا۔ ”مند گاؤں والے انبے او گوکل کے ہنسنے  
 لو بھئی یہ حضرت ہاتھ سے گئے۔ نہ جانے کیا زمانہ آیا ہے۔ چھوٹوں کو بڑوں کا لحاظ نہیں رہا  
 ہتاؤ۔ اقربا میرے کریں خون کا دعوے کس پر۔“

## گل حکمت کا متوالا

چھپر۔ بیٹھے رفیق کو سو بھی۔ رفیق کو ہمیشہ ہی سو جھا کرتی تھیں اگرچہ بظاہر وہ  
 خاموش لڑکا تھا۔ رفیق کی تمام تر قوت اس کی آنکھوں اور گالوں میں سمٹ کر آگئی تھی۔  
 تنک زبان کا تعلق تھا وہ گونگا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی بات بھی کرو تو وہ مسکراتا اس کی مسکرا  
 میں تتلی نہیں ہوتی تھی۔ ایسی بات کرو جو اسے ناپسند ہو تو اس کے ہونٹ ہلکے سے کل با  
 اور اس کی آنکھوں میں بوندا باندی شروع ہو جاتی۔ ایسی بات چھیڑ دو جو اس کے لئے تھک  
 ہو تو وہ گھبرا جاتا۔ اس کے ہونٹوں سے ”آف آف“ کی آواز نکلتی جیسے اس نے کوئی گرم چیز  
 ڈال لی ہو اور اس کی حرکت اضطرابی رنگ اختیار کر لیتیں۔

بے زبان ہونے کے باوجود رفیق بے حد حساس تھا۔ اس کی طبیعت میں دہلی دہلا  
 تھی۔ صبح سویرے ہی وہ شریف کے یہاں جا پہنچتا ”چچی کوئی چیز تو نہیں منگنی۔“ اور پھر جب  
 رتکین اشتہار کی طرح اس کے سامنے آتی تو وہ گھبرا کے پیچھے ہٹ جاتا اس کی آنکھیں  
 جاتیں اور کوئی رتکین سرگلے میں پھنس جاتا شدت تاثر سے وہ ”آف آف“ ہی کرتا آنکھوں  
 بوندا باندی اور تیز ہو جاتی۔ رفیق دہلی دہلی آج کو پسند کرتا تھا۔ وہ گل حکمت کا متوالا تھا۔  
 بھرک کر جلتے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے کردار میں دو پہلو نمایاں تھے رجحانی اور بھگ

## آن ملا تھا

اس کے باوجود رفیق کو اکثر سو جھتی تھیں۔ اب کی بار اسے لا جواب بات سو جھی  
 کے لڑکے بات سن کر متفقہ طور پر جھومنے لگے۔

یہ جلد کیسے کہا جاسکتا ہے۔ پھر سانوری کہے۔  
 ”لیکن پھر وہ کون تھا۔ کون تھا وہ۔“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”نہ جانے کون تھا۔ کوئی خوش نصیب ہو گا۔“

اس کی چشیاں کیسے نازک وقت پر ختم ہوئی تھیں۔ اگر وہاں کچھ دیر اور رہتا کاش —  
 کم از کم اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ خوش نصیب کون ہے۔

پھر جب وہ شریف کو خدا حافظ کہنے کے لئے شہزاد کے گھر گیا تو اس نے دیکھا کہ سانوری کڑی میں کھڑی تھی۔ خاموش اداس، ایک ساعت کے لئے اس کی پلکیں اٹھیں اس نے ایک ساعت کے لئے نگاہ بھر کر اہلی کی طرف دیکھا۔ ایک واضح آہ بھری پھر اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ سانورے رنگ کی لبوتری انگلی نے یوں رخسار کو چھوا جیسے آنسو پونچھ رہی ہو پھر اس نے منہ موڑ لیا۔

”تم جا رہے ہو اہلی۔“ شریف مسکرایا ”جاؤ چلے جاؤ۔ اس اندھے کنوئیں سے بھاگ جاؤ۔ جاؤ وہاں جہاں لوگ محبت کرنے کو گناہ نہیں سمجھتے جاؤ محبت کرو اہلی جاؤ۔“

ڈیوڑھی میں رفق سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ سی سی کی مدھم آواز سنائی دی۔ ”میں بھی جا رہا ہوں اہلی ”وہ بولا ”نو کری مل گئی ہے۔ مجھے اب جانا ہی ہو گا۔“ وہ یوں آہیں بھر رہا تھا جیسے نوکری کا دل جانا بد قسمتی ہو۔

لائین کے قریب ارجمند کھڑا اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ ”یہ تم نہیں جا رہے اہلی۔“ وہ بولا ”تمہیں کون خاطر میں لاتا ہے۔“ وہ رک گیا۔  
 ”لیکن کیا۔“ اہلی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”چپکاری سے رنگ جا رہا ہے۔ بانسری سے نغمہ جا رہا ہے“ ارجمند نے آہ بھر کر کہا۔  
 ”پاگل ہو گئے ہو۔“ اہلی نے اسے گھورا۔

”ہاں۔“ اس نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی ”سچ کہتا ہوں۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔  
 ”سانوری کنیا نے پاگل کر دیا ہے کیا۔“ اہلی نے پوچھا۔

گوپیوں کے بغیر کنیا کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں اتنا بھی نہیں جانتے تم۔ ارجمند نے پینتر بدلا ”چلے جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ جاؤ ہم حکم دیتے ہیں جاؤ۔ مابدولت کا فرماں بجالاؤ۔ جاؤ۔“

تماشا لائی بار بار تلیاں بجا رہے تھے۔ گیلری کے دھندلے میں سفید سفید دانت چمک رہے تھے۔ ہلکی ہلکی رو پہلی گھنٹیں بج رہی تھیں جنہیں سن کر اداکار اور بھی چپکتے اور ان کے لئے اپنے پارٹ پر محدود رہ جانا مشکل ہو جاتا اور وہ اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر مکالمے بولتے۔ آنسو لگانے پر زبردست تلیاں پینی گئیں۔ گیلری سے دبا دباواہ واکا شور بلند ہوا۔ اس پر گلے دلایا اور بھی چپکے اور وہ جوش میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگے اور وہ اپنے بازو جھلاتے ہوئے چلایا۔ ”آؤ ملا تھا۔ اک پردیسی پیاری بھول نہ جانا۔“ جیسے گیلری میں کسی سے مخاطب ہو۔ اس پر تلیوں کا طوفان اور بھی تیز ہو گیا۔ گیلری سے با آواز بلند نعرے سنائی دیئے اور آخری ڈراپ گرا دیا گیا۔

## کون خوش نصیب

اگلے روز جب اہلی چائے پینے کے لئے شریف کے گھر بیٹھا تھا اور شریف دو ایک منٹ کے لئے اسے اکیلا چھوڑ کر خود کو ٹیٹے پر گیا ہوا تھا تو دفعتاً ”قریب ہی سے اک سریلی آواز اس کے کان میں پڑی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کوئی گا رہی تھی۔

”آن ملا تھا اک پردیسی پیارے بھول نہ جانا جی۔“ اس نے لپک کر ملحقہ کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ سانوری کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ جن پر لمبی لمبی پلکیں سایہ کئے ہوئے تھیں۔ اس کے سانورے رنگ میں مٹلی چمک تھی اور کھڑے ہونے کے لئے اس میں واضح سپردگی اہلی کا دل اچھل کر اس کے گلے آٹکا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا وہ مسکرائے جا رہی تھی۔ اہلی کا جی چاہتا تھا کہ اس سے بات کرے اس سے پوچھے۔  
 سانوری ہو۔ کیا واقعی۔“ مگر اس میں اتنی جرات نہ تھی۔

شام کو اہلی جب دولت پور جانے کی تیاری میں مصروف تھا تو دفعتاً ”وہ چونکا۔“ اس نے وہ چلایا۔ ”اس نے تو کہا تھا۔ پیارے بھول نہ جانا جی۔ پیارے ہاں ہاں یقیناً اس نے پیارے کہا تھا۔ لیکن گیت میں تو پیارا تھا۔ ہاں ہاں۔ پیاری بھول نہ جانا جی۔ پھر سانوری نے پیارے کہا۔ کہا تھا۔ پیارے سے اس کا مطلب کیا تھا۔ کس سے مخاطب تھی وہ۔ اس وقت کمرے میں ڈکا بھی نہ تھا اور وہ کھڑکی میں تو نہ تھی۔ کھڑکی سے دور اس دروازے کے قریب جو گھر میں تھا۔ ایک ساعت کے لئے اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی ”شاید“ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا ”نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے یہ مجھ میں ہے ہی کیا لا حول ولا قوۃ مجھ“

دل کی گہرائیوں میں بیٹھ چکا تھا جب وہ ابھر کر اہلی کے شعوری ذہن کی طرف یورش کرتا تو اہلی اسے پھر دہانتا اور اس طرح اپنی دنیا کو محفوظ کر لیا کرتا مگر وہ دبایا ہوا خیال اندر ہی اندر دل کو متھن کیے جا رہا تھا۔

### جنیاتی محور

اہلی کی تمام تر جنیاتی زندگی علی احمد کے محور کے گرد گھومنی تھی جب کوئی جو تک ان کے گھر آکر علی احمد کا خون چوسنے کے شغل میں مصروف کار ہو جاتی تو وہ غصے سے بھوت بن جاتا۔ علی احمد کو ایسی زندگی بسر کرنے کا حق نہیں۔ اسے نین کے سپاہی کا کردار ادا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسے اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کرنے کا کیا حق ہے۔ کیا اسے ایسی سستی قسم کی عورتوں کے علاوہ کوئی باعزت عورت نہیں ملتی — وہ اس بات پر بیچ و تپ کھاتا۔ اور اگر سارہ صبورہ سی باعزت لڑکیاں علی احمد کے رنگین جال میں پھنس جاتیں تو بھی اسے غصہ آتا کیا اسے اپنی عمر کی عورتیں نہیں ملتیں۔ کیا اسے اس قسم کی سستی عورتیں نہیں مل سکتیں جو روپے کے عوض خریدی جاسکتی ہوں۔ ہر صورت میں اسے علی احمد پر غصہ آتا اور غصے کے بلنے اس کے جنسی پہلو میں اہل آجاتا اور پھر وہ چوری چوری سوچتا کہ عورت سے قرب حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے ایک واحد امید اور پھر ایک عمر رسیدہ عورت بالوں سے جھانکتی اور اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی۔ اسے اپنی طرف بلائی اور اس کا جی چاہتا کہ اس کی گود میں سر رکھ کر لادے۔ روتا رہے حتیٰ کہ جسم کا درد دور ہو جائے۔ ہڈیوں میں جو چوٹیوں سی چلتی تھیں پھٹک لیتی تھیں ان سے نجات حاصل ہونے میں جو تناؤ سا اسے پریشان رکھتا تھا وہ ختم ہو جائے لیکن دفعتاً وہ گود میں پڑے ہوئے محسوس کرتا کہ وہ اس بھرپور عورت کو جانتا ہے اس کی شکل و صورت مانوس سی دکھائی دیتی اس کے منہ سے ایک چیخ نکل جاتی۔ اور وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا اور پھر معدوم ہونے کی کوشش میں کھو جاتا۔

ہائے اہلی!

لیب کی بار جب وہ دولت پور میں آیا تو اس کے خیالات کی دنیا میں نئی تفصیلات کا اضافہ ہو گیا تھا بیٹھے بیٹھے اسی آواز اس کے کان میں پڑتی پیارے بھول نہ جانا جی۔ ایک

## تیم اور نیم

### قرب کی آرزو

اب کی بار دولت پور میں پہنچ کر اہلی کے خیالات اور حسیات بدل رہے تھے۔ اس احساسات میں نئی بیداریاں پیدا ہو رہی تھیں۔ خیالات میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ جسم میں تقاضے ابھر رہے تھے۔ اس کے دل میں عورت کے قرب کا شوق پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ اس چاہتا تھا کہ عورت کے قریب جائے۔ اسے قریب سے دیکھے اسے پیار کرے مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ آصفی سراج میں کسی عورت کے قریب جانے کا امکان نہ تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو اپنی جرأت کہاں؟ بہر حال اس کی خواہش تھی کہ کسی کی ہانہ پکڑ لے اور پھر رو دے۔ اس کو بچے کا خیال آتا جس سے سارنگی کی سرس گونجا کرتی تھیں۔ لیکن — اگر بھروسہ وہاں چلا بھی جاتا تو ان عورتوں کو دیکھ کر عجیب سی کراہت محسوس ہوتی جو لائین جلائے بیٹھی مردوں کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ درحقیقت وہ انہیں عورتیں ہی نہیں سمجھتا تھا۔ اس کو بچے میں پہنچے بغیر کسی عورت سے قرب ممکن نہ تھا کسی کو بلوریں پاؤں ہوئے دیکھتا یا کسی کو کھڑکی سے جھانکتے ہوئے ایک نظر دیکھ لیتا تو اسے اور بھی مضطرب کرتا۔ پھر عورت سے قرب کی آرزو کیسے پوری ہو سکتی تھی۔

پھر دفعتاً اسے ایک خیال آیا۔ ایک مکروہ بھیاںک خیال — اور وہ رزمیا مگر تھا اس کا مسلسل طور پر اس خیال پر لا حول پڑھنا بیکار تھا کیونکہ ابتداء سے ہی یہ خیال

اجل کے دولت پر آجانے سے ایلی کو ایک سہارا مل گیا کیونکہ اجمل نے وہاں پہنچنے ہی اپنے اثر و رسوخ سے علی احمد کے گھر سے ملحقہ چھو کا چوبارہ کرائے پر لے لیا اور ایلی کے لیے اجل کا گھر ایک نعمت غیر مترقبہ ہو گیا۔

ایک فائدہ یہ بھی ہو کہ اجل کے آجانے سے ایلی نے عیش کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے سے نجات پالی اب اسے پہلوان کی دوکان پر جا کر دودھ اور بن کھانے کی بھی ضرورت نہ پڑتی تھی۔

اگرچہ علی احمد نے ایک بار پھر — پرانے انداز کو اعلانِ اپنا لیا تھا شاید اس لیے کہ کشمیر کا سب اپنی تمام تر رعینیں کھو چکا تھا۔ اب علی احمد کو ان بل کھاتی ہوئی گلیوں سے گزر کر اتنی دور راجو کے گھر جانا نہیں پڑتا تھا بلکہ راجو خود ان کے میل آزادی سے آتی جاتی تھی اور علی احمد کا کمرہ ایک مرتبہ پھر وہی بام آبلو کا کمرہ بن گیا تھا جس ریزو کی گزیا جینٹی۔ اور نیشن کا بکتر بند سپاہی جنگ کے نعرے لگاتا اور پھر رنگین ہنسی کی آواز سنائی دیتی جسے سن کر عیش غصے سے بل کھاتی اور پھر انتقامی عیبی کھڑی میں جا کھڑی ہوتی اور آنسو پونچھ کر مسکرانے کی کوشش کرتی۔

اگرچہ اب بھی ایلی علی احمد سے ڈرتا تھا گھبراتا تھا لیکن اب وہ علی احمد کے کمرے سے غافل نہ تھا اب نہ تو اسے بوتل اٹھا کر کنوئیں پر جانا پڑتا تھا اور نہ ہی چینی ہوئی ریزو کی گزیا یا نیشن کے سپاہی کی آوازیں سننا پڑتی تھیں اس لیے کہ جب علی احمد کے کمرے میں میدان کارزار گرم ہوتا تو ایلی چپکے سے اجمل کے چوبارے میں جا بیٹھتا اور وہاں پہنچ کر گرمی سوچ میں کھو جاتا۔

### نہ جانے کیوں

نہ جانے کیوں عورتیں ریزو کی گزریوں کی طرح کیوں چپیں چپیں کرتی ہیں اور مرد نیشن کے سپاہی کیوں بن جاتے ہیں۔ کیا سبھی مرد نیشن کے سپاہی بن جاتے ہیں کیا سبھی عورتیں ریزو کی گزریوں کی طرح چپیں چپیں کرتی ہیں۔ ان کے منہ سے بچوں کی طرح لاڈ بھری توہلی باتیں کیوں نکلتی ہیں۔ ویسے عام بات کریں تو ان کا لہجہ بالکل صاف ہوتا ہے۔ ذرا تو تلاپن نہیں ہوتا آواز میں لہجہ نہیں ہوتا۔ ان امور کے علاوہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ علی احمد کس معیار کے مطابق عورتوں کو چننے تھے۔ مثلاً۔ وہ کور تھی۔ یہ راجو تھی۔ ان میں کوئی کشش بھی تو نہ تھی۔ کوئی بات بھی تو نہ تھی جسے قابل ستائش یا دلکش سمجھا جا سکتا۔ کیا حسن و خوبصورتی کی

طبع تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے جھلسلاتی۔ پھر ایک بامعنی ہنسی۔ واضح اور رنگین اور ہلکا۔ مڑمڑ کے دو گھٹنے جھتر جھک جاتے اور ایک لمبی سی مخروطی پر ہم انگلی فضا میں ابھرتی۔ ہمدردی جھم سے کوئی آجاتا اور منظر یوں بدل جاتا جیسے پتھر گرنے سے جھیل کے ساکت پانی میں رام کے ایوانوں کے دھندلے مگر حسین نقوش دفعتاً "پاش پاش" ہو جاتے ہیں اور چاروں طرف لڑنے اٹھنے لگتیں۔ پھر فضا میں چاروں طرف مرکزی دیوتا کے ٹخنوں پر لگے ہوئے ننھے بازو پھڑپھڑاتے بلوریں پاؤں رقص کرتے اور بل دہشہ اور مڑمڑ ایک زنانے سے اس کے قریب سے آ جاتے اور دور — دور ایک مدہم حسین آواز گنگنائی ہوئی سنائی دیتی "ہائے ایلی وہ جانے انتظار کر رہے ہیں۔" اس وقت ایلی چونکا اور شرم سے سر جھکا لیتا۔ ایک مبہم سا احساسِ جرم کے دل و دماغ پر چھا جاتا۔ دور ایک ننھی سی حسین عورت سفید آنچل پھیلانے اڑے جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ کہیں سر رکھ کر رو دے اتنا روئے کہ کوئی ہاتھ لپک کر اسے تھپکنے پر مجبور جائے۔ قریب ہی سے شریف کا مدہم قہقہہ گونجتا۔ ایلی محبت کرو۔ محبت کرو چاہئے کہ سے کرو محبت کرو۔ محبت کیے بغیر تم کچھ بھی نہیں؟ وہ اپنا سر خلاف میں گاڑ دیتا آنکھیں بند لیتا۔ نہیں نہیں میں مجرم نہیں ہوں میں جرم نہیں کروں گا۔ اور پھر نہ جانے کہاں سے بلوریں ہاتھ اس کی طرف بڑھتے اور ہمدردی بھرے لمس سے اسے تھپکنے لگتے اور وہ یوں — روتے سو جاتا جیسی کوئی بچہ کسی کھلونے کو حاصل نہ کرنے پر روتے روتے تھک کر سو جاتا۔

### چھو کا چوبارہ

خوش قسمتی سے انہیں دنوں ایلی کا بہنوئی اجل دولت پور میں آگیا۔ اسے دولت پور پھری میں ایک نوکری مل گئی تھی۔

ایلی کو اجل سے بہت ہمدردی تھی۔ کیونکہ کئی ایک پہلوؤں سے اس کی اپنی زندگی سے ملتی جلتی تھی اس کے علاوہ اجل نے اوائل عمر میں ہی بصرہ اور کابل سے دور دراز کے سفر کیے تھے جن کی وجہ سے اس کے دل میں اجل کی عزت پیدا ہو گئی تھی۔

اجمل اونچے لمبے قد کا لڑکا تھا جس کی قابلیت پر ایلی فخر محسوس کیا کرتا تھا اور سب سے کراے اجل کی رنگین طبیعت بہت پسند تھی۔ ہاجرہ کی کتہ چینی کے باوجود یا شاید اس لیے اسے اجل بہت پسند تھا اور وہ محسوس کرتا تھا کہ اجل اس کا دوست ہے۔

”کیا ہے۔ کیا ہے۔ چاروں طرف سے عورتیں راجو کی طرف لپکیں اور یک آن میں بھیڑ لگ گئی۔“

صرف وہ بڑھیا دور کھڑی چلاتی رہی۔ ”کیا پا کھنڈ چار کھا ہے تم دونوں نے۔ میں مرتا ہوں۔ میں مرتی ہوں اور مرتا کوئی بھی نہیں خڑے دکھانے شروع کر رکھے ہیں۔ میں کتنی ہوں یہ شخص کیوں آتا ہے اس گھر میں اور یہ مرنے جوگی اس سے کیوں ملتی ہے اس سے تو یہی بہتر ہے کہ مر جائے خس کم جہاں پاک۔“

”پاکل ہو گئی ہو ملں“ راجو چلائی ”لوکی بے ہوش ہے ہاتھ سے جارہی ہے اور تو کھڑی وعظ کر رہی ہے جیسے ککے سے آئی ہو۔“

”تو مجھے ملں نہ کہا کر ڈائن“ رحمن چیخی۔

راجو جیرانی سے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اس کے ٹوٹے ہوئے ہاتھ چھاتی پر پڑے تھے منہ خوف سے اور بھی بد نما ہو گیا تھا۔

راجو کے رخسار پھول رہے تھے جیسے باسی ڈبل روٹی میں اہل آگیا ہو۔

سیلز مین نے بڑھ کر راجو کو اٹھا کر بٹھادیا۔ سا جو نے اس کی مدد کی علی احمد نے سرسری طور پر سارا دیا لیکن بیٹھنے کی بجائے وہ ڈھیر ہو کر گر پڑی۔

یہ دیکھ کر علی احمد گھبرا گئے ”کانڈ کہاں ہے دوات دوات۔“ وہ چلانے لگے کچھ دیر تلاش کرنے کے بعد انہوں نے کانڈ اور دوات علی احمد کو دے دی۔ علی احمد نے کانڈ پر کچھ لکھا اور چادر میں لپٹا ہوا سیلز مین اسے لے کر بھاگا۔

چھوٹے کمرے میں رحمن کھڑی چلا رہی تھی قریب ہی سا جو غصے سے گھور رہی تھی۔ باہر دالان کے ایک کونے میں آجو سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس سے پرے ٹوٹی ہوئی کھات پر ایللی بیٹھا سوچ رہا تھا نہ جانے کیا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ راجو کیوں چارپائی پر ڈھیر ہوئی پڑی ہے اس کی مل جیٹی سے ہمدردی کرنے کی بجائے ان سب کو صلواتیں کیوں سنا رہی ہے اور علی احمد اس قدر گھبرائے کیوں ہیں۔

”ہمدردوازہ کھلا اور چادر میں لپٹے ہوئے سیلز مین کی آواز سنائی دی“ ڈاکٹر صاحب آگئے۔

”ڈاکٹر“ ایلانے دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔ کیس ڈاکٹر پہچان نہ لے۔ اس مکان میں دیکھ نہ

خصوصیات کے ویلے کے بغیر عورت بذات خود قابل حصول ہوتی ہے لیکن یہ کیسے ممکن ہے کچھ عورتوں کو دیکھ کر تو ایللی کو گھن آتی تھی۔

ایللی محسوس کرتا جیسے عورت ایک معصہ ہو ایک ایسا معصہ جو بند کمرے کے بغیر حل نہ ہو سکتا ہو اس خیال پر اسے شدید خواہش محسوس ہوتی کہ ایک بار اسے بھی کسی عورت کے بند کمرے میں بند ہونے کا اتفاق ہو اور اس کے رویہ بھی وہ اسرار کھل جائیں صرف ایک بار ایک بار۔

وہ راجو یہ راجو

ایک روز رات گئے جب ایللی گھر پہنچا تو علی احمد کے کمرے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹھکا کرے سے ٹین کے سپاہی کے نعروں اور ریڈیو گریا کی چیں چیں کی بجائے عجیب سی آوازیں رہی تھیں کوئی کراہ رہی تھی کوئی مدہم آواز میں ہمدردی جتا رہا تھا۔

ابھی وہ اپنے کمرے میں داخل نہ ہوا تھا کہ دھتتا“ علی احمد کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اسے ہنسی کھیاتی راجو کی جگہ نحیف و زوال راجو برآمد ہوئی۔ اس نے اپنا ہاتھ علی احمد کے کندے پر رکھا ہوا تھا اور بصد مشکل سہارے کر چل رہی تھی۔

”ایللی“ انہوں نے باہر نکلتے ہی ایللی کو آواز دی۔ ”ادھر آؤ ذرا۔ ہمارے ساتھ چلو۔“

”اس وقت اتنی رات گئے۔“ شمیم زیر لب بولی۔

”مزدوری کلام ہے ابھی لوٹ آئیں گے۔“ انہوں نے بے رخی سے جواب دیا ”چلو ایللی“

”اس بچارے کو کیوں ساتھ خراب کرتے ہو۔“ شمیم نے کہا۔

”چلو ایللی“ علی احمد نے شمیم کی بات نہ سنی قائلہ چل پڑا۔ برقعے میں لپٹی ہوئی راجو علی احمد کے ساتھ گھٹ گھٹ کر چل رہی تھی۔ اور علی احمد نے اسے یوں سہارا دے رکھا تھا جیسے بیمار ہو پیچھے پیچھے ایللی سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا نہ جانے کیا بات ہے۔ نہ جانے کمرے سے یہ کون

راجو نکل ہے۔ راجو ایسی تو نہ تھی۔ وہ تو کتر کتر باتیں کیا کرتی۔ آنکھیں مشکاتی خڑے کر لیں۔ راجو تو روٹی روٹی سی تھی۔ نہ جانے وہ کدھر جا رہے تھے۔ کیوں جا رہے تھے اور چلے

راجو گھٹ گھٹ کیوں رہی تھی راجو اپنے گھر پہنچ کر دھڑام سے چارپائی پر گر پڑی اور علی احمد نے دوسری چارپائی کے قریب کھڑے ہو کر چلانے لگے۔ ”رحمن دوڑو دوڑو۔ دیکھو راجو کو کیا

ہو جائے۔ کل صبح مجھے اطلاع دینا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ایک بار پھر سب نے چھوٹے کمرے کی طرف یورش کر دی اور وہاں لڑنے جھگڑنے لگے نہ جانے کیا بات تھی جس پر وہ جھگڑ رہے تھے۔ بڑھیا چلا چلا کر رو رہی تھی۔ جیسے غصے سے بھررا ہوا بلڈر پھٹ گیا ہو۔ ساجو طعنے دے رہی تھی۔ سیلزمین شاید اپنے ذریعہ تجارت کو تباہ ہوتے دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔ اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی اور علی احمد اسٹراب میں ٹہل رہے تھے جیسے وہ کمرہ ایک صحرا ہو۔ ہاتھ کولہوں پر رکھے ہوئے تھے ٹوپی ماتھے پر الٹی ہوئی تھی۔

آہستہ آہستہ شور کم ہوتا گیا۔ بڑھیا کی ہچکیاں مدہم پڑ گئیں ساجو کے طعنے نفرت بھری نگاہ تک محدود ہو گئے۔ آج دروازے کے باہر چوکھٹ کے قریب سہمی ہوئی کھڑی تھی اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

دیر تک خاموشی طاری رہی۔ رحیم راجو کی کونٹھری میں جا کر لیٹ گئی۔ آج باہر کھاٹ پر ڈھیر ہو گئی ساجو پاندان سامنے رکھے بکری کی طرح جھگی کرتی رہی علی احمد ویسے ہی گھبراہٹ بھرے انداز میں ٹٹلتے رہے پھر راجو کراہنے لگی علی احمد اور ساجو دوڑ کر اندر چلے گئے کچھ دیر کے بعد وہ دونوں باہر نکلے۔ ساجو کو لمبے منکاتی ہوئی باہر نکلی۔ پھولے ہوئے جسم میں سفید سفید دانت اور آنکھیں چمکیں۔ پیچھے پیچھے علی احمد تھے ایلی کو دیکھ کر وہ چونکے۔

"تم۔ تم یہاں تم۔" جیسے وہ ایلی کو ساتھ لانے کی تفصیل بھول چکے ہوں "اچھا اچھا خیر۔" دفعتاً وہ گھبرا کر رک گئے۔ "اب اس وقت تو گھر جانا ٹھیک نہیں۔" انہوں نے ایلی سے کہا "رات بہت گزر چکی ہے۔ بیس لیٹ کر سو رہو۔ صبح سویرے چلے جائیں گے۔"

### زہر

علی احمد کے انداز میں غیر معمولی ملائمت پیدا ہو گئی تھی نہ جانے کیوں؟ "اور دیکھنا" علی احمد اس کے قریب بیٹھ کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے "گھر جا کر یہ نہ کہنا کہ راجو بیمار تھی۔ کہ راجو نے زہر کھالیا تھا۔"

زہر — ایلی سکتے میں رہ گیا۔ کیا واقعی راجو نے زہر کھالیا تھا۔ مگر کیوں کیا اسے علی احمد سے محبت تھی؟ کیا راجو بھی محبت کی اہل تھی لیکن۔ وہ سیلزمین اور وہ دس کانٹ جو اس روز وہ راجو کے لیے لایا تھا۔ اس کی وہ نگاہیں جو اس نے غلام محمد پر ڈالی تھیں۔ نہیں اسے محبت نہیں

لے لیکن علی احمد علی احمد بھی تو اسی گھر میں تھے اور علی احمد کا کیا ہو گا۔ اگر علی احمد کو ہوا پہچان لیا تو۔

علی احمد کھیانی ہنسی ہنس رہے تھے "ہی ہی ہی ڈاکٹر صاحب مریضہ بے ہوش ہے کہ سے یونہی پڑی ہے۔" "اسے اندر لے چلو۔" ڈاکٹر نے کہا۔ اور وہ سب راجو کو اٹھانے کے دوڑے۔

### بوکار یلا

اس دوران میں ساجو آگئی اور ایلی کے قریب بیٹھ کر پان لگانے لگی اندھیرے میں اس سفید دانت چمک رہے تھے۔

"گڈی گڈے کا کھیل بنا رکھا ہے انہوں نے۔" اس نے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا "اپنا ہی ہوش ہے دوسرے جائیں جنم میں اب تم ہی بتاؤ انہیں ایسا کرنا چاہئے تھا کیا۔" گئی۔ پھر آپ ہی آپ بولی۔ "راجو کے خصم کو پتہ چلا تو کیا ہو گا۔ اسی بات کا خیال ہونا چاہیے انہیں دولت پور میں وہ کونسا چوک ہے جہاں ان کی باتیں نہیں ہو رہی ہیں۔ کیوں نہ ہوں ڈھنک سے بات کریں تو ہے۔ ناوہ ایک رات بھی اس کے بغیر نہیں رہتی اور اگر وہ بھی یہ بڑھاپوں کی طرح بلکنے لگتا ہے۔ اور رہی سہی بات اس بڑھیا نے ڈبو رکھی ہے کولہوں پر رکھ کر چیختی ہے جو کسی نے نہیں سنی بات تو یہ اللہ کی بندی اسے بنا کر رہے گی۔ پان لگے۔" وہ ایلی کے قریب سرک آئی۔

قریب بہت ہی قریب ساجو کے میلے دانت چمکے بوکا ایک رپلا آیا۔ ایلی نے محسوس کیا اسے کسی گندے نالے میں دھکیل دیا گیا ہو۔ جہاں گلے سرے گوشت کا ڈھیر لگا ہوا۔ لالہ اٹھ بیٹھا۔ "پان تو کھالے" ایک سیاہ بازو اس کی طرف لپکا۔ "نہیں نہیں۔" ایلی نے کچھ کہنے کی کوشش۔

"کانٹا ہے کیا۔" وہ عجیب انداز سے بولی "اچھا بیٹھ تو جا۔" اور وہ اس سے دور ہٹ چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔

### نیا عقدہ

چھوٹے کمرے کا دروازہ کھلا ڈاکٹر باہر نکلتے ہوئے بولا "اسے اکیلے پرارہنے دلا۔"



نفرت سے ایلے نے منہ موڑ لیا آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن وہ گنگناہٹ لکھ بہ لکھ نقل ہوئی گئی جیسے کوئی آہستہ ایک ایک کر کے کپڑے اتار رہا ہو۔ پھر چارپائی کھینچنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ اسے کسی ریڑ کی گڑیا کی چیس چیس سنائی دے رہی تھی۔ اس کی نگاہوں تلے ٹین کا سپاہی ابھر رہا تھا۔ — بڑھ رہا تھا۔

جاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اس نے بہت بڑا جرم کیا ہو جیسے اس نے ہمیشہ کے لیے آپ کو قعرِ زلت میں دھکیل دیا ہو اور وہ تسخّر اور تحقیر سے بھرا ہوا قعر۔ کیا یہی عورت کا قرب تھا کیا علی احمد کو اسی قرب کا شوق تھا۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا؟ عورت کے قرب کا مطلب غلامی کے جوہر میں ڈبکیں کھانا نہیں ہو سکتا۔ نہیں نہیں۔

کئی ایک دن وہ اس نائٹ میئر کے تاثرات میں کھویا رہا اس کے دل میں صرف ایک خیال تھا کہ وہ عورت کے قرب کے قابل نہیں اس میں وہ اہلیت ہی نہیں درنہ وہ تسخّر و تحقیر جس کی وجہ سے وہ ایک کیڑے کی طرح ریٹکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

نہیں نہیں۔ شریف کی آواز سنائی دیتی۔ یہ نہیں محبت کرو محبت پھر وہ دیوانہ وار ادا کر دے گا۔ گھومتا کس سے محبت کروں۔ کیسے محبت کروں اور اس کے دل میں جستجو کی ایک لہر دوں۔ جاتی۔

### بے زاری

دولت پور میں اب ایلچی کی زندگی نے ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس کے صبح و شام ایک مخصوص ڈگر پر چلنے لگے تھے کالج اس کے لیے دلچسپی سے خالی تھا۔ اگرچہ اب وہ کالج جانے سے بالکل نہ گھبراتا۔ لیکن اس کی توجہ تعلیم کی طرف مبذول نہ ہوئی تھی۔ اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ تحصیل علم کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔ ایلچی کے لئے کالج محض ایک تفریح گاہ تھی۔

کالج سے واپس آتے ہی وہ کتابیں گھر میں پھینک کر اجہل کی طرف چلا جاتا اور وہاں کسی نہ کسی مشغل میں مصروف ہو جاتا۔ گھر میں تو کوئی ایسی بات نہ ہوتی تھی جو اس کے لئے جاذب توجہ ہوتی۔

علی احمد حساب کار رجسٹر پر کرنے میں مصروف رہتے یا کسی نہ کسی بات پر غم سے جھگڑا شروع کر دیتے۔ غم دو ایک منٹ جینتی چلاتی ہاتھ چلاتی اور پھر تھک کر روتا شروع کر دیتی۔ اسے دوتا دیکھ کر اس کی دونوں بچیاں چیخنے لگتیں اور گھر میں کھرام مچ جاتا۔

راجو آجائی تو علی احمد کی حساب کتاب سے دلچسپی ختم ہو جاتی۔ رجسٹر بند کر کے وہ راجو کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ بات بات پر ہنسنے چمھاتے۔ نہ جانے کیوں راجو کے آنے پر وہ ہلانے ہلانے غم کو ہلاتے اس سے کچھ پوچھتے یا اس کی تعریف کرتے۔ شاید غم کو تنگ کرنے میں مزا

وہ بلوریں پاؤں واقعی اس قابل تھے کہ ان سے محبت کی جائے لیکن اسے اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ وہ پاؤں کس کے ہیں۔ وہ کون ہے جو ان پاکیزہ پاؤں کی مالک ہے۔ اس نے کئی بار دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر تنگ پاجامہ ایک سیاہ آنکھ اور دو بلوریں پاؤں کے علاوہ اسی کچھ دکھاتا نہ دیتا تھا۔

ان حالات میں محبت کرنا کیسے ممکن تھا اس بھیا تک خواب کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ اس کے دل میں عورت کے قرب کا خوف جاگزیں ہو گیا اور اپنی نا اہلیت کا خیال یقین کی حد تک متھم



علی احمد اے چٹکیوں میں اڑا کے لیٹ جاتے۔

”ٹھیک ہے“ وہ کہتے ”تو لڑنا چاہتی ہے تو میں ضرور تیری خواہش پوری کروں گا لیکن حق کی چلم بے بغیر لڑنا نہ بھی یہ مشکل ہے تو ذرا چلم بھر دے پھر لڑیں گے کیوں نہیں لڑیں گے تو چاہے اور ہم نہ لڑیں۔ بھی واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس پر شمیم روتے ہوئے چلم بھرنے لگتی اور علی احمد کپڑے بدلتے ہوئے گنگنانے لگتے۔

### گزشتہ خفت

جب بھی علی احمد باہر جانے لگتے تو ایلی گھبرا جاتا کہ کیس علی احمد کو اسے ساتھ لے جانے کا خیال نہ آجائے۔ ان کے ساتھ باہر جانے سے وہ ڈرتا تھا۔ اس مکان سے ڈرتا تھا جہاں اس نے وہ رات بسر کی تھی۔ اس سیاہ فام عورت سے ڈرتا تھا جس کا تحقیر بھرا قہقہہ اب تک اس کے کانوں میں گونجتا تھا۔ وہ اس قرب سے ڈرتا تھا جس کا وہ ایک بار سزاوار ہو چکا تھا۔

علی احمد باہر جانے لگتے تو وہ گھبرا جاتا۔ راجو ان کے گھر آتی تو وہ چپ چاپ دبے پاؤں باہر نکل جاتا۔ راجو کی زیر لب مسکراہٹ سے اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ ایلی کی گزشتہ خفت سے کماحقہ واقف ہو جیسے وہ جانتی ہو جانے بغیر سمجھتی ہو جیسے ساجو نے اسے اس تمسخر بھرے قہقہے سمیت ساری بات بتا دی ہو۔ اس کی مسکراہٹ ایلی کے سینے میں دھار بن کر اتر جاتی اور وہ محسوس کرتا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔

”اچھا تو جناب بھی اس میں ان میں قدم رکھتے ہیں۔ واہ واہ بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر۔“ اس پر وہ گزشتہ خفت از سر نو اس پر طاری ہو جاتی۔

کبھی تو راجو کو دیکھ کر ایلی کے دل میں ایک عجیب سی وحشت بیدار ہو جاتی اور اس کا دل ہلکتا کہ بڑھ کر اس کی فیض تار تار کر دے اور پھر چلا چلا کر کہے ”میں تمہیں جانتا ہوں تم جو تک ہو جو تک۔“ پھر وہ لاجول پڑھ کر اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی کوشش میں کھو جاتا اور بالاخر چپکے سے گھر سے باہر نکل جاتا۔ بیڑھیاں اترتے ہوئے اسے شریف کی ہنسی کی آواز سنائی دیتی ”نہیں نہیں ایلی محبت کرو محبت۔“

تین راتیں

ایک روز راجو کے آنے پر جب وہ دبے پاؤں بیڑھیاں اتر رہا تھا تو علی احمد نے آواز زد

آتا ہو یا شاید اس کی وجہ ان کی ازلی تماش بینی ہو۔ راجو کو دیکھ کر غصے کی وجہ سے لم آنکھوں کا فرق بے حد نمایاں ہو جاتا اور اس کی شکل و صورت بالکل ہی مضحکہ خیز ہو جاتی۔ بلاآخر ٹین کا سپاہی قلعہ بند ہو جاتا اور کشمیر کا سیب انتقام ”لمحقہ کمرے کی عقبی کونجی“ نلک جاتا۔ بند کمرے میں ریڑ کی گزیا چینی اور مٹی کا پہلوان گرتا اور پھرا۔ ستودہ ہو جاتا پھر گزیا۔ ستودہ ہو جاتا۔ گزیا تالیاں پیٹتی قہقہے لگاتی۔ نیچے سڑک سے گزرتے ہوئے لوگ ان کی قسموں کو سن کر رک جاتے پھر پڑاؤ کی دوکان پر بات چل نکلتی۔

”ہاں میاں روج آوے ہے اس چو بارے والے پاؤ کے پاس۔“

”ٹھیک کہے ہے یہ میں آپ دیکھے ہوں روج میاں سے گجرتے دے۔ میاں آکر اچھ جھکالے ہے میں نے کبھی نہیں جتایا۔“

”کیا کیا میاں اس چو بارے ماں۔“ ارے نہیں بھائی عقل کی بات کرو۔“

”ارے ماں کھوب جانوں یہ چو بارے والا پاؤ بڑا گھاگ ہے یہ پاؤ۔ چار روج ماں نماں

اس نے اب وہ چلاوا پناہ ہے۔ چلاوا۔“

شام پڑتی تو راجو رخصت ہو جاتی اور علی احمد پھر سے رجسٹر کھول کر مصروف ہو جاتا۔ جب رات کے آٹھ بجتے تو وہ آپ ہی آپ گنگنانے لگتے۔ ”افو مجھے تو آج انسپکٹر صاحب بلایا تھا۔ یاد ہی نہیں رہا۔ حافظہ کس قدر کمزور ہو گیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ باہر جانے کے کپڑے پہننے لگتے۔

چار ایک منٹ بل کھانے کے بعد شمیم گویا اپنے آپ سے کہتی ”جیسے میں جانتی ہی ہوں ان کے انسپکٹر صاحب کو۔“

علی احمد ہنس پڑتے ”تو تو بالکل بگلی ہے راجو کی طرف جانا ہوتا تو چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔“

”توبہ اتنا بڑبڑ بھی نہ ہو کوئی چوری اور پھر سینہ زوری شرم نہیں آتی۔“ شمیم جواب دیتی ”بے وقوف شرم تو عورتوں کے لیے ہے۔“ وہ ہنسنے لگتے۔ ”مردوں کے لیے نہیں۔“

اس پر شمیم خاموش ہو جاتی اور چھوٹے کمرے سے سکیوں کی آواز آنے لگتی ”نہیں ابھی آیا۔“ کہہ کر علی احمد باہر نکل جاتے اور پھر آدھی رات تک راجو کے میاں پڑے رہ جاتے۔ واپسی پر گھڑی دو گھڑی تو میاں بیوی کی لڑائی ہوتی۔ شمیم بات بدھانے کی کوشش کرتا۔

دولت پور کا پناہ میں ہی ہوں کیا سمجھا ہے تم نے جہاں میرا جی چاہے جاؤ گی جس کے ساتھ جی چاہے رہوں گی کر لو میرا جو کرتا ہے۔“ اور دور پیچھے ایلی یوں چلا آتا جیسے بازار سے کوئی سودا خریدانے کے لیے جا رہا ہو اور اسے اس میلے برقعے میں لمبوس ٹھک ٹھک کرتی ہوئی عورت اور چہرہ نگاہوں والے مرد سے کوئی تعلق نہ ہو۔

اس روز ان کے پیچھے چلتے ہوئے وہ دعائیں مانگ رہا تھا یا اللہ کہیں وہ اس گھر میں نہ جا رہے ہوں جہاں میلے پنڈے کی بو کے ریلے آتے ہیں اور وہ سیاہ گوشت میں میلے دانت۔ وہ اس کے رو برو کیے جانے کا نہیں نہیں۔

موز پر جا کر علی احمد رک گئے۔ ”اچھا راجو تو چل گھر۔ لیکن جلد اس جگہ پہنچ جائیو۔ سبھی ہم انتظار کریں گے۔“

اچھا کہہ کر راجو چلی گئی اور علی احمد اور ایلی مڑ کر دوسری سڑک کو ہو لیے۔ کئی ایک راستوں سے ہوتے ہوئے بالاخروہ ٹاؤن ہال میں داخل ہوئے جہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔

### بے بی شو

”آؤ ایلی آؤ یہاں آج بے بی شو ہے۔“ علی احمد نے ایلی کی طرف دیکھا ”ارے بے بی شو نہیں جانتے اور کہنے کو کالج میں پڑھتے ہو۔“ وہ سننے لگے ”واہ یہ بھی لا جواب بات ہے۔ دیکھو بے بی کا مطلب ہے بچہ یعنی دودھ پیتا بچہ یعنی وہ بچہ جو ماں کا دودھ پیتا ہے آج یہاں ان بچوں کا شو ہو گا میو ہل ہال میں جو بچہ سب سے زیادہ سندرست ہو گا اسے انعام ملے گا۔ یعنی یعنی۔“ وہ لوہر اوہر تکتے ہوئے کہنے لگے۔ ”یہ بچوں کی نمائش ہے سمجھو اور سرکار یہ نمائش اس لیے موز کر رہی ہے تاکہ لوگوں کی توجہ بچوں کی صحت کی طرف مبذول ہو۔ ہی ہی ہی۔“ وہ نہ جانے کس کی طرف دیکھ کر رہے۔ اور پھر اپنا لیکچر شروع کر دیا۔

”ہل تو کیا کہہ رہا تھا میں۔ ہال بے بی شو۔ شو کا مطلب ہے۔ مظاہرہ مطلب ہے دکھانا۔ سی یعنی ایس ڈسٹنسی۔ مطلب دیکھنا اور سی سے شو۔ یہ ٹاؤن ہے۔ سمجھو۔“ پھر خاموش ہو گئے۔

”ہل تو کیا کہہ رہا تھا میں۔“ وہ پھر کسی طرف دیکھنے لگے۔

حفظان صحت اور زچہ و بچہ کا لیکچر تو محض جملہ معترضہ تھا۔ مطلب تو یہ تھا کہ اس احاطے

”ایلی۔ جانا نہیں۔“

وہ رک گیا اس کا دل دھک دھک کرنے لگا ”نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ میں لاپس نہیں جاؤں گا۔“

”ایلی اوہر آؤ۔“ علی احمد نے پھر آواز دی۔

راجو اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی ”اب تو نظری نہیں آتا ایلی۔“ اس نے لاڈ بھرے لہجے سے کہا ”جی نہیں چاہتا تیرا ملنے کو۔“ ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ بات طنز ”کئی گئی ہو۔“

”ایلی ذرا ہمارے ساتھ چلنا ہے تمہیں۔ ابھی چلتے ہیں ذرا ٹھہرو“ علی احمد بولے۔

”میں نہیں جاؤں گا۔“ ایلی نے با آواز بلند کہنے کی ناکام کوشش کی۔ اور پھر اپنی بے بسی بل کھا کر خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد علی احمد تیار ہو گئے ”چلو ایلی“ وہ بولے اور پھر علی احمد راجو اور ایلی سڑکیاں اترنے لگے۔

علی احمد اور راجو کے ساتھ دولت پور کے بازار سے گزرتا ایلی کے لیے بہت بڑی ٹل تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ پنواڑیوں کی دوکانوں پر کھڑے لوگ ان کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے تھے۔ ان کے متعلق زیر لب باتیں کرتے تھے۔ اس وقت ایلی کی حیثیت سلیزمن کی سی ہو رہی تھی۔ اسے یہ بات بے حد ناگوار گزرتی لیکن وہ کبھی کیا سکتا تھا۔ وہ تینوں راہ گیر عجیب انداز سے چلے جا رہے تھے۔

علی احمد کو تو لوگوں کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہوتا تھا راہ چلتے ہوئے انہوں نے کبھی رہنبروں یا پنواڑیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ انہیں اوہر دیکھنے کی فرصت ہی نہ ہوتی وہ تو گردن اٹھا کر چلنے کے عادی تھے اور ان کی گردن کا زاویہ ایسا ہوتا تھا کہ سڑک لگا او جھل رہتی بلکہ مکانات کی مٹلی منزل کی طرف دیکھتا۔

ان کے لیے ممکن نہ رہتا اور دو رویہ بنے ہوئے چوباروں یا کونٹوں کو منڈیروں کی طرح دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھے جاتے۔ ان کے عقب میں راجو برقعہ پہنے ہوئے گرگلی جالوں یوں چلتی جیسے وہ دولت پور کی راجو نہیں بلکہ کوئی اور ہی ہو جیسے اسے کوئی جانتا ہی نہ ہو۔ اس کے باوجود کبھی کبھی اس کا سینہ تن جاتا قدموں میں شوخی لہراتی اور جالی کے پیچھے سے لپکتی جیسے اس کا جی چاہتا ہو کہ ان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے والے لوگوں سے کہے ”میں ہی“

”ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگا ”ہاں ہاں استغنے دینے ہی کو تو کہتے تھے۔“

”اور۔ اور تم نہیں ہوا بھی۔“

”ہم بھی جا رہے ہیں۔“ وہ بولی۔

”اوہ تو تم بھی جا رہی ہو۔ اس سلسلے میں میری مدد کی ضرورت ہو تو بلا روک ٹوک کہو۔“

اتنا صاحب اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہمارے پرانے دوست ہیں اور پھر خاندانی تعلقات ہیں ہی ہی۔“

جھوٹ جھوٹ۔ ایلی کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی مکڑا اپنے پنجے پھیلا رہا ہو ہی ہی ہی کے تار سے جال بن رہا ہوں اور کبھی قریب ہوئی جا رہی ہو اور قریب۔

ایلی کو اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ علی احمد چھوٹی سی لڑکی سے بھی ہی ہی کیے بغیر نہ رہے۔ کتنی چھوٹی عمر تھی اس کی جب کہ وہاں علی احمد کے برابر کی عورتیں موجود تھیں پھر۔

شاید وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ لڑکی کسی نوجوان کی توجہ کے لائق تھی۔ پھر دفعتاً اسے سارہ اور عبور یاد آ گئیں اور اسے غلی احمد کی آواز سنائی دی۔ سارہ سو گئی کیا۔ ہی ہی۔

”شراب نہیں تسلیم“ علی احمد اسے بھر مار رہے تھے ”ہاں ہاں برقعہ اٹھا لو کیا حرج ہے۔ ڈرو نہیں۔ ہم جو تمہارے ساتھ ہیں۔“

دفعتاً سفید رنگ کا ایک دمبہ ایلی کی آنکھوں تلے ابھرا اور گھٹکھریالے بالوں کی ایک لٹ لٹائی اور اس نے گھبرا کر نگاہیں نیچی کر لیں۔

علی احمد کو تسلیم کی کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے شدید صدمہ محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا دل مسل رہا ہو۔ ایلی کی نگاہوں میں وہ نمائش دھندلی پڑ گئی۔ بے بس فیسے اس نے علی احمد کی طرف دیکھا اور پھر مٹھیاں بھیج کر چل پڑا جیسے اس کے دل میں ایک نرم قائم ہو چکا ہو۔ جیسے اس نے ایک فیصلہ کر لیا ہو۔

”نہیں نہیں میں اسے سارہ نہیں بننے دوں گا۔ اس کی زندگی تباہ نہیں ہوگی۔ اسے اپنی عمر راہب خانے میں بسر نہیں کرنی پڑے گی نہیں نہیں“ وہ چلا رہا تھا۔ اس کے گرد لوگ شور مچا رہے تھے ٹانگے والے چلا رہے تھے۔ عورتیں سینے سے بچے چٹائے بھاگی جا رہی تھیں لیکن اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ ایک ارادہ تھا۔ سامنے شریف مسکرا رہا تھا ہاں۔ ایلی

میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے کے بجائے ارد گرد کے مجمع میں کسی کو ٹاکا جائے۔ ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے بچوں کے ہمانے وہ عورتوں کی نمائش ہو اور پھر دولت پور کی عورتیں بھی تو ایسی اچھی تھیں ان میں وہ امرتسر اور لاہور والی بات ہی نہ تھی۔ سیاہ رنگ کی دہلی پٹلی عورتیں جن کی ہاں نما ٹانگوں پر میلے تنگ پاجاموں کے غلاف چڑھے تھے اور جن کی گودیوں میں انسانی دھلچلے لٹ رہے تھے۔

ہر جیلے کے بعد علی احمد چاروں طرف دیکھتے اور ہر برقعہ پوش کو نگاہوں سے ٹٹولتے پھر اسے قول رہے ہوں اور پھر ہنسنے لگتے۔

”ہی ہی ہی۔ تم انفیٹ مارٹیلٹی کو بھی نہیں جانتے تمہیں کالج میں پڑھانے کیا ہوں وہ۔ دیکھو ہم تمہیں سمجھاتے ہیں۔“ ”آئیے خان صاحب آئیے۔ کسے مزاج کیسے ہیں۔“ وہ ایک اجنبی سے کہنے لگے۔ ”ہاں ہاں میں ایلی کو سمجھا رہا تھا کہ انفیٹ مارٹیلٹی کے کئے ہیں بچے کو باتیں سمجھانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے ایسے تہوار دکھائے جائیں۔ ہی ہی۔ اور خان صاحب کے جانے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ ہاں ٹاکا کہہ رہا تھا۔ میں یعنی مطلب ہے۔“

ایلی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مطلب کیا ہے اور وہ چاہتا تھا کہ چلا چلا کر لوگوں پر واضح کر دے کہ مطلب کیا ہے بلکہ خود انہیں بتا دے کہ وہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ مطلب کیا ہے۔

## سفید دھبہ، بھوری لٹ

”ہائیں تم ہو تسلیم۔ تم۔“ علی احمد ایک اچلے برقعے کی طرف بڑھے تم یہاں۔“ برقعہ پٹا گھبرا کر رک گئی۔ ”تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ ہی ہی ہی۔ وہ ہنسنے لگے ”بھئی میں علی احمد ہوں علی احمد اپنے آغا صاحب اور میں دونوں ایک ہی دفتر میں تو تھے۔ آج کل کہاں ہیں صاحب۔“

”امرتسر گئے ہوئے ہیں۔“ ایک باریک سی سسی سی آواز سنائی دی ”ہاں ہاں امرتسر ہی ہوں گے انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا ہی ہی ہی۔“

”پرانے دفتر سے چھٹی لی ہے کیا۔“

”استغنے دے دیا ہے۔“

## کچھ نہیں سے..... بہت کچھ

اس جلوئے کے بعد ایللی کا دولت پور میں رہنا قطعی طور پر ناممکن ہو گیا اس نے وہ آخری مہینہ بڑی مشکل سے گزرا۔ اب اس کی نگاہ میں علی احمد کی حیثیت ایک راکش کی رہ گئی تھی جس کا کام صرف یہ تھا کہ سیٹاؤں کو اپنی لٹکا کی بجھٹ چڑھلوے اور راجو سا جو تو غلط ڈھیروں کے سوا کچھ نہ تھیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے ایللی کو گھن آنے لگی تھی۔

البتہ اب جب غم عقی کھڑی کا سارا لیتی تو ایللی کو غصہ نہ آتا بلکہ اس کے دل میں ہمدردی کی ایک لہر دوڑ جاتی پجاری جو اس خوفناک لٹکا میں بیکار بے مصرف مقید تھی۔ جو جھوٹے ساروں پر اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھی جس کے لیے زندگی صبح و شام کے توازن کے سوا کچھ نہ تھی۔

ایک ماہ کے لیے کالج میں امتحان کی تیاری کے لیے چشیاں ہو چکی تھیں ایللی کتابیں لے کر اجمل کے پلگ پر پڑ جاتا۔ ایک گھنٹہ ریالی لٹ اس کی آنکھوں تلے لٹکتی۔ ایک سفید سادہ چاند کی طرح چمکتا اور وہ چھت کی طرف ٹھنکی پاندھ کر بیٹھ جاتا اور نگاہوں کو مست بنانے کی شدید کوشش کرتا چھت سے شریف کی تجسم آواز آتی۔ تم محبت کے بغیر کچھ بھی نہیں ایللی۔ کچھ بھی نہیں۔ اور وہ محسوس کرتا کہ وہ بہت کچھ ہے بہت کچھ۔ پھر اسے امتحان دینے کیلئے اجلا ریاست میں جانا پڑا۔

## ریاست اجلا

اجلا ایک ویران شہر تھا۔ جس میں یہاں وہاں آبادی کے گلزے تھے۔ اور کہیں کہیں خوبصورت محل اور بنائے تھے۔ اجلے کا بڑا بازار کا ایک وسیع اور غلط کوچہ تھا جس میں سیاہ فام چمٹ و چھالاک قسم کے لوگ ادھر ادھر گھومتے پھرے تھے۔ جن کی زبان کچر کچر چلتی اور جن کی آواز میں نہ تو دلی کی سی رعینگی تھی اور نہ لاہور کی سی مٹھاس۔ باتوں میں عجیب سی کرختگی تھی۔ انداز میں عمومیت سی تھی جن کی باتیں گویا بنگلی تھیں۔ بھونڈی اور بنگلی۔ اس بازار کے ادھر ادھر پرانی وضع کی بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ جن پر دیرانی اور اواسی

ہاں۔ محبت کرو۔ چاہے کسی سے کرو لیکن محبت کرو۔

## اچھا تو

گھر پہنچ کر وہ دھڑام سے چار بائی پر گر پڑا غصے اور بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو گئے۔ ان آنسوؤں کے دھندلکے میں شریف تحسین بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "کچھ بھی نہیں۔" کے بغیر تم کچھ بھی نہیں ایللی۔" ایللی تم رو رہے ہو۔ علی احمد سے اجمل دفتر سے آیا تو ایللی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ "ایللی تم رو رہے ہو۔ علی احمد سے ہو گئی کیا۔"

"نہیں تو۔" وہ بولا۔

"تو کیا غم نے کچھ کہا ہے۔"

"نہیں تو" ایللی کی بچی نکل گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ اس بچکیاں کیوں نکل رہی ہیں۔ اس کی کوئی وجہ بھی تو نہ تھی مگر اس کے باوجود وہ چاہتا تھا کہ کے کندھے پر سر رکھ کر رو دے اس کا دل چاہتا تھا کہ راز دارانہ انداز میں اجمل کو ایک لے جائے اور اس سے کہے "مجھے محبت ہو گئی ہے۔ اب میں کیا کروں۔"

ایللی بار بار کوشش کرتا کہ اپنی محبوبہ کے تصور میں کھو جائے لیکن ایک سفید سادہ بھورے بالوں کی گھنٹہ ریالی لٹ کے سوا کوئی اور تفصیل اس کے تصور میں نہ آتی بلکہ یہ تھا بھی دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ کتنا پیارا نام تھا اس کا تسلیم۔ اور آواز۔ کتنی میٹھی کتنی رنلا۔ ایللی کی باتیں سن کر اجمل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی "ہوں" اس نے ایک آواز کہا۔ "اچھا تو ایللی کو محبت ہو گئی ہے۔" اتنا کہنے کے بعد وہ کسی خیال میں کھو گیا اور آٹھ آنکھوں تلے نجو کا بلوریں جسم منور ہو گیا۔ نجو البزرقاصہ جو اس کے باپ کے واسطے جاگتا تھا تھی اور جسے اس نے کئی ایک سال آنکھوں کا تار بنائے رکھا تھا۔ وہ نجو جس کو بھلانے کا اس نے بھرے کی خاک چھانی تھی اور کابل کی پہاڑیوں میں پناہ لی تھی اور جسے بھولنے کی کوشش میں وہ اب تک ملحقہ چوباروں میں نہ جانے کس کی تلاش کیا کرتا تھا۔



”جی۔“  
مجید جوان سب میں شوخ طبیعت کا لڑکا تھا چلا کر کہنے لگا ”وہ جو بوڑھا اور نوجوان لڑکی وہاں  
بٹار کے ہیں۔“  
”اس نے اندر باغیچہ کی طرف اشارہ کیا۔“ وہ کیوں بیٹھے ہیں جی۔“  
باغیچہ کے اندر ایک کونے میں ایک بوڑھا اور اس کی نوجوان بیٹی چپ چاپ گھاس پر بیٹھے  
تھے۔  
سنتری مسکرایا ”تم کون ہو بھئی۔“ وہ بولا ”ہندو ہوا مسلمان“ ”الحمد للہ“ مجید نے شوخی سے  
کہا۔

سنتری قریب آگیا ”تم نہیں جان سکتے یہ بات۔“ اس نے مسکرا کر راز دارانہ انداز سے کہا  
”یہ کام تم کر سکتے ہو نہ جان سکتے ہو۔ یہ بڑھا بڑی امید لے کر مہاراج کے دربار میں آیا  
ہے۔“

”تو کیا یہ جو اس کے ساتھ لڑیا ہے اس کی امیدیں ہیں۔ الطاف نے اس گوری نوجوان لڑکی  
کی طرف دیکھ کر کہا جس کی نگاہ خمار آلود تھی۔

”ہاں۔“ سپاہی ہنسا ”اس لڑکی کو اس نے ۱۲ سال تک گائے کا دودھ پلا پلا کر جوان کیا ہے۔  
کہتا ہے میں نے لڑکی کے پنڈے پر حلوہ باندھ باندھ کر اسے پالا ہے اس امید پر کہ مہاراج یہ  
نذرانہ منظور کر لیں۔“

”لوہ۔“ — مجید ہنسا ”تو یہ نذر نیاز کا معاملہ ہے۔“ ایللی نے غور سے اس لڑکی کی  
طرف دیکھا جو نو عمر ہونے کے باوجود جوانی سے بھرپور تھی۔ ایللی سوچنے لگا کیا ہر مرد ایسا ہی ہوتا  
ہے۔ کیا عورت کے معاملہ میں ہر مرد ہی مہاراج ہوتا ہے۔ وہ۔ وہ کور تھی۔ وہ بھی تو بھائی کو  
بلازمت دلوانے کیلئے آئی تھی اور پھر وہ خاتم تھی جسے وہ بلا اموں کی گتھڑیاں دینے جایا کرتا تھا اور  
بلا خوراج۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ مہاراج ظالم تھا یا وہ بوڑھا باپ۔

دیر لہ

اتھن سے فارغ ہو کر وہ پھر علی پور آگیا اس کا خیال تھا کہ علی پور وہی علی پور ہو گا جس  
سے وہ چند لمحوں پہلے گیا تھا جس بند راہن کی رہنمائی چھائی رہتی۔ کرشن کنھیہا بانسری بجاتے اور  
ملواری کوٹھے پر شمشاد تھی جس کپ چھلکتے تھے کیپ بوے طعراق سے اپنی نمائش کرتی تھی اور

چھائی رہتی تھی اور جن کی اندھیری لمبی ڈیوڑھیوں میں اونچے لمبے سپاہی بندوقیں اٹھائے ہوئے  
کرتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ان پرانے محلوں میں مہاراج کی وہ رائیاں مقیم تھیں جو مہاراج کا  
ختم ہو جانے پر ان محلات میں منتقل کر دی گئی تھیں اور زندگی کے باقی دن نوکروں اور اہل کاروں  
کی نگاہ التفات کے سارے بسر کر رہی تھیں۔

ایللی محلات کے نوکروں کو مسرت کی نظر سے دیکھتا۔ دفعتاً اسے مہاراج پر غصہ آئے تو  
پھر علی احمد کی آواز سنائی دی۔ ”شرانے کی کیا بات ہے تسلیم۔ ہم کوئی بیگانے تو نہیں۔“ ایللی  
نگاہوں تلے ایک سفید دھبہ جھللاتا ایک بھوری لٹ لراتی اور وہ آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھ  
لگتا اور محسوس کرتا جیسے وہ سبھی کچھ ہو۔

## مہاراج

مہاراج کا موتی محل دیکھ کر ایللی سہم گیا۔ کتنے حسین کمرے تھے۔ کتنا خوبصورت ما  
سلمان تھا ایللی کے لیے اتنی خوبصورتی اور فراوانی قابل حصول نہ تھی۔ زیادہ عالی شان چیزوں  
دیکھ کر اس کے دل میں ڈر سا پیدا ہو جاتا تھا ایک بوجھ سا پڑ جاتا تھا۔

شامی حمام کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ یہاں رائیاں اور مہاراج نہاتے تھے تلاب میں فو  
دار پانی بھردیا جاتا تھا پھر غلام گردش پر وہ ایک دوسرے کو پکڑتے تھے۔ پھر جب اسے معلوم  
کہ سیڑھیاں چڑھتے وقت مہاراج سارا لیتے ہیں تو اس کے دل میں مہاراجوں کے خلاف  
پیدا ہو گیا اور اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ دنیا غریبوں کی شرافت اور محبت کی وجہ سے  
تھی۔

واپسی پر سندھ محل کے دروازے کے قریب وہ رک گئے ان کی ہمت نہ پڑتی تھی  
دروازے پر سنتری سے بات کریں۔

## ظالم یا مظلوم

”کیوں بھئی یہاں کیوں کھڑے ہو۔“ سنتری نے لٹکارا۔

”جی جی۔“ ایللی بولا ”یہ محل دیکھنا چاہتے ہیں ہم۔“

”یہ محل نہیں دیکھا جا سکتا۔“ وہ بولا۔ مہاراج آرہے ہیں۔ یہاں اب بھاگ دو۔

کچی حویلی کی کبڑی لالین کے نیچے علی پور کا جادوگر اپنا سلطان لے کر اینسکرائنٹی کا پرہتا تھا مگر اب کی دفعہ وہ علی پور پہنچا تو وہ ایک ویرانہ تھا۔ لٹ و لٹ ویرانہ۔

رنگ محل کی عمارت ویران پڑی تھی شریف اور بیگم اپنے کنبے سمیت واپس نور پور تھے رنگ محل کے جنوبی حصے میں صرف رابعہ اور اس کا ننھا بیٹا سائر مقیم تھے۔ مغربی طرف فرحت اور باجرہ رہتی تھیں شمال میں اس کے ماموں حشمت علی اور ان کا بڑا بیٹا منظور تھے۔ حشمت علی پانچ وقت کی نماز پڑھنے اور قرآن کریم کی تلاوت کرنے میں مشغول رہتے۔ ان کا بیٹا پرانی یادوں کو بار بار دل میں دہرانے اور ”حافظ خدا تمہارا“ کی دھن لاپنے میں مگن رہتا اور کبھی کبھی اپنے نانا سے روپے تھپتھپا کر چوری چوری شراب پینے کے شغل میں رہ کر آتا تھا۔

### پرویز

رابعہ۔ سیدہ اور انور اجمل کی بہنیں تھیں۔ رابعہ کی شادی نو عمری میں اس کے چاچا بھائی پرویز سے ہو چکی تھی جو میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں بھرتی تھا اور جس نے دوران تعلیم ہی میں حلقہ اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مذہب کی اس تبدیلی کا سبب کسی نوجوان لڑکی کا حسن و جمال تھا لیکن اس کے متعلق وہاں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ کیونکہ پرویز کی زندگی ایک پر اسرار معمہ بن کر رہ گئی تھی۔ والد کا بے حد لاڈلا تھا اسی وجہ سے باپ نے اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی حالانکہ وہ صاحب شخص نہ تھے۔ پھر بھی انہوں نے بیٹے کی ہر بات پوری کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ متوسط درجے کے والدین کا بیٹا ہونے کے باوجود فیشن ایبل حلقوں میں رہنے کا عادی ہو گیا۔ ہمیشہ کے لیے اپنے عزیزوں کی سی علمیانہ زندگی بسر کرنے سے نجات حاصل کرنے کی غرض اس نے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔

پرویز کی تبدیلی مذہب گھروالوں کے لیے ایک گمراہ صدمہ تھی اس کی والدہ نے اس کا اور یوں خاموش ہو گئی جیسے کسی اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی ہو۔ والد نے سنا تو وہ انگریز ادھر ادھر ٹھٹھنے لگے۔ ”نہیں نہیں۔“ وہ چلائے ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں پرویز ایسا نہ کرے گا۔“

اور پھر جب انہیں یقین ہو گیا کہ خبر درست ہے تو انہوں نے پہلو بدلا ”عیسائی ہو گیا تو کیا ہوا۔“ انہوں نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بہر حال وہ پرویز ہے وہ ہمارا بیٹا ہے۔ نہیں نہیں اس کا کیا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ مگر ان کے انداز سے واضح تھا کہ فرق پڑتا ہے۔ ایسا فرق جو ان کے لیے قابل برداشت نہیں۔

پرویز کے متعلق یہ خبر اس کی بیوی رابعہ نے سنی تو اس نے لپک کر ننھے ساحر کو اپنی گود میں اٹھالیا اور حیرانی سے چاروں طرف دیکھنے لگی جیسے کھو گئی ہو۔ رابعہ نوجوان تھی حسین تھی اور زندگی کی راہ میں ابھی نو آموز تھی۔

رابعہ کو دیکھ کر ایللی کو پرویز پر غصہ آنا شروع ہو جاتا اور وہ سوچنے لگتا کہ ضرور پرویز کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو گا جیسا سارہ کے ساتھ آیا تھا ورنہ عیسائیت کا سہارا کیوں لیتا۔

### کیا ہے تجھے

سارہ کا خیال آتے ہی اسے علی احمد یاد آ جاتے اور پھر بے بی شو کا وہ میدان دکھائی دیتا اور ایک ابلے برقعہ والی لڑکی اس کے روبرو آکھڑی ہوتی۔ ایک سفید وجہ ایک گھنٹھریالی لٹ۔ پھر وہ چپ چاپ گھر جا کر بیٹھ جاتا اور دادی ایللی پوچھتی ایللی کیا ہے تجھے کیا ہو گیا ہے۔ کیا بات ہے۔ ایللی۔ ایللی کو خود بھی معلوم نہ تھا کہ اسے کیا ہو گیا تھا۔

مکے کا احاطہ ویران پڑا تھا اس لیے کہ ارجند نہ جانے کہاں کس نوکری پر چلا گیا تھا اور انگریزی کا کھیل ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی ایللی گھبرا کے ارجند کے گھر چلا جاتا جہاں تخت پر ارجند کی بانسری پڑی دیکھ کر اس کا دل بھر آتا۔ یا کسی وقت جب وہ نگاہ بچا کر مقابل کے مکان کی طرف دیکھتا اور وہاں بکوری ڈکوری کا کوئی ایڈیشن نظر آتا تو دل پر ٹھیس لگتی۔ پھر وہ کچی حویلی کی کبڑی خیدہ لالین تلے چلا جاتا لیکن وہاں کھڑا ہونا تو بالکل بیکار تھا۔ اگرچہ کیپ فوراً کھڑکی میں آکھڑی ہوتی اور مسکرا مسکرا کر کسی نہ کسی سے با آواز بلند باتیں کرنے لگتی لیکن ایللی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے کس طرح ہاتھ ہلائے، رومال لہرائے۔ وہاں بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑے رہتا بھی تو بے معنی بات تھی اور پھر لوگ — پھر وہ رضا کی دوکان پر جا بیٹھتا اور رضا اسے دلچسپ باتیں سنا تا اور ہر آتے جاتے کو چھیڑتا اور بالآخر ایللی پر فقرے کسے

میں کوٹ ہوتی تھی اور وہ ہر ممکن موقع پر رضا کے پاس جا بیٹھتا اور رضا اسے اواس دیکھ کر کہتا "آؤ ہمیں گھملا لیں۔ کیا یاد کرو گے بابو۔"

وہ اپنی لاشی سنبھل کے ساتھ ہو لیتا اور جب وہ علی پور کی فیصل کے باہر پھر لگا لگا کر تھک جاتے تو وہ اسے پہلوان اور طفیل کے پاس لے جاتا۔ پہلوان اور طفیل آصفی محلے کے پڑوس میں رہتے تھے بلڈان ایللی کو دیکھ کر مسکراتا۔ "آئیے بابو جی۔" اور پھر اپنی تمام تر معصومیت کو لیے ہوئے بیٹھا مسکراتا رہتا۔ طفیل ایک دیلا پتلا لڑکا تھا جس کی طبیعت میں رنگینی اور تیزی دونوں غصہ موجود تھے۔ وہ دونوں ایللی کے ساتھ بڑی محبت اور عزت سے پیش آتے تھے اور ایللی محسوس کرتا تھا جیسے وہ ایک بلند و برتر ہستی ہو۔ پھر وہ شیخ ہدم کی طرف جا بیٹھتے جو چڑے کا سوداگر تھا۔

### شیخ ہدم

پہلی دفعہ شیخ ہدم کو دیکھ کر ایللی بہت متاثر ہوا تھا۔ شکل و صورت سے معزز دکھائی دینے کے باوجود اس کے خیالات نوجوانوں کے سے تھے اور طبیعت میں بلا کی چمک تھی۔ شیخ ہدم پہلا شخص تھا جو عمراور مرتبے میں بڑا ہونے کے باوجود ایللی سے دوستانہ حیثیت سے ملتا تھا۔ "آئیے الیاس صاحب۔" وہ اسے دیکھ کر مسکراتا "تشریف رکھیے یہاں گھبرانے کی کوئی بات نہیں بس چار ایک منٹ میں سودا طے ہو جائے گا اور پھر بیٹھ کر گپ اڑائیں گے۔" ہاں جی چودھری جی۔" وہ اپنے گرد بیٹھے ہوئے بیوپاریوں سے کہتا "بس جو کہہ دیا ہے نا میں نے وہ عین مناسب ہے۔ آپ بھی کیا یاد رکھیں گے چودھری صاحب۔ سو کے پیچھے ایک آنہ اور سسی۔ بس چودھری صاحب اب تو مطمئن ہو جانا چاہئے آپ کو۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے اچھا تو سلام علیکم ہاں جی الیاس صاحب۔ تو رہے گی شطرنج کی بازی۔ مگر ابھی تو آپ ناچتے ہیں اس فن میں بہر حال چلئے۔ ہو ہی جائے ایک بازی۔ ہاں کیا پیسے گے آپ نہیں چاہئے تو واہیات ہے۔ او لڑکے دودھ والے۔ آدھ کیر دودھ میں چار بیڑے بلو کر لانا۔ ذرا بالائی زیادہ ڈالنا۔ الیاس صاحب بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی شیخ سے پالا پڑا تھا۔ بابو الیاس صاحب دودھ پیجئے۔ بالائی کھائیے اور ورزش کیجئے ورزش۔ یہی میٹھ ہے آپ کی قسم۔ ہاں تو کسے کیسی گزرتی ہے آج کل۔"

شیخ ہدم میں زندگی تھی۔ جوانی تھی اور اس کے علاوہ وہ معزز شہری سمجھے جاتے تھے اور یہ سب باتیں علی پور میں ایللی کو نصیب نہ تھیں گھر اور محلے والے اسے کھانڈرہ لڑکا سمجھتے تھے اور

شروع کر دیتا۔ "ہوں تو ایللی بابو کو محبت ہو گئی ہے۔ بڑا خطرناک مرض ہے یہ۔ اللہ ہی پہلے وہ ہے ورنہ ایسے مریض پیچتے نہیں۔" اور ایللی کو اس کی باتوں کے علاوہ اپنی حماقت پر غصہ آتا کہ اس نے اپنی محبت کی بات رضا کو کیوں بتا دی تھی مگر رضا کو بتائے بغیر چارہ بھی تو نہ تھا علی پور میں اور کون تھا جس سے وہ راز دل کہہ سکتا تھا۔ صرف ایک رضا تھا نا۔ رفت بھی تو نوکر کی رشتے کے لیے میں کہیں جا چکا تھا۔

### حمیدہ رشیدہ

محلے میں اس کے لیے دلچسپی کی کوئی صورت نہ تھی گھر میں بوڑھی داوی کے سوا کوئی نہ تھا۔ سیدہ تو بالکل ہی خاموش رہا کرتی تھی۔ وہ ہر وقت داوی امں کے ساتھ چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ جوان ہونے کے باوجود وہ ازلی طور پر بوڑھی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا ظہور اس کی پروانہ کرتا تھا۔ کبھی کبھار سال دو سال کے بعد رات کے اندھیرے میں وہ چپ چاپ آجاتا پھر انگلی صبح جب ایللی بیدار ہوتا تو اسے خبر ملتی کہ فاضل صاحب آئے ہوئے ہیں وہ دوروں ہی اسے دیکھتا۔ سیاہ فام بھاری بھر کم سامرو جس کے بال کالے ہونے کے باوجود سفید دکھائی دیتے تھے اور جس کی جگہ ہوئی کمر سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ شانوں پر صدیوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ وہ دھیمی آواز میں باتیں کرنے کا عادی تھا یہاں تک کہ گھروالوں کو اس کو کھسپھسے انداز میں ہو سکتا تھا کہ وہ آپس میں محبت بھری باتیں کر رہے ہیں یا ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں بلکہ جب کبھی ایللی اس کے پاس جاتا تو وہ ایک نہ ایک دلچسپ بات شروع کر دیتا اور ایللی کو یقین نہ آتا کہ اس شکل و صورت کا شخص ایسی چمکیلی اور دلچسپ بات بھی کر سکتا ہے۔

ایللی کے گھر میں سیدہ کے علاوہ سیدہ کی مرحوم بہن نیاز کی بیٹیاں حمیدہ اور رشیدہ بھی رہتی تھیں مگر وہ تو بالکل بچیاں تھیں۔ حمیدہ اور رشیدہ کا ایک بھائی بھی تھا جس کا نام نقی تھا اور جہاں کے چرے پر بہت بڑا داغ تھا۔

حمیدہ اور رشیدہ کے آنے سے ایللی کو چند ایک سہولیات ضرور حاصل ہو گئی تھیں مگر اسے دو چھوٹی بہنیں میسر ہو گئی تھیں جو اس کے چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف رہتی تھیں اور اس کا کام کرنے میں حقیقی مسرت محسوس کرتی تھیں مگر ان باتوں کے باوجود اسے گھر میں

بڑی تھی اس لیے انہوں نے اسے چنداں اہمیت نہ دی تھی۔ لیکن ایللی کے لیے اب بے بی شوکا  
وہ دن ایک تاریخی دن تھا ایک ایسا دن جسے وہ کبھی فراموش نہ کر سکتا تھا۔

پرنسپل

روشن لال خوش شکل اور جوان قسم کے آدمی تھی ان کے بشرے سے ذہانت اور بے تکلفی  
پتہ تھی۔

”ہوں۔۔۔“ وہ بولے ”تو تم علی احمد کے لڑکے ہو۔ جانتے ہو علی احمد میرے  
دوست ہیں لنگوٹیسہ دوست۔ مگر تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ علی احمد کے بیٹے کو گھبرانا زیب  
نہیں دیتا۔ بیٹہ جاؤ چائے پیو گے نا۔ اوہ تو تمہیں مجھ سے زیادہ ان سنہری مچھلیوں سے دلچسپی  
ہے۔“ ایللی کو بلور کے مرتبان میں تیرتی ہوں مچھلیوں کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ ہنسنے  
لگے۔

”اچھا تو الیاس یہ بتاؤ کہ جب مرتبان کا پانی گندہ ہو جائے اور مچھلیوں کو تازہ پانی بہم پہنچانا ہو  
یعنی مرتبان کا پانی بدلانا ہو تو کیا کریں گے۔“  
ایللی سوچنے لگا ”ہاں ہاں سوچ لو۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ ”مگر کوئی ایسی بات بھی نہیں۔  
مانٹس پڑھی تھی نا تم نے دسویں میں۔“

ایللی ان کی بے تکلف باتیں حیرانی سے سن رہا تھا اس کا تو خیال تھا کہ روشن لال اسے کوئی  
ضروری پیغام دیں گے اور بزرگانہ انداز میں کچھ فرمانے کے بعد یہ ملاقات ختم ہو جائے گی مگر وہ تو  
اس سے یوں باتیں کر رہے تھے جیسے وہ علی احمد کی لہجائے خود ایللی کے دوست ہوں۔  
”اچھا تو الیاس تمہارے مشاغل کیا ہیں؟“ وہ پوچھنے لگے۔ ”سنا ہے فی الحال فیل ہونا تمہارا  
مشغلہ ہے جب میں تمہاری عمر میں تھا تو میرا بھی یہی مشغلہ تھا۔ کئی ایک سال میں کامیابی سے  
فل ہوتا رہا۔“

ایللی حیران تھا کہ انہیں کیا جواب دے وہ بڑے شوق سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور مسکرا  
رہا تھا ”اچھا بھئی“ بلاخر وہ بولے ”اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہم تمہیں اپنے کالج میں داخل کر  
سکتے۔ خوب مگر رے کی جو بل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ کیوں۔“  
”آپ کا کالج۔“ ایللی نے خوشی سے پوچھا۔

بس وہ اس قابل نہ تھا کہ اسے کوئی اہمیت دی جائے۔ اس میں ذہنی چمک تو تھی مگر وہ اُن  
خوف کے دبیز پردوں میں دم توڑ رہی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود کفیل نہ تھا پھر  
شیخ ہدم تھے۔ جب شیخ ہدم اسے الیاس صاحب کہتے تو وہ خوشی سے پھولانے ساٹا اور اسے غم  
ہوتا کہ وہ بھی ایک حیثیت کا مالک ہے باعزت فرد ہے ایک ایسا شخص جو بالغ العقل ہے۔  
ان باتوں کے باوجود ایللی زیادہ دیر تک شیخ ہدم کے پاس نہیں بیٹھ سکتا تھا کیونکہ جلد ہی  
پر احساس کمتری چھا جاتا اور وہ وہاں سے چلے آنے کا کوئی نہ کوئی جواز پیدا کر لیتا۔ مگر اُن  
چارپائی پر لیٹ جاتا اور شریف کی سی آنکھیں بنا کر چھت کو گھورنے لگتا چھت پر ایک سفید  
دھبہ چمکتا اور ایک بھوری لٹ لٹکتی دوسیاہ آنکھیں ڈولتیں۔ بار بار آپہں بھرتا اور پہلو بدلتا  
محسوس کرتا کہ زندگی ایک مسلسل کوفت ہے ایک دکھ بھری کیفیت۔

نتیجہ

ایللی کا نتیجہ نکلا تو وہ فیل تھا۔ اس خبر کو سن کر اسے بہت صدمہ ہوا لیکن اس نے اپنی فیل  
کا ناکامی کو ایسی چابکدستی سے ناکامی محبت کی طرف مبذول کر دیا کہ اسے فیل ہونے کا  
صدمہ نہ رہا۔ وہ ابھی ہوئی لٹ اور پر پیچ ہو گئی اور اس سفید دھبے میں دل کے خون کی لگی  
سرخی شامل ہو گئی۔

نتیجہ کے اعلان کے بعد علی احمد کا ایک خط موصول ہوا جس میں ایللی کو مختصر طور پر بدلے  
کی گئی تھی کہ وہ امرتسر جاکر ایڈورڈ روڈ پر روشن لال سے ملے خط میں علی احمد نے یہ نہ لکھا  
کہ یہ روشن لال کون تھے اور ان سے ایللی کو ملانے کا مقصد کیا تھا۔ ایللی صرف اس حد تک  
سکا تھا کہ روشن لال علی احمد کے دوست تھے اور انہوں نے کسی نجی کام کے لیے اس سے  
لال سے ملنے کو کہا تھا۔

ایللی کو معلوم نہ تھا کہ روشن لال امرتسر آریہ کالج کے پرنسپل تھے اور علی احمد کا مقصد  
ملاقات سے صرف یہ تھا کہ روشن لال ایللی کو امرتسر آریہ کالج میں داخل ہونے پر رضامند کرے  
اور وہ لاہور میں آوارگی کرنے سے محفوظ ہو جائے انہیں معلوم نہیں تھا کہ ایللی کی سب  
بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ امرتسر جائے وہاں ایک سال رہتا تو بہت بڑی خوش نصیبی  
شاید انہیں بے بی شوکا وہ معمولی واقعہ یاد ہی نہیں رہا تھا ان کی زندگی ایسے واقعات سے

سہنی باغ اور ٹھنڈی کھوئی تھی۔  
اڑتے پھلکے

بورڈنگ میں تقریباً بارہ تیرہ کمرے تھے جن سے ہٹ کر دو کمرے تھے جو باورچی خانے کے لیے مخصوص تھے جن میں چار ایک غلیظ باورچی اور نوکر ہر وقت کام کاج میں مصروف رہتے تھے۔ کوٹھری کے مشرق میں دو بڑے کمرے بنگالی پروفیسر سیزجی کے لیے مخصوص تھے جو بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور اکثر چوری گھر میں مچھلی پکا کر کھایا کرتے تھے کیونکہ بورڈنگ میں گوشت مچھلی اور انڈا پکانا قانونی طور پر منع تھا۔ بورڈنگ کے باورچی خانے میں آلو ساگ بھنے ہوئے ٹنڈے بیگن کا بھرتہ اور دالیں پکتی تھیں۔ سوئی کے باہر ایک لمبی میز بڑی تھی یہ میز لڑکوں کا ڈائننگ ہال تھی۔ بندو باورچی چھوٹے چھوٹے پکا کر انہیں باورچی خانے سے پر اسرار رکابیوں کی طرح ہوا میں پھینکتا اور باہر منیر پر بیٹھے ہوئے لڑکے انہیں دبوچتے۔

”بندو پھلکا“ رام لال چلاتا اور بندو ایک زرد زرد سا پھلکا فقسا میں چھوڑتا جو رام لال کے ہاتھوں میں آگرتا۔ ایللی بندو کی چستی اور نشانی پر حیران رہ گیا۔ وہ منظر عجیب تھا۔ باورچی خانے کے باہر سفید زمین پر ایک لمبی غلیظ میز پر دس بارہ لڑکے کٹوریاں سامنے رکھے بیٹھے تھے اور بندو کے پھلکے کپوتروں کی طرح ہوا میں اڑ رہے تھے۔

”بندو پھلکا“ اور ایک ساعت میں ایک پھلکا پکارنے والے کے ہاتھ میں آگرتا۔  
”بندو وال“ ایک لڑکا چیخا اور ہنستا ایک کٹوری لے کر بھاگتا۔

ایللی کے لیے کھانے کی میز کا یہ منظر بالکل نیا تھا۔ نیا اور انوکھا۔ لیکن اسے اجازت نہ تھی کہ وہ اس میز پر بیٹھے کیونکہ وہ مسلمان تھا اور مسلمان کے لیے جزل نیبل پر بیٹھنا منع تھا اس کے لیے کچن کے برتنوں کو استعمال کرنا ممنوع تھا۔ خوش قسمتی سے اس سال بورڈنگ میں دو اور مسلمان لڑکے داخل ہو گئے تھے جنہیں خصوصی وجہ کی بناء پر وہاں رہنے کی اجازت مل گئی تھی اور ان تینوں کا فرض تھا کہ یا تو وہ سب سے پہلے کھانا کھالیں اور یا سب کے بعد اور یا کمرے میں بیٹھ کر جب جی چاہے کھائیں بشرطیکہ اس وقت کوئی نوکر فارغ ہو جو ان کے لیے کھانا لاسکے۔

کٹوریاں

نوکران زرد کٹوریوں میں کھانا لے آتا اور پھر کٹوریوں میں انگلیاں ڈال کر بڑی بے تکلفی

”ہاں ہاں۔“ وہ بولے ”ایک چھوٹا سا کالج ہے اور اسے چلانا میرے ذمہ ہے تو اگر اگر میرے کالج میں داخل ہو جائیں تو بڑا اچھا ہو۔“

”جی ہاں۔“ ایللی خوشی سے جھوم گیا۔ ایک تو امرتسر اور پھر روشن لال صاحب اس صورت اور کیا ہو سکتی تھی اور وہ داخل ہونے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔

ہال دروازے میں پہنچ کر دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ یہاں رہتی ہے اس شہر میں میں بیٹھتی ہوگی اس نے بازار میں چلتے ہوئے ٹانگوں کی طرف دیکھ کر سوچا۔ ان بزرگوں پھرتی ہوگی کتنی خوش نصیب ہیں یہ سڑکیں یہ راستے یہ تانگے یہ ہوا۔ ایک سفید مادہ نگاہوں تلے چپکنے لگا اور تھکھریالی لٹ لہرا لہرا کر اسے بلائے لگی۔ اللہ کرے اب روشن لال ہاں لیں اور میں امرتسر کالج میں داخل ہو جاؤں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ تجویز تو خود لے تھی جسے روشن لال نے اپنی جانب سے پیش کیا تھا تاکہ ایللی کو یہ احساس نہ ہو کہ اسے میں داخل ہونے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اور وہ لاہور میں داخل ہونے کا مطالبہ نہ کرے۔ دس دن کے اندر اندر علی احمد کا خط موصول ہوا جس میں اسے امرتسر میں داخلہ اجازت دے دی گئی اور وہ اپنا مختصر سا سامان اٹھا کر امرتسر آ پہنچا اور آریہ کالج میں داخل اور پرنسپل روشن لال نے اسے بورڈنگ میں داخل ہونے کی خصوصی اجازت حاصل کیونکہ وہاں مسلمان لڑکوں کو رہنے کی اجازت نہ تھی۔

آم اور سانپ

بورڈنگ شہر سے بہت دور نہر کے کنارے آموں کو کوٹھی میں واقع تھی۔ آموں کا ایک ویران جگہ تھی زرد رنگ کی یہ پرانی عمارت چاروں طرف سے آم کے درختوں سے گھری ہوئی تھی جہاں رات بھر زمین پر سانپ ریختے اور دن بھر الو بولتا۔ مغرب کی جانب لڑکے سڑک تھی جس کے پرے آموں کا ایک باغ تھا جنوب کی طرف نہر بہتی تھی اور باغ کی طرف ویران زمین تھی۔

کوٹھی سے ایک پختہ سڑک شہر کی طرف نکل گئی تھی۔ سڑک کا یہ ویران علاقہ تھا جس کے دونوں طرف اونچے لمبے درخت لگے تھے اور وہ اتنے گھنے تھے اور تنہا زیادہ تھے کہ اچھی خاصی جنگل کی شکل بن گئی تھی۔ سڑک کے اس ویران علاقے

انداز میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی اور معصومیت تھی۔

”نہیں۔ نہیں یہ بہ بند کالج میں نہیں چلے گا۔ کوئی شلوار نہیں ہے تمہارے پاس پہننے کے لیے۔“

”مل جائے تو پہن لوں گا۔“ وہ بولا۔

اس پر پرنسپل نے کسی فنڈ سے اسے دو شلواریں سلوا دی تھیں۔ اس کے بعد بورڈنگ سے چلے وقت مولادوا ایک شلوار اخبار کے کانڈ میں لپیٹ کر لے جاتا۔ جب کالج کی کھٹی بجتی تو وہ تہہ بند اتار کر جھٹ شلوار میں داخل ہو جاتا اور جماعت میں جا بیٹھتا جہاں خالی پیئرڈ آتا وہ شلوار کانڈ میں لپیٹ لیتا اور تہہ بند باندھ کر اطمینان کا سانس لیتا۔

”بھئی اب کرو بات۔“ وہ چلاتا۔ ”یار اس شلوار میں تو دم گھٹتا ہے۔“

کوئی نہیں جانتا تھا کہ مولادوا کہاں کا رہنے والا تھا اور کہاں سے آیا تھا اس نے کبھی اپنے گاؤں اور والدین کا ذکر ہی نہ کیا تھا البتہ اسے جیب خرچ بہت کم ملتا تھا اور اس کے زیادہ تر اخراجات کالج والے خود ادا کیا کرتے تھے کیونکہ وہ کرکٹ کا ایک نہایت عمدہ کھلاڑی تھا اور بائیں ہاتھ سے کھلے گیند پھینکنے کی وجہ سے کالج والے اس کی عزت کیا کرتے تھے۔

شفیع یا تو سانپ مارنے کے شوق میں ادھر ادھر گھومتا پھرتا اور یا ہاکی کھیلنے کے متعلق چہیں غانا رہتا۔ مولادوا تہہ بند جھاڑتا اور عجیب و غریب منصوبے بناتا رہتا۔ پہلے ہفتے میں اس نے لنگوٹا باندھ کر جڑے پر رومال باندھ کر ہاتھ میں لٹھ لے لیا اور رات کے وقت سڑک پر دو رویہ درختوں میں جا چھپا۔ جب بھی کوئی بورڈنگ سے متعلقہ لڑکا سڑک پر آتا دکھائی دیتا تو وہ لٹھ لے کر درختوں سے باہر نکل آتا۔

رکھ دے میل جو بھی تیرے پاس ہے وہ ڈاکو بن کر انہیں ڈانٹتا۔ اس طرح پہلی رات اس نے کئی فیلپس۔ چاقو۔ گھڑیاں اور سات روپے بارہ آنے نقد جمع کر لیے تھے اور بورڈنگ کے لڑکوں کے دل میں سڑک کے اس دیران حصے کا ڈر پیدا ہو گیا تھا۔

میں ہوں!

سویرے وہ تینوں تیار ہو کر کالج کی طرف چل پڑے اور دو گھنٹے کی پیدل مسافت طے کرنے کے بعد کالج پہنچے کیونکہ انکے پاس بائیکل نہ تھے اور تاکے پر جانے کی توفیق نہ تھی۔ راستے میں

سے دال یا سبزی ان کے ذاتی برتنوں میں اتار ڈالتا۔ اس عمل کے دوران میں وہ احتیاط رکھتا کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ ان کے برتنوں سے چھو کر بھڑکتا نہ ہو جائے اور پھر وہ تینوں باری باری چلاتے۔ ”بندو پھلکا“ اور پھلکے ہوا میں اڑتے اور برتن بجتے اور وہ تینوں ایلٹی شفیع اور مولادوا شور مچاتے۔

ہفتے کو سرشام ہی سے بچن سے باہر دودھ کی بڑی بڑی گاگریں قطار میں پڑی دکھائی دیتی۔ نہ جانے وہ گاگریں کہاں سے آتی تھیں۔ شام کو ہر آدھ گھنٹے بعد کوئی مرا سر پر گاگر اٹھائے تینوں سے نیم چٹا نیم بھانگتا ہوا آتا دکھائی دیتا۔ اس کا جسم میل سے بھرا ہوتا۔ ہاتھوں کی انگلیاں گاگر میں ڈوبی ہوئی ہوتیں اور کہنیوں تک بازو دودھ میں تر ہوتے دودھ کی چھلکتی ہوئی گاگر لیے۔ بھاگا آتا اور پھر بسنتے یارامو کی مدد سے گاگر اتار لی جاتی۔

ہفتے کی رات بندو بڑے بڑے کڑا ہے چولہوں پر رکھ کر آگ جلا دیتا اور پھر رات بھر ان کڑاہوں میں چمچ چلانے کی آوازیں آتیں اور بندو باری باری بسنتے اور رامو کو ڈانٹتا۔ اگلے روز بڑی بڑی زرد تھالیوں میں کھیر ڈال دی جاتی اس پر لڑکے خوشی سے پھولے نہ ساتے اور پھر میز پر بیٹھ کر کھیر بھری انگلیاں چاٹتے۔ اس روز بندو کے پھلکے ہوا میں نہ اڑتے اور کٹوریال باورچی خانے کے ایک کونے میں ڈھیر کر دی جاتیں۔

## معزز آدمی

شفیع۔ مولادوا اور ایلٹی بورڈنگ کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے۔ شفیع پتلا دلا دراز قد لڑکا تھا جس کے خدو خال سے چستی اور ذہانت نکلتی تھی۔ اس کے والدین امرتسر کے قریب تھا کسی گاؤں کے زمیندار تھے۔ مولادوا کو تاہ قد اور جسم تھا۔ خدو خال سے وہ کالج کا لڑکا معلوم تھا نہ ہوتا تھا اور گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کسی گاؤں کا جاٹ بھول کر شہر میں آ نکلا ہو۔ اس کا لباس بھی عجیب تھا۔ کم از کم ایلٹی کے لیے تو وہ لباس بہت ہی انوکھا تھا اس کے لباس کو دیکھ کر پہلے ہی روز پرنسپل نے اسے دفتر میں بلا لیا اور کہنے لگے۔

”مولادوا یہ کیا حلیہ بنایا ہے تم نے۔“

”حلیہ“ مولادوا نے حیرانی سے دیکھا اور پھر ٹھوڑی پر ہاتھ پھیر کر بولا پرنسپل صاحب میں اپنے گاؤں کا ایک معزز آدمی ہوں اور جناب حلیہ تو مجرموں کا ہوتا ہے۔“ مولادوا کی آواز



شفیع تو صبح و شام سانپ مارنے۔ اچھلنے کودنے۔ گنگناٹے اور بالاخر ہاکی کی دلچسپی میں کھویا رہتا تھا اور مولاداد کی شکل و صورت ہی ایسی تھی کہ اس سے کوئی رنگین بات بیان ہی نہ کی جا سکتی تھی۔ کالج میں بیسیوں لڑکے تھے مگر وہ ان سے اچھی طرح واقف نہ تھے مثلاً مدھوک تھا۔ نوچا لبا پیارا سا ساتھی۔ جس کے انداز سے بے پناہ ہمدردی ٹپکتی تھی اور جس کی آنکھوں پر مہمی اور لمبی بھوس عجیب پیناٹک اثر رکھتی تھیں۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود ایلے کے لیے مدھوک سے ایسی بات کرنا ممکن نہ تھا۔ پھر وہ پست قد بشیر تھا مگر وہ تو سرا سر معزہ تھا اس سے کوئی سنجیدہ بات نہ ہو سکتی تھی۔ البتہ آصف تھا۔

### آصف

آصف ایک خوبصورت اور دراز قد لڑکا تھا جو بات بات پر شرما جانے کا عادی تھا اور جس کے جذبات پر لہر اس کے چہرے پر گلابی رنگ کی صورت میں ناپتے رہتے تھے۔ معمولی سی بات پر اس کے رخساروں پر ایک گلابی لہر دوڑ جاتی۔ نگاہیں جھک جاتیں آنکھوں میں پھلجھریاں سی چلتیں اور جسم بید کی طرح جھولتا۔

آصف زیادہ باتیں کرنے کا شوقین نہ تھا اور نہ ہی محفل میں جانے کا دلدادہ جب بھی لڑکے غلط چریڈ میں کالج کے گراؤنڈ میں کھڑے ہو کر خوش گپیاں کرتے وہ مسکراتا ہوا آنکھٹا اور چپکے سے ایلے کو اشارہ کرتا اور وہ دونوں چپکے سے وہاں سے کھسک جاتے اور یا تو پہلوان کی دوکان پر بیٹھ کر پوری کچوری کھاتے یا رامو پان والے سے پان سگریٹ خریدتے۔ بازاروں میں گھومتے پھرتے ہوئے جب بھی کوئی عورت قریب یا دور سے گزرتی جس کے سینے پر سلوٹ پڑے ہوتے آصف ایلے کو کہنی مار کر چپکے سے کہتا۔ ”وہ دیکھو۔ اوھر۔ وہ اوھر۔“

آصف کو پکڑنے کی سلوٹوں اور متناسب جسم کے دائروں سے بے پناہ دلچسپی تھی جسے اس نے عام لڑکوں کے سامنے کبھی ظاہر نہ کیا تھا۔ اس کے احساسات بے حد پاکیزہ اور لطیف تھے اور ذہنیت میں شاعرانہ رنگ کوٹ کر بھرا ہوا تھا لیکن عورت کے جمال کے علاوہ اسے اس سے دل اور دلچسپی نہ تھی بلکہ عورت کے قرب کا ڈر اس کے دل میں خطرناک قسم کی شدت اختیار رہ چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ عورت کے جمال کو دیکھے۔ اس کے جسم کے خم و چوڑے جانچے چوری وری حسن سے محفوظ ہو مگر دیکھے جانے والی کو احساس نہ ہو جائے کہ اسے دیکھا جا رہا ہے۔

مولاداد بار بار تمہ بند بھاڑتا جاؤں کی طرح چکھاڑتا اور عجیب و غریب حرکات کرتا۔ شفیع یا تو مست انداز میں کوئی دھن گنگناٹا رہتا یا ہاکی کے میچوں کے متعلق قصے سناتا۔ چپ چاپ اپنے خیالات میں کھویا چلا جاتا۔ نہ جانے وہ کہاں رہتی ہے۔ نہ جانے اسے معلوم ہے یا نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح اس کا پتہ لگائے اسے صرف یہ معلوم تھا کہ اس کے بھائی پہلے کسی دفتر میں ملازم تھے اور اب ان کا ارادہ تھا کہ ملازمت چھوڑ کر شروع کر دیں اور ان کا نام آغا صاحب تھا۔ آغا غلام بخش۔“

وہ امرتسر میں آوارہ پھرتے ہوئے بڑے غور سے لوگوں کے بوڑو پڑھتا رہتا کہ شاید کبیر غلام بخش کا بوڑو ملے ہو مگر کئی روز تک وہ بے کار گھومتا رہا اور اسے وہ بوڑو نظر نہ آیا۔ ایلے کے دل میں تسلیم کے متعلق نفقوش دھندلے پڑتے جا رہے تھے اور جوں جوں دھندلے پڑتے ڈوبنے کے مانند وہ ان نکتوں سے شدت سے چٹنے جاتا جس قدر وہ دھندلے تھے اسی قدر اس کا جذبہ محبت بڑھتا جا رہا تھا وہ ڈرتا تھا کہ کیسے وہ شکل اس کے دل میں محو نہ ہو جائے اور اسے محبوبہ کی از سرنو جستجو کرنی پڑے کیسے ایک مرتبہ ”سب کچھ“ ہو کے بعد وہ پھر سے ”کچھ بھی نہ“ نہ رہ جائے۔

برقعہ میں لپٹی ہوئی ہر عورت کو وہ امید بھری نگاہ سے یوں دیکھتا جیسے اسے توقع ہو کہ وہ اس کے پاس چلی آئے گی اور قریب آکر برقعہ اٹھا کر راز دارانہ انداز سے جھانکے گی اور پھر بے لہجے میں کہے گی۔ ”تسلیم میں ہوں۔“

ہر برقعہ پوش لڑکی جب اس کے قریب سے چپ چاپ گزر جاتی تو اسے دکھ سامعہ لیکن جلد ہی دور سے آتی ہوئی کوئی اور برقعہ پوش اس کی امید کا مرکز بن جاتی اور وہ اپنے سے اسے ٹھونٹا شاید وہ نورانی وجہ اور گھنگھریالی لٹ اس برقعے میں ملفوف ہو۔ اکثر مرتبہ ہوتا کہ کمپنی باغ میں ٹہلتے ہوئے اسے لڑکیوں کے گردہ دکھائی دیتے جنہوں نے برقعہ ہوتے اور اسے کئی ایک سفید وجہ اور گھنگھریالی بھوری ٹیٹیں دکھائی دیتیں اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ ان میں سے کون سی تسلیم ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کس کی طرف دیکھے۔ کبھی گوری چٹی لڑکیاں حسین معلوم ہوتی تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے قریب نہ آتا اور راز دارانہ انداز میں نہ کہتی۔ ”تسلیم۔ میں ہوں۔“ یہ صورت حال بے حد تکلیف اور سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ امرتسر میں وہ کسی سے دل کی بات نہ کہہ سکتا تھا۔

مزن جاتا تو دونوں پہلوان کی دوکان پر پوریاں کھاتے نسائی خم و بیچ دیکھتے۔ مہر کی واپسی کا انتظار کرتے۔ اگرچہ مہر کی حیثیت محض نعم البدل کی تھی لیکن اس سفید دھبے اور بھوری لٹ کی نسبت جسے دھوم نکالنے میں وہ ناکام ہو چکے تھے۔ یہ نعم البدل ایک مثبت اور ٹھوس حقیقت تھی۔ اور حقیقت بھی ایسی جس پر ایک خواب کا سا عالم طاری رہتا تھا۔ چونکہ مہر نہ تو گردن اٹھانے کا عالمی تھی۔ نہ قریب آکر بات کرنے کا۔ اس کے برعکس وہ ایک دور کا موبہوم تبسم اور گلابی جینپ کی آمیزش تھا۔ لہذا چاہے وہ لڑکا تھا یا لڑکی ایلی کے لیے چنداں فرق نہیں پڑتا تھا۔ کالج کے بعد ایلی اور آصف امرتسر کے بازاروں اور باغات میں گھومتے رہتے یا آصف کے گھر جا بیٹھے۔ آصف گھومنے کا بہت شوقین تھا مگر اسے اپنے والدین کی عزت اور اپنی نیک نامی کا بہت خیال رہتا تھا۔ بازاروں میں چلتے ہوئے وہ ہمیشہ سر جھکا کر چلتا تاکہ اس کے رویے سے آوارہ پن ظاہر نہ ہو نہ ہی وہ ایسے علاقوں میں جانے کے لیے تیار ہوتا جہاں پائے جانے پر بدنامی کا خدشہ ہو مثلاً وہ کٹڑہ رنگین میں کبھی داخل نہ ہوتا حالانکہ یہ کٹڑہ ان کے مکان کے قریب ہی تھا۔

### کٹڑہ رنگین

کٹڑہ رنگین میں رقاصائیں رہتی تھیں اور وہاں سے ہر وقت دلکش آوازیں آیا کرتیں۔ کبھی دور سے سازنگی بین کرتی ہوئی سنائی دیتی کبھی ستار رقص کرتی اور کبھی طبلہ کی تھاپ سن کر ایلی کے دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا۔ اس وقت ایلی کا دل چاہتا کہ ایک بار کٹڑہ رنگین میں سے گزرے اور ان آوازوں کو قریب سے سنے۔ آصف بھی ان آوازوں کو سن کر مسکراتا اور اس کی آنکھوں میں گلابی بوندیوں کی پھوار پڑتی لیکن وہ ایک لمبی آہ بھر کر کسی اور طرف مڑ جاتا۔ ایلی آصف کی وجہ سے مجبور تھا اس لیے وہ بھی کبھی اس کٹڑے میں داخل نہ ہوا تھا۔ وہاں اکیلے جانا بھی تو مشکل تھا اس نے کئی بار ادھر کا رخ کیا تھا مگر موڑ پر جا کر وہ گھبرا جاتا اور اس کا دل دھڑکنے لگتا۔

کئی ایک مرتبہ شیخ ہدم کے ساتھ بھی اسے امرتسر کے بازاروں میں گھومنے کا اتفاق ہوا۔ ہدم تجارت کے سلسلے میں امرتسر آتے رہتے تھے اور ہمیشہ آنے سے پہلے خط کے ذریعہ ایلی کو اطلاع دے دیتے ”الیاس صاحب میں آرہا ہوں شام کو تین بجے مجھے کمپنی باغ کے مرکزی پلاٹ

نگاہیں چار نہ ہو جائیں اگر کوئی شوخ راہ گیر نگاہ بھر کر اسے دیکھ لیتی تو آصف کو ہلیر آہ آ نکھیں پلکوں تلے غروب ہو جائیں اور رخساروں پر یوں ہوائیاں سی چلتیں جیسے غروب آفتاب کے وقت بادلوں میں گلابی نقوش بننے لگتے ہیں۔

آصف کی طبیعت ایسی تھی کہ دیر تک اس سے دل کا راز نہ کہنا ممکن نہ تھا۔ اس نے ایک روز ٹلٹے ٹلٹے اس سے اس دھبے اور گھنگھریالی لٹ کا راز کہہ دیا۔ ایلی کا قصہ یہ آصف نے ہتھیلی پر رخسار رکھ کر ترچھی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں گلابی بوندیوں کی پھولوار پڑنے لگی ”تم تو چھپے رستم ہو۔“ وہ مسکرانے لگا۔

آصف سے درد دل کہنے کا ایلی کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ نہ کسی لڑکی نے نقاب بلند ”تسلیم میں ہوں۔“ اور نہ ہی کسی بورڈ پر آغا غلام بخش لکھا نظر آتا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ ایلی لڑکوں میں کھڑا ہوتا تو آصف چپکے سے آکر کہتا ”تسلیم“ اور ہاتھ اٹھا کر سر جھکا کر مسکراتے جاتا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ سمجھا رہا ہو جتا رہا ہو۔

### گلابی جینپ

ایک روز حسب معمول آصف اور ایلی دونوں کالج گراؤنڈ کے درمیان کھڑے مہر کی دیکھ رہے تھے جو کالج کا حسین ترین نو عمر لڑکا تھا۔ مہر بھاگتا ہوا آ رہا تھا دھنستا اسے ٹھوکر اس کی ٹوپی دور جا پڑی۔ گھنگھریالے بال بکھر گئے۔ اس پر آصف مدہم آوازیں سن گئیں ”کچھ تو نہیں تمہاری تسلیم“ اور ایلی نے ایک نظر مہر کی طرف دیکھا پھر محسوس کرنے لگا جیسے ”ہم شکل ہو۔“

اس کے بعد کی تمام تر بکھری بکھری توجہ مہر پر مرکوز ہو گئی اس کے ذہن میں تسلیم روپ دھار لیا۔

علی الصبح ایلی بڑے شق سے کالج آتا اور پھر آتے ہی اس دروازے پر کھڑا ہوا جانا مہر داخل ہوا کرتا تھا اور وہاں کھڑا مہر کا انتظار کرتا رہتا۔ مہر آ جاتا تو ایلی کے جسم میں کچھ کرنٹ سی دوڑ جاتی اور پھر وہ سارا دن یہ سوچتا رہتا کہ کس مقام پر کھڑا ہو۔ اور کس دیکھے تاکہ مہر کا مسکراتا ہوا چہرہ پورے طور پر اسے نظر آتا رہے۔ دوسرے وقت جب ہوتی تو آصف اور ایلی کالج کے دروازے کی طرف بھاگتے جس سے گزر کر مہر گھبرا جاتا۔

قدر لطف انداز اختیار کر سکتی ہیں خصوصاً وہ چوبارے جو اس کے متصل اور ملحق تھے ان کی کمین  
و بے حد جاذب نظر تھیں۔ بازار میں دورویہ خوبصورت دوکانیں تھیں جن میں ہوازیوں کی  
سزت تھی۔

ہوازیوں کی دوکانوں پر آتے جاتے پان کھانے کے بہانے کھڑے ہو جاتے اور پھر عاشقانہ  
نظروں سے چوباروں کی طرف دیکھتے۔ ان کے متعلق فقرے چست کرتے یا عریاں اشارے  
کرتے جس پر چوباروں میں بیٹھی ہوئی رقاصائیں لطیف تبسم سے منہ پھیر لیتیں۔  
شام کے وقت اس کوچے میں گویا بہار آجاتی تھی۔ چوبارے والیاں شام سے پہلے ہی نہادھو  
کر نیا جوڑا بدلتیں سنگار کرنے کے بعد وہ تیار ہو کر جنگلے میں آ بیٹھتیں۔

رات پڑتے ہی محفل ہائے نشاط آراستہ ہو جاتیں۔ کٹرہ موسیقی کی آوازوں سے  
گونجنا سارنگیاں چمڑ جاتیں کھٹکھٹو بجاتے لے بلپٹ سے شروع ہو کر درت ہوتی جاتی اور  
جوں جوں رات بھیکتی گیت کے بولوں کی ادائیگی میں عربانی کا عنصر بڑھتا جاتا۔  
نیچے بازار میں محروم مگر شوقین مزدوروں کی پکیوں سی سڑک اور دیواریں رنگی جاتیں اور ان  
کے نعرے بلند ہوتے جاتے۔

”میری جان۔“

”ایک نظر ادھر بھی۔“

”ذمہ ل کھنا دل پرد۔ سیل دار ابجی رکھنا۔“

بلاخر ان کی محرومی اضطراب میں بدل جاتی اور کسی معمولی سے بہانے پر یہ اضطراب شدت  
اختیار کر لیتا اور پھر آپس میں گلی گلوچ تک نوبت پہنچ جاتی اور کٹرہ میں لڑائی شروع ہو جاتی  
کسی کا سر پھٹ جاتا کسی کا پیٹ چاک کر دیا جاتا پھر پولیس میدان عمل میں آ پہنچتی۔ اب جگر تھام  
کے نیمو میری باری آئی۔ کی سی نگاہیں ڈالتے ہوئے چوباروں میں بیٹھے ہوئے سیٹھ اس ہنگامے  
سے گھبرا کر میراثیوں کو درخواست کر دیتے اور رقاصہ کا قرب حاصل کر کے خود کو ایک شدید  
ترہنگامے کے حوالے کر دیتے تاکہ کٹرہ کے ہنگامے سے نجات حاصل کر سکیں۔

مجسم شعر

ایلی یا سمین سینا کی فراخ ڈیوڑھی میں کھڑا حیرانی سے کٹرہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سینا

میں ملیے۔ وہاں سے ہم سینما جائیں گے۔

ہم ایلی سے ملتے ہی مخصوص انداز میں چلانا شروع کر دیتے ”ایلی صاحب یہ کیا مصیبت  
ہے آپ ایسے دکھائی دے رہے ہیں جیسے قیامت ٹوٹی ہوئی ہو، عشق تو نہیں ہو گیا کیس۔ عین  
سے بچنے کا بہترین طریقہ ہم بتائیں گے۔ آئیے آئیے نا صاحب۔“ اور وہ اسے دودھ کی دوکان پر  
لے جاتے۔ ہاں پہلوان ذرا آدھ سیر دودھ میں چار پیڑے بلوٹا۔ بس الیاں صاحب صبح و شام کھا  
پیو انشاء اللہ عشق قریب نہیں پھٹکے گا۔ اس مرض کے لیے دودھ ہی تریاق ہے اور سگریٹ اور  
چائے سے پرہیز لازم ہے۔ آئیے اب سینما چلیں۔ سینما دیکھنا صحت کے لیے بے حد مفید ہوتا  
ہے آئیے رام بلغ میں مسٹرز آف نورا کی فلم گلی ہے۔ اور وہ دونوں سینما چلے جاتے وہاں  
سگریٹ پیتے پوریاں کھاتے اور پھر شیخ ہمد رات کی گاڑی سے واپس علی پور چلے جاتے اور ایلی  
آموں والی کو خسی کا رخ کر لیتا۔ ایلی کے دل میں ایک دبی دبی امید تھی کہ شاید کسی روز شیخ ہمد  
یا سمین سینما ہاؤس جانے کا ارادہ کر لیں جو کٹرہ رنگین میں واقع تھی لیکن ہمد نے کبھی اس بل  
میں جانے کی بات نہ کی تھی۔

پھر ایک روز امرتسر میں دو مشہور شاعر تشریف لائے۔ جن سے آصف کے گہرے تعلقات  
تھے ان کی آمد پر آصف کو امرتسر میں ایک عظیم مشاعرے کا انتظام کرنا پڑا اور حسن اتفاق سے  
مشاعرہ یا سمین سینما ہال میں ہونا قرار پایا۔ جو اس ممنوع کٹرہ میں واقع تھا آصف نے پہلے تو بہن  
کوشش کی کہ مشاعرے کا انتظام کسی اور جگہ ہو جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہوا بہر حال آکر  
اسے کٹرہ میں جانا ہی پڑا۔

کٹرہ رنگین امرتسر کے خوب صورت ترین بازاروں میں سے تھا اس کی لمبائی ایک فرلانگ  
سے زیادہ نہ تھی ویسے کافی فراخ تھا۔ سڑک کے دو دروازے خوبصورت چوبارے بنے ہوئے تھے جن  
کے جھجے بڑھے ہوئے تھے جن پر رنگ روغن کیا ہوا تھا۔ ان چھجوں کے پیچھے فراخ چوباروں  
چاند نیاں بچھی ہوئی تھیں۔ گاؤ نکلیے لگے ہوئے تھے اور چھتوں سے جھاڑ فانوس لٹکتے دکھائی  
تھے۔ جنگلوں میں خوب صورت رقاصائیں دیدہ زیب ملبوسات پہنے بڑے طمطراق سے بیٹھی  
غلط انداز سے نیچے بازار کی طرف دیکھتی رہتیں۔ ان کی حرکات جمیل تھیں آوازیں اچھا  
تھیں۔

ایلی انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کبھی تصور نہ کر سکتا تھا کہ ناچنے گانے والی عورتیں

سمتے ہو کب۔“ اس نے جملہ لوگوں کو مخاطب کر کے پوچھا۔ اور طوائف کی طرف ٹکلی باندھ کر با  
آواز بلند یہ شعر پڑھنے لگا۔  
نظر کو ہے عادت تماشا!  
جہاں ہو جیسا ہو جس طرح ہو

کوئی یہ حسن ازل سے کہہ دے  
کہ جلوہ آرا ہو جس طرح ہو  
شعرن کر سب لوگ جھومنے لگے اور آصف گہرا کراہی کی طرف بڑھا۔  
”ہائیں۔ آصف اہلی کے پاس کھڑے ایک شخص کو دیکھ کر بولا آپ ہیں آغا صاحب آپ  
ہیں۔“

آغا صاحب۔ اہلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا وہ درمیانے قد کا شخص تھا چہرے پر  
مہمت کے آثار تھے اور انداز سے خلوص ٹپکتا تھا۔  
”یہ ہیں الیاس میرے ہم جماعت اور دوست۔“ آصف نے آغا سے کہا۔

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ آغا صاحب نے اہلی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا  
”آپ امرتسر کے رہنے والے ہیں۔“

”اہلی نے جواب دیا۔ ”میں تو علی پور کا ہوں۔“ ”علی پور“ آغا صاحب نے  
دہرایا ”وہاں میرا ایک عزیز دوست علی احمد رہتے ہیں۔ بڑے رنگین مزاج ہیں۔“ وہ ہنسنے لگا۔  
”یہ انہیں کے بیٹے ہیں۔“ آصف مسکرا کر بولا۔

”علی احمد کے بیٹے۔“ آغا صاحب نے پھر اہلی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کتنی خوشی  
ہوئی آپ سے مل کر خاکسار کو آغا غلام بخش کہتے ہیں۔ آپ کے والد صاحب میرے گھرے  
دوست ہیں اور مہربان بھی۔“

آغا غلام بخش۔ اہلی کی نگاہ میں گرد و پیش دھندلا گئے۔ نہ جانے وہ جوان شاعر بیڑھیوں پر  
بیٹھا کیا کہہ رہا تھا۔ نہ جانے چوہارے میں بیٹھی ہوئی گلابی کرپ میں لمبوس رقاصہ کیسے مسکرا  
رہی تھی۔ اہلی کی نگاہوں تلے اس شور بھرے دھندلے میں آغا صاحب کے علاوہ کبھی معدوم ہو  
چکے تھے اور آغا صاحب کے عقب میں ایک تھنڈی لٹ لٹ رہی تھی اور ایک رنگین وجہ

کے مقابل کے چوہارے میں بیٹھی ہوئی رقاصہ کس قدر حسین و جمیل تھی۔ اس کی حرکات  
قدر متوازن اور دلچسپ تھیں۔ اس کا وہ بے پروائی اور بے نیازی بھرا انداز اسے اور بھی  
صورت بنا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے رقاصہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی حرکت سے  
ستاہن۔ عربانی یا نمائش کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

آصف سینما ہل کے اندر چھپا ہوا تھا تاکہ کوئی اسے وہاں دیکھ نہ پائے۔ اہلی ڈیوڑھی  
کھڑا چوری چوری چوہاروں کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے دائیں بائیں کھڑے کبھی لوگ  
ٹکلی سے طوائفوں کی طرف دیکھ رہے تھے پھر بھی نہ جانے کیوں ادھر دیکھتے ہوئے اس پر  
دھڑکنے لگا ایک لٹ جانا سا خوف طاری ہو جاتا حالانکہ وہ سب ادھر دیکھنے میں اس قدر  
مصروف تھے کہ انہیں اہلی کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی اور اگر فرصت ہوتی بھی تو  
کے اس فعل کو قطعی طور پر اہمیت نہ دیتے۔

دلفنٹا۔ ایک اور گردہ ڈیوڑھی میں داخل ہوا جس کے پیش پیش ایک نوجوان تھا جس  
بال بکھرے ہوئے تھے آنکھوں میں مستی جھلک رہی تھی اور چہرے سے ٹکلی اور ذہانت  
تھی۔

”آغا۔“ وہ سامنے کے چوہارے میں بیٹھی ہوئی حسینہ کی طرف دیکھ کر بے  
سے چلایا ”سبحان اللہ۔ حضور تو مجسم شعر ہیں۔ واہ واہ۔ واہ واہ۔“ وہ ٹکلی باندھ کر وہاں  
رقاصہ کی طرف دیکھنے لگا اس کے ساتھی مسکرانے لگے۔

”واہ واہ کیا انداز دلیری ہے حسن بذات خود انگشت بدلتا ہے۔“ رقاصہ نے شور  
ایک بھر پور نگاہ اس نوجوان پر ڈالی۔

نوجوان عالم مستی میں سینما کے دروازے کی بیڑھیوں پر بیٹھ کر رقاصہ کی طرف دیکھ رہا  
چلانے لگا۔ ”اللہ کی قسم۔ ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است۔“ آصف بھاگتا ہوا  
باہر نکلا اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور وہ کانپ رہا تھا۔ وہ شاعر سے مخاطب ہو کر چلایا ”یہ کیا کر  
ہیں آپ لوگ کیا کہیں گے۔“

آغا

”بھئی واہ۔“ بے خود حیرانی سے چلایا۔ ”اس میں کہنے کی بات کیا ہے۔ کیوں بھی“

مسکرا رہا تھا۔

”تسلیم“ آصف نے مسکرا کر ایللی کی طرف بامعنی انداز سے کہا ”تسلیم“ تھا صاحب  
عقب میں کسی تبسم چہرے نے گھٹکھریالی لٹ جھٹک کر کہا۔

ایللی کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ وہ خوشی سے ناچنے لگے اور چیخ کر کے ”تسلیم“  
اچھے ہیں۔“

”تسلیم آپ آغا صاحب ہیں۔“ تسلیم مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔“

\_\_\_\_\_

آغا صاحب کامکان یا سمین سینما کے قریب ہی کسٹرو رنگین میں واقع تھا مکان کے بار  
سنار کی دوکان تھی جس کے پیچھے ایک والاں تھا جس میں مک کھلتا تھا جسے ملاقاتی کرے کے  
استعمال کیا جاتا تھا اور جس کے ایک پہلو میں ایک زینہ اوپر کو چلا گیا تھا۔ آغا کے کمرے  
اوپر چوبارے میں رہتے تھے اور یہ چوبارہ کسٹرو کے باقی چوباروں کی طرح تھا۔ فرق مرز  
قدر تھا کہ اس کے آگے بالکونی نہ تھی اور چوبارے کی تین کھڑکیوں پر چھتیں پڑی ہوئی تھیں  
ان کھڑکیوں سی کبھی کسی نے باہر نہ جھانکا تھا۔

ایللی اس بات پر حیران نہ ہوا کہ وہ اس چوبارے میں کیوں رہتے تھے اور اگر رہتے  
کسٹرو کی رسم کے مطابق وہ کھڑکیوں چتوں سے خالی کیوں نہ تھیں یہ باتیں غیر اہم  
اس لیے یہ تفصیلات اس کی توجہ کو جذب نہ کر سکیں اور وہ اپنی امیدوں کے اس گہوار  
دیکھنے میں کھو گیا۔

تیم نیم

آغا کے ساتھ ملاقاتی کرے میں بیٹھے ہوئے اس کے احساسات عجیب سے تھے وہ اس  
پر سرت محسوس کر رہا تھا کہ وہ اسی مکان میں بیٹھا ہے جہاں وہ رہتی ہے اسی چھت تلے ہے  
جس کے اوپر نہ جانے وہ کس کام میں مصروف ہے آغا سے باتیں کرنے کے بلو جہاں سے  
ان آوازوں پر لگے ہوئے تھے جو اوپر سے آ رہی تھیں۔ ”ہائے میں کیا کروں۔ لو میں کیا  
یوں ہوتا ہے۔“ ان آوازوں میں لے تھے راگ تھا۔ شوخی تھی۔ ان قدموں کی آواز  
ترنم تھا۔ اوپر سے بہت سی آوازیں آ رہی تھیں لیکن ان سب کا ایک ہی سا انداز تھا۔

میں ایللی ہوں۔ نہ جانے اس کی آواز کون سی تھی۔

جب والاں کے اوپر چٹکے سے کوئی پلو لہراتا ہوا نکل جاتا تو ایللی کا دل دھک سے رہ جاتا۔ ان  
پلوں کی اڑان کتنی حسین تھی۔ بظاہر وہ آغا سے باتیں کر رہا تھا مگر اس کا دل کسی اور ہی لے پر  
بیٹھ رہا تھا اور آغا میں بھی کتنی مٹھاس تھی اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک دبیز تہ چڑھی ہوئی  
تھی۔ سکون اور اطمینان۔ گویا وہ یوں اپنے آپ میں گمن تھا جیسے کوئی ناؤ کسی ساکن جھیل میں  
چوڑوں کی مدد کے بغیر آپ ہی آپ رواں ہو۔

”اچھا بھی میں ذرا نہالوں۔“ آغا صاحب اٹھ بیٹھے۔ ”ابھی پانچ منٹ میں حاضر ہوا۔“ وہ  
زیر ہی غسل خانے میں داخل ہو گئے۔

ایللی موقع غنیمت جان کر بلا تکلف اوپر دیکھنے لگا جہاں سفید سفید انجل لہرا رہے تھے ”بھائی  
جان۔“ ایک سرلی آواز سنائی دی۔ معصوم گلابی چہرہ جھکا۔ ایک تبسم جھلکا۔ ”بھائی جان۔“ پھر  
آواز آئی۔

چند ساعت کے بعد نو دس سال کی ایک حسین چینی کی گڑیاں نیچے اتر آئی۔ اس نے ایللی کی  
طرف دیکھا اور پھر ایک تبسم مسکراہٹ سے شرابا کر منہ موڑ لیا وہ صابون اور تولیہ غسل خانے  
کے دروازے پر رکھ کر بھاگ گئی اور پھر دروازے کی درز سے مسکرا مسکرا کر جھانکنے لگی۔

”رکھ دیا نیم۔“ آغا نے پوچھا۔

”جی دروازے میں ہے۔“ وہ بولی اور پھر بامعنی انداز سے مسکرا کر بھاگ گئی۔  
”آہستہ آہستہ ایللی اور نیم دوست بن گئے۔ جب ایللی زینے میں کھڑے ہو کر آواز دیتا ”آغا  
صاحب“ تو بھائی منزل کے دروازے میں رنگین سرگوشیاں ہوتیں۔ پھر نیم مسکراتی ہوئی نیچے اتر  
آئی۔

”وہ کمال ہے نیم۔“ ایللی اس سے دلی آواز میں پوچھتا۔  
”ہے“ وہ کتنی ”دہل دروازے کی اوٹ میں۔“ وہ زیادہ تراشاروں میں جواب دیتی تھی۔  
اس کے اشارات میں عجیب شان بے نیازی تھی۔  
”اس سے کوساٹنے آئے۔“ ایللی کہتا۔  
”ہونہ۔ وہ نہیں آتی ہم کیا کریں۔“  
”تم نے کہا بھی تھا۔“

طور پر مختلف تھی۔ جسمانی طور پر بھی ان دونوں میں کوئی مشابہت نہ تھی۔ حتیٰ کا جسم پتلا دھلا تھا اس کے چہرے پر شوخی اور اضطراب چھائے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ حتیٰ کے خدو خلل بے حد جاذبِ نظر تھے۔ ایللی نے جب پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو وہ چونک پڑا۔ اس وقت وہ گرم چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ سبز چادر میں خوب صورت خدو خلل کو دیکھ کر ایللی نے سمجھا جیسے کوئی خاتون غلطی سے مردانے میں آگئی ہو۔

حتیٰ بہت جلد ایللی سے مانوس ہو گیا۔ اس کی باتیں عجیب تھیں ”ایللی“ وہ چلاتا آؤ ایللی ہمیں میٹھ کر لائیں۔ آؤ ہمیں تمہاری ہم نام کے پاس لے چلوں۔ اتنی رسیلی آنکھ ہے کہ اگر اس کی ایک نگاہ پڑ گئی تم پر تو طبیعت صاف ہو جائے گی اور کیا جسم ہے۔ شعلے نکلنے شعلے۔ چلو ملا لاؤں ہمیں۔ اپنے پر تو مرتی ہے لیکن بڑی اچھی ہے چلو۔“

ایللی حیرانی سے اس کی باتیں سنتا اور پھر گھبرا کر کہتا ”پھر سہی کبھی۔“ اور حتیٰ منہ بنا کر کہتا ”چھا بھئی تو پھر میں تو چلا۔“ اور پھر تنہائی میں بیٹھ کر ایللی اوپر گم کی طرف دیکھتا اور نیم کو اشارے کرتا اور نیم تسلیم کا بازو پکڑ کر اسے بیڑھیوں کی طرف کھینچتی اور تسلیم ہنسنے جاتی حتیٰ کہ بوڑھی دادی شور مچانا شروع کر دیتی ”لڑکیو یہ کیا غل غپاڑہ ہے۔ آرام سے بیٹھو۔“ اور لڑکیاں خاموش ہو جاتیں اور ایللی چپ چاپ محروم اور مایوس انداز سے باہر نکل کر بورڈنگ کی طرف چل پڑتا۔

### گھما گھمی

بورڈنگ کی اس دیران کو غمی میں بیٹھے ہوئے وہ سوچتا۔ کیا یہ محبت ہے کیا یہی وہ محبت ہے جس کے متعلق شریف اسے خبردار کیا کرتا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں اسے احساسِ تشنگی ہوتا۔ بات کسی لحاظ سے بھی تو مکمل نہ تھی۔ نہ تو تسلیم نے کبھی تھیلی میں سلا ہوا امینڈک اس پر پھینکا تھا اور نہ کسی اور طریقے سے ایللی کی محبت کی سنجیدگی کو محسوس کیا تھا۔ بلکہ تسلیم کے رویے کو دیکھ کر ایللی سوچتا تھا کہ وہ تو بچوں کا کھیل کھیل رہے تھے محبت نہیں کر رہے تھے۔ کیا محبت بچوں کا کھیل ہوتی ہے۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اتنی عظیم چیز بچوں کا کھیل کیسے ہو سکتی ہے۔ اسے یوں خاموش بیٹھے دیکھ کر مولا داو چلاتا۔ ”یہ کیا صورت بنا رکھی ہے ایللی۔ کیا ہماری زندگی بھی حرام کو کے چلو باغ سے امروہ چرا کر کھائیں۔ کیوں شفیق“

”کہہ رہی ہوں کہا تھا کہا تھا اور کیا کرتی۔“

”پھر کیا کہتی ہے وہ۔“

”بس ہنسے جاتی ہے۔ چھوڑو اسے۔“ وہ ہونٹ نکال کر جواب دیتی ”مجھے سناؤ“

”کراؤ نہ کراؤ گے۔“ وہ زبردستی اپنی بات جھینڈ دیتی۔

”لے چلوں گا۔ لے چلوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کیا وہ باہر نہیں نکلتی۔ کیسے جاتی نہیں۔ یا ویسے۔“

”ہونہ وہ کیا جائے گی۔“ وہ تحقیر سے ہونٹ نکالتی۔ ”چھوڑو اسے۔“

### ہوتا ہے، ہوتا ہے

”پہلے جا کر اس سے کوکو دردوازے سے جھانکے۔ بڑی پیاری ہے نیم۔ جاؤ۔“ مشکل سے اوپر جانے کیلئے تیار ہوئی۔ پھر آہستہ آہستہ بیڑھیاں چڑھتی پھر اوپر کے دروازے رکتیں سرگوشیاں ہوتیں۔ ہلکے ہلکے قہقہے سنائی دیتے اور بالآخر دردوازے سے ایک سفید بازو کھڑا اور انگلیاں یوں ناچتیں جیسے کتھا کلی کے کسی مندر کی مشق کر رہی ہوں۔ پھر لٹ اڑتی۔

لو اس سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی ہنس کر کہتی۔  
بالآخر نیم نیچے از آتی۔ ”وہ نہیں آتی سامنے کہتی ہے ہم کسی کے سامنے ٹپ کرتے۔“ وہ منہ بنا کر کہتی۔

ایللی روز جان بوجھ کر ایسے وقت آنا کے یہاں جایا کرتا تھا جب وہ گھر پر نہ ہوں اور ڈرتے ڈرتے دیر تک بیڑھیوں میں کھڑا رہتا۔ پھر وہ شام کے وقت دوبارہ وہاں جاتا۔ صاحب کے پاس بیٹھا رہتا اور اوپر سے عجیب و غریب باطنی آوازیں سنائی دیتیں۔ بلکہ کبھی کبھی موقعہ پا کر لوہے کی سلاخوں سے سفید بازو جھولتے اور کوئی کہتی ”لو اس سے!“ ہے۔ ”اور کوئی جواب دیتی۔“ ”ہوتا ہے ہوتا ہے۔“ اور ایللی محسوس کرتا جیسے اس آواز سے پھر وہ سوچنے لگتا کہ آخر کس بات سے کچھ ہوتا ہے اور وہ دیر تک سوچتا رہتا۔ حتیٰ کہ آواز نہا کر باہر نکل آتے اور کپڑے پہننے لگتے اور پھر وہ دونوں باہر گھومنے کے لیے چلے جاتے شام کے وقت حتیٰ آجاتا۔ حتیٰ آنا کا چھوٹا بھائی تھا مگر اس کی طبیعت آنا صاحب



”ہمارے محلے والے کہہ رہے ہیں۔“  
 ”کیا کہہ رہے ہیں۔“ ایلی نے گہرا کر پوچھا۔  
 ”کہتے ہیں کہ امرتسر میں عشق کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ کالج تو محض بھانہ ہے۔ اس قدر  
 قریب رہتے ہوئے بھی اب علی پور آنے کی فرصت نہیں ملتی۔“  
 رضا سے مل کر جب وہ محلے میں پہنچا تو اس نے محسوس کیا جیسے سبھی لوگ اس کی طرف  
 دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگے۔

”ہائیں ”چچا امداد چلائے“ کیوں بھی ایلی آگیا تجھے بھی ہوش پڑ گیا اسی چاؤ کے چکر میں آخر  
 بیٹا کس کا ہے شاباش“ غصے سے ایلی کے کان سرخ ہو گئے۔

”اے۔ ہے یہ تو ایلی ہے اپنا“ محلے کی عورتوں نے اسے دیکھ کر شور مچایا۔  
 ”اللہ عمر دراز کرے۔ جیتا رہے۔ مل کا کچھ ٹھنڈا رہے۔“

”ہائے ایلی تو اب عید کا چاند ہو گیا۔“ ”جوان ہو گیا ہے نا“ دوسری مسکرا کر بولی۔  
 ”ہمارے لیے تو وہی ایلی ہے۔“ ایک مسکرائی۔

”کیوں ایلی کیا امرتسر میں جی لگ گیا تیرا۔ اب تو علی پور کی طرف رخ ہی نہیں کرتا۔“  
 ”پڑھائی ہے فرصت بھی ہو۔“ ایک نے طنزاً کہا۔

”تو آیا ہے ایلی۔“ ہاجرہ شور سن کر بھاگی بھاگی آئی ”آ میں تو کب سے تیرا انتظار کر رہی  
 تھی۔“

”اب اس کا انتظار کیا کرے گی تو۔“ چچی نے مسکرا کر کہا ”اللہ رکھے اب جوان ہو گیا  
 ہے۔“

داوی ملل اسے دیکھ کر کھڑکی سے چلائیں ”کب آیا تو۔“

”جاداوی ملل سے مل لے۔ اس کا جی اچھا نہیں۔“ ہاجرہ نے کہا۔

داوی ملل کو دیکھ کر وہ بھاگا اور بھاگ کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔

”کیا کرتا ہے تو۔“ وہ چلائی ”وہی جاٹ کا جاٹ ہی رہا تو۔“ اور وہ کھانسنے لگی۔

”کیوں داوی ملل۔ بیمار ہو گیا؟“

”نہیں تو۔“ وہ بولی ”اچھی بھلی ہوں۔“

”نہے کا دورہ پڑتا ہے۔“ سیدہ نے کہا۔

شفیع ہنس کر جواب دیا ”دیکھو تو اپنی صورت۔ دیکھنے میں تو ڈاکو نظر آتے ہو لو کہ  
 چوریاں اور وہ بھی امرتسر کی۔“

پھر وہ دونوں ایلی کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

”اے کیا ہے۔“

”کیا ہے بے تجھے۔“

”عشق کا روگ لگا ہے کیا۔“

”وہ مہر لڑکا ہے ناکالج میں اس پر مرتا ہے تو۔“

”لو اس میں کیا ہے۔“ مولا داو پیار سے کہتا۔ ”کہو تو اٹھا لاؤں اسے یہاں اس کی

میں۔“

”پاکل ہوئے ہو۔“ ایلی چلاتا۔

ایلی نے تسلیم کے متعلق مولا داو اور شفیع سے کبھی بات نہ کی تھی یہ راز صرف

تک محدود تھا۔ جب کبھی وہ آصف سے ملتا اس کا جی چاہتا کہ وہ سنجیدگی سے اس سے پوچھ

آصف محبت کیا ہوتی ہے۔ کس طرح کی جاتی ہے۔ اس نے کئی ایک بار آصف سے پوچھا

پوچھا تھا مگر مسکرانے کے سوا آصف نے کبھی جواب نہیں دیا تھا۔

ہنگامہ

پھر خبر آئی کہ شریف چھٹی پر علی پور آیا ہوا ہے اور ایلی کی آنکھوں میں خوشی

ٹھمنے لگے۔ ”میں جاؤں گا۔“ اس نے آصف سے کہا۔

”تم نہیں جاسکتے۔“ آصف مسکرایا ”تم اسے چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہو۔“

لیکن آصف کے اعتراض کے باوجود وہ گرمی کی چھٹیوں سے دس روز پہلے علی

اب کی بار علی پور ویران نہ تھا وہاں شریف تھا۔ شہزاد تھی رفیق اور ارجمند تھے۔

تھے۔ علی پور پہنچ کر خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ محلے میں پہنچنے سے پہلے

مل گیا جو ایلی کو دیکھ کر چلانے لگا۔

”کیوں بھی فرما۔ وہ نہر کھودنے کا کام ختم ہو گیا۔“

”کیا بلکا ہے تو۔“ ایلی نے اسے گھورا۔

”اس کی نگاہ“ شریف تلی بجا کر اٹھ بیٹھا ”اس کی نگاہ سے تم کیسے دیکھ سکتی ہو۔ ہر کسی کی نگاہ الگ ہوتی ہے۔ ہر کوئی اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے اور۔ اور۔“ اس نے ایک لمبی آہ بھری۔  
”دوسرے دیکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں۔“  
”مجھے کیا معلوم۔“ شہزادہ نہ بنا کر خاموش ہو گئی۔

ایلی سوچنے لگا نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے وہ دونوں۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ شہزاد کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہو۔ ایسی نگاہ سے جس سے شاید شریف نے اسے کبھی نہ دیکھا ہو۔ لیکن شہزادہ جانے اسے کسی کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ گھبرا گیا۔  
”لیکن آپ تو امتحان کی بات کر رہے تھے۔“ اس نے شریف سے کہا۔

”دنیائی امتحانات کی بات نہیں۔“ شریف شہزاد کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”میں تو اس امتحان کی بات کر رہا ہوں۔“ ”اچھا تو پھر کون ہے وہ۔ کیسی ہے۔ سنا ہے بڑی خوب صورت ہے۔“ شہزاد نے ایلی کو عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ ”خوب صورت۔“ شریف ہنسا۔ ”خوب صورت تو وہ ہے ایلی جسے کوئی دیکھنے والا مل جائے۔“

شہزاد نے چتون چڑھا کر کہا ”آپ نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے خوبصورتی۔“  
”پاکل نہ بنو۔“ وہ آہ بھر کر بولا ”زخموں کو طفرے نہیں کریدا کرتے۔“ ایک ساعت کے لیے شہزاد کی آنکھیں گویا کسی نامعلوم جمیل پر تیرنے لگیں پھر دفعتاً ”وہ مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی اور وہ دونوں تنہا رہ گئے۔“

”اب تو تم بڑے آدمی بن گئے ہو۔“ شریف نے کہا ”اب تو لوگ تمہیں دیکھنے لگے ہیں بس دو ہی باتیں ہیں صرف دو۔ باقی سب بیچ ہے۔ سب بیچ! یا تو تم میں خود دیکھنے کی اہلیت ہو یا دوسروں کی توجہ جذب کرنے کی۔ اور تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم دونوں خصوصیات رکھتے ہو۔“

ایلی گھبرا گیا۔ ”نہ جانے کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“ ”میں نہیں سمجھا۔“  
”سب سمجھ میں آجائے گا۔“ شریف ہنسنے لگا۔ ”بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ آج تم سے مل کر بڑی راحت ہو رہی ہے مجھے۔ تمہاری قسم بڑی راحت۔“

شریف سے ملنے کے بعد جب وہ احاطے میں پہنچا تو اسے ارجمند مل گیا اسے دیکھتے ہی ارجمند چلایا ”اے ایلی۔ تم دی تیلی کے تیلی رہے نا ہمارا سارا اینکرائسڈی تم نے تباہ کر دیا بھی۔ واہ

”کیوں دادی اہل۔“ اس نے دادی سے پوچھا۔  
”اب بھی نہ پڑے گا دے گا دورہ تو کب پڑے گا۔“ وہ ہنسی۔

یعنی اس وقت تیزی سے کسی کے میڑھیوں سے اترنے کی آواز آئی اور جھم سے شہزاد کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ”سنا ہے ایلی آیا ہے۔“  
ایک ساعت کے لیے ایلی شہزاد کو دیکھ کر بھونپکا رہ گیا جالی کے سیاہ دوپٹے پر سفید چمک چمک رہے تھے اور وہ اس کے شانوں پر یوں اڑ رہا تھا۔ جیسے پر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ اس نے ہونٹوں پر عجیب سا تبسم تھا۔ ایسا تبسم جو اس سے پہلے ایلی نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ نگاہوں میں عام معمولی چمک تھی اور گالوں پر سرخی جھلک رہی تھی جیسے لجا رہی ہو۔ وہ تو کبھی لہلائی نہ تھی مگر کے انداز میں تو ہمیشہ بے نیازی کی جھلک ہوتی تھی۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے دفعتاً شہزاد کی پینگی بدل لی ہو۔

”ایلی آؤ نا۔“ وہ بولی ”تمہیں بلا رہے ہیں وہ جلدی آؤ۔“ وہ مسکرائی۔

ایلی کے جسم پر چھوٹیاں چلنے لگیں۔

”اے ہے۔“ دادی اہل بولی ”تو سن ہو کر کیوں رہ گیا۔ دیکھو تو یوں کھڑا ہے جیسے میں نہ ہو۔ جانا ہے ادھر تو جاہو آ۔ میری طرف کیا دیکھتا ہے۔“  
”تمہیں مبارک ہو ایلی۔“ شریف اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا ”تم پہلے امتحان میں ہار گئے۔“

”کونسا امتحان“ ایلی نے پوچھا۔

شریف نے ایک بھر پور نگاہ ایلی پر ڈالی ”پہلے امتحان میں تم پاس ہو گئے اور اگلے امتحان میں بھی تم پاس ہو جاؤ گے۔“

”میں تو ایف اے میں فیل ہو گیا ہوں۔“ ایلی نے گھبرا کر کہا۔ شریف قہقہہ مار کر ہنسا اور پاس کھڑی شہزاد کی طرف دیکھنے لگا۔ سیاہ دوپٹے کے سفید پھولوں کے درمیان ایک گلاب ہوا تھا۔ ”سنٹی ہو۔“ وہ بولا ”ایلی کی باتیں سن رہی ہو۔“

”سن رہی ہوں۔“ وہ بولی ”اب تو میں بھی ایلی کی باتیں بڑے غور سے سننے لگی ہوں۔“  
”وہ کیسے۔“ شریف مسکرایا۔

”اب اس کی نگاہیں تو دیکھو ذرا۔“ وہ بولی۔

دیکھ کر اپنے دل میں فخر محسوس کرتی مگر دُعا کرتی کہ "نہ جانے اسے کیا خیال آتا کہ وہ مسرت بھری نگاہِ حریت میں بدل جاتی۔ اس کی آنکھیں بھر آتیں اور وہ منہ موڑ کر آنسو پونچھتی۔ اس پر ارجمند فقہہ مار کر ہنستا اور کہتا۔ "اماں رو رہی ہو تم۔ واہ اماں رونے کی اس میں کوئی بات ہے۔ مابدولت اب بڑے ہو گئے ہیں۔ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سمجھو اب سکھ چین کا زمانہ آ گیا۔ چٹنی کی جگہ مابدولت کے حکم سے چاہیل اور کوفتے ہوں گے اور سوکھی روٹی کی جگہ پراٹھے۔" وہ جھک کر اماں کو آغوش میں لے لیتا۔ "اب تو کوئی رونے کی بات نہیں اماں۔" وہ ہنستا۔ "نہیں اماں ہم مریں گے نہیں۔ اللہ میاں نے جو تیسویں پارے میں صاف لکھا ہے کہ ارجمند نہیں مرے گا جب تک اس کے یہاں بارہ لڑکے اور چھ لڑکیاں پیدا نہ ہو جائیں گی اور اس کی داڑھی دو فٹ گیارہ انچ تک نہ بڑھ جائے گی۔ واہ تم ویسے ہی روتی ہو اماں۔"

ان کی جواں مری کے متعلق تمام محلے میں چرچا تھا۔ لوگ محسوس کرتے تھے کہ ان کی جوانی پیغامِ اجل لاتی ہے حالانکہ اب تک صرف ایک بھائی ہی فوت ہوا تھا اور پانچ بھائی بچپن کے مختلف مدارج طے کر رہے تھے۔

### سچا عاشق

نوکر ہونے کے بعد ارجمند نے اعلانیہ طور پر احاطے میں کھڑے ہو کر انگریزی کے شغل میں مصروف رہنے کی عادت چھوڑ دی تھی۔ وہ احاطے میں کھڑا ہوتا تو تھا مگر اس کے انداز میں ایک وقار سا پیدا ہو گیا تھا اگرچہ اس کے جذبات وہی پرانے تھے اور اس کا طریق کار بھی نہ بدلا تھا۔

لیکن امیلی کے لیے اب اس شغل میں حصہ لینا ممکن نہ رہا تھا۔ وہ کیسے احاطے میں کھڑا ہو سکتا تھا اسے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ محبت لگانے کے بعد اس کا لڑکیوں کو دیکھنا مناسب نہیں۔ لوگ سمجھیں گے کہ اس کا عشق محض ایک ڈھونگ ہے۔ جسمانی لذت کے حصول کا ذریعہ۔ اور پھر وہ ہنس کر کہیں گے کیوں نہ ہو آخر بیٹا کس کا ہے۔

امیلی کو جس قدر نفرت اس ایک جملے سے تھی کسی اور چیز سے نہ تھی۔ اسے خود علی احمد کے طریقہ کار سے نفرت تھی شاید اس لیے کہ ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے اسے بہت دکھ پہنچا تھا۔ اس کی ماں کی زندگی تباہ ہوئی تھی۔ ان کا گھر برباد رہا تھا پھر وہ اس انداز کو کیسے اچھا

عجیب آدمی ہو۔ اتنا ترین کیا تھا تمہیں۔ سب اکثرت گیا۔ سنا ہے محبت لگا بیٹھے ہو۔ ارجمند توقف محبت لگانا مردوں کا کام نہیں۔ مردوں کا کام تو پھول پھول پر بیٹھ کر لطف اندوز ہونا ہے۔ ہم لوگوں کی دوستی ملاحظہ ہو یار جب سے شاہ کاکو کی فیکٹری میں ملازم ہوا ہوں ہر سانس خیال رہا ہے کہ گاؤں کی گوریاں جن جن کے پھنسا رکھوں۔ اپنے لیے نہیں۔ تمہاری قسم! اس خیال سے کہ یار لوگوں کو بلا کر کبھی عیش کرا دوں۔ وہ محفل جملوں کہ سالے عمر بھر رکھیں۔ مگر یار ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تم نے یہ عشق کی بیماری لگا کر۔ آخر تلی ہی ہے کتے ہیں تاکہ کتے کی دم کو بیس سال لوہے کی تلی میں رکھو پر نکالو گے جب تو سلی ٹیڑھی ہی جا گی۔"

### چھ بھائی

ارجمند کو شاہ کاکو کی فیکٹری میں نوکری کرتے صرف چھ ماہ کا عرصہ ہوا تھا اس عرصے میں وہ بہت بدل چکا تھا۔ اول تو اس کا قد بہت لمبا ہو چکا تھا۔ ارجمند کے تمام بھائی دراز تھے۔ محلے میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو قد میں ان کی برابری کر سکتا ہو۔ ان بھائیوں میں تین بڑے خصوصیات تھیں ایک تو وہ سب غیر معمولی طور پر دراز قد تھے۔ دوسرے تمام کے تمام بھائی دراز مزاج تھے اور سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو مذاق میں ٹال دیا کرتے تھے اور بڑی سے بڑی معین ہنس کے برداشت کرنے کے عادی تھے۔

ان کے والد ڈاکٹر تھے۔ والد کے زیر سایہ انہوں نے بڑی ناز و نعمت سے بچپن گزارا تھا۔ والد کی وفات کے بعد مالی مشکلات کا دور آیا۔ وہ گھر میں چھپ کر چٹنی سے روٹی کھاتے اور باہر نکل کر یوں موٹھیں سنوارا کرتے جیسے کوفتے کھا کر آئے ہوں۔ لیکن ان کی خصوصیت بہت الم انگیز تھی۔ بچپن گزر جانے پر وہ دفعتاً "اونچے لمبے جوان بن جانے" یہاں تک کہ عام دروازوں سے گزرتا بھی ان کے لیے مشکل ہو جاتا لیکن جوانی اپنے پیغامِ اجل لے آتی جوان ہوتے ہی وہ نیا توئی بی کا شکار ہو جاتے یا کسی اور وجہ سے آہٹا جاتے۔ باپ کی وفات کے بعد ارجمند کا بڑا بھائی بھرپور جوانی میں فوت ہو چکا تھا۔ اس کی وفات ان کے گھرانے کی حالت اور بھی نازک ہو گئی تھی۔ اب ارجمند جوان ہو رہا تھا۔ ارجمند کی بوڑھی ماں جو مصائب کی وجہ سے جیتے جی گویا پاگل ہو چکی تھی ارجمند

مخلق نہ جانے کیا خیال آیا تھا۔ اس کے دل میں اکثر شہزاد کو دیکھ کر طوفان سا پیدا ہو جاتا تھا۔ ایک عجیب سا طوفان بد تمیزی۔

ایک طرف مونگیا گٹھڑی کے پٹ کھل جاتے۔ دوسری طرف نیلی جھیل میں کنول سا ابھرتا۔ مینڈک لہار لگانے لگتا اور دو سفید سے بازو لہراتے اور دو رنگین خوں ہاتھ اس کی طرف پلکتے اور کہیں سے شریف کی متبسم آواز سنائی دیتی۔ ”ہر کوئی اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے بنگی۔“ اور پھر وہ اس طوفان بد تمیزی کو سمیٹنے کی شدید کوشش کرتا۔

اس طوفان بد تمیزی پر اسے شدید غصہ آتا تھا۔ اپنے آپ پر غصہ آتا۔ وہ محسوس کرتا تھا جیسے علی احمد بنا جا رہا ہو۔ پھر اس کا جی چاہتا کہ بھاگ کر روپوش ہو جائے ”کہاں بٹھاؤ گے۔“ اسے خاموش دیکھ کر شہزاد نے اپنی بات دہرائی۔ ”اسے نہ بٹھا سکے تو مجھے کیسے بٹھاؤ گے۔“ وہ پھر ہنس۔ اس کی ہنسی شرارت آمیز تھی۔

نہ جانے شہزاد کس قسم کی لڑکی تھی۔ ایک انوکھی عجیب سی لڑکی۔ جس کی ہر بات نزالی تھی۔ جس کی ہر حرکت گویا منہموم سے بھری ہوئی تھی۔ نہ جانے شہزاد کی ہر بات چھیڑکیوں دیتی تھی۔ اس کی ہر نگاہ دل میں کھب کیوں جاتی تھی۔ اور یہی نہیں اس کا طرز عمل دودھاری تھا۔ وہ ایک نگاہ سے یوں چھیڑتی جیسے اسے چھیڑ دینے سے دلچسپی ہو اور دوسری نگاہ سے یوں الگ تھلک ہو جاتی جیسے ان باتوں سے بلند تر ہو۔ جیسے اسے فانی مخلوق سے قطعی طور پر کوئی دلچسپی نہ ہو۔ ایک ساعت میں وہ اس قدر قریب آ جاتی تھی جیسے پوچھ رہی ہو۔ ”میں کہاں بیٹھوں۔“ اور دوسری ساعت میں اس قدر دور ہو جاتی۔ دور — اس افق سے بھی دور جہاں گلابی جھیلوں میں نیلے مینڈک پھد کتے تھے۔ ایک وقت اس کا تبسم گویا دل کو کاٹ کر رکھ دیتا اور پھر دوسری ساعت میں اس کے ہونٹوں میں ایک ہلکی سی سلوٹ پیدا ہو جاتی اور محسوس ہوتا جیسے وہ مذاق اڑا رہی ہو۔ تنقید کر رہی ہو۔ رنگینی کے بلوغ اس میں بے نیازی کا عنصر بہت واضح تھا۔ اعلیٰ سے بلند دبلا ہستی سمجھتا تھا جس کے متعلق ایسی دلی بات نہیں سوچی جاسکتی تھی۔ لیکن یہ کیا معیت تھی کہ ایسی دلی بات نہ جانے کہاں سے اس کے دل میں آگھبتی اور وہ شرمندہ ہو کر کئی اور بات کے متعلق سوچنے کی شدید کوشش کرتا۔

طوطا اور مینا

لیکن اس روز تو شہزاد کا انداز قطعی طور پر مختلف تھا اور اس کا رات کے وقت وہاں اکیلے

سمجھ سکتا تھا اس لیے اس نے اس طریق کار سے پہلو بچانے کے لیے دل میں یہ ایمان پیدا کر لیا تھا کہ محبت کو جسم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ محبت اور جسم دو متضاد باتیں ہیں۔ وقت کئی کے لیے لڑکیوں کی طرف دیکھنا اس کی نظر میں جرم تھا۔ دل گئی کے لیے انگریزی کا کھیل کھیلنا اسے گوارا نہ تھا اور اب جب محلے بھر میں اس کے عشق کے چرچے ہو رہے تھے۔ اب تو اس نے لیے احاطے میں کھڑے ہونا ممکن ہی نہ رہا تھا۔ سچے عاشق کا کام یہ نہیں کہ چوگان میں کھڑے ہو کر نوجوان لڑکیوں سے آنکھیں لڑائے۔ اس کے برعکس سچے عاشق کو تو چاہیے کہ چارپائی پر بار کر مست نگاہوں سے چھت کی طرف گھورتا رہے اور جب تھک جائے تو ٹھنڈی آہ بھر کر ہا بدل لے۔

## طوفان بد تمیزی

اس رات بستر پر لیٹے ہوئے جب وہ نیم کی سرگوشیوں کے متعلق سوچ رہا تھا تو اس۔ پاؤں کی ہلکی سی آہٹ سنی جیسے نیم سیڑھیاں اتر کر تکی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ تصور میں کتنی تڑپ تھی کیسی وضاحت سے آواز آ رہی تھی پھر آہستہ سے دروازہ کھلا جیسے نیم کھولا کرتی تھی۔ ”میں بائیکل کی سیر کرادو۔“

ایک اونچی لمبی نیم کو سامنے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

شہزاد ہنس پڑی ”ڈر گئے۔“

”اوہ آپ ہیں خالہ جی۔“ اعلیٰ اسے خالہ کہا کرتا تھا۔

”ابھی سے سو گئے۔“ وہ پھولدار پروں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔

بیٹھ جاؤ خالہ جی۔ کہہ کر وہ گھبرا گیا۔ اسے بٹھائے کہاں۔ کمرے میں ایک چارپائی کے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔

”کہاں بٹھاؤ گے۔“ شہزاد ہنسی

اعلیٰ محطٹھ کا شہزاد دل کی بات کس طرح بھانپ لیتی تھی کیا وہ اس کے دل کی سب بات سمجھتی تھی۔ اس خیال پر وہ لرز گیا کیونکہ اپنے دل کی سب باتوں کو اپنانے یا ان پر سوچنے سے کبھی جرات نہ ہوئی تھی۔ کئی بار اپنی کسی پوشیدہ خواہش کی ہلکی سی جھلک دیکھ کر وہ گھبرا کر جاتا تھا اور پھر دوسرے امور پر غور کرنے کی کوشش کرتا۔ اس وقت بھی اسے

”میتا کون ہے؟“ ایللی نے پوچھا۔

”وہ بھی تھی بچاری۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا۔ اس کی سُدھ بدھ جاتی رہی۔ اس نے کہا تھا طوطے کو میتا کی کہانی سنا دینا ایک بار۔ شاید اس کہانی کو سن کر سمجھ جائے مگر یکا رہے مجھے معلوم نہ تھا کہ طوطا میں بولے باتیں کرتا ہے اور اس کا اثر اس حد تک ہو سکتا ہے تو یہ ہے۔“ شنزراؤ نے جمر جھری لی۔ ”چھا۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”میں جلتی ہوں ناحق تمہیں بے آرام کیا۔ صبح آؤ گے۔“

”لیکن ذرا ٹھہرو تو۔“ ایللی نے کہا۔

”نہ بھئی۔“ وہ ہنسی ”اب تو تم سے ڈر آنے لگا ہے۔“ اور ہنستی ہوئی چلی گئی۔

ایللی دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ طوطا کون تھا۔ میتا کون تھی اور بے پروا بے نیاز شنزراؤ کو اب ڈر کیوں آنے لگا تھا۔ ایللی کے دل میں جذبات کی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

ایللی کو یہ معلوم بھی کیسے ہوتا کہ شنزراؤ گوگل کے بن کی سانوری کے متعلق بات کر رہی ہے۔ وہ سانوری جسے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ ایک سمانا خواب ہے ایک دلکش تصویر۔ وہ خواب بھلا حقیقت کیسے ہو سکتا تھا۔ حقیقت تو محلے کی لڑکیاں تھیں جو جنوں کے پیچھے چھپ چھپ کر مسکراتی تھیں۔ اور پھر اپنے آپ سے ڈر کر پیچھے ہٹ جاتیں۔ لیکن سانوری تو یوں بے نیازی سے کوٹھے پر شلا کرتی تھی جیسے گرد و پیش ایک ناقابل توجہ منظر پیش کر رہا ہو۔ وہ ایک ساعت کے لیے بھی یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ طوطا میتا کی کہانی کی میتا سانوری تھی جس نے کبھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھا تھا جو اسے قابل التفات ہی نہ سمجھتی تھی۔

اس زمانے میں ایللی نسائی دورخی سے واقف نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ عورت بھی اسی طرح ہوتی ہے جیسے لڑکے ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان کی بظاہر بے نیازی محض ایک پردہ ہوا کرتی ہے۔ اس لیے وہ طوطا میتا کی کہانی کے مفہوم کو نہ سمجھ سکا اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ سانوری نے اسے ایسا مرتبہ بخشا ہے تو وہ خوشی سے ناپنے لگتا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ایک بار ڈنکے کی جوت سے تسلیم کے عشق کا اعلان کر چکا تھا۔

عشق تو ایک بار محبت لگا کے پھر نہیں بدلتے۔ سچی محبت کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے نزدیک وفا تھی۔ سرد مری کے باوجود وفا۔ بے پروائی کے باوجود وفا۔ اگر اسے طوطا میتا کی کہانی کا مفہوم معلوم ہو جاتا تو الٹا وہ کشمکش میں گرفتار ہو جاتا کہ کس طرح تسلیم کو چھوڑ کر سانوری

آتا۔ اور پھر پوچھتا۔ ”کہاں بٹھاؤ گے۔“

وہ چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ ”ایللی۔“ وہ بولی ”میں پوچھنے آئی ہوں کہ کیا تمہیں محبت ہو گئی ہے۔“

ایللی گھبرا گیا۔ وہ اسے کیا جواب دے۔

”اس خبر کی تو محلے میں دھوم مچی ہے آج کل پھر تم مجھ سے کیوں چھپاتے ہو۔“

”چھپاتا تو نہیں۔“ ایللی نے بمشکل کہا۔

”تو بتاؤ نا۔ یہ سچ ہے کیا۔“

ایللی نے اثبات میں سر ہلا دیا اور چپ رہا۔

”کتنے بد نصیب ہو تم ایللی۔“ شنزراؤ کی آواز میں سنجیدگی تھی۔ ”بہت بد نصیب ہو تم۔“

”اگر تم کچھ دیر صبر کرتے اگر تم جلد بازی نہ کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔“

”میں نہیں سمجھا۔“ ایللی نے آہستہ سے کہا۔

وہ مسکرا دی۔ ”اب سمجھنے کا کیا فائدہ۔ اب تو نہ ہی سمجھو تو اچھا ہے۔ جب میں پلے

یہاں محلے میں آئی اور تمہیں دیکھا تو میں سمجھی کہ ایللی ایک عام سالاکا ہے۔ مجھے یہ خیال

پیدا ہوا تھا کہ تمہیں دیکھ کر کسی کے دل میں اتنا گرا اثر پیدا ہو سکتا ہے وہ تو آپے

رہی۔ لیکن اب کیا فائدہ۔ بے کار ہے اب۔ بچاری۔“ وہ آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

ایللی حیران تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

”خالہ“ ایللی بولا۔ ”یہ کیا طوطا میتا کی کہانی سنا رہی ہیں آپ۔“

”ہاں۔“ وہ مسکرائی ”میں سمجھتی تھی۔“ وہ بولی ”یہ طوطا معمولی طوطا ہے جیسے

طوطے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ طوطا بولتا بھی ہے۔ اب تو ہمیں طوطے سے ڈر آنے لگا

پھر ہنسی۔

”جبھی یہاں آگئی ہو اس وقت ایللی۔“ ایللی نے پہلی مرتبہ شنزراؤ سے مذاق کرنے

کی۔

”اونہوں“ وہ سنجیدگی سے بولی ”میری بات چھوڑو۔ یہ تو میتا کا خیال تھا جو مجھے

ہلانا

سے عشق لگائے۔

## ایک اور

اگلے روز صبح ہی علی احمد کی آمد کا شور مچ گیا۔ چچا امداد جو کسی کام سے شیٹن کے گھر تھے واپسی پر احاطے میں آکر چلانے لگے ”بہن نواب۔ بہن نواب۔“

دادی اہل ان کی آواز سن کر بولیں ”اے ہے لڑکیو سنو تو امداد کی آواز آ رہی ہے ان کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھ رہتی ہو۔“

”بہن نواب سے کہہ دو۔“ چچا امداد چلائے ”علی احمد آرہے ہیں میں نے انہیں بلو دیکھا ہے کھانا دانا تیار رکھے اور سیدہ بیٹی“ وہ ہنس کر بولے: ”کتنا ساتھ شمیم بھی ہے بچہ گرا ایک اور بھی۔“ وہ ہنسنے لگے۔

”اے ہے چچا“ ایک بولی۔ ”یہ ایک اور کون ہے۔“

چچا نے۔ ”ہر بار ہوتی ہے ساتھ ایک اور نئی بات ہے کیا۔“

”کیوں نہ ہو ایک اور ساتھ۔“ دوسری بولی ”علی احمد کے ساتھ ایک اور نہ تو کوئی جانے کہ علی احمد ہیں۔“

”مگر چچی اب کی بار کون ہے؟“

”ہو گی کوئی ترکھانی یا ننھی۔“

”اے ہے یہ نہ کہو سنا ہے شریف زادیاں بھی آتی ہیں۔“

”نہ بھی میں تو نہیں مانتی۔ وہ شریف زادی ہی کیا ہوئی جو آگئی۔ اور بہن یوں پکے اور اطمینان سے انگلی پکڑے آتا ہے یہ علی احمد۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے میلے سے گواہی خرید کر لا رہا ہو۔ ذرا نہیں شرماتا ذرا نہیں سوچتا کہ محلے میں جا رہا ہوں محلے والے کہیں گے۔“

”ہونہ۔ محلے والے۔ محلے والوں کی بہن وہ پروا کرتا ہے کیا جو بچ پوچھو تو شرافت فدا ہی میں رہ گئی ہے علی احمد کے پاس اللہ کے فضل سے چار پیسے ہیں۔ اچھے عمدے پر لگا۔ اسے محلے والوں کی کیا پروا۔“

علی احمد کا قافلہ احاطے میں داخل ہوا تو محلے کے مکانوں کی تمام کھڑکیں بھری ہوئی تھیں

بڑھیاں چوہن میں کھڑی تھیں لڑکیاں، چتوں کے پیچھے دکی ہوئی تھیں، جیسے علی احمد کی آمد ایک عظیم واقعہ ہو۔

”علی احمد“ ایک بولی۔ ”سنا ہے پھر ایک اور ساتھ لے آیا ہے۔“

”ہی ہی ہی۔“ علی احمد نے۔ ”چچی وہ تو شمیم کی سہیلی ہے۔“

”ہیش سہیلی ہی بن کر آتی ہے پہلے پہل۔“ ایک چلائی۔

”اے ہے علی احمد تیرے بہانے نہ گئے کیسے کیسے بہانے تراشتا ہے تو“ دوسری نے کہا۔

”ہی ہی ہی۔“ وہ نے ”تو اور کیا صاف صاف کہوں تمہارا لحاظ بھی نہ کروں چاچی۔“

”اے ہے۔ یہ اچھا لحاظ ہے علی احمد“ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

علی احمد ہی ہی کر کے ہوئے ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے اور محلے والیوں کی نگاہیں ان کے پیچھے چلنے ہوئے قافلے پر مرکوز ہو گئیں۔

”چچی ہے تو اونچی لمبی۔“ ایک بولی۔

”ہو گی تو ویسی ہی کالی کلونی۔ ایسی ہی لایا کرتا ہے۔ یہ علی احمد“ دوسری نے کہا۔

نہ جانے کیا چاؤ ہے اس کو۔ گلی سڑی اٹھا لاتا ہے۔“ تیسری نے منہ ہٹا کر کہا۔

”اے ری۔“ ایک چلائی ”میں مرگئی یہ تو ننھی معلوم ہوتی ہے۔“

”ننھی ہے تو اور بھی اچھا ہے اپنے علی احمد کو ناچ نچائے گی۔“

”اے یہی تو وہ چاہتا ہے۔“ چچی نے جواب دیا۔

”اتنی عمر بیت گئی پر ابھی یہ جنون اس کے سر سے نہ گیا۔“

”وہ جنون ہی کیا ہوا اہل جو چلا جائے۔“

دادی اہل نے اپنے کمرے سے آنکھ بچا کر دیکھا پھر دھڑم سے تخت پر گر پڑی۔ جیسے اسے دھچکا لگا ہو۔ پھر بات کیے بغیر تخت پوش پر گڈٹ ہو کر پڑی رہی جیسے سجدے میں پڑی ہو۔

شمیم نے گھر میں داخل ہوتے ہی برقعہ اتار کر پھینک دیا اور تیزی سے بھاگ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کا منہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا آنکھیں رو رو کر ابلی ہوئی تھیں۔ اس کی دونوں لڑکیاں سہمی ہوئی تھیں۔

معذرت

علی احمد اور نوداد وہ چپ چاپ اطمینان سے الگ ایک کمرے میں جا بیٹھے جیسے کوئی بات



کے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

### گورو دیو مہاراج

راجو کے آنے پر چار ایک دن محلے میں بھی شغل رہا ایک مسکرا کر پوچھتی ”علی احمد یہ تو کیا لے آیا ہے۔“

علی احمد مسکرا کر جواب دیتے ”جی جی تو مجھے تم سے پوچھنا ہے یہ میں کیا لایا ہوں۔ خسارہ کا سودا تو نہیں۔“

”دوسری پوچھتی ”علی احمد یہ کیا لے آیا تو دیکھنے میں تو کچھ بھی نہیں۔“

علی احمد ہنس کر کہتے ”ہاں بہن دیکھنے میں کچھ نہیں۔“

پھر کوئی محلے والا چلاتا۔ ”علی احمد اب تمہارے دن نہیں رہے۔“

”ہاں بھی صاحب۔“ وہ ہنستے ”جیسی تو راتیں مٹا رہا ہوں۔“

ایلی بھی راجو کو دیکھ کر حیران تھا اس میں وہ بات ہی نہ تھی۔ کوئی بھی تو بات نہ تھی اس میں۔ بالکل چلا ہوا پٹا نہ جانے کیا ہو گیا تھا اسے۔ جیسے کچھ ہو گیا ہو۔

اگلے روز جب ایلی نے ارجمند سے بات کی تو وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ ”بھئی واہ ایلی تم تیلی کے تیلی ہی رہے صرف علی احمد ہی سیانے آوی ہیں باقی تو سب الو کے پٹھے رہتے ہیں۔ یہاں وہ باغی کے دانت نہیں پالتے جو کھانے کے نہیں بلکہ دکھانے کے ہوں سمجھ میاں۔ پیٹ کی بھوک آنکھیں سیراب کرنے سے نہیں مٹتی۔ سمجھ مگر تم کیا سمجھو گے۔ تم تو ہوئے تیلی کے تیلی۔ مطلب یہ ہے بیٹا وہ کما ہے سیانوں نے کہ عورت دیکھنے کے لیے نہیں لائی جاتی گھر میں۔

پھر صورت پر کیا جاتا۔ تمہارے ابا تو گورو دیو مہاراج ہیں۔ دھن ہیں گورو دیو مہاراج وہ انگریزوں کی سیکھ رکھا ہے کہ واہ وا۔ یوں اڑی چلی آتی ہیں جیسے شمع پر پروانہ آتا ہے۔ آبا کیا گریکھ رکھا ہے تمہارے ابا نے بیٹا اپنے ابا کی قدر و منزلت اس خاکسار سے پوچھو۔ اپنے خادم سے پوچھو۔

خاکسار پرانا کھلاڑی ہے۔ خاکسار نے یہ کھیل ڈپنری کی میزوں پر سیکھا تھا اور آج اتنے سال کے بعد جب خاکسار شاہ کا کو گیا اور جناب یوں سمجھ لو کہ ایک طرف شاہ گاؤں ہے اور دوسری طرف کاکو گاؤں اور درمیان میں بردزے کی فیکٹری ہے جہاں خاکسار شور کیپر ہے۔ اوھر سے شلو کی شزلوایاں آتی ہیں اور اوھر سے کاکو کی کراریاں۔ خاکسار ایک نظر اوھر رکھتا ہے۔ دوسری

ہی نہ ہو یا ہر محلے والیوں کا ہنسنے لگ گیا۔

”ایلی۔“ علی احمد نے آواز دی۔ ”ایلی بھی یہ راجو تم سے ملنے آئی ہے۔ علی احمد تھی کہ علی پور دیکھوں گی۔ اب یہ کام تمہارا ہے ایلی کو اسے گھماؤ پھراؤ۔ ایلی تو علی پور کے چپے سے واقف ہوا۔ ہی ہی ہی۔ کیوں ایلی۔ اچھا تو باجرہ کہاں ہے اسے راجو سے ملائیں۔“

”سیدہ۔ کیا کر رہی ہے۔ تو۔ اوھر آنا اوھر دیکھ یہ راجو تجھ سے ملنے آئی ہے اور تو ہاں چولے کے پاس بیٹھی ہے۔ یہ دولت پور کے رہنے والے ہیں۔ راجپوت ہیں۔ اپنی دوکانیں زمینیں ہیں سبھی جانتے ہیں انہیں وہاں دولت پور میں مشہور خاندان کے ہیں۔ راجپوت ہر عزت والے سمجھے جاتے ہیں۔ آجاؤ۔ آجاؤ بیٹھ جاؤ۔ سیدہ راجو یہ سیدہ ہے میری بہن کی بیٹی۔ میری بیٹی ہی سمجھو۔ اپنے یہاں ہی رہتی ہے۔ اور کو سیدہ کیا حال چال ہے۔ باجرہ نہیں آئی۔ شیم کیا ہوئی۔ سفر کی وجہ سے تھک کر جا پڑی ہو گی اپنے کمرے میں ہی ہی ہی۔ اچھا بھلا چہ ذرا چلم میں دو کوئلے تو رکھ دیتا۔ واقعی سفر میں انسان تھک جاتا ہے۔“

وہ مسلسل بولتے گئے جیسے خاموشی سے ڈرتے ہوں جیسی آواز کے تنکے کا سارا لڑکے ڈوبنے سے بچنا چاہتے ہوں اور پھر ہر بات پر ان کا قہقہہ گونجتا رہا کھوکھلا کھسیانہ قہقہہ جیسے راجو کو لانے پر معذرت کر رہے ہوں۔

”اماں۔“ وہ بھاگے بھاگے اپنی والدہ کی طرف آئے۔ ”اماں تمہارا کیا حال ہے؟“

بھلی ہوں علی احمد ”برھیانے جواب دیا ”ذرا دم کی تکلیف ہے۔ رک جاتا ہے۔“

”پھر تو بہت تکلیف ہوئی۔“

”اب یہی کچھ ہوتا ہے۔ کچھ وقت بیت گیا کچھ بیت جائے گا مگر علی احمد یہ تو کیا لے آیا ہے۔“ داوی اماں نے آہستہ سے کہا۔

”اوہو اماں۔“ وہ ہنسنے ”بہت دہلی ہو گئی ہو۔ کوئی دوا دارو کر رہی ہو۔“ علی احمد کو یوں بات بدلتے دیکھ کر وہ مسکرا کر بولی ”علی احمد تیری عادت نہ بدلی اور دوا کا کیا پوچھتے ہو۔ اب تو نا کرو۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ بولے ”میں ڈاکٹر کو بلاؤں گا اس سے پوچھوں گا۔“ اور پھر راجو کے پاس یوں جا بیٹھے جیسے وہ خود مریض ہوں اور ڈاکٹر ان کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور پھر علی احمد

## سفینہ اور نور

ادھر۔ اس قدر چاق و چوبند رہنے کے باوجود نتیجہ کیا ہے۔ بالکل ٹیل۔ چھ ماہ میں صرف وہ تھیں اور وہ بھی سمجھ لو مجبوری ہے۔ لیکن تمہارے ابا۔ سبحان اللہ گرو دیو جی مہاراجا انگریزی چلاتا ہے بڑھا کہ دولت پور سے علی پور چلی آتی ہیں۔ واہ وا۔ بیٹا بڑے ہو کر پورے اس بڑھے کے کارناموں پر۔ مگر یار اس ہے وہ نسخہ تو لے لو جو وہ استعمال کرتا ہے۔ یہ کلام کرو گے تو سدا سکھی رہو گے۔“

اب تو محلے کے سبھی لوگ اس بارے میں ایلی سے کچھ نہ کچھ کہنے کے لیے باز رہے تھے۔

ایک کہتا ”میاں ایلی مبارک ہو۔“

دوسرا کہتا ”کوننی ماں پسند آئی۔“

تیسرا کہتا ”کیوں ایلی تم کب تک دیکھتے رہو گے میاں اب تو تمہارے دن آگئے۔“

کوئی کہتی ”ایلی تیرے ابا کا چتاؤ کیسا ہے۔“

ایک بولتی۔ ”ایلی تو نہ اس راہ پر چلیو چھوڑ اس کو۔ اس نے تو اپنی جندگی جلا کر لی۔“

پھر اتفاق سے محلے میں دو ایک شادیوں کا اہتمام شروع ہو گیا اور لوگوں کی توجہ علی راجو سے ہٹ کر شادیوں کی طرف مبذول ہو گئی۔



### میراثین

انہی دنوں علی پور میں میراثنوں کا ایک نیا ٹولہ آیا تھا۔ ان میں ایک میراثن زہرہ فغیب کی بیٹی تھی۔ جب وہ نکاتی اس کا حلیہ ہی بدل جاتا۔ اس پر ایک عجیب کیفیت چھا جاتی تھی کہ دیکھنے والے مبسوت ہو کر رہ جاتے۔

محلے کے جوان بچارے انتظار میں رہتے تھے کہ کوئی اہمانہ ہاتھ آئے تو وہ میراثنوں کو بلائیں اور چھت پر چاندنی بیٹھ کر زہرہ کو گاتے دیکھیں۔

کوٹھے پر ایک طرف عورتیں بیٹھ جاتیں۔ درمیان میں میراثنوں کے لئے جگہ مقرر کر دی جاتی۔ دوسری طرف محلے کے جوان بیٹھ کر زہرہ کی طرف متبسم نگاہوں سے دیکھتے۔ جب وہ عورتوں کی طرف دیکھتی تو اس کے چہرے پر مرونی چھائی ہوتی۔ لیکن جب وہ جوانوں کی طرف آنکھ اٹھاتی تو دفعتاً ”گویا سوکھا ہوا پھول از سر نو تازہ ہو جاتا اس پر جوانوں کے ہاتھ چپ چاپ میموں میں کچھ ٹٹولنے لگتے۔ زہرہ کے ساتھیوں کے چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ جاتی اور ان کی تنوں میں جوش پیدا ہو جاتا۔

محلے کی عورتیں میراثنوں کو پسند نہ کرتی تھیں اگرچہ وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور تھیں کہ ان کے آنے سے محلے میں رونق کی لہر دوڑ جاتی ہے اور تقریب میں چل پھل پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر نوجوانوں کا مسکرا مسکرا کر زہرہ کی طرف دیکھنا اور روپے پر روپے دیتے جانا انہیں

کروا آتے ہی ہوں گے۔ بچا۔“ اور پشتراس کے کہ چاچی جواب دیتی وہ اس کے پاس سے نکل جاتی اور کسی اور سے جا کر بات کرنے لگتی۔

”بہا عمرو ہیں۔ سلام کہتی ہوں بابا۔ نماز پڑھ کر آئے ہو۔ یہ کس وقت کی نماز ہوئی۔ دن میں نو نمازیں پڑھتے ہو کیا۔“ اور پشتراس کے کہ بابا کچھ کہیں وہ کسی بچے سے بات شروع کر دیتی۔

شزاو کی ملائیں انوکھی تھیں جو محلے والیوں کی نگاہوں میں کھنکھتیں مگر اس کی ہنس مکھ طبیعت کی وجہ سے۔

### رفیق اور سیکینہ

محلہ والیاں خاموش رہتی تھیں۔ پھر بھی دبی دبی رہنے کے باوجود بات نہ دبی اور محلہ والیوں کی سرگوشیاں جاری رہیں۔ ”ہرنی ہے ہرنی۔“ وہ اسے دیکھ کر کہیں ”کلیلیں بھرتی ہے۔“ شاید اس لئے کہ اکیلی شزاو کے متعلق سرگوشیاں کرنا آسان نہ تھا۔ جب تک دو نام منسلک نہ ہوں سرگوشیوں میں لذت پیدا نہیں ہوتی۔

اس لئے آہستہ آہستہ ان سرگوشیوں میں شزاو کے ساتھ رفیق کا نام شامل کر لیا گیا اور محلے والیاں رفیق کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ شاید رفیق کی طرف انگلیاں نہ اٹھتیں مگر مشکل یہ تھی کہ رفیق کی شادی سوچنی تھی اور وہ بچپن ہی میں سیکینہ کا خوندین چکا تھا جو اس کی ہر حرکت پر کڑی نگاہ رکھتی تھی اور اس کی ہر جنبش میں مقصد ڈھونڈتی تھی۔ رفیق کی آنکھوں میں بوندا باندی ہوتی دیکھ کر اس کے کپڑوں میں عطر کی خوشبو محسوس کر کے وہ ایک گہری سوچ میں پڑ جاتی۔

رفیق اور سیکینہ ایک قدامت پسند گھرانے کے افراد تھے۔ خاوند بیوی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے آزادانہ طور پر مل نہیں سکتے تھے۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کے لئے بھی انہیں بہانوں کا سہارا لینا پڑتا تھا اور پھر موقعہ اور محل کو دیکھنا پڑتا۔ رفیق کو رومل دھلوانا ہوتا تو وہ رومل پکڑ کر چھت کی طرف گھومتے ہوئے یوں گنگناتا جیسے کوئی منتر پڑھ رہا ہو۔ ”میں کہتا ہوں اسے دھوا لانا آج۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سیکینہ کی طرف قطعی طور پر نہ دیکھتا اور چولہے کے قریب بیٹھی ہوئی سیکینہ ہنڈا میں جھانکتے ہوئے گنگناتی ”رکھ دیجئے۔“ پھر رفیق رومل کو جھاڑ کر یوں گرا

بے حد ناپسند تھا۔

محلے میں صرف چند ایک لڑکیاں ایسی تھیں جو محلے کی عام عورتوں کے برعکس ایسے ہلکے خوش دکھائی دیا کرتی تھیں ان میں شزاو پیش پیش تھی۔ ڈھولک کی آواز سن کر اس کی آنکھوں میں گلابی جھینے اڑنے لگتے شانوں پر پریشمیں دوپٹے کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ بازو یوں بات بہا لہراتے جیسے کتھا سکی کے مندر ادا کر رہی ہو۔ اس کی تو آواز بھی بدل جاتی تھی۔ کٹے چڑھ جاتے اور بات میں تھا۔ لوج پیدا ہو جاتا۔

### ہرنی ہے ہرنی

شزاو کی اس بات پر محلہ والیوں میں چہ میگوئیاں ہوتی۔ دبی دبی آوازیں سنائی دیتیں۔

”آخر خاندان کا اثر نہیں جاتا بن۔“

”خود بھی تو کاتی ہے۔ سنا تھا۔ جب دولسن بن کر آئی تھی خود اپنے بیاہ پر گلے لگی توبہ ذرا نہ جھجھکی۔“

”میں کہتی ہوں چاچی یہ چیزیں خون میں ہوتی ہیں ہاں کہے دیتی ہوں۔“

”چ کہتی ہو بیٹی۔ زمانے کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔“

”ابھی تو دیکھتی جاؤ چاچی۔ ابھی دیکھا کیا ہے۔“

”نہ اللہ نہ کرے۔ اب تو خدا اٹھا ہی لے تو اچھا ہے بن۔“

”ہے اور وہ میرا شن توبہ یوں دیکھتی ہے۔ جیسے آنکھوں کی جگہ میغیں ہوں۔ ہاں! ہے نگاہیں۔“

”آج کل کے نوجوانوں کو تو یہی پسند ہے بن۔“

”توبہ وہ تو ان میگوں پر بچھے جاتے ہیں۔“

جب سے شزاو محلے میں آئی تھی۔ محلہ والیاں اسے حیرانی سے دیکھتی تھیں اور انگلی ڈال کر کھڑی کی کھڑی رہ جاتیں۔ مگر شزاو نے کبھی اس تفصیل کو اہمیت نہ دی تھی محسوس ہی نہ ہوا تھا کہ وہ اس کی طرف حیرانی سے دیکھتی ہیں اور اس کی حرکت کا بخورہ ہیں۔

وہ چلتے چلتے چاچی کی طرف دیکھ کر شور مچا دیتی۔ ”سنا چاچی کس کا انتظار کر رہی ہے۔“

دن کا نوکر نیچے آیا۔ ”آصف صاحب ہیں۔“ اس نے پوچھا۔ ”جی میں دیکھتا ہوں۔“ وہ بولا ”آپ کا نام کیا ہے؟“ آصف نے تو کبھی ایسا نہ کیا تھا۔ جب بھی ایلی اس تنگ گلی میں کھڑا ہو کر آواز دیتا تو کھڑکی سے آصف جھانکتا اور مسکرا کر کہتا ”آیا ابھی۔“ اس سے پہلے نوکر نے کبھی نیچے آکر نہ کہا تھا ”جی میں دیکھتا ہوں۔“ آپ کا نام کیا ہے۔“

نوکر دوسری بار آیا ”جی آئیے۔“ وہ بولا۔ وہ اسے بیشک میں لے گیا۔ ”بیٹے وہ ابھی آتے ہیں۔“ وہ بیشک بہت ہی مختصر سا کمرہ تھا جس کے ایک کونے میں پٹنگ پڑا تھا اور دوسری جانب ایک میز اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں، دو بڑی کھڑکیاں اور روشندان گلی میں کھلتے تھے۔ ایلی نے آصف کی بیشک کو دیکھ کر محسوس کیا جیسی وہ بدلی بدلی سی ہو۔ پہلے تو اس میں اتنا اندھیرا نہ ہوتا تھا نہ ہی وہ اس قدر دیران تھی۔ پہلے روشندانوں میں شیشے لگے ہوئے تھے لیکن اب ان پر ٹاٹ لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد آصف داخل ہوا اس کا چہرہ زرد تھا آنکھیں روئی روئی نظر آتی تھیں اور انداز میں جھجک تھی۔ ایلی کی طرف دیکھ کر اس نے مسکراتے کی کوشش کی لیکن اس کی مسکراہٹ بے حد اواس تھی۔

”تم آگئے۔“ وہ بولا ”میں محسوس کر رہا تھا کہ تم کبھی نہیں آؤ گے اور کالج ہمیشہ بند پڑا رہے گا اور۔۔۔ اور۔۔۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”تم بیمار ہو کیا؟“ ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔ ہاں بیماری سمجھ لو۔“ وہ بولا۔

”کیا تکلیف ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”تکلیف۔“ آصف مسکرایا ”تکلیف نہیں روگ لگا ہے۔“ وہ ایلی کے قریب تر ہو کر زیر لب باتیں کر رہا تھا۔ جیسے اپنی آواز سے ڈر رہا ہو۔

”آخر بات بھی تو بتاؤ؟“ ایلی نے چیخ کر کہا۔

آصف گہرا گیا۔ ”خدا کے لئے آہستہ ہو لو۔ کوئی سن نہ لے۔“

”کون سن رہا ہے تمہاری بات۔“ ایلی نے پوچھا۔

”سن رہا ہے۔ سن رہا ہے۔“ اس نے روشن دانوں کی طرف اشارہ کیا۔

”عین اس وقت گلی میں کسی نے قہقہہ لگایا۔ ایلی چونکا: ”یہ کون ہنس رہی ہے؟“

دیتا جیسے مداری تماشا دکھا رہا ہو۔ پھر وہ باہر نکل جاتا اور سیکنہ لمبا گھونٹ سنبھالے آتی اور گردن روہل اٹھا لیتی اور اس سمت قطعی طور پر نہ دیکھتی۔ جس سمت کو رفتی گیا ہو۔ ان حالات میں سیکنہ اپنے شوہر کو نیچی نظروں سے دیکھنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی تھی۔ اس کے برعکس شہزاد سے سراٹھا کر ملتا تھا۔ اگرچہ بات عزت سے کرتا تھا۔ لیکن اس کا ہلنے ہلنے شہزاد سے ”چچی کچھ منگوانا تو نہیں۔ میں بازار جا رہا ہوں۔ چچی ایسے اچھے چاول آتے ہیں۔ بنواری لال دوکلن پر منگوانے ہیں کیا۔ چچی چائے سستی ہو گئی ہے۔ چچی بڑا اچھا کپڑا منڈی میں آیا ہے۔“ دن میں رفتی دوبار شہزاد کی طرف جاتا اور پھر دیر تک آہستہ آہستہ اس سے باتیں کرتا اور باتوں کے دوران میں سی سی کرنے کے علاوہ جھجکتا اور گہرا گہرا کر ادھر ادھر دیکھتا اس وقت اس کی آنکھوں سے پھلجھڑیاں چلتیں اور کانوں پر سرخ چوٹیاں رہتی تھیں۔

رفتی کی پیوی سیکنہ اسے شہزاد کی طرف آتے دیکھ کر اپنے لیے گھونٹ سمیت کوٹھم چڑھ آتی اور ان کی طرف کھڑکی چھت یا طاق سے چوری چوری جھانکتی۔ انہیں قریب قریب کھڑے دیکھ کر رفتی کے متعلق نہ جانے کیا کیا اندازے لگاتی۔ پھر اکیلے میں بیٹھ کر آنسو بہا اور محلے والیاں اسے او اس دیکھ کرچہ میگوئیاں کرتیں اور ان کی سرگوشیوں میں رفتی اور شہزاد کے نام سنائی دیتے۔

ایلی نے بھی کئی ایک بار انہیں یوں قریب کھڑے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا اور غلو اس کے دل میں بھی جلن پیدا ہوئی تھی۔ پھر تنہائی میں بیٹھ کر سوچتا رہا تھا ”رفتی اثر پیدا کر رہے تو کیا ہے۔“ اس نے لا حول پڑھ کر اس خیال کو دل سے نکال دیا تھا۔ لیکن یہ تو اس دنیا کی بات تھی جب اسے تسلیم سے محبت نہ ہوئی تھی۔ اب تو جب بھی وہ شہزاد کی طرف دیکھتا اس کی نگاہوں میں شہزاد کے خدو غل و خندلے پڑ جاتے اور اس رنگین و خندلے میں سفید چمکتے اور ہتھکڑی والے بالوں کی لٹ لہرائی اور وہ محسوس کرتا جیسے وہ شہزاد نہیں بلکہ تسلیم ہو چکا ہو۔

## ڈبل اینٹ

علی پور کے ان مشاغل میں ایلی کی چھٹیاں گویا چشم زدن میں ختم ہو گئیں۔ اور وہ غلو سے امر تر چلا آیا کالج جانے سے پہلے وہ آصف کے گھر گیا اور دیر تک اسے آوازیں دیتا رہا۔

چلو یہاں سے چلیں۔ وہ گھبرا کر بولا: ”لیکن ایسے نہیں تم پہلے جاؤ میں آ جاؤں گا۔ ہمارے  
ملوں گا۔ جلدی کرو جلدی۔“

اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ ”کھڑکی کھول دو۔“ قریب ہی سے پھر وہ  
غریب آواز آئی۔

”یہ ہے کون؟“ ایللی نے پوچھا۔ آصف کا چہرہ اور بھی زرد پڑ گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے  
کے لیے بازار میں میرا انتظار کرتا۔ شاید مجھے دیر ہو جائے۔“

عین اس وقت ایک ڈبل اینٹ روشندان کے ٹاٹ سے ٹکرا کر دھڑام سے گلی میں گر  
باہر نکلتے ہوئے ایللی نے چوری چوری ایک نظر مقابل کے چوہارے پر ڈالی۔ کھڑکی میں

کھڑا تھا۔ اس کے سیاہ لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”اس سے کہو باہر نکلے۔“ وہ چلائی۔

ایللی ڈر کر بھاگا کہ کوئی اینٹ اس کے سر پر نہ گر جائے۔

## کوئی نہیں کسی سے نہیں

بازار میں وہ دیر تک ٹھکتا رہا مگر آصف نہ آیا اس کا جی چاہتا تھا کہ پھر سے گلی میں دائر  
جائے اور جا کر اسے آواز دے مگر جرات نہ پڑتی تھی۔ نہ جانے وہ اینٹ کس نے ماری تھی

جانے وہ اسے ڈانٹ کیوں رہی تھی۔ نہ جانے وہ کون تھی اور حالات کیا تھے۔ دیر تک  
سوچتا رہا اور پھر ان جانے میں اس نے اپنا رخ اتنا کے گھر کی طرف موڑ لیا اور پھر جواس نے

اٹھا کر دیکھا تو وہ تسلیم کی سی دھیوں میں کھڑا تھا۔ غیر از معمول اس نے دروازہ کھٹکٹایا۔ لیکن  
گویا دیر ان پڑا تھا کوئی آواز نہیں آرہی تھی ڈیوڑھی زینہ اور بیٹھک سب دیر ان پر

اس نے پھر دروازہ کھٹکٹایا۔ دور سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔  
”کون ہے؟“ تسلیم کی آواز سن کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ دروازے میں تسلیم

دوپٹہ لہرایا اور پھر ایک گھنگھریالی لٹ جھلکی۔

”تسلیم۔“ ایللی نے زیر لب کہا۔

”اوئی اللہ۔“ وہ چلا کر پیچھے ہٹ گئی اور پھر ہنسنے لگی۔

”گھر کوئی نہیں۔“ وہ ہنستی ہوئے بولی۔ اس کی ہنسی میں واضح اشارہ تھا۔

”مجھے کوئی نہیں سے ملتا ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”کوئی نہیں۔ کسی سے نہیں ملتے۔“ وہ پھر ہنسی۔

”ہاں ہاں۔“ ایللی نے کہا۔ ”میں کسی سے نہیں ہوں۔“

”بڑے ہو۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”ہم کیا کریں۔“

”جی تو ہمیں بتانے آیا ہوں۔“ ”وہ بولا۔ کہ تم کیا کرو۔“

”نہ جی۔“ وہ کہنے لگی۔ ”ہمیں نہ بتائیے کچھ۔ ہم نہیں سنتے ایسی ویسی بات۔ کو کو کام کیا

ہے؟“

”ہم وہ آن پڑا ہے۔“ ایللی گھٹکٹانے لگا ”خدا کے لئے ذرا دروازے میں تو آؤ۔“

”نہ میں نہیں آتی۔“

”ضروری بات ہے۔“ وہ ہنسنے کرنے لگا۔

”پڑی ہو۔“ وہ بولی۔

ایللی نے دروازہ کھول دیا۔ ”اچھا تو میں آتا ہوں۔“ ”خدا کے لئے۔ خدا کے لئے۔“ وہ  
چلائی۔ ”وہ آنے ہی والے ہیں۔“

”تو پھر وعدہ کرو کہ تم مجھ سے ملو گی۔“ ایک فاتح کی طرح اس کی باچھیں کھل گئیں۔

”لے سے مطلب!“ وہ بولی۔

”تمہیں دیکھنا ہے۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”دیکھنا ہے۔“ وہ تہقہ مار کر ہنسی ”دیکھ کر کیا لیں گے۔“

”کیا لینے دینے کے بغیر دیکھا نہیں جاسکتا۔“

”بس جی بس۔“ وہ چڑ کر بولی۔ ”اب جانے دو ورنہ۔“

”ورنہ۔“ وہ چلائی۔ ”میں اندر آ رہا ہوں۔“

”نہیں نہیں۔“ اس نے منت کی۔

”تو پھر ملنے کا وعدہ کرو جلدی۔“

”ملوں گی، ملوں گی۔“

”کب؟“

”کہہ جو دیا ملوں گی۔ جاؤ نا اب۔ جاؤ بھی۔“ وہ چڑ کر بولی۔

رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔  
 ”وہ ہاتھ دکھائے گا صاحب کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔“ رام گوپال چلایا۔  
 ”واہ کرو۔“ ہرنام سنگھ کی آواز گونجی۔  
 ”علی۔ حیدر“ اللہ داد چیخنے لگا۔  
 ”شور نہ مچاؤ۔“ بنگالی بابو مسکرانے لگا ”چلو ہم آتا ہے۔“ لڑکے جانے لگے تو اس نے انہیں روک لیا۔

”ٹھہرو“

”ہاں بھئی۔“ بنگالی پرنسڈنٹ نے کہا ”تم سب کو رولوں کا کبھر ہے۔“  
 ”مسلمانوں کو گوشت منگوانے کی اجازت دی جائے۔“ شفیع بولا۔  
 ”نو۔ نو۔“ نہیں نہیں۔“ چاروں طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔ ”نہیں نہیں۔“  
 پرنسڈنٹ نے کہا۔ اس کی اجازت نہیں ہو سکتی۔  
 ”کچھ پروا نہیں۔“ اللہ داد بولا ”لیکن ہم تین مسلمان ہیں۔ ہم مل کر مقابلہ کریں گے۔“  
 ہمارا احباب اکٹھا رکھا جائے۔ بعد میں اسے تین پر تقسیم کر دیا جائے۔  
 ”نو۔ نو۔“ لڑکے چلائے۔  
 ”اس میں کوئی حرج نہیں۔“ پرنسڈنٹ بولا ”ہرے۔ ہرے۔“ شفیع اور اللہ داد چیخنے لگے۔

”آدھ گھنٹے کے بعد مقابلہ شروع ہو جائے گا اب تیاری شروع کرو۔“ بنگالی بابو نے کہا۔

مقابلہ

پرنسڈنٹ کی اس بات پر نعروں اور چنگھاڑوں کے بعد جلوس بکھر گیا۔ اللہ داد ایللی کو شانوں اٹھائے ہوئے اپنے کمرے میں آیا۔

”کے لیے کیا مقابلہ ہو گا۔ مجھے بتاؤ تو سہی۔“ ایللی نے اللہ داد سے پوچھا۔  
 ”ہمیں جس معلوم نہیں کیا۔“ اللہ داد نے غصے میں دھم سے ایللی کو چار پائی پر پیٹک کر ہار دیا۔  
 ”میرے بدھو آج مسلمانوں کے احتجاج کا دن ہے۔ آج انہیں کفار کو نیچا دکھانا ہے۔ بیٹا آج

ایللی میڑھیاں اترتے ہوئے سوچنے لگا۔ اگر وہ اوپر سے ایک ڈبل اینٹ مارے یا پتھر تو زندگی کتنی دلفریب ہو جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو جائے کوئی شرارت۔ کوئی شرارت حرکت۔ جس سے زندگی زندگی بن جائے چاہے جو کچھ بھی ہو یہ سوچتا ہوا وہ چپ چاپ آنسو کوٹھی کی طرف چل پڑا۔

پٹھو

جونہی وہ بورڈنگ میں پہنچا۔ اللہ داد نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور اسے شانوں پر اٹھا کر لگا۔ ایللی نے شور مچایا۔ ٹانگیں چلائیں۔ لیکن بے کار۔ اللہ داد نے اسے اٹھائے رکھا۔ شفیع اب بن گئی بات۔ اب تو وہ باؤنڈری لگائیں گے کہ یہ مہاشے یاد کریں گے۔ ”شفیع! کرنے کے بعد وہ دونوں ویسے ہی ایللی کو اٹھائے ہوئے جلوس کی صورت میں ہر کرنا گھومنے لگے۔

”لو بھئی ہو جاؤ تیار ہر نام سیال اور گوہند رام ذرا آجاؤ میدان میں ہمارا پٹھو بھی لگا۔ وہ باؤنڈری لگے گی کہ یاد رکھو گے۔“  
 ہر نام سنگھ نے انہیں دیکھ کر مونچھ مروڑی ”واہ کرو۔“ وہ دھاڑنے لگا۔ ”وہ نہ رکھو کہ یاد کرو گے۔“

اللہ داد نے طنز بھرا اقبہ لگایا ”تو آجاؤ میدان میں میرے یار۔“  
 پھر وہ رام گوپال کے کمرے میں جا گئے ”نکل آجے رامو۔“ اللہ داد چلایا ”دیکھیں تیرے ہاتھ ابے مسلوں کے سامنے کیا ٹھہرو گے تم۔ آدم خور ہوتے ہیں ہیں۔“  
 رام گوپال نے ایک نعرو لگایا جسے کالی مانتا جسے بڑنگ ملی اور چھلانگ مار کر باہر نکل آیا۔ یونہی جلوس بڑھتا گیا۔ وہ ہر کمرے میں داخل ہوتے اور پھر باہر نکل کر نعرے لڑکوں کو نکال کر آگے چل پڑتے۔ سب سے آخر میں وہ بنگالی پرنسڈنٹ کے کمرے میں۔  
 ”علی۔ مولا علی“ اللہ داد نے نعرو لگایا۔ بنگالی بابو گھبرا کر باہر نکل آیا اور وہ جلوس کو دیکھ کر اس کی گھبراہٹ نے مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی۔

”ارے یہ کیا گڑبڑ ہے بھئی۔“ بنگالی بولا۔  
 ”باہر نکلے صاحب۔“ لڑکے ایک زبان ہو کر چلائے وقت ہو چکا ہے وہ مقابلہ



پہلے ہر نام سنگھ چٹنا ”آٹھ“ اس کے سر پر کھڑا ریفری جلاتا اور پھر اوہر سے رام گوپال شور چا  
 بند ”بندو اوہر“ پندرہ ”بندو“ پھلکی ”اللہ داو چٹنا ساتھ ہی شفیع اور ایللی چٹنے لگتے۔ ”پھلکاری  
 بند“ ”پھلکاری۔“ ”ستاٹھ۔“ ”ستاٹھ۔“ کی آواز سن کر رام گوپال چونک جاتا۔ ارے پھر دفعتاً اسے یاد  
 آتا کہ اللہ داو شفیع اور ایللی کے پھلکوں کا حساب اکٹھا ہو رہا ہے اور ستاٹھ کا مطلب تھا ستاٹھ بنا  
 تین یعنی بائیس فی کس۔ اسی قسم کی چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔ چاروں طرف سے  
 شہلش رام گوپال اکٹھے اوے ہر نام۔ علی حیدر کے نعرے گونج رہے تھے اور ہر لحظہ سکور بڑھتا  
 جا رہا تھا۔ مقابلے میں صرف سات امیدوار تھے۔ رام گوپال، ہر نام سنگھ امرت لال، گوچرن  
 سنگھ، ان کے علاوہ مسلمانوں کا ایک گروپ تھا۔ جس میں اللہ داو شفیع اور ایللی تھے۔ مچن میں پانچ  
 چھ میزس لگی ہوئی تھیں۔ ہر میز پر امیدواروں کے سروں پر ریفری اور لڑکے کھڑے کتنی میں  
 مشغول تھے۔ درمیان میں چھ لڑکے؟ کی حیثیت سے حساب کتاب لکھنے میں مصروف تھے۔ جن  
 کے پاس ہی آرام کرسی پر بنگالی بابو سپرنٹنڈنٹ جج کی حیثیت سے بیٹھے تھے۔

### تین پیڑو

”ایک سو ستون۔“ مسلمانوں کے گروپ کے ریفری نے آواز دی۔

”علی حیدر۔“ اللہ داو چلایا۔ ”بندو چٹنی۔“

”پوائنٹ آف آرڈر۔“ رام گوپال کھڑا ہو گیا۔ ”سپرنٹنڈنٹ صاحب اللہ داو صرف چٹنی کھا  
 رہا ہے۔“

”علی حیدر۔“ اللہ داو داڑنے لگا۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔

”ٹھہرو، ٹھہرو۔“ جی جی بولے۔ ”چٹنی پر کوئی پابندی نہیں۔“

”علی حیدر۔“ اللہ داو غرایا اور رام گوپال میز سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے  
 بعد شفیع اور اللہ داو دیر تک چٹکھاڑتے رہے پھر آہستہ آہستہ گوچرن نے بھی ہاتھ روک لیا اور  
 سب سے آخر میں ہر نام سنگھ کی طبیعت ہاش کرنے لگی ”علی حیدر۔“ تینوں مسلمان ہیرو ایک سو  
 ستون پر اٹھ بیٹھے اور بورڈنگ والوں پر گویا اوس پڑ گئی۔

”اتنی یہ فٹول ہے یہ سٹے چٹنی سے روٹی کھاتے رہے ہیں یہ اصول کے خلاف ہے“ لیکن  
 ان کی ہریت پر اللہ داو ”علی حیدر“ کا نعرہ لگا کر ان کا منہ چراتا اور جی مکرار کرتے ”چٹنی کھانا

تمہیں ہماری لاج رکھنی ہے۔ اگر مسلمانوں کے ہوتے ہوئے ”پیڑو“ کا خطاب کسی اور کو مل  
 بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔“ اللہ داو بولا۔

”اتنا کھاؤ آج۔ اتنا کھاؤ کہ اس اسلامی پیٹ کے صحرا میں بندو کے پھلکے رست کے لئے  
 بن جائیں۔“ شفیع نے اپنا ادبی انداز دکھایا۔

”ارے چھوڑو یہ صحرا و ہرا۔“ اللہ داو بولا ”یوں کہہ کہ اتنا کھاؤ اتنا کھاؤ کہ میزے اللہ  
 کے لئے چار آدمی بلانے پڑیں۔ یہ بنگالی بابو کیا یاد کرے گا سلا کہ مسئلے کبھی اگر ٹھہرے  
 بورڈنگ میں۔“

کالج کے بورڈنگ کی رسم کے مطابق ہر سال ایک مرتبہ کھانے کا مقابلہ ہوا کرتا تھا  
 کے کھانے پر باہر میزس لگا دی جاتیں۔ تمام امیدوار اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے۔ درمیان  
 سپرنٹنڈنٹ کی کرسی رکھ دی جاتی تاکہ وہ فیور اور فاول کا فیصلہ کر سکے۔

کچن میں اس روز دو چار اچھے اچھے سالن پکائے جاتے۔ اتنی مقدار میں پکائے جانے  
 امیدواروں کے لئے کافی ہوں کیونکہ مقابلے کے روز ہر امیدوار کوئی سا سالن طلب کر سکتا  
 جب مقابلہ شروع ہو جاتا تو ہر امیدوار کے پاس دو ریفری کھڑے ہو جاتے جو پھلکوں کی تعداد  
 جاتے اور ہر نام پھلکے پر آواز دیتے ”رام گوپال بارہواں۔“ ”لینا سیان پندر ہواں۔“  
 درمیان میں بیٹھے ہوئے فٹنی ہر امیدوار کے نام کے سامنے تعداد لکھتے جاتے۔ ان ریفری  
 ساتھ مختلف پارٹیوں کے لڑکے کھڑے رہتے تاکہ تعداد لکھنے والے شرارت نہ کریں اور  
 ضابطی پر سپرنٹنڈنٹ کو پکارا جاتا۔ ”پوائنٹ آف شکایت لالہ جی۔“ جو لڑکا اس مقابلے میں  
 سے زیادہ پھلکے کھاتا اسے ”پیڑو“ کا خطاب دیا جاتا اور گلے میں ہار ڈال کر اس کا جلوس نکلا  
 جس کی ساتھ مناسب قسم کے نعرے لگائے جاتے۔

مقابلے کے دن کے لئے باورچی بندو پہلے ہی پھلکے پکا رکھتا تاکہ پھلکوں کی کمی نہ  
 بیچ میں غلل نہ پڑ جائے پھر مقابلے کے وقت بندو۔ رامو، ہر نامہ اور کرشار سوئی میں پکا  
 ہوئے پھلکے سینکے میں مصروف ہو جاتے اور رامو۔ کھمیا اور بڑھا چوکیدار باہر میزوں پر  
 کرنے کے لئے تیار رہتے۔

مقابلہ شروع ہوا۔ سوئی کی کھڑکیوں اور دروازے سے پھلکوں کی بو چھاؤ شروع  
 ایللی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے سوئی اور میزوں کے درمیان سفید کپڑے اوڑھے ہوئے

پہلی بھی خاموش ہو گیا اور دیر تک وہ دونوں درخت تلے خاموش بیٹھے رہے۔ ہر چند منٹ کے بعد آصف ایلی کی طرف دیکھ کر بے بسی بھرے انداز سے مسکراتا۔ آخر وہ بولا۔ کہنے لگا ”ایلی اگر میں زہر کھلوں تو تم برا تو نہ مانو گے۔“

”زہر۔“ ایلی نے پوچھا ”آخر کیوں؟“

”یہ نہ پوچھو۔“ آصف نے کہا ”اب زندگی بیکار ہے۔ بے عزتی کی زندگی سے مر جانا بہتر ہے۔“

”اگر میں کھلوں تو کیا کھالو گے تم۔“ ایلی نے شرارت سے پوچھا ”ہاں۔“ وہ بولا

”کھلوں گا۔“

ایلی سوچ میں پڑ گیا۔ آصف چپ چاپ نہر کے پانی کو گھورنے لگا۔ دور کوئی رہٹ رو رہا تھا۔ سامنے ندی کا پانی گویا چلتے چلتے رک گیا تھا۔ ارد گرد پھیلے ہوئے کھیتوں میں پودے سر جگائے کھڑے تھے اور وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔

وہ یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ حتیٰ کہ سورج مغرب میں جا ڈوبا اور آسمان پر سرخ دریاں بھل گئیں اور رہٹ رو رو کر چپ ہو گیا۔ کتنی اواس شام تھی وہ۔

ایلی اٹھ بیٹھا ”نہیں“ وہ بولا ”ابھی تم زہر نہ کھاؤ۔“

”کیوں۔“ آصف نے پوچھا ”کیوں نہ کھاؤں۔“

”بس ابھی نہیں کہہ جو دیا ہے میں نے۔“

”اچھا۔“ آصف نے آہ بھری۔ ”پھر میں کیا کروں۔“

”انتظار کرو۔“ ایلی بولا۔

اچھا کہہ کر آصف خاموش ہو گیا اور پھر بورڈنگ میں جانے کی بجائے شہر کو چل پڑا ”میں اب چلتا ہوں۔“

”اچھا۔“ ایلی بولا ”کل پھر ملیں گے۔“

ساری رات ایلی سوچتا رہا کہ آصف زہر کھانے پر کیوں آمادہ تھا وہ کوئی بات تھی جس کی وجہ سے دیکھی تھا وہ لڑکی کون تھی وہ چلا کیوں رہی تھی اس روز کیا آصف کو اس سے محبت تھی۔ پھر اس نے آصف کی بیٹھک پر اینٹ کیوں پھینکی تھی اور چلا کیوں کما تھا۔ سامنے بلاؤ لے کر انہیں محبت تھی تو۔ لیکن محبت ایسے تو نہیں کی جاتی محبت تھی تو پھر زہر کھانے کی کیا

اصولوں کے خلاف نہیں۔“ اور اللہ داد پھر سے تازہ دم ہو کر چنگھاڑا۔ ”علی حیدر“

پیڑ کا لقب تو انہوں نے حاصل کر لیا۔ لیکن رات بھر ان تینوں کی بری حالت رہا چارپائیوں پر پڑے وہ دیر تک کروٹیں بدلتے رہے اور پھر اللہ داد اٹھ بیٹھا اور کلن پر ہاتھ رکھ کر لگانے لگا اور پھر دو گھنٹہ چلا کر بولا۔

”ارے یارو۔ کیوں اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔ نیند تو آج تمہارے باپ کو بھی نہ آئے گی۔ بیکار پڑے ہو۔ آؤ چلو امرو دوں کے بلوغ سے امرو دو توڑ کر لائیں۔ بڑے ہانگم ہوا ہیں۔ تمہاری قسم۔“

صبح سویرے اللہ داد نے پر نیل کے نام ایک درخواست لکھی کہ حضور چھٹی لینے کا ہمارا ارادہ ہے۔ اور نہ چھٹی نہیں کوئی دلچسپی ہے ازراہ کرم چار آدمی بھیج دیجئے جو ہمیں انکار کالج لے آئیں۔

دوسرے وقت پر نیل اپنی لینڈو میں آیا اس کے ساتھ آصف تھا ”ہیلو“ پر نیل بولا مبارک ہو تمہیں۔ پیڑ بولو کیا حال چال ہے تمہارا۔“ اللہ داد نے اٹھ کر ہاتھ جوڑے ”صبر“ آپ کا دیا سب کچھ ہے صرف اتنی ارج ہے کہ چار دن کے لئے چار آدمی مقرر کر دیئے جائیں ہمیں اٹھا کر گھما پھرا لایا کریں۔“ پر نیل نے ایک قلم لکایا اور پھر ”شائش ویل ڈن“ لکھا رخصت ہو گیا۔

## اواس شام

پر نیل کے جانے کے بعد آصف نے ایلی کو اشارہ کیا۔ ذرا یہاں تک چلنا میرے مانو اس وقت اللہ داد اور شفیع اپنی ہی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ اس لئے ایلی چپکے سے آصف کے ساتھ چل پڑا۔ آصف کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو تھی مگر مسکراہٹ میں تازگی نہ تھی۔ اسے ملتے ہی ایلی نے ایک سانس میں کئی ایک سوال کر ڈالے۔

”کل تم کیوں نہ آئے وہ کون تھی جس نے ڈیل اینٹ ماری تھی۔ وہ تمہیں گھور رہا تھا۔“

”تم سے ہوئے کیوں ہو۔ کیا ہے تمہیں آصف بولو بھی نا۔“

لیکن آصف چپ چاپ کھڑا تھا اس کے ہونٹوں پر کھسیانی مسکراہٹ تھی اور دھم دھم رہا تھا۔

ضرورت تھی۔ انہیں خیالات میں کھویا ہوا وہ سوچتے سوچتے سو گیا۔

## آصف

آصف ایک خاموش اور شرمیلا نوجوان تھا۔ نہ جانے اس کی بے پناہ جلالت کا کیا راز تھا شاید اس کی وجہ اسکی خاموشی اور شرمیلا پن ہو یا شاید اس کا سفید رنگ جھکی جھکی آنکھیں رخساروں پر جھلکتی ہوئی سرخی کو اس سے کوئی تعلق ہو بہر صورت یہ امر مسلمہ ہے کہ لڑکیوں اس کے لئے بے قرار رہتی تھیں۔ قرب و جوار میں رہنے والیاں بار بار کوٹھے پر آ کر کہ شاید ایک نظر آصف کو دیکھنا نصیب ہو جائے۔ کئی ایک تو گھنٹوں کوٹھے پر شعلی رہتی۔ کالج جانے یا وہاں سے لوٹنے کا وقت ہوتا تو وہ گلی کی کھڑکیوں میں آکھڑی ہوتیں۔ کئی ایک چھپ کر دیکھتیں۔ کئی ایک ایسی بھی تھیں جو بے پروائی کے پردے میں اپنی نمائش کرنے ایک نظر آصف انہیں دیکھ لے اور چند ایک تو دیوانہ وار چتیں اٹھالیں یا کھڑکیوں سے شعلی لڑکیوں نے کئی بار اعلانیہ طور پر اسے سلام بھی کئے تھے۔ اس کے علاوہ اعلانیہ بات نہ تھی۔ مگر گلی میں چلتے ہوئے آصف نے کبھی گردن نہ اٹھائی تھی۔ وہ چپ چاپ زمین پر گناؤں جلدی جلدی گلی میں سے گزر جانے کی کوشش کرتا تھا۔

کوٹھے پر اس کا رویہ مختلف ہوتا تھا وہ اوپر چڑھتے ہی نیچی نظروں سے چھتوں کا جائزہ لیتا اور بزرگ صورت مرد یا عورت قرب و جوار میں نہ ہوتے تو وہ لڑکی پر بھرپور نظر ڈالتا اور ہنس مٹانے سے ہٹ جاتا غالباً اس کی یہ بھرپور نظروں کی تمام تر مشکلات کی وجہ تھی۔ اسے لڑکیوں سے دلچسپی ضرور تھی۔ لیکن اسے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا کہ لوگ کیا کہیں والدین کیا سمجھیں گے نہ جانے والدین کو خوش کرنے کے لئے یا اپنے زہد و تقویٰ اور جمانے کے لئے۔ یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ وہ اپنی برتری کا عملی طور پر اظہار کرنا چاہے اس کی وجہ کچھ بھی ہو وہ اکثر کوٹھے سے اتر کر گلی کی طرف جاتا اور کسی نہ کسی شکایت کرتا ”دیکھ لو اماں آج اس نے مجھے سلام کیا ہے۔“ اور اس کی اماں نہ جانے کتنی یا محنت کی وجہ سے جھٹ ٹوکر کو بھیج کر لڑکی کے والدین تک شکایت پہنچا دیتی۔ ایسی شکایت محلے کی کئی ایک لڑکیوں کے والدین تک پہنچ چکی تھی اور وہ سب اس عادت سے تلائ تھیں۔ والدین تو پہلے ہی اپنی بچیوں کی معصومیت پر یقین رکھتے

خواہند ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی اپنی اولاد بے حد معصوم اور پاکباز ہے البتہ دوسروں کے بچے انہیں گمراہی کی طرف راغب کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ آصف کی ان شکایات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکیوں نے آنسو بہا بہا کر والدین کو یقین دلا دیا کہ ان کا کوئی قصور نہیں اور محلے والوں کے دلوں میں آصف کے خلاف بغض پیدا ہو گیا۔

اگلے روز جب وہ کالج میں ملے تو آصف کے چہرے پر حقیقی انہماک کی جھلک تھی اور اس کے جسم میں قنفطی تھی۔ ایلی کو دیکھ کر وہ حسب معمول اس کی طرف بڑھا اور ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھ کر بولا ”تسلیم۔“ ایک ہی نظر میں ایلی کو محسوس ہو گیا کہ یہ آصف کل والا آصف نہیں تھا وہ آصف جو تین گھنٹے یوں چپ چاپ بیٹھا رہا تھا جیسے پتھر کا بنا ہو۔

”زہر تو نہیں کھایا تم نے۔“ ایلی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ بولا ”تم نے جو کہا تھا انتظار کرو۔“

”تو انتظار کر رہے ہو۔“ ایلی نے اسے چھیڑا۔

”نہیں۔“ وہ بولا ”اب اس کی ضرورت نہیں۔ آؤ اور تھائی میں گھومیں یہاں لڑکے آ جاتے ہیں۔ اکیلے میں بتاؤں گا تمہیں۔“ اور وہ دونوں میدان کی طرف نکل گئے۔

## سفینہ

آصف نے بات شروع کی۔ ”اس لڑکی نے مجھے بہت تنگ کیا ہے ایلی۔“ آصف نے مکرانے ہوئے کہا ”دبی جو اس روز مقابل کے چوہارے میں کھڑی تھی۔ جس روز تم آئے تھے۔ جس نے روشن دان پر اینٹ پھینکی تھی۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ ایلی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ عام لڑکیوں کی طرح کوٹھے پر چڑھ کر ہمارے گھر کی طرف جھانکا کرتی تھی۔ میں نے وہ ایک مرتبہ اماں کی معرفت شکایت بھی بھجوائی۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اماں نے گھنٹوں اعلانیہ کوٹھے پر ٹھٹھا شروع کر دیا۔ سارا دن کوٹھی پر دھوپ میں کھڑی رہتی۔ خیر وہ دن بھی گزر گئے پھر گرمیاں آئیں تو ہم کوٹھے پر سونے لگے۔ ان کے کوٹھے پر ہماری طرح پردے بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ صبح سویرے وہ اٹھ بیٹھتی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہمارے کوٹھے کی طرف منہ کر کے بیٹھ رہتی۔ جب تک میں نہ جاگتا وہ اسی طرح بیٹھی رہتی پھر جب میں بیدار ہو جاتا تو وہ منہ سے ہاتھ ہٹاتی اور مجھے سلام کر کے مسکراتی۔ ایسے معلوم ہوتا

تھی۔

”کیا وہ خوبصورت ہے آصف؟“ ایللی نے پوچھا۔

”خوبصورت“ آصف سوچنے لگا اور پھر ہنس کر بولا ”یہ کبھی خوبصورت دکھائی دیتی ہیں۔“

اس روز ایللی آصف کی باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ کس قدر عجیب باتیں تھیں آصف کی۔ شریف سے کس قدر مختلف۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر محبت کے متعلق ہر ایک کا نظریہ مختلف کیوں تھا اور محبت کی حقیقت کیا تھا۔ وہ تو اس بات پر فخر کیا کرتا تھا کہ اسے تسلیم سے محبت ہے اور محلے والوں کے سامنے اسے تسلیم کرنے میں ذرا نہ ہچکچاتا تھا۔ لیکن آصف۔

دن بھر ایللی بورڈنگ میں بیٹھے ہوئے سوچتا رہا۔ اس کے سر پر آموں کے درختوں کی ٹہنیاں ہوا میں جمی ہوئی رہیں۔ کھیت گویا بال پھیلانے سوگ مناتے رہے اور دور رہٹ کر اہتا رہا۔ یونہی دوسرے شام ہو گئی اور مغرب میں بادل کسی ان جانے غم سے سلگنے لگے۔ آگ کے شعلے لپکنے لگے۔ ایک اضطراب۔ دکھ بھری بے قراری۔ خاموش غم فضا سے چھتا رہا۔

بادلوں کے ان ٹکڑوں میں تسلیم اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی ٹیس ابھی ہوئی تھیں۔ پھر دفعتاً ایک حرکت سی ہوئی اور تسلیم نے گول مثول صورت اختیار کر لی۔ جیسے ٹھنڈی ہو۔ پھر سبز ٹھنڈی کے پت کھل گئے اور چہم سے کسی نے جھانکا۔ ”مجھے تم سے ڈر آتا ہے ایللی۔“ ایک متبسم آواز سنائی دی اور پٹ پھر سے بند ہو گئے۔ وہ چونک پڑا۔ توبہ ہے۔ وہ زیر لب بولا اور کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی کوشش کرتے لگا۔ لیکن جلد ہی ایک بدلی نے کرن کنیا کا روپ دھار لیا۔ ٹک ٹک ٹک قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ دو بڑی بڑی سیاہ کتیاں ڈول رہی تھیں۔ دور کوئی بانسری بجا رہا تھا۔ کتنی اداس تھی۔ وہ شام۔ اداس اور خاموشی۔

پگلی بہن

اگلے روز تسلیم کے گھر جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا اگر تسلیم کو بھی کچھ ہو جائے جیسے آصف کو ہوا تھا اور وہ کھڑکی سے جتن اٹھا کر سامنے آکھڑی ہو جیسے اس روز آصف کھڑی تھی اور پھر اسی طرح کے ”تم سامنے کیوں نہیں آتے تو کیا زندگی بن جائے۔ یا جب وہ وہاں پہنچے تو تسلیم آنکھوں پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہو اور اسے دیکھ کر ہاتھ اٹھا کر مسکرائے ”سلام“ اور پھر ہنس کر اندر

جیسے اس نے صبح سویرے مجھے دیکھنے اور سلام کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ مجھے دیکھنے سے پہلے منہ سے ہاتھ نہ ہٹاتی تاکہ کوئی اس کے رویو نہ آئے۔ گھر والوں نے اس بات پر اسے لاپرواہ مگر اپنی ہٹ سے باز نہ آئی۔ آخر گھر والے ہار گئے۔

اس کی یہ کیفیت دیکھ کر میرے تو اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ محلے والے کیا کہیں گے۔ سوچتا رہتا۔ محلے کے لوگوں کو دیکھ کر سر جھکا لیتا۔ مجھے شرم محسوس ہوتی۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ مجھ پر ہنس رہے ہوں۔ میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔ لیکن اب۔ اب نہ جانے اسے کیا ہوا ہے۔ گویا وہ اپنے بس میں نہیں رہی اب اسے ہسٹریا کا دورہ پڑتا ہے یا وہ پاگل ہو چکی ہے۔ ایک دن سے اس کی آنکھیں سرخ ہیں۔ منہ سوجا ہوا ہے اور اسے قطعی پروا نہیں کہ وہ کیا رہی ہے اسے کسی بڑے بھوٹے کی پروا نہیں۔ وہ کوشے پر چڑھ کر با آواز بلند میرا نام لے لے کر پکارتی ہے۔ آوازیں دیتی ہے۔ آصف آصف جی۔ لوگ سن کر ہنستے ہیں۔ میرا مذاق اڑاتا ہے۔ پھر وہ مقابل کے چوہارے میں آجاتی ہے اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر با آواز بلند باتیں کرتا ہے۔ اگر میں سامنے نہ جاؤں تو پتھر پھینکتی ہے۔ ”آصف نے آہ بھری اس کی آنکھیں ڈھانپ لیں اور وہ خاموش ہو گیا۔ ایللی یہ رویہ اوسن کر خوشی کی ایک لہر محسوس کر رہا تھا۔ کتنا خوش تسلیم ہے اُف۔ وہ سوچ رہا تھا۔ جسے کسی کی محبت حاصل ہے۔ جسے دیکھنے کے لئے کوئی منہ نہ پڑا رکھے بیٹھی رہتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آصف اس بات پر آمیدہ کیوں ہو رہا ہے اس بات پر زہر کھانے کا مطلب۔

”اور۔۔۔ اور۔“ آصف نے پھر بات شروع کی۔ ”اس نے اپنا نام بھی بدل لیا۔ اب وہ سفینہ کی بجائے اپنے آپ کو آصفہ کہتی ہے۔ آصفہ توبہ کتنی جرات ہے۔ لیکن اب چلی گئی ہے۔“ آصف نے کہا ”اس کے والدین زبردستی اسے لے گئے ہیں۔ نہ جانے کد تاکہ بدنامی نہ ہو۔ اللہ کرے وہ کبھی واپس نہ آئے۔

”کیا واقعی اسے تم سے محبت ہے۔“ ایللی نے حسرت ناک انداز سے پوچھا۔ آصف ہنسنے لگا ”مجھے کیا معلوم۔“ وہ بولا کہ محبت کیا ہوتی ہے اگر یہی محبت ہے تو پچائے توبہ کتنی بدنامی ہوئی ہے۔ کتنی رسوائی۔ ”کیا تمہیں بھی اس کا خیال ہے؟“ ایللی۔

پوچھا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ متبسم نگاہوں سے ایللی کو دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ میں تنہائی کی

جلنے اس قدر خاموشی کیوں چھائی ہوئی تھی۔  
 ”حی کی بات سنی تم نے؟“ آٹا نے بات شروع کی ”حد ہو گئی اس کا نام الماس ہے۔ نئی نئی  
 آئی ہے۔ یہاں اچھی خاصی ہے۔ نوجوان ہے۔ نہ جانے حی نے کیا کر دیا ہے۔ بچاری نے  
 دھندہ چھوڑ رکھا ہے۔ اس کے جواری میراثی بھوکے مر رہے ہیں اور حی کے خون کے پیاسے ہو  
 رہے ہیں۔ لیکن یہ کسی سے ڈرے۔ تو بہ کرد۔ ڈر تو اس کی گھٹی ہی میں نہیں۔ سارا دن وہاں جا  
 کر بیٹھ رہتا ہے۔ وہ اس کی جراثیں دھوتی ہے پتلونیں استری کرتی ہے۔ چائے بنا کر پلاتی  
 ہے۔ عجیب جذبہ ہے محبت کا۔“ آٹا ہنسنے لگا۔ دھندہ کرنے والیوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ کوئی  
 معصوم نہیں ہے وہ اتناڑی نہیں۔ سب کچھ سمجھتی ہے۔ جانتی ہے کہ ان نکوں میں تیل نہیں۔  
 حی محض وقت کٹی کر رہا ہے۔ پھر بھی وہ فریب کھائے جاتی ہے۔ عجیب بات ہے۔“ آٹا ہنسنے  
 لگا۔ ”آؤ آج ہمیں سیر کر لائیں“ آؤ۔“

جب وہ چلنے لگے تو دفعتاً اوپر سے نیم کی آواز آئی ”بھائی جان میں آ رہی ہوں۔“  
 ”تو پھر میں کیا کروں۔“ آٹا نے ہنس کر کہا۔

”میں آج رہی ہوں۔“ وہ بیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔

”خواہ مخواہ۔ مجھ سے کلام ہے کیا۔“

”نہیں تو۔“ وہ دروازے میں کھڑی ہو گئی۔

”تو پھر میں کیا کروں۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”تو پھر چلا کیوں رہی تھی تو۔“

”بس چلا رہی تھی۔ یونی۔“

”اچھا شور نہ مچا ہم جا رہے ہیں۔ آؤ ایللی۔“

آٹا بات کر رہا تھا تو چھوٹی نیم اس کی پشت کے پیچھے سے یوں ہونٹ ہلا رہی تھی جیسے کچھ  
 کہہ رہی ہو جیسے کوئی پیغام دے رہی ہو۔ لیکن ایللی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

جب آٹا چلنے لگا تو وہ پھر چلائی۔ ”کتنی ہوں کوٹھے پر بلا رہے ہیں آپ کو۔“

”بلا رہے ہیں کیوں۔“

”کیا معلوم۔“ وہ پھر ہونٹ ہلا کر ایللی کو اشارہ کرنے لگی۔

بھاگ جائے۔ صرف ایک مرتبہ صرف ایک بار۔ روز نہ سہی صرف ایک بار۔ صرف ایک بار  
 صرف ایک بار کا ورد کرتا ہوا وہ ان کے گھر پہنچ گیا اور وہاں پہنچ کر دفعتاً اسے خیال ہوا کہ  
 منزل پر پہنچ چکا ہے۔ مگر منزل ویران پڑی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ بیڑھیاں خالی تھیں۔  
 تک وہ وہاں کھڑا میس و محروم نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کا جی چاہا کہ چپکے سے لوٹ لے  
 نہروالی کوٹھی میں آموں کے درختوں تلے بیٹھ کر بیٹھ کر رہے۔ روتا رہے حتیٰ کہ اس کا  
 جسم کے بند بند میں وہ چلچلاتا ہوا درد ختم ہو جائے جو ان دنوں وہ محسوس کرنے لگا تھا۔

”ہائیں۔ تم ہو ایللی۔“ حی اسے دیکھ کر چلایا ”یہ کیا صورت بنا رکھی ہے۔ جیسے ہڈیاں  
 آئے ہو۔ آؤ۔ آؤ۔ تمہارا دل بے ملاؤں۔ اس کے پاس جا کر سب دکھ بھول جاتے ہیں۔ لیکن  
 نہیں گھبراؤ نہیں۔ اس کے یہاں کوئی نہیں آتا جاتا۔ اس نے دھندہ چھوڑ رکھا ہے۔ کیسے کہ  
 دھندہ۔ ہمارے عشق میں مری جا رہی ہے اور ایللی ایمان سے وہ تو اذنی طور پر گھریلو عورت ہے  
 خالص پدہنی۔ اس کے پاس بیٹھ کر ایسے محسوس کرتا ہوں۔ جیسے ماں کی گود میں بیٹھا ہوں۔  
 آرام و سکون ملتا ہے وہاں۔ آؤ۔ آؤ لے چلوں تمہیں۔“

”آہ ایللی۔“ آٹا بابل بتاتا ہوا باہر نکلا۔ ”بھئی اب تو آتے ہی نہیں تم اس طرف۔ کنے  
 نے مشاغل پیدا کر لئے ہیں اور وہاں۔“

”کیوں ایللی چلو گئے؟“ حی نے آٹا کی بات کو کاٹ کر کہا۔

”نہ۔ نہ بھئی۔“ آٹا نے حی سے کہا ”اس پر تو کرم ہی کر۔“ اس پر حی منہ بنا کر چلا  
 اور ایللی آٹا کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ حی اسے وہاں لے جائے جہاں  
 کی آغوش کا سا سکون میسر ہوتا ہے۔ جہاں وہ ہو جو محبت کے لئے دھندہ چھوڑنے کی جگہ  
 رکھتی ہے۔ جو روپوں کی جھنکار کو محبت پر قربان کر سکتی ہے۔

”کس سوچ میں کھوئے ہوئے ہو آج؟“ آٹا بولا ”بہت ادا اس ہو۔“

جواب میں ایللی ہنس دیا ”نہیں تو ادا اس تو نہیں۔“ اس نے آہ بھر کر کہا۔

”تو کوئی بات سناؤ۔“ آٹا نے کہا۔

”کوئی بات ہو بھی۔“

”اوہ۔۔۔“ آٹا مسکرا دیا اور پھر دانت صاف کرنے لگا۔

ایللی نے چوری چوری اوپر کی طرف نظر دوڑائی مگر وہاں کوئی پلو دکھائی نہ دے

دینے لگی تھی جیسے ایک ویرانہ ہو۔ طویل و عریض ویرانہ۔ بے مقصد پھیلاؤ۔ ایک اذیت وہ ٹھراؤ چاروں طرف بٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس صحرا میں وہ خود ایک ناؤ تھا۔ جس کے گرد ریت کی لہریں بھٹنوں کی طرح ٹانچ رہی تھیں۔

جب بھی ایللی کی توجہ اپنی جانب مبذول ہوتی تو وہ اس ٹھراؤ کو شدت سے محسوس کرتا۔ لیکن جب اس کی توجہ ریت کی لہروں کی طرف منعطف ہوتی تو اسے حرکت کا احساس ہوتا۔ جب وہ بسز لیتا تو اس کا خیال نیم کے پیغام پر مرکوز ہو گیا۔ نہ جانے نیم کا مطلب کیا تھا۔ مطلب تھا بھی یا محض تفریح یا کچھ اور پھر بائیسکل رکھنے سے کیا مقصد ہو سکتا ہے اور اسے واپس لانے کی سیم سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ دیر تک وہ اس پگلی لڑکی کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ لیکن مسمیٰ نہ کھلی۔ وہ سوچ سوچ کر ہار گیا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔

اگلے روز کئی دفعہ اسے خیال آیا کہ سائیکل وقت مقررہ پر لانے کی آخر کیا ضرورت ہے۔ کسی وقت بھی لے آؤں گا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر اس کے ذہن میں امید کی ایک کرن روشن ہو جاتی۔ شاید فرق پڑ جائے پھر جلد ہی وہ کرن بجھ جاتی اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔ لیکن اس نکلش کے باوجود وہ مقررہ وقت پر آٹا صاحب کے گھر جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے چوہارے کی کھڑکیوں پر نگاہ دوڑائی۔ میزھیوں کی طرف دیکھا مکان گویا ویران پڑا تھا۔ بے دلی سے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

”کون ہے؟“ بڑھیا نے آواز دی۔

”میں ہوں ایللی۔“ وہ چلایا۔

”کوئی گھر نہیں ہے نہ آٹا ہے نہ جی۔“ بڑھیا نے رونے کے انداز میں کہا۔

”اپنا سائیکل لینے آیا ہوں۔“ وہ بولا۔

”سائیکل؟“ بڑھیا خاموش ہو گئی۔ پھر مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔ ”سائیکل ساتھ والے گھر میں کھڑا ہے۔ یہ جو ادھر ہے۔ پنواڑی کے پیچھے والا سمجھ گیا نا۔ لے لے جا کر ادھر سے۔“

یہ انتہائی اتنی بے رخی تو اجنبی کے ساتھ بھی نہیں برتی جاتی۔ خیر بڑھیا کی عادت ہی ایسی تھی۔ لیکن وہ نیم کیا ہوئی۔ کم از کم اسے تو موجود رہنا چاہئے تھا، کچھ دیر تو وہ ڈیوڑھی میں کھڑا سوچتا رہا۔ اس امید پر کہ شاید ابھی دروازہ کھل جائے اور نیم بھاگے۔ لیکن دروازہ بند ہی رہا۔ پھر مدھم سی ہو گیا۔ اور سوچنے لگا۔ اب کون پتہ لگائے کہ وہ مکان کونسا ہے۔ جس میں

”اس وقت نہیں۔ ہم جا رہے ہیں۔“ آٹا نے گھور کر کہا۔

”اچھا تو اچھے بھائی جان ہمیں ایک پان لے دو۔“

”اوہ۔۔۔ تو یہ بات ہے۔“ آٹا ہنسنے لگا۔ ”خود لے لیتا یہ لو پیسے۔“

”ہم تو پان لیں گے پیسے نہیں۔“ وہ لاڈ سے بولی۔

”پاکل ہو گئی ہے کیا۔“ آٹا ہنسا۔

”ہاں۔“ نیم نے سنجیدگی سے کہا ”پاکل ہو گئی ہوں۔“

آٹا قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ”یہ بہنیں بھی بہت مہنگی پڑتی ہیں۔ اچھا میں لاتا ہوں پان۔“

بھاگ نہ جائیو۔“

”نہیں بھاگتی۔“ وہ مسکرائی۔

آٹا باہر نکلا تو وہ ایللی کے قریب تر ہو کر بولی ”اپنا بائیسکل نہ لے جانا میں پھوڑ چلاؤں گا“

شام کو تین بجے آکر کتا بائیسکل دو“ اس نے ایللی کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے وہ ایک بچہ ہو۔

روز پہلے دن ایللی نے محسوس کیا کہ وہ منہ می معصوم بچی ایک مکمل عورت تھی جس کے پاس

کئی آغوش ملا رہ چھپی ہوئی تھیں۔ یہ کہہ کر وہ اوپر کی طرف بھاگی۔

”ہائیں۔“ ایللی چلایا ”اور وہ پان۔“

”پان۔“ وہ ہنسی۔ ”میں نہیں کھاتی پان وان۔ نہ بھی۔“

عین اس وقت آٹا داخل ہوا۔ ”ہائیں چلی گئی اور یہ پان۔“ اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

ہی۔ یہ بہنیں بالکل ہی پگلی ہوتی ہیں۔“ اور وہ پان منہ میں ڈال کر ہنسنے لگا۔

”سائیکل لے لو چلیں۔“ آٹا نے ایللی سے کہا۔

”نہیں۔“ ایللی نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں ہی پڑا رہے گا کل لے لوں گا“

وقت۔۔۔۔۔ ”اچھا یوں ہی سی۔“ آٹا نے بے پرواہی سے کہا اور وہ دونوں چل پڑے۔

## اتنی ساری

اس روز جب ایللی بورڈنگ میں پہنچا تو وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ کئی ایک دنوں سے لگا

نام سلور اس کے بند بند میں چوینٹوں کی طرح رینگ رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا

وجود ایک تکلیف دہ چیز ہو۔ اس کے گرد نیلا آسمان روز بروز پھیکا پڑتا جاتا تھا اور دنیا



شعلوں کی طرح اسے چلنے لگے۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ آنکھوں تلے دھند چھا گئی۔  
 گورے بچے مجسم چرے۔ سیاہ ڈولتی آنکھیں۔ لہراتی ہوئی چوٹیاں اس سے ٹکرائیں۔ پھر دفعتاً  
 نیم نیم کا شور بلند ہوا اور وہ سب بھاگیں اور ایک مقام پر یوں گڈمڈ ہو گئیں۔ جیسے جمناسٹک  
 مرد دفعتاً ایک نئی ترتیب میں تشکیل ہو جاتا ہے۔ ”نیم نیم“ وہ کسی پر جھکی ہوئی چلا رہی  
 تھیں۔ پھر وہ کسی کو تھمتی ہوئی ایلی کی طرف بڑھیں اور ایلی رنگین آنچلوں، گوری گوری  
 ہانپوں، ریشمی چوڑیوں اڑتی ہوئی خوشبو دار لٹوں اور دلنواز قہقروں کے انبار میں دب گیا۔

”پکڑ لو۔ پکڑ لو اسے۔“ وہ ایلی کو لٹا رہی تھیں ”سنہیلو اپنی پیاری کو اب پکڑ بھی لو۔“  
 کئی ایک گوری بانیں اس کی طرف لپکیں اور بلاخود بازو اس کے ہاتھوں میں تھما دیئے گئے۔  
 ایک قہقروں کا جواور پھر وہ سب ہنسی ہوئی اس زینے کی طرف بھاگیں جو صحن کے ایک کونے سے  
 کونے کی طرف چلا گیا تھا۔ زینے پر رنگین آنچل لہرائے قہقروں کی آوازیں گونجیں اور پھر  
 خاموشی چھا گئی۔ ایلی نے دیکھا کہ وہ سفید سفید بازو تھمتے تن تھما کھڑا ہے اور فرش پر رنگین  
 کپڑوں کی ایک گھڑی پڑی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان سفید بازوؤں کو کیا کرے اور  
 اس گھڑی کو کس طرح کھولے ”نیم نیم“ اس نے بازوؤں کو جھنجھوڑا۔ ”نیم اوھر دیکھو۔“ اس  
 نے گھڑی کو کھولنے کی کوشش کی مگر گھڑی اور بھی سٹ گئی۔ وہ اس بند گھڑی سے گویا کشتی  
 لڑنے میں مصروف ہو گیا۔ مگر اس کی کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ گھڑی کے پلو اور بھی لپٹ  
 گئے۔ حتیٰ کہ وہ بازو بھی کیس گم ہو گیا اور وہ گھڑی اس کے قدموں میں کپڑوں کا ایک ڈھیر سا بن  
 کر رہ گئی۔ ”نیم نیم“ وہ چلایا مگر کوئی جواب نہ ملا ”نیم۔“ اوپر سے بڑھیا کی آواز سنائی  
 دی۔ اس نے گھبرا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ تڑپ کر وہ گیند اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نکل گئی۔  
 ایک ساعت کے لئے زینے میں رنگین پلو لہرایا پھر کونے سے ایک سرخ چرے نے اس کی طرف  
 مڑ کر دیکھا جیسے وہ بتا کا بنا ہوا ہو پھر اس مکان پر موت کا سکوت چھا گیا۔ والانوں کے خاموش  
 کونے گویا ہر نکل آئے اور اس پر ہنسنے لگے۔ اس کا تسخراڑا نے لگے۔ ”تم تم“ اور کونے کے  
 پوسے جھک جھک کر اس کی طرف دیکھنے لگے ”بیچارہ۔ بیچارہ۔“

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ اس کا راز کھل چکا ہے۔ وہ سب جان گئی ہیں کہ وہ کچھ بھی  
 نہیں۔ ایک گھڑی تک کو نہیں کھول سکتا۔ دو بازوؤں کو نہیں سنہیل سکتا۔ بیچارہ اس نے  
 محسوس کیا کہ وہ سب والانوں کی دیواروں کے پیچھے کھڑی اس پر ہنس رہی ہیں اور اوپر کونے پر نیم

بائیکل پڑا ہے۔ چھوڑو بائیکل لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ تھکا ہوا ہے اور اتنی دور نہیں  
 کوٹھی تک واپس پیدل جاتا۔ اس خیال پر وہ پنواڑی کی دوکلن پر جا کھڑا ہوا۔ ”کیوں صاحب  
 بولا“ آپ کے پچھلے مکان کی طرف کونسا راستہ جاتا ہے۔“  
 ”یہ ہے۔“ پنواڑی نے قریب ہی ایک ڈیوڑھی کی طرف اشارہ کیا۔

”انہوں نے کہا ہے۔ میرا بائیکل وہاں رکھا ہے۔ اس مکان میں کون رہتا ہے؟“ اس نے  
 پنواڑی سے ملتی جلتی انداز سے پوچھا پنواڑی نے غور سے ایلی کی طرف دیکھا پھر بولا ”مکمل  
 رہتا خلی پڑا ہے۔“

جھجکتے ہوئے اس نے ڈیوڑھی سے اندر جھانکا۔ اندر کوئی دکھائی نہ دیا۔ آواز تک  
 آ رہی تھی۔ پھر جرات کر کے وہ اندر داخل ہو گیا۔ صحن کے عین درمیان میں سائیکل کوا  
 اور مکان ویران پڑا تھا۔

مکان کے درمیان ایک وسیع صحن تھا۔ جس کے ارد گرد چاروں طرف والان بنے ہوئے  
 تھے۔ جن میں بہت سے دروازے اور فراخ کھڑکیاں تھیں۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے سائیکل  
 طرف بڑھا اور اسے سینڈ سے اتارنے لگا۔ جب وہ اسے کھینٹنے لگا تو دفعتاً چاروں طرف  
 سے کئی ایک جوان لڑکیاں جھانکنے لگیں۔ وہ سب ہنس رہی تھیں۔ مسکرا رہی تھیں۔ پھر وہ  
 والانوں سے نکل کر باہر صحن میں آگئیں اور ان کی آن میں اس صحن میں رنگین آنچل لپٹ  
 گئیں۔

## بیچارہ

”لے جاؤ بائیکل“ ایک پتلی لمبی لڑکی آگے بڑھ کر بولی۔  
 ”کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟“ دوسری نے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر اسے ڈانٹا اور پھر ہنس  
 ”یہ ہے کون؟“ ایک اور چمک کر بولی۔

”پوچھو نیم سے۔“ عقب سے ایک شوخ آواز آئی اور وہ کھلکھلا کر ہنسی۔  
 چاروں طرف سے ان لڑکیوں نے گویا ایلی پر یورش کر دی۔ خوشبو کا ایک سلاٹ  
 اڑتے ہوئے آنچل۔ اس کی طرف لپکے جیسے کالے ناگ زبانیں نکالے جھپٹ رہے ہیں  
 سے ہالی کا سر جسم سے الگ ہو کر فضا میں اڑا جیسے بارود کا بنا ہوا ہو۔ رنگین خوشبو

لوگوں کو دیکھنے لگا جو کپاؤنڈ میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔

”کسی سے ملے گا کیا؟“ پرنسپل نے پوچھا۔

”لوگوں بھی۔ دیکھ رہے ہیں۔ کرکٹ کا یہ کھیل۔“

کرکٹ کا لفظ سن کر پرنسپل چونکا۔ ”پڑھے لکھے ہو کیا؟“

”پور تو کیا دیے ہی کھڑے ہیں۔“ وہ بولا

”میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں۔“ پرنسپل بولا ”یہ کالج گراؤنڈ ہے۔“

”اچھا۔“ وہ بولا ”اجازت نہیں تو چلے جاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ پھلانگ کر کالج کی چار

دیواری پر چڑھ گیا اور دیوار پر بیٹھ کر کرکٹ دیکھنے لگا۔

اس پر پرنسپل کو بے حد طیش آیا اور اس نے قریب جا کر کہا ”اب دیوار پر بیٹھ گئے۔“

”تم نے جو کہا تھا کہ گراؤنڈ میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں۔ اب کیا یہاں بیٹھنے کی بھی

اجازت نہیں۔“ وہ تنک کر بولا۔

پرنسپل کو اس کی بدتمیزی پر ہنسی آگئی۔ بولا ”تم اس کھیل کو سمجھتے ہو کیا۔“

”سمجھتے۔“ اس نے پرنسپل کی طرف دیکھا۔ ”ہم نے تو اس کھیل کو کھیل کھیل کر چھوڑ دیا

ہے۔ اب کسی زمانے میں کھیلا کرتے تھے۔“

”کھیل کھیلا کرتے تھے؟“ پرنسپل نے پوچھا۔

”مدرسے میں اور کہیں۔“

”اچھا تو مدرسے میں پڑھتے رہے ہو۔“

”ہاں۔“ وہ بولا ”دس پاس کی ہیں۔“

”لو اب کیا کرتے ہو۔“

”کچھ بھی نہیں۔“

”کرکٹ کھیلو گے آؤ تمہیں کھلائیں۔“

اللہ دلوئے سمجھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ کہنے لگا ”واہ کھڑا ہونے تو دیتے نہیں اور کہتے ہو کہ

پرنسپل قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا اور پھر اسے پکڑ کر ٹیم میں لے گیا۔ ”لو بھی ایک نیا پلیئر لائے

میں ہم۔“ وہ بولا۔ اللہ دلوئے گیند اٹھا لیا اور بائیں ہاتھ سے بال کرنا شروع کر دیا ایک ہی دور

بایوس و محروم کھڑی ہے۔ اور اس کا چہرہ جذبہ حقیر سے سرخ ہو رہا ہے۔ صحن میں پلا

سائیکل سرک کر پرے ہٹ ہٹ گیا۔ جیسے وہ اپنا آپ اس کے حوالے کرنے کے لئے تیار

ہو۔ ایلی کی پیشانی پر پینہ آگیا اور وہ سائیکل اٹھا کر بھاگا۔ بورڈنگ کی طرف جاتے ہوئے

اسے اپنی بزدلی اور حماقت کا احساس ہوتا اور محسوس کرتا کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ اتنا اچھا موقع

کے باوجود وہ کچھ نہ کر سکا۔ وہاں اتنی لڑکیاں تھیں۔ مگر وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیا

سکا حتیٰ کہ وہ نیم کی شکل بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کے دل میں اس واقعے کی یاد کانٹا بن کر چبھ

اس طرح وہ واقعہ اس کے لئے ایک تلخ اور خوشگوار واقعہ بن گیا۔ ”بیچارہ۔ بیچارہ۔ بیچارہ۔“

سائیکل کا فری ویل چلا رہا تھا اور سڑک پر دھندلی اشکال اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔

اس واقعہ کے بعد مدت تک ایلی کے آغا کی گھر جانے کی جرات نہ ہوئی۔ جب بھی آغا

مکان کے متعلق اسے خیال آتا تو وہ محسوس کرتا کہ اس کا راز فاش ہو چکا ہے، اس کو پچے کی

نوجوان لڑکیاں چوباروں میں کھڑی اس پر ہنس رہی ہیں۔ اس پر انگلیاں اٹھا رہی ہیں ”وہی ہے

وہی۔“ اس خیال کے آتے ہی اسے پینہ آ جاتا۔

## کھلاڑی

پھر اتفاق سے کالج میں ایک نئی تحریک شروع ہو گئی، جس نے ایلی کی توجہ کو جذب کر لیا۔

یہ تحریک ایک ڈرامہ کھیلنے کی تحریک تھی۔ مگر اس تحریک کی ابتدا انوکھی تھی اور اس کی تمام

ذمہ داری اللہ دلوئے پر عائد ہوتی ہے۔

اللہ دلوئے فطری طور پر ایک مسخروہ واقع ہوا تھا اور اس کا مذاق اس قدر سنجیدگی کا پہلو لے

کہ انسان کو بے اختیار ہنسی آ جاتی مثال کے طور پر کالج میں اس کا داخلہ بھی انوکھے انداز سے

تھا۔ ایک روز چادر باندھے ایک تھیلا سی قیص پینے اور شانے پر ایک بڑا سا روئل ڈالے لگا

کی کپاؤنڈ میں کھڑا حسرت سے لڑکوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اتفاق سے پرنسپل اس طرف

گزر رہے پرنسپل اسے کھڑا دیکھ کر سمجھا کہ کوئی جاٹ کالج کی حدود میں آکھسا ہے۔ پرنسپل اس

قریب آکھڑا ہوا۔ اس پر وہ جبکہ محسوس کئے بغیر وہیں کھڑا رہا۔

”اے چودھری۔“ پرنسپل نے کہا ”میں کیا کر رہا ہے تو؟“

”میں۔“ وہ چونکا۔ ”دیکھتا نہیں کہ کھڑا ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں کر رہا۔“ یہ کہہ کر وہ

اسے پانچ روپے جرمانہ کر دیا۔ اللہ داوے تو جرمانہ ادا نہ کیا۔ ہر حال دفتر نے جرمانے کی ادائیگی کے لئے تقاضہ جاری رکھا۔ حتیٰ کہ اللہ داو کو احساس ہو گیا کہ اسے یہ جرمانہ ادا کرنا ہی ہو گا۔ ایک روز وہ شفیع سے کہنے لگا ”یار شفیع اب تو اس جرمانے کا کچھ کرنا ہی ہو گا۔“

”کرنا کیا ہے؟“ شفیع بولا ”پانچ روپے دے دو اور کیا۔“

”اچھا بھئی۔“ اللہ داو نے کہا۔ ”تو مجھے دس روپے قرض کے طور پر دے دے یار۔“

”ہاں یار دس ہی دے دو۔“ اس نے کہا۔ ”یا تو یہ زائد پانچ اصل کو بھی واپس لے آئے

اور نہیں تو دسوں ہی گئے۔ یہ جو اکھیل ہی دیکھوں۔“

اگلے روز اکاؤنٹس نے پرنسپل سے جا کر شکایت کی کہ اللہ داو پانچ کی بجائے دس روپے جرمانہ ادا کرنے پر مصر ہے یہ ایک عجیب و غریب شکایت تھی۔

اللہ داو کو طلب کیا گیا۔ ”یہ کیا حماقت ہے؟“ پرنسپل نے پوچھا۔ ”جرمانہ تو تمہیں پانچ روپے ہوا ہے اور تم دس ادا کر رہے ہو یہ کیا حماقت ہے۔“

اللہ داو نے سر جھکا لیا۔ ”نہیں حماقت نہیں جی۔“ وہ بولا۔ ”تو پھر کیا ہے؟“ پرنسپل نے پوچھا۔

”صاحب پانچ روپے تو جرمانہ دیا ہے اور پانچ روپے جمع کرا دیئے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ پرنسپل نے پوچھا۔

”جی کسی وقت پانچ روپے ہوتے ہیں۔ کسی وقت نہیں ہوتے اور ان پر خورداروں کا کیا اعتبار نہ جائے کب اگر الجھ جائیں۔“

اللہ داو نے یہ بات کچھ ایسی سنجیدگی اور معصومیت سے کہی کہ پرنسپل قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ ”تو مطلب یہ ہے کہ پانچ ایڈوائس کے طور پر دے رہے ہو۔ ہا ہا ہا۔“ وہ ہنسے۔ ”حد ہو گئی۔ اللہ داو تمہیں تو تحفہ کا مسخرہ ہونا چاہئے خواہ مخواہ کالج میں پڑھ کر وقت گنوار ہے ہو تم۔ ہی ہی۔“

”حضور میرا کیا ہے۔ آپ نے کالج میں داخل کر لیا تو کالج میں داخل ہو گیا۔ تحفہ میں داخل کر دیئے تو تحفہ میں داخل ہو جاتا۔ میرا کیا ہے۔“

”اچھا تو تمہیں تحفہ میں داخل کر دیں گے۔“ پرنسپل ہنستا ہوا چلا گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تو اللہ داو کا جرمانہ معاف کر دیا گیا اور دوسرے کالج کی مجلس تمثیل کا

میں اس نے کالج کے دو بہترین کھلاڑیوں کی وکٹیں اڑا دیں تو پرنسپل نے واہ وا کا شور مچا دیا۔ پرنسپل اسے اپنی لینڈ میں بٹھا کر گھر لے گیا اور اگلے ہی روز اسے کالج میں داخل کر لیا گیا۔ کی تمام فیس معاف کر دی گئیں بلکہ پورے فنڈ میں سے اس کے لئے کتابیں خریدی گئیں اور جوڑا کپڑوں کا بنا کر دیا گیا تاکہ وہ مناسب کپڑے پہن کر کالج آ سکے۔

## مسخرہ

ایک روز اللہ داو برآمدے کے کونے پر کھڑا نہ جانے کیا سلوج رہا تھا کہ گیارہویں مارچ چھوٹا سال لڑکا بھاگتا ہوا ادھر آ نکلا اور اللہ داو سے ٹکرا کر گر پڑا۔ اللہ داو نے لپک کر اسے ”نہ بیٹا۔“ وہ بزرگانہ انداز میں بولا ”اندھا دھند بھاگا نہیں کرتے۔“ اللہ داو نے اس کے کپڑے جھاڑے اور پھر اس کا منہ چوم کر کہا: ”نہ بر خودار ایسے نہیں کیا کرتے۔“ اس پر ارد گردی سب لڑکوں نے تالیاں پیٹ دیں اور بہت ہنگامہ برپا کیا۔ اس شور اور ہنگامے کی وجہ سے لڑکے نے جا کر پرنسپل سے رپورٹ کر دی۔ اس رپورٹ پر پرنسپل غصے میں آ گیا اور اسے لڑکے کو فوراً دفتر میں طلب کیا۔ ”اللہ داو تمہارے خلاف شکایت پہنچی ہے ہمیں۔“ انہوں نے اسے کہا: ”جی کیسی شکایت؟“ اللہ داو نے معصومیت سے پوچھا۔

”کیا یہ درست ہے کہ تم نے گوشت کا منہ چوما ہے؟“ وہ طیش میں بولے۔ ”جی ہاں۔“

داو نے سر جھکا لیا۔

”ہوں۔“ پرنسپل غرایا۔ ”تو تمہیں اس کی سزا ملنی چاہیے۔“

”غلطی ہو گئی مجھ سے جناب۔“ اللہ داو بولا۔

ممکن ہے اللہ داو کا یہ قصور بھی معاف کر دیا جاتا اور اسے آئندہ کے لئے سزا مل جاتی۔ لڑکوں کا خیال تھا کہ ایسا ہی ہو گا کیونکہ ہر بات میں پرنسپل اللہ داو کی رعایت کرتے تھے۔ بلکہ ایک روز اللہ داو کی شرارت پر تو پرنسپل صاحب نے اعلانیہ قہقہہ مار کر کہا: ”اللہ داو کو معاف نہ کروں تو اور کیا کروں اگر جرمانہ کر دوں تو وہ جرمانہ بھی کالج کے کسی لڑکے ہی ادا کرنا پڑے گا۔“ یہی اس کے پاس کچھ ہو بھی۔“ پرنسپل کی یہ بات سچی تھی۔ اللہ داو کچھ بھی تو نہ تھا۔

لیکن اس روز پرنسپل بے حد غصے میں تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی اس

تمام تلخ یادیں محو ہو جاتیں یہاں تک کہ وہ بالکل والا واقعہ بھی بھول جاتا جب وہ کپڑوں کی عمری کے بل کھولنے سے قاصر رہا تھا۔ اس وقت اسے شہزاد کا جھم سے آنا بھی بھول جاتا۔ پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ موسیقی اسے تلخ یادوں سے آزاد کر سکتی ہے۔ خصوصاً جب نور کی شہ لگن سے بہار آئی گاتا تو ایلی یہ بھی بھول جاتا کہ وہ ایلی ہے کہ وہ علی احمد کا بیٹا ہے اور علی احمد کو نین کا سپاہی بننے سے دلچسپی ہے اسے سبھی کچھ بھول جاتا اور وہ حیرانی سے اس سانورے سے چھوٹے سے نور کی طرف ٹٹکی باندھ کر دیکھتا۔ دیکھتے چلا جاتا۔ اس وقت نور کے چہرے کے گرد ایک ہلا سا نمودار ہوتا آنکھوں میں چمک لہرائی۔ بازو رقص کرنے لگتے۔ اس وقت اسکی آنکھیں باتیں کرتیں اس کے چتون اظہار سے چھلکتے۔ ان کا پیغام کس قدر حسین ہوتا۔

نور کو دیکھ کر پہلی مرتبہ ایلی کو نزہت کی عظمت کا احساس ہوا۔ اس کا گیت سن کر اس نے محسوس کیا جیسے واقعی بہار آگئی ہو اور وہ شہ لگن جس کی وجہ سے بہار آئی تھی۔ نور بذات خود ہو۔

اس کے بعد ایلی کئی ایک دن شہ لگن اور بہار میں کھویا رہا۔ انتظار کرتے کرتے وہ تھک جاتا۔ لیکن کالج کا وقت ختم ہونے میں نہ آتا۔ خدا خدا کر کے ریسرسل کا وقت ہوتا اور نور ٹھمکتا ہوا ہل میں داخل ہوتا اور ایلی کے لئے بہار آتی۔

### معصوم فاحشہ

لیکن چند ہی دن کے بعد ایلی پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس پتلے دبلے سانورے لڑکے میں دو شخصیتیں کلام کر رہی ہیں۔ دو مختلف متضاد شخصیتیں۔ ایک وہ نور جو گاتے وقت اس میں بیچارہ ہوتا۔ وہ نور جس کی حرکات میں حسن کی جھلک دکھائی دیتی۔ جس کے گلے میں سے گویا پھلکی ہوئی ہانسی کا ایک فوارہ چھوٹا۔ لیکن جو نئی وہ گانا ختم کر دیتا تو اس کی آنکھوں میں عریانی بھرا پیغام جھلکتا اور اس کی حرکات سے سستے پن کا مظاہرہ ہوتا۔

نور کی چال تو بالکل ان عورتوں کی طرح تھی۔ جو کنزوار تئیں میں دوسرے درجے کے پتواریوں میں بیٹھتی تھیں۔ نور کی ان باتوں کو دیکھ کر ایلی کو دکھ سا محسوس ہوتا اور وہ جلد ہی کسی اور بات کی طرف توجہ منعطف کر لیتا تاکہ خیال بٹ جائے۔ مگر اس کے باوجود اس کے دل میں

اجرا ہو گیا۔ اور چند ہی دنوں میں کالج میں شکنتلا کے کھیل کی ریسرسل شروع ہو گئی۔

### شہ لگن

ایلی کو موسیقی سے بے حد دلچسپی تھی۔ گانے کی آواز سن کر اس کے دل میں چوہ دوڑنے لگتے۔ دل بیٹھ جاتا ایک رتئیں اداسی اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی۔ شہ لگن کی ریسرسل شروع ہوئی تھی، اس کے لئے بورڈنگ میں جانا مشکل ہو گیا تھا۔ نصیبت یہ تھی کہ عام لڑکوں کو ریسرسل دیکھنے کی اجازت نہ تھی اور ریسرسل کے وقت ان لڑکوں کا داخلہ ممنوع تھا، جن کو ڈرامہ کھیلنے کے لئے نہیں چنا گیا تھا۔ اس لئے جب ریسرسل شروع ہوتی تو وہ ہال سے باہر دروازے کے شیشے سے لگ کر دیکھتا رہتا اور جب سائڈس دھن بجاتے تو اس پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ چند ہی یوم میں ایلی کو تین چار مرتبہ سنتے پکڑ لیا گیا اور آخر کار ڈرامے کا انچارج اسے پرنسپل کے پاس لے گیا۔ پرنسپل نے اسے ڈانٹا ڈپٹا۔ پھر دفعتاً نہ جانے اسے کیا سوچھی بولا۔ ”ہوں اگر تمہیں ڈرامے سے لپٹے تو عملی طور پر ہماری مدد کیوں نہیں کرتے۔“

”عملی مدد“ ایلی سوچنے لگا۔

”تم کا سکتے ہو؟“ پرنسپل نے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”ناج سکتے ہو؟“

”جی نہیں۔“

”یہ اچھی دلچسپی ہے۔“ وہ ہنسنے لگے ”گا نہیں سکتے۔ ناج نہیں سکتے مگر ڈرامے سے۔“

نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کو پروفیسر انچارج کے حوالے کر دیا گیا کہ جو مناسب کلام کرے گا

سے لیا جائے اور ایلی کو ریسرسل کے دوران ہال میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔

جب ”حمہ“ کی مشق شروع ہوتی اور میراثی طبلے پر ہاتھ چلاتا تو ایلی کا دل ڈوبنے کے جسم پر ہیر ہونیاں ریگنے لگتیں۔ خاص طور پر جب ربایوں کا وہ چھوٹا سا لڑکا نور بیٹھی سی آواز میں ”تو جگ کا ہے۔“ کہتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا وہ سب

نہیں دیکھا تھا۔

نور چند ایک روز کے لئے تو ان کا منہ سکتا رہا پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا یہ نیا تعلق اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا تعلق ہے تو وہ حیران رہ گیا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ سمجھ میں آتی تو بھی اسے یقین نہیں پڑتا تھا۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا ایک روز وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”خدا کے لئے مجھے بچالو۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں یہ زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ پتلے پتلے ہونٹ لرز رہے تھے اور وہ امید بھری نگاہوں سے ایللی اور آصف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ندی کے کنارے پر سوکھے ہوئے درخت جو شبہ لگن سے ہرے ہو چکے تھے۔ پھر سے سوکھ گئے۔ ندی کے پانی کی روانی تھم گئی۔ جیسے وہ ایک جوہر بن گئی ہو اور ان کے ارد گرد ایک وسیع دیرانہ پھیلا ہوا تھا۔

### بیگانے دوست

ایک روز آصف بھاگا بھاگا ایللی کے پاس آیا اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

”ایلی“ وہ بولا۔ ”وہ“ وہ سفید پھر یہاں آ رہی ہے۔ اگر وہ آگئی تو پھر میں کیا کروں گا۔ چلو ہم امرتسر سے بھاگ چلیں ایللی۔“

”لیکن جائیں کہاں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”کہیں بھی۔“ اس نے آہ بھر کر کہا۔

”نہیں آصف۔“ ایللی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اگر وہاں بھی لڑکیوں نے تمہیں سلام کرنے شروع کر دیئے تو۔“

”تو تو۔۔۔۔۔“ آصف سوچنے لگا۔ ”تو میں کیا کروں۔“ اس نے بے بسی سے ہاتھ پلایا۔

”تم ان کی شکایت کرنا چھوڑ دو۔“ ایللی نے سوچ کر کہا ”شکایتوں کی وجہ سے وہ چڑ جاتی ہیں۔ ضد پیدا ہوتی ہے۔ تم خود انہیں سلام کرنا شروع کر دو تاکہ وہ خود تمہاری شکایتیں کریں۔“

”میری شکایتیں۔“ آصف گھبرا کر بولا۔ ”نہیں نہیں یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔“

کالسا سا چھرا رہتا۔ پھر وہ شدید کوشش سے تصور کے زور پر اس نور کو گانے والے نور میں بدل دیتا اور یوں وہ عریاں منظر شبہ لگن میں تبدیلی ہو جاتا اور بہار آجاتی۔

جب آصف کو ایللی کی اس نئی دلچسپی کا علم ہوا تو وہ بہت ہنسا کہنے لگا ”اچھا ابھی آج دیکھیں گے تمہارا نور۔“ اس شام کو آصف گل ہتھیلی پر رکھے بیٹھا نور کا گانا سنتا رہا حتیٰ کہ اس کی آنکھیں شفاف پانی کی مچھلیوں میں بدل گئیں اس کے ہونٹوں کی وہ تسخیر آمیز سلوٹ دور ہو گئی اور پاؤں انجانے میں تل دینے لگے۔

اس کے بعد آصف اور ایللی فارغ وقت میں نور کو لے کر آموں والی کوٹھی کے قریب نہر کے کنارے چلے جاتے۔ ایللی کسی پیڑ تلے بیٹھ جاتا۔ آصف ندی میں پاؤں لٹکا لیتا اور نور کا گانا اس شبہ لگن میں ایللی کی نگاہوں تلے ہتھکھالی لٹ لراتی اور آصف کی آنکھیں جھپٹ جاتیں تیرتیں اور سوکھے ہوئے درختوں پر ہریا دل یورش کرتی اور ندی کا پانی ناچتا اور آسمان پر ہندسے رقص کرتے۔

گانے کے اختتام پر نور کی آنکھ میں وہ نورانی چمک بچھ جاتی اور ایک ریڑی کپڑے انداز میں ہو کر ان کے روبرو اکھڑی ہوتی اور نمائش کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ ہونٹ جو کون کی لہا ان کی طرف بڑھتے اور وہ دونوں گھبرا کر وہاں سے چل دیتے اور سوچتے کہ کس طرح اس سے بچا چھڑائیں۔ اس وقت انہیں یہ فکر دامن گیر ہو جاتا کہ کوئی انہیں نور کے ساتھ دیکھ نہ پائے لیکن جو نئی وہ نور سے جدا ہوتے تو وہ اس کے خیال میں کھو جاتے۔ شبہ لگن پھر کرب لگتا گا۔

اتفاق سے ایک روز شیخ ہدم بھی آگئے اور ان تینوں نے مل کر شبہ لگن منائی لیکن شام خاموش ہو گئے اور پھر اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے: ”یہ سب ٹھیک ہے۔ الیاس صاحب لیکن امرتسر کے رہا یہ لڑکے سے نہر کے کنارے پر گانا سنتا اور پھر ماشاء اللہ گانے والے جببہ صاحب ہوں بات ذرا خطرناک ہے۔“

”خطرناک ہے۔“ ایللی کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر بات خطرناک کیوں تھی۔ اس میں خطر کی کیا بات تھی۔ نور ان کے ساتھ بے حد مانوس ہو چکا تھا اور اب تو اس پر واضح ہو چکا تھا کہ وہ کا مقصد موسیقی کے سوا کچھ نہیں اور اس کا پاؤں ٹھمکانا، آنکھیں مٹکانا اور ہونٹ ٹکانا ایللی پر بے کار تھا۔ ایللی نے اب سے پہلے کبھی اتنے چھوٹے بچے کو ایسی عریاں حرکات کرتے

میں جاتا تو یہ احساس اس کی رگ و پے میں بس جاتا۔ وہیں پہنچ کر وہ محسوس کرنے لگتا جیسے زندگی ایک گرداب ہو جس میں افراد کی چھوٹی چھوٹی قدیمیں اپنی اپنی دھن میں سلگ رہی ہوں اور گرداب کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ دیوانہ وار گھوم رہی ہوں۔

جب بھی شام کے وقت ایللی آتا سے ملنے ان کے یہاں جاتا تو آتا ایللی کو لے کر ڈیوڑھی کے باہر کمرے ہو جاتے تاکہ کمرے میں چلتے پھرتے لوگوں کا تماشا کر سکیں۔ کمرے میں لوگ ہنسنے، مگرٹ کے کش لیتے اور نگاہوں کی انگلیوں سے چوباروں میں بیٹھی ہوئی رقاصوں کو جھپٹتے۔ اشارے کرتے۔ تماشین تانگوں پر بیٹھ کر چوباروں کی طرف گرم نگاہیں ڈالتے ہوئے مڑ جاتے۔ مزدوروں کے گروہ کوچے میں شلتے۔ تاجر نگاہیں جھکائے قدم اٹھاتے ہوئے نکل جاتے۔ شوقین مزاج دوکانداروں کی نگاہیں گاہکوں اور رقاصوں کے درمیان یوں گھومتی جیسے گڑی کا پنڈولم چلتا ہے۔

ہر چند گھنٹوں کے بعد کمرے میں کوئی ایسا شخص بھی آنکھتا جسے دیکھ کر لوگوں کی نگاہیں چوباروں سے ہٹ کر اس کی طرف منعطف ہو جاتیں۔ بازار میں ایک مدھم سی سرگوشی ابھرتی۔

”کون ہے۔“

”ہائیں یہ ہے وہ۔“

”کیسے دیکھ رہا ہے۔“

”یارانہ ہے اس سے کیا؟“

لورہ سرگوشی برف کی گیند کی طرح لڑھکتی۔ لڑھکتے جاتی۔ حتیٰ کہ سارا کمرہ اس کی لپیٹ میں آجاتا۔ رقاصائیں بھی اپنے بے نیازانہ انداز کو چھوڑ کر بچوں کی طرح بازار کی طرف دیکھنے لگتیں اور چند ساعت کیلئے انہیں یاد نہ رہتا کہ وہ دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ اپنا آپ دکھانے کے لئے وہاں بیٹھی ہیں۔ اس وقت رقاصوں میں نسائیت کی جھلک نمودار ہو جاتی اور محسوس ہونے لگتا کہ وہ گزریاں نہیں بلکہ جیتی جاگتی عورتیں ہیں۔

لکھنؤ، الہ آباد یا مدراس کا کوئی مشہور سا زندہ آجاتا یا کوئی پیرا نوکھا لباس پہنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتا۔ وہاں مشہور ڈاکو اور لٹیرے آیا کرتے تھے۔ کروڑ پتی اور کسیدہ تو اکثر آتے۔ لیکن کمرے میں سب سے زیادہ دھوم انکسٹر رووف کی تھی۔

انکسٹر رووف

اگر انکسٹر رووف آجاتا تو فوراً بازار پر سناٹا چھا جاتا۔ پناہی سسم کر بیچھے ہٹ جاتے۔

”اگر تم انہیں سلام کرنا شروع کر دو گے تو ان کا برتاؤ محبوب کا سا ہو جائے گا۔“ ایللیا نے کہا۔ ”اور وہ تم سے دور بھاگنے لگیں گی۔ انہیں دور بھاگانے کی یہی ایک ترکیب ہے۔“

”اچھا۔“ آصف نے تلی بجائی۔ ”کیا یہ چلے گی۔ پھر تو بہت اچھا ہے۔“

آصف سمجھ رہا تھا کہ ایللی اسے مشورہ دے رہا تھا۔ حالانکہ درحقیقت مشورے کے پہلو میں وہ اپنی مشکل بیان کر رہا تھا وہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی لڑکی ایسی نہ تھی جو صبح سویرے ایللی سے سلام کرتی ہو۔ کوئی بھی تو نہ تھی جو اس کے لئے بیقرار ہو۔ بلکہ قریب اگر بھی وہ کسی کی طرح سٹ جاتی تھیں اور کوشش کے باوجود بھی کھل نہ سکتی تھیں۔

”لیکن لیکن آصف۔“ ایللی نے کہا ”ایسا کیوں ہوتا ہے اگر تم ان کی تلاش میں سرگرداں نہ جاؤ تو وہ دور بھاگتی ہیں اور اگر تم ان سے دور بھاگو تو وہ تمہارا پیچھا کرتی ہیں۔“

”ہاں۔“ آصف مگھلتا، ”مگر میں ان کی تلاش میں کیسے کھو جاؤں۔“

اس کے برعکس ایللی سوچ رہا تھا کہ وہ انہیں اپنی تلاش میں کیسے سرگرداں کرے۔ مگر اس طرح انہیں تلاش پر مائل کرے۔

وہ دونوں بہترین دوست تھے لیکن ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کس قدر دور تھے۔ کس قدر بیگانہ۔ ان کی مشکلات ایک دوسرے سے کس قدر مختلف اور متضاد تھیں۔

”اچھا۔“ آصف نے کہا۔ ”تو مجھے بتاؤ کہ میں کس طرح ان پر ظاہر کروں کہ میں ان کی متلاشی ہوں۔“

”تم صبح اٹھ کر ان کو سلام کرنا شروع کر دو۔“ ایللی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اور کبھی دوپہر یا شام کو کوشش کر کے کوٹھے یا کھڑکی سے اسے دیکھ لیا کرو۔“

”اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔“ آصف بولا۔

اور ایللی نے دل میں سوچا اچھا میں کوشش کروں گا کہ کسی کو اپنے لئے سرگرداں نہ مائل جستجو کروں۔

وہ کوچہ

ایللی اب محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ سمندر میں بہتا ہوا تنکا ہو۔ خصوصاً جب وہ اس



کوئین بلبل سر پٹیا۔ پھر کچھ دیر بعد چوہارے سے انسپکٹر رؤف کے دھاڑنے کی آوازیں آئیں جو مارے کھڑے میں گونجیں۔ وہ نشے میں چیتا چلاتا دھمکیاں دیتا۔ غلیظ گالیاں دیتا اور پھر ایسے لگتا جیسے چوہارے میں دنگا فساد ہو رہا ہو۔ وہ بالا خربتیاں بچھ جاتیں اور سکوت چھا جاتا اور کھڑے والے محسوس کرتے جیسے اس گہری خاموشی سے کراہوں کی آواز آرہی ہو۔

انسپکٹر رؤف کے علاوہ کوئی دوسری شخصیت جو کھڑے پر اثر انداز ہوتی تھی، پیر سبز پوش کی تھی۔ جب بھی وہ کھڑے میں داخل ہوتے تو ایک تعجب اور خاموشی بھری سرگوشی بلند ہوتی۔ پنوازی پان لگانا چھوڑ دیتے۔ تماش بینوں کی نگاہیں چوہاروں سے ہٹ کر پیر صاحب کے چہرے اور لباس پر مرکوز ہو جاتیں۔ سلازمین دوکان کے اندرونی حصے سے دوڑ کر باہر آکھڑے ہوتے اور رقاصائیں جنگلوں پر کھڑی ہو کر نیچے دیکھنے لگ جاتیں۔

پیر صاحب کے سبز ریشم پیراہن پر ان کی لابی سیاہ ریشم لکٹیں ان کے سر پر ریشمیں ہزاروں عربی انداز سے بندھا ہوتا اور ان کا حسین نسائی چہرہ چمکتا اور ریشمی سیاہ آنکھیں جھکی رہتیں۔ ان کے خدو خال ستواں تھے۔ ان کی آنکھیں دیکھنے والی نہیں بلکہ دیکھنے والی تھیں اور انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی حسین عورت جوگی لباس پہنے چوہارے سے اتر کر تقریباً کھڑے کے بازار میں گھوم کر اپنی نمائش کر رہی ہو۔

### آنچل اور گٹھڑیاں

اس کوپے کو دیکھ کر نہ جانے ایللی کو کیا ہو جاتا۔ اس کے جسم پر چوہنیاں ریگنے لگتیں اور پھر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ وہیں کھڑا دیکھتا رہے۔ دیکھتا رہے۔

اب اس کے لئے آغا کے ملاقاتی کمرے میں بیٹھنا ناممکن ہو چکا تھا۔ جب بھی وہ وہاں بیٹھتا تو اسے محسوس ہوتا کہ کوئی اس پر ہنس رہا ہے۔ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ ایک رنگین آنچل لہراتا دکھائی دیتا اور پھر بہت سے کپڑے لپٹ لپٹ کر گٹھڑی کی شکل اختیار کر لیتے اور وہ گٹھڑی لڑھکتی ہوئی کوئی ہنسنا جیسے مذاق اڑاتا۔ ایللی گھبرا کر اٹھتا اور زینے کی طرف بھاگتا زینے میں کھڑی نیم کے ہونٹوں پر اسرار تبسم ہوتا ”آگئے، آگئے۔“ وہ آنکھیں میٹکا کر کہتی۔ ایللی کو اس کی آوازیں بلا کاٹھڑ محسوس ہوتا پھر وہ باہر نکل جاتا اور بازار کے کسی کونے میں کھڑا ہو کر لوگوں کی طرف دیکھنے

دوکاندار چوہاروں کی طرف دیکھنا موقوف کر دیتے۔ راہ گیر نگاہیں جھکا لیتے۔ اوھر چوہاروں کی سرخی بھرے چہرے زرد پڑ جاتے۔ نگاہوں میں شوخی کی جگہ گھبراہٹ دوڑ جاتی۔ رقصائیں چھپ چھپ چھپ کر دھکائے بیٹھ جاتیں جیسے طبیعت ناماز ہو۔

اس زمانے میں کھڑے پر رؤف کی حکومت تھی۔ وہ کھڑا اس کی ریاست تھی۔ جب کہ وقت وردی پر سٹی پٹی لگائے۔ سر پر طرے دار پگڑی باندھے اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ کھڑے میں لٹکتا تو ایک سرگوشی ابھرتی اور تیزی سے یہاں سے وہاں تک دوڑ جاتی اور ایک عقب میں بھیانک خاموشی چھوڑ جاتی۔

پنوازی چوہاروں کی طرف تاڑنے کا شغل چھوڑ کر شدت سے پان بنانے میں مصروف جاتے۔ دوکان پر کھڑے شوقین نظرس لوانے کا خیال موقوف کر دیتے۔ جزل مرچنٹ سلازمین حساب کتاب کے رجسٹر کھول کر مصروف ہو جاتے۔

انسپکٹر رؤف کی آمد کی خبر سن کر چوہاروں میں سازندوں کے ہاتھ لرز کر ممنوع سروں پر پڑتے دکھ بھری سروں پر قیام لے ہو جاتے۔ سارنگیاں ناچنا چھوڑ کر رونا شروع کر دیتیں اور مسکراتی ہوئی رقاصائیں گھبرا کر گانا چھوڑ دیتیں اور کھوئے ہوئے انداز میں پان لگائے بیٹھ جاتے۔ انسپکٹر رؤف تمہید کے طور پر کھڑے کے دو تین چکر لگاتے۔ پھر کسی چوہارے کے دروازے پر اپنے سپاہی کو متعین کر دیتے اور خود سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا پہنچتے۔ ان کے پیڑھ چڑھتے ہی وہ طلسم گویا ٹوٹ جاتا۔ اس وقت کوئی پنوازی نعرہ لگاتا ”علی“ اس کا وہ نعرہ کنکائی کھڑے میں گونجتا اور کھڑے میں رکی ہوئی زندگی پھر سے حرکت میں آجاتی۔ تماش بینوں کی نگاہیں بے باکی سے کھڑکیوں پر منزل لانا شروع کر دیتیں۔ پنوازیوں کی دوکانوں پر کھڑے شہزادوں سے رقاصوں کو تاڑنے لگتے۔ رقاصوں کے ہونٹوں پر ایک بار پھر تبسم لہراتا اور ان کے لبوں سے بوجھ اتر جاتا۔

البتہ جس چوہارے پر انسپکٹر رؤف چڑھ جاتے تھے وہاں لوگوں کی حالت بد سے بدتر جاتی۔ محفل درخواست ہو جاتی۔ سینٹھ اور تاجر چپکے سے نیچے اتر آتے۔ میرانی ہاتھ دھر کر جاتے۔

پھر اگر رؤف کے حکم کے مطابق وہاں راگ رنگ ہوتا بھی تو سارنگیاں لگنے کی جگہ

میں کھو جاتا۔

کالج میں جب آصف مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا "ایلی تسلیم۔" تو ایک رہنمائی گھڑی دھم سے ان کے درمیان آگرتی اور اس کا راز کھول دیتی۔ وہ محسوس کرتا کہ آصف کے راز سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایلی ایک ریشمیں گھڑی کھولنے کی ہمت بھی کر رکھتا۔

پھر شام کو وہ دونوں آموں کی کوٹھی کے قریب نہر کے کنارے نور سے ملنے اور نور کے نیچے بیٹھ کر گاتا اور شہ گنگن سے بہا آجاتی۔ لیکن سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ نور کے لئے شہ سے اتنی دور چل کر آموں کی کوٹھی تک پہنچنا مشکل تھا اور نور کو اس کے گھر سے ممکن نہ تھا۔ کیونکہ نور محلے کے لڑکوں سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ لڑکے گھر سے اسے بلائے۔ نور سے ایک جگہ مقرر کر لی جاتی اور ایلی مقرر وقت پر وہاں جا کر نور اپنے ہائیکل پر بٹھا کر بورڈنگ میں لے آتا۔ ایلی کو یہ احساس نہ تھا کہ نور کو یوں ہائیکل پر خطرے سے خالی نہیں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ نور کو یوں ہائیکل پر لانا خطرے سے خالی نہیں۔ معلوم نہ تھا کہ کسی لڑکے سے دوستی کی وجہ سے عداوت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

ایک روز جب ایلی سفید چوک میں کھڑا نور کا انتظار کر رہا تھا تو ایک پہلوان قسم کا شخص آ کر اور بڑی بے تکلفی سے بولا۔ "دیکھ بابو تو نور کا چچھا کرنا چھوڑ دے ورنہ خون بہہ جائے گا۔ تیری کھلڑی اتر جائے گی۔" یہ کہہ کر اس نے غصے میں تل پر ایک گھونہ مارا۔ پانی کا ایک ٹپا چھوٹا اور ایلی کے کپڑے بھیگ گئے۔

اس روز آصف اور ایلی تنہا نہر کے کنارے خاموش بیٹھے رہے حتیٰ کہ سورج کی دھاریاں دھندلی پڑ گئیں۔ اور دور شہ کی بتیاں روشن ہو کر ناچنے لگیں۔ مگر شہ گنگن سے ملنے آئی۔ دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

پھر ایلی نے کہا۔ "آصف میرا یہاں جی نہیں لگتا۔"

"اچھا۔" آصف نے مسکرا کر پوچھا۔ "تو پھر کیا کیا جائے۔"

"تو پھر میں علی پور سے ہو آؤں کیا۔" ایلی نے کہا۔

"اس سے کیا ہو گا۔"

"پتہ نہیں۔" ایلی بولا "شاید۔"

"اچھا۔" آصف نے آہ بھری۔ "لیکن میں کہاں جاؤں۔"

"کہوں۔ تم تو یہاں خوش ہو۔"

"یہاں خوش ہوں۔ برا خوش ہوں لیکن۔" آصف نے آہ بھری "لیکن کیا۔" ایلی نے کہا۔ "معلوم نہیں۔" آصف نے سر جھکا لیا ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے اب یہ شہر دیران ہو گیا ہے۔ جیسے کچھ بتی نہیں رہا جیسے کچھ کھو گیا ہے۔

"اب تو وہ یہاں نہیں۔ اب تو تمہیں کوئی تنگ نہیں کرتی۔" ایلی نے طنزاً کہا۔ "ہاں۔"

آصف نے آہ بھری۔ "اب مجھے کوئی تنگ نہیں کرتی۔"

"پھر بھی تم اس کو۔ عجیب بات ہے۔" ایلی بولا۔

"ہاں۔" آصف نے اثبات میں سر ہلایا۔ "عجیب بات ہے۔ اچھا تم ہو آؤ علی پور سے۔"

"اس نے آہ بھری۔ "کاش کہ میرا بھی کوئی علی پور ہوتا۔"

اس روز وہ دونوں دیر تک اندھیرے میں نہر کے کنارے بیٹھے رہے حتیٰ کہ اللہ داو لکڑی اٹھائے ان کی تلاش میں آ پہنچا۔

"ارے یہاں بیٹھے ہو تم دونوں۔" وہ چلایا۔ "اور میں سمجھا شاید نہر میں ڈوب گئے جو ابھی تک نہیں آئے۔" "ہاں۔" وہ انہیں خاموش دیکھ کر چلایا "کیا کر رہے ہو میاں۔ یوں چپ چاپ بیٹھے سے مطلب چلو ایلی چلو۔"

رات کے وقت لیٹے ہوئے ایلی نے شدت سے محسوس کیا جیسے شہ گنگن گزر گئی ہو اور بہار کے بعد چاروں طرف خزاں کی دیرانی چھا گئی ہو۔ چاروں طرف ایک لٹی ہوئی دنیا تھی۔ دورندی کا دھارا اس آواز میں گنگنا رہا تھا۔ لہریں ہچکیاں لے رہی تھیں۔ درخت شاخیں شاخیں بھر رہے تھے۔ رسیوں میں رامو بھدی آواز میں کچھ گنگنا رہا تھا اور چاروں طرف گھپ اندھیرا لہریں لہرا رہا تھا۔

اس کا خیال نیم کی طرف منعطف ہو گیا۔ ایک گھڑی سی لپٹ گئی۔ ایک تہقہ بلند ہوا اور زرد و اس چرے ستونوں کی اوٹ سے نکل کر بھاٹکنے لگے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تسنن سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

گھبرا کر اس نے باورچی خانے کے تل کو گھورتا شروع کر دیا۔ کتنا غلیظ تل ہے۔ اس نے جھرجھری لی۔ نہ جانے رامو کہاں ہے کس کام میں لگا ہے۔ شاید برتن صاف کر رہا ہو۔ شاید

رسوئی میں بیٹھا ہو۔ اس کی نگاہ پھر تل پر رک گئی۔ اگر اس کے گرد اینٹوں کا چھوڑا ہوا ڈھیر اس کی نگاہ میں تل کے گرد ایک صاف ستھرا چہرہ بن گیا۔ ”اور بابو۔“ ایک بدستور طرف لپکا ”کھڑی اتر جائے گی تیری۔ ہاں۔“ ایلی نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسے ہونے لگا کہ تل سے چھینے اڑ رہے ہیں اور وہ شرابور ہو چکا ہے۔

## رینگتی دیواریں

اگلے روز ایلی گاڑی میں علی پور جا رہا تھا۔ بخار کی وجہ سے اس کی کپٹیاں تھک رہی تھیں۔ دل میں دھکی بج رہی تھی۔ ہرے بھرے کھیتوں میں جا رہی تھی۔ یہاں وہاں بزرگھڑیاں بندھی پڑی تھیں۔ ایک گھڑی قریب آتی۔ ”دھننا“ اس میں سے دو حنا مالیدہ ہاتھ ایلی کی طرف لپکے۔ شیم کی ہنسی کی آواز سنائی دیتی۔ ”ہی ہی ہی“ علی احمد ققمہ مارتے۔ ”کشمیر کے سیبوں“ ہے ہاں۔“

دوسری گھڑی کے پٹ کھل جاتے۔ بھوؤں کے عین درمیان ایک تارہ جھلک رہی۔ روشن بندی ہو۔ پھر سیاہ جھیلوں میں دو دیئے روشن ہو جاتے۔ ”رے رے رے رے۔“ ارجمند چھاتی پینٹا۔ ”جب سے اس پنڈورا کی گھڑی کھلے ہیں اک قیامت ٹوٹ پڑی ہے محلے پر۔“

لوہکتی ہوئی ایک اور گھڑی قریب آ جاتی اور کھلنے کی بجائے مزید لپکے جاتی۔ پٹ اور ہوا جاتے۔ پھر چاروں طرف سے حسین چہرے جھانکتے۔ ایک ققمہ ابھرتا۔ ”بے ہوا چارہ۔“

ایلی چونک جاتا۔ وہ اپنے آپ کو جھنجھوڑتا۔ لیکن گزشتہ سخت کا احساس اس کے لطافت ہو جاتا۔ پھر بزرگھڑی قریب آکر سکتی۔

”اسے بھول جاؤ ایلی۔ بھول جاؤ۔ میری طرف دیکھو۔ میری طرف۔“

گھبرا کر وہ لالچل پڑھنے لگتا۔ ”یہ میں کیا سوچ رہا ہوں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا۔ ”تم امتحان میں پاس ہو گئے ہو ایلی۔ تم میں جرات ہے۔“ ”ہاں ہاں“ شنواؤ سکتی۔ ”اب تو ایلی سے ڈر آنے لگا ہے۔“ اور وہ گھبرا کر

دھننا“ ایلی دیکھتا کہ وہ اس پر جھک گئی ہے اور سیاہ جھیلوں پر کنٹرول سے دیئے روشن ہو گئے ہیں۔ جب وہ محلے میں پہنچا تو شام پڑ چکی تھی۔ بڑی ڈیوڑھی ویران پڑی تھی چوگان میں کوئی نہ غلچک سے وہ گھر کی بیڑھیاں چڑھنے لگا۔

گھر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف دادی اماں کے کمرے میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ وہ بچے سے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ دادی اماں کا تخت جہاں وہ نماز پڑھا کرتی تھی، خالی پڑا تھا۔ دادی اماں چارپائی پر بے حس و حرکت پڑی تھی اور سیدہ اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ حمیدہ اور رشیدہ چپ چاپ ایک کونے میں سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔

دیر تک وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے آواز دی۔ ”دادی اماں“ سیدہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا دادی اماں میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے نحیف و زار آواز میں کہا۔ ”ایلی ہے اچھا اچھا۔“ اور پھر خاموش ہو گئیں۔

اس پر ایلی سیدہ سے چٹ گیا۔ ”تم اس طرح سے کیوں بیٹھی ہو۔ دادی اماں کو کیا ہے وہ لپکے ہوئی کیوں ہیں۔ بولتی کیوں نہیں۔ بولو۔ بولو۔ تم سب خاموش کیوں ہو۔“ ”سیدہ نے ایلی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اشارے سے بولی۔ ”چل اس کمرے میں یہاں نہیں۔“

جب وہ اس کمرے میں پہنچا تو وہاں ماں کو دیکھ کر اور بھی گھبرا گیا۔

”ایلی آیا ہے۔“ ہاجرہ چلائی۔ ”کب آیا تو۔“

”دادی اماں کو کیا ہوا ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”اس کی حالت اچھی نہیں۔“

”تیار ہے؟“

”ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ تو جا ادھر فرحت کی طرف۔ ادھر سو جا کے۔ یہاں ہم ٹوہیں۔“

”لیکن مجھے دادی اماں۔“

”اسے اپنا ہوش نہیں۔ بہت تکلیف میں ہے جا شلماش۔“ ہاجرہ نے منت کی۔ ”سیدہ“ وہ اس کے داخل ہونے پر چلا کر بولا۔ جواب میں سیدہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا۔

”خود نہ پچا ہوش آتا ہے تو وہ پھلی کی طرح تڑپتی ہے۔ تین دن ہو چکے ہیں۔ بڑے عذاب میں

### گھال پچکاری

ہائیں۔ وہ گھبرا کر رک گیا اس کے روبرو چوہارے میں شزاو بیٹھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ تخت پر بیٹنے کی مشین پڑی تھی۔ جس کے ایک جانب دو بلوریں پاؤں قرینے سے رکھے تھے۔ سیاہ جلی کے دوپٹے سے دو سفید بازو نکل کر مشین کو تھامے ہوئے تھے۔ ر۔ شمس لبوس کے اوپر ایک مجسم چہرہ دو نوکیلی آنکھیں اور ان پریشانی کا سیاہ تل۔ گھبرا کر ایلی نے نگاہ جھکا۔

شزاو کے سرخ حنا بالیدہ ہاتھوں نے جیسے اس کے منہ پر ایک طمانچہ مار دیا۔ سرخ بوندیاں بپنے لگیں۔ ایلی لوکڑا گیا۔

”تو ایلیا ایلی؟“ شزاو نے مسکرا کر پوچھا۔ داوی کی بیماری کی خبر سن کر آیا ہے؟“

”نہ۔ نہ نہیں تو۔“ ایلی نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ”آپ یہاں ہیں۔“  
دفعہ ”اس غیر محرک تصویر میں جنبش ہوئی۔ ایک چمک لرائی بھجھکتی ہوئی چمک ”ہاں۔“  
شزاو مشین چلاتے ہوئے بولی۔ ”اب کی بار میں ان کے ساتھ نہیں گئی۔ میں نے کہا کچھ دیر یہاں رہ لوں بیٹھ جاؤ۔“

”کھڑکیوں ہے تو؟“

ایلی بیٹھ گیا اور شزاو کی طرف دیکھ کر سوچنے لگا۔ شزاو سر اٹھا کر دیکھتی تو اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ چمکتی عجیب سی مسکراہٹ ایسے محسوس ہوتا کہ گھال بھری پچکاری چل گئی ہو جیسے شزاو بہت قریب آگئی ہو بہت قریب۔ اتنی قریب کہ قرب کی وجہ سے ایلی کے بند بند میں بتیاں کی روشن ہو گئی ہوں جیسے اس نے نہ جا۔ نہ کیا پایا ہو لیکن جب شزاو آنکھیں جھکا لیتی تو ایلی محسوس کرتا جیسے گھانا ٹوپ اندھیرا چھا گیا ہو چاروں طرف دیرانی اور اواسی چھا جاتی اس وقت ایلی کو شزاو کے حنا بالیدہ ہاتھوں سے گھن آنے لگتی اس وقت وہ محسوس کرتا جیسے وہ نگاہ ہو۔ جیسے اس کا وجود باعث تنگ ہو۔ احساس ندامت سے اس کا سر جھک جاتا اور وہ دل ہی دل میں لاجول بڑھنے لگتا لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں شدت سے آرزو پیدا ہوتی کہ شزاو ایک بار پھر ٹھہرنا کر دیکھے۔ اس منور پریشانی سے بجلی چمکے چھوٹی چھوٹی بتیاں یوں روشن ہو جاتیں جیسے گھال بھری پچکاری چل گئی ہو اور شزاو کے حنا بالیدہ ہاتھوں کی پچکاری سے گھال کی پھوار پڑے۔ شزاو

جھٹکا ہے۔ اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔“ سیدہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”آؤ ایلی۔۔۔۔۔“ ہاجرہ بولی۔ ”آؤ اوھر چلیں۔“ اور وہ دونوں چپ چاپ فرحت کی طرف چل پڑے۔

”تیری داوی کی حالت اچھی نہیں۔ کیا معلوم کب آنکھیں بند کر لے۔“ ہاجرہ نے پوچھا۔  
”لیکن۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”کیا بیماری ہے؟“

”بیماری؟ اب میں اس کا جواب دوں۔“ ہاجرہ مسکرائی۔ ”عمر کا تقاضہ ہے آخر ایک دن جانا ہی ہے سب کو۔“

ایلی خاموش ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ داوی امان بہت ضعیف ہے لیکن اس کے مرنا متعلق اسے کبھی خیال نہ آیا تھا اور اب اس کے دل پر چوٹ سی لگی تھی۔

”سب انتظامات کر چکی ہے اب ہاتھوں سے وہ۔“ ہاجرہ نے کہا۔ ”کھڑکیاں بند کر دیاں۔“  
”ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ ”کل خود ہی ختم دیا۔ کفن کا کپڑا بھی کر رکھا ہوا ہے۔ بس اب تو گھڑی پل کی بات ہے۔ جبھی تو میں رات کو اوھر ہی رہی تھی۔ لیکن ایلی تو اوھر فرحت ہی کی طرف سو سو۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس آ جاؤں گی۔“  
”ہوں۔“ ایلی خاموش ہو گیا۔

”تو داوی کے پاس سو کر کیا کرے گا۔“ ہاجرہ نے کہا۔ ”اسے تو اپنا ہوش نہیں اس کا بگڑتا ہے۔ تو بڑی تکلیف ہوتی ہے اسے۔ تو کیا خدمت کرے گا اس کی۔ اس نے تو مجھ سے خدمت نہیں کرائی آج تک۔“

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ علی پور نہیں بلکہ امرتسری میں ہو۔ چاروں طرف لالائی ہوئی تھی۔ محلے کے اونچے لمبے مکانات خاموش کھڑے تھے۔ ٹانک چندی اینٹوں کی دیواریں ریگ رہی تھیں۔ دیواروں پر چمکڑا دیں منڈلا رہی تھیں وہ یوں جچ رہی تھیں جیسے اس کی پر قہقہے لگا رہی ہوں۔ کھڑکیاں دیران پڑی تھیں۔ جن پر سیاہ تیلیوں کے پردے بھول دیے دور کچی حویلی میں کڑی لال ٹین سرجھکائے سوچ رہی تھی۔

فرحت کی طرف جاتے ہوئے ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے علی پور ایک دیرانہ ہو اس نے ایک دھندلی اور لٹی ہوئی دنیا تھی۔ جس میں کوئی بات بھی جاذب نظر نہ تھی وہ محسوس کر رہا تھا جیسے جینے کے لئے کوئی جواز باقی نہ رہا ہو۔ جیسے زندگی اپنی تمام رنگینی اور دلچسپی کھو چکی ہو۔

پکڑی چلائی جاتی ہے اور وہ شرابور ہوا ہی چاہتا ہے۔ لیکن دفعتاً نہ جانے کیا ہو جاتا۔ بات مگر جالی، گال کی جگہ دو ایک پھول پتیاں برستیں اور پھر مطلع غبار آلود ہو جاتا۔ پھول پتیوں کا کیا تھا وہ تو ہر تبسم پر اڑا کرتی تھیں۔

کچھ دیر اہلی شہزاد کے سامنے بیٹھا رہا۔ پھر اس کے لئے وہاں بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا۔ شہزاد نہ جانے کہاں تھی۔ اس کے چہرے پر ایک وقار تھا۔ بے حسی تھی۔

اہلی اٹھ بیٹھا۔ ”اچھا اب میں جاتا ہوں فرحت انتظار کر رہی ہو گی۔“

”اچھا تو مل آئے۔“ اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ ”لیکن چائے یہاں پیتا نیچے جانو بنا رہی ہے۔“

”اچھا تو میں ابھی آیا۔“ یہ کہہ کر وہ فرحت کی طرف چل پڑا۔

### احساس عظمت

نیچے صندر اندھیری کوٹھری کے ساتھ والا کمرہ صاف کر رہا تھا۔

”ہائیں اہلی ہے۔“ صندر اسے دیکھ کر چونکا ”چھٹی لے کر آئے ہو؟“

”داؤی اللہ!“ صندر نے دانت پیسے۔ ”وہ نہیں مرے گی وہ کبھی نہیں مرے گی وہ مرے تو میں پابندی دوں گا۔ ضرور دوں گا ایمان سے مذاق نہیں۔“

اہلی کو صندر کی بات اچھی نہ لگی۔

”آؤ۔ آؤ۔ بیٹھ جاؤ اہلی۔“ صندر نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

اہلی بہت خوش تھا کہ محلے کا ایک بڑا لڑکا اسے اتنی اہمیت دے رہا تھا اور پھر وہ لڑکا جسے تھپڑ کی پاری لڑکی سے عشق تھا۔

”تم مجھ سے کبھی نہیں ملے اہلی۔ میرے پاس بھی آکر بیٹھا کرو۔ اور دوں کے پاس بیٹھے ہو تو ہمارے پاس بیٹھنے میں کیا حرج ہے۔“

اہلی کو صندر کی باتیں سمجھ میں نہ آرہی تھیں نہ جانے کیا کہہ رہا تھا وہ اس کے بازو عجیب انداز سے پھیلے ہوئے تھے۔ دائیں بازو پر نیلے حروف میں کچھ کھدا ہوا تھا۔ شاید اس پار سن کا نام ہو اہلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان نیلے حروف کے متعلق صندر سے پوچھے لیکن اس میں ہمت نہ پڑی۔

کا انداز عجیب سا تھا۔ جب وہ مسکراتی تو فضا میں اثبات کی پھلجھڑیاں چل جاتیں۔ لیکن جسے سنجیدہ ہو جاتی تو بے نیازی کا دبیز پردہ پڑ جاتا اور پھر وہ گویا اہلی کی موجودگی اور گویا وجود سے بے تعلق ہو جاتی۔ نہ جانے یہ کیا سحر تھا یوں لمحہ بھر میں اس قدر قریب آ جاتا اور پھر دور لمحے میں جیسے کوئی کوسوں دور ہو۔

اہلی اکثر سوچتا تھا کہ وہ خصوصی مسکراہٹ کیا تھی جو قرب کا احساس دیتی تھی۔ نہ جانے اہلی کی مسکراہٹ میں کیا جادو تھا۔ جیسے کوئی ان جالی شہ گن آگئی ہو۔ اس نے کئی بار رفت کی بات کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ دیکھی تھی مگر رفت پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ گال کی ہلکی پکڑی تلے کھڑے ہو کر بھی وہ ویسے ہی خشک رہتا اور پھر تیوری چڑھا کر خشک آواز میں اے ڈانٹا ”دوپٹہ سنبھالو۔ سرنگا ہوا جا رہا ہے۔“ اور پھر باہر نکل جاتا۔

کئی بار شریف کے پاس بیٹھے ہوئے اس نے محسوس کیا تھا کہ شہزاد کی آنکھوں میں وہی نم کی لہر چمک رہی ہے اور اس نے محسوس کیا تھا جیسے شہزاد واضح الفاظ میں اپنے خلوند سے بگو کر رہی ہو۔ جیسے دور کھڑے رہنے کے باوجود اس کے قریب آگئی ہو۔ اس کی گود میں بیٹھ لگی ہو۔

شریف اس کے جواب میں گھورتا تو نہیں تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں مسرت کی جگہ لڑائی جھلکتی حسرت اور اداسی اور پھر شہزاد اس کی حسرت بھری اداسی کو محسوس کر کے چونکتی۔ وہ بچھ جاتی اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔ ایسی چمک اس نے مردوں کی آنکھوں میں کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہاں عورتوں کی آنکھوں میں کئی بار دیکھی تھی، لیکن عورتوں کی آنکھوں میں نہ جانے کیا ہوتا تھا۔ نہ جانے وہ نگاہ کیا تھی، مسکراتی تو وہ ویسے بھی تھیں لیکن ہر مسکراہٹ میں وہ بات پانا نہ ہوتی تھی۔

شہزاد اکثر مسکرا مسکرا کر اہلی سے باتیں کیا کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اہلی کو محسوس ہوتا جیسے وہ مسکراہٹ محض سطحی ہو لیکن شریف کی طرف دیکھ کر مسکراتی تو اہلی تڑپ اٹھتا۔ مسکراہٹ عام مسکراہٹ سے کس قدر مختلف ہوتی تھی۔ اہلی کا جی چاہتا کہ کوئی اس کی طرف ہی وہی مسکراہٹ لہرائے۔ ویسی ہی مسکراہٹ سے دیکھے۔ ان دونوں اہلی کی سب سے بڑی آرزو یہ حسرت وہ مسکراہٹ تھی۔

اہلی کے جسم کا بند بند اس نگاہ کا بھوکا تھا اور پھر شہزاد سے ”میرے ایسے نصیب کہاں ہے۔ سوچتا کہ شہزاد میری طرف وہ نگاہ ڈالے۔ پھر بھی کبھی کبھار وہ محسوس کرتا کہ وہ گال بھلا

ہا تھا اسے اپنی عظمت کا احساس ہوا جا رہا تھا اگرچہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ احساس عفت کس وجہ سے ہے اور وہ سب اس سے مایوس کیوں تھے اور ان کا انداز حسرت زدہ کیوں تھا یہ سوچتا ہوا وہ شہزاد کی طرف چل پڑا۔

بے نیاز درزن

جب وہ داخل ہوا تو شہزاد اسی طرح بیٹھی مٹھین چلا رہی تھی اور اس کی نگاہ ریشمیں کپڑے پر جمی ہوئی تھی۔  
”آگے تم۔“ اس نے نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔ ”دیکھو تو کب سے چائے پڑی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

میز پر چائے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ چند ایک ساعت تو ایلی منتظر رہا کہ ابھی شہزاد آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھے گی لیکن وہ جوں کی توں کام کرتی رہی۔ آخر وہ سوچنے لگا کہ آنکھ اٹھا کر دیکھنا نہ سہی لیکن اٹھ کر چائے تو بنائے گی مگر جلد ہی اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔  
”اب پی بھی لو نا چائے۔“ وہ بولی۔ ”مجھے بھی ایک پیالہ بنا دو۔“ ایلی کے تمام سامنے خیال صلیں کے بلبلوں کی طرح پھوٹ گئے۔

اس نے محسوس کیا جیسے گرد و پیش دھندلا رہے ہوں۔ جیسے وہ گرا جا رہا ہو۔ بلندیوں سے نیچے کی طرف لڑھک رہا ہو وہ احساس برتری کا نور ہو چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا ”میں چائے کا بھکاری تو نہیں جو میز پر رکھی ہے۔“ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جائے اور اپنے آپ کو اس برتر اور بے نیاز درزن سے محفوظ کر لے، لیکن اٹھ کر بھاگنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ پھر دھنستا اسے یاد آیا کہ اس نے کہا تھا کہ میرے لئے بھی بنا دو ایک پیالہ، ڈوبتے کو تنکے کا سارا مل گیا۔ میرے لئے بھی بنا دو ایک پیالہ۔ اس ایک فقرے میں جادو تھا کتنی اچھی ہے شہزاد۔ وہ محسوس کرنے لگا اور بھر جائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔

اگلے روز صبح سویرے ہی شہزاد چہم سے آئندوار ہوئی۔ ”چلو ایلی۔“ وہ بولی۔ ”میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“  
”یہاں جو بنی ہوئی ہے۔“ فرحت بولی۔ ”دونوں بیٹھ کر پییں کیوں نہیں پی لیتے۔“ فرحت کے انداز میں طعنے تھے۔

اگرچہ صدر اس وقت کمرے کی صفائی کرنے میں مشغول تھا۔ لیکن کبھی کبھار وہ رکن اور اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ سرخ بوندیاں اڑتیں۔ لیکن جلد ہی وہ چمک ماند پڑ جاتی۔ محرومیت کے بادل چھا جاتے وہ ایک آہ بھرتا۔ اس کے ہونٹوں میں وہی جنبش ہوتی۔ ”میرے تمہارا۔“ کی جنبش، پھر وہ تڑپ کر مڑتا اور ایلی سے کہتا ”ایلی تم شریف کے پاس بیٹھا کرسے لیکن میرے پاس تم کبھی نہیں آئے۔ کبھی نہیں۔ حالانکہ ہم دونوں کا رشتہ زیادہ قریبی ہے اچھا۔ اچھا آج چائے اکٹھے پیئیں گے۔“

یعنی اس وقت چوبارے سے شہزاد کی آواز آئی۔ ”ایلی۔“ شہزاد کی آواز سن کر صدر چونک پڑا اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی اور ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کا بندھن رگڑ کر رہا ہو۔

”ایلی چائے تیار ہے آؤ بھی نا۔“ شہزاد کی آواز گونجی۔  
شہزاد کی آواز سن کر بھی چونک جاتے تھے۔ نہ جانے اس کی آواز میں کیا اثر تھا اس کی آواز مکے والیوں کی آواز سے قطعی طور پر مختلف تھی جسے سن کر یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اس میں کوئی اڑتا ہوا پتھری تن اڑا گیا ہو، یا جیسے گھور گھٹا میں سورج کی کوئی کرن چمک گئی ہو۔ اس کی آواز سن کر مکے کے بزرگ بھی چونک پڑتے تھے اور پھر کسی سے پوچھتے۔ ”یہ شہزاد ہے؟“ صدر نے ایلی کی طرف محروم نگاہ سے دیکھا۔ ”ہاں بھئی۔“ وہ بولا ”اب میں کیا کہہ ہوں۔ کچھ بھی نہیں۔ کون کچھ کہہ سکتا ہے۔“ اس نے ایلی سے یا اپنے آپ سے کہا ”اچھا وہ بولا“ کبھی تو ہم دونوں اکٹھے چائے پیئیں گے۔“

ایلی صدر کے کمرے سے باہر نکلا تو فرحت کھڑی تھی۔ ”ایلی تو کب آیا؟ مجھے توچہ نہیں تھا کہ تو آیا ہے۔“ وہ حسرت بھری مسکراہٹ سے بولی۔ ”مگر میں شہزاد کی آواز نہ سنی مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ تو آیا ہے چلو شکر ہے کہ ہم تیرا نام تو سن لیتے ہیں شہزاد کی زبان مان سہی۔ چائے تو ہمارے یہاں بھی تیار ہے۔“

”مگر۔۔۔“ اس نے شہزاد کے چوبارے کی طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھ کر کہا۔  
فرحت مل جائے تو آئیو آئے گا نا۔ ضرور آئے۔“ فرحت کی آنکھوں میں غمی غمی سی دیکھ کر ایلی لرز گیا۔ وہ حیران تھا کہ وہ سب ایلی کی طرف سے اس قدر مایوس کیوں تھے۔ وہ سوچ رہا تھا۔  
ان کی ان کسی شکایات کا کیا جواب دے مگر ان جانے میں ایلی میں ایک احساس برتری لہرائی



کیا کروں

پھر رضا آیا — ”ٹھیک ہے بابو اب کیوں ہمارے پاس آنے لگے تم۔ اب تو بس چہلوروں میں بیٹھ کر چائے اڑتی ہے۔ لوگ بلا بلا کر پلاتے ہیں۔ مگر بابو جب اونچے چوہاروں سے کوئی کرے تو ہڈی پہلی ایک ہو جاتی ہے ہاں۔“ اس نے اپنی ننگری ٹانگ دکھاتے ہوئے کہا۔  
”یقین نہ آئے تو یہ دیکھ لو۔“

”جو اس بند کرو۔“ ایللی نے بات مذاق میں ٹالنے کی غرض سے کہا۔  
”کیسے کروں بند۔“ رضا ہنسنے لگا ”اپنا تو کام ہی بکنا ہے۔ سنا امر تسروالوں کا کیا حال ہے۔ اب توڑے ہیں نا۔“  
رضا اسے چھیڑنے لگا۔

”بیٹھ جا۔“ وہ بولا ”بیٹھ جا میاں۔“  
”کوئوں۔“ ایللی نے جواب دیا۔  
”کیوں؟“

”بیٹھے کو بھی نہیں چاہتا چل کہیں گھومیں پھریں۔ وہ دل خوش کر دیا رضا نے لاشی پکڑی اور چل پڑا۔ دیر تک وہ دونوں فاصل سے باہر گھومتے رہے پھر ایک درخت تلے بیٹھ گئے۔  
”رضا۔“ ایللی بولا؟ ”میرا جی نہیں لگتا۔“  
”جی لگ جائے بابو تو پھر بھی نہیں لگتا۔“  
”کیا مطلب؟“ ایللی نے پوچھا۔

”سارے محلے میں تیری تسلیم کی باتیں ہو رہی ہیں۔“  
”لیکن رضا تسلیم تو میرے سامنے نہیں آتی کئی جتن کر دیکھے“  
”تسلیمیں سامنے نہیں آیا کرتیں ایللی۔ سامنے آکھڑی ہوں تو پھر بات ہی کیا ہے۔“  
”رضا نے کہا۔ یہ تو ہوتا ہی ہے۔“ پھر ایللی امر تسر کی باتیں سنا تا رہا اور رضا قہقہے مار کر ہنستا رہا۔  
میر کر کے جب وہ واپس آئے تو رضا سے رخصت ہو کر ایللی داوی اماں کی طرف گیا  
دلازے میں باجرہ کھڑی تھی۔ ”تو یہاں کیا کر رہا ہے۔“ وہ بولی۔ ”جا فرحت کی طرف دوڑ جا  
ملا سے۔“ ”کیوں؟“ ایللی نے پوچھا۔

”یہاں نہیں۔“ شنزاد تن کر بولی۔ ”چائے کا مڑا اکیلے میں آتا ہے۔“  
”تو جی ایللی کو بلانے آئی ہو۔“ فرحت نے پھر وار کیا۔  
”ہاں۔“ شنزاد نے قہقہہ لگایا۔

”مجھے بھی ساتھ لے چلو۔“ فرحت بولی۔  
”نہ بھائی۔“ شنزاد نے جواب دیا۔

”معلوم ہوتا ہے شریف جاتے ہوئے ایللی کو ہمیں سوئپ گیا ہے۔“  
”ہاں۔“ شنزاد مسکرائی۔ ”وہ کہہ گئے ہیں ایللی کو چائے پر ضرور بلایا کریں۔“

”اوہ“ فرحت شنزاد کی دلیری پر گھبرا گئی اور ایللی چپ چاپ شنزاد کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔  
جب وہ شنزاد کے چوہارے میں پہنچے تو شنزاد حسب معمول مشین کے سامنے بیٹھ کر لگا۔  
”ایک پیالہ مجھے بھی بنا دو۔“ اور خود کام میں مصروف ہو گئی۔

دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھا چائے پیتا رہا اور شنزاد کپڑے سینے میں منہمک رہی۔ چائے پلا۔  
جب وہ نیچے اترا تو اندھیری کو ٹھنڈی میں صفدر کھڑا حسرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے  
ہونٹ ہنسنے ہوئے تھے جیسے ”حافظ خدا تمہارا۔ گنگناٹا بھول چکے ہوں۔ ایللی کو دیکھ کر اس نے  
ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ہونٹوں پر ایک حسرت بھری مسکراہٹ آگئی۔ نہ جانے وہ کیوں اس کی  
طرف حسرت سے دیکھتے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ چلا کر کہے۔ ”نہیں نہیں۔ میں نے خود اپنے ہاتھ  
سے چائے بنا کر پی ہے۔ میرے ساتھ میز پر کسی نے چائے نہیں پی۔“ لیکن اس میں اتنی جرات  
نہ تھی۔ چوگان میں عورتوں نے اس کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔  
”اے ہے۔“ ایک بولی۔ ”ایللی آیا ہے۔“

”میں کہہ رہی ہوں۔ یہ کیا گورکھ دھندہ ہے۔“ چاچی بولی۔ ”داوی تیری اس طرف پلا  
پڑی ہے۔ بن تیری ادھر ہے تو اس ڈیوڑھی سے باہر نکل رہا ہے۔“

”ہائے چاچی۔“ دوسری نے کہا۔ ”آج کل کے لڑکے گھر پر کھل بیٹھتے ہیں۔“  
”نہ لڑکی۔“ چاچی نے پینتزا بدلا۔ ”ہمارا ایللی ایسا نہیں۔ ہو گا کوئی کام آخر پڑ جاتا ہے۔“  
”لڑکی۔“ اس نے کان سے منہ لگا کر کچھ کہا اور پھر ہنسنے لگی۔

”دیکھ لو زمانے کے رنگ ہیں چاچی۔“  
”یہی تو دیکھ رہی ہوں۔ تو بہ کیا زمانہ آیا ہے مگر ہمارا ایللی ایسا نہیں۔“

## شہزاد

”کنا جو ہے تم سے۔“ وہ بولی۔ ”وہ اسی طرح بے ہوش پڑی ہے۔ آنکھیں کھلے سکت نہیں رہی۔ اس کے پاس بیٹھ کر اپنا دل برا کرے گا تو۔ جا فرحت تیرا انتظار کر رہی ہوگی وہ چپ چاپ فرحت کی طرف چل پڑا۔

شام کو جب وہ شہزاد کے چوہارے میں پہنچا تو چوہارے سے ملحقہ چھت پر پانچ چھ چھائی بھی ہوئی تھیں اور فرحت اور شہزاد چارپائی پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔  
”تو آگیا ایل۔“ فرحت اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ”اچھا کیا تو نے کہ چلا آیا۔“  
ایں کی حالت اچھی نہیں۔ نہ جانے کب۔“

— وہ رک گئی۔ ”ایں تو کئی راتوں سے ادھر ہی رہتی ہیں، آج کی رات — مجھے بھی جانا پڑے اسی لئے میں نے یہاں چارپائیاں بچھوا دی ہیں تاکہ بچے اکیلے نہ رہیں۔ لگا ہے نا شہزاد —“ وہ ہے تیری چارپائی ایل۔ وہ کونے والی۔“

### رہنمائی اور سپیرا

رات کو شہزاد کی طرف دیکھے بغیر ایل اپنی چارپائی پر چپ چاپ لیٹ گیا اور سوچ میں غرق ہو گیا۔ محن میں چاندی۔ چٹکی ہوئی تھی رو پہلی چاندنی میں شہزاد کے دو بلوریں پاؤں کہیں رکھے ہوئے تھے اور سیاہ جالی دار دوپٹے میں اس کی دودھیا پیشانی پر ایک سیاہ بیرہوٹی چھٹی ہوئی تھی۔  
دو ٹوکی آنکھیں ڈول رہی تھیں۔ گھبرا کر ایل نے دیوار کی طرف منہ موڑ لیا اور کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد داوی ایں کی طرف سے ہاجرہ نے فرحت کو آواز دی۔ ”ادھر آنا۔ جلدی۔“

”خدا خیر کرے۔“ فرحت نے گھبرا کر کہا اور ملحقہ کوٹھا پھلانگ کر داوی کی طرف چلی گئی۔  
فرحت کے جانے کے بعد دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ نہ جانے شہزاد بیٹھی کیا کر رہی تھی۔  
ایل نے شہزاد کی طرف نہ دیکھنے کا عزم کر رکھا تھا مگر اس کے باوجود اس کی نگاہوں تلے سیاہ جالی دار دوپٹے کا پلوڑا رہا تھا۔ شفاف پیشانی پر سیاہ بیرہوٹی رینگ رہی تھی۔ ہر پانچ منٹ کے بعد اسے احساس ہوتا کہ وہ شہزاد کے متعلق سوچ رہا ہے پھر وہ گھبرا کر اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنے کی کوشش میں لگ جاتا۔

”سو گئے ایل۔“ قریب ہی شہزاد کی آواز سن کر وہ چونک پڑا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا ”نہیں تو“



جاگ رہا ہوں۔

”اوه—— میں سمجھی سو گیا ہے۔ لیکن یوں چپ کیوں پڑا ہے تو“ وہ بولی ”گور کیا ہوا؟“

ناچوں۔“ ایلی نے جل کر کہا۔

وہ بچوں کی طرح ہنسنے لگی ”ناچ تجھے کون منع کرتا ہے۔“

”اکیلے میں تو ناچا بھی نہیں جاتا۔“ وہ بولا۔

”تو کیا اکیلا ہے۔“ شنراو نے اشارتاً اسے امرتریادولانے کی کوشش کی۔

”اکیلا ہی تو ہوں۔“ ایلی نے لمبی آہ بھری۔

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ ”اوه میں سمجھی امرتریاد آ رہا ہے تجھے۔“

”امر تر؟“ وہ گھبرا گیا۔

”تسلیم۔“ شنراو نے جھک کر اسے آداب کیا اور پھر ہنسنے لگی۔

ایلی کا منہ فق ہو گیا۔ نہ جانے کیوں وہ سمجھتا تھا کہ شنراو امرترو اور تسلیم کے متعلق نہیں جانتی۔

”کبھی تسلیم سے ملاقات بھی ہوئی ہے؟“ شنراو نے اس کے قریب آکر پوچھا اور پھر اس چارپائی پر بیٹھ گئی۔

ایلی کے جسم پر چوٹیاں رینگنے لگیں اسے محسوس ہونے لگا جیسے گرمی کی ایک لہر اس

طرف بڑھ رہی ہے۔ ان جانا اضطراب اس پر چھائے جا رہا تھا۔ ایک سرخ دھندلکا اس کی کپٹیا

میں تھرک رہا تھا۔ صحن میں زرد چاندنی اور گدرے سایوں کی عجیب سی دھاریاں پڑی ہوئی

تھیں۔ پاس ہی چوبارے میں اندھیرا رنگ رہا تھا۔ مسجد کے گنبد کے اوپر چمکدیں جگمگ

تھیں۔

”یاد آتی ہے تمہیں۔“ شنراو نے ایلی کی طرف دیکھ کر پوچھا ”جسبی یوں چپ چاپ ہونا

ہے تو۔“

”نہیں تو۔“ وہ بولا۔

شنراو اپنے حنا لیدہ ہاتھوں سے کھیل رہی تھی۔ سفید ہاتھوں پر حنائی رنگ اسے ملے

دکھائی دے رہا تھا۔

”نہیں۔“ وہ بولا

”اچھا۔“ وہ ہنسی ”اگر وہ یاد بھی نہیں آتی تو پھر فائدہ ہی کیا ہوا؟“

”فائدہ۔“ اس نے شنراو کی اڑتی ہوئی لٹ کی طرف دیکھا۔

”اچھی محبت ہے یہ۔“ وہ بولی۔

”ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر بھاگ جائے وہ قرب نہ جانے کیا کر رہا تھا جیسے اسے چھیڑ رہا

ہو۔ اس کی قوت عمل دھندلائی جا رہی تھی نہ جانے قرب کی وجہ سے یا کسی ان کے ڈر سے جو

اس کی نگوں میں دھنکی کی طرح بج رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر اس نے بات کرنے کی

کوشش کی تو اس کی آواز کی لرزش راز فاش کر دے گی۔

”میں پانی پی لوں۔“ ایلی نے گھبرا کر کہا۔

”میں پلاتی ہوں تمہیں پانی۔“ شنراو اٹھ کھڑی ہوئی۔

ایلی کا بھاگ جانے کا یہ بمانہ بھی بے کار ہو کر رہ گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا گھرے

کے پاس شنراو گلاس میں پانی ڈال رہی تھی۔ اس کے گرد چاندنی اور اندھیرے کی بساط بچھی ہوئی

تھی اور اس بساط پر ملکہ بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر اڑتے ہوئے بالوں کا تاج تھا۔ ”یہ لو۔“ شنراو

کا تالیفہ ہاتھ اس کی طرف بڑھا۔ ناگ نے پھن اٹھایا۔ ایلی جھجک کر پیچھے ہٹا۔

”لو بھی“ ہاتھ اور قریب آگیا ایلی کا جی چاہتا تھا پانی کے گلاس کی بجائے اس کا ہاتھ پکڑے

اور پھر پھر۔ مگر پھر کے متعلق اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ ایک سرخ دھندلکا

جج جج۔ ایک چمکدیں کس قریب سے ایلی کی طرف لپکی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ شنراو

نے گلاس چھوڑ دیا ایلی شرابور ہو گیا۔ شنراو کی سریلی ہنسی سے فضا کو بجنے لگی۔

”بالکل ہی جنون بن گئے۔“ وہ چلائی۔ ”لاؤ میں پونچھ دوں۔“ وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھی۔

سرخ ناگ بھن پھلائے پھر اس کی طرف لپکا بوا کا ایک رٹلا آیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ سرخ دیوانگی

اس پر مسلط ہو گئی۔ اس نے لپک کر اس رنگین سانپ کو ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ جسے وہ سپیرا ہو۔

اسے اپنی طرف کھینچا۔ نہ جانے محض جنون کی وجہ سے۔ محبت سے۔ نفرت سے یا اس خوف کی

وجہ سے جو اس پر مسلط و محیط تھا۔ اس کی دیوانگی اور بھی شدید ہو گئی۔ اس نے ایک تازہ جھنکا

دے کر دیوانہ وار اسے اپنی طرف کھینچا۔ یوں بے دردی سے کھینچا۔ جیسے شنراو محض ایک رنگین

گڑیا ہو۔ شاید وہ اسے دانٹوں سے کاٹنا چاہتا تھا تاکہ کاٹے جانے سے پہلے اس کی گردن چبالے

اور اپنے آپ کو محفوظ کرے لیکن اس کے گرم لمس سے ایلی کے ہونٹ جلنے لگے اور ان جانے

لیکن شاید شہزاد کسی کو نہ بتائے۔ شاید وہ اس راز کو چھپالے۔ ابھی تک تو اس نے فرحت سے اس بارے میں بات نہ کی تھی۔ شاید وہ موقعہ کی تلاش میں تھی کہ کب اہلی کہیں جائے اور وہ اہلی کی حماقت کا قصہ بیان کرے۔ فرحت اور ہاجرہ سن کر کیا کہیں گی۔ کہیں گی۔ آخر بیٹا کس کا ہے اس خیال پر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

لیکن شہزاد کا رویہ بے نیازی اور بے پروائی کا مظہر تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے اس رویے کی وجہ سے اہلی کے دل میں امید کی کرن روشن ہو گئی۔ شاید وہ کسی کو نہ بتائے۔ لیکن پھر اسے خیال آتا اگر نہ بھی بتائے تو بھی وہ اپنے دل میں اسے ذلیل سمجھے گی۔ اس کی اس مذموم حرکت پر رنجیدہ ہو گی۔ ممکن ہے اب کبھی اس کے قریب نہ آئے اور آئے بھی تو نفرت سے ہانک بیٹھ لے۔ کیا وہ ہمیشہ کے لئے شہزاد کی جھم سے محروم ہو جائے گا۔ کیا وہ اسے دیکھ کر کبھی نہ سکرائے گی۔ اس کی آنکھوں میں نفی بتیاں روشن نہ ہوں گی اور وہ گلال بھری پچکاری نہیں نہیں۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ شہزاد فرحت سے شکایت کر دے۔ ہاجرہ سے کہے۔ شریف سے کہہ دے۔ جس سے جی چاہے کہہ دے مگر اپنا انداز نہ بدلے ہاں ہاں۔ میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ ہاتھ جوڑ دوں گا اور جب وہ معاف کر دے گی تو منت کر کے کہوں گا۔ "میری ایک بات مان لو خدا کے لئے۔ صرف ایک بات۔ اپنے ہاتھوں پر مندی نہ لگایا کرو اور اگر اس کے بغیر چارہ نہ ہو تو اپنا ہاتھ میرے اس قدر قریب نہ لایا کرو۔"

چارپائی پر پڑے پڑے وہ سوچ رہا تھا۔ اس کے سر پر اندھیرے کا ایک بہت بڑا ٹکڑا منڈلا رہا تھا اور شیش محل کی سب سے اونچی منزل فیالی چاندنی میں اپنی بے نور کھڑکیوں سے اس کی طرف گھور رہی تھی۔ قریب ہی شہزاد فرحت سے باتیں کرتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

شہزاد کی ہنسی سن کر وہ چونک پڑا۔ وہ ہنس کیوں رہی تھی۔ وہ باتیں کیوں کر رہی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ شاید وہ اس کی اس حرکت کو درخور اعتناء نہ سمجھتی ہو۔ اس خیال پر وہ پر کانپ اٹھا۔ اگر اس نے اس بات کو اہمیت نہ دی تو اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا اور وہ اضطراب میں کونٹیں بدلنے لگا۔

"گویہ اور دیکھو۔" شہزاد ہنسی۔ "ویسے سویا ہوا ہے لیکن کونٹیں لئے جا رہا ہے۔" فرحت نے عجیبگی سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کبھی خیال نہیں کیا سوتے میں ہمیشہ کونٹیں لیتا ہے۔"

میں اس نے اسے دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا۔ شہزاد چارپائی پر یوں گر چکی تھی جیسے ایک ہارلم موتیا گٹھڑی میں تبدیل ہو گئی ہو۔

"اہلی تم —؟" وہ ہونک رہی تھی۔

اہلی کی نگاہ میں وہ زرد چاندنی سرخ ہوئی جا رہی تھی۔ جیسے فضا میں گلال کی پچکاریاں پڑ رہی ہوں۔

عین اس وقت لمحہ کوٹھے سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ فرحت چلاتی ہوئی آری تھی۔ "تم سو گئے کیا؟"

فرحت کی آواز سن کر وہ خونیں طلسم ٹوٹ گیا۔ اہلی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ گٹھڑی ہلک کر کھڑی ہو گئی اور اہلی لیٹ کر یوں چپ چاپ پڑ گیا۔ جیسے عرصہ دراز سے سو رہا ہو۔

"تم ابھی گئی۔" شہزاد نے کہا۔

"اماں نے بھیج دیا۔" فرحت بولی۔

"کیا حال ہے اب۔"

"اچھا نہیں۔ شاید آج کی رات —"

"بیچاری کی جان چھٹے۔"

"میں سمجھی تم سوچکے ہو گے۔" فرحت نے کہا۔

"نہیں تو۔" شہزاد بولی۔ "ابھی تو جاگ رہے ہیں۔"

"اور اہلی تو غالباً سوچکا ہے۔" فرحت نے اہلی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ابھی تو باتیں کر رہا تھا۔ مجھ سے۔" شہزاد کی آواز میں کسی قسم کی لرزش نہ تھی۔ وہ بالکل کوٹھے پر ادھر ادھر گھوم رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

**اگر۔ لیکن**

اہلی پسینے میں شرابور تھا۔ اسے اپنے کئے پر پشیمانی ہو رہی تھی۔ میں نے کیا کر دیا۔ کیا کیا۔ اگر شہزاد نے فرحت سے کہہ دیا تو۔ اگر اس نے شریف کو بتا دیا تو وہ کیا کہے گا۔ مجھ سے نفرت کرنے لگے گا۔ دونوں مل کر تسخیر سے نہیں گے۔ اس تسخیر کو محسوس کر کے اٹھنا سانس رک گیا۔

معرف مہوتا رہا۔ وہاں آکر چپکے سے اندھیری ڈیوڑھی سے گزر کر سیدھا فرحت کے گھر آچکا۔ جلا تک عام طور پر وہ ہمیشہ شہزاد کے مکان سے گزر کر فرحت کی طرف آیا کرتا تھا۔ پھر جب دوسرا کوہ گھر بیٹھا فرحت سے باتیں کرنے میں منہمک تھا تو میزبانیوں سے طلبہ کی تھاپ سنائی دی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اسے بھول گیا کہ وہ کہہ رہا تھا۔ کیا کہتا چاہتا تھا۔ فرحت اور ہاجرہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ وہ اٹھ بیٹھا ”اچھا میں ہو آؤں۔“ ”چم سے شہزاد اس کے قریب آرکی۔ ایلی نے نگاہیں جھکالیں۔

”ایلی ہے۔“ شہزاد نے لا پرواہی سے کہا ”نظر ہی نہیں آیا آج کہاں رہا۔“ وہ ہنسی اور فرحت کی طرف دیکھنے لگی۔

ایلی چپکے سے وہاں سے سرک گیا۔

چوگن دیران پڑا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے جو چوگن میں کھیل رہے تھے، مٹی کے پتلے معلوم ہو رہے تھے۔ پرانی حویلی کی خمیدہ لال ٹین کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اسے گھور رہی تھی۔ کپ کی کمری کی جتنی لٹی دکھائی دے رہی تھی۔ کنوئیں کے پاس رہنے والی کشمیر یوں بیٹھی تھی جیسے کسی نے چوکی پر زرد رنگ کے گوشت کا ڈھیر لگا رکھا ہو۔

بھروسہ داری الہ کے پاس جا بیٹھا۔ مگر وہ خاموش چارپائی پر پڑی تھی۔ ”تو آگیا۔“ سیدہ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”نہیں نہیں۔“ وہ چلائی۔ ”جا۔ جا کر کھیل۔ یہاں نہ بیٹھ بیار کے پاس نہیں بیٹھا کرتے۔“ کچھ دیر تک وہ وہاں بیٹھا رہا پھر گھبرا کر باہر نکل آیا۔ چاروں طرف دیرانی بھل ہوئی تھی۔

شام کو جب وہ فرحت کے ساتھ شہزاد کے کونے پر سونے کے لئے گیا تو اس نے جھکی جھکی آنکھوں سے محسوس کیا کہ شہزاد مسکرا رہی ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز کی دھار تھی۔ نفرت بھری مسکراہٹ۔

”تو ابھی نہیں ہے ایلی؟“ وہ بولی۔ ”میں سمجھی چلا گیا ہے وہاں امر تر۔“

”نہیں تو۔“ شہزاد کی طرف دیکھے بغیر اس نے جواب دیا۔

”کیا ہوا ہے تجھے؟“ وہ بولی۔

”کچھ بھی نہیں۔“ ایلی نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا اور چپکے سے چارپائی پر لیٹ گیا۔

”اچھا۔“ شہزاد کی آواز میں طنز تھی۔ سوتے میں جاگنے کی سی حرکتیں کرتا ہے اور جاگنے میں سوتے کی سی۔ عجیب بات ہے۔“

فرحت شہزاد کی بات سمجھ نہ سکی۔ البتہ ایلی کی پیشانی پر چند قطرے نمودار ہوئے وہ سوچ لگا کہ شہزاد کی آواز میں کتنی طنز تھی۔ ضرور اس نے اس کی اس حرکت کا برا مانا تھا۔ ضرور برا ہو گا۔ اب کیا ہو گا۔ کیا وہ اس گھر میں آنے سے محروم کر دیا جائے گا۔ ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ شکر ہے اس نے کچھ تو مانا اسے اچھا نہ سہی برا سہی درخور اعتنا تو سمجھا۔ اگر وہ کچھ بھی سمجھتی تو اس خیال پر اسے خوشی تو ہوتی، مگر پھر وہی فکر سوہان روح ہو جاتا۔ نہ جلنے لہ وہ کیا کرے گی۔

آہستہ آہستہ فرحت اور شہزاد کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں اور ان کی باتوں میں وقفے پڑ گئے۔ حتیٰ کہ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

وہ چونک کر جاگ پڑا۔ اس نے مڑ کر چوری چوری فرحت اور شہزاد کی چارپائیوں کی طرف دیکھا انہیں چپ چاپ پڑے دیکھ کر وہ پانی پینے کے بہانے اٹھ بیٹھا۔ فرحت چارپائی کے ایک پا پر سٹھی ہوئی پڑی تھی۔ اس سے پرے شہزاد چارپائی پر یوں جھجھی ہوئی تھی جیسے پلنگ پوش ہوتا ہے اس کے ہونٹوں پر بمبم سی مسکراہٹ تھی۔ ایک ہاتھ ساتھ والی چارپائی پر اپنی ٹانگیں صیبہ پر پڑا تھا۔ جیسے تھکتے تھکتے سو گئی تھی۔ ایلی نے شدت سے محسوس کیا کہ کاش وہ صیبہ اور شہزاد کا ہاتھ اسے تھکتا۔

دھنسا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ہاتھ اسے تھپک رہا ہو اس کے بدن میں چونٹیل پائیں۔ سرخ ناگ پھن اٹھا کر اس کی طرف لپکا۔ ایلی کسی شدید جذبہ سے متاثر ہو کر شہزاد کی طرف بڑھا۔ اس کا جی چاہتا کہ اس رنگین پھن سے لپٹ جائے اور پھر ڈسے جانے کے بعد خوابیدہ حسینہ پر گر کر ڈھیر ہو جائے۔ لیکن عین اس وقت فرحت نے کروٹ لی اور وہ گھبرا کر گیا اور پھر چپ چاپ اپنی چارپائی پر جا لیٹا۔

ندامت یا ڈر

اگلے روز ایلی سارا دن اس کوشش میں لگا رہا کہ شہزاد کے روبرو نہ جائے۔ وہ شہزاد ڈرتا تھا۔ صبح سویرے ہی اٹھ کر وہ باہر نکل گیا اور کوٹلی جا کر قبرستان اور تالاب کے گرد

پاؤں پر مگر معافی مانگ لے لیکن پاؤں پر گرنا بھی تو مشکل تھا۔ اس نے شنراؤ کے پاؤں کے طرف دیکھا کتنے خوبصورت تھے۔ جیسے سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہوں۔

شنراؤ نے کراٹ سی لی اور اس کا ایک بازو کرسی سے نیچے لٹکے لگ۔ ”مجھے تم سے ایسی توقع نہ تھی۔“ اس نے اپنی بات دہرائی۔ اس رنگین ناگ نے پھن اٹھایا۔ ایللی کی نگاہیں اوپر اٹھ گئیں۔ اس کے چہرے کی زردی سرخی میں بدل گئی۔ وہ اٹھ کر شنراؤ کی طرف لپکا اور اس کے لٹکے بازو سے یوں لپٹ گیا۔ جیسے کوئی نیولا سانپ سے لڑ رہا ہو۔

اس نے شنراؤ کو چپ کرانے کے لئے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا پھر نہ جانے کیا محسوس کر کے وہ شنراؤ کے بلوریں پاؤں سے لپٹ کر اپنے ہونٹ ان پر ملنے لگا ”شنراؤ۔ شنراؤ“ وہ گنگنایا۔ ”مجھے تم سے محبت ہے۔“

لیکن ایللی دیوانہ وار اس کے پاؤں سے لپٹا رہا۔ آہستہ آہستہ شنراؤ کی آواز مدھم پڑتی گئی۔ ”مجھے تم سے محبت ہے شنراؤ۔ مجھے تم سے محبت ہے شنراؤ۔ مجھے تم سے —“

ایللی کی آواز بلند ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ ایللی نے بڑھ کر شنراؤ کے لبوں پر مر سکوت لگا دی۔ اس ٹھنڈی کے پٹ از سر نو بند ہو گئے۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ مڑھان نے ان سیاہ شراروں کو ڈھانپ لیا اور اس کے بازو فضا میں معلق ہو کر رہ گئے۔

ممکن ہے۔ شاید

ایللی نے جواب میں یہ بات صرف اس لئے کہی تھی کہ اس کے علاوہ اور کوئی جواب دینا ممکن نہ تھا۔ معافی مانگ لینے کا امکان تو تھا۔ مگر اس میں اس کی بے عزتی تھی اگر وہ معافی مانگ لیتا تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ وہ حرکت اس نے کسی مذموم خیال سے کی تھی۔ سستی عیش و عشرت کے خیال سے یا رنگین وقت کٹی کے لئے۔ اس کے علاوہ اس نے محسوس کیا تھا کہ اگر معافی مانگ لی تو وہ شنراؤ سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گا۔ کس منہ سے اس کے رو برو جلیا کرے گا بے شک اسے شنراؤ سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ شنراؤ کو دیکھ کر وہ مضطرب ہو جلیا کرتا تھا مگر یہ اضطراب بے نام اور بے مقصد تھا۔ اس نے کبھی شعوری طور پر شنراؤ سے محبت کرنے کی آرزو محسوس نہ کی تھی۔ نہ ہی اس نے کبھی سوچا تھا کہ شنراؤ سے وہ اس قسم کا تعلق پیدا کر سکا ہے۔ لہذا وہ تو اسے اس قدر بلند اور عظیم ہستی سمجھتا تھا کہ اس کے قرب کی آرزو دل میں

مر سکوت

اگلے روز وہ بہت دیر سے بیدار ہوا۔ اس نے کونٹھے پر چاروں طرف دیکھا۔ فرحت چاہی تھی۔ شنراؤ کی چارپائی خالی پڑی تھی۔ صرف صبیحہ پڑی سو رہی تھی۔ موقعہ کو غنیمت جان کر یہ جلدی سے اٹھا تاکہ شنراؤ کے آنے سے پہلے ہی فرحت کی طرف چلا جائے۔ جب وہ دروازہ میں داخل ہوا تو کسی نے زور سے اس کی قیض پکڑ لی۔ ”کمال جاتا ہے تو؟“ — اور چائے پی کے جانا۔ ”شنراؤ کو دیکھ کر اسے ہیونہ آگیا۔ ”نہیں نہیں۔“ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”ادھر آکر بات کرنا۔“ وہ اسے گھسیٹ کر اپنے کمرے میں لے گئی اور کرسی پر بٹھا کر بے نیازی سے میز پر چائے کے برتن رکھنے میں یوں مصروف ہو گئی جیسے ایللی سے کوئی دلدل نہ ہو جیسے وہ اسے پکڑ کر لائی نہ ہو۔

دیر تک وہ یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر وہ اس کے سامنے آ بیٹھی۔ ”پلی چائے۔“ وہ یوں گھور کر بولی جیسے بچے کو دوا پلا رہی ہو۔ ”پلی سانپ سو گھوما تجھے کیا۔“

”ہاں۔“ وہ بولا ”سانپ سو گھوما گیا ہے۔“

”اچھا۔“ وہ ہنسی۔ ”پھر تو تو بڑا ڈھیٹ ہے کہ اب تک اچھا بھلا چلتا پھرتا ہے۔“

”لوگ نہ جینے دیتے ہیں نہ مرنے۔“ وہ بولا۔

”اتنی پروا کرتا ہے تو لوگوں کی۔“

وہ لا جواب ہو گیا۔ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔

وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”ایللی۔“ وہ بولی۔ ”وہ کیا حماقت تھی۔ مجھے تجھ سے ایسا توقع نہ

ایللی۔“ اس نے آہستہ سے کہا ”تجھے شرم نہ آئی۔“

ایللی کی ناگ پر ہیونہ آگیا اس کی آنکھیں اور بھی جھک گئیں سمجھ میں نہیں آتا تھا

جواب دے۔ ”اور پھر تو ایسی بات کرے۔ تو ایللی۔“ وہ بولی ”کوئی اور کرتا تو مجھے

ہوتا۔“

ایللی کے دل میں آیا کہ اٹھ کر بھاگ جائے مگر اس میں ہمت نہ تھی پھر اس نے



رہانے کے خیال ہی سے گویا اس کی جان نکلتی تھی۔

اگر اس ٹیلی چاندنی میں وہ تنہائی میں اس کے قریب نہ بیٹھتی یا اس کے ہاتھوں پر چومے نہ ہوتا یا حنا میں وہ بونہ ہوتی جو ایلے کو مشتعل کر دیا کرتی تھی یا وہ ہاتھ ازراہ اتفاق ہاتھ طرح پھین نہ اٹھاتا اور ایلے کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ اسے اپنی حفاظت کرنی ہے تو وہ کبھی ٹھڑا اپنی گرفت میں نہ لیتا۔

اگر شہزاد بار بار اسے نہ بلاتی تو اس کی گردن جھکی ہی رہتی اور آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی حماقت کا احساس ہو جاتا یا اگر شہزاد تنہائی میں اس سے اس کے اندر رویہ کے متعلق استفسار کر کے اسے لا جواب نہ کر دیتی تو وہ اپنی گزشتہ حماقت کا اعلان نہ کرتا اس کی زندگی میں شہزاد کا رنگین بھنور پیدا ہی نہ ہوتا اور اس کی داستان حیات سراسر غم ہوتی۔

ان چھوٹی چھوٹی تفصیلات نے مل کر ایلے کی زندگی کے دھارے کا رخ پھیر دیا۔ ڈنچے طرح ایلے کے لئے وہ رنگین ہاتھ تنکا بن گئے اور وہ ان رنگین ناگوں سے دیوانہ وار چٹکایا ہاتھوں سے چمپنے کے لئے صرف ایک جواز ہو سکتا تھا۔ صرف ایک ”مجھے تم سے محبت ہے“ مجھے تم سے محبت ہے۔“ اپنی لغزش پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ اس جیلے کو دہرائیا کرتی کہ وہ وہ مکان اس کے اس جیلے سے گونجنے لگے۔ ”مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔“ نہ جانے ان الفاظ نے یا اس بڑھتی ہوئی شدت نے جس سے وہ ادا کئے جاتے تھے یا ان کی ادائیگی کے تواتر شہزاد کی عقل و خرد کو مغلوب کر دیا یا ممکن ہے کہ اس میں قوت دماغ باقی نہ رہی ہو۔ ممکن ہے شہزاد ان الفاظ کی بھوک ہو اور شریف نے ہمیشہ اسے اس جیلے سے محروم رکھا ہو۔ اس لئے شہزاد نے انجانے میں ایلے کو وہ الفاظ کہنے پر مجبور کر دیا ہو۔ شاید شہزاد اپنے خاندان کے رویے سے چکی ہو جو ہر وقت ٹھنکی لگائے چھت کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ جو کبوتر کی سی آنکھیں بنا کر لڑتا تھا جو ہر بات پر آہ بھرتا تھا اور انور کی محبت کے خود ساختہ قریب میں ڈبکیاں لینے میں لگا ہوا محسوس کرتا تھا اور شہزاد اس کے قریب اس بات کی تمنا میں کھلتی رہتی تھی کہ وہ ایک نظر ان طرف دیکھے۔ ایک بار ماضی کے دھندلے سے نکل کر حال کی طرف متوجہ ہو۔ ممکن ہے کہ شریف کی سچی محبت کے آکا دینے والے تسلسل سے بیزار ہو گئی ہو اور اس کے دل میں ان جانے میں بیدار ہو چکی ہو کہ وہ بھی کسی کی انور بن جائے۔ ہر صورت اس کی کئی باتیں

ہو نیچے یہ ہوا کہ شہزاد کو قریب دینے کے بعد ایلے نے ان جانے میں اپنے آپ کو قریب دینا شروع کر دیا اس نے حقائق کو اپنے خود ساختہ جذبات کے ایندھن میں جلا جلا کر سرخ کر لیا اور اسے پھینک دیا کیونکہ اسے شہزاد سے محبت ہے۔

### گودی کا گیند

اس روز وہ سارا دن شہزاد کے قدموں میں بیٹھا روتا رہا۔ ”مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ میں نے بار بار چاہا کہ انکار محبت نہ کروں۔ تمہیں ناراض نہ کروں۔ مجھے ڈر تھا کہ تم ناراض ہو جاؤ گی اور تم ناراض ہو جاؤ تو پھر زندگی میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔ شہزاد تم ناراض تو نہیں۔ شہزاد۔ بولو تم خاموش کیوں ہو۔ میں تمہارے قابل نہیں شہزاد میں تمہارے قریب آجاؤں تو تم مٹی ہو جاتی ہو۔ تم چاند ہو شہزاد اور میں بے وقوف پتھر۔ میں تمہارے قابل نکلتا۔ مجھے برداشت کرو گی شہزاد۔ بولو شہزاد۔“

شہزاد حیرانی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ ابتدا میں تو اس کی حیرانی میں بیگانگی کا عنصر غالب تھا مگر آہستہ آہستہ وہ بے تکلی باتیں وہ احمقانہ شدت۔ وہ بے مصرف پگلا پن جو ایلے کی باتوں اور چہرے سے ہوتا تھا اس کے دل پر نہ جانے کیا اثر پیدا کر گیا۔ ایلے کی بے تکلی باتیں اس کے گلوں سے داخل ہو کر چہرے پر ریگنے لگیں گالوں پر سرخی بن کر جھلکنے لگیں آنکھوں سے پر نم مٹی بن کر جھانکنے لگیں۔

”تم میری حماقت کسی کو بتاؤ گی تو نہیں شہزاد۔ میری دیوانگی اپنے تک محدود رکھو گی نا۔ وعدہ کرو شہزاد، اگر تم نے کسی سے کہہ دیا تو میرا کیا ہو گا۔ پھر میں اس گھر میں کیسے آسکوں گا اور تم سے دور رہ کر زندگی کیسے کئے گی۔ شہزاد غصہ نہ کرنا۔ میں مجبور ہوں شہزاد۔“ شہزاد کے چہرے پر حیا کی سرخی جھلکنے لگی۔ اس کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ اس کی ناک پر ہلکے آنے لگا اور پھر اس کے بازو بے جان ہو کر ٹپکنے لگے جیسے سپردگی کے شدید جذبے سے شل ہو چکے ہوں۔

مگر ایلے کو یہ احساس نہ تھا کہ اس کے منہ پر حیا کیوں جھلک رہی ہے۔ اس کی ناک پر پسینہ کیل سوتیلوں کی طرح ابھرتا رہا ہے اور اس کے بازو لٹک کیوں رہے ہیں۔ وہ ابھی تک زینے کی پکلی میز می پر ہی قدم جمائے کی جدوجہد میں دیوانہ وار مصروف تھا۔

خوش نہ رہے۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنی تمام چیزیں اکٹھی کیں اور پھر سوٹ کیس اٹھا کر باہر نکلا۔ صحن میں فرحت ہنسیا پکاری تھی۔ ”میں جا رہا ہوں فرحت۔“ وہ بولا۔

”جا رہا ہے تو کیا واقعی جا رہا ہے۔“ وہ بولی۔ ”کہاں جا رہا ہے تو؟“ — ہائیں۔ اتنی جلدی۔ ”وہ حیران رہ گئی۔“ ”تمہیں تو ابھی چار دن اور رہنا تھا۔“

”نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ ابھی۔“ ایللی بولا۔

”آخر بات کیا ہے؟“ فرحت نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”کسی بات سے ناراض ہو گیا ہے کیا؟“

”لو نموں۔“

”نہ جانے تو ہم سے کیوں ناراض رہتا ہے۔ ایللی۔ ہمارا کیا قصور ہے؟“

”نہیں تو۔“ وہ گھبرا کر بولا۔

”تو کیا شہزاد نے کہا ہے کچھ؟“

”میں کہتا ہوں۔“ وہ چڑ کر بولا۔ ”کچھ بھی نہیں۔ کسی نے کچھ نہیں کہا مجھ سے۔“

”تو میں شہزاد کو بلاؤں۔ وہی تمہیں روک سکتی ہے۔“ فرحت نے غلصانہ طور پر کہا۔

”نہیں نہیں۔“ شہزاد کا نام سن کر وہ ڈر گیا۔ ”مجھے امرتسر سے خط آیا ہے۔“

”خط آیا؟“

”ہاں میرا دست تیار ہے۔“

”لو۔“ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”تو پہلے کہا ہوتا مجھ سے۔“

”چھٹا تو میں چلتا ہوں۔“

”لیکن اہل سے تو مل کر جا اور تیری داوی اہل۔ وہ بھی تو بیمار ہے اس کی حالت۔“

”یہ کہہ کر وہ چپکے سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ اسے ڈر تھا کہ راستے میں اس کا کوئی دوست نہ مل جائے۔ اگر رضال بھی گیا تو غضب ہو جائے گا۔ وہ اسے تنگ کرے گا۔ لیکن خوش قسمتی سے بنگلہ میں بچوں کے سوا کوئی نہ تھا اور رضا سے بچنے کے لئے وہ ایک اور راستہ اختیار کر سکتا تھا۔

”تم بتاؤ گی تو نہیں شہزاد۔ تم مجھے معاف کر سکو گی۔ میں تمہیں دور سے دیکھتا گا۔ دور سے بس۔ اتنا تو تم برداشت کر لو گی۔ نا۔“

ایللی عورت سے واقف نہ تھا اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی بے نیکی باتوں نے شہزاد کو کیا کر دیا ہے۔ اسے احساس نہ تھا کہ تمام کا تمام زینہ مگر کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہو چکا ہے۔ پہلی سیڑھی پر قدم جمانے کی کوشش میں کھوئے رہتا بیکار ہے۔ اسے احساس نہ تھا کہ وہ رینگنے ناگ اس کی الہ گرفت کے لئے خطر تھے۔ بے تاب تھے اور وہ ڈولتی ہوئی شریقی آنکھیں اس انتظار میں کھلی ہوئی تھیں کہ کوئی لمس انہیں بند کر کے راحت فراہم بخش دے اور وہ رینگنے گھٹری جو ہر لمحہ بند ہوئی جا رہی تھی اس بات کی خواہشمند تھی کہ اسے اٹھا کر گودی کا گیند بنالے۔

اسے ان باتوں کا احساس بھی کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ بیچارہ عورت اور محبت کی دنیا کی رہا بھی واقف نہ تھا۔ اس کا مقصد تو صرف اس قدر تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو چھانچا حفاقت کو نشتر نہ ہونے دے اپنے خود ساختہ راز کو محفوظ کرے۔

عین اس وقت اگر باجرہ نہ آجاتی تو نہ جانے وہ دونوں کب تک یوں ہی بیٹھے رہنے کے پاؤں کی چاپ سن کر اس خطر موم گیا گھڑی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ اچھل کر اٹھ کر بیٹھ۔

”اچھا تو چائے۔ بناؤں تیرے لئے۔“ وہ بولی۔

”چائے۔“ وہ گھبرا گیا۔ چائے کی تو بات ہی نہیں ہو رہی تھی۔

”نہیں نہیں۔“ شہزاد بولی۔ ”اب تو چائے پی کر ہی جانا۔“

باجرہ کے آنے پر شہزاد کا انداز ہی بدل گیا وہ یوں ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرنے لگی کوئی بچی انتہائے معصومیت میں اظہار مسرت کرتی ہے۔ ایللی چپکے سے اٹھ بیٹھا اور چوری سے باہر نکل گیا تاکہ کوئی اسے روک نہ لے۔ جوں جوں وہ شہزاد کے چہرے سے ہوتا گیا تو اس کے دل میں اس سرنویدہ ڈر پیدا ہوتا گیا کہ شہزاد اہل کو وہ بات نہ شکایت نہ کر دے۔ اگر اس نے شریف سے کہہ دیا تو نہ جانے اس نے اسے معاف کیا کہ نہیں۔

فرار

باہر جا کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ واپس امرتسر چلا جائے گا تاکہ پھر شہزاد کے سامنے

بے تاب رہتا ہے۔ اس لئے بار بار گھر کو بھاگتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اچھی آپ بولا "لیکن آخر وہ بھی تو گود ہے۔ دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔" اللہ دلوں نے بی آہ بھری۔ "وہ بھاگتا بھری تھی اپنی۔ اللہ جانتا ہے اس کی گود میں پڑ کر مجھے بے بے بول جاتی تھی۔" ایللی یہ سن کر بھونچکا رہ گیا اس کم بخت کو کیسے معلوم ہو گیا کہ — اسے فہم آئے لگے۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا اور اللہ داؤ کی معصوم مسکراہٹ کے جواب میں غصہ کرنا بالکل ہی بے معنی معلوم ہوتا تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھ بیٹھا اور ٹھٹھا ٹھٹھا نر کے کنارے پر جا پہنچا۔ دراصل اس کا جی چاہتا تھا کہ اچانک نور سے ملاقات ہو جائے اور پھر شبہ لگن آجائے۔ اس کے دل کے نچلے پردوں میں ایک شبہ لگن جھلک رہی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ دل کی گمراہیوں سے نکل کر اس پر مسلط و محیط ہو جائے اور پھر وہ پودوں کی اوٹ میں بیٹھ کر چپکے چپکے رووے۔ آنسو اس کے گالوں پر ڈھلکیں اور نور پوچھے۔ "کیا ہے جی۔" جیسے اس کی عادت تھی اور وہ جواب دے۔ "کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں۔"

"ہائیں۔" نر کے کنارے آصف کو بیٹھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا اس کی آنکھوں میں وہی پورا پڑ رہی تھی لیکن یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ آیا وہ خوشی سے سرخ ہو رہی ہیں یا غم کی وجہ سے۔ "آگے تم —" اس نے دبی دبی او اس مسکراہٹ سے کہا۔

"ہاں۔" ایللی نے آہ بھری۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ نور کا انتظار کر رہے ہو کیا؟"

"نوںوں۔" آصف نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر ایللی نے پوچھا۔ "سیر کرنے آئے تھے۔"

"سیر —" آصف نے زہر خند سے کہا۔ "میں کہاں جاؤں ایللی۔"

"کیوں۔" ایللی نے گھبرا کر پوچھا۔

"کوئی جگہ بھی تو نہیں رہی۔"

"کیوں۔" ایللی چلایا۔

دیکھ نکلا

"نوںوں والیں آگئی ہے۔" آصف نے آہ بھر کر کہا۔  
"والیں آگئی ہے۔"

— ریل میں بیٹھے ہوئے وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس دنیا ہی بدل ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ سبزہ گویا نئے انداز سے لہرا رہا تھا۔ بوٹے عجیب شان نہ کھڑے تھے۔ پھول بہت ہی شوخ تھے۔ جیسے رنگین دیئے ٹٹا رہے ہوں۔ کھیتوں میں لہکے ہوئے کسان انوکھی رویمان بھری فضا میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گاڑیوں چلی جاری تھی جیسے چھاتی پھلا کر پرواز کر رہا ہو۔ ایللی کا جی چاہتا تھا کہ مناظر کے حسن پر رووے۔

امر تر پہنچ کر اس نے محسوس کیا جیسے وہ کسی نئے شہر میں آپہنچا ہو، جسے اس نے پہلے دیکھا ہو۔ سٹیشن کے گنبد الف لیلے کے کسی پر اسرار منظر کی یاد دلا رہے تھے۔ سڑکیں خوشی اور ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں لوگ آ رہے تھے۔ جیسے کسی تقریب پر اکٹھے ہو رہے ہوں۔

لیکن بورڈنگ میں وہی دیرانی چھاتی ہوئی تھی۔ رامو بیٹھا برتن صاف کر رہا تھا۔ بندوڑا کی بورڈوں میں سرویئے بیٹھا تھا۔ ہر نام سنگھ، گورچرن سنگھ اور جیون ایک درخت کے نیچے اپنے کیس سکھا رہے تھے۔ کمرے میں اللہ داؤ کرسی پر اپنی قبض پھیلائے خود فرش پر بیٹھا، آم کی خشک سٹھلی رگڑ رہا تھا۔

"ارے۔" اللہ داؤ اسے دیکھ کر چلایا۔ "تو آگیا۔ بیٹا چار روز پہلے ہی ماں کی گود چھوڑ آیا۔ اونٹوں یہاں تیرا جی نہیں لگے گا۔"

"بک نہیں۔" ایللی نے بتاؤنی غصے سے کہا۔

"اچھا بھئی۔" اللہ داؤ چلایا۔ "ایک تم ہو کہ ماں کی گود نہیں چھوڑتے ایک وہ شفا ہے۔ سارا سارا دن یوں سانپ مارنے میں لگا رہتا ہے۔ جیسے کالج میں سانپ مارنا سیکھنے کے لئے لگا ہوا۔ بس ایک میں رہ گیا ہوں۔ محنت کرنے کے لئے۔" یہ کہہ کر اس نے مظلومانہ انداز سے پر آم کی سٹھلی رگڑنی شروع کر دی جیسے امتحان پاس کرنے کے لئے سر پر آم کی سٹھلی رگڑ رہا ہو۔

ایللی دھم سے چارپائی پر گر پڑا۔ اسے اللہ داؤ کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی نہ جانے کیا تھا اسے، و نعتاً اسے اس بورڈنگ، کالج اور شہر سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ وہ کمرہ بیٹھ بیٹھا ہو رہا تھا اور اللہ داؤ یوں لگ رہا تھا جیسے اجنبی ہو۔

دیر تک کمرے میں خاموشی چھاتی رہی۔ سٹھلی رگڑتے رگڑتے اللہ داؤ نے ایک نظر ایللی کی طرف ڈالی اور پھر چپکے سے بولا۔ "ارے بھائی پہلے تو ہم سمجھتے تھے کہ ایللی باپوں کی گود سے

شرابور کر جاتی۔ وہ ایک نگاہ کس قدر مدہوش کن تھی۔ ایک نگاہ — اس نگاہ کو حاصل کرنے کے لیے ایلی دنیا کی بڑی سے بڑی مشکل کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ ساری دنیا کے خلاف جھڑپ کرنے پر آمادہ تھا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ آصف سے وہ راز کھدے کسی سے کھدے اور اپنے آپ کو محفوظ کر لے مگر وہ شہزاد کا راز تھا وہ اسے کس طرح افشا کر سکتا تھا اور پھر آصف سے وہ راز کہتا جو اس غم میں تسکین رکھتا تھا کہ ایک حسینہ اس کے لئے پاگل ہو رہی ہے۔ بھلا شہزاد کی مت کن نگاہ کو آصف کیسے سمجھ سکے گا۔ ایلی بات کہتے کہتے رک جاتا اور پھر آسمان پر پھیلی ہوئی مرغی کو دیکھنے میں کھو جاتا اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے شہزاد کے گالوں سے اتر کر وہ مرغی آسمان پر پھیل گئی ہو اور اس کا ہر چھوٹے سے چھوٹا وجہ کہہ رہا ہو۔ ”تم لوگوں کی پروا کرتے ہو۔ تم ایلی۔“ اگلے روز صبح سویرے وہ دونوں پر نپل کے گھر چلے گئے اور اس سے درخواست کی کہ وہ آصف کو ایک ماہ کے لئے بورڈنگ میں رہنے کی اجازت دے دے۔

پر نپل نے ان کی بات سن کر حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔

”آصف کیا بات ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”بات تو کوئی نہیں پر نپل صاحب —“ آصف کے چہرے پر گھبراہٹ کا طوفان اٹھ گیا جو اس کی بات کو اعلانیہ جھٹکا رہا تھا۔ پر نپل مسکرانے لگا۔ ”بھئی ایک بات کرو۔ زبان سے کہہ رہے ہو کہ کچھ نہیں اور نگاہیں کہہ رہی ہیں بہت کچھ ہے۔“ ایلی نے گھبرا کر سچی بات کہہ دینے کی غرض سے منہ کھولا۔ ”جی بات یہ ہے۔“ وہ بولا۔ آصف نے بھرپور نگاہ ایلی پر ڈالی اس نگاہ میں ایک طوفان تھا۔ غصہ تھا۔ بے بسی تھی۔ منت تھی۔ دھمکی تھی۔ ایلی سسم کر خاموش ہو گیا۔

پر نپل نے ان دونوں کی طرف تعجب سے دیکھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”نہیں نہیں۔“ وہ ہنس کر بولا ”پڑھائی کا بہانہ نہ کرنا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کا کیا فائدہ ہے تو بہتر ہے کہ صاف کہہ دیا جاتا کہ اس کی وجہ بتانے سے ہم قاصر ہیں۔ بہر صورت مجھے یقین ہے کہ تم شرارت کے درپے نہیں ہو اور کوئی ایسی بات سرزد نہ ہوگی جو کالج کے لئے باعث بدنامی ہو۔“

”جی نہیں ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔“ آصف بولا۔

”اچھا تو اجازت ہے۔“ پر نپل نے کہا۔ ”اب تم جاؤ اور آرام کرو مجھے صورت حال اچھی نہیں دیکھی اگر تم مجھے دوست سمجھ کر بتا دیتے تو شاید میں مدد کر سکتا۔ لیکن خیر —“

”ہاں۔“ — وہ بولا۔ ”جیسے انتقام لینے آئی ہو۔“

”انتقام۔“ ایلی نے دہرایا۔

”اب وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتی اور ایلی اب تو وہ اعلانیہ کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے گھر والے بیچارے ہار گئے ہیں۔ محلے میں کرام مچا ہوا ہے اور میں گھر سے بھاگا پھرتا ہوں۔ اب ہوگی ایلی۔ کیا کروں میں۔“

— ایلی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس میں مشکل کوئی تھی۔ یہ تو بلکہ اس کی غلط نصیبی تھی۔ عجیب آدمی تھا آصف بھی۔

”دیوانوں کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہتی ہے۔“

”دیکھتی ہے تو دیکھنے دو۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”اتنی رسوائی اتنی بدنامی ہو رہی ہے کہ۔“ آصف نے جھرجھری لی۔ ”میرا تمنا ہمارا کھانا

اس کے گھر والے کہتے ہیں ہم کیا کریں۔ لڑکی ہوش و حواس کھو چکی ہے اور اگر اس پر — وہ خاموش ہو گیا اور پھر حسرت و یاس بھری نگاہ سے اُس نے ایلی کی طرف دیکھا۔

”میری طرف محلے والے یوں دیکھتے ہیں جیسے کوئی مجرم ہو۔ جیسے اس کی دیوانگی میلاد سے ہو۔ وہ تو پاگل ہو کر آزاد ہو گئی ایلی مجھ سے تو وہی اچھی ہے۔ لیکن میں کیا کروں میرا گھر میں آنا جانا بند ہو چکا ہے۔ مجھے تو دیس نکالا ل گیا ہے۔“

”اچھا۔“ ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

”اگر تم کو تو میں تمہارے بورڈنگ میں آ رہوں۔“ آصف نے پوچھا۔

”ہاں۔ ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ ”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔“

”تو میں کل آجاؤں۔“ آصف کے منہ پر مسکراہٹ پھیل گئی جیسے وہ ایلی کا سہارا پا کر فائدہ ہو گیا ہو۔

”آجاؤ۔“ ایلی خوشی سے چلایا۔ ”کتنا اچھا رہے گا۔ ہم صبح و شام اکٹھے رہیں گے۔“ آصف نے اس کا ہاتھ دیا اور نہ جانے کب تک وہ اسی طرح ہاتھ میں ہاتھ پکڑے ہوئے کنارے بیٹھے رہے۔ آصف اپنے خیالات میں مگن تھا مگر ایلی کے روبرو کچھ اور ہی تھا ایک گور ابازو اس کی طرف بوہتا اور حنا مالیدہ ہاتھ اسے اپنی گرفت میں لے لیتا۔ ”ایلی تم لوگوں کی پروا کرتے ہو؟“ — دو گلابی آنکھیں اس کی طرف دیکھتیں، گلاب بھری پچکاری چلتی اور

رہے تھے۔ محلے والے جنازے کے متعلق یوں تفصیلات طے کر رہے تھے۔ جیسے کوئی عام سی تقریب ہو۔ جس میں غم یا دکھ کا کوئی عنصر نہ ہو۔

ایلی کو دیکھ کر کوئی چلائی ”اے ہے لڑکے کو تو آئیے دو اپنی داوی کے قریب۔“  
”ہائیں آئی تو ایلی۔ شکر ہے آئی تو۔“

”ہائے بن اس کے بغیر تو دم نکلتا تھا اس کی داوی امل کا۔“  
”اس کے سوا اور تھا ہی کون اس کا۔ علی احمد نے تو کبھی پوچھا ہی نہیں۔“  
”آخری دم تک یاد کرتی رہی تھی۔ لے دیکھ لے اس کا منہ۔“

ایلی داوی امل کی طرف دیکھنے سے ڈر رہا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ مری ہوئی داوی کی طرف دیکھے۔ نہیں نہیں وہ جیتی ہے مری نہیں۔ اس کے تخیل میں وہ ابھی تک جیتی تھی۔ وہ نہیں مر سکتی۔ وہ کبھی نہیں مر سکتی ایلی نے نگاہ پھیر لی اور داوی امل کی طرف دیکھے بغیر ہی وہاں کھڑا رہا۔

### جنازہ

چاروں طرف لوگوں کا جھگڑا لگا ہوا تھا ہر کوئی دوسرے سے بات کر رہا تھا۔ ان کی باتوں پر ایلی کو غصہ آ رہا تھا۔ کیا انہیں داوی امل کی موت کا غم نہیں۔ کیا انہیں اس کی موت پر دکھ نہیں ہوا یوں شوخی سے ایک دوسرے سے باتیں کیوں کر رہے تھے۔ ناگاہ ایلی کی نگاہ علی احمد پر پڑی۔ وہ چپ چاپ بت بنے کھڑے تھے۔

ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا جیسے وہ دکھ محسوس کر رہے ہوں۔ پہلی مرتبہ ایلی کو خیال آیا کہ ان کے دل میں بھی جذبات ہیں۔ انہیں بھی کسی کے مرنے پر دکھ ہوتا ہے۔ انہیں بھی عزیزوں کے دکھ سکھ کا احساس ہے۔ یہ احساس ایلی کے لئے بالکل نیا تھا اور اتنا عجیب تھا کہ اس نے جلد ہی اس سے مخلص پانے کی کوشش کی۔ پھر چار بزرگوں نے بڑھ کر جنازے کو اٹھایا اور وہ سب ان کے پیچھے پیچھے قبرستان کی طرف چل پڑے۔

علی پور کے بازار میں جنازے کو دیکھ کر راہ چلتے چلتے لوگ رک جاتے تھے۔ دوکاندار سودا مند تو ناچھوڑ کر ایک طرف ادب سے کھڑے ہو جاتے گاہک بازار سے ہٹ کر کسی بند دوکان کے تختے پر بٹھ جاتے۔ کھیلتے ہوئے بچے سہم کر رک جاتے اور منہ میں انگلیاں ڈال کر حیرانی سے اس جلوں کی طرف دیکھتے۔

جب وہ بورڈنگ میں پہنچا تو لڑکوں نے اسے دیکھ کر شور مچا دیا۔ ”ایلی، ایلی، ایلی۔ ارے ارے آیا ہے۔“

### داوی امل

تار۔۔۔ ایلی کا دل ڈوب گیا۔ تار آیا ہے۔ اسے زندگی بھر کبھی تار نہ آیا تھا۔ راز کھل گیا۔ نہ جانے اب کیا ہو گا۔ شہزاد نے وہ بات بتا دی۔ اس روز کبھی جو قہقہے ایلی سے ایسی توقع نہ تھی۔ تم نے یہ کیا کیا ایلی۔ ہائے تم نے یہ کیا کیا۔ ایلی کے پاؤں نے زمین نکل گئی۔ اب کیا ہو گا اور وہ برآمدے میں کھڑا ہو کر سوچنے لگا۔

”ارے جا کر پتہ بھی لگائے گا کہ نہیں۔“ شفیع چلانے لگا۔  
”اللہ داویولا“ ”بھئی تار والا اور ہی تو گیا ہے تمہیں دیکھنے کے لئے۔“

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ چپکے سے بھاگ جائے۔ جہاں تار والا اسے تلاش نہ کر سکے گا۔ وہ خفت سے بچ جائے مگر اسے تار والے کی تلاش کرنا ہی پڑی۔ اللہ داویا کے گم لڑکا سمجھیں گے اس کے باوجود وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ تار والا جا چکا ہو۔

تار والے کو دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ بات بنے دیکھ کر اللہ داوی نے تار اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور تار کھولتے ہوئے بولا۔ ”اللہ لاڈلے کی فرقت میں اداس ہو گئی ہو گی۔“ ”دفتا“ اللہ داوی خاموش ہو گیا۔ اس کی اضطراب سے تار کو پھر تمہ کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ ”ابے“ شفیع نے اس سے پوچھ لئے کچھ کہنا چاہا مگر اللہ داوی کا چہرہ دیکھ کر اس میں ہمت نہ پڑی دیر تک برآمدے میں غامض رہی۔ پھر آصف آہستہ سے بولا۔ ”ایلی تمہاری داوی امل۔۔۔“

”داوی امل۔“ ایلی نے حیرانی سے دہرایا۔

”ہاں۔ تمہاری داوی امل چلی گئیں۔“ آصف نے کہا۔

”چلی گئیں؟۔۔۔“ ایلی نے گھبرا کر تار کی طرف دیکھا اس کے منہ سے ایک جگہ

اور پھر دور سے آواز آئی۔ ”نہیں ایلی۔ کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں۔“

جب وہ محلے کے چوگان میں پہنچا تو اس کا دل ڈوب گیا۔ چوگان کے عین درمیان میں پڑا تھا۔ چاروں طرف محلے والے کھڑے تھے۔ محلے والیاں بچے چلاتے ہوئے کھڑے تھیں۔

نماز پڑھی تھی اور جہاں پاس ہی چادر سے ڈھکی ہوئی چارپائی پر داوی اماں پڑی تھیں۔ وہاں بیٹھے ہوئے اس نے اللہ سے بڑی عجز بھری دعائیں مانگی تھیں۔ ”یا اللہ یہ کیا ہو گیا اللہ داوی اماں اب مجھ سے کبھی نہ ملیں گی۔ یا اللہ۔“ اس نے بن سوچے سمجھے یہ سب دعائیں مانگی تھیں۔ اسے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ وہ دعائیں مانگ رہا ہے یا وہ دعائیں نہ تھیں بلکہ سوالات تھے۔ عجیب سوالات تھے۔ ایسے سوالات جن کا کوئی جواب نہ تھا۔ دعائیں مانگ کر وہ وہیں بیٹھ کر زمین کریدتا رہا تھا حتیٰ کہ اسے اس مقام سے وحشت ہونے لگی۔ دور لوگ قبر کھودنے میں مصروف تھے۔ قبرستان میں میل وہاں محلے والے ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے دبی دبی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ جوان دور پختہ تالاب کی طرف نکل گئے تھے اور نوجوان نہ جانے کہاں تھے۔

وہ اٹھ بیٹھا اور پھرتا پھرتا ان کچی قبروں میں جا پہنچا جہاں محلے کے عام آدمی دفنائے جاتے تھے۔ وہ گھبرا کر رک گیا۔ سامنے صفر ایک پیڑ کے نیچے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ نہ جانے وہ اپنی ہی دمن میں بیٹھا کیا سوچ رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں چمک نہ تھی۔ بازو لٹک رہے تھے اور ہونٹوں پر کوئی بول نہ تھا۔

”تم ایل!“ وہ اسے دیکھ کر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ”آؤ آؤ۔ تالاب کی طرف چلیں۔ آؤ۔ اہی قبر میں اتارنے میں دیر ہے۔ آؤ۔“ اس کی آواز روٹی تھی۔

وہ دونوں چپ چاپ تالاب کی طرف چل پڑے۔ ”تم آگئے۔“ وہ بولا تم تو چلے گئے تھے اچھا کیا آگئے۔“ وہ بولا۔ ”بہت اچھا کیا۔ میں بھی جا رہا تھا مگر نہ گیا۔ محض اتفاق ہے ورنہ بلا جالہ۔“ اس کا گلا خشک ہو گیا۔

دیر تک صفر خاموش رہا۔ پھر زیر لب بولا۔ ”مرگئی۔“ اور چپ ہو گیا جیسے گلا آواز سے خالی ہو۔ پھر دفعتاً اس کے ہونٹ ہلے اور اس نے مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھا کر دور پھینک دیا۔ ایل نے محسوس کیا جیسے وہ کہہ رہا ہو حافظ خدا تمہارا جیسے داوی اماں پارسی لڑکی ہو اور اس کے چلے جانے پر صفر کا گلا آواز سے خالی رہ گیا ہو۔

”تم کہتے تھے وہ مرنے بھی نہیں۔“ ایل نے گلو کیر آواز میں کہا۔

”ہاں۔“ صفر بولا۔ ”کہتا تھا۔ مگر وہ مرگئی۔ مرگئی۔“

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے صفر کا وہ ایک لفظ داستان کو چھپائے ہوئے ہو۔

بازار سے نکل کر وہ کھیتوں میں جا پہنچے۔ کھیتوں پر کام کرنے والے کسان انہیں دیکھ کر اچھوڑ کر ان کے ساتھ چل پڑے۔

”کیوں بھائی کس کا جنازہ ہے۔“

”مائی کس کی والدہ تھی۔“

”اچھا وہ جو دفتر کے باپ ہیں۔“

”آیا کرتے ہیں کبھی اس طرف۔“

”کیا تکلیف تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ تو ہمانے ہوتے ہیں۔ اصل میں تو تقدیر کا لکھا ہوتا ہے جو ہو کر رہتا ہے۔

جنازے کے آگے محلے کے بوڑھے آخ تھو آخ تھو کرتے کھانتے چلے جا رہے تھے۔

کبھار کوئی کھانتے کے علاوہ مدھم آواز میں چلاتے ”یارب العزت یا اللہ۔“ ”قادر مہم۔“

ان کے پیچھے پیچھے محلے کے جوان تھے اور سب سے آخر میں محلے کے نوجوان دوڑتے ہوئے ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے تھے، چٹکیاں بھرتے تھے، پھریوں سنجیدگی اختیار کر لیتے تھے جیسے وہ ایسی حرکت کے اہل ہی نہ ہوں۔ کبھی کبھار نوجوانوں کی قطاروں سے دبے دبے فتنے ہوتے جس پر محلے کے بوڑھے آخ کہہ کر رک جاتے اور تھو کرنے کی بجائے غصہ ہو

نگاہوں سے پیچھے کی طرف دیکھتے۔

لیکن اس روز ایل سب سے پہلی قطار میں چل رہا تھا اسے احساس نہ تھا کہ بوڑھے

خیز انداز میں آخ تھو آخ تھو کر رہے ہیں یا جوان دزدیدہ نظروں سے کھیتوں میں جے رہا

گھروندوں سے جھانکتی ہوئی سیاہ فام مگر نوجوان لڑکیوں کی طرف دیکھ رہے ہیں یا نوجوان کبلا

مار مار کر ایک دوسرے کو کسی قابل توجہ منظر کی طرف دیکھنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ اس روز ایل

ذہن ایک وسیع خلا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس پر ایک پریشان کن قہقہہ مسلط اور محض

گھبراہٹ تھی نہ پریشانی نہ خوشی تھی نہ غم۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔

داوی اماں کی موت کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا

چلے جا رہا تھا خاموش بے حس!

وہ مرگئی

جنازے کی نماز کے بعد قبرستان میں دیر تک وہ اس جگہ بیٹھا رہا جہاں کھڑے ہو کر

”ہاں مرغی۔“

صفر کے کہنے کا انداز ایسا تھا کہ ایللی کی آنکھوں میں پھر سے آنسو آگئے مگر صفر نے دھن میں گنگنائے چلا جا رہا تھا اور ہر دس قدم کے بعد چپکے سے کہتا ”مرغی۔“

## بھیانک اداسی

داوی اماں کو دفنانے سے فارغ ہو کر وہ محلے میں واپس پہنچے چوگان میں چاروں طرف کھڑکیوں اور منڈیروں پر غورتیں کھڑی تھیں اسے علم نہ تھا کہ شہزاد بھی وہیں کھڑی ہے۔ اس کے سیاہ دوپٹے میں ستارے چمک رہے ہیں بازو دوپٹے سے اٹکھے ہوئے ہیں۔ لمبی ترجمی آنکھوں پر مڑھاں ڈھلکی ہوئی ہیں۔ اسے شہزاد کے وجہ کا ہی احساس نہ تھا۔ وہ اسے بھول چکا تھا۔ یاد ہی نہ تھا کہ شہزاد نے اس کے ہاتھ تھام کر اس سے کہا تھا۔

”ایللی تم لوگوں کی پروا کرتے ہو! تم ایللی؟“

چوگان سے وہ ان جانے میں گھر کی طرف چل پڑا۔ لیکن سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ نے محسوس کیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کیوں جا رہا ہے۔ گھر میں اب کیا دھڑا تھا۔ کچھ بھی نہ تھا۔ تخت ویران پڑا ہو گا۔ چولیس کے پاس گھٹنوں میں سر دیئے کوئی بیٹھا نہ ہو گا۔ کوئی اس سے کہے گا۔

”تو آگیا۔ میں نے تیرے لئے کچھ رکھا ہوا ہے۔ ہنڈیا میں۔“

کوئی نہیں جتنے گا ”ہے تو نے تو میری ہڈیاں توڑ دیں۔“

کسی کا جھروں بھرا ہاتھ اسے تھپکے گا نہیں۔ ”کچھ بھی تو نہیں ایللی۔“ وہ رک گیا۔

”داوی اماں۔ داوی اماں۔“ وہ قبر پر بیٹھا رہا تھا۔ ”داوی اماں یہ کیا ہو گیا۔ کیا ہو گیا۔“

”ایک بوڑھا چہرہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا دو جھلی وار بازو اس کی طرف بڑھے۔

”نہیں ایللی۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ چاروں طرف بھیانک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ قریب ہی کھانا کراہ رہا تھا۔ دور چلی ہو تک رہی تھی۔ مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔

قبرستان سے اٹھ کر ابھی اس نے چند ایک قدم اٹھائے تھے کہ رضا ایللی۔ ”تم“

رضا کی طرف تعجب سے دیکھا۔

”چل۔“ رضا بولا ”تیرے ابا بلا رہے ہیں۔“ وہ خاموشی سے ایللی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ایللی کا منہ نہیں چاہتا کہ گھر جائے لیکن وہ چپ چاپ رضا کے ساتھ چل پڑا۔

جب وہ گھر پہنچا تو علی احمد نے اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ ”بیٹھ جاؤ ایللی۔ تم کہاں آوارہ گھوم رہے ہو۔“ فضول۔ ایللی کی ماں۔ ”انہوں نے ہاجرہ کو بلایا“ اس کا بستر بچھا دو یہاں۔ آج یہ ہمیں رہے گا۔ ہمارے پاس۔“

## ایللی تم۔ تم ایللی

اگلے روز صبح سویرے ایللی چپکے سے علی پور سے امرتسر چلا آیا۔ نہ جانے اس کے لئے علی پور میں رہنا کیوں ناممکن ہو چکا تھا۔ اس کا منہ چاہتا تھا کہ علی پور سے چلا جائے اس مکان سے دور بھاگ جائے اس کے لئے اس تخت کی طرف دیکھنا ناممکن ہو چکا تھا جہاں داوی اماں بیٹھ کر نماز پڑھا کرتی تھی۔

وہ رات علی پور میں اس نے یوں کائی جیسی کانٹوں پر پڑا ہو۔ اسے یقین نہیں پڑتا تھا کہ داوی اماں فوت ہو چکی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کانٹوں پر پڑا ہو۔ اسے یقین نہیں پڑتا تھا کہ داوی اماں فوت ہو چکی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے تخت پر بیٹھی نماز پڑھ رہی ہو اور ابھی وہ نماز سے فارغ ہو کر چارپائی پر اس کے سر ہانے آ بیٹھے گی اور اپنے جھلی دار ہاتھوں سے اسے تھپکنے لگے گی۔ ”سو جا ایللی سو جا۔ کچھ بھی تو نہیں۔“

اس خیال پر ایللی کو خوف سا محسوس ہوتا کہ داوی مرغی ہے اور اب وہ کبھی آکر اس تخت پر بیٹھ جائے۔ اسی بے نام ڈر کی وجہ سے اب کی بار علی پور میں رہنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔ علی الصبح وہ اٹھ بیٹھا۔ سیدہ کھڑکی کے پاس بیٹھی قرآن کریم پڑھ رہی تھی۔

”خالد۔“ اس نے سیدہ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”میں جا رہا ہوں۔“

”کمال جا رہا ہے تو۔“ سیدہ نے سرسری طور پر پوچھا ”جا رہا ہوں۔“ اس نے سر کی جنبش سے ظاہر کرنے کو شش کی۔ ”میں پوچھ رہی ہوں کہاں جائے گا تو اس وقت“ سیدہ چڑ گئی۔

”امرتسر؟“ وہ یوں بولا جیسے امرتسر اس مکان کے کسی کمرے کا نام ہو۔

”ہاں۔“ ایللی نے کہا ”مجھے جانا ہی چاہئے۔“



”ابا سے تو پوچھ لے۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”نہیں۔“ وہ بولا ”پوچھنے کی کیا بات ہے اس میں۔“

”نہیں نہیں یہ مناسب نہیں۔“ وہ بولی۔ ”بڑوں سے بات کرنا اچھا ہوتا ہے۔“

ایلی نے گویا سیدہ کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔

سیدہ نے شور مچایا۔ ”ایلی امر تر جا رہا ہے میں کستی ہوں سنا آپ نے ایلی جا رہا ہے۔“ اور اسے آوازیں دیتی رہ گئی۔

علی احمد کی آوازیں سن کر وہ رک گیا اور اسے ان کے روبرو حاضر ہونا پڑا۔

”مجھے امتحان کے لئے تیاری کرنی ہے۔“ اس نے کہا ”مجھے جانا ہی چاہئے۔“

یہ بات سن کر علی احمد خاموش ہو گئے۔

”یہ تو بلکہ اچھا ہی ہے“ سیدہ بولی۔ ”پڑھائی میں لگ جائے گا۔“

گاڑی میں بیٹھتے ہی ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے دل کا بوجھ اتر گیا ہو۔ وہ خلاص اور مسلط اور محیط تھا اب ختم ہوا جا رہا تھا۔ لیکن اب غم بوند بوند اس کے بند بند میں سرایت کرتا تھا۔

ایلی کی نفسیات کی یہ عجیب خصوصیت تھی کہ کسی تکلیف وہ واقعہ پر اس کے دل کو دھچکا نہیں لگتا تھا بلکہ ایسے واقعہ کی خبر سن کر اس کے ذہن میں ایک خلا پیدا ہو جاتا جو اسے تخیل اور احساسات کو شل کر دیتا۔ دیر تک اس پر یہ کیفیت طاری رہتی۔ جیسے وہ عالم غلبہ گھوم پھر رہا ہو۔ پھر بوند بوند غم اس کے دل میں سرایت کرتا۔ اواسی چاروں طرف سے اسے کرتی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی ایلی نے محسوس کیا۔ جیسے ساری دنیا ایک بے معنی پھیلاؤ ہو۔ طرف سے اواسی امڈی آ رہی تھی۔ دور درختوں کے جھنڈ میں داوی امڈی اس کی طرف دھکے دھکے مسکرا رہی تھی۔ اس کا ہاتھ ایلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ”اے ہے کیا ہے تمہیں۔“ کچھ بھی نہ ہوا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ ”لیکن اس کے باوجود ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے کچھ ہو گیا ہو۔ کچھ نہ ہو۔ ایلی نے آہ بھری۔ ”اب مجھے کون تھک کر سلائے گا۔“

دلفت اس کی نگاہ تلے گھاس کی سبز ٹھٹھری میں حرکت ہوئی۔ شہزاد کا جسم چومنے والا پھولدار دوپٹے سے گورا چٹا بازو برآمد ہوا۔ ”میں جو ہوں۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں جو ہوں۔“

بھول گئے کیا۔“

شہزاد کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ ”ہائیں“ گھبرا کر اس نے شہزاد کی طرف دیکھا شہزاد تو بالکل اس کے ذہن سے مفقود ہو چکی تھی۔ اسے اس کے وجود کا احساس ہی نہ تھا۔ پورے چوبیس گھنٹے علی پور میں رہنے کے باوجود اس کے ذہن میں شہزاد کا خیال نہ آیا تھا اس نے محسوس کیا گویا وہ بہت بڑے کنارہ کا مرتکب ہوا ہو۔ علی پور ایک دن رہنے کے باوجود اسے شہزاد کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ جیسے شہزاد اس کے لئے ایک دم معدوم ہو گئی ہو۔ شہزاد کے گھر کی دیواروں کی طرف دیکھنے کے باوجود اس کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہونے کے باوجود اس کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ اپنی اس دیوانگی پر وہ بوکھلا گیا۔ نہ جانے وہ دل میں کیا کہتی ہوگی ہو سمجھتی ہوگی کہ اس روز اس کے بازو پکڑ کر جو کچھ ایلی نے کہا تھا وہ سب جھوٹ تھا۔ فریب تھا محض وقتی دل بسلاوا تھا۔ اس پر اس کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ شہزاد دل میں کیا کہتی ہوگی۔ اف ایلی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

پھر اس کے دل میں شبہات پیدا ہونے لگے۔ شاید شہزاد کو اس کی آمد کا احساس ہی نہ ہوا ہو۔ شاید اس نے ایلی کو قاتل تو جہ ہی نہ سمجھا ہو۔ شاید اس کی وہ مسکراہٹ وہ جملہ۔ ”تم لوگوں کی پروا کرتے ہو؟ ایلی تم؟“ محض ایک مذاق ہو ایک ادا ہو۔ پھر اسے اس تمام واقعہ کی حقیقت پر شک پڑنے لگا۔ شاید یہ سب کچھ میرے دماغ کی اختراع ہو۔ ورنہ شہزاد میری پروا کرے؟ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شہزاد سی رنگین حسینہ مجھے دنیا کے روبرو کھڑے ہونے کی شہہ دے۔ نہیں نہیں یہ سب خوش فہمی ہے۔ محض خوش فہمی!

یہ سوچ کر ایلی گھبرا گیا۔ اس کی گرد و پیش سرسبز کھیت ویران ہونے لگے سروسوں کے پھول خزاں زندہ پتے دکھائی دینے لگے۔ پھر در در ایک ٹیلے پر کھڑی ہو کر کوئی مسکرانے لگی۔ اس کے بازو ایلی کی طرف بڑھنے لگے۔ حنا مالیدہ ہاتھوں کی مٹھیاں کھلیں۔ ”ایلی تم؟“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”تم ایلی؟“ وہ آواز گاڑی کے پیوں میں گونجنے لگی۔ ایلی تم، تم، تم ایلی۔“ گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ساری کائنات پھولدار آئینل میں لپٹی جا رہی تھی۔

اکاٹھٹ

بورڈنگ کی سڑک پر نہر کے قریب اسے مراد نور ملے وہ دونوں بورڈنگ سے واپس آ

نے سر اٹھایا اور تہہ بند جھاڑ کر کہنے لگا: ”یہ تو جانا آتا ہی رہتا ہے۔“  
 شفع نے اللہ داد کو ڈانٹا ”بک نہیں۔ داوی اماں کی موت کو تو کیا جانے۔“  
 ”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ اللہ داد نے زیر لب کہا ”نہ اپنی کوئی داوی اور نہ اماں۔ وہ جو کمرے  
 میں رہتی ہے ناخوشید بائی اس کے پاس گیا تھا۔ بہتری منتیں کیس کہ مجھے بیٹا بنا لو لیکن سالی نے  
 ہت نہی ہی نہیں الٹا میرا شیوں سے کہہ کر مجھے باہر نکلوا دیا۔ لو بولو۔ اب میں کروں تو کیا  
 کروں۔“

شفع ہنسنے لگا۔ ”میں بتاؤں۔“ وہ بولا۔ ”بس چپ چاپ بیٹھا رہ تو۔“  
 اللہ داد آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد آصف اور اپلی چہل قدمی کے لئے باہر نکل گئے۔ فضا بے حد  
 لاس تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں وحدتی سڑک ڈراؤنا منظر پیش  
 کر رہی تھی۔ چپ چاپ وہ دونوں کہنی باغ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً ”آصف گویا اس  
 خاموشی سے آتا کر بولا ”ایلی۔“

”جی۔“ ایلی نے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے کہا۔

”میرا کیا ہو گا ایلی۔“

”کیوں؟“

”میرا انجام کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔“ وہ بولا

”خواہ مخواہ۔“

”خواہ مخواہ نہیں۔“ آصف نے کہا۔ ”میں محسوس کرتا ہوں۔“  
 ”کیا محسوس کرتے ہو۔“

”جیسے جیسے نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔“

”آخر بات تو اتنی ہے ناکہ وہ آگئی ہے۔“

”نہیں یہ نہیں۔“ آصف نے آہ بھری۔  
 ”پھر؟“

”اس کی بات نہیں۔“

”تو پھر کس کی بات کر رہے ہو؟“

رہے تھے۔

وہ دونوں ایلی کے قریب سے گزر گئے۔ چار ایک قدم چلنے کے بعد وہ رک گئے مگر کراہ  
 گیا اور نور ایلی کی طرف بڑھا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی غم تھا۔ آنکھوں میں وہی نگاہ تھی۔ نہ  
 دیکھ کر ایلی ندامت سے زمین میں گڑ گیا مگر کیا کہے گا۔ وہ ایلی کے متعلق کس قدر غلط فہمی  
 لگائے گا۔

”آگئے۔“ نور نے ترچھی نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“

”بک آئے۔“ نور کی نگاہوں نے ایلی کے چہرے پر بچے گاڑ دیے۔

”ابھی۔“

”وہ مجھے ادھر آنے نہیں دیتے۔“ اس نے شکایت کی۔

”کون؟“

”وہی۔“ وہ مسکرایا ”محلے والے۔“

”کیوں؟“

”پتہ نہیں۔“ نور نے ہونٹ بڑھ سے بتائے۔

”اچھا۔“ ایلی چل پڑا۔

”وہ شک کرتے ہیں۔“ اس نے ایلی کا راستہ روک لیا۔

”ہوں۔“ ایلی نے بے پروائی سے کہا۔

”پھر؟“ نور نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو تم ان کے شکوک کو پورا کیوں نہیں  
 کرتے۔

”پھر کچھ نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا اور بورڈنگ کی طرف چل پڑا جیسے وہ نور کی بات سمجھ  
 ہی نہ ہو۔ نہ چاروں طرف آکٹا ہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

آموں کی کوٹھی کے میدان میں بہت سے لڑکے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ رسولی

پھلکوں کی بارش ہو رہی تھی۔

”آگئے بابو جی۔“ رامو اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے غلیظ دانت چمکے۔

”کمرے میں آصف ہاتھوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔“ تم آگئے۔“ وہ ایلی کو دیکھ کر بولا۔

”واہی! فوٹ ہو گئیں تھیں۔“ ایلی نے رونی آواز میں کہا۔  
 ”اوہ۔“ ایک ساعت کے لئے حسی خاموش ہو گیا۔ پھر وہ مخصوص انداز سے مسکرانے لگا۔  
 ”واہی! باتیں ایسا ہی کیا کرتی ہیں۔ ان کی تو عادت ہی ایسی ہے اب چھوڑو بھی۔ تم نے تو ایسا حال  
 بنا رکھا ہے۔ جیسے دنیا تیاگ دو گے۔ آؤ تمہیں اپنی عاشق کے پاس لے چلوں۔ اسے دیکھ کر سب  
 کچھ بھول جاؤ گے۔ شرط لگا لو۔ نہ بھولو۔ تو اپنا ذمہ۔ میں اپنے دکھ وہاں اٹھا کر لے جاتا ہوں اور  
 وہ ایسی اچھی ہے کہ ایک نظر دیکھ لے تو سب بھول جاتا ہے آؤ۔“ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ حسی اسے  
 زبردستی ساتھ لے جائے لیکن اس کے باوجود اس کے دل کے کسی کونے میں ڈر چھپا ہوا تھا۔  
 ”نہیں نہیں۔“ وہ ہجک کر بیچھے ہٹا۔ ساتھ ہی وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں حسی اس کے احتجاج کو  
 تسلیم نہ کر لے۔ اسے اکیلا چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ لیکن حسی اسے کھینچتا ہوا چوبارے پر چڑھنے  
 لگا۔

بالی۔ اور ”ہے نا۔“

پھر زینے میں حسی نے آواز دی۔ ”ہے نا۔ ادھر آؤ بھاگ کر میں ایک شخص کو پکڑ لیا  
 ہوں۔ بھاگ نہ جائے دوڑ کر آؤ نا۔“ وہ چلا آ گیا۔

”ہے نا۔“ کو دیکھ کر ایلی حیران رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ رقصہ کی طرح بنی سنوری  
 ہوئی عورت ہو گی، اس کے کپڑوں میں وہی بھڑک ہو گی۔ اس کے بال ویسے ہی بنے ہوں گے۔  
 ان سے خوشبو کی پٹیں آتی ہوں گی۔ لیکن وہ تو گویا باورچی خانے سے دال بھگارتی ہوئی اٹھ کر  
 آئی تھی۔ کپڑے عام سے تھے۔ جن میں اجلا پن نام کو نہ تھا۔ بال اچھے ہوئے تھے۔  
 آستینیں یوں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ جیسے روز کپڑے دھوتی ہو اور چہرے پر جوانی کی ٹکٹکی  
 کے سوانگر کا کوئی عنصر نہ تھا۔ وہ بھاگی بھاگی آئی اور سوچے سمجھے بغیر ایلی کا بازو پکڑ کر اسے کھینچنے  
 لگی۔ ایلی نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ وہ یوں مسکرا رہی تھی جیسے صدیوں سے اسے  
 جانتی ہو اور اس کا جسم یوں بے تسکلفی ایلی سے چھو رہا تھا۔ جیسے وہ عورت ہی نہ ہو۔

پھر چہرہ ہی منوں میں معامی کے پاس ایک ہی چارپائی پر بیٹھی ہوئی بلا تکلف باتیں کر رہی  
 تھی ”حسی نے مجھے کئی بار تمہارے متعلق بتایا ہے۔ حسی کہتا ہے تم اس کے دوست ہو۔ مجھے  
 حسی کے بھی دوست پیارے ہیں۔“ وہ مسکراتی اور پھر ہم۔ ہم نام بھی تو ہیں۔ تم الیاس ہو اور

”میں کہتا ہوں۔ یہ لڑکیاں مجھے تنگ کیوں کرتی ہیں؟“ اس نے آہ بھر کر پوچھا۔  
 ”تنگ تم خود ہوتے ہو آصف۔“ ایلی نے کہا ”وہ نہیں کرتیں۔“  
 ”تمہیں نہیں معلوم۔“ آصف نے جواب دیا ”اب دیکھو تا کتنی بدنامی ہو رہی ہے مجھ  
 جانے اس نے وہاں گھر میں کیا طوفان پا کر رکھا ہے۔ اماں کیا کہتی ہوں گی اور پھر محلے والے  
 پہلے ہی کہتے تھے۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بچتی۔“  
 ”تو انہیں کہنے دو تمہارا کیا جاتا ہے۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”نہیں نہیں۔“ آصف چلایا ”تم ایسا نہ کہا کرو۔“  
 ”تو بتاؤ کیا کہوں میں۔“  
 ”یہ بتاؤ کہ میرا کیا ہو گا؟“ آصف نے پھر آہ بھری۔  
 ”مجھے کیا معلوم۔“ ایلی چڑ گیا۔

”نہ جانے کیا ہو گا؟“ آصف نے ہاتھ مل کر کہا۔ کچھ دیر کے لئے وہ دونوں خاموش  
 چلتے رہے پھر آصف نے بات بدل دی۔

”ایلی۔“ وہ بولا ”تم نیم سے نہیں ملے؟“

”نیم۔“ ایلی چونک پڑا۔ وہ نیم کو قطعی طور پر بھول چکا تھا۔

”مجھ سے چھپاتے ہو۔“ آصف ہنسا۔

”نہیں تو۔“ ایلی نے کہا۔ ایک ساعت کے لئے اس کے دل میں آئی کہ آصف سے  
 کی بات کہہ دے لیکن اس میں جرات نہ ہوئی۔ آصف سے بات کرنا ممکن نہ تھا ایلی محسوس  
 تھا۔ جیسے طبعی رہنمائی کے باوجود آصف ایک ملا تھا۔ جس سے دل کی بات نہ کہی جاسکتی تھی۔  
 اگلے روز کالج سے فارغ ہو کر ایلی آغا کی طرف چل پڑا۔ اسے اس کوچے سے با  
 وچسپی تھی، ان چروں سے تو اسے ڈر لگتا تھا جو کھڑکیوں اور جنگلوں میں بنے سنورے دکھائی  
 تھے۔ لیکن کھڑے والیوں کی لودھار آوازیں سن کر ایلی کے دل پر سانپ لوٹ جاتا۔  
 محسوس ہوتا جیسے کوئی کلیجہ مسل رہا ہو۔ اس میٹھی جلن میں کس قدر لذت تھی۔ پھر جب  
 کسی ایک چوبارے میں بین کرتی اور طلبہ سر بیٹھا تو ایلی پر کیفیت طاری ہو جاتی۔  
 ابھی وہ چوک میں ہی تھا کہ حسی نہ جانے کہاں سے آدھمکا۔ ”ارے تم ایلی؟“ وہ پوچھا  
 تو جیسے کھو گئے۔ کیا ہوا تمہیں۔“

یہاں پر ایک اور بات یہ کہ اگرچہ یہاں پر بھی ایک ہی طرح کے

سمجھتی ہوں ایسوں کو۔ وہ ڈانٹا میں نے کہ پھر کبھی میرے گھر کا رخ نہیں کیا۔  
 ”لیکن اسے قید کیوں کر لیا گیا ہے؟“ ایللی نے پوچھا۔

”کچھ کر دیا ہو گا نشتے میں۔“ وہ بولی۔ ”کسی کو قتل نہ کر دیا ہو۔“

اسی وقت ایک ساعت کے لئے ”ہے نا“ کی جگہ بائی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی اس ہاتھ اپنے کولوں پر رکھ لئے۔ ہونٹ بڑھ سے بن گئے اور آنکھ میں چمک لرائی۔

”سمجھتا تھا۔“ وہ بولی۔ ”کہ اسے بھی دھمکی دے کر گرا لوں گا۔“ بڑا نانا قلم۔

ایللی الماس کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”ہے نا۔“ وہ بولا۔ ”پانی پلاؤ گی۔“

”پانی۔“ وہ چونک پڑی اور دفعتاً ”بائی کی جگہ ہے نا مسکرا نے لگی۔“ تم بھی مجھے کر کے لگے ہو۔“ وہ چلائی اور اندر جا داخل ہوئی۔

”ایللی یہاں آؤ۔ یہاں نیچے بازار میں۔“ حسی چلانے لگا۔ اس کی آواز سن کر ایللی نے اپنے مرتبہ محسوس کیا کہ وہ الماس کے چوبارے میں تھا۔ اسے شرم آنے لگی۔ گھبرا کر کھڑکی سے پیٹ

ہٹ گیا اور پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ حسی کو خاموش کرنے کے لئے اسے نیچے جانا پڑے گا۔ جب وہ بیڑھیوں کے پاس پہنچا تو ہے نا بھاگی بھاگی آگئی۔

”یہ لو اپنا پانی۔“ وہ بولی اور اپنے آپ کو یوں سنبھالنے لگی۔ جیسے گاؤں کی لڑکیاں ہمارے کے بعد تھک کر آئیں اور اپنا آپ سنبھالتی ہیں۔

”میں جا رہا ہوں۔“ ایللی نے کہا اور زینہ اترنے لگا۔

”پھر آؤ گے نا۔“ وہ بولی۔ ”ضرور آنا۔ میں یہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے تھک جاتی ہوں۔“ آنا۔ ضرور۔“ اس کی آواز گونج رہی تھی اور ایللی بازار میں پہنچ چکا تھا۔

## انوکھی تحقیق

کنڑے میں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ لوگ جگہ جگہ گروہوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ پنڈتوں کی دوکانوں پر لوگ جمع تھے۔ پان کی پیک تھوک کر یا سگریٹ کا لباس لگا کر وہ

سبز جنگل والے چوبارے کی طرف دیکھتے اور پھر چہ میگوئیاں کرنے لگتے۔ چوباروں میں رقاصائیں منہ میں انگلیاں ڈالے کھڑی تھیں اس وقت انہیں ہوش نہ تھا۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ ان کے بال پریشان ہو رہے ہیں۔ چروں پر

جھلکیں۔

پڑی ہیں۔ مہل پاؤڈر اور روغن سے خالی ہیں یا پاؤں ننگے ہیں۔ غالباً اس وقت انہیں یہ احساس نہ تھا کہ وہ رقاصائیں ہیں۔ اس وقت تمام بایاں ہے نا ہوئی تھیں۔ جیسے دفعتاً باورچی خانے سے پلم کرتے کرتے بھاگ کر جنگل میں آکھڑی ہوں۔

وہ سب حیرانی سے سبز جنگلوں کے مکان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ سبز جنگلہ دیران پڑا تھا۔ بازار میں لوگ حیرانی سے چلا رہے تھے:

”بھئی مد ہو گئی۔ وہی سیٹی پٹی والا راجہ۔“ مد ہو گئی۔“ ایک بولا۔

”سالہ خدمت کرتا تھا یاں کنڑے پر۔“

”حکومت سی حکومت سنا ہے سینہ جمناداس نے ہاتھ جوڑے تھے۔ اس کے رو برو۔“ بھئی کیوں نہ جوڑتا۔ دل کا معاملہ تھا۔“

”سیٹی پٹی والا چاہتا تو سالہ چار موٹر کاریں مانگ لیتا۔ سینہ سے۔“

”موٹر کیا ہے جو چاہتا سو لیتا ہاں۔“

”پر اسے تو میاں ”شادی“ کے سوا کچھ سوچتا ہی نہ تھا۔ وہ اس کے سر پر سوار تھی۔“ وہ ہنسی مائی ہے بھئی تو بند بوتل چڑھ جاتی ہے ایک دم۔“

”پر اب تو باؤ کھل گئی وہ بند بوتل۔ کیوں بھئی۔“

”پرالم کیسے ہوا پہلوان کو کہ سالہ ویسے ہی راجہ بنا ہوا ہے جھوٹ موٹ کا۔“

”نہیں ہو گیا۔ کانٹھ کی ہنڈیا کب تک چڑھتی ہے۔ ہاں۔“

”بھئی ہنڈیا تو آٹھ مینے چڑھی رہی۔ میرے بھائی۔“

”اور میں کہتا ہوں یہ تو چڑھی ہی رہتی اگر اپنے باؤ کی بیٹی کو نہ چھیڑتا وہ۔“

”کون بی؟“

”اسے یہی سبز جنگل والی۔“

”وہ جو ہنڈی سلونی سی ہے؟“

”ہاں ہاں بڑی مرچیلی ہے وہ۔ باؤ اس کے ہاں آتا جاتا ہے نا۔“

”کون باؤ؟“

”باؤ کو نہیں جانتے۔ بھئی وہ گورا چنڈا۔ پیس کنڑے میں رہتا ہے۔ سرداراں کے چوبارے

کے بچہ اڑسے کی گلی میں کھینچ پولیس میں ہے وہ باؤ اپنا۔“

”لیکن کیسے معلوم ہوا کہ سیٹی پٹی والا بتاؤں افسرین کر تحقیق کر رہا ہے۔“

”بس جی بابو نے پہلے تو اس بروپیے کی فٹیں کیں۔ تم جانتے ہو ایک مجھے کے ٹولہ پر دوسرے سے بات کر لیتے ہیں اپنے بابو نے کہا بھی جس پر جی چاہے ہاتھ رکھ ڈالو اپنے کا“  
”تعلیق نہیں پر“ ”نئی“ پر ہاتھ نہ ڈالنا۔“  
”پھر کیا ہوا؟“

”بات تو کھری کسی بابو نے پیارے۔“

”ہاں بھی صاف بات اچھی ہوتی ہے۔“

”پر وہ تو گویا نفلوں کا بھوکا تھا۔ اسی شام کو وہ ”بتی“ کے چوہارے پر چڑھ گیا اور پھر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ پھر بابو نے جا کر دفتر سے مالومات لیں۔ اس سے پوچھا اس سے پوری تیغ کی اور مالوم ہوا کہ سرکار نے تفتیش کے لئے کوئی حکم جاری نہیں کیا اور صاحب آج بابو میاں دوخان پر آیا اور بولا استاد آج کہیں سرکنا نہیں وہ تماشہ دکھاؤ گا کیا بارگے ایسا تماشہ کنڑے والوں نے کبھی نہ دیکھا ہو گا اور اس وقت وہ اوپر ”بتی“ کے چوہارے پر ہے اور ساتھ پس ہے تاکہ سیٹی پٹی والے کو ہتھکڑی لگا لے۔“

”ہوں تو یہ بات ہے۔“

”بھی شابیشے بابو کا۔“

”بڑا بچے کا آدمی ہے وہ اگرچہ ہے کھفہ پس کا پڑ اپنا یار ہے۔“

”عین اس وقت آنا آگیا۔ اس کے چہرے پر وہی بے نیازی برس رہی تھی۔“

”تم ہو ایللی؟“ آنا اس کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ سرسری انداز سے بولا۔ ”آگئے تم۔ اب کی مرتبہ تو دیر کر دی تم نے یہ تماشہ دکھا ہو گئی۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ انکوائری محض ڈھونگ ہے اور وہ سی آئی ڈی کا انسپکٹر دراصل ایک موقوف شدہ پلیہ ہے۔ پٹھے نے آٹھ مہینے کنڑے میں عیش کئے ہیں۔ دعوتیں اڑائی ہیں۔ مجرے دیکھے ہیں۔ گانے سنے ہیں اور جس کی بیج پر چالایا ہے۔ خدا کی قسم ایسا قسم طرف نہ جونی کی بایوں سے چلیں بھڑاتا رہا۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”لیکن۔“ ایللی نے پوچھا ”پوری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”ہاں۔“ آنا ہنسنا۔ ”میں سمجھا شاید تم جانتے ہو اس معاملے کو کنڑے کا تو بچہ پڑا۔“

”جے۔“

”آنا ہنسنے لگے۔ ”کیا واقعی۔“ ایللی نے کہا۔

”یہ سیٹی پٹی والا انسپکٹر پہلے پولیس میں تھا۔ پھر نہ جانے کس وجہ سے درخواست ہو گیا۔ اس کے بعد اس شخص نے ایک جعلی حکمنامہ بنایا۔ جس میں لکھا تھا کہ فلاں شخص نے حکومت کا ایک لاکھ روپیہ غبن کیا ہے۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے زیادہ تر روپیہ امرتسر کنڑہ رنگین میں اپنی محبوبہ بنام سردار دیا بہارو پر صرف کیا ہے۔ انسپکٹر رؤف کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ موقع پر جا کر اس امر کی تحقیق کرے اور اپنی رپورٹ پیش کرے۔“ آنا صاحب ہنسنے لگے۔

”کبنت کو کیا بات سوچھی اور پھر اس نے رقصاؤں کے جو دو نام لکھے اس خط میں وہ بہت سوچ کر لکھے۔ چونکہ کنڑے میں ان ناموں والی بہت سی رقصائیں ہیں اور وہ سب اوپر کے درجے کی ہیں۔ بس تو اس نے وہ خط یہاں کے ایس پی کو دکھایا۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا اس کے بعد اس نے تفتیش کے پردے میں وہ کیا جس کا جواب نہیں۔“

”آخا آخا ہیں۔“ ایک نوواردان کی طرف بڑھا اور وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے سبز چٹکے والے چوہارے کی طرف چل دیئے۔

ایللی نے آنا کی ڈیوڑھی کی طرف دیکھا وہاں نیم کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نیم کو اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے دیکھ کر ایللی کا دل ڈوب گیا۔ ”معا“ اسے خیال آیا شاید نیم بھی وہیں کہیں موجود ہوگی۔ وہ تڑپ کر مڑا مگر آنا کے چوہارے کی کھڑکیوں جوں کی توں بند تھیں۔ چٹیس بے جان انداز سے لٹک رہی تھیں اور حرکت سے قطعی طور پر بے گانہ تھیں۔ اوپر کوٹھے کی منڈیر پر کربا بازو کا کوئی حصہ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ ایک بار پھر اس پر مایوسی چھا گئی۔ اس نے نیم کی طرف دیکھا جو ویسے ہی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی خوشخبری اس کے ہونٹوں میں دبلی ہوئی ہو۔

بالرب بالماظہ ہو شیر

ایللی نے آنا کی طرف دیکھا وہ دور جا چکا تھا۔ حتیٰ پان کی دکان پر کھڑا باتوں میں مصروف تھا۔ اس نے لا ایک مرتبہ اوھر اوھر دیکھا اور پھر حالات کو سازگار سمجھ کر نیم کی طرف بڑھا۔ اسے آنسو دیکھ کر نیم کے ماتھے پر پیارا شکن پڑ گیا۔ بھویں کمانوں کی طرح ہوتی گئیں۔

”کہاں ہے ہر ویسہ؟“

”پکڑ لیا گیا۔“

”اسے لار ہے ہیں۔“

”پہلوان ذرا دیکھنا دکان کو میں آیا۔“

سب لوگ دیوانہ وار سبز جنگل والے چوہارے کی طرف لپکے۔ حتیٰ نے دو ایک کو گرایا دو ایک کو بچھاڑا اور وہ دھاڑتا ہوا ایللی سمیت سبز جنگل والے چوہارے کی میڑھیوں کے سامنے جا پہنچا۔ چند ایک سپاہی میڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ ہجوم کو دیکھ کر انہوں نے اپنے چابک چلانے شروع کر دیے۔ ”ہٹ جاؤ ہٹ جاؤ۔“ لوگوں نے بڑی مشکل سے راستہ دیا۔ حتیٰ یہ دیکھ کر اس دکان کی طرف لپکا جو ان میڑھیوں سے ملحقہ تھی اور اس نے ایللی کو جھجھے پر تھمھٹ لیا۔ سپاہیوں کے پیچھے سینی پینی والا روف ہنکڑی پنے بڑے وقار سے آ رہا تھا۔ ایک ساعت کے لئے وہ رکا۔ اس نے بڑے غیور انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پھر یارعب انداز سے بولا۔ جیسے اپنی رہنمائی کو حکم دے رہا ہو۔

”اے ہمارے لئے موڑ بھی نہیں لائے تم۔ ہم موڑ کے بغیر کیسے جائیں گے۔“

یادو نے ایک ترہ خند مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔ سپاہی مسکرائے۔

”اور دیکھو۔“ طرم نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ہمیں سگریٹ چائیس پہلوان ”وہ چلایا۔“

مگرٹ کا ایک ٹین۔“

”مگرٹ کا نہیں۔“ پہلوان پناڑی چلایا۔ ”اب تو بیٹے ویسے ہی ٹین پاٹ ہو گا۔“

”سلا موڑ لگتا ہے۔“ ہجوم سے آواز آئی چل تو سہی تھانے میں تیرا ایکسیڈیٹر دبائیں گے تو ہوش آجائے گا۔“

”ارے اوسکی دالی پٹی۔“

”خاموش“ طرم نے انہیں ڈانٹا۔ ”ہمیں نہیں جانتے تم۔“

یادو نے لگا ”اب سالہ دیوانہ بنتا ہے۔“

”بیکار خلیش ہشیار ہے۔“

”جلوس آہستہ آہستہ کنڑے میں چلنے لگا۔ ہجوم نعرے لگا رہا تھا۔ لوگ بیڑیوں کے ٹکڑے اس معمول شدہ راجہ پر پھینک رہے تھے۔ اوپر رقصائیں جنگلوں سے نیچے لگی ہوئی تھیں کئی

”ہم نہیں بولتے تم سے۔“ وہ ایک انداز سے زیر لب بولی۔

”کیوں؟“ ایللی نے نگاہیں چمکاتے ہوئے کہا۔

”بس تم نے کھو دیا۔“ اس نے ناک چڑھا کر کہا۔

”کیا کھو دیا؟“ ایللی نے پوچھا۔

”سب کچھ۔“ وہ بولی ”تم تو بس کھو ہی دیتے ہو۔ میں بتاتی ہوں بات اور تم بگاڑتا ہو۔“

”آخر بتاؤ بھی نا۔“ ایللی نے پوچھا۔

”پھر تم آتے کیوں نہیں ہمارے میاں۔“ وہ بولی۔

”تمہاری آپا جو چھپی رہتی ہے۔“ اس نے پینترہ بدلا۔ ”دیکھ لو آج بھی چھپی بیٹھی ہے۔“

”اوں۔“ وہ بولی۔ ”وہ تو نہیں چھپتی پر داوی اسے باہر آنے بھی دے۔“

”کیوں داوی کیا پکڑے رکھتی ہے اسے۔“

”سائے کی طرح سوار رہتی ہے۔ آپا کتنی تھی۔“ وہ رک گئی۔

”میرے متعلق کچھ کتنی تھی۔“ ایللی نے منت کی۔

”نہیں بتاتی۔“ اس نے بسور کر کہا۔ ”مجھ سے ملنے جو نہیں تو بتاؤں کیوں۔“

”تم بڑی پیاری ہو۔“ وہ اس کے قریب تر ہو گیا۔

”جھوٹ۔“ نیم نے اپنا آپ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا ”چھوڑو ہمیں۔“

ایللی نے محسوس کیا جیسے وہ چھوٹی سی لڑکی درحقیقت ایک بالغ عورت ہو۔ ایک عورت

لہجانے کے انداز سے پورے طور پر واقف ہو۔ اس نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا نا

اس حوالگی کے باوجود اپنا منہ نہ ڈر رکھا تھا۔

عین اس وقت ایک شور اٹھا اور کنڑے میں کھڑے تمام لوگ سبز جنگل والے ملک

طرف بھاگے۔

”ادھر آؤ۔ ادھر آؤ۔“ حتیٰ نے بڑھ کر ایللی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”وہ اسے نیچے لار رہا تھا۔“

حتیٰ ایللی کو دیوانہ وار تھمھنے لگا۔

وہاں ایک کمرام بچ گیا۔

”جو تے مارو جو تے۔“



والوں نے اس پر بھی مچھلی کھانے کے خلاف پابندی لگا رکھی تھی۔

جب وہ سب امتحان سے فارغ ہوئے تو اللہ داوے سکھوں کے ساتھ مل کر بورڈنگ میں ایک جلوس نکالا۔ وہ جلوس تین لڑکوں پر مشتمل تھا ایک ہندو ایک مسلمان اور ایک سکھ، اللہ داو خود اس جلوس کا لیڈر تھا۔ وہ ہر کمرے میں جا کر نعرہ لگاتے۔

”جے ہندو دھرم کی جے۔“

”اے بندوؤ۔“ اللہ داو چلاتا۔ ”خدا تمہارا کلیان کرے۔ تم نے سال بھر ہمیں دالیں کھلا کھا کر اندر باہر سے خوشبو دار بنا دیا ہے۔“ اس پر بانی لڑکے چلاتے۔ ”جے ہندو دھرم کی جے۔“

اللہ داو کے نعرے سن کر رسوئی کے تمام نوکر مسرت سے سر ہلا رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ واقعی اندر باہر سے خوشبودار ہونا ایک قابل تعریف امر ہے۔ ہندو جذبات کے اثر سے بھیگی ہوئی قسین بھری نگاہوں سے اللہ داو کو دیکھ رہا تھا۔ دور بنگالی بلو زیر لب مسکراتے ہوئے نکل رہے تھے۔ اوہر آصف اپنی ہی دھن میں کھویا ہوا ایللی کے کلن میں کہہ رہا تھا ”اب کیا ہو گا اب میں مگر کیسے جاؤں گا ایللی؟“

عین اس وقت پر نپل اپنی لینڈو میں آموں والی کوٹھی میں آدھمک۔ چند ایک ساعت کے لئے پودوں کے پیچھے چھپ کر وہ لڑکوں کی باتیں سنتا رہا پھر معاملہ کی نوعیت کو بھانپ کر مسکرایا اور وہیں سے چلانے لگا۔ ”او اللہ داو یہ کیسا شور ہے؟“ جلوس پر نپل کو دیکھ کر ختم کیا۔ سکھ دغتا اپنے کلمے بالوں میں کنگھی کرنے میں مشغول ہو گئے۔ رامو اور لالو بھاگ کر رسوئی میں بدلتن صف کرنے لگے۔ اللہ داو ایک ساعت کے لئے چپ چاپ کھڑا رہا اور پھر اسے سو جھی۔ اس نے جیب سے آم کی خشک گٹھلی نکالی اور اسے اپنے سر پر رگڑنے لگا۔

”کیا کر رہے ہو اللہ داو۔“ پر نپل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”مسلم پر نپل جی۔ سر سے خشکی نکال رہا ہوں۔“

”ہوں۔ لیکن تمہاری سر کی خشکی کبھی نہ جائے گی۔ خشکی آم کی گٹھلی سے نہیں جاتی عقل سے جاتی ہے۔“ اس پر سب لڑکے ہنس پڑے۔

”مضور۔“ اللہ داو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”اسی عقل کے کھوج میں اس کلن میں آیا تھا پر کلن ہی میں ملی۔“

ایک ہاتھ مل رہی تھیں۔ کئی ایک شرمندگی محسوس کر رہی تھیں کہ انہیں دھوکہ دے کر لوٹا گیا اور وہ سیٹی پٹی کا متوالا تحکمانہ انداز سے احکامات جاری کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

”ہٹ جاؤ یہ ہمارا جلوس ہے باادب با ملاحظہ ہوشیار۔“

اس روز شام کو جب ایللی واپس اپنے بورڈنگ ہاؤس کو جا رہا تھا تو وہ محسوس کر رہا تھا کہ خود سیٹی پٹی کا بہروپے ہو اور ایک روز اسے بھی یونہی جلوس میں چلتے ہوئے پکارنا ہو گا ”ہالربا ملاحظہ ہوشیار۔“

## الوداع

پھر وہ سب امتحانات کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ شفیع صبح سویرے ہی اپنی ہاکی لگ کر کتابیں اٹھا کر قریب کے باغ میں جا بیٹھتا اور وہاں دن بھر پڑھنے اور سانپ مارنے کے مشاغل میں وقت کاٹتا۔ آصف اور وہاں دن بھر پڑھنے اور سانپ مارنے کے مشاغل میں وقت کاٹتا۔ آصف اور ایللی نسر کے کنارے جا بیٹھتے۔ جہاں آصف پڑھنے کے علاوہ ٹھنڈی آبیں بھرتا اور بار بار ”اے سے پوچھتا“ ایللی اب کیا ہو گا“ اور ایللی یہ سن کر سونے لگتا اس وقت اس کے روہو شہزادہ آغا ہوتی اس کے حنا مالیدہ ہاتھ ایللی کی طرف بڑھتے اور پھر ایک رنگین آواز سنائی دیتی۔ ”ایللی مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی۔“

”ایللی اب کیا ہو گا۔“ آصف کی آواز سنائی دیتی اور پھر ایللی کے سامنے وہ سیٹی پٹی کا ڈھول آمو جوہر ہوتا اور تحکمانہ انداز سے چلاتا ”باادب با ملاحظہ ہوشیار۔“

اللہ داو سارا دن کمرے میں بیٹھا رہتا اور پڑھنے کے علاوہ سر پر آم کی گٹھلی رگڑتا رہتا۔ پھر یہ آواز بلند بنگالی بالو کو گالیاں دیتا جس کی وجہ سے وہ گوشت کھانے سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ”ان ہندوؤں کو اللہ غارت کرے یا مہاتما بدھ ان پر اپنا قہر نازل فرما کہ انہوں نے ایک مومن پر گوشت کھانا حرام کر رکھا ہے۔“

رام ان کو بن باس دے کہ انہوں نے مجھے دال کھلا کھلا کر تباہ کر دیا ہے میرا معذہ برداشت لا حول پڑھتا ہے۔“

اللہ داو کا شور سن کر ہر نام اور لیتا سیاں آجاتے اور وہ سب مل کر شور مچاتے۔ ہوش بنگالی سپرنٹنڈنٹ اللہ داو کی بددعائیں سنتا اور چوری چوری مسکراتا کیونکہ وہ خود مقلوم تھا۔

منسوبہ ہندو۔ اگر وہ اسے خطوط لکھنے اور وہاں تک پہنچانے کی ترکیبیں سوچنے کے فکر میں تھا اور ایلی سے ان امور میں مدد چاہتا۔ تو شاید ایلی کو اس رومان میں دلچسپی محسوس ہوتی۔ سفینہ سے بچنے کی ترکیبیں سوچنے میں ایلی کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن آصف سے انکار کرنا بھی تو ممکن تھا اور ویسے بھی شتراو کی کشش کے باوجود ان حنائی ناگوں کے سحر کے باوجود وہ علی پور جانے سے ڈرتا تھا۔ وہ شتراو کے قرب سے ڈرتا تھا وہ ان لنگتی ہوئی گوری بانسوں سے ڈرتا تھا۔ جن میں ایلی کی زبردست آرزو اس کے سینے میں سنگ رہی تھی۔

در حقیقت اس وقت وہ دونوں آصف اور ایلی ”بھگوڑے“ تھے اور ان کا وہ انوکھا فرار ان انہوں کا حال تھا جو بندھنوں کی پید اواری ہوتی ہیں۔ وہ دونوں زندگی سے دور بھاگ رہے تھے۔ انسان کی بنیادی خواہشات سے منکر تھے اور زندگی کے دھارے سے ہٹ کر کنارے کے بند اور متعفن پائوں کے بھنور میں ڈبکیاں کھا رہے تھے۔ وہ بھگوڑے دراصل مریض تھے۔ جنہیں یہ احساس نہ تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں جنہیں شعور نہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا گلا گھونٹ رہے ہیں اور مستقبل کو تباہ کر رہے ہیں۔ زندگی کے ہاتھی کو ٹٹولنے والے دو اندھے۔

وہ چوبارہ جو انہیں رہنے کے لئے کرائے پر ملا۔ ایک چھوٹی سی گلی میں واقع تھا جو ہل بازار سے نکل کر رام باغ کے بازار میں جا ملتی تھی۔ اس گلی کی چلی منزل میں تمام تر دوکانیں تھیں جو مرثام ہی بند ہو جاتی تھیں۔ اوپر کی منزل میں زیادہ تر گودام تھے جو دن رات بند رہتے اس وجہ سے گلی دیران اور سندان رہتی۔ لیکن ان کے چوبارے کے جنگلے کی کھڑکیوں کے عین مقابل میں ایک نوجوان رقاصہ کی بیٹھک کا پچھلا حصہ تھا۔ بیٹھک کی کھڑکیاں رام باغ کے بازار میں کھلتی تھیں۔ صدر دروازہ بھی اسی بازار میں تھا مگر — پچھلے حصے کی کھڑکیاں اس چوبارے کے مقابل کھلتی تھیں۔

اس چوبارے میں وہ دونوں بے سرو سامان حالت میں جا بیٹھے۔ ان کی پاس ایک ٹوٹے ہوئے ٹنک اور دو بستروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کھڑکیوں کے پاس انہوں نے زمین پر بستر بچھائے اور ہوم تیل کا بیکٹ دیا سلائی سگریٹ سرہانے رکھ کر وہ دونوں بیٹھ گئے۔ چند ایک منٹ کے لئے وہ اس اجنبی ماحول کے متعلق باتیں کرتے رہے پھر خاموش ہو گئے۔ خاموشی گہری ہوتی گئی کہ رات کے اندھیرے نے اسے اور بھی بھیانک بنا دیا۔

”اچھا لڑکے۔“ پرنسپل نے بات کا رخ بدلا۔ ”مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ اس پر اس طرف سے لڑکے بھاگے بھاگے آئے اور پرنسپل کے گرد جمع ہو گئے۔

”آج تم امتحان سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھر جا رہے ہو۔ تم میں سے کئی لڑکے ہیں اس کالج میں نہیں آئیں گے اسی لئے تم سب سے الوداع کہنے آیا ہوں۔“

اس پر سب لڑکوں نے تالیاں بجائیں اور پھر پرنسپل سے مصافحہ کرنے کے لئے قہار ہو کھڑے ہو گئے۔ اس اثناء میں بنگالی سپرنٹنڈنٹ بھی آیا اور وہ دونوں باری باری لڑکوں سے ہلا مانے لگے۔

## دو بھگوڑے

پرنسپل کے جانے کے بعد بنگالی بابو کے کہنے کے مطابق وہ سب اپنا بستر بچھائے اور پھر باری باری ناگوں میں بیٹھ کر رخصت ہونے لگے۔ ایلی کو بستر باندھے دیکھ کر آصف نے اس سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ایلی۔“ اس کی آواز میں منت تھی۔ ”تم چلے گئے تو میں کیا کروں گا۔ ایلی۔“

ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”اب تو مجھے جانا ہی ہو گا۔“ وہ بولا۔

”کیوں یہاں رہنے میں کیا ہرج ہے۔ تمہاری تسلیم بھی تو یہیں ہے۔“

”میری تسلیم۔“ ایلی چونکا لیکن جلد ہی سنبھل کر بولا ”ہاں وہ۔“

”تو پھر تم کیوں علی پور جاتے ہو فضول۔ یہیں رہو ایلی میرے ساتھ۔ یہاں تو بڑے

لگن ہے مہر ہے سہی تو یہاں ہیں۔ یہیں رہو میری خاطر۔ ایلی۔“

”لیکن یہاں رہیں گے کہاں۔ تمہارے گھر میں؟“

”نہیں نہیں۔“ وہ چلایا ”گھر میں میں کیسے جا سکتا ہوں۔“

”تو پھر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہم یہاں کوئی مکان کرائے پر لے لیں گے۔“ آصف نے جواب دیا۔

ایلی امر ترمیم رہنا نہ چاہتا تھا۔ اسے آصف اور سفینہ کہ کہانی میں قطعی دلچسپی نہ تھی۔ اگر آصف لڑکی میں اثباتی دلچسپی محسوس کرتا۔ اگر وہ لڑکی

”ایلی۔“ آصف نے لمبی آہ بھری۔  
 ”ہاں۔“  
 ”اب کیا ہو گا؟“  
 ”کیوں؟“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”اب میں کیا کروں گا؟ کیسے گھر جاؤں گا؟“  
 ”تم تو خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔“ ایلی نے جواب دیا۔  
 ”تو کیا گھر چلا جاؤں۔“ آصف نے پوچھا۔  
 ”تمہارا اپنا گھر ہے۔“ ایلی بولا۔  
 ”لیکن محلے والے کیا کہیں گے۔“  
 ”پڑے کہیں تم نے کوئی جرم کیا ہے کیا۔“ ایلی نے چمک کر کہا۔  
 ”لیکن میں اس سے نجات کیسے پاؤں گا؟“  
 ”نجات پانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دیکھتی ہے تو پڑی دیکھے۔ تمہارا کیا لپتی ہے۔ تمہارا بگڑتا ہے۔“  
 ”ج“ آصف اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
 ”اور کیا“ ایلی نے تن کر کہا۔  
 ”اور اگر وہ آوازے کسے تو؟“  
 ”تو کیا کہنے دو؟“  
 ”مگر اس کا انجام کیا ہو گا؟“  
 ”انجام اچھا چاہتے ہو تو اس پر یہ ظاہر کرو کہ تمہیں اس سے محبت ہے۔“  
 ”لیکن کیسے ظاہر کروں۔“  
 ”تم اس کی طرف دیکھو۔“  
 ”بس اتنی سی بات ہے۔“ آصف نے مسکرا کر پوچھا۔  
 ”اور کیا وہ مطمئن ہو جائے گی اور تمہیں تنگ نہ کرے گی۔“ ایلی نے دھوکے سے کہا۔  
 ”ج۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔“  
 ”اس کے بعد آصف خاموش ہو جاتا اور کسی گھرے خیال میں کھو جاتا اور دیر تک وہیں بیٹھ رہتا۔“

پپ پپ لئے رہتے۔ پھر دفعتاً ”آصف چونکتا۔  
 ”مگر ایلی“ آصف مدھم مدھم آواز میں کہتا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔ ”اس طرح تو بات  
 بڑھ جائے گی۔“  
 ”ہاں بات تو بڑھ جائے گی۔“  
 ”تو پھر کیا ہو گا؟“  
 ”تو پھر۔۔۔۔۔ ایلی سوچ میں پڑ جاتا۔  
 ”اگلے روز صبح سویرے ہی آصف نے ایلی کو جگایا۔  
 ”ایلی ایلی۔“ اس نے اسے جھنجھوڑا۔ ایلی کے بیدار ہونے پر وہ مسکرانے لگا اس کی  
 آنکھوں میں عجیب سی پھوار پڑ رہی تھی۔ ”ایلی۔“ وہ چلایا۔ ”چلو میں تمہیں دکھاؤں۔ چلو اوپر  
 کوٹھے پر۔“  
 ”اوپر“ ایلی نے حیرانی سے پوچھا۔  
 ”ہاں“ وہ بولا۔ ”وہ کوٹھے پر کھڑی ہے۔“  
 ”وہ۔۔۔۔۔؟ یہاں اس کوٹھے پر۔“  
 ”اپنے گھر کے کوٹھے پر یہاں سے صاف نظر آتا ہے۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔“  
 ”لیکن وہ کن۔“ ایلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔  
 ”بھئی وہی۔ آؤ۔“  
 ”وہی تمہارے والی سیفینہ۔“  
 ”ہاں ہاں وہی۔ کوٹھے سے صاف دکھائی دیتی ہے۔ اپنے گھر کی چھت پر کھڑی ہے۔“  
 ”لیکن تمہارا محلہ تو دور ہے یہاں سے۔“  
 ”نہیں تو اس چوہارے کے عین پچھواڑے میں ہے۔ یہ ہاں بازار کے پیچھے اس کنڑے کے  
 بائیں ہاتھ۔“  
 ”لیکن۔۔۔۔۔ ایلی کو یقین نہ آتا تھا۔  
 ”راستہ گھوم پھر کر جاتا ہے ویسے یہاں سے قریب ہے چلو۔ پتھاری کھڑی میری راہ دیکھ  
 رہی ہو گی ابھی تک بہت نہیں ہماری حالانکہ مجھے گھر سے نکلے اتنی دیر ہو چکی ہے۔ حد کر دی  
 میں نے یہ تو میری جان لے کر ہی چھوڑے گی۔“

”اس کے بعد آصف خاموش ہو جاتا اور کسی گھرے خیال میں کھو جاتا اور دیر تک وہیں بیٹھ رہتا۔“

”کیوں؟“ وہ چلایا۔

”کیا اس طرح وہ خود بدنام نہیں ہوتی“

”اسے بدنامی کی پروا نہیں۔“

”بڑی ہو کر بدنامی کی پروا نہیں؟ کتنی عجیب بات کرتے ہو تم۔“

”ہاں عجیب سی ہی مظلوم ہوتی ہے۔“ آصف سوچ پر پڑ گیا۔

اس قسم کی بے ڈھنگی باتیں کرتے کرتے دفعتاً وہ دونوں خاموش ہو جاتے۔ آصف نہ بننے کس سوچ میں پڑ جاتا اور اہلی کا جی چاہتا کہ اس کا بھی کوئی انتظار کرے اس کے لئے بھی کوئی پھت پر کھڑی رہے حتیٰ کہ صبح سے شام ہو جائے۔ اس کے لئے وہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ ساری دنیا کو ٹھکرانے کے لئے بے تاب تھا۔

پھر دفعتاً ایک دھندلی سی شکل اہلی کی نگاہوں تلے واضح ہونے لگتی۔ دو سفید بانٹیں لٹکتی۔ دو شگرتی ہاتھ جوڑتے اور ماتھے کے عین درمیان میں ایک سیاہ تل ابھر آتا۔ شہزاد مسکراتی اور کتنی ”اہلی تم کیا تم دنیا والوں کی پروا کرتے ہو؟“ اس وقت اہلی خاموش ہو جاتا اور آصف کی آواز سن کر چونک پڑتا اور اس کا وہ حسین خواب ٹوٹ جاتا۔

اس طرح ایک دوسرے سے دور ایک دوسرے سے بیگانہ وہ دونوں قریب قریب بیٹھ رہتے اور دیوالوں کی طرح اس اجڑے ہوئے منڈیروں کے ڈھیر کی طرف دیکھتے رہتے۔

### نرالی تجویز

ایک روز آصف بولا۔ ”اہلی کوئی ایسا طریقہ نہیں کیا کہ وہ جھوٹی ثابت ہو جائے اور میں اسے طعنہ دے سکوں۔“

اہلی کو بات سمجھ میں نہ آئی۔ ”میں نہیں سمجھا۔“ وہ بولا۔

”مطلب یہ ہے کہ میں اسے کوئی ایسی فرمائش کروں جو وہ پوری نہ کر سکے اور پھر میں اس سے کہوں بس دیکھ لی تمہاری محبت۔“

”یہ تو سیدھی سادھی بات ہے۔“ اہلی چلایا۔ ”اسے کہہ کہ یوں اعلانیہ تم سے اظہار محبت نہ کرے۔“

”لوں توں“ آصف نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ وہ نہیں مانتی۔ کوئی اور بات ہو۔“

کونٹھے سے اہلی نے اس طرف نگاہ دوڑائی جدھر آصف اشارہ کر رہا تھا۔ چاندنی طرز منڈیروں کو ٹھوں اور چھتوں کا ایک طوفان پھیلا ہوا تھا اور وہ منڈیریں اور چھتیں ایک دوسرے سے شانے جوڑ کر کھڑی تھیں۔ جیسے ایک دوسرے کا سہارا لے رہی ہوں ایسے معلوم ہوتا جیسے مکانات مسار ہونے کے بعد لمبے کے ڈھیر بن گئے ہوں اور ان ڈھیروں میں چتر پائے ہوئے پھر رہے ہوں۔

”وہ دیکھو وہ“ آصف شرماتے ہوئے بولا۔ ”وہ جو نیلی برساتی کے پاس زرد رنگ کی منڈیروں والی چھت ہے اور اس کے قریب میلے سے کونٹھے پر وہ جس کے پیچھے بڑے بڑے سوراخ ہیں دیوار میں ان پردوں کے پاس وہ سفید کپڑوں میں لمبوس لڑکی ہے نا آئی نظر نہیں آتی ہے۔ دیکھا۔“

غور سے دیکھنے کے باوجود اہلی کو چھتوں کے انبار کے سوائے کچھ دکھائی نہ دیا۔ لیکن آصف کے اصرار سے بچنے کے لئے اسے کچھ دیر کے بعد ”ہاں ہاں۔۔۔“ وہ کہتا ہی پڑا۔

”اب دیکھ لو۔“ آصف بولا۔ ”یوں کھڑی رہتی ہے جیسے پتھر کا بت کھڑا ہو۔“

”ہاں۔“ اہلی بولا۔ ”تم نے تو اسے پتھر کا بتا دیا۔“

”ج“ آصف نے مسکراتے ہوئے اہلی کی طرف دیکھا۔ ”وہ بھی یہی کہتی ہے۔“

”جج کہتی ہے وہ۔“ اہلی نے جواب دیا۔

”تم بھی یہی سمجھتے ہو کیا۔“ آصف نے آہ بھر کر پوچھا۔

”تم اسے خواہ مخواہ تباہ و برباد کر رہے ہو آصف۔“ اہلی غصے میں بولا۔

”میں؟“ آصف نے مظلوم نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں تم۔“ اہلی چلایا۔

”نہیں نہیں ایسا نہ کہو۔“ آصف نے منت کی۔

”اسے تم سے محبت ہے۔“ اہلی نے جواب دیا۔ ”اسی لئے تم اسے ذلیل کر رہے ہو۔“

”کیا واقعی محبت ہے اسے؟“ آصف نے پوچھا۔

”ظاہر ہے اور کیا۔“ اہلی نے جواب دیا۔

”میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا مقصد صرف مجھے بدنام کرنا ہے۔“

”تم پاگل ہو آصف۔“

”کوئی اور بات“ ایلی سوچ میں پڑ گیا۔ دیر تک وہ دونوں خاموش رہے پھر دفعتاً ایلی چنکی بجائی۔ بن گئی بات۔

”کیا؟“ آصف نے پوچھا۔

”اس سے بہتر تجویز نہیں ہو سکتی۔“ ایلی نے خوشی سے اچھل کر کہا۔

”کیا تجویز ہے؟“ آصف شوق سے ایلی کے قریب تر ہو گیا۔

”لیکن اس پر عمل کرنے کے لئے تمہیں گھر جانا پڑے گا۔“ ایلی بولا۔

”ہاں۔“ آصف بولا۔ ”میں چلا جاؤں گا۔ بتاؤ تو۔“

”جب تم گھر جاؤ تو کوٹھے پر چلے جانا۔“ ایلی نے گرجوٹی سے کہا۔

”گھر جاتا ہوں تو کوٹھے پر تو ضرور جایا کرتا ہوں اگرچہ لوٹا لے کر جاتا ہوں۔ دیکھو“

دکھانے کو۔“ آصف بولا۔

”اور وہ کوٹھے پر آجائے گی۔ آجائے گی نا۔“

”ہاں۔ وہ تو اکثر کوٹھے پر ہی رہتی ہے اور مجھے دیکھتے ہی اعلان یہ سلام کرتی ہے جکا“

بڑے ادب سے۔“ آصف ہنسنے لگا۔

”اب کی مرتبہ وہ سامنے آئے تو اسے اشارہ کر کے اپنی قمیض کے نچلے کونے کو پکڑ کر“

اٹھانا۔ یہاں تک کہ بازو سر کے اوپر انگڑائی کی صورت معلق ہو جائیں۔“

”اس سے کیا ہو گا؟“ آصف نے پوچھا۔

”اس سے قمیض کا اگلا حصہ اوپر اٹھ جائے گا۔“

”پھر؟“ آصف اس کے قریب تر ہو گیا۔

”پھر تمہارا سارا جسم ننگا ہو جائے گا۔“

”لیکن اس کا فائدہ۔“

”پھر اس اشارہ کرنا کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔ اشارے سے کتنا میری خاطر۔“

”یوں کرنے سے تو اس کا جسم بھی ننگا ہو جائے گا۔“ آصف گھبرا کر بولا۔

”ہاں۔“ ایلی نے بڑے فخر سے کہا۔

”لیکن وہاں کوٹھے پر اسے ننگا کر دینا۔“ آصف ہچکچا کر بولا۔ ”نہیں نہیں۔“

”یہی تو بات ہے“ ایلی نے کہا۔ ”وہ عورت ہے۔ حیا مانع ہو گی۔ وہ مجبور ہو گی اور نہ“

فرائض پوری نہ کر سکے گی۔“

”ہوں۔“ آصف بولا۔ ”لیکن اگر اس نے قمیض اٹھا دی تو۔۔۔۔۔“

”قمیض اٹھا دی تو۔۔۔ ایک ساعت کے لئے ایلی گھبرا گیا اس نے اس امکان پر غور ہی نہ کیا تھا پھر وہ بولا۔ ”نہیں نہیں یہ ایسا نہیں کر سکتی خصوصاً“ کوٹھے پر کھڑی ہو کر ایسا نہ کر سکے گی

بہرہہ تمخرے ہنس دینا بس یہی ہے تمہاری محبت۔“

”لیکن تمخرے کس طرح ہنسوں گا میں۔“ آصف نے پوچھا۔

”جیسے تمخرے ہنستے ہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”بہرہہ دونوں تمخرے ہنسنے کی کوشش کرنے لگے۔“

### سنگ مرمر کا مجسمہ

اگلے روز صبح سویرے ایلی نے بصد مشکل آصف کو گھر جانے پر مجبور کر دیا تاکہ وہ گھر جا کر

اس کی نئی تجویز پر عمل کر سکے۔ نئی تجویز پر عمل کرنے کے لئے آصف گھر جا چکا تھا اور ایلی رو

مل کی تفصیلات جاننے کے لئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اس کے ذہن کی عجیب کیفیت تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ لڑکی آصف کے کسنے

پر اپنی قمیض نہیں اٹھائے گی۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کے سامنے عریاں نہ کرے گی۔ مگر دفعتاً اس

کا سلسلہ خیال ٹوٹ جاتا اور دل میں یہ خواہش ابھرتی کہ وہ قمیض اٹھالے تاکہ آصف واپس گھر

جانے پر مجبور ہو جائے اور اس دیران چوبارے میں رہنے سے نجات مل جائے۔ پھر وہ لا حول

پڑنے لگتا اور اسے احساس ہو تاکہ وہ کمینہ ہے جو اپنے فائدہ کے لئے آصف کو گھر جانے پر اکسا

رہا ہے۔ پھر وہ چلا اٹھتا۔ ”نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ایسا نہیں ہو گا۔“

اس نے اپنے پیچھے آہٹ سنی۔ ”آصف“ وہ چلایا۔ ”تم آگے۔“ آصف ایک بت کی طرح

اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ ہونٹ لرز رہے تھے۔ بازو لٹک

رہے تھے۔

”آصف“ ایلی اس کی طرح مڑا۔ ”کیا ہوا آصف؟“

آصف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔

”لیکن وہ۔ وہ ہمہ رک گیا۔“ وہ لڑکی۔“

”اگر تم سیدھے گھر نہ گئے آصف تو میں تم سے کبھی نہ بولوں گا۔“ یہ کہہ کر ایلی گلی میں  
 از گیا۔  
 آصف نے صرست بھری نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو  
 گیا۔



آصف نے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی۔  
 ”اس نے کیا کیا بولو۔“ ایلی اضطراب سے دیوانہ ہو رہا تھا۔  
 آصف نے پھر اثبات میں سر ہلادیا اور اس کا سر ایلی کی چھاتی پر لٹک گیا۔  
 ”خدا کے لئے بولو۔“ ایلی چلایا۔  
 ”ہاں اس نے قمیض اٹھا دی۔“ آصف زیر لب بولا اور اس کے گھٹوں پر دھنستار  
 آنسو ڈھلک آئے۔

”بالکل ہی اٹھا دی؟“ ایلی نے دیوانہ وار پوچھا۔  
 ”ہاں۔ بالکل۔“  
 ”پھر؟“ ایلی کا سر بھڑکے ڈنک کی طرح بھن بھن کر رہا تھا۔  
 ”ذر سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔“ آصف نے جواب دیا ”اور میں بھاگا کہ لگا!  
 وہاں دیکھ نہ لے۔“  
 ”اور وہ۔“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”وہ ویسے ہی کھڑی تھی جیسے سنگ مرمر کا کوئی مجسمہ ہو۔ سر کٹا مجسمہ۔“  
 وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ ایلی تنکے سے زمین کریدنے لگا اور آصف دیوار سے سہارا لگا کر  
 گیا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دیر تک وہ دونوں خاموش رہے۔  
 ”ایلی۔“ دیر کے بعد آصف گنگنایا۔  
 ”ہاں۔“ ایلی چونکا۔

”اس کا جسم اتنا خوبصورت۔۔۔۔۔۔ شدت جذبات سے آصف کی آواز رک گئی۔  
 ”آصف۔“ دھنستا ”ایلی اٹھ بیٹھا۔“ تم اب جاؤ۔ یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں  
 نہیں۔“

”ایلی۔“ آصف چلایا۔

”اب تمہیں جانا ہی ہو گا۔ میں شام کی گاڑی سے علی پور جا رہا ہوں۔“  
 ”ایلی۔ ایسا نہ کرو۔“ آصف نے منت سے کہا۔ ”میں تباہ ہو جاؤں گا۔“  
 ”نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”اب تمہیں اسے اپنانا ہی ہو گا۔“ اور وہ نیچے اتر کر سنان  
 ”ایلی۔۔۔۔۔۔ آصف نے آخری بار اسے پکارا۔ لیکن وہ زمین میں پہنچ چکا تھا۔

## دیوانگی

### زندگی کا موڑ

اس روز آصفی محلے کی طرف جاتے ہوئے ایلی پہلی مرتبہ لوگوں کی نظریں بچا کر نکلے کوشش کر رہا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔ اگرچہ طبعی طور پر وہ بچہ پر چڑھنے سے گھبراتا تھا لیکن محلے کی اور بات تھی۔ محلے میں وہ اہمیت محسوس کیا کرتا تھا۔ جب محلے کے کسی لڑکے کی آواز سنتا!

”آگئے باوجی۔“

تو خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی۔

محلے کے بازار میں سب سے پہلے حکیم بوٹا کی دوکان تھی۔ بوٹے کے انداز میں سبکیں یا سی ترشی تھی۔ وہ ہمیشہ طنز بھری بات کرتا۔ لیکن ایلی کو بری نہیں لگتی تھی۔ بوٹے کے بعد بڈا حلوائی کی دوکان تھی ایلی کو دیکھتے ہی اس کے زرد دانت باہر نکل آتے۔

”آگئے باوجی۔ نمستے مہاراج۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لیتا۔

اس روز نہ جانے ایلی کو کیا ہوا تھا۔ ان جانے میں وہ چھپ چھپ کر گھر جا رہا تھا۔ حکیم نہ دیکھ پائے۔ چاند دکان پر موجود نہ ہو۔ چاند اور حکیم کے دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہ تھا کیونکہ رات پڑ چکی تھی۔ لوگ دکانیں بڑھا چکے تھے۔ بہر صورت ننھو تمباکو فروش کی دکان حسب معمول جھگڑا تھا اور وہ سب اندر بیٹھے ہوئے چوٹ کھیل رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر آصفی کے لئے وہ رکا۔ پھر منہ دوسری طرف موڑ کر چپکے سے آگے نکل گیا۔ تنہا کی دکان پر کوئی بھی نہ تھا۔ بچہ خالی پڑا تھا جس پر محلے کے لوگ اکثر دیر تک بیٹھ کر دھڑکھڑا کر ہانکا کرتے تھے۔ سردار خود بازار کی طرف پیٹھ کئے دودھ کی کڑا ہی صاف کر رہا تھا۔

مہر کے قریب پہنچ کر ایلی شاہ ولی کی خانقاہ کی چار دیواری کے سائے میں چلنے لگا تاکہ مسجد سے آتا ہوا کوئی بزرگ اسے نہ دیکھے۔ چوگان دیران پڑا تھا جس کے اوپر محلے کی کھڑکیاں یوں ٹھنڈی رہی تھیں جیسے قبرستان میں یہاں وہاں دیئے جل رہے ہوں۔ ایک ساعت کے لئے وہ وہاں رکا اور پھر ایک ہی جست میں چوگان کو پار کر کے چھٹی گلی میں جا گھسا۔ اتنی رات گئے فرحت کے گھر کی اندھیری دیواروں سے گزرتا تو ممکن نہ تھا کیونکہ وہ دروازہ تو گھر والے سر شام ہی بند کر لیا کرتے تھے۔ شہزاد کی طرف سے جاتے ہوئے وہ گھبراتا تھا کیونکہ شہزاد کے چوہارے کی ٹہلی منزلیں میں سیدہ رہتی تھی اور سیدہ کے سامنے اوپر جانا، یہ اسے گوارا نہ تھا۔ سیدہ کیا کہے گی۔ منہ سے نہ بھی کہے تو دل میں کہے گی۔ اللہ کرے سیدہ کا دروازہ کھلا ہو تاکہ اسے کھٹکھٹانا نہ پڑے۔ دروازہ کھلا دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر چند ایک ساعت کے لئے ٹہلی منزل کا جائزہ لینے کے بعد وہ سائے کی طرح لپک کر اوپر کے زینے میں جا پہنچا۔ آہستہ آہستہ اس نے وہ بیڑیاں نہ جانے کتنی دیر میں طے کیں تاکہ سیدہ یا شہزاد کو پاؤں کو چاپ سٹائی نہ دے۔

بیڑیوں میں چھپ کر اس نے ایک نگاہ شہزاد کے چوہارے پر ڈالی۔ چوہارے کے دروازے کے عین درمیان میں ایک چوکی پر سلائی مشین رکھے وہ کچھ سینے میں مصروف تھی۔ شانے جگے ہوئے تھے۔ سیاہ تاروں والا دوپٹہ ایک شان بے نیازی سے اس کے کندھوں پر لٹک رہا تھا۔ سیاہ دوپٹے میں اس کا سفید چہرہ کسی انجمنی مسرت سے چمک رہا تھا۔ سیاہ سرگئیں آنکھیں وہ آڑی ترچھی قدیلوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اور ماتھے کے عین درمیان میں سیاہ تلک آویزاں تھا۔ آدمی آستینوں والے بھرے بھرے بازو مشین پر لٹک رہے تھے۔

شہزاد کو دیکھ کر اس کا دل خوشی سے دھک سے رہ گیا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ سنگ مرمر کا مجسمہ ہو۔ جیتا جاگتا مجسمہ۔ وہ ایک پستانا تھی۔ سندر پستانا۔ ایسا پستانا جس کی تعبیر کے متعلق اسے خود بھی علم نہ تھا۔

آہستہ آہستہ وہ شہزاد کی طرف بڑھا اور چپکے سے آنکھ بچا کر اس کے پہلو میں جا بیٹھا اور پھر اس کے ہلکتے ہوئے بازو کو گرفت میں لے کر دیوانہ وار چومنے لگا۔

شہزاد اسے دیکھ کر ڈر گئی۔

”ہائے تم ہو۔“ وہ چلائی۔ ”تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔“

ایلی نے اپنا منہ اس کے گورے ہاتھوں میں گاڑ دیا۔



”یہ کیا حالت ہے۔“ وہ اسے گھورنے لگی لیکن اس کی شیریں آواز میں مسکراہٹ واضح جھلک تھی۔ جیسے تیوری محض دکھلاوا ہو۔

”یہ کیا پگلا پن ہے۔“ شہزاد نے اسے گھورا۔

”ہے پھر۔“ وہ بولا۔ ”کرلو جو کرنا ہے۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”اب پاگلوں سے کون لڑے۔“

”لو کرو دیکھ لو۔ اگر ہمت ہے تو۔“ ایلی نے کہا۔

”اونسوں۔“ شہزاد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا: ”چپ وہ۔۔۔“

”کون ہے۔“ ایلی گھبرا اٹھا۔ ”کون ہے؟“

”جانو۔“ وہ زیر لب بولی اور اس نے صحن کے پرلے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ ایلی کے لئے ہے۔“

ایلی کی تمام تر مسرت مفقود ہو گئی اور وہ چپ چاپ یوں بیٹھ گیا جیسے اسے شہزاد کی آنکھوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔

”آخر آہی گئے تم۔“ شہزاد زیر لب بولی۔

”آٹا ہی پڑا۔“ ایلی نے کہا۔

”اور جو اتنی دیر وہاں ٹھہرے رہے۔ امتحان کے بعد وہ۔۔۔“ شہزاد مسکرائی۔

”تم نے جو کہا تھا۔ میں شکایت کر دوں گی۔ یاد ہے کہا تھا ناں۔“ ایلی ہنسنا۔

شہزاد نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

”جھوٹ کہا تھا کیا۔“ وہ آنکھیں چپکا کر بولی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے ردو دو شمعیں روشن ہو گئی ہوں۔

وہ نگاہ اس کے لئے ایک نئی چیز تھی جس میں چمک کے علاوہ عجیب سی گرمی تھی جس نے زیر اثر اس کے خون میں حدت پیدا ہو جاتی تھی۔ کنپٹیاں تھرکنے لگتیں۔ آنکھوں میں غبار آتا اور پلکیں بوجھل ہو کر جھک جاتیں۔ اس ایک نگاہ سے ایلی نے محسوس کیا جیسے گرد و غبار ایک سنہرے دھندلکے نے لپیٹ میں لے لیا ہو۔ جیسے تمام کائنات منور ہو گئی ہو۔ جیسے زندگی ایک نیا روپ دھار لیا ہو۔ وہ اس ایک بے پایاں نگاہ کے نئے میں سرشار نہ جانے کب تک

رہا۔ حتیٰ کہ جانو ہاتھ میں لوٹا لئے باہر نکلی اور اسے دیکھ کر چلائی۔

”ایلی ہے۔“ کب آیا ہے۔ کیا سکول چھوڑ دیا یا دیسے ہی چھٹی پر آیا ہے۔ اے ہے بوتا نہیں۔“ وہ بچے بھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔

”ہوتا تو ہوں۔ کیا کہتی ہے تو۔“ ایلی نے کہا۔

”کہیں بوتا ہے تو جیسے مدھک پٹی رکھی ہو۔ آنکھیں تو دیکھ اپنی۔“ جانو نے ہنس کر کہا۔

ایلی کو بات ٹالنے کی ترکیب نہ سوجھی، بولا: ”تجھے دیکھ کر نہ جانے کیا ہو گیا ہے آنکھوں کو۔“

کسی کی جرات ہے کہ میری طرف دیکھے۔“ وہ غرائی۔ ”دیدے نہ پھوڑ دوں۔ آج تک تو جرات نہ ہوئی کسی کو میری طرف دیکھنے کی۔“

شہزاد کی آنکھوں میں پھوار پڑنے لگی۔ وہ ہنستے ہوئے بولی: ”یہ تو دیکھ رہا ہے روک لے۔ اسے درنہ سرچڑھ جائے گا۔ بات بڑھ جائے گی۔“

”ہوں۔“ وہ نفرت سے بولی۔ ”یہ کیا سرچڑھے گا۔“

”ناک نہ چڑھا جانو۔“ ایلی قہقہہ مار کر بولا: ”پہلے ہی تیری ناک تلواری طرح تیز ہے۔“

”لے کر لے بات۔“ شہزاد نے پھر وہی نگاہ ایلی پر ڈالی۔

”دفع کر ان آجکل کے چھو کروں کو۔ جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کمرے کے پرلے کونے کی طرف چل پڑی اور بڑبڑاتی ہوئی کلام میں مصروف ہو گئی۔

شہزاد نے پھر وہ نگاہ ایلی پر ڈالی۔ اس کی آنکھیں چمکیں۔ ہونٹوں میں نہ جانے کیسی غریبی جھلک پیدا ہوئی اور پیشانی کا تنک و نعتا منور ہو گیا۔ ایلی کے دل میں نہ جانے کیا ہونے لگا۔ اس کے جسم سے پھلپھری کی طرح انگارے نکلنے لگے۔

ایلی کا سر شانوں پر بھن بھن کر رہا تھا۔ شہزاد یوں اٹھناک سے سوئی میں آگاہ پروری تھی جیسے احساس ہی نہ ہو کہ پاس کون بیٹھا ہے۔ ایلی کی نگاہوں تلے شہزاد کے سر کے گرد ایک سنہری ہلہنگ رہا تھا۔ دور جانو نہ جانے کیا بڑا بداری تھی۔

اس روز ایلی کو اپنی گزشتہ زندگی ایک دھندلا خواب محسوس ہونے لگی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ از سر نو پیدا ہوا ہو۔ شہزاد کے بطن سے پیدا ہوا ہو اور ایک نئی زندگی سے نوازا گیا ہو۔ جیسے اس نے زندگی کا پہلا موڑ طے کر لیا ہو اور اس کے طے کرتے ہی زندگی کی شکل کلیتہً بدل

”نہ مجھے نہیں اچھا لگتا یہ مذاق۔“ جانو بولی۔  
 ”تجھ سے نہ کرے تو کس سے کرے مذاق۔“ شہزاد نے کہا۔  
 ”کیوں۔ کیا میں بن سے کرے گا مذاق۔ سچ ہے آخر بیٹا کس کا ہے۔ علی احمد کا ہی ہے نا“  
 ”کیوں۔“ وہ چمک کر بولا۔ ”علی احمد نے کیا کیا تھا مذاق۔“  
 جانو کلیاں دینے لگی۔

”شرم نہیں آتی جو منہ میں آیا بک دیا۔“  
 ”تو پلادے اسے چائے تو خاموش ہو جائے گا۔“ شہزاد نے ویسے ہی بے پرواہی سے کہا۔  
 اور جانو چائے پانے لگی۔

جانو عرصہ دراز سے آصفی محلے میں مقیم تھی۔ وہ آصفی نہ تھی بلکہ ان لوگوں میں سے تھی جو باہر سے آکر محلے میں رہنے لگے تھے۔ جانو کا خاوند عرصہ دراز سے فوت ہو چکا تھا۔ اور اب دونوں بیٹی کا گزارہ محلے والوں کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے پر تھا کیونکہ اس کے علاوہ ان کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ کام کاج نہ بھی ہوتا تو بھی محلے والے جانو کو کچھ نہ کچھ دیتے رہتے۔

جانو کا رنگ کھلا کھلا تھا۔ نقوش ستواں تھے۔ اسے دیکھ کر خیال آتا تھا کہ جوانی کے دنوں میں بے حد حسین ہو گی۔ اگرچہ اب اس کے حسین نقوش پر ضبط کی کرختگی کی مر لگی ہوئی تھی۔ محلے والے جانو کی بے حد عزت کرتے تھے کیونکہ نوجوانی میں بیوہ ہو جانے کے باوجود اس نے اپنی تمام زندگی پاکبازی میں گزاری تھی۔ محلے میں کسی شخص نے کبھی اس پر انگلی نہ اٹھائی تھی۔ محلے والے اس کی شرافت کا تذکرہ اکثر کیا کرتے تھے اور جانو اپنی اہمیت کا احساس اس پاک دامن سے اٹھ کرتی تھی اور اسی وجہ سے ہر کسی سے پاک دامن کا مطالبہ کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اس کی آواز میں کرختگی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے مزاج میں درشتی اور لاپرواہی تھی۔ محلے کے لوگ اس کی سخت مزاجی پر نکتہ چینی کرنے لگے تھے۔ حالانکہ یہ خصوصیات انہوں نے بذات خود اس میں پیدا کی تھیں۔ بلکہ یوں کہیں کہ انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار سے جانو پر عائد تہمت پر قائم کی جا چکی تھی۔ بہر حال جانو کو یہ احساس نہ تھا کہ لوگوں نے اس کے متعلق ایک رائے قائم کر کے دراصل اسے زندگی کے ایشیائی پہلوؤں سے محروم کر دیا ہے۔

ہونکہ جانو کی تہمت اہمیت ”دامن ترکن ہشیار باش“ پر مبنی تھی اس لئے وہ سمجھنے لگی تھی

گئی ہو۔ اتنی سی بات نے اس کی زندگی بدل دی تھی۔ صرف اتنی سی بات کہ اس نے دلوں ہوئے بازوؤں کو تھام لیا تھا اور نفرت سے بچنے کے لئے محبت کا ڈھونگ رکھ لیا تھا۔ زندگی پر قدر عجیب تھی اور وہ زندگی کا موڑ کس قدر حسین تھا۔

جانو

نہ جانے شہزاد کو کیا ہے۔ ایللی سوچنے لگا۔ نگاہ اٹھا کر دیکھتی ہے تو اس قدر قریب آجاتی ہے کہ نسوں میں تھرکتی محسوس ہوتی ہے۔ پہلو میں دھڑکتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ گرمی کی ہوا طرح بند بند میں ریختی ہے اور کبھی یوں دیکھتی ہے جیسے کوسوں دور ہو۔ جیسے اسے ایللی کے کا بھی شعور نہ ہو۔ احساس ہی نہ ہو کہ ان دونوں میں کوئی بندھن ہے۔

صرف نگاہ ہی نہیں اس کی خاموشی بھی ایسے ہی اثرات کی حامل تھی۔ کبھی وہ آنکھیں نہ کر کام میں لگ جاتی تو کبھی ایللی کو محسوس ہوتا جیسے وہ اس پر جھکی ہوئی ہو جیسے اس کے جسم کا گرمی اسے پکھلا رہی ہو۔ جیسے اس کا نرم و گداز جسم اس سے مس ہو رہا ہو۔ مگر کبھی جب آنکھیں جھکائے کام میں مصروف ہوتی تو گویا وہ برف کا ایک تودہ بن جاتی۔ اس کے انگ انگ سے بیگا نکیت کی لہریں نکلتیں اور ایللی کو منجھ کر دیتیں۔ اور وہ اضطراب اور گھبراہٹ سے ہل بدلنے لگتا۔ نہ جانے یہ خصوصیت صرف شہزاد میں ہے یا سبھی عورتوں میں ہوتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے وہ سوچنے لگا کیا سبھی عورتوں کے کئی ایک روپ ہوتے ہیں۔ کیا وہ سب آن میں رہ بن جاتی ہیں۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جب شہزاد سے قرب کا احساس حاصل ہوتا تھا کہ اس کے لئے سانس لینا بھی پر لذت ہو جاتا لیکن جب وہ بیگا نکیت کا روپ دھارتی تو ایللی کے دل میں از سر نو احساس کتری جاگ اٹھتا اور وہ دیوانہ وار اپنے آپ کو کوستا۔

”اب تو چائے پئے بغیر نہ جائے گا کیا؟“ جانو نے اس کے قریب آکر کہا۔

وہ چونکا۔

”تو ابھی تک یہیں ہے۔“ ایللی نے پوچھا۔

دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر جانو سر ہلانے لگی۔

”تو کیا چلی جاؤں۔ اچھی نہیں لگتی تجھے۔“

”نہیں نہیں۔ اچھی لگتی ہے تو۔“ ایللی نے پینتڑا بدلا۔ ”بہت اچھی لگتی ہے۔“

نے اور عرصہ دراز سے عملی طور پر شہزاد کے سامنے بھی سر جھکا چکے تھے۔

ان ملاقاتوں میں شہزاد کو اپنی ذات سے ہٹ کر سوچنے یا سمجھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے ہفتی محلے میں آجانے کے باوجود وہ محلے کے تقاضوں سے بے نیاز رہی۔ محلے والوں کو دیکھ کر اس نے کبھی دلیہ یا نگاہیں سنبھالنے کی کوشش نہ کی۔ بات کرنے سے پہلے کبھی نہ سوچا کہ سن کر وہ کیا کہیں گے اور غالباً اسی وجہ سے وہ محلے بھر کی محبوبہ بن چکی تھی۔

نوجوان حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے اور سردھنٹے۔ وہ محسوس کرتے کہ شہزاد میں وہ زندگی کو صحیح شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ دکھلاوے اور رسم سے آزاد بے پروا بلند دے نیاز۔

محلے کی لڑکیاں حیرت سے اس کی طرف دیکھتیں اور منہ میں انگلی ڈال کر رہ جاتیں۔ ابتدا میں تو محلے کی بوڑھیاں بھی اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ انہیں احساس ہونے لگا کہ جوانی کے قائم کردہ اصولوں پر نہ چلے وہ اچھی کیسے کھلائی جاسکتی ہے۔ اس کے باوجود شہزاد کی معصومیت اس کے اخلاق اور اس کی طبعی فیاضی کی وجہ سے انہیں شہزاد سے مل کر ان اصولوں کے باوجود خوشی محسوس ہوتی تھی۔ پھر جب وہ چلی جاتی تو ان کو غصہ آنا شروع ہو جاتا۔ — توبہ کتنی بے پروا لڑکی ہے — وہ محسوس کرتیں جیسے انہیں دھوکا دیا گیا ہو اور فریب سے خوش کر لیا گیا ہو۔ پھر ان کی زبانیں حرکت میں آ جاتیں اور دیر تک باتیں کرتی رہتیں۔ کسی نہ کسی ہمارے شہزاد کی بے پروائی اور جرات پر نکتہ چینی کرتیں۔

”توبہ۔ کیا زمانہ آیا ہے۔ اب تو کل کی چھو کریاں ہرنوں کی طرح قلائعیں بھرنے لگی ہیں۔ انکی ریل تھی اور یہ لوب اوپر چوبارے سے بول رہی ہے جیسے پاؤں تلے پیسے لگے ہوئے ہوں۔“

”اور بس اللہ ماری یہ سیڑھیاں جو ہیں۔ انہیں گھنٹوں پر ہاتھ رکھے بغیر چڑھنا بھی تو ممکن نہیں۔“

”میں تڑپ جاتی ہے جیسے پانی کا گلاس پی لیا۔“

”توبہ مل یہ تو بھلا سیڑھیاں ہیں۔ وہ تو نگاہوں پر چڑھی بیٹھی ہے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہے۔ ذرا نہیں سمجھتی۔“

”مگر زمانہ آیا ہے مل۔ پر شکر ہے اپنے محلے کو ہوا نہیں گئی۔“

”اللہ بچائے لڑکی۔ یہاں پھر بھی اللہ کا فضل ہے بس یہ باہر سے آنے والیاں ہی جل کو گندا

کہ وہ ”دامن تر کن ہشیار باش“ کی تلقین کرنے کے لئے دنیا میں بھیجی گئی ہے۔ اپنی زندگی کو سنوارنے کے بعد اب وہ دوسروں کی زندگی کو سنوارنا اپنا فرض سمجھتی تھی اور اس کے لئے ہر جوان لڑکی یا غیار حسینہ کو بات بات پر ہدایت کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اس کی طبیعت وجہ سے محلے کی بوڑھیاں اسے بہت اچھا سمجھتی تھیں اور محلے کی جوان عورتیں اس کی ہر بات پر محتاط ہو جاتی تھیں۔ اور ایسا برتاؤ اختیار کر لیتیں کہ وہ زیادہ دیر ان کے پاس نہ ٹھہرے۔ واضح اشارات کا جانو پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ان خصوصیات کو رکھ کر جن پر اس کی اہمیت کا تمام تر دارو مدار تھا۔

### مطمعون محبوبہ

شہزاد محلے کی فضا میں پل کر جوان نہ ہوئی تھی اس لئے وہ محلے کی رسومات اور آہل رو کی تفصیلات سے نہ تو واقف تھی اور نہ انہیں اہمیت دیتی تھی۔ وہ طبعاً ان تفصیلات سے بے نیاز تھی اور اپنی طبیعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی قائل تھی۔ شہزاد کو کبھی نہ سوچا کہ ماحول کا تقاضا کیا ہے۔ اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ لوگ کیا سمجھیں گے۔ کیا اندازہ لگائیں گے۔ لوگوں کی اہمیت کا شعور ہی نہ رکھتی تھی۔ رکھتی بھی کیسے اس کے اپنے میاں برائے ہم نام بلکہ طبعاً شریف واقع ہوئے تھے اور شریف خاندان سے کہتے ہیں جو بیوی کی ہر بات پر سر تسلیم خم کر دے۔

شہزاد نے سر تسلیم خم کرنے کا ایک انوکھا بہانہ ایجاد کر رکھا تھا۔ وہ ظاہر کرتا تھا کہ حقیقی میں ڈوب کر اسے کسی بات میں دلچسپی نہیں رہی۔ اسے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ لڑکی باتوں پر غور کر سکے۔ اگرچہ شہزاد کا حسن دیکھ کر اس کی آنکھ میں چمک لہراتی تھی اور ہونٹوں پر لعاب ٹپکنے لگتا تھا لیکن وہ تو قطعی طور پر اور بات تھی۔ دلچسپی کے اس فقدان کے علاوہ شہزاد شخصیت میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو شہزاد کے دل میں اس کی عظمت کا احساس پیدا کرے۔ شہزاد کی خوشنودی کے لئے ذاتی محسوسات کے چکر سے نکلنے پر مجبور کرتی یا شہزاد کو بے اہم کرتی۔ وہ تو شہزاد کی آمد سے پہلے جیتے جا چکے تھے اور اس حد تک جیتے جا چکے تھے کہ شہزاد کو شہزادیت کی کوئی شش سراسر بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ اگرچہ بظاہر وہ یہ ظاہر کیا کرتے تھے کہ ان کے عادی ہو چکے ہیں مگر وہ محض ایک دل بسلاوہ تھا۔ درحقیقت وہ طبعاً سر جھکا دینے والا

”ہے نہ اچھی لگتی ہیں نہ۔ وہ بھی کیا کہ آستینیں جو ہاتھوں پر لگتی رہیں۔ اچھا اب چائے بنا جا کر۔“

شنراؤ کے اس انداز کو پہلے پہل تو جانو سمجھ نہ سکی۔ شنراؤ کی باتیں سن کر اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جواب میں کیا کہے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ شنراؤ کے انداز سے مانوس ہوتی گئی اور اب ہی آپ بڑوانے میں وقت بسر کرنے لگی۔

ایلی جبران تھا کہ شنراؤ کی باتوں پر سبک پاکیوں نہیں ہوتی۔ اسے غصہ کیوں نہیں آتا۔ وہ بات بن کر کیوں ٹل دیتی ہے۔ پیشانی پر شکن تک نہیں آتا بلکہ بسا اوقات وہ اس کی بات سنتی ہی نہیں جیسے جانو جھک مار رہی ہو۔

### دکھایا مینا

چائے بنانے کے بعد جانو اپنا کھانا برتن میں ڈال کر گھر چلی گئی اور وہ دونوں اس دالان میں اکیلے رہ گئے۔ شنراؤ کے ساتھ اپنے آپ کو اکیلے پا کر ایلی کا دل دھڑکنے لگا لیکن اس کے باوجود شنراؤ خاموشی سے اپنے کام میں یوں لگی رہی جیسے اسے ایلی کے وجود کا علم ہی نہ ہو۔

”شنراؤ۔“ ہر دو منٹ بعد ایلی زیر لب اسے آواز دیتا۔ ”شنراؤ۔“

”ہوں۔“ وہ جھکی جھکی آنکھوں سے جواب دیتی۔ ”کہو۔ کیا کہتا ہے۔“ اس کی آواز میں

عجب سی بیگانگی ہوتی جیسے وہ شنراؤ ہی نہ ہو جس نے اس پر وہ نگاہ ڈالی تھی۔

”اوجھر دکھو ناں۔“ وہ منت سے کہتا۔

”کیا دیکھوں؟“ وہ بے نیازی سے جواب دیتی۔ ”کیا ہے دیکھنے کو یہاں؟“

”اچھو۔ ایلی چلاتا۔“ اتنی بے پرواہی۔

”کیا ہے؟“ کچھ دیر کے بعد شنراؤ نے سر اٹھایا اور اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ زمین میں گرا ہوا ایک پتھر ہو۔

”مناؤ ناکیا کہتا ہے۔“

ایلی نے جھپٹ کر اس کا بایاں بازو تھام لیا۔

”بس مکی کام تھا۔“ وہ خشک آواز سے بولی اور بائیں بازو کو اس کے حوالے کر کے یوں کام میں متھک ہو گئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ حتیٰ کہ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے ہاتھ میں کاٹھ کا

کرتی ہیں ہاں میں تو ج کھوں گی۔“

نہ جانے شنراؤ کو ان باتوں کا علم تھا یا نہیں لیکن اس کے برتاؤ سے کبھی ظاہر نہ ہوا تھا کہ عورتوں کو دیکھ کر وہ یوں کھل جاتی جیسے نو خیز کلی ہو۔ ان کی ہر ضرورت کو فرائض سے پہلے کرتی لیکن اس کے علاوہ اسے ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ صرف دو چار گھرانوں سے اس کا باہر جوں تھا اور وہ بھی محض سرسری۔ چوبارے کی کھڑکی میں کھڑی ہو کر وہ کوئل کی طرح چنچن کرتی۔

”کیوں چنچی۔ آج تو بہت مصروف نظر آتی ہو۔ کیا چچا امر ترسے آگئے۔“

چنچی منہ میں انگلی ڈال لیتی:

”ہائے اللہ۔ اس لڑکی نے کیا کہہ دیا۔ کوئی نے گا تو کیا کہے گا۔“ اس کے باوجود اس کا

حقیقت کا اظہار سن کر چنچی کے چہرے پر مسرت کی ایک روداد جاتی۔

محلے والیوں کے لئے شنراؤ کی باتیں انوکھی ہونے کی وجہ سے بے حد جاذب تھیں اور

جاذبیت کی وجہ سے وہ اس پر نکتہ چینی کرتی تھیں۔

جانو کے شنراؤ کے گھر میں آنے کو ایلی نے بہت برا مانا۔ جانو کی موجودگی کی وجہ سے اسے شنراؤ کے پاس بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ جانو کیا کہے گی۔ یہ یہاں کیوں بیٹھ رہتا ہے۔ اپنے گھر پر نہیں جاتا۔ اور پھر جانو تو منہ پر کہہ دینے سے بھی دریغ نہیں کرتی تھی۔ وہ تو براہ راست اس سے کہہ دے گی۔ اسے نہ لگایا کہ منہ در نہ لوگ کیا کہیں گے۔ اللہ رکھے اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ کیا بچہ ہے جو ہر وقت تجھ سے چپکا رہتا ہے، لیکن شنراؤ کو یہ بات سو جھی تک نہ تھی۔ شنراؤ کی بات کو اہمیت ہی نہ دیتی تھی جب وہ ایسے مسائل چھیڑ لیتی تو شنراؤ چپکے سے کسی کام میں مشغول ہو جاتی۔ غالباً اس نے کبھی جانو کی بات کو سنا ہی نہ تھا اگرچہ اس وقت وہ بے نیازی

ہاں کرتی رہتی۔

اوجھر جانو جب سے شنراؤ کے پاس آئی تھی اس کی یوں رکھوالی کرنے لگی تھی جیسے پتھر کی ایجنٹ ہو اور شنراؤ کو نظریہ سے بچانے کے لئے متعین کی گئی ہو۔ وہ شنراؤ کی آدمی اپنے

کو دیکھ کر ناک منہ چڑھاتی:

”اے ہے۔ یہ کیا تنگی باہیں لئے پھرتی ہو تم خواہ مخواہ اپنا گورا رنگ چمکاتے ہو۔“

آستینیں تو پوری ہونی چاہئیں جو باعزت عورتوں کو جیتی ہیں۔“

اس پر شنراؤ مسکرا کر کہتی:

بازو ہو۔ بے کار۔ بے جان

”یہ کیا حماقت ہے۔“ وہ بولی۔

”کیا حماقت؟“ ایللی نے پوچھا۔

”اور کیا حماقت نہیں تو۔“ شنزاد نے بازو کھینچ لیا۔ ”بیٹھ کر باتیں کرو۔“

”کیا بات کروں؟“ ایللی نے پوچھا۔

”کوئی بھی ہو۔“ شنزاد بولی۔

”اچھا۔“ ایللی کو سوچھی۔ ”تم اتنی پیاری کیوں ہو شنزاد؟“

”ہوں پھر۔ کرلو جو میرا کرنا ہے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”کاش۔۔۔ میں کچھ کر سکتا۔“ ایللی نے آہ بھری۔

”کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ بس!“ وہ ہنسنے لگی۔

”مجھے اکسا رہی ہو۔“ ایللی غصے میں بولا۔

”پیاریوں سے لڑا بھی کرتے ہو تم؟“ شنزاد نے پوچھا۔

”لڑائی مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ تمہیں نہیں لگتی کیا؟“

”کس سے لڑوں۔ کوئی ہو بھی لڑنے کے لئے۔“

”مجھ سے لڑو۔“

”تم سے کیا لڑنا۔“ شنزاد مسکرائی۔

”اس سے لڑتی ہو کیا؟“ ایللی نے پوچھا۔

”وہ۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ اس کی ہنسی میں تحقیر کی دھار تھی۔ ”اے آپیں بھرنے۔

فرصت بھی ہو۔ وہ کیا لڑنے لگا۔ اور آجکل تو وہ ابا جان کے پاس گیا ہوا ہے۔“

”کیوں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”اب تمہیں کیا بتاؤں۔“ وہ بولی۔ ”بکرے کی جان گئی پر کھانے والی کو مزہ نہ آیا۔“

”میں نہیں سمجھا۔“ وہ منت سے بولا۔

”وہ مسکرائے لگی: ”تم کیا سمجھو گے؟“

”آخر بات کیا ہے۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔“ ایللی نے محسوس کیا جیسے بات اس کی دلالت

متعلق ہو۔

”میں کیا بتاؤں۔ انہیں سے پوچھ لیتا کبھی۔“

”کس سے؟“

”ان سے یا سانوری سے۔“ شنزاد نے ایک خصوصی انداز سے کہا۔

”سانوری سے؟“

”ہاں ہاں اسی سے۔ اب کیا بھول گئے اسے۔ ان دنوں جب وہ اس کوٹھے پر شلا کرتی تھی اور تم لوہر چھت پر منہ پر کتاب رکھے پڑھنے کے بہانے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ مجھے کیا معلوم نہیں۔“

”شنزاد۔“ ایللی ندامت سے چلایا۔

”اس بے چاری کو کیا پتہ تھا۔ وہ تو تمہارے تھپڑ پر ہی مر مٹی۔“ شنزاد ہنسنے لگی۔ ”تمہاری دھن میں گا کر رویا کرتی تھی۔“

”رویہ کرتی تھی؟“ ایللی حیران ہو رہا تھا۔

”اپنی طرف سے تو وہ محبت لگا بیٹھی تھی تم سے۔ اسے کیا معلوم تھا کیسے لگائی جاتی ہے محبت نہ جانے کوئی بات پسند آگئی تھی اسے تمہاری۔ جب گھر والوں کو معلوم ہوا تو وہ سب اسے بھیڑنے لگے۔ اس وجہ سے وہ اور بھی ضد میں آگئی اور اس نے اماں سے صاف کہہ دیا میں ایللی سے شادی کروں گی۔“ شنزاد ہنسنے لگی۔ ”ان دنوں مجھے کیا خبر تھی کہ ایللی۔“ وہ با معنی انداز سے رک گئی۔ پھر اس نے با معنی نگاہ اس پر ڈالی۔ ”کیا پتہ تھا۔“ وہ ہنسنے لگی۔

ایللی نے شرم سے سر جھکا لیا۔ شنزاد ہنسنے لگی۔

”بے چاری نے بڑے بڑے طعنے سنے تمہارے لئے۔ سارے گھر والوں کی نگو بن کر رہ گئی۔ اماں تو اسے آنکھیں دکھاتی تھی۔ تمہارا نام سن کر اماں کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ نہ جانے کیوں جیسے تم سے کوئی بیر ہو۔“

”کیوں۔ میں نے تمہاری اماں کا بگاڑا تھا۔“ ایللی نے کہا۔

”جب تو نہیں بگاڑا تھا مگر اب تو۔۔۔۔۔۔“ اس نے ایک بار ایللی کو پھر اسی نگاہ سے دیکھا۔ لا روشن دیکھے اس کی طرف لپکے۔

”شنزاد۔“ اس کے بازو کا سہارا لینے کے لئے ایللی آگے بڑھا۔

”پھر بات اب تک پہنچ گئی۔“ شنزاد نے دلفراہ انداز بدلا۔ ”اور انہوں نے فوراً مشورہ کر کے

”نہیں نہیں۔“ وہ چلائی۔ ”میرا مطلب ہے۔“ اور پھر رک گئی۔  
 ”میں سمجھتا ہوں تمہارا مطلب۔“ وہ اٹھ بیٹھا اور فرحت کی طرف چل پڑا۔  
 ”ایلی۔“ شنزاد نے اسے آواز دے کر روکنا چاہا۔  
 مگر ایلی کے لئے واپس جانا ناممکن ہو چکا تھا۔

### اتنے قریب اتنے دور

اس رات وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے دل میں عجیب و غریب قسم کے شکوک اور  
 توہم بھڑوں کے چھتے کی طرح جھنجھٹا رہے تھے۔ سینہ سلگ رہا تھا۔ کلیجہ کوئی مسل رہا تھا۔ چاروں  
 طرف سے لہریں سی اٹھ رہی تھیں جو ہر ساعت مزید شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ کیا یہی  
 محبت ہے جس کے لئے وہ اس قدر بیتاب تھا۔ کیا یہی وہ محبت ہے جس کی شریف اسے تلقین کیا  
 کرتا تھا۔  
 ”محبت کرو ایلی محبت۔“ وہ اس کے رو برو کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ”محبت کرو ایلی چاہے کسی سے  
 کرو۔“

لیکن شریف کی اپنی کیفیت تو ایسی نہ تھی۔ وہ تو اس طرح کروٹیں نہیں بدلتا تھا۔ وہ تو بڑے  
 الطمین سے منہ میں حقے کی نلے لیے لینا چھت کو تکتا رہتا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مبہم  
 مسکراہٹ کھلا کرتی تھی۔ اور اس کی آنکھیں گویا ہر وقت نشے میں رہتی تھیں۔ — نہیں  
 نہیں یہ محبت نہیں۔ نہ جانے کیا ہے محبت۔ نہیں محبت تو ایک خمار ہوتی ہے۔ ایک نشہ، ایک  
 کیفیت!

دراصل اسے شنزاد کے برتاؤ کے متعلق کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کسی وقت تو وہ ایلی سے  
 اس قدر قریب آ جاتی کہ وہ محسوس کرتا جیسے دونوں ایک جان دو قالب ہوں۔ اس وقت اس کے  
 دل میں ایک سنسنی سی دوڑ جاتی اور وہ محسوس کرتا جیسے وہ فاتح ہو۔ جیسے اس نے دنیا کی بہترین  
 نعمت، بہترین لذت کو پایا ہو۔

لیکن جلد ہی منظر بدل جاتا اور دوسری ساعت میں شنزاد اس سے کوسوں دور چلی جاتی۔ جیسے  
 اس کے وجود سے ہی بے خبر ہو۔ جیسے جانتی ہی نہ ہو اور وہ دونوں ایک دوسرے سے قطعی طور  
 پر بیگنہ ہوں۔ اس بیگانگی کو وہ روح کی گہرائیوں میں شدت سے محسوس کرتا اور اس کا جی

سانوری کا رشتہ کر دیا۔ زبردستی۔“

”کس کے ساتھ۔“ ایلی نے پوچھا۔

”نہ جانے کون ہیں۔ کہتے ہیں کوئی ایس ڈی او کا لڑکا ہے مگر مجھے تو نہیں دکھائی دے رہی۔  
 تمہارے شریف صاحب نے بھی ابا کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ اب وہ بے چاری اپنی قسمت  
 رہی ہے وہاں۔“

”میں تم سے کیا مذاق کروں گی۔“ وہ بولی۔ ”مذاق تو اس بے چاری کا اڑ گیا جو تم سے مذاق  
 کی بات بھی نہ کہہ سکی۔ بے چاری نے کئی ایک بار خط بھی لکھا تھا مگر تمہارا پتہ معلوم نہ تھا۔  
 وہ ڈرتی تھی کہ کسی اور کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ پھر جب اس نے سنا کہ تم اس امر تروال لڑکی  
 کے لئے پاگل ہو رہے ہو تو دل ٹوٹ گیا۔ میرے پاس رویا کرتی تھی۔“  
 ”شنزاد“ ایلی نے اپنا سر اس کے بازوؤں پر رکھ دیا۔

”اور آج تم میرے بازو سے لپٹے ہو۔“ وہ تقبہ مار کر ہنسی۔ ایلی نے محسوس کیا ہے  
 تقبہ اسے چھری کی طرح چیرتا جا رہا ہو۔

”مجھے تم سے محبت ہے شنزاد۔“ وہ گڑ گڑا کر بولا۔

”تو پھر میں کیا کروں؟“ وہ فحشا، شنزاد کا انداز بدل گیا۔

”تمہیں میرا کوئی خیال نہیں کیا۔“ اس نے پوچھا۔

”مجھے کسی کا بھی خیال نہیں۔“ وہ بولی۔

”تمہیں شریف کا خیال ہے ناں۔ میں جانتا ہوں۔“ ایلی کی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی  
 تھیں۔ کپٹیاں تھرک رہی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی اس کا کلیجہ چاٹ رہا ہو۔  
 ”تمہیں شریف سے محبت ہے نا؟“

”یونہی سمجھ لو۔“ ایلی چلائی۔ ”میں بے وقوف ہوں بے وقوف۔“

”سیانے بھی ہوتے تو کیا فرق پڑ جاتا۔“ شنزاد بولی۔

”سیانا ہوتا تو تمہارے لئے یوں پاگل نہ ہوتا۔“ ایلی نے کہا۔

”سچ ایلی۔ ایک بات پوچھوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”تمہیں مجھ سے محبت جتنی ہے؟“  
 ”سو جی؟“

”تمہارا مطلب ہے میں فریب کر رہا ہوں۔“ ایلی نے بناوٹی غصے سے کہا۔

اس پر فرحت چلائی:

”لے تو ایللی کو انگلی سے پکڑ کر لے چلی تا۔“ اس کی بات میں دھار ہوتی تھی۔ مگر شزاو گویا ہنسی بن جاتی تھی جیسے سناہی نہ ہو۔ ”اپنی خیر منا۔“ وہ چلائی۔ ”کسی روز تجھے

انگلی سے پکڑ کر لے جاؤں۔“

”بیٹھے کون انگلی پکڑ کر لے جاتا ہے جی۔“ فرحت زیر لب کہتی۔

”تم تو آنکھیں دکھاتی ہو ورنہ لے ہی چلوں کبھی۔“ شزاو ہنستی۔

اور بات ہنسی میں ٹل جاتی۔

پھر باجرہ مظلوم انداز میں شزاو کے چوہارے کی چوکھٹ پر آکھڑی ہوتی:

”کب آئے گا تو ایللی؟“

”نہیں دیے پوچھ رہی تھی۔ جلدی آ جانا ایللی۔ فرحت کھانے پر انتظار کرتی رہتی ہے۔“

”ٹھیک تو ہے۔“ شزاو ہنس کر کہتی۔ ”میل قحط پڑا ہوا ہے۔ کھانے کو تو صرف دیہں ملتا

ہے فرحت کے ہاں۔“

اور وہ دونوں دو بچوں کی طرح بیٹھ کر گپیں مارتے اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

اور جانو انہیں دیکھ کر باورچی خانے کے برتنوں کو گھورتی اور آخر زیر لب کہتی۔ ”لو بیٹھو

گے بھی چھو منو۔ یوں بھاگے دوڑے پھرتے ہیں جیسے میلے پر آئے ہوئے ہوں۔ میں کہتی ہوں

لوگ دیکھ کر کیا کہتے ہوتے۔“

”جو ان کے جی چاہے وہ کہیں۔ جو ہمارا جی چاہے گا ہم کریں گے۔“ شزاو ایللی کی طرف

دیکھ کر ڈالتی اور ایللی محسوس کرتا جیسے اس ایک نگاہ کے سہارے وہ ساری دنیا کے خلاف یدھ

کرنے کے لئے تیار تھا۔ جانے اس نگاہ میں کیا تھا۔ اسے دیکھ کر ایللی کو سبھی کچھ بھول جاتا تھا۔

اسے رات بھر کی گریہ و زاری بالکل ہی بھول جاتی۔ اس کے ذہن میں کوئی سوالیہ نشان نہ رہتا

اور وہ بھٹاکہ زندگی واقعی قابل زہمت ہے۔

جانو شزاو کا جواب سن کر بظاہر چپ ہو جاتی مگر وہ شکایت دن بھر اس کے انداز میں گویا بوند

نمذرتی رہتی۔ اس کی چال سے، اس کے سر ہلانے کے انداز سے، اس کے ہونٹوں کے خم

سے اس کی ہر بات سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ ایسی باتوں کو اچھا نہیں جانتی مگر وہ دونوں جانو کے

اس اظہار سے بے نیاز بیٹھ کر چائے پیتے اور گپیں ہانکتے اور بھانے بھانے ایک دوسرے کو دق

چاہتا کہ کسی کے گلے لگ کر رو دے۔ چنچیں مار مار کر رو دے اور پھر کوئی آتا نہ پکڑ کر نکال دے۔  
کونے کونے میں بے وفائی کے گیت گاتا پھرے۔

اسے خیال آتا کہ شزاو کا محبت کا روپ محض ایک دکھلاوا ہے۔ ٹھیک تو ہے۔

آخر شزاو کو کیا پڑی ہے کہ ایک بد صورت بے ڈھنگے چھو کرے سے محبت کرے۔ کوئی غلطی

لڑکی ہوتی تو بھی بات قابل قبول ہوتی۔ لیکن شزاو — وہ تو جس کو چاہتی اپنے روزگار

تھی۔ شاید اس کا مقصد صرف لوگوں کے سر جھکانے کے علاوہ کچھ نہ ہو۔ لوگوں کو خیر کر

کے علاوہ کوئی مقصد نہ ہو۔ اس خیال پر ایللی کے تصور میں شزاو کرشن بیگلوں کی طرح مٹا

ایک انداز سے کھڑی ہو جاتی اور اس کے گرد سینکڑوں سر جھکے دکھائی دیتے۔ اور پھر ایللی

دیکھے سروں کو پہچاننے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا۔ یہ خوش نصیب کون ہے۔ وہ کون۔

اس کے دل میں وہم اٹھتے اور وہ سوچنے لگتا شاید رفتی وہ خوش نصیب ہو۔ جیسی تو شزاو

دیکھ کر مسکرایا کرتی ہے اور گھنٹوں کسی کونے میں، بیڑھیوں پر، منڈیر یا جنگلے پر اس کے ملنے

کھڑی رہا کرتی ہے۔ مگر کسی وجہ سے اسے یقین نہ پڑتا کہ رفتی شزاو کے لئے جاذب توجہ ہو

ہے۔ اس کی جب کے ر — شمس رومال، پریم شاستر اور سینٹ کی شیشی اور اس کی آنگھول

پڑتی ہوئی بنگشی پھوار کے باوجود جاذب توجہ ہو سکتا ہے۔ رفتی میں تھا ہی کیا — نہیں

تو پھر؟ — ایک سوالیہ نشان اس کے روبرو آکھڑا ہوتا۔ پھر وہ نشان شریف کی

اختیار کر لیتا۔ ضرور اسے شریف سے محبت ہے جیسی تو اس پر مینڈک پھینکا گیا تھا۔ جیسی تو اس

آمد پر شزاو کی چال تک بدل جاتی ہے اور وہ بیڑھیاں اتر کر چھم سے رک جاتی ہے:

”ایللی وہ بیٹھے چائے پر انتظار کر رہے ہیں۔“

اس پر ایللی احساس رقابت سے لوٹنے لگتا اور اس کے سینے میں ایک جلن سی ہونے لگتی

رات بھر وہ اسی طرح دیوانہ وار کروٹیں بدلتا رہا اور پھر صبح کے قریب تھک کر سو گیا

جب وہ چائے پی رہا ہوتا تو بیڑھیوں میں — چھم کی آواز سنائی دیتی اور شزاو قہقہے

ہوئی اس کے روبرو آکھڑی ہوتی اور مسکرا کر کہتی:

”وہاں کب سے چائے بنی ہوئی ہے اور ایللی تم یہاں بیٹھے ہو۔ آؤ تا۔“

یہ کہہ کر وہ مسکرا کر وہی نگاہ اس پر ڈالتی اور وہ اپنے تمام وہم اور عزم بھول کر پوچھ

طرح اس کے پیچھے چل پڑتا۔



شعوری طور پر کوئی آرزو نہ تھی۔

ایلی کو کسی مخصوص جسمانی قرب کا خیال نہ تھا بلکہ اسے اس قرب سے ڈر لگتا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اس قابل نہیں کہ شہزاد کے ساتھ وہ قرب حاصل کر سکے۔ اسے اپنے آپ پر بھروسہ نہ تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس قربت کی نوبت آگئی تو وہ بری طرح سے ناکام رہے گا۔ اور پھر شہزاد کیا کہے گی۔ اس کے علاوہ ویسے بھی اسے ایسے قرب سے نفرت تھی۔ اس کے خیال میں ایسا قرب محبت کے جذبہ کے لئے باعث ننگ تھا۔ محبت کی توہین تھا۔ پھر شہزاد سی پاکیزہ دیوی ہے۔ نہیں نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس خیال پر ہی اسے وحشت ہوتی تھی۔

میں چائے پی کر وہ دیر تک شہزاد کے پاس بیٹھا رہتا تھا کہ مظلوم صورت بتائے ہوئے ہاجرہ نمودار ہوتی:

”اے ہے فرحت کب سے انتظار کر رہی ہے کہ کھانا کھا لو۔“

”میں ابھی آیا۔“ کہہ کر وہ ماں کو ٹال دیتا۔

اس پر جانو بڑبڑانے لگتی:

”توبہ کیا زمانہ آیا ہے اولاد کے دل میں ماں کا لحاظ نہیں رہا۔“

آج ایک گھنٹے کے بعد ہاجرہ پھر آ جاتی۔ حتیٰ کہ وہ مجبور ہو کے اٹھ بیٹھتا اور بادل غواشتہ ماں کے پیچھے پیچھے چل پڑتا۔

جب ایلی کھانا کھا رہا ہوتا تو بیڑھیوں میں وہی دھما چوکڑی کی آواز سنائی دیتی اور پھر جھم سے شہزاد ہاتھ میں سالن کی پلیٹ لئے مسکراتی ہوئی آ موجود ہوتی۔

”وہ کرلیے پکائے ہیں آج کہ کچھ لو تو طبیعت سنور جائے۔“ وہ چلائی۔

”کیوں نہ ہو جی ان ہاتھوں میں جادو ہے۔“ فرحت طعنہ دیتی۔

”لوگوں کی تو ویسے ہی طبیعت سنور جاتی ہے۔“ ہاجرہ فرحت کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”کیوں نہ سنورے جی۔“ شہزادیوں قہقہہ مار کر ہنستی جیسے اسے طنز کا احساس ہی نہ ہو پھر شہزاد بیڑھیوں میں ایلی کے پاس پہنچتی اور پھر چوری چوری وہی مسکراہٹ چھلکا کر زیر لب کہتی۔

”پھر یا آواز بلند چلائی:“ لے کھا کر دیکھ اپنی انگلیاں نہ چاٹ لیں اس وقت چپکے سے شہزاد کا جتنی ہاتھ ایلی کے پلو سے نکل کر اس کا گلہ سلاتا اور ایلی کی

کرتے۔ پھر جو نئی جانو کسی کام کے لئے چوبارے سے نیچے اتر جاتی تو دفترا“ ان کی لادہ باتیں ختم ہو جاتیں۔ ایلی شہزاد کی طرف یوں دیکھنے لگتا جیسے بچہ ہو۔ اور اس کے سامنے مٹھائی کی ایک تھالی۔ اس کی بدلتی ہوئی نگاہ دیکھ کر شہزاد دفترا“ سنجیدہ ہو جاتی اور پھر کی ہر مصروف ہو جاتی اور یوں ایلی کے وجود سے بے نیاز ہو جاتی جیسے اس سے کوئی واسطہ نہ ہو دیکھ کر ایلی کے دل میں غصے کا ایک طوفان کھولتا اور وہ پاگلوں کی طرح شہزاد کی طرف ہنسنے لگتا۔

”خدا کے واسطے۔“ وہ زیر لب سنجیدگی سے کہتی۔ ”جانو آ جائے گی۔“

”نہیں نہیں۔“ ایلی چلاتا۔ ”وہ تو ابھی گئی ہے۔“

”کوئی اور آ جائے گا۔ ہوش کرو۔“ شہزاد اسے گھورتی۔

”اور تم تو کہتی تھیں۔ ایلی کیا لوگوں سے ڈرتے ہو۔ یاد ہے؟“ ایلی کہتا۔

”تم سمجھتے تو ہو نہیں۔“ شہزاد کی آواز میں درشتی پیدا ہو جاتی۔

اس پر ایلی کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا۔ وہ گہرے فکر میں پڑ جاتا اور ایک سوالیہ نشان کے سامنے ابھرنے لگتا۔

اس طرح تھکنے میں وہ دونوں بیگانہ وار ایک دوسرے کے روہرو بیٹھے رہتے۔ شہزاد جانے کو نئے افق میں کھوئی رہتی اور ایلی اس کی طرف پاگلوں کی طرح ٹٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا۔

اس کا بازو تھام لیتا اور وہ اسے یوں اس کے حوالے کر دیتی جیسے بچے کو ہلانے کے لئے بلکہ کھلوتا ہو اور خود بے نیاز ہو جاتی جیسے وہ بازو اس کا اپنا نہ ہو۔ کچھ دیر تک تو وہ اس بے جان سے کھیلتا رہتا۔ پھر اسے احساس ہونے لگتا کہ اس بازو سے شہزاد کا دور کا واسطہ نہیں۔ بچل

ایک اضطراب گھیر لیتا اور وہ شہزاد کے قریب بیٹھ کر محروم محسوس کرتا اور محرومیت کی وجہ سے

قرب کی بنا پر کروٹیں بدلتا اور کڑھ کڑھ کر اپنی جان ہلکان کر لیتا حتیٰ کہ کوئی آ جاتا اور شہزاد کی چاپ سنتے ہی اس سے اپنا بازو چھڑا کر دور ہو بیٹھتی اور پھر ہنس ہنس کر باتیں کرتی۔ اس کی

طرف خاص انداز سے دیکھتی۔ وہی انداز۔ اس طرح وہ تھائی میں قرب کے باوجود ایک دوسرے سے دور رہتے اور محفل میں دور ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے۔

ایلی کی صرف ایک خواہش تھی کہ وہ شہزاد کے قریب تر ہو جائے اور قریب اور قریب۔ شہزاد اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ وہی مسکراہٹ۔ باہمی سازش کی مسکراہٹ۔ اور تھائی میں

بھی وہ اس کے اس قدر قریب ہو جاتی کہ دونوں میں ذرا فرق نہ رہے۔ اس کے علاوہ

علی پور تو ایسی جگہ تھی جہاں سیاہ ناک شہابی اینٹیں آنکھیں موند کر سب کچھ دیکھتی رہتیں۔ اور بھرات کے پردے میں بڑھا چڑھا کر ایک دوسری سے سب کچھ کہہ دیتیں۔ انیوں کی بات دروازے چاؤں چاؤں کر کے دہراتے جنہیں سن کر آوارہ کتے قہقہے لگاتے اور چنگاڑیں خوشی سے رقص کرتیں اور اندھیرے کوئے باہر نکل نکل کر چنگاڑوں کی کٹھاکلی دیکھتے۔ مسکرا کر پھر سے چپ جاتے۔ پھر جب سورج کی پہلی کرن محلے کے مکانات کو روشن کرنے کی ناکام کوشش میں معیوب ہوتی تو محلے والے وہی بات چھیڑ دیتے۔ دہلی دہلی زبان سے بات پھسل نکلتی۔ انگلیاں ڈولائی انداز سے ابھر کر ہونٹوں پر ٹپک جاتیں۔

”ہائے اللہ۔ یہ بات ہے؟“

”توبہ کیا زمانہ آیا ہے۔“

”وہ تو میں پہلے ہی کہتی تھی ناں۔ کہتے ہیں ہونمار بڑا کے چکنے چکنے پات۔“

”ہرسن لو تم بہن یہ کاٹھ کی ہنڈیا چار دن چڑھے گی بس۔“

”ہرسن کہتی ہوں اسے شرم نہ آئی۔“

اگر ایلی اس راز کو اتنی اہمیت نہ دیتا تو شاید بات نہ بگڑتی۔ اور اگر بگڑتی بھی تو اس میں تعفن پیدا نہ ہوتا۔ اگر ایلی اس سلسلے میں محض ایک تفریح جانتا اور دیوی کی بجائے شہزاد کو محض ایک رنگین نگلی سمجھتا یا خوب صورت کھلونا سمجھ کر اس سے کھیلتا تو بات یوں گل حکمت ہو کر خطرناک ہو لے یہاں نہ کرتی لیکن ایلی کو پیدا انٹی طور پر یہ تعلیم دی گئی تھی کہ ایسے تفریحی تعلقات گناہ کے مترادف ہوتے ہیں۔ علی احمد کے کمرے کے خلاف اس نے جو بغض پال رکھا تھا اس کے اس خیال کو اور بھی مستحکم کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسے تعلقات یا ایسی خواہشات کو جائز بنانے کے لئے انہیں حقیقی عمل عشق و مروت ضروری ہوتا ہے اور حقیقی عشق میں لازم ہے کہ انسان اپنی شخصیت کو تباہ کر دے۔ زندگی کو ایک روگ بنالے۔ وصال کے تمام راستے اپنے ہاتھوں سے مسدود کر دے اور پھر عمر بھر

دکھ و دھن کا سارا لئے ایک لپاچ بنا رہے، اسی وجہ سے ایلی نے اس تفریحی تعلق کو جو اس کو اس شہم کو اس معمولی غرض کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔ ماحول سے اخذ کئے ہوئے اعتباروں کی وجہ سے ایک لاپرواہی اور تباہ کن الجھن میں بدل دیا۔ اور شہزاد کو دیوی بنا کر خود اسکے روبرو پیسوی بن کر بیٹھ گیا۔ اگر وہ شہزاد کو دیوی کی بجائے ایک جیتی جاگتی حسین عورت سمجھتا۔ مرد کی حیثیت سے اس کی آواز کرتا تو شاید شہزاد میں بھی دورخی پیدا نہ ہوتی اور اس کا قرب قرب ہوتا اور بعد، بعد مگر اب ان

آنکھوں تلے تارے ناچنے لگتے۔ وہ قہقہہ مار کر ہنستی: ”دیکھ لے فرحت ایک ہی لئے میں آنکھیں اٹل آئی ہیں ایلی کی۔“

فرحت زیر لب کہتی: ”نہ جانے کیا لقمہ دیا ہے تم نے۔“

”یہی تو ایک راز ہے۔“ شہزاد نظر بچا کر ایلی کے منہ پر ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی۔ ”یہ کیسے ہوتا ہے اچھا میں چلی۔“ اور وہ بھاگ کر بیڑھیوں میں غائب ہو جاتی۔

ایلی بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھا کر دیکھتا رہتا۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک چھوٹا سا گڑا کر اس کے منہ پر لگتا اور ایلی کی باچھیں کھل جاتیں اور وہ محسوس کرتا کہ زندگی کس قدر عجیب ہے۔ اس وقت اس کی نگاہ تلے سوالیہ کی بجائے استفہامیہ نشانات رقص کرتے۔

شہزاد کا وہ التفات بھرا لمس اس کے گال میں جذب ہو کر خون میں جالتا اور اس کی رگوں میں یوں لہرس لینے لگتا جیسے کسی ٹھہری ہوئی جھیل میں کسی نے پتھر پھینک دیا۔ ایلی کے لئے یہ لقمہ ٹکٹا مشکل ہو جاتا اور جلد ہی وہ کوئی ہمانہ بنا کر شہزاد کے چوہارے کی طرف چل پڑا۔ جب وہ بیڑھیاں چڑھنے لگتا تو فرحت کوئی طنز بھری بات کہہ دیتی یا جابرہ مظلومیت بھرے لہجے میں اسے ٹوکتی جس پر وہ غصے سے بھوت بن جاتا اور اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔

جونہی ایلی شہزاد کے چوہارے میں پہنچتا تو اس کی توقع کے خلاف وہاں کوئی اور ہی شہزاد ہوتی جیسے اس شہزاد سے دور کا کوئی واسطہ نہ ہو جو جھم سے زینے سے اتری تھی۔ اس وقت اس کے ہاتھ حنا ملیدہ ہونے کے باوجود بے جان ہوتے۔ اس کی آنکھیں دور نہ جانے کن مہاراجا کھوئی ہوتیں۔ وہ پتھر کے بھگوان کی طرح بیٹھی رہتی جیسے اسے ایلی کی آمد کا احساس تک نہ ہو۔ ایلی اس پتھر کے بھگوان کے روبرو بیٹھ کر نہ جانے کہاں کھو جاتا یا اس بے جان کھلونے سے کچھ جو شہزاد کے شانوں سے لٹکا کرتا تھا۔

## دورخی

ان دنوں ایلی سارا سارا دن گھر میں چھپا رہتا اور گھر میں بھی وہ کھڑکی میں کھڑے ہوتا۔ احتراز کرتا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ نہ جانے کیوں و غصا، اس کی زندگی میں پردہ واری کا عنصر پیدا گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی کو خبر نہ ہو کہ وہ علی پور آیا ہوا ہے۔ کوئی اس کا راز نہ لے لیکن علی پور میں کسی بات کو چھپے رہنا قطعی طور پر ناممکن تھا۔

ایلی نے نہ تھا اور گھر آواز دینے سے وہ ہچکچاتے تھے۔ اگر کوئی آکر آواز دیتا بھی تو ایلی خاموش ہو رہتا کہ وہ سمجھے گھر نہیں اور واپس چلے جائیں۔

ابن دنوں رشتہ اور جیل تو علی پور سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ارجمند کو لاہور کے قریب تارپین کے تیل کے کارخانے میں ملازمت مل گئی تھی۔ یوسف بھی وہاں نہیں تھا۔ لے وے کے رضا تھا۔ وہ لکڑی چیتا ہوا آہنچا اور معصوم سامنے بنا کر بچی نگاہوں سے شہزاد کی کھڑکیوں تلے کھڑا ہو کر آواز دیتا۔

”ایلی!“۔ ”ایلی!“۔

ایلی آواز سن کر خاموش ہو رہتا۔

جانو آگ گولہ ہو جاتی:

”سدا بدھ نہیں رہی کیا۔ سناٹی نہیں دیتا کوئی آواز دے رہا ہے۔“

ایلی مسکرا کر خاموش ہو رہتا اور شہزاد تو یوں اپنا کام میں منہمک دکھائی دیتی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ باوجود ایک منٹ کے لئے کبھی ایلی اور کبھی شہزاد کی طرف دیکھتی اور پھر بڑبڑاتی ہوئی کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی۔

”کون ہے؟“ جانو چلاتی۔

”ایلی ہے کیا؟“ رضا اوپر دیکھے بغیر چلاتا۔

”بیٹھا ہے۔“ جانو غصے میں چیختی۔

”اچھا۔“ رضا جان بوجھ کر سر ابراہن جاتا۔ ”جب وہ آئے تو دوکان پر بھیج دیتا۔“

جانو پھر سے یوں چلاتی جیسے رضا کی بجائے اڑوس پڑوس والوں کو سناری ہو۔

”میں کتنی ہوں بیس بیٹھا ہے بوتا نہیں۔“

”اچھا۔“ رضا چلتے ہوئے کہتا۔ ”جب وہ آئے تو دوکان پر بھیج دیتا۔“

جانو کا منہ غصے سے تپنے لگتا۔ ”عجب احمق ہے میں کچھ کہہ رہی ہوں اور وہ اپنی ہی کہے جاتا ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو جانو۔ مجھ سے کہہ رہی ہو کیا؟“ ایلی اسے ستانے کے لئے معصوم انداز میں کہتی۔

”گولب اسے بھی اٹھایا ہوش۔ کب سے چلا رہی تھی کہ رضا نیچے بلا رہا ہے۔ سنتے ہی نہیں۔ اور اب یہ مجھ سے پوچھ رہا ہے۔“

ابجھے حالات میں شہزاد بھی الجھ کر رہ گئی تھی جس کی وجہ سے ایلی ان سوالیہ نشانات سے واقف اور اس کی زندگی بے پناہ مسرت اور بے پایاں الم کے چکر میں پس کر رہ گئی۔

## وہ راز

ایلی نے اس راز کو اس قدر متبرک بنا دیا کہ محلے کی ٹانگ شامی اینٹیں جیٹرنگ کی طرح گیس دروازے آہ و زاری کرنے لگے کتے کسی آنے والی مصیبت کے مبہم احساس سے مضطرب چیخیں مارنے لگتے اور محلے والیوں کے کان کھڑے ہو گئے:

محلے والیاں ایلی کو دیکھ کر منہ میں انگلیاں ڈال لیتیں:

”ہائے ایلی تو کیا یہاں ہے۔ لو۔۔۔ اور میں سمجھ رہی تھی کہ لڑکا سکول میں پڑھتا ہے۔“

”لو ہمیں کیا معلوم کبھی دیکھا بھی ہو یا ہر چوگن میں۔ پہلے تو اللہ مارے ارجمند کے ساتھ لائین تلے کھڑا رہتا تھا اور اب گویا کسی نہ خانے میں چھپا رہتا ہے۔ کیا ہو گیا تری عقل کو۔“ کوئی کہتی:

”اے ہے لڑکے تو تواب شکل دکھانے سے بھی رہا۔ ایسا بھی کیا۔ نہ لڑکے اپنوں سے لڑے رہتا ہی اچھا ہوتا ہے۔“ کوئی مسکرا کر کہتی:

”اپنوں سے تو ملتا رہتا ہے لال۔ اپنے دی ہوتے ہیں ناں جسے کوئی سمجھے۔ ہم بوزیوں کیسے سمجھے۔ ماشاء اللہ اب جوان ہے۔ اب تو اس کی ماں کو چاہئے کہ شادی کر دے اس کی۔“

”نہ جانے باپ کی طرح کتنی عورتیں گھرائے گا۔“

”نہ بسن دعا کرو۔ اللہ ہدایت دے۔“

محلے والیاں تو پھر بھی بات اشارہ کرتی تھیں لیکن محلے کے لڑکے تو کھلے بندوں اس سے کہتے تھے:

”کیوں بھی۔ کیا پھر سے ماں کی گود میں پڑ گئے۔ اب تو دکھائی ہی نہیں دیتے۔ کونے بنے پھنسے ہو۔ اب تو اونچی ہواؤں میں اڑنے لگے ہوں۔“

وہ خود بھی انہیں ملنے سے کتراتا تھا۔ باہر تو وہ نکلتا ہی نہ تھا اس لئے اس کے بچوں کا

”اب شرما کر بھاگ کیوں رہے ہو؟“

”انہیں اتار دو ان پردوں کو ہٹا دو۔ ان رکاوٹوں کو دور کر دو اور خود میرے سامنے آرام کر لی پر بیٹھ جاؤ ورنہ میں ماروں گی اینٹ۔“

پہلے چار خطوں کا تو ایلی نے جواب بھی دیا تھا۔ اسے بار بار تاکید کی تھی کہ حالات تفصیل سے لکھے۔ ایلی کو آصف کے معاملے میں بہت دلچسپی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ایک بار اپنی آنکھوں سے اس عذر عاشق کو دیکھے جو لڑکی ہونے کے باوجود اس قدر بے باک اور دلیر تھی کہ اپنے بھائیوں، باپ اور دیگر وارثوں کے سامنے بھی اظہار محبت سے نہ گھبراتی تھی۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اسے بھی کوئی ایسا ساتھی مل جائے اور وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ پکڑے اتنی کی طرف چل پڑیں اور ایک دوسرے کے لئے تمام دنیا کو ٹھکرا دیں۔

پہلے تو اس کے دل میں شہزاد کے کہنے پر ”ایلی تم لوگوں کی پروا کرتے ہو؟“ بڑی بڑی

”لو——“ جانو چلانے لگتی اور خرافات بکنا شروع کر دیتی۔

پھر جب وہ تھک کر خاموش ہو جاتی تو شہزاد چپکے سے کہتی:

”کیا بات ہے جانو۔ آج تو خاموش کیوں ہے۔ بات ہی نہیں کرتی کوئی؟“

اس پر جانو کے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور وہ ہاتھ ہلا ہلا کر چلاتی۔ شہزادو آگم چار کی طرف دیکھ کر باہمی انداز سے مسکراتی۔ اس پر ایلے کے جسم میں خوشی کی رودڑ جاتی اور محسوس کرتا جیسے وہ دونوں بچے ہوں اور مل کر جانو کے خلاف سازش کر رہے ہوں۔

”مجھے کیوں ستا رہے ہو۔ اپنا سر کھٹاؤ۔ چاہے جو جی میں آئے کرو۔ مجھے کیا واسطہ ہے تمہارے ہی بھلے کی کستی ہوں کہ یوں سارا دن ایک جگہ بیٹھ رہتا اچھا نہیں۔ لوگ ایسے ہیں کہ بات کئے بغیر نہیں رہتے۔ چاہے کوئی کتنا ہی پاک پرہیزگار کیوں نہ ہو۔ لیکن تم سنئے۔ میری تو نہ سہی۔ مجھے کیا غرض۔“ جانو کبے جاتی۔

جب وہ ایک لبا چڑا لکچر ملا کر فارغ ہوتی تو شہزاد چکے سے بات ٹالنے کے لئے کہی:

”جانو! آج چائے نہیں پلاو گی کیا؟ تم بالکل ہی بھوکا مارو گی ہمیں — کیوں ایلا!

پو کے تا؟“

ایلی ہنس کر کہتا:

”لو چائے بھی نہ ملی تو میں پیاسا مر جاؤں گا۔“ اور شہزاد چھپ چھپ کر مسکرا اٹھا۔  
 کی مسکراہٹ کا راز اہلی کی روح میں ناچتا اور وہ چھپا کر رکھنے کی اور بھی شدت سے اُکرتا۔

ایسی باتیں کیسی باتیں

ایسی باتیں - سی باتیں

لیکن آصفی محلے کی سیاہ اینٹیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراہٹ بھینچ کر تھیں اور آصفی مکانات کے دروازے زیر لب چوں چوں کر کے مسکراتے ہوئے اور ان کے اندھیرے میں محلے کے کتے روتے، چمکڑاؤں چچیتیں اور ان تہ خانہ نمائندگان والیاں سر جوڑ کر باتیں کرتیں اور پھر انگلیاں ہونٹوں پر رکھ لیتیں۔

اہلی کے شب و روز میں اس کی علاوہ صرف ایک بات تھی۔ ہر روز یا ہر

بربادی اور تباہی کے اعلان کم ہوتے گئے۔ شاعری کا عنصر نہ رہا جس سے اس کے پہلے خط لبرز ہوتے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کے خطوط میں صبر اور ضبط کی جھلک واضح ہو گئی اور نفس مضمون میں اختصار پیدا ہوتا گیا اور آخر اہلی کو آصف کا وہ خط موصول ہوا جس میں صرف ایک جملہ لکھا تھا۔

”میں تادم تحریر زندہ ہوں۔“

اہلی نے وہ خط دیکھا۔ اسے بار بار پڑھا لیکن اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔ آخر تادم تحریر زندہ ہوں سے اس کا مقصد کیا تھا۔ یہ بات تو ایک حقیقت تھی۔ ایک ایسی حقیقت جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ انسان اپنے مستقبل کے متعلق کیسے جان سکتا ہے۔ وہ صرف حال کے متعلق ہی جانتا ہے اور حال کیا ہے۔ ایک ساعت، ایک مختصر ترین ساعت۔ اہلی نے لاشعوری طور پر ان باتوں کا جائزہ لیا۔

اس وقت شام کا وقت تھا۔ ایک اداس شام شہزاد کی موجودگی کے باوجود اداس، اس کی سیاہ آنکھوں میں چمکتی ہوئی شرارت کے باوجود اداس۔ وہ چپ چاپ شہزاد کے پاس جا بیٹھا۔

”شہزاد“ وہ بولا۔ ”یہ دیکھو تو؟“

”کیا ہے؟“ وہ بولی۔ ”کیا دیکھو تو؟“

”یہ خط میرے دوست کا ہے۔“ اہلی نے اسے خط دیتے ہوئے کہا۔

”عجب خط ہے۔“ وہ بولی۔ ”اس سے تو بہتر تھا اپنی تصویر ہی بھیج دیتا“ وہ ہنسنے لگی۔

”تم نہیں جانتیں۔“ اہلی نے کہا۔ ”اسے ایک لڑکی سے محبت ہے۔“

”اچھا۔“ وہ مسکرائی۔ ”محبت ہے — پھر؟“

”کس کوئی گزبوند ہو جائے۔“ اہلی نے کہا۔ ”کس وہ مرنے جائے۔“

”محبت میں مرجائے۔“ اس نے پوچھا۔ ”کیا لڑکی کو اس کی پروا نہیں۔“

”وہ جان دیتی ہے اس پر۔“ اہلی نے جواب دیا۔

”تو پھر اسے کیا پڑی ہے کہ جان دے۔“ شہزاد مسکراتے ہوئے بولی۔

”شاید۔“ اہلی سوچ رہا تھا۔

”واہ۔“ وہ ہنسی۔ ”محبت کرنے والے کبھی نہیں مرتے۔ وہ تو امر ہو جاتے ہیں۔“

”اچھا امر ہو جاتے ہیں کیا۔ تو مجھے بھی امر کر دو شہزاد۔“

امیدیں پیدا ہو گئی تھیں لیکن پھر جلد ہی وہ سب گارے کی دیواروں کی طرح دھڑام سے گر گئیں۔ اب بھی جب شہزاد اس پر وہ نگاہ ڈالتی یا جب وہ فرحت کی طرف آکر فرحت یا اہلی کسی طے کے جواب میں ظاہر کرتی جیسے لوگوں سے قطعی طور پر بے نیاز ہو۔ جب وہ لوگوں کی موجودگی کے باوجود آنکھ بچا کر اہلی کا گل سلا جاتی یا چلتے چلتے چپکے سے اسے چپکی بھر لیتا یا اہلی ہی باتوں میں آنکھ بچا کر اسے گھورتی یا زبان نکال کر اس کا منہ چراتی اس وقت اہلی کا سینہ ہلکا جاتا اور شانے ابھر آتے۔ وہ محسوس کرتا کہ وہ خوش قسمت شخص ہے جسے شہزاد کی سامتی ہر ہے مگر جو نہی وہ تنہائی میں شہزاد سے ملتا تو اس کی تمام امیدیں اور سرسبز خاک میں مل جاتیں۔

اہلی نے آصف کے دو ایک خطوں کے جواب بھیجے تھے بار بار مطالبہ کیا تھا کہ تفصیلات کر دیجیے۔ لیکن آصف میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ کاغذ پر دل کا راز لکھ بھیجتا۔ اس نے تو اپنی شخصیت کو یوں چھپا رکھا تھا کہ خود اسے جاننے سے محروم ہو چکا تھا۔ تفصیلات کی بجائے وہ اپنی اور بربادی کے راگ الاپتا رہا اور بار بار اہلی کو امر تر بلاتا رہا۔ ”خدا کے لئے ایک بار آکر لے بربادی سے بچالو۔“..... مگر اہلی کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ آصف سے ملے جاتا۔ وہ ڈنڈوں میں اپنا آپ کھو چکا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ شہزاد اس کے سامنے بیٹھی مشین چلاتی رہے اور وہ ان کی ڈولتی آنکھوں اور لٹکتے ہوئے بھرے اور گورے بازوؤں کو دیکھتا رہے۔ اس کے حجاب ہاتھوں کا شہر رہے۔ شہزاد چہم سے زینے سے اترے اور کہے:

”ایک۔“

”ایک لقمہ کھاؤ تو زندگی سنور جائے۔“

اس بات کا متنی تھا کہ شہزاد زبان نکال کر اہلی کا منہ چڑائے اور پھر سنجیدگی سے بولا:

کہے:

”جانو۔ تم آج بات ہی نہیں کرتیں۔ ناراض ہو کیا؟“

اگر اہلی کو احساس ہو جاتا کہ آصف شہر چھوڑ کر جانے کے علاوہ کچھ اور کرنے کی بھی بات

رکھتا ہے تو حالات یہ رخ اختیار نہ کرتے لیکن اہلی کو تو یقین تھا کہ آصف خطرے میں کوئی

سکتا چونکہ اس میں آگے قدم رکھنے کی جرأت نہیں۔ اہلی کو کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ

پیچھے ہٹا سکتا ہے جو خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ اگر اسے اس بات کا ذرا بھی احساس

شاید وہ آصف کو ملنے کے لئے امر تر چلا جاتا مگر ایسا نہ ہوا۔

کے بعد آصف کا وہ خط بے معنی ہو کر رہ گیا۔ ایللی کے لئے تمام کائنات شہزاد سے بھر گئی۔ ان بلنے میں ایللی کا سر جھکا اور بازو کی بجائے شہزاد کے بلوری پاؤں پر ٹک گیا اور شہزاد نہ جانے کس فن پر کھو کر رہ گئی۔

بلانوا

اگلے روز ایللی جب چوبارے میں بیٹھا ہوا حسب معمولی شہزاد کے پاؤں کا جائزہ لے رہا تھا تو رشتہ چوگان سے شور مچا دیا۔

”کون ہے تو؟“

”دیر کے ملے گا تو؟“ کوئی محنت والی بولی۔

”کون آیا ہے۔ ہن؟“ دوسری چلائی۔

”میں کتنی ہوں کوئی آیا ہے کیا؟“

”ہاں ہاں۔ کوئی امر ترسے آیا ہے۔“

”کس کے ہاں آیا ہے؟“

”اپنے علی احمد کے ہاں۔“

”اچھا نام اللہ۔ سو بار آئے۔ کوئی مہمان ہو گا لیکن علی احمد تو آج کل نوکری پر ہیں۔“

”کہتا ہے ایللی سے ملنا ہے۔“

”ایللی سے ملنا ہے؟“

ایللی گھبرا گیا۔ وہ چپکے سے اٹھا اور کھڑکی کی درز سے دیکھنے لگا۔ چوگان کے عین درمیان میں ایک اونچا لمبا جوان کھڑا دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ نہ جانے کون ہے؟ اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے کے باوجود وہ اسے پہچان نہ سکا۔

”بیٹے! کیا نام ہے تیرا؟“ مائی حاجاں پٹکھا چلاتے ہوئی چلا کر بولی۔

”کیا کا شفیع“ اللہ تیرا بھلا کرے۔ ابھی آ جاتا ہے ایللی بیس ہو گا۔“

”اے ہاجرہ۔ اے لڑکی فرحت میں کتنی ہوں لڑکی کیا نام ہے تیرا؟“ ”ہے مجھے تو اللہ ملا ہم ہی بھول جاتا ہے۔ ہاں اپنی جانوں۔۔۔۔۔ اے جانوں۔۔۔۔۔ ذرا ہاجرہ کو آواز تو دینا۔۔۔۔۔ کتنا کوئی ایللی سے ملنے آیا ہے۔“

”امر ہوتے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”کئے نہیں جاتے۔“

”تو کیا میں امر ہو گیا ہوں؟“ ایللی نے پوچھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر دفتہ ”سراٹھا کر بولی۔

”ایللی؟“

”جی۔“ ایللی نے امید افزا نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایللی کیا تم واقعی۔۔۔۔۔ پھر دفتہ“ وہ رک گئی۔

”بولو نا۔“ ایللی نے شہزاد کا بازو جھنجھوڑا۔ ”کیا کہہ رہی تھیں تم؟“

”کچھ نہیں۔“ شہزاد کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”نہیں نہیں۔“ وہ ضد کرنے لگا۔ ”ضرور بتاؤ مجھے۔“

”کچھ ہو تو بتاؤں میں۔۔۔۔۔“ وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ غمناک تھی۔

”اچھا تو کچھ بھی نہیں کیا۔“ ایللی نے بات کا رخ بدلا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ پھر دفتہ اس

نے سراٹھایا۔

”شہزاد۔“ وہ بولا۔ ”تمہارا کچھ بھی نہیں میرے لئے دنیا بھر کے بسے کچھ سے زیادہ ہے۔“

”۔۔۔۔۔“

شہزاد نے تڑپ کر ایللی کی طرف دیکھا اور پھر ایللی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ایسی باتیں نہ کیا کرو ایللی۔“ وہ بولی۔

”کیسی باتیں؟“ ایللی نے پوچھا۔ شہزاد خاموش رہی۔

”کیوں نہ کیا کروں؟“ ایللی نے پھر پوچھا۔

”بس نہ کیا کرو ایللی۔۔۔۔۔ میری خاطر۔“ شہزاد نے منت سے کہا۔

”تمہاری خاطر میں بس کچھ کر سکتا ہوں شہزاد مگر یہ مطالبہ نہ کرو کہ تمہاری خاطر میں

نہ کروں۔“

”اچھا۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”میری خاطر تم کیا کیا کر رہے ہو؟“

”جو میں اپنی خاطر نہیں کر سکتا تمہاری خاطر کر سکتا ہوں صرف تمہاری خاطر۔“

”چپ۔“ وہ چلائی۔ اور اس کی حنائی انگلی ایللی کے ہونٹوں پر ٹک گئی۔

وہ پہلا دن تھا جب تیجے میں شہزاد نے ایللی سے اظہار التفات کیا تھا۔ اس اظہار التفات

”آصف کی حالت اچھی نہیں۔“ شفیع نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

”مات اچھی نہیں۔ کیا مطلب؟“

”اس نے کہا تھا میری طرف سے کہہ دینا حالات اچھے نہیں اور ساتھ لے کر آنا۔“ شفیع نے بعد مشکل جملہ ختم کیا۔

”ہوں۔ تو حالات اچھے نہیں۔ یہ کہو نا۔ اس کے حالات تو کبھی اچھے نہ ہوں گے۔“ ایللی

جھک کر بولا۔

”چلو اب راستے میں باتیں کریں گے۔“ شفیع بولا۔

”اگر میں دوسری گاڑی میں آ جاؤں تو؟“ ایللی نے پوچھا۔

”نہیں۔“ شفیع بولا۔ ”ابھی چلنا ہو گا۔ ضروری ہے۔“

”اچھا تو میں تیار ہو آؤں۔“ ایللی نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”دیر نہ لگانا۔“ شفیع نے اسے تاکید کی۔

### بے معنی کھرام

ایللی تیار ہو کر آیا تو وہ شیش کی طرف چل پڑے۔ محلے سے باہر نکلتے ہی ایللی نے سوالات کی بھرمار کر دی:

”آصف تمہیں کیسے مل گیا؟ کیا تم چھٹیوں میں باہر نہیں گئے تھے کہیں؟ خود کیوں نہ آیا

آصف؟ تمہیں گھر کا پتہ کیسے مل گیا؟ مجھے اس نے کیوں بلایا ہے؟ آخر بات کیا ہے؟“

شفیع ایللی کے سوالات سے گھبرا گیا۔ لیکن اس نے ان میں سے کسی کا جواب نہ دیا بلکہ

جواب دینے کی بجائے اس نے اپنا قصہ چھیڑ دیا کہنے لگا۔

”بات یہ ہے کہ آصف کو ایک لڑکی سے محبت تھی۔“ ایللی نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

”ہاں اسے محبت ہو گئی تھی۔“ شفیع نے کہا۔

”لیکن اس نے مجھ سے تو کبھی بات نہیں کی تھی۔ اس کے متعلق۔“ ایللی نے منہ پکا کر

”کسی سے بات کرنا اس کی عادت میں داخل نہیں تھا۔“ شفیع نے آہ بھری۔

”پھر اس نے تم سے بات کیسے کی۔ تمہیں یہ راز کیسے بتا دیا آصف نے؟“

ایللی کا جی چاہتا تھا کہ کسی سے کہلوایے کہ ایللی گھر پر نہیں اور اس اجنبی سے ملاقات کوفت سے جان بچالے لیکن اس وقت تک محلے میں چاروں طرف شور مچ چکا تھا۔ محلے والے اجنبی کے متعلق سن کر گدھوں کی طرح کھڑکیوں اور منڈیروں پر آکھڑی ہوئی تھیں۔ ہاتھ پتھیاں چل رہی تھیں ہاتھ چل رہے تھے۔ زبانیں قینچی کی طرح چل رہی تھیں۔ لب لہجہ سے بچنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے وہ بادل خواستہ نیچے اتر گیا اور ڈرتے ڈرتے چوگان میں پہنچا۔

”کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔

چاروں طرف سے محلے والیوں نے ایللی کو دیکھ کر شور مچا دیا۔

”ہائیں تم شفیع۔“ شفیع کو دیکھ کر ایللی حیران رہ گیا۔ شفیع اس

جماعت تھا۔ وہ اس کی شکل و صورت سے پوری طرح واقف تھا۔ حیرانی اس بات پر غمی کر کے شفیع کا پہچانا کیوں نہ تھا اور فرض کیجئے دوری کی وجہ سے پہچان نہ سکا تھا تو بھی اس کے لئے جانے پر وہ اسے کیوں نہ پہچان سکا؟

”آؤ آؤ۔“ وہ گرجوٹی سے بولا۔ ”اوپر چلو۔“

”نہیں۔“ شفیع بولا۔ ”مجھے جلدی ہے۔“

”جلدی ہے تو کیا بیٹھو گے نہیں۔“ ایللی نے پوچھا۔ ”کیسے آئے ہو؟“

”تمہیں لینے آیا ہوں۔“ شفیع نے جواب دیا۔

”مجھے لینے آئے ہو؟“

”ہاں۔“ وہ رک کر بولا: ”میری ساتھ امرتسر چلنا ہے تمہیں۔“

”کیوں؟“ ایللی کے منہ سے یوں نکل گیا جیسے اسے شفیع کی بات بری لگی ہو۔

ایک ساعت کے لئے شفیع گھبرا رہا پھر مسکرا کر بولا: ”آصف نے بلایا ہے تمہیں۔“

مسکراہٹ حسرت آلودہ تھی۔

”آصف نے بلایا ہے۔“ ایللی نے دہرایا۔

”ہاں۔ وہ کہتا تھا اسے ساتھ لے کر آنا۔“

”تم کسی اپنے کام سے آئے ہو گے یا نہیں؟“ ایللی نے پوچھا۔

”نہیں تو۔ صرف تمہارے لئے۔“

”صرف مجھے لے جانے کے لئے خیریت تو ہے؟“ ایللی گھبرا گیا۔



”ج ایل۔“ شفیع نے سر جھکا لیا۔

شفیع کے انداز کی سنجیدگی کی وجہ سے ایللی خاموش ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ شفیع کی بات کی پہنچتی اڑا دے مگر بہت نہ پڑی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی طاقت گویائی ختم ہوتی جا رہی ہو۔ جیسے اس کی رگوں میں خون جم گیا ہو۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اور وہ دونوں نہ جانے کب تک خاموش بیٹھے رہے۔ ایللی گاڑی کی کھڑکی کے باہر دوڑتے ہوئے دیہات کے منظر کی طرف کھوئے کھوئے دیکھتا رہا اور شفیع کی دکھتی آنکھ سے قطرے گرتے رہے۔

دھننا ”گاڑی کو دھچکا لگا اور وہ رک گئی۔ امرتسر کے پلیٹ فارم کو دیکھ کر ایللی حیران رہ گیا۔ اسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ وہ امرتسر جا رہا ہے۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا تھا کہ شہزاد اس وقت بیٹھی ٹرین چلا رہی ہو گی۔ اسی طرح سر جھکائے بازو لٹکائے۔ اس وقت ایللی کے ذہن میں ایک وسیع غلا پھیلا ہوا تھا۔

ٹرین سے وہ دونوں تانگے میں سوار ہو گئے۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے تھے جیسے انہیں ایک دوسرے سے کچھ نہ کہتا ہو۔

جب وہ آصف کے گھر کے قریب پہنچے تو شفیع نے مہر سکوت توڑا۔

”ایللی۔“ وہ بولا۔

”جی۔“ ایللی چونکا۔

شفیع رک گیا جیسے اسے یاد نہ رہا ہو کہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ ”آصف کی حالت بہت خراب تھی۔ بہت خراب۔ اس حد تک کہ شاید.....“

”سب ٹھیک کر لوں گا میں۔“ ایللی چمک کر بولا۔

”شاید وہ.....“ شفیع نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”شاید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ ایللی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

گلی کا موڑ مڑتے ہی ایللی حیران رہ گیا۔ وہ تنگ گلی لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ کھڑکیوں میں ٹنڈرول پر عورتوں کا جھوم تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہاں غدر ہو گیا ہو۔ لوگ چلا رہے تھے۔ جھج رہے تھے۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے ہٹ کر شفیع سے پوچھا۔

شفیع نے ایللی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر مجمع کر چیرتا ہوا آگے نکل

”بے چارہ مجبور ہو گیا ہو گا۔ پھر بھی اس نے مجھ سے پوری بات نہیں کی۔“ شفیع نے لگا ”کیا بات کی تھی تم سے آصف نے؟“ ایللی اپنی لاعلمی کا اظہار کرنے کی کوشش کرنے لگا ”مجھ سے۔“ شفیع خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو ڈھلک آیا۔

”شفیع۔“ ایللی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم رو رہے ہو؟“

”نہیں۔“ شفیع نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”در اصل میری آنکھیں دکھتی ہیں۔ پلٹا کر ہے۔ آصف نے مجھے گھر بلا بھیجا تھا کہنے لگا۔ شفیع کیا تم ایللی کو بلا سکتے ہو۔ اگر ایللی نہ آیا تو۔۔۔۔۔۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ جس طرح وہ بات کرتا ہے تم جانتے ہی ہو۔“ شفیع نے پھر بد شروع کی۔

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ ایللی نے کہا۔ ”اچھی طرح معلوم ہے۔“

”پھر اس نے میری ختیں کیں۔“ شفیع کہنے لگا۔ ”لیکن میں نہ مانا۔ میں نے کہا جب تک بلانے کی وجہ نہ بتاؤ گے میں نہ جاؤں گا۔ پھر اس نے بتایا مجھے کہنے لگا میں عجیب مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اگر ایللی نہ آیا تو سمجھ لو میری زندگی ختم ہو جائے گی۔“

”بے وقوف۔“ ایللی چلایا۔ ”محبت لڑکی سے ہے لیکن ایللی نہ آیا تو سمجھ لو زندگی ختم ہو جائے گی..... عجیب بے سکی سے بات ہے۔“

”نہیں ایللی۔“ شفیع نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”وہ واقعی تکلیف میں ہے۔ اس کی حالت اچھی نہیں۔“

”حالت اچھی نہیں۔“ ایللی چلایا۔ ”اچھا خاصا ہے۔ کھانا پیتا ہے۔ حالت اچھی کیوں نہیں۔“

”نہیں۔“ شفیع رک رک کر کہنے لگا۔ ”اب تو بے چارہ ختم ہو گیا۔ منہ زرد ہو گیا۔“ آنکھیں نکل آئی ہیں۔ پہچانا تک نہیں جاتا۔“ شفیع نے کہا۔

”کیا واقعی؟“ ایللی سوچ میں پڑ گیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔ اب شاید وہ بچ نہ سکے۔“ شفیع نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”بچ نہ سکے۔ تم بھی حد کرتے ہو۔۔۔۔۔۔“ ایللی بولا۔

پھر وہ نماز پڑھ رہے تھے اور وہ امامت کر رہی تھی۔ وہ لاش کو دفن رہے تھے اور وہ قہقہے لگا رہی تھی۔

ایلی نے اے آواز دی۔ ”چلو گھر چلیں۔“

ایلی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کیا تم علی پور جاؤ گے؟“ شفیع نے پوچھا۔ ”اس وقت؟“

”ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”میں جا رہا ہوں۔“

”اچھا تو چلو میں تمہیں شیٹن پر چھوڑ آؤں گا۔“ وہ بولا۔

رفتہ۔ ایلی نے شفیع کی طرف دیکھا:

”شفیع۔“ وہ بولا۔ کیا واقعی آصف مر گیا؟“

شفیع نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”لیکن لیکن — تم تو کہتے تھے —“ ایلی رک گیا۔

”میں میں۔“ شفیع نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ ”میں تمہیں بتانا چاہتا تھا لیکن.....“

”تمہیں معلوم تھا کہ؟“ ایلی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس کی دھمکی آنکھ سے پانی جاری ہو گیا۔ ”آصف نے مرتے وقت وصیت کی تھی

کہ تمہارے آنے سے پہلے اس کا جنازہ نہ اٹھایا جائے۔“

ایلی تڑپ کر مڑا۔ وہ پھیلا ہوا دھند لگا دفتا ختم ہو گیا۔ اس کی گرد اونچے لمبے لوگ بھاگ

رہے تھے۔ ڈراؤنے مکانات سر اٹھائے کھڑے تھے۔

”وصیت۔“ ایلی گنگنایا۔

”ہاں۔“ شفیع بولا۔ ”آصف نے کل رات زہر کھالیا تھا۔“

”زہر؟“ ایلی کے ہونٹ ہلے۔

”رات کے دو بجے وہ مر گیا اور مرنے سے پہلے اس نے گھر والوں سے کہہ دیا کہ جب تک

تم نہ آؤ جنازہ نہ اٹھایا جائے۔ صبح اس کے گھر والوں نے مجھے بلا کر علی پور بھیج دیا تاکہ تمہیں

لے آؤں۔“

”زہر کھالیا؟“ ایلی اپنے آپ ہی بڑبڑا رہا تھا۔

”کتنے ہیں۔“ شفیع نے کہا۔ ”اس لڑکی نے آصف کو خط لکھا تھا۔ آؤ ہم آکٹھے زہر کھالیں۔“

گیا۔ آصف کے مکان کے نیچے وہ رک جہاں لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

”ایلی آگیا ہے۔“ وہ چیخ کر بولا۔

”ایلی آگیا ہے۔“ اوپر سے زنانہ آوازیں آئیں اور پھر دفعتاً ”لوگوں کی دلدوز چیخیں سنائی دیں۔ ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ چاروں طرف سے چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔“

”وہ آگیا ہے۔ وہ آگیا ہے۔“

”ایلی آگیا ہے مگر تو چلا گیا ہے۔ لے بیٹے آگیا ہے تیرا دوست۔ اب اس سے توبہ کر

آصف تیرا دوست تجھ سے ملنے آیا ہے۔ ہم سے تو تو نے کبھی بات نہ کی کیا اس سے کئی بات

کرے گا۔ ایلی بیٹے! تیرا آصف چپ ہو گیا ہے۔ اب وہ نہیں بولتا۔ اب وہ کبھی نہ بولے گا۔“

پھر وہی چیخیں سنائی دینے لگیں جنہیں سن کر ایلی سن ہو کر رہ گیا۔ جیسے وہ ایک بے ہوش

ہو۔ اس کے گرد چاروں طرف چیخوں سے بھرا ہوا ایک دیرانہ پھیلا ہوا تھا۔ اسے نیلے رنگ

سے دکھائی دے رہے تھے۔ دور کوئی بین کر رہا تھا اور سینکڑوں مدہم مدہم آوازیں گونجنے

تھیں۔

## نگلی رقاصہ

پھر دفعتاً ”کوئی چلایا:“ ہٹ جاؤ جنازہ آ رہا ہے۔“

اور وہ دھبے ہوا میں تیرنے لگے۔ چاروں طرف سے عجیب عجیب آوازیں بلند ہوئیں۔

معنی آوازیں پھر وہ سب ایک کھلے میدان میں کھڑے تھے جہاں ایک خوف ناک سناٹا چھایا ہوا تھا

آسیب زدہ مکان میں بھوت پریت چل پھر رہے تھے۔ میدان میں قبروں کے درمیان کھلے

والی ایک خوبصورت ڈائن کھڑی تھی۔ اس نے اپنی چھاتیوں پر سے قمیض اٹھا رکھی تھی۔ ان

کے گھٹنگھریالے بال چہرے کے گرد پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے

تھے اور وہ رقص کر رہی تھی۔ مسرت بھرا رقص..... وحشت بھرا رقص۔ لوگ اس کے

سے بے خبر سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی لاش کندھے پر اٹھائے ہوئے تھے۔

پھر دفعتاً ”ایک شور برپا ہوا۔ وہ دلدوز چیخیں وہ ہچکیاں کراہیں بند ہو گئیں۔“ وہ

کدھر کو چل پڑے۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے ان کے آگے آگے وہی نگلی رقاصہ اپنی

تھی۔

فلان دن فلاں دقت اور دونوں مرجائیں۔“  
”اور وہ بھی مر گئی کیا؟“ ایللی نے پوچھا۔

## انتقام ---- انتقام

”نہیں۔“ شفیع بولا۔ ”وہ نہیں مری۔ کوئی کہتا ہے اسے کھانے کو زہر نہیں ملا۔ کوئی کہتا ہے وہ دراصل آصف سے انتقام لینا چاہتی تھی اس لئے اس نے اسے دھوکا دیا۔ اس لڑکی کا یہ حد بدنامی ہوئی تھی۔ اور اس کے بھائیوں نے اسے باندھ کر پٹیا تھا۔ پھر وہ اس محلے سے لے گئے تھے۔ دور کسی اور محلے میں سفید کنڑے کے قریب لیکن سچی بات کے متعلق کیا ہم نہیں معلوم۔“ شفیع نے کہا۔ ”میرا خیال تھا شاید تمہیں معلوم ہو گا۔“

”مجھے ----“ ایللی سوچ میں پڑ گیا۔ ”سب بیکار ہے بالکل بے کار۔ کوئی فائدہ نہیں۔“ ایللی نے محسوس کیا جیسے وہ خود آصف کی موت کا ذمہ دار ہو جیسے اسی نے آصف کو مارا ہو۔ ان لوگوں کے عمارتوں کے اوپر ایک حسین لڑکی مسکرا رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس نے اپنی قمیض کے دامن کو نیچے کونوں سے پکڑ لیا اور پھر بازو اوپر اٹھائے۔ اوپر اور اوپر۔ حتیٰ کہ وہ تنگی ہو گئی اور آصف اسے دیکھ کر چلانے لگا۔ ”نہیں نہیں نہیں نہیں۔“ پھر اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا اور وہ بھوت بن گیا اور لوگوں نے اسے سفید لٹھے میں لپیٹ دیا۔ کسی نے با آواز بلند چلا کر کہا۔ ”ہٹ جاؤ۔ جتاؤ آ رہا ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ شفیع بولا۔ ”اس لڑکی نے واقعی آصف سے انتقام لیا ہے کیونکہ ہم نے اس کی طرف التفات نہ کیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں وہ دونوں چار ایک بار چوری چوری لے بھی تھے۔ کچھ کہتے ہیں نہیں لڑکی کی شوق ملاقات سے تڑپتی رہی لیکن آصف نے اپنی بے وفائی سے اسے بھسم کر دیا اس لئے وہ انتقام پر تل گئی۔ کہتے ہیں اگر لڑکی کے پیار کو ٹھکرا دے تو وہ انتقام لیتی ہے۔ میرا مطلب ہے اگر اس کی آرزو نہیں پوری نہ کرو تو وہ انتقام لیتی ہے۔“ شفیع نے وضاحت کی۔

”انتقام لیتی ہے۔ انتقام لیتی ہے۔“

گاڑی کا انجن چلاتا ہوا جا رہا تھا۔

کھیتوں میں ایک برہنہ عورت ناچ رہی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے۔ چھاتیاں ابھری ہوئی تھیں۔

نہیں۔ ہنسنے لگے تھے۔

”انتقام لیتی ہے۔ انتقام لیتی ہے۔“ انجن گویا ایللی کو دھکیلیں دے رہا تھا۔ ”انتقام لیتی ہے۔“

انتقام لیتی ہے۔

دھن۔ برہنہ عورت کے چہرے میں تبدیلی واقع ہوئی۔ ایللی نے اسے پہچان کر چیخ سی ماری۔  
”شہزاد۔“ اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔

”کیا ہے تمہیں بابو۔“ اس کے قریب بیٹھے ہوئے مسافر نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔  
”یار ہو بھائی؟“ دوسرے نے پوچھا۔

ایللی گھبرا گیا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

لیٹ جاؤ۔ لیٹ جاؤ۔“ انہوں نے زبردستی اسے لٹا دیا۔

وہ برہنہ عورت تیرتی ہوئی کھیتوں سے گاڑی میں آکھسی اور اس کی چھاتی پر بیٹھ گئی۔

”انتقام۔ انتقام۔“ گاڑی چلائے جا رہی تھی۔ تڑپ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ ”انتقام۔ انتقام۔“ شفیع دور سے مسکرا کر بولا۔ ”اگر اس کی خواہشات پوری نہ کی جائیں تو وہ انتقام لیتی ہے۔“  
برہنہ شہزاد کے کھلے بال ایللی کے چہرے سے مس کر رہے تھے۔ ”انتقام۔ انتقام۔“ انجن اسے خردوار کر رہا تھا۔ ڈبے کے سبھی مسافر حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”نہیں نہیں۔“ وہ چلایا ”نہیں نہیں۔“

”کیا ہے تمہیں؟“ کسی نے قریب آکر پوچھا اور اس کے جسم کو ہاتھ لگا کر بولا۔ ”اسے تو غلار ہو رہا ہے۔“ ”نہیں نہیں۔“ ایللی چلایا۔ ”بخار نہیں بخار نہیں۔“

پھر اسے ہوش آیا تو وہ چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے گرد کئی ایک دھندلائے ہوئے چہرے تھے۔ دھن۔ ایک چہرہ اس کے قریب تر ہو گیا کھلے بالوں میں گھرا ہوا۔ گھبرا ہوا۔

”شہزاد۔“ اس کے ہونٹ کھلے۔ اسے دیکھ کر وہ جوش میں آ گیا۔ ”تم مجھ سے انتقام لو کہ۔“ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

شہزاد ہنسنے لگی۔ ”کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”نہ جانے بیوشی میں کیا بول رہا ہے۔“ ہاجرہ بولی۔ ”دیکھو تو بخار سے بدن تپ رہا ہے۔“

ہر بات پر مسکراتا ہے اور جب بھی اس کی طرف دیکھتا ہے تو اس کے ہونٹوں سے لعاب کا تار نکل آتا ہے جیسے شہزاد مصطفیٰ کی ٹوکری ہو۔ ایسے خلود کو چھوڑ کر ایللی سے محبت کرنے میں اسے کیا فائدہ ہے۔ ایللی کا ناک نقشہ حسین نہ تھا۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ رنگ سیاہ تھا جس میں چوڑے چوڑے زرد دانت نہایت بد نما لگتے تھے۔

ایلی کو یقین نہ آتا تھا کہ کوئی عورت اس سے محبت کر سکتی ہے۔ اس دور میں ایللی کے خیالات روایتی رنگ لئے ہوئے تھے۔ بہت سے روایتی اعتبار اس کے دل میں جاگزیں تھے جن کی صحت کے متعلق اسے کبھی شک نہیں پڑا تھا۔ شک بھی کیسے پڑتا؟ یہ دور اس عمر کا وہ دور تھا جب کہ اس کے والدین، اس کے بزرگ اور محلے کے بوڑھے اسے ایک بچے سے زیادہ حیثیت دینے کے لئے تیار نہ تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب تجربہ سب سے بڑی خصوصیت سمجھا جاتا تھا۔ جب علم اور فکر کی کوئی حیثیت نہ تھی اور انفرادیت دیوانگی کے مترادف سمجھی جاتی تھی۔ اس زمانے میں شادی ہو جانے کے بعد دفعتاً لوگ معزز بن جاتے تھے اور انہیں یہ حق حاصل ہو جاتا کہ وہ جملہ حقائق پر تمبرہ کریں اور کتواہوں کو صراطِ مستقیم کے متعلق سمجھائیں۔

اس کے والد علی احمد جب بھی ایللی کے متعلق اظہارِ رائے فرمایا کرتے تو ان کے انداز سے تحقیر کا عنصر واضح ہوتا۔ ان حالات میں وہ بھلا زندگی کے مسائل کے متعلق خود سوچنے کی جرات کیسے کر سکتا تھا۔ اسے کیسے یقین آ سکتا تھا کہ کوئی عورت اس سے محبت کر سکتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے نزدیک شہزاد کے قرب کی آرزو کرنا بھی جائز نہ تھا۔ اس خیال پر ہی وہ چونک جاتا اور ندامت محسوس کرتا۔ چونکہ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے شہزاد کو چھوا تو وہ میلی ہو جائے گی۔ ہٹاک ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے ایللی کی خواہش تھی کہ وہ شہزاد کو دور سے پیار کرے ایللی کے سجدے، شہزاد کے لٹکنے والے بازوؤں، اس کے رنگین گدے سے ہاتھوں اور اس کے بلوری پاؤں تک محدود رہے مگر اب اس کی محبت کی راہ میں ایک نئی مشکل حائل ہو گئی تھی۔ ایک ایسی مشکل جس نے اسے ابھن میں ڈال دیا تھا۔

جلتا بجھتا سائن بورڈ

جب وہ شہزاد کے پاؤں پر سر جھکاتا تو چپکے سے شفیع کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کے قریب آ جاتا۔

”کیا ہے تمہیں ایللی؟“ شہزاد نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔“ ایللی خاموش ہو گیا۔

پھر جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے شہزاد کو آواز دی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

”کیا ہے ایللی؟“ وہ قریب آ کر بولی۔

”تم مجھ سے انتقام تو نہ لو گی۔“ ایللی نے پوچھا۔

”انتقام۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ شہزاد گھبرا گئی۔

ایللی نے شہزاد کا بلوری پاؤں پکڑ لیا۔ بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”ہائیں۔“ شہزاد چلائی۔ ”تم رو رہے ہو؟“

”وعدہ کرو شہزاد۔ وعدہ کرو۔“ وہ منت کرنے لگا۔ ”تم مجھ سے انتقام نہ لو گی۔ وعدہ کرو۔“

”پاکل نہ بنو۔“ وہ بولی۔

”نہیں نہیں۔ وعدہ کرو۔“ ایللی نے منت کی۔

”نہیں۔ میں تم سے انتقام نہ لوں گی۔“ شہزاد بولی۔ ”اب نہ روؤ۔“ وہ اسے تھپکے لگا۔

وہ اس کے بلوری پاؤں پر سر رکھے روتا روتا سو گیا۔

## نئی ابھن

شہزاد کے اس وعدے کے باوجود ایللی کے دل میں انتقام کا خوف جوں کا توں قائم رہا۔ اگرچہ شفیع نے اس روز وہ بات سرسری طور پر کی تھی مگر ایللی کے دل میں وہ بات گرا گئی۔ اور پھر نہ جانے آصف کی موت کی وجہ سے یا امرتسر کے لوگوں کی سرگوشیوں کی وجہ سے وہ بات ایللی کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

جب بھی ایللی شہزاد کے پاس جاتا تو شفیع نہ جانے کدھر سے آنکلتا اور مسکرا کر کہتا۔ ”اگر عورت کی آرزوئیں پوری نہ کی جائیں۔۔۔۔۔۔“ دفعتاً اس کی مسکراہٹ ناک سنجیدگی میں بدل جاتی اور ساری دنیا پر سکوت طاری ہو جاتا۔ خوف ناک سکوت۔ اور ناک سہیلے اور شہزاد کو سوس دور ہو جاتی اور وہ بڑبڑاتی جانو منظر سے خارج ہو جاتی۔ اکثر اکیلے میں بیٹھے ہوئے وہ سوچتا۔ آخر شہزاد کو کیا پڑی ہے کہ مجھے اچھا سمجھتا ہے۔ اور ہے۔ وہ شادی شدہ ہے۔ اس کا خاوند ہے، جو چھت ر آنکھیں گاڑنے کے پوچھتا ہے۔

سٹش میں ڈبکیں کھاتا رہا۔ اندھیرے میں اپنا راستہ ٹٹوتا رہا لیکن دوسری ساعت میں سورج کی ہند کرئیں اس کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیتیں اور وہ پھر سے اندھا ہو جاتا۔ اس کی کیفیت اس بجلی کے ساٹن بورڈ کی سی تھی جو ایک ساعت میں روشن ہو جاتا ہے اور دوسری ساعت میں بجھ جاتا ہے۔

غرم

نقارہ خدا کے شور کے باوجود شاید ایلی کبھی اس راہ پر گامزن نہ ہوتا مگر اسے ڈر تھا کہ کہیں شہزاد آکر اسے اپنے ہاتھ سے پھینک نہ دے۔ وہ کبھی کچھ برداشت کر سکتا تھا مگر شہزاد سے قطع خلقی اسے گوارا نہ تھی۔ اگر شہزاد کی آرزوؤں کو قرب سے تعلق نہیں تو قرب کی کوشش سے وہ زیادہ سے زیادہ ناراض ہوگی تا مایوس تو نہ ہوگی — اس کے دل میں ایک خاموش عزم پیدا ہو گیا۔ گویا ایک نئے زخمی سپاہی نے حملہ کرنے کی ٹھان لی۔

کئی ایک روز وہ سوچتا رہا۔ اس کا یوں سوچتے رہتا شہزاد کے لئے خاصا پریشان کن تھا۔ وہ بار بار پوچھتی ”ایلی کیا ہے تجھے؟“

”کچھ نہیں۔“ ایلی جواب دیتا۔

”نہ۔“ شہزاد اشارہ کرتی۔ ”یوں سوچ بچار میں نہیں پڑا کرتے۔ جب سے امر تر سے آئے ہو نہ جانے کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“

شہزاد کو آصف کی موت کا پتہ تھا اور اسے لئے وہ ایلی کے متعلق فکر مند تھی۔ وہ دن میں کئی ایک بار فرحت کے ہاں آتی تاکہ ایلی کا پتہ لڑے۔ ہر بار وہاں آنے کے لئے وہ نئے سے نیا ہمانہ تلاش کرتی۔ اور ہر بار فرحت طنزاً ”بات کرتی جسے سن کر شہزادی ہنس دیتی۔ پھر وہ ایلی کے قریب آ جاتی۔

”کوئی۔ کیا ابھی تک جنون نہیں گیا؟“ وہ ہنس کر پوچھتی۔

ایلی مسکراتا۔ ”جنون بھی کبھی جاتا ہے؟“

”اتنے امر تر مجھے تم۔ اب چار پائی چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے۔“ وہ ہنسی۔

”سے۔“ ہاجرہ کہتی۔ ”وہ تو اس حالت میں بھی تمہاری طرف جانے کے لئے بے تاب رہتا ہے۔“

اگر عورت کی آرزوئیں پوری نہ کی جائیں تو وہ انتقام لیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سفید کپڑوں میں لپٹا ہوا آصف منہ سے پلو اٹھا کر یوں بے بسی سے مسکراتا جیسے شفیع کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہو۔ چونک کر اٹھ بیٹھتا اور پھر شہزاد کی طرف دیکھ کر اس کی بے نیازی اور بے پردہائی کو محسوس کر کے یہ سمجھنے لگتا کہ شہزاد کی آرزوئیں پوری نہیں ہو رہیں۔ پھر وہ گہری سوچ میں پڑ جاتا۔ جیسی وہ تخیل میں اس سے دور ہو جاتی ہے اور دوری میں اسے آکسانی ہے جیسی وہ تھلائی میں اس سے بے پردا ہو جاتی ہے جیسے ایلی کے وجود کا اسے احساس ہی نہ ہو۔ اور فرحت، ہاجرہ اور جلالہ سامنے بھانے بھانے اس کا دامن کھینچتی ہے۔ چوری چوری اس کا گل سلا جاتی ہے یا پلٹ پلٹ چٹکی بھر لیتی ہے۔ ظاہر ہے وہ سوچتا کہ تخیل میں ایلی کو چرن تپسیہ کرتے دیکھ کر وہ یوں جاتی ہے اور لوگوں کی موجودگی میں پھر سے امید کا دھبہ جلا لیتی ہے۔

ان دنوں ایلی یہ نہ جانتا تھا کہ عورت کے لئے محبت محض ایک ماحول ہے۔ چن بڑ بھری نگاہوں اور رومان بھرے خوابوں سے بنا ہوا ماحول۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ عورت مردانہ جسم کی خواہش مٹتی ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک محبت ایک ذہنی تاثر ہے۔ جسم کو وہ مرل اس لئے برداشت کرتی ہے کہ وہ ظلم نہ ٹوٹے۔ وہ تپسیہ بھری نگاہیں کم نہ ہو جائیں گی۔ ایلی شہزاد کی بے نیازی کو مایوسی سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ بے نیازی احساس تسخیر و مسرت کا بے پلا اظہار تھی۔

ایلی ان باتوں کو سمجھتا بھی کیسے؟ اسے تو یہ بتایا گیا تھا کہ زبان خلق نقارہ خدا ہوتی ہے۔ خدا کا نقارہ کبھی دروغ بیانی کر سکتا ہے بھلا۔ اس نے اپنے دوستوں کے علاوہ کئی بار ہاں چھپ کر بزرگوں کی باتیں بھی سنی تھیں۔ ان سب کا خیال تھا کہ عورت کی آرزوئیں پوری نہ کی جائیں تو وہ انتقام لیتی ہے۔ اور ان آرزوؤں کے متعلق کئی بار علی احمد ہنس کر کہا کرتے تھے ”ان عورتوں کی کیا پوچھتے ہو میاں۔ یہ تو تب تک تمہاری ہیں جب تک تمہاری گرت میں ہیں۔ ہاتھ سے نکل گئیں تو پھر تم کون ہم کون؟“

اس نقارہ خدا کے باوجود ایلی کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے حقیقت تسلیم کر لے۔ کیا عورت کی آرزو یہی ہوتی ہے؟ کیا شہزاد یہی چاہتی ہے؟ — نہیں نہیں۔ وہ جھلا اٹھا۔ شہزاد لگتا نہیں۔ وہ عام عورت نہیں وہ کبھی ایسی بات کی آرزو نہیں کر سکتی۔

اس کے باوجود دل ہی دل میں ایلی لوگوں کی باتوں کو تسلیم کرنے پر مجبور تھا۔ وہ اس طرح

مسلل سوچ بچار کے بعد ایلی کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ خوشی سے وہ اچھل پڑا۔ اور  
پہرہ میں سے تفصیلات پر غور کرنے لگا۔  
”وہ لوہا کیا تجویز ہے۔“

وہ حیران تھا کہ یہ خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا۔

پھر اترنواس کے دل میں غدشات پیدا ہونے لگے۔

”اگر شہزاد نے برانہ مانا تو ——— اگر وہ ناراض ہو گئی تو ——— اگر کسی نے دیکھ لیا تو  
———— اگر بات شریف تک پہنچ گئی تو!۔“

شہزاد تیسری منزل پر چوہارے میں رہتی تھی لیکن سب سے ٹہلی منزل میں ڈیوڑھی سے  
لٹخت ایک بیٹھک بنی ہوئی تھی جو شریف کے قبضے میں تھی اور جہاں انہوں نے گھر کا سامان بند  
کر رکھا تھا۔ بیٹھک عرصہ دراز سے بند پڑی تھی۔۔۔۔۔ کبھی کبھار شہزاد وہاں کوئی چیز رکھنے یا  
لانے کے لئے جایا کرتی تھی۔ ایلی نے بیٹھک میں کپڑے کی آرام کرسیاں رکھی ہوئی دیکھی  
تھیں۔

”پھر کب شہزاد آئی تو ایلی نے چپکے سے اس کی چابیاں اڑالیں۔ جب وہ چلی گئی تو وہ چپکے  
سے اٹھ شہزاد کی بیٹھک کا قفل کھلا اور کمرے میں داخل ہو کر اس نے ایک کھڑکی کی اندر سے  
چٹکی کھول دی۔ لیکن پٹ جوں کے توں بند رہنے دیئے۔ پھر بیٹھک کے دروازے پر تالہ لگا کر  
دہلیز آگیا۔

اگلی روز جب شہزاد آئی اور حسب معمول قریب آکر زیر لب بولی:  
”اوجھرنہ آؤ گے کیا؟۔“

”آؤں گا۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”بشرطیکہ۔“

”اوہ۔ اب شرمیں لگنے لگے۔“ شہزاد نے آنکھیں چپکا کر کہا۔

”ہاں۔“ وہ مسکرایا۔ ”شرمیں ہی لگائیں گے۔“

”اچھا۔“ شہزاد ہنسنے لگی۔ ”کیا شرط ہے؟۔“

”دہلیز میں کپڑے کی ایک آرام کرسی میں بیٹھوں گا۔“ ایلی نے معصوم انداز سے کہا۔

”نہیں۔ اتنی سی بات ہے۔ میں ابھی جانو کو بھیجتی ہوں نیچے سنور میں وہاں رکھی ہیں دو  
کرسیاں۔ ابھی لے آئے گی۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔“

”پتہ نہیں۔“ فرحت مسکراتے لگتی۔ ”شہزاد نے کیا جادو کر رکھا ہے ہم سب پر۔“  
”جادو تو ہو گا۔“ شہزاد آنکھیں چپکا کر کہتی۔

”مجھے بھی سکھا دو۔“ فرحت بات بدلنے کی کوشش کرتی۔

”اونٹوں۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ تم سے اتنا تو ہو نہیں سکتا کہ خلود کو کلے۔“  
”سکو۔“

”سچ کہتی ہو۔“ فرحت جل کر کہتی۔ ”یہ منہ اور مسور کی دال۔“

”اونٹ۔“ شہزاد آنکھیں چپکاتی۔ ”خالی منہ سے کیا ہوتا ہے۔ بڑی بڑی مثل و  
والیاں اپنا سامنہ لے کر رہ جاتی ہیں۔“ پھر وہ بات بدلتی۔ ”یہ ایلی پڑے پڑے کہا  
ہے؟۔“ ”تمہارے متعلق ہی سوچتا ہو گا۔“ فرحت پھر وار کرتی۔

”کیوں ایلی میرے متعلق سوچتے ہو؟۔“ شہزاد ایلی پر وہی نگاہ ڈالتی۔ ”جواب دو۔“

”ہاں تمہارے متعلق۔“ ایلی ہنستا۔

”اب کی بار آلیں وہ۔ ان سے شکایت کروں گی۔ پھر کمرہ جانا۔“ شہزاد سنجیدگی سے کہتی  
”ان کو تو تم نے جان بوجھ کر باہر بھیج رکھا ہے۔“ فرحت چیختی۔

”ہے نا۔“ شہزاد ہنستی۔ ”اب تو مجھے مانو گی نا۔“

”اب تو بہت دیر ہو گئی۔ کب آئے گا شریف؟“ ہاجرہ بات بدلنے کی خاطر پوچھتی۔

”کیا معلوم کب آئیں گے۔“ شہزاد مسکراتی۔

شریف کا نام سن کر ایلی کا احساس گناہ جاگ اٹھا۔ اس کے سینے پر ایک ٹھیس لگتی تھی

مزید سوچ میں پڑ جاتا۔

## سوچ بچار

امر تیسرے واپسی کے بعد چار ایک دن ایلی نے چار پائی پر گزار دیئے۔ ویسے تو وہ  
سکتا تھا اور شہزاد کی طرف جا سکتا تھا مگر اس نے جان بوجھ کر اوھر جانے سے انکار کر دیا  
جانے میں رکھا ہی کیا تھا۔ وہاں شہزاد کے قریب پہنچ کر تو وہ بالکل ہی معدوم ہو جاتا تھا۔  
جانے سے فائدہ ——— اس سے تو یہی بہتر تھا کہ وہ اوھر نہ جاتا تو شہزاد بار بار فرحت کی  
آیا کرتی ——— اس کی نگاہ کی اس اذیت دے بغیر التفاتی سے نجات ملی ہوتی تھی۔

ایلی نے نفی میں سر ہلایا:

”جانو کو نہ بھیجتا۔ وہ باتیں بنائے گی۔ خواہ مخواہ طعنے دے گی۔“

”اچھا تو۔“ شہزاد بولی۔ ”میں خود لے آتی ہوں۔ اتنی سی بات تھی۔“

ہنستے ہنستے وہ انھی اور فرحت کو چھیڑتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ اسے ہاتھ پہلے تو ایلی کا دل گھبرا گیا۔ پھر ہمت کر کے دیوانہ وار اٹھا اور دوسرے راستے بیٹھ کر فز کہ شہزاد کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی کھلی کھڑی کے ذریعے کمرے کے اندر جا پہنچے۔

ایلی کی تجویز کارگر ہو چکی تھی لیکن عین موقع پر اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اس کی گردن گھرائیوں سے نفرین کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ تزیل کر رہا ہو۔ اس روز پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ دوسرے کی سے محبت کی جذبات وابستہ کرنا اس کے نزدیک قاتل نفرین نہ تھا۔ مگر محبت میں جسمانی خواہش کرنا یقیناً ”گناہ تھا۔“

ذہنی طور پر ایلی سمجھتا تھا کہ محبت دراصل ایک فطری تقاضا ہے۔ ایسا فطری تقاضا جو جسمانی قرب ضروری ہے مگر جذباتی طور پر وہ سمجھتا تھا کہ محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔ ایک لگاؤ جو جسم کی آلائش سے قطعی پاک ہے۔ یوسف زلیخا، ہیرا رنچھا اور سسی پنوں کے فیے کی سے یقین ہو چکا تھا کہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس میں محرومی کا عنصر لازم ہوتا ہے اور نتیجہ موت ہوتا ہے۔ ان قصوں کے علاوہ علی احمد کے کمرے کے قرب میں رہ کر اسے محبت سے نفرت ہو چکی تھی۔ وہ جسمانی محبت جس نے اسے والد کے قرب اور اس کی محبت محروم رکھا تھا۔

### بند بیٹھک

ان خیالات کے باوجود ایلی دیوانہ وار شہزاد کی بیٹھک کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اس میں شہزاد کے حسین جسم کا شوق نہ تھا بلکہ جب بھی اسے اس کا خیال آتا تو وہ گھبرا محسوس کرتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے وہ چاند کو میلا کر رہا ہو۔ اسے اپنے جسم سے نفرت اسے اپنی جسمانی کثرتی کا شدت سے احساس تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ آگے بڑھتا تھا۔ اس کے رو برو شفیق مسکرا رہا تھا: ”ان کی آرزوؤں پوری نہ کرو تو وہ انتقام لیتی ہیں۔“

بیٹھک کے پاس پہنچ کر اس نے دھڑکتے دل سے کھڑکی کھولی اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نے اعتبار سے کھڑکی کے پٹ بند کئے اور کباڑ خانے کا جائزہ لینے لگا۔ کمرے میں ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، چند میز کرسیاں اور دیگر سامان گرد سے اٹا پڑا تھا۔ نہ جانے کب سے وہ کمرہ بند پڑا تھا۔ جگہ جگہ مٹی کے جالے تھے ہوئے تھے۔ کڑے بڑی بڑی ٹانگیں پھیلائے دیواروں پر بیٹھے تھے۔ ہر جگہ گرد کی تہہ جھی ہوئی تھی۔

پاؤں کی آہٹ سن کر وہ ایک جھنجھی ہوئی چارپائی کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا۔ کوئی بیڑھیاں اتر رہا تھا۔

”اوموں۔ پاؤں کی چاپ میں بھدا پن واضح ہے وہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے قدموں کی چاپ میں ایک لے ہوتی ہے۔“

پاؤں کی چاپ قریب تر ہو گئی۔ پھر وہ آواز مدھم پڑ گئی۔ حتیٰ کہ خاموشی چھا گئی۔ ایلی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے دل کا ایک حصہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ شہزاد نہ آئے۔

وہ غور سے اوپر کی منزل کی آوازیں سننے لگا۔ شہزاد کا چوبارہ اوپر تیسری منزل پر تھا اس لئے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ درمیانی منزل میں عام طور پر سیدہ رہا کرتی تھی جو ان دنوں اپنے خاندان کے ساتھ کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ اب وہاں اکیلی رابہ رہتی تھی۔ رابہ اپنے بیٹے کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ ”خبردار۔ اسے ہاتھ نہ لگاتا۔۔۔۔۔ نہ تجھے جو کما ہے بڑا پیارا بیٹا ہے یہ۔“

پھر خاموش چھا گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ اسے اس بند کمرے سے خوف آنے لگا۔ باہر چوکن کی طرف سے شور سن کر وہ چونکا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے وہاں چھپنے کا راز آشکار ہو چکا ہو۔

لورہ سب اس کمرے کی طرف آرہے ہوں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

اس مٹی سے اٹے ہوئے کباڑ خانے میں ایلی ایک قیدی کی طرح دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔ ان محلات میں وہ اپنی محبوب شہزاد کا انتظار کر رہا تھا تاکہ اس کی آرزوؤں کو پورا کر کے اسے ہمیشہ کے لئے اپنا لے۔ اور محبوبہ بھی وہ جو پہلے سے ہی کسی اور کی تھی جو ایک چھوٹی سی بچی کی ماں بن



چکی تھی اور اس کا اپنا دل اس کے اپنے ارادوں پر نغیر رہا تھا اور دل ہی دل میں پھر چوری دعائیں مانگ رہا تھا کہ شہزاد نہ آئے۔

دھنسا شہزاد کی آواز سنائی دی۔ اس کی پیٹھ پر گویا ایک چوہا پھدکا۔ وہ ڈر کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی آواز میں نہ جانے وہ لوچ کیسے آجاتا تھا۔ اس کے گلے میں تاری تاری تھی۔ اور اس کی بات میں مینڈی سنائی دیتی تھی۔ شہزاد کی آواز سن کر اس کے جسم میں جھانجھانج بجنے لگیں۔ مگر اس وقت وہ آواز اسے یوں سنائی دی جیسے موت کی کھنٹی بج رہی ہو۔ ایلی کا دل بھڑک اٹھا۔ وہ گریبا دل میں دھکی بیٹھنے لگی اور جسم منوں بوجھل ہو گیا۔

”کیا ہو رہا ہے راجہ؟“ اوپر کی منزل سے شہزاد کی آواز سنائی دی۔

”کہاں جا رہی ہے تو؟“ راجہ نے پوچھا۔ ”چابیوں کا گچھا اٹھائے۔“

”ذرا نیچے بیٹھک میں جا رہی ہوں کچھ چیزیں لانے کے لئے۔“

”جانو کو بھیج دیجی۔ وہاں تو ایک منٹ کے لئے ٹھہرا نہیں جاتا۔“ راجہ کہہ رہی تھی۔

”جانو باہر گئی ہے۔“ شہزاد بولی۔

”تو انتظار کر لیا ہوتا۔“

شہزاد ہنسی:

”وہ کہاں کرتی ہے ایسے کام۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بیڑھیاں اترنے لگی۔

اپنے احساس کمتری کو دبانے کے لئے، احساس گناہ کو معطل کرنے کے لئے اور اس نالے والے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف ایک طریقہ تھا جیسے گھرے ہوئے کبوتر کے لئے عقاب سے بچنے کا ایک ہی طریق ہوتا ہے۔ وہ مڑ کر عقاب پر بچھتا ہے اور یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ وہ ایک کبوتر ہے۔

جوں جوں آواز قریب تر ہوتی گئی۔ ایلی اپنے آپ میں وہی خود ساختہ وحشت پیدا کرنے لگی سہی کرتا رہا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوتی گئیں۔ بند بند جوش سے تھرکتے لگا۔ اور وہ بھول گیا کہ وہ ایلی ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ایسے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے اور مردہ ہونا جس میں وحشت اور بربریت ہو۔ وحشت اور بربریت عورتوں کو محبوب ہوتی ہے۔

دروازہ کھلا۔ شہزاد اندر داخل ہوئی۔

ایلی بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ سی ٹکلا اور لپک کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ شہزاد نے

کر ایک بجلی سی چنچ ماری۔

کنڈی لگانے کے بعد وہ شہزاد کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

ایک ساعت کے لئے وہ گھبراگئی مگر اسے پہچان کر مطمئن ہو کر بولی: ”تم یہاں۔“

ایلی کی خاموشی اور وحشت بھرے انداز کو دیکھ کر وہ از سر نو گھبراگئی۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“ وہ بولی ”تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“

ایلی جواب دینے بغیر اس کی طرف بڑھا۔

”پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ وہ زیر لب چلائی۔

وہ سمجھتی تھی کہ ایلی اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دراصل وہ اپنی شدید

کتری کی فتنہ منائی کی ناکام کوشش کر رہا ہے اور اپنا روپ چھپانے کے لئے اس نے شیر کی

کھل پننے کی مٹھک خیز کوشش کی ہے۔

”خدا کے لئے۔“ وہ چلائی۔ ”بھٹ جاؤ۔ یہ کیا دیوانگی ہے۔“

وہ چپ چاپ آگے بڑھتا گیا۔

”فردوز تم پاگل ہو گئے ہو“ وہ بولی۔ ”تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ ایلی نے بھیاک آواز میں جواب دیا۔ ”نہیں ہوں۔“

”ایلی۔ کوئی سن لے گا۔ دیکھ لے گا۔ پاگل نہ بنو۔ پاگل نہ بنو۔ پاگل نہ بنو۔“

ایک رنگین دھندلا ایلی کے قریب تر آتا گیا۔ اور قریب اور قریب۔ اور وہ دیوانہ وار اس

کی طرف بڑھتا گیا۔ اس کے ہونٹ شہزاد کا خون چوسنے کے لئے جوک کی طرح آگے بڑھے۔

ہاتھ باز نہ سرجم، وہ دیوانہ وار اس کے جسم کا ایک ایک حصہ چوسنے لگا۔ پہلے تو شہزاد نے

اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چمڑانے کی کوشش کی۔ پھر وہ تھک ہار کر ایک لاش کی طرح میز

پر گر پڑی۔ بھیاک خاموش طاری ہو گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کی وحشت ختم ہوئی جا رہی ہو۔ اس نے دیوانہ وار بھٹی میں نی

لہرمن دھکینے کی کوشش کی۔

”تھار۔۔۔۔۔ چار۔۔۔۔۔“ ریشمین کپڑے کے پھٹنے کی آواز آئی۔

”ایلی۔ پاگل نہ بنو۔“ ایک بار پھر مرمریں جسم میں حرکت ہوئی۔ ”پاگل نہ بنو۔“

مردم آواز میں مبہم سا احتجاج دیکھ کر وہ اور بھی پھر گیا۔

## فرار

جب وہ واپس گھر پہنچا تو وہ تھکا ہارا محروم و ناکام ایلی تھا۔ چپکے سے چور کی طرح وہ اندر داخل ہوا اور دبے پاؤں چلتا ہوا اپنی چارپائی پر گر گیا۔ اس نے اپنا منہ تکیے میں گاڑ دیا اور مایوسی کے اظہار میں ڈوب گیا۔

اگر ایلی اس پہلی کوشش میں کامیاب ہو جاتا تو ممکن ہے کہ اس کی تمام تر زندگی کا رخ ہی بدل جاتا۔ ممکن ہے محبت اور عورت کے متعلق اس کے خیالات از سر نو ترتیب پاتے۔ جذبات میں توازن پیدا ہو جاتا لیکن ایسا نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ ایلی کا احساس کمتری اور بھی شدید ہو گیا۔ دل میں جسم کی نفرت اور بھی شدید ہو گئی۔ عورت کا ذرا اس کی روح پر خوفناک پراسرار سائے کی طرح مسلط ہو گیا۔ اور محبت کے تخیل میں چھوٹی روحانیت کی ایک اور کلی لگ گئی۔ نہ جانے کب تک ایلی اسی طرح تکیے میں منہ گاڑے پڑا رہا۔

”سوچ رہا تھا۔ اس پر ثابت ہو چکا تھا کہ اس میں آرزوئیں پوری کرنے کی صلاحیت کب سے ہی مفقود ہے اب شہزاد کا انتقام اور بھی یقینی ہو چکا تھا۔ اب وہ کس منہ سے شہزاد کے لئے ہاسک تھا۔ کس برستے پر اس سے محبت جتا سکتا تھا۔“

”نہیں نہیں میں اس کے روبرو نہیں جاؤں گا کبھی نہیں جاؤں گا۔“

”مجھے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں مجھ میں کوئی ایسا خزانہ نہیں جو محبت کا حق دار بنا سکے۔“

دھپ — ایک ہوائی سی چھوٹ گئی۔ اور معاً ”گرد و پیش تاریک ہو گئے۔“

اس نے محسوس کیا جیسے وہ ڈوب گیا ہو۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ گھور اندھیرا۔ ناکامی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ خود ساختہ وحشت کا سہارا چھوٹ چکا تھا۔ وہ دیوانگی ختم ہو چکی تھی اب اس کے عقب میں معصیت اور شکست کے منفی احساسات کا ریلا اٹھا آ رہا تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے منہ میں گھاس کا تنکا ہو۔ وہی تنکا جو پورس اپنے منہ میں لے کر سکندر کے حضور حاضر ہوا تھا۔

اس نئی فخت کو مٹانے کے لئے ایلی ایک بار پھر آگے بڑھا اور شہزاد کے بند بندہ کو ہونے لگا۔ اور بالاخر تھک کر بچے کی طرح اس کے قدموں میں سر رکھ کر گر پڑا:

”مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔ مجھے تم سے.....“

اپنے پاؤں پر آنسوؤں کے قطرے محسوس کر کے شہزاد اٹھ بیٹھی۔ اور اس کا بازو ایلی کا طرف بڑھا اور اسے تھپکنے لگا۔

اس کیفیت میں کتنا اطمینان تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے ماں کا ہاتھ سرزنش کرنے کی بجائے معاف کر دینے کے بعد اسے تھپک رہا ہو۔

میری تمام تر زندگی ہی بے کار ہے۔“

آصف نے لہٹے کی سفید چادر کو منہ سے ہٹا کر ایلی کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ مسکراہٹ جیسے اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہو۔ اسے بلا رہا ہو۔ ”آ جاؤ ایلی آ جاؤ۔“ وہ ڈر کر اٹھ بیٹھا۔ اور گھبرا کر گھر سے باہر نکل گیا۔

اس روز وہ پہلی مرتبہ باہر نکلا تھا۔ اب حالات بدل چکے تھے اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ بھاگ جائے کس دور بھاگ جائے۔ شہزاد کے چوبارے سے دور اس بیٹھک دور جہاں وہ شکست کھا کر منہ میں گھاس پھڑے سکندر کے روبرو حاضر ہوا تھا۔ اور اس نے جھکا کر کہا تھا۔ حضور مجھ سے ایسا سلوک کیا جائے جو بادشاہ بھکاریوں سے کرتے ہیں۔ اسے چوگان سے گزرتے دیکھ کر محلے والیاں چلانے لگیں۔

”کون ایلی ہے بسم اللہ۔“

”شکر ہے تو بھی گھر سے باہر نکلا۔“

”نہ بیٹا۔“ ایک بولی ”اپنے باپ کے قدموں پر نہ چلنا۔ اسے ہی گھر میں بیٹھے رہنا عادت ہے۔“

دوسری بولی ”لو ماں تم بھی حد کرتی ہو یہ آج کل کی لڑکیاں تو راہ چلنے کو بلاتی ہیں۔ جلد دیتی ہیں اس بیچارے کا کیا دوش ہے، بس پتھر کا بتا کر چولے پر رکھ لیتی ہیں۔“

”نہ بیٹا تو نہ پڑنا ان کے فریب میں۔“

”اللہ تعالیٰ کا فضل ہے بہن ابھی اس محلے کی لڑکیوں پر اللہ اپنا فضل ہی رکھے۔“

ایلی چوگان سے نکلا ہی تھا کہ سامنے رضا لاٹھی ٹیکتا ہوا آ نکلا۔

”نکل آئے تمہ خانے سے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”کیسے آنے دیا۔ اماں نے گود کے پتہ نہ کھلے کیا۔“

”بکو نہیں۔“ وہ بیٹاؤنی غصے میں چلایا۔

”بیٹا کچھ دن اور یونہی اندر رہے تو لاٹھی کے سارے چلنا پڑے گا۔ تجربے کی بات کرنا ہوں۔“ رضا نے تہقہ لگایا۔

”شرم تو نہیں آتی تمہیں۔“ ایلی نے کھسپائے ہو کر کہا۔

”اونہوں۔“ رضا چلایا ”شرم شروع شروع میں آتی ہے، جب لکڑی اٹھاوے تو شرم نہیں

آئی گی۔“

”جاںکوں رہے ہو؟۔“ ایلی نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

”ابھی آتا ہوں۔ تمہیں فرصت ہو تو بیٹھنا ذرا دوکان پر۔“ رضا بولا۔

رسوائی

رخا کی دوکان تک پہنچتے پہنچتے کئی ایک لوگ اسے ملے وہ سب درپردہ اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور باتوں ہی باتوں میں سبھی شہزاد کا طعنہ دے رہے تھے۔ اس نے اس روز پہلی دفعہ محسوس کیا کہ وہ راز جو وہ اپنے دل میں چھپائے بیٹھا تھا تمام محلے میں زبان زد خلق ہو چکا تھا۔ اس بات کو محسوس کر کے وہ لرز گیا لیکن اب کیا تھا اب تو سب ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ شہزاد کے روبرو نہیں جاسکتا تھا۔ اس خیال پر اس کے دل کو ڈھارس سی ہو گئی۔

کیپ کی کھڑکی کی طرف دیکھ کر اسے ارجمند یاد آ گیا جو نہ جانے اس تیل کے کارخانے میں کیسے دن گزار رہا تھا۔ کھڑکی میں کیپ کھڑی نہ جانے کس سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ رک گیا اور کیپ کو دیکھنے لگا۔ کیپ نے اسے دیکھتے ہی کھڑکی کے پٹ زناٹے سے بند کر دیے۔

”اوہ۔“ اس نے سوچا۔ ”تو بات اس حد تک پہنچ چکی ہے۔“

کونوئیں کے قریب دو منزلہ مکان کے دروازے میں اپنی منگیت کو کھڑے دیکھ کر ایلی چونکا۔

”جوان ہو گئی ہے بچھلی مرتبہ جب دیکھا تھا تو بچی سی تھی۔ لڑکیاں کتنی جلدی جوان ہو جاتی ہیں۔ رنگ کتنا کھرم گیا ہے اور اعضاء میں نہ جانے کیا ہر گیم ہے جیسے آٹے میں خیر اٹھ گیا ہو۔“ ”اے۔“ وہ تعجب سے چلایا۔ اسے دیکھ لینے کے باوجود شرمہ اسی طرح بازو اوپر اٹھائے ہوئے کھڑکی میں کھڑی رہی جیسے وہ ایلی کی حیثیت سے منکر ہونے کا اظہار کر رہی ہو۔ اس نے ایلی کی طرف دیکھ کر ناک سکونڈی۔ اس کے ہونٹوں کے نوٹوں میں طنز دہنی ہوئی تھی ایلی کھڑا اسے دیکھتا ہلہ پھرہ گویا آتا کئی۔ اس نے بے پروائی سے گھر با معنی انداز سے تھوک دیا اور پھر اندر گئی۔

”ہوں۔“ ایلی نے مسکراتے کی کوشش کی ”ہوں تو اب بات یہیں تک نہ کا جی

اگرچہ ایلی نے بار بار چلا چلا کر لوگوں سے کہا تھا کہ منگنی محض ایک بچوں کی

الفاظ صرف اس لیے رچایا تھا کہ اس کا دل کا چاؤ پورا ہو جائے۔ اور اعلان

نہم پر کرم ہو رہا ہے یا اس نے مار کر گھر سے نکل دیا ہے۔ آخر کب تک خاکسار سے بات چیت کے ارے دانی سے پیٹ چھپانا۔۔۔ اس مٹیار کے دام میں پھنسے ہو بیٹا جس کا کانٹا پانی نہیں چھوڑے۔“

ایلی کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ ان دنوں اسے یہ معلوم نہ تھا کہ راز کو محفوظ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے اہمیت نہ دی جائے جھٹلایا نہ جائے۔ وہ تو سمجھتا تھا کہ راز کو محفوظ کرنے کے لیے شک کرنے والے کے رویہ و قسمیں کھانا ضروری ہوتا ہے اس لیے اس نے نہیں کھانا شروع کر دیا۔

”ایمن سے ایسی تو کوئی بات نہیں تم سے کیا چھپانا ہے۔“ وہ کھیانی ہنسی ہنسنے لگا۔  
”چھپا تو یہ بات ہے۔“ رضائے لنگڑی ٹانگ جھلا کر کہا۔ ”پر یار چاہے کتنا ہی رنگ روغن کیوں نہ ہو اندھیرے میں سب نیلیاں دکھائی دیتی ہیں اور سب سے پسینے کی بو آتی ہے۔“  
”جو نہیں۔“ ایلی نے بات مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔

”جوئی چاہے کو پر بات سوچنے کی ہے پلے باندھ لو کیا یاد کرو گے کہ رضائے نسخہ بتایا تھا پر یاد کی اور چھو کر سے لگاتے تو ہم بھی ساتھ دیتے تم کہتے تو سالی کو اٹھا کر لے آتے یہ کیا گڑبڑ دلی تم نے ہماری پرواز اتنی اونچی نہیں اور پھر بعد میں نہ حاصل نہ حصول وہ تو بیڑوں بیڑوں کے کان کھرتی ہے توبہ اک قیامت ہے سمنی ہوئی۔“ اس نے کہا ”بڑا اونچا ہاتھ مارا ہے میرے بارے۔“

ایلی خاموش ہو گیا۔ رضا کے سامنے قسمیں کھانا بے کار تھا۔ بالکل بے کار۔ رضا کے پاس وہ ایک کھٹے بیٹھا وہ بھی بادل ناخواستہ، پھر وہ واپس گھر آ گیا۔ کئی ایک مرتبہ اسے خیال آیا کہ رضائے ساری بات کہہ دے لیکن شنراؤ کی عزت کا سوال تھا۔ اگر وہ شادی شدہ نہ ہوتی تو وہ رضائے دل کی بات کہہ سکتا تھا یا اگر اس کا مقصد محض تفریح ہوتا تو بھی تھا۔ محبت کی بات کرنا کسی قدر دشوار نہ تھا لیکن وہ اس خفت کا تذکرہ کیسے کر سکتا تھا جس کی وجہ سے ایلی تباہ حال تھا کہ وہ رضائے ساری بات کہہ دے اور دل کا راز کہہ کر اس ٹھٹھن سے نجات حاصل کرے جس کی وجہ سے وہ مضطرب تھا۔ جو اس کے بند بند میں رچی ہوئی تھی۔ وہ راز اس کے

بیاض نہیں کرے گا مگر اس وقت اپنی منگیتری بے پروائی اور اظہار تحقیر کو دیکھ کر اسے تلخ محسوس ہوئی اس نے محسوس کیا جیسے اس کی توہین کی گئی ہو۔ اس خیال پر اس کا وہل رگنا ٹھٹھن ہو گیا اور وہ سیدھا رضا کی دوکان پر پہنچا اور چپکے سے دوکان کے عقب میں پڑی ہوئی چوکی پر چڑھ کر سوچنے لگا۔

اس روز وہ محسوس کر رہا تھا کہ محلے کے سبھی لوگ اس سے شکی تھے۔ شنراؤ کی بات دور تک پہنچ چکی تھی۔ نہ جانے بات کیوں نکل گئی تھی۔ اس کا صرف یہی تصور تھا کہ وہ سارا دن گھر بیٹھا رہتا تھا کیا اتنی سی بات پر وہ سب اس سے بدظن ہو چکے تھے کیا اتنی سی بات سے انہوں نے وہ سب کچھ اخذ کر لیا تھا۔ حیرانی کی بات تھی۔ پھر اس کے دل میں شکوک پیدا ہونے لگتے نہیں نہیں اتنی سی بات سے سب کچھ اخذ کرنا ممکن نہیں۔ شاید کسی نے انہیں دیکھ لیا ہو۔۔۔ تو کیا بیشک۔۔۔ اس خیال پر اسے پسینہ آ جاتا۔ محبت کے راز کا کھل جانا اور بات تھی۔ مگر اس کی شکست کی بات کا کھل جانا۔۔۔؟

”ارے ایلی تو یہاں؟“۔۔۔ کسی کی آواز سنائی دی۔

گھبراہٹ اس نے سراٹھایا۔ سامنے صفدر بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دھندلا جھم کا عالم تھا اور ہونٹوں پر طنز تھی۔

”گھبراؤ نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں ہوں لیکن تم نے کبھی نہیں جانا بھی ہو، سمجھا بھی ہو۔ تمہاری آواز تو اکثر سن لیتے ہیں بھی لیکن ملنا کبھی کبھار ہوتا ہے۔“  
”جی۔ جی۔“ ایلی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے۔

”میں آج کل ٹپلی بیشک میں ہوتا ہوں نا۔“ صفدر بولا ”اس کے چوبارے کے عین آج تمہاری آوازیں آتی رہتی ہیں ہم تو بھی آوازوں کے سہارے جی رہے ہیں۔“

اس کی آواز میں مایوسی اور حسرت محسوس کر کے ایلی اور بھی گھبرایا۔

”مل لیا کرو ایلی۔“ وہ بولا ”کبھی ہم سے بھی مل لیا کرو۔ مانا کہ آج کل اونچی فضاؤں میں ”بیناس کی آواز منٹاک ہو گئی۔“ خدا کی قسم مجھے خوشی ہوتی ہے اس بات پر مگر ہم ہوں۔“ رضا یک نہیں۔ آیا کرو گے نا۔“ یہ کہہ کر وہ بازو ہلاتا ہوا یوں دوکان سے باہر نکل گیا۔  
”شرم تو نہ ادا کر کے جا رہا ہو۔“

”اومہوں۔“ نہ نہ پایا تھا کہ رضائے لنگڑی بیٹھا ہوا آ پہنچا۔ ”بیٹھے ہو۔“ وہ باہر سے چلا آیا۔

کپ کپ کیا جا رہا ہے۔ رپورٹ دو۔ ساری کیس ہسٹری سنیں گے اپن تو کس حال میں ہیں یار  
وطن۔ اس نے اشارہ کیا۔ لیکن کھانسی کا دورہ پھر شروع ہو گیا۔ پہلے تو وہ دیوار کا  
سارالے کر کھڑا رہا لیکن دورے کی شدت کی وجہ سے اسے بیٹھنا پڑا جب دورہ ختم ہوا تو ارجمند  
نے ایک بار پھر مسکرانے کی شدید کوشش کی۔

”یہ کھانسی بھی اپن سے مذاق کرتی ہے۔ اپنا سارا کھیل غارت کر کے رکھ دیا سالی نے۔  
دوہرم نے پیم سندیس سے لڑکی پر جادو کیا ادھر اس کبخت نے سر نکالا۔ اپنا جادو ٹوٹنے کا کھیل  
کمل کریں یا بیٹھ کر کھائیں۔۔۔ سب ملیا میٹ کر دیا۔ اپنے گاؤں میں ایک ایسی ٹیار آئی ہے  
ارے رے کیا جادو کیا چیز ہے۔ سمجھ لو گھی کی مٹکی ہے اور کھی بھی وہ جیسے کچی مگری ہو۔ کچی  
گڑی کیا پھین ہے کیا با کچن ہے۔ اور پھر چال۔ یوں چلتی ہے جیسے ناگ رانی ہو۔“ اس کی  
آنکھوں میں پھر سے وہی چمک لہرانے لگی چہرے پر وہی انبساط دکھنے لگی۔

دفترا“ گلی سے ارجمند کی ماں نے سر نکالا جیسے وہ وہاں کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی ہو۔ ماں کو  
دیکھ کر ارجمند نے پینٹر بدلا۔ ”ارے یار۔“ وہ بولا ”سنائیں گے کسی وقت تمہیں یہ قصہ ارے  
کبھی وہاں آؤ تو کھائیں تمہیں سارے گاؤں کو مرید بنا رکھا ہے۔ تمہارے اس خاکسار نے۔ نام  
پتہ ہیں لوگ۔“ پھر وہ ماں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”ماں تو کیوں یہاں کھڑی ہے۔ کوئی کام  
ہے تو حکم کر کسی سے ملنا ہے تو میں ڈھونڈ کر لے آؤں۔“

”تم تو تجھے دیکھ رہی تھی۔“ ماں نے کہا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ آنکھیں پر نم  
تھیں۔

”مجھے دیکھ رہی تھی۔ کیوں۔ میرے لائق کیا حکم ہے ماں۔“ وہ چلانے لگا۔  
”ہم تو کوئی نہیں۔“ وہ بولی ”ویسے ہی دیکھ رہی تھی تجھے۔“

”اچھا تو صرف دیکھتا ہے۔ تو دیکھ لو۔ دیکھ لو۔ ادھر سے اور ادھر سے بھی۔“ اس نے اپنا  
چہرہ مٹاتے ہوئے کہا۔

ماں نے ہنس پڑی۔ ”تو تو مذاق کر رہا ہے۔“ وہ بولی۔ ”چل اب گھر چل آرام سے لیٹ تیری  
فوجت اچھی نہیں۔“ ”لو ماں۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”ہنا کتنا تو ہوں۔ دیکھ تو میری طرف۔“ یہ کہتے  
ہوئے ارجمند کو پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے اسے روکنے کی شدید کوشش کی لیکن بے سود وہ  
بہانے لگا۔ ”ماں! اس کی حالت دیکھ کر ماں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ

اس کشمکش سے مخلص پانے کے لیے وہ اٹھ بیٹھا۔ ”میں اب جاتا ہوں۔“  
”ہاں بھائی۔“ رضائے مسکرا کر کہا ”اب تو میرے پاس کیوں بیٹھنے لگا۔“

”رضاء خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔“ ایللی نے منت سے کہا۔ ”تیرے منہ سے ایللی  
مجھے اچھی نہیں لگتی۔“

”میرے منہ سے تجھے کوئی بات اب اچھی لگے گی کیا۔“ رضائے بنادٹی سنجیدگی سے کہہ  
”پھر وہی بات۔“ ایللی چلایا۔ ”تم سے تو بات کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ اچھا ملتا  
ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ چل پڑا۔

”جانے کے لیے بہانہ مل گیا۔“ رضائے چلا کر کہا۔ لیکن ایللی نے اس کی بات کا  
پردانہ کی۔۔۔۔

## ماں اور بیٹا

بڑی ڈیوڑھی میں ارجمند کو دیکھ کر وہ خوشی سے چلایا۔ ”ارے تم کب آئے؟“  
لیکن ارجمند کو دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ گل پتے ہوئے  
چہرے پر مرونی چھائی ہوئی تھی۔

ایللی کی آواز سن کر ارجمند نے شور مچانے کی کوشش کی۔ ”ماں کیا سمجھا ہے تم نے  
لیکن کھانسی کی وجہ سے وہ پوری بات نہ کر سکا۔

چھاتی لرز رہی تھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ایللی اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔  
”ہے؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”تم بیمار تو نہیں ہو؟“

ارجمند کی آنکھیں پر نم تھیں۔ اس نے مسکرانے کی شدید کوشش کی ”اپن کھانسی دانی  
پردانیں کرتے۔“ وہ بولا۔ ”کھانسی کا کیا ہے۔ اور بیماری۔ نہ بھی اس خاکسار کو لگ گیا۔  
تو سالی کو حاصل کیا ہو گا۔ واہ یار۔“

لیکن ایللی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تمہاری یہ حالت کیا ہو رہی ہے۔“  
”ہاں بھی یہ تو ہے۔“ ارجمند بولا۔ ”وہ کہا ہے نا استاد نے ہمارے  
میں کھل کھل کے بن گئے ہاتھی۔ استاد کی بات عین صادق آتی ہے اپن پر۔“

آنسو مگر نے لگے۔

”کسی کا دوش نہیں۔“ وہ بولی۔ ”میرے نصیب؟“ اس نے ماتھے پر زور سے ہاتھ دبا دیا۔  
”میرے نصیب وہ اس سے بڑا لڑکا تھا۔“ اس نے ایللی سے مخاطب ہو کر کہہ دیا۔  
پور جوانی آئی تھی اس پر بیٹے آنکھ نہیں نکلتی تھی۔ اور قدیوں نکلا تھا جیسے سرسوں کا پودا۔  
بس نظر کھا گئی اسے۔ کہتے تھے دق ہو گیا ہے۔ اونٹوں دق نہیں اسے تو نظر کھا گئی۔  
یہ۔“ اس نے ارجمند کی طرف اشارہ کی اور دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگی۔

ارجمند کو دورہ ختم ہوا تو اس نے بڑھ کر ماں کو آغوش میں لے لیا۔ ”اونٹوں ملنا نہیں لگے گی۔ میں تو نظر بڑھوں۔ اور دق میں تو سینکڑوں دق ہضم کر جاؤں۔ اپنی مراد نہیں۔ موت کی کیا مجال ہے جو ادھر ہماری اور آنکھ اٹھا کر دیکھ۔ تم تو کسی ہی جی ہاراک اپنا۔“ ارجمند نے یہ کہہ کر ماں کو آغوش میں اٹھالیا اور ایللی سے بولا۔ ”ملو گے ہاشم کا کرنے چلیں گے۔“ اور خود گھر کی طرف چل پڑا۔

اس کی ماں چیخ رہی تھی ”اب مجھے چھوڑ دے۔ چھوڑ بھی دے۔“ اور وہ ہنسنے لگا۔  
”کیسے چھوڑ دوں بڑی مشکل سے قابو میں آئی ہے تو۔“

### یہ دن وہ دن

ارجمند کے جانے کے بعد ایللی نے محسوس کیا جیسے وہ محلہ ایک ویرانہ ہو گیا۔ ایک ویرانہ۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے کیا کرے۔ گھر جانا تو اس کے لیے قلعہ ناممکن ہو چکا تھا۔ فرحت اور ہارہہ کیا کہیں گی شہزاد کو خیراب ان کے ہاں کبھی نہ آئے گا۔ اس کا نہ آنا بھی تو بذات خود ایک واضح اشارہ ہو گا۔ اور فرحت کو تو طعنے دینے کی جگہ بڑی معصومیت سے کہے گی۔

”نہ جانے اب شہزاد کیوں نہیں آتی ادھر۔ کیوں ایللی کیا بات ہے؟“ اور اس نے میں بلا کا تسخیر ہو گا۔ شہزاد کے گھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس کی نگاہ میں تحقیر ہو گی۔ ”آگئے تم۔ بڑی مردانگی کا زعم لئے پھرتے تھے۔ میری بات ہی نہیں سننے ختم کیں میں نے کہ نہ یہ خیال نکال دو اپنے دل سے لیکن سر پر بھوت سوار تھا۔“ ایللی نے جھرجھری لی۔ ”توبہ ہے۔“ وہ بولا اور پھر سہ پڑنے لگا۔ ”کہاں جاؤں میں کیا کروں؟“

”اے تم یہاں ایللی۔“ صفدر کی آواز سن کر ایللی چونک۔ ”یہاں کیا کر رہے ہو تم؟ تمہیں باہر نکلنے کی فرصت مل گئی کیا۔ لیکن یار۔“ اس نے پینتر ابدلا ”بڑے خوش نصیب ہو تم؟ خدا کی قسم تمہیں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ بس صرف یہ التجا ہے کہ کبھی ہمیں بھی ملاقات کا شرف حاصل ہو جائے۔ تمہیں نہیں معلوم ایللی۔“ صفدر اپنے مخصوص انداز میں یوں کہنے لگا جیسے پتھر ڈرامہ کھیل رہا ہو۔ ”زندگی میں مجھے بھی بڑے بڑے موقعے ملے ہیں۔ ایسے موقعے کہ لوگ میری طرف دیکھا کرتے تھے۔ سر اٹھا اٹھا کر دیکھا کرتے تھے جیسے آج میں تمہاری طرف دیکھ رہا ہوں لیکن ان دنوں ہم ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ ایک عجیب شان تھی اپنی کسی کی آنکھ کا تارا بننے میں عجیب شان ہوتی ہے اور پھر اس کی آنکھ کا تارا جو خود زمانے بھر کی آنکھ کا تارا ہو جسے دنیا آنکھوں پر بٹھائے اس کی آنکھوں کا تارا تم جانتے ہی ہو لیکن اس زمانے میں مجھے یہ معلوم نہ تھا کبھی آنکھ سے گر کر دنیا کے پاؤں میں روندنا جاؤں۔ سو آج ہم تو پاؤں میں روندنے جانے کے قاتل رہ گئے ہیں۔ تم بھی روند لو۔“ لیکن بھائی ہر کسی کو۔ ”صفدر آہ بھر کر بولا ”وہ دن بھی میسر آتے ہیں اور یہ دن بھی دیکھنے پڑتے ہیں۔“ اس نے پر معنی انداز سے کہا۔ ہارہہ فحشا ”چونک کر بولا۔“ ”یہاں کیوں کھڑے ہو۔ انتظار کر رہے ہو کیا۔ فرصت ملے تو آ جانا کبھی میرے پاس اسی چوبارے کے قدموں میں پڑا رہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ یوں چل پڑا جیسے مکالمہ ادا کر کے بچتا ہے جا رہا ہو۔

صفدر کے جانے کے بعد دنیا ایللی کی نگاہ میں اور بھی تاریک ہو گئی۔

”وہ چپ چاپ محلے سے باہر نکل گیا اور شہر کی فسیل سے نکل کر کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ اسے کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جا رہا ہے۔ کس مقصد کے لئے جا رہا ہے۔ اسے صرف ایک دھن تھی کہ شہزاد سے دور اس محلے سے دو۔ کہیں جنگل میں چلا جائے لیکن وہاں جا کر کیا کرے یہ اسے معلوم نہ تھا۔

کوئی پہنچ کر وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور کنکر اٹھا کر تالاب میں پھینکنے لگا۔ دیر تک وہ وہاں بیٹھا رہا حتیٰ کہ سائے ڈھل گئے اور آسمان پر شفق کی سرخ دھاریاں دوڑ گئیں۔ پھر بھی اس میں گھر جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ گلی کی عورتیں اسے دیکھ کر کیا کہیں گی۔ وہ اس سے پوچھیں گی ”یہ ایللی آن تو سارا دن باہر کیسے رہا۔“

کاش کہ

ہر جب شفق کی شہرینی دھاریاں سیاہی مایل ہو گئیں تو وہ اٹھا اور محلے کی طرف چل پڑا۔

”ایلی۔“ وہ سکرائی اس کی آنکھیں گویا جھیلوں میں تیر رہی تھیں ”یہ تمہیں کیا ہو گیا

”نہیں نہیں۔“ وہ چلانے لگا۔ ”میں۔ میں تمہیں کبھی تنگ نہیں کروں گا۔ میرے غلطیہ اندھے پاکیزہ جسم کو چھونے کے قابل نہیں۔“ ایلی نے شہزاد کا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔  
”میں اپنے وجود سے تمہاری زندگی کو ویران نہیں کروں گا۔ صرف ایک بار، ایک بار مجھے معاف کرو۔ میری حماقت کو معاف کر دو ایک بار کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا پھر میں چپ چاپ چلا جاؤں گا۔ چپ چاپ اور چاہے میری زندگی تاریک ہی کیوں نہ ہو جائے میں کبھی بھول کر بھی

”ایلی۔“ وہ چلائی۔ ”تم نے مجھے کیا سمجھا ہے۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ از سر نو فتیں کرنے لگا۔ ”مجھ سے غلطی ہوئی میں تسلیم کرتا ہوں۔“  
”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“ وہ بولی۔ ”ایلی میری طرف دیکھو۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

”تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ کس قسم کی عورت سمجھتے ہو مجھے کیا میں —؟“

”نہیں نہیں مجھ سے غلطی ہوئی۔“ وہ از سر نو گھبرا گیا۔

شہزاد نے بڑھ کر اس کے بازو پکڑ لیے۔ ”تم سمجھتے ہو کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ مجھے خواہش۔“ وہ رک گئی اس کی آنکھوں سے آنسو گرا۔ وہ گھبرا گیا۔ وہ کیوں رو رہی تھی۔ کیوں رو رہی تھی۔

”کاش تم اس قسم کی غلطی نہ کرتے۔“ وہ بولی۔ ”کاش تم میرے لیے صرف ایلی ہی رہتے۔“  
”نہیں نہیں معلوم ہوتا کہ مجھے صرف تم پیارے ہو مجھے تم سے کوئی غرض نہیں۔“ وہ پھر رونے لگی۔

اگرچہ ایلی نے کبھی اس بات کو واضح طور پر تسلیم نہ کیا تھا کہ اسے شہزاد کے جسم کی ہوس تھی۔ اگرچہ وہ اس کی خوبصورتی سے بے حد متاثر ہوا تھا مگر یہ تاثر اس قسم کا نہ تھا جسے عشق کہا جاسکے۔ خوب صورت عورتیں تو اس نے کئی ایک دیکھی تھیں لیکن اسے ان سے عشق پیدا نہ ہوا تھا۔ یہ تاثر عملی طور پر اس حد تک صرف اس لیے بڑھ گیا تھا کیونکہ اسے شہزاد کا قرب حاصل تھا کیونکہ اسے شہزاد کے قریب رہنے کے مواقع حاصل تھے۔ شاید دل ہی دل میں سوچا ہو

چھتی گلی کے پاس جا کر وہ پھر رک گیا۔ شاید وہ چھتی گلی میں بیٹھی ہوں۔ لیکن چھتی ویران پڑی تھی۔ شہزاد کے مکان کی ٹپلی منزل میں سے آوازیں آرہی تھیں۔ وہ دگ کر لگا۔

دھنسا۔ اسے خیال آیا کہ کیسے وہ باہر نہ نکل آئیں اس خیال پر وہ ڈر کر بھاگا۔  
اندھیری ڈیوڑھی میں وہ دھم سے کسی چیز سے ٹکرایا۔  
”ہائے۔“ کسی نے چیخ سی ماری۔

اس کا دل ڈوب گیا۔

”کون ہے کون؟“ اس نے چلا کر کہا مگر اس اندھیری ڈیوڑھی پر خاموشی طاری رہی۔  
اس نے محسوس کیا جیسے کوئی دھندلی شکل اس کے قریب ہی کھڑی ہو۔  
”کون ہے کون ہے۔“ وہ پھر چلایا۔ اس نے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے ہاتھ چاٹا۔  
نرم و گرم لمس سے گھبرا کر اس نے وہ لنگتی ہوئی چیز تھام لی۔ اس کے سامنے شہزاد کی ڈیوڑھی تھی۔  
کشتی نما آنکھیں ابھر آئیں۔

”اوہ۔“ اس نے گھبرا کر شہزاد کا بازو چھوڑ دیا۔ اور بھاگنے لگا۔

”ایلی۔“ شہزاد کی آواز میں منت تھی۔ ”ایلی افسوس ہے تم پر۔“ اس نے اس کی اس کوٹ پکڑ لیا وہ تڑپ کر مڑا اور سمجھے سوچے بغیر وہ اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ وہ ٹپکنا لینے لگا۔ ”میں نے جرم کیا ہے شہزاد۔ میں نے چاند پر — وہ بات پوری نہ کر سکا شہزاد خاموشی سے بت بنی کھڑی رہی۔ ”میں تمہارے قابل نہیں ہوں شہزاد نہیں ہوں۔ کاش کہ تم سے کبھی نہ ملتا۔ میری نگاہ تم پر کبھی نہ پڑتی۔ مجھے، زمین جگہ دے دیتی اور میں اس میں جا جاتا۔“

”ایلی۔“ وہ چلائی۔ ”یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟“

لیکن ایلی اس کی بات سننے بغیر بچے کی طرح روتا اور چلاتا رہا۔ ”شہزاد تم اپنے دل میں کتنی ہوتی ہوگی۔ تم کیا سمجھتی ہوگی۔ کاش میں اس قاتل ہوتا کہ تمہیں اپنی یا سکہ میں نے تمہیں اپنی ملکہ بنایا تھا۔ میں نے تمہیں اپنی دیوی بنایا تھا مگر میں تمہاری پوجا نہ کر سکا۔ میرے پاس ہی کیا جو تمہیں ملکہ بناؤں۔ مجھے معاف کر دو شہزاد شہزاد۔“



لے ایک بلند و بالا ہستی سمجھتا تھا۔ ایسی ہستی جو اس قابل تھی کہ اسے دیوی بنا کر پوجا جائے۔  
اس طرف وہ سمجھتا تھا کہ وہ ایک مشاق کھلاڑی تھی ورنہ وہ کبھی اس رات اس کا ہاتھ تھانے  
کی جرات نہ کرتا اگرچہ اس خیال کو اس نے شعوری طور پر کبھی نہ اپنایا تھا وہ سمجھتا تھا کہ شنراؤ کا  
ہم دیکھنے والے کو شہہ دینے کی غرض سے ہونٹوں پر آتا ہے اس کی چال اس اہر انداز اس کی  
تہذیب اس کی ہر چھوٹی جنبش دعوت تھی، صدائے عام تھی۔ اسے کبھی یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ  
شنراؤ کسی کی ایسی لغزش پر دکھ محسوس کر سکتی ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ تھا کہ محلے کے تمام  
نوجوان شنراؤ کے گرد پروانوں کی طرح گھومنا کرتے تھے اور وہ ہر ایک سے ہنس نہی کر بات کرنے  
کی بلوی تھی۔ رفتی ریشمیں رومال ہلاتا ہوا اور جھجکتا ہوا پوچھتا۔ ”میں نے کہا پوچھ آؤں شاید  
کئی سودا ہو سکتا ہو میں نے کہا پوچھ آؤں۔“

”ہوں تو آگئے تم۔ میں بھی کہتی تھی۔“ میں نے کہا پوچھ آؤں ”صبح سے نہیں آیا۔ اچھا  
نہ۔“ میں نے کہا پوچھ آؤں ”ذرا بیٹھ جاؤ۔“ پھر وہ اپنی سیاہ آنکھیں گھما گھما کر اس کی طرف  
دیکھتی اور مسکراتی۔ اس وقت ایللی محسوس کرتا جیسے اس کے پوچھنے کی عادت پر مذہن اڑا رہی ہو۔  
اور اسے یقین کر رہی ہو کہ پوچھنے کی عادت چھوڑ دے اور بنا پوچھنے کی جرات پدا کرے۔  
یاد جب بھی صفر اس کی نظر پڑ جاتا۔ تو وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر چلائی۔  
”میں نے کہا کس خیال میں کھڑا ہے تو۔ وہ پار سن نہیں بھولی ابھی تک لیکن میں کہتی ہوں  
لب آئیں بھرنے سے کیا حاصل۔ جب موقعہ تھا تب کھو دیا۔“

جب شنراؤ اس قسم کی بے تکلف باتیں کرتی تو ایللی محسوس کرتا جیسے وہ لوگوں کو اکسار ہی ہو  
— متوجہ کر رہی ہو۔ اس وقت وہ محسوس کرتا کہ وہ ایک کھلاڑی ہے۔ لیکن جب وہ پر غم  
انگڑوں سے ایللی کی طرف دیکھتی اور کہتی ”ہے ایللی یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم نے مجھے کیا سمجھتا  
ہے۔“ اس وقت وہ محسوس کرتا کہ اس کی بظاہر شوخی محض ایک دکھلاوا ہے اور درحقیقت وہ  
ایک عظیم شخصیت کی مالک ہے۔

شنراؤ کے دل کی گہرائیوں کو محسوس کر کے ایللی اس سے محبت کرتا تھا۔ ایسی محبت جس میں  
خفا کی گھبراہٹ اس وقت ایللی کی نگاہ میں شنراؤ دیوی کا روپ دکھار لیتی تھی وہ بچاری بن کر اس  
کے قدموں میں گر جاتا۔

لیکن جب شنراؤ میں شوخی کا عنصر بیدار ہوتا اور وہ دوسروں سے چمک کر بات کرتی تو ایللی

کہ وہ شنراؤ سے تفریح کے چند لمحات حاصل کر سکتا تھا کیونکہ ایک تو شنراؤ محلے والوں کا  
بہتر دل نہ تھی۔ اور اس لیے اس سے دل کی بات کہی جاسکتی تھی اور دوسرے چونکہ وہ  
تمام نوجوانوں کی نگاہوں کا مرکز تھی شاید اس کا خیال ہو کہ شنراؤ اس کی جرات اور جھڑپ  
نہ مانے گی۔

”کاش کہ تم مجھے سمجھ سکتے۔“ شنراؤ نے بمشکل کہا۔ ”کاش کہ تم جانتے۔“ یہ کہہ کر  
پڑی اور وہ چپ چاپ حیران وہیں کھڑا رہا۔

دیر تک وہ وہیں کھڑا رہا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی بے عزتی کی گئی ہو۔ شاید اس  
خیال تھا جب وہ شنراؤ سے معافی مانگے گا تو شنراؤ اسے تھپک کر کہے گی اب تو معاف کر لیں  
آئندہ سے کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اور بات آئی گئی ہو جائے گی۔ مگر شنراؤ کے برعکس وہ  
ہوتا تھا جیسے وہ کسی بات پر دکھ محسوس کر رہی ہو۔

کچھ دیر تک تو وہ وہاں اس اعتبار پر کھڑا رہا کہ وہ دونوں اس اندھیری ڈیوڑھی میں پھنس  
طرح آنکھ پھولی کھیل رہے تھے اس کا خیال تھا کہ شنراؤ وہیں کہیں چھپی کھڑی ہے اور  
چوری اسے دیکھ رہی ہے۔ اس صورت میں تو اسے فوراً ”جانا نہیں چاہئے آخر وہ کیا کہے گی  
ایللی کا جذبہ اس قدر کمزور ہے کہ گرنے کے بعد فوراً ہی سنبھل جاتا ہے۔ اس میں اور کیا  
نہ تھی بس ایک محبت ہی تھی تا صرف محبت اس لیے اس کے محبت کے جذبے میں تو اس  
کمزوری نہیں ہونا چاہئے۔

لیکن جلد ہی اسے احساس ہوا کہ اندھیری ڈیوڑھی میں اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں  
اندھیرا بھی وہ جس میں نہ جانے کیسے کیسے کپڑے کوڑے رینگ رہے تھے اس خیال کے آگے  
وہ گھبرا گیا اور آخری مرتبہ ڈیوڑھی کا جائزہ لے کر میڑھیاں چرھنے لگا۔

گھر جا کر دیر تک وہ چارپائی پر پڑا سوچتا رہا۔ کیا واقعی شنراؤ کو اس سے شکایت تھی؟  
کے انداز میں غصے کی نسبت دکھ کی جھلک تھی۔ اس نے اسے دکھ تو نہیں پہنچایا تھا۔ پھر اس  
آنکھوں میں آنسو کیوں تھے؟ وہ رو کیوں رہی تھی کیا وہ ایللی کی خفت پر رو رہی تھی؟  
خفت پر اسے رونے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا وہ اس لیے رو رہی تھی کہ ایللی سے اسے  
میسر نہ ہو سکتی تھی۔

دراصل شنراؤ کے متعلق ایللی کے خیالات اور جذبات متضاد قسم کے تھے ایک طرف تو

آتش رقابت میں جلتا۔ اس کا دل یوں سلگنے لگتا جیسے کسی نے بھس میں آگ لگا دی ہو۔  
شہزاد اس کی نگاہ میں قلو پطرہ کی حیثیت اختیار کر لیتی اور وہ سمجھتا کہ شہزاد کو اس سے کیا  
نہیں وہ صرف اس سے کھیل رہی ہے جیسے وہ اک کھلوتا ہو۔ وقتی تفریح کا سلسلہ۔  
اس روز اندھیری گلی میں شہزاد کا برتاؤ دیکھ کر ایلی کو بے حد تعجب ہوا آخر وہ ایلی  
روسیے پر اس قدر پریشان کیوں تھی۔ اسے دکھ کیوں ہو رہا تھا۔ ایلی کے خیال کے مطابق  
اسے فرحت کے گھر آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اور اگر آتی بھی تو اس کے انداز میں تسکین اور  
غصہ ہونا چاہئے تھا۔

### جلد کا کھیل

ایلی گھر پہنچا تو فرحت نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”تو کہاں رہا آج سارا دن ایلی شہزاد  
تجھے تلاش کرتی رہی آج۔ توبہ ہے صبح سے اب تک بیسیوں مرتبہ آئی ہوگی لوہر۔“  
”کہاں چلا گیا تھا تو۔“ ہاجرہ بلی زبان سے بولی۔ ”میں تو ڈر گئی۔“ کیوں خیر تو ہے؟  
نے پوچھا۔ ”بولتا کیوں نہیں۔“

”ویسے ہی باہر چلا گیا تھا۔“ ایلی نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔  
”تو تو کبھی نہیں نکلا باہر۔“ فرحت نے کہا۔ ”ہر وقت وہیں گھسا رہتا ہے شہزاد کے پاس۔“  
”اے ہے کیا کہہ رہی ہے تو۔“ ہاجرہ نے فرحت کو ٹوک۔ ”چاہے کہیں رہ بیٹا لیکن وہ  
سے باہر نکل جانا بتائے بغیر۔ تیری تو عادت ایسی تو نہیں۔“

”لڑائی تو نہیں ہو گئی تمہاری آپس میں۔“ فرحت بولی ”بیچاری صبح سے سرگردان  
تھی۔“

”جاکر اسے مل آ۔ اسے معلوم ہو کہ تو آگیا ہے۔“ ہاجرہ نے کہا۔  
”نہ اس وقت میں تھا کہ ہوا ہوں۔“ ایلی نے کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گا۔“  
”اے ہے وہ بیچاری۔“ ہاجرہ نے اس کی منت کی۔

”چھوڑ بھی ماں۔“ فرحت بات کاٹ کر بولی۔ ”زبردستی کیوں کرتی ہو۔ اس کا منہ  
تو نہ سہی۔ خواہ مخواہ۔ ایسا بھی کیا ہے صبح ہو آئے گا۔“

رات کو دیر تک وہ چارپائی پر پڑا سوچتا رہا۔ ”نہیں نہیں وہ مجھے کبھی اچھا نہیں سمجھا  
اور محبت۔ محبت کس برتے پر کی جاتی ہے زبانی دعوے کون خاطر میں لاتا ہے۔“  
باتیں۔“ اس وقت رات کے اندھیرے میں دو رنگین بازو اس کی طرف بڑھتے۔ ”ایلی! تو  
لے۔“ ارشد چلا۔ ”وہ گھڑ۔“ ارشد دیکھ بھی۔ میرے منہ کی طرف کسا دیکھتا ہے بار۔ یہاں تو

”ارے تم اتنی سویرے۔“ ارشد اسے دیکھ کر چلایا۔ ”کیس تم نمازی تو نہیں بن گئے  
اپنے اپنی کالٹا اثر تو نہیں ہو گیا۔ آؤ آؤ اہل رک کیوں گئے۔ بیٹھ جاؤ آج وہ چیز دکھائیں گے  
نہیں کہ قسم ہے عمر بھر نہ دیکھی ہو کبھی۔ کیا یاد کرو گے کہ کوئی دوست تھا اپنا۔ یہ کھڑکی کھولنا  
ذرا۔ یہ جو سرہانے کی طرف ہے۔“

”ارے رے رے۔“ وہ چلایا۔ ”تم نے تو بالکل ہی کھول دی۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر  
کھڑکی کے پٹ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”اہل کوئی ہوا تھوڑی کھانی ہے کہ پٹ کھول دیں۔ اپن  
لے تو محض دیوڑی درشن کرتے ہیں اور چوٹ کھلی ہو تو دیوڑیاں چوکی ہو جاتی ہیں اور پھر درشن  
مما وہ بات نہیں رہتی۔ یہ اتنی درز کافی ہے اب دیکھو۔ اونہوں گھبراؤ نہیں۔“ ارشد بولا۔  
”اے لوہر نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہی ہے اور باقی سب سو رہے ہیں بے تکلف دیکھو۔ سامنے  
چوبارے میں ساری کوریوں اور ڈکورے پازری باری جاگیں گے اور پھر جاگتے ہی ہر کوئی پہلے  
آئینے کے سامنے آکھڑی ہوگی یہ ان کی ریت ہے۔ جاگتے ہی پہلے آئینے میں اپنا آپ دیکھتی ہیں  
کہ جن دن رات کو چوری تو نہیں کر لیا کسی نے آنکھیں ملیں گی۔ انگریزیاں لیں گی۔ آہا۔“ وہ  
چلایا۔ ”عورت کو دیکھنا ہو تو صبح سویرے دیکھو۔ آہا! کیا جین ہوتا ہے۔ جب وہ سو کر اٹھتی  
ہے آنکھوں میں غماز بال الجھے ہوئے۔ جسم گدرا لیا ہوا۔ اور پھر انگریزیاں۔ وہ کہا ہے نا استوا  
لے ہاتھ انگریز کی صورت آنکھ شرمائی ہوئی۔ آہا کیا کیفیت ہوئی ہے۔ واہ واہ واہ واہ —  
لے۔“ ارشد چلایا۔ ”وہ گھڑ۔“ ارشد دیکھ بھی۔ میرے منہ کی طرف کسا دیکھتا ہے بار۔ یہاں تو

دے دیکھا کیا ہے۔" ایلی کو چپ بیٹھے دیکھ کر ارچند نے چھلانگ لگائی اور دروازہ کھول کر پھر بستر کی طرف لپکا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ "یہ مٹی کے دیئے جھاڑ فانوس کے روبرو کیا حیثیت رکھتے ہیں۔"

ایلی چپ چاپ بیٹھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شہزاد اس کے لیے وہاں آئی ہے۔ لیکن اسے یقین نہیں آتا تھا۔ اس کے لئے شہزاد اتنی دور چل کر ارچند کے گھر آئے۔ جہاں پہلے وہ کبھی نہ آئی تھی۔ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ اس کشمکش میں کھویا ہوا تھا۔

"ارے او تجھے کیا ہو گیا ہے۔ زبان کیوں بند ہو گئی تیری۔ دیکھتا نہیں باہر کوکل کے کنہیا آئے ہیں واہ واہ اس کنہیا کی ہر بات نیاری ہے۔ بولنے میں جیسے تن اڑی ہو، چلتے میں جیسے اس رچائی ہو اور بات۔ ہے ہے کیا بات کرتے ہیں۔"

شہزاد کو دروازے میں کھڑی دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا اور گویا بھیڑنے کی کھال اتار کر بھیڑ کے داب میں آگیا۔ "سلام کتا ہوں۔" وہ ادب سے بولا۔

"کب آیا تو۔" شہزاد نے ایلی پر ایک اپشتی ہوئی نگاہ ڈال کر کہا۔

"چار روز کی چھٹی پر آیا ہوں جی۔" وہ بولا۔

"تو میں ہے ایلی۔" وہ ایلی کے قریب آکھڑی ہوئی "اور وہاں گھر میں تیری تلاش ہو رہی ہے میں نے تو کہا تھا ورنہ دروازہ ایسے نہیں ملے گا۔"

شہزاد کے کمرے میں داخل ہوتے ہی خوشبو کا ریلا آیا اور ایلی اسے محسوس کر کے مدھوش ہو گیا۔ نہ جانے شہزاد سے وہ خصوصی خوشبو کیوں وابستہ تھی۔ حالانکہ اس نے کبھی خوشبو استعمال نہ کی تھی۔ اور وہ خوشبو بھی عجیب سی تھی جیسے سحر کے وقت فضا سے پاس آتی ہے جسے نہ تو بول سکتا ہے اور نہ خوشبو۔

پھر دھن "شہزاد نے بڑھ کر ایلی کا منہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ "کیا ہے تجھے جواب کیوں نہیں دیتا۔" وہ بولی دبا ہوا آتش فشاں پھٹ گیا۔ ایلی کا سر ہوائی بن کر اڑ گیا۔ اور وہ خود لٹو کی طرح گھومتے لٹو لٹو گاس نے جھپٹ کر شہزاد کے بازو پکڑ لیے۔ اور پھر مڑ کر شہزاد کی طرف دیکھا اس کی اہلی ہوئی آنکھوں میں منت تھی، آہ دزاری تھی۔

شہزاد نے ایک رنگین قتیقہ لگایا۔ "اوہو۔" وہ بولی "میں تو حالات بہت بگڑے ہوئے ہوں ہوتے ہیں۔" اور وہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔

کچھ نہیں وہ تو ادھر ہے سانسے چوبارے میں آیا۔ کیا چال ہے کیا انداز ہے۔ ہے یہی بلبل تجھ پر قربان۔ بولو۔ وہ انگڑائی شروع ہوئی واہ واہ واہ۔ کیا انگڑائی لینے کا سلیقہ آتا ہے ان کی بونی بونی تھرک جاتی ہے سبحان اللہ۔"

اور وہ دیر تک کھڑکی کی درز سے مقابل کے چوبارے کی عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ حتیٰ کہ سورج چڑھ آیا گھر کے سب لوگ بیدار ہو گئے۔ لیکن ارچند ان باتوں میں بہت دل نہ دے کب آڑے آنے والا تھا۔ اس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور چار لگ۔ "ماں ادھر کوئی نہ آئے۔ میں ایلی کو جادو کا کھیل دکھانے لگا ہوں۔" پھر وہ دبی آواز میں بولا "ابے دیکھ بے جادو کا کھیل واہ واہ کیا جادو گرئی ہے موسیٰ کو پاگل نہ بنا دے تو اپنا زمرہ۔" اور با آواز بلند کہنے لگا۔ "دیکھو بھی ایلی یہ انداز ہے انداز عام مرغی کا انداز اس میں نہ تو کھلی گی اور نہ اس کے اندر کوئی گیس چھپا ہے اب میں اس کو روشن کرتا ہوں۔ اندازوں چمکے جیسے اندھیرے میں جگنو چمکتا ہے۔ ہے ہے۔" پھر وہ زیر لب چلایا۔ "ارے ادھر دیکھ نا ااااا کیا جگنو چمک رہے ہیں اندھیرے میں۔"

## مرلیا باجی رے

"چاچی۔" نیچے سے شہزاد کی آواز سن کر ایلی کا دل ڈوب گیا۔ "میں نے کہا تھا گھر پر ہی ہے ناتو۔" وہ پھر چلائی۔

وہی ہے ایلی کے دل میں کسی نے کہا۔ شہزاد کی آواز محلے بھر سے الگ تھی اس میں نا لوچ تھا۔ ایک خوشی تھی۔

"ارے۔" ارچند چلایا۔ "مرلیا کہاں باجی رے۔"

باہر ارچند کی ماں کہہ رہی تھی۔ "تو شہزاد۔ تو ادھر کیسے آ نکلی۔ کس رات تو نہیں گئی۔ شکر ہے تو میرے گھر آئی۔ ہے کتنی خوشی ہوئی ہے مجھے۔"

"ویسے ہی جا رہی تھی ادھر غنور کی طرف تو میں نے کہا چاچی کو دیکھ آؤں۔" ناہارہ آیا ہوا ہے۔"

"رام رام رام۔" ارچند بولا۔ "دیوی کے منہ پر اس کا نام آیا۔ ارے بے وقت بھاگ کر دروازے کی کنڈی کھل دے کیا معلوم نام جو اپنا لیا ہے تو شاید درشن بھی ہو جائے۔"

دب آیا ہے تو۔ نوکری کا معاملہ تو ٹھیک ہے نا۔“ ہاجرہ نے پوچھا اور جواب سنے بغیر ایللی نے چلنے پر ہلکی سی جھنجھکی ماری۔

میلو

جب وہ گھر پہنچا تو چمن سے شہزاد اس کے روبرو آکھڑی ہوئی۔ ”میں کے کہنے پر آگیا تو۔ اور جب میں گئی تھی اس وقت تو یوں چپ چاپ بیٹھا رہا تھا جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ جیسے جسم میں جان نہ ہو۔“

”آگیا ایللی۔“ فرحت اسے دیکھ کر بھاگی آئی۔ ”اے ہے۔ چائے تو پی کر جاتا۔ کب سے رکھی ہے اب تو ٹھنڈی بھی ہو گئی ہوگی۔ گرم کر دوں یا پھر سے بنا دوں۔“

”مجھے بھوک نہیں۔“ ایللی نے بے پروائی سے کہا۔

”تو چائے ہی پی لے۔“ ہاجرہ بولی۔

”میرا جی نہیں چاہتا۔“ وہ روکھی آواز میں بولا۔

شہزاد نے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ اور اسے کھینچتے ہوئے بولی۔ ”چل جو تیرا جی چاہتا ہے وہ کھاؤں تجھے چل۔“

فرحت نے شرارت بھری مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھا۔ ”تم ہی جانتو کیا جی چاہتا ہے اس کا۔ اپنے بس کی بات تو نہیں۔“

”جی تو لیے جا رہی ہوں اسے۔“ شہزاد نے ہنس کر کہا۔ ”تم پیچاری کیا جاناو۔“

”ہاں ہاں۔“ ہاجرہ بولی ”لے جا اسے لے جا بس خوش رہے میں تو یہی چاہتی ہوں۔ تیری بیٹی مریلی ہوگی۔“

پہلے تو ایللی نے بازو چھڑانے کی خفیف سی کوشش کی لیکن شہزاد سے بازو چھڑانا یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ پھر وہ اس کے پیچھے پیچھے گیند کی طرح لڑھکتا چل پڑا۔

”توبہ ہے۔“ وہ اکیلے میں کہنے لگی ”بڑے خڑے آگئے ہیں تجھے۔ مانتا ہی نہیں کسی صورت۔ دو روز سے پاگل کر رکھا ہے مجھے۔“

”لے بیٹھ میں۔“ شہزاد نے اپنے کمرے میں پہنچ کر اسی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”توبہ ہے دو روز سے کیا حال کر دیا ہے۔ میری طرف دیکھ۔“ اس نے ایللی کا سراپنہ ہاتھوں میں تھام

کمرے پر کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

پھر سیڑھیوں میں وہی چوکڑی بھرنے کی آواز سنائی دی چمن چمن چمن کوئی میز میز تھا۔

”ارے رے رے۔“ ارجمند چلایا۔ ”ہاں۔ مندر میں گھینٹیاں بجیں دیوی آئی اور چائے تو ابے او حرامی تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ سالے تو اندھا ہے۔ بد نصیب ہے۔ گدھا ہے تم پر ایک بار وہ اپن کا منہ سہلا دے تو دنیا تیاگ کر یوگی بن جاؤں۔ ارے دیوی کی دیوی ہے کے روبرو سب بیچ ہیں۔ ایسا چاند ہے جو چمک کر سب تاروں کو ماند کر دیتا ہے۔ دلوں کا ہے۔ اور تو۔ تو وہاں رہتا ہے اس کے پڑوس میں۔ اور وہ تیرے منہ کو ہاتھوں سے سہلا رہا ہے اور تجھ سے اشاروں میں باتیں کرتی ہے۔ اور پھر اتنی قریب۔ رام رام رام۔ ارے بار بار دھوکے ہی میں رکھا آج تک۔“

”کیا فضول بک رہا ہے تو۔“ ایللی نے چیخ کر کہا۔ ”چھوڑ —“ ”ارے کس کو چھوڑوں بھنورا پھول کو چھوڑ دے چکورا چاند کو چھوڑ دے پر اپن دیوی پوجا نہیں چھوڑے۔ پھر دیوی بھی ذہ جس کے چرنوں میں سکھ ہے شافی ہے۔ گود نہیں چرنوں میں۔ گود لالہ بیسیوں پھرتی ہیں۔ ان کی بات اور ہے۔“

شہزاد کو گئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہاجرہ آگئی۔ ”ہے ایللی تو یہاں بیٹھا ہے۔ سب وہاں ڈھونڈ کر پاگل ہو رہے ہیں۔“ وہ چلانے لگی۔ ”کسی کو بتا کر آیا ہوتا میں۔ لو۔ کوئی بندش لگا رکھی ہے تیرے آنے جانے پر۔ نہ کھانا نہ پینا نہ کسی کو بتایا کہ میں ارجمند کی جا رہا ہوں۔ یہ بھی کوئی بات ہے بس ناحق پریشان ہو رہی ہے وہ تو اللہ بھلا کرے شہزاد نے ڈھونڈ نکالا تجھے۔“

”ارے۔“ ارجمند زیر لب بولا۔ ”تو تجھے ڈھونڈنے آئی تھی۔ اپن سمجھے اپن کی بات پڑی۔“

”اور دیکھ بس دیے تو یہ اپنا ہی گھر ہے جس وقت چاہے آئے جائے لیکن میں آتا۔“ پھر وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ”کیا کر رہا ہے تو چل اب گھر چل پھر آجائے۔“

پاس ارجمند۔

”سلام عرض کرتا ہوں۔“ ارجمند اٹھ بیٹھا۔

لیا شنراو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا ایللی۔“ اس نے پوچھا۔  
 شنراو کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ایللی کا ضبط پاش پاش ہو گیا۔ وہ دم سے اس کے پاس  
 گر پڑا۔ ”میں تمہارے قاتل نہیں ہوں شنراو۔“ وہ بولا۔ ”میں تمہارے قاتل نہیں ہوں۔ میں  
 نااہل ہوں بچ ہوں بچ۔“ اس کی گھٹکی بندھ گئی۔ شنراو نے اس کا سراپے جسم سے لگا لیا اور  
 تھپکنے لگی۔  
 ”ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ تم کیا ہو یہ مجھ سے پوچھو۔ جو حالت میری ہوئی ہے تمہارے  
 بغیر میں ہی جانتی ہوں۔“

”میں کچھ کھا کر مر جاؤں گا۔ زندگی بے کار ہے اب۔“ ایللی نے کہا۔  
 ”چپ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ تم مر جاؤ گے تو میرا کیا ہو گا۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے  
 ایللی۔ مجھے تمہاری لگن ہے صرف تمہاری تم سے کچھ نہیں چاہئے۔ بس تم میرے پاس رہو۔  
 میرے سامنے رہو اور کچھ نہیں مانگتی میں۔“  
 ”نہیں نہیں۔“ وہ چلایا ”میں اپنی زندگی ختم کروں گا۔ اگر تم سے محبت نہیں کر سکتا تو  
 بیچ ہے بیچ ہے۔“  
 ”محبت اسے نہیں کہتے بچے۔“ وہ بولی۔ ”مجھے اس کی پروا نہیں۔ مجھے کسی چیز کی پروا نہیں  
 مجھے صرف ایللی چاہئے۔ صرف ایللی۔“ اس کی آنکھوں سے ایک آنسو گرا۔  
 ایللی سکیں بھرنے لگا۔ ”تم اتنی حسین ہو تم اتنی پیاری ہو۔ دنیا تمہارے دروازے پر  
 شنراو تم اتنی رکتیں ہو کہ تمہیں دیکھ کر میں نشے میں جھونے لگتا ہوں۔ تمہیں محسوس کرتے  
 میری کائنات بدل جاتی ہے اور میں میں ایک ذلیل نااہل شخص ہوں۔ بیچ ہوں۔“  
 ”تمہیں کیا معلوم۔“ وہ بولی ”تم کیا ہو۔ چھوڑو اب۔ معاف کر دو مجھے۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر  
 سامنے کھڑی ہو گئی۔ اسے یوں ہاتھ جوڑے کھڑی دیکھ کر وہ دیوانہ وار اٹھا اور شنراو کا ہاتھ  
 چومنے لگا۔ جانو کے پاؤں کی چاپ سن کر وہ الگ ہو گئی۔ اور کھڑکی میں یوں کھڑی ہو گئی جیسے روز  
 ازل سے وہاں کھڑی ہو۔ پھر جانو آئی تو شنراو بولی۔ ”کیا کر رہی ہے تو جانو کچھ خبر بھی ہے  
 کتنی محنت سے ایللی کو تلاش کر کے لائی ہوں اب اگر تو نے اس مادہ کو کی خاطر تواضع نہ کی تو  
 پھر روٹھ کر چلا جائے گا۔“

”بڑا مادہ ہو منہ تو دیکھو۔“ جانو نے کہا۔ ”خبرے کرتا پھر تارے اول تو گھر سے باہر نہیں  
 اگلے روز جب وہ دونوں بظاہر ایک دوسرے کے قریب لیکن حقیقتاً ایک دوسرے سے  
 مدت دور بیٹھے تھے تو شریف آ گیا۔ شریف کو دیکھ کر ایللی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اس نے یوں  
 محسوس کیا جیسے وہ پکڑا گیا ہو وہ گھبرا کر اٹھا۔ بات کرنے کے لیے اسے الفاظ نہیں ملتے تھے زبان  
 ٹٹا گیا قوت گویائی مفقود ہو چکی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے بازوؤں کو کیسے سنبھالے جو  
 ٹٹا ٹٹا کر گویا زمین سے جا گئے تھے اس نے خوشی کا اظہار کرنے کے لیے ہنسنے کی کوشش کی  
 لیکن اس کی باجھوں پر گویا تالے لگے ہوئے تھے۔ آنکھیں اس حد تک کھل گئی تھیں کہ کوشش  
 کے بغیر وہ انہیں قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔

### جوش رقابت

”یک وہ چارپائی پر پڑا کروٹیں لیتا رہا۔ پھر سیڑھیوں میں چھن چھن کی آواز سن کر چونکا۔  
”ایلی کہاں ہے۔“ شہزاد جسم تبسم بنی ہوئی سانسے کھڑی تھی۔

اسے اکیلا دیکھ کر وہ بولی ”تم بھاگ کیوں آئے۔ خواہ مخواہ چلے آئے۔ واہ یوں کسی کو اکیلا  
میں چھوڑا کرتے۔ چل اٹھ۔“

”میں نہیں جاتے۔“ وہ منہ بنا کر بولا۔

”کیسے نہیں جاتے۔“ اس نے اس کے گل سلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں جاتے۔“ وہ غصے میں اس کا ہاتھ جھٹک کر بولا۔ ”تم جاؤ۔ اپنے میاں کا دل بسلاؤ جا کر  
میں آؤں یا نہ آؤں تمہیں کیا پڑی ہے۔“

”اوہو۔“ وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”تم نہ جاؤ گے تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔  
میرا دل کیا کام۔ کوئی آئے یا جائے مجھے کیا۔“

”پاگل ہو گئی ہو۔“ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ ”یہ سب لوگ کیا کہیں گے۔“  
”پڑے کیس۔“ وہ بولی ”مجھے نہیں پروا۔“

”میاں سے پڑ گئی تم۔“ ایلی نے مصنوعی غصے سے کہا اگرچہ شہزاد کی باتیں سن کر اسے ایک  
لن جانے خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی خاطر شہزاد سبھی کچھ کرنے کے لیے تیار تھی۔ دنیا بھر  
سے جنگ کرنے کے لیے تیار تھی۔

”پڑ گئی۔“ وہ چلائی۔ ”مجھے کون پیٹ سکتا ہے جی۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”وہ بیچارہ کیا کرے  
گداس کی کیا مجال ہے۔ چلو اٹھو ——— ورنہ ———“

”ورنہ کیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”ورنہ میں بھی میس لیٹ جاؤں گی تمہارے ساتھ۔“

ایلی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ”پاگل ہو گئی ہو۔“ ایلی نے کہا۔

”ہاں ہو گئی ہوں۔“ وہ بولی۔

”لوگوں ہو گیا ہے پاگل۔“ فرحت نے داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”میں لور کون۔“ شہزاد نے جواب دیا۔ ”تم سب تو سیانیاں ہو۔ پاگل تو ایک میں ہی ہوں

”میں لور ہوتی ہو پاگل۔“ فرحت بولی ”حکیم نے کہا ہے کیا۔“

”میں میں اس۔ آپ آپ۔ یعنی میں۔“ اس نے شریف کے آنے پر خوشی کا اظہار کرنے  
کے لیے کچھ کہنا چاہا۔

شہزاد اطمینان سے بیٹھی اپنی کام میں یوں مصروف رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے شہزاد  
کا آنا یا نہ آنا۔ ایلی کا اس قدر قریب بیٹھے ہونا یا نہ ہونا سب برابر ہو۔

”کیوں ایلی۔“ شریف نے کہا۔ ”خوش ہو تم بڑی مشکل سے چھٹی ملی ہے مجھے۔ جلد  
حقہ تو بھرتا۔“

”چائے بھی تو بنا دو جانو۔“ شہزاد بولی۔ ”اور کھانا بھی تو کھائیں گے۔“

شریف نے بیک وقت تبسم اور مغموم نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ لیکن شہزاد اپنے  
کام میں مصروف تھی۔ ایلی نے محسوس کیا کہ اسے وہاں سے کھسک جانا چاہئے اس نے پہلی روز  
شہزاد کے گھر میں محسوس کیا جیسے اس کی حیثیت جملہ معترضہ کی ہو۔ کچھ دیر وہ وہاں جلد باز  
بیٹھا رہا پھر اٹھا۔ ”ابھی آؤں گا۔“ وہ بولا ”ذرا گھر سے ہو آؤں۔“

”اچھا۔“ شریف نے جواب دیا۔ ”لیکن آنا ضرور تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“  
نے سوچا۔ اس نے محسوس کیا جیسے شریف صورت حالات سے پورے طور پر واقف ہے۔  
اسے علم ہے کہ ایلی وہاں کیوں آتا ہے اور اس نے اسی بارے میں باتیں کرنی ہیں۔

گھر پہنچ کر وہ دھڑام سے چارپائی پر گر پڑا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ ہاجرہ دوڑتی ہوئی آئی۔ ”خیر تو ہے۔ پھر کوئی بات تو نہیں ہوگی۔“

”بات کیا ہوئی ہے۔“ فرحت نے ہنس کر کہا۔ ”گھر والے اپنے گھر آگئے اور کھلا۔“

”کیا مطلب ہے تیرا فرحت؟“ ہاجرہ نے پوچھا۔

”شریف چھٹی لے کر آیا ہے اور کیا۔“ فرحت بولی۔

”ہائیں شریف آیا ہے۔“ ہاجرہ نے حیرانی سے دہرایا ”لیکن اس میں کیا ہے۔“

”پوچھو ایلی سے۔“ وہ بولی ”آخر اس نے تو گھر آنا ہی ہوا۔“

اس وقت ایلی اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ اس نے فرحت کی بات کا برا نہ مانا اس وقت  
عجیب کیفیت تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شریف کی آمد پر اسے دکھ کیوں  
ہے۔ شریف کو تو وہ بہت اچھا سمجھتا تھا وہ تو ایلی کا پیارا دوست تھا پھر اس کی آمد اس قدر  
کون سے وجوہات سے اسے دکھ کیوں ہو رہی تھی۔

”حکیم نے تو نہیں کہا۔“ وہ اٹھ کر بولی۔ ”البتہ تم ایسے سیانوں کو دیکھ کر مٹی چاہتا ہے ہو کر کہیں نکل جاؤں۔“

شنزاد کے انداز تکلم میں غضب کی دھار تھی۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک معصوم نہ تھا۔ ”اب آؤ گے بھی یا نہیں۔“ وہ ایللی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”اب آگئی جاؤ۔ وہ انتظار رہے ہیں چائے سامنے رکھی ہے ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

ایللی وہاں پہنچا تو شریف چائے کا پیالہ سامنے رکھے اسی طرح چھت کی طرف ٹھکی ہوئے بیٹھ تھا۔ ایللی کو دیکھ کر اس نے اپنی مخصوص حسرت زدہ مسکراہٹ سے کہا۔ ”نہ جانے کیا ہوا ہے جسے چاہو وہی دور بھاگتا ہے۔ اب یہ ایللی بھی محبوب سے غم کرنے لگا۔ اپنی قسمت ایسی ہے۔“

”نہیں نہیں۔“ ایللی چلایا ”میں تو وہاں —“

## انوکھے اظہار

”اب چھوڑو ان باتوں کو۔“ شریف نے کہا۔ ”یہ بہانے اپنے لیے نئی چیز نہیں تم بہ طبیعت ملی تھی سوچا تھا خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے لیکن اب تم بھی کئی کڑے لگے ہا یاد آیا۔ یہ تو بتاؤ امر تسروالی کا کیا حال ہے کچھ بات بنی یا نہیں۔ اسے علم ہوا یا نہیں۔ کیوں نہ گا علم محبت اثر کیے بغیر رہ سکتی ہے کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ محبت میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے نہ کر اور کوئی طاقت نہیں۔ تو بتاؤ نا ہمیں۔ کیا وہ بھی مضطرب ہے۔ کیا اسے بھی خیال ہے۔ نہ ہو گا۔ لیکن اس کا اظہار بھی ہوا ہے یا نہیں۔ تمہارے جذبے کی آزمائش ہے ایللی۔ دیکھا تمہارے جذبے میں کتنا اثر ہے۔“ ایللی کو خاموش دیکھ کر شریف نے کیوترکی سی آنکھیں ملنے ہوئے کہا۔ ”کیوں تمہیں تو معلوم ہے کچھ۔“ اس نے شنزاد سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

”سارے محلے میں چرچا ہے۔“ شنزاد بولی ”سنا ہے حسن میں جواب نہیں اس کا جی وہاں کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ دیکھو تو اس کی طرف مجھ سے کتنا تھا۔“ وہ ہنسی بے تحاشہ ہنسی ملی گئی۔ ”مجھ سے کتنا تھا کہ زہر کھالوں گا۔“ ایللی نے غصے سے شنزاد کی طرف دیکھا۔

”اب دیکھ لیجئے کیسے دیکھ رہا ہے میری طرف۔ پر ایمان سے کتنا ایللی تم نے کہا نہیں نہ سے میں زہر کھالوں گا۔“

ایللی جرنی سے شنزاد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی شوخی اور بے یابی دیکھ کر وہ گویا سکتے ہیں

ایللی

”ہو نہیں۔“ شریف مسکرایا۔ ”زہر کھانا مردوں کا کام نہیں۔“

”میں نے اس سے کہا تھا۔“ شنزاد قہقہہ مار کر — ہنسی ”لیکن یہ کہتا ہے میں مرد نہیں۔ کوئی پوچھتے کیسے نہیں۔ میں تو مرد سمجھتی ہوں اسے۔“

”زہر کھانا یا مرجانا مرد کا کام نہیں۔“ شریف بولا۔ ”میری طرف دیکھو جی رہا ہوں۔ اتنا کچھ جمل کر بھی جی رہا ہوں۔ تم یہ بتاؤ اس کو بھی خیال ہے تمہارا یا نہیں۔“

شنزاد نے پھر قہقہہ لگایا۔ ”وہ تو مرنی ہے۔“ وہ بولی ”اسی کو یقین نہیں آتا یہ سمجھتا ہے کہ اسے زرا بھی پروا نہیں۔ اب وہ بیچاری کیا کرے۔“

”کیوں ایللی۔“ شریف نے پوچھا۔

ایللی شنزاد کی دو دھاری باتوں پر طیش میں آ رہا تھا۔ لیکن ان باتوں میں جو کنہیہ کی مدد سے ایللی سے کی جا رہی تھیں ایک عجیب سی لذت تھی۔

”کیوں مذاق کر رہی ہیں آپ۔“ ایللی نے شنزاد کو گھورا۔

”مذاق۔“ وہ بولی۔ ”اب میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں نے زندگی بھر میں کبھی اس قدر عجیبی سے بات نہیں کی۔ مشکل تو یہ ہے کہ تمہیں یقین نہیں آتا اب میں کیا کروں۔“ شنزاد کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ ایللی گھبرا گیا۔ وہ شریف کی موجودگی میں براہ راست اس سے ”وہ باتیں کر رہی تھی جو اس نے ایللی سے کبھی نہ سنی تھیں۔“

اور شریف بھولا بھالا شریف مسکرا رہا تھا۔ ”ٹھیک کہتی ہے یہ۔“ وہ شنزاد کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا۔ ”ابتداء میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ دوسرے کی بات کا یقین نہیں آتا۔“ بس ایللی کو جی ہی نہیں آتا۔ ”شنزاد بولی۔“ ”اب میں کیسے یقین دلاؤں اسے۔“

”ہاں ہاں۔“ شریف نے کہا — پھر اس نے آہ بھری لیکن وہ بولا ”جب عشق پرانا ہو جاتا ہے تو پھر دنیا ہی بدل جاتی ہے نہ شکوک نہ گلہ نہ بے یقینی۔“

”نہ جانے وہ دن کب آئے گا۔“ شنزاد نے حسرت ناک آواز میں کہا۔

”اب آئے گا؟“ شریف چونک پڑا۔ پھر آپ ہی آپ ہنس کر بولا۔ ”اچھا تو تم ایللی کے حوصلے کو دیکھ رہی ہو۔ میں سمجھا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔



”اور کیا آپ کے متعلق کہہ رہی ہوں۔“ شہزاد ققمہ مار کر بولی۔ اس کی بات سن کر دونوں میں بلا کی تحقیر تھی۔ ایللی کانپ گیا۔

شہزاد اس کے نزدیک ایک معمہ تھی۔ اس میں بلا کی جرأت تھی اور وہ بات اعلیٰ سے بچکاتی نہ تھی اور سب سے عجیب ترین بات یہ تھی کہ کسی تیسرے آدمی کی موجودگی میں ایللی سے اس قدر قریب ہو جاتی تھی جیسے اس کی گود میں بیٹھی ہو۔ اس کے اشارات کی وضاحت اور رنگین ہوتے تھے اس کی حرکات سے محبت آمیز شرارت یا شرارت آمیز محبت لیکن تنہائی میں اس کا انداز قطعی طور پر بدل جاتا تھا جیسے وہ ایللی کے وجود ہی سے منکر ہو۔

کے خدوخال پر سرد مہری کا دیز پر وہ پڑ جاتا اور اس کا حسن بے جان ہو کر رہ جاتا تھا۔ جب ایللی اپنے بستر پر پڑا تھا تو وہ سوچ رہا تھا کہ وہ دونوں مل کر شریف کو دھوکا دے رہے ہیں۔ کا مذاق اڑا رہے ہیں اور معصوم اور پیارا شریف بے خبری میں دھوکے کھائے جا رہا ہے۔

ایک دوسرے سے اظہار محبت کا ذریعہ بن رہا ہے۔ ایللی کو یہ باتیں سوچ کر دکھ ہو رہا تھا کہ رہا تھا کہ وہ ایک مجرم ہے۔ اسے شریف سے ہمدردی ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی اسے یہ خیال آتا کہ شریف اس وقت شہزاد کے قریب بیٹھا ہو گا۔ وہ اس سے اظہار محبت ہو گا۔ اور شہزاد اپنے خاوند کی آمد پر شوق محبت سے بے تاب ہوئی جا رہی ہو گی تو اس کے بچے پر سانپ لوٹ جاتا۔ اور اسے شریف سے نفرت ہونے لگتی۔ ”لا حول ولا قوۃ کیا یہ وہ آواز ہے وقف جس کے منہ سے ہر وقت رال نکلتی ہے۔ جو ہر وقت کبوتر کی طرح آنکھیں ہلکا چھت کو گھورنے کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ جو شہزاد سی رنگین شخصیت کے قریب بیٹھ کر گزشتہ عشق کی محرومی پر آہیں بھرتا رہتا ہے۔ نہیں نہیں وہ شہزاد کے قابل نہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ زندگی اور موت کی طرح وہ دونوں متضاد چیز ہیں۔ شہزاد زندگی ہے رنگینی ہے اور شریف مایوسی حسرت اور موت۔“ لیکن اس کے بعد لے آتا ”شہزاد اسے کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ کیوں برداشت کرتی ہے۔“ پھر اسے شہزاد کے غصہ آنا شروع ہو جاتا اور اس کے تخیل میں شہزاد اور شریف کے قرب کی عجیب تصاویر کرتیں اور دل میں رقابت کی جلن محسوس ہوتی۔

ساری رات وہ پہلو بدلتا رہا ساری رات وہ ترپتا رہا۔ رقابت اور تکلیف کا یہ احساس اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ نیا اور بے حد تکلیف وہ اگلے روز جب شہزاد اسے بلانے آئی تو ایللی نے اسے انداز میں جواب دیا۔ ”تم جاؤ۔ میں پہنچ جاؤں گا۔“

لیکن شہزاد نے اصرار کیا۔ ”میں تو ضرور ساتھ لے کر جاؤں گی کوئی بات ہے۔ تمہارا کیا انتہا کر کے کر جاؤ۔“ شہزاد نے اس بات پر اس قدر ہنگامہ مچایا کہ ہاجرہ کے اصرار پر ایللی کو باہی چلا۔

”میزوں میں جب وہ اکیلے تھے تو شہزاد نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور وہ بولی ”پارہ بہت چڑھا ہوا ہے آج۔“

”مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔“ ایللی نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

”کیوں کیا ہے اس ہاتھ کو۔“ شہزاد بولی۔

”اس ہاتھ سے شریف کے منہ کی رال کی بو آتی ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”شریف کے منہ کی رال۔ ہونہ۔“ وہ نفرت سے کہنے لگی۔ ”تم نے کیا سمجھا ہے مجھے۔“ کیا ہو تم۔“ ایللی نے پوچھا۔

”میں میں ہوں۔“ وہ سینہ تان کر بولی۔

”مگر وہ تمہارا خاوند ہے نا۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”ہو گا۔“ وہ بولی۔ ”پڑا ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”رات بھر محفل گرم رہتی ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”ہونہ محفل گرم رہتی ہے۔“ وہ بولی۔ ”وہ بیچارہ کیا محفل گرم کرے گا۔“ تو تم کرتی ہو

کروٹیں

اس روز وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ ساری رات اسے نیند نہ آئی۔ جب

شرف نے ٹھنڈی آہ بھری ”کبھی ہم بھی ہری کو نہیں تھے۔ کبھی ہم میں بھی زندگی تھی۔ لیکن زمانے نے وفانہ کی۔ محبت راس نہ آئی۔ لوگ سب کچھ برواشت کر لیتے ہیں لیکن یہ برواشت نہیں کر سکتے کہ دو محبت کرنے والے ملیں۔ زمانے کا رنگ ہی ایسا ہے لیکن۔“ وہ یک دم جلیں میں آگیا۔ ”وہ محبت کو زندگی سے خارج نہیں کر سکتے صرف محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ لوگوں کو محبت کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ کیوں اہلی ٹھیک ہے نا۔“ شریف نے مسکرا کر اہلی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم بھی ان سے ڈرنا نہیں۔ ان کی پروا نہ کرنا۔ اپنے آپ میں جرأت پیدا کرنا۔ سچائی میں جرات ہوتی ہے اہلی۔“

”نہ۔“ شہزاد بولی ”اس کا تو ڈر ڈر کر برا حال ہو رہا ہے۔ اس سے دلیری کی امید رکھنا ناممکن ہے۔“ شہزاد نے معنی خیز نگاہ اہلی پر ڈالی۔

”کیوں اہلی ٹھیک کہتی ہے یہ تم ڈر جاؤ گے کیا؟“ شریف نے پوچھا۔

”میں میں۔“ اہلی گھبرا گیا۔

”تو دیکھ لو۔“ شہزاد ہنسی۔ ”یہ تو اتنی سی بات پر گھبرا جاتا ہے۔“

شریف نے شہزاد کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ ”لیکن یہ بتاؤ اہلی کیا اسے تمہاری پروا ہے۔

کیسی ہے وہ۔“

”وہ۔“ اہلی نے دہرایا۔ اور پھر پہلی مرتبہ اس نے جرأت سے کہا ”اتنی رنگین ہے وہ۔“ وہ

معنی خیز نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اتنی رنگین ہے اتنی شوخ ہے اتنی پیاری ہے کہ میں کیا بتاؤں۔“

”لیکن کیا رفتار بھی ہے یا نہیں۔“ شریف نے پوچھا۔

”رفتار — اہلی نے پھر شرارت سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ اور پھر آہ بھر کر بولا

”بیاریوں میں وفا کب ہوتی ہے۔ وہ تو بے نیاز ہے۔ بلند و بالا جو ہوئی۔ وہ بیچاری وفا کیا جانے۔“

”جھوٹ۔“ اتنی وفا ہے اس میں۔“ شہزاد نے مشین چلاتے ہوئے کہا۔ ”کہ کیا بتاؤں۔“

”تم کیسے جانتی ہو اسے“ شریف بولا ”خواہ خواہ۔“

”واہ میں نہیں جانتی تو کون جانتا ہے۔“ وہ قہقہہ مار کر بولی ”وہ تو —————“

”لیکن — اہلی نے گھبرا کر اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔

گی۔“ اہلی نے کہا۔

”کبھی کروں گی ہی نا۔“ شہزاد نے آہ بھر کر کہا۔ ”دیکھ اہلی میری بات سن۔“ شہزاد نے دونوں شانوں سے پکڑ کر کہا۔ ”کسی کو جہاں نہیں ہے جو مجھے ہاتھ لگائے۔ تم تو باقی جتنے بھی لگائے۔ لیکن وہ تمہارا مالک ہے۔ تمہیں ہاتھ لگانے کے لیے ہی جھنجھکی لے کر کیا ہے۔“ شہزاد نے اہلی سے ملنے کے لیے۔ تمہاری آرزو لیے۔ ”وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔“ چلو چل کر مالک کی طرف صورت دیکھ لو پہلے۔“ یہ کہہ کر ہنستی ہوئی وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

## پھنس گئی تو پھڑکن کیسا

”معلوم ہوتا ہے۔“ شریف نے اہلی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ”اب تمہیں بھی یہاں نہیں رہا مجھ سے محبت نہیں رہی کب سے انتظار کر رہا ہوں۔ ہماری قسمت میں تو انتظار لکھا ہے۔“ نہ جانے کیوں شریف نے ننھی نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ جو اس دن مشین پر بیٹھی کام میں مصروف ہو چکی تھی جیسے گردو پیش کے متعلق کچھ خبری نہ ہو۔ باہر جا کر ہی ہنستی ہے۔“ شریف نے شہزاد کی طرف اشارہ کیا ”ہمارے ساتھ کوئی بھی ہنستا۔“

”روتوں کے ساتھ کون ہنستے۔“ شہزاد بولی۔ ”سن رہے ہو اہلی۔ سچ کہہ رہی ہوں نا۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ شریف نے آہ بھر کر کہا۔ روتوں کے ساتھ کون ہنستے۔“ چلو نا روتے کو تسلی تو دو اس کے آنسو تو پوچھو اس سے ہمدردی تو کرو۔“

”نہ جی۔“ شہزاد بولی ”یہ یتیم خانہ نہیں ہے کہ یہاں ہم ہر وقت روتوں کو چپ کر رہیں۔“

”سن لیا تم نے۔“ شریف نے اہلی سے کہا ”یہی خوش نہ ہو سکی تو کس کو خوش کر

ہوں میں۔ اپنے اپنے نصیب ہیں بھائی۔ تم پر امید باندھی تھی تم نے بھی اتنا جانا چھوڑا نا۔“

بیٹھا انتظار کر رہا تھا کہ کب اہلی آئے۔ شاید تمہارا بھی میرے پاس بیٹھنے کوئی نہیں

ٹھیک تو ہے ہری کو نپلیں سوکھے چوں سے کیسے لگاؤ رکھیں۔ ہم تو اب سوکھے چنے سے

ہو چکے۔“ اس نے پھر سے چمت کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اور باتیں کرتے ہوئے

منہ سے رال کے تار نکلنے لگے۔

واقعی شہزاد سے محبت ہو چکی تھی۔  
 وہ سلسلہ جو محض ایک تفریحی حرکت سے شروع ہوا تھا ایک عظیم جذبے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یاقوت اپنے اس خود ساختہ اعتبار کو جذبات کی بجائی میں ڈال کر ایللی نے اسے اس قدر آگ بکائی تھی کہ وہ واقعی لندن بن چکا تھا۔ اور یا شہزاد کی رنگینی نے اس کے کردار کی عظمت میں شامل ہو کر شہزاد کی کشش کو ہزاروں گنا بڑھا دیا تھا۔ اور اب وہ بچے دل سے اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ ہر حال حقیقت چاہے کچھ بھی ہو اس کے دل میں شہزاد کے لیے جذبات کا ایک مندر رکھول رہا تھا۔

### بجھتا پ

جب وہ ارچند کی گلی میں پہنچا تو ارچند سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھائے باہر نکل رہا تھا اور اس کی ماں اس کے قریب کھڑی آنسو پونچھ رہی تھی۔

”آگئے تم۔“ ارچند اسے دیکھ کر بولا۔ ”چلو آؤ گئے۔“ وہ حسرت آلود مسکراہٹ سے بولا۔ ”اتنا کرم کیا کم ہے۔ نہ آتے تو اپن کیا کر لیتے تمہارا کیوں ماں۔“ پھر اسے کھانسی کا دوزخہ پڑ گیا۔ لورہ دو دروازے سارا لے کر کھانسنے لگا۔

”آخر تم جاتے ہی کیوں ہو۔“ ارچند کی ماں نے روتے ہوئے کہا۔ ”چھٹی نہیں ملتی تو مجھ کو نوکری کو اسے جان ہے تو جہاں ہے جان ہی نہ ہوئی تو نوکری کو کیا کرتا ہے۔“

”واہ امل۔“ ارچند نے کہا۔ ”معمولی کھانسی سے اپن گھبرانے والے نہیں۔ اور پھر ماں تم سے بیٹے ہیں ہم۔ بڑی بڑی تکلیفیں ہمارا کچھ بگاڑ نہ سکیں یہ تو معمولی کھانسی ہے۔ تم تو خواہ تو کو گھبراتی ہو۔“

”گھبراتی نہیں میں۔“ ماں بولی ”مجھے معلوم ہے میں جانتی ہوں۔ میں سب جانتی ہوں مجھے غر آ رہا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ارچند نے بڑھ کر اس کو آغوش میں لے لیا اور یوں تھکنے اور پیار کرنے لگا جیسے وہ چھوٹی سی بچی ہو۔

”دیکھو ماں میں ترقی کرتے کرتے پتہ ہے کیا بنوں گا۔ فیکٹری کا مینجر بنوں گا معلوم ہے اس کی تنخواہ کیا ہوتی ہے ڈیڑھ ہزار۔ یعنی پندرہ سو۔ اعتبار نہ ہو تو یہ دیکھ لو میرا ہاتھ۔“ اس نے اپنا ہاتھ دکھایا۔ ”یہ دیکھو یہ لکیر عمر کی لکیر ہے۔“ اور کرلو حساب

ایللی کے لیے وہ سلسلہ گفتگو ناقابل برداشت اور خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ براہ راست محبت کی باتیں کر رہے تھے عہد و پیاں کر رہے تھے اور وہ پروردگار کے انہوں نے اپنے جذبات کو چھپایا ہوا تھا۔ ہر ساعت باریک سے باریک تر ہوا جا رہا تھا۔ لیکن کانٹے کے بعد وہ گھبرا گیا اسے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔  
 پھر گھبراہٹ میں اس کے منہ سے نکل گیا۔ ”لیکن مجھ میں کوئی خوبی ہے کہ وہ مجھ سے کرے۔ میری شکل و صورت ملاحظہ ہو۔“

شہزاد ہنس پڑی۔ ”بہی عورتیں بیوقوف ہوتی ہیں۔“ وہ بولی ”وہ شکل و صورت ہم جانتیں۔ خوبیاں نہیں تلاش کرتیں۔ سمجھ لو پھنس جاتی ہیں اور بس پھنس گئی تو پھر کن کیلا۔ وہ ہنسی اور پھر بولی۔ ”اور پھنس جائیں ایک بار تو پھر یا ہر لکنا پسند نہیں کرتیں۔ عورتوں کا کام ہے۔“ شہزاد نے آہ بھر کر کہا ”ڈٹ جائیں تو دنیا کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ ہانڈا کو چیر دیتی ہیں اور عاجز ہونے لگیں۔ تو نالی کے کنارے بیٹھ کر رو دیتی ہیں۔“

”بڑی سیانی ہو گئی ہو تم۔“ شریف نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔  
 ایللی کے لیے اس موضوع پر باتیں کرنا بالکل ہی ناممکن ہو گیا۔ اس کا پیانہ ممبر لیز ہو رہا تھا۔ شہزاد کی ہر بات ہر حرکت واضح طور پر ایللی کے لیے مخصوص ہو چکی تھی۔ اس قدر اذکار واضح ہو چکے تھے۔ ایللی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”اچھا میں اب چلتا ہوں۔“ وہ بولا ”مجھے ارچند کی طرف جانا ہے وہ آج والیں جا رہا اس کی چھٹی ختم ہو چکی ہے۔ اسے مل کر واپس آؤں گا۔“

”کب آؤ گے؟“ شریف نے پوچھا۔  
 ”اور اگر نہ آئے۔“ شہزاد بولی ”تو ہم کھانا نہیں کھائیں گے سنا تم نے۔“

سیڑھاں اترتے ہوئے ایللی سوچنے لگا۔ کہ کہاں جائے۔ ارچند نے واقعی اس روز گلی سے جانا تھا۔ اور اس نے ایللی سے تاکید کی تھی کہ اسے ملے۔ لیکن اس وقت اس کے ملائم عجیب و غریب جذبات چمک رہے تھے۔ شہزاد کی ایک بات جو اس نے اشارتاً اس سے کہی تھی اس کے دل میں طوفان بن کر کھول رہی تھی۔ دل بھرا ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی دوسری میں جا کر رو دے۔ کسی کھیت میں اونڈھے منہ پر ذکر بچیں مارے۔ حتیٰ کہ شام ہو جائے اور رات کے اندھیرے میں چپکے سے چارپائی پر پڑ کر شہزاد کے تصور میں اپنا آپ کو دے۔

نے آفرین کے ہاں ہوتا۔

”لیکن یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“ ایلی نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔

”ہم کچھ نہیں کہہ رہے بیٹا۔“ اس نے اپنے انداز میں کہا ”ہم تمہیں دھندلا دے رہے ہیں تم نے اپنے گرو کی لاج رکھ لی۔ مگر پتر صرف ایک بات کا کھٹکا ہے۔ ستاروں سے کھیلو گے تو

کھلاڑی رہو گے اور آکر سورج کو پالینے کی کوشش کرو گے تو پر جل جائیں گے اور پھراڑنے کی ہمت نہ رہے گی۔ اپنے گرو کے اس قول کو یاد رکھو۔ پتر کھلاڑی بنو۔ پروانہ نہیں اپنے پر نہ

ورنہ کیا

ارجند کو یکے میں بٹھانے کے بعد ایلی سوچنے لگا۔ اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ شریف اور شتراو کی طرف جائے۔ فرحت کے پاس جانا بھی اسے پسند نہ تھا۔ عزت کی محبت بھری باتوں میں طنز کا عنصر شامل ہوتا تھا اور وہ بات بات پر شتراو کا طعنہ دیتی تھی۔ رضایا مصدر کے پاس جانا بے کار تھا۔ وہ بھی گفتگو کی ابتداء شتراو سے ہی کرتے تھے جب وہ وہاں آ رہا تھا تو راستے میں اسے رضا ملا۔

”ایلی۔“ رضائے اسے لاکارا۔ ”دیکھ میری طرف‘ جب تک میرا دم میں دم ہے تو چاہے کس سے محبت لگاؤ اور اگر کوئی تیری طرف نظر بھر کر دیکھے تو بس مجھے بتا دینا سمجھے وہ پاگل لمبا وہی تیرا دوست ہے ابھی یکے میں بٹھایا ہے اگر اس نے کوئی گڑبڑ کی تو اس ہاکی سے اس کی کھوپڑی توڑ دوں گا۔“ اس نے اپنی لنگڑی ٹانگ کو یوں چلایا جیسے وہ ہاکی سنگ ہو۔ ”سمجھے۔ لیکن یار۔“ وہ اس کے قریب ہو کر بولا۔ ”ایک بار ہمارے سامنے تسلیم تو کر لے کہ تو اسے پیار کرتا ہے۔ بڑی لڑائی ہو گئی تھی مگر ہمارا ہے۔ دوست اپنے کو تو ان باتوں میں دلچسپی نہیں مگر تو نے تو بڑے بڑوں کے بات کئے کر دیئے خدا کی قسم جی چاہتا ہے تجھے جھنڈا بنا کر لہراتا پھروں۔ ہاں تو پھر کیسے رام کر لیا تو نے اسے اور صرف اسے ہی نہیں ساتھ ہی اس کے مالک کو بھی پچھاڑ دیا ہے سالہ بول نہیں سکتا بول۔ بول۔ بول۔ بتا دے اچھا یار نہیں جانتا تو نہ سہی۔“ رضائے ایلی کو خاموش کھڑے کر دیا۔ ”پھر بھی ہم تیرے ساتھ ہیں ہاں۔“ یہ کہہ کر وہ آگے چل پڑا۔

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ مرکز اس ہاکی والے کو پکڑ لے اور اس کے سامنے رو کر سارا حال کہہ

یہاں تک ہوئے چالیس برس یہاں بچپن ختم ہوئے اور یہ اسی سے اوپر کا حصہ ہے پندرہ نوے تک جیویں یا سوا سو تک۔ اور یہ دیکھو یہ ستارہ جو بتا ہے ٹائی والا اس کا مطلب ہے یار بہت بڑا عمد یعنی فیکٹری کا مینجر اور سمجھ لو پچاس کے لگ بھگ ملے گا۔ یہ عمدہ اور تم لیا ابھی سے اپن کے ٹین ہاٹ کا فکر کر رہی ہو۔ بھی حد ہو گئی۔“

میں سے جدا ہو کر اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور حسرت زدہ نگاہ سے مٹی کی فرز دیکھا۔ پھر ایلی کی طرف دیکھا۔ یوں چونکا جیسے اس کی موجودگی کو بھول چکا ہو۔ کتنے لگ بھگ کھڑوں اپن تو مرنے ورنے سے ڈرتے نہیں۔ بھی آخر کیا ہو گا وہ کہا ہے نا اسلئے۔ کھائیں گے احباب فاتحہ ہو گا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اور جہاں تک اپن کا خیال ہے لکھن میں اڑایا وہاں جا بیٹھا۔ یہاں کپ کیپ ہیں اور بکوری‘ ڈکوری ہیں اور وہاں حوریں ہوں گی یار انگریزی پر محنت کرنی پڑتی ہے وہاں محنت کیے بغیر سب ملتا ہے۔ اپن کے ایسے نصیب ملے گا ابھی سے حوروں کی دنیا کا پاسپورٹ مل جائے۔ اپن کہاں مرتے ہیں میاں مگر اہل کو جو اپن موت کا فکر لگا ہے کہیں اس غم سے نہ مر جائیں ہم ویسے کھانسی تو اپن کا کچھ نہیں باز کر لیکن یار۔“ وہ کچھ وقفے کے بعد بولا۔ ”ایک بات کا افسوس رہ جائے گا۔“

”کس بات کا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”یہ ملال رہ جائے گا کہ تم نے وہاں فیکٹری — میں آ کر اپنی شہنشاہی نہ دیکھی۔ پھر کی گوریاں جب ہاتھ جوڑ کھ اپنے حضور میں کورنش بجالانے کے لئے آتی ہیں کمی اڑنے کے بدلے سلام ہوتے ہیں گھڑا اٹھانے کے بدلے کورنش بجالائی جاتی ہیں ہے کھیل کے بدلے چلیں پیش کی جاتی ہیں اور مبدولت ملاحظہ فرماتے ہیں اور دھندلا دیتے ہیں۔ لیکن فاتحہ؟“ اس نے آہ بھری ”تم نے اگر یہ نظارے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے تو بے کار ہو یہی ایک ملال لے جاؤں گا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

”ملال لے جاؤں گا۔ کیا مطلب۔“ ایلی نے پوچھا۔

ارجند نے دھنسا۔ ”بینیتر ا بدلا۔ صاف تو ہے۔“ وہ بولا۔ ”مبدولت اس وقت جاری ہیں۔ اور یہ ملال لیے جا رہے ہیں۔ مگر یار تم کیسے آسکتے ہو وہاں تم تو خود مصروف ہو۔ پھر کیا کیا ہاتھ مارا ہے۔ واہ واہ کیا چیز پائی ہے تم نے۔ آخر ہمارے شاگرد ہوتا۔ بیٹا۔ آف کیا ہے۔ چال ہے کیا انداز ہے کیا بات ہے۔ جواب نہیں بڑے بڑے کھلاڑیوں کے دانت کھنے کر دیتے

### نئی پرائی

”اے ہے ہاجرہ کہاں گئی میں کہتی ہوں رابعہ، شہزاد تم کہاں ہو۔“ دفعتاً ”مگ سے اس کی بھابی پر پڑی۔ اسے دیکھ کر وہ پھر چلانے لگی۔“ اے تو یہاں کھڑا ہے ایللی۔ لڑکے جا جا کر اپنے باپ کو لا۔“ تو اسے شیش پر ملنے نہیں گیا۔ سنا ہے علی احمد آرہا ہے۔“ ایللی اس کی بات سن کر بوچکا رہ گیا۔ نہ جانے وہ بڑھیا کیا کہہ رہی تھی۔ شاید وہ علی احمد کو قطعی طور پر بھول چکا تھا۔

”میں نے کہاں بات تو سن۔“ وہ شور مچاتا ہوا اس کے پیچھے بھاگا مگر وہ تو آندھ سی کی طرح چلاتی ہوئی جا رہی تھی۔ ابھی ابھی شیش سے آیا ہے کتا ہے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔ اب کی مرتبہ ایک اور ساتھ ہے۔“

”کون آیا ہے ماں برکتے“ جانو کھڑکی سے چلانے لگی۔

”اے ہے اپنا علی احمد آیا ہے۔“

”ساتھ کون ہے“ جانو نے پوچھا۔

”کہتے ہیں اب کی بار کوئی نئی نویلی ساتھ ہے۔“ برکتے نے شور مچایا۔

”اے بس“ مائی، جاہل دوڑی دوڑی چھٹی گلی سے باہر نکلی۔“ اس کے ساتھ تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی ہوتی ہے بس۔ نئی ہو یا پرانی تمیز نہیں بس ساتھ ہو۔“

”ہوں نئی“ بی بی فاطماں کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔ ”نہ جانے کہاں سے گلی سڑی ہوئی اٹھا لیا ہے۔ اسے آج تک الم نہیں ہوا کہ نئی کیا ہوتی ہے اور پرانی کیا۔“

”اے ہے اپنی طرف سے تو نئی ہی لاتا ہے۔ پر کیا کرے نصیب ہی میں پرانی لکھی ہیں۔“

ماں جاہل بولی۔

”بہن“ برکتے نے کہا ”مما کہتا ہے اب کے تو حد ہی کر دی علی احمد نے۔“

”کیا کیا ماں برکتے۔ بات بھی تو کرنا ماں۔ وہ تو ہر مرتبہ ہی حد کرتا ہے۔“ چاروں طرف شور مچا گیا۔

”پر لڑکی کیا بتاؤں میں۔“ ماں برکتے نے ہاتھ مل کر کہا۔ ”اب کی مرتبہ جسے لایا ہے اس کی گود میں بچہ ہے۔ ماں بچہ۔ لو کر لو بات۔“

”ہائیں بچہ، کیا کہاں۔ بچہ گود میں ہے۔“ چاروں طرف سے قہقہے بلند ہوئے۔

سنائے، اس کا جی چاہتا تھا کہ دل کی بات چیخ چیخ کر لوگوں کو سنائے اور اس طرح دل کا بوجھ لے۔ مگر جب بھی وہ بات کہہ دینے کا ارادہ کرتا تو چمن سے شہزاد اس کے سامنے آکر ٹپکناؤسی آنکھیں ڈالتیں اس کے ہونٹ عجیب سا خم کھا کر کچھ کہتے اور وہ مسکراتی رہتیں۔ ”ایللی چلاتا“ میں کسی سے نہ کہوں گا میں تم سے بے وفائی نہ کروں گا میں تمہاری بات نہیں کروں گا۔“ اور ایللی کے دل کا بوجھ اور بھی بڑھ جاتا۔

”ایک نا ایک روز تم ضرور بتاؤ گے۔“ شہزاد آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا۔ ”تم اپنے دوستوں سے بات کیے بغیر نہیں رہ سکو گے۔ اچھا تمہاری خوشی۔ میری بدعنوانی۔ خوش ہو تو ایسا ہی سہی۔“ شہزاد کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ بھاگتا اس ہاکی دالے سے دور بازار سے دور اور دور۔ کہیں وہ کسی سے کہہ نہ دے کہیں اس کے دل کی بات زبان پر نہ آجائے۔ جب وہ شہزاد کے پاس پہنچا تو وہ مسکرا رہی تھی عین اسی طرح جس طرح بازار میں اس سے اس کے سامنے آکر مسکرانے لگی تھی۔ ”وہ کہاں ہے؟“ ایللی نے پوچھا۔

شہزاد نے منہ بتایا اور اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ ”کہاں بھاگ گئے تھے تم۔“ وہ بولی۔

”کہاں جاؤں گا۔ جاسکتا ہوں کیا؟“

وہ از سر نو مسکرانے لگی۔ ”بھاگ جاؤ۔“ وہ ہنستے ہوئی چلائی ”دور۔ بہت دور۔ ورنہ۔“

”ورنہ کیا۔“ ایللی نے پوچھا۔

”ورنہ۔“ شہزاد نے اپنے سڈول بازو اس کی طرف بڑھا کر اسے تھام لیا ”ورنہ تم بھاگ جاؤ گے۔ قید کر لیے جاؤ گے۔“ اس کے بال اڑ کر ایللی کے منہ پر آ پڑے دم رک گیا۔

تالی پیٹ کر بولی۔ ”بات کرنے سے بھی گئے بولو۔ بولتے نہیں۔“ ایللی کی آنکھیں گولالنے لگیں۔

اس نے شہزاد کو اپنی گرفت میں لیتا چاہا مگر وہ بازو چھڑا کر بھاگ گئی۔ ”اونہوں۔“ وہ اسے دیکھتے دیکھتے بھاگتے ہوئے دیکھ کر بولی ”وہ اوپر ہیں اگر۔“ پھر رگ پر کھڑی ہو کر بائیں کرنے میں یوں مشغول ہو گئی جیسے آن کی آن میں ایللی کے وجود کو تعقل طور پر سمجھ رہی ہو جیسے احساس ہی نہ ہو کہ قریب ہی ایللی انگڑائیاں لے لے کر اپنی ہڈیاں توڑ رہا ہے۔

سرخ ہو کر ایللی جا رہی ہیں۔

ابھی وہ کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ شریف کے پاس جائے یا نہ جائے۔ کہ محلے کی ایک بوڑھی عورت نیچے شور مچاتی ہوئی بولی۔

”چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ آج تک بچے والی نہ آئی تھی۔“

”ابھی تو دیکھو بہن۔ وہ کشمیر کا سیب ایک سال تک نہ چل سکا تو یہ بچاری کب تک چلے گی۔“

”میں نے کہا ماں برکتے۔“ شہزاد کھڑکی میں آکر چیخنے لگی۔ ”کیا واقعی بچے والی لایا ہے؟“ احمد یا مذاق کر رہی ہو۔“

”لو میں کیا تم سے عجا کروں گی۔“ ماں برکتے بولی۔ ”اے ہے حملہ نے بتایا ہے۔“ ”اے لو۔“ بی بی نقو بولی۔ ”قافلہ تو ابھی پہنچا“ اس نے ہنسی حویلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

لے اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لے لڑکی۔“ ماں حاجاں شہزاد سے کہنے لگی۔ ”سناؤ کوا آج ابھی دودھ کا دودھ اور پانی پانی ہو جائے گا۔“

حاجاں نے ابھی بات ختم نہ کی تھی کہ علی احمد سینہ تانے چوگان میں داخل ہوئے۔ ”علی احمد مبارک ہو۔“ ایک بولی۔

”میں نے کہا باقی قافلہ کہاں ہے تیرا۔“

”اے چچی پر آیا ہے کیا۔ اچھا کیا جو آگیا۔ تیرے بغیر یہاں رونق نہیں ہوتی۔“

”اے علی احمد اب کی بار سنا ہے نئی لایا ہے تو۔“

علی احمد چوگان میں ہیرو کی طرح کھڑے مسکرا رہے تھے جیسے ہیروئین کو دیو کے چنگل سے چھڑا کر لائے ہوں۔

”لو ماں“ وہ بولے ”کون کتا ہے نئی ہے ماں ہم تو پرانی کے پجاری ہیں وہ کہتے ہیں ڈاؤن دن پرانی سودن اور اگر اکیلا آتا تو سواگت کے لئے تم سب یہاں نہ ہوتیں۔ کسی کو پتہ نہ چلا کہ میں آیا ہوں۔“

”اے ہے لڑکے“ حاجاں مائی بولی ”تو کیا ہمیں پتہ دینے کے لئے لاتا ہے تو۔“

”اور تو کیا اپنے لئے لاتا ہوں۔“ وہ قہقہہ مار کے بولے ”تم بھی کتنی بھولی ہو بی بی نقو۔“

شوق و مدت سے ختم ہو چکا اب تو محلے کی نفری بڑھانے کے لئے لے آتا ہوں۔“

”جیسی اب کے بچے والی لایا ہے“ جانو کھڑکی سے چیخنے لگی۔

”اور کیا جانو“ علی احمد ہنسے۔ ”تو تو آپ سیانی ہے۔“

”علی احمد“ مائی حاجاں کہنے لگی ”جتنے کوئی لڑکی نہیں ملتی کیا۔“

”لڑکی“ علی احمد ہنسے ”لڑکی کو کیا کرتا ہے مائی حاجاں کام کی وہ ہوتی ہے جو تجربہ کار ہو۔“

”پر علی احمد“ نقو بی بی نے ہنستے ہوئے کہا ”کام کی تو تو لایا نہیں کبھی۔ کباڑ خانہ ہی اکٹھا کر رکھا ہے۔ لے ماں برکتے ایمان سے کہنا دیکھنے میں ہے کوئی کام کی۔“

”نوں لو بی بی کی بات“ علی احمد ہنسے۔ ”میں کیا دیکھنے کے لئے لاتا ہوں بی بی میں کیا بچہ ہوں کہ دیکھ کر کر بیٹھ جاؤں وہ دن گئے بی بی۔ اور ہاتھی دانت لانے کا فائدہ۔ تمہاری آنکھیں چکا چند ہو جائیں تو اپنا کیا فائدہ ہوا اس میں۔ کیوں بی بی۔“ وہ چوگان میں کھڑے ہو کر ہیرو کی طرح ہنسے گئے۔

”ہائے علی احمد“ ایک نے ہونٹوں پر انگلی رکھ رکھ کر کہا۔

”تو ہے علی احمد“ دوسری ہنستے ہوئے چلائی۔

”کچھ شرم کیا کرات کرتے ہوئے۔“ تیسری قہقہہ مار کر بولی۔ چوگان ان کے قہقہوں سے گونجنے لگا۔ اور علی احمد فاتح کی حیثیت سے گھر کی طرف چل پڑے جیسے سٹیج پر ایک خوب صورت جملہ کہہ کر ایکٹر باہر نکل جاتا ہے۔ اور تماشائی تالیاں پیٹتے رہ جاتے ہیں۔

علی احمد کے پیچھے پیچھے وہی پرانی راجو نیا برقعہ لئے آ رہی تھی گود میں دو سال کا بچہ تھا اور وہ بال بال رہی تھی جیسے مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹ رہی ہو۔

”اے ہے“ ماں برکتے بولی۔ ”ہم سے بھی پردہ ہے کیا۔ لڑکی برقعہ تو اٹھا لے۔“

”ماں ہمیں سے تو پردہ ہے۔“ نقو بی بی نے کہا۔ ”یہ نیا زمانہ ہے اپنوں سے پردہ غیروں سے۔ تم جانتی ہی ہو ماں۔“

جانو بولی۔ ”اے بی بی ڈرتی ہے کہیں نظرنہ لگ جائے ہماری۔“

اس کے پیچھے پیچھے تانگے والے کے ہاتھ میں سالن تھا اور آخر میں شمیم ایک لڑکی اٹھائے اور دوسری کو انگلی لگائے آ رہی تھی۔

شمیم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ بھوسیں تنی ہوئی تھیں اور آنکھ کا فرق بے حد نمایاں ہو رہا تھا۔ اس نے محلے والیوں کو دیکھتے ہی پیشنا شروع کر دیا۔

”اے ماں برکتے دیکھ لے میرے تو نصیب ہی پھوٹ گئے۔ میری طرف کیا دیکھ رہی ہو میں تو بالہ بن کر رہ گئی ہوں اپنے ہی گھر میں۔“

”وہابی بات چھوڑ، بی بی نھو۔“ اور وہ ایک دوسری کے قریب تر ہو گئیں۔

ہے ہمت

محلے والیوں کی باتیں سن کر ایلی کو غصہ آ رہا تھا۔ وہ شہزاد کے خلاف بات کرنے سے بھی نہ ہٹتی تھی حالانکہ شہزاد کے تعلقات محلے والیوں سے بے حد اچھے تھے وہ انکی عزت کیا کرتی تھی اور ان سب کی حد سے زیادہ خاطر و مدارت کیا کرتی۔ کسی نہ کسی بہانے وہ انہیں گھر بلا لیتی۔ جوت موٹ مشورہ لینے کے لئے یا کوئی دوا دارو پوچھنے کے لئے یا کوئی اور بات نہ سوچتی تو کہتی ”ہاں ہاں تو ذرا مجھے بتا کہ مٹھی سویاں کیسے پکاتے ہیں۔ ہائے مجھ سے تو ہر بار خراب ہو جاتی ہیں اصل میں مجھے یہ نہیں معلوم کہ میٹھا کتنا ہونا چاہئے اور سویاں کتنی۔“ گھر لے جا کر وہ جانو سے کہتی ”لے جانو ذرا لا تو ایک پلیٹ ماں کے لئے۔“ اور پھر ماں سے مخاطب ہو کر کہتی ”دیکھ تو کھا کے اسے تاکہ معلوم ہو کیا خرابی ہے۔ نہ جانے کیا نقص رہ جاتا ہے۔“

حالانکہ شہزاد پکانے میں بے حد ماہر تھی۔ اور پکانے کے معاملے میں محلے والیاں تو بالکل جہل تھیں۔ جب میاں ہی کھانے کے شوقین نہ ہوں تو بیویاں بھلا کیسے اچھا پکا سکتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود شہزاد نے کبھی اپنی چیز کی تعریف نہ کی تھی۔ ایلی نے محسوس کیا کہ شہزاد کی بڑھتی ہوئی بدنامی کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ اس کے شہزاد کے ہاں رہنے کی وجہ سے سب اس سے بدظن ہو چکے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شہزاد کا رنگ انوکھا تھا۔ اس میں عجیب سا بانجھن تھا ایک شوخی قہر یعنی تھی اس لئے وہ محلے میں آتے ہی محلے والیوں کی نگاہ پر چڑھ گئی تھی۔ لیکن اس کی اس خصوصیت نے بدظنی کی فضا پیدا کی تھی۔ بدنامی کی نہیں اور اب ایلی کی وجہ سے وہ بدظن ہوئی جارہی تھی۔

اس خیال سے ایلی نے محسوس کیا کہ وہ مجرم ہے۔ اور اپنے جرم کی شدت کو کم کرنے کے لئے چپ چاپ اوپر چوہارے کی طرف چل پڑا۔

”آگے تم“ شریف اس کی طرف دیکھ کر بولا ”ہم تو کب سے انتظار کر رہے تھے۔“

”نچو کھڑا علی احمد کو کوئی نہیں پوچھتا محلے میں یہ جتنے جلوس چاہے نکالے جسے چاہے لے آئے ہاڑو یا بھارت۔“ شریف نے آہ بھری ”ہمیں تو ظالموں نے کچھ بھی نہ کرنے دیا۔“

”اے تم کیوں دلالہ بنو۔“ تم تو اللہ کے فضل و کرم سے سروں سے بیاہی ہوئی ہو لو ہر فصلی بیڑوں کا کیا ہے یہ تو آتی جاتی رہتی ہیں۔“

”نہ ماں یہ نہ کو اس کھیت میں تو خالی فصلی بیڑے ہی پلتے ہیں۔“ شمیم بولی ”میل ڈال جانے والیاں ہی چلتی ہیں۔ تم اس گھر کو کیا جانو۔“

”غم نہ کرو“ بی بی نھو نے کہا ”یہ دور بھی گزر جائے گا۔“

”یہ چاہے گزر جائے۔ اپنا دور نہیں آئے گا میاں ہاں۔“ وہ بولی۔ ”لکھ لو میری بات ہر تو سوکھیں ہی آئیں گی۔ اپنے نصیب میں سکھ نہیں۔“

”اب تو ایلی پر بھی سوکن آگئی“ شہزاد اپنی کھڑکی سے چلائی۔

اے ہے ایلی پر کیوں سوکن آنے لگی۔“ ماں برکتے نے کہا۔

”اب تو ایک ننھا ایلی بھی آگیا۔“ وہ ہنسی۔

”لو یہ بھی کوئی بات ہے۔“ بی بی نھو نے کہا۔ ”نہ بہن، ایلی ایلی ہی ہے۔ جو مزیدار ہے وہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا میں توچ کہوں گی۔“

”نہ جانے ایلی جو ان ہو کر کیا گل کھلائے گا۔“ برکتے نے کہا۔

”آخر بیٹا کس کا ہے۔“ حاجاں بولی۔

”وہ کہتے ہیں نا۔“ ننھو چلائی۔ ”ہو نہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ ابھی تو لڑکے نے ابتدائی ہے۔ کیوں شہزاد ٹھیک کہتی ہوں نا میں۔“ ننھو نے اسے طعنہ دیا۔

”تو جو کہتی ہے بی بی تو ٹھیک ہی کہتی ہو گی۔“ شہزاد بولی۔ ”تجھ سے بڑھ کر تجربے؟“

ان باتوں کا۔“

یہ سن کر چوگان میں قہقہہ گونجا۔ ”تو نہ اس سے نہٹ سکے گی۔“ ماں حاجاں نے کہا۔

”مائی برکتے کہنے لگی“ نہ مائی اس سے کون بٹے ایسی چیخ کہ قہقہہ کی طرح چلتی ہے۔“

”پر ماں“ ایک نے مدہم آواز سے سرگوشی کی ”بری نہیں محبت سے ملتی ہے کھاتو کھا کر ہے۔“

”بھاری بڑی اچھی ہے۔ بس صرف یہی اللہ مارا اک شوق ہے۔“

ماں حاجاں قریب تر ہو گئی ”ہو گا شاید تم ٹھیک کہتی ہو لیکن جی بات تو یہ ہے کہ“

والے بھی تو جینے نہیں دیتے۔“

”اے ہے“ بی بی نے کہا ”مجھے کیوں دیتے ہیں جینے۔“



لے کے لئے بے تاب ہے۔

شاید انہی اشارات کی وجہ سے اس کے صبر کا پیمانہ چھلک جاتا اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلے  
بلے پر مجبور ہو جاتا۔ یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ شریف کی موجودگی میں بار بار محسوس کرتا تھا  
کہ وہ مل کر اسے دھوکا دے رہے تھے اور احساس جرم اس قدر شدید ہو جاتا تھا کہ اس کے لئے  
وہاں بیٹھنا مشکل ہو جاتا۔

### اے کی راجپوتی

جب وہ گھر پہنچا تو علی احمد قلعہ پر قلعہ لگا رہے تھے ”دیکھو تاسیدہ“ وہ کہہ رہے تھے ”پہلے  
میں آئی تھی راجو پر پہلے تو وہ غسیم کی مسمان تھی تا پرانی سیلیاں ہیں یہ دونوں۔“  
”ہونہ“ غسیم چلائی ”جان نہ پہچان خالہ جی سلام۔“  
علی احمد نے غسیم کی بات گویا سنی ہی نہیں۔ ”اور اب اب تو بہنیں بن گئی ہیں۔“  
”ہونہ بہن“ غسیم چلائی۔

”تو اس کی باتیں نہ سن“ علی احمد نے ہنس کر غسیم کی بات کاٹ دی ”ایسے مذاق یہ راجو  
سے کیا ہی کرتی ہے بے تکلفی جو ہوئی۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ دونوں بہنیں بنی ہوئی ہیں تو  
انہیں اکٹھا کر دو سو میں نے راجو سے نکاح پڑھوا لیا۔ پوچھ لو غسیم سے غلط بات نہیں کہہ رہا  
میں“ اور پھر اس کے کہ غسیم کوئی بات کرے وہ معا“ ایلی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”ہائیں ایلی  
تم بھل۔“ پھر خود ہی بولے ”اور ٹھیک تو ہے تو تو اب امتحان سے فارغ ہو چکا ہو گا۔ لیکن تم  
نے اپنی اہلی کو سلام نہیں کیا۔ تو تو اچھی طرح واقف ہے راجو سے۔ ان کی بڑی دوستی ہے ایک  
دوسرے سے جب یہ دولت پور میں تھا تو آکر زبایا کرتا تھا راجو کے ہاں“ وہ ہنسنے لگے۔ ”راجو ساہو  
ابو بھی سے واقف ہے ایلی“ لیکن کو بھی بانٹا ہے کیوں ایلی۔“ وہ ہنسنے لگے۔ ”اور ایلی تو بہت  
خوش ہو گا مفت کا ایک بھائی مل گیا ہے اسے۔ تم نے شیرد کو نہیں دیکھا ایلی آ۔ مجھے شیرد سے  
لامک۔ لا بھی راجو لانا شیرد کو۔ جاؤ بھی تم دونوں کھیلو چوگان میں لے جاؤ اسے ایلی سیر کرالا  
زار“

ایلی کو چپ چاپ کھڑے دیکھ کر وہ حمیدہ رشیدہ کو بلانے لگے۔ ”لو بھی تم لے جاؤ اسے ایلی  
تو شہناہ ہے شہناہ تو ہوا۔ کبھی چھوٹا بچہ اٹھایا بھی ہو۔“

”جس میں جرأت ہو اسے کوئی نہیں پوچھتا۔“ شنراو بولی اور اس نے ایک جملہ  
نکاح ایلی پر ڈالی۔ ”کیوں ایلی“ وہ بولی ”ٹھیک ہے نا۔“  
”مجھے کیا معلوم۔“ ایلی نے جواب دیا۔  
تو پھر تمہارا حشر بھی ایسے ہی ہو گا جیسا ان کا ہوا ہے۔“ شنراو نے شریف کی طرف  
کرتے ہوئے کہا۔

”سچ کہتی ہو تم“ شریف نے آہ بھری ”دراصل وہی ڈرتے ہیں جن کی میت ہمارے  
ہو۔“

ہونہ سچی اور پاکیزہ“ شنراو نے کہا۔ ”بزدلی کو سچائی کے پردے میں چھپایا نہیں جا سکتا  
”اب یہ نئی کون ہے“ جیسے علی احمد نے تو اپنے گھر کباڑی کی دوکان کھولی ہوئی ہے  
کہاں سے لائے گا۔ وہ کشمیر والی نئی لایا تھا بالکل بے کار پھولی ہوئی روٹی کی طرح۔  
پچک کر رہ گئی۔“

”میرے خیال میں“ ایلی بولا ”وہی راجو ہے دولت پور والی۔ دولت پور میں اسے  
تھے۔“

”پانچہ“ شنراو ہنسی۔ ”چلا ہوا نا۔“  
”کون ہے وہ۔“ شریف نے پوچھا۔  
”نام ہی سے پتہ چل رہا ہے۔ پوچھنے کی ضرورت باقی ہے کیا۔“ شنراو نے کہا۔  
تمہاری نگاہ میں تو کوئی جتنی ہی نہیں۔“ شریف مسکرا کر بولا۔ ”سوائے اپنے والا  
نگاہیں جو تک کی طرح شنراو پر گاڑ دیں۔“

”جھوٹ ہے کیا“ وہ قلعہ مار کر بولی۔ ”میری برابری کون کر سکتا ہے۔ اور بھرا  
جہاں سب کاٹھ کباڑ بھرا ہے۔ کیوں ایلی کیا یہ جھوٹ ہے“ وہ ایلی کی طرف دیکھ کر شہناہ  
مسکرائی۔

کھانا کھا کر ایلی علی احمد سے ملنے کے بلانے وہاں سے چلا آیا۔ نہ جانے کیوں  
موجودگی میں وہاں بیٹھنا مشکل ہو جاتا تھا حالانکہ شریف کی موجودگی میں شنراو کا افسانہ  
جاتا تھا وہ ہر بات پر کوئی نہ کوئی اشارہ کرتی۔ کبھی ہاتھ بڑھا دیتی جیسے کہہ رہی ہو اگر  
پکڑ لو۔ کبھی اپنا بلوری پاؤں ننگا کر کے دکھاتی اور کبھی یوں بازو پھیلا دیتی جیسے اسے

”میں کیوں ہونے لگی اجلے کی راجپوتی۔“ نھو بی بی جوش میں بولی۔ ”پر میں کیا علی احمد سے ڈرتی ہوں جو یہاں کھڑی رہوں گی۔“ یہ کہہ کر نھو بی بی شور مچاتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

”ہے علی احمد یہ کیا دھیگا مشتی شروع کر رکھی ہے تو نے۔“

یہ صورت حالات دیکھ کر ایلچی چپکے سے باہر نکل آیا۔ اندر علی احمد قہقہے لگا رہے تھے۔ ”جی جی جی بی بی تقو تم ہو۔ کو کیا حال چال ہے۔ بابلیا بابلیا“

بول کیا چاہتا ہے

جب وہ چوگان میں پہنچا تو رضا لاشی نیکتا ہوا چھتی ڈیوڑھی سے نکلا ”کیوں بابو“ وہ بولا  
 منت کا بھائی ہاتھ لگا ہے۔ سیدھے ہاتھ سے کھلا دو مٹھائی ورنہ۔“  
 ”کو نہیں“ ایلی چلایا۔ ”خواہ مخواہ میری بے عزتی کرتے ہو۔“  
 ”ابھی تو بے عزتی نہیں کی میں نے۔ ابھی تو عزت کر رہا ہوں بابو۔ جب بے عزتی کرنے پر  
 لوگوں کا تو درد دے تم۔ چلو سیدھے چلو میرے ساتھ۔ ادھر کارخ کیا تو یہ ہاکی سنک چلاؤں گایار  
 تیرا جت پڑا ہو گا میدان کے بیچ۔ ارے بابو کے بیچ۔ لاکھ بار تجھے سمجھایا کہ چھوڑ دے ہم سے  
 ہاکی مگرتو سنتا ہی نہیں لاتوں کا بھوت بھلا باتوں سے مانتا ہے ابھی۔ چل تجھے گھر لے کر جاؤں  
 لاشی نے کئی کئی مٹھی روٹی پکائی ہوئی ہے۔ دونوں کھائیں گے۔“  
 رضا کے گھر پہنچ کر وہ دونوں ایک طرف اکیلے میں جا بیٹھے۔

”دیکھ بھائی۔“ رضائے بات شروع کی ”پہلے تم اور ارشد کپ اور کپ کو پھانسنے میں لگے رہو اور ہم دیکھتے رہے۔ یہ کھیل اپنے بس کا نہیں۔ تم تماشا کرتے رہے اور ہم دیکھتے رہے پھر حق امرتروالی کا چکر پڑا۔ اور تو اس کے عشق میں گھلتا رہا۔ اور تو نے آکر ہم سے ساری بات کہہ دی۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ ہم سے کہ دو گے یار تو ہم ٹوکیں گے کیا۔ اللہ ہماری مدد تمہارے ساتھ ہوگی۔ کہو تو اٹھا کر لے آئیں اس امرتروالی کو۔ کیا ہے دو سال کی سزا ہو جائے گی نا جھیل لکھ کے جس تو وہ سلی مل جائے گی۔ تم تو مزے کرو گے نا۔ کیا یاد کرو گے کہ ہاکی سٹک والا یار

لیکن یہ جس معاملے میں اب پھنسے ہو تم یہ ہمیں پسند نہیں۔ اول تو وہ بچوں والی ہے  
 ظہور اس کامیاب تمہارا دوست ہے اور — پھر چلو یہ بھی مانے لیتے ہیں لیکن بشرطیکہ تم

اتنے میں محلے والیاں اکٹھی ہو گئیں۔ ”کیا لایا ہے اب کی بار دکھاؤ“ ایک نے کہہ  
 ”اے ہے یہ تو دی پرانی راجو ہے میں سمجھی پہلے کشمیر کا سیب لایا تھا اب نہ جانے کہاں  
 لایا ہو گا۔“

”سیب ہی تو ہے“ علی احمد بولے۔ ”وہ کشمیر کا تھا یہ کلو کا ہے۔ وہ دکھانے کا ہوتا ہے، کھانے کا“ ذرا ترشی ہوتی ہے اس میں ماں، بلکہ ترشی کی وجہ سے اچھا ہوتا ہے یہ۔“

”میں نے کہا یہ دلہن چھپی ہوئی کیوں بیٹھی ہے۔“ دوسری بولی۔

”دلنہیں چھپی ہوئی، ہی اچھی لگتی ہیں لی لی۔“

”کیا شرماتی ہے ہم سے“ شنزاد داخل ہو کر بولی۔

”شرماتی تو ہے“ وہ بولے ”تمہارے مقابلے کی ہو تو میدان میں آئے۔“

وہ سب ہنسنے لگیں ”اب کربات“ ایک چلائی ”ہم سے ہی باتیں کر لیا کرتی ہے تو“ ہنسنے لگی۔ ”اس بیچاری کا کیا قصور ہے یہ تو لانے والے کی سوجھ بوجھ ہوتی ہے۔“

”سنا ہے شہزادہ تیرا سوجھ بوجھ والا شریف آیا ہوا ہے۔“

محلے والیوں نے پھر قہقہہ لگایا۔ ”باہر کیوں نہیں نکلتا میدان میں۔“ علی احمد نے قہقہہ لگا کر کہا ”لیکن وہ بھی سچا ہے گھر میں دھن دولت کے انبار لگے ہوں تو باہر کا فائدہ۔“ یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہو گئے اور راجو سے ہی ہی کرنے لگے۔

”اے ہے بسن“ تھو بی بی داخل ہوتے ہوئے بولی ”ابھی تک اپنے علی احمد کا چاکہ نہیں اڑا  
کیا جو ہر بار نی لے آتا ہے۔“

”اونہوں نئی۔“ شمیم نے ہونٹ نکالے۔ ”وہی پرانی تو ہے۔“

”میں نے کہا دیکھو تو اب کی بار کیا گل کھلایا ہے اپنے علی احمد نے۔“ ننھو بی بی نے  
ہوئے علی احمد کے کمرے کی طرف بڑھی۔

”اندر کیسے جائے گی لی لی۔“ شمیم بولی۔ ”اندر تو دونوں میں دھینگا مٹتی ہو رہی ہے۔“

”بابا بابا“ علی احمد کی آواز آئی۔ ”ہم سے زور آزمائی کرے گی تو راجہوتی جو ہوئی ہے“

راجپوتی۔ بابا بابا لیکن ہم بھی علی پور کے ہیں ہاں۔“

”تو اندر جا کر کیا کرے گی بی بی نختہ۔“ سیدہ بولی ”تو بھی کیا اجلے کی راجپوتی ہے۔“

اپنے منہ سے کہ دو اپنی زبان سے مانو اور کبھی مجبور ہوں پھنس گیا ہوں۔ پھر ہمارا تیار ہوں گے ایسے نہیں۔ چالاکی سے کام نہیں چلے گا ایل۔ ہمارے ساتھ جس نے گناہ سالہ منہ کے بل گرا۔

”یہ تم کیا بک رہے ہو۔“ ایل نے منہ پکا کر کے کہا۔

”تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کون بک رہا ہے۔“ رضا بولا ”سارے غم میں ہوا ہے ہر جگہ یہی بات ہو رہی ہے۔“

”کون سی بات؟“ ایل نے پوچھا۔

”تم جو سارا سارا دن اور آدھی آدھی رات تک اس کے گھر میں گھسے رہتے ہو۔ لیے وہاں چائے بنتی ہے۔ کھانے پکاتے ہیں مٹھائیاں خریدی جاتی ہیں۔ لوگ اندھے نہیں علی پور میں بات چیتی نہیں۔ یہ محلے والیاں تو تیر پچانتی ہیں۔“

”تمہیں مجھ پر یقین نہیں کیا۔“ ایل نے غصے میں کہا۔ ”مجھے دوست ہو تم مجھے سمجھتے ہو مگر یقین نہیں کرتے میری بات پر۔“

”ایمان سے کہتا ہوں میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تم مجھ سے بات چہا رہے ہو۔ چہا مجھ سے نہ چہا۔ ظالم اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔ تجھے یار نہ کہا ہوتا تو اب تک اگلا ہوتی میں نے۔“

”رضا۔“ ایل آنکھوں میں آنسو چھلکا کر بولا ”میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا سے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

رضا کے انداز کی درشتی یک قلم مفقود ہو گئی۔ ”دیکھ ایل۔“ وہ بولا ”میں تیرا دوست ہوں بول کیا چاہتا ہے تو چاہے جائز ہوتا جائز ہو۔ روپیہ چاہئے تو مجھ سے لے چاہے چوری کر لے لیکن تیرے سامنے ڈھیر کر دوں گا۔ کسی سے دشمنی ہے تو بلا خوف کہ دے۔ اسے ایک لاکھ سنک نہ دلا دوں تو میرا ذمہ۔ کسی سے محبت ہو گئی ہے تجھے تو بتا۔ کیسے نہیں ماننے کی جان ہے جو ہمارے یار کی بات رد کرے جینا مشکل کر دوں گا۔ اور نہ ماننے کی تو طریقے بھی ہیں۔ تو کسی طرح خوش رہ اپنا تو صرف یہی ایک مقصد ہے کہ تجھے تکلیف نہ ہو۔ رضا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کے چہرے پر حسرت جھلک رہی تھی ”مجھے معلوم تھا وہ بولا“ میں نے کبھی کسی دوست کے لیے اتنی محبت محسوس نہیں کی۔ پتہ نہیں تم کون

اپنے منہ سے کہ دو اپنی زبان سے مانو اور کبھی مجبور ہوں پھنس گیا ہوں۔ پھر ہمارا تیار ہوں گے ایسے نہیں۔ چالاکی سے کام نہیں چلے گا ایل۔ ہمارے ساتھ جس نے گناہ سالہ منہ کے بل گرا۔

”یہ تم کیا بک رہے ہو۔“ ایل نے منہ پکا کر کے کہا۔

”تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کون بک رہا ہے۔“ رضا بولا ”سارے غم میں ہوا ہے ہر جگہ یہی بات ہو رہی ہے۔“

”کون سی بات؟“ ایل نے پوچھا۔

”تم جو سارا سارا دن اور آدھی آدھی رات تک اس کے گھر میں گھسے رہتے ہو۔ لیے وہاں چائے بنتی ہے۔ کھانے پکاتے ہیں مٹھائیاں خریدی جاتی ہیں۔ لوگ اندھے نہیں علی پور میں بات چیتی نہیں۔ یہ محلے والیاں تو تیر پچانتی ہیں۔“

”تمہیں مجھ پر یقین نہیں کیا۔“ ایل نے غصے میں کہا۔ ”مجھے دوست ہو تم مجھے سمجھتے ہو مگر یقین نہیں کرتے میری بات پر۔“

”ایمان سے کہتا ہوں میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تم مجھ سے بات چہا رہے ہو۔ چہا مجھ سے نہ چہا۔ ظالم اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔ تجھے یار نہ کہا ہوتا تو اب تک اگلا ہوتی میں نے۔“

”رضا۔“ ایل آنکھوں میں آنسو چھلکا کر بولا ”میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا سے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

رضا کے انداز کی درشتی یک قلم مفقود ہو گئی۔ ”دیکھ ایل۔“ وہ بولا ”میں تیرا دوست ہوں بول کیا چاہتا ہے تو چاہے جائز ہوتا جائز ہو۔ روپیہ چاہئے تو مجھ سے لے چاہے چوری کر لے لیکن تیرے سامنے ڈھیر کر دوں گا۔ کسی سے دشمنی ہے تو بلا خوف کہ دے۔ اسے ایک لاکھ سنک نہ دلا دوں تو میرا ذمہ۔ کسی سے محبت ہو گئی ہے تجھے تو بتا۔ کیسے نہیں ماننے کی جان ہے جو ہمارے یار کی بات رد کرے جینا مشکل کر دوں گا۔ اور نہ ماننے کی تو طریقے بھی ہیں۔ تو کسی طرح خوش رہ اپنا تو صرف یہی ایک مقصد ہے کہ تجھے تکلیف نہ ہو۔ رضا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کے چہرے پر حسرت جھلک رہی تھی ”مجھے معلوم تھا وہ بولا“ میں نے کبھی کسی دوست کے لیے اتنی محبت محسوس نہیں کی۔ پتہ نہیں تم کون

اپنے منہ سے کہ دو اپنی زبان سے مانو اور کبھی مجبور ہوں پھنس گیا ہوں۔ پھر ہمارا تیار ہوں گے ایسے نہیں۔ چالاکی سے کام نہیں چلے گا ایل۔ ہمارے ساتھ جس نے گناہ سالہ منہ کے بل گرا۔

”یہ تم کیا بک رہے ہو۔“ ایل نے منہ پکا کر کے کہا۔

”تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کون بک رہا ہے۔“ رضا بولا ”سارے غم میں ہوا ہے ہر جگہ یہی بات ہو رہی ہے۔“

”کون سی بات؟“ ایل نے پوچھا۔

”تم جو سارا سارا دن اور آدھی آدھی رات تک اس کے گھر میں گھسے رہتے ہو۔ لیے وہاں چائے بنتی ہے۔ کھانے پکاتے ہیں مٹھائیاں خریدی جاتی ہیں۔ لوگ اندھے نہیں علی پور میں بات چیتی نہیں۔ یہ محلے والیاں تو تیر پچانتی ہیں۔“

”تمہیں مجھ پر یقین نہیں کیا۔“ ایل نے غصے میں کہا۔ ”مجھے دوست ہو تم مجھے سمجھتے ہو مگر یقین نہیں کرتے میری بات پر۔“

”ایمان سے کہتا ہوں میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تم مجھ سے بات چہا رہے ہو۔ چہا مجھ سے نہ چہا۔ ظالم اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔ تجھے یار نہ کہا ہوتا تو اب تک اگلا ہوتی میں نے۔“

”رضا۔“ ایل آنکھوں میں آنسو چھلکا کر بولا ”میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا سے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

رضا کے انداز کی درشتی یک قلم مفقود ہو گئی۔ ”دیکھ ایل۔“ وہ بولا ”میں تیرا دوست ہوں بول کیا چاہتا ہے تو چاہے جائز ہوتا جائز ہو۔ روپیہ چاہئے تو مجھ سے لے چاہے چوری کر لے لیکن تیرے سامنے ڈھیر کر دوں گا۔ کسی سے دشمنی ہے تو بلا خوف کہ دے۔ اسے ایک لاکھ سنک نہ دلا دوں تو میرا ذمہ۔ کسی سے محبت ہو گئی ہے تجھے تو بتا۔ کیسے نہیں ماننے کی جان ہے جو ہمارے یار کی بات رد کرے جینا مشکل کر دوں گا۔ اور نہ ماننے کی تو طریقے بھی ہیں۔ تو کسی طرح خوش رہ اپنا تو صرف یہی ایک مقصد ہے کہ تجھے تکلیف نہ ہو۔ رضا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کے چہرے پر حسرت جھلک رہی تھی ”مجھے معلوم تھا وہ بولا“ میں نے کبھی کسی دوست کے لیے اتنی محبت محسوس نہیں کی۔ پتہ نہیں تم کون

در تک وہ دونوں خاموشی سے کئی کئی منٹھی روٹی کھاتے رہے پھر دفعتاً ”ساتھ والے مکان سے شہزاد کی حسین آواز یوں گونجی جیسے کوئی کوئل تن اڑا رہی ہو۔ اس آواز کو سن کر ایل ایک پڑا اس کے جسم پر روٹنے کھڑے ہو گئے۔“

”ہل دی تو ہے“ رضا ہنسنے لگا۔ ”اس کی آواز سن کر تمہاری کیا حالت ہو جاتی ہے۔“

”کیا حالت ہو جاتی ہے؟“ ایل نے پوچھا۔

”اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔“ وہ بولا ”سنو سنو فضول باتیں نہ کرو۔“

شہزاد کا قہقہہ پھر سنائی دیا۔ اس کے ساتھ بھدی سی آواز میں کوئی ہنس رہا تھا۔

”اس محلے کے جوہڑ میں یہ اکیلی ایک ہی راج ہنس ہے۔ چلتی ہے تو جیسے پانی کی لہرائی رہی ہو۔“ ایل نے پوچھا۔

”مگر ایل“ رضا بولا ”میرا دل کہتا ہے یا تو یہ مہارانی ہے اور یا۔۔۔ یا مہترانی۔“

”کیا مطلب؟“ ایل نے پوچھا۔

”ہل یا تو بہت ہی اونچی چیز ہے اور یا بچ ہے بے حد بچ۔ یا تو واقعی پرستش کے لائق ہے۔ اور یا۔۔۔“

”میرا دل کہتا ہے یا تو یہ مہارانی ہے اور یا۔۔۔ یا مہترانی۔“

”کیا مطلب؟“ ایل نے پوچھا۔

”ہل یا تو بہت ہی اونچی چیز ہے اور یا بچ ہے بے حد بچ۔ یا تو واقعی پرستش کے لائق ہے۔ اور یا۔۔۔“

”میرا دل کہتا ہے یا تو یہ مہارانی ہے اور یا۔۔۔ یا مہترانی۔“

”کیا مطلب؟“ ایل نے پوچھا۔

”ہل یا تو بہت ہی اونچی چیز ہے اور یا بچ ہے بے حد بچ۔ یا تو واقعی پرستش کے لائق ہے۔ اور یا۔۔۔“

خیرلو کا غفور سے ملنا ایلی کو قطعی طور پر ناپسند تھا لیکن شریف کی سگی ہمیشہ غفور کے بھائی  
تھے۔ یہاں ہوئی تھی لہذا شہزاد کو وہاں جانے سے روکنا ممکن نہ تھا۔

شہزاد کو دوسروں سے بے تکلفانہ بات کرتے ہوئے سن کر ایلی محسوس کرتا تھا جیسے اس  
پاپاؤں میں وہی دو دھاری مفہوم ہو جس کا اظہار وہ ایلی سے کیا کرتی تھی اور اس کے اشارات  
اور نئیات اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہوں وہ محسوس کیا کرتا تھا جیسے شہزاد ہر کسی سے وعدے  
کرتی ہے اور اپنے خصوصی انداز میں اپنی محبت کا یقین دلاتی ہے اس خیال پر وہ ایک عجیب  
دشمن میں جلا ہو جاتا۔ اس کا اپنا احساس کتری شکوک کو ہوا دیتا اور وہ آتش رقابت میں جلتا۔

### محراوردی

شہزاد کی باتیں سننے کے بعد اس کے لیے رضا کے پاس بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا اور وہ اٹھ  
ہٹا۔ اسے قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ جانے کے لیے کوئی جگہ بھی تو نہ  
تھی۔ علی احمد کے گھر میں نین کا سپاہی ربڑ کی گڑیا سے کھیلنے میں مصروف تھا باہر شمیم آنسو بہا  
رہی تھی۔ ہمارے چپکے سے کونے میں کھڑی تھی جیسے اس گھر کے تمام افراد کی زر خرید غلام ہو۔  
بدو چپ چاپ جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ وہ یا تو نماز پڑھتی اور یا گھٹنوں میں سر دے کر آلو چھیلنے  
میں مصروف رہتی۔ بڑے سے بڑا ہنگامہ بھی اس پر کوئی اثر نہ رکھتا تھا جیسے آندھی میں کوئی چھوٹا  
ماپوہا جھک کر زمین پر لیٹ جاتا ہے چمٹ جاتا ہے حتیٰ کہ آندھی کا زور کم ہو جاتا اور وہ پھر  
بروہا کھڑا ہو جاتا ہے۔ سیدہ کو دیکھ کر ایلی محسوس کیا کرتا تھا جیسے کسی بہت زور دار آندھی نے  
اسے بیش کے لیے ہموار کر دیا ہو اور اب یہ چھوٹے چھوٹے ہنگامے اس کے لیے بے معنی ہو  
چکے ہوں۔

علی احمد کے گھر میں وہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو ایلی کے لیے جاذب توجہ تھا۔ وہ کمرہ جس  
میں داؤی الی رہا کرتی تھی۔ داؤی اماں کی موت کے بعد وہ کمرہ جوں کا توں پڑا تھا۔ اس میں کوئی  
تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ تخت ویسے ہی کونے میں بچھا ہوا تھا جہاں وہ نماز پڑھا کرتی تھی اور اس  
کے پاس ہی وہ کھوکھا تھا جس میں وہ ایلی کا گیند یا دوسری چیزیں سنبھال کر رکھا کرتی تھی۔  
اور انہی اسی طرح پائے ستون پر لگی ہوئی تھیں جن کے نیچے مٹی کے برتنوں کی قطاریں تھیں  
اور انہی چھوٹے صندوق رکھے ہوئے تھے۔

آواز بلند ذرا نہیں جھجکتی ڈرتی نہیں۔ یا تو بڑے صاف دل والی ہے اور یا بڑی ہلکا  
ہے۔ اللہ کرے رانی ہی ثابت ہو ورنہ تمہاری خیر نہیں۔“

”ہونہ“ شہزاد کی آواز سنائی دی۔ ”ان کا کیا ہے وہ تو کیو ترکی طرح آنکھیں ہونڈ  
نے منہ میں دبا کر بیٹھ رہتے ہیں۔ وہ کہاں آتے جاتے ہیں۔ ان کا یہاں چھٹی پر اتار دینا  
ہے۔“ وہ تھقہ مار کر ہنسنے لگی۔

”سن لیا“ رضا بولا ”وہ گدھ کہاں اس لائق تھا کہ اسے مورنی مل جائے۔ ہے واقعی  
لیکن تمہیں کیا۔ تم مجھ سے جھوٹ تو بولتے ہی نہیں۔“

رضا کے گھر سے نکل کر وہ چپ چاپ فرحت کی طرف چلا آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ  
کر چارپائی پر لیٹ جائے۔ رضا کی بات اس کے دل میں کلنے کی طرح چبھ گئی تھی۔ اور  
باتوں اور قہقہے نے ان شبہات کو ہوا دی تھی شہزاد کے رویے اور رضا کی باتوں کی وجہ سے  
کے دل میں شکوک پیدا ہو رہے تھے۔

ایلی کو غفور سے خدا واسطے کی نفرت تھی۔ اسے انکے سارے خاندان سے نفرت تھی۔  
کے چار بھائی تھے۔ ان کا تمام تزکیہ محلے والوں سے الگ تھلک رہا کرتا تھا۔ ان کی روایات  
مختلف تھیں۔ وہ محلے کے آصفیوں سے زیادہ تعلقات نہیں رکھتے تھے چونکہ ان کے والدین  
آکر وہاں مقیم ہوئے تھے البتہ ان کی والدہ محلے ہی کی لڑکی تھی جو رشتے میں ایلی کی دینی بانی  
تھی۔

غفور ایلی سے عمر میں چار ایک سال بڑا تھا۔ غفور کو دیکھ کر ایلی محسوس کرتا تھا جیسے  
گوشت کا لوتھڑا ہو۔ اس کی شخصیت میں جسم کا عنصر بے حد غالب تھا۔ نگاہوں سے غمناک  
تھا جیسے وہ روح کی روشنی سے محروم ہو۔ جب وہ کھجاتا تھا تو اس کی آنکھوں میں گرنا ہٹ  
دکھائی دیتی تھی اور وہ اکثر نامناسب مقامات پر کھجایا کرتا تھا۔

اس کے علاوہ اس کی نگاہیں تندہی سے بھری ہوتی تھیں۔ بات کرنا تو اس میں جلد  
عنصر جھلکا ایلی کی غفور سے نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایلی میں کتری کا احساس قائل  
رویہ جھوٹی عظمت اور زعم کا حامل تھا تمام بھائیوں میں صرف غفور کی شخصیت میں  
بھائی الگ رہنے کے باوجود شوکت نفس سے بھرے ہوئے نہیں تھے۔ وہ سب غفور  
تلاں تھے۔ اور بوڑھا باپ تو اس کی وجہ سے سراسر زچ تھا۔

ان چیزوں کو دیکھ کر ایللی کا دل بھر آتا تھا اس کمرے میں جانا ایللی کے لیے تکلیف فرحت کا گھر تھا۔ وہاں فرحت کے علاوہ اجمل کے والد فیروز مقیم تھے۔ نیچے فرحت اور ایللی تھیں اوپر چوبارے میں فیروز رہا کرتے تھے۔ فیروز کو وقت پر نہانے وقت پر چائے پینے کا اور وقت پر سیر کرنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ ان مقررہ کاموں کے علاوہ یا تو وہ سارا دن پر پڑے رہتے اور یا ریل اور نجوم کی جنسیوں کا مطالعہ کیا کرتے۔ نیچے فرحت بھی کام دھونے یا سینے یا کھانا پکانا میں مصروف رہا کرتی تھی۔ ایللی کے لیے وہاں بیٹھنا بے حد مشکل اول تو وہ کمرے بے حد اداس تھے۔ دوسرے فرحت جوش محبت کی وجہ سے ہر بات میں ایللی بھلائی اور بہتری کا تذکرہ کرنے کی عادی تھی۔ اور ایللی کی بھلائی اور بہتری کے متعلق فرحت خیالات سے ایللی کو قطعی طور پر اتفاق نہ تھا۔ فرحت ایللی کی لا تعلقی کو محسوس کر کے شہزادہ چھیڑ دیتی تھی اور طنز میں فرحت کا جواب نہ تھا۔

محلے میں وہ کسی کے ہاں جانے کا عادی نہ تھا۔ اسے دوسروں کے گھر میں جاتے ہوئے وحشت ہوتی تھی محلے والیاں اگرچہ بڑی محبت اور ہمدردی سے اسے ملا کرتی تھیں۔ لیکن وہ ہمدردی میں ترس کا عنصر شامل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ فطری طور پر وہ لوگوں کی نگاہوں سے اُکرتا تھا۔ چاہے ان میں ہمدردی ہو یا تحسین اس کے لیے باہر نکلتا بھی مشکل تھا چونکہ ایللی کے ڈیوڑھیوں میں عورتوں کا تنگٹھا ضرور ہوتا تھا۔ چوگان میں بیٹھ کر عورتیں اپنے کام کا کرتی تھیں جیسے وہ گھر کا صحن ہو۔

عورتیں بالے کے مکان کی ڈیوڑھی میں بیٹھی رہتی تھیں یا تو وہ اپنے اپنے کام میں مشغول ہوتیں اور یا خالی بیٹھ کر باتوں میں مصروف رہتیں۔ محلے میں آزار بند بننا سب سے برا مسئلہ اور آزار بند بننے میں محلے کی عورتوں کو اس قدر مہارت ہو چکی تھی کہ ان کی انگوٹیاں کھینچتے تھے۔ نگاہیں آوارہ رہتی تھیں اور زبانیں یوں چلتی تھیں جسے قینچیاں ہوں۔ لہذا اندھیرے کمرے میں بلا تخت پر اپنی چیزیں رکھ بیٹھا آپ ہی آپ باتیں کرتا رہتا۔

اس روز ایللی نے سوچا چلو بالا کے ہاں جا بیٹھو کچھ وقت گزر جائے گا۔ جب وہ چوگان پہنچا تو شہزاد کے چوبارے کی کھڑکی میں کسی نے اشارے سے اسے بلایا۔ نہ جانے کون ہے نے سوچا۔ شاید جانو ہو۔ پھر اس نے شریف کی آواز پہچان لی کھڑکی میں شریف کھڑا ہوا تھا۔ نہ جانے کیا بات ہے وہ سوچنے لگا۔ بہر صورت شریف سے انکار کرنے کی اس میں

نہیں۔ چوبارے میں شریف اکیلا بیٹھا تھا۔ ”وہ تو محض اتفاق سے میری نگاہ پڑ گئی۔“ شریف نے کہا ”وہ نہ تم تو شاید آتے ہی نہ۔ کیا بات ہے ایللی۔“ شریف نے لمبی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا ”تم ہم سے اس قدر گریز کیوں کرتے ہو۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تمہاری میں شاید تم مجھے اپنی نیم کا قصہ سنا سکو شہزاد کے سامنے تو ہچکچاتے ہو نا۔ بتاؤ کبھی ملی بھی ہے تم سے۔“

ایللی مسکرایا۔  
”درو نہیں۔ میں کسی سے نہیں کہوں گا“ وہ بولا ”گھبراؤ نہیں۔“  
ایللی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے ”طے نہ طے“ وہ بولا ”مطلب تو جذبے سے ہے“

”ہاں بالکل“ شریف کا چہرہ مسرت سے جگمگا اٹھا اگر جذبے میں خلوص ہے تو سمجھ لو پیرا پار ہے کچ کہتے ہو کچ کہتے ہو“ شریف نے ٹھنڈی آہ بھری ”چاہے تباہ ہو جاؤ۔ لیکن جذبہ میں غلوں اور شدت قائم رہے۔ ایسی تباہی پر سینکڑوں آبادیاں قربان ہیں۔ اچھا اس کے عزیزوں کو طے ہے کیا؟“

”معلوم نہیں“ ایللی نے کہا ”شاید علم ہو۔ لیکن کیسے معلوم ہو سکتا ہے انہیں۔ میں نے تو کبھی کسی سے بات نہیں کی اور ابا کو تو ابھی اپنے چاؤ سے فرصت نہیں۔“

شریف ہنسنے لگا۔  
”اے اپنے چاؤ سے فرصت کیسے طے“ شہزاد داخل ہو کر بولی ”سارا محلہ چھان مارا میں لیکن تمہارا پتہ نہ چلا۔ پہلے بالے کے ہاں گئی پھر ار حند کے گھر گئی ادھر غفور کی طرف جا پہنچی بلکہ نہ ملا تو میں نے کہا شاید اپنے ابا کے پاس بیٹھا ہو۔ آخر اپنی نئی اماں کو بھی تو سلام کرنا تھا۔“

”دیکھ لے ہم نے بیٹھے بیٹھے تلاش کر لیا“ شریف نے کہا ”کچھ دھاگے سے بندھا آیا ہے۔“

ایللی پوچھ لے اس سے خود نہیں آیا یہ۔“

شہزاد نے آہ بھری ”ہمیں یہ کچا دھاگا نصیب نہ ہوا۔ ہم نے اپنی زندگی ویسے ہی کھو دی۔ ہمیں لگتا ہے عشق نصیب ہی نہ کیا۔ اپنے اپنے نصیب ہیں جس کے ساتھ ہماری سنجوگ طے وہ پلکی سے کسی اور کے ہو چکے تھے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ شریف بولا اس کے انداز میں احتجاج تھا۔

”غلط کہہ رہی ہوں کیا“ شہزاد چمک کر بولی۔ ”میاں اپنی دھن میں بیٹھے رہتے ہیں ایلہ دھن میں آوارہ رہتا ہے۔ ایک میں ہوں جو بغیر کسی دھن کے کوئے کی طرح میلے وہاں جا بیٹھی۔“

”اب پنچھیوں کو بھی کوئے بننے کا شوق چرایا“ ایلہ بولا۔

”پنچھی۔“ شہزاد نے غصے سے ایلہ کی طرف دیکھا ”کبھی تھے ہی پنچھی۔“

”کیا کہہ رہے ہو تم۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں“ شریف بولا۔

”نہ ہی آئیں تو بہتر ہے۔“ شہزاد ہنسنے لگی۔ ”محسوسات کی دنیا میں رہنے والوں کو سمجھنا کیا ضرورت۔“

”اچھا بھئی تم جو کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہو گا۔“ شریف آہ بھر کر بولا۔ اور پھر خاموش ہو گیا۔

## کروٹیں اور قہقہے

رات کے وقت جب ایلہ چارپائی پر لیٹا تو اس کے دل میں متضاد قسم کے احساسات۔ شہزاد اور شریف کے پاس بیٹھے ہوئے اسے شریف پر ترس آتا تھا۔ اس وقت شریف کی بیڑیچ ہو کر رہ جاتی تھی۔ اور شہزاد کی باتیں اور اس کے اشارات ایلہ کے دل میں پختہ یقین پیدا دیتے تھے کہ وہ اس سے کھیل نہیں رہی بلکہ اس کی لگن میں بری طرح سے سرشار ہے۔ جو نہی وہ اکیلے میں لیٹتا تو شہزاد کی باتیں دھندلی پڑتی جاتیں اور ارجمند اور رضا کی آوازیں ہوتیں۔ میں بتاؤں ایلہ یا تو وہ مہارانی ہے اور یا مہترانی۔ مہترانی مہترانی۔ دور کوئی چلا تا پھر غوراً بھدی آواز ابھرتی اور شہزاد چیخ کر کہتی ان کا کیا ہے ان کا میاں چھٹی پر آنا نہ آتا برا ہے۔ فرق پڑتا ہے۔ کھلاڑی! محلے کی مسجد کے گنبد سے کوئی الو چیخ کھلاڑی دور کوئی چھگڑا اس انداز میں چراتی۔

پھر ایک رنگین اور شوخ کھلاڑی اس کے روبرو آکر کھڑی ہو جاتی اور وہ شریف کو بلکے کرتی۔ اپنی طرف بلاتی۔ اور اس کا جہم ابھرتا سمٹتا جیسے شدید خواہش اسے بلواری ہو۔ مہرمان کے کپڑے دھجیاں بن کر اڑ جاتے اور وہ برہنہ رہ جاتی۔ اس وقت ایلہ محسوس کرتا جیسے ہاتھ ہو۔ اس خیال پر اس پر دیوانگی طاری ہو جاتی۔ اس کے دل کی اقلہ گہرائیوں سے ایک کربا

اور جسم کے روئیں روئیں کو یوں دھنکتا جیسے روٹی کا گلا ہو۔ وہ دیوانہ وار چارپائی پر کروٹیں

باندھ

ساری رات وہ چارپائی پر تڑپتا رہتا حتیٰ کہ صبح کلاب کا وقت ہو جاتا اور پھر تھک کر اس کی آنکھ لگ جاتی۔ پھر بھی اس سونے کو نیند سے تعلق نہ ہوتا۔ جیسے کوئی مریض کسی خوف ناک تکلیف کے تحت کچھ عرصے کے لیے تھک ہار کر بے جان ہو کر پڑ جاتا ہے۔

اس لیے صبح جب وہ جاگتا تو وہ تازگی محسوس نہ ہوتی۔ جو نیند کے بعد انسان محسوس کرتا ہے۔ ہند بند درد کرنا اینٹھن کی وجہ سے اعصاب دکھتے۔ اور چہرے پر پڑمردگی چھائی ہوتی۔ ابھی وہ رات کی واردات کی تعلق سوچ رہا ہوتا کہ میڑھیوں میں کسی کے پاؤں کے رقص کی آواز گونجتی اور چھن سے شہزاد اس کے روبرو آکھڑی ہوتی۔

”جہل اٹھ وہ چائے کے لیے کب سے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔ ابھی لاث صاحب جاگے بھی نہیں۔ کیا زندگی ہے جیسے کوئی نواب زاہد ہو۔“ وہ ہنستی۔

شہزاد کی باتیں سن کر اس کی تمام تر تھکن فرو ہو جاتی۔ اس کی ہر بات محبت کا پیغام ہوتی اور یہ پیغامات ایسی خوشی اور رنگین سے ایلہ تک پہنچائے جاتے کہ اس پر نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور رات کے شکوک اور بے خوابی گویا اسے یاد ہی نہ رہتے۔ اگر کسی وقت اسے رات کے کرب کا خیال آتا بھی تو وہ ہنس دیتا۔ میں بھی کیسا پاگل ہوں وہ سوچتا جو خواہ مخواہ کے شکوک پال لیتا ہوں۔

لیکن اس کے باوجود پھر جب رات پڑتی تو دن کے وہ لطیف اور رنگین پیغامات اس کے ذہن سے مٹ جاتے اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہی بھیانک تصاویر متحرک ہو جاتیں اور وہ شدت کرب سے تڑپتا اور کروٹیں لیتا۔ تڑپتا اور کروٹیں لیتا حتیٰ کہ صبح کلاب کے وقت تھک کر بے ہوش ہو جاتا۔

اس طرح اس کی زندگی دو زخنی حیثیت اختیار کر گئی اس کے ساتھ ہی شہزاد کی شخصیت اس کے نزدیک راوہا اور راہو دونوں کی خصوصیات سے مزین ہو گئی۔ وہ بیک وقت اسے پاکیزہ ترین معصوم محبوب اور چالباز کھلاڑی دکھائی دیتی تھی۔ ایک ساعت میں ایلہ اسے خلوص بھرے سجدے کرتا تھا۔ دوسری ساعت میں ناگن سمجھ کر اس سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا۔ یہ کیفیت ایک دیوانگی کی حیثیت اختیار کر گئی حتیٰ کہ اس کے لیے یہ جاننا مشکل ہو گیا کہ آیا

”لیکن آپ نے تو کہا تھا“ ایلی بولا ”کہ آپ مجھے کسی اور کالج میں داخل کریں گے۔“  
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔“ وہ ننگے پیٹ کو کھجاتے ہوئے بولے ”سیدہ او  
 سیدہ ذرا دھر آنا۔ آنا ذرا ایک منٹ کے لیے“ اور جب سیدہ آئی تو کہنے لگے ”جھلا بتاؤ تو کیا یہ  
 ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم ایلی کو مشن کالج میں داخل کرائیں۔ جب اپنا اسلامی کالج موجود ہو تو  
 میاںوں کے کالج میں کیسے داخل کرائیں کیوں سیدہ ایمان سے کہنا۔“  
 ”ہے“ سیدہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی ”اس عیسائی کالج میں جہاں اپنے محسن کا لڑکا پرویز ایسا گیا  
 کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ بس عیسائی ہو گیا اور نتیجہ کیا ہوا ماں نے اسی غم میں جان دے دی اور  
 باپ کا جو حال ہو رہا ہے وہ کس سے چھپا ہے۔“

”دیکھو سیدہ“ وہ بڑی سنجیدگی سے بولے ”مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا چاہے گورنمنٹ کے کالج  
 میں داخل ہو جائے یا عیسائیوں کے کالج میں دس ایک روپے کا فرق پڑ جائے تو کیا ہوا۔ مطلب تو  
 یہ ہے کہ تعلیم اچھی ہو جائے لڑکے کی۔ بس صرف یہ خیال آتا ہے کہ اگر اپنا اسلامی کالج موجود  
 ہے تو پھر کیا ہمیں ایلی کو عیسائیوں کے کالج میں داخل کرانا چاہیے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ تم پر رہا۔  
 جو تم کو وہی کروں گا میں ذرا شیم کو بھی بلا لوں ناس کی مرضی بھی پوچھ لیں۔ اور باجرہ کہاں  
 ہے اس کا موجود ہونا بھی ضروری ہے۔ کیوں سیدہ۔“

سیدہ شیم کو بلانے گئی تو وہ اٹھ کر جنگلے میں جا کھڑے ہوئے اور چلا چلا کر محلے والیوں کو  
 بلانے لگے۔ ”میں نے کہا ماماں برکتے ذرا آنا تو ایک منٹ کے لیے اے بی بی تنھو تو کیا کر رہی ہے۔  
 ہر وقت آزار بند ہی بنتی رہتی ہے کبھی اللہ اور رسول کا کام بھی کر لیا کر۔ آذرا یہاں تیرا مشورہ  
 لینا ہے۔ بہت ضروری بات ہے۔“

علی احمد نے شور مچا کر محلے والیوں کو اکٹھا کر لیا اور پھر اس جرگے کے سامنے ایلی کے داخلے  
 کا مقدمہ نمائیت خوب صورتی سے پیش کر دیا۔ محلے والیاں یک زبان ہو کر علی احمد کی رائے پر  
 عمل کر دی تھیں۔ اور وہ بار بار چلا رہے تھے ”دیکھ ماں برکتے میرا کیا ہے مجھے تو لڑکے کو  
 داخل کرنا ہے ناپسند نہ کیا وہاں کر دیا۔ کیا فرق پڑتا ہے اول تو اخراجات میں کمی زیادتی ہوتی  
 نہیں اور اگر وہ بھی بی بی تنھو تو کیا ہے اپنے بیٹے سے بڑھ کر کون ہوتا ہے۔ انہیں کے لیے محنت  
 مزدوری کرتے ہیں ہم اور پھر جہاں سو وہاں سو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ اب سوچ لو تم ایک تو  
 عیسائیوں کا کالج ہے جہاں عیسائی مسیح کی بائبل پڑھتے ہیں اور دوسرا ہے اپنا اسلامی کالج جہاں اللہ

وہ اس حسین اور پاکیزہ دیوی کی وجہ سے وہاں سیس نوانے پر مجبور تھا یا اس دلکش ہانگے  
 ڈسے جانے کے شوق نے اسے وہاں رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کربا  
 شدید لذت جو وہ رات کے وقت محسوس کیا کرتا تھا اسے شہزاد سے محبت کرنے پر مجبور کر رہی  
 اور ایذا پرستی کا جنون اس کے سر پر سوار ہو۔

بہر حال یہ تو ایک مسلم امر ہے کہ اگر شہزاد صرف حسین و جمیل عورت ہوتی تو شاید ایلی  
 کے دل میں اس کے لیے اس قدر عظیم جذبہ پیدا نہ ہوتا اور ہوتا بھی تو اسے اس قدر دہم  
 حاصل نہ ہوتا۔

## جرگہ

کچھ دن کے بعد ایلی کا نتیجہ نکل آیا وہ ایف۔ اے میں پاس ہو گیا۔ علی احمد نے اسے فہر  
 ایئر میں داخل کرانے کے لیے لاہور بھیجے کا فیصلہ کر دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے ایلی کو بہت لبا پڑا  
 لکھ دیا۔

ایلی ان کی باتیں بڑے غور سے سنتا رہا جب وہ سب داؤ اور گرتا چکے تو ایلی نے کہا ”بکے  
 ابا جان آپ کے فرمان بالکل درست ہیں لیکن آپ مجھے اسلامیہ کالج میں داخل نہ کرائیں بڑک  
 وہاں کا ماحول ایسا ہے کہ وہاں میں اطمینان سے نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ واقعی چاہتے ہیں کہ  
 بے ضابطگیوں کا اعادہ نہ ہو جو پہلے مجھ سے سرزد ہوئی ہیں تو مہربانی سے مجھے گورنمنٹ ہائس  
 کالج میں داخل کرا دیجئے۔“

”ہاں ہاں“ وہ بولے ”ہمیں اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہمارا مقصد تو صرف یہ ہے کہ  
 تمہاری تعلیم مکمل ہو جائے۔“

اس کے بعد انہوں نے مختلف لڑکوں کو ادھر ادھر بھیجا تا کہ وہ تینوں کالجوں کے پراپٹن  
 لے آئیں۔ پراپٹن میا کرنے کے بعد وہ اپنے بڑے بڑے رجسٹر لے کر چٹائی پر بیٹھ گئے اور  
 سارا دن مختلف کالجوں کی فیس اور دیگر اخراجات جوڑتے رہے انہوں نے رقبے بار بار لکھیں  
 بار انہیں جمع کیا ایک میزان کو دوسرے میزانوں سے ملایا۔ اور کئی ایک گھنٹوں کے بعد  
 سے ہر اٹھا کر بولے ”ٹھیک تو ہے تم کل ہی لاہور روانہ ہو جاؤ اور جا کر اسلامیہ کالج میں داخل  
 ہو جاؤ۔“



شہزادے اکیلے میں مل سکے مگر شریف نے چپکے سے اپنی چھٹی بڑھالی تھی اس لیے اس کی یہ آواز پوری نہ ہو سکی۔ ادھر علی احمد تقاضا کر رہے تھے کہ جلد جائے لہذا اسے اپنی مرضی کے خلاف لاہور جانا ہی پڑا۔ جاتے وقت اس نے ان بے آنسوؤں سے شہزاد کی طرف دیکھا اور یونٹ ہائے بغیر اشاروں کی مدد سے شہزاد سے اظہارِ درد دل کیا اور رخصت ہو گیا۔



اور رسولؐ کے احکامات اور اسلام کے ارکان کی تعلیم دیتے ہیں۔ اب تم ہی فیصلہ کر لو ہاں۔“  
جوں کے فیصلے کے بعد علی احمد نے ایک بار پھر رجسٹر میں اندراج شدہ رقوم کے معائنہ دیکھے۔ ایک بار پھر رقیں جمع کیں اور پھر یوں فاتحانہ انداز سے مسکرانے لگے جیسے کوئی سرانجام بہت بڑے منافع کا سودا اپنا کر گردو پیش پر نگاہ ڈال رہا ہو۔

اگلے روز سیڑھیوں میں دھما چوکڑی کی آواز کے بغیر چھن چھنان کے بغیر شہزاد چپکے داخل ہوئی۔ ”تو جا رہا ہے“ وہ بولی ”سنا ہے کلج میں داخل ہونے کے لیے جا رہا ہے۔“  
”ہاں“ ایلی نے کہا۔ ”تمہارے لیے کیا فرق پڑتا ہے۔“  
”پڑتا ہے۔“ وہ بولی ”صرف ساٹھ میل کا فرق ہے۔ چار گھنٹے کا فرق سمجھ لو۔“  
”اچھا۔“ وہ ہنسا۔ ”میں تو سمجھا تھا کہ —“  
”یہ سمجھ کی بات نہیں ہاں“ وہ بولی ”یہ احساس کی بات ہے۔ چلو وہ چائے پر ملا رہے ہیں۔“

ایلی بگڑ گیا ”میں نہیں جانتا۔ وہ بلانے والے کون ہیں۔“  
”بلانے والے کا خیال نہ کرو۔ بلاوی کا تو خیال کرو۔ میری طرف دیکھو۔“ وہ بولی۔  
”نہ میں نہیں دیکھتا۔“ وہ منہ پھیر کر بولا۔  
”دیکھے بغیر رہ بھی سکو گے۔“ وہ ہنسی۔  
فرحت چپکے سے داخل ہو کر جھٹ سے بولی ”کون کے دیکھے بغیر نہیں رہ سکے گا۔“  
”میں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ شہزاد ہنستے ہوئے کہنے لگی۔  
”کے دیکھے بغیر“ اس نے پوچھا۔  
”تمہیں اور کے“ شہزاد ہنسے چلی گئی۔  
”مجھے؟“

اور کیا ایلی کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس ایلی کے۔ ذرا اپنے بھائی کی صورت تو دیکھو۔  
جانے بھائیوں کے متعلق بہنیں غلط فہمیاں کیوں پال رکھتی ہیں۔“  
”چلو بھی نا اب کہ مجھے فرحت سے پڑا کے رہو گے“ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولی۔  
بھی نا“ اور ایلی چپکے سے اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔  
ایلی کا خیال تھا کہ شریف کے رخصت ہو جانے کے بعد وہ لاہور جائے گا تاکہ ایک

”اتنی دیر نہ رہنا دیکھے بنا اور کیا۔“

اور اس نے جواب میں کہا تھا: ”اگر رہنا پڑے تو؟“

تو وہ بے پرواہی سے بولی تھی: ”تو کیا ہوا۔ تم نہ آسکو گے تو میں آجاؤں گی۔“

”تم آؤ گی لاہور۔“ ایللی نے حیرت سی شنراؤ کی طرف دیکھا تھا۔

”ہوں۔“ شنراؤ ہنس کر بولی تھی۔ ”اس میں کیا مشکل ہے۔ ایک گاڑی سے آؤں گی۔“

دوسری سے لوٹ آؤں گی۔ تم دیکھ لیتا جی بھر کے۔“

کتنی جرات تھی اس میں۔

ریلوے سٹیشن سے وہ سیدھا کالج پہنچا اور علی احمد کی ہدایات کے مطابق دفتر میں داخلہ اور فیس ادا کرنے کے بعد حسن منزل کی طرف چل پڑا تھا۔ جہاں اسے رہنے کے لئے جگہ ملی تھی۔

اس نے کوشش سے حسن منزل میں جگہ لی تھی کیونکہ ریواز ہوٹل میں رہنا پسند نہ تھا۔

تاہا اس کی وجہ یہ تھی کہ ریواز ہوٹل سے گزشتہ کئی ایک تلخ یادیں وابستہ تھیں اور وہاں اب

بھی گاؤں کے چودھری بھرے پڑے تھے۔ وہی چودھری جن کے ساتھ گاؤں کے کہیں نوکر

ہوتے۔ حقہ اور تمباکو کی تھیلیاں ہوتیں اور جو شلوار کی جگہ چادریں باندھے یوں بورڈنگ میں

گھومتے پھرتے جیسے ریواز ہوٹل ان کے گاؤں کا کھیت ہو وہ چلا چلا کر بات کرتے۔ بات بات پر

لٹکارتے۔ بورڈنگ کے نوکروں کو گالیاں دیتے۔ دھمکاتے اور ہر نئے لڑکے کو گھورتے۔

اسلامیہ کالج کے اب تین بورڈنگ تھے۔ ریواز ہوٹل اور رحیم بلڈنگ تو کالج کی عمارت

کے پہلو میں واقع تھے اور حسن منزل کافی فاصلہ پر تھی۔ کالج والے حسن منزل کے قریب کوپر

روڈ پر ایک نیا بورڈنگ بنوا رہے تھے لیکن یہ باکریٹ ہوٹل ابھی زیر تعمیر تھا۔

تاسے میں بیٹھے ہوئے ایللی غور سے لاہور کے ان علاقوں کو دیکھتا رہا۔ جنوب کی طرف ایک

وسیع میدان تھا جس میں جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ اس وسیع میدان میں دو ایک مکانات زیر تعمیر

تھے۔ بیڈن روڈ پر چند ٹوٹے پھوٹے ویران سے مکانات تھے۔ میکلوڈ روڈ ویران سڑک تھی

جس کے دونوں طرف کوئی عمارت نہ تھی۔

میکلوڈ روڈ کوپر روڈ اور بیڈن روڈ کے وسیع ویرانے کے عین درمیان میں حسن منزل

واقع تھی۔ اس وسیع اور ویران علاقے میں وہ واحد دو منزلہ بلڈنگ تھی۔ میکلوڈ روڈ پر

اڈنی لاگوٹی نشین نہ تھا۔ صرف ایک سڑک جس کے غریب حصے میں یہاں اکا دکا عمارت

## تیاگ

### حسن منزل

گاڑی علی پور کے سٹیشن سے روانہ ہوئی تو ایللی نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ جا رہا ہے

شنراؤ سے دور جا رہا ہے۔ اس کے گورے چنے ہاتھوں سے دور۔ اس کے لگتے ہوئے بالوں

سے دور۔ ناؤسی ڈولتی آنکھوں اور ماتھے کے تلک سے دور۔ پھر اسے ان رنگین اور شرف

بیان کا خیال آیا جو انہوں نے شریف کے روپرو لطیف کنایوں اور رنگین اشارات کی مدد

ایک دوسرے سے کئے تھے۔ اس کے دل میں اضطراب کھولنے لگا۔

کیا میں ان رنگینوں سے محروم ہو جاؤں گا؟

کھڑکی سے باہر شنراؤ مسکرا رہی تھی۔ ”کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ ہنس رہی تھی۔

کھٹنے کا فرق؟ وہ تھمہ مار کر ہنسنے لگی۔

ایللی کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

”میری ہے تو پھر کیا غم؟“ اس نے سوچا۔ پھر اسے شنراؤ کی وہ بات یاد آئی جب ایللی

ایکے میں شنراؤ سے کہا تھا۔

”شنراؤ اگر میں وہاں سے نہ آسکا تو پھر میں تمہیں کیسے دیکھوں گا۔ اتنی دیر دیکھے جائے

رہوں گا۔“

یہ سن کر وہ ہنس پڑی تھی۔

خوش فضا یا شرارت کا اظہار نہیں ہوتا تھا بلکہ دائمی طور پر اس کے چہرے پر ایک کیفیت گویا کندہ کر دی تھی جیسا کہ رہا ہو۔ ”معاف کیجئے بات سمجھ میں نہیں آئی“ — بات کو سننے اور سمجھنے کے بلکہ اس کے چہرے پر لا علمی اور بے بسی کے طے جملے جذبات طاری رہتے تھے۔ بل اپنے لیے قد کا خوب صورت جوان تھا۔ رنگ گورا تھا بال سنہرے تھے آنکھیں بھوری اور مدخل ستواں ہونے کے باوجود مردانہ قسم کے تھے۔ اس کا جسم بھرا ہوا اور اعضاء میں ایک پگ تھی۔

جمل لا بلور کے کسی چمک کا رہنے والا تھا۔ اس کی عادت دیہاتی رنگ لئے ہوئے تھیں۔ طاروہ بندہ ہانسنے، ملل کا کرتہ پہننے اور پھر بھرپور قہقہے لگانے میں خاص مسرت محسوس کیا کرتا اور اسے جسم کھانے کی عادت تھی۔

ہر ایک روز وہ تینوں ایک دوسرے سے جھگ محسوس کرتے رہے اور تکلف برتتے رہے لیکن جلد ہی جمل ایلی سے کھل کر باتیں کرنے لگا۔ جمل اور ایلی دونوں کو معلوم ہو گیا کہ رات کے ان سے مکمل مل جانے کی توقع بے سود ہے کیونکہ وہ اپنی طبیعت کی وجہ سے مجبور ہے۔

کالج سے واپسی پر ایلی اپنی چارپائی پر بیٹھ جاتا اور خیالات کی دنیا میں کھو جاتا۔ کمرے کی مشق دیوار آہستہ آہستہ سرکتی۔ ایک زینہ نمودار ہوتا۔ پھر اس زینے سے دھما چوڑی کی آواز آتی اور جن چمنٹن سے کوئی اس کے رویو آکھڑی ہوتی —

”ہلو، وہ جائے پر انتظار کر رہے ہیں۔“

ایلی چونک پڑتا اور گہرا کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا۔ ریاضت چپ چاپ دیوار سے ٹک لگے ہاتھ میں کتب لئے چھت کی طرف گھور رہا ہوتا۔ جمل اپنے کپڑوں کو تہہ کر کے لولے تے جملے میں شدت سے مصروف ہوتا۔ ایلی سوچنے لگتا شاید انہوں نے شہزاد کے قہقہوں کی آواز سن پائی ہو۔ شاید وہ اس کے راز سے واقف ہو گئے ہوں شاید —

پھر وہ اپنے اعتقاد غدشات پر ہنس دیتا ”میں بھی پاگل ہوں۔“ وہ سوچتا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے آپ میں کھوئے ہوئے دیکھ کر اسے خیال آتا۔ نہ جانے ان دونوں پر کیا بیت رہا ہے اس کمرے میں ہوتے ہوئے نہ جانے یہ کہاں کہاں گھوم رہے ہیں۔ بیچاروں کو اپنی

کھڑی تھی۔ کوپر روڈ اور بیٹن روڈ کا تمام تر علاقہ ویران تھا جہاں رات کے وقت گزرتا آسمان تھا کیونکہ اس علاقے میں چوری اور ڈکیتی کی واردات عام تھیں۔ میکلوٹ روڈ پر صرف ایک سینما ہال تھا جس کا نام ایپرس سینما تھا اور جہاں زیادہ تر ٹائی فلم دیکھتے تھے۔ فلم کے دوران میں وہ ایک دوسرے کو گالیاں بکتے۔ مونگ پھلی کھاتے اور متحرک مگر خاموش تصویروں میں بیٹھ کر ناٹکیں دیکھ کر چنگاڑوں کی طرح چیخیں مارتے تھے۔

حسن منزل ایک بہت بڑی دو منزلہ عمارت تھی جس کی چلی منزل میں ایک ہوٹل تھا اور اوپر کی منزل کالج نے کرایہ پر لے رکھی تھی۔ اس منزل کے پچھواڑے میں ایک پرائیویٹ کھارہ تھا۔ منزل کے عین مقابل میں ایک پرانی کوٹھی جس میں ایک پارسی شراب پیپتا تھا اس کے گاہک زیادہ تر ٹائی تھے جو ڈھائی آنے میں ڈرافٹ بیر کا گلاس خریدتے تھے۔ اور ایک گلاس سے دو بوتل کا نشہ حاصل کرنے کے لئے شور مچاتے دنگا کرتے اور سیٹیاں بجاتے تھے۔

حسن منزل کی اوپر کی منزل کالج والوں نے اس لئے کرایہ پر لے رکھی تھی تاکہ بورڈروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو جگہ دی جاسکے۔ غالباً ”کالج کے ناٹکوں کو بورڈروں میں صرف اس تک دلچسپی تھی کہ ان کی وجہ سے کالج کی آمدنی میں اضافہ ہو رہا تھا ورنہ حسن منزل کو کالج نے نوجوانوں کی رہائش کے لئے موزوں نہ سمجھتے۔ حسن منزل تو کیا ریواز ہوٹل بذات خود کالج کے لڑکوں کی رہائش کے لئے موزوں نہ رہا تھا کیونکہ اس کے گرد بہت سے مکانات تعمیر ہو چکے تھے۔ ریواز ہوٹل کے مقابل کالج کے مشرقی سرے پر جو عمارت بورڈمگ کے طور پر خریدی گئی تھی اس کی کھڑکیوں سے تو گرد و نواح کے تمام مکانات کے اندرونی حصے تک دکھائی دیتے تھے۔

حسن منزل کے جس کمرے میں ایلی کو جگہ ملی وہاں کل تین سیٹیں تھیں۔ ایلی کے علاوہ وہاں دو لڑکے تھے ایک کا نام جمل اور دوسرے کا ریاضت تھا۔ ریاضت ایک دلا پٹا طالب علم تھا جس کی ناک چونچ کی طرح نکلی ہوئی تھی اور جس کی آنکھیں روٹی سی تھیں۔ جب وہ چنانچہ اس کا سرا جسم جھوٹا تھا۔ اعضاء اکھڑے اکھڑے معلوم ہوتے تھے جیسے وقتی طور پر مزارا کرنے کے لئے فٹ کئے بغیر جوڑ دیئے گئے ہوں۔ وہ خود بات کرنے سے گریز کرتا تھا لیکن کوئی بات کرنا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے کانوں کے اوپر سے ہوا سا ٹم کھالیتے تھے تاکہ بات کا کوئی حصہ کان سے ٹکرا کر باہر نہ نکل جائے۔ بات سننے وقت اس کی آنکھیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ بات کو قطعی طور پر نہیں سمجھ رہا۔ اس کے چہرے پر

”جب بھی موٹر سائیکل آتا ہے۔ یہ سب یوں بھاگ لیتے ہیں جیسے —  
الادیکھاتم نے۔ یہ جوہلی منزل میں ہوٹل ہے۔ گاہک آتے کبھی دیکھا نہیں کسی نے ہلکا

”باہر چلو۔“ جمل نے آہستہ سے کہا ”میں بات نہ ہو سکے گی۔“ اس نے طرف اشارہ کیا۔ ”باہر برآمدے میں کھڑے ہوں گے۔ آؤ۔“  
برآمدے میں جا کر اس نے ایک ہاتھ میں وہ تصویر پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے



شراب پیتے ہیں اور ہوٹل والے نے اپنے ہاں پانچ چھ لال بیسیاں رکھی ہوئی ہیں۔“  
 ”مال بیسیاں؟“ ایلی نے تعجب سے جمل کی طرف دیکھا۔  
 ”ارے وہی۔ ہیرامنڈی کی عورتیں اور کون“ جمل مسکرانے لگا۔  
 ”کیا مطلب؟“ ایلی نے حیرانی سے کہا۔ ”اس ہوٹل میں جو بورڈنگ تیلے واقع ہے۔“  
 ”ہاں۔ یہ ہوٹل تو شخص بہانہ ہے دراصل مینجر کا کاروبار ہی یہی ہے۔“  
 ”تو پھر؟“ ایلی نے پوچھا۔

”پھر کیا؟“ جمل ہنسا۔ ”میں نے گوروں سے کہا میں نے کہا سالو ڈنڈا گورا آئے گا تو بتاؤں گا میں کہ تم بد معاشی کرتے ہو۔ پہلے تو وہ بات کو مذاق میں ٹالتے رہے پھر کہنے لگے اور تم یہاں کیوں آتے۔ تم بھی تو لال بی بی کے لیے آتا ہوٹل میں۔“ جمل ہنسنے لگا۔ ”میں نے کہا: ”ہم رپورٹ کرے گا کہ تم نے گند چھایا ہے یہاں۔ اور ایلی کچھ دیر کے بعد ایک جیب سے چاکلیٹ نکال کر مجھے دیکر کہنے لگا اچھا بتاؤ نہیں چاکلیٹ دینا ہم تم کو۔ میں نے کہا نہیں سالو چاکلیٹ دے کر ہانا ہے ہمیں۔ ہم رپورٹ کرے گا ضرور کرنے لگا۔ پھر وہ بولا کیا لے گا۔ بس میں نے کہا اب بھنے سالے۔ میں نے کہا ہم کو لال بی بی کے پاس لے چلو۔ اس پر وہ ہنسنے لگے بہت ہنسے بولے۔ ”اچھا دل تم بھی جانا نا نکلتا۔“ پھر ان میں سے دو مینجر کے پاس گئے اور کچھ دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے۔ پھر انہوں نے اشارے سے مجھے بلایا اور ہوٹل والا مجھے اندر لے گیا۔

”ارے ایلی۔“ جمل نے تہہ بند جھاڑ کر کہا۔ ”سالی کا جسم یوں تھا جیسے گاجنی سے بنی ہوئی ہے۔ زرد زرد جیسے زردے کی پلیٹ اتنا گھسا ہوا کہ انگلی نہ چسبے واہ واہ اور وہ ہنستی تھی مجھے دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی۔“

”اچھا۔“ اچھا۔“ ایلی کا حلق بند ہوا جا رہا تھا۔

زرد

اور جب میں باہر نکلا تو مینجر نے سوچا۔ شاید بخشش دے گا۔ میں نے اٹا جھاڑ دی۔  
 ”میں نے کہا“ ”لوگوں کے بورڈنگ تیلے تم ایسا کام کرتا ہے۔ ہم رپورٹ کریں گے۔ اس پر وہ ڈر گیا اور فحش کرنے لگا۔ اور مالوم ہے اس نے کیا کہا۔“

آئی۔ اس وجہ سے اس کی حیرانگی اور بھی بڑھ گئی۔  
 ”نہ جانے کیا کہہ رہے ہو“ ایلی نے جمل سے کہا ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم پتی کر آئے ہو۔“

”لاحول ولا قوۃ جمل گویا دھنسا“ ہوش میں آگیا ”ایسا کام کبھی نہیں کیا میں نے“  
 ”لیکن“ وہ پھر بدست ہو گیا۔ ”سمجھ لو پی کر ہی آیا ہوں۔ شراب نہیں پی۔ لیکن سمجھ لو پی کر ہی آیا ہوں۔“ وہ چلایا ”سمجھ لو مکمل ہو گیا۔ آؤ میں تمہیں واقعہ سناؤں۔“ وہ ایلی کو کھینچنے لگا۔ ”یہاں نہیں یہاں بات کی تو ریاضت سن لے گا کہ کراؤ اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔“ وہ رک کر جسم کھانے لگا اور پھر بولا۔

”ویسے یوں بیٹھا رہتا ہے جیسے بھس بھرا ہو مجھے نہیں اچھا لگتا۔“  
 جمل اسے کھینچ کر نیچے سڑک پر لے گیا۔ ”وہ دیکھو۔ وہ“ اس نے اشارہ کر کے کہا ”مینجر ٹھل رہا ہے میں بھی سوچتا تھا کہ یہ کس قسم کا بزنس ہے کہ کوئی گاہک آتا نہیں دیر ہوٹل کھولے بیٹھا ہے۔ اب تو میرا دوست بن گیا ہے۔“ وہ رک گیا۔  
 ”سلام علیکم“ ہوٹل کے مینجر نے پاس سے گزرتے ہوئے کہا جمل نے ہنس کر اس کی طرف دیکھا۔

مینجر مسکرانے لگا ”سیر کر رہے ہیں آپ“ اس نے جمل سے کہا۔  
 ”ہاں ذرا یہاں تک جا رہے ہیں۔“ جمل نے جواب دیا۔  
 مینجر سے دور نکل کر جمل پھر ہنسنے لگا۔ ”اب تو مزے ہو گئے۔ اب زندگی سنے کی ہے۔“

”آخر کچھ پتہ بھی چلے۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”اب کیا ہو گیا ہے۔“  
 ”میں بھی روز سوچا کرتا تھا۔“ جمل نے کہا ”کہ جب موٹر سائیکل والا آتا ہے اور میں میں تو یہ ٹامی بھگتے کیوں ہیں۔“

”تو کیا پتہ چلا۔“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”موٹر سائیکل والا ڈنڈا گورا ہے۔“ جمل بولا۔  
 ”ڈنڈا گورا۔“ ایلی نے تعجب سے دہرایا۔  
 ”ہاں۔ ان ٹامیوں کا سار جنت ہے وہ“ اسے ڈنڈا گورا کہتے ہیں یہ سالے اس بار کا



”کیا؟“ ایلی کی آواز بیٹھ چکی تھی۔

کننے لگا ”نہیں جی رپورٹ نہ کرنا۔ جب جی چاہے آجایا کرو۔“ اس نے قہقہہ مارا۔  
اب ہم کو فری پاس مل گیا ہے۔ اور اس کے پاس ایک نہیں چھ ہیں۔ چھ۔“ اس نے قہقہہ مارا۔  
جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”اب مزا آئے گا۔ سمجھ لو زندگی بن گئی۔“

”اور اور — وہ لڑکی“ ایلی نے پوچھا۔

”کون لڑکی۔“

”جس کی تصویر تم نے مجھے دکھائی تھی۔“ ایلی نے کہا۔

”لڑکی۔“ جمال نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ ”ارے ایلی وہ لڑکی نہیں وہ تو میری بیوی ہے۔  
ارے اس کی کیا بات ہے۔ اس کا جواب نہیں۔ مگر یہ زردہ بھی خاصی ہے۔ بڑی اچھی ہے۔“  
پھر کھانے لگا۔ ”اگرچہ اس میں گڑ کی آمیزش ہے۔ لیکن ایلی اس میں کڑا کا ہے۔ یار کل ہم  
کب پڑے گی۔ دعا مانگو کل شام ابھی ہو جائے۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”اور دیکھو ایلی۔“ اس نے ہنسنے  
سے ایلی کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بھی لے چلوں گا کسی روز۔ ذرا اپنے پاؤں جمانوں پھر  
چلو گے نا۔“

”لا حول ولا قوۃ“ ایلی چلایا

”کیوں لا حول کی اس میں کیا بات ہے ارے کیا تم بھی ریاضت کی طرح مولوی ہو۔ انہما  
دکھنے میں تو نظر نہیں آتے۔ ارے بے وقوف کی تو زندگی ہے۔“

”نہ نہ“ ایلی بولا۔ ”میں نہیں جاؤں گا۔ تم جایا کرو۔“

”لیکن کیوں؟“ جمال نے پوچھا

”بس میرا جی نہیں چاہتا۔“

ویسے ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ زبردستی اسے لے جائے اس کرے میں بند کر دے اور وہ لال  
بی بی جس میں گڑ کی آمیزش تھی چاروں طرف سے زبردستی اسے گھیر لے حتیٰ کہ فراہ کی تمام  
رائیں بند ہو جائیں — لیکن دفعتاً اسے شہزاد کی بند بیشک کا خیال آ گیا — لال بابا  
قہقہہ مار کر ہنسی۔ بس بابو۔ بس۔ اس کی آواز میں ہلا کی تحقیر تھی۔

”نہیں نہیں“ ایلی چلا کر بولا۔ ”میں مجبور ہوں بالکل مجبور۔“

اگلے روز سارا دن جمال بے تلی سے شام کا انتظار کرتا رہا۔ پھر جب سورج غروب ہوا

لو میکلوڈ روڈ کی بتیاں روشن ہو گئیں تو جمال کھانا ہوا ایلی کے پاس آیا۔

”ایلی میں جا رہا ہوں۔ اگر کوئی گڑ ہو جائے تو خیال رکھنا۔“

اس کے بعد ان کا یہ معمول ہو گیا۔ سارا دن جمال بڑی بے تلی سے شام کا انتظار کرتا۔  
دن جوں دن دھلتا اس کے کھانے کی شدت بڑھتی جاتی اور پھر جب شام کا دھند لگا چھا جاتا اور

میکلوڈ روڈ پر بتیاں ٹٹٹٹٹ لگتیں تو جمال کپڑے بدل کر تیار ہو جاتا اور مسکراتا ہوا نیچے اتر  
جاتا اور ایلی چپکے سے اپنی چارپائی پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیتا اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ

دلت پور میں ہو۔ اور بالائی چارپائی اس کے قریب ہو۔ اور پھر لال کے ہاتھ جنبش میں آجاتے۔

ایک روز جمال خوشی خوشی ایلی کے پاس آیا۔ ”ایلی۔“ وہ چلانے لگا۔ ”ذرا باہر آؤ۔ تمہیں

کچھ بتاؤں۔ باہر برآمدے میں۔“ اس نے ایک ریشمی رومال جیب سے نکالا۔ ”یہ دیکھو۔“ وہ بولا  
”کتنا خوبصورت ہے، ہے نا۔ یہ اس نے دیا ہے۔“

”کس نے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”اسی نے جو زرد رنگ کی ہے جسے میں پہلے روز ملا تھا۔“ جمال بولا۔

”اچھا۔“

”آج جب میں باہر آنے لگا تو برآمدے میں اس نے مجھے پکڑ لیا۔ کننے لگی آپ تو ملتے ہی  
نہیں۔ اچھا میری نشانی تو لیتے جاؤ۔ کیا بتاؤں تمہیں اس کی آنکھوں میں کیا عالم تھا اس وقت جیسے  
بتیاں روشن ہوں۔ کبکنت نے ایسی محبت بھری نظر ڈالی کہ میری ہڈیاں چٹختنے لگیں میں بتاؤں  
تمہیں۔“ — جمال دفعتاً رک گیا۔

”بتاؤ نا“ ایلی نے کہا

”اسے مجھ سے عشق ہو گیا ہے۔“ جمال نے رومال لہراتے ہوئے کہا۔

”ان کو بھی عشق ہوتا ہے کیا۔“ ایلی نے حیرانی سے پوچھا۔

”تمہیں نہیں معلوم۔“ جمال قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”جب ان کو عشق ہوتا ہے تو مزہ آ جاتا  
ہے جس سے عشق ہو جائے۔ اپنا آپ بیچ کر اسے دے دیتی ہیں۔“

”کیا واقعی؟“ ایلی نے پوچھا۔

”تساری قسم“ جمال نے چھاتی نکال کر کہا ”ان کے عشق کی کیا بات ہے۔“

”اچھا۔“

”تم جاگ رہے ہو ایللی۔ مجھے بھی نیند نہیں آتی۔ کبخت کا خیال سونے نہیں دیتا۔ لیکن جنہیں کیا ہے جنہیں نیند کیوں نہیں آتی۔“  
 ”مجھے تو کچھ بھی نہیں“ ایللی جواب دیتا۔  
 ”کچھ بھی نہیں پھر بھی نیند نہیں آتی۔“ جمل ہنستا ”وہ دیکھو ریاضت یوں پڑا ہے جیسے کل کامرا ہوا ہو۔“

ہنگامہ

اسی طرح ان کی زندگی حسن منزل میں گزرتی رہی۔ لیکن ایک روز جب شام کے وقت ایللی برآمدے میں گھوم رہا تھا اور جمل بن سنور کر نیچے جا چکا تھا تو سڑک پر شور و غل ہوا۔ بہت سے سپاہیوں نے ہوٹل پر یورش کر دی۔ ایللی کو معلوم نہ تھا کہ آیا جمل ہوٹل میں ہے یا کہیں اور اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اگر وہ ہوٹل میں ہے تو کس طرح اسے باہر نکل لائے۔ اسے اس بات کے متعلق بھی علم نہ تھا کہ پولیس کے سپاہی وہاں کیوں کھڑے تھے۔ اور گورے بھاگ کر پارسی کی کوٹھی میں کیوں داخل ہو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا پھر جی کڑا کر کے نیچے اتر آیا کیونکہ بورڈنگ کے تمام طلباء برآمدے میں آکھڑے ہوئے تھے اور وہاں ایک بھیڑ لگ گئی تھی۔

سڑک پر پہنچ کر پہلے تو وہ سپاہیوں کی طرف دیکھتا رہا پھر ہمت کر کے آگے بڑھا لیکن ایک سپاہی نے اسے روک دیا۔ ”اونہوں آگے جانے کا حکم بند ہے۔“

وہ ڈر کر رک گیا دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ سپاہی مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ گھبرا گیا اور کوپر روڈ پر تکیے کی طرف چل پڑا ابھی وہ چار ایک قدم چلا تھا کہ تکیے کے قریب سے جمل نے سر نکالا۔

”ارے ایللی ارے ایللی۔“ وہ آہستہ سے چلایا ”تم ہو کیا۔“ وہ رک گیا۔  
 ”شکر ہے۔“ جمل بولا ”تم آگئے ہو۔ ارے یار میں تو پھنس گیا۔ اور اگر پولیس پکڑ لیتی تو میں غسل خانے میں تھا کہ وہ آگئے۔ میں نے جو شور سنا تو فوراً ہچھوڑا اے کے دروازے کی طرف سے نکل کر تکیے میں آگیا۔ وہ ادھر تو نہیں آرہے۔“  
 ”نہیں تو۔“ ایللی نے کہا۔ ”وہ تو ادھر کھڑے ہیں۔ آ جاؤ آ جاؤ۔“

”ہاں۔ یار کبھی تم بھی چلو تمہیں دکھاؤں۔ واقعی زروے کی پلیٹ ہے اتنی مٹاس ہے لہا رس ہے کہ حد ہو گئی یار“ وہ جوش میں کھجائے لگا۔ ”کسی روز جب میجر ادھر ادھر ہو جائے گا میں تمہیں لے چلوں گا۔“  
 ”نہیں نہیں“ ایللی چلایا۔

”ویسے نہیں۔“ جمل نے کہا۔ ”یونہی دکھانے کے لیے۔ بڑی پیاری باتیں کرتی ہے اور پھر میل نہ لین نہ دین۔ مجھ سے کیا لالچ کرتا ہے اس نے۔ میں تو فری پاس والا ہوں۔“ وہ ہنسنے لگا۔

جمل کی باتیں سن کر ایللی کو خیال آتا کہ کاش وہ بھی فری پاس والا ہوتا۔ اسے بھی کوئی شغل کے طور پر رومل دیتا۔ لیکن کس برتے پر۔ وہ سوچتا مجھ میں وہ جھپٹ بھی ہو۔ وہ مردانہ چہرہ وہ جوش جس کے بغیر عورت کسی کو پیار نہیں کر سکتی۔ پھر اسے شزاؤ کا خیال آ جاتا۔  
 نہ جانے شزاؤ کیا کہہ رہی ہو گی۔ نہ جانے شریف وہیں ہے یا جا چکا ہے۔ اگر شریف وہیں ہے تو وہ اسے لہانے میں مصروف ہو گی۔ آخر وہ اس کا خاوند ہے۔

”نہیں نہیں“ وہ گھبرا کر چلاتا ”شریف وہاں نہیں ہے۔ وہ تو کب کا جا چکا ہو گا اس کی چٹی عرصہ دراز سے ختم ہو چکی ہو گی آخر سرکار ان گنت چھٹیاں تو نہیں دیتی اپنے ملازمین کو کپے دے سکتی ہے۔ ورنہ کام کیسے چلے۔“ اس خیال پر اس کی تسکین سی ہو جاتی لیکن پھر اس کے تجھیل میں رضا سونٹا نکلتے ہوئے آکر چلاتا۔

”بچ۔۔۔ بچ۔“

پھر ارجمند کی آواز سنائی دیتی۔

”ارے اندھے یہ وہ دیوی ہے کہ جس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھ لے اس کا جی چاہتا ہے کہ سب کچھ تیاگ کر سادھو بن جائے۔ واہ واہ کیا جاوہ ہے۔“

پھر شزاؤ غفور کے ساتھ کوٹھے پر ٹہلنے لگتی۔ ”ہی ہی ہی ہی“ اس کے رتھیں تھپتھپ گونجن اور غفور کی بھدی آواز سنائی دیتی۔ اور پھر دفعتاً خاموشی چھا جاتی اور خاموشی معنی خیز بن جاتی۔ اور اس کا مفہوم ایللی کی آنکھوں کے سامنے کئی ایک منظر پیش کر دیتا۔ جنہیں دیکھ کر اس پر دی دیوانگی طاری ہو جاتی۔ وہ یوں کروٹیں بدلتا جیسے دار پر چڑھا ہوا ہو۔ اس وقت جمل آہستہ آہستہ آواز دیتا۔

”لیکن ذرا بیٹھے تو۔ صرف دیکھنے کے لیے ہے۔ میرے لیے اتنی تکلیف نہ کرو گے۔“  
مرف دیکھنے کے لئے اس کے بازو ایللی کے گرد حائل ہو جاتے اس کی آنکھوں میں وہ نگاہ چمکتی  
دی نگاہ جس کی وجہ سے وہ شہزاد کو بھول نہ سکتا تھا۔  
ہوٹل کے بند ہو جانے کے بعد جمال کی توجہ پھر اسی تصویر پر مرکوز ہو گئی جسے وہ ہوٹل میں  
بلنے سے پہلے دیکھ دیکھ کر وقت گزارا کرتا تھا۔

”آج کوئی خط نہیں آیا ایللی“ آج پھر کوئی خط نہیں آیا۔ اس طرح زندگی کیسے کٹے گی میں  
لے کہا میں دو روز کی رخصت لے کر گھر سے نہ ہو آؤں۔ یہاں اب میرا جی نہیں لگتا۔ اور وہ  
کہا کہ گی کہ گئے ہوئے اتنی دیر ہو چکی ابھی تک مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ کیا سمجھے گی۔ اسے کیا  
معلوم کہ یہاں اس کے بغیر وقت کاٹنا مشکل ہو رہا ہے۔ ”جمال شدت سے کھانا شروع کر دیتا۔  
”راصل ایللی مجھے اس سے بہت ہی محبت ہے۔ بے حد۔ اس کے بغیر چلنا دو بھر ہو جاتا ہے۔ کیا  
کرلوں۔“

بمردہ یکدم پیشترہ بدل کر کہتا۔ ”ایللی۔ وہ زردہ کیا کہے گی کہ مجھے بھی نہیں ملنے کی کوشش  
بھی نہیں کی۔“

”لیکن وہ تو چلی گئی ہے یہاں سے۔“ ایللی نے کہا  
”لیکن وہیں گئی ہے نابیرا منڈی میں۔ اسے ڈھونڈنا کیا مشکل ہے۔ یار مجھے اس کا شکریہ تو  
ادا کرنا چاہیے کم از کم۔“

”تو پھر“ ایللی نے پوچھا۔

”تم ہاں تو دونوں چل کر اسے ڈھونڈیں۔“

”لیکن ڈھونڈیں گے کیسے۔“ ایللی نے پوچھا۔

”گویہ بھی کیا مشکل ہے کیا اس کو بچے سے گزرتے جائیں گے اور دیکھتے جائیں گے اگر وہ  
ہوگا ہے تو کھڑکی یا دروازے میں بیٹھی ہوگی۔ چھپ کر تو نہیں بیٹھیں۔ ان کا تو کام ہی ایسا  
ہے۔“

ایللی کو ہینہ ملیا۔ ”یار“ وہ بولا ”مجھے تو نہ لے کر جاؤ اپنے ساتھ۔“

”لو اس میں کیا ہے۔“ جمال کہنے لگا۔ ”وہاں کوئی اپنا جان پہچان تو ہو گا نہیں پھر ڈر کیسا۔“

”یار حد ہو گئی پولیس نے ریڈ کر دی شکر ہے بچ گیا میں۔“

وہ دونوں باہر نکل کر ویران سڑک پر یوں ٹہلنے لگے جیسے اتفاقاً ”سیر کرتے کرتے لومر آئے  
ہوں۔“

اس ڈر کے مارے کہ کہیں پولیس بورڈنگ میں آکر تفتیش نہ شروع کر دے وہ دیر تک  
آوارہ گردی کرتے رہے۔ اور آخر تھک ہار کر اپنے کمرے میں جا پہنچے اور اپنی اپنی چارپائی پر  
کر لیٹ گئے۔

اگلے روز کالج جاتے ہوئے انہوں نے ہوٹل کی طرف دیکھا۔ وہاں تالہ پڑا ہوا تھا۔

”ارے“ جمال چلایا۔ ”یہ لوگ کہاں چلے گئے۔“

”جہاں سے آئے تھے وہیں چلے گئے بابو۔ اور کہاں جائیں گے۔“ گنڈیری والے نے کہا  
”کہاں“ جمال نے پوچھا۔

”وہیں ہیرا منڈی یا موتی بازار میں اور کہاں جائیں گے۔ کبھی دھند ابھی چھٹا ہے۔“ وہ بولا  
”اور یہ جگہ؟“ جمال نے پوچھا۔

”یہ جگہ“ گنڈیری والا ہنسا۔ ”یہ جگہ کسی تیل صابن والے نے لے لی ہے۔ دکان کھولے گا  
یہاں۔“

راتے میں جمال بار بار ایللی سے کہتا۔ ”اب کیا ہو گا ایللی اب ہم کیا کریں گے زردہ کی  
پلیٹ کیسے ملے گی۔ کیا خوب چیز تھی۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں اس کے گمن تو اب کھلنے لگے  
تھے مجھ پر اب کیا کروں ایللی۔“

وہ بار بار ایللی سے یوں پوچھ رہا تھا جیسے ان معاملات میں ایللی سے بڑھ کر کوئی اتھارٹی نہ ہو۔  
اور ایللی چپ چاپ اس کی باتیں سنے جا رہا تھا۔ درحقیقت اسے خود کھ محسوس ہو رہا تھا اگر وہ  
زردہ کو دیکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ پھر بھی امکان تو تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ کسی روز بچے  
سے نیچے اتر جائے اور پھر زردہ سے مل کر کہے ”نہیں نہیں میرا یہاں آنے سے کوئی مقصد نہیں  
میں تو صرف تمہیں دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔“

اس وقت ایک زرد رنگ کی نوجوان لڑکی اس کے رویرو آکھڑی ہوتی۔ وہ پٹی پٹی آنکھوں  
سے ایللی کی طرف دیکھتی جو صرف اسے دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ پھر اس کی حیرت بھری نگاہیں  
احساس تحسین سے چمکتیں اور ایللی دفعتاً ”ہیرو بن جاتا اور وہ زرد رو لڑکی اس کی منتیں کر لے“

دلے ہوٹل میں چائے پینے کے بہانے بیٹھ گئے لیکن چائے کا پیالہ لے کر وہاں دیر تک بیٹھنا  
تہا نہ تھا۔

”وہاں بھی لوگ بلا تکلف باتوں کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔  
”اس منہی پانی کے متعلق سنا تھا تم نے استاد۔ کہتے ہیں سیٹھ جمناداس سے مینڈی کھلوانے  
کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔“

”اور بھی اس نے تو بیس ہزار دیا ہے بڑی پانی کو مینڈی کھلوانے کے لیے۔“

”کیوں نہ لے میں ہزار چنچ بھی تو غضب کی ہے۔“

”پر گاڈا انہیں آوے ہے لڑخی کو۔“

”اپنی قدرت بھی حساب سے دیتی ہے۔ کسی کو گلا دیوے ہے تو کسی کو جوبن کیوں پاوے۔“  
اس نے جمل کو کہنی مار کر پوچھا۔

ایلی اور جمل نے دانت نکالے ”ٹھیک ہے میر صاحب۔“

”بس کمالے دو ایک سال پھر وہاں گلی میں جا کر بیٹھ جائے گی۔“ استاد ہنسنے لگا۔ ”بازار میں تو  
اسی کا ٹھکانہ رہ سکتا ہے جس کا گلا اچھا ہو۔ کیوں فٹلے۔“

فٹلے ہنسنے لگا ”ٹھیک ہے استاد۔ گلی میں ہی بیٹھنے کی اور کیا۔“

”کوئی گلی میں۔“ ایلی نے فٹلے کے قریب ہو کر پوچھا۔

”ایلی اسی میں۔“ پھر اس نے غور سے ایلی اور جمل کی طرف دیکھا۔ ”تم پردیسی ہو پاوے۔“

”ہاں ہاں۔“ جمل بولا۔ ”میرا ترسے آئے ہیں۔“

”ہی ہی ہی ہی“ فٹلے ہنسنے لگا جیسی گلی کا پتہ نہیں۔“

”بھڑکی کمال ہے وہ“ جمل نے دوبارہ پوچھا۔

”یہ تھانے کے سامنے جو ہے۔ پر پاوے میں کمال اچھا نہیں۔ بس دو تین ہی کام کی ہیں باقی  
سب بھرتی کمال ہے۔“

چائے ختم کر کے وہ پھر اسی چکر میں مصروف ہو گئے۔ لیکن اب مشکل حل ہو چکی تھی۔

”لبہ کی راہ گیر سے پوچھ سکتے تھے کیوں میاں تھانہ کدھر ہے اس علاقے کا۔“

دفتر ”ایلی خوشی سے چلایا۔“ تھانے کا بورڈ تو میں نے پڑھا تھا۔ کسی چوک کے قریب تھا۔  
پرنسپل رہا کس چوک کے قریب تھا۔“

”مجھے تو ڈر آتا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”تو پگڑی باندھ لینا تاکہ کوئی پچانے نہیں۔“

اس روز وہ دونوں راستے میں اسی بحث میں الجھے رہے۔ ایلی کو اس کے کپے میں ہلنے  
سے ڈر لگتا تھا لیکن ساتھ ہی وہ چاہتا تھا کہ کسی طریقے سے جمل اسے زبردستی لے جائے اور  
جا کر دیکھے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ وہ کس طرح بیٹھتی ہیں۔ کس طرح اپنی نمائش کرتی ہیں اور  
اگر زردہ مل جائے تو وہ اس سے کہے گا۔ میں تو صرف تمہیں دیکھنے کے لیے آیا ہوں لیکن مل  
کو نہ بتاتا۔ میں اب چلتا ہوں صرف دیکھنے کے لئے۔ زردہ کی نگاہوں میں خمیں جھکنے لگی۔ اور  
وہ بیٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لے گی اور کہے گی۔ نہیں میں جمل کو کیوں ہٹانے لگی۔

## اس کوچے میں

ہفتے کو شام ہی سے جمل نے تیاریاں شروع کر دیں تھیں۔ پہلے اس نے ایک طویل حل  
کیا پھر ٹنک کے پاس بیٹھ کر دیر تک ہنسنے کے لیے کپڑوں کا انتخاب کرتا رہا۔ بلاخر کپڑے پہن کر  
خوشبو لگائی۔ سرے بالوں کو بڑے اہتمام سے بتایا۔ منہ پر کریم کی مالش کی بوٹ چکایا اور ہلرا  
تیار ہو بیٹھا جیسے عید کی نماز پڑھنے جا رہا ہو۔

شام کے قریب وہ دونوں چل پڑے تھے۔ بھائی دروازے پر وہ تانکے سے اتر گئے اور  
تانکے والے سے یہ نہ کہنا پڑے کہ انہیں کہاں جانا ہے۔

اس علاقے میں گھومتے گھومتے انہیں کافی دیر ہو گئی۔ کیونکہ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ  
کوچہ کہاں واقع ہے۔ جمل چوباروں میں راگ رنگہ کی محفلیں ہو رہی تھیں۔ ساز پرکے ہا  
رہے تھے۔ بانیاں تائیں اڑا رہی تھیں لوگ یوں گھوم پھر رہے تھے جیسے میلے پر آئے ہوں  
ہوں۔ کسی سے پوچھے بغیر اس بازار میں پہنچنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن اس کوچے میں پہنچنا بہ  
مشکل تھا۔

دیر تک وہ چکر لگاتے رہے اور اس امر پر بحث کرتے رہے کہ آخر وہ کیسے وہاں پہنچیں  
ہیں۔

اس کوچے کے متعلق کسی سے دریافت کرنے کی ان دونوں میں ہمت نہ تھی۔ اور وہ  
کیسے بغیر وہاں پہنچنا ناممکن معلوم ہو رہا تھا۔ آخر تھک کر وہ ایک بائی کے حمارے کے ملنے

دراصل وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ اور نگاہوں میں گھبراہٹ

نہی۔ ایک تو ایلی نے آنکھیں اٹھا کر ان بیٹھی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ  
کی۔ مجرب اس نے محسوس کیا کہ کوئی بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تو اس نے ایک سرسری  
تقریر پڑھ کر ریشیوں پر ڈالی۔ انہیں دیکھ کر اس کا جی متلانے لگا۔ لاجول دلاقوہ اس نے زیر  
بکہ

اس جگہ تاریک بل کھاتی ہوئی گلی میں وہ لائینز کی بیٹوں کے نیچے بن سنور کر بیٹھی  
ہوئی تھیں۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے مویشیوں کی سیلے میں بھینس دیکھ رہا ہو۔ ان کی جوانیاں لٹی  
ہوئی تھیں۔ آنکھیں سوچ رہی تھیں۔ ہونٹ یوں لٹکے ہوئے تھے جیسے جوئیں ہوں۔ چروں پر  
نہا ہوا پاؤں اور سرخی انہیں اور بھی بھیاک بنا رہا تھا۔ ایلی نے جھرجھری لی۔ وہ بازار حسن نہیں  
فابکے سڑے ہوئے بدبودار گوشت کی منڈی تھی۔

ریشیوں کے چروں پر ترو تازگی اور معصومیت نہ تھی۔ بلکہ حزن و ملال اور اداسی چھائی  
نہی تھی۔ ان کی حرکت بھونڈی تھیں۔ آوازیں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے پھٹے ہوئے  
لٹائی رہے ہوں اور وہ اعلانیہ لوگوں کو بلا رہی تھیں۔ یا یوں بازو اٹھاتیں جیسے کسی کو گلے لگنے  
کی خواہش میں بے قرار ہو رہی ہوں۔ ایک انگڑائیاں لیے جا رہی تھی۔ لیکن اس کی انگڑائیوں  
میں اکہٹ اور حسرت تھی۔ دوسری روٹی لے میں کچھ گنگنا رہی تھی۔ اس کا گیت دکھ بھرا تھا۔  
نواہ ترو تازگی چپ چاپ بیٹھی انتظار کر رہی تھیں کہ کب کوئی آکر ان سے سودا کرے۔

مردوں کے گرد ان کے سامنے کھڑے انہیں گھور رہے تھے۔ ان کے جسموں کو ٹٹل رہے  
تھے ان کے ناک نقشے پر پھبتیلیں اڑا رہے تھے۔ ان کی عمروں کے متعلق اندازے لگا رہے تھے  
اور ان سے قش مذاق کر رہے تھے۔ وہ ان کی باتیں سنتی تھیں لیکن انہیں ان سنی کر دینے پر  
مجبور تھیں۔ وہ ان کی منگھلہ خیر نگاہوں کو برداشت کرنے پر مجبور تھیں۔ ان کی نکتہ چینی کے  
غلب میں سکرانے پر مجبور تھیں۔

دفعہ ایلی نے محسوس کیا کہ عورت کے لیے اس سے بڑی بے عزتی کوئی نہیں ہو سکتی کہ  
وہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے کولوں، چھاتیوں اور جسم کے نکالیں گتیں یا اس کے  
مکھڑیل یا عمر کے متعلق پھبتیلیں اڑائیں۔

تھانہ تلاش کرنے میں انہیں چنداں وقت نہ ہوئی۔ تھانے پہنچ کر اس گلی کو نہ دیکھا  
ناممکن تھا کیونکہ بہت سے لوگ ادھر سے آرہے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک لاکھ  
کنیاں مار رہے تھے آنکھیں چکا رہے تھے۔ کئی ایک تو با آواز بلند گارہے تھے۔  
وہاں پہنچ کر ایلی کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کی ہمت نہ پڑ رہی تھی کہ گلی میں داخل ہو جائے  
بات اور تھی۔ وہ تو دوسرے بازاروں کی طرح ایک عام گزر گاہ تھی۔ وہاں چلے ہوئے لوگ  
متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ ریشیوں کو دیکھنے کے لیے آئے ہیں یا انہوں نے چھپا رہے  
جانا ہے۔

لیکن اس گلی میں جانا تو اعلانیہ اس بات کا اظہار تھا کہ وہ ان عورتوں کے لیے آئے ہیں۔  
اور پھر گلے والیوں کو دیکھنا یا ان کا گانا سننا برانہ تھا۔ گلی کی ریشیوں کو دیکھنا ایلی کی ناگہی لانے  
لگتیں۔ لیکن اتنی دور آنے کے بعد اب گلی میں جانے سے انکار کرنا بھی تو ٹھیک نہ تھا۔  
”میں کہتا ہوں۔“ اس نے جمل سے کہا۔ ”میں اندر جا کر کیا کروں گا۔ تم جا کر اے ل  
لو۔ میں تمہارا یہاں انتظار کروں گا۔ اسی جگہ۔“

”نہیں یار۔“ جمل نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا ”اکٹھے چلے ہیں۔“  
”لیکن“ ایلی نے کہا۔ ”اگر وہ مل گئی تو میں وہاں کیسے انتظار کروں گا۔“  
”ہاں۔“ جمل سوچ میں پڑ گیا۔ ”مل گئی۔“ اس نے کہا ”تم پھر تم یہاں آکر انتظار کرو۔  
چلو۔“ وہ اسے کھیٹ کر لے چلا

گلی میں بے حد ہجوم تھا لوگ قہقہے لگا رہے تھے۔ بھونڈے مذاق کر رہے تھے۔ ریشیوں  
سے بحث کر رہے تھے۔ انہیں چھیڑ رہے تھے۔ یوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے جیسے  
ریشیاں ہی نہ ہوں۔ ایلی یوں جمل کے ساتھ چل رہا تھا جیسے اسے گلی سے قطعی طور پر کٹا  
دلچسپی نہ ہو۔ جیسے وہ وہاں زبردستی لایا گیا ہو۔ ہر راہ گیر کی طرف وہ کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے  
اسے ذہن نشین کر رہا ہو کہ میں تو ویسے ہی آیا ہوں ان کے ساتھ دلچسپی تو صرف انہیں ہے  
نہیں۔

خود جمل وہاں پہنچ کر بھول چکا تھا کہ وہ دو گھنٹے کی تیاری کے بعد آیا ہے۔ وہ یہ بھول چکا تھا  
کہ اس نے نئے کپڑے زیب تن کیے ہوئے ہیں اور ان پر خوشبو لگا رکھی ہے اسے وہ  
ریشیوں کے سامنے بھی یاد نہ رہے تھے جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

پھر وہ وہاں کیوں بیٹھی تھیں۔

اس کا خیال تھا کہ جسمانی ہوس پوری کرنے کے لئے عورتیں اس کے لومیں جا پہنچیں۔ جسمانی لذت ”یہ بیچاریاں“ وہ سوچنے لگا ”ان کے چہرے تو دکھ بھرے ہیں۔ ان کے اندر صرف آہیں بھرنے کے لیے بنے ہیں۔ اور ان کے لئے ہوئے لپاچ جسم، جسمانی لذت کی ہی پیدا نہیں ہوتی۔“

ایک ضعیف عورت کو وہاں بیٹھے دیکھ کر وہ حیران ہوا ”یا اللہ یہ اس عمر میں ایسا ہے۔“ وہ رک گیا۔ بڑھیا کے سامنے دو جوان مزدور کھڑے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ایک مزدور بڑھیا کے قریب تر ہو گیا اور اسے چھیڑنے لگا ”اے تو یہیل کی امیر ہے۔“

بڑھیا نے کچھ جواب نہ دیا اور ویسے ہی بیٹھی حقہ چتی رہی۔

مزدور کے ساتھی نے تقہہ لگایا۔ ”مائی تیرے پاس کوئی آتا بھی ہے کیا۔“

”تو ہی آجا بیٹا جو تجھے اتار دے میرا۔“ بڑھیا نے نفرت سے کہا۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے کسی نے اسے گندگی میں دھکا دے کر گرا دیا ہو۔ اس کا دل ہل رہا تھا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور سارے جسم میں جھن جھن سی ہوا رہی تھی۔ جیسے ایسا جسم کا بند بند کراہ رہا ہو۔ اس کے لیے اس کو بچے میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ نکل۔ کہہ دے میں جا رہا ہوں۔ میں اب یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔

”ایلی ایلی“ کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر کہا ”ایلی وہ مل گئی۔“

ایلی نے مڑ کر دیکھا۔ جمال کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ”وہ مل گئی ایلی! نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اور رومال سے اشارہ کر کے مجھے بلارہی ہے۔ وہ دیکھو۔“ جمال نے لگا کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ دیکھو جو سرخ قیض پٹنے ہوئے ہے۔ جس کے ہاتھ رومال ہے۔ وہ دیکھا وہ مسکرا رہی ہے۔ ارے“ وہ چلایا ”وہ مجھے بوسے پھینک رہی ہے۔“ ایلی نے اس طرف دیکھا ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی کے دروازے میں سرخ قیض ایک دہلی پتلی عورت بیٹھی تھی۔ اس کے کلوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ہاتھوں میں بڑی بڑی تھیں۔ اور آنکھیں یوں کھینچی ہوئی تھیں جیسے ان میں بند ہونے کی صلاحیت ہی نہ رہی۔ ”اچھا تو میں چلتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”گلی کے باہر تمہارا انتظار کروں گا۔“

گلی کے باہر انتظار کرتے ہوئے وہ سوچتا رہا لیکن اس میں سوچنے کی صلاحیت نہ رہی تھی۔ شہ نفرت کی وجہ سے اس کے جسم کا بند بند کانپ رہا تھا۔ گلی کے بد صورت چہرے اس کے سامنے تھے۔ ان کے سوچے ہوئے منہ۔ پھٹی پھٹی آنکھیں اور مجروح جسم ایلی کے دل میں نفرت کی بجلی بج رہی تھی۔ اور یہ نفرت اس حد تک شدت اختیار کر چکی تھی کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ ہمارا کر دیوانہ وار گلی میں جا داخل ہو۔ اور کسی بد صورت ڈائن کی کوٹھڑی میں داخل ہو کر کے میں آگیا ہوں میں آگیا ہوں مجھے اپنی غلاطت سے بھر دے۔ مجھے اس گندگی سے شرابور کر دے۔ میری ہڈیاں توڑ دے، مجھے فنا کر دے۔ اور پھر اس کے غلیظ جسم پر ڈھیر ہو جائے۔

ایلی کے دل میں عجیب متضاد خواہشات پیدا ہوتی تھیں۔ کسی وقت اس تضاد کو محسوس کر کے گہرا جاتا اور اسے خیال آتا کہ اس کی سرشت میں نہ جانے کیا خاں ہے کہ اس کے دل میں ایک وقت ایسی متضاد خواہشات پیدا ہوتی تھیں۔ بسا اوقات اسے شک پڑتا کہ وہ دیوانگی کا شکار ہے۔

ان خیالات سے بچنے کے لیے دیر تک وہ تھانے کی عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ بازار کو غور سے دیکھتا رہا۔ راہ گروں کو جانچنے کی کوشش میں شدت سے مصروف رہا۔ لیکن جب وہ ذرا بے خبر ہوتا تو اس کی نگاہ کے تلے اسی گلی کے چہرے نمودار ہو جاتے ان کی کمرہ مسکراہٹیں اسے ہلاں طرف سے گھیر لیتیں۔ ان کے تباہ شدہ لٹے ہوئے جسم اس کی طرف بڑھتے دل میں نفرت کی دھمکی بچا شروع ہو جاتی۔ اور پھر وہی دیوانہ پن اس پر مسلط و محیط ہو جاتا۔

”کس خیال میں پڑے ہو“ جمال نے اس کے قریب آ کر اسے جھنجھوڑا۔ ”سننے ہی نہیں“

”وہ تم آگئے“ وہ چونکا۔ ”مل آئے زورہ سے“ اس نے پوچھا۔

”ارے نہیں وہ تو کوئی اور ہی نکلی لیکن اچھی تھی بیچاری۔ اتنی اچھی تھی کہ میں تمہیں کیا بتاؤں کتنی تھی مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے۔ ایمان سے یہی کہتی تھی دیکھتے ہی پیار ہو گیا اور اس قدر شوق محسوس کیا میں نے کہ اگر تم اشارے سے نہ آتے تو خود آکر تمہارا ہاتھ پکڑ لیتی۔“

ایلی نے حیرانی سے جمال کی طرف دیکھا۔ خوش قسمت تھا وہ جو بھی اسے دیکھتی تھی اسے ہمارا کرتے لگتی تھی۔ کاش ایلی نے آہ بھری۔

راستے میں جمال اسے اپنے اس نئے عشق کے قصے سنا رہا تھا۔ تفصیلات بتا رہا تھا لیکن ایلی اپنے ہی خیالات میں گمن چلا جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جمال میں کون سی بات ہے جس کی وجہ

انہیں ڈرامہ پڑھانے والے پروفیسر کی مونچھوں سے اسے ڈر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ  
موس کیا کرتا تھا کہ کسی سکول کے ماسٹر نے پروفیسر کا چٹا پن رکھا ہو۔ اس لیے ڈرامے کے  
ویڈیو میں ایلی بیٹھے کے لیے خاص طور پر ایسے مقامات تلاش کرتا تھا جہاں پروفیسر کی نگاہ نہ  
پڑے۔ ڈرامہ کے پروفیسر کے پڑھانے کا انداز بھی تو عجیب تھا۔ سبق کی ابتدا میں تو پروفیسر کی  
طرح بات شروع کرتا۔ پھر بتدریج جوں جوں وقت گزرتا پڑھانے کے بجائے پلیٹ فارم پر ڈرامہ  
کھیلنا شروع کر دیتا۔

وہ ایکٹروں کی طرح ہاتھ چلاتا۔ منہ بناتا۔ پروفیسر کو ایکٹنگ کرتے دیکھ کر اسے علی پور کا وہ  
زن من یاد آ جاتا جہاں انہوں نے ڈرامہ کھیلا تھا اور پھر سانوری اس کے سامنے آ جیتی اور  
ڈیک اسے دیکھ کر جوش میں آ جاتا اور اپنا ڈنڈا بے پردائی سے گھماتا اور سٹیج پر کھڑے دیگر  
ایکٹرز پر چلاتے۔ ”اے خیال سے بے کسین زخمی نہ کر دیتا کسی کو۔“ اور ناظرین ڈیک کی  
بومزدی حرکات کو دیکھ کر تالیاں پیٹتے اور واہ واہ کا شور مچ جاتا۔

ایلی کو امرتسر کی آم والی کوٹھی یاد آ جاتی اور نور اپنی تمام تر رعنائی سے ٹپٹتے ہوئے گانے  
گاتا پھر شہر گلوں سے ہمار آ جاتی۔ ندی کا پانی رک جاتا اور ندی ایک وسیع نیلی جھیل میں تبدیل  
ہو جاتی اور درختوں پر کوئل کوکتی۔ کھیتوں میں سروسوں لہلہاتی اور آصف مسکرا کر اس کی طرف  
دیکھتا اور آہ بھر کر کتا آ جاؤں ایلی یہاں شہر گلوں ہے۔

گلی بار ایسا بھی ہوا تھا کہ جب وہ جماعت میں اپنے تخیل میں کھویا ہوتا تھا تو اس کے ساتھی  
نے اسے جھجھوڑ کر جگایا تھا اور اس نے دیکھا تھا کہ جماعت کے تمام لڑکوں کی نگاہیں اس پر مرکوز  
تھیں اور مونچھوں والا ایکٹر پروفیسر اس پر پھبتیاں کس رہا تھا۔

آئناکس کے پیریڈ میں ایسا حادثہ ہر لمحہ ہوا تھا۔ اسی لیے آئناکس کے پیریڈ میں کبھی کسی کا  
اور عموں نہ ہوا تھا۔ آئناکس کے پروفیسر ہر لحاظ سے انگلینڈ ریٹرنڈ قسم کی طبیعت کے مالک تھے۔  
اگرچہ وہ انگلستان سے ڈگری لے کر واپس آ چکے تھے۔ مگر ذہنی طور پر وہ ہمیشہ کے لیے انگلستان  
میں مقیم ہو چکے تھے۔ وہ خوبصورت لباس پہن کر جماعت میں داخل ہوتے تھے اور آتے ہی  
ڈانسر کھول کر حاضری لگانے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ حاضری لگاتے وقت انہوں نے کبھی سر  
ٹھاکر لڑکوں کی طرف نہ دیکھا تھا۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ لڑکے یس سرکنے کے  
بوجھت سے باہر نکلتے جا رہے ہیں۔ انہیں اس بات کی قطعاً پرواہ نہ تھی کہ آیا لڑکے ان کے

سے وہ اس سے عشق کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس  
مردانہ جھپٹ ہوتی۔ کاش۔

چار ایک روز کے بعد جمل بھاگا بھاگا ایلی کے پاس آیا۔ ”ایلی!“ اس نے شکر  
”کنا“ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟“ مجھے کچھ ہو گیا ہے۔“

”کیا ہو گیا ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔  
”کچھ پتہ نہیں چلتا۔ مجھے نہیں پڑتی ہے اور میں نے ڈاکٹر کو دکھایا تو وہ کہتا ہے  
”بیاری ہو گئی ہے۔“

”بیاری کوئی بیاری“ ایلی نے پوچھا۔  
”وہ بیاری“ جمل بولا۔ اس کے چہرے پر تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”اگر میں  
تمام لڑکوں کو معلوم ہو جائے گا۔ مجھ سے چلا جو نہیں جاتا۔ اس لیے میں گاؤں جا رہا ہوں“  
”گاؤں جا رہے ہو۔“

”ہاں ہاں“ وہ بولا۔ ”اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں مجھے جانا ہی ہو گا“ یہ کہہ کر  
ایلی کے ہاتھ میں جھٹی کی عرضی تھادی۔ اور بات کی وضاحت، کیے بغیر اپنے ڈیک پر  
قرینے سے رکھے لگا۔

”لیکن“ ایلی نے کہا ”آخر بات کیا ہے۔ کچھ بتاؤ گے بھی یار۔“  
”ابھی اس نے جملہ مکمل نہ کیا تھا کہ ریاضت داخل ہوا اور جمل نے اشارہ کرنا  
خاموش کر دیا۔

## اوٹ میں شانتی

جمل کے جانے کے بعد ایلی بالکل ہی تنہا رہ گیا۔ دوپہر تک وہ کالج میں وقت گزار  
جماعت میں چلا جاتا تھا لیکن ابھی تک اس نے ہم جماعتوں سے کوئی رسم و راہ پیدا نہ کی  
اکیلا برآمدوں میں گھومتا رہتا خالی پیریڈ میں یا تو باہر لان میں ٹھہرتا اور یا بازار کی طرف نکلتا۔  
ان مقامات پر جانے سے احتراز کرتا جمل کالج کے لڑکے جمع ہوتے۔

جماعت میں وہ آخری بچوں میں بیٹھ جاتا اور جب پروفیسر لیکچر شروع کر دیتا تو وہ کھانا  
لڑکے کے پیچھے ہو کر تخیلات کی دنیا میں کھو جاتا۔



پیرٹ میں حاضر رہنا چاہتے ہیں یا بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ انا وہ بھاگنے والوں کے لیے نہیں کرتے کے قائل تھے۔ انہیں اس کی بھی فکر نہ تھی کہ آیا لڑکے ان کے لپچر کو سمجھ سکتے ہیں؟ نہیں۔ آیا وہ اسے سمجھتا بھی چاہتے ہیں یا نہیں۔ ان کا انداز بالکل پروفیسرنا تھا بلکہ پروفیسر کی بات پر کلن کھڑے کرنے کے عادی تھے جیسے سکول ماسٹر ہوں۔

بہر حال اہلی جماعت میں ضرور بیٹھتا تھا۔ وہ حاضری لگوا کر بھاگتا نہیں تھا۔ اس لیے اسے تعلیم سے دلچسپی تھی یا لپچر سننے کی خواہش تھی بلکہ صرف اس لیے کہ جماعت کے ایسی جگہ نہ تھی جہاں وہ بیٹھ سکتا ہو۔ جہاں اسے کالج کے لڑکوں سے پناہ مل سکتی ہو۔ کوئی اس کے لیے بہترین پناہ گاہ تھی۔ جہاں وہ اپنے تخیل سے کھیل سکتا تھا۔

کالج میں وہ ایک گنہگار تھا۔ حتیٰ کہ جماعت کے پروفیسر اور لڑکے اس سے واقف نہ تھے اگر تھے بھی تو سرسری طور پر جب وہ اہلی کی طرف دیکھتے۔ تو ان کی نگاہ میں حقیر بھری ہوتی محسوس کر کے اہلی کو ایک جھٹکا سا لگتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ اس جگہ سے بھاگ جائے۔ ان خبر بھری کریدتی ہوئی نگاہوں سے دور بھاگ جائے اور پھر جھم سے شتراداس کے روہو آکر ملے اور اپنی دونوں ہاتھیں اٹھاتی اور وہ اس کی آغوش میں گر جاتا۔

ان دنوں حسن منزل کے قریب کالج والے ایک نیا بورڈنگ تعمیر کر رہے تھے جس میں صرف کیوبیکل بنے ہوئے تھے۔ یہ خبر عام تھی کہ حسن منزل کو خالی کر دیا جائے گا۔ اور حسن منزل کے لڑکوں کو ریوازا یا نئے بورڈنگ میں جگہ دی جائے گی۔ جو کالج کی عمارت کے ساتھ ہی تھے۔ یہ خبر اہلی کے لیے بڑی پریشان کن تھی کیونکہ اہلی کو حسن منزل کی تہائی اور خانوٹی کا حد پسند تھی۔ وہ ریوازا ہوٹل میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ جہاں لڑکے بے حد ہنگامہ پسند تھے۔

اہلی کی خواہش تھی کہ اسے ایک کمرہ مل جائے جہاں وہ تہائی میں اطمینان سے رہ سکے۔ الگ کمرہ ملنا آسان نہ تھا۔ نئے ہوٹل کے کیوبیکل خصوصی طور پر سیکنڈ اور فورٹھ ایئر کے لڑکوں کے لیے بنائے گئے تھے اہلی تو تھرڈ ایئر میں تھا اس کے لیے کیوبیکل حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ پھر یوسف اعظم سے جو کالج کے نئے پرنسپل بن کر آئے تھے اور جنہوں نے آتے ہی ان کی وجہ سے کالج میں اپنی دھماک بٹھادی تھی۔

ایک روز جب اہلی اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اس کی اس عجیب و غریب بیماری کے متعلق رہا تھا جو ابھی تک ٹھیک نہ ہوئی تھی۔ اور جس کی وجہ سے اس نے مزید ایک ہفتے کی چھٹی

ریاضت مسکرا کر کہنے لگا ”میرے ابا ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے پرنسپل کو لکھا ہے۔ اس لیے اصل بات یہ ہے۔“ وہ گھبرا کر بولا ”اگر میں شور و شغب میں رہوں تو مجھے قبض کا عارضہ ہو جاتا ہے۔“

اہلی نے حیرانی سے ریاضت کی بات سنی۔ شور و شغب سے قبض؟ یہ بات اس کے لیے نئی تھی۔ سارا دن وہ سوچتا رہا کہ وہ بھی ایسا ہی کوئی بہانہ تراش لے تو شاید اسے بھی نئے ہوٹل میں جگہ مل جائے اور وہ ریوازا ہوٹل میں جانے سے بچ جائے۔

### واٹ ناسن

دو روز کی مسلسل سوچ بچار کے بعد اس نے ایک عرضی لکھی جس میں درج تھا کہ میں ذہنی انتشار کا مریض ہوں اور شور و شغب میں تعلیم کی طرف توجہ دینے سے معذور ہوں۔ لہذا اسے رات کو مجھے ایک کیوبیکل میں رہنے کی اجازت دی جائے۔

عرضی ہاتھ میں پکڑے وہ دیر تک پرنسپل کے چپڑاسی کے ساتھ دفتر کے باہر بیٹھا رہا۔ پھر پرنسپل نے اسے بلایا۔ اندر داخل ہو کر اس نے مودبانہ سلام کیا اور عرضی پرنسپل کے سامنے رکھ دی۔

”دل دل“ عرضی پڑھ کر پرنسپل غصے میں بولا۔ ”تم نیو راسس کا مریض ہے؟“

”جی ہاں جی ہاں۔“ اہلی نے نیو راسس کا مطلب سمجھ بغیر سر ہلایا۔

”دل دل“ پرنسپل بولا۔ ”تو تمہیں کالج میں کس نے داخل کیا۔ نیو راسس کے مریض کا کالج میں کیا کام۔“

”جی جی۔“ اہلی گھبرا گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا جواب دے۔

”تم تمہیں کالج میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ جب تک تم فنسنس کا سارٹیفکیٹ نہیں لے کر۔“ سمجھا۔

”جی جی۔“ ایلی کی گھنگھی بندھی ہوئی تھی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ پرنسپل نے گھورا۔

”جی جی۔ ایلی۔ ایلی جی ہاں ایلی۔“

”ایلی۔“ پرنسپل نے حیرانی سے دہرایا ”یہ کیا نام ہے۔“

”جی نام تو ایلاس ہے ایلاس ویسے ایلی ایلی کہتے ہیں۔“

اس پر پرنسپل نہ جانے کیوں ہنسنے لگا۔ ”تم کالج میں پڑھتا ہے۔ اس کالج میں۔“ اس وقت چھت کے گارڈز پر بیٹھے ہوئے کبوتر نے بیٹ کی جو پرنسپل کے سر پر گری۔ ”ہے۔“ وہ چلانے لگا۔ ”واٹ بن سینس۔ اے چوکیدار۔ چوکیدار۔“ اس نے بھائی شروع کر دی۔ اور پھر غصے میں کمرے میں ٹپٹپٹنے لگا۔

ایلی ڈر کر دیوار سے لگ گیا۔ چوکیدار بھاگا بھاگا اندر داخل ہوا۔ ”حضور حضور۔“

کہاں تھا تم۔ کہاں تھا۔ وائس پرنسپل کو بلاؤ۔ وائس پرنسپل کو فوراً۔“

چوکیدار باہر بھاگا پرنسپل دیوانہ وار کمرے میں گھوم رہا تھا۔ کبھی وہ چھت کی طرف دیکھتا اپنے سر پر ہاتھ پھیرتا وہ مسلسل چلائے جا رہا تھا۔ ”واٹ بن سینس دس از آفس آرا۔ ہول دس از نو خانقاہ۔“ وہ کبوتر کو دیکھ کر کہتا۔

موٹھوں والا پروفیسر گھبراہٹ میں داخل ہوا۔

”اے وائس پرنسپل۔ واٹ از دس۔ یہ کالج ہے یا خانقاہ ہے۔“

”خانقاہ۔“ وائس پرنسپل نے تعجب سے دہرایا۔

”دل دل دو بچن دیکھو۔ وہ چھت پر وہ۔“ اس نے اشارہ کیا۔ ”سی وٹ اٹ از روم۔“

”ابھی ابھی۔ دس از پرنسپل روم نان سس اس نے چوکیدار اور وائس پرنسپل کو چاہا

کے کما چوکیدار باہر سے ایک لمبا بانس لے کر آیا اور وائس پرنسپل اور چوکیدار کبوتر کو کالنے مصروف ہو گئے۔

دفترا پرنسپل کی نظر ایلی پر پڑی۔ ”دل تم یہاں کیوں ہے۔“

”جی وہ عرضی۔“ ایلی نے کہا۔

”عرضی۔ کیسی عرضی۔“ وہ عرضی کی طرف لپکا۔

”آپ نے کہا تھا۔ آپ نے یعنی۔“ ایلی گھبراہٹ میں بولا۔

”دل دل چھٹی ہانتا ہے۔“

”جی جی یعنی میرا مطلب ہے۔“ ایلی کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔

پرنسپل نے جب سے پن نکالا اور عرضی پر کچھ لکھ کر ایلی کے ہاتھ میں عرضی تھادی۔ رن بے رن اوے وہ ایلی اور کبوتر سے مخاطب ہو کر چلانے لگا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر ایلی نے عرضی میز پر پھینک دی۔ اور خود چارپائی پر پڑ گیا نہ جانے اب کیا ہو گا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کہیں وہ کالج سے نہ نکال دیں۔ اسے پرنسپل نے کہہ جو دیا تھا کہ جس کالج میں کس نے داخل کیا تھا۔ لیکن میں یہ عرضی پھاڑ دوں گا مجھے کیا پڑی ہے کہ کسی کو دکھاؤں یہ عرضی۔

وہ سوچنے لگا کیا کالج کے پرنسپل ایسے ہوتے ہیں اور پھر یوسف اعظم کتنا مشہور آدمی تھا وہ ماری دنیا میں اس کے علم کا چرچا تھا۔ انگریزی کا عالم گنا جاتا تھا۔ کیا بڑے آدمی اس طرح کے ہوتے ہیں۔ اور وہ یوں کمرے میں کبوتر اڑاتے ہیں۔

کمرے میں دوسری جانب ریاضت اپنا سامان اکٹھا کر رہا تھا کیونکہ اسی روز وہ نئے بورڈنگ میں جا رہا تھا۔

”یہ کانڈ یہ کانڈ“ اس نے میز سے کانڈ اٹھاتے ہوئے کہا۔ یہ میرا کانڈ ہے کیا؟“

”ہے نہیں۔“ ایلی اس کی بات سمجھے بغیر بولا۔

”ارے ہائیں۔“ ریاضت چلایا۔ ”یہ تو تمہاری عرضی ہے۔“

”میری عرضی۔“ ایلی اٹھ بیٹھا۔ ”میری عرضی۔ ہاں ارے“ اسے یاد آیا۔ ”اسے مجھے دے

اسے پڑھو نہیں یہ تو پرائیوٹ کانڈ ہے۔ وہ ریاضت کی طرف لپکا۔

ریاضت گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ”میں نے تو پڑھ لی ہے۔“ وہ بولا ”مجھے معلوم نہ تھا کہ جس بھی نئے بورڈنگ میں کمرہ دے دیا گیا ہے۔“

”کمرہ دے دیا گیا ہے۔“ ایلی نے حیرت سے ریاضت کی طرف دیکھا ”کس کو کمرہ دے دیا گیا ہے۔“

”یہ دیکھ لو اس پر جو لکھا ہے۔“ ریاضت نے عرضی اس کی طرف بڑھادی۔

ایلی نے حیرانی سے عرضی کی طرف دیکھا تھا۔ یس او کے نیچے پرنسپل کے دستخط جو تھے۔ خوشی سے ایلی کی چیخ نکل گئی۔ ”ارے۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا ارے وہ کبوتر اڑانے والا مسخرا۔



آخر کس باپ کا بیٹا ہے۔“

وہ سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں۔

”آجا آجا تو رک کیوں گیا۔ ایللی ایللی صدے۔“

”پر میں تو ہے ہی نہیں جو صدے ہو۔ کیوں میں“ ایک ہنس کر بولی۔

”اس کی تو اللہ رکھے ان گنت مائیں ہیں کیوں ایللی۔“

عین اس وقت کھڑکی میں سے شہزاد نے سر نکال کر کہا ”کب آیا تو ایللی۔“

دوسری بولی ”ایک تو یہ بولی۔“

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ ایللی پسینے میں شرابور ہو گیا۔

”میں“ شہزاد کھڑکی سے چلانے لگی ”جو بولنے میں مزا ہے وہ چپکے چپکے چوری چوری میں

نہیں۔“

”ہائے ری لڑکی کیا کہہ رہی ہے تو“ میں نے منہ میں انگلی ڈال لی۔ ”جو منہ میں آتا ہے کہ

دیتی ہے۔ ذرا نہیں سمجھتی۔“

”جھجکنے کا زمانہ میں گزر گیا۔ بات پرانی ہو جائے تو جھجکتا گیا۔“

”لو سن لو بہن یہ لڑکی تو بس جد ہے۔“ وہ پھر سے ہنسنے لگیں لیکن یہ ہنسی سے کس قدر

مختلف تھی۔ ایللی کا پسینہ سوکھ گیا۔

”آج تجھے چائے پلاؤں۔ بالکل تیار ہے ایللی۔“ شہزاد نے با آواز بلند کہا۔

”جا چا پللی اس کی تو۔“ میں نے پھر بات شروع کی۔

”اچھے موقع پر آیا ہے تو محلے میں ایک نہیں چار شادیاں“ ایک نے بات کا رخ بدلنے کا

کوشش کی۔

”اے بی بی“ میں بولی ”اب تو اس کی شادی کی فکر کرنی چاہیے۔“

”سن رہی ہے تو“ ایک نے شہزاد کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ ”کوئی اس کے بارے میں کچھ

فکر کر۔“

”ایسی بیوی لاؤں گی اس کی“ شہزاد نے گھبراہٹ کے بغیر کہا ”کہہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔“

”کوئی ایسی نہ لے آئے۔“ میں نے شہزاد کو طعنہ دیا۔ ”جو اپنی ہی برات میں پچھتا شہزاد کر

دے۔“

”اور کیا تم میں گھٹنگھیاں ڈال کر بیٹھ رہے۔ نہ بھئی ایسی کس کام کی۔“ شہزاد نے

جواب دیا۔ ”میں کام کی تو تو ہی آئی محلے میں۔“ وہ پھر ہنسنے لگیں۔

”میں میں دیکھ تو کام کی نہیں ہوں کیا۔“ اس نے سینہ تپ کر کہا۔

شہزاد کی ہنس کچھ جرات اور بات کی رنگینی انہیں خاموش کر دیتی تھی۔ اور وہ سب دل ہی

دل میں شہزاد کو برا سمجھنے کے باوجود داد دینے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ شہزاد کی اس بات پر وہ سب

ہنسنے لگیں۔ اور ایللی کو موقع مل گیا۔ انہیں مصروف دیکھ کر وہ سیدھا شہزاد کی طرف چل پڑا۔

”یہ لڑکی میں اسے مائی حاجیاں مل گئی۔“ آجا کبھی ہماری طرف بھی آیا کرو۔“ اس نے

ایللی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”کبھی ہم سے بھی کر لیا کر بات۔ اے ہے اتنی بے اعتنائی بھی اچھی نہیں

ہوتی۔“

”اے پکڑ کر اپنے گھر لے گئی۔ اور صحن میں چلاتی ہوئی کرے کی طرف چلی۔ صحن میں

کا ایک عورتیں بیٹھی تھیں۔ دہلی پتی، زرد رو میلی عورتیں۔“

”نہ لڑکی یہ خود تو نہیں آیا میں زبردستی لائی ہوں اسے۔ یہ کہاں آتا ہے کسی کے ہاں یہ تو

مرف کٹے پری چڑھنا جانتا ہے چپکے سے سیڑھیاں چڑھ جاتا ہے جیسے چور دبے پاؤں آتے

ہیں۔“

ایللی حاجیاں کا کمرہ بہت چھوٹا اور تاریک تھا۔ اس میں ایک طرف ایک پرانا پلنگ بچھا ہوا تھا۔

اس کے سرہانے مٹی کے برتن نیچے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک میلا سا تخت پڑا تھا۔

ایللی حاجیاں نے اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔ اور خود ایک چوکی لے کر بیٹھ گئی کہنے لگی ”اے ہے

مما تو دیر سے سوچ رہی تھی کہ کبھی تو اکیلا مل جائے تو بات کروں۔ آخر میں نہ کروں تجھ سے

بات بناتا کون کرے گا۔“

ایللی کا ماتھا ٹھکانا نہ جانے کیا کہنے کے لیے وہ اسے وہاں کھینچ لائی تھی۔ ضرور کوئی بات ہو

گی۔ مگر ایللی

”اے ہے۔“ بولی ”لوگ تو ویسے ہی باتیں بتاتے رہتے ہیں۔ ان کے دل میں درد نہیں

ہوتا۔ لیکن میرے لیے تو تو اپنا ہے بلکہ اپنوں سے بھی بڑھ کر عزیز۔“

”میں معلوم ہے میں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”میری بات کا برا تو نہیں مانتا تو نے۔“

”نہیں میں۔“

”میں بھی لے تو کیا ہوا“ وہ بولی ”ہم تو سچی بات کرنا نہیں چھوڑیں گے چاہے تو برا ہی  
ہو۔ اور تو کام ہے کہ اپنے بچوں کو بھلائی کا راستہ بتائیں۔ ہاں۔“

بھانجان سے دیا

ابھی وہ محن میں ہی پہنچا تھا کہ چھن سے شہزاد ناچتی ہوئی آ پہنچی۔

”ہے میں نے کہا۔“ وہ بولی ”نہ جانے کہاں گم ہو گیا ہے۔ میرے سامنے تو چل پڑا تھا  
وہیں سے پھر چلا کہاں گیا۔ حیرت کی بات تھی، کیوں میں۔“

”تو کیا اس کے ایک ایک منٹ کا حساب رکھتی ہے لڑکی۔“ میں نے ہنس کر طعنہ دیا۔

”کیوں نہ رکھوں میں“ وہ ہنسنے لگی ”رکھنا پڑتا ہے۔ ذمہ داری کی بات جو ہوئی۔“

”اب تو میرا ہی مسلمان ہے یہ۔ جب فرحت اور باجرہ ہوتی تھیں جب اور بات تھی۔ اب  
مندانہ میاں رکھوں گی تو وہ آکر کیا کہیں گی۔“

”اب تو ان کا بہانہ نہ بنا۔“ میں بولی۔

”بھانے بھی بنائے ہی پڑتے ہیں۔“ وہ رازدارانہ انداز سے کہنے لگی۔

”ہائے دی کیا کہہ رہی ہے تو“ میں نے انگلی منہ میں دبالی۔ ”تیری یہ باتیں لے ڈوبیں مٹکے  
دھل کر۔“

”گولم“ وہ پھر ہنسنے لگی۔ ”فی الحال تو مجھے ہی لے ڈوب رہی ہیں۔“

”تو نہ ڈوب کس نے تجھ سے کہا ہے کہ جو منہ میں آیا بک دیتا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”جہاں اب جو چائے ٹھنڈی ہو گئی تو پھر سے کون بنائے گا چائے تیرے لیے چل“ وہ ایللی  
کے کہنے لگی۔

”میں تیری چائے پیتا ہے یہ۔ میں نے کتنی ہی منتیں کیں کہ یہاں پی لے۔ پر اس لڑکے  
سازدگی رٹ لگائے رکھی۔“

”میں وہ میز میاں چڑھنے لگے تو ایللی نے شہزاد کا پلو پکڑ لیا۔  
”مرا بہت تو سن“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”اے ہے۔ برا نہ مانو میری بات کا میں تو تیرا ہی بھلا چاہتی ہوں۔“ میں نے تھیرا  
پر کہا۔

”ہاں ہاں میں“ وہ بولا

”اور دیکھو یہ نہ سمجھتا کہ میں کسی خیل سے کتنی ہوں۔ نہ بھی مجھے کوئی خیال ہے  
خوش رہ میں صرف یہی چاہتی ہوں چاہے جہاں مرضی ہے وہ بس میری خوشی تو اسی میں ہے  
لڑکے آخر دنیا دینا ہے۔ دنیا کا منہ کون بند کر سکتا ہے۔ جب لوگ تیرے متعلق باتیں کرتے  
تو دل دکھتا ہے اور دیکھنا۔ پھر یہ لڑکی ہے کیا نام ہے اس کا آج کل کے نام بھی تو عجیب  
ہیں۔ میں اسے برا نہیں کہتی بچاری بڑی اچھی ہے ہنس کھ ہے اور ایمانداری سے کہتی ہوں  
چلا جائے۔ اس قدر محبت سے ملتی ہے اور اتنی خاطر تواضع کرتی ہے کہ میں کیا بتاؤں۔“  
ساعت کے لیے وہ چپ ہو گئی پھر خود ہی بولی ”لیکن تو جانتا ہے کہ آخر اصل اصل ہے تو  
نقل ہاں خون خون کی بات ہوتی ہے۔ ہم غریب سسی مگر ہمارا خاندان اصلی ہے۔ اس میں  
ملاوٹ نہیں تو جانتا ہی ہے۔ خاندان بڑی چیز ہوتی ہے۔ ہاں اور سچ پوچھ تو وہ کبھی چھپائیں  
تم ہی کو کیا اپنے بیاہ پر کبھی کسی کو گاتے سنا ہے۔ ایمان سے کہتا۔ تو ہے آخر لان بھی لگاؤ  
ہے۔ ہے نا اپنے ہی بیاہ پر گاتی رہی اور مٹکے والیاں سب منہ میں انگلیاں ڈالے حیرت سے  
رہی تھیں۔“ وہ خاموش ہو گئی۔

”سو بیٹا“ وہ پھر بولی۔ ”اس طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر چلتا کیا تو کیا ہو گا یہ رانا  
نہیں۔ اس کے لیے تو گھڑی بھر کا تماشا ہو جائے گا۔ کھلاڑی کو تو کھیل چاہیے پر تیری  
جنگدگ حرام ہو جائے گی ہاں کسے دیتی ہوں میں تجھے۔ آگے تو چاہے جو کر ہمارا کام تو صرف  
دیتا ہے۔ آخر تو باجرہ کا بیٹا ہے اور باجرہ سے بڑھ کر ہمیں اور کون عزیز ہے اور ایللی  
مرضی ہے کر پر اپنے ابا کے قدموں پر نہ چلنا نہ بیٹا۔ یہ راستہ اچھا نہیں۔ نہ اللہ رحمت  
ہے۔ اور نہ کسی اللہ کے بندے کو تو تو برا ہی اچھا لڑکا ہے۔ اب بتا کیا باتوں تیرے لڑکے  
کا یا شہرت؟“

”نہیں میں میں کچھ نہیں پیوں گا۔ تو تکلیف نہ کر۔“ ایللی اٹھ بیٹھا۔

”اے ہے بیٹھ تو سہی کچھ دیر کے لیے۔“

”پھر آؤں گا میں۔“ وہ بولا

لیکن شنراو قہقہے لگاتی ہوئی ہوائی کی طرح اوپر چڑھ گئی۔  
 اوپر جا کر وہ چیخنے لگی۔ ”اب آؤ گے بھی یا دو مزدوروں کو بلاؤں اٹھانے کے لیے۔“  
 دوپٹہ ایللی کے ہاتھ میں رہ گیا۔  
 اس کی بات سن کر راجہ اپنے کمرے سے نکل آئی۔ ”کس کو اٹھوانا پڑے گا کر۔“  
 باتیں کر رہی ہو تم۔“

”تمہارا ہی بھائی بند ہے کوئی۔ اوپر چڑھنے کا نام ہی نہیں لیتا“ شنراو ہنسی۔

”اوہ تمہارا دوپٹہ کیا ہوا۔“ راجہ نے پوچھا۔

”پوچھو اسی سے“ وہ بولی ”اس کا کیا اعتبار ہے آج میرا دوپٹہ اتار لیا ہے۔ اس نے کہہ جانے زیور اتارنے کے لیے کلن مروڑ لے۔ نہ بھائی یہ تمہارے رشتے دار مجھ سے نہیں ہنرا جاتے۔“

”سلام کہتا ہوں۔“ ایللی نے اوپر آکر راجہ سے کہا۔

”تو ہے ایللی“ وہ بولی ”میں سمجھی نہ جانے کس سے کشتی لڑتی ہوئی آئی ہے۔“

”یہ تیرا بھائی بند کیا لڑے گا کشتی۔“ شنراو ہنسی۔ ”اس کی صورت تو دیکھو۔“

”صورت تو اچھی بھلی ہے۔“ راجہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”دیکھ لو۔“ وہ بولی ”یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی رو دے گا۔“

ایللی کو شنراو پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ لیکن اس کی باتیں سن کر اور اس کی ہنسی دیکھ کر وہ ہنسنے لگا۔ اور وہ دونوں ہنستے ہوئے اوپر چوبارے میں چلے گئے۔

چوبارے میں جانو کھڑی تھی۔

”کیوں جانو چائے بھی بنائی یا نہیں۔ دیکھ تو مہمان عین سر پر پہنچ گیا ہے۔“ شنراو نے پوچھا۔

”بڑا مہمان تو دیکھو۔“ جانو بولی۔ ”ایسوں کو ہم مہمان نہیں سمجھتے۔“

”تو کیا سمجھتے ہو ہمیں بھی بتاؤ بھئی۔“ اس نے جانو سے کہا۔

”یہ تو بے ایمان ہے۔ مہمان تو دو دن کا ہوتا ہے۔“ جانو نے کہا۔

”کیوں تم سے کوئی بے ایمانی کی ہے اس نے۔ شرماتی کیوں ہو بتا دے میں کسی کو بتاؤ۔“

”تھوڑی۔“

”اے ہے مجھ سے کیوں کرے بے ایمانی تم جو ہو۔“ جانو غصے میں آگئی۔

”نہیں کچھ نہیں سوچتا۔ کچھ مل جائے ہمیں۔“ ایللی نے پھر ہاتھ بڑھایا۔

”مہمان سے دیا مانگتے ہو۔ اب یہاں رکھا ہی کیا ہے۔“ شنراو نے آہ بھری۔ ”بسمی کچھ ن کہہ۔ اب بھکاری آیا بھی تو کیا آیا۔ اب اسے کوئی کیا دے، کیا دے۔“ شنراو نے بھرپور نگاہ سے ایللی کی طرف دیکھا۔

”شنراو“ ایللی دیوانہ وار اس پر جھپٹا ”میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

”ہو جاؤ ہو جاؤ۔ جلدی کرو۔“ شنراو ہنسنے لگی۔

ایللی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دیوانہ وار اسے چومنے لگا۔ اور شنراو یوں کھڑکی میں کھڑی ہو کر اڑ رہی تھی۔

جانو چائے لائی تو وہ چونکی۔ ٹرے لے کر شنراو نے میز پر رکھ دیا۔ اور زبردستی ایللی کو کرسی پر بٹھا کر کھانے لگی۔ ”اب یہاں بیٹھ کر چائے پیو۔ میرے سامنے بیٹھے رہو اور میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔“ اور پھر اس کے سامنے تخت پر بیٹھ کر یوں سلائی کے کام میں مصروف ہو گئی جیسے اسے ایللی سے دور کا واسطہ بھی نہ ہو۔ ایللی پاگلوں کی طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ ہلکا ہلکا لڑکھاتے کے ق کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی چھوٹی سی چھوٹی حرکت پر ہنسا ہوئے جا رہا تھا۔

”دراہر مہمان میں جانو بیٹھی ایللی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

آخر جانو سے نہ رہا گیا وہیں سے چلا کر بولی ”اے لڑکے کیا ہو گیا ہے تجھے، یوں دیکھ رہا ہے جیسے پاگل ہو گیا ہو۔ ہوش میں آ۔“

”مونٹوس“ شنراو سر اٹھائے بغیر بولی۔ ”سب بے کار ہے جانو۔ پاگل کبھی ہوش میں نہیں آیا کرتے۔ تم کیوں اپنا جی جلا رہی ہو۔“

”تو نے ہی اسے کر دیا پاگل“ جانو غصے میں پھٹکارنے لگی۔

”اونسوں۔“ وہ ویسے ہی بے پرواہی سے بولی۔ ”میں کیا کروں گی پاگل جانے۔“  
میاں کو پاگل نہ کر سکی۔  
”وہ تو پہلے ہی پاگل ہو رہا تھا۔ اس کی کیا بات“ جانو بولی۔  
”توبہ پھر“ شہزاد نے ہنس کر کہا ”یہ بھی پہلے ہی سے پاگل ہے۔“  
”توبہ ہے۔“ جانو نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا ”اب تجھ سے کون کسے بہت  
کہہ کر وہ غصے میں اٹھ کر نیچے چلی گئی۔

گشت کا نو تھرا

شام کے وقت شہزاد نے کپڑے بدلے اور بڑے اہتمام سے ہٹاؤ سنگار کر کے بیٹھ گئی۔ ایللی کو  
بے خیال پیدا ہو گیا کہ یہ اہتمام اس کی آمد کی وجہ سے ہے۔ شہزاد کے اس اہتمام کی وجہ سے وہ  
بے حد خوش ہو رہا تھا۔

شہزاد کی طبیعت میں ہلاکی بے نیازی تھی۔ اس نے کبھی سنگار کے لیے سرخی یا پاؤڈر استعمال  
نہ کیا تھا اس زمانے میں عورتیں سرخی یا پاؤڈر استعمال کرنے کو باعث عار سمجھتی تھیں۔ کیونکہ بڑی  
ہارے اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ عورتیں سرخی یا پاؤڈر لگا کر اپنی نمائش کریں۔ اگرچہ  
بہارت کپڑے اور زیور پہننے کو معیوب نہ سمجھا جاتا۔ کپڑا اور زیور پہننا تو عورت کا ازلی حق

شہزاد ہمیشہ خوبصورت کپڑے پہنے رکھتی تھی اگرچہ اس کی پوشاک میں نمائش کی جگہ سادگی  
اور ہوتا تھا اس کی آنکھیں لمبی اور خوبصورت تھیں اور اس کے ماتھے پر قدرتی طور پر ایسے  
مہر اور تھانیں ہندو عورتیں ٹیکا یا بندی لگاتی ہیں۔ اس کی پیشانی اور آنکھیں اس قدر جاذب  
توجہ تھیں کہ ہونٹوں کا موٹاپا اس کے حسن میں کبھی حارج نہیں ہوا تھا۔

ایللی اس کے سیاہ جالی دار دوپٹے جس پر سفید پھول کاڑھے ہوئے تھے کو دیکھ دیکھ کر حیران  
وہا تھا اسے یقین نہیں پڑتا تھا کہ شام کے وقت شہزاد کا کپڑے بدل کر بیٹھ جائے۔ اس کی آمد کی  
وجہ سے قلعہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی میرے لیے اس قدر پروا کرے۔ میرے لیے بنے  
نہیں۔ مگر جی چوری چوری دل ہی دل میں وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اسی کے لیے ہے، شام کے  
قلعے سے فارغ ہو کر وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ نیچے سے شور بلند ہوا۔ چھٹی گلی سے عورتیں  
نکلنے لگیں۔ بلا رہی تھیں۔

محب تو بلدی بھی کرے گی یا نہیں۔“ جانو نے شہزاد سے کہا ”تو یہاں اپنی دھن میں لگی  
بلا رہی ہے۔“

”تو نے مجھے بدنام کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ ہے نا۔“ شہزاد نے آنکھیں اٹھائیں۔  
مخاطب کیے بغیر کہا۔

”کبھی مجھے طعنے دیتے ہیں میں سمجھتی نہیں۔ سب سمجھتی ہوں میں لیکن کیا کلام ہو۔  
نے مجھے یہاں رہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔“

”میں بہت برا ہوں۔“ ایللی نے خلوص سے کہا۔  
”ہو گا۔“ شہزاد نے بے پرواہی سے کہا ”لیکن مجھے نہ جانے کیوں اچھا لگتا ہے۔“

ہے تجھے سامنے بٹھائے رکھوں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں تیری خاطر میں ان کے ماتھے پر  
نہیں لگتی ہے کتنی منتیں کی تھیں انہوں نے میری اب کی بار لیکن میرا جی ہی نہیں چاہتا۔

کما چلی گئی تو پھر نہ جانے کب ملاقات ہو تم سے اور پھر تم نے آنے میں اتنے دن لگا دیے  
انتظار کرتے کرتے آنکھیں تھک گئیں۔“ شہزاد نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ”نہ جانے کیا ہو گیا ہے ایللی۔“ وہ بولی ”ہائے میں تو انجانے ہی میں  
گئی اور یہ سب محلے والیاں مجھے تمہارے طعنے دیتی ہیں۔ جلی کئی سناتی ہیں۔ ہر روز ہر وقت۔“

”شہزاد۔“ ایللی اچھل کر اس کے قریب آگیا۔  
د فتنہ“ وہ طلسم ٹوٹا اور شہزاد گویا جاگ پڑی۔

”نہ“ وہ بولی ”ایسا نہ کر ایللی میری اپنی نگاہ میں تو میری عزت رہنے دے۔ مجھے اپنی شان  
نہ گرا تمہارا تو کچھ نہیں بگڑے گا ایللی میں اپنے آپ سے جاؤں گی۔“

”تو میں کیا کروں۔“ ایللی نے گھبرا کر کہا۔  
”وہیں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کر۔ میری باتیں سن۔ میں اپنی بات کے سناؤں۔ تو نے ہی  
سنی تو کون سنے گا۔ ایللی۔“ وہ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔ ”لیکن تم نے مجھے



ہاپ سر جھکائے باہر نکل آتے۔ اول تو وہ محلے میں آتے ہی نہیں تھے کیونکہ ان کا مکان محلے کے ایک کونے میں واقع تھا۔ یہ کو نہ بازار سے عین ملا ہوا تھا اور انہوں نے براہ راست بازار سے آنے جانے کا راستہ بنا رکھا تھا جو محلے کی ڈیوڑھی سے بھی ہٹ کر تھا۔ لہذا انہیں گھر آنے کے لیے محلے کی ڈیوڑھی میں داخل ہونے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

انہیں دیکھ کر ایلی محسوس کرتا تھا جیسے وہ سب ویسے نہ ہوں جیسے وہ دوسروں کے درہرو دکھائی دیتے تھے جھکے ہوئے سر کے باوجود ان کی نگاہوں میں محلے والوں کے لیے تسخیر کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ ہونٹوں میں تحقیر کا احساس دبا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جب وہ ادب و احترام سے کسی کو سلام علیکم کہتے تھے تو محسوس ہوتا جیسے محض دکھاوے کے لیے بات کر رہے ہوں اور اگر ان کے ہاں کوئی محلے دار چلا جاتا تو اس کی آمد پر یوں خاموشی چھا جاتی جیسے نہ جانے کیا ہو گیا ہو۔ چنانچہ نو وارد کو محسوس ہونے لگتا کہ بگائوں کی محفل میں بیگانہ آ گیا ہے۔ وہ سب کان سے منہ جوڑ کر بات کرنے والے تھے۔ ان کی شکلیں دکھانے کی محسوس ہوتی تھیں اور ان کی باتیں ہاتھی رات۔ ممکن ہے ایلی کے یہ احساسات دراصل ایلی کے من گھڑت بغض ہوں۔ ممکن ہے کسی وجہ سے ایلی نے کوئی لاشعوری الجھن پال رکھی ہو۔ اور اس کو جائز ثابت کرنے کے لیے اس نے ایسے احساسات اختراع کر رکھے ہوں۔ بہر حال یہ ایک حقیقت تھی کہ ایلی کو غفور اور اس کے بھائیوں سے بغض تھا۔ بھائیوں کی بات چھوڑیے غفور کی ذات سے تو اسے بے انتہا چڑھتی اور غلغلہ میں ہر کوئی جانتا تھا کہ غفور کے رویے سے خود اس کے بھائی بھی تالان تھے۔

عام طور پر ایلی کی غفور سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ اور اگر کبھی ہوتی تھی تو کبھی حویلی کے قریب چونکہ عام طور پر غفور محلے کی مسجد میں نمانے جایا کرتا تھا نمانے کے لیے وہ اس راستے سے باہر نکلتا تھا جو محلے کے اندر کی چھوٹی گلی میں نکلتا تھا۔ ایلی نے چھوٹی گلی میں ہاتھ میں صلیب ڈال کر توجہ پکڑنے سے کئی بار دیکھا تھا۔ وہ بے تکلفی سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا بے حس انداز میں آگے بڑھے چلا جاتا۔ اور ہر عورت اور لڑکی کی طرف ایسے بے باکانہ دیکھتا جیسے اس کے جسم کو جانچ رہا ہو۔ جیسے قصائی بوچڑ خانے میں گایوں کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ ساتھ ہی وہ جسم کو کھانڈ اس وقت ایلی کو محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی بورا بھالو ہو اور اوپر نیچے سے اپنے جسم کو غور غور دے رہا ہو۔ یا کسی کو کچھ سمجھا رہا ہو۔ یہ محسوس کر کے ایلی کو بے حد غصہ آتا تھا لیکن غور غور میں ایلی کے مقابلے میں پہلو ان کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ بے بسی بھرا غصہ ایلی کے

انتظار کر رہی ہیں۔ کون انتظار کر رہی ہیں۔" ایلی نے پوچھا۔

"اے ہے محلے کی عورتیں اور کون۔ شادی والے گھر گانے کے لیے نہ جلتے ہیں۔ سمجھتا ہے یہاں تیرے سرہانے بیٹھ رہے گی کیا۔"

"شادی والے گھر۔" ایلی نے گھبراہٹ بھری شرمندگی سے کہا۔ وہ شادیوں کی بڑا طور پر بھول چکا تھا۔

"اور کہاں۔" جانو بولی۔ "تیری شادی ہوگی تو تجھے معلوم ہو گا تاکہ شادی والے گھر کیلئے جانا ضروری ہوتا ہے۔ ہاں۔"

"اے ہے کیوں خواہ مخواہ مغز چاٹ رہی ہو۔" شہزاد جانو کو کونے لگی۔ "جانو بولی جلدی آجاؤں گی میں۔" وہ ایلی سے کہنے لگی۔ "تو جب تک کوئی اپنی کتاب پڑھا۔" اس نے ایک نگاہ التفات ڈالی اور پھر سیاہ پھولدار دوپٹے کے سر پر لے کر یوں آنکھیں ماکر اپنی طرف دیکھنے لگی کہ اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔ اور پھر جب جانو بیڑھیوں میں ہو گئی تو شہزاد نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر رکھ دیا۔ اور اس کے چہرے کو سنا ہوئے بولی "سو نہ جانا۔ میں ابھی آئی۔" یہ کہہ کر وہ بیڑھیوں میں داخل ہو گئی اور اپنا دماغ گم کیا۔

دیر تک وہ چپ چاپ پڑا رہا۔ پھر دھنچکا "اسے خیال آیا کہ شادی والا گھر تو دی ہے۔ غفور رہتا ہے۔"

اسے بچپن ہی سے غفور سے نفرت تھی۔ صرف غفور ہی سے نہیں ان کے ساتھ سے نفرت تھی۔ اگرچہ وہ آصفی محلے میں رہتے تھے اور آصفیوں سے گہرے تعلقات نہ بھی غفور اور اس کے بچپن بھائی آصفیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اور خود کو کسلواتے تھے۔

وہ محلے سے قطعی طور پر مختلف تھے۔ جسمانی لحاظ سے بھی ان کی ساخت الگ ہی تھی۔ ان کے جسم بھرے ہوئے تھے قد چھوٹے اور چہرے گول تھے انہیں دیکھ کر ایلی محسوس کیا کرتا جیسے وہ گوشت کے لو تھڑے ہوں ایسے غلیظ ننگے لو تھڑے جیسے علی پور کے بوچڑ خانے نے بار بار دیکھے تھے۔ جمل گائیاں اور بھینسیں ذبح کی جاتی تھیں۔ حالانکہ غفور کے علاوہ باقی بھائی بہن شریف سمجھے جاتے تھے۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے محلے میں داخل ہوتے تھے۔

آجھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ لیکن محلہ پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔

آجھوں میں اس کے انتظار میں پاگل ہو رہا ہوں ایللی نے سوچا۔ جب جی چاہے آئے مجھے کیا۔  
پانچ ساری رات گلی کے اس تاریک کونے میں بسر کر دے آخر مجھے اس سے کیا غرض یہ سوچ  
توڑ لیت گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی نگاہوں تلے بھالو ناچ رہا تھا۔ قریب ہی ایک رنگین  
ڈھیر سا بڑا تھا اور گلی خوف کے مارے بھیانک اور سنسان ہو رہی تھی۔

ہنٹے روتے

دروازہ بجا تو چونکا۔ بھاگ کر اس نے کنڈی کھول دی اس وقت وہ بھول گیا کہ شہزاد کے  
آنے یا نہ آنے سے اسے کیا غرض تھی۔ اسے یہ احساس بھی نہ ہوا تھا کہ عرصہ دراز تک اس  
نے یوں آنکھیں بند کر رکھی تھیں جیسے مدت سے سوچا ہو۔

شہزاد گھر پہنچے ہی اپنی چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ ”توبہ ہے۔“ وہ بولی ”گاگا کر ہلکان ہو گئی  
مروں بہن بہن کر رہا ہے جیسے بھڑوں کا جھتہ ہو۔“  
”کو“ جانو چلائی ”تو کیا اب کپڑے بھی نہ بدلو گی۔“

”اپنی جان کھائیں کپڑے۔ مجھ میں اٹھنے کی ہمت بھی ہو۔“ یہ کہہ کر وہ سرہانے تلے بازو  
رکھ کر ایللی کو بلانے بغیر یوں سو گئی جیسے ایللی وہاں موجود ہی نہ ہو جیسے ایللی نہ جانے کون ہو۔

اور ایللی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس رنگین ڈھیر کو دیکھتا اور کمرے کے دروازے سے باہر  
اندھیرے کونے میں بھالو ناچتا رہا۔ اور سرخ گوشت کے لو تھڑے ابھرتے رہے۔ حتیٰ کہ صبح کی  
پہلی جھلکنے لگی اور تھک ہار ایللی کی آنکھ لگ گئی۔

اگلے روز جاگتے ہی شہزاد نے ایللی کے کان میں جینکے چھوٹے شروع کر دیے۔

”گھوڑے بیچ کر سوئے ہو کیا اب جاگو گے بھی یا نہیں۔ دیکھو تو دن چڑھ آیا ہے۔“ شرم  
نہیں آئی ”ایللی چلایا۔“ ساری رات انتظار کرایا اور اب تنگ کر رہی ہے۔“ ”توبہ ہے۔“ ”وہ  
نہی“ جب کوئی موجود نہ ہو بیٹھ کر انتظار کرتا ہے اور جب موجود ہو۔“ وہ ہنٹے ہنٹے رک گئی۔

”تو پراخراٹے لے کر سوئے جاتا ہے۔“

اس بات پر ایللی کو اور غصہ آیا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ شہزاد اپنی غلطی تسلیم کر لے گی اور اس  
سے وعدہ کرے گی کہ آئندہ وہ کبھی اتنی دیر باہر نہ رہے گی۔ لیکن شہزاد اس معاملہ میں بالکل

احساس کتری پر تازیانے کی حیثیت رکھتا وہ کھولتا۔ اور پھر بھاگ لیتا۔

اس روز شہزاد کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے ایللی سوچ رہا تھا کہ وہ بیٹھی گا رہی ہو گی۔  
وقت وہ کتنی پیاری لگتی ہے معلوم ہوتا ہے جیسے اس سے اس کی آنکھوں میں نمی کی  
روشن ہو جاتی ہیں اور ان سے چھن چھن کر شعاعیں نکلتی ہیں۔ عورتیں تعجب سے اس کی  
دیکھتیں تھیں۔ اس وقت رنگین دوپٹوں کے اس ڈھیر کے قریب ایک بھورا بھلا آکھڑ  
اس کی نگاہیں شہزاد پر مرکوز ہو جاتیں۔ اور پھر اس کا بچہ اٹھتا۔ اور وہ کھانے لگتا۔ اتنے ذرا  
کھجائے کہ اس کے بال اکھڑ جاتے اور نیچے سے نیچے غلیظ گوشت کا لو تھڑا نکل آتا۔  
ایللی غصے سے کھولنے لگتا۔

پھر وہ لاجول پڑھ کر اپنی توجہ کسی اور طرف منعطف کرنے کی کوشش کرتا مگر جلد ہی  
اس گانے والیوں کے رنگین جھرمٹ سے وہی بھالو ابھرتا اور وہی بھیانک منظر حقیقت بن کر  
کے رو برو آکر کھڑا ہوتا۔

”ن۔ گھڑی نے ایک بجایا۔

ایک“ اس نے گھڑی کی طرف غور سے دیکھا۔ ساڑھے ساڑھے بارہ بجے تک لگا  
ہے اس نے سوچا۔

عین اس وقت نیچے چوگان سے اسے عورتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ شکر ہے اس نے  
یقیناً ”وہ بھی ان کے ساتھ ہی آ رہی ہو گی۔ بس پہنچا ہی چاہتی ہو گی۔ وہ منہر ہو کر بیٹھ گیا  
وہ آکر آواز دے گی اور میں جھٹ سے دروازہ کھول دوں گا اور کسوں گا دیکھا یوں کیا کرتے ہیں  
انتظار۔ آواز دیئے بغیر دروازہ کھول دیا۔ پاؤں کی چاپ سمجھتا ہوں۔ کیا سمجھا ہے تم نے۔  
عورتوں کی آواز مدھم پڑ گئی۔ دروازوں پر دستکیں دی گئیں۔ دروازے کھلے اور بند ہو گئے۔  
محلے پر ایک بار پھر سناٹا چھا گیا لیکن شہزاد کے پاؤں کی چاپ سنائی نہ دی۔

دفترا۔ ایللی کی نگاہ کے سامنے وہ تنگ گلی آ گئی جس میں غفور صابون دانی اور قید خانہ  
ہوئے کھجائے ہوا گزرا کرتا تھا۔ گلی میں ایک طرف شہزاد سہمی ہوئی گھڑی تھی دوسری طرف لکڑی  
بھالو کھچا کھچا کر گوشت کے لو تھڑے بنائے جا رہا تھا۔ پھر وہ شہزاد کی طرف لپکا اور گلی کے اس  
پر تاریکی اور بھیانک خاموشی چھا گئی۔

ایللی پاگلوں کی طرح اٹھ بیٹھا اور دیوانہ وار ابھر اھر شلنے لگا۔ بے بسی اور غصے میں

چلنے لگی۔ ”معلوم ہوتا ہے تیرا داگ بھی چل گیا ہے۔ تم دونوں ہی کا پتہ نہیں چلتا۔“ وہ بولی  
 ”بے وجہ نہ ہے ہو بے وجہ روتے ہو۔“  
 ”ایلی اٹھ بیٹھا۔“ ”اچھا میں ذرا باہر جاؤں گا۔“  
 ”ہی ہیں۔“ ”جانو گرائی“ ”اب تو یہاں کیوں بیٹھنے لگا جا جا کر بری دیکھ تو لوگ بری دیکھیں  
 گے۔“ ”تو اسے دیکھنا یہاں بیٹھا کیا کری گا۔“  
 جب وہ میز پر اترنے لگا۔ تو جانو اس کے پاس آئی اور دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ پکڑ  
 کر بولی۔ ”میں داری کیوں اپنی جان ہلکان کر رہا ہے تو تجھے کس چیز کی کمی ہے۔ جیسی چاہے گا  
 دیکھ لی جائے گی۔ یہاں سے تجھے کیا حاصل ہو گا۔ پھر کیوں اپنا ایمان گنوا رہا ہے تو یہاں۔“

جلو

چوہن میں پہنچ کر اس نے محسوس کیا جیسے خلا میں چل پھر رہا ہو۔ اس کے لیے سارا علی پور  
 ایک دیرانہ حقائق دق ویرانہ جس میں صرف ایک قدیل روشن تھی۔ اور جب وہ رنگین قدیل  
 نگاہ سے دور ہو جاتی تو گھٹا نوپ اندھیرا چھا جاتا اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔  
 ”بے توبہ۔“ ”رضا اسے یوں کھڑے دیکھ کر چلایا۔“ ”یہاں کیا کر رہا ہے تو جیسے کوئی کھو گیا  
 ہو۔“

”کوئی نہیں“ ایلی نے جواب دیا ”میں خود کھو گیا ہوں رضا۔“ وہ پسلا دن تھا جب اس نے  
 رضا کے دہو اس بات کا اقرار کیا تھا۔ اگر اس وقت رضا اس کی بات نہ کاٹتا تو غالباً وہ اپنا سر  
 اس کے کندھے پر رکھ کر رو دیتا۔ اور رو کر اپنی داستان کہہ دیتا۔ لیکن اس روز نہ جلنے کیوں  
 رضا خود کسی رنگین اضطراب میں کھویا ہوا تھا۔

”ارے یار“ وہ بولا ”آج وہ رونق ہے وہ مشتعل ہیں کہ حد ہے۔ ہر لڑکا کسی نہ کسی داؤ پر لگا  
 ہے۔ لڑکیوں کے جھنڈ کے جھنڈ آ جا رہے ہیں۔ ٹانگ جھانک ہو رہی ہے۔ لوگ ڈیوڑھیوں اور  
 تنگ گلیوں میں گھوم پھر رہے ہیں اور تو۔ تو یہاں کھڑا ہے جیسے۔“

ایلی چپ کھڑا رہا۔ اسے خاموش دیکھ کر رضا بولا ”آئیں تجھے سائیں کے پیڑے کھلاؤں کیا  
 یاد کرے گا تو چل اب۔“ اور وہ دونوں سائیں کی دکان کی طرف چل پڑے۔ دیر تک وہ دونوں  
 جہ چاہ چلتے رہے ایلی اپنے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ اور رضا کسی اپنی ہی بات میں مگن تھا۔

مجبور تھی۔ نمائش کا جذبہ آن کی آن میں اس میں یوں ابھرتا تھا جیسے بوتل سے جن لکھ رہی ہو  
 پھر وہ اپنا آپ بھول جاتی۔ اور دیوانہ وار اس جذبے کی تسکین کے لیے مضطرب ہو جاتی۔  
 اس روز جب وہ ایلی کو سمجھا رہی تھی۔ ”نہ پیارے اس طرح بات بات پر نہیں  
 کرتے۔ یہ کیا بگڑنے کی بات ہے چلو تم برا ماننے ہو تو میں آج سے گلے نہ گاؤں گی لیکن مسلم  
 ہے میں نہ مٹی تو محلے والیں کیا سمجھیں گی کیا کہیں گی۔ ایک دوسری سے گانا تو کوئی بری چیز نہیں  
 زرا دل لگا رہتا ہے۔ ہم بھی دو منٹ کے لیے جی لیتے ہیں۔ اگر تو برا ماننا ہے تو نہ سہی۔“  
 عین اس وقت نیچے ڈیوڑھی سے نائن کی آواز آئی۔ ”بی بی حسن دین کے گھر سے بلا  
 ہے۔ آکر بری کی چیزیں دیکھ لو۔“

”بلاوا ہے۔“ ”شہزاد اپنے آپ بولی۔“ ”بری کی چیزیں دیکھنے کا بلاوا ہے۔“

بری کی بات سن کر شہزاد کی آنکھوں میں چمک لہرائی اور گرد و پیش دھندلا کر رہ گئے۔ یکدم  
 ایلی کا وجود اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا اور ایلی سے کیے ہوئے تمام وعدے فراموش ہو  
 گئے۔ لپک کر اٹھی اور ٹنک کھول کر کپڑے نکالنے لگی اور پھر آئینے کے سامنے سنگار  
 مصروف ہو گئی۔ ایلی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

آخر وہ اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ”تم جا رہی ہو۔“ اس نے پوچھا۔  
 شہزاد نے خالی نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھا۔ ”تم کہہ رہے ہو کچھ۔“ اس نے ایلی سے  
 پوچھا۔ اس بے تعلقی کے اظہار پر ایلی کا منہ غصے میں لال ہو گیا۔ لیکن شہزاد نے اس کی طرف  
 کوئی توجہ نہ دی۔ اس وقت وہ ٹنک سے اپنا محبوب سوٹ نکال رہی تھی۔ پھر وہ بات کے لیے  
 غسل خانے میں داخل ہو کر کپڑے بدلنے لگی۔

جلدی جلدی وہ تیز ہو کر یوں میز پر اترنے لگی۔ جیسے جانے کے سوا کسی اور بات کا  
 سدھ سدھ نہ ہو۔ میز چیموں میں پہنچ کر وہ چلائی۔ ”جانو تو ہنڈیا چڑھا رہا میں ابھی لوٹ آؤں گی۔“  
 شہزاد کے جانے کے بعد ایلی دیر تک غصے سے کھوتا رہا اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شہزاد  
 کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا تھا۔ کہاں وہ محبت بھری باتیں کرنے والی شہزاد جو محلے میں اس کا  
 تلاش میں سرگردان پھرتی تھی اور کہاں یہ شہزاد جو اس کے وجود ہی سے منکر تھی۔ اسے  
 میں نہیں آتا تھا کہ ان دونوں میں سے اصلی شہزاد کون سی ہے۔

دیر تک وہ غصے میں کھوتا رہا اور پھر اپنی حماقت پر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ جانو اسے

”تو نہیں جائے گا گھر اطلاع دینے۔“ ایلی نے پوچھا۔  
”ہاں کیا ہے۔“ وہ بولا ”کسی کے ہاتھ کھلا بھیجوں گا کہ مل لینے جا رہا ہوں۔“ تو جا۔

ہاگ۔“

بب ایلی گھر پہنچا تو اس کا دل دو متضاد خواہشات میں بنا ہوا تھا۔ ایک لمحے میں اسے خیال آتا ہے تائے بغیر میں کیسے جا سکتا ہوں۔ جب اسی معلوم ہو گا تو وہ کیا کہے گا۔ اور پھر آٹھ چٹیاں ضائع کر دینا پھر نہ جانے کب علی پور آنا نصیب ہو۔

دوسرے لمحے میں وہ سوچتا یہاں کیوں بیٹھا اس کا انتظار کھینچتا رہوں اور وہ یوں گانے میں اور بری چیز دیکھنے میں مصروف رہے۔ گانا تو محض بہانہ ہوتا ہے۔ مقصد تو اپنی نمائش کرنا ہوتا ہے۔ اور اور پھر اس وقت اس کی نگاہوں تلے وہ کھاتا ہوا بھالو آکھڑا ہوتا۔ شہزاد ڈگڈگی بجا بجا کر گاتی اس خیال پر ایلی کو از سر نو غصہ آگیا۔ اس نے لپک کر سوٹ کیس اٹھایا اور چپکے سے بیڑھیاں اترنے لگا۔ راستے میں کئی بار جی چاہا کہ لوٹ جائے۔

علی پور سے نکلتے ہی ایلی کو وہاں سے چلے آنے پر افسوس ہونے لگا۔ دل میں درد ہونے لگا گاڑی چمکا چمک چلے جا رہی تھی۔ دور ہرے بھرے کھیتوں کے پرے شہزاد اس کے پیچھے بچے بھاگ رہی تھی۔ ”نہ جاؤ نہ جاؤ تم کیوں چلے گئے ہو ایلی کیا تم مجھ پر اعتماد نہیں کر سکتے۔“ ”ایلی۔“ شہزاد چیخ رہی تھی چلا رہی تھی۔  
شیشن پر اترنے کے بعد ایلی نے ان چند کچے گھروندوں پر نگاہ ڈالی جو ریلوے شیشن کے پاس ڈھیر ہو رہے تھے۔

بھار کی دوکان پر چار ایک آدمی کھاٹ پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ان کے قریب ہی دو آدمی زمین پر بیٹھے لوگھ رہے تھے۔ بائیں ہاتھ بیکر کے درخت تلے ایک گدھا کھڑا تھا جس پر لکڑیاں لدی ہوئی تھیں اس کے قریب ہی کونیں پر چار ایک بھدی اور کل عورتیں ہائی بھر رہی تھیں۔ کچے گھروندوں کے چاروں طرف دور دور تک بھجر زمین کا وسیع پہاڑ۔

گھن دیکھ کر ایلی گھبرا گیا۔ ”کیا یہی گاؤں ہے“ اس نے رضا سے پوچھا۔ ”یہ تو محض دیرانہ ہے۔“

”گور کیا ہو پیارے۔“ رضا چلایا۔ ”گاؤں تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

فرق یہ تھا کہ ایلی کی خاموشی باپوسی بھری تھی اور رضا میں ایک امید بھرا اضطراب کروٹ میں لہا تھا۔

دفتا۔ ایلی رک گیا۔ ”رضا ایک بات کہوں۔“

”کہو۔“ رضا نے اپنا سونٹا زمین پر ٹیک کر لنگڑی ٹانگ اٹھائی ”کہو۔“ وہ بولا۔  
اس وقت ایلی کو احساس ہوا کہ اس نے رضا سے کچھ کہا ہے۔ شاید وہ اپنا راز پہلے کے لیے مضطرب ہو رہا تھا۔

”کہو نا“ رضا بے تابانہ بولا۔

ایلی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے۔ وہ ایک ساعت کے لیے سوچتا رہا۔ پھر بولا  
”رضا میرا جی نہیں لگتا۔“

”تو پھر“ وہ بولا

”پھر“ ایلی نے دہرایا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پھر کے جواب میں کیا کہے۔  
”یہاں سے کیسے چلے جائیں؟“ ایلی کے منہ نکل گیا۔

”لیکن جائیں کہاں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہاں یہ سوچنے کی بات ہے۔“ رضا بولا پھر دفتا ”وہ چلایا“ ارے وہ ارجمند جو ہے کھڑا  
کب سے ہماری راہ دیکھ رہا ہے۔ بیمار پڑا ہے۔ کہتے ہیں دق ہے۔ اس کا بڑا بھائی تو جوالی میں دن سے مرا تھا۔“

”ہاں ارجمند جو ہے۔“ ایلی نے محسوس کیا کہ اس کا علی پور سے جانے کا شوق دم بدم بڑھتا رہا ہے۔

”تو کب چلیں؟“ رضا نے پوچھا۔ ”آج ہی سہی۔ چاہے ابھی چلو۔“

ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

رضا نے سونٹا دونوں ہاتھوں میں تھام لیا ”اب آپ ہی بات کر کے پیچھے ہٹا ہے۔“  
اسے گھورنے لگا۔

ایلی بھی جوش میں آگیا ”تو چل ابھی سہی۔ میں اپنا سوٹ کیس اٹھا لوں۔“ ”ہوں سوٹ“

کیس“ رضا چلایا اس کی کیا ضرورت ہوگی۔ بلاو بنا پھرتا ہے۔“

”اچھا تو ابھی لا سوٹ کیس اپنا میں انتظار کروں گا۔“

”لیکن لیکن ارجمند تو کہتا تھا۔“

رضانے قہقہہ لگایا ”اسے تو بچنے کی عادت ہے کبے جاتا ہے۔“ ”وہ تو بندر لینا ملے ہیں۔“

”ایلی نے کہا۔“

”دیکھ لو بندر ابن رضا ہنسنے لگا۔“

”وہ تو کارخانے میں کام کرتا ہے نا۔“ ایلی نے پوچھا۔

جلو کا تارپین کا کارخانہ گاؤں سے میل کے فاصلے پر تھا۔ شیش سے ایک چھوٹی سی لائو کارخانے کی طرف جاتی تھی جس پر چھوٹی چھوٹی ٹالیاں چلتی تھیں۔

کارخانہ ایک وسیع جوگن میں تھا جس میں عمارتیں اور مشینیں تو کافی تھیں لیکن بیشتر عمارتیں ویران پڑی تھیں اور اکثر مشینیں بے کار کھڑی رنگ آلود ہو چکی تھیں۔

کارخانے کے جنوبی حصے میں مزدوروں اور ملازمین کے لیے کوارٹروں کی چند ایک قطاریں بنی ہوئی تھیں۔ بہت دیر تلاش کرنے کے بعد انہیں ارجمند کا گھر ملا۔

## مرلی کا رسیا

وہ ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا۔ مختصر سے صحن میں ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اور غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ دوسری طرف ایک کمرہ تھا۔

کمرے میں ایک طرف چارپائی پر ارجمند لیٹا ہوا تھا۔ چارپائی کے قریب اس کی ماں بٹھی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ دوسری طرف ارجمند کی ہمیشہ چپ چاپ بیٹھی رو رہی تھی۔ چارپائی پر ارجمند کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، آنکھوں کے گرد سیاہی پڑے ہوئے تھے۔ ایلی نے گہرا کر چاروں طرف دیکھا ”یا اللہ یہ میں کہاں آگیا ہوں۔“ اس کے قریب رضا لائو زمین سے نیچے چپ چاپ کھڑا تھا۔

دفترا ”ارجمند کی ماں نے مڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ایک ساعت کے لیے انہیں بٹھی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر چونکی۔ اس نے مسکرائے کی شدید کوشش کی۔ لیکن اس کی آنکھیں نکل گئی۔ اور پھر ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”دیکھ تو بیٹا۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تیرے دوست تجھ سے ملنے آئے ہیں۔ دیکھ تو ادھر آنکھیں تو کھول۔“

لیکن ارجمند اسی طرح آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔

وہ ایلی اور رضا سے مخاطب ہو کر بولی ”اسے تو اپنی سدھ بھی نہیں رہی۔ بس یوں ہی آنکھیں بند کیے پڑا رہتا ہے۔ نہ خود بات کرتا ہے۔ نہ کسی کی بات سنتا ہے۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔ دیکھ لو اپنے دوست کا حال۔“

وہ دونوں چپ چاپ چوکیوں پر بیٹھ گئے ماں پھر سے اپنے بیٹے کی طرف ٹٹکی باندھ کر دیکھنے میں لگی اور کواٹر پر ایک خوفناک خاموشی مسلط ہو گئی۔

نہ جانے کب تک وہ یوں ہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔

رضانے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ ایلی غور سے ارجمند کی طرف ٹٹکی باندھ دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ اس میز پر پڑی جو ارجمند کے سر ہانے پڑی تھی۔ میز پر ایک موتی سی جملہ کاپی تھی جس کے سرورق پر خوش خط حروف میں انگریزی ملباؤں لکھا ہوا تھا۔ ایک طرف ہانسی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اور اس کے قریب ہی سستی خوشبو کی چند خالی شیشیاں تھیں اور اشعار کی کئی ایک چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑی تھیں اپنی انگریزی پریم سندیس پریم پتر اور پونم ٹپاسے بے نیاز گوگل کے بن کا وہ کنسیا آنکھیں بند کیے ہوں بے حس لیٹا ہوا تھا جیسے اس میں حرکت کی سکت نہ رہی ہو۔“

اس منظر کو دیکھ کر ایلی کا جی چاہتا تھا کہ چیخیں مار مار کر رو دے۔

دفترا ”ارجمند کو کھانسی کا دورہ شروع ہو گیا اور اس کا سارا جسم کھانسی کی شدت سے لرزے لگے۔ سینے میں دھنکی سی چل رہی تھی۔ ہڈیاں چیختی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ماں نے بڑھ کر اسے قلم لیا۔ بن چوڑے بھرا پیالہ اٹھا کر پاس آکھڑی ہوئی تاکہ اسے تھوکنے میں دقت نہ ہو۔ دیر تک ہڈیوں کا ڈھانچہ یوں ہلتا رہا۔ جیسے روٹی سے بنا ہوا ہو۔ پھر اس نے منہ کھول دیا اور بہتر خون کی پچکاری سی چل گئی۔ ماں نے اسی لٹا دیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن ان میں دیکھنے کی سکت نہ تھی ماں چلانے لگی۔ ”بیٹا دیکھ تو تیرے دوست آئے ہیں۔“ مگر وہ جوں کا توں پڑا رہا۔

پھر ایلی اٹھ کر اس کے سامنے چارپائی پر جا بیٹھا۔ ”ارجمند“ اس نے اسے آواز دی۔ ”ارجمند ارجمند۔“ ارجمند کی نگاہ میں ایک چمک سی لرائی۔

”میں ہوں ارجمند میں اور رضا بھی آیا ہے۔“ ایلی نے رضا کی طرف اشارہ کیا۔ ارجمند نے

”جی“ وہ بولا ”بڑا مزار ہے گا وہاں۔“  
”کیا اس نہ کر۔“ رضا چلایا۔

”اوسوں“ ”دوبنا“ یہ بند نہ ہوگی۔“  
دیر تک وہ باتیں کرتے رہے۔ پھر ایلی اور رضا اٹھ بیٹھے ”اچھا اب ہم جاتے ہیں۔“  
”اوسوں۔“ ارجمند نے سر ہلایا۔  
”چچے دوکان اکیلی ہے۔“ رضا بولا۔

”ہمیں اب اجازت ہی دو۔“ ایلی نے کہا۔  
ارجمند نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ اور جب ایلی رضا مصافحہ کرنے لگے۔ ارجمند کا  
اپنے ہاتھ میں تھا تو اس کی آنکھ سے ایک آنسو ڈھلک کر رخسار پر بہ گیا۔  
”دل برانہ کرو ارجی۔“ ایلی نے کہا ”پھر ملیں گے۔“  
ارجمند کی آنکھ میں عجیب سی مایوسی تھی۔ بے بسی بھری مایوسی۔  
”اچھا خدا حافظ“ رضائے کہا۔ اور وہ دونوں چپ چاپ باہر نکل آئے۔  
شیش ٹیک وہ دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ ان کے دلوں پر بوجھ پڑا ہوا تھا۔  
ہاروں طرف اواسی چھائی ہوئی تھی۔ فضا بوجھل محسوس ہو رہی تھی۔ اور وہ رینگتا ہوا  
دیرانہ پھیل کر کیا لامتناہی ہوا جا رہا تھا۔

گاؤں کے قریب پہنچ کر وہ دونوں رک گئے۔  
”کنویں سے پانی نہ پانی لوں تمہوڑا سا۔“ رضائے کہا۔  
”ہی لو۔“ اور وہ دونوں کنویں کی طرف چل پڑے۔  
کنویں پر عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔  
”میں پانی پانا ڈرا۔“ رضائے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ پانی پی کر وہ دونوں چل پڑے۔  
کنویں پر عورتیں ان کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔  
”کون تھے یہ؟“ کوئی پوچھ رہی تھی۔

ایک مرد کہہ رہا تھا۔ ”کارخانے میں کسی کے مہماں آئے تھے۔ وہ پتلا دھلا چھوکر اشیاء  
دلا۔“

”اچھا وہ سوداگاری سا“ ایک ہنسنے لگی۔

گردن موڑنے کی کوشش کی اپنی بے بسی محسوس کر کے اس کی آنکھیں پر غم سی ہو گئیں۔  
”کوئی بات کر ان سے بیٹا۔“ اس کی ماں آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”کیا حال ہے تیرا۔“ ایلی نے چلا کر کہا۔

ارجمند نے بعد مشکل اپنا ہاتھ اٹھایا اور یوں اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو ”ٹھیک ہوں مگر۔“  
”جلد جلد صحت یاب ہوتا۔“ وہ بولا۔  
ارجمند مسکرا دیا۔

دو روز انہوں نے وہاں قیام کیا۔ پلے دن تو ارجمند ان سے کوئی بات نہ کر سکا مگر اکیلا  
اس کی طبیعت بہتر معلوم ہوتی تھی۔

”تم اچھے ہو تا۔“ ارجمند نے اشاروں کی مدد سے ایلی سے پوچھا۔

”تم اپنی بات کرو۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”مزے میں ہوں۔“ وہ بولا ”لیکن تم دیر سے آئے ہو۔ بہت دیر سے۔“ ارجمند نے رک  
رک کر کہا۔

”کیوں اب کیا ہے۔“ رضائے پوچھا۔

”اب۔ اب۔“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”اب بھی ٹھیک ہے۔ لیکن وہ تمہیں بند رہیں کن  
دکھائے گا۔ اور اور وہ۔“ رک گیا۔

”اے مسخرے یہ کیا ڈھونگ رچایا ہے تو نے۔“ رضائے شرارت سے کہا۔

”ڈھونگ رچائے بنا رہے ہیں کبھی۔“ وہ بولا ”ماں ڈھونگ بھی نہ ہو تو ہو کیا۔“

”اب جلد ٹھیک ہو جانا۔ اور علی پور آؤ۔ بیاہ ہو رہے وہاں۔“

”کپ کپ کی سناؤ۔“ ارجمند نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مری تو نہیں جاری اپنے لڑائی  
میں۔“

”تو شرارت سے کب باز آئے گا۔“ رضا چلایا۔

”اوسوں“ ارجمند بولا ”باز آنا اپن کا کام نہیں۔“

وہ دونوں ہنسنے لگے۔

”وہاں جا کر بھی یہی کام کروں گا۔“ ارجمند نے کہا۔

”کہاں جا کر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہاں ہاں وی۔“

”سنا ہے آج کل بیمار پڑا ہے۔ بڑا روگ کتے ہیں۔“

”تت تت تت تت پیارہ۔“

”ہیں۔“ ایلی بولا۔

”تو پھر۔“

”میں علی پور نہیں جاؤں گا۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”تو کہیں جاؤ گے؟“

”لاہور۔“ ایلی سوچے سمجھے بغیر بولا۔ اس چھائی ہوئی اداسی اور ویرانی نے نہ جانے ایلی پر کیا جادو کر دیا تھا۔ اس کی نگاہ میں شہزاد اور اس کی تمام ریگینیاں عبث ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے ساری دنیا کو تیاگ دیا ہو۔ اور سادھو بن کر باہر نکل آیا ہو۔

”لیکن۔“ رضا بولا۔ ”محلے میں تو اتنی شادیاں ہیں۔“

”شادیاں۔“ ایلی نے برا سامنہ بنایا ”ہونے دو۔“

”اور اور۔“ رضائے پوچھا ”اور وہ۔“

”وہ“ ایلی نے تعجب سے پوچھا ”وہ کون۔“

”کیا اسے نہ لو گے۔؟“ رضائے پوچھا۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔“ ایلی نے سمجھے بغیر آہ بھری۔

”اور تمہاری چھٹیاں۔“

”جھمی ہی چھٹی ہے اب اور کیا۔“ ایلی بولا۔

”اوہ۔“ رضا خاموش ہو گیا۔ دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔

جب گاڑی آئی تو رضائے ایک مرتبہ پھر ایلی کی منت کی۔ ”چلو اکٹھے چلتے ہیں۔“

”لوں ہوں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”تو میں اسے کیا جواب دوں گا۔“ رضائے پوچھا۔

”جو جی چاہے کہہ دیتا۔“ ایلی نے آہ بھری۔

”وہ مجھ سے ناراض ہوگی۔“

”مجھ سے کون سی خوش ہے وہ۔“ ایلی سمجھے سوچے بغیر باتیں کیے جا رہا تھا۔ اس وقت وہ بھول چکا تھا کہ رضا اس کے متعلق بات کر رہا ہے۔ جس کے متعلق وہ کسی سے بات کرنے کو تیار نہ تھا۔

لاہور پہنچ کر ایلی یوں چارپائی پر لیٹ گیا جیسے اس وسیع دنیا میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ ہو

ایلی کے روبہ و ارجمند کھڑا مسکرا رہا تھا سمجھے ہو اس کو کتے ہیں لان گوگل کی ویڈیو دیکھیں  
ہیں۔ جان جائے پر آن نہ جائے۔ اندر ہی اندر محبت کی آگ سے پھلک مریں گی۔ لیکن  
تک بات آجائے اونہوں۔ دھنیا ہے گوپیوں نے آج کرشن کتیا کی بھی لان رکھ لی۔ کیا کہہ  
کہہ کر وہ مری کارسیا بانسری بجانے لگا۔

کنویں پر کھڑی وہ ٹیار ہنس رہی تھی۔ ”تیری طرف ہی دیکھ دیکھ کر آنکھیں مٹکایا کرتا تھا  
پھریوں مری بجانے لگتا جیسے بڑا مین کار ہو پر خاک بھی نہ بچتی تھی اس سے۔“  
کا کا کاکس درخت پر بیٹھا ہوا کوا یوں بولنے لگا جیسے کسی مری کے رسیا کی نقل ادا رہا ہو۔  
دور گاؤں کی چکی ہو تک رہی تھی۔ اور کھیتوں میں کوئی ماہیا گا رہا تھا۔

”اساں کل ترو بختل تس راہ پئے تکتے نی۔“

## ان جانا تیاگ

دیر تک وہ دونوں شیش کے پنج پر اس ریختے ہوئے دیرانے میں بیٹھے گاڑی کا انتظار کرتے  
رہے۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ دو ایک بار رضائے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن  
بات اس مسلط اور محیط اداسی کے پھیلاؤ میں یوں بے کار ہو کر رہ گئی تھی جیسے ریگستان میں ہلکا  
ایک بوند گر گئی ہو۔

پھر جب گاڑی کی کھنٹی بجی تو وہ چونکے۔ ”میں نکٹ لے آؤں۔“ رضائے کہا۔

”صرف ایک لانا۔“ ایلی نے کہا۔

”ایک“ رضائے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں“ ایلی نے رضا کی طرف دیکھے بغیر کہا ”ایک۔“

”کیوں۔؟“

”بس۔“

”تم کیا بیس بیٹھے رہو گے باقی عمر“ رضائے پوچھا۔



جیسے دنیا محض ایک دیرانہ ہولق و دوق دیرانہ۔  
 نیا بورنگ خالی پڑا تھا۔ لڑکے اپنے اپنے گھر گئے ہوئے تھے۔ صرف چند ایک نوکر بکریاں  
 گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے جیسے کسی پرانے قلعے میں بھوت چل پھر رہے ہوں۔  
 چار روزہ چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑا رہا۔ اس کا ذہن ایک غلامش تبدیل ہو چکا تھا۔  
 علی پور شہزادہ تیم نیم گویا اس کی زندگی سے معدوم ہو چکے تھے۔

## کرینٹ ہوسٹل

پھر آہستہ آہستہ کرینٹ ہوسٹل میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ نئے ماحول میں کھو گیا۔  
 کرینٹ ہوسٹل ریواز سے قطعی طور پر مختلف تھا۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ  
 ہر شخص کو ایک الگ کمرہ حاصل تھا۔ جب بھی وہ چاہتا اپنے کمرے میں جا کر لوگوں کو اپنی زندگی  
 سے خارج کر سکتا تھا اور جب چاہتا کمرے سے باہر نکل کر بیٹھ کر شامل ہو سکتا تھا۔ اگرچہ بیٹھ  
 میں شامل ہونے کی خواہش اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی اس کے برعکس ریواز ہوسٹل میں  
 کمرے کے اندر اور کمرے کے باہر ہر جگہ بیٹھ کر رہتی تھی۔ اس بیٹھنے سے پتہ قطعی طور پر  
 ناممکن تھا۔ لیکن یہاں اس نے ہوسٹل میں کمرے سے باہر بھی بیٹھ نہ تھی۔ یہاں باہر بھی افراد  
 تھے ایسے افراد تھے جو اس کی طرح اذلی طور پر اکیلے تھے تنہا تھے۔

کرینٹ ہوسٹل میں پہنچ کر اس نے غالباً پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ بیشتر افراد اکیلے اور تنہا  
 ہونے کی وجہ سے لوگوں کے شور و شغب سے دور بھاگتے ہیں۔ اس احساس کو رد کرنے کے لیے  
 ہنگامہ پیدا کرتے ہیں اور بیٹھنے کی طرف بھاگتے ہیں یا بیٹھنے لگتے ہیں۔

## بھا اور جاہ

کرینٹ ہوسٹل میں جا کر اسے تسلی سی ہو گئی۔ اب وہ دوسرے طالب علموں سے اس  
 تک نہیں ڈرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ بیٹھنے لگانے والے خود احساس غمی  
 اور احساس کمتری سے عاجز آئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اب وہ فٹ ایئر کا نہیں بلکہ  
 تھرو ایئر کا طالب علم تھا۔ اگرچہ اس کے باوجود کالج کے بیشتر پروفیسر اور لڑکے اس سے قطعی طور  
 پر نا آشنا تھے۔

بہر صورت اس نے ہوسٹل میں اسے تنہائی میسر تھی اور اس لیے ہوسٹل کے لوگوں کا  
 نگاہیں اس کی آمد و رفت میں دخل انداز نہیں ہوتی تھیں اسے چھپتی نہ تھیں اس پر  
 بھائی مسکراہٹ میں تسخیر نام کو نہ تھا۔ الٹا اس میں تو بلا کا خلوص ہمدردی اور اک ان جانی  
 باہمی گرمی تھی۔ محبت تھی۔ ایسی محبت نہیں جیسی اسے شہزاد سے تھی جو جلا کر جسم کر  
 لیا۔ بلکہ ایک ایسی گرمی جس کے تحت سکون ملتا ہے۔ ٹھنڈی مٹھاس بھری مدھم گرمی۔  
 ہمدردیوں کو کڑی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ الٹا وہ تو نگاہیں جھکا لیتا تھا اور پھر بن دیکھے دوسرے کے  
 قریب کو محسوس کرتا اور مسکراتا جیسے کہ رہا ہو میں جانتا ہوں۔ میں تمہاری مشکلات کا حل ہوں۔  
 میں تمہاری آجگاہ بن سکتا ہوں۔ اگر تم چاہو۔ ورنہ کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔

بھائی کی محبت تھی کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتا تھا۔ دن میں کئی مرتبہ  
 دھونڈا کر نماز پڑھتا نظر آتا اور ہاتھ دھونا تو اس کا مسلسل شغل تھا۔ اسے ہاتھ دھوتے دیکھ

میرا بیٹا رہا لیکن کبھی کبھار اس کی حقیقی شخصیت کی مختصر سی جھلک ایک رنگین اور رنگین  
بنت بھری سکرپٹ کی صورت میں ہویدا ہوتی جیسی برکھارت میں بادلوں میں سے سورج کی  
نیش میں پھٹ نکلتی ہیں اور ایک ساعت کے لیے منظر پر رنگین دھاریاں دکھائی دیتی ہیں۔  
بنت کے اس جھجک اور ڈر کا بظاہر کوئی جواز دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن اس کی شدت سے ظاہر  
ہوا کہ یہ نفوذ کسی شدید ذہنی طوفان کے چھوڑے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کی  
نفس کا دھار ا خارجی سمت کی طرف بننے کی بجائے داخلیت کی طرف مڑ گیا تھا۔ اور اس طرح  
وہ اپنی ہی انا کا بنور بنا کر اس میں ڈبکیں کھا رہا تھا۔

کہا نہیں

خارجیت سے ہٹ کر جاہ کی توجہ کتابی دنیا کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ اور اس کتابی دنیا  
نے حقیقی دنیا کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس میں وہ جیتا تھا کتابی کرداروں سے جھجکے بغیر ملتا تھا۔  
ان سے تعلقات پیدا کرتا تھا۔ اپنے ارد گرد ان کی بھیڑ لگا کر بیٹھ رہتا تھا کرینٹ ہوٹل میں ایللی  
کے لیے بھا اور جاہ دو پناہ گاہیں تھیں۔ اس لیے روز بروز وہ ان دونوں بھائیوں کے قریب تر ہو  
گیا۔ ایک تو ان دونوں کے کیوبیکل ایللی کے کمرے کے پاس ہی واقع تھے۔ دوسرے وہ دونوں طنز  
اور تمسخر سے عاری تھے اور ان میں دوسروں کا مذاق اڑانے کی عادت نہ تھی۔ ان سی مل کر ایللی  
کا احساس کمتری ابھرنے کی بجائے دب جاتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ جاہ سے ایک بعد سا محسوس  
کرتا۔ جاہ کی بظاہر سرد مزی ایللی میں جھجک پیدا کرتی تھی۔

جب بھی ایللی جاہ کے کمرے میں جاتا تو وہ یوں سراٹھا کر اس کی طرف دیکھتا جیسے پوچھ رہا  
ہو۔ تمہارا یہاں آنے کا مطلب؟ جاہ کے ماتھے پر تیوری چڑھ جاتی۔ ایک ساعت کے لیے وہ ایللی  
کی طرف دیکھ کر گھورتا اور پھر بات کیے بغیر مطالعہ میں کھو جاتا اور ایللی جاہ کے قریب بیٹھے ہونے  
کے باوجود تیارہ جاتا۔ ابتدا میں تو ایللی جاہ کے اس رویے پر گھبرا جاتا تھا اور کچھ دیر جاہ کے کمرے  
میں بیٹھنے کے بعد چپکے سے وہاں سے کھسک آتا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ جاہ کی اس علوت سے  
دوس ہو گیا۔ مانا کہ جاہ کی بے رخی اور بے پروائی وہ بھی لیکن دوسرے لڑکوں کی طرح اس کی  
تجلیں ٹوٹتی تو نہ تھیں۔ اور جب بھی وہ جاہ کی بے حسی سے گھبرا جاتا تو آزادانہ طور پر وہاں سے  
اٹھ کر آسکتا تھا۔

کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سمجھتا ہو کہ اس کے ہاتھ کبھی صاف نہیں ہو سکتے اگرچہ وہ  
میں شیشے کی طرح صاف اور چمکدار تھے پھر نہ جانے کیوں بار بار بھائی توجہ ہاتھوں کی  
مبذول ہو جاتی اور وہ کہتا "چھاتو میں ذرا ہاتھ دھو لوں۔" ہاتھ دھونے کے بعد دیر تک ہاتھ  
صاف ستھرے ہاتھوں کو تولیے سے رگڑ رگڑ کر صاف کرتا رہتا۔

بھائی کی طبیعت میں مٹھاس کے علاوہ ایک نظم بھی تھا۔ اس کی ہر بات قاعدے کے مطابق  
ہوتی۔ ہر کام پر دو گرام کے تحت تکمیل پاتا تھا۔ نظم کے اس شدید جذبے کی وجہ سے لوگ  
ایسی کام سوچ دیا کرتے جو باقاعدگی اور سلیقے کے بغیر سرانجام نہیں دیئے جاسکتے اور دوسرے  
توجہ جاتے ہیں۔ اگر کسی کا پن خراب ہو جاتا تو وہ اسے بھلا کو دے دیتا۔ "بھائی یہ ذرا دیکھو  
قلم میں کیا گڑبڑ ہے۔" اگر کسی کی گھڑی صحیح وقت نہ دیتی ہو تو وہ بھی بھلا کو سوچ دی جاتی۔  
ایسی چیز بھلا کو دیتے ہوئے تاکید توجہ یا احتیاط سے متعلق ہدایات دینا بالکل عادت تھا۔  
دکھانا ہی کافی تھا۔ "بھائی ذرا دیکھنا۔" اور پھر بھائی تمام تر توجہ اس پر مرکوز ہو جاتی اس حد تک  
وہ ہر وقت اسے اٹھائے پھرتا اور راہ چلتے یا فرصت کے وقت بیٹھے ہوئے اسے ٹھیک کرتے  
شدت سے مصروف رہتا اور جب وہ بالکل ٹھیک ہو جاتی تو دہشتا "اس چیز سے بھائی دلچسپی لہو  
جاتی۔

بھلا کو ٹوٹی ہوئی یا بگڑی ہوئی چیزوں کو بنانے سنوارنے سے دلچسپی تھی۔ لیکن ایسے محلوں  
ہوتا تھا جیسے وہ خود ایک ٹوٹی ہوئی چیز ہو۔ لیکن اپنے آپ کو بنانے سنوارنے کی اس نے  
کوشش نہ کی تھی۔ اسے بننے سنوارنے سے قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی۔ اسے دیکھ کر محلوں  
ہوتا تھا جیسے مٹی کا دیا ہو جو مدھم لوجھل رہا ہو۔ بھانے کبھی بھڑک کر جلنے کی کوشش نہ کی تھی۔  
اس کی شخصیت اس فرد کی چمک سے عاری تھی جو کالج کے لڑکے اپنی طرف توجہ منصف کرنے  
کے لیے پیدا کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

ویسے بھڑک کر جلنے کی خواہش جاہ میں بھی نہ تھی بنیادی طور پر وہ بھی جھوڑے یا  
چراغ تھا۔ لیکن اس کے انداز میں ایک عجیب سی جھجک تھی۔ وہ ہر نووارد کی آمد پر ہنسنے کو  
رہ جاتا۔ پیشانی پر تیوری چڑھ جاتی ہونٹوں پر تحقیر کی ہلکی سی لرزش پیدا ہوتی۔ اور پھر وہ گوارا  
کے کپڑے کی طرح اپنے کونے میں گھس جاتا۔ لیکن اس عمل کی وجہ سے اسے کونے میں  
رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔ اور بسا اوقات وہ تنہائی میں بھی بے حسی اور بے پرواہی سے

رتکین بھنور

علی پور سے آنے کے بعد ایک ہی بار ایلی کے دل میں ایک عجیب سی خواہش ابھر آئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ شنراؤ کے خیال کے بھنور سے نکل جائے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ شنراؤ کا سحر اس حد تک مسلط اور محیط ہو چکا ہے کہ اس سے بچاؤ ممکن نہیں لیکن شنراؤ کی بے پروائی کی وجہ سے اس کے دل میں ایک کرب پیدا ہوتا تھا ایک ایسا کرب جو اس کی روح کو یوں بلوتا جیسے وہی کا ایک برتن ہو بسا اوقات سوتے وقت جب اسے شنراؤ کا خیال آتا تو اس کے ذہن میں شنراؤ کا ہرے ہوئے تاروں سے بھرا ہوا نقاب آ جاتا اور وہ ان ابھرے ہوئے تاروں کو گنتا۔ اس وقت ایک گوشت کا لوتھرا غفور کی شکل اختیار کر لیتا۔ ”ہی ہی ہی ہی“ وہ قہقہہ مار کر ہنستا ہنستے ہنستے اس کا منہ بات کا رنگ اختیار کر لیتا۔ بازو اور ٹانگیں کٹ جاتیں اور وہ چلاتا۔ ”ایلی تم ایلی۔“ ایلی کی نگاہ تلے اس وقت وہ اندھیری بند بینٹک ابھر آتی بینٹک کے وسط میں آب زم زم کی ایک جھیل ابھرتی اور جھیل میں سے شنراؤ سر نکل کر کھتی ایلی تم۔ اس وقت شنراؤ کے انداز میں طنزیہ تسخیر کا ایک طوفان کھولتا اور ایلی کو اپنی پلیٹ میں لے لیتا۔ پھر گوشت کا ٹنڈ منڈ لو تھرا قہقہہ لگاتا ”تم۔“

اس وقت مختلف شکلیں ایلی کے روبرو آ کر ناچتیں گاتیں بھیڑیے کی کھال اتر جاتی اور اندر سے علی احمد ہنستے شنراؤ یہ تم کیا بچوں کو اکٹھا کر کے بیٹھ رہتی ہو کبھی ہمارے ہاں بھی آؤ نا کیا کھتی ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔“

غیر کا پردہ اٹھا اور صند ایک ڈرامائی انداز سے داخل ہو کر کہتا۔ ”ایلی ایلی میری طرف دیکھو ایلی میں بیٹھ رہتا ہوں اس رتکین چوہارے کے نیچے میں یہاں دلیپز پر پڑا ہوں کبھی مجھے مل گیا کرو۔ کبھی مجھے بھی مل لیا کرو کبھی مجھے بھی کبھی۔“ پھر وہ گانے لگتا۔ ”اے دلبر ہوں میں فدا۔“ گاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں گلابی پھوار پڑنے لگی پیشانی پر دیا روشن ہوا۔

پھر شنراؤ اٹھ بیٹھتی اور ٹریک کھول کر سفید پھول دار دوپٹہ لے کر کہتی۔ ”ہاں ہاں مجھے جانا ہے مجھے جانا ہی ہو گا۔ میں جاؤں گی۔ میں جا رہی ہوں۔“ اور گوشت کا لوتھرا قہقہے لگاتا۔ ایکٹر مگر آنا اور علی احمد ہنستے ”ہی ہی ہی ہی۔“ اور ایلی کو محسوس ہوتا جیسے وہ سب اس پر ہنس رہے

جاہ نے کبھی اس سے نہ پوچھا تھا کہ تم جا رہے ہو یا تم کیوں یا کہاں جا رہے ہو۔ باہر برآمدے میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے بغیر بھاگتا۔ ”ایلی۔ آؤ یا میں تو اس کے چکر میں پڑا ہوں نہ جانے کیا خرابی ہے۔ یہ ٹھیک وقت نہیں دیتی۔ وہ سعید ہے ابھو چوہدری کرم دین کا بیٹا اس کی ہے یہ گھڑی۔ کیا وقت ہو گا بھی اودہ یہ تو چار بج گئے۔ ابھو وضو کر لوں“ جاہ ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھتا اس کی نگاہ میں چمکوک اور اعتراض نمایاں ہوتا تھا پھر بات کیے بغیر مطالعہ میں کھو جاتا حتیٰ کہ اسے احساس ہی نہ رہتا کہ کوئی شخص کمرے میں بیٹھ رہا ہے۔

جاہ کا کمرہ کتابوں اور رسائل اور تصاویر سے بھرا رہتا تھا۔ ہر ماہ کتابوں اور رسائل کا ایک پتہ لکھا آ جاتا۔ اور جاہ ان کے مطالعہ میں کھو جاتا۔ صبح سے شام تک جاہ کو ان کتب اور رسائل کے علاوہ اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی پڑھتے پڑھتے وہ آپ ہی آپ ہنسنے لگتا۔ ”خوب خوب“ وہ اپنے آپ سے کہتا۔ ”یہ شخص بھی عجیب مسخرا ہے ہی ہی ہی ہی۔“

ایلی ہنسنے لگتا۔ کون مسخرو ہے ایلی کی موجودگی کو محسوس کر کے دفعتاً ”جاہ کا انداز بدل جانا کون مسخرو ہے جاہ دہراتا“ ہوں ہوں“ اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ پھر سے کتب میں کھو جاتا اور پھر کچھ دیر کے بعد آپ ہنسنے لگتا۔ ”جروم کے جروم بھی عجیب ہے عجیب ہے عجیب ہے انگلیاں چٹختے ہوئے جاہ مدھم آواز میں بولے جاتا اور پھر سے بھول جاتا کہ اس کے کمرے میں کتابوں کے شلت کے قریب کوئی بیٹھا ہے ایلی وہاں بیٹھ کر کوئی کتاب یا رسالہ کھول کر تصویریں دیکھنا شروع کر دیتا تھا۔ اور چپ چاپ ورق گردانی میں مصروف رہتا۔

اس سے پہلے ایلی کو یہ احساس نہ تھا کہ کتاب کو کالج یا امتحان کے نقطہ نظر سے ہٹ کر نگاہ پڑھا جا سکتا ہے جاہ سے مل کر اسے پہلی مرتبہ کتاب کا احساس ہوا۔ پہلی مرتبہ اسے کتب کا ورق گردانی کا موقع ملا لیکن اس کے باوجود کتاب کے نفس مضمون کی اہمیت کا اسے احساس نہ تھا۔

پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ جاہ اپنے کمرے میں ایلی کی موجودگی کے احساس سے ہلنا ہوتا گیا لیکن اس کے باوجود طنز بھری نگاہوں کی توں قائم رہی اس کی بے اعتنائی کچھ بڑھ گئی لیکن اس کے ساتھ آشنائی اور مسرت کے ان لمحات کی تعداد بھی بڑھ گئی جب وہ اپنے کمرے سے باہر نکلتا تھا۔

یوں سکتا جاوے پھر کا بنا ہو۔ اور ایلی حیرت سے اس کی طرف دیکھتا دیکھے جاتا جاہ کی بات سن کر ایلی کو دفعتاً یہ احساس ہوتا جیسے کوئی کنویں کا مینڈک پھدک کر سمندر میں جاگرا ہو۔ جاہ کی میس فیئر رسل وٹز فرائیڈ شا اور برگسٹن کی دنیا عجیب دنیا تھی اور ایلی کے لیے یہ دنیا کے مرکز کے گرد گھومتی تھی۔

پہلے مرے دوستوں نے کہا کہ میں نے تمہیں اس بارے میں بتا دیا ہے۔  
 پھر جب ایللی واپس اپنے کمرے میں پہنچتا تو جھن سے شنزاد آسن جہاں سامنے آکھڑی ہوتی۔  
 "کس بات پر بگڑے ہو مہاراج وہ پوچھتی۔ کب تک غیر حاضر رہو گے۔ کب تک پناہ گاہوں میں  
 چپے رہو گے کب تک مانوڑا میں کھوئے رہو گے میری طرف دیکھو مانوڑا میں ہوں میں۔"  
 اس کے چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ جھلکتی "دیکھو نا۔ یلدرم نے میرے بارے میں لکھا ہے  
 ماتھے پر ہندی آنکھ میں جادو" اس وقت شنزاد کے ماتھے کا تل تک سے یوں روشن ہو جاتا جیسے بجلی  
 کا ہنڈا ہو۔ اور آنکھیں ناچتیں اور رسل و لڑشا اور فیس فیلڈ ازروئے اوب ایک طرف قطار لگا  
 کر کھڑے ہو جاتے اور پھر چپکے سے ایک ایک کر کے کمرے سے باہر نکل جاتے اور شنزاد وہاں  
 اکیلی رہ جاتی اور اس نئی شخصیت دو حصوں میں بٹ جاتی۔ ایک طرف میڈونا کا جمال اس کے گرد  
 ہلہ بٹا دیتا اور دوسری جانب ڈانسا کا خیال۔ اس میں وقار بھر دیتا۔ اور ایللی محسوس کرتا جیسے وہ سگ  
 لیلی ہو اور وہ دم ہلاتا ہوا ڈانسا کے قدوں میں جا بیٹھتا۔

## رازی اور زو

ایک روز جاہ کے کمرے میں کیوپڈ اور سائیکل۔ بولا کنڈ آؤٹ، ریش ڈی مائیلو کی تصاویر دیکھنے کے بعد جب ایلی اپنے کمرے میں پہنچا اور لحاف لے کر لیٹا اور حسب معمول چھن سے ٹنڈل روہو آکھڑی ہوئی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ارے کیا شہزاد کے ناچ میں آواز پیدا ہو گئی۔ وہ اٹھ کر نکلے گا۔ چھن چھن گھٹکھرو کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ کوئی واقعی ناچ رہا تھا۔ ایلی ڈر گیا۔ کیا اس کے حواس اس حد تک مفلوج ہو چکے تھے۔ اس کے تخیل کے ساتھ آواز کا عنصر کیسے شامل ہو گیا تھا۔ یا وہ ناچ کسی منکھ فلم کا ایک ٹکڑا تھا۔

اس زمانے میں محرک تصاویر نے ایک ناباروپ بدلا تھا۔ انہی دنوں چند ایک ایسی نئی تصاویر کی فائٹس ہو رہی تھیں جو پرانی تصاویر کی سیریل قسم کی نہ تھیں بلکہ کہانی ایک ہی نشست میں ختم ہو جاتی تھیں۔ یہ ایک انوکھی بات تھی کیونکہ اس سے پہلے فلمی کہانیاں اتنی لمبی ہوتی تھیں کہ

ہوں اور شہزاد در پردہ ان کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ ساری رات ایللی کروٹیں بدلتا آئیں مگر نہ شدت سی کوشش کرنا کہ ان خیالات کو اپنے دامن سے جھٹک دے لیکن ان خیالات سے چھٹی پاتا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس روحانی کرب کی وجہ سے وہ چاہتا تھا کہ شہزاد کی گرفت سے نکل جائے لیکن اس کے ساتھ ہی شہزاد کے تصور کی رہنمائی شہزاد کی جائزت اور شہزاد کی توجہ عظمت بے پناہ کیف کے حامل تھے۔

صبح کے وقت شناراد کے سحر سے بچنے کے لیے وہ جاہ کے کمرے میں جا پناہ لیتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس نے جاہ کی سرد مہری اور بے رخی کو گوارا کر لیا تھا۔ جاہ کی شکوک بھری نگاہوں سے بچنے کے لیے اس نے ان رسائل اخبارات اور کتابوں کی ورق گردانی شروع کر دی تھی جن کا جلد کے کمرے میں ڈھیر لگا رہتا تھا۔ ایلچی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا تھا کہ مطالعہ امتحان کے خیال سے یہ کام کر بھی ممکن ہے پہلے پہل اس کی توجہ تصاویر کی طرف مبذول ہوئی تھی اور تصاویر کا تفصیل مفہوم سمجھنے کے لیے اس نے ان کے نیچے لکھے اشارات پڑھنے شروع کر دیے تھے پھر آہستہ آہستہ اس کی توجہ رسائل کے مضامین کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔

ایلی کو کتابوں اور رسالوں کی طرف متوجہ دیکھ کر جاہ کی سرد مہری تسخیر میں بدل گئی۔ "تم یہ رسالہ پڑھ رہے ہو کیا۔" اونہوں کتاب کو یوں نہ موڑو۔ پہلے کتاب پڑھنے کا سلیقہ سیکھو پہل اور جریہ یہ دنیا کے عظیم نقوش کا مجموعہ ہے اسے دیکھ کر تم کیا سمجھو گے۔"

لیکن ایلی کے لیے جاہ کی باتیں ہاتھی دانت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اگرچہ وہ باتیں طاقتور لیکن تلخ تر حقائق کی یاد ایلی کے دل سے محو کرنے کا ذریعہ تھیں۔

پھر آہستہ آہستہ ایللی کی ہٹ دھری کی وجہ سے ان کے قرب کے لمحات بڑھتے گئے۔ کلب کے مطالعہ سے تھک کر دفعتاً ”جاہ ایللی کی طرف دیکھتا ہے۔“ ”تو تم برٹنڈرسل کا مضمون پڑھ رہے ہو۔ اچھی چیز ہے۔“ بڑی دیر کے بعد رسل نے اپنے انداز کی چیز لکھی ہے۔ مطلوبات ایک پٹارہ ہے یہ شخص حد ہو گئی۔“ ”یہ کہہ کر وہ رسل کے متعلق ایک لمبی چوڑی تقریر جھارنا جسے ایللی حیرت سے سنتا۔ وہ اس وقت یوں منہ کھولے بیٹھا ہوتا کہ دفعتاً ”جاہ رک جانے“ ”وہ؟“ ”وہ انگلیاں جھکاتے ہوئے چلاتا اور پھر وہ گویا اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ”میاں تم کوئی سیدھی چیز شروع کرو کوئی داستان کوئی کہانی اور وہ بھی مینس فیلڈ کی نہیں اور اشاروں میں بات سمجھاتی ہے پلو مار کے دیا بھجاتی ہے۔ کیا چیز لکھتی ہے۔ واہ واہ واہ پلو مار“

مقرر۔ وہ اٹھ بیٹھا اپنے کیوبیکل کا دروازہ کھولا۔ باہر ہوٹل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی جہاں بھی ہوئی تھیں۔ لیکن تھکھروؤں کی آواز وضاحت سے سنائی دے رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی سربراہ مگر دم ساز بج رہا تھا۔ دیر تک وہ کھڑا اس آواز کو سنتا رہا اور پھر اس کے کھوج میں نکلا۔

آواز کو نے کے کمرے سے آرہی تھی۔ وہ کو نے کے کمرے کے قریب جا کھڑا ہوا اور باہر کمرہ ساز سنتا رہا۔ اس کا جی تو چاہتا تھا کہ دروازے کے شیشے سے جھانک کر اندر دیکھے یا دروازہ کھٹکا کر اندر داخل ہو جائے مگر اس میں ہمت نہ پڑی۔ اس لیے وہ وہیں بت بنا کھڑا رہا۔ وہ ساز کس قدر سربراہ تھا اور دھن کس قدر جاذب پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ تھکھرو۔

دفتر "کمرے کا دروازہ کھلا کوئی شخص باہر نکلا۔

"کون ہو تم۔" وہ بولا۔

"میں میں۔" ایلی گھبرا گیا۔ "میرا نام الیاں ہے۔"

"اوہ" نودارو نے ماچس چلائی۔

روشنی میں ایلی نے اس کا چہرہ دیکھا اور سم گیا۔ اس کا چہرہ کچھ ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا جیسے جیٹی ہو۔

"میں کے ہونا ہوٹل کے۔"

"جی ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنس۔ "تو بھی پھر اندر کیوں نہیں آجاتے۔ چلو۔" وہ ایلی کو گھورنے لگا۔ اس کا تھکھروؤں کی آواز اور تھکھرو بجا بند ہو گئے۔ "کون ہے بھی ذو۔" اندر سے آواز سنائی دی۔ ذو نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

"لڑکا ہے بورڈنگ کال۔" وہ بولا "باہر کھڑا سن رہا ہے۔"

"کون ہے۔" پھر آواز آئی۔

ایلی مجرموں کی طرح کمرے میں جھانکنے لگا۔

"جی میں ہوں الیاں۔" وہ بولا۔

"تمہیں دیکھا نہیں کبھی میاں۔" اس نے پوچھا۔

"جی میرا نمبر سترہ ہے۔"

ایک کہانی کئی ایک نشستوں میں ختم ہو جاتی تھی۔ یہ ایک انوکھی بات تھی کیونکہ اس سے پہلے فلمی کہانیاں اتنی لمبی ہوتی تھیں کہ ایک کہانی کئی ایک نشستوں میں ختم ہوتی تھی۔ ایک نشست میں کہانی کے صرف تین اسی سوڈ دکھائے جاتے تھے اور ہر کہانی عموماً "پندرہ یا بیس اسی سوڈ" مشتمل ہوتی تھی۔ ایک نشست میں کہانی ختم کرنے کی یہ نئی تحریک فلم دیکھنے والوں کے لیے ایک انوکھی بات تھی۔ اور فلم سازوں نے صرف اسی بات پہ اکتفا نہیں کیا تھا۔ انہوں نے فلم مختصر فلمی کہانیوں کے ساتھ ایسے ریکارڈ بھیجنے شروع کر دیے تھے جو کہانی کے مناسب مقلات پر مناسب صوتی اثرات پیدا کرتے تھے۔ مثلاً بن حور فلم میں بحری لڑائیوں کے مناظر کے ساتھ ساتھ توپوں اور طبل جنگ کی آوازیں اور پس منظر کی موسیقی یہ صوتی کلیاں فلم دیکھنے والوں کے لیے عجیب تھیں۔ انہی دنوں میں جاہ کے ساتھ ایلی نے دو ایک ایسے فلم دیکھے تھے۔ فلم دیکھنے میں جاہ کو بھی دلچسپی تھی لیکن جاہ چونکہ تمام زائد روپوں کی کتابیں اور رسائل خرید کر لیتا تھا اس لیے روز فلم چل رہا ہے اور میرے پاس صرف آٹھ آنے ہیں۔ وہ آٹھ آنے میرے اٹاکر کہتا "اگر دیکھنا ہو تو چلو میرے ساتھ۔"

اور وہ دونوں چپکے سے پلس سینما کی طرف چل پڑتے جو میکلوڈ روڈ کے کو نے پر بنایا تھا۔ اکثر وہ دونوں بہت لیت بیٹھتے جب کہ چار آنے والے درجے کی تمام تریٹیں بھر جاتی ہوتیں۔ اور وہ حسب معمول اندھیرے میں چلتے چلتے ہال کی دوسری دیوار کے قریب پہنچ کر بند دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا تھا کہ وہ حسب معمول سینما میں لیت پہنچتے تھے اور حسب معمول سیڑھیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ اور انٹروں میں جب بقیں جلی تھیں تو ایلی نے دیکھا کہ چار آنے کے درجے کی تمام سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ اور ہال میں گنڈیریاں بیچنے والے انہیں سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے "ارے" ایلی چلا تا۔ "جاہ سیٹیں تو تمام کی تمام خالی پڑی ہیں۔" "اچھا۔" جاہ اپنی بے اعتنائی سے کہتا تھا۔ اور پھر اپنے خیال میں کھوجا تھا۔ جیسے سیٹوں کا خالی ہونا اور ان کا سیڑھیوں پر بیٹھنا کوئی قاتل توجہ یا غور طلب امر نہ ہو۔

"تو چلو وہاں چل بیٹھیں۔" ایلی نے کہا تھا اور اس نے منہ بنا کر شائے جھک دیے تھے اور جوں کا توں بیٹھا رہا تھا۔

ہال تو اس روز اپنے کمرے میں تھکھروؤں کی آواز سن کر ایلی چونک پڑا اس نے محسوس کیا جیسے فلم کی طرح اس کے تخیل کے ساتھ بھی کوئی ایسا ریکارڈ چل رہا تھا۔ لیکن بورڈنگ میں

جی کے اور ایم کے

اگرچہ اسے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ایک پتلا دیوار کا مطالعہ میں مصروف تھا۔ ”جی جی کے

بڑا۔ دھانگی گھٹا، دھانگی گھٹا دھانگی گھٹا دھانگی گھٹا۔



”جی کے چلایا۔“ اپنے آپ ہی کھیل رہے ہو۔“  
 ”جیسے اعتراض ہے کیا۔“ وہ چمک کر بولا۔  
 ”ہم نے تو سنا تھا میاں۔“ جاہ نے کہا ”کہ یہ کھیل دو کے بغیر نہیں کھیلا جاتا۔“  
 ”جی کے چلایا۔“ لڑکا بولا۔

یہ میرا دوست ایم کے ہے۔“ جی کے نے ایللی سے کہا ”بڑے معر کے کا آدمی ہے۔“ دو کا  
 کھیل اکیلا کھیلتا ہے۔ اکیلے کے کھیل کے لیے ساتھی ڈھونڈتا ہے۔“ جی کے ہنسنے لگا۔  
 ایللی نے ایم کے کی طرف دیکھا وہ ایک اونچا لمبا دھلا پتلا نوجوان تھا اس کے ہونٹوں پر ایک  
 مہربان گویا جھٹ ہو چکی تھی اور اس کی آنکھیں شرارت سے ابل رہی تھیں۔ ”جو بھی آتا  
 ہے اپنی بے عزتی کرتا ہے۔“ ایم کے نے قہقہہ لگایا۔  
 ”جیسے کیا خطرہ“ جی کے نے اپنی ناک کو گھورتے ہوئے کہا ”تمہاری بے عزتی کیسے ہو  
 گی ہے کوئی عزت ہو تو بے عزتی کا امکان ہوتا۔ لگاؤ یا اس سے کوئی بازی“ جی کے نے ایللی اور  
 ہائے مخاطب ہو کر کہا۔

”کونوں“ جاہ نے انگلیاں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”اپنے بس کا روگ نہیں۔ اس کھیل  
 کے لیے وقت کمال سے آئے قانونی طور پر جوانوں کو یہ کھیل کھیلنے کی اجازت نہیں ہونی  
 چاہیے۔ بڑھوں کا کھیل ہے۔ جب انسان کو کوئی کام نہ ہو تب۔“  
 ”تو تم کمال کے جوان ہو۔“ ایم کے نے جاہ سے کہا۔

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ جاہ بولا ”جوان تو نہیں لیکن ابھی بوڑھا نہیں ہوا۔“ تم خود کیوں نہیں  
 کھیلے اس کے ساتھ۔“ اس نے جی کے سے پوچھا۔  
 ”کونوں۔“ وہ بولا ”مجھ سے تو روز پٹتا ہے۔“  
 ایم کے نے قہقہہ لگایا اور سر کھانے لگا ”بات تو ٹھیک ہے۔“

نصہ کریں

جی کے اور ایم کے سے ملاقات کے بعد ایللی کے مشاغل بڑھ گئے جاہ کی سرد مہری سے آگتا  
 کہ بڑھاپے کا ٹھنڈا ہل چلا جاتا جس میں وہ دونوں رہتے تھے۔ یا تو ایللی جی کے کے ساتھ بیٹھ کر تصاویر  
 کے لیے فریم بناتا رہتا اور یا ایم کے کے ساتھ شطرنج کی بازی لگا لیتا۔ اسے ایم کے سے بے حد

ہے۔“ جاہ نے کہا ”اور یہ ہمارے دوست الیاس صاحب ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ الیاس صاحب  
 موجودگی کو قطعی طور پر بھول گیا۔ ”ہم اس لیے آئے ہیں۔“ جاہ بات کرتے ہوئے رک گیا  
 ”دراصل میں سوچ رہا تھا کہ جو رڈ گریٹ پیٹنگنز جریدے کی صورت میں آ رہی ہیں ان کی  
 نے تو دیکھی ہی نہیں وہ۔“  
 ”نہیں تو۔“ جی کے نے جواب دیا۔

”میں سوچ رہا تھا اگر ہم انہیں فریم کر لیں تو کیسا رہے۔ بازار سے تو بات نہ بنے گی۔“  
 ”کیوں نہ فریم بنائیں۔“  
 ”ٹھہرو۔“ جی کے نے گویا اپنی تمام تر توجہ ناک پر مرکوز کر دی۔ اس کی ناک لمبی اور چوڑی  
 دار تھی۔ انداز میں ہلا کی پھرتی تھی اور ذہانت میں تیزی تھی۔

جی کے قاعدے اور اصول کا آدمی تھا۔ وہ قاعدوں اور اصول میں سوچتا تھا۔ خشک اور کڑوا  
 دلیلیں دینے کا عادی تھا۔ دوسروں کو خشک اصولوں پر پرکھنے کا متوالہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں  
 بنیادی طور پر حزن و ملال کی گہرائی جھلکتی تھی۔ چہرے سے غم خوری چپکتی تھی لیکن وہ اپنے آپ  
 پر خوشی اور انبساط کے شدید لمحات طاری کر سکتا تھا۔ اور اپنی بے پناہ ذہانت کے بل بوتے پر  
 نہایت چمکیلی اور جاذب توجہ باتیں کرنے کا اہل تھا۔

”ٹھہرو۔“ کہہ کر جی کے یوں سوچ میں پڑ گیا جیسے کوئی بیوپاری لین دین کے حساب میں کو  
 گیا ہو۔ دیر تک اپنی ناک کو گھورتا اور چہرہ سر اٹھا کر کہنے لگا۔ ”ہاں چلے گا ضرور چلے گا۔“  
 تیل کے بغیر ادا ہوتا ہے گی۔“

”اچھا“ جاہ نے بچوں کی طرح تلی بھائی ”کیسے۔“  
 ”سانچہ ہم خود بنالیں گے۔“ وہ بولا۔ ”آری مل جائے گی۔ بس فریم کی لکڑی پسند  
 کھیل خریدنے پڑیں گے۔“

”اگر کچھ خریدے بغیر فریم بنا سکیں ہم تو بہتر نہ ہو گا۔“ جاہ نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش  
 کی۔ جی کے کی ناک اور بھی لمبی ہو گئیں۔

”چلو یہ دھندا ابھی طے ہو جائے۔ جاہ اٹھ بیٹھا اور وہ تینوں انارکلی کی طرف چل پڑے  
 جب وہ واپس آئے تو جی کے کے کمرے سے باہر آمدے میں ایک لڑکا بیٹھتا تھا شطرنج کھیلتا  
 رہا تھا۔



دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس میں زندگی تھی جو دلولہ تھا جاہ کی طرح اس کی زندگی اصولوں کا علم رکھتی تھی۔

اس کے بعد کئی ایک دن وہ سب تصاویر فریم کرنے میں شدت سے مصروف رہیں۔ لکڑی کاٹنے اور اسے کیلوں سے جوڑنے کا کام جی کے کے سپرد تھا۔ جی کے وزیر آباد کے ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو ٹیکنیکل کام کے لیے فرہم صلاحیت رکھتا تھا۔

تصویر کی پینٹش کرنے کے بعد جی کے فریم کی لکڑی سانچے میں رکھ کر آدمی سے لے کر اور پھر ان لکڑیوں کے سرے جوڑ کر ان میں کیل ٹھونک کر فریم تیار کرتا۔ جاہ اس دوران میں اس خصوصی تصویر اور تصویر کار کے متعلق معلومات بہم پہنچاتا اور تصویر کے خصوصی پہلوؤں روشنی ڈالتا۔ ایلی مناسب ساز کے مطابق گتہ کاٹتا ایم کے ہتھوڑی اور کیل اٹھائے رکھتا۔ مناسب وقت پر جی کے کو بہم پہنچا سکے۔ اس کے علاوہ سرکس کے مسخرے کی طرح ہر سیدھی حرکات سے ان کا دل بہلاتا رہتا۔

تصاویر فریم کرتے ہوئے ان میں سے کسی ایک کو خیال نہ آیا کہ ان میں بیشتر تصاویر تھیں اور انہیں ہوشل کے کمرے میں آویزاں کرنا قابل اعتراض سمجھا جاسکتا تھا۔ جاہ کے لیکچر سننے کے بعد ان سب کی توجہ اس حد تک تصاویر کے معانی پر مرکوز ہو چکی تھی کہ انہیں خیال بھی نہ آیا کہ بیشتر نقوش ملبوسات سے معرا تھے حتیٰ کہ بھاجب نماز پڑھنے کے بعد نماز بنانے کے کام کی رفتار کا جائزہ لینے کے لیے فریم شدہ تصاویر کی طرف دیکھتا تو اسے بھی غلط پڑھنے کا خیال نہ آتا۔

پھر جب انہوں نے اپنے اپنے کمرے میں وہ تصاویر آویزاں کر دیں اور ہوشل کے کمرے نے انہیں دیکھا اور ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ شدت سے جسم سمجھانے لگے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ تصاویر برہنہ تھیں۔ اس نے جاہ سے بات کی ”جاہ یہ تصاویر تو“

”ہوں۔“ جاہ نے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے۔“ ایلی گھبرا کر بولا ”یعنی۔۔۔“

”ہوں۔“ جاہ نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ تصاویر تو برہنہ ہیں۔“ ایلی نے بعد مشکل جملہ مکمل کیا۔

”تصاویر۔۔۔“ اس نے کمرے میں ٹنگی ہوئی تصاویر کا جائزہ لیا۔ پھر اس کی نگاہ میں

”خیر جملہ“ برہنہ“ اس نے حقارت بھری نگاہ ایلی پر ڈالی۔ جیسے اس کی نگاہ میں کمرے کی جملہ

”خیر جملہ“ صرف ایلی کا وجود عریانی اور برہنگی کا منظر ہو۔ تسخیر اور نفرت کے اس اظہار پر ایلی

”ہاں۔۔۔“ ایلی نے ہلکا سے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ برآمدے میں بھاؤ صو کر رہا تھا۔ ایلی

کافی چاہتا تھا کہ بھاؤ کے گلے لگ کر رو پڑے۔ لیکن بھاؤ اپنی ہی دھن میں مگن تھا۔

”جاہ“ وہ بولا ”یہ تصویریں جو ہم نے کمروں میں آویزاں کی ہیں۔“

”ہاں ہاں۔“ بھاؤ پاؤں دھوتے ہوئے بولا۔

”وہ عریانی ہیں۔ میرا مطلب ہیں برہنہ ہیں۔“

”بھاجب میں پڑ گیا۔“ ہاں ہاں“ وہ بولا ”مجھے بھی کئی بار شک سا پڑا ہے۔“

”وہ انہیں دیکھ کر کھاتے ہیں۔“ ایلی بولا ”اور پھر کمرے سے باہر نکل کر چنگھاڑتے ہیں۔“

”لگتے ہیں۔ اور ان کی آنکھیں۔“

”ہاں ہاں۔“ بھاؤ بولا۔ ”مجھے اب خیال آتا ہے کہ۔“

”اور وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔ میاں میاں۔“

”میاں میاں سن کر بھاؤ اچھل کر کھڑا ہو گیا“ ہاں۔“ وہ بولا ”میاں میاں مجھے خیال ہی نہیں

آتا۔“

”لیکن میاں میاں کا مطلب کیا ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”میاں میاں کا مطلب“ بھاؤ نے تعجب سے ایلی کی طرف دیکھا۔

میاں۔ میاں

میاں میاں در حقیقت کالج میں فارسی پڑھانے والے مولانا کا تکیہ کلام تھا۔ مولانا کا نام محمد

محمدؒ وہ کالج میں فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ کالج میں وہ اپنی چار ایک نمایاں خصوصیات کی وجہ

سے مشہور تھے۔

ان کا سلیقہ ایک ایسے وسیع ہال کی مانند تھا جہاں ہلکی سے ہلکی آواز گونج کر پھر گونجتی۔

اس لیے ان کی معمولی سے معمولی بات بھی یوں سنائی دیتی تھی جیسے کوئی مجاہد حملہ کرنے

مناہک مروٹی ابھرتی۔ ”میاں میاں۔“ اور ہر کمرے میں دہرائی جاتی تھی کہ ساری بلڈنگ میں میاں میاں سے گونجنے لگیں۔

مولا نان میں صرف ایک بار مین بلڈنگ میں آتے تھے۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر بلڈنگ کے قریب وہ حاضری کارجر بنڈل میں دیا کر مین بلڈنگ میں داخل ہو جاتے۔ اور بلڈنگ کے قریب سے گزرتے اور بند کمرے پر دستک دے کر کہتے ”میاں میاں۔“ جس پر لڑکے بھی سر کہہ دیتے اور مولا نا حاضری لگا کر دوسرے کمرے کی طرف چل پڑتے۔

### اول ولا قوتہ

حاضری کے وقت کرینٹ ہوٹل میں خاصہ ہنگامہ رہتا تھا چونکہ کئی ایک حاضر لڑکوں کو کئی بار غیر حاضر لڑکوں کی حاضریاں لگوانی ہوتی تھیں۔ مثلاً ”کمرہ نمبر ایک کا لڑکا پہلے اپنی حاضری لگوانا پھر باری باری کمرہ نمبر ۲۲ اور ۵۶ میں داخل ہو کر لیس سرپول کر اپنے دوستوں کی حاضری لگواتا۔ لڑکا چاہے موجود نہ ہو لیکن کمرہ ضرور اندر سے بند ہو۔ کمرے میں جی جلائے رکھا ضروری ہوتا۔ اور اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ باہر تالہ نہ پڑا ہو۔ جب مولا نا سولہ نمبر پر دستک دیتے تو سولہ نمبر کا لڑکا اندر سے لیس سر کہہ دیتا اور جب وہ سترہ نمبر پر دستک دیتے تو سولہ نمبر پر دستک لیس سر چلا کر سترہ نمبر والے کی حاضری لگوا دیتا۔

ایک روز وہی ہوا جس کا اہلی کو ڈر تھا جس وقت مولا نا نے حاضری کے وقت جاہ کے اندر سے دستک دے کر میاں میاں کہا اس وقت جاہ نہ جانے داستو دسکی یا ٹامس مین کے نام میں اس حد تک مصروف تھا کہ یاں میاں کے جواب میں لیس سر کہنے کے بجائے بے نتیجہ میں اس نے کہا ”کم آن۔“

دستور کے مطابق مولا نا کو چاہئے تھا کہ آواز سن کر رجسٹر میں حاضری لگائیں اور اگلے کمرے کی طرف چل پڑیں۔ چونکہ دستور کے مطابق اہم بات یہ تھی کہ اندر سے آواز آجائے۔ لیس سر کہنا یا گولوسے کو کوئی فرق نہیں پڑتا چاہئے تھا لیکن جاہ کے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر نہ جانے مولا نا کو کیا ہوا۔ وہ یہ بھول گئے کہ وہ حاضری کے لے راؤنڈ کر رہے ہیں ممکن ہے کہ انگریزی لب و لہجہ کو بھی اس سے تعلق ہوتا۔ بہر حال مولا نا سمجھ بیٹھے کہ وہ پرنسپل کے کمرے کے باہر کھڑے ہیں۔ لہذا جاہ کے کم ان پر وہ انجانے میں پٹ کھول کر اندر داخل ہو

سے پہلے سپاہیوں کو جوش اور غیرت دلا رہا ہو۔

مسلط طور پر جوش اور جذبہ محسوس کرتی رہنے کی وجہ سے مولا نا کے خد و خصل نہ ترتیب اختیار کر لی تھی کہ ان کا چہرہ احتجاج اور جذبے کی آمیزش بن کر رہ گیا تھا۔ ان کے کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے جملہ نامناسب باتوں کے خلاف ایک گھونٹہ کسا ہوا ہو۔ مولا نا کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ معمولی سے معمولی نامناسب بات پر وہ غصہ جاتا اور اس شدت سے احتجاج کا اظہار کرتے کہ لڑکے محسوس کرتے کہ نہ جلتے وہ کیا کر گئے۔ لیکن اس شدت بھرے احتجاج کے بعد وہ ہر نامناسب بات کو یوں برداشت کر لیتے کہ کوئی بات ہی نہ ہو جیسے نامناسب باتوں کو برداشت کرنا ان کی عادت ہو۔ اور وہ اپنی اس عادت سے مجبور ہوں۔

مولا نا کی آخری خصوصیت ان کا تکیہ کلام تھا۔ وہ جماعت یا افراد سے میاں میاں مخاطب ہوتے۔ اسی وجہ سے لڑکوں میں وہ میاں میاں کے نام سے مشہور تھے۔ مولا نا داخل ہوتے ہی وہ گونجتے ”میاں میاں یہ کیا شور ہے۔“ اس پر لڑکے خاموش ہو جاتے۔ مسخرا چپکے سے سہٹی بجاتا اور اس پر مولا نا چونکتے ”لا حول ولا قوتہ“ سارا کالج مولا نا کے اس نعرے سے گونجتا۔ پھر چاروں طرف سے پر اسرار آوازوں کی یورش شروع ہو جاتی ایک میں چکی ہو نکلتی۔ دوسری طرف ریل گاڑی چھکا چھک کرتی اور تیسری طرف میڈیکل ٹالہ کوکتی۔ اور مولا نا نفثا ”ان آوازوں کے وجود سے بے نیاز ہو کر صائب کے اشارہ پر مصروف ہو جاتے۔

کرینٹ ہوٹل کے اجراء کے بعد وقتی طور پر مولا نا کو ہوٹل پرنسپلٹ مارا گیا۔ بورڈنگ کی مین بلڈنگ سے باہر ملحقہ عمارت کے ایک کمرے میں مقیم تھے جو کھانا کھانے کمرے کے قریب تھا۔

لڑکے ڈانٹنگ ہال کی طرف جاتے تو انہیں محسوس ہوتا کہ وہ بورڈنگ میں موجود ہیں۔ عام طور پر مولا نا نماز پڑھتے ہوئے یا وضو کرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ البتہ کوئی غیر مناسب وقوع میں آتی تو مولا نا کا لا حول ولا قوتہ ملحقہ بلڈنگ سے ابھر کر ہوٹل کی مین بلڈنگ میں گونجتا اور لڑکے چونک کر اٹھ بیٹھتے اور انہیں یہ امر یاد آتا کہ میاں میاں اس بورڈنگ پرنسپلٹ ہیں اور ملحقہ بلڈنگ میں کوئی مناسب بات وقوع میں آئی ہے۔ اس پر بیٹھتے

مے

باہر نکل کر لڑکوں نے دیکھا کہ مولانا ہوشل کے صدر دردازے کی طرف بھاگے جا رہے ہیں اور حاضری کے رجسٹر کے ورق ہوشل کے صحن میں اڑ رہے ہیں۔ مولانا حاضری لگا رہے تھے۔ اور انہیں حاضری کے رجسٹر کا خیال بھی نہ رہا تھا۔ اس روز کرینٹ ہوشل کے لڑکوں میں سے صرف جاہ واحد لڑکا تھا جو اس حادثہ سے بے خبر اپنے کمرے میں بیٹھا کتب خانے میں منہمک رہا تھا۔

”اچھا میں نے خیال نہیں کیا۔“ وہ انگلیوں سے کھیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تم چپ رہو جی۔“ جی کے نے اسے ڈانٹا۔

”اچھا بھئی۔“ وہ بولا ”تو کوئی اور بولے اب۔“

بھانے کہا۔ ”لیکن اب ہو گا کیا۔“

”اللہ جانے کیا ہو گا۔“ اہلی نے کہا۔

وہ سب خاموش ہو گئے۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

پھر دفترا "جاہ بریدرانے لگا" نہیں نہیں — نہیں نہیں۔"

سب کی نگاہیں جاہ پر مرکوز ہو گئیں۔

کی۔ اور ایل۔" جاہ بولا "تم چاہو تو ہمیں ہمارے ساتھ رہو۔ ہاں اور اگر وہ تمہارا دوست بخوشی آنا چاہے تو آجائے ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ تم کہتے ہو ناوہ اچھا لڑکا ہے تو اچھا ہی ہو گا اور اگر ایسا ہی ہے تو آجائے کیا حرج ہے اوپر کا کمرہ ہم اس کے لئے مخصوص کر دیں گے۔ کیا نام ہے اس کاہل۔ جمل۔ جمل۔" بھابھ بولا۔ "پانچ ہو جائیں گے تو کفایت رہے گی اور تم ایل تم کہاں آجائے تو بستر ہے۔" بھابھ بولا۔ "پانچ ہو جائیں گے تو کفایت رہے گی اور تم ایل تم کہاں رہو گے۔"

## گوریاں

"میں میں۔" ایل نے کہا "میں تو نیم چھتی میں رہوں گا۔"

"نیم چھتی؟" جاہ کے ہونٹ حقارت سے کھلے "ہوں نیم چھتی۔" وہ انگلیاں چلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "اے نیم چھتیوں سے دلچسپی ہے۔ کھلے کمروں سے نہیں بس ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ جو ذہنی طور پر خود نیم چھتی ہو وہ —" وہ خاموش ہو گیا۔

## ناؤ گھر

ان کا نیا لاج ایک عظیم تنکون نما بلڈنگ کے کونے کا ایک حصہ تھا جہاں انہوں نے اس کام ناول گھر رکھ دیا تھا بلڈنگ کی پہلی منزل میں گودام اور دوکانیں تھیں۔ کونے کے قریب ٹکی سیرھیاں دوسری منزل میں چلی گئی تھیں۔ جہاں غسل خانہ باورچی خانہ ایک والان لورڈ کمرہ تھے۔ جن کے ایک طرف جدھر سڑک واقع تھی لکڑی کا جنگلا بنا ہوا تھا۔ جو اب بوسیدہ ہو چکا تھا۔ باورچی خانے اور غسل خانے کے اوپر ایک نیم چھتی تھی۔ جس کا دروازہ اوپر کی بیڑیاں کے درمیان کھلتا تھا اور اوپر تیسری منزل میں ایک کمرہ ایک وسیع برساتی اور کچھ کھلی چھت تھی۔ ناول گھر میں پہنچتے ہی جاہ نے اعلان کر دیا کہ وہ دوسری منزل میں قیام کرے گا۔ "یہ کمرہ بولا۔" ہمارا بیڈ روم رہے گا۔ دوسرا کمرہ سٹنگ روم اور اس والان کو ہم کھانے کا کمرہ بنائیں گے۔"

ہیں۔"

"کیوں۔ بھابی نے پوچھا۔"

بھانے والان سے ملحقہ جنگل کی طرف دیکھا "بالکل۔" وہ بولا "یہ جنگلہ نماز کے لئے تپا موزوں ہے۔ ہے نا پال۔"

وہ سب جی کے کو پیار سے پال کہا کرتے تھے۔

"بالکل۔" پال چلایا "اور جنگلے میں یہاں حمام رکھ دیا جائے تو وضو کی جگہ بھی بن جائے۔"

نیم تیسری منزل کے کمرے کو دیکھ کر ان تین کھڑکیوں کی طرف لپکا جو سڑک کی طرف کھلی تھیں۔ کھڑکیوں کو کھول کر وہ خوشی میں چلایا۔

"اے یہاں سے تو سامنے مکمل کے سارے مکانات نظر آتے ہیں۔ کتنے خوبصورت مکانات ہیں۔ کھاتے پیتے فیشن ایبل لوگ رہتے ہوں گے کیوں ایل۔"

ایل کو یہ بات نہ سوجھی تھی۔ "ظاہر ہے۔" وہ بولا۔

”لیکن۔“ جمال نے ہاتھ سے بال سنوارتے ہوئے کہا ”ذرا دور ہیں۔“

پھر وہ برساتی کی کھڑکیوں میں جا کھڑا ہوا۔ ”یہاں سے تو اور بھی اچھا ہی۔“ اس نے ایک لمبے پور مسرت بھری نگاہ ایللی پر ڈالی۔ ”ذرا غور سے دیکھو نا۔“ وہ چلایا اور جسم کھجانے لگا۔ پھر وہ مکان کی عقبی دیوار کے پردے پر جا کھڑا ہوا اور چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اونہوں اس جانب تو امید کی کوئی صورت نہیں۔“ ”زردہ سے پھر ملاقات نہیں ہوئی۔“ ایللی نے پوچھا۔

”زردہ۔“ جمال نے قہقہہ لگایا۔ ”توبہ ہے یار۔“ اس نے ہنستے ہوئے اپنا کلاں پکڑ لیا۔

”توبہ ہے یار۔ اتنی تکلیف ہوئی کہ جس کی انتہا نہیں۔ ایسی خالم بیماری ہے یہ کہ توبہ ہے۔ بیوی کے سامنے سارا بھانڈہ پھوٹ گیا اور معلوم ہے ڈاکٹر کیا کتا تھا۔ کتا تھا یہ بیماری کبھی نہیں جاتی۔ کبھی نہیں۔ اب میں نے توبہ کر لی ہے۔“ اس نے پھر قہقہہ لگایا ”بالکل توبہ کر لی ہے۔ لیکن یار۔ تم کتنے اچھے ہو۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”تمہارا جواب نہیں ایللی دوست ہو تو ایسا ہو۔“ اس نے ہنستے ہوئے ایللی کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ”ایسا اچھا کمرہ میرے لئے مخصوص رکھا جس کا جواب نہیں۔ جواب نہیں ایمان سے اور پھر محلہ کے عین مقابل اور محلہ بھی فیشن ایبل لوگوں کا بھی واہ خوب گزرے گی۔ جو مل بیٹیں گے دیوانے دو۔“ جمال نے پھر قہقہہ لگایا۔ ”تم نیم چھتی میں اور میں چوبارے میں واہ واہ اور وہ ٹپلی منزل والے دور۔ یار ایللی وہ تو کتابوں میں جیتے ہیں۔ کتابیں ہی کتابیں۔“ حد ہو گئی۔

### بانورہ ہوشمند

ابھی وہ نیم چھتی میں چیزیں لگانے میں مصروف تھا کہ کرینٹ ہوشل کا بلور بیجی دتہ آگیا۔

”باہو جی۔“ وہ بولا ”آپ کو نیچے بلا رہے ہیں۔“

نیچے بیڈ روم میں جاہ، بھا اور پال بیٹھے ایللی کا انتظار کر رہے تھے۔

”ہاں بھئی۔“ اسے دیکھ کر جاہ نے کہا ”بیٹھ جاؤ۔ اچھا ہوا کہ جمال نے یہاں آنا پسند کر لیا۔“

اچھا ہوا۔ اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ خاصہ ہے خاصہ میرا مطلب ہے۔“ اس نے مٹکرائے ہوئے کہا ”گوارا اہم کا ہے، بشرطیکہ ناگوار ہونا نہ شروع کر دے۔ کیوں پال۔“ جاہ کا مزاج اس

نک بک ہوتا تھا کہ اس کا اور اک مشکل سے ہوتا تھا۔ لیکن ایللی نے جاہ کی خصوصی مسکراہٹ سے ہنپ لیا کہ وہ اپنے مزاج کی داد کا طالب ہے۔ ایللی نے قہقہہ لگایا۔

”ہے نا۔“ وہ ایللی سے مخاطب ہوا۔ ”لیکن اس وقت مسئلہ درپیش یہ ہے کہ اپنا نوکر دتہ اپنے ہمراہ ایک نوکر لایا ہے۔ نوکر تو ہمیں یہاں رکھنا ہی ہو گا۔ اس سے کہا تھا کہ بھئی کوئی جانا پہچانا نوکر لاؤ۔“

”بالکل۔“ پال نے کہا ”نوکر کے بغیر کیسے ہو گا۔“

”لیکن دقت یہ ہے۔“ جاہ نے کہا ”کہ یہ نوکر جو وہ لایا ہے اس کا جانا پہچانا نہیں اور بندہ تو بنائے پہچانے کے معاملے میں یہ بوقوف ہے۔“ جاہ اس روز مزاج کے موڈ میں تھا۔

”جوڑنے یا نفی کرنے کی بات ہو تو میں حاضر ہوں۔“ پال نے کہا۔

”یہ تو کھانا پکانے کی بات ہے۔“ بھانے کہا۔

”اچھا؟“ جاہ تعجب سے بولا۔

”معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“ پال کی ناک اور بھی لمبی ہو گئی۔

”کھانے کے متعلق میں صرف اتنا جانتا ہوں۔“ جاہ نے کہا کہ نمک اور مرچ ہو تو کھانا ٹیک ہوتا ہے اور نمک مرچ کی مجھے خوب پہچان ہے۔ وہاں کرینٹ میں کھانے کی میز پر جب

کوئی چلا۔ دتہ نمک بھیجے۔ تو دفتنا“ مجھے احساس ہوتا کہ میں بھی سوچ رہا تھا کہ آخر کھانے میں کس بات کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔“ ایللی نے قہقہہ لگایا۔ اس پر جاہ نے بڑے التفات سے ایللی کو مخاطب کر کے کہا ”کیوں میاں ہے نا یہی بات۔“

لیکن بھانے کہا۔ ”معاملہ تو یہ ہے کہ نوکر کی تنخواہ مقرر کی جائے۔“

”بغ اجازت دیں۔“ جاہ مسکرایا۔ ”تو بندہ کتاب پڑھنے کا کام کرے چونکہ اس معاملے میں اپنا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ لہذا اپنا دخل دینا نقصان دہ ہو گا۔ کیوں پال۔“ ”لو جی یہ گیا غفار۔“ دتہ چلا کر بولا۔

غفار پتلا دلا سانولا نوجوان تھا۔ اس کے نقش چٹکے تھے اور بشرے پر ذہانت کے آثار تھے۔

”سلام علیکم۔“ اس نے بے پروائی سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ پھر خود ہی بات شروع کر کے ”دیکھئے صاحب۔“ وہ بولا ”میرا نام غفار ہے۔“

”ذرا گھبرائے۔“ جاہ نے اس کی بات کٹی۔ ”کیا آپ اپنا نام نہیں بدل سکتے؟“ غفار نے غور

”بہت اچھا صاحب۔“ بانورہ مسکرایا۔ ”اب مجھے ازاقت ہے کیا۔ السلام علیکم۔“ یہ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

”عجب نوکر ہے۔“ بھانے کہا۔

پال بننے لگا ”کہتا ہے ابھی پودہ اگا نہیں تو پھل پھول کی بات کیسی۔“

”جی تو میں نے کہا تھا۔“ جاہ بولا ”کہہ پوٹری کا طالب علم معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کل اس کا نہیں بلکہ ہمارا امتحان ہو گا اور نتیجے کا اعلان وہ کرے گا۔ بانورہ۔ یار اس کا نام ہوشمند ہونا چاہیے۔“

اگلے روز بانورہ آیا تو وہ سبھی جاہ کے کمرے میں اکٹھے ہو گئے۔

”ہاں بھئی بانورے کیا پکائے گا تو۔“

”جو آپ چاہیں۔“ بانورے نے جواب دیا۔

”بھئی مجھے تو بھنا ہو گوشت پسند ہے۔“ جاہ نے کہا۔

”وہ تو جی۔“ بانورہ بولا ”کھانے میں پسند ہے نا آپ تو پکانے کے لئے پکوارہے رہیں۔“

”ہائیں۔“ ایک نگاہ جاہ نے بانورے کی طرف دیکھا اور پھریوں سر ہلانے لگا جیسے روٹی کا باوا ہو۔

”چلو بھائی کرلیے گوشت بناؤ آج۔“

”کرلیے کھا کھا کر تو تھک گئے بھلا۔ پالک نہ ہو جائے۔“ پال نے کہا۔

”ہو جائے۔“ بھابھولا۔

”ایک گجارس میں بھی کروں۔“ بانورہ نے کہا۔

”ہاں ہاں۔“ بھانے کہا۔

”دیے پکانے کے لئے جو بھی چاہیں تیار کر دوں لیکن ایسے موخر پر مناسب رہتا ہے۔ کوئی لکھا آج نمونے کے طور پر پکوائی جائے جسے پکانا مشکل ہو۔“

”اچھا بھائی تو کیا کیا چیز پکانی مشکل ہوتی ہے۔“ پال نے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔“ جاہ بولا ”ذرا لگے ہاتھوں یہ بھی بتا ہی دیجئے۔“

بانورہ نے کہا ”صاحب گوشت تو سبھی بنا لیتے ہیں لیکن کام پر کھنا ہو تو دال پکوائیے اور وہ بھی اس کی۔ جو ایک زائد آج سے ڈھل جاتی ہے اور ایک آج کم ہو تو کھڑی رہتی ہے۔ ویسے

سے جاہ کی طرف دیکھا۔

”آپ کا نام خاصہ بو جھل ہے۔“ جاہ بولا ”سارے حلق کو تکلیف ہوتی ہے۔ میرے لئے آپ کو بلانا مشکل ہو گا۔“

”جی صاحب۔“ غفار نے مسکرا کر کہا۔ ”نام تو سکھار ہی ہے اگرچہ گھر کے لوگ مجھے بانورہ سے بانورہ کہتے تھے۔“

”اگر ہم بھی بانورہ کہیں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہو گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کہیں گے محبت سے۔“ جاہ مسکرانے لگا۔

”اجی محبت سے پکاریے تو جوجی میں آئے کہئے۔“ غفار بولا۔

”اچھا بھئی بانورے۔“ بھانے مشکل مطلب کی بات شروع کی۔ ”تمہیں پانچ آدمیوں کا کھانا پکانا ہو گا۔ سودا بھی خود ہی لانا ہو گا۔ تو یہ بتاؤ کہ تم لوگ کیا۔“ بانورہ مسکرایا بولا ”مضمر ابھی پودا لگا نہیں اور پہلے ہی سے پھل پھول کی بات کرنا تو مناسب نہیں۔“

”کیا مطلب۔“ پال چلایا۔

”معلوم ہوتا ہے۔“ جاہ بولا ”یہ بانورہ پوٹری کا طالب علم ہے۔“

”مطلب یہ ہے حضور۔“ بانورہ چمک کر بولا۔ ”پہلے کام پھر دام۔“

”بھئی واہ۔“ جاہ چلایا۔ ”معقول بات ہے۔ جیسے آسکروائیڈ کی لائن ہو۔“

”یعنی۔“ بھانے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”واہ بھلا۔“ جاہ نے کہا ”تم بھی حد ہو میاں پہلے بات اپر۔ شیٹ کرو پھر سمجھنے کی کوشش کرو۔ جو طریقہ ہوتا ہے۔“

”جی میرا مطلب ہے۔“ بانورہ بولا۔ ”طریقے کے مطابق تو مناسب ہے کہ ایک روز کے لئے آپ میرا کام دیکھیں اور پھر اگر آپ کو میرا کام پسند ہو تو مجھ سے تنخواہ کی بات کریں۔ اگر میری مانگ آپ کو منظور ہو تو میں کام شروع کر دوں اور نہ ہو تو اللہ حافظ کہہ کر رخصت ہ جاؤں۔“

”بات تو معقول ہے۔“ پال نے ناک کو گھورتے ہوئے کہا۔

”کچھ زیادہ ہی معقول ہے۔“ جاہ بولا۔

”اچھا میاں۔“ بھانے کہا ”تو کل صبح آجانا۔“

کھانے کے لئے نہیں آیا بلکہ عقل سلیم سکھانے آیا ہے۔ اونہوں۔ یہ بات نہ فہمے گی۔“ وہ بولا  
 ”ہر وقت کی معقولیت اور بات بات پر طریقے سلیقے۔ منگنا دیا ہے دوستو۔ آگے آپ مالک  
 ہیں۔ اپنی تو صرف ایک گجارس ہے۔  
 اگلے روز جب ایک نیا نوکر گاما آیا تو اس کی حواس باختہ شکل کو دیکھ کر جاہ خوشی سے چلانے  
 لگا۔ ”یہ ہوئی نا بات۔“ وہ بولا ”یہ تو اپنا بھائی بند معلوم ہوتا ہے۔ دیکھنے سے ہی تسلی ہو گئی۔  
 ”کی گوس روٹی پکالیتا ہوں۔“ پوچھنے پر نئے نوکر نے مختصر جواب دیا۔  
 ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ جاہ نے قہقہہ لگایا۔ ”آہا گوس روٹی گوس روٹی سے بڑھ کر کیا چیز  
 ہوگی۔ میاں۔ بات ہوئی نا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بچہ جوڑ میں پہنچ گئی ہو۔“ — اور گامے کو  
 ذکر کر لیا گیا۔

### گوریاں

ناگھر میں ایلی کی مصروفیات کرینٹ ہوٹل سے چنداں مختلف نہ تھیں۔ کالج سے واپس  
 آکر وہ چپکے سے جاہ کی ایک کتاب اٹھا کر نیم چھتی میں بیٹھ کر اس کا مطالعہ کرتا جب تک جاہ کے  
 واپس آنے کا وقت نہ ہو جاتا۔ جاہ کے آنے سے پہلے ہی ایلی وہ کتاب واپس اپنی جگہ پر رکھ دیتا۔  
 پھر کچھ دیر تک جاہ کے پاس بیٹھ کر اس کی ترش مگر بصیرت افروز باتیں سنتا اور پھر شام کے وقت  
 لا اور تھل دونوں سیر کو نکل جاتے اور جمل اسے تفصیلاً بتاتا کہ سفید منزل میں ایک کالی کلونی  
 مگر خون دھیرہ رہتی ہے۔ جس کی آنکھوں میں ہلا کی مستی ہے۔ پہلے مکان میں دو ادھیڑ عمر کی  
 اور تین ہیں جو سونکین معلوم ہوتی ہیں اور۔ ماننے منزل میں دو چنی سفید گوریاں رہتی ہیں جو اتنی  
 گوری ہیں کہ توبہ ہے اور ہر وقت ہنستی ہیں ہنسنے ہی جاتی ہیں۔

تھل گوریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس کے گالوں پر سرخی جھلکتی آنکھوں  
 میں مستی جھلکتی اور وہ بار بار جوش میں کھجاتا پھر فرط جوش میں جمل ایلی کو اپنی آغوش میں لے  
 لیتا۔

”یار ایلی۔“ وہ کہتا ”تم بڑے اچھے ہو۔ کیا جگہ دلوائی ہے مجھے واہ واہ۔ ناؤ گھرا جواب گھر  
 ہے بس اگر ذرا سا چھو چلا دو بھائی تو اپنی زندگی میں بھی حرکت پیدا ہو جائے۔ لیکن ایلی۔“ وہ  
 دلائل ہاتھوں سے ایلی کے شانے پکڑ لیتا اور پھر مست آنکھیں بنا کر اس کی طرف دیکھ کر

جو آپ چاہیں۔ اپنا کیا ہے۔“

”اچھا بھئی تو وال ہی پکاؤ۔“ پال بولا۔

”ہاں۔“ بھانے کہا۔

جب ہنڈیا میں کھی ڈالنے کا وقت آیا تو بانورہ نے آکر کہا۔ ”صاحب ایک گجارس ہے  
 میں ڈالنے کے لئے کھی دیا جائے۔“

”واہ میاں۔“ بھانے جواب دیا۔ ”کھی وہاں الماری میں پڑا ہے۔ ڈال لو۔“

”یہ تو درست بات نہیں صاحب۔“ بانورہ بولا۔

”کیوں پال۔“ نے پوچھا۔

”جھو رکھانے میں کھی ڈال کر اسے مجیدار بنانا تو مشکل نہیں اور جو پر کھنا ہو تو جھوڑی ہے  
 کہ کم کھی دیا جائے۔“

”ارے بھائی۔“ جاہ کتاب رکھتے ہوئے بولا ”بانورے کی بات رد کرنے کا خیال ملانے

نکل دو پال کی حساب دانی یہاں کام نہ آئے گی۔“

روٹی پکانے سے پہلے بانورہ پھر آگیا بولا ”حضور کھانا تیار ہے تشریف لائیے۔“

”اچھا بھئی۔“ بھانے جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

”میں تو میاں کچھ دیر کے بعد کھاؤں گا۔“ جاہ نے کہا۔

”جھو رگجارس ہے کہ ایسے وقت یوں ہونا چاہئے کہ آپ سب باورچی خانے میں میرا

پاس آ بیٹھیں ادھر آپ سب کھانا شروع کریں ادھر میں پھلکے اتارنا شروع کروں۔“

”ہوں۔“ جاہ بولا۔

”دیکھنا تو یہ ہے صاحب کہ میں اس تیزی سے پھلکے اتار سکتا ہوں کیا کہ پانچ آدمی کھانے

جائیں اور پھلکا کم نہ ہو۔ تار نہ ٹوٹے اور پھر پھلکے کچے نہ اتریں پھول کر اتریں اور کھانے میں

اچھے ہوں۔ ہی ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”کمو بھئی اس کے جواب میں کیا کہتے ہو۔“ جاہ نے پوچھا۔

”بات تو معقول ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”اچھا بھئی ہم آتے ہیں۔“ بھانے کہا۔

جب بانورہ چلا گیا تو جاہ بولا ”میاں میں محسوس کرتا ہوں جیسے یہ بانورہ ہمیں کھانا پکا



پوچھتا۔ ”ایلی وہ اتنی گوری کیوں ہیں۔ بتاؤ نا۔ حد ہو گئی یا راتنی سفید جیسے کھوسے کی ٹیٹا ہو۔“

”مجھے کیا معلوم۔“ ایلی جواب دیتا۔

”پھر بھی — بتاؤ تو سہی۔“

یہ ہوتی ہی ایسی ہیں۔“ ایلی کہتا۔ ”اگر گوری نہ ہوں تو مرچیلی ہوتی ہیں اور مرچیلی ہوں۔ تو میٹھی رس بھری۔“

”ہے نا۔“ جمال قہقہہ مار کر ہنستا۔ ”اور وہ زردہ تھی۔ وہ زرد ہو گئی تھی کتنی زرد تھی۔“

”گلابی تو یہ ہیں۔“ جمال کہتا۔ ”ضرور گلابی ہوں گی۔ جو دور سے خالی سفید دیکھ دہ زہب سے گلابی ہوتی ہے۔ لیکن یار۔“ وہ پھر ایلی کو شانوں سے پکڑ لیتا۔ ”یار وہ اس قدر ہنسی کی ہیں۔ دیکھتی ہیں اور ہنسی ہیں۔ ہنسی ہیں اور دیکھتی ہیں۔ دیکھ دیکھ کر ہنسی ہیں۔“

”تو کیا تم چاہتے ہو کہ دیکھ کر رو دیں۔“ ایلی پوچھتا۔

”ارے نہیں۔“ جمال رک کر سوچنے لگتا۔

”شکر کر بھائی روتی نہیں وہ۔ جو رو دیں تو تمہاری زندگی حرام ہو جائے۔“ ایلی جواب دیتا۔

”یار ایلی۔“ جمال چلاتا۔ ”کوئی ملنے کی صورت بتاؤ۔ پھر چاہئے نہیں یا روئیں۔“

”کیوں پھر کیا ہو گا۔“ ایلی اسے چھیڑتا۔

”پھر۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنستا اور سر کھاتا۔ ”پھر بہت کچھ ہو جایا کرتا ہے۔“ ہنسنے

دھنستا ”وہ خاموش ہو جاتا۔ پھر سنجیدگی سے کہتا۔ ”یار دقت یہ ہے کہ وہ دور رہیں اور مجھے“

سے پتہ نہیں چلتا کہ کون کون سی ہے اور کون سی۔ کون بڑی ہے کون چھوٹی بڑی مشکل ہے۔“

”بڑی چھوٹی ہو یا چھوٹی بڑی کیا فرق پڑتا ہے۔“ ایلی فلسفیانہ انداز سے بولا۔

”بڑا فرق پڑتا ہے۔“ جمال کہتا۔ ”چھوٹی چھوٹی ہی ہوتی ہے تمہیں کیا خبر۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“

”نہیں یار۔“ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر کہتا۔ ”مجھے سب خبر ہے۔“

نہ جانے جمال کو یہ خیال کیسے پیدا ہو گیا تھا کہ لڑکیوں کے معاملے میں ایلی ہر راز سے

مکافقہ واقف ہے جمال سچے دل سے سمجھتا تھا کہ اس معاملے میں ایلی بڑا سانا ہے ایلی بھی اس کی

میری میں بیاتوں کا رویہ اختیار کر لیتا اس وقت وہ بھول جاتا کہ شہزاد کے رویہ اس کی اپنی کیا

ٹپٹ ہوتی ہے۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہتا کہ وہ بند بیٹھک سے کس شان سے باہر نکلتا تھا۔

بروز شام کے وقت کسی نہ کسی بہانہ جمال اسے آتا۔ اگر ایلی چاہ کے پاس بیٹھا ہوتا تو وہ

بروز شام کے وقت کسی نہ کسی بہانہ بتاتا۔ ”ایلی اگر فراغت ہو تو مجھے پوٹیری کا خلاصہ تو خرید دو۔“

”کئی بہانہ بتاتا۔“ ایلی اگر فراغت ہو تو مجھے پوٹیری کا خلاصہ تو خرید دو۔“

”جہ چوک کر اس کی طرف دیکھتا اور پھر جمال کے چہرے کا جائزہ لے کر کہتا

”خلاصہ۔“ جہ چوک کر اس کی طرف دیکھتا اور پھر جمال کے چہرے کا جائزہ لے کر کہتا

”ٹیک ہے۔ خلاصہ ہاں۔ بھئی تو لے دو انہیں خلاصہ۔ خود بھی خلاصہ پڑھ لو تو کیا حرج

— ٹیک ہے۔ خلاصہ ہاں۔ بھئی تو لے دو انہیں خلاصہ۔ خود بھی خلاصہ پڑھ لو تو کیا حرج

ہے خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا۔ اونسوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔“

جہ خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا۔ اونسوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔“

جہ خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا۔ اونسوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔“

جہ خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا۔ اونسوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔“

جہ خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا۔ اونسوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔“

جہ خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا۔ اونسوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔“

جہ خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا۔ اونسوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔“

جہ خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا۔ اونسوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔“

جہ خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا۔ اونسوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔“

جہ خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا۔ اونسوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔“

جہ خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا۔ اونسوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔“

جہ خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا۔ اونسوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔“

جہ خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا۔ اونسوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔“

جہ خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا۔ اونسوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔“

جہ خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا۔ اونسوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔“

جل کی وہ بات بھل کر کی حیثیت اختیار کرتی گئی اس کا اشتیاق بڑھتا گیا۔ اس کے قہقہے اور ہنسنے کی آواز سن کر ایللی نے کہا: "وہ گوریاں جو اتنی دور رہتی تھیں اور جن کی حیثیت محض ایک مہمان کی تھی قریب آتی گئیں اور قریب اور قریب حتیٰ کہ وہ نیم چھتی اور چوبارے پر ملا کر بیٹھ کر رہ گئیں بن دیکھے بن جانے ایللی ان سے اس حد تک مانوس ہو گیا جیسے وہ بھی اس کے ساتھ ٹائمر میں رہتی ہوں۔ مثلاً ایللی کو معلوم تھا کہ ان کی چال کیسی ہے ان کے بال کس طرح گردن پر لگتے ہیں ان کی چونیاں کیسے مل کھاتی ہیں۔ ان کے دوپٹے کس رنگ کے ہوتے ہیں اور وہ ہوا میں کس طرح لہراتے ہیں اور ان کی آنکھیں کن کن زاویوں سے دیکھی جاتی ہیں ان میں کیسی کیسی چمک لہراتی ہے۔ ان کی ٹانگیں کتنی لمبی ہیں اور وہ بن کتنے چھوٹے۔ ان کے حلق کوئی بات بھی تو نہ تھی جو جمال نے تفصیل سے ایللی کو نہ بتائی تھی۔ صرف ایک عقدہ ہی تھا جو جمال حل نہ کر سکا تھا۔ اسے یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ کون کونسی ہے اور اس بارے میں ایللی بھی اس کی مدد نہ کر سکتا تھا۔

### مل کرانی

ایللی تو اس معاملے میں جمال کی مدد نہ کر سکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں جمال اس بات پر مصر تھا کہ ایللی کے بغیر اسے گوریوں سے قرب حاصل نہیں ہو سکتا اور وہ اس خلوص اور یقین کے ساتھ بار بار یہ بات دہراتا رہا کہ ایللی کی بے تعلقی کے باوجود اس کے احساس کمتری کے باوجود ایللی بچہ لگنے سے سوچنے لگا کہ کس طریقہ سے وہ جمال کی آرزو پوری کر سکتا ہے۔ کئی ایک روز وہ سوچا لیکن کوئی بات اس کے ذہن میں نہ آئی۔ آخر ایک روز جب وہ نیم چھتی میں پڑا سلیمانی لٹالے کے متعلق سوچ رہا تھا کیونکہ انیس ايام میں اس نے ایچ جی ویلز کا ناول "دی ان دز بیل مین" ختم کیا تھا کہ دفعتاً اس نے آنکھ اٹھائی تو کھڑکی میں ارجمند کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پلم پٹر تھا اور ہونٹوں سے پریم سندیس لگی ہوئی تھی۔ چند ایک ساعت تو وہ کرشن کنیا کی طرح سکائی آنکھوں سے کھڑا مٹی بجاتا رہا پھر مرلی کو ہونٹوں سے الگ کر کے بولا۔

"موسے ہم روشن کرو نہ کرو پر نتو اپنے گرو کی لاج تو رکھ لو۔ ایک کلی میں کھو جائے بیٹا تو ہنوز کا کلیاں نہیں ہوتا دھرم پالن نہیں ہوتا۔" نروان نہیں ملتا۔ کلی کلی پتر کلی کلی اور بیٹا کنیا کے بندے کا دوار کھٹکھٹاتا ہو تو — "ارجمند مسکرایا اور اس نے پتر والا ہاتھ آگے بڑھا

حد ہو گئی یار۔ آج تو دونوں نے بال کھول رکھے تھے۔ اتنے لمبے بال جیسے کسی بال بال کی ہوتی ہوں۔ یہاں سے وہاں تک اور پھر اتنے کالے اتنے کالے اور ان کئی زلفوں میں اس کے چہرے حد ہو گئی ایللی بالکل جیسے کچی گری کی بنی ہوئی ہوں۔ یار ایللی "وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کہتا۔" اب میں کیا کروں۔"

ایللی کو بھی جمال کی یہ باتیں بے حد پسند تھیں۔ سارے ٹائمر میں صرف ہنسنے ہی ہستی تھی۔ جس کے روبرو ایللی کی حیثیت پیدا ہو جاتی تھی۔ جمال کے پاس جا کر دھم دھم سے سیانا بن جاتا اور ان پڑھ سے عالم ہو جاتا۔ ایسی صورت میں اسے جمال کی باتیں کچھ یاد نہ ہوتیں اور جمال کا بار بار کہنا یار ایللی تم ہی کچھ کرو گے تو بات بنے گی۔ تمہارے یہ بلی بلی نہیں چڑھے گی۔ کچھ کرونا ایللی۔ کچھ ہو جائے۔ اب تو یہ دوری مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی کیا کروں میں کیا کروں۔

جمال کو یہ معلوم نہیں تھا کہ رات کو جب وہ ایللی کو نیم چھتی میں چھوڑ کر اپنے چوبارے میں چڑھ جاتا ہے تو سیڑھیوں میں سے چھن چھنان کی آواز آتی ہے اور پھر چھن سے کوئی ایللی کے روبرو آکھڑی ہوتی ہے اور ایللی کے حواس باختہ ہو جاتے ہیں اور وہ حواس کم قیاس گمے مصداق یوں اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جیسے دیوی کی آمد پر باندیاں عزت اور احترام سے کمانے جاتی ہیں اور پھر وہ حسرت بھری نگاہ سے ان کے بلوری پاؤں کی طرف دیکھتا ہے دیکھتا ہے کہ اسے ہمت نہیں پڑتی کہ نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھے جہاں گلابی چاند جگمگا رہا ہوتا ہے۔ اس کا نام ہوتا ہے کہ بلوری قدموں پر اپنا سر رکھ کر رو دے۔ آنکھیں ملے اور کہے "دیوی میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔ لیکن کیا کروں میں۔ کیا کروں۔"

جمال کو معلوم نہیں تھا کہ گوریوں سے قرب حاصل کرنے کے لئے جس پر اس نے تمام امیدیں استوار کر رکھی تھیں۔ اس میں اتنی حرارت نہ تھی اتنی سوجھ بوجھ نہ تھی کہ تجلیے میں بھی قرب حاصل کر سکتا۔ انا تخیلے میں وہ اور بھی دور ہو جاتا تھا اور کوششوں کو وہ نہ دیکھتا کہ باوجود گوری کو اپنا نہ بنا سکا تھا جو اعلان اس کی ہو چکی تھی۔

جمال کی موجودگی میں ایللی کو بھی یہ تفصیل بھول جاتی تھیں۔ گھڑی کی جھونکی غفلت حاصل کرنے کے لئے وہ شہزاد کو بھی بھول جاتا وہ شہزاد جو اس کے لئے زندگی تھی۔ جیسی کچھ تھی۔ جس کے بغیر اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

دیا۔ ”پریم پتر۔ پریم پتر سے کواڑ کھل جاتے ہیں۔ مندر میں دیوتا براہمن ہو جاتا ہے اور یہ پچانتا کیا مشکل ہے۔ تم نے تو اپنے گرد کا اپنا مان کر رکھا ہے۔“

ایلی اٹھ بیٹھا۔ پریم پتر وہ سوچنے لگا۔ پھر وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اور اس مکان کی طرف دیکھنے لگا جہاں گوریاں رہتی تھیں۔ اس نے اس مکان کی طرف کئی بار غور سے دیکھا تو عجیب سے وہاں کوئی بھی تو جگہ نظر نہ آئی تھی جس کی راہ مکینوں کو دیکھا جاسکتا تھا۔ اس کی طرف دیواریں حصار کی طرح کھڑی تھیں۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ کھڑکیاں عرصہ سے بند رہی تھیں۔ کیونکہ اس جانب مکان کا پچھواڑا تھا۔ گلی سنسان پڑی تھی نہ جانے وہ کتنی دیر تک یہاں کھڑا سنسان گلی کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر مکان کا عقبی دروازہ کھلتے دیکھ کر وہ چونکا۔ نہ جانے کیسے ہے۔ ایک سیاہ فام اوجڑ عمر کی عورت کو باہر نکلتے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ وہ کولے مکان کی طرف ناؤ گھر کی جانب آ رہی تھی۔ ارے اس کے ہاتھ میں تو جھاڑو تھا۔ مترانی ہے بڑی ملک ملک کر چلتی ہے۔ ————— بائیں حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مترانی ناؤ گھر میں داخل ہو چکی تھی۔ ارے مترانی ————— اسے یہ بات کیوں نہ سوجھی۔

”ہوں۔“ سامنے درخت کے پتوں سے ارجمند بھانکنے لگا۔ ”بیٹا یہ تو انگریزی کا پہلا سبق ہے۔ اسے مترانی نہ سمجھو اینٹ البحر میں اس کا نام ”میل کرانی۔“ ہے جب تک اپنی جہم بھری میں میل کرانی موجود ہے۔ بھنوروں کو غم کس بات کا۔“ پھر اس نے مرلی ہونٹوں سے لگی اور پریم دیا میں کھو گیا۔

ایلی جانتا تھا کہ چند ایک منٹ کے بعد مترانی ٹپلی منزل میں صفائی کرنے کے بعد لوہو تنہا گی۔ چونکہ بیت الخلا اوپر ہی تھا۔ لیکن اس سے بات کرنا۔ ایلی میں اتنی جرأت نہ تھی اگر نہا نے جواب میں الٹی سی بات کہدی اگر اس نے شور مچا دیا تو جاہ کیا کہے گا بھلا حول پڑے گا۔ پھر اس سے کس انداز سے بات کی جائے اونہوں یہ ایلی کے بس کا روگ نہ تھا۔ لیکن اسے ڈنبا آیا بات کرنے میں جمل کا تو جواب نہ تھا خصوصاً اس قسم کی بات۔ اس نے جلدی جلدی لپچ پنے اور چوبارے کی طرف بھاگ لگا۔

”میں نے کہا۔“ وہ چلایا۔ ”وہ آ رہی ہے۔“

”آ رہی ہے؟۔“ جمل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کون آ رہی ہے؟۔“

”بھئی وہی۔“ ایلی نے کہا۔ ”مترانی۔“

”مترانی۔“ جمل نے پوچھا۔

”ہاں ہاں ہماری مترانی۔“

”اچھا۔“ جمل کی باچھیں کھل گئیں۔ ”کیا وہ نوجوان ہے۔؟“

”ارے نہیں یار۔“ ایلی نے غصے سے +

”تو پھر۔“ جمل نے حیرانی سے پوچھا۔

”ارے بھائی یہی مترانی ان کے گھر کام کرتی ہے۔“

”ان کے گھر؟۔“ جمل نے حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔

”گھریوں کے گھر۔“ وہ بولا۔

”اچھا۔“ جمل نے خوشی سے تالی بجائی۔ ”کیا واقعی؟۔“

”ہاں ہاں۔“ ایلی نے کہا۔

”میں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔“

”تو دیکھ لو نا اور بات بھی کر لو۔“

”بات؟ کیا بات کروں میں اس سے پوچھوں میں کون کونسی ہے۔“

”تم بھی بے وقوف ہو۔“ ایلی نے سیانے کا پارٹ ادا کرنا شروع کر دیا۔

”پلے اس سے ادھر ادھر کی بات کرو دیے ہی کپ شپ اور اگر دیکھو کہ بات چیت کرنے

وہی ہے تو۔۔۔۔۔ ایلی خاموش ہو گیا۔

”تو کیا؟۔“

”تو اسے کہو کہ تمہارا خط پہنچا دے ان تک۔“

”خفا؟۔“ جمل چلایا اس کا چہرہ یوں چمکنے لگا۔ جیسے کسی بچے کو نیا کھلونا مل جاتا ہے لیکن ایلی

نے سیانوں کی طرح احتیاطی تدبیروں کی وضاحت شروع کر دی۔

”لیکن آج ہی بھانڈہ نہ پھوڑ دیتا۔ آج تو ٹٹولو اسے۔“

”عین اس وقت میڑھیوں میں مترانی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔“

”اچھا تو میں باہر کوشے پر جاتا ہوں تم بیس بیٹھے رہتا۔“

”بیس بیٹھا رہوں۔۔۔۔۔ ایلی کا دل ڈوب گیا۔ ”نہیں نہیں میں چلتا ہوں۔“

”ارے نہیں۔“ جمل نے کہا۔ ”مجھے اکیلا نہ پھوڑو۔“



بت بند لکھا کرتا ہے۔  
 ”نہیں نہیں۔“ جمال کہنے لگا۔ ”بیوی کو خط لکھتا اور ہوتا ہے۔ وہ چیز ہی اور ہے یار تمہیں  
 معلوم نہیں۔“ جمال پھر اس کی منتیں کرنے لگا۔  
 رات بھر ایلی سوچتا رہا لیکن اسے کوئی بات نہ سوجھی۔ آخر تھک کر اس نے ایک پرزے پر  
 ایک جملہ اور ایک شعر لکھا اور پھر سو گیا۔

صبح سویرے ہی جمال نے اسے آجگایا۔ ”لکھ لیا یار۔“ وہ بولا۔  
 ”ہاں۔“ ایلی نے وہ پرزہ سرانے سے نکال کر اسے دے دیا۔  
 ”ارے۔“ جمال چلایا۔ ”بس اتنا۔“

دفترا“ سیانا بیدار ہوا۔ ”اور کیا۔“ ایلی نے کہا۔ ”بھئی پہلی مرتبہ تو لمبے قصبے نہیں چلتے۔“  
 ”واہ۔“ جمال نے کہا۔ ”پہلی مرتبہ ہی تو اثر ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔“  
 ”تم تو پاگل ہو۔ پہلی مرتبہ تو صرف دیا سلائی دکھائی جاتی ہے۔ آگ تو بعد میں لگانی چاہئے۔  
 تم کیا معلوم۔“

”اچھا یار۔“ جمال کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ”تم جو کہتے ہو تو ٹھیک ہی ہو گا۔“

”تم پڑھو تو ہسی۔“ ایلی نے کہا۔ جمال اسے پڑھنے لگا۔

”گورو کچھ کو کچھ سنو۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی ہو۔ واہ۔“

”ارے۔“ جمال چلایا اس میں تو شعر بھی لکھا ہے تم نے۔

”یہ ہے دامن یہ گرباں آؤ کوئی کام کریں

موسم کا منہ نہ سکتے رہتا کام نہیں دیوانوں کا۔“

جمال نے کہا۔ ”اس کا مطلب کیا ہوا؟۔“

”تم چھوڑو مطلب و طلب کو۔“ ایلی نے کہا۔ ”تمہیں آم کھانے ہیں پیر گننے سے کیا کام۔“

”اچھا۔“ وہ جوش میں کھجائے لگا اور پھر بولا۔ ”اچھا یار میں یہ نقل کر کے بھیج دوں گا۔ تم  
 کہتے ہو پہلے خط میں لمبی بات نہیں ہونی چاہئے یار ایلی اگر تم نہ ہو تو یہ باتیں مجھے کون  
 بتائے۔“ جمال نے فرط محبت اور انبساط سے ایلی کے شانے پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔ ”اچھا میں اب  
 ہا کر لکھتا ہوں۔ ایسا اچھا کاندہ اور لفافہ خرید کر لایا ہوں میں کہ دیکھ کر طبیعت خوش ہو جائے اور  
 ہارٹ کی شیشی بھی۔ معطر کر کے بھیجوں گا۔“

”اور کون لکھے گا۔“

”تم خود لکھو نا۔“

”نہیں یار میں انپ شتاب لکھ دوں گا۔ پڑھ کر وہ کیا کہیں گی۔“

”میں نے تو کبھی نہیں لکھا محبت کا خط۔“

”نہیں یار۔“ جمال اس کی منتیں کرنے لگا۔ ”تم لکھ سکتے ہو۔ ایسی ایسی باتیں لکھ کر  
 حیرت سے میری طرف دیکھنے لگیں۔“

اس روز سارا دن جمال ایلی کے گلے کا ہار بنا رہا۔ ”یار لکھ دو نا لکھا دو نا یار۔“ ایلی کو  
 میں نہ آتا تھا کہ کیا لکھے۔ اس نے زندگی میں صرف ایک محبت نامہ لکھا تھا۔ وہ بھی ارمنی کا  
 سے جو انہوں نے صبرہ کے جوتے میں رکھ دیا تھا تو یہ کتنا ہنگامہ ہوا تھا۔ جب بھی اس کا خیال آتا  
 تو ایلی کو پسینہ آ جاتا تھا اور وہ خط تھا بھی تو بے حد واہیات۔ اس خط کے خیال سے ایلی کو باہر  
 شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ نہیں نہیں وہ سوچتا میں نہیں لکھوں گا۔ میں کیوں لکھوں نے  
 دیکھا تک نہ ہو کیا اسے محبت نامہ لکھا جا سکتا ہے۔ نہ جانے وہ کون ہیں کیسی ہیں اور پھر کیسی  
 ہوں۔ مجھے ان سے کیا لینا دینا۔ میں خواہ خواہ میں کیا منشی ہوں ان کا۔ واہ۔ خواہ خواہ کا منشی  
 رکھا ہے کیا۔ لیکن ایلی کے دل کے کسی عینق ترین کونے میں یہ آرزو چھپی بیٹھی تھی کہ وہ  
 پر اسرار گوریوں کو خط لکھے۔ جو اتنی چٹی سفید تھیں جو ہنسنے جاتی تھیں جن میں اس قدر دان  
 تھی۔ ایسا خط لکھے کہ وہ پاگل ہو کر باہر نکل آئیں۔ گلی کی کھڑکیاں کھول کر ان میں آکر بیٹھیں  
 اور لیکن اس کے ذہن میں کوئی بات نہ آتی تھی۔

جمال مسلسل اصرار کرتے جا رہا تھا ”لکھو نا یار۔“ ایلی کو لکھنے سے ڈر آتا تھا چونکہ لکھنے  
 لئے اس کے ذہن میں کچھ بھی تو نہ تھا۔ اس زمانے میں اس نے کئی ایک نظمیں اور غزلیں  
 پڑھی تھیں اور کئی ایک تو اسے حفظ تھیں مثلاً ”وہ تھی اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر جاگتا  
 سے۔ لیکن وہ تو گزری ہوئی دلچسپی کی یاد تھی۔ پھر وہ تھی مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں  
 یہاں تو عشق ہے ہے کی ضرورت تھی۔ پھر وہ نظم تھی۔ ابھی تو میں جوان ہوں یا فرصت کا تھکا  
 میں اور یا وہ خوبصورت نقش ماتھے پہ بندی آنکھ میں جاوے۔“

وہ سب موقعہ کی چیزیں نہ تھیں۔ اس روز اسے احساس ہو رہا تھا کہ شاعر بننے کے لیے  
 چیزیں لکھتے ہیں۔ نہیں، اس نے فیصلہ کیا۔ کیوں لکھوں۔ خود ہی لکھے وہ۔ وہ تو ہر شے ایلی کے

”ارے رے رے ایسا نہ کرنا۔“ ایللی چلایا۔

”کیوں۔“ جمال گھبرا گیا۔

”میرے یار تو پڑا کر رہے گا اپنی گوریوں کو۔“

”کیوں۔“

”ایک تو پڑے پر لکھتا۔ معمولی سے پڑے پر اور وہ کتنا ہوا نہ ہو بلکہ پھٹا ہوا ہو۔ اور دوسرے لفافے میں نہ ڈالتا۔“

”وہ کیوں۔“

”بھئی اگر کسی کے ہاتھ بھی لگ جائے تو خط معلوم نہ ہو۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ جمال کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ ”اور وہ سینٹ اور لفافے۔“

”جب بات چل نکلے گی۔ تب اب کی بار تو پرزہ ہی تھما دو۔“

”اچھا یار، کہہ کر جمال چلا گیا۔ لیکن اسے ایللی کی یہ بات اچھی نہ لگی۔

اگلے روز جمال فاتحانہ انداز سے داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک رنگین لفافہ تھا۔ دیکھو۔“ اس نے گلابی لفافہ دکھایا۔ جس پر سنہری لکیر لگی ہوئی تھی۔ پھر جھٹ سے چھاپا۔ دیکھا۔“ وہ بولا۔

”ہوں۔“ ایللی نے بے تعلقی سے کہا۔ ”اب تو خوش ہوتا۔“

”اور کیا تم نہیں۔“ اس نے مضطربانہ انداز سے پوچھا۔

”مجھے اس میں نہ گھسیٹو۔“ ایللی نے کہا۔

”کیوں۔“

”اوسوں۔“

”میں نے کہا۔“ جمال چمک کر بولا۔ ”وہ دو ہیں اور اگر تم بھی میدان میں آ جاؤ تو۔“

میرا دل نہیں چاہتا کہ کسی کو بھی ہاتھ سے جلنے دوں ایمان سے کہتا ہوں ایللی۔ نہ جلنے کیا؟

مجھے میرا جی چاہتا ہے کہ دونوں سے عشق لڑاؤں۔“

”تو لڑاؤ۔“ ایللی نے ہنس کر کہا۔

”تم نے برا تو نہیں مانا۔۔۔۔۔؟“

”نہیں تو۔“

”لیکن یار تمہارا درمیان میں ہونا ضروری ہے۔“

”وہ تو میں ہوں ہی۔“ ایللی نے کہا۔ ”ہے نا۔“

”ہی ہو تو سہی لیکن اس ہونے اور اس ہونے میں بڑا فرق ہے۔“

”وہ تو مجھ سے نہ ہو سکے گا۔“

”لیکن کیوں۔“ جمال تڑپ کر بولا۔

”مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”آخر کیوں نہیں۔؟“

”معلوم نہیں۔“ ایللی نے آہ بھر کر کہا۔ اس وقت اس کے سامنے شہزاد کھڑی تھی۔

”عجب آدمی ہو تم بھی۔“

”جو ہے حاضر ہے۔ کیا کیا جائے۔“

”یہ دیکھو کیا لکھا ہے انہوں نے یار بڑی جرات ہے ان میں اور پھر ایللی۔۔۔۔۔“ وہ رک گیا۔

”ہوں۔“

”وہ تو بڑی اونچی باتیں کرنے والی معلوم پڑتی ہیں۔ اپنے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی۔“

”تو کیا میں نے کہا تھا کہ اونچی باتیں کرنے والیوں سے عشق لگا لو۔ اب جو لگایا ہے تو نہیں۔“

”لیکن خط تو تمہیں ہی لکھتا ہو گا نا۔“

”نہ بھئی یہ بات مشکل ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”تم نے برا سامنہ بنا کر لفافہ ایللی کے سامنے رکھ دیا۔ لفافے کے اوپر لکھا تھا۔“ سنہرے

”ہاں اور شہزاد آنکھوں کے نام۔۔۔۔۔“

”کیوں بھئی سنہرے بال۔“ ایللی نے جمال سے کہا۔ ”آنکھوں سے شرارتیں کرتا ہے اور

عمان خانے سے ڈرتا ہے۔“ ایللی نے یہ کہتے ہوئے لفافے میں سے کانڈ نکالا۔ لکھا تھا۔ ”ہم سختی

نہ آپ کیس۔ موسم تو الٹا موزوں ہے۔“

”گرسے۔“ ایللی تعجب سے چلایا۔ بڑا چست جواب دیا ہے۔“

”ہو گا ہمیں تو یار ست کر دیا اس جملے نے۔ اب اس کا جواب کون لکھے گا۔ مجھے تو سمجھ

میں نہیں آتا کچھ اور تم پلو چھڑا رہے ہو۔“ جمال بولا۔

”ہاں بھئی۔“ ایللی نے جواب دیا۔ ”یہ تو بڑی مشکل پڑ گئی۔ میرا خیال تھا کوئی میری بات لکھیں گی۔“

”تم نے شروع ہی میں بات الٹی چلائی ہے۔ اب تم ہی سنبھالو گے تو سنبھالنے کی کیا بات بھائی اس وقت شروع ہو گا جب آئے سامنے کھڑے ہوں گے۔“

”اس کے جواب میں تو عام محبت نامہ نہیں لکھا جاسکتا۔“ ایللی نے کہا۔

”تو بھائی لکھو جو جی میں آئے لکھو۔“ جمال بولا۔

”لیکن مختصر ہی ہو سکتا ہے۔“

”مختصر ہی سہی یار۔ تم لکھو تو۔ بات رک نہ جائے۔“

”اچھا۔“ ایللی نے کہا۔ ”لکھ دوں گا۔“

جمال کے چہرے پر بشارت دوڑ گئی۔

اس کے بعد اس کے معمول ہو گیا۔ ایللی سوچ سوچ کر دو ایک چست اور چمکیلے خط لکھ کر دے دیتا۔ جمال رنگین معطر کاغذ پر انہیں نقل کر دیتا اور پھر گجری کے انتظار میں بیٹھ جاتا۔ دوپہر ڈھلنے لگتی تو جمال چوبارے سے نکل کر برساتی میں جا بیٹھتا چونکہ برساتی سے وہ اٹھنا نہیں سکتا تھا۔ پھر شام تک وہ ایک دوسرے سے اشارے کرتے رہتے۔ اگلے روز صبح سویرے وہ دونوں جمال اور ایللی بے صبری سے جواب کا انتظار کرتے اور پھر اسے پڑھتے سمجھنے کی کوشش کرتے۔

”ارے یہ تو فارسی کے شعر لکھتی ہیں۔“ ایللی نے ان کی دوسرے خط پر شور مچا دیا۔ وہ میں کورا تھا۔ ”اب بتاؤ۔“ وہ بولا۔ ”اب تو کسی مولانا کو ساتھ ملانا پڑے گا ورنہ نہ ملے گی میں آئے گا نہ جواب سوچے گا۔“

”میں بتاؤں۔“ جمال کہنے لگا۔ ”ایک لغات کیوں نہ خرید لیں۔“

”تو کیا میں سارا دن معانی دیکھتا رہوں گا۔“

”بھائے پوچھ لیا کرنا اسے کیا معلوم کہ خط میں لکھا آیا ہے شعر۔“ تیسرے خط میں گوریوں نے سسرے بالوں شریر آنکھوں تانک جھانک اور ان اشاروں سے متعلق جو جمال کیا کرتا تھا۔ ایک نظم لکھ بھیجی۔

”ایلی چلایا۔“ ”یہ تو شاعر بھی ہیں اب بولو۔“ لیکن اس کے باوجود ایللی کو ان کے لکھنے کے جواب لکھنے میں حزا آنے لگا تھا۔ وہ ہر بات میں نکتہ پیدا کرتی تھیں اور ہر لطیف سے خف اشارہ کو خوب سمجھتی تھیں۔

”نہیں یار۔“ جمال گھبرا گیا۔ ”تمہارا ان سے تعارف کرائے بغیر کام نہ چلے گا۔ یہ تو اب کرای ہو گا۔ آج ہی سی۔“

کل کلوتا

ایللی نے دو ایک بار تو انکار کیا۔ پھر خاموش ہو گیا اور اصل دل ہی دل میں وہ چاہتا تھا کہ ان کو دیکھے۔ ان کے قریب تر ہو جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ جمال زبردستی اسے کھینچ کر ان کے سامنے لے جائے۔

اس لئے اس روز دوپہر ڈھلنے کے وقت جب جمال ایللی کے انکار کے باوجود اسے کھینچتا ہوا برساتی میں لے گیا تو اس نے سرسری ضد کرنے کے علاوہ کچھ نہ کیا حتیٰ کہ وہ ان کھڑکیوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”وہ سامنے مکان کی عقبی دیوار ہے نا۔“ جمال اسے سمجھانے لگا۔ ”اس میں اینٹوں کی جالی ٹائی ہے یہ جالی ان کی میڑھیوں میں ہے۔ جالی کے ”عین سامنے دروازہ ہے جس کے پرے ان کا کٹھا ہے۔ دروازہ کھلا ہو تو جالی میں سے صاف دکھائی دیتا ہے اور اگر بند ہو تو جالی اندھی ہو جاتی ہے۔ لو دیکھو۔“ اس نے ایللی سے کہا۔ ”وہ سامنے کھڑی ہے ایک حرامزادی مارک ٹائیم کر رہی ہے۔ بلی شریر ہیں یہ۔“ جمال ہنسنے لگا۔

پھر جمال نے عجیب سے اشارے کرنے شروع کر دیے۔ ایللی کے کندھوں پر بازو رکھ کر اسے اپنے قریب تر کھینچ لیا وہ اشاروں کی مدد سے گوریوں کو سمجھانے لگا۔ یہ میرا عزیز ترین دوست ہے۔ اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔

ایللی کو بھی دھندلی دھندلی اشکال دکھائی دینے لگی تھیں۔ جیسے فضا میں دھبے سے تیر رہے ہوں۔

دھندلا جمال چلایا۔ ”ارے انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔“ ایللی نے دیوار کی جالی کی طرف دیکھا۔ وہاں تو مسلسل دیوار کھڑی تھی۔ ”یہ کیا حماقت



ہے۔ ”جمال چلایا۔

”چھوڑ یار“ ایللی بولا — وہ ہاتھ چھڑا کر نیم چھتی میں جا بیٹھا۔

اگلے روز غیر متوقع طور پر سگری گوریوں کا خط لائی حالانکہ اس روز جمال نے کامیابی سے لکھا تھا۔

”کل آپ ایک کل کلونے کو کھینچ کھینچ کر ہمارے سامنے لا رہے تھے۔ یہ کیا تھیں؟“ آپ نے ہمیں سمجھا کیا ہے۔ آئندہ سے ایسی حرکت نہ فرمائیے گا۔“

ایللی خط پڑھ کر قہقہہ مار کر ہنسا ”دیکھا۔“ وہ غصے میں چلانے لگا ”تم کہتے تھے میں تمہارا تعارف کرا کے رہوں گا ہونہ ہو گیا نا تعارف۔“ اس نے جمال کو ڈانٹا اور پھر ہنسنے لگا۔ ایک قہقہے لگانے کے بعد دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل بیٹھ رہا ہے۔ آنکھوں نے اندھیرا چھا رہا ہے۔

رات کو جب وہ نیم چھتی میں لیٹا ہوا تھا تو میڑھیوں میں شنرا کھڑی تھی۔ وہ مکراراً تھی۔ ”یوں گہری سوچ میں ڈوبنے سے فائدہ“ فکر کرنے یا غم کھانے سے تم کو رہے تو نہ ہو جائے۔“

”تمہیں کیا۔“ ایللی نے کھڑکی کی طرف منہ موڑ لیا۔ لیکن اسے احساس تھا کہ وہ وہیں کھڑی ہے ویسے ہی مکرار رہی ہے۔

کھڑکیوں کے عین مقابل میں سہ منزلہ بلڈنگ میں گوریاں قہقہے لگا رہی تھیں۔ ”کل کلونا۔“ ایک قہقہہ مار کر ہنسی ”اونسوں۔“ دوسری نے برا سا منہ بنایا۔ ”نہیں چاہئے نما چاہئے۔“

”انہیں کیا معلوم۔“ میڑھیوں میں شنرا بولی۔

”سنہرے بال شربتی آنکھیں۔“ سہ منزلہ بلڈنگ سے کوئی چلائی۔

”تم ان کی باتیں نہ سنو ایللی۔“ میڑھیوں میں کسی نے آہ بھری۔ ”ابھی میلے پر جلتے ۲۲

ہے۔ رنگ روپ کا دور ہے نا۔“

ایللی نے تڑپ کر میڑھیوں کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم رنگ روپ میں مدہوش نہیں ہو۔ کیا تم میلے پر جانے کے لئے بیتاب نہیں ہو۔ بھول گئیں جب گانے کے لئے جاتی تھیں۔ یہ بری دہشت کے لئے بلاؤہ آیا تھا۔“

”ہمارا غصہ نہیں کیا ابھی۔“ وہ بولی۔ ”اچھا۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔ ”آخر آؤ گے ہی سب تک بھاگے بھاگے پھرد گے۔ کب تک۔“ یہ کہہ کر وہ چل پڑی۔

ایللی تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ شنرا کو کالو کھینچ لے چلا چلا کر کہے۔ ”نہیں ایللی تڑپ کر اٹھ لے جاؤ۔ شنرا میں بھاگ بھاگ کر آکتا چکا ہوں۔ بھگوڑے کو گھر لے چلو۔“ مگر نہیں مجھے ساتھ لے جاؤ۔

اگلے روز صبح سویرے ایللی اپنے سوٹ کیس میں کپڑے لگا رہا تھا۔ سلبن اٹھا کر رہا تھا۔ بڑیاں چڑھتے ہوئے بھانے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ ”کہیں جا رہے ہو ایللی۔“ ”بھا لے پوچھنا۔“

”نہیں تو۔“ ایللی چونک کر بولا۔

”اچھا۔“ بھانے کہا۔ ”چیزیں جو اس طرح سنبھال رہے تھے میں سمجھا۔“ یہ کہہ کر ہالوپر چلا گیا۔ دفعتاً ایللی کو خیال آیا جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔ ”ہاں۔“ وہ بولا ”میں جاؤں گا۔ میں جاؤں گا۔ مجھے جانا ہی ہو گا۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہے۔ وہ مجھ سے مایوس ہو جائے گی تو۔“ وہ کیا کہے گی۔ کیا کہے گی وہ نہیں نہیں میں جاؤں گا۔“ ”کہیں جاؤ گے؟“ جمال نے داخل ہو کر پوچھا۔

”مٹی پور جاؤں گا۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”ارے ارے نہ بھائی۔“ جمال چلایا۔ ”تم چلے گئے تو سارا معاملہ چوٹ ہو جائے گا۔“ ”کوڑا معاملہ؟“

”وہی معاملہ اور کون سا بڑی مشکل۔“ چالو ہوا ہے۔ یار اب اسے آدھے رتے چھوڑ کر نہ چلے جاؤ۔“

”آدھے رتے۔“ کیوں۔“ ایللی نے غصے میں کہا۔ ”اب تو بات چل پڑی ہے۔“

”نہ بھئی۔“ جمال نے اسے فرط محبت سے آغوش میں لے لیا۔ ”ابھی تو بات شروع ہوئی ہے۔“

”تو کیا میں اسے چلانے کا ذمہ دار ہوں۔“

”نہیں بھئی۔“ جمال ہنسنے لگا۔ ”ذمہ دار تو نہیں لیکن یار اگر نیا پار لگا دو گے تو یاد کروں گا مٹی مٹی ایک مرتبہ ملاقات ہو جائے پھر میں سنبھال لوں گا۔ پھر چاہے چلے جاؤ۔“

”نہیں بھی۔“ ایلی چلایا۔ ”جب انہیں دخل اندازی ناپسند ہے تو۔۔۔“  
 ”اونہوں۔“ جمال بولا۔ ”انہیں کیا پتہ کہ یہ دخل اندازی نہیں وہ تمہاری قدر کیا جانیں؟“  
 سے پوچھو یار۔ اپنی قدر و منزلت مجھ سے پوچھو۔“  
 ایلی خاموش ہو گیا۔  
 ”نہ جانا۔ خدا کے لئے۔“ جمال نے اس کی منتیں شروع کر دیں۔ ”کچھ دن غم بھرا رہو۔“  
 جانا۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔“

بیڑھیوں میں شہزاد امید بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ چپ چاپ۔ اس کی نگاہ میں حسرت کی جھلک تھی۔ ہونٹوں میں گویا سکی ہلیا تھی۔

جمال کی نگاہ میں منت تھی۔ عین اس وقت بھا اوپر سے آگیا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے سرسری طور پر جمال سے پوچھا۔

”ایلی گھر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔“ وہ بولا۔ ”میں کتنا ہوں نہ جا۔“

بھا ہنسنے لگا۔ ”مجھے بھی یہی خیال پیدا ہوا تھا۔ میں سمجھا ایلی جا رہا ہے۔ لیکن وہ نہیں جا رہا۔“

”ارے۔“ جمال چلایا۔ ”تم نہیں جا رہے۔“

”نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”اچھا یا؟“ جمال نے فرط انبساط سے ایلی کے شانے پر زور سے ہاتھ مارا۔ ”تم تو کہہ رہے تھے۔ جا رہا ہوں۔“

”ویسے مذاق میں کہا ہو گا۔“ بھا مسکرایا اور بیڑھیاں اترنے لگا۔

”تمہارا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا؟ جمال خوشی سے چلانے لگا۔ ”تم بڑے ہی پیارے ہو لیکن تنگ کرتے ہو۔ یار بہت تنگ کرتے ہو۔ میں پہلے ہی تنگ ہوں۔“ وہ کھجائے لگا۔ ”تم چلتی ہو؟“

”ارے۔“ وہ دھنستا چلایا۔ ”میں تو ان کے خط کا جواب دیتا ہے۔“

”تو دونا۔“ ایلی نے کہا۔ ”اب میں کل کلونے کے بارے میں کیا لکھوں۔“

”یار تم اپنی طرف سے ایک خط کیوں نہیں لکھتے۔“

”کیا فائدہ۔“

”یار مزہ ہے گا اور پھر تم بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ گے۔“

”مجھے کوئی لچکی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”پھر کس حیثیت سے لکھوں۔“

”یار اور نہ طور پر لکھ دو۔“

”کیوں۔“ ایلی نے غصے میں کہا جیسے جمال نے اس کی توہین کر دی ہو۔

”میں بھی لکھتا ہوں۔ تمہارے متعلق وضاحت کر دوں گا۔ لیکن یار تم میرا لکھا صحیح کر دینا مجھے

نہیں آتا خط لکھنا۔ ٹھیک ٹھاک کر دینا۔ بے عزتی نہ ہو جائے کہیں۔“

اگرچہ بظاہر ایلی خط لکھنے پر رضامند نہ تھا لیکن دل میں شاید اسے بے حد خوشی ہو رہی تھی کہ

اپنی طرف سے خط لکھنے کا موقع ملا۔ رومانی خط تو وہ لکھ نہیں سکتا تھا چلو مزاحیہ ہی سہی۔ کسی نہ کسی

طور پر وہ اپنی شخصیت کا اظہار تو کر سکے گا۔ شاید اس کے دل کی گمراہیوں میں کل کلونا کا کانا لگا تھا اور

وہ چاہتا تھا کہ ان پر اس حد تک اثر انداز ہو کہ اس کانے کا گھاؤ بھر جائے یا شاید یہ کہ انہیں بھی کانا

لگ جائے۔

بہر حال پلا خط جو ایلی نے لکھا ہے حد مختصر تھا گوری سانورے کننائی توری سدھ بسرانی۔

جمال نے اپنے خط میں ایلی کی عظمت کے گمن گائے ہوئے تھے۔ ایلی کے بغیر میں ادھورا ہوں

اس کی مدد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ خدا کے لئے اس سے ایسا سلوک نہ کرو۔ وہ میرا دوست ہے۔

میت گمراہ دوست۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کو گوارا کر لیا گیا اور گوارا بھی نہیں بلکہ ہر بار دو چٹھیاں موصول

ہوئیں۔ ایک سہرے بالوں کے نام اور دوسری میں کل کلونے سے مذاق کئے جاتے اور آج کی فلموں

کی طرح اس پریم کتھیاں جو چوباروں اور چھتوں پر کھیلی جا رہی تھی۔ ہیرو کے ساتھ ایک مضرا بھی

ٹپل کر لیا گیا۔ لیکن ادھر وہ دونوں گوریاں ہیروئن ہی رہیں۔ بلکہ جمال اور ایلی پر یہ عقدہ نہ کھلا کہ

دونوں خطوط کون لکھتی ہے اور وہ خطوط دونوں کی جانب سے لکھے جاتے تھے یا ایک کی۔

البتہ اتنا ضرور ہوا کہ جمال کو معلوم ہو گیا کہ کون کون سی ہے۔ اسے یہ بھی علم ہو گیا کہ چھوٹی

بڑھ کر ہے۔ اس کا چہرہ ہنستا چہرہ ہے اور بڑی کی شکل کتلی ہے اور اس کے انداز میں غم کی جھلک

بہ

۲۲۔ ۱۱۸۸ پھر ہوا۔

”جی“ کا پھر ہنسنا۔  
 ”جی“ بات بھی کرنے دو۔“ بھانے کہا۔ ”ہاں گامے۔“  
 ”جی“ بات بھی کرنے دو۔“

”آئے تھے۔ جی ہاں۔“

”بھانے پوچھا۔“

”اور کون۔“ پال بولا۔

”کیون آئے تھے؟“ بھانے اپنا سوال دہرایا۔

”جہاں ہم نہیں کون۔“ گلاب نے کہا۔

”ہے اس کا کوئی جواب۔“ جاہ ہنسنے لگا۔

”کس سے ملنے آئے تھے۔؟“ بھانے پوچھا۔

جی۔ ”گما شرا کر بولا۔ ”جی مالم نہیں۔“

”حد ہو گئی۔“ بھاہشی ضبط نہ کر سکا۔

”بدمی بات تو ہے معلوم نہیں آئے تھے معلوم نہیں کس سے ملنے آئے تھے۔“

”کہہ رہے تھے۔“ گامے نے کہا۔ ”ہمیں اس سے ملنا ہے۔“

”کس سے۔؟“ بھانے پوچھا۔

”سنہرے بالوں سے۔“ گمانے جواب دیا۔

”سنہری بالوں سے۔“ بھا کے منہ کا نوالہ اڑ کر باہر نکل آیا۔

”مئی وہ کہتے تھے۔“ گلمانے بات کی وضاحت کی۔ ”جن کے بال سنہرے ہیں“ ان سے ملنا

۳۔ اہلِ کائنات فق ہو گیا۔

”کیوں بھی کس کے بال سنہرے ہیں؟“ حاہ نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔ ”میرے تو

کمرے بھورے ہیں پال کے سیاہ ہیں اور املی تمہارے۔ انہوں تمہارے بھی سنہرے نہیں

میں نے کہا۔ "میں یہ نہیں سوچتا۔"

”بلکہ“ بھانے کہا۔ ”اس کے شاید سنہرے ہوں۔“

”وہ آیا نہیں آج۔“ جاہ نے اہلی سے پوچھا۔

”مینگ میں بیٹھا تھا۔ ابھی آجائے گا۔“ اہلی نے جواب دیا۔

”اچھا بھئی۔“ جاہ پھر ہنسنے لگا۔ ”اگر اس کے سنہرے ہوں تو اسے بتا دینا کہ معلوم نہیں اس

نے اے تھ۔“

کوٹھے پر ان کے رو برو آزادانہ آنے جانے کے باوجود ایلی کے لئے وہ دونوں دمناساتہ دھبوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ کوشش کے باوجود وہ ان کے خدوخل نہ دیکھ سکتے تھے۔ ہی اسے معلوم ہوا تھا کہ کون کونسی ہے نہ ہی اسے اس میں کوئی دلچسپی تھی۔ کئی مرتبہ جب ایلی سمجھتا کہ ان میں سے ایک سامنے آئی ہے تو جمال شور مچا دیتا۔

”اُنہوں مت دیکھو۔ ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔ یہ تو کوئی اور ہے۔ شاید ان کا بھائی ہے۔“ ایللی گھبرا جاتا اور کئی بار جب وہ سامنے آتیں تو ایللی سمجھتا کہ ان کا بھائی آ گیا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے سامنے کھڑا نہ ہوتا تھا کہ اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے ان جانے میں کوئی فتنہ نہ مکڑا کر دے اور وہ بھی اس کی حیثیت کال کلونے کے سوا کیا تھی۔

شاید اس ایک لقب یعنی کال کلوئی کی بنا پر۔ گوریوں کو روزانہ محبت بھرے خطوط لکھے  
وجود ان کے رتلیں اور رومان بھرے خطوط موصول کرنے کے باوجود وہ ان سے کوئی خاص دلچسپی  
سوس نہ کر سکا۔

وہ عالم نہیں

پھر دفعتاً "ایک عجیب واقعہ رونما ہوا جس کی وجہ سے ناؤ گھر میں اپہل مچ گئی۔ ایک روز جب کالج سے لوٹنے کے بعد کھانا کھانے میں مصروف تھے تو ان کا نوکر گانا اندر داخل ہوا۔ حسب معمول اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں آنکھوں میں وہی خصوصی بے بسی تھی۔

"جی جی۔" وہ بولا۔

”جی جی۔“ جاہ نے ازراہ مذاق دہرایا۔

”یعنی۔“ پال بولا۔ ”یہ تمہید ہے اور گامامیاں بات کرنے کے موڈ میں ہیں۔“

”جی جی۔۔۔“ گلمانے دانت نکالے جیسے پال کی بات پر خوشی کی لہر دوڑ گئی ہو۔ ”اسے دیکھو“

مجھے ڈکنز یاد آتا ہے۔ ”جاہ نے کہا۔

’کیوں گامے کیا بات ہے۔؟‘ بھانے پوچھا۔

’جی۔۔۔“ گاما کی باچھیں از سرنو کھل گئیں۔

”اتنی جلدی بات بتانے کا قائل نہیں ہے یہ۔“ بھاہنے لگا۔ ”سپینس پیدا کر لے گا۔“

صاحب کمال ہے۔ گویا دور حاضر کا ٹیکسپٹر ہے۔“

ہم کے دھندلے میں ایلی اچھی طرح سے اجنبی کا جائزہ نہ لے سکا جو ناؤ گھر کے دروازے پر عزت مند سر نہ لپٹی تھی۔ ایک بے ڈھب سا کونٹ پہن رکھا تھا اور ساتھ شلوار۔ انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ گھبراہٹ میں تھی۔ اس لئے مضطرب ہو۔ ”جی فرمائیے۔“ ایلی نے کہا۔

”جی، میں نے لپٹی ہاتھ پر سرکالی اور پھر دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر کھڑا ہو گیا اور ایلی کی طرف دیکھ کر غلطی بڑھانے کی طرف گھورنے لگا۔

”آپ کس سے ملیں گے۔؟“ ایلی نے پوچھا۔

”جواب میں وہ دیر تک خاموش رہا۔ پھر دھنسا ہوا۔ ”ہم ملیں گے۔“

”کس سے ملنے کا۔؟“ ایلی نے دوبارہ پوچھا۔

”وہ۔۔۔“ گھبرا کر وہ شلنے لگا۔ ”وہ اسی گھر میں رہتے ہیں۔“ پھر اس نے ایک نظر چوبارے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”ہاں یہیں تو رہتے ہیں۔“

”میں تو کئی ایک لوگ رہتے ہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”ہاں ہاں۔“ وہ بولا۔ ”وہ کئی ایک لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں۔“

”مگر وہ ہیں کون۔؟“

”وہ۔۔۔“ اجنبی رک گیا۔ ”اپنے عزیز ہی ہیں۔ قریبی رشتہ ہے۔“

”کیا رشتہ ہے۔؟“

”رشتہ۔؟“ وہ چونکا۔ ”کہا جو ہے قریبی رشتہ ہے۔“ وہ رک گیا۔

”وہ جو سسرے بالوں والے ہیں۔ وہ۔۔۔“ اس نے چوبارے کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں ہاں دی۔“ دھنسا ہوا۔ ”وہ جوش میں بولا۔

”دیکھئے۔“ ایلی نے کہا۔ ”آپ ذرا اوھر آجائیے۔ دروازہ سے ہٹ کر۔ یہاں انتظار کیجئے میں آپ کو بتاؤں انہیں۔“

”ہاں ہاں بھیج دیجئے۔ کہنا تمہارے رشتہ دار آئے ہیں ملنے کے لئے۔ پیغام دینا ہے ایک۔“

”نیل کو نیچے بھیج کر ایلی خود جاہ کے کمرے کی طرف چل پڑا تاکہ جاہ بھا اور پال کو باتوں میں مصروف کرے اور وہ نیچے اترنے نہ پائیں۔ لیکن جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو کراخالی تھا۔ بھا جاہ لپٹا تھیں سناٹا گئے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر ایلی نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر مطمئن ہو کر نیم چھتی ہوئی بائیں اور جمل کا انتظار کرنے لگا۔

”جی وہ پھر آئیں گے۔“ گلابولا۔ ”کہتے تھے ہم پھر آئیں گے۔“

اس نامعلوم آنے والے کا واقعہ سن کر جمال بے حد مضطرب ہو گیا۔

”کیا واقعی۔“ وہ چلایا۔ ”یار حد ہو گئی۔ مگر وہ تھا کون۔؟“

”مجھے کیا معلوم۔“ ایلی نے کہا۔

”شاید انہوں نے بھیجا ہو۔“ جمال نے کھباتے ہوئے کہا۔

”سنرے بالوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔“

”لیکن یار۔“ جمال مضطربانہ انداز سے کہنے لگا۔ ”یہ لوگ کیا کہیں گے۔ انہیں شک نہ پڑے۔“

”ہو۔ تمہارے جاہ سے تو ڈر لگتا ہے۔ تو کیا وہ پھر آئے گا۔“

”ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”گمانے تو یہی کہا تھا۔“

”تو پھر کیا کریں ایلی۔“ جوش میں جمال اس سے لپٹ گیا۔

اس روز شام کے وقت برساتی میں کھڑے ہو کر جمال نے گوریوں سے پوچھنے کی کوشش کی کہ

کیا انہوں نے کسی کو بھیجا تھا۔ لیکن اشارہ کرنے میں جمال اس قدر بھونڈا دکھائی دیتا تھا کہ ہاتھ پائے

وقت وہ سرسک کا جو کہ معلوم ہوتا۔ وہ دیوانہ وار اشارے کرتا رہا اور ساتھ ہی ایلی سے پوچھتا رہا۔

”ارے یار یہ اشارہ تو بہت مشکل ہوتا ہے۔ کیسے پوچھوں ان سے۔“ اوھر گوریاں اس کے

اضطراب پر ہنسنے جاری تھیں، مسلسل ہنسنے جاری تھیں۔

مغرب کے وقت نیچے دروازے پر دستک سن کر ایلی چونک کر اٹھ بیٹھا۔ کبھی کسی نے نوکر

کے دروازے پر دستک نہ دی تھی۔ دستک نہ دی تھی۔ دستک دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ہاں ہاں

پردہ دار لوگ بستے تھے۔ وہ تو ایک لاج تھا۔ جو بھی آتا دستک دیئے بغیر بیڑھیاں چڑھ کر اوپر آجاتا۔

ایلی نے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ دروازے پر کوئی کھڑا تھا۔ پھر وہ دیوانہ وار بیڑھیاں اترنے لگا۔

کیس گمانہ جا پنے اور سنری بالوں کا بھید نہ کھل جائے ایلی جاہ سے ڈرتا تھا۔ اس کی طنز آمیز بات

ڈرتا تھا۔ جاہ کے گا۔ ”ہوں تو کوٹھے پر پریم دو یا کھلی پڑی ہے۔ سنرے بال اور گوریوں کا میل ہونا

ہے اور تم ایلی تم مسخرے کا پارٹ ادا کر رہے ہو۔ رازداں مسخرہ بھی واہ کیا ردول ہے۔ جی ہاں تو

کھیل کھیلنا نہ آیا کبھی۔ بہتر اسرینا۔ انہوں نے اپنے دماغ میں یہ خانہ سرے سے خالی ہے۔ یہ تو مہرور

تھل کا کھیل ہے کنڈی پر کچھو لگایا اور ڈوری پھینک کر بیٹھ رہے۔ نہ بھی اپنے میں اتنا مہرور

پون گھسنے کے بعد جمال فاتح کی طرح نیم چھتی میں داخل ہوا۔

”کیوں کیا ہوا۔ کون تھا وہ۔؟“ ایلی نے چلایا۔

”ہوں ہوں ہوں۔“ جمال گنگتایا اور پھر بیڑھیوں میں منہ ڈال کر با آواز بلند چلایا۔

”اے آؤ اوپر۔ ہاں ہاں۔ یہاں نیم چھتی میں۔“

## اتنے سارے پھل

اس پر گھما ایک بڑا سا ٹوکرا اٹھائے ہوئے داخل ہوا۔

”ہمیں رکھ دو۔“ جمال نے کہا اور پھر ٹوکرا اتارنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ گلے کے بعد ایلی نے پھر سے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”اس ٹوکرے میں کیا ہے۔؟“

”پھل ہیں۔“ جمال نے کہا۔

”اتنے سارے پھل۔“

”ہاں۔ انہوں نے بھیجے ہیں۔“ جمال نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہائیں۔“

جمال قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ ”وہ تو مسخریاں معلوم ہوتی ہیں۔ اتنا بڑا ٹوکرا بھیج دیا جیسے ہم

پھلوں کی دوکان کھولنی ہو۔“

”لیکن وہ رومی ٹوپی والا کیا ہوا۔“

”وہی تو لایا ہے“ اس نے کہا ”ذرا ٹھہریے میں ابھی آیا۔ میں وہاں انتظار کرتا رہا پھر جب وہ

اس کے ساتھ ایک مزدور نے یہ ٹوکرا اٹھایا ہوا تھا۔“

”ارے اور وہ تھا کون رومی ٹوپی والا۔“

جمال نے ہنستے ہوئے تالی بجائی۔ ”یار اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ عجیب باتیں کرتا تھا پتہ

بہت دیر تک میرے بالوں کی طرف دیکھتا رہا۔“ تم ہی ہو نا“ وہ بولا۔ ”ہمارے رشتہ دار وہ چوہا

میں رہتا ہے۔ وہ وہاں اوپر۔ سنہرے بالوں والا۔“ عجیب باتیں کرتا رہا۔ جمال نے قہقہہ مار کر

معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ہے کون۔“

”لیکن کیا وہ انہیں کی طرف سے آیا تھا۔“

”ہاں ہاں۔“

”لیکن یار۔ شاید۔“

”ارے۔“ جمال چلایا۔ ”ان کا خط بھی تو لایا تھا۔ میں تو بھول ہی گیا۔“

”خط۔“

”ہاں۔“ یہ کہہ کر جہلی نے وہ خط ایلی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ رنگین کاغذ پر دو مختصر سے فقرے

لکھے ہوئے تھے۔ ”آپ بھی کیا کہیں گے کہ اپنے جنم دن پر کچھ کھلایا ہی نہیں خوب کھائیے۔ بے فکر

ہو کر کھائیے۔ ڈاکٹر کی ضرورت پڑے تو وہ بھی بھجوا دیں گے۔“

”ارے۔“ ایلی ہنسنے لگا۔ ”کیا شے ہیں یہ اور کیا دونوں کا جنم دن ایک ہی ہے۔“

”کچھ پتہ نہیں چلتا یار۔ لیکن چھوڑو اس بات کو۔“ جمال نے ٹوکرے میں ہاتھ ڈالا۔

”پلے پھل تو کھالیں۔“

”ارے۔“ پھل کھاتے ہوئے ایلی چلایا۔ ”یہ تم نے کیا غضب کر دیا۔“

”کیا۔“

”یہ ٹوکرا گھاسے اٹھوایا تھا نا۔“

”ہاں ہاں۔“

”اور اس وقت وہ رومی ٹوپی والا وہیں تھا نا۔“

”ہاں۔“

”میں غضب کر دیا۔“

”کیوں۔“

”گھانا میں بتا دے گا کہ وہی معلوم نہیں پھل کا ٹوکرا دے گیا ہے۔“

اگلے روز جب ایلی کالج سے لوٹا تو وہ سب والاں میں بیٹھے پھل کھا رہے تھے اور پھلوں کا ٹوکرا

ان کے سامنے پڑا تھا۔

”اگرے بھی آؤ جلدی آؤ۔“ جاہ ایلی کو دیکھ کر کہنے لگا۔ ”تمہیں بھی آج ہی لیٹ آنا تھا کیا، قسم

ہے اگر مجھے اس ٹوکرے کے وجود کا علم ہوتا تو آج سرے سے کالج جاتا ہی نہ۔ آج آ جاؤ روٹی و روٹی کا

خیال چھوڑو۔ بس اسی پر گزارا کر لو۔“

”اتنا سارا پھل۔“ ایلی نے بناوٹی تعجب سے کہا۔

”جمال کے چچا معلوم نہیں کو دعائیں دو۔“ جاہ بولا۔ ”اگر وہ گاؤں سے چل کر شرمشہ آئے ہم اس کا کیا بگاڑ لیتے۔ کیوں بھی۔“ اس نے جملہ لوگوں کو مخاطب ہو کر کہا۔  
”کون چچا۔“ ایللی نے پوچھا۔  
”یہ تو نہ جانتے تھے کو معلوم ہے نہ خود چچا کو اور ہم بیچارے کس شمار میں ہیں۔ میاں ہمیں بڑے سے واسطے۔ چچا معلوم ہو یا معلوم نہ ہو۔ کوئی بھی ہو۔ بہر حال یہ حقیقت نہیں جھٹلائی جا سکتی کہ تم پھل کھا رہے ہیں۔“

”اور پیٹ بھر کر کھا رہے ہیں۔“ پال ہنسا۔  
”ویسے۔“ بھانے ہنس کر کہا۔ ”معاملہ گڑبڑ معلوم ہوتا ہے۔“  
”کوئی تعجب نہیں ہو گا۔“ پال نے کہا۔ ”اگر ابھی ناؤ گھر کا دروازہ بجے اور وہ میاں ٹالم آ کر کہیں کہ بھی اب جو ہمیں یاد آیا تو ہمارے بھتیجے کے بال سنہرے نہیں بلکہ کالے ہیں۔“ ”کچھ ہوا نہ کرو اگر ایسا ہوا۔“ جاہ بولا۔ ”تو ظاہر ہے جمال نہیں بلکہ تم اس کے بھتیجے ہو۔ چونکہ تمہارے بال کالے ہیں۔“  
”بھئی جمال۔“ بھانے کہا۔ ”تم نے ان سے پوچھا نہیں کیا کہ وہ پھر کب شرمشہ آئیں گے۔“

”پوچھنے کی کیا بات ہے۔“ پال بولا۔ ”میں نے دو مرتبہ تو آئیں گے ہی۔“  
”چونکہ ہر معقول چچا کو ایسا کرنا چاہئے۔“ جاہ ہنسنے لگا۔  
پھر وہ سب دیر تک پھل کھانے میں مصروف رہے۔  
”ایسا معلوم ہوتا ہے۔“ جاہ نے کہا۔ ”جیسے یہ گھر اپنا گھر نہ ہو۔“  
”کیوں؟“ پال نے پوچھا۔  
”یہاں عجیب سے واقعات ہونے لگے ہیں۔ جو اپنے گھر میں نہیں ہو سکتے۔“

”مثلاً۔“ بھانے پوچھا۔  
”مثلاً۔“ جاہ بولا۔ ”یہ پھل ہی لو اتنا پھل ہمارے گھر میں دکھائی دے سکتا ہے۔“  
”قسمہ مار کر ہنسنے لگا۔ ”گویا پھل نہ ہو آکٹائیں ہو گئیں۔“  
”بات تو درست ہے۔“ پال نے کہا۔  
”مثلاً اور۔“ ایللی نے پوچھا۔

”ہاں بھئی اس عمر میں ایسے حادثات ہو جاتے ہیں۔“ جاہ نے کہا۔  
رات کے وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوئے تو جمال کہنے لگا۔ ”یار ایللی ان گوریوں میں اس قدر جرات ہے۔ مجھے تو ڈر آنے لگا ہے۔“

”اس میں ڈر کی کیا بات ہے۔“ ایللی نے پوچھا۔  
”لیکن یار اس قدر جرات۔ آخر وہ نوکر اکھر منگوا لیا گیا ہو گا۔ پھر اسے بھجوا دینا اور ایک معمر آدمی کے ہوتے۔ مجھے تو وہ گھر کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔“  
”مثلاً وہ گھر ایللی ہوں اس وقت۔“ ایللی نے کہا۔

”سوچ رہا تھا آج“ جاہ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“  
”سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر دو میں سوچ رہا تھا۔“

”نہیں تو۔“ جمال بولا۔ ”گھر میں نے ان کی والدہ اور ایک ضعیف عورت کو دیکھا ہے۔“  
”اچھا۔“ ایللی سوچ میں پڑ گیا۔

”جیسی تو میں سوچتا ہوں اپنے بس کاروگ نہیں معلوم ہوتا اور پھر ان کے خطوط دیکھا کہ ہیں پورے جواب مضمون ہوتے ہیں۔“ جمال ہنسنے لگا۔  
”یہ تو ٹھیک ہے۔“ ایللی نے کہا۔ ”لیکن انہی بات تو تمہارے حق میں ہے۔“  
”وہ کیسے۔“ جمال نے پوچھا۔

”اگر ان میں اس قدر جرات ہے تو خود ہی ملاقات کی صورت پیدا کریں گی۔“  
”اچھا یا؟“ جمال نے تعجب آمیز مسرت سے ایللی کے شانے پر ایک بھرپور ہاتھ مارا۔  
یار۔ اب کی بار خط میں لکھ دو۔“  
”کیا لکھ دوں۔؟“  
”لکھ دو کہ ہم ملنا چاہتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی لکھ دو۔“

گوریوں کا جواب پڑھ کر دونوں بھونچکے رہ گئے۔ لکھا تھا۔ ”جسے ملاقات کا شوق ہے“  
کرے کو شش اللہ کار ساز ہے۔ ہمیں تو ملاقات سے کوئی دلچسپی نہیں۔“  
”بھئی بڑی تیز ہیں۔“ جمال قہقہہ مار کر ہنسا۔

ایللی چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا۔  
دیر تک وہ دونوں خاموش رہے۔  
آخر جمال ہار گیا۔ ”اچھا بھئی۔“ وہ بولا۔ ”جو جی میں آئے کرو لیکن یار میرے ان کے روبرو  
جانے پر کوئی بندش نہ ڈالو یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔“

اس چند منٹ کی خاموشی کے بعد گویا ایک طوفان اٹھ آیا۔ ایللی نے اعلان کر دیا کہ ہر ٹکی کرنا  
جائے اور گوریوں کو کوئی خط نہ لکھا جائے جب تک وہ ملاقات پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ  
خیال تھا کہ احتجاج کے تحت جمال کو ٹھے پر ان کے روبرو کھڑا ہونا بھی موقوف کر دے۔ جمال کو اب  
کے خیال سے اتفاق نہیں تھا۔  
”نہیں یار ایسا نہ کرو۔“ وہ بار بار چلا رہا تھا۔ ”ہمیں اس ضد میں بات ہی نہ ٹوٹ جائے۔“  
اس کی منتیں کر رہا تھا ہاتھ جوڑ رہا تھا مگر ایللی اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔  
”یہ میرا فیصلہ ہے اٹل فیصلہ۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اگر تمہیں میرا فیصلہ منظور نہیں ملاقات

کر نے کی میری ذمہ داری نہیں۔“ وہ جمال پر یوں دھونس جما رہا تھا۔ جیسے اس کی ذمہ داری ختم ہو  
جانے کے بعد گوریوں سے رسم و رواج ختم ہو جانا ایک طے شدہ امر تھا۔

ایللی کے فیصلے کی کئی وجوہات تھیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس  
ملاقات کے کنارہ کش ہو جائے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس چلیوں کے کھیل کو چھوڑ کر اپنی دیوی کی  
پاس چلا جائے۔ اسے وہ یاد آ رہا تھا جو کرسی سے لٹکا کر آتا تھا۔ وہ پیشانی جس کے عین درمیان میں تلک  
لگا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں جو کشتیوں کی طرح ڈولتی تھیں۔

چونکہ ایللی جذباتی طور پر اس رومان سے بے تعلق تھا۔ اس لئے وہ اس معاملے میں بڑی سے  
بڑی جرات کر سکتا تھا اور اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ محبت میں ذہنی بے تعلقی کامیابی کی ضامن  
ہوتی ہے اور انسان جس قدر متاثر ہوتا ہے اسی قدر ناکام رہتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عورت  
نفی طور پر اس مرد کی تسخیر پر شدت سے آمادہ ہوتی ہے جو ناقابل تسخیر نظر آئے اور جودل و جان  
سے اس کا ہونچکا ہوا اس میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتی۔

اسی وجہ سے جمال ہر ایسے اقدام سے ڈرتا تھا چونکہ اسے ان کے قرب کی آرزو تھی۔ وہ ڈرتا تھا  
کہ گوریوں کا گوند جائیں۔ اس کے برعکس چونکہ ایللی آرزو سے مبرا تھا اسے کوئی خدشہ نہ تھا اس لئے  
وہ چاہتا تھا کہ ان کو مجبور کر دے ان پر چھا جائے۔

اس روز رات گئے وہ دونوں لڑتے جھگڑتے رہے کئی مرتبہ جمال طیش کھا کر اپنے کمرے میں چلا  
گیا۔ ”اچھا تو میں خود خط لکھوں گا انہیں۔ میں خود بات چلاؤں گا۔“ لیکن جلد ہی ہی وہ واپس آ  
جاؤ اور ایللی کی منتیں کرنے لگا۔

آخر جمال ہار گیا۔ ”اچھا بھئی۔“ وہ بولا۔ ”جو جی میں آئے کرو لیکن یار میرے ان کے روبرو  
جانے پر کوئی بندش نہ ڈالو یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔“  
اس روز کے بعد ایللی ان کے ہر خط کے جواب میں باقی ملاقات پر لکھ بھیج دیتا۔ پہلے تو وہ یہ الفاظ  
دیکھ کر نہیں انہوں نے مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ ”باقی ملاقات پر صاحب کوئی بات کیجئے کچھ کہئے  
کہہ دیجئے۔“ آپ تو گرمیوں کی انہی ہوئی سوئی بن کر رہ گئے۔“ پھر انہوں نے روٹھ جانے کی  
دھمکیاں دینا شروع کر دیں لیکن ایللی نے جواب میں اسی جملے کی رٹ لگائے رکھی۔ دھمکیوں سے آگتا  
آگتا ہر مذاق اڑانے لگیں۔ ”میاں مٹھو دس چہ شک کے علاوہ بھی کوئی بات آتی ہے کیا۔“ اور  
آخر میں وہ ملاقات پر رضامند ہو گئیں۔



”مثنیٰ و محبت میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔“ ایلی نے اسے چھیڑا۔  
”لیکن یار میں سوچتا رہا ہوں۔“

”کیا؟“

”مثنیٰ یہ کہنے سے اچھا ملاقات ہوگی ملاقات تو نہیں ہو جاتی۔“  
”بھئی بور آیا ہے تو پھل بھی لگے گا۔“ ایلی نے فلسفہ بھگارتا شروع کیا۔  
”لیکن ملاقات ہوگی کیسے۔“ جمال نے پوچھا۔

”جب ہوگی تو کوائف خود بخود معلوم ہو جائیں گے۔“  
”مثالی کا مطلب ہو کہ ہم انتظام کریں۔“ جمال نے کہا۔  
”یہ توقف نہیں ہیں وہ۔“ ایلی بولا۔  
”مثالیہ وہ انتظام نہ کر سکیں۔“

”جوانا بڑا نوکر ایجنے کا انتظام کر سکتی ہیں وہ۔“ ایلی ہنسنے لگا۔

”لیکن یار یہ نوکر ایجنے کی بات تو نہیں اور شاید انہوں نے بات ٹالنے کے لئے کہہ دیا ہو۔“  
”مارا دن جمال نے اپنے شکوک اور وہم سے ایلی کا سر کھالیا۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد وہ نیم چھتی  
میں آجودہ ہوتا۔“ یار ایلی اگر انہوں نے دفعتاً بلا لیا تو ہمیں تیار رہنا چاہئے۔ دیکھو تو یہ رومال کیسا  
رہے گا۔ یار یہ کچھ اچھا نہیں اور یہ خوشبو یہ میں نے بھائیوں کی دوکلن سے لی تھی۔ لیکن یار بہت ہی  
مہم ہے۔“

”بھرتہ آہستہ آہستہ جمال بات کا رخ بدلتا۔“ یار ایلی اگر ہم یہاں تیار بیٹھے رہیں اور کوئی ہمیں  
بٹہ کی نہیں تو کیا ہوگا۔“

”جل کی باتوں سے ایلی چڑ گیا۔ شام کے وقت جب جمال نے آکر اپنے شکوک کو ہوا دی تو ایلی  
نہ اس کے شکوک کو رفع کرنے کے بجائے انہیں تقویت دینے کی کوشش۔

”مثالیہ وہ مذاق کر رہی ہوں۔“ جمال نے کہا۔ ”ہیں تو بلا کی مسخریاں۔“  
”بھلا یار۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”میں سمجھتا ہوں مذاق کیا ہے انہوں نے۔“  
”کی۔“ جمال کی آنکھیں ابل آئیں۔  
”بھلا۔“ ایلی نے کہا۔  
”لیکن تم تو کہتے تھے۔“

اس روز جمال کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ بات بات پر ققمہ لگاتا اور جوش مسرت میں اس سے  
بغل گیر ہوتا اور پیار سے دھول مارتا اور پھر بے اختیار کھجاتا۔ کھجاتا ہی چلا جاتا۔ جمال کے  
جوش انبساط کو سب سے پہلے بھانے محسوس کیا کیونکہ بھا اکثر اوپر نیم چھتی اور چوڑے میں ٹوکان  
تھا۔

”کیوں بھی کیا بات ہے۔؟“ بھانے پن کائب درست کرتے ہوئے جمال کی طرف دیکھے  
پوچھا ”کیا تمہارے بچا پھر تو نہیں آرہے شہر۔؟“  
”نہیں تو۔“ ایلی ہنسا۔

”میں سمجھا شاید۔“ بھا مسکراتے ہوئے بولا۔ ”بہر حال کوئی بات ضرور ہے۔“  
”گھر سے خط آیا ہے۔“ ایلی نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

لیکن جاہ کے سامنے ایلی کو کوئی بات نہ سوجھی۔ جاہ نے ایک ساعت کے لئے غور سے ہلکی  
طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ”آج تو جمال یوں مسکرا رہا ہے جیسے بعد ارن مسکراتے ہوئے بیڑیاں اڑا  
کرتی ہے۔ اب تو کلیا پلٹ گئی ہے اس کی۔“

”ہوں۔“ جاہ نے کہا۔ ”ان عورتوں کی کلیا پلٹ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ایک نگاہ ایک جملہ سچی  
مغرور اور محتاج ہے یہ مخلوق جس کی ایک نگاہ سے کلیا پلٹ ہو جاتی ہے۔“  
”کیوں ایلی۔“ پال نے چمک کر پوچھا۔ ”تمہاری ہی نظر تو نہیں۔“  
”ہاں۔“ ایلی ہنسنے لگا۔ ”میری ہی تو ہے۔“

جاہ نے غور سے ایلی کی طرف دیکھا اور شانے جھٹک کر کہا۔ ”بہر حال اپنی نہیں اپنی نظر تو لٹاؤ  
کرتی ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”اگر کبھی ڈال دوں ایک نظر تو بھاڑوں نہ اٹھائے تو اپنا ذمہ۔“  
اس روز تو جمال فرط انبساط سے بات بات پر ققمے لگاتا رہا لیکن اگلے روز صبح سویرے اتنا لبا ہوا  
لئے نیم چھتی میں آ گیا۔

”یار ایلی۔“ وہ بولا۔ ”مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔“  
”کیسے آئی۔“ ایلی نے کہا۔

”مذاق نہیں کر رہا۔“ جمال سنجیدگی سے بولا۔

”میں کب کہتا ہوں کہ۔۔۔“

”یار ساری رات کروٹیں بدلتے بدلتے پہلو چھل گئے ہیں۔“

بہار اپنے آپ سے کہنے لگا اب تو ملاقات ہو گئی۔ وعدہ پورا ہو گیا۔ چلو جان چھٹی۔ مجھے کیا ماننا ہے۔ خواہ مخواہ مجھے تو کوئی دلچسپی نہیں۔ اب میں علی پور جا سکتا ہوں۔ وہ اٹھ بیٹھا سوٹ کیس سے ٹائم ٹیبل نکالا۔ ”ارے“ وہ چلایا ”نو بجے بھی تو جاتی ہے ایک گاڑی۔“ اس شخص نے جملت بچے تھے۔ ایلی نے جلدی ٹیس سوٹ کیس میں چیزیں رکھیں۔ پھر ایک رقعہ جمل کے کلمہ ”میں علی پور جا رہا ہوں۔ ملاقات مبارک ہو۔“ یہ رقعہ چوبارے میں رکھ کر ایلی نے سوٹ کیس اٹھایا اور نیچے اتر گیا۔

گوریوں کے سہ منزلہ مکان کا نام سفید منزل تھا۔ سفید منزل کا پچھواڑا ناؤ گھر کی جانب تھا۔ گھر کے عین مقابل ایک مختصر سی مگر فراخ گلی تھی۔ جس کے بائیں بازو میں چار مکانات اور دائیں بازو میں صرف سفید منزل تھی جو گلی کے پرلے سرے پر واقع تھی۔ اس سے پہلے ایک مختصر سے قبرستان سے ملحقہ کچھ خالی زمین تھی اور بازار میں دو ایک ایک منزلہ دکانیں تھیں۔ اسی وجہ سے سفید منزل کا پچھواڑہ ناؤ گھر کے چوبارے اور نیم چھتی سے پورے طور پر دکھائی داتا تھا۔ سفید منزل کے پچھواڑے میں صرف دو کھڑکیاں تھیں۔ پہلی منزل میں کھلتی تھیں ہلکی دھڑکیوں پر۔ ان اینٹوں کے سوراخوں کے سوا جو سفید منزل کی سیڑھیوں میں بچے ہوئے تھے۔ کوئی کھڑکی یا روشن دان نہ تھا۔ گوریوں نے جمال کو ان دونوں میں سے ایک کھڑکی میں تباہی و برباد دی تھی۔ یہ کھڑکی گلی کے عین قریب تھی۔ انہوں نے وضاحت سے لکھا تھا کہ غریب کے وقت آپ اس کھڑکی کی طرف دیکھتے رہیں۔ جب کھڑکی میں روشنی دکھائی دے تو غریب ہوتے ہوئے کھڑکی تک پہنچ جائیں۔ لیکن آپ کی آمد پر کھڑکی کی روشنی بجھ جائے گی۔ اس روز سارا دن جمال تیاری میں مصروف رہا اس نے دو ایک ریشمیں روئی خریدی۔ ایک عطر کی شیشیاں حاصل کیں پھر وہ اپنے لباس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بار بار ایک چوڑا لٹیرا

## بے معنی بے مصرف

شیش کی طرف جاتے ہوئے اس کے چاروں طرف دھندلے دھندلے نقوش عکاسی ہو رہے تھے۔ جیسے اداس آسمان پر بادل تیر رہے ہوں گرد و پیش ان دھندلے دھندلے نقوش عکاسی تھا۔ بے معنی بے مصرف دھبے جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو گرد و پیش کی ہر چیز منوم سے نظر آ رہی تھی۔ وہ خود محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کھو گیا ہو اور اپنے آپ کو ڈھونڈنے کے لئے سرگرداں ہو۔ پھر وہ ریلوے شیش میں نہ جانے کہاں سے کہاں جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹی پرائیڈر نکلتا تھا مگر وہ سمجھ رہا تھا۔ جیسے علی پور کروڑوں میل دور آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں سے۔

ٹریا کی دودھیا سفیدی سے دور۔

”ایلی۔ ایلی۔“

اپنا نام سن کر وہ چونکا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک بڑا سادہ تیرتا ہوا اس کے قریب آئی۔ ”ایلی تم ہو۔“ اس نے ایک جانی پہچانی آواز سن۔ پھر اس میلے سے دھبے نے واضح شکل اختیار لی۔ اپنے روبرو چچا عماد کو دیکھ کر وہ ہتھکتا۔ ”آپ ہیں چچا۔“ وہ بولا۔

”میں نے اتنی آوازیں دیں۔“ چچا نے کہا۔ ”لیکن تم تو قدرے اپنے آپ میں گم تھے۔“

”میں میں۔“ ایلی گھبرا گیا۔ ”دراصل میں جلدی میں تھا مجھے گاڑی میں سوار ہونا تھا۔“

”گاڑی میں۔“ چچا عماد نے دہرایا۔

”علی پور جا رہا ہوں میں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”اوہ۔“ چچا بولے۔ ”خیر تو ہے۔“

”ایک ضروری کام ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”اچھا۔“ چچا عماد نے کہا۔ ”میں تو اسی گاڑی سے آیا ہوں۔ علی پور سے۔“

اسی گاڑی سے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔“

”محلے کا کیا حال ہے چچا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”دیران پڑا ہے۔“ چچا بولے۔ ”شادیوں کے بعد سب لوگ چلے۔“

”ایلی بولا۔“

”جو علی احمد کا گھر ویران پڑا ہے۔ ادھر تیری ماں اور بہن ابھی کابل سے نہیں آئیں پھر جو علی احمد کو ساتھ لے گیا ہے۔ اب کی بار۔“

”ایلی بولی بچوں کو ساتھ لے گیا۔ لیکن وہ مصلحت کی وجہ سے خاموش رہا۔“

”ایلی کا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن وہ مصلحت کی وجہ سے خاموش رہا۔“

”شرف آیا تھا۔ اس کے گھر والی کہتی تھی۔ میں ساتھ نہیں جاؤں گی مگر اسے کھانے کی

”شرف نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

”ایلی نے اس لئے منٹیں دنتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔“

کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ فی سٹل پر کھڑا چائے پی رہا تھا۔

شیشن کے باہر پہنچ کر وہ بنگ آفس کے سامنے رک گیا۔ ”ایک نکت علی پور۔“ ایک نکت علی پور۔“  
 شخص چلا رہا تھا۔ ”ایک نکت علی پور۔“ ایلی نے اپنی مٹھی کھولی۔ نکت پر حسرت بھرا نظر  
 پھر اس نے چپکے سے نکت اس آدمی کی مٹھی میں تھمادی اور باہر نکل گیا۔

تاگوں کے اڈے کے قریب وہ شیشن کے چھوٹے سے باغیچے میں پہنچ کر بیٹھ گیا۔  
 طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جس میں بتیاں غٹمانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ قریب ہی دالہ  
 لے درخت اس کا کھڑے تھے۔ سامنے ایک دیران مسجد کے مینار گویا محو حیرت کھڑے تھے۔  
 کوئی چلی ہوئی نہ تھی۔

دیر تک وہ وہیں بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ سڑک دیران ہو گئی۔ دوکانیں بند ہو گئیں۔  
 بھیڑ سے خالی ہو گیا۔ کتے بھونکنے لگے۔

”بابو جی چلو گے۔؟“ ایک تانگے والا اس کے قریب آ کر کہنے لگا۔ ”کھل جاؤ گے۔“  
 جی۔؟“ وہ چونکا ”کھل جاؤ گے بابو جی۔؟“ کتنا رو رہا تھا۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ اسے جانے  
 کیسے نہ کہیں جانا ہی ہو گا۔

”ہاں۔“ اس نے تانگے والے سے کہل۔ تانگے والے نے بڑھ کر اس کا سوت کسٹا ہوا  
 اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

## ملاقاتیں

اگلے روز جب ایلی بیدار ہوا تو جمال اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔  
 ”مار لے یار تم نے حد کر دی۔“ وہ چلا رہا تھا۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے۔“ شکر ہے تم ملے  
 نہیں گئے یار مجھے منہ ہار میں چھوڑ کر تو نہ جاؤ۔“ وہ چلائے جا رہا تھا۔ ”تم بولے کیوں نہیں  
 کیا ہوا ہے تمہیں۔“

”جمال مسلسل طور پر چلا رہا تھا لیکن ایلی خاموش تھا۔ ایلی محسوس کر رہا تھا چپے سے  
 بل اور گوریوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی ہو۔ اس کے لئے  
 آصف کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ”آ جاؤ آ جاؤ ایلی۔“ وہ اسے اپنے مخصوص انداز میں بلا رہا تھا۔  
 اس روز کئی مرتبہ جمال اس کے پاس آیا۔ کئی مرتبہ جمال نے کوشش کی کہ ایلی اسے

بچے کی ملاقات کیسی رہی۔ لیکن ایلی نے ہر بار اسے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ ”یار میری طبیعت اچھی  
 نہیں۔“ لیکن رات کے وقت جب ایلی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا تو جمال نے آ کر خود بخود قصہ چھیڑ

دیا۔ ”یار ایلی ملاقات کا کیا فائدہ۔ وہ سلاخ دار کھڑکی کے اندر رہیں اور میں باہر اور پھر ہر آہٹ  
 پر غور کہ کوئی دیکھ نہ لے پوچھ نہ بیٹھے کہ میاں میاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اوہر وہ  
 درجے میں کھڑی تھیں۔ اندر جی بھی نہیں تھی۔ گھپ اندھیرا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن  
 بارش کی آوازیں اتنی پیاری ہیں اور ان کی باتیں اتنی رنگین ہیں کہ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ بڑی  
 تجربہ دار اور بڑی نڈر اور یار انہوں نے مجھے سرگرم پلائے پان کھلائے میں نے بہتیری کوشش  
 کی کہ سرگرم دیتے وقت ہاتھ سینوں سے باہر نکالیں۔ لیکن وہ بڑی چالاک ہیں فوراً ”بھانپ  
 نہیں اور تھپہ مار کر ہنستیں۔“ ”ہم سے چالاک نہیں چلے گی صاحب۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”وہ مسلسل  
 باتیں کئے جا رہی تھیں۔ اور میں حیران کھڑا تھا۔ بت بنا کھڑا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کہوں  
 اور وہ کہہ رہی تھیں آپ کو تگے ہیں یا بات کیجئے کوئی یوں تصویر بن کر کھڑے رہنے سے فائدہ۔  
 بلایا۔“ جمال چلانے لگا ”انہوں نے کئی بار مجھ سے کہا ہاں صاحب تو وہ باقی ملاقات پر جو لکھتے  
 تھے آپ بار بار اب بتائیے تا وہ باقی کیا ہے اب کیا ہو گیا آپ کو۔“

چار روز بعد پھر بلاوا آیا اور جمال نئی امیدیں لے کر نئے جوش اور نئی تیاریوں کے بعد کھڑکی  
 پر جا کھڑا ہوا۔

جب وہ واپس آیا تو اس کے شانے اندر دھنسنے ہوئے تھے۔ گردن لٹکی ہوئی تھی۔ اس روز  
 ”چپ چاپ آ کر بیٹھ گیا اور گہری فکر میں کھو گیا۔“ ”یار وہ طعنے دیتی ہیں۔“ وہ کچھ دیر کے بعد  
 بلاوا۔ ”کتنی ہیں خطوں میں تو بڑی باتیں بگھارتے ہیں آپ۔ بڑے نکلتے پیدا کرتے ہیں لیکن  
 ملنے آ کر کیا ہو جاتا ہے منہ سے بات نہیں نکلتی۔“

”نور یار۔“ کچھ دیر کے بعد وہ پھر جوش میں کہنے لگا۔ ”اب تو سارا راز فاش ہو گیا۔ اس  
 سے تو ہنستا تھا کہ ملاقات ہی نہ ہوتی۔“  
 ایلی خاموش بیٹھا رہا۔

چار روز کے بعد جب پھر بلاوا آیا تو جمال خوش ہونے کی بجائے برا سامنے بنا کر کہنے لگا۔  
 ”میں تمہیں جاکوں گا۔ جانے کا کیا فائدہ۔ البتہ تم ساتھ چلو تو ٹھیک ہے چلو گے۔“

اس روزان کی ملاقات کافی مختصر رہی۔ واپس آ کر نہ تو جمل نے کوئی بات کی اور نہ ہی فٹی باؤب کا اظہار کیا۔  
گلے روز گوریوں کا جو خط موصول ہوا وہ سارا کھل کھلے کے نام تھا۔ جس میں اسے بار بار تباہی کی گئی تھی کہ ان سے ملنے کے لئے سنہری بالوں کے ہمراہ آئے اور اس سے پہلے وہ کیوں نہ آیا تھا اور کھل کھلے ہونے پر جتا کیوں ہے۔ منہ کیوں چھپاتا پھرتا ہے۔ روتا کیوں ہے اور نہیں روتا تو کل ایسی کیوں ہے۔

اس خط پر ایلی حیران ہوا اتنا لمبا چوڑا خط اسے کبھی موصول نہ ہوا تھا اور پھر سارا کا سارا اس کے ہم اس سے پہلے تو کبھی کبھار اس کا نام کا رقعہ ملفوف ہوتا تھا اور اس رفیع کی حیثیت ضمنی ہوتی تھی۔ حیرت کی بات تھی۔

ایلی سارا دن اس بارے میں سوچتا رہا پھر اسے قرآن سے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ جمل کے کہنے پر ہوا ہے۔ پچھلی ملاقات میں اس نے اس کے سوا کوئی اور بات ہی نہ کی تھی۔  
شام کے وقت جمل اس کے پاس آ بیٹھا اور سفید منزل کی طرف خنجر نگاہوں سے دیکھنے لگے۔  
”لو وہ بلا رہی ہیں۔“ اس نے ایلی سے کہا۔

”ابھی تو تم کل ہی مل کر آئے ہو۔“ ایلی نے کہا اور آج کے خط میں تو اس ملاقات کا تذکرہ نہ تھا۔

”انہوں نے زبانی بتایا تھا مجھے۔“ جمل بولا ”کہ شام کو اگر روشنی جلتے تو آ جانا ورنہ نہیں۔“  
مگر وہ ایلی کی منتیں کرنے لگا۔

ایلی حیرت میں وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ غالباً وہ ”کھل کھلے“ نے اس کی انا کو صدمہ پہنچایا تھا اس واسطے ایلی ان میں کوئی دلچسپی محسوس نہ کرتا تھا۔ یا شاید اس کی کوئی اور وجہ ہو۔ بہر حال اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ جمل اس کے بغیر اکیلا ہی چلا جائے لیکن جمل گویا اسے ساتھ لے کر جانے کی قسم کھائے ہوئے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کو جمل کے ساتھ جانا پڑا۔

ایلی کا سید رہن

مگر سنسن تھی۔ قبرستان کے پیچھے کھڑکی کے پاس کھڑے ہونا خصوصی طور پر خطرناک نہ

”اونہوں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”میرا وہاں کیا کام اور پھر جس کو بلایا جاتا ہے وہی جاتا ہے۔“

”لیکن میں ان سے کسوں گا کہ میں اسے زبردستی لایا ہوں۔“ جمل نے کہا۔  
”اگر وہ پوچھیں کہ زبردستی لانے کا مطلب۔“ ایلی نے پوچھا۔  
”کہہ دوں گا باتیں کرنے کے لئے۔“

ایلی کی ہنسی نکل گئی۔ ”بھئی واہ۔“ وہ بولا۔ ”خط میں لکھوں۔ باتیں میں کروں۔ پھر آکر کرو گے۔“

”ہاں یار بات تو درست ہے۔“

”میں بتاؤں۔“ ایلی بولا۔

”بتاؤ۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ سودا خرید کر ہنڈیا پکا کر برتن میں ڈال کر میں تمہارے سامنے رکھوں اور پھر تم اسے کھاؤ۔“

جمل نے قہقہہ مار کر کھجنا شروع کر دیا۔ ”یار بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔“

ایلی دھنستا ہوا گیا۔ ”دیکھو جمل اس کھیل میں سودا لانے اور ہنڈیا پکانے کی ہی دہلی ہوئی ہے کھانا اہم نہیں ہوتا۔“

”لیکن یار۔“ جمل بولا۔ ”میں کیا کروں میرا دل جو چاہتا ہے۔“

اس وقت ایک ساعت کے لئے ایلی نے جمل سے نفرت کا جذبہ محسوس کیا۔ لیکن خاموش رہا۔ شام کے وقت جب کھڑکی میں چمکدار روشنی نظر آئی تو ایلی نے زبردستی جمل کو اٹھایا اور باہر دھکیل کر نیچے لے گیا تاکہ ان سے ملے نیچے جا کر جمل نے ایلی کی منتیں شروع کر دیں۔

”اب آ بھی جاؤ یار۔ دس قدم تو ہے یہاں سے تیرا کیا بگڑ جائے گا۔ اپنی بات ہی بولنے کی۔“ جمل کو ابھی تک احساس نہیں ہوا تھا کہ ایلی کو اپنے معاملے میں ڈال کر وہ بات کاڑھا ہے۔ لیکن ایلی کو پورے طور پر احساس ہو چکا تھا کہ جمل بات بولنے کا خواہشمند نہیں ہے۔ صرف ملاپ کا متمنی ہے۔ خصوصی ملاپ ایسا ملاپ جس میں لوہے کی سلاخیں شامل نہ ہوں۔

بھی معلوم ہو چکا تھا کہ گوریاں اس کی اس خواہش سے کما حقہ واقف ہو چکی ہیں۔

اس کے باوجود نہ جانے کیوں ایلی نے جمل کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

تھا۔ اول تو اس گلی میں آمد و رفت بہت کم تھی دوسرے گلی میں گزرتا ہوا شخص اگر کوئی دیکھتا تو اسے اندھیرے کی وجہ سے وضاحت سے کچھ دکھائی نہ دیتا۔

وہ دونوں چپ چاپ قبرستان میں داخل ہو گئے اور پھر کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

نے دو ایک مرتبہ کھڑکی کی طرف دیکھا لیکن وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ جگہ سنبھال معلوم ہوا تو اس نے سمجھا ابھی گوریاں نہیں آئیں اس لئے وہ جہل سے کہنے لگا۔

”میں نہیں سمجھتا آخر مجھے یہاں لانے سے کیا فائدہ۔“

”حرج بھی کیا ہے۔“ جمال نے کہا۔

”واہ۔“ ایللی چمک کر بولا۔ ”تم تو بھلا عشق لڑاؤ گے۔ میں کیا کروں گا۔“

”آپ دیکھئے عشق کس طرح سے لڑایا جاتا ہے۔“ کھڑکی سے آواز آئی۔

”ارے۔۔۔۔۔“ ایللی چونکا۔ ”یہ تو اندر ہی ہیں۔“

اندر سے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔

”یہ تو بڑی بے انصافی ہے۔“ ایللی نے کہا۔ ”کہ آپ تو سلیمانی ٹوپی پہنے رہیں اور ہم دلوں

سر سے پاؤں تک بیوقوف بنے کھڑے رہیں۔“

”تو کیا آپ یہاں انصاف کے لئے آئے ہیں یہ کیا جانتیہر کا مقبرہ ہے۔“ آواز آئی۔

”نور جمال بھی تو دکھائی نہیں دیتی۔“ ایللی نے کہا۔

”آپ طے آئے ہیں یا لڑنے کے لئے۔“ اندر کوئی ہنسی۔

”ہاں پہلے یہ طے کر دیجئے کہ مجھے کس حیثیت سے بلایا گیا ہے۔ کیا اس لئے کہ میں بہنوئی

ہیروئین کا تماشا دیکھوں۔ یا مسخرے کی طرح آپ لوگوں کو محظوظ کروں یا گورے کے لئے غلام

کا کام دوں۔“

”چلے ہم نے آپ کو بھائی کا مرتبہ بخشا۔“ آواز آئی۔

”سوچ لیجئے۔“ ایللی نے کہا۔

”سوچ لیا۔“ آواز آئی۔

”تو بھی دونوں اپنی اپنے کانٹے کھڑے کرو اور میرے ہاتھ میں دے دو۔“

”کیوں۔“ کوئی ہنسی۔

”تاکہ میں انہیں کھینچوں اور کموں تم دونوں یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو چلو کھڑے ہو۔“

”ارے۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”نہ صاحب ہم آپ کو بھائی نہیں بتاتے۔“

”تو پھر پہلے یہ فیصلہ کیجئے کہ میں کس حیثیت سے بلایا گیا ہوں۔“

”کہہ دو وہ دونوں کبھی کبھی کر کے ہنسی رہیں۔“

پھر ایک بولی۔ ”چلئے آپ انڈر کانسٹیبل ریشن ہسی۔“ یہ سن کر ایللی کو پینہ آگیا اور

لے کوئی جواب نہ سوچا۔

”معلوم ہوتا ہے اب مطمئن ہو گئے ہیں۔“ کوئی ہنسی۔

”دیکھئے۔“ غصے میں ایللی نے جانے کیا کہنے لگا۔

”نہرے جی۔“ وہ بولی۔ ”انہیں بھی کوئی بات کرنے دیجئے اب۔۔۔۔۔ یہ نہیں کہ آپ

یہ کہتے رہیں باری باری موقعہ دیا جائے گا۔“ ایللی کا غصہ بخ ہو گیا۔

”انہیں باتوں سے دلچسپی ہوتی۔“ ایللی نے کہا۔ ”تو مجھے نہ بلایا جاتا۔“

”اب آپ اس کا ناجائز فائدہ حاصل نہ کیجئے۔“ اندر سے آواز آئی۔

ایللی خاموش ہو گیا محفل پر کچھ دیر کے لئے خاموشی طاری رہی۔

”گرد نا کوئی بات بھی۔“ ایللی نے جمال سے کہا۔

”لیجئے اب تو سفارش کر دی آپ کے دوست نے۔“ کوئی ہنسی۔

”میں تو جدائی کا مارا ہوا ہوں۔ میں کیا بات کروں۔“ جمال کھجائے لگا۔

”دیکھ لیجئے۔“ وہ بولی۔ ”یہ پاس آکر بھی جدائی کے مارے رہتے ہیں۔“

”یہ کیا ملاقات ہے۔“ جمال نے آہ بھری۔

”اور ملاقات کسے کہتے ہیں جی۔“ وہ بولی۔

جمال لا جواب ہو کر خاموش ہو گیا۔

”میں نے کہا۔“ ایللی نے بات شروع کی۔ ”اس کمرے کا دروازہ باہر گلی میں بھی تو کھلتا ہے

یہ دیکھو جس کے باہر تالا پڑا ہے۔“

”تو پھر اسے کھول لیجئے نا۔“ وہ نہیں

”کی۔“ ایللی نے پوچھا۔

”ہاں ہیں۔“  
 ”لیکن اندر کی چٹنی۔“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”وہ نہیں کھل سکتی۔“  
 ”کیوں؟“  
 ”بس نہیں کھل سکتی۔ لیچے سگرت۔“ انہوں نے ایک سگرت سلاخوں سے باہر نکالا۔  
 ”اونہوں۔“ ایلی چلایا۔ ”ہاتھ اندر کیچے ہاتھ اندر کیچے ورنہ نظر آ جائے گا۔“  
 وہ ہنسنے لگیں۔  
 جمل نے سگرت پکڑ لیا۔  
 پھر جب انہوں نے دوسرا سگرت باہر نکالا تو ایلی نے انکار کر دیا۔ ”میں نہیں پیتا۔“  
 ”جھوٹ کیوں بولتا ہے۔“ جمل بولا۔  
 ”وہ تو کبھی کبھار تفریحاً پیتا ہوں۔“  
 ”یہ بھی تو تفریحاً ہی دیا جا رہا ہے۔“ وہ بولی۔ ”دوا کے طور پر نہیں۔“  
 ”اچھا۔“ ایلی بولا۔ ”ضرور ہی پلانا ہے تو سگرت کا دیکھئے۔“  
 وہ ہنسنے لگی۔ ”جی نہیں۔“ وہ بولی۔ ”خود ہی تکلیف فرمائیے۔“  
 ”ہم نہیں پیتے۔“ ایلی کہنے لگا۔ ”ایک تو تمہارے کہنے پر سگرت ہینوں اور لاہرا“  
 سگرتوں بھی خود ہی یہ منگنا سودا ہے۔“

”ارے۔“ وہ چلائیں۔ ”یہ باتوں کے دھنی معلوم ہوتے ہیں۔“  
 ”خالی باتوں کا ہی ہوں۔ ڈرئیے نہیں۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”دیکھا میں نے کہا نہ تھا۔“ جمل ہنسنے لگا کہ اسے ضرور بلائیے۔  
 ”آپ نہ جانیں کیا کیا کروائیں گے ہم سے۔“ انہوں نے جمل سے کہا۔ ”لیچے پلا“  
 ”کھائیے۔“  
 جمل نے لپک کر پان لے لیا۔ ایلی نے انکار کر دیا۔  
 ”اب آپ کہیں گے کہ پان بھی چبا کر دیجئے۔“  
 ”اگر تم اندر کا نہ۔“ بیڈریشن ہوتیں تو ضرور کتا۔“  
 ”یعنی آپ انتقام لے رہے ہیں۔ چھی چھی۔“ وہ ہنسیں۔

”لیکن آپ ہیں کتنی۔“ ایلی نے بات کا رخ بدلا۔ ”ایک ہیں دو ہیں تین ہیں کتنی ہیں۔“  
 ”یہ راز نہیں بتایا کرتے۔“ وہ بولی۔  
 ”ہر بات تو ایک ہی ہے۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”لیکن ہیں دو۔“ جمل نے کہا۔  
 ”دوسری کہاں ہے؟“  
 ”دوسری ہی تو بولتی ہے۔“ کسی نے ہنس کر کہا۔  
 ”ہوں نہیں دونوں ایک ساتھ بولو تو یقین آئے۔“ ایلی بولا۔  
 ”میں اس وقت سڑک پر قریب ہی موٹر سائیکل کی آواز آئی۔“  
 ”بھائی جان۔“ اندر کوئی زیر لب چلائی۔ ”اچھا اب آپ جایئے۔“ کھڑکی کے پٹ بند ہو گئے۔  
 ”اگلے روز جمل بے حد خوش تھا۔“ یار تم نے تو حد کر دی۔ جی تو میں کتا تھا کہ ضرور چلو تمہارے جانے کے بغیر وہاں بات نہیں چلے گی۔“  
 ”یار۔“ ایلی نے کہا۔ ”وہ تو بے حد تیز ہیں۔ وہاں تو اپنی دال بھی نہیں نکلتی۔“  
 ”دیکھا۔“ جمل نے کہا۔ ”جی تو میں اکیلا جانے سے گھبرایا کرتا تھا۔“  
 ”لیکن جمل۔“ ایلی نے کہا۔ ”میرا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔“  
 ”کیوں۔“  
 ”آخر کیوں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔“

اس روز سارا دن اسی بات پر ان کا جھگڑا ہوتا رہا۔ جمل اسے کہہ رہا تھا کہ اب تو جانا ہی پڑے گا۔ لیکن ایلی جانے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔  
 دن میں چار ایک بار جمل نے ایلی سے بحث کرنے کی کوشش کی لیکن ایلی نے اسے روک دیا۔ ”میں جمل میں نہیں جاؤں گا۔ اس میں بحث کی کوئی بات نہیں۔“  
 شام کے وقت ایلی چپکے سے نیچے اتر گیا اور جمل کے پاس جا بیٹھا۔ جمل نے باہر کھڑے ہو کر اشارات کئے لیکن ایلی نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اس لئے جمل کو اکیلے ہی جانا پڑا۔  
 باتیں ہی باتیں  
 اگلے روز جمل کی حالت غیر تھی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ دوسرے دن وہ ایلی کے پاس نہ



”جواب۔“

”ہاؤ تو منظر عام پر آئے گا۔“ ایلی نے کہا۔

”ارے۔“ وہ ہنسی۔ ”انہیں بازو دیکھنے کا شوق ہے۔ بچوں کی سی بات کرتے ہیں۔“

”جی ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”کیا آپ بچہ ہیں۔؟“ وہ بولی۔

”ہوں تو نہیں لیکن بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ ایلی نے کہا۔

”کیوں۔“ وہ بولی۔

”شاید آپ میں ہاستا جاگ اٹھے۔“

”ارے۔“ وہ ترقیہ مار کر ہنسی اور اندر کسی سے کہنے لگی۔ ”یہ بھی انہیں کے ہم خیال

معلوم دیتے ہیں۔“

”تو کن کے۔؟“ ایلی نے پوچھا۔

”اپنے دوست کے اور کن کے آپ کے دوست کا خیال ہے کہ درمیان میں لوہے کی

سلاخیں ہوں تو ملاقات نہیں ہو سکتی اور ہمیں معلوم ہے کہ اگر سلاخیں ہٹا دی جائیں تو یہ کیا

ملاحظہ کریں گے۔“

”پھر تو میں اپنے دوست کا ہم خیال نہیں ہوں۔“

”کیوں۔“

”میں تو کہتا ہوں کہ ان سلاخوں کو ڈبل کر دیا جائے تاکہ میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ

سمجھوں اور آپ کی قسم اگر یہ سلاخیں نہ ہوں تو مجھ سے بات بھی نہ ہو سکے۔“

”کیا مطلب۔“ انہوں نے پوچھا۔

”آپ نے وہ قصہ سنا۔“ ایلی کو معاً ”ا۔ سب کی کہانی یاد آگئی۔“

”کوئی۔“

ایلی نے کہانی سنانا شروع کی ”بھیلریا گھوم پھر رہا تھا۔ وہ ایک سو فٹ اونچی دیوار کے قریب

پہنچ کر دیکھا کہ دیوار کے اوپر ایک بھیلر کا بچہ بیٹھا ہے۔ بھیلر کے بچے نے چلا کر کہا چچا جان سلام

اٹھ کر آہوں۔ بھیلر نے جواب دیا بیٹا یہ تو نہیں بول رہا یہ سو فٹ اونچی دیوار بول رہی

ہے۔ ایلی نے کہا۔ ”محترمہ یہ میں نہیں بول رہا۔ بلکہ لوہے کی سلاخیں بول رہی ہیں۔“

آیا تو ایلی چو بارے میں گیا۔ ”کیوں بھی کیا ہوا کل۔“ اس نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ بولا۔

”کچھ نہیں کا کیا مطلب۔“ ایلی نے پوچھا۔

”انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کھڑکی بند کر لی اور کہنے لگیں جب تک اسے ساتھ لے کر

گئے۔ اب کھڑکی نہیں کھلے گی۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئیں اور میں حیران کھڑا کھڑا رہ گیا۔“

ایلی یہ سن کر حیران رہ گیا اس نے محسوس کیا جیسے اس کا کلارنگ دھل کر گورا ہو گیا ہو۔

”اب تم کیوں جانے لگے۔“ جمال نے کہا۔ نہ جانے جمال کی حالت دیکھ کر یا اس لئے کہ اس کا

رنگ گورا ہو چکا تھا۔ اس نے جمال کا ہاتھ تھام لیا۔ ”مجھے معلوم نہ تھا جمال۔“ وہ بولا ”مجھے

معلوم نہ تھا کہ وہ ایسا کریں گی۔“

”میں جاؤں گا ضرور جاؤں گا۔ تم دل برا نہ کرو۔“ ایلی نے کہا۔

جمال کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”اچھا۔“ وہ بولا ”تو تم جاؤ گے نا۔“

”ہاں۔“ ایلی نے کہا۔

”پھر کبھی انکار نہ کرو گے نا۔“

”نہیں۔“

شام کو جب وہ دونوں کھڑکی کے قریب پہنچے تو آواز آئی۔ ”آپ کس حیثیت سے آئے ہیں

جی۔“

”انڈر کانفرس۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”اوہ۔ اور کل کیوں نہیں آئے تھے جی۔“

”اس لئے کہ کل میں اپنے آپ کو ابھی ”کانفرس۔“ سمجھتا تھا۔“

”تو کیا سزا ملنی چاہئے آپ کو۔“ وہ بولی۔

”سزا تو ضرور ملنی چاہئے۔“ ایلی نے کہا۔ ”ایک تھپڑ کانی ہو گا کیا۔“

”ہاں۔“ وہ بولی اور پھر جمال سی مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”آپ انہیں ایک تھپڑ مار جائے۔“

”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”آپ کو خود تکلیف کرنی ہو گی۔“

”کیوں کیا اس لئے کہ ہمارے ہاتھ سے چوٹ نہیں لگے گی۔ بتائیے۔“

”اوسوں۔“ ایلی نے سر ہلایا۔

اس کے بعد ان کا معمول ہو گیا کہ شام کے وقت جب کھڑکی میں تیز روشنی دکھائی دیتی وہ وہاں قبرستان کی طرف چل پڑتے۔ ان کی آمد پر وہ پوچھتیں آپ کے پاس ٹارچ ہے تو اسے رکھ دیجئے ورنہ کھڑکی نہیں کھلے گی۔ یقین دہانی پر کھڑکی کھل جاتی اور کوئی نہ کوئی بات چل نکلتی اور باہر جاتے جاتے سرگت پیتے حتیٰ کہ ان کے جانے کا وقت ہو جاتا اور وہ شب بخیر کہہ کر کھڑکی بند کر لیتیں۔

ان ملاقاتوں میں ایلی باتوں میں جوش پیش کرتا تھا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ابھی تک وہ اپنی طور پر گوریوں سے وابستہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے جو جی میں آئے کہہ سکتا تھا اس کے علاوہ مزید قرب کی آرزو نہ تھی۔ حتیٰ کہ اسے یہ بھی خواہش نہ تھی کہ ان کو روشنی میں دیکھے۔ لیکن اس کا مطلب نہیں کہ ایلی ان کی شخصیتوں سے متاثر نہ ہوا تھا۔

وہ ان کی ذہانت، جرأت اور علم پر حیران تھا۔ ان کی باتیں رنگین ہونے کے علاوہ پر معنی ہوتی۔ ان کی زبان شستہ تھی۔ مذاق لطیف اور خیالات بلند تھے۔

ایلی نے اچھی طرح سے جان لیا تھا کہ وہ صرف باتوں کی دلدلادہ ہیں اور ان ملاقاتوں سے ان کا عقد محفل آرائی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ رنگین باتیں کرنے اور سننے کی شوقین تھیں اور انہیں بونڈی باتوں سے نفرت تھی۔

ملازمتوں کی آمد پر ملاقات کا وقت بدل گیا۔ اب شام کی بجائے وہ سحری کے وقت ملنے لگے رات کے دو بجے کے قریب سفید منزل کے چوبارے میں روشنی چمکتی۔ جسے دیکھ کر دونوں کڑیاں سے ملنے کے لئے چل پڑتے۔ اس تبدیلی اوقات پر جمال چلا اٹھا۔

”یاریہ بہت مشکل کام ہے رات کے دو بجے کون جاگے۔“

چونکہ بونڈی گھر کے رہنے والے سب کے سب امتحان کی تیاری میں مصروف تھے۔ بھا کے سوا کسی سے کوئی روزہ نہ رکھتا تھا اس لئے سحری کے وقت ناؤ گھر میں کوئی نہیں جاگتا تھا۔ بھانے کی خصوصی انتظام کر رکھتا تھا۔ شام کے وقت وہ دو انڈے بنوا لیتا جو صبح ڈبل روٹی کے ساتھ کھا کر اندر لے جاتا تھا۔ بھا سے یہ کہنا کہ ہمیں دو بجے جگا دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ گھڑی کو بجے گا اور گھانٹے سے بھی وہ ڈرتے تھے۔ تاکہ گھروالوں کو شک نہ پڑے۔ رات کے دو بجے نہ ہی آپ جاگنا بہت بڑی مشکل تھی۔

ان دنوں کالج امتحان کی تیاری کی چھٹیوں کی وجہ سے بند ہو چکا تھا اور بی اے کے امتحان

”یہ تو بکواس کر رہا ہے۔“ جمال نے کہا۔

”تو پھر آپ بات کیجئے نا۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”انہیں بکواس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”یہ تو اندر کا انسداد ہے۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”انہوں نے جمال کو چلبلا کر کہا۔ ”نہ جانے آپ انہیں ساتھ کیوں لے آتے ہیں۔“

”آپ نے تو خود ہی کھڑکی بند کر لی تھی کل۔“ جمال نے کہا۔ ”اور کہا تھا جب تک ساتھ نہیں لائیں گے کھڑکی نہیں کھلے گی۔“

”وہ تو اس لئے کہا تھا کہ آپ پر صرف ایک دھن سوار ہے۔ چونکہ آپ کے خطرناک ہیں۔ اس لئے تیسرے آدمی کا ہونا ضروری ہے۔“

”نہیں نہیں خدا کے لئے ایسا نہ کہئے۔“ جمال کھڑکی کے قریب تر ہو گیا۔ ”اندر ہاتھ نہ ڈالئے۔“ وہ بولی۔ ”منہ زبانی بات کیجئے آپ کو تو کشتی کرنے کا شوق ہے۔“

ہوتا ہے۔ ”ذرا انہیں پیچھے ہٹا دیجئے نا۔“ انہوں نے ایلی سے اپیل کی۔ ایلی خاموش کھڑا رہا۔

”خدا کے لئے ذرا دیا سلائی تو جلائیے۔“ جمال نے منت کی۔ ”کیوں؟“

”یہاں بہت اندھیرا ہے۔“ وہ بولا۔

”بس ان کو یہی ایک بات کر آتی ہے۔“ وہ ایلی سے کہنے لگی۔

”خدا کے لئے۔“ جمال نے اپنا بازو سلاخوں کے اندر ڈال دیا اور وہ ٹارچ جلا دی جو ان کے ساتھ لایا تھا۔ کمرے سے دو ایک ہلکی ہلکی چیخوں کی آوازیں آئیں دو ملفوف سی اشیاں نکلیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

دیر تک وہ دونوں وہاں چپ چاپ کھڑے رہے۔

”بھاگ گئیں آخر۔“ جمال بولا۔ ”وہ یونہی بھاگ جایا کرتی ہیں۔“

”لیکن یہ ٹارچ تم کیسے لے آئے تھے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”چھپا کر لایا تھا۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”یار اتنی دیر ہو گئی ہے ابھی تک ان کی ٹیکسٹیں بھی نہیں دیکھیں میرے صبر کا پیمانہ لبرز ہو چکا ہے۔“

”جتنی نہیں کھولیں گی۔“

”جلدی نہ کرو۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”یہ بات مجھ پر چھوڑو۔“

”یار کچھ کرو۔“ جمل نے فٹیں کرنا شروع کر دیں۔ ”ایسی چالاکی کرو کہ بات بن جائے۔“

”اگلی رات وہ دو بجے سے پہلے ہی وہاں جا پہنچے انہوں نے تالہ اور کنڈی کھول دی۔“

پھر وہ گوریوں کا انتظار کرنے لگے۔ اس دوران میں ایلی نے اچھی طرح جمال کو تاکید کر دی

کہ دروازہ کھولنے کے بارے میں گوریوں کا انتظار نہ کرے۔ جب وہ دونوں کھڑکی میں آئیں تو

ایلی نے سب معمول ادھر ادھر کی بات چھیڑ دی اور دیر تک وہ یوں باتوں میں محو رہا جیسے

دروازے کی تفصیل بھول چکا ہو۔ پھر دفعتاً ”وہ زمین پر بیٹھ گیا۔“

”ہائیں آپ بیٹھ کیوں گئے۔“ وہ بولی۔

”ہوا لگتی ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”ہوا تو بلکہ اچھی لگتی ہے۔“ وہ بولی۔

”اے کل سے بخار آتا ہے۔“ جمل نے کہا۔

”ارے۔“ وہ بولی۔ ”تو آپ نے بتایا کیوں نہیں۔“

”تو بتاتا تو کیا کرتیں آپ کیا دروازہ کھول کر اندر بلا لیتیں۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ وہ ہنسی۔

”جیسی تو بتایا نہیں۔ ڈر تھا کہ مجھے اندر نہ بلا لو۔“

”اگر باہر تالہ نہ پڑا ہوتا تو میں ابھی آپ کو اندر لے آتی۔“

ایلی نے قہقہہ لگایا۔ ”آپ میں اتنی جرأت کہاں۔ آپ —۔“

”کیوں۔“ اندر سے آواز آئی۔

”نہیں۔“ قرآن سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ آپ شاید اس خوشی فہمی میں ہیں۔“ وہ بولا۔ ”کہ

نہ لٹا ہیں۔ اور ہم بھوکے جاٹ۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”بھوکے جاٹ نہیں البتہ بھکاریوں سے

ماتہ ضرور پڑا ہے ہمیں۔“

”بھکاریوں سے ڈرتی ہیں آپ۔“ ایلی نے قہقہہ لگایا۔

”ہم تو کسی سے بھی نہیں ڈرتے۔“ وہ بولی۔

”تو پھر اندر کی چٹنی کھول دکھائیے۔“ اس گفتگو کے دوران میں جمل تھوکنے کے بہانے کلی

کی طرف نکل گیا تھا۔ لیکن ایلی جبکہ پر جا رہا۔

میں صرف ڈیڑھ مہینہ باقی تھا۔ ان حالات میں گوریوں کے سنگٹل کو دیکھنے کے لئے لازم تھا

جمال یا ایلی ان میں سے کوئی دو بجے تک جاگے۔ چونکہ جمال جاگنے کے لئے تیار نہ تھا اس

یہ ذمہ داری ایلی کو اپنے سر لینی پڑی۔ وہ دو بجے تک مطالعہ میں مصروف رہتا اور پھر

دیکھ کر جمال کو جگاتا اور پھر وہ دونوں مخصوص مقام پر پہنچتے اور وہاں اندھڑے میں ادھر ادھر

بات چل نکلتی اور ایلی بے سکی ہانکتا۔ گوریاں فقرے چست کرتیں اور ہنستیں اور سبیل کی

آنکھیں بنا کر گوریوں کی طرف دیکھتا۔ ان جانے میں سمجھتا اور جب ضبط کا دامن ہاتھ سے پھر

جاتا تو بھکاری کی حیثیت سے سلاخوں کے قریب جا کھڑا ہوتا۔ ”خدا کے لئے خدا کے لئے

چلاتا اور گوریوں کے ماتھے پر شکن پڑ جاتے۔“

## دروازہ

دراصل جمال کا پیکانہ صبر لہریز ہو چکا تھا۔ وہ ان ملاقاتوں اور بے کاری باتوں سے اکتا چکا

اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ گھنٹوں کھڑے ہو کر باتیں کرتے رہنے کا مطلب کیا تھا۔ اسی

سے وہ بار بار ایلی کو کہتا رہا۔

”ایلی یار کچھ کرنا چاہئے اگر ہم کسی طرح اس دروازے کو کھول لیں جو باہر گلی میں کھتا

تو اندر جا سکیں گے۔“ ایلی کو یہ تجویز ناپسند نہ تھی۔ لیکن وہ اس کے لئے بہت ہی نا

در حقیقت دل ہی دل میں ایلی ان لڑکیوں کے قرب سے ڈرتا تھا۔ اس کی وجہ غالباً اس کا

کمتری تھا جو عورت سے متعلق اس کے دل کی گمراہیوں میں جا گزین ہو چکا تھا۔ شاید اس کا

سے وہ جمال کے اس مطالبے کو ٹالتا رہا۔ لیکن آخر کار اسے جمال کی بات ماننا ہی پڑی۔

ایک روز گوریوں سے ملاقات کے اختتام پر وہ دونوں وہاں رک گئے۔ انہوں نے مل جل

کر تالے کی ساخت کو بغور دیکھا اور لیوروں کی تعداد معلوم کی اور بالا خرہ موم کے ایک کلو

جو وہ جاتے ہوئے ہمراہ لے گئے تھے تالے کے سوراخ کا نقش حاصل کر لیا۔

اس روز وہ دونوں بازار میں تالوں کی دوکانوں پر گھومتے رہے اور انجام کار دیکھ کر

تالے خرید کر لے آئے۔ اگلے روز ملاقات کے بعد انہوں نے وہ چاروں چابیاں اس لئے

آزمائیں خوش نصیبی سے ایک چابی لگ گئی اور تالہ کھل گیا۔ انہوں نے کنڈی کھلا

دروازے کو کھولنے کی کوشش کی مگر اندر سے چٹنی لگی ہوئی تھی۔

”اب کیا ہو گا۔“ جمال کہنے لگا۔ ”ساری محنت اکارت گئی۔ اگر ہم نے تالہ کھول دیا

”لو اس میں کیا ہے۔“ اندر کوئی بولی اور پھر چنچنی کھولنے کی آواز سنائی دی اور پھر اس نے کہ وہ اسے پھر سے بند کر لیتیں جمل نے دروازے کو دھکیل کر کھول دیا۔ دروازہ کھلتا دیکھ کر دونوں چنچیں مار کر بھاگیں اور ایک دوسری پر گرتی پڑتی نظر سے غائب ہو گئیں۔ سلسلہ وار کونکے پیچھے وہ جگہ جسے وہ کمرہ سمجھتے تھے درحقیقت زینے کا نچلا حصہ تھا۔

سامنے ایک دروازہ عمارت کے اندر کھلتا تھا۔ دوسری طرف زینہ تھا۔ جس میں گورنر کا کباڑ بھرا ہوا تھا۔ ٹوٹی ہوئی میزیں کرسیاں کھوکھے اور جانے کیا کیا۔ دوسرے کونے میں اندر دروازے کے پاس دو پاٹ رکھے ہوئے تھے۔ کمرے کی چوڑائی چار فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ اگلے روز دروازہ کھولنے کا جھگڑا از سر نو شروع ہو گیا۔ آخر میں وہ جلال میں آگیا۔ ”دیکھئے صاحب۔“ ایک بولی۔ ”ہمیں دروازہ کھلنے میں کوئی عذر نہیں آپ شوق سے ٹکرائے لائیں لیکن۔۔۔“ ایلی نے اس کی بات کٹ کر کہا ”اگر اس لیکن کی وضاحت ہمیں اندر بلانے کے بعد کی جائے تو بہتر ہو گا۔“

جب دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہو گئے تو وہ نہایت سنجیدگی سے کہنے لگی۔ ”دیکھئے ملن ہے آپ ہمارے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ شاید آپ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ آپ کو ملاقات کی دعوت دینے سے ہمارا کچھ مقصد ہے۔ یہ خوش فہمیاں دل سے نکل دیجیے تو بہتر ہو گا اور اگر آپ نے کوئی نامناسب حرکت کی تو ہمیں بے حد دکھ ہو گا۔“

”ذرا پیچھے ہٹ جائیے محترمہ مجھے بو آتی ہے۔“ ایلی نے کہا۔ یہ کہہ کر وہ زمین پر جڑ بکریا ”بو۔“ وہ بولی۔ ”نہیں یہ پاٹ تو خالی پڑنے ہیں۔“

”نہیں پاٹ والی بو نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”لیکن ہم نے کوئی خوشبو تو لگا رکھی ہوئی نہیں۔“ ”لگائی ہو یا نہ بہر صورت آتی ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”آپ کی ساری قوم سے آتی ہے۔“ ”بڑے بد تمیز ہیں آپ۔“ وہ ہنسی

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”الٹا مجھے آپ سے شکایت ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ باتیں ہیں۔“

عین اس وقت جمل نے دیا سلائی سے موم بنی جلائی جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور پھر لے کرے کے پرلے کونے میں رکھ دیا۔

”ارے۔“ وہ چلائیں۔ لیکن جلد ہی سنبھل گئیں۔ ”تو آپ شکل و صورت دیکھنا چاہتے ہیں۔“ کچھ دیر تک وہ خاموش رہتی تھیں۔

پھر ایک بولی۔

”میں بند ہے آپ کو۔“

”میں بند ہے آپ کو۔“ ایلی نے کہا۔ لیکن جمل نے جا رہا تھا۔ اس کے انداز میں اتنی فطرت تھی کہ ایلی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ لیکن جمل نے جا رہا تھا۔ ”میں بند ہے آپ کو۔“ ایلی بولا۔ ”معموم اور پاکیزہ چٹ کپڑیاں بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”کیسے بہتر ہیں جو آنکھیں منکاتی ہیں لچاتی ہیں شرماتی ہیں اور کھلے۔۔۔“

”میں اسٹاپ ہے آپ کل۔“ وہ بولی۔

”میں اسٹاپ ہے آپ کل۔“ وہ بولی۔ ”میرا تو یہ خیال تھا کہ اندر میری رہائش باہر کی نسبت بہتر ہو جائے گی۔ لیکن یہاں آکر تو اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں رہی۔ بہت مل خطرناک ہو گئی ہے۔“

”تو خود ہی باہر نکل جائیے۔“ وہ جلال میں بولی۔

”خود نکلنے کوئی نہیں چاہتا۔“ ایلی نے کہا۔

”پہلے کہہ کر وہ آگے بڑھی۔“

”نہیں نہیں نہیں۔“ ایلی نے شور مچا دیا۔ ”خدا کے لئے مجھے جھوٹا نہیں میرا دل پہلے نکلا ہے۔“

”فنس پڑی۔“ آپ بھی عجیب ہیں۔ لیکن آپ انہیں تو بات کرنے دیتے ہی نہیں آپ لاکھ بات کیجئے۔“ اس نے جمل کو مخاطب کر کے کہا۔

”جمل من میں تو۔۔۔“ جمل نے آگے بڑھتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”ذرا بات کیجئے۔“ وہ بولی اور خود پیچھے ہٹ گئی۔

ملی بری

اس روز روشنی میں ایلی نے پہلی مرتبہ انہیں دیکھا۔ شکل و صورت طبیعت اور انداز میں جمل ایک دوسری سے مختلف تھیں بڑی کا چہرہ کتابی قنائتوش ستواں تھے۔ جسم دھلا پتلا موٹی لائیں آنکھوں میں غم کی جھلک ہونٹ پتے اور یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے کراہ دبائے ہوئے تھے۔ لہجہ لکڑی جیسے اور زندگی سے بھرپور تھا اس کا جسم بھرا بھرا تھا۔ ہونٹ یوں کھلے ہوئے تھے کہ لافینہ سن کے بیٹھی ہو۔ بڑی خاموش تھی نہ تو وہ کھیل کی متنی تھی نہ اس میں کوئی صلاحیت تھی چھوٹی میں جلال اور جمل کی عجیب آمیزش تھی دفعتاً۔۔۔ ہنستے ہنستے

دہاں جاتے ہوئے ایلی نے جمل سے کہا۔ ”یہ کیا کیا تم نے۔ سارا کیا کر لیا تباہ کر دیا۔“

جمل نے کہا۔ ”یار ایلی یہ لڑکیاں یونہی کیا کرتی ہیں۔ تمہیں کیا خبر۔“

ایلی نے چڑ کر کہا۔ ”وہ ایسی باتیں پسند نہیں کرتیں۔“

ایلی نے کہا۔ ”یار ایلی یہ لڑکیاں یونہی کیا کرتی ہیں۔“ جمل نے پہلی مرتبہ ایلی کے خیال سے اتفاق نہ کیا۔ ”تم اس

نام کی خاطر کیا کرتی ہیں۔“ جمل نے ایک بار احتجاج کریں گی پھر۔ ”وہ معنی خیز انداز میں ہنسنے لگا۔

ایلی کو فہم آ رہا تھا لیکن وہ خاموش رہا۔

”تمہاری مرضی۔“ وہ بولا۔ ”آخر یہ ساری رچنا تمہاری ہی رچائی ہوئی ہے۔“

جمل نے کہا۔ ”جمل بولا۔“ اس معاملے میں تم دخل نہ دو۔ بس دیکھتے جاؤ۔“

نہن دان مگر گئے نہ تو مگوریوں نے خط لکھا اور نہ انہوں نے رات کے وقت انہیں بلایا۔

جمل گہرا گیا اور اس نے از سر نو برساتی سے انہیں دیوانہ وار اشارے کرنے شروع کر

دے دیے۔ جمل کو دیکھ کر وہ ہنسنے لگا۔ رات کی ملاقات کے لئے اشارہ کرتا تو نفی میں سر

ہنسا۔

نہن دان روزانہ کا ایک لمبا چوڑا خط موصول ہوا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ جب تک آپ

نہن دان لائیں گے کہ بھونڈی اور فحش حرکات کے مرتکب نہ ہوں گے ملاقات نہیں ہوگی۔

اپ کے دوست آسکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ ہمیں یقین دلائیں کہ وہ آپ کو ساتھ نہیں لائیں

۔

”ایلی۔“ جمل نیم چھتی میں بیٹھ کر کہنے لگا۔ ”یار تم مجھے چھپا کر ساتھ لے چلو میں صرف

نہن دان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”نہن دان یقین کیوں نہیں دلا دیتے کہ تم ایسی حرکت نہ کرو گے۔“

”ایلی حرکت نہ کرنی ہو تو پھر راتوں کی نیند حرام کرنے کا فائدہ۔“ وہ بولا۔

”نہن دان اس موضوع پر سارا دن بحث کرتے رہے۔ جمل چاہتا تھا کہ ایلی اکیلا آنے کا

دعا کر ساتھ اسے لے جائے۔ لیکن ایلی کو یہ بات منظور نہ تھی۔ آخر جمل کو ایلی کی بات

پہنچا اور انہوں نے ایک مختصر خط میں انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ کوئی ایسی حرکت نہ

کرے۔

”نہن دان پہلی مرتبہ ایلی کا جی چاہا وہ اپنی طرف سے بھی ایک رقعہ لکھے۔ نہ جانے کیوں

وہ سنجیدگی اختیار کر لیتی اور پھر جلد ہی آپ ہی آپ ہنسنے لگتی۔ ان دونوں کے لبوں پر ہلکے

بظاہر ہنکار سے عاری تھیں۔

”آپ بیٹھ کیوں گئے۔“ چھوٹی نے کہا۔ ”اٹھ کر کوئی بات کیجئے۔“

”اونہوں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”ب جمل کی باری ہے۔“

”انہیں تو صرف ایک بات آتی ہے۔“ چھوٹی نے کہا۔

”وہ بھی سن لیجئے کیا حرج ہے۔ جب تک میری باچھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”باچھیں ٹھیک ہونے کا مطلب؟“

”محترمہ۔“ وہ بولا۔ ”بول بول کر میری باچھیں دکھنے لگی ہیں۔“

”ارے۔“ وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

”میں گھٹوں کا رہنے والا ہوں محترمہ۔“ وہ بولا۔ ”ہم تو کبھی کبھار عید شب بیکار

ہوتے ہیں۔ یا جب کبھی غصہ آجائے۔ آپ سی ایلر، زمان کو ملنے کا مجھے موقعہ نہیں ملا گی۔“

ازراہ مذاق وہ پختلی میں کہنے لگا۔

”ہن مینوں سلہ لے لین دیو۔“

”لے لو جی سلہ ڈھڈ بھر کے۔“ وہ ٹھیکہ پختلی میں بولتے ہوئے ہنسی۔

”ارے۔“ ایلی اٹھ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ”پختلی؟“

”ٹھیکہ۔“ پختلی۔“ وہ بولی

”پختلی فارسی اردو انگریزی۔“ ایلی مسخروں کی طرح منہ بنا کر چلا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“ دفعتاً وہ غصے میں چلائی۔ ”جمل صاحب ایسا فضل

نہ کیجئے۔“

”میری جان۔“ جمل بولا۔ ”میں کیا کروں میں مجبور ہوں۔“

”چلو باجی چلیں۔“ اس نے بڑی بہن سے کہا۔ ”چلو۔“

”خدا کے لئے۔“ جمل چلایا۔ ”میں تباہ ہو جاؤں گا۔“ اور پھر دھڑلے سے

گھر پڑا۔

”ارے۔“ ایلی اس کی طرف لپکا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”دیکھئے۔“ چھوٹی بیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولی۔ ”جب یہ ہوش میں آجائیں وہ انہیں

سے اٹھا کر لے جائیے گا۔ خدا حافظ۔“

اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ کچھ کہے۔ ایسی بات کہے جو تاروں کو چھیڑ دے ایسی بات جو کہیں نہ رہی ہو اور بھی کچھ کہہ دے۔ اسے اس بات کا شعور نہیں تھا کہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

ایلی نے پہلی مرتبہ یہ خواہش محسوس کی کہ وہ جمل کو نہ بتائے بلکہ چپکے سے رقم دے اور جمل کو علم بھی نہ ہو۔ چونکہ شعوری طور پر اس کا کوئی خاص مقصد نہ تھا اس نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ یہ تو محض چھیڑ چھاڑ ہے۔ لیکن دراصل اس نے چھیڑ چھاڑ کے بدلے وہ اس محفل میں اپنے لئے ایک مقام پیدا کر رہا تھا۔ اور جمل کو یہ بات کرتا تھا۔ ایسا انداز اپناتا تھا۔ جس سے جمل اور ایلی کا فرق نمایاں ہو۔ دونوں کا یہ حال تھا۔ ایلی نے کبھی اپنے آپ کو اس سلسلے میں مورد الزام نہ ٹھہرایا تھا نہ ہی اس نے سہا وہ چلائی سے اپنے دوست کو بھونڈی شکل میں پیش کر رہا ہے۔ اس کی ایسی حرکت اور باتوں کا مقصد کیا تھا یہ اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ شاید وہ گوریوں سے انتقام لے رہا تھا۔

نے اس پر ناقابل التفات کا لیبل لگایا تھا۔ جو تسخیر سے اس پر ہنسی رہی تھیں یا شاید اس وجہ ہو کہ ان کی رنگین باتیں سن کر ان کی خود داری اور ذہنی عظمت کو محسوس کر کے وہ ان سے محبت کرنے لگا تھا۔

جب جمل خط نقل کر کے چوبارے میں چلا گیا تو ایلی اپنا رقعہ لکھنے کے لئے بیڑی لکھنے کے لئے چار ایک سطور لکھیں۔ لیکن دوبارہ پڑھنے پر اس نے محسوس کیا کہ وہ سطور بے معنی تھیں۔ اس نے وہ ورق پھاڑ دیا اور پھر بے لکھنے لگا۔ لیکن سات آٹھ الفاظ لکھنے کے بعد اس نے پھر محسوس کیا کہ مضمون تاثر سے خالی ہے۔

گھڑی نے ایک بجایا اور ابھی وہ اپنا رقعہ مکمل نہ کر پایا تھا۔ یہ پملا دن تھا جب ایلی نے انہیں خط لکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ انہیں سوچے سمجھے بغیر بیسیوں خط لکھ چکا تھا۔ خطوں پر اسے سوچنا ضرور پڑتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی لکھے ہوئے خط کو پھاڑا نہ تھا۔ کبھی نہ کیا تھا کہ خط کا مضمون تاثر سے خالی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پملا دن تھا جب ایلی گوریوں سے لگاؤ محسوس کر رہا تھا۔ اگرچہ اسے اس لگاؤ کا شعوری احساس نہ تھا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب ایلی نے محسوس کیا کہ جو کچھ بھی وہ کہنا چاہتا ہے اسے لکھنا نہیں لایا جا سکتا اس لئے اس نے صرف ایک سطر لکھ کر ایک چھوٹا سا پرزہ جمل کے نام لکھ دیا۔ لکھا تھا۔

”اب نہ ملے محترمہ! اب ملاقات کی ہمت نہیں رہی۔ جب سے آپ سے خط لکھا“

ایلی نے اپنی باتوں کو ملاقات کا سلسلہ مسدود ہو جائے ورنہ —

ایلی کا وہ دن رنگ لایا اگلے روز دوران ملاقات جب ایلی نے کہا۔ ”اللہ کرے اب کی بار میں نہ رہا رہا ہو چلا کہ ملاقاتوں کا امکان ہی ختم ہو جائے۔“

”میں؟“ بڑی نے پوچھا۔ ”آپ کو کیا تکلیف ہے؟“

”میں تکلیف ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”کتنے سادہ لوح ہیں ہم کہ آگ سے کھیلنے کے لئے گھر میں آگ لگاتے ہیں۔“

”میں ہے آگ؟“ چھوٹی ہنسی۔

”اب ملاقات کی ہمت نہیں رہی۔“ ایلی نے کہا۔ ”اور —“

”میں اس وقت ایلی نے اپنے ہاتھ پر نرم سا دباؤ محسوس کیا۔

ایلی سمجھتا تھا کہ اس دباؤ کا مطلب اسے خاموش کرنا ہے، لیکن نہ جانے اسی دباؤ کی وجہ سے اسے غمناک تین دہائی کی وجہ سے جو اس دباؤ میں پنہاں تھی۔

اس کو نہانے کے جذبہ کی وجہ سے جو اس دباؤ سے ظاہر ہوتا تھا۔ ایلی جوش میں آگیا۔

”یہ کس نے مجھے چھیڑا۔ کون چھیڑ رہا ہے مجھے؟“ اس نے دہائی بچا دی۔

”کون چھیڑ رہا ہے ہمیں۔ مت چھیڑو انہیں؟“ چھوٹی ہنس کر بولی۔ ساتھ ہی ایلی نے دباؤ پھر لکھ دیا۔

”نہا“ اس نے بات کا رخ بدلا۔ ”سازنہ چھیڑو۔“ وہ بولا۔ ”مجھ میں تو پہلے سے ہی نفی تھا۔“

”نہا؟“ بڑی بولی۔ ”بڑا زعم ہے آپ کو اپنے آپ پر۔“

”زعم تو نہیں، اگر میں کر رہے ہوں ہو گیا تو پھر ہوش میں نہ آؤں گا اور لاش —“

”نہا؟“ بڑی نے ایلی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ایلی پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا اور وہ گھبرا کر بیٹھ گیا۔

”نہا؟“ بڑی نے ایلی کے قریب چھوٹی گھڑی تھی۔

”نہا؟“ بڑی نے چھوٹی سے پوچھا۔

”نہا؟“ وہ ہنسنے لگی۔

”کیسی دیکھی ہیں؟“ ایلی نے بے توجہی سے پوچھا۔

اس روز جب وہ ناؤ گمر لوٹ رہا تھا تو پہلی مرتبہ اس کے دل میں کچھ ہوا تھا اس پہلی مرتبہ وہ بے تعلق فاتح کی حیثیت سے نہیں لوٹ رہا تھا۔ بلکہ جیسے اس کا کچھ حصہ وہاں



جمل نے قہقہہ مار کر ایک بھر پور ہاتھ ایللی کے شانے پر مارا۔ ”یار لڑکیاں تو چہرے چلا رہی ہیں جھینپتی بھی ہیں، لجاتی بھی ہیں، نہ نہ بھی کرتی ہیں، لیکن ساتھ ہی چپٹی بھی جالی جالی۔“ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

”اچھا!“ ایللی بولا۔ ہمیں بھی پتہ چلا کسی ایسی لڑکی کا۔“

”مذاق نہ کرو یار۔“ جمل بولا۔ ”یہ باتی بھی خاموش لڑکی ہے اور نہ نہ کرتے ہوئے بہت کچھ برداشت کر لیتی ہے۔“

”تو یار۔“ ایللی نے نہ جانے کس خیال سے کہہ۔ ”کل ہم اپنی اپنی جگہ بدل نہ لیں۔“

”نہ نہ نہ۔“ وہ شور مچانے لگا۔ ”آپا تو مجھے ڈانٹنے کی۔“

”مجھے تو نہیں ڈانٹنی۔“ ایللی نے کہہ۔

”تمہاری بات اور ہے۔“ وہ بولا۔

”وہ کیسے؟“

جمل ہنسنے لگا۔ ”برانہ ماننا۔ تمہیں دونوں ہی پسند نہیں کرتیں اس لئے۔“

”چلو یہ بھی اچھا ہے۔“ ایللی بولا۔ ”جان چکی لاکھوں پائے۔“

یہ باتیں ایللی شاید اس لئے کر رہا تھا کہ وہ بات کو راز بنا کر محفوظ کر لیتا چاہتا تھا۔ اس کا راز بتانا بذات خود اس بات کا شاہد تھا کہ وہ آپا سے تعلق محسوس کرنے لگا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ جمل کے رویہ کوئی ایسی بات کرے جس سے آپا پر حرف آئے۔

اس روز ایللی سارا دن مضطرب رہا۔ وہ پہلا دن تھا جب اس نے اس کھیل کو اہمیت دے تھی۔ ان کیفیات کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جو اس نے سفید منزل کے زینے میں محسوس کی تھیں۔ اس روز وہ ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکا۔

شام کو جب وہ دونوں نیم چھتی میں بیٹھے تھے تو نیچے سے بھا آیا۔ ”یہ تمہارا گھر ہے۔“ نے تار جمل کی طرف بدھلتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری بیوی بیمار ہے تمہیں بلایا ہے۔“ لیکن یار۔“ نے حیرت سے کہہ۔ ”تم شادی شدہ ہو جمل یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا؟“

”کئی لوگوں کو اب تک معلوم نہیں۔“ ایللی نے با معنی انداز سے کہہ۔

جمل تار پڑھ کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے کی حالت بدل گئی۔ ”یار مجھے جانا ہوا۔“ کوئی گاڑی جاتی ہے اس وقت؟“

”لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں، بیماری عام سی معلوم ہوتی ہے۔“

”نہیں یار۔“ جمل بولا۔ ”مجھے اپنی بیوی سے بڑی محبت ہے۔“ اس کی آنکھیں پر نرم

نہیں۔ گاڑی میں بیٹھ کر پہلی مرتبہ جمل کو خیال آیا کہنے لگا۔ ”یار ایللی تم تو شاید اب ان سے ملنے جا رہے۔“ لیکن ایک مرتبہ تو جانا ہی پڑے گا ضرور جانا کہیں ان سے یہ نہ کہہ دیتا یار کہ بیوی پارہے بلکہ کہنا والدہ کی بیماری کا تار آیا تھا یار انہیں یہ معلوم نہ ہو کہ میں شادی شدہ ہوں۔“

ہولڈ اپ

رات کو جب گوریوں نے دیکھا کہ ایللی اکیلا ہی آیا ہے تو باتی بولی۔ ”وہ کہاں ہیں؟“ ”مے گاؤں جانا پڑا۔“ ایللی نے انہیں تار کے متعلق بتایا۔ پھر وہ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ دونوں اس کے دائیں بائیں آکھڑی ہو گئیں۔

”یہ بات تو غلط ہے۔“ اس نے شور مچا دیا۔ ”آپ دو اور میں اکیلا۔“ دونوں نے اس کے ٹانگوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”ہاتھ لگانا فاول ہے۔“ وہ چیخنے لگا۔ پھر اسے دفعتاً ”سوچھی“ دیکھیے جی۔“ وہ بولا۔ ”شاید آپ نے میرے متعلق کوئی خوشی فحشی پال رکھی ہو۔ شاید آپ سمجھے بیٹی ہوں کہ ملاقات سے برا لگتی خاص مقصد ہے میرانی سے یہ خیال دل سے نکل دیں۔“

”انتقام لینے میں تو آپ کا جواب نہیں۔“ آپا ہنسنے لگی۔

”نہیں نہیں انتقام کی بات نہیں۔ ابھی کل کی مصیبت سر سے نہیں ٹلی۔“

”کل کی مصیبت کیا۔“ انہوں نے پوچھا۔

”کل رات کسی کی لاپرواہی سے ایک خوشبو دار رکتیں ہاتھ میرے چہرے سے چھو گیا تھا یا شاید کسی نے شرارت کی ہو۔ ایمان سے ابھی تک جھنجھٹا ہوا ہوں۔ اصل میں میرا دل بہت کھو رہا ہے اور مجھ پر شاید آپ کو معلوم نہیں میں اپنی ماں کا اکھوتا بیٹا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ زمین پر گر پڑا۔

”یہ کیا کرتے ہیں آپ؟“ وہ چلائیں۔ ”زمین پر بیٹھ جاتے ہیں اس طرح۔“

”آپ نے بددقیق جو اٹھا رکھی ہیں۔“ کوئی تو وہاں بیٹھا رہتا ہوں۔“

”بددقیق۔“ کون سی بددقیق۔“ بیوی نے پوچھا۔

”جو آپ نے بظنوں میں دبا رکھی۔“ ایللی رک گیا۔

”رہے۔“ ایلی چلایا۔  
 ”خاموش کھڑے رہئے۔“ آپانس کر بولی۔  
 ”لیکن یہ کیا ہے۔“ ایلی نے بھولے بن کر کہا۔  
 ”تجربہ نہیں صرف آپ کو آنے کا مطلب سمجھا رہی ہوں۔“  
 ”لیکن میں تو کچھ بھی نہیں سمجھ رہا۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”یہ اور بھی اچھا ہے۔“ وہ بولی۔  
 ”مجھے تو ایسے معلوم ہو رہا ہے جیسے اپنا ہولڈ اپ ہو گیا ہو۔ لیکن میری کمر میں دو پستول کی  
 ہاں رکھے کا مطلب؟“

”خاموش۔“ وہ ہنستے ہوئی بولی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ ایلی کے منہ پر رکھ دیئے۔  
 ”دیر تک وہ دونوں خاموش کھڑے رہے۔  
 ”بڑبڑھوں سے باقی کی آواز سنائی دی۔“ ”آپا جلدی آؤ۔ جلدی!“  
 اس نے ایلی کو زور سے بھینچا۔  
 ”کل ضرور آئے گا۔“ وہ بولی۔ ”ضرور۔“  
 ”گور اگر نہ آؤں تو؟“ ایلی نے کہا۔  
 ”کیسے نہ آئیں گے آپ۔“ وہ بولی۔ ”نہ آئے تو میں خود ناؤ گھر آؤں گی۔“  
 ”اتنی جرات۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”میں سے بھی زیادہ۔“ وہ بولی۔ آپ نے سمجھا کیا ہے؟“  
 ”میں تو صرف یہ سمجھتا ہوں کہ ایک خوبصورت شوخ رنگین اور دست دراز لڑکی۔“

”دست دراز۔ اچھا تو یہ لیجئے۔“ اس نے پیار سے ایلی کے منہ پر چپت ماری۔ ”ضرور آئیے  
 ”گور بڑبڑھیاں چڑھنے لگی۔ ایلی نے لپک کر اس کا دہنہ کھینچ لیا۔  
 ”کیا بد تمیزی ہے؟“ وہ بولی۔  
 ”بڑبڑھیاں نہیں ضرورت ہے میں اس کے رومل بناؤں گا۔“  
 ”مہلا۔“ وہ ہنسی۔ ”تو بنا لیجئے۔“ اور بڑبڑھوں میں گم ہو گئی۔  
 ”ملاوطن ایلی سوچتا رہا اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ رومان کا کھیل جو تفریحاً شروع ہوا

”چپ چپ۔“ چھوٹی چلائی۔ ”آپ بھی غضب کرتے ہیں۔“  
 ”لیکن۔۔۔“ ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

اندھیرے میں پھر وہی ہاتھ اس کے منہ پر آٹکا۔  
 ”جھن جھن جھن جھن۔“ وہ شور مچانے لگا۔  
 ”کیا ہوا؟“ باقی نے پوچھا۔ آپا نے چپکے سے ہاتھ اٹھالیا۔  
 ”جھنجھنا بن گیا ہوں۔ مجھے بچائیے۔ خدا کے لئے مجھے کوئی بچائیے۔“  
 ”دیر تک وہ ہنستی رہیں۔ پھر کسی نے چپکے سے اسے چٹکی بھری۔  
 ”تمہارے گھر میں آیا ہوں جو جی میں آئے کر لیجئے اور پھر آج ہی کا تو دن ہے۔“  
 ”کیوں؟“ آپا بولی۔  
 ”میں تو صرف یہ پیغام دینے آیا تھا کہ جمل نہیں آسکے گا کچھ روز کے لئے۔“  
 ”لیکن آپ تو آئیں گے نا؟“ چھوٹی نے پوچھا۔  
 ”آنے کا مطلب؟“ ایلی نے کہا۔  
 ”تو کیا آنے کا کوئی مطلب نہیں؟“ آپا بولی۔  
 ”آپا نے چٹکی بھری اور بولی۔ ”آپ ہی بتائیے۔“  
 ”میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میری حیثیت کھانے میں نمک کی سی ہے۔ کھانا نہ ہو تو خالی نمک  
 پھانکنا ہے۔“  
 وہ خاموش ہو گئیں۔ ”اب آپ سے کون بحث کرے لیکن آپا پڑے گا روز آپا پڑے گا  
 سمجھے آپ ورنہ۔“

”ورنہ کیا؟“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”ورنہ کیا بتایا نہیں جاتا عمل میں لایا جاتا ہے۔“ آپا ہنسی۔  
 اس وقت اوپر سے ایسی آواز آئی جیسے کسی نے بڑا سا برتن دیوار سے دے مارا ہو۔  
 ”یہ کیا تھا باقی؟“ آپا نے پوچھا۔  
 ”معلوم نہیں۔“ باقی نے کہا۔ ”میں دیکھتی ہوں ابھی آئی۔“ کہہ کر وہ دبے پاؤں پڑھیلیا  
 چڑھنے لگی۔

ایلی باہر کھڑکی سے جھانک رہا تھا کہ باہر تو کوئی نہیں۔  
 دفعتاً آپا نے پیچھے سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

کہیں آپ ڈرتے ہیں۔“ وہ بولی۔

”ہاں۔“ ایللی نے کہا۔ ”تم نہیں جانتی کہ میں تم سے کتنا ڈرتا ہوں۔ میں تمہارے حسن سے نہیں ڈرتا تمہارے جسم سے نہیں ڈرتا۔“ ایللی کی آواز بھرا گئی۔ ”میں تمہاری نگاہ کرم سے برا ہوں میں تمہاری رہنمائی سے ڈرتا ہوں میں تمہاری جرأت سے ڈرتا ہوں۔“

”آپ عجیب باتیں کرتے ہیں۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”جی باتیں عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ ہم سچ سے اس قدر بیگانہ ہو چکے ہیں۔“

”جی۔“

”چھوڑیے ان فلسفوں کو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ”کوئی ہنسی خوشی کی بات کیجئے۔“

”آج مجھے جی باتیں کہہ لینے دو پھر شاید کبھی موقع نہ ملے۔“ ایللی کے انداز میں اس قدر ناز تھا کہ وہ خاموش بت بنے کھڑی رہی۔

”تم سمجھتی ہو کہ میں مسخرا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”مسخر اپن تو خفت ملانے کے لئے تھا۔ میرے بل نہرے نہیں ناس لئے۔ میرا رنگ —“

”خاموش ہو جائیے۔“ وہ چیخ کر بولی۔ ”خاموشی ورنہ میں منہ پر ہاتھ رکھ دوں گی۔“

”منہ پر ہاتھ رکھنے سے دل کی بات تو نہیں نکلتی۔“ ایللی نے کہا۔

”ہم نہیں سنتے آپ کے دل کی بات۔“ وہ بولی۔

ایللی نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے۔

”اچھا نہ سنو۔“

دیر تک وہ دونوں خاموش کھڑے رہے۔

”کوئی بات کیجئے نا۔“ وہ چلائی۔

”کر تو رہا ہوں۔“ ایللی نے کہا۔

”کہیں آپ تو خاموش کھڑے ہیں۔“ وہ بولی۔

”یہ خاموشی بھی تو اک اظہار ہے۔“ وہ بولا۔ ”میرا منہ بند کر دو گی تو میرے ہاتھ بولیں گے۔“

”یہ تو سناکت پڑے ہیں۔“ اس نے ایللی کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

”یہ اپنے ہاتھ اٹھاؤ۔“ وہ بولا۔

تھا۔ یکدم کیسی کروٹ لے گیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کون تھیں وہ تو ان کے پاس سے بھی واقف نہ تھا۔ اس نے کئی مرتبہ ان سے پوچھا تھا۔

”اپنا نام تو بتا دیجئے۔“ اور جواب میں انہوں نے کہا تھا۔

”نام سے کیا فرق پڑتا ہے جی کچھ سمجھ لو۔“

صرف یہ سمجھا ہوں کہ تم میں ایک ہاں جی ہے اور ایک نہ جی اب یہ تم خود فیصلہ کرو کہ ہاں جی کون ہے اور نہ جی کون۔“

سارا دن وہ سوچتا رہا تھا کہ اس ڈرامے میں جو سفید منزل کے زینے میں کھیلا جا رہا تھا اس کردار کیا تھا۔ وہ ان گوریوں کے کردار کا معترف تھا ان کی جرأت ان کی عظمت اور رہنمائی کے ادبی ذوق پر متعجب تھا لیکن —؟

ایللی اس لیکن کا جواب نہ دے سکتا تھا۔

نیم چھٹی میں لیٹے ہوئے اس طرف کھڑکی میں سے چھوٹی جھانکتی۔ ”لیجئے میں آگئی ہوں کمر میں آگئی۔ آپ سے ملنے کے لئے نہیں دیے ہی۔“ اس کے چہرے سے عجیب سی مسرت لڑکی اور زندگی کا اظہار ہوتا تھا۔ ”اٹھیے اٹھیے آپ او اس کیوں ہیں؟ یوں لیٹے ہوئے ہیں۔ جیسے کسی کچھ ہار کر آئے ہوں۔ آپ نے کچھ بھی نہیں ہارا۔ جنہوں نے ہارا ہے ان سے پوچھئے۔“

اس طرف زینے میں شہزاد اکھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ مغموم تھا۔ میں جانتی تھی۔ کیا انہم ہو گا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ ہماری کہانی ہی ایسی تھی۔ جس کا انجام نہیں ہو سکتا چلو اچھا ہوا تمہیں مناسب ساتھ مل گیا۔“

ایللی گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور پھر سوچ میں پڑ جاتا۔

گھڑی نے نو بجائے تو وہ چونکا اور پھر سوچے سمجھے بغیر اس نے پہلی بار محبت بھرا خط لکھا اور اسے پڑھتے وقت پہلی مرتبہ شدت سے محسوس کیا کہ اس کے دل میں کس قدر جذبات لٹ رہے تھے۔ خط لکھ کر اس نے اس کا گولہ سایا کر اپنی جیب میں ڈال لیا اور پھر لیٹ گیا۔

اس رات جب وہ سفید منزل میں داخل ہوا تو اکیلی چھوٹی موجود تھی۔

”تم اکیلی ہو کیا؟“ ایللی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ بولی۔ بائیں کی طبیعت اچھی نہیں۔“

نہ جانے کیوں یہ سن کر ایللی گھبرا گیا۔

”کیوں؟“

”یہ مجھ سے باتیں کرتے ہیں اور پھر سارا دن گھر بیٹھے ہوئے مجھے ان کی باتیں یاد آتی ہیں۔“

”آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“ وہ چلائی اس کی آواز میں بلا کا اضطراب تھا۔ ”مگر کی تم پر بھی ایک ہی دن سوار ہے۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ چلائی۔

”جیسے سنہرے بالوں کے بارے میں کہتی تھی۔“ ایللی نے کہا۔ ”مجھ کو بھی ڈانٹ ڈھنکنا۔“

”نہیں تو۔“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”آپ تو بڑے ہی اچھے ہیں۔ جمال صاحب کی بات اور ہے۔“

”وہ تو مجھے معلوم ہے۔“ ایللی نے طنز بھرا تیر چلایا۔

”ہائے اللہ کیا آپ مجھے کبھی معاف نہ کریں گے۔ جمال تو یہ سمجھتے ہیں۔ جیسے ہم دلدل ہوں۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”اور وہ سوچتے ہیں کہ کس طرح منہ میں ڈال لوں۔ سگرت پکڑے آپ۔“ غالباً وہ بات بدلنے کے لئے کہنے لگی۔

## سلگا سگریٹ

”ہاں۔“ ایللی نے کہا۔ ”بیویں کا بشرطیکہ تم سلگا کر دو۔“

”یہ کیا ضد ہے۔ آپ ہر مرتبہ یہی کہتے ہیں۔“

”ضد تو نہیں۔“ ایللی نے کہا۔ ”درخواست ہے۔“

”یہ کبھی ہو سکتا ہے کیا؟“

”کیا نہیں ہو سکتا۔“ وہ بولا۔

”بہت زعم ہے آپ کو۔“

”جی ہے۔“

”تو پی کر دکھائیے وہ سگریٹ جو میں نے سلگایا ہو۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”مجھ سے ضد نہ کیجئے۔ میں بہت ضدی ہوں۔“ ایللی نے کہا۔

”بھیس۔“ وہ بولی۔

”چال۔“ وہ بیٹھ گیا۔ ”اب میں سے اس وقت اٹھوں گا۔ جب آپ کا سلگایا ہوا سگرت میرے ہاتھ میں ہو گا۔“

”چلے پونی سسی۔“ وہ جوش میں آگئی۔ ”تو لیجئے میں چلی خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر وہ بڑھتی پڑھنے لگی۔ ”اب بھی مان جاؤ ضد چھوڑ دو۔“ وہ بیڑھیوں سے بولی۔

”سگرت سلگا دیجئے۔“ ایللی نے کہا۔

کچھ دیر تک اس کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی پھر خاموشی چھا گئی۔ ایللی چپ چاپ بیٹھا رہا۔

پہلے تو اسے امید تھی کہ وہ ابھی لوٹ آئے گی۔ آخر وہ ان کے مکان میں بیٹھا تھا اور اس کا خط ان کے ذمہ داری تھی۔ اس لئے وہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے دل میں شک پیدا ہونا شروع ہو گئے اگر وہ نہ آئی تو — اگر کوئی بات استعمال کرنے کے لئے اس کمرے میں آگیا تو —

ایللی بنیادی طور پر بے حد ڈر پوک واقع ہوا تھا۔ لیکن کبھی اس کی زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے تھے جب وہ نتائج سے لاپرواہ ہو کر اسی حد تک بڑھ جاتا تھا، جس حد تک بنیادی طور پر ڈر پوک تھا۔

کچھ دیر تک وہ بے حد متذبذب رہا پھر اس نے اپنا دل کڑا کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس روز وہ اپنی بات منوانے میں ناکام رہا تو آپا کے دل میں اس کے لئے تحقیر کا جذبہ پیدا ہو جائے گا اور اس رنگین لڑکی کے دل میں اپنے لئے تحقیر کا جذبہ پیدا کرنے کی لئے وہ تیار نہ تھا۔ وہ اس بات سے غافل تھا کہ وہ کیا کہے گی۔ آہستہ آہستہ یہ ڈر حاوی ہوتا گیا فوراً کسی کے آجانے کا خوف دم بڑھ گیا حتیٰ کہ وہ وہاں یوں بیٹھا تھا جیسے سفید منزل نہیں بلکہ نیم چھتی ہو۔

ایک محض گزر گیا دو گھنٹے گزر گئے دور کسی مسجد سے پہلی اذان کی آواز سن کر وہ ٹھٹھکا کر اُسے وہ سوچنے لگا صبح ہو گئی۔ پھر چاروں طرف سے مؤذنوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کلی محلہ دروازے کھلنے لگے۔ نمازیوں کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

دفتر قریب ہی پاؤں کی چاپ سنائی دی وہ ٹھٹھکا۔ پھر کسی نے دیا سلائی جلائی باجی کو قریب کمرے دیکھ کر وہ مطمئن ہو گیا۔

جی آکر وہ چلی گئی اور ایللی تنہا رہ گیا۔

انٹا "اس کی نگاہ کھڑکی کی طرف پڑی۔ باہر صبح کی سپیدی پھیلی ہوئی تھی۔

اب اس کا ڈر قطعی طور پر مفقود ہو گیا تھا چونکہ اب عزت کا معاملہ تھا اور وہ بھی ایک حریف کے دل میں۔ اس وقت وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ہر خطرے کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ سفید

داخل میں داخل ہو کر چلا چلا کر کہا سکتا ہے میں چور ہوں مجھے پکڑ لو۔ میں چور ہوں۔  
قرب ہی کسی گھڑی نے چھ بجائے۔ دفعتاً اسے یاد آیا کہ اس کی جیب میں محبت نامہ تھا  
وہ لکھ کر گھر سے لایا تھا۔ جب وہ اس کی تلاشی لیں گے تو خط برآمد ہو جائے گا اور راز کھل  
جائے گا اس میں گوریوں کی عزت کا سوال ہے۔ نہیں نہیں میں ان کی عزت پر آنچ نہ آنے  
دلاں گا اس نے خط کا وہ گولہ جیب سے نکالا اور قریب پڑے کاٹھ کباڑ میں اسے چھپا دیا اور پھر  
ملین ہو کر بیٹھ گیا۔

گھڑی نے سات بجائے وہ اٹھ بیٹھا۔ کھڑکی سے سورج کی شعاعیں اندر داخل ہو رہی تھیں  
ان نے کھڑکی بند کر دی اور درز سے باہر دیکھنے لگا۔ قبرستان سنسان پڑا تھا۔ گلی میں چند بچے  
کھیل رہے تھے۔ پرلے بازار میں اکا دکا لوگ چل پھر رہے تھے۔ دیر تک وہ وہاں کھڑا دیکھتا رہا۔  
پہاں کی آہٹ سن کر وہ مڑا زینے میں کوئی آ رہا تھا۔ وہ جھٹ آتی پانپتی مار کر بیٹھ گیا۔

اس کے رو برو سادی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ "آپ بڑے ہٹ دھرم ہیں۔" وہ بولی۔  
"جو کچھ بھی ہوں حاضر ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اب آپ جائیں گے کس طرح؟" سادی نے پوچھا۔  
"جائے گا مسلمان ہو جائے گا گوری تو بھکاری چلے جائیں گے۔" ایللی نے کہا۔  
"اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟" سادی بولی۔

"کچھ گامبھاری ہے بھکشالے کر جا رہا ہے۔" ایللی نے جواب دیا۔  
"شکل سے تو بھکاری نہیں دکتے۔" وہ ہنسی۔

"ہل شکل سے تو چور دکھتا ہوں۔ لیکن شکل کون دیکھتا ہے۔"  
"آپ بڑے نڈر نکلتے۔" سادی کی نگاہ میں تحسین جھلک رہی تھی۔

"تو نمول۔" ایللی نے کہا۔ "مقابلہ ایسے مہلویو سے تھا کہ اسے دیکھ کر اپنے میں بھی کچھ کچھ  
لڑکت پیدا ہو گئی۔"

آپ کی باتوں نے مجھے — "وہ رک گئی اس کی آواز آبدیدہ تھی۔

"یہ کیا حماقت ہے؟" بائی نے کہا۔ "آپ جانتے کیوں نہیں اگر کوئی آگیا تو۔" اس نے  
خوف زدہ ہو رہا تھا۔

"ابھی چلا جاتا ہوں۔" وہ بولا۔

"تو پھر جائیں نا۔ آپ کو ہماری عزت کا خیال نہیں کیا؟" وہ بولی۔

"سگ کر سگرت پلا دیجئے تو ابھی چلا جاؤں گا۔" ایللی نے کہا۔

"یہ کیا فضول سی ضد ہے؟" وہ غصے میں بولی۔

"ہے کیا کیا جائے؟"

"لیجئے میں سگائے دیتی ہوں سگرت۔" بائی نے کہا۔

"اونسوں۔" ایللی نے نفی میں سر ہلادیا۔

"کیوں میری سگلی ہوئی پسند نہیں؟" اس نے عجیب انداز سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر  
کہا۔

"تم نے ہمارا اعلان نہیں کیا" وہ یوں بولا جیسے جتنی سستی یوگی ہو۔

"ہے میں کیا کروں؟" وہ چلائی۔ "اوپر سادی ضد کئے بیٹھی ہے۔"

"سادی؟" ایللی نے دہرایا۔

"ہاں! گھر والے اسے سادی کہتے ہیں۔" بائی نے کہا۔

"اور آپ کو مرصع کہتے ہوں گے؟"

"نہیں تو۔" وہ ہنسی۔ "مجھے تو بائی ہی کہتے ہیں۔ لیکن اب آپ جائیں گے بھی یا نہیں؟"

کیا بچوں کی سی ضد ہے۔

"بچے کبھی نہیں سمجھا کرتے۔" ایللی نے کہا۔

"تو پیٹتے بھی ہیں۔" وہ بولی۔

"پیٹنے کے لئے کوئی اور آئے گا۔" وہ بولی۔ "ہے کوئی آگیا تو سمجھ جا چوری۔"

"تو کہہ دینا ڈاکو ہے چور نہیں۔" ایللی بولا۔

"خدا کے لئے چلے جائیں۔" وہ فٹیں کرنے لگی۔

"سگ ہو اسگرت، سگ ہو اسگرت۔" ایللی نے رٹ لگا دی۔

"مان جائیے۔" بائی نے منت کی۔

"سگ ہو اسگرت۔" ایللی گویا وظیفے میں مشغول ہو گیا۔

”نہیں۔“ ایللی نے کہا۔ ”تم اوپر جنگلے میں جا کر کھڑی ہو جاؤ۔“

”نہیں۔“ وہ چلائی۔ ”پھر وہی ضد۔“

”اچھا۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔ وہ اس کے قریب تر ہو گئی۔

ایللی چپ چاپ باہر نکلا کچھ دیر دروازے میں رکا۔ وہ وہاں سے یوں اطمینان سے نکلا جیسے ایللی کا اپنا گھر ہو۔ پھر خرابی خرابی گلی میں چل پڑا۔ دروازے کی درز میں سے ایک پر غم آنکھ لے دیکھ رہی تھی۔

### رنگی سادی

اس سگے ہوئے سگریٹ نے گویا آگ لگا دی اور اس گولے خط نے اس پر بارود چھڑک دیا۔ اگلے روز ایللی کے سامنے سادی کا خط پڑا تھا۔ ایسا خط پہلے انہیں کبھی موصول نہ ہوا تھا وہ خط ہلہ مفتاح پر مشتمل تھا۔ جس میں سادی نے بھی کچھ شامل کر دیا تھا۔ کوئی بات تھی جو رہ گئی تھی۔ کبھی وہ اسے چھپرتی، مذاق کرتی، کبھی بسلامتی پھسلاتی، کبھی جرات دلاتی کبھی تعریف کرتی کبھی ہنسی ہنساتی کبھی روتی رلاتی۔ وہ خط ایک کائنات تھی جسے پڑھ کر ایللی ساکت و جامد رہ گیا تھا وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے ایک طوفانی رو بہ رہی تھی۔ لیکن جھولا جھلار رہی تھیں تھیں بڑھتی تھیں۔ سستی تھیں ساکن ہو جاتی تھیں۔

خط پڑھ کر وہ شرابور ہو گیا۔ تحریر کس قدر برجستہ اور بے تکلان تھی اشعار کس قدر موزوں اور بلند پایہ تھے۔ اشارے کسی قدر رنگین اور لطیف تھے بات سے بات ٹپکتی تھی اور ہر بات کی لوث میں وہ ان کی بات چھپی تھی جو ان کے نئے تعلق کی مظہر تھی۔ بات بات میں وہ ان کی بات بیل تھی واضح تھی اجاگر تھی۔ اس حد تک واضح ہو جاتی تھی کہ کسی بات پس پشت پڑ جائے۔

سارا دن وہ اس خط کے سمندر میں ڈبکیں کھاتا رہتا رہتا کہ وہ اس شوق مگر خوددار شخصیت میں ڈبا رہتا اور اگلے روز ایک نیا خط اس کے سامنے پڑا ہوتا۔

رات کو جب باہی اور سادی دونوں موجود ہوئیں تو وہ باہی کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جاتا اور باہی سے مخاطب ہو کر کنایہ کی مدد سے سادی سے باتیں کرتا۔ وہ مزاح کے پردے میں آنسو بہاتا حاضر جوابی کی لوث میں اپنے گنگے پن کا دکھڑا دوتا اور سادی اس کی ہر بات کو پابا جاتی اور

”آپ کے انداز نے مجھے —“ وہ بھی رک گیا۔

”کیا؟“ وہ بولی۔ ”پوری بات کیجئے نا۔“

”مجھے کیا سے کیا کر دیا۔“ اس نے کہا۔

”سگریٹ کہاں ہیں؟“ وہ بولی۔

”مجھے کیا معلوم۔“

”میں سارا پیکٹ سلگا کر دوں گی۔“ وہ سگریٹ سلگانے لگی۔

”دان کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ ایللی نے کہا۔

”چپ کرو جی۔“ وہ غصے میں بولی۔ اس کا غصہ پیار سے بھیگا ہوا تھا۔

”سادی۔“ وہ کچھ دیر کے بعد کہنے لگا۔

”وہ چوگی —“ ”سادی! آپ کو کیسے معلوم ہوا؟۔“

”تمہاری اس دیا کے عوض میں ایک ختہ پیش کروں۔“

”دیا۔“ وہ ہنسی۔ ”ہم تو ہر گئے۔“

”ہاں!“ ایللی نے کہا۔ ”کچھ لوگ ہار کر جیت جاتے ہیں اور کچھ۔“ اس نے تو بولی

”کچھ جیت کر بھی ہار جاتے ہیں۔ تمہارا ہاتھ کہاں ہے؟ دکھاؤ۔“

سادی نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ ایللی نے وہ کانٹہ کا گولا اٹھا کر اس کے ہاتھ میں رکھا اور ہر گز

بند کر دی۔ ”برگ سبزا ست —“ وہ بولا۔

”یہ لیجئے اپنے سگریٹ۔“ وہ بولی۔ ”اب آپ جائیں۔ لیکن آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے

تھا۔ پھر نہ ایسا کیجئے گا کبھی وعدہ کرو۔“

”کیوں؟“ وہ بولا۔

”میں بہت ضدی ہوں۔“ سادی نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”مجھے دیکھ

کہ —“ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”وعدہ کیجئے۔“

”وعدہ کرتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”تو خدا حافظ۔“

”نہیں۔“ ایللی نے کہا۔ ”تم جاؤ پھر میں باہر نکلوں گا۔“

”نہیں۔“ سادی نے کہا۔ ”اگر کچھ ہو گیا تو میں قریب تو ہوں گی۔“

وہ بے جملے بولے جاتا جیسے لکنت کا مریض ہو۔  
”سادی جمل آئے گا تو۔“

”تو کیا؟“

”کیا ہوگا؟“

”کچھ بھی نہیں۔ باجی بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی ہیں۔“

”تم اور باجی اس قدر مختلف کیوں ہو؟“

”کیسے؟“

”تم نہ جی ہو وہ ہاں جی۔“

”میری باجی ایسی نہیں۔“ وہ غصے میں بولی۔ ”میں آپ کی سب باتیں سمجھتی ہوں۔“

”ہلو کوئی ہمدرد تو ملا۔“

”ہمدرد؟“ وہ چلائی۔

”تو کیا ہو تم؟“

”آپ ہمیں نہیں جانتے۔ آپ نہیں سمجھتے۔ نہیں سمجھ سکتے؟“ سادی چیختی

”ممنہ ہو۔“ ایللی پوچھتا۔

”نہیں۔“

”تو پھر۔“

”بس کہ جو دیا آپ ہمیں نہیں سمجھتے۔“

”تو سمجھا دیجئے۔“

”کس گھر کی ہر موم جی دونوں سروں پر جلتی ہے۔“ سادی مسکرا کر کہتی۔

”تو کیا یہاں دیوالی ہے؟“

”ہاں ہر سہ دیوالی ہے۔ میرے ہنستے چہرے پر نہ بھولے۔“

”تو کیا آپ روتی ہیں؟“

”مجھے ٹسوے بہانا نہیں آتا۔ آنسو بہانا نہیں آتا۔“

”تو پھر۔“

”نہ کیجئے اس موضوع کو۔ آپ نہیں سمجھ سکیں گے۔“

اس کے قریب ہوتے ہوئے تڑپتی۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپتی اور پھر جھجک کر کہتی آپ باجی! کریں نہ کریں۔ لیکن اس کے اضطراب کا باجی پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ محسوس کرتا کہ اس نے ہاتھوں تلے باجی پکھل کر چھلک رہی ہے۔ اس کی اس چھلکن کی وجہ سے ایللی پر جھپٹے پڑتے۔ اس کی لئے مشکلات پیدا کر دیتے آسمانیاں نہیں۔ باجی چھلک چھلک کر ہار جاتی اور اس پر ہاتھ جاتا اور پھر وہ محروم نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھتی اور اس کی نگاہیں اور بھی لولہس جاتیں۔

”آپ میری باجی کو تنگ کر رہے ہیں۔“ سادی قریب تر آ جاتی۔ ”چھوڑ دیجئے باجی! بہت برے ہیں باجی ان کی باتوں میں نہ آؤ۔ ان کی باتیں نہ سنو۔ ورنہ تم پانی ہو کر بہہ جاؤ گی۔ وہ تیرا کہ ہیں جو اس پانی میں تیر کر نکل جائیں گے۔ یہ ڈوبتے نہیں۔“

”ہاں! ایللی نے کہا۔“ ”میں ڈوبتا نہیں بلکہ ڈوبے جاتا ہوں“ ڈوبے جاتا ہوں۔ ڈوب جاؤں تو کتنا اچھا ہو۔“

”پھر وہی باتیں۔“ سادی چلائی اور پھر بات کا رخ بدلنے کے لئے کچھ نہ کچھ کہہ دیتی۔

”باجی آپ نے انہیں میرا نام کیوں بتایا؟“

ایللی جواب دیتا۔ ”ہاں تم بھی انتقام لو باجی سے تم اس کا نام بتا دو مجھے۔“

سادی ہنستی۔ ”کتنے چالاک ہیں آپ۔“

”سادی کیا نام ہے۔“ ایللی چلایا۔

”مجھے بہت پسند ہے۔“ سادی ہنس کر کہتی۔

”مجھے نہیں۔“ ایللی منہ بنا دیتا۔

”کیوں؟“

”غلط نام ہے۔“

”غلط کیسے؟“

”رنگی ہونا چاہئے۔ رنگی کو سادی کہیں دیکھ کبیرا ہنسنے۔“ ایللی قہقہہ مار کر کہتا۔

اس طرح وہ بچوں کی طرح باتیں کرتے رہتے۔

اور اگر سادی اکیلی آتی تو ایللی کو پسینہ آ جاتا۔ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کہے۔

اس کی آواز میں وہ بے پروائی بے نیازی ختم ہو جاتی اور وہ بھیجی بھیجی آواز میں ہوتا۔



”تو سمجھ کر کرنا ہی کیا ہے؟“ ایلی کہتا۔ ”تم تم ہو اور یہی کافی ہے۔“  
پھر وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی اور ایلی چلاتا جھن جھن جھن جھن

## واپسی

آٹھ روز کے بعد جب ایک روز ایلی نیم چھتی میں بیٹھا سادی کا تازہ خط پڑھ رہا تھا تو اس نے نگاہ اٹھائی زینے میں جمال کھڑا تھا۔ جمال کو دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا وہ آٹھ دنوں میں یہ کے وجود ہی کو بھول چکا تھا۔

جمال نے آتے ہی کئی ایک سوالات کر دیے۔  
”بتاؤ یار ان کا حال کیا ہے۔ لیکن تم تو صرف ایک بار اطلاع دینے گئے ہو گے۔“

انتظار کر رہی ہوں گی۔ کوٹھے پر شعلی ہوں گی دیکھنے کے لئے کہ آیا ہے یا نہیں اور تم برساتی میں جاتے ہی نہیں، تمہیں کیا معلوم کوئی چھٹی آئی ہے کیا۔ لیکن چھٹی کیسے آئی میں؟ ہوا تھا۔ یار میرا جی تو چاہتا تھا کہ جلدی لوٹ آؤں لیکن کیا کرتا وہ مجھے آنے نہیں دیتی تھی برا بیوی اور تم جانتے ہو مجھے اپنی بیوی سے عشق ہے۔ ایمان سے۔“

جمال کی باتیں سن کر ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ مجرم ہو۔ جیسے اس نے ایک بچے کو دوا دیا ہو۔ وہ چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا اور مختصر جواب دیتا رہا۔  
”آؤنا، آؤنا۔“ جمال چلانے لگا۔ ”وہاں برساتی میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ ذرا دیکھو ان شاید وہ سامنے ہی ہوں۔ انہیں تسلی ہو جائے گی کہ میں آ گیا ہوں۔“

برساتی میں پہنچ کر جمال کھڑکیوں کے سامنے کھڑا ہو گیا اور ایلی ایک کونے میں چارہ لالہ بیٹھ گیا۔ ایلی کبھی کھڑکیوں میں نہ کھڑا ہوا تھا۔ دو ایک بار انہوں نے کہا بھی تھا۔ ”آپ سامنے کیوں نہیں آتے اپنی برساتی میں۔“ اس نے کہا تھا ”ایک بار جو آیا تھا۔“ ”ہے اللہ“ اس پر سلی یوں تڑپتی تھی۔ جیسے آتش بازی کو آگ دکھا دی گئی ہو۔ درحقیقت ایلی وہاں کھڑے ہو کر اندازے کرنے کے خلاف تھا۔ اس لئے کہ اسے ڈر تھا کہ کہیں ناؤ گھر کا کوئی لڑکا دیکھ نہ لے۔ وہ جلد سے ڈرتا تھا۔ جاہ کو معلوم ہو گیا تو وہ کہے لگا۔ ”ہاں بھئی یہ بھی ایک فن ہے اور اگر ایلی کو یہ فن پتہ ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں ذرا یہ سننا کام ہے میرا مطلب ہے چپ ہے۔“ ایلی اس جملے کو لڑکھائے سے ڈرتا تھا اس کے علاوہ جب روز ملاقات ہوتی تھی اور وہ باتوں کے ذریعے اپنی نمائش کرتا

آٹھ گھنٹے کے بعد وہ پھر نیم چھتی میں آیا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ بازو لٹک رہے تھے۔  
”یار ایلی غضب ہو گیا۔ میں وہاں گیا تو سامنے کوئی بیٹھی تھی۔ میں نے سمجھا انہیں میں سے ایک ہو گی میں نے اشارے کرنے شروع کر دیئے وہ بھی اشارے کرتی رہی۔ پھر دفعتاً اس نے ہنسنے لگا کہ وہ دیا اور نیچے سے سوٹ والا ایک نوجوان نکل آیا غالباً ان کا بھائی ہو گا۔ اب کیا ہو ایلی۔ ایلی بتاؤ نا؟“  
”مجھے کیا معلوم۔“  
رات کو وہ دونوں نیم چھتی میں بیٹھے روشنی کا انتظار کرتے رہے۔ تین بجے کے قریب ان کا بھائی چھانے لگی اور ساڑھے تین بجے جمال کرسی میں بیٹھا بیٹھا سو گیا لیکن ایلی چپ چاپ غیر متحرک کی طرف ٹھنکی باندھے بیٹھا رہا۔ وہ غم یا مایوسی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ کچھ بھی محسوس نہ کر رہا تھا اس کا ذہن قطعی پر خالی تھا۔ کھڑکی میں سادی ہنس رہی تھی۔ ”کوئی بات کیجئے تم کوئی باتیں کیا کرتے ہیں۔“ زینے میں شہزاد کھڑی کہہ رہی تھی۔ ”نہیں میں تو کچھ نہیں کہتی۔“ درمیان میں جمال آرام کرسی پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔

جب کی بات تھی کہ اہلی کو سادی سے وہ محبت پیدا نہ ہوئی تھی جس میں آرزو کا عنصر ہوتا ہے۔ اہلی نے اس کی شخصیت کی عظمت کا بے پناہ احساس تھا۔ اس کی رنگین باتیں اس کا اہلی ذوق اس کے بے پناہ جرات سادی سے محروم ہو جانے پر وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ دنیا کی تمام اچھی چیزوں سے محروم کر دیا گیا ہو۔ جیسے لطافت ختم ہو گئی ہو اور صرف دھندلی کثافت باقی رہ گئی ہو۔ اہلی نے کبھی یہ آرزو محسوس نہ کی تھی کہ وہ سادی کو آغوش میں لے یا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ڈال لے یا اس سے حسن کی بھیک مانگے یا ملاپ کی خواہش کرے۔

اہلی روز سادی کے خط نکال لیتا اور انہیں پڑھتا۔ بار بار پڑھتا اور پھر حیرت میں ڈوب جاتا۔ نہ جانے یہ لڑکی کون ہے۔ نہ جانے وہ لوگ کتنے اونچے ہوں گے نہ جانے — پھر وہ شدت سے کٹری کا جذبہ محسوس کرتا۔ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارا میل ہو سکے اور ہو بھی جائے تو وہ جلد مجھ سے اکٹا جائے گی۔ مجھ میں ہے ہی کیا جو اتنی بڑی شخصیت کو جذب کر سکے۔ اہلی نے سادی کو کبھی عورت کی حیثیت سے نہ دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی آرزو کی تھی۔ اس نے اہلی کا غم عجیب سا تھا۔ ایسا غم جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ یہ محسوس نہیں کرتا تھا جیسے کھو گیا ہو بلکہ جیسے کچھ کھو دیا ہو جیسے روشنی کی کرن بجھ گئی تھی۔ جیسے رنگ ختم ہو گئے تھے اور محض ایک خاکستری دھند لکا باقی رہ گیا تھا۔

دس روز کے بعد جمال کے نام پھر ایک تار آگیا۔ لکھا تھا۔ ”فورا“ پہنچئے۔“

”کیا بات ہے؟“ اہلی نے جمال سے پوچھا۔ ”یہ کیسا بلاوا ہے؟“

”کچھ ہونے والا ہے۔“ جمال ہنسنے لگا۔ ”میں کہہ آیا تھا مجھے تار دے دینا۔“

تمل کے جانے کے ایک دن بعد اہلی کو ڈاک سے ایک خط موصول ہوا۔

اس نے اس لئے خط کو کچھ اہمیت نہ دی۔ پتہ ناموس خط میں لکھا ہوا تھا۔ نہ جانے کس کا خط ہے اس نے سوچا۔ طرز تحریر جانی پہچانی سے تھی لیکن —

در اصل اسے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ سادی اسے ڈاک کے ذریعے بھی خط لکھ سکتی ہے۔

لفظہ پاک کر کے اس نے خط باہر نکالا تو دفعتاً حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اسے سادی کا خط۔ لکھا تھا۔

”گھر والوں کو پتہ چل گیا ہے۔ ملاقات کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے ہیں۔ اب میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ سووار کو رات کے دو بجے اسی جگہ میرا انتظار کیجئے اور مجھے ساتھ لے

اگلے روز سفید منزل کے چوہارے میں مزدور کام کر رہے تھے۔ میڑھیوں والی دیوار پر اینٹوں کے جنگلے بنے ہوئے تھے۔ جن کی وجہ سے میڑھیوں کا دروازہ کھلنے پر تھوڑا کھڑکھڑاتا تھا۔ منزل کے چوہارے کا ایک حصہ دکھائی دیتا تھا انیس سینٹ سے پر کیا جا رہا تھا۔ ”اہلی اہلی۔“ جمال چلانے لگا۔ ”یہ دیکھا تم نے انہوں نے وہ جنگلے بند کر دیئے ہیں۔“ ہوتا ہے معاملہ دور تک پہنچ گیا ہے۔“

”ہوں۔“ اہلی نے کھڑکی کی درز سے دیکھتے ہوئے کہا پھر وہ دونوں دیر تک خاموشی کو رہے پھر جمال بولا۔

”لیکن شاید ملاقات پر پابندی نہ لگے گھر والوں کو اس کا علم تو نہیں ہوا ہو گا اور اہلی لا وہ بھیجیں گی۔ ضرور بھیجیں گی۔“

جب جمعدارن آئی تو اہلی نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں بلکہ ماتے پرانی شکن پڑی تھی۔ اس نے فوراً محسوس کر لیا کہ اب خط و کتابت ممکن نہ ہوگی۔ کچھ دن بعد جمال آیا۔

”یار وہ جمعدارن تو بات ہی نہیں کرتی۔ کتنی تھی نہ بابو جی وہاں ان کے گھر میں تو قیام ہوا ہے۔ لڑکی کو دورے پڑ رہے ہیں۔ دورے میں لڑکی کی ہاتھ پاؤں مڑ جاتے ہیں اب بتاؤ جمال نے پوچھا۔“

ان حالات کے باوجود وہ دل ہی دل میں امید رکھتا رہے کہ شاید کوئی صورت پیدا جائے شاید وہ کوئی ترکیب لڑائیں۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ عید آگئی لیکن گوروں کی طرف سے نہ کوئی پیغام موصول ہوا اور نہ ہی سفید منزل میں کسی جگہ ان کی جھلک دکھائی دی۔ جمال کو اس بات کا قلق ضرور تھا کہ ایک دلچسپی کی صورت ختم ہو گئی اس کے علاوہ کوئی دکھ نہ ہوا۔

جس روز وہ واقعہ رونما ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کا سلسلہ ملاقات ٹوٹ گیا تھا۔ اس دن اہلی نے محسوس کیا تھا جیسے وہ خالی الذہن ہو پھر حسب عادت دکھ بوند بوند اس کے دل میں بھرا گیا۔ دنیا ویران ہوتی گئی۔ چیزیں مغموم سے خالی ہوتی گئیں مناظر و خندلے پڑتے گئے اور لوگ یوں گھومتے بھرتے دکھائی دینے لگے۔ جیسے دیرانے میں بھوت پریت چل پھر رہے ہوں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے کوئی نعت عظمیٰ کھو دی ہو۔ جیسے امد کی کرن مٹ ہو گئی ہو۔

ایلیس — ایلی کو وہ لفظ کچھ مانوس سا معلوم ہو رہا تھا۔ ہاں الیاس ایلی۔ علی پور کا ایلی۔  
ایلی آپ سے کہہ رہا تھا۔

”جی ہاں“ ٹھٹھا ٹھٹھا بولا۔ ”سامنے چائے کی دوکان میں بیٹھ کر بات کریں گے۔“  
ایلی نے غور سے لے لے کر دیکھا۔ ہاں یہ شخص اس نے محسوس کیا جیسے اسے

دیکھا ہو۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ کون تھا۔  
”مجھے جانتے ہوئے۔“ لے لے کر ایلی نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں۔“ ایلی نے سر ہلایا۔ لیکن اس کا ذہن سر کے اشارے سے بیگانہ رہا۔ ”میں ناؤ گھر  
آئی ہوں۔“

”ہاں۔“ ایلی کے ذہن میں روشنی کی ایک اور کرن جھلکائی۔  
”میں جاہ کا دوست ہوں۔“ لے لے کر ایلی بولا۔

جاہ — ایک اور کرن۔

”مجھے جانتے ہوئے۔“ لے لے کر ایلی نے دہرایا۔

”ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ ”جانتا ہوں۔“ لیکن اس کی نگاہیں اسے جھٹلا رہی تھیں۔  
”نہیں نہیں۔“ چھوٹے آدی نے اشارہ کیا۔ ”ابھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ ابھی ہوش  
نہیں۔“

”تم نے کچھ استعمال تو نہیں کیا؟“ لے لے کر ایلی سے پوچھا۔

”استعمال۔“ ایلی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ چھوٹے آدی نے اشارہ کیا۔ ”یہ بات نہیں۔“

”تمہاری طبیعت تو اچھی ہے۔؟“ لے لے کر ایلی نے چائے کی میز پر بیٹھے ہوئے ایلی سے  
پوچھا۔

”ہاں نہیں مجھے تو کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں۔“ ایلی نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر بات  
سنائی۔

”تم تمہارے دوست ہیں۔“ چھوٹا بولا۔ ”میرا نام بخشی ہے اور یہ بخاری ہیں۔“

”ہاں ہاں۔“ ایلی نے سر ہلایا۔ ”اور یہ کیا ہے۔؟“ بخشی نے پوچھا۔

جائے۔ اگر آپ نہ آئے تو — ضرور آئیے گا ضرور ورنہ —  
ایک کونے میں جلدی میں چند الفاظ لکھتے تھے۔

”جس روز آپ کو یہ خط ملے اسی روز رات کو بارہ سے ایک بجے تک اپنا برساتی  
جلائے رکھئے تاکہ مجھے علم ہو جائے کہ آپ کو میرا خط مل گیا ہے۔ وہ حق ہمارے ہر  
دکھائی دیتی ہی۔“

خط پڑھ کر ایلی سن رہ گیا۔ اس کا ذہن پھر سے ایک خلا میں تبدیل ہو گیا۔ وہ اٹھ بڑا  
پھر برساتی میں ادھر سے ادھر سے ادھر گھومنے لگا۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔

سارا دن وہ آوارہ گھومتا رہا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہے کھل جا رہا ہے۔ کسی  
سے سرگرداں ہے۔ اسے سادی کا بھی خیال نہ رہا تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ سوموار کو رات کے  
بجے اسے بلایا گیا ہے اور اسے کسی کو ساتھ لے کر چلے جانا ہے نہ جانے کھل چلے جانا ہے کہ  
چلے جانا ہے مگر چلے جانا ہے ورنہ۔

اس کے ذہن میں کوئی بات نہ تھی کوئی فکر نہ تھا کوئی پریشانی نہ تھی۔ البتہ وہ بذات  
پریشان تھا۔ اس کی شخصیت گویا بکھر گئی تھی۔ شعور شل ہو چکا تھا۔ وہ دیکھتا تھا لیکن سمجھتا تو  
نہیں۔ اس کی دیکھنے کی قوت دھندلائی ہوئی تھی۔ کان بند ہو چکے تھے۔ وہ ایک دم مگر مسل  
شور سن رہا تھا۔ جیسے کھیاں جھنجھٹا رہی ہوں۔ جیسے سادی کا نکتہ کھیوں کے ایک عظیم جے  
تبدیل ہو گئی۔

دوپہر کے وقت وہ ایک ویران سڑک پر چل رہا تھا۔ پھر شام کو اس نے دیکھا کہ وہ بلا  
ایک بیچ پر بیٹھا ہے۔ پھر وہ سڑک کے عین درمیان میں کھڑا تھا۔ ایک موٹر کے قریب کھڑا تھا  
ارد گرد چند لوگ کھڑے تھے۔

## بخشی بخاری

پھر وہ شخص اس سے کچھ پوچھ رہے تھے اور چوک میں کھڑا سپاہی اس کی طرف دیکھ رہا  
مسکرا رہا تھا۔

لے لے کر اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔

”تم الیاس ہو؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”یہ — ایللی نے پہلی مرتبہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں  
 کانڈ تھا جسے وہ ان جانے میں مروڑ رہا تھا۔ ”یہ۔“ ایللی نے کہا۔ ”یہ تو کانڈ ہے۔ اس نے نہ کر  
 بخاری کو دیتے ہوئے کچھ اس انداز میں کہا جیسے انہیں دکھانا چاہتا ہو کہ واقعی وہ کانڈ ہے اور اس  
 ثابت کرنا چاہتا ہو کہ اسے کچھ بھی نہیں وہ قطعی طور پر بھول چکا تھا کہ وہ کانڈ سلوی کا خطہ تھا۔  
 بخاری نے وہ کانڈ ایللی کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے دیکھنے لگا۔  
 ”چائے پیو۔“ بخشی مسکرایا۔  
 ایللی چائے پینے لگا۔  
 ”اب کیا گھر جاؤ گے؟“ بخشی نے پوچھا۔  
 ”ہاں۔“  
 ”تمہیں چھوڑ آئیں؟“  
 ”نہیں میں چلا جاؤں گا۔“ ایللی بولا۔  
 ”اچھی بات ہے۔“ بخشی نے کہا۔  
 ”تم ذرا بیٹھو میں بل دے دوں۔“ بخاری نے کہا۔  
 ”میرے پاس ہیں۔“ ایللی نے اپنی جب کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرے پاس ہیں۔“  
 ”نہیں میں دوں گا۔“ بخاری نے مسکرا کر کہا۔  
 پھر بخاری نے بخشی کو اشارہ کیا۔ ”ذرا ادھر آنا۔“ اور وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔  
 ایللی کی نگاہوں میں اب چیزیں اور ان کا مفہوم ابھر رہا تھا اور وہ شرمندگی کی محسوس کرنا  
 لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔  
 کچھ دیر کے بعد بخشی اور بخاری دونوں واپس آ گئے۔ ”چلو ہم بھی تمہاری ماٹھ میں  
 گئے۔“ بخاری نے کہا۔

”یہ — ایللی نے پہلی مرتبہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں  
 کانڈ تھا جسے وہ ان جانے میں مروڑ رہا تھا۔ ”یہ۔“ ایللی نے کہا۔ ”یہ تو کانڈ ہے۔ اس نے نہ کر  
 بخاری کو دیتے ہوئے کچھ اس انداز میں کہا جیسے انہیں دکھانا چاہتا ہو کہ واقعی وہ کانڈ ہے اور اس  
 ثابت کرنا چاہتا ہو کہ اسے کچھ بھی نہیں وہ قطعی طور پر بھول چکا تھا کہ وہ کانڈ سلوی کا خطہ تھا۔  
 بخاری نے وہ کانڈ ایللی کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے دیکھنے لگا۔  
 ”چائے پیو۔“ بخشی مسکرایا۔  
 ایللی چائے پینے لگا۔  
 ”اب کیا گھر جاؤ گے؟“ بخشی نے پوچھا۔  
 ”ہاں۔“  
 ”تمہیں چھوڑ آئیں؟“  
 ”نہیں میں چلا جاؤں گا۔“ ایللی بولا۔  
 ”اچھی بات ہے۔“ بخشی نے کہا۔  
 ”تم ذرا بیٹھو میں بل دے دوں۔“ بخاری نے کہا۔  
 ”میرے پاس ہیں۔“ ایللی نے اپنی جب کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرے پاس ہیں۔“  
 ”نہیں میں دوں گا۔“ بخاری نے مسکرا کر کہا۔  
 پھر بخاری نے بخشی کو اشارہ کیا۔ ”ذرا ادھر آنا۔“ اور وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔  
 ایللی کی نگاہوں میں اب چیزیں اور ان کا مفہوم ابھر رہا تھا اور وہ شرمندگی کی محسوس کرنا  
 لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔  
 کچھ دیر کے بعد بخشی اور بخاری دونوں واپس آ گئے۔ ”چلو ہم بھی تمہاری ماٹھ میں  
 گئے۔“ بخاری نے کہا۔

”نہیں تو۔“ وہ بولا۔ ”میں کہاں جاؤں گا۔“  
 اگلے روز صبح سویرے ہی بخشی اور بخاری آ گئے۔  
 ”آج تو طبیعت اچھی معلوم ہوتی ہے۔“ بخاری نے بات شروع کی۔  
 ”جی ہاں۔“ ایللی نے جواب دیا۔  
 ”کل کیا ہوا تھا؟“ بخاری نے پوچھا۔  
 ”کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔“ ایللی نے جواب دیا۔  
 ”تو کل گھوم رہے تھے تم؟“  
 ”جی گھوم رہا تھا۔“  
 ”کئی کلم سے نکلے تھے کیا؟“  
 ”نہیں تو دیسے ہی میں بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرا گئی تھی۔ جدھر منہ اٹھایا چل پڑا۔“ ایللی نے  
 ”آج تو نہیں گھبرا رہی طبیعت؟“  
 ”نہیں تو۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”آج تو کوئی ایسی بات نہیں۔“  
 ”کل کیا بات تھی؟“ بخشی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔  
 ”میں ہم کچھ مدد کر سکیں۔“ بخاری نے کہا۔  
 ”بت تو کوئی نہیں۔“ ایللی نے جواب دیا۔  
 ”تو اس بات کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”نہیں نہیں۔“ ایللی نے کہا۔ ”آپ تکلیف نہ کریں۔“  
 ”نہیں۔“ بخاری نے کہا۔ ”ہم ادھر ہی جا رہے ہیں۔“  
 ”اچھا۔“ ایللی لا جواب ہو گیا اور تینوں چل پڑے۔  
 جب وہ ٹاؤ گھر کے مقابل میں پہنچے تو دفعتاً ایللی کو یاد آیا اور وہ دیوانہ وار اپنی ماٹھ میں  
 لگا۔

”وہ خاموش ہو گئے۔“

”ایلیا برا نہ بنو تو میں پوچھوں کہ وہ کون ہے؟“ بخاری نے پوچھا۔

”کون ہے؟“ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون ہے؟“ ایلیا نے جواب دیا۔

”میرا مطلب ہے کس گھرانے سے ہے؟“ بخاری نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔ مجھے اس کا علم نہیں۔“ ایلیا نے جواب دیا۔

”بھئی اور بخاری نے حیرت سے ایلیا کی طرف دیکھا۔“ اس کے رشتے داروں کے متعلق

”بخشی نے پوچھا۔“

”مجھے نہیں معلوم؟“ ایلیا نے بخشی کی بات کاٹ دی۔

”اچھا۔“ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ”تعب کی بات ہے۔“ کچھ دیر تک وہ خاموش رہے۔

”تو کیا تمہارا فیصلہ اٹل ہے؟“ بخاری نے پوچھا۔

”ہاں میں جاؤں گا۔“ ایلیا نے جواب دیا۔ ”مجھے جانا ہی ہو گا۔“

”اس کے نتائج سوچے ہیں تم نے؟“

”نہیں۔ مجھے نتائج کی پروا نہیں۔“

”وہ۔۔۔“

”تمہارے پاس کوئی جگہ ہے جہاں اسے لے جاسکو؟“

”نہیں۔“

”کوئی بھی نہیں۔“

”گوئیوں۔“

”لوپے کا انتظام ہے؟“

”ایلیا ہنس پڑا۔“ ”میرے پاس روپیہ کمال۔“

”کوئی دوست ہے؟“

”گوئیوں۔“

”کچھ دیر تک وہ خاموش رہے بخشی کی آنکھوں میں غم کی گھٹائیں چھائے جاری تھیں۔ بخاری

”مور اگر تم پکڑے گئے تو؟“

”کس بات کے متعلق؟“ ایلیا نے پوچھا۔

”سو موہ کو دو بجے۔“ اس نے حیرت سے بخاری کی طرف دیکھا پھر دھڑکے۔

”ارے یعنی میرا مطلب ہے یعنی میرا۔۔۔“ ایلیا گھبرا گیا۔

”دیکھو بھائی الیاس!۔“ بخشی مسکرایا اس کی مسکراہٹ بڑی تسلی بخشی تھی۔

”ہم نے وہ خط پڑھ لیا ہے۔“

”خط؟“

”تم نے خود ہی تو دیا تھا ہمیں چائے کی دوکان میں۔“ بخاری مسکرائے لگا۔

”میں نے؟“

”گھبراؤ نہیں تمہارا راز ہمارے پاس محفوظ رہے گا۔“ بخاری نے اسے تسلی دی۔

ایلیا سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔

”تمہیں اس لڑکی سے محبت ہے کیا؟“ بخاری نے پوچھا۔

”محبت؟ مجھے معلوم نہیں۔“ ایلیا نے جواب دیا۔

”ہوں۔“

”تو کیا تم دو بجے وہاں جاؤ گے؟“

”ہاں۔۔۔ مجھے جانا ہی ہو گا۔“

”کیوں کوئی مجبوری ہے کیا۔“ بخشی نے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ ایلیا نے جواب دیا۔

”تو پھر جانا ہی ہو گا کیوں؟“ بخاری نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں اسے دھوکہ نہیں دے سکتا۔“ ایلیا نے جواب دیا۔ ”اور اگر میں نہ گیا تو۔۔۔“

”تو کیا؟“ بخاری نے پوچھا۔

”تو وہ ورنہ۔۔۔“ ایلیا نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

”ورنہ؟“

”ہاں۔“ اس نے لکھا ہے ضرور آنا ورنہ۔۔۔“

”ورنہ تو یہ ہمیشہ ہی لکھتی ہیں۔“ بخاری ہنسنے لگا۔

”نہیں۔“ ایلیا بولا۔ ”تم اسے نہیں جانتے میں اسے جانتا ہوں اور اس کے ورنہ کو بھی۔“

جنت انہیں سنا دئے اور ان کی خواہش پر واپسی پر سفید منزل انہیں دکھادی۔

لہذا ہو اکبر

بخشی اور بخاری سے مل کر ایللی کو اک ان جانی تسلی ہو گئی۔ حالانکہ انہوں نے اس کی امداد کرنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ لیکن بخشی اور بخاری دو عجیب شخصیتیں تھیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر غموں ہوتا تھا۔ جیسے اپنوں کے پاس ہو۔ بخاری کی باتیں تلخ تھیں۔ لیکن اس کے خشک رویہ سے بہت دور ہمدردی گویا رستی تھی۔ بخشی کی باتیں محاساں بھری تھیں اور وہ یوں جذبات سے سرشار رہنے کا مادی تھا۔ جیسے بھیگا ہوا اکبوتر ایللی نے عجیب سے تسلی محسوس کی تھی۔ نہ جانے کیسے ایللی کو غم ہوتا تھا کہ وہ دوستوں سے گھرا ہوا ہے۔ پکڑے جانے یا قید ہو جانے کے فکر سے تو ایللی آزاد نہ لگے دے دیے جی سی اس روز سٹلے ہوئے سگریٹ کے لئے وہ سادی کے زینے میں پانچ گھنٹے بیٹھا رہا۔ لہذا اسے ایک ڈر تھا کہ کیس ایسا نہ ہو کہ وہ سوموار کو رات کے دو بجے مقررہ جگہ پہنچ نہ سکے۔ لہذا اس وقت اس کا مقصد حیات صرف یہ تھا کہ رات کے دو بجے وہاں پہنچ جائے اس کے بعد کیا ہو لگے ہو گا اس کے متعلق اس نے کچھ نہ سوچا تھا۔ وہ اس کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے لہو ہلے کچھ ہو جائے پڑا ہو۔

سوموار کے روز بخشی اور بخاری دونوں بار بار ایللی کے پاس آئے اور اسے موہوم سے تسلی دے لے کر چلے گئے۔ ان کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انقطاعات میں مصروف ہیں۔ ایللی کے پاس آکر لگا لگا کر آپس میں بحث کرتے لڑتے جھگڑتے اور پھر کہیں چلے جاتے۔

شام کے وقت وہ دونوں ایللی کو باہر لے گئے۔

پارک میں پہنچ کر وہ ایک پہنچ پر بیٹھ گئے بخاری نے ایللی کے دونوں شانے پکڑ لئے۔

”کونو بھائی جو کچھ ہم سے ہو سکا ہم نے کر دیا ہے۔ اب غور سے سن لو اور اچھی طرح سمجھ لو۔“

”گربت بن گئی تو تم اسے لے کر ٹاؤ گھر کی طرف نہ آنا بلکہ اس سے متعلقہ سمت کی گلی سے ہوتے ہوئے سڑک پر پہنچ جانا۔ سڑک وہاں سے چالیس پچاس قدم دور ہے۔ وہاں تمہارے لئے لیمو لیمو کئی ہوگی یہ مونز تمہیں سیدھی کراچی لے جائے گی۔ اگر تم کراچی بخیر و عافیت پہنچ گئے تو

”پکڑا جاؤں گا اور کیا۔“ ایللی نے کہا۔

”اور اگر لڑکی نے تمہارے خلاف بیان دے دیا پھر؟“

”نہیں۔“ ایللی بولا۔

”نہیں کیا۔۔۔؟“

”وہ میرا ساتھ دے گی۔“

”تمہیں یقین ہے؟“

”ہاں۔“

”اور اگر۔۔۔۔“

”اونسوں۔“ ایللی نے بخاری کی بات کاٹ دی۔ ”کوئی اگر مکر نہیں۔“ کرے پر پھر غامض ہوا۔

”کچھ دیر کے بعد بخاری نے کہا۔ ”بھائی الیاس مجھے تم سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔“

”کیوں؟“ ایللی نے پوچھا۔

”تم ان سوالات کا برا تو نہیں مان رہے۔“

”نہیں اب کیا ہے؟“ وہ بولا۔

”اور اگر تم ہار گئے؟“

”تو کیا ہوا۔۔۔؟“ ایللی نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“ ایللی نے کہا۔ ”اگر مجھے وہ نہ ملی تو میں محسوس کروں گا جیسے میں نے کچھ

کھو دیا ہو۔“

”اچھا۔“ بخشی نے کہا۔ ”ابھی تو دونوں باقی ہیں۔ آج ہفتہ ہے نا۔“

”اچھا۔“ ایللی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ابھی دونوں باقی ہیں۔

”اگر تم ہمیں سارا قصہ سنا دو تو کوئی حرج ہے؟“ بخاری نے پوچھا۔

”اب کیا ہے؟“ ایللی نے کہا۔ ”لیکن جاہ کو پتہ نہ چلے۔“

”اچھا تو کل ہم پھر آئیں گے۔ شاید کچھ ہو سکے۔“

”بھگوان کرے۔“ بخشی بولا اور وہ دونوں رخصت ہو گئے۔

اگلے روز وہ دونوں اسے باغ میں لے گئے اور وہاں بیٹھ کر ایللی نے مختصر طور پر

پھر اللہ مالک ہے۔“

عین اس وقت قریب کی مسجد سے مؤذن لکڑا۔ ”اللہ اکبر۔“

ایلی کی نس نس میں ایک برقی روسی دوڑ گئی۔ اس نے پہلی مرتبہ حیرت سے بخشی عظمیٰ کی طرف دیکھا اور محسوس کیا۔ جیسے وہ اللہ کے پیچھے ہوئے فرشتے ہوں جو اللہ واسطے اس کی آمد کو کرتے ہوں بے مقصد بے لاگ امداد۔ اللہ — اس کے دل میں پہلی مرتبہ ایک گونج سی پیدا ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں شدت تاثر سے آنسو آ گئے۔

”میں میں“ ایلی نے شکر گزاری سے ان کی طرف دیکھا۔ ”یعنی۔“ وہ بولا۔ اس کی تہذیب بھرائی ہوئی تھی۔ بخاری ہنس پڑا۔ ”ہم یہ کام تمہارے لئے نہیں کر رہے۔“ اس نے کندھ میں احسان مندی یا شکر گزاری کا کوئی موقعہ محل نہیں۔ ”بخاری نے ایک دبی دبی آہ بھری اور پھر گونج آواز میں بولا۔ ”جو خود روشنی سے محروم کر دئے گئے ہوں وہ دوسروں کو راہ دکھانے میں سر نہ محسوس کرتے ہیں۔“

ایلی نے حیرت سے بخاری کی طرف دیکھا اس نے محسوس کیا جیسے اس کے پہلوؤں ایک لائن خلا ہو جسے دنیا کی تمام نعمتیں اور مسرتیں پر نہ کر سکتی ہوں۔ اللہ ہو اکبر مؤذن لڑان ختم کر رہا تھا۔ اللہ ہو اکبر ایلی کے دل کی گہرائیوں سے آواز آئی۔ سامنے بخاری مسکرانے کی شدید کوشش کر رہا تھا۔ قریب ہی بخشی کی آنکھوں میں بوند اباندی ہو رہی تھی۔

تمام تفصیلات سمجھا کر وہ دونوں ایلی کو سفید منزل کی طرف لے گئے اور عملی طور پر لے سمجھانے لگے ”یہ گلی ہے۔ ادھر سے تمہیں آنا ہے۔ اس طرف کو۔ یہاں موٹر کھڑی ہو گی عین اٹا جگہ اور ہم تمہارے ساتھ ساتھ رہیں گے۔ پاس نہیں بلکہ قریب یہ نہ سمجھنا کہ تم اکیلے ہو۔“ تمام تفصیلات سمجھانے کے بعد جب وہ ناؤ گھر پہنچے تو ساڑھے نو بجے تھے۔ وہ سیدھے لوہنم چھتی کی طرف چل دیئے تاکہ جاہ بھا اور پال کو ان کی آمد کا علم نہ ہو۔

حد ہو گئی

جب وہ نیم چھتی میں پہنچے تو دروازے میں جمل کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جمل کو دیکھ کر ایلی کا دل پیٹ گیا۔ جمل کو دیکھتے ہی یہ احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا کہ وہ مجرم ہے۔ اس نے جمل کو دھوکا دیا ہے۔ احساس گناہ سے اس کی گردن لٹک گئی۔

ایلی نے اس احساس سے مخلصی پانے کی شدید کوشش کی مگر ناکام۔ وہ احساس اس شدت سے اٹھ اٹھا رہا تھا۔ کہ اس دہائے میں ایلی کی شخصیت بد گئی۔ وہ جمل کے روبرو کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھ نہ سکتا تھا۔ پھر اس نے اپنا دل کڑا کر لیا۔ اور پھر بن کر کھڑا ہو گیا اس ڈر کے مارے کہیں جمل کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے کے لئے فٹیں کرنا شروع نہ کر دے۔

جمل ایلی کی طرف بڑھا۔ ”ایلی سب ٹھیک ہے نا؟“

ایلی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بخشی بخاری جی کیا حال ہے جاہ سے ملنے آئے تھے کیا۔“ جمل نے ان سے بات کی۔

”ہاں۔“ بخشی نے کہا اور پھر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

”ان کا حال ساؤ ایلی۔“ اس نے اشارتاً پوچھا۔

”ٹھیک ہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”کوئی آیا تھا؟“

”نہیں۔“

”خدا بھی نہیں؟“

”نہیں۔“

”پیٹم؟“

”نہیں۔“

”تو بات ختم ہو گئی۔“

”ہاں۔“

جمل بایوس ہو گیا اور برساتی کے باہر کو ٹھہر پر ٹھٹھنے لگا۔

بخاری ایلی کے قریب تر ہو گیا۔ ”یہ تمہارا ساتھی تھا؟“

”ہاں۔“ ایلی بولا۔

”ساتھی کو اپنے خلاف کر لیتا دانشمندی نہیں۔“

ایلی خاموش رہا۔

”اسے متاثر نہ کیا ہے۔“ بخاری نے کہا۔



”کہیں جاؤ گے؟“ جمال پھر رک کر پوچھنے لگا۔

”پتہ نہیں۔“ ایلی بولا۔

”پتہ نہیں۔ حد ہو گئی۔“ جمال چلایا۔

بخشی اور بخاری چپ چاپ دیوار کے قریب کھڑے تھے ایلی زینے کے پاس تیوری چڑھائے  
مل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جمال کوٹھے پر دیوانہ وار گھوم رہا تھا۔ ”حد ہو گئی۔“ وہ اپنے آپ چلا رہا تھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا

ہے۔ عیب بات ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے؟“

رفتہ ”جمال رک۔“ خط آیا تھا کیا؟

”ہاں۔“ ایلی نے کہا۔

”اسی کے ہاتھ؟“

”نہیں۔“

”روی ٹوپی والا لایا تھا؟“

”نہیں؟“

”تو پھر؟“

”ڈاک سے۔“

”اوہ۔ ڈاک سے۔“ جمال پھر مضطربانہ طور پر ٹہلنے لگا۔ پھر رک۔ ”اگر اگر میں میں یعنی۔“ اس

نے تہی نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا اور لفافے سمیت سادی کا خط جمال کی طرف بڑھا دیا۔

جمال نے لپک کر وہ خط اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پتہ دیکھا پھر بے صبری سے رقعہ نکالا اور  
دشٹی سے کھرا ہو کر اسے پڑھنے لگا۔

دیر تک وہ وہیں کھڑا رہا۔ نہ جانے کتنی مرتبہ خط پڑھا ہو گا۔ پھر گویا اس کے جسم کا تار ٹوٹ گیا  
بوقلمنی لگے گلے گلے ڈھلک گئے۔ ”حد ہو گئی۔“ اب اس نے اور انداز سے کہا۔ ”اچھا بھئی۔“ وہ ایلی  
کے قریب آگیا۔ ”تمہیں مبارک ہو۔“ اس نے خط واپس دیتے ہوئے کہا

”جمال صاحب۔“ بخاری نے کہا۔ ”آپ تو انہیں جانتے ہیں۔ کیا وہ آئے گی؟“

”آئے گی؟“ جمال نے دھرایا۔

”لیکن میں — میں کیسے بتاؤں۔“

”اس سے بات چھی نہ رہ سکے گی۔“ بخاری بولا۔

”ہوں۔“ ایلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ جمال کے سامنے  
اقبل جرم کرے۔ کچھ دیر کے بعد جمال مڑا۔ ”ایلی انہوں نے بلایا تو نہیں تھا؟“

”ہاں۔“

”بلایا تھا؟“ جمال نے دہرایا۔

”بلایا ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”کب؟“

”آج رات کے دو بجے۔“

”آج۔“ جمال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”دو بجے؟“ حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”ہاں دو بجے۔“

”رفتہ“ جمال نے محسوس کیا کہ وہ بخشی کے سامنے ہی باتیں کئے جا رہا ہے۔ ”اوہ۔“ اس نے  
ان کی طرف دیکھ کر مسکرائے کی کوشش کی۔

”جمال بھئی۔“ بخاری نے پہلی مرتبہ جمال سے بات کی۔ ”الیاس آج جا رہا ہے۔“

”جا رہا ہے۔ کہاں؟“

”اس لڑکی کو ساتھ لے کر جا رہا ہے۔“

”کیا مطلب۔ تم جا رہے ہو ایلی؟“ وہ ایلی سے مخاطب ہوا۔

”ہاں۔“ ایلی نے سر ہلا دیا۔

”کس کے ساتھ؟“

”چھوٹی کے ساتھ۔“

”چھوٹی کے ساتھ۔“ وہ حیرت سے سر کھانے لگا۔ ”حد ہو گئی۔“ اس نے صحن میں ایک پکڑ

”چھوٹی نے بلایا ہے کیا؟“ جمال نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”حد ہو گئی۔ حد ہو گئی۔“ وہ دیوانہ وار صحن میں گھومنے لگا۔

”مطلب ہے کیا وہ بات کی پکی ہے۔“ بخاری نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ جمال بولا۔ ”ایلی کو معلوم ہے۔ میں تو اسی کے سارے“ اس نے  
کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں پر نم ہو گئیں۔ بخشی گھبرا کر سی سی کرنے لگا جیسے اسے بہت  
برداشت کرنا پڑ رہا ہو۔

”مجھے تو کچھ علم نہیں۔ میں تو میں تو۔“ جمال بولا۔ ”میں تو حیران ہوں۔ مجھ کچھ سمجھ میں نہیں  
آ رہا۔“

بخاری بت بنا کھڑا تھا۔

ایلی احساسِ ندامت سے بھیگا ہوا تھا۔

بخشی چپ چاپ ظلم سے جا رہا تھا۔

جمال کبھی سوچ میں پڑ جاتا۔ کبھی سر لٹا کرتا کبھی مسکرانے کی کوشش کرتا کبھی سر کھاتا اور پتہ  
آپ سے کہا۔ ”حد ہو گئی۔“ پھر دفعتاً ”ایلی کی طرف دیکھ کر نہ جانے اسے کیا ہوا بھاگ کر وہ ایلی سے  
لپٹ گیا۔

”ایلی۔ تم کمال ہو۔ تمہارا جواب نہیں ایلی تم نے حد کر دی۔ تم ہمیشہ حد کرتے ہو۔ لیکن یار تم  
نے یہ کیسے کر دیا۔ مجھے بڑی خوشی ہے ایلی۔ بڑی خوشی ہے۔ مجھے تم پر یہی امید تھی۔“ جذبات کی  
شدت کی وجہ سے وہ رک گیا۔ ایلی کی گردن لٹک گئی۔ اس نے محسوس کیا جیسے واقعی وہ مجرم ہو۔

”آپ کو نہیں معلوم۔“ وہ بخشی بخاری نے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”ایلی نے شیر مارا ہے۔ شیر  
بہر۔ آسمان کا تارہ توڑ لایا ہے۔ یہ جادو گر ہے۔ جادو گر۔ اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ میں اس کے  
جادو سے واقف ہوں۔“

بخشی۔ بخاری حیرت سے جمال کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”اور وہ۔“ جمال ہنسنے لگا۔ ”وہ پیچھے ہٹنے والی نہیں۔ وہ معمولی لڑکی نہیں۔“  
”اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ کون ہے جو اسے روک سکے کون ہے جو اس کی  
طرف ہاتھ بڑھا سکے۔“ جمال ہنسنے لگا اس کی ہنسی میں ہسٹیریا کا عنصر تھا بخشی بخاری چپ چاپ  
کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

گھڑی نے بارہ بجادیئے۔

”اچھا تو۔“ جمال چلایا۔ ”میرا دوست آج جا رہا ہے وہ کہتے ہیں تاکیا کہتے ہیں وہ۔“ اس نے

ہاتھ باندھ کر نہیں رہا۔“ وہ بولا۔

”چھ۔“ بخاری نے کہا۔ ”وقت کم ہے۔ ہم ذرا موٹروالے کو دیکھ آئیں جب تک تم تیاری  
کرنا۔“

”ایلی نے دہرایا۔“ میں کیا تیاری کروں گا؟“

”کوئی چیز۔“

”میرے پاس کچھ بھی نہیں۔“

”جمال صاحب آپ ایلی کے ساتھ جائیں گے۔ میرا مطلب ہے صرف اسے لانے کے لئے۔“  
بخاری نے کہا۔

”ہاں ہاں۔“ جمال چلانے لگا۔ ”میں ساتھ جاؤں گا۔ میں اس کا ساتھی ہوں۔ اس نے میرا ساتھ  
دیا۔ اب میں اس کا ساتھ دوں گا۔ میں انہیں خود موٹر میں بٹھاؤں گا۔ کیوں ایلی مجھ کے ساتھ لے چلو  
گے؟“

ایلی ڈرتا تھا کہ بخشی بخاری کے جانے کے بعد وہ جمال کے ساتھ اکیلا نہ رہ جائے اس لئے وہ  
بچے اڑ گیا۔

”میں ذرا جاہ اور پال سے مل لوں۔“ وہ بولا۔

جاہ اپنی چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ ایک ساعت کے لئے ایلی ہچکچایا۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید پھر  
کبھی ملاقات نہ ہو۔

”جاہ جاہ۔“ ایلی نے اسے جھنجھوڑا۔

جلوئے کر لٹی۔ ”جاہ۔“ وہ چلایا۔ جاہ نے سر اٹھایا۔ ”ہوں؟“

”میں جا رہا ہوں۔“ ایلی بولا۔

”اچھا۔“ وہ نیند میں بولا اور پھر اپنا دایاں ہاتھ بڑھا دیا۔ ”خدا حافظ۔“

ایلی نے جاہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بے پناہ پیار سے اسے سلانے لگا۔ لیکن جاہ پھر سو گیا تھا۔  
پلیٹیں پورے طور پر نہیں سویا تھا۔ ”کہیں جا رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔  
”گھر جا رہا ہوں۔“

”تو جاؤ۔“ میں سمجھا شاید سات سمندر پار جا رہے ہو۔“ پال بولا۔

”ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ ”سات سمندر پار جا رہا ہوں۔ وہیں گھر بٹاؤں گا۔“ پال اٹھ بیٹھا اور پھر

مذاق میں ایللی سے لپٹ گیا۔

”اس وقت کون سے گاڑی جائے گی؟“ بھانے پوچھا۔

”جائے گئی۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”کوئی پیشیل ہی ہو سکتی ہے۔“ بھانے کہا۔

”ہاں پیشیل ہی ہے۔“

”اب یہ پوچھو بھاکہ پیشیل کے کون سے ڈبے میں بیٹھو گے؟“ پال بولا۔

”اس سے پہلے تو کبھی ایللی یوں مل کر نہیں گیا۔“ بھانے کہا۔

ایللی نے محسوس کیا کہ اگر کچھ دیر کے لئے وہیں رکا تو وہ سب جاگ پڑیں گے اور بانیں ٹولیں گئیں تو ————— ”اچھا تو خدا حافظ۔“ وہ اٹھا اس کی آواز گھو گھیر تھی۔

اٹپچی

عین پونے دو بجے جمال اور ایللی اس کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے وہ دونوں چپ چاپ کمرے تھے۔ گلی دیر ان تھی۔ قبرستان کے پرلے سرے پر کوئی فقیر مگر ڈی میں لپٹا پڑا تھا۔ ایللی کا دل دھک دھک کر رہا تھا دیر تک وہ کھڑے رہے۔ وہ پندرہ منٹ پندرہ گھنٹوں سے زیادہ طویل ہو گئے تھے۔

قریب ہی کسی گھڑی نے دو بجائے جمال بولا۔ ”کیا دو بج گئے؟“ واقعی دو بج گئے۔ کیوں ایللی ٹائم نے۔“

”ایللی دو ہی بجے ہیں کیا؟“ ایللی نے کوئی جواب نہ دیا۔

دیر تک وہ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔

پھر سفید منزل سے یوں آواز سی آئی جیسے کوئی ٹرنک کھینچ رہا ہو۔ وہ چونکے ہو گئے۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

پھر زینے میں پاؤں کی چاپ سنائی دی۔

”وہ۔ وہ۔“ جمال بولا۔

ایللی نے آہستہ سے بند کھڑکی کو انگلی سے بجایا۔

اندر سے دروازے کی چٹنی کھلنے کی آواز آئی۔

دروازوں پر پک کر دروازے کے مقابل جا کھڑے ہوئے۔ دروازے میں کوئی سیاہ نقاب میں

لپٹا کھڑا تھا۔

”سادی؟“ ایللی نے پوچھا۔

”نواب میں اس نے لوہے کا ایک ٹپچی آگے بڑھا دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ ایللی نے دبی زبان میں پوچھا۔

”میرا زیور ہے۔“ سادی نے جواب دیا۔

”لوٹو نہیں۔“ ایللی بولا۔ ”اسے واپس رکھ آؤ۔“

”کیوں؟“

”یہ میں ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔“

”یہ تو پاگل ہے۔“ جمال بولا۔ ”لاؤ مجھے دو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اٹپچی اٹھا لیا۔

”نہیں سادی۔“ ایللی دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”یہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گا۔“

دھڑاڑا اڑا۔ زام

سفید منزل سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی بڑا سا ٹرنک کسی نے اٹھا کر فرش پر دے مارا ہو۔

”ہائے اللہ۔“ سادی نے ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ ”بابی۔“ وہ بولی۔

پھر سفید منزل میں کرام بچ گیا۔

ہمارا ایک مردان کی طرف لپکے۔ وہ ایللی کے قریب آئے اور پھر نہ جانے کیوں اسے چھوڑ کر انہوں نے جمال کو دو بچ لیا۔ سادی نے چیخ ماری اور بیہوش ہو کر اندر گر پڑی۔

ایللی کو کچھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ کیا ہو رہا ہے۔ نیچے گلی میں وہ جمال کو پیٹ رہے تھے اوپر کوئی گولہری تھی، کوئی مین کر رہی تھی۔ بند کھڑکیں کھل رہی تھیں۔ پھر ایللی چلانے لگا۔

”میں ہوں میں میں ہوں میں“ ادھر دیکھو ادھر دیکھو میں ادھر ہوں۔“ لیکن وہ اس کی طرف توجہ نہ ہوئے باری باری اس نے ہر شخص کو شانے سے جھنجھوڑا۔ ”یہ نہیں میں ہوں۔ اسے چھوڑ دو۔ میں ہوں میں۔“ لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی وہ سب دیوانہ وار جمال سے کشتی لڑنے میں مصروف تھے۔

”کون ہے کون ہے۔ کیا ہوا۔“ دو شخص ایللی کی طرف لپکے۔

”میں ہوں میں۔“ وہ چلایا۔

منزل کا پھانک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں کوئی کسی کو  
منزل کے باہر آئی نے دونوں ہاتھوں سے پھانک بجانا شروع کر دیا۔  
”دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔“ وہ رعب سے نہ جانے کسے ڈانٹ رہا تھا۔ جیسے کوئی سورا  
پڑی کی حیثیت سے قلعے میں واپس آیا ہو۔

اس کی دستک کا کسی نے جواب نہ دیا۔  
اس نے دروازے پر دو ہتھ مارنے شروع کر دیئے اندر باتوں کا سلسلہ جوں کا توں جاری تھا۔  
”میں ہوں میں“ اس نے پھر دستک دی۔ میں ہوں میں۔ الیاس ہوں۔ ایللی میں واپس آگیا  
میں۔ مجھ سے بات کرو۔ دروازہ کھولو۔“

اس وقت اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے کیا کہہ رہا ہے۔ اسے یہ بھی احساس نہ ہوا  
کہ ارد گرد کے مکانات کے لوگ کھڑکیاں کھول کھول کر باہر جھانک رہے تھے۔ اندر سے کنڈی  
لڑکی آواز آئی۔

”کون ہے؟“ ایک دہلے پتلے شخص نے پورا دروازہ کھولے بغیر درز سے باہر جھانکا۔  
”میں ہوں میں“ ایللی بولا۔ ”ایللی جسے تم تلاش کر رہے ہو۔ وہ ایللی۔“  
”کون ہے؟“ اندر سے کسی اور شخص کی غصے بھری آواز آئی۔ ”پکڑ لاؤ اس بد معاش  
کو لا کر جا۔“

دہلے پتلے آدمی نے ایللی کا بازو پکڑ کر اسے یوں اندر گھسیٹ لیا جیسے تمباکو کی بوری ہو۔  
”بھول“ وہ دانت پیسنے لگا اور پھر اسے ایک کمرے میں دھکا دے کر باہر سے کنڈی لگا دی۔

چونچ سامت میں کسی نے کنڈی کھولی ایک اجنبی نوجوان اندر داخل ہوتے ہوئے چلایا۔  
”کون ہے تو؟“

”میں الیاس ہوں؟“

”کون الیاس؟“

مجھے تم تلاش کر رہے ہو۔ میں واپس آگیا ہوں۔ وہ غلط آدمی ہے جسے تم نے پکڑا ہوا  
میں سے کوئی بات۔“

”اچھا تو تم ہو۔“ ان دونوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔  
پھر وہ دونوں ایللی کو کسی تنگ جگہ میں ٹھونس رہے تھے۔

ہوا کے چار ایک جھونکے لگے تو ایللی نے دیکھا کہ وہ موٹر پر سوار ہے اور اس کے پاس بھاری  
بخاری بیٹھے ہیں۔

”نہیں نہیں۔“ وہ انہیں دیکھ کر چلایا۔ ”مجھے جانے دو۔ مجھے جانا ہے۔“ وہ چلا آیا لیکن گھر  
فرائے بھرتی چلتی رہی۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو۔“ ”نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے جانا ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔“  
”روک لو۔ روک لو۔“ ایللی چیخ رہا تھا۔ دیر تک وہ چلاتا رہا پھر دھنسا۔ ”بخاری بولا۔“

”روک لو۔“  
گاڑی رک گئی۔

”مجھے جانا ہے بخاری جی مجھے جانا چاہیے مجھے جانا ہو گا۔“ ایللی کے سر پر گویا جنون سوار تھا۔  
”لیکن۔“ بخشی بولا۔

”لیکن دیکھ کچھ نہیں۔ اگر میں نہ گیا تو زندگی بھر۔“ وہ رک گیا۔  
”زندگی بھر۔“ اس نے پھر ناکام کوشش کی۔

”موڑ لو۔“ بخاری نے ڈرائیور سے کہا۔  
موٹر واپس جا رہی تھی۔ وہ تینوں خاموش تھے۔

ایللی کو کچھ احساس نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیوں واپس جا رہا ہے  
واپس جا کر اسے کیا کرنا ہے۔ اسے اس وقت یہ بھی خیال نہ آیا کہ سادی خطرے میں تھی۔ اس  
بھی احساس بھی نہ تھا کہ جیل کو چھڑانا اس کا اخلاقی فرض تھا۔ اس وقت فرض اور اخلاقی ایللی کے  
دو ممل لفظ تھے۔ اسے صرف ایک خیال تھا کہ سادی کیا کے گی کہ ایللی بھاگ گیا سفید منزل سے  
ہی انہوں نے اسے موٹر سے اتار دیا۔

”اچھا بھائی۔“ بخاری نے کہا۔ ”خدا حافظ۔“  
ایللی نے اس کی بات نہ سنی اور دیوانہ وار سفید منزل کی طرف بھاگا۔

گلی میں کوئی نہ تھا لیکن سفید منزل کے ارد گرد کے سبھی مکانات میں بتیاں جل رہی تھیں  
زیر لہجہ باتیں سنائی دے رہی تھیں۔

نودارد نے غصے میں ہاتھ اٹھایا۔ میں تمہاری ہڈی پتلی توڑ دوں گا۔

ایلی چپ چاپ کھڑا رہا۔ ”توڑ دیجئے۔“ وہ بولا۔

”تم نے کوئی دھوکا یا فریب کیا تو یاد رکھو میرے سرہانے تلے پستول پڑا ہے۔“

”میں کب کہتا ہوں کہ میں نے احسان کیا ہے آپ پر۔“ ایلی نے غصے سے پھر کر کہا۔  
”تو کس پر احسان کیا ہے۔“ نوجوان چلایا۔

”کسی پر بھی نہیں۔“

”تم پہلے کبھی آئے اس گھر میں؟“

”نہیں۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ گھر کس کا ہے مجھے جانتے ہو؟“

”نہیں۔“

نوجوان خاموش ہو گیا اور ایک سگرت سلگا کر پینے لگا۔

ایلی غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک خوبصورت جوان تھا۔ درمیانہ قد بھرا بھرا جسم گدے سے ہاتھ پاؤں۔ سفید رنگ

فراخ ماتھے پر تیوری تھی۔ خمدار ہونٹوں میں مسکراہٹ دہی ہوئی تھی۔ اس نے انگریزی لہجہ

سلیپنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔

وہ کمرہ نہایت مختصر تھا۔ دیواروں پر ہلکا گلابی پینٹ کیا ہوا تھا۔ پانگ پر جدید طرز کی چادر

ہوئی تھی۔ سرہانے کا غلاف ہم رنگ تھا۔ تپائی پر دو ایک کتابیں پڑی تھیں۔ پانی کے لئے

کانچ کی صراحی تھی۔ کارنس پر دو ایک چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

پانگ پر لیٹے ہوئے سگرت کے کش لگاتے ہوئے نوجوان کبھی کبھی آنکھ پچا کر ایلی کی طرف

دیکھتا اور پھر یوں چھت کو گھورنے لگتا جیسے خوفناک ارادے قائم کرنے میں شدت سے

ہو۔

دھنستا اوپر سے چیخوں کی آواز سنائی دی کوئی چلا رہی تھی۔ کوئی نین کے ذریعہ جانا

کوئی کراہ رہی تھی۔ پھر کوئی تھقہ مار کر بیٹ رہی تھی۔

نوجوان چھلانگ مار کر اٹھا۔ دروازے میں کھڑے ہو کر اس نے اوپر چلنے کی طرف اشارہ

پھر رعب سے لٹکارا۔ ”کیا ہو رہا ہے۔“

تو ایلی بہ ستور جاری رہیں۔

پھر ایلی کی طرف مڑا خبردار ”نوجوان چلایا۔“ اگر بھاگنے کی کوشش کی — اور پھر

یہی ذہن میں داخل ہو گیا۔

ایلی

ایلی اکیلا رہ گیا صدر دروازے سے ملحقہ کمرے میں سے چار ایک شخص باہر نکل کر

میں کمرے ہو گئے۔ ایلی غور سے ان آوازوں کو سن رہا تھا۔ جو اوپر سے آرہی تھیں۔

نہ تو ایلی اور نہ سادی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ اوپر صورت حال

بہرحال صورت حال تسلی بخش نہیں معلوم ہوتی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ اس بات پر

غور کر رہا تھا کہ اوپر حالات تسلی بخش نہیں معلوم ہوتے تھے۔

خیال آیا وہ مڑا اوپر والے زینے کے مقابل میں ایک دروازہ تھا۔ ہوں اس نے سوچا تو یہ

اکو جس میں ہم ملا کرتے تھے۔ دروازہ بند تھا۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کھلا ہو۔

پانٹ پڑے تھے۔ اس کے قریب ہی کاٹھ کباڑ والا زینہ تھا۔ سلاخوں والی کھڑکی کے

ایک لٹل سگرت پڑا تھا۔

ایلی نے دے پاؤں زینے سے اتر رہی تھی۔ ”خدا کے لئے۔“ وہ بولی۔ ”آپ اب جائیں

۔“

پانچوں کا چلا جاؤں گا۔ گھبراہٹ کیوں ہیں آپ اب جانا ہی ہے نا۔“

نہیں نہیں۔“ اوپر کوئی چیخ کر بولی۔

ایلی نے اوپر دیکھنے لگا۔

نہ لاد رہی تھی۔

ایلی نے ”نوجوان بیڑھیوں سے نکل کر اندر داخل ہوا۔“ آپ“ وہ اس نے ایلی کی طرف

نہ لاد رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد نوجوان نے غصے سے ایلی کی طرف دیکھا۔ تم نے میری

ایلی کہی ہے۔“ اس نے زور سے دروازے پر لات ماری۔ ”تم نے وہ جرم کیا ہے کہ

میں کل بھرا کروں تو کم ہے۔“

میری طرف سے۔" ایلی نے جواب دیا۔  
 "جی کہ رہے ہیں آپ" نوجوان نے پوچھا۔  
 "ہاں۔" ایلی بولا۔

اب کا مقصد اسے گمراہ کر کے خراب کرنا تھا۔  
 "یہ غلط ہے۔" ایلی نے غصے میں نوجوان کی طرف دیکھا۔  
 "تو کیا مقصد تھا۔" نوجوان نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔  
 "میں بیک میل کرتا ہوں۔" نوجوان کو پھر سے غصہ آگیا۔  
 "یہ الزام ہے۔" ایلی نے دانت پیسے۔

"وہ" نوجوان پھر حلال میں آگیا۔ "دور ہو جائیے میری نگاہوں سے میں آپ کی شکل دیکھنا  
 لی جانتا۔ ہماری زندگی میں آپ کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ جائیے جائیے۔"  
 ایلی جوں کا توں بیٹھا رہا۔

"آپ نے ہمیں وہ دکھ پہنچایا ہے کہ —" نوجوان کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ لیکن یاد  
 لئے اگر آپ نے پھر کسی قسم کا رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو — جاؤ۔"  
 ایلی پھر بھی بیٹھا رہا۔

کچھ دیر کے بعد نوجوان پھر لپک کر باہر نکلا "محمد علی۔" اس نے کسی کو آواز دی۔ "باہر نکال  
 اسے۔"

پتلا رطلافض صدر دروازے سے لپک کر آیا اور ایلی کا ہاتھ کھینچنے لگا۔ پھر اس نے صدر  
 اند کی ہماری چٹنی کھولی اور ایلی کو باہر دھکیل کر اندر سے کنڈی لگا دی۔  
 باہر صبح کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

کمزور لڑکیوں سے لوگ سر نکال کر دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کی طرف اشارے کر رہے تھے۔  
 "کون ہے؟"

"مگر مر ہے؟"

ایلی چپ چاپ سر جھکائے یوں چل رہا تھا۔ جیسے رام باس کو جا رہے ہوں۔

"ہاں" ایلی نے کہا۔ "میں نے چوری کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"بکو نہیں۔" نوجوان کی آنکھیں انگاروں کی طرح روشن ہو گئیں۔ "میں تمہاری ہڈی  
 توڑ کر رکھ دوں گا۔" وہ جوش میں ایلی کی طرف لپکا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے  
 چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ قریب آکر نوجوان نے اپنی بائیں ایلی کے گرد حائل کر دیا۔  
 کندھے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ نوجوان کی کراہیں سن کر لوہا  
 طاری ہو گئی۔

پہلے تو ایلی حیران کھڑا رہا۔ پھر اسے وہی خوشبو سی محسوس ہوئی جو سلامی کے لباس میں  
 تھی اور کمرے کی فضا میں اڑا کرتی تھی۔ وہ نوجوان کے قریب تر ہو گیا۔ اس کا پیچھا کر  
 دامن پکڑے اور اسے اپنی آنکھوں پر ملے۔  
 دیر تک وہ دونوں بغل گیر رہے۔

خوش شکل جوان نے آنکھیں پونچھیں اپنا آپ قابو کر کے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو چکا  
 گیا۔

"مجھے ساری بات بتا دیجئے۔" اس نے ایلی سے کہا۔ اس کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔

"ساری بات؟" ایلی نے منصوبی حیرت کا اظہار کیا۔

"مجھ سے کوئی بات نہ چھپائیے۔" نوجوان نے منت کی۔

"لیکن۔" ایلی بولا "میں تو چور ہوں چوری کے لئے آیا تھا۔"

نوجوان خاموش ہو گیا۔

"ایک بات پوچھوں۔" کچھ دیر کے بعد نوجوان نے بات کی۔

"فرمائیے۔"

"اگر ہم پولیس بلوا لیتے تو کیا آپ وہی بیان دیتے۔"

"جے شک۔" ایلی نے کہا۔

نوجوان پھر سوچ میں پڑ گیا۔

"آپ نے اغوا کا فیصلہ کیسے کیا۔" نوجوان نے پوچھا۔

ایلی خاموش رہا۔

کیا یہ تجویز آپ کی طرف سے تھی — "نوجوان رک گیا۔

## سادی

بہی کل رات ہم سے بغل گیر ہو رہا تھا۔ ”پال بولا  
 ”میں نے بھی کہا بارہ بجے کوئی گاڑی جاتی ہے۔“  
 ”معلوم نہ تھا کہ ایلچی چھپا رستم ہے“ جاہ نے کہا ”انسان کو سمجھنا کس قدر مشکل  
 ہے۔“ فرف تودہ پیلیب کنارہ اور دوسری طرف یہ علق ”وہ فلسفیانہ انداز میں مسکرایا۔ اس  
 کراہٹ میں تھخیر کی جھلک تھی۔  
 ”بہی غش و محبت کے دن ہیں۔“  
 ”ہم پر تو نہ آئے یہ دن“ جاہ نے کہا ایک سے ذرا سی راہ ورسم ہوئی تھی۔ لیکن یار یہ کام  
 ناکام نہیں۔ کون سا رادقت ضائع کرے۔“ وہ ہنسنے لگا۔  
 ”لیکن کیا واقعی وہ جارہے تھے؟“ پال نے پوچھا۔  
 ”ہاں ہاں“ بھانے کہا۔

نیت ہے۔ ”جاہ بولا ایلچی پر کوئی اس قدر مفتون ہو جائے کہ —“ وہ ہنسنے لگا ”ہاں بھی  
 اہر ہوئی تو بات بھی تھی اور پھر انصار منصر کا گھرانہ۔ کوئی معمولی گھرانہ نہیں۔“  
 انصار منصر ”پال نے پوچھا وہ کون ہے۔“  
 ”میر تو خیر نہیں مگر بڑا مذہب متدن گھرانہ ہے اور منصر کی قابلیت کا بڑا چرچا ہے اصلیت کا  
 میں مجھے شاید واقعی قاتل ہو۔ ویسے اونچے ہو تلوں میں بیٹھنے والا آدمی ہے۔“  
 ”او تو بڑا آدمی ہوا۔“ پال تمسخر سے بولا جاہ ہنسا ”باقی اللہ جانے۔“  
 ”ایلی سے پوچھیں تو ہی“ بھانے کہا۔

”نفس“ بولا جس بات کو اس نے ہم سے خود جان بوجھ کر راز رکھا ہے — اور پھر  
 کے پائینٹ معاملات میں دخل دیتا —“  
 ”میں نے بھی پہلے روز تذکرہ چھیڑا تھا۔“

”یہ نہ خواتمہ خواہ تھوہ پڑا دیا۔“ وہ بولا ”میں چیختا چلاتا رہا کہ میں نہیں ہوں لیکن انہوں نے  
 ”یہ نہ خواتمہ“ اور پھر اندر لے جا کر پھر سے پٹائی شروع کر دی پھر دھونس بھانے لگے میں  
 ”یہ نہ خواتمہ“ حضور میں نہیں ہوں۔ آپ غلط آدمی کو پکڑ لائے ہیں لیکن وہ میری بات ہی  
 ”یہ نہ خواتمہ“ تو شکر ہے تم واپس آگئے اور تمہاری آواز سن کر میں نے شور مچا دیا کہ وہ ہے وہ  
 ”یہ نہ خواتمہ“ آئے تو نہ جانے کیا ہوتا۔“

## بہتا تنکا

سفید منزل سے آنے کے بعد ایلچی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ لکڑی کا ایک چھوٹا سا کھڑا ہوا  
 جہاز کے پاش پاش ہو جانے کے بعد طوفان میں بہتا ہوا ایک ویران ساحل پر آگیا ہو۔  
 لاہور کی وہ ہما بھی گویا معدوم ہو چکی تھی۔ عمارتوں کا وہ پھیلاؤ سمٹ کر بے معنی تھرا  
 بن گیا تھا۔ جسے چاروں طرف سے پھیکے نیلے آسمان نے گھیر لیا تھا سڑکوں پر دھول اڑتی تھی  
 مکانات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ جیسے دفعتاً ”زندگی سے حرکت مفقود ہو گئی ہو اور چادر پر ایک ساکن  
 تصویر رہ گئی ہو۔“

سارا دن وہ نیم چھتی میں بیٹھ کر اوگھٹا شام کو سوچتا کیا کروں کدھر جاؤں۔  
 اس کی اس تواریخی واپسی کے بعد صرف ایک دن کے لیے ناؤ گھر میں بیٹھنے سا واقعہ  
 جانے کیسے لیکن بھاجاہ اور پال کو اس رات کے ہنگامے کا علم ہو چکا تھا۔ ممکن ہے جتنی  
 نے بات کہندی ہو یا خونِ بلیغ کے لب کے اس ڈاکٹر نے انہیں قصہ سنا دیا ہو جو سفید منزل کے  
 قریب ہی رہتا تھا۔ یا شاید بھانے ہنگامہ سن کر خود جا کر تحقیق کی ہو بہر حال اس روز وہ چوں کہ  
 تک بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔

”بڑا ہنگامہ ہوا۔“ بھانے کہا ”سارے محلے والے جانتے ہیں۔“

”ہوں۔“ جاہ نے منہ بتایا۔



یہ قصہ سنانے کے بعد وہ الیاس سے پوچھتا رہا کہ اس کے ساتھ سفید حملی سلوک کیا۔ ایلی نے مختصر سی بات بتا کر قصہ ختم کر دیا۔

دو دن تو ایلی چپ چاپ اس وسیع دیرانے کو حیرت سے گھورتا رہا جو اس کے ارد گرد ہوا تھا۔ تیسرے روز اس دھندلے میں روشنی کی ایک کرن دکھائی دی ڈاک سے لٹکا گئے کا ایک خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا ازراہ کرم مجھے شام کے وقت میرے دفتر میں بیٹہ دفتر کا منسل پتہ تحریر تھا۔

خط موصول ہونے کے بعد ایلی کے گرد و پیش پھر سے استوار ہو گئے۔ چیزیں بہت اصلی روپ میں اباگر ہو گئیں۔ آسمان سمنا سمر پھیل گیا۔ نہ جانے کیوں بلایا ہے ایلی شاید کیس پولیس کے حوالے کر دینے کا ارادہ ہو۔ یا شاید پھر سے تحقیق کرنی ہو۔ چاہے یہ ہو۔ چاہے اس ملاقات کی نوعیت ضرر رساں ہو۔ پھر بھی ملاقات تو ہو گی۔ چاہے تھی ایک تعلق تو استوار ہو گا۔ اور پھر منصر کا قرب اس کے گدے سے ہاتھ پاؤں اس کے بوتے خم۔ اس کا ذہانت بھرا حسین چرا۔ ایلی بے حد خوش تھا۔

### انصار منصر

شام کے وقت جب وہ دفتر پہنچا تو منصر نے اس کی آمد کو خاص اہمیت نہ دی۔ ”بیٹھے۔“ وہ بولا ذرا میں کام ختم کر لوں۔ سگرت پیجئے۔“ اس نے پیک ایلی کی طرف دیا اور یوں کام میں منہمک ہو گیا جیسے اسے خصوصی طور پر بلایا ہی نہ گیا ہو۔ دیر تک ایلی وہاں بیٹھا رہا وہ حیرت اور احترام بھری نگاہوں سے منصر کو دیکھتا رہا۔

آپ کو زیادہ دیر کے لیے انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟“ منصر نے اس کے قریب آ کر بے لطف سے کہا ایلی اس کے رویے پر حیران تھا۔

”آئیے“ منصر نے کہا ”اب چلیں۔“

لیکن ”ایلی نے کہا۔ آپ نے تو مجھے بلایا تھا۔“

”ہاں ہاں“ منصر بولا چلئے ناگھو میں پھرں گے۔“

ایلی نے حیرت سے منصر کی طرف دیکھا۔

”منصر نے پینتر ابدلا۔“

”منصر نے ایلی کو اپنے موٹر سائیکل کے پیچھے سوار کر لیا وہ دو دنوں چل پڑے۔“

منصر ہوسٹل میں پہنچ کر منصر نے سرسری طور پر کہا۔

”میں نے سوچا آج شام آکھٹے بسر کریں۔ آپ تو سارا دن مطالعہ کرتے تھک جاتے ہوں۔“

ایلی سوچ رہا تھا کہ کہاں وہ باہر نکال دو اس بد معاش کو۔ اور کہاں یہ آکھٹے شام بسر کرنے کی جگہ ہو۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ دو گھنٹے آکھٹے رہنے کے بعد منصر نے اشارتاً ”بھی کسی ایسی بات کرنا کیا تھا جو گزشتہ واقعہ سے متعلق ہو۔ وہ نہایت بے تکلفی اور گرم جوشی سے ایلی سی کر رہا تھا۔ جیسے دونوں بہت پرانے دوست ہوں۔“

انصار منصر کی شخصیت کو دیکھ کر ایلی بھونچکا رہ گیا۔ وہ ایک خوب صورت اور پیارا جوان اس کا لباس سادہ ہونے کے باوجود نفیس تھا۔ جس میں رنگوں کا حسین امتزاج تھا۔ اس کی لٹ میں لے تھی۔ ہاتھوں میں مزاج کی جھلک تھی۔ مزاج رنگین تھا اور شعر و سخن ادب اور نہ سے لگاؤ تھا اور اس کی علمی معلومات بہت وسیع تھیں۔

منصر نے جب ایلی کو ناؤ گھر کے دروازے پر موٹر سائیکل سے اتارا تو وہ کہنے لگا اگر اعتراض ہو۔ میرا مطلب ہے اگر آپ کو کوئی پروگرام نہ ہو اور تعلیم کا حرج نہ ہو تو کل شام کو دفتر آئیے گا۔“

اس کے بعد ایلی کا معمول ہو گیا کہ سارا دن وہ کتاب سامنے رکھ کر شام کے خواب دیکھتا رہتا۔ منصر کے دفتر میں پہنچ جاتا اور پھر جب منصر کام سے فارغ ہوتا تو وہ اس کے موٹر سائیکل پر بٹیاں جیسے شاہی تخت پر بیٹھا ہو۔ شاہ کا جلوس سڑکوں پر گھومتا۔ لوگ حیرت سے ماک طرف دیکھتے اور ادب سے صف آرا ہو جاتے کورٹش بجالاتے۔ جب وہ مشغل ہوٹل میں پہنچتا تو میرے تعلیم کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

اگرچہ منصر کی عادت تھی کہ وہ عالمانہ باتیں کرنے سے احتراز کرتا تھا پھر بھی کوئی نہ کوئی شے چلنے چلنے منصر کے منہ سے نکل جاتی جسے ایلی یوں حفظ کر لیتا جیسے وہ قرآن کریم کی آیت نہ ملنا بات چھوڑے منصر کوئی بھی ایسی بات کرنے سے احتراز کرتا تھا۔ جس سے اس کی بے نیکی ثابت ہو۔ یا جو ایلی کو احساس کمتری دلائے۔ عجیب بات تھی یہ کہ منصر نے کبھی ایلی کو اس

لیکن سبھی کبھار جاہ تک بات پہنچ ہی جاتی اور وہ منہ بنا کر کہتا۔  
 ”ابن سبھی آج کل اہلی صاحب اونچی ہواؤں میں اڑتے ہیں۔ ہم ریگننے والے لوگ ان کی  
 جہن میں کھل ملتے ہیں۔“

یہ ایک حقیقت تھی جب سے اہلی منصر سے واقف ہوا تھا اس کے دل میں جاہ کے لیے  
 ”چند اجازت نہ رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تا جیسے وہ کتابی دنیا میں محصور ہو۔ وہ اس رنگینی سے  
 بے گد ہو جو زندگی کی جان ہے اس کی شخصیت میں کتابی علم کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔

سبھی کبھار جب وہ منصر کے پاس ہوتا تو اسے خیال آتا کہ اگر میں بی۔ اے نہ کر سکا تو کیا ہو  
 گا۔ یہ لوگ کیا سمجھیں گے شاید وہ ایک انڈر گریجویٹ کو درخور اعتناء نہ سمجھیں۔ اس روز گھر آکر  
 بیوی نے اسے کتابیں کھول کر بیٹھ گیا۔ لیکن کتاب کے صفحات سے سادی جھانکتی۔ ”میں بیمار  
 ہوں۔“ منصر ہنستا ”آپ مجھ سے بات کریں الیاس صاحب۔ براہ راست ان سے بات نہ کرنے کا  
 آپ نے وعدہ کیا ہے۔“ سادی چلائی۔ اونٹوں۔ ان کا آپ سے تعلق صرف میری وجہ سے ہے  
 ان کی مہربانیاں میری وجہ سے ہیں۔ ان میں نہ کھو جائیے گا۔ یہ صرف آپ کی توجہ کو جذب کرنا  
 ہے جس میں تاکہ مرکز نوٹ جائے۔“

اہلی کتب بند کر دیتا۔ پھر اسے محسوس ہوتا کہ زینے میں شنراؤ کھڑی حرام بھری نگاہوں  
 سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ مڑتا۔ شنراؤ آنکھیں جھکا لیتی اور زیر لب کہتی ”نہیں میں نے  
 کچھ نہیں کہا“ اور پھر میڑھیاں اترتا شروع کر دیتی۔

اجتہاد

ایک روز جب منصر اور اہلی دونوں ہوٹل میں بیٹھے تھے تو منصر نے غیر معمولی ہیرے کو  
 اُٹھا دیتے ہوئے کہا ”دو چھوٹا“ اہلی چونکا۔ دو چھوٹا اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ اس  
 سے پہلے تو منصر نے کبھی دو کا آرڈر نہ دیا تھا۔ شاید بے خبری میں — لیکن منصر تو بے خبری  
 نہیں کر سکتا۔ وہ شہنشاہی کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ اس میں عقل اور جذبے کی عجیب سی آمیزش تھی۔ اس  
 شہنشاہی میں کہ جذبہ حاوی رہتا تھا لیکن اظہار کرنا منصر کے نزدیک مستحسن تھا۔ اس کا وقار  
 ان کا اجازت نہ دیتا تھا۔

مکس نے دونوں چھوٹے میز پر رکھ دیے۔ منصر نے سگٹ پھینکتے ہوئے تعجب سے میز کی

حقیقت کا احساس نہ دلایا تھا کہ وہ سادی کا بھائی ہے یا اسے اس گھرانے سے کوئی تعلق ہے۔  
 اہلی پر چوری کا الزام لگایا گیا تھا۔ منصر نے اس دوران میں الزام اپنے گھر کے متعلق مڑا  
 بات کی تھی اور وہ بھی سرسری طور پر کہنے لگا۔

”الیاس صاحب آپ سفید منزل کی طرف کبھی نہ جائیے گا۔ ورنہ وہی تباہی ہو  
 پیچیدگیوں پیدا ہو جائیں گی اور ممکن ہے —“ وہ رک گیا اور پھر معنی خیز مسکراہٹ۔  
 کہنے لگا ”مجھے یقین ہے کہ آپ ایسی حفاظت نہیں کریں گے لہذا جملہ مکمل کرنے کی کیا ضرورت  
 ہے۔“ اس کے علاوہ ایک روزانہ جانے میں منصر کے منہ سے گھر کی بات نکل گئی تھی جس سے  
 ظاہر ہوتا تھا کہ سادی بیمار ہے اور کسی سپیشلسٹ کے زیر علاج ہے۔ اس پر اہلی چونکا تھا۔ اس  
 جی چاہتا تھا کہ منصر سے پوچھے کہ اسے کیا تکلیف ہے اور اب کیا حال ہے۔ لیکن منصر  
 موضوع بدل دیا تھا اور اہلی میں پوچھنے کی جرات نہ ہوئی تھی پھر کچھ دیر کے بعد وہ منصر کی  
 حد تک جذب ہو کر رہ گیا تھا کہ وہ یہ بھول چکا تھا کہ سادی بیمار ہے۔

پھر شام گزارنے کے بعد رات کے گیارہ بجے جب منصر نے اسے اپنے موٹر سائیکل سے  
 اتارا تھا تو ناؤ گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دفعتاً ”اہلی کو یاد آیا تھا کہ سادی بیمار ہے۔ وہ ڈپ کر  
 مڑا تھا کہ منصر سے پوچھے لیکن منصر جا چکا تھا۔ چند ایک روز کے بعد منصر نے خود ناؤ گھر آنا شروع  
 کر دیا تھا۔ وہ کبھی اوپر نہ آیا تھا۔ شام کے وقت وہ ناؤ گھر کے نیچے بارن بجاتا اور اہلی فوراً نیچے  
 آتا۔ روز موٹر سائیکل کو ناؤ گھر آتے دیکھ کر بھا جاہ اور پال حیرانی سے اہلی کی طرف دیکھتے تھے اور  
 جمل تو اسے دیکھ کر یوں کھل جاتا جیسے خربوزہ منھاس کی وجہ سے پھٹ جاتا ہے۔

”یار اہلی تم کمال ہو۔“ وہ چلاتا ”یار تم تو منزل تک پہنچ کر رہے۔ اب کیا ہے اب تو ب  
 رام ہو گئے ہیں۔ کیوں۔“

لیکن اہلی کو نہ جانے کیا ہوا تھا وہ جمل سے اجتناب کرنے لگا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی  
 کہ جمل کے دروبر اہلی احساس جرم محسوس کرتا تھا۔ جیسے اس نے جمل کے سفید رنگ اور  
 سنہرے بالوں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا ہو جیسے اس نے شکار کرنے کے لیے شہرے ہلکا  
 دانا پھینکا ہو۔ اسی وجہ سے وہ اس سے زیادہ بات نہ کرتا بلکہ کوشش کرتا کہ اس کی بات نہ  
 دے۔

نیم چمکتی سے نیچے تو اہلی جاتا ہی نہ تھا۔ اگر کبھی جاتا بھی تو کوشش کرتا کہ جاہ سے دور رہے۔

طرف دیکھا۔ ارے کیا میں نے دو منگالیے اچھا“ وہ ہنسنے لگا تو لیجئے پھر دفعتاً اس نے ہاتھ بلند کر کے کہا ”چلو کیا حرج ہے آپ کوئی مولانا تو ہیں نہیں“ آئیے میرے ساتھ شامل ہو جائیے۔“

”میں نے آج تک —“ ایلی نے معذرت کے لیے منہ کھولا۔

”اوہ“ وہ اک انداز محبویت سے بولا ”خدا را اب مسائل بیان کرنے نہ شروع کرو۔“

”لیکن —“ ایلی نے پھر کوشش کی۔

”آخر یہ لیکن ایک نہ ایک روز تو ٹوٹے گا ہی۔ چلے آج ہی سہی۔“ وہ مکر لیا محض یہ ہے کہ آپ نے کبھی — ہاں ہاں اب کیا پردہ ہے۔“

اب کیا پردہ ہے۔ اب کیا پردہ ہے سڑک پر موٹر بھونکنے لگی۔ اب کیا پردہ ہے ہوٹل کے سازندے نے والٹن پر دہرایا۔ ہا ہا ہا ہا۔ پاس بیٹھا ہوا ایک مولانا سکھ ہنسنے لگا۔ ”سب پردے ہٹا دیے۔ کیا چیز ہے۔“

دفعتاً ایلی کو خیال آیا کہ شاید منصر سوچی سمجھی سکیم کے مطابق اسے پلا رہا ہے۔ پلا رہا ہے تاکہ — اس کا دل ڈوب گیا۔ شاید وہ ایلی سے سادی کی ملاقاتوں کے متعلق تفصیلات جاننے کا خواہشمند ہے۔ وہ ڈرتا تھا کہ اگر اس نے انکار پر اصرار کیا تو منصر سمجھے گا کہ وہ اپنا راز محفوظ رکھنے کے لیے انکار کر رہا ہے اس سے ثابت ہو گا کہ راز کا وجود ہے۔ ایلی نے اپنا آپ بیتی بنانے کی شدید کوشش کی۔ اس نے اپنے تمام تر عزم کو لاکڑا کوئی بات زبان پر نہ آنے کوئی لکڑی بات جس میں سادی پر حرف آئے۔ سادی کی عزت کا سوال ہے۔ پردہ جوں کا توں قائم رہے گا۔ یہ دو گھونٹ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے نہیں بگاڑ سکتے۔ ایلی نے چھوٹا اٹھالیا۔ اس کا ہاتھ ذرا نہ کھلا۔ اور وہ اسے یوں غٹ غٹ پی گیا جیسے چھوٹا نہیں بلکہ شربت کا گلاس ہو۔ ایک ساعت کے لیے منصر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا پھر دفعتاً ”مزکر چلایا بیرا دو چھوٹا اور۔“

چار چھوٹے ٹنگنے کے بعد ایلی نے محسوس کیا کہ اس کے اندر آگ لگی ہے۔ باہر ہوٹل؛ ایک سرخ دھند لگا چھائے جا رہا تھا۔ اور وہ پورے عزم سے اپنے آپ کو پتھر بنانے میں مصروف تھا۔

”آپ کا امتحان کب ہو رہا ہے؟“ منصر نے پوچھا۔

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ کندے امتحان تو ہو رہا ہے ممتحن سامنے بیٹھا ہے۔

پندرہ روز کے بعد ہو گا“ وہ بولا ”مشن کالج میں سنٹر بنایا ہے۔“

منصر نے کئی ایک بار کہا کوئی بات کیجئے الیاس صاحب۔ کچھ کہیے۔

اس نے خود کچھ کہنا شروع کر دیا۔ ”آپ نے وہ شعر سنا ہے؟“

نہ پوچھ حال میں وہ چوب خشک صحرا ہوں

لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

تو یہ ایک وہ اسے سناتا رہا۔ پھر بولا ”مجھے شعر بے حد پسند ہیں۔ اور میں محسوس کرتا جیسے مائیکروں اشعار بے تاب ہوں اگرچہ میں آج تک اپنے خیال کو شعر کا جامہ نہیں پہنا

ایک عظیم کیفیت کو چند الفاظ میں کہہ دیتا ہوں بات ہے۔ ہم تو بہت سارے الفاظ میں بھی کہہ سکتے۔ آپ کو کونسا شعر پسند ہے؟“ اس نے پوچھا۔

ایلی کو اس وقت کوئی شعر یاد نہ آ رہا تھا۔

پھر دفعتاً منصر نے بات کا رخ بدلا۔ ”ہاں تو الیاس صاحب ذرا اس واقعہ کی تفصیلات تو بتاؤ ہماری ملاقات کا موجب ہوا۔ میں صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں۔“ وہ بولا ”کیونکہ یہ دل میں بے لاگ انتشار پیدا ہوا ہے کسی خاص مقصد کے تحت نہیں پوچھ رہا اور نہ ہی بے گتہ بننے پر کسی قسم کے نتائج پیدا ہوں گے۔“

ایلی نے شدت سے پتھر بننے کی کوشش کی وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”وہ اصل بات وہی تھی مگر نے آپ کو بتادی تھی۔“ ایلی نے کہا ”میں نے کوئی تفصیل چھپائی نہیں۔“

”ہوں“ منصر نے کہا۔ ”پھر بھی۔“

”آپ پوچھنے کو کسی خصوصی تفصیل —“

”کیا اور سے ابتدا ہوئی تھی؟“ منصر نے کہا ”یا آپ کی طرف سے۔“

”اور سے نہیں“ ایلی نے کہا۔

”تو آپ نے ہی تحریک شروع کی تھی۔“

”کیا۔“

”مگر اور سے کیا رد عمل ہوا۔“

”کھلم کھلت۔“ ایلی نے کہا۔

منصر نے لگا ”آپ کس نفسی سے کام لے رہے ہیں۔“

”میں کل کوٹے کا خطاب دیا گیا۔“

”ہوں۔ تو کیا آخری واقعہ کے متعلق وہ تجویز آپ کی ہی تھی؟“

”ہاں“

”اس سے آپ کا مقصد کیا تھا۔“

”جذبہ اور کیا۔ میں نے سوچا نہیں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”آپ نے یہ نہ سوچا کہ کسی کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔“

”نہیں“ ایللی نے کہا۔

”اور آپ کی تجویز منظور کیسے کر لی گئی؟“

میں نے خود کشی کی دھمکی دی تھی۔ شاید اس لیے۔“

منصر تہقہ مار کر ہنسا۔

”اور وہ زیور۔ کیا آپ کے کہنے پر لایا گیا تھا۔“

”نہیں۔ بلکہ اگر وہ ایللی نہ ہوتا تو ہم جا چکے ہوتے۔“

”کیسے۔“

”میں نے اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔“

”پھر آپ موقع سے بھاگ کیوں گئے؟“

”مجھے میرے دو دوست زبردستی گھسیٹ کر لے گئے تھے۔“

”ہوں۔“ وہ تہقہ مار کر ہنسا آپ بھی خوب ہیں الیاس صاحب۔“

”کچھ دیر کے بعد اس نے پوچھا اگر آپ لوگ چلے جاتے تو کیا کرتے۔“

”شادی۔۔۔ ایللی نے کہا۔

”ہوں۔“ منصر نے ایک بھر پور نگاہ ایللی پر ڈالی۔

آپ کو امداد دینے والا کوئی تھا۔ میرا مطلب ہے جہاں سے امداد کی توقع لگائی جائے

”نہیں۔“ ایللی نے کہا۔

”آپ کے والدین زندہ ہیں۔“

”جی۔“

”تو ظاہر ہے کہ وہ آپ کی مدد کریں گے۔“

”اوہوں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”کیوں“ منصر نے پوچھا۔

”والدہ صاحب کی تین بیویاں ہیں۔“

”ہوں۔ اور آپ کی اپنی والدہ۔“

”وہ ان کی پہلی بیوی ہے۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”ایللی اٹھ بیٹا اس کا ضبط ختم ہو چکا تھا ہوٹل کا وہ کمرہ لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ میز ایک

”ایللی اٹھ بیٹا اس کا ضبط ختم ہو چکا تھا ہوٹل کا وہ کمرہ لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ میز ایک

”دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب وہ کسی نالی میں گر کر رہے ہوش ہو جائے

”منصر بار بار اسے کہہ رہا تھا کچھ کھائے تاہم تین تہائی کے علاوہ کھانے کو جی نہیں

پاتا تھا۔

”بیٹھے ہا“ منصر نے کہا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”چلے میں آپ کو ٹھیک کر دوں۔“ منصر نے ایللی کو سائیکل پر بٹھالیا۔ ایللی نے مضبوطی سے

منصر کو پکڑ لیا۔ اور پھر ایللی کو اس وقت ہوش آیا جب سائیکل رک چکا تھا۔ اس نے سمجھا کہ ناؤ

گھر آیا وہ ہونچکا رہ گیا۔ شاید نشے کی وجہ سے اسے ناؤ گھر کا چھوٹا سا دروازہ بھانک دکھائی دے

رہا تھا۔

”آئیے۔“ منصر نے آکر اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔

اسے۔“ حیرت سے اس نے منصر کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں سفید منزل میں داخل ہو رہے

تھے۔

”ایک بات کہوں۔“ منصر نے ہنس کر ایللی سے کہا۔ ”پہلے تو ہم نے آپ کی بات تسلیم کر لی

تھی لیکن اگر اب آپ کہیں کہ آج پینے کا آپ کا پہلا موقع تھا۔“ تو وہ رک گیا۔ ”بات قابل

قبل نہیں۔“

”بیٹھے منصر نے کہا۔ ایللی نے کمرے کی طرف دیکھا یہ وہی کمرہ تھا جہاں وہ چند روز پہلے چور

کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ اور آج — لیکن آج تو اسے اپنی حیثیت کا علم نہ تھا۔ وہ

محسوس کر رہا تھا کہ واقعات پر اسرار طور پر رخ بدل رہے تھے نہ جانے کیا ہونے والا ہے نہ

بلنے کیا ہو گا۔ ایللی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ منصر نے کئی بار اسے تاکیدا ”کہا تھا۔“ الیاس

منصر نے لگا "اگر ہمارے لوگ آپ کے سامنے آئیں تو تخصیص کیوں کی جائے گی نہ وہ شراب؟ آپ سب کے سامنے۔"

"ہاں نہیں سمجھا۔" ایللی نے جواب دیا۔

"وقت تو یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں سمجھ رہا۔" منصر چلایا "اگرچہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ — اور میں نے آج تک اس مسئلے پر غور نہیں کیا تھا۔" ایللی نے کہا "وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی کشش میں گرفتار ہے۔"

"جی" ایللی نے کہا۔

"جی کیلے" وہ بولا کیا سمجھے آپ۔

"کچھ بھی نہیں۔" ایللی نے کہا۔ منصر نے ایک تہققہ لگایا۔

"تجربہ کی بات ہے" وہ بولا "ہم دونوں اس قدر قریب ہیں بہت قریب اتنے قریب کہ آپ کو اندازہ نہیں ہو سکتا اور پھر ہم دونوں بیک وقت اس قدر بیگانہ ہیں اس قدر دور کہ —" منصر گر گیا۔ "سگریٹ پیچھے۔" وہ — سگریٹ تو آپ پیٹے ہی نہیں — ہاں تو میں کہہ رہا تھا — کیا کہہ رہا تھا میں — "وہ ہنسنے لگا "ہاں — آپ نے داستودسکی کا ناول برادرز کیلے؟"

"جی نہیں۔" ایللی نے کہا "میں نے صرف ایڈیٹ اور کرائم اینڈ پنشنمنٹ پڑھے ہیں۔"

"منصر پڑھے۔" وہ بولا — اے پڑھے بغیر آپ ہم کو نہیں سمجھ پائیں گے۔"

"آپ کی کتنی ہمشیریں ہیں؟" منصر نے دفعتاً بات بدلی۔

"ایک" ایللی نے کہا۔

"جی ہیں یا چھوٹی۔"

"جی۔"

"تو آپ نہیں سمجھ سکتے کہ چھوٹی بہن کا مفہوم کیا ہے۔" منصر نے جوش اور جذبے سے کہا۔

ایللی نے سوچا کہ شاید منصر نشے میں باتیں کیے جا رہا ہے۔ لیکن خصوصی طور پر آج کیوں؟

صاحب آپ کا ہمارے گھر جانا یا کسی قسم کا کوئی رابطہ پیدا کرنا ہمارے لیے تکلیف کا باعث ہو گا اور اب جب کہ ہمارے دوستانہ مراسم ہو چکے ہیں اگر آپ نے چوری چھپے کوئی بات کی یا کوئی بات مجھ سے چھپائی تو مجھے دکھ ہو گا۔"

"آپ شاید یہ سوچ رہے ہیں کہ یہاں آپ کو کیوں لایا گیا ہے۔ مجھے دفعتاً خیال آیا کہ اس حالت میں آپ کو اپنے لاج میں نہیں جانا چاہئے۔ ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ لیجے سگریٹ پیچھے۔" وہ میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں کہ آپ سگریٹ نہیں پیٹے۔ لیکن اس میں میرا قصور نہیں کیونکہ اس عمر میں کم و بیش لوگ سگریٹ پینا شروع کر ہی دیتے ہیں۔"

سائیکل پر ہوا کھانے کے بعد ایللی کی حالت اور بھی خراب ہو چکی تھی۔ اس کے قہقہہ جہم میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ منہ سخت کڑوا ہو رہا تھا طبیعت مالاں کر رہی تھی۔

"آپ کچھ دیر کے لیے یہاں آرام کیجئے۔ لیٹ جائیے۔" لیکن ایللی اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں ابھی آیا" کہہ کر منصر چلا گیا اور ایللی کمرے میں اکیلا رہ گیا۔

پھر دفعتاً اس کی طبیعت گھبرائی وہ باہر نکلا۔ سامنے اس زینے کا دروازہ تھا جہاں وہ پہلے کی ایک بار آچکا تھا ایک کرکڈی کھولی اور اندر پہنچتے ہی شدت سے قے کرنا شروع کر دیا۔

قے کے بعد اس کی طبیعت ہلکی ہو گئی۔ اس نے اس کمرے کی طرف حسرت بھری نظر ڈالی۔ فرش پر ابھی تک سگریٹوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ گھڑیوں پر ایک ماہیں پڑی تھی۔ اسے ان ملاقاتوں کا خیال آ گیا۔ یہاں وہ بیٹھ جایا کرتا تھا اور کوئی کمرہ کرتی تھی "آپ بیٹھ کیوں گئے۔ اٹھئے نا۔"

"آئیے نا۔" اس کی پشت پر منصر کھڑا تھا۔ "یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں۔ آپ۔"

اسی روز باتوں ہی باتوں میں منصر نے پروے کا موضوع چھیڑ دیا۔ "پروے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔"

"میں نہیں سمجھا ایللی نے کہا۔ میرا مطلب ہے۔" منصر نے کہا جہاں تک اس کے تعلق ہے آپ کی حیثیت ایک اجنبی کی ہے ایک بیگانے کی۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ اسے خصوصی سلوک کیا جائے۔"

ایللی کو منصر کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

میل کے دوران میں ایللی نے دو ایک بار چوری چوری سادی کی طرف دیکھا۔ اس کے ہنسنے پر ایللی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے وہ سادی نہیں بلکہ سکندر ہو جو دریائے جہلم کے کنارے کھڑا ہو۔

میل کے وقت میں والدہ کے اشارے پر منصر نے بیرے کو آواز دی لیکن اس کی آواز کسی نے نہ سنی اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔ والدہ نے مسکرا کر ایللی کی طرف دیکھا۔

”آپ کے مزاج اچھے ہیں۔“ ایللی نے کچھ کہنے کے لیے کہا۔

”مسکرائیں اور پھر کہنے لگیں۔“ کبھی مجھ سے ملتا، مجھے تم سے باتیں کرتا ہے۔“

”ہی“ ایللی نے جواب دیا۔

”گھر آئیے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب۔“ والدہ نے کہا۔

”ہمت اچھا۔“ ایللی نے جھکی جھکی نگاہوں سے جواب دیا۔

”گھر دے دیجئے انہیں“ سادی چمک کر بولی۔

”ہی۔“ ایللی نے سادی کی طرف دیکھ کر بغیر کہا ”کہیں دو بجے نہ آجائیں۔“ وہ بولی۔

”منور آتا ہے“ والدہ نے یوں جواب دیا جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

”ہی۔“

اور

اور

”تم انتظار کروں گی۔“ والدہ بولیں اور — پھر منصر کی آمد پر وہ دفعتاً ”چپ ہو گئی۔“

منصر آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔

منصر نے شدید خواہش کے باوجود سادی اور باجی کی طرف نہ دیکھا اس میں ہمت نہ پائی۔ اسے منصر کے الفاظ یاد آرہے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ پھر تخصیص کیوں کی جائے منصر سادی اور باجی کو منظر عام پر لانے سے گریز نہ کیا تھا۔ ایللی نے حیرت بھرے احترام سے منصر کی طرف دیکھا۔ کس قدر پروقار تھا وہ چھوٹا سا خوب صورت آدمی۔

وہ یہ نہ سمجھ سکا ”مجھے اپنی ہمشیرگان سے بے حد محبت ہے۔“ منصر بولا آپ اندازہ نہیں کرتے ہیں۔ سرہاں پردے کا تو میں قائل نہیں ہوں میرا مطلب رسی پردے سے ہے۔ پلاسٹک بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔“ اس نے ایللی سے پوچھا۔

”میں تو رسی پردے کو فضول سمجھتا ہوں۔“

”ہاں۔“ دفعتاً ”منصر نے پھریات کا رخ بدلا۔ آپ کو ٹینس سے دلچسپی ہے؟“

”جی ہاں کچھ کچھ ہوشل میں کھیلا کرتا تھا۔“

”آپ کو معلوم ہے کہ پنجاب ٹینس چیمپئن شپ کا فائنل ہو رہا ہے۔“

”جی نہیں۔“

تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کل شام کے چار بجے لارنس باغ کی گراؤنڈ میں یہ میچ ہو

اور آپ ہمارے ساتھ وہاں جا رہے ہیں۔ آپ چار بجے وہاں از خود پہنچ جائیے گا۔ وہاں مایہ ہوگی۔“

منصر کی اس روز کی باتیں ایللی کو قطعی طور پر سمجھ میں نہ آئیں۔ نہ جانے وہ ریگلازادہ کچھ کہہ رہا تھا شاید گپ ہانک رہا ہو۔ لیکن ان کی بات کرنے میں منصر کو کمال حاصل تھا اور حقیقت سے ایللی واقف تھا۔ پھر بھی اس روز کی باتیں تو نہ کی تھیں نہ ان کی۔

## منظر عام

اگلے روز جب ایللی ٹینس میچ کے میدان میں پہنچا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی منصر ہمراہ سادی باجی اور ایک معزز خاتون تھیں وہ تینوں بے نقاب تھیں۔ ایللی انہیں دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”آئیے آئیے“ منصر چلایا ”یہ ہیں الیاس صاحب“ اس نے خاتون کو مخاطب کر کے کہا۔ آپ والدہ صاحبہ ہیں۔ اور انہیں“ اس نے سادی اور باجی کی طرف دیکھ کر کہا انہیں تو پتہ جانتے ہیں۔“ ایللی نے جھک کر والدہ کو سلام کیا۔

ایللی نے شدید خواہش کے باوجود سادی اور باجی کی طرف نہ دیکھا اس میں ہمت نہ پائی۔ اسے منصر کے الفاظ یاد آرہے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ پھر تخصیص کیوں کی جائے منصر سادی اور باجی کو منظر عام پر لانے سے گریز نہ کیا تھا۔ ایللی نے حیرت بھرے احترام سے منصر کی طرف دیکھا۔ کس قدر پروقار تھا وہ چھوٹا سا خوب صورت آدمی۔

وہیں کہا کہ ایللی سن لے۔  
 ایللی خاموش بیٹھا رہا اور والدہ سے رسمی باتیں کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔  
 ”دیکھو تو۔“ سادی پھر بولی جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔  
 ”اب میں کیا کہوں۔“ ایللی نے والدہ کو مخاطب کر کے کہا۔  
 ”کیا کام نے میں نہیں سمجھی۔“ وہ بولیں۔  
 ”میں نے عرض کیا کہ۔۔۔“ ایللی رک گیا۔  
 ”جملہ کھل کر دو باجی۔“ سادی پھر بولی۔  
 ”جملہ نہیں“ وہ بولا۔ ”کمانی۔“  
 ”وہ کیا میں تھوڑا کروں گی۔“ سادی تہقیر مار کر نہی۔  
 ”نہ جانے تم کیا کہہ رہے ہو۔“ والدہ بولیں۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ بیٹھیں ”میں ذرا دیکھوں تو  
 لہن تو نہیں آیا۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

”یہ کس مشکل میں ڈال دیا مجھے نہ جی۔“ وہ چمک کر بولا۔  
 ”اچھی نہ اٹھانے کی سزا بھی تو ملنے چاہیے باجی انہوں نے ضد کر کے سب کچھ کھو دیا۔“  
 ”کھویا تو نہیں پالیا ہے۔“ ایللی نے کہا۔  
 ”لوںوں پالیا ہے۔“ وہ بولی بڑی ہمت والے تو دیکھو یہ تو مابدولت کی محنت کا نتیجہ ہے۔“  
 ”جی“ ایللی نے کہا مابدولت تو غش کھا کر گرنا جانتے ہیں۔“  
 وہ تہقیر مار کر نہی ”غش نہ کھاتے تو بات بھی نہ بنتی۔“  
 ”میں نے سنا تھا تم بیمار تھیں سادی۔“

”اچھی تو وہی بات ہے کہ فراق یار میں کھس کھس کے بن گئے ہاتھی۔“ وہ ہنسنے لگی۔  
 ”جھوٹ۔“ باجی نے کہا۔

”خاموش باجی۔“ سادی اٹھ بیٹھی۔

”دراصل۔۔۔“ باجی نے بات کرنے کی کوشش کی۔

”ایک لفظ منہ سے نکالنے کی اجازت نہیں۔“ سادی نے کہا اور کل ”وہ ایللی سے مخاطب ہوئی۔

”یوں نہیں بال پر نگاہیں جما کر بیٹھے رہے جیسے جانف حلوے پر جملے رہتے ہیں۔“

اگلے روز دوپہر کے وقت جب ایللی سفید منزل میں داخل ہوا تو وہ  
 اس کے روبرو آگیا۔ والدہ پہلے ہی سے اوپر چنگے میں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ایللی کو دیکھ  
 والدہ نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر تک وہ دستک دیئے بغیر دروازے پر کھڑا ہوا  
 کھلا۔ جب وہ اندر داخل ہوا تو دروازہ بند کر لیا گیا۔ چلی منزل ویران پڑی تھی۔  
 رسمی باتوں کے بعد والدہ نے کہا ”مجھے اپنی بچیوں سے بڑی محبت ہے۔ بڑی محبت۔“ اس  
 آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ کیا کروں میں مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور چھوٹی تو بڑی ہی  
 ہے۔ بڑی ہی۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔  
 ”تم بڑے اچھے ہو۔“ دفتا“ والدہ نے موضوع بدلا ”تم سے مل کر مجھے بڑی خوشی  
 ہے۔“

”مجھے تم سے اتنی ہی محبت ہے جتنی“ وہ رک گئی۔

”آپ کی بڑی نوازش ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”مجھے باتیں نہیں کرنا آتیں بیٹا۔“ وہ بولی۔

”جی“ ایللی نے اس رسمی جملے پر شرمندگی سی محسوس کی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس  
 خاتون کو یوں آغوش میں لے لے جیسے وہ ایک نصی سی بچی ہو مگر اس میں ہمت نہ پڑی ابھی  
 باتیں ہی کر رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے بجھا۔  
 ”آؤ نا ادھر اس کمرے میں آجاؤ اس بغلی کمرے میں آئیے اگر المان کو پتہ چلا کہ تم اس  
 میں آئے ہو۔ تو قیامت آجائے گی۔“

”المان؟“ ایللی نے دہرایا۔

ہاں۔ وہ ہمارا عزیز ہے اللہ رکھے بڑی کامیگیر ہے۔ چھوٹی کی منگنی ابھی نہیں ہوئی لہذا  
 جو شیلہ ہے۔ پتہ نہیں کیا کر دے۔۔۔ آؤ ادھر آجاؤ۔“

جب وہ بغلی کمرے میں داخل ہوا تو قریب ہی سے ہنسی کی آوازیں سنائی دیں۔ ”وہ وہ وہ“  
 سادی اور باجی بیٹھی آپس میں کانا پھوسی کر رہی تھیں۔

”بیٹھ جاؤ بیٹا۔ اب تم سے کیا پردہ ہے۔ بیٹھ جاؤ۔“

ایللی سر جھکا کر ادب سے بیٹھ گیا۔

سادی نے باجی کے کان میں کہا۔ ”وہ پتہ لاؤ انہیں باجی۔“ اور اس نے جان بوجھ کر



بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے  
بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے

بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے  
بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے

بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے  
بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے

بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے  
بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے

بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے  
بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے

بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے  
بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے

بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے  
بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے

بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے  
بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے

بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے  
بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے

بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے  
بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے

بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے  
بہنہ کرنا لیکن روئے خن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھبڑتیں اور ایللی کے

”ایک گھنٹہ تباہ کر دیا۔ کیون جی۔ ہم سے بات بھی نہ کی۔“

”تم سے باتیں کرنے کا مزہ تو کچھ لیا۔“

”ابھی سے گھبرا گئے۔ اور ہم تو حضور سے امیدیں لگائیں بیٹھے ہیں وہ کیا ہوں گی۔“

چمک کر بولی۔

”ایک کال کلوئے سے۔۔۔“ ایللی رک گیا۔

”خاموش۔۔۔“ سادی نے ایللی کو ڈانٹا۔ ”ہائے باجی یہ تو ساری عمر معاف نہ کریں گے مجھے“ وہ ہنسنے لگی۔

”اور وہ سنہری بال خواہ مخواہ پٹ گیا بیچارہ۔“

”ہئے واقعی۔“ باجی بولی۔

”دونوں طرف پٹ گیا۔“ ایللی نے کہا۔

”کچھ کہتے تھے وہ“ سادی نے پوچھا۔

”کہتا تھا یار یہ لڑکیاں بھی کیا ہوتی ہیں کبھی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔“

”آپ انہیں ساتھ کیوں لائے تھے جی۔ ساتھ لاکر پڑا دیا۔“ سادی نے پوچھا۔

”خود ضد کر کے آیا تھا۔“ ایللی نے کہا۔

مجھے حیرانی ہے۔“ سادی ہنسی انہوں نے انہیں کیوں پکڑ لیا۔ آپ کو کیوں نہ پکڑا۔“

”اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔“ ایللی بولا۔

”کیوں۔“ باجی نے پوچھا۔

”سنہری رنگت والی گوری کے ساتھ گلفام ہی ہونا چاہئے نا۔“

”بس ان سے بات بھی نہ کرو باجی۔“ سادی غصے میں اٹھ بیٹھی۔

”مجھے دیر ہو گئی۔“ والدہ نے داخل ہوتے ہوئے کہا لیکن امان نہیں ہے چلو فکر تو نہ

ہوا۔“

## کیراموزوز

اس کے بعد ایللی کے شب و روز میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔ دوسرے یا تیسرے دن  
اسے گھربلا یا جاتا۔ وہ چاروں چھوٹے کمرے میں بیٹھ جاتے سادی زیر لب بات چھبڑاتا۔ ایللی

جو اسلامہ کالج میں پروفیسر ہیں۔“ اس نے کہا۔  
نہیں ”نو وارد بولا۔ یہ ان کا مکان نہیں۔“

تکلیف معاف کہہ کر وہ باہر نکلا اور گلی میں اس سمت کو چل پڑا جو تازہ گھر سے برعکس جاتی  
نئی بازار میں پہنچ کر ایک پلاٹ میں وہ ڈھیر ہو کر گر پڑا۔  
ایلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر امان کون تھا۔ اس سے ان کی والدہ کیوں خائف  
نہی رہی؟ کسی کی گردن مروڑنے کی بات کر رہا تھا۔ پھر وہ چیخ کیوں رہا تھا۔ بھلا بدوق کی کیا ضرورت  
تھی اور یوں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے اور محلے والوں کو اکٹھا کرنے میں کیا مصلحت تھی۔ اسے کچھ  
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے روبرو منصر کھڑا مسکرا رہا تھا ”ایلیاس صاحب آپ نے داستو و سکی  
کی برادرزیرا موزووز نہیں پڑھی۔۔۔ (Brothers Karamozovs) ضرور پڑھے۔

### ایک اور

— شام کے قریب نیم چھتی میں لیٹے ہوئے ایلی کو یاد آ گیا کہ اسے منصر سے ملنے جانا  
ہے۔ چونکہ خصوصی طور پر منصر نے طے کر رکھا تھا۔ کہ اس روز وہ دفتر میں ملیں گے۔ لیکن  
امت نہ پڑی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھنا محال تھا۔ چلو نہ سہی اس نے سوچا کوئی بہانہ  
باناؤں گا۔ اور وہ پھر لیٹ گیا۔

دغنا! اسے پھر خیال آیا۔ نہ گیا تو منصر سمجھے گا کہ کوئی خصوصی بات ہے۔ اور دوپہر کا واقعہ  
اس کی نظر میں حقیقت کا روپ اختیار کر لے گا اور وہ سمجھے گا کہ واقعی ایلی سفید منزل میں گیا تھا۔  
”نہیں نہیں وہ اٹھ بیٹھا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔“ منصر پر یہ ظاہر نہ ہونے پائے  
کہ میں دہل جاتا ہوں۔

شام کے وقت جب وہ منصر کے دفتر میں پہنچا تو منصر کے طبعی اخلاق کے باوجود اس کے انداز  
سے عجیبی کا انکار ہو رہا تھا۔

”میں فارغ ہوں تو ابھی چلتے ہیں۔“ منصر نے حسب معمول کہا۔

”آج پریشان معلوم ہوتا ہے۔ شاید دوپہر کے واقعہ کے متعلق کبیدہ خاطر ہے۔ ضرور مجھ سے  
انتظار ہو گا۔ نہیں میں کبھی تسلیم نہیں کروں گا۔“ ایلی سوچ رہا تھا۔ اس میں امان کی عزت کا  
ہل ہے۔ امان کتنی قابل تعظیم ہے۔ لیکن امان نے امان کا بھی خیال نہیں کیا نہ جانے کون ہے

”ایسی دھمکی ہے تو نہیں کھولتے ہم۔ توڑ دو دروازے کو“ ماں بولی۔  
”اچھا“ اس نے وانت پیسے کہاں ہے میری بدوق۔“ وہ دیوانہ وار میز چیاں چڑھنے لگا  
یا اللہ یا اللہ ——— امان گھبرا کر دعائیں مانگنے لگی۔  
”میں جانتا ہوں“ ایلی نے کہا۔

”وہ گولی چلا دے گا چلا دے گا“ امان نے کہا۔  
”دیکھوں گی میں کیسے چلائیں گے“ سادی جوش میں آگئی اس نے ایلی کا ہاتھ تھم لیا۔  
”مجھے جانے دو سادی۔“ ایلی نے کہا۔  
”نہیں میں ساتھ جاؤں گی۔ میں آپ کو گھر چھوڑ کر آؤں گی۔“ غصے میں سادی کی آنکھوں  
سے انگارے جھڑ رہے تھے۔

”سادی۔“ ماں کی آنکھیں گویا ابل کر باہر نکل آئیں۔  
”پہلے مجھے گولی مارنا پڑے گی انہیں! چلے۔“ وہ ایلی سے بولی۔  
”سادی یہ تمہاری عزت کا سوال ہے مجھے جانے دو۔“ ایلی نے کہا۔  
امان سادی کے پاؤں پڑ گئی۔

ایلی بھاگا خوش قسمتی سے صدر دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ دروازے میں پہنچ کر وہ رو  
گیا۔ دیوار کے ساتھ لگ گیا تاکہ اوپر سے اسے کوئی دیکھ نہ سکے کافی دیر وہ کھڑا رہا۔ پھر جب شہ  
سے معلوم ہوا کہ امان زینہ اتر رہا ہے تو ایلی چپکے سے پڑوس کے مکان کی ڈیوڑھی میں داخل  
کر کونے میں دبک گیا۔ پھر امان گلی میں چلا رہا تھا۔ کہاں ہے وہ کہاں ہے۔“  
ایک اونچے لمبے خنجر مند مرد کو ہاتھ میں بدوق لیے دیکھ کر گلی کی تمام لوگ تھڑکیں ٹٹا  
آگئے۔ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

”کہاں ہے وہ کہاں ہے وہ۔“ امان گلی میں یوں چکر کاٹ رہا تھا جیسے شیر خنجرے میں پھر کاٹا  
ہے۔ پھر منصر آگیا اور امان کو پکڑ کر اندر لے گیا۔

یعین اس وقت کوئی اس ڈیوڑھی میں داخل ہوا جہاں ایلی چھپا ہوا تھا۔ بیشتر اس کے کہ  
ایلی کو دیکھتا ایلی کونے سے نکل آیا اور معصومانہ انداز سے پوچھنے لگا جی یہ مولوی محمد علی کا گھر  
ہے۔“

”محمد علی کون محمد علی۔“ نو وارد نے مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ امان“ پھر وہ منصر کی طرف دیکھنے لگا۔ منصر اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہی حسین اور پناہ چرا۔ وہی شان استغنیٰ وہی وقار۔ لیکن ان سب پر پڑمردگی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کی مگرملہ میں جاذبیت کے باوجود شکستگی کی جھلک تھی جیسے پیانے میں بال آگیا ہو۔ ایللی نے شدت سے محسوس کیا کہ منصر دکھی تھا۔ اگرچہ وہ اپنے دکھ کو چھپانے کی کوشش میں شدت سے مصروف تھا۔

”پریشان سے دیکھتے ہیں آپ“ اس نے منصر سے کہا۔

وہ چونکا ہاں“ اس نے ہنسنے کی کوشش کی آج ایسا کام آن پڑا ہے کہ —

”تو دفتری پریشانی ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”اور کیا ہو سکتا ہے۔“ وہ بولا۔

لیکن ایللی نے محسوس کیا کہ وہ بات ٹال رہا ہے۔ ظاہر تھا کہ اس کے احساس وقار پر ضرب پڑی ہے ورنہ دفتری معاملات کو اتنی اہمیت کون دیتا ہے اور پھر منصر — ضرور یہ دوسرے واقعہ کا اثر ہے۔ ایللی نے محسوس کیا کہ تمام تر ذمہ داری ایللی پر عائد ہوتی ہے۔ وہی ان کی پریشانی اور دکھ کا باعث ہے۔ احساس گناہ سے اس کی نس نس بھیگ گئی۔

جب وہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے تو دفعتاً منصر نے کہا کیا اتفاق سے آج آپ ہماری گلی سے تو نہیں گزرے تھے۔“

ایللی چونکا۔ اور سوچنے لگا۔ منصر کا سوال اس کی خوش اخلاقی پر دلیل تھا۔

”میرا مطلب ہے۔“ منصر نے کہا شاید آپ ادھر سے گزرے ہوں۔“

ایللی کا جی چاہتا تھا کہ چلا چلا کر کہے نہیں نہیں یہ بہتان ہے دردغ بیانی ہے۔ لیکن منصر کے دکھ بھرے چہرے کو دیکھ کر نہ جانے اسے کیا ہوا اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تو آپ ادھر گئے تھے؟“

”جی۔“

”گھر گئے تھے۔“

”جی ہاں۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”خود سے گئے تھے“ اس نے ہر اٹھا کر پوچھا۔

”جی ہاں۔“  
”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ بولا آپ مذاق کر رہے ہیں یا —  
”خود سے گیا تھا۔“  
”ہیرا“ وہ چلایا ایک بڑا — ہیرا — جلدی ایک بڑا۔“

تعارف

اس روز واپسی پر منصر ایللی کو اپنے گھر لے گیا۔ اسے کمرے میں بٹھا کر اس نے آوازیں دینا شروع کر دیا۔ امان صاحب ہوں تو انہیں ذرا نیچے بھیجے ابھی۔“  
امان ایک اونچا لمبا جاٹ نما شخص تھا۔ انداز میں وہ بات نہیں تھی۔ جو منصر اور سادی میں درجہ اتم نظر آتی تھی۔ ”آئیے آپ کو اپنے نئے دوست سے ملواؤں۔“ منصر نے کہا یہ ہیں ایساں صاحب۔“

امان چونکا لیکن جلدی اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔

”آپ میرے عزیز ہیں۔“ منصر نے امان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بھائی ہی سمجھ لیجئے بس فرق صرف اتنا ہے کہ یہ زمیندار ہیں اور میں مزدور۔“

امان نے کوئی استفسار نہ کیا بلکہ چپ چاپ بیٹھ کر ایللی کو بغور اور بے تکلف دیکھنا شروع کر دیا۔ ”نابا“ وہ ایللی کو جانچ رہا تھا۔ ایللی کو یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو دوسرے وقت شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا اور پھر بندوق لے کر اس کے پیچھے بھاگا تھا۔

”امان صاحب کا گاؤں یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں اگر آپ کبھی ان کے ہمراہ گاؤں جائیں تو آپ کو معلوم ہو کر زمیندار کس شے کا نام ہے۔“ منصر ہنسنے لگا۔ ”اگر یہ جلال میں ہوں تو میز پر پڑا ہوا کالچ کا گلاس جلت رنگ کی طرح بیچے لگتا ہے۔ اور ہاں۔“ منصر نے کہا ”آپ میرے لاکرے بھائیوں سے ملے ہی نہیں۔ ان سے بھی تعارف ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ آج اتفاق سے آپ یہاں آئے ہیں تو ان سے بھی مل لیجئے۔ امان صاحب آپ لمبو پر جائیں تو انور اور محمد علی کو بھی دیں شکریہ۔“

امان اٹھ بیٹھا اور جواب دیئے بغیر چلا گیا۔

انور ایک شوخ نوجوان تھا جس کی آنکھیں بے حد جاذب تھیں اس کے خدو حال بہت موندل تھے۔ ان دنوں وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ محمد علی کی آنکھیں دیکھنے والی تھیں انور کی طرح

دیکھنے والی نہیں۔ اس کے چہرے پر خوابوں کا دھیر پردہ پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ خوابوں کی بستی سے باہر نکل کر حقائق کی دنیا کو دیکھنے سے گھبراتا ہو۔ وہ والٹن کا رسیا تھا اور اس کے انداز میں برہا کے گیت کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔

”باقی رہا رانا۔“ منصر کے تعارف کرانے کے بعد کہ ”وہ یہاں نہیں ہے لہذا اس وقت اس سے ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”آپ شاید سوچ رہے ہیں کہ یہ تعارف کیوں کرائے جا رہے ہیں آپ سے۔ آپ سے یہ الفاظ خود ہی کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ ہم نے آپ کو اپنا لیا ہے الیاس صاحب۔“

”ذرا نوازی ہے“ ایللی نے کہا۔

”نہیں اس میں ذرا نوازی کی بات نہیں عام حالات میں شاید آپ کو درخور افتاد سمجھا جاتا۔ حالات کا تقاضہ ہے کہ آپ کو اپنا لیا جائے اور اگر اپنا لیا جائے یعنی اگر اپنا ہی ہے تو کیوں نہ فراخ دلی کو کام میں لایا جائے۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”والدہ صاحبہ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں۔“ کچھ دیر کے بعد اس نے پھر بات شروع کی۔

”اور حقیقت یہ ہے کہ ہم سب ان کے تابع فرمان ہیں۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”دیکھیے“ وہ پھر جوش میں بولا۔ ”اس سے یہ اندازہ نہ لگا لیجئے گا کہ یہ ایک وعدہ ہے کی قسم کا واضح یا مبہم وعدہ اس سلسلے میں کرنے کا میں مجاز نہیں ہوں کیونکہ اس معاملے میں میری کوئی حیثیت نہیں۔ البتہ یہ ہمارے خلوص کا نشان ضرور ہے۔“

”ہم سب مخلصانہ کوشش کریں گے کیونکہ آخری فیصلہ والد صاحب نے کرنا ہے جو اس وقت یہاں نہیں اور جنہیں ابھی تک حالات کے متعلق مطلع نہیں کیا گیا۔ نہ جانے انہیں کب مطلع کیا جاسکے گا۔ چونکہ دانشمندی کا تقاضہ ہے کہ یہ بات والد صاحب کی خدمت میں کیا احسن انداز سے پیش کی جائے۔ خیر۔ اب آپ سفید منزل میں آسکتے ہیں لیکن مناسب ہو گا کہ آپ یہاں اس وقت تشریف لایا کریں جب میں یہاں موجود ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس چھوٹی سی تفصیل کو اہمیت دیں گے۔“

اس روز ایللی ناؤ گھر پہنچا تو اس کی خیالات بے حد پریشان تھیں۔

”راست گویا“

اس روز کے واقعات کس قدر عجیب تھے۔ سفید منزل کے تمام افراد کس قدر انوکھے اور

دیکھنے والی نہیں۔ اس کے چہرے پر خوابوں کا دھیر پردہ پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ خوابوں کی بستی سے باہر نکل کر حقائق کی دنیا کو دیکھنے سے گھبراتا ہو۔ وہ والٹن کا رسیا تھا اور اس کے انداز میں برہا کے گیت کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔

”باقی رہا رانا۔“ منصر کے تعارف کرانے کے بعد کہ ”وہ یہاں نہیں ہے لہذا اس وقت اس سے ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”آپ شاید سوچ رہے ہیں کہ یہ تعارف کیوں کرائے جا رہے ہیں آپ سے۔ آپ سے یہ الفاظ خود ہی کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ ہم نے آپ کو اپنا لیا ہے الیاس صاحب۔“

”ذرا نوازی ہے“ ایللی نے کہا۔

”نہیں اس میں ذرا نوازی کی بات نہیں عام حالات میں شاید آپ کو درخور افتاد سمجھا جاتا۔ حالات کا تقاضہ ہے کہ آپ کو اپنا لیا جائے اور اگر اپنا لیا جائے یعنی اگر اپنا ہی ہے تو کیوں نہ فراخ دلی کو کام میں لایا جائے۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”والدہ صاحبہ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں۔“ کچھ دیر کے بعد اس نے پھر بات شروع کی۔

”اور حقیقت یہ ہے کہ ہم سب ان کے تابع فرمان ہیں۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”دیکھیے“ وہ پھر جوش میں بولا۔ ”اس سے یہ اندازہ نہ لگا لیجئے گا کہ یہ ایک وعدہ ہے کی قسم کا واضح یا مبہم وعدہ اس سلسلے میں کرنے کا میں مجاز نہیں ہوں کیونکہ اس معاملے میں میری کوئی حیثیت نہیں۔ البتہ یہ ہمارے خلوص کا نشان ضرور ہے۔“

”ہم سب مخلصانہ کوشش کریں گے کیونکہ آخری فیصلہ والد صاحب نے کرنا ہے جو اس وقت یہاں نہیں اور جنہیں ابھی تک حالات کے متعلق مطلع نہیں کیا گیا۔ نہ جانے انہیں کب مطلع کیا جاسکے گا۔ چونکہ دانشمندی کا تقاضہ ہے کہ یہ بات والد صاحب کی خدمت میں کیا احسن انداز سے پیش کی جائے۔ خیر۔ اب آپ سفید منزل میں آسکتے ہیں لیکن مناسب ہو گا کہ آپ یہاں اس وقت تشریف لایا کریں جب میں یہاں موجود ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس چھوٹی سی تفصیل کو اہمیت دیں گے۔“

اس روز ایللی ناؤ گھر پہنچا تو اس کی خیالات بے حد پریشان تھیں۔

راست گویا

اس روز کے واقعات کس قدر عجیب تھے۔ سفید منزل کے تمام افراد کس قدر انوکھے اور

میں ضروری بات ہو اور آپ تو لاہور آتے ہی رہتے ہوں گے علی پور قریب ہی تو ہے انشاء اللہ  
 یہ ملاقات ہوگی۔  
 منصر نے تو ہسپتال کی بات نہ کی تھی۔

اس دور میں  
ایلیا محروم واپس آ گیا۔ اس کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ سلمان باندھے یا جانے کی تیاری کرے  
لیکن سب تیاریوں میں مصروف تھے اور وہ لانج چھوڑ رہے تھے ناچار اسے بھی تیاری میں  
صوف ہونا پڑا۔ لیکن اس کی تمام توجہ گلی کی طرف لگی ہوئی تھی۔ نہ جانے وہ لوگ کب  
پہنچیں گے واپس آ جائیں لیکن گاڑی کا وقت آ گیا اور گلی میں سے موٹر یا تانگا نہ گزرا۔ ناچار وہ  
دوڑ بھاگے ساتھ تانگے میں سوار ہو گیا۔ اس نے ناؤ گھر اور سفید منزل پر آخری حسرت بھری  
نظر ڈالی اس وقت ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ منزل کو چھوڑ کر راہی بن رہا ہو۔ منزل اس کے  
مٹنے لگی تھی لیکن وہ متضاد راستے پر جانے پر مجبور تھا۔ کالی سڑک دوڑ رہی تھی۔ دوڑے جا رہی  
تھی غمی کوڑے کے سم یوں بج رہے تھے جیسے کوئی چھاتی پیٹ رہا ہو۔ ریل گاڑی کے پیہنے اس پر  
نہیں رہے تھے۔ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ لاہور سمٹ رہا تھا نیلا آسمان چاروں طرف سے یورش  
کر رہا تھا چمٹے جا رہا تھا مسلط ہوا جا رہا تھا۔

一

علی پور پہنچ کر وہ بلا سوچے سمجھے سیدھا مکمل کی طرف چل پڑا۔ اس کا ذہن ایک خلا میں بہا ہوا چکا تھا۔ اسے قطعی طور پر احساس نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کیوں جا رہا ہے یا علی پور کے کئی کوپوں میں جا رہا ہے۔ اسے راستے میں کوئی نہ ملا۔ کچی حویلی سنسان پڑی تھی۔ ٹین دم لمبے جل رہی تھی۔ میدان میں اندھیرا تھا علی احمد کے مکان کے دروازے بند تھے۔ ایک کمرہ کیوں میں دھندلی روشنیاں جھللا رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے چل رہا تھا۔

جب وہ شہزاد کے چوبارے میں پہنچا تو اسے کھلا دیکھ کر وہ چونکا اسے یاد آیا کہ وہ تو باہر سے تھی۔ یہ دروازے کیسے کھلے ہیں اور میں ادھر کیسے آگیا۔

”میرے چار بانی پر شہزاد بیٹھی تھی۔ قریب ہی ایک نومولود بچہ لیٹا ہوا تھا۔ شہزاد نے اس کی طرف دیکھا اور وہ یوں حیران بیٹھی رہ گئی جیسے پتھر کی بنی ہوئی ہو۔ جانو چلانے لگی۔“

امتحان کی تیاری کرنے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ سارا دن وہ غیم جھپتی میں کتاب اٹھائے پڑھتا سوچتا اور پھر تھک کر پڑ جاتا۔ وقت اس کے لیے گویا تھم گیا تھا۔ کسی چیز میں دلچسپی لیتا نہ تھی۔ ناؤ گھر پھیل کر جہاز بن گیا تھا۔ اور وہ جہاز کسی نامعلوم سمت میں بہہ رہا تھا بے مقصد صرف۔

## منزل اور راہی

امتحان ختم ہونے کے بعد وہ سب اپنے گھر جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے جاہ بھیلا اور جمال کے لیے کہیں سے آنے میں قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی البتہ بھیلا اور جمال تین دن تھے۔ وہ ہمیشہ کے لیے ناؤ گھر چھوڑ رہے تھے۔

ایلی سوچتا رہا اور آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ علی پور جانے سے پہلے وہ سفید منزل جائے گا تاکہ منصر سے آخری ملاقات کر سکے۔ دل ہی دل میں وہ چاہتا تھا کہ جب وہاں پہنچے تو منصر موجود ہو اور سلامی اسے جنگلے سے دیکھ لے اور وہ دونوں اس چھوٹے کمرے میں جا بیٹھیں اور سلامی اس کی راست گوئی کا مذاق اڑائے۔ ”لیجئے باجی آگئے ہمارے راست گو۔ جھوٹ صرف ہم بولتے ہیں۔ دوسروں سے نہیں۔ کیوں جی ٹھیک ہے نا۔“

لیکن جب وہ امتحان سے فارغ ہو کر سفید منزل میں گیا تو وہاں انور اور محمد علی کے سوا کوئی نہ تھا۔ انور نے اسے بتایا کہ وہ سب ہسپتال گئے ہوئے ہیں لیکن کوشش کے باوجود وہ یہ نہ معلوم کر سکا کہ آخر وہ ہسپتال کیوں گئے تھے۔

اسی روز امتحان کے بعد منصر اسے ملا تھا۔ امتحان کے دوران میں منصر اسے تقریباً روز نما ہوا تھا۔ پہلے روز جب ایلی پرچہ دے کر ہال سے نکلا تھا تو اس نے دیکھا تھا کہ سامنے منصر اپنے سائیکل پر آ رہا ہے۔ اور منصر نے حسب عادت کہا تھا۔ ”کیا عجیب اتفاق ہے میں ابھی لچکھا رہا تھا۔ آئیے آئیے چلے آپ کو لے چلوں کئے پرچہ کیا ہوا۔“ اس کے بعد ان کا معمول یہ تھا کہ عین اس وقت منصر لچکھا کر ادھر سے واپس آتا جب ایلی کے پرچے کا وقت ختم ہوتا۔ سرسری طور پر اسے پوچھتا کہ کئے پرچہ کیا ہوا۔ اس روز بھی وہ اس سے ملا تھا اور سرسری طور پر اس نے کہا تھا۔ ”تو آج آپ جا رہے ہیں اور ناؤ گھر کے دروازے پر اسے ٹوٹا سا لکھا تھا۔ اتار کر کہا تھا اچھا الیاں صاحب خدا حافظ۔ خط تو آپ لکھا ہی کریں گے میرا مطلب ہے یہ

وہ ایک عورتوں کو گھرانے کے عادی نہ تھے۔ وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے کہ عورت کو اپنے سے شوق کی تسکین نہیں ہوتی۔ وہ عورت کو محسوس کرتے اور اس کے حصول کی بات کرتے ان کے نزدیک حصول وقتی ملاپ کے مترادف تھا اور اسے دوام بخشے کی چنداں بات نہ تھی۔ "بھلا" وہ ایک بھنورا تھے۔ کلی کلی کا رس چوسنا انکا شغل تھا۔ لیکن گھر میں بڑے بڑے ختم لگانا انہیں پسند نہ تھا۔ گھر میں صرف ایک پھول تھا۔ بیگم۔ چونکہ غلام علی کے معاملات میں دخل دینے کے قائل نہ تھے گھر پر بیگم کی حکومت تھی۔

جس سے نہیں کہا جاسکتا کہ آیا بیگم "بھلا" حاکم تھی یا برسوں کی حکومت کے بعد اس میں ان کا صریح اثر ہو گیا تھا۔ بہر حال گھر کے معاملات میں وہ دخل اندازی گوارا نہیں کرتی تھی۔ ہاتھ نہ ملے اسے اپنا حق سمجھتی تھی کہ کوئی بات اس کی رضامندی کے بغیر واقعہ نہ ہو۔ وہ ہاتھ نہ ملنے والوں اور حتیٰ کہ محلے والوں پر حکم چلاتی تھی۔ دراصل اسے کسی محلے میں نہ لگائی اتفاق نہ ہوا تھا چونکہ اس کا خاوند محکمہ ریل میں شیٹن ماسٹر تھا اس لیے ساری عمر نے ریلوے شیٹنوں کے کوارٹروں میں بسر کی تھی۔ جہاں ارد گرد قلی خواہنے والے کارندے ہر لوگ رہتے تھے جو سب غلام علی کے ماتحت کام کرتے تھے۔ لہذا بیگم ان سب کو اور ان خفیوں کو براہ راست اپنے ماتحت سمجھتی تھی۔ اس تفصیل کی وجہ سے اس کے انداز میں نہایت اور نور جماعت کے سے عناصر پیدا ہو چکے تھے۔

بیگم کو خاوند کی کمزوری کا علم تھا۔ اسے صرف ایک دکھ تھا کہ خاوند اس کے حکم سے کیوں نہ اس بات پر اکثر گھر میں فساد ہوتا تھا لیکن غلام علی اپنی رنگیلی اور شوخ باتوں کے بل بوتے پر اسے دبا کر لے جاتا تھا۔

اس کے علاوہ چونکہ غلام علی کا جادو صرف ان عورتوں پر چلتا جن کی سماجی طور پر کوئی نہ تھی ہوتی تھی۔ اس لیے بیگم ان کی خوش فطریوں پر حقارت کا اظہار کرتیں اور خاوند کی ہر بات کو اپنی بیگم کی اپنی حیثیت اور بھی بڑھ جاتی۔

بیگم کے ایک معاطے پر گھر میں غلام علی کی حکومت تھی۔ وہ مقوی اور لذیذ غذا کھانے کے شوقین تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے شوق کو پورا کرنے کے لیے غذا بے حد اہم چیز ہے۔ بیگم نے غلام علی سے متعلقہ کوئی بات ان کی رضامندی اور خواہش کے بغیر عمل میں نہ آ سکتی تھی۔ بیگم نے غلام علی سے خصوصی غذا میں حاصل کرتے خصوصی اہتمام سے انہیں تیار کرواتے

"کون آیا ہے۔" قریب ہی سے ان جانی یاد قار آواز سنائی دی۔ اور پھر بیگم اس کے علاوہ آکھڑی ہوئی۔

"ہے۔" شہزاد بولی۔ "ایلی کے لیے چائے بناؤ جانو منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ اتنی دیر کے بعد ہے چلو آیا تو ہے۔"

وہ مسکرائی "اب بھی نہ آتا تو اس کا کیا بگاڑ لیتے۔ اب تو جا کھل رہا ہے۔" وہ دروازہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولی۔ "ادھر کون ہے وہ تو سبھی کھل گئے ہوئے ہیں۔"

ایلی نے بیگم کی طرف دیکھا۔ بیگم بڑے رعب سے اسے گھور رہی تھی۔ "بیگم کو نہیں پہچانتا تو نے ایلی۔"

بیگم۔ اسے وہ نام جانا پہچانا معلوم ہو رہا تھا۔

"اب یہ کیوں پہچانے لگا۔" بیگم نے کہا "اب تو جوان ہو گیا ہے۔"

"جوان" شہزاد ہنسی۔ "شکل تو دیکھو جوان کی جیسے راستہ کھو کر ادھر آ نکلا ہو۔"

"راستہ کھو کر ادھر آ نکلا ہو۔" کسی نے اس کے کان میں دہرایا۔ اس کی نگاہوں میں منہ

منزل آکھڑی ہوئی۔ راستہ اور چیز ہے منزل اور! سادی مسکرائی۔ منزل! منزل!! منزل!!! ہجر

چنگاڑ چیچی۔ "چلو راستہ بھول کر ہی سہی۔" شہزاد ہنسی۔ "اب بیٹھ بھی جا۔"

وہ بیٹھ گیا۔

"مجھ سے نہیں تو اماں سے ہی بات کر کوئی۔" شہزاد پھر ہنسی۔

"اماں۔۔۔۔۔۔" دغمتا "اسے یاد آیا۔ ہاں بیگم شہزاد کی ماں تھی۔ پھر اس کی نگاہوں میں

دن پھر گئے جب محلہ گوکل کا بن بنا ہوا تھا۔ سانوری کی نیم وا آنکھیں ڈول رہی تھیں۔ اس کے

ڈھلکے ہوئے شانے اس کی ترچھی نگاہ اور مرچیلی مسکراہٹ نیچے ارجند چلا تھا۔ "ہے ہے کا

شے ہیں یہ گوکل کے کنہیا جب سے آئے ہیں۔ سارا محلہ پچھت بن گیا ہے۔ ہے ہے بے بے

کیا کروں۔"

پھر تھیر کی سٹیج پر رنیک اپنا سونالہ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے گیلیری پر مچی ہوئی تھیں

جہاں سانوری تخت پر جلوہ افروز تھی اور گھد م اور گلخیرو آہستہ آہستہ چلا رہے تھے۔

دیکھ کر بے لیکن تینوں ہی گیلیری کی طرف دیکھ رہے تھے۔

شہزاد کے والد غلام علی بانگے رنگیلے محض تھے۔ عورت ان کی واحد کمزوری تھی۔

اور خاتون نے غلام علی کو پورے طور پر ہاتھ میں لے کر اسے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ تعلق صرف اس لیے گوارا کیا تھا کہ اسے پہلی ہی نظر میں غلام علی سے محبت ہو گئی تھی۔ آج تک کبھی کسی عورت نے ان سے محبت کا جذبہ قائم نہیں کیا۔ اور ان کی اپنی بیوی تو بے رحمی کا انکسار تھی۔ لہذا وہ خاتون کے سحر میں آ گئے۔ جن کے تحفظ سے متعلقہ تمام شرائط کو تسلیم کر کے انہوں نے خفیہ طور پر اس سے نکاح کر لیا۔ جن کے تحفظ کے طور پر بیگم کو طلاق دینے کا بھی مطالبہ کر دیا۔

جب بیگم کو معلوم ہوا تو وہ سناٹے میں آ گئی۔ اسے یقین نہ آتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی یہ محض ایک نالیک ناخوش کن خواب۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دفعتاً اسے معزول کر دیا جائے اور اسے اس سے اتار دیا جائے جب کہ وہ چار جوان بچوں کی ماں تھی جن میں دو شادی شدہ تھے۔ جب طلاق نامہ اس کے ہاتھ میں تھمایا گیا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اور اب وہ ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی شہزاد کے پاس آ گئی تھی۔

بیگم نے اپنی طرف دیکھا گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہ میاں ٹھہرے گا کہاں۔“

شہزاد نے لگی۔ ”آخر اپنے ہی گھر ٹھہرتا ہے نا انسان۔“

بیگم نے حیرت سے شہزاد کی طرف دیکھا۔

ایک لمحہ محسوس کیا کہ ابھی بیگم اٹھ کر ایللی کے کان پکڑا دے گی۔

بیگم کے اس رویے کے بعد شہزاد نے اپنی تمام تر توجہ ایللی کی طرف مبذول کر دی۔ وہ ان کو بھانپنا میز پوش نکالا اور پھر خود میز اٹھا کر ایللی کے سامنے لا رکھا۔

مہربان ہوئے لاؤ جانو۔“ وہ بولی۔

بیگم نے یہ کہہ کر دیتی ہوں۔“ بیگم بولی۔ ”تم کیوں خواہ مخواہ تمہاری طبیعت جو اچھی

ہم کے لیے اچھی ہے۔“ شہزاد جان بوجھ کر بیگم کو چڑھائی تھی۔

”تو مجھ میں نہیں آتی تمہاری باتیں۔“ بیگم نے بعد محفل کہا۔

”بے شک۔“ شہزاد بولی۔ ”آؤ نا ایللی تو اب چائے بھی پیئے گا یا نہیں۔“

”ایللی بولا اس نے ان دونوں کی باتیں سنی ہی نہ تھیں۔ نہ جانے وہ کہاں

”اچھا تو یہ بات ہے اب میاں پہنچ کر بھی کھوئے ہوئے ہو۔“

اور پھر جب وہ دسترخوان پر بیٹھتے تو اہل خانہ پر ہو کا عالم طاری ہو جاتا سب کی نگاہیں غلام علی کے چہرے پر جم جاتیں ذل دھڑکنے ہاتھ کا پچھتے نہ جانے کیا ہو گا۔

پہلا نوالہ منہ میں رکھنے کے بعد یا تو غلام علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکی۔ سب کے دل قائم ہو جاتے ہاتھ رواں ہو جاتے اور چروں پر مسرت بھرا غر بھرا ہوتا غلام علی کے چہرے پر مسکراہٹ نہ آتی تو برتن دھم سے دیوار سے ٹکراتے ”یہ کیا ہے اور پھر گھر میں سناٹا چھا جاتا۔

غلام علی کے شوق کو بیگم روک نہ سکی تھی اس نے پیار محبت سے سمجھایا۔ دھمکیاں دیں کئی ایک عورتیں جنہوں نے غلام علی کے شوق کو پورا کیا تھا انہیں پانچ بات جوں کی توں قائم رہی۔ لہذا یہ بات بیگم کو گوارا کرنی ہی پڑی بہر حال بیگم بھی ہٹا تھی۔ اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ غلام علی عورت کے بغیر خوش نہیں رہ سکا اور ان مواقع آتے تھے جب غلام علی کو یاد آتا کہ بیگم بھی عورت ہے اس وقت بیگم غلام علی کے بخشی کے ذریعے انتقام لیتی تھی۔ حیوان تڑپتا اور بیگم کو اس کا تڑپنا دیکھ کر لذت حاصل دھاڑتا چیختا چلاتا اور پھر باہر نکل جاتا اور دیوانہ وار عورت کو تلاش کرتا۔

ایک مرتبہ جب وہ ان حالات میں باہر نکلے تو پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی تھی۔ اور ایک ایسی خاتون باہر نکل رہی تھی جو خود کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھی جس سے وہ روپیہ بنو سکتی ہو۔ وہ فیشن ایبل لباس میں ملبوس تھی ہاتھ میں ہینڈ بیگ اور ملنے سے معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ کماتا فر فر انگریزی بولنے لگے گی۔ غلام علی بھانپنے میں فوراً ”تاڑ گئے کہ حالات سازگار ہیں اگرچہ پہلے کبھی اس نوعیت کی عورت سے سابقہ نہ پھر بھی آخر عورت ہی تھی۔

ان کا مقصد تو محض ملاپ تھا۔ لہذا وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے اور پلے چلنے ڈانٹنگ روم میں پہنچ گئے۔

خاتون بڑی ہوشیار تھی اس کا مقصد ملاپ نہ تھا۔ حصول زر کی خواہش ہی دینی دوام کی قائل تھی چونکہ ضرورت وقتی چیز نہیں۔ لہذا اس نے تنگ بخشی کو ہم لاکر غلام آگ میں تیل ڈال کر اسے بھڑکا دیا۔

بیگم کو علم ہوا تو وہ چیخنی چلائی لیکن بیگم کو یہ علم نہ ہوا کہ غلام علی کے اس دوام کا خطرہ ہے لہذا وہ چیخ چلا کر خاموش ہو گئی۔



”بے لکی۔“ بیگم حیرت سے شہزاد کی طرف دیکھتی۔

”شہزاد پھر تھکے لگاتی“ اماں جو ہوا اب چھوڑو یہ قصہ تمہارے بال بچے ہیں۔ اتنے گھر  
نہ اپنے ہیں جس کے پاس جی چاہے رہو جو چاہے کھاؤ پیو۔ پھر رونا کس بات کا۔ اور پھر  
شہزاد کی عمر بھی اب پینتالیس کے قریب ہوگی اس عمر میں خاوند سے جدائی ہو بھی جائے تو کیا  
لگتا ہے۔“

”ایک دن میں بیگم نے محسوس کر لیا کہ امی وہاں صرف اس لیے موجود تھا کہ سارا دن  
ان کی باتیں سنے اور اظہار ہمدردی کرے۔ اس میں شک نہیں کہ امی کو بیگم سے بے حد  
دوستی تھی لیکن وقت یہ تھی کہ جب بیگم اسے کوئی قصہ سناتی تو سنتے سنتے کسی لفظ یا اشارے کی  
بے امی کا خیال نہ جانے کہاں جا پہنچتا اور وہ بیگم اور جانو کے پاس بیٹھ کر خالی سر ہلاتا رہتا۔  
پھر بیگم کی آپ بیتیوں کے بعد ایک اور دور آیا اور بیگم اور امی مل کر عجیب و غریب  
روایات میں کود گئے۔ بیگم امی کو اشارہ کرتی کہ چلو میں آئی۔ وہ راجہ کے خالی چوہارے میں جا  
ناکجو دیر کے بعد بیگم آجاتی وہ سیاہ روٹی سی تھیلے سے نکال کر کہتی۔ ”اس نے کہا ہے اس  
لڑکی سات بھائی بنالو۔ کورے برتن میں موم کی تیلی بنا کر رکھو۔ پھر اس جی کو آگ لگا کر اس  
ٹام ڈال دو لیکن اس طریق سے ڈالو کہ جی بجھے نہیں۔ اور جب تک برتن سے دھواں نکلتا  
ہے ایک ٹانگ پر کھڑی ہو کر“ ”آئی بلا کو ٹال تو“ پڑھتی رہو۔

”یہ حال سمجھنا بھی دکھتا ہے یا نہیں“ امی پوچھتا۔

”بھائیابا ہے۔“ بیگم جواب دیتی ”ہزاروں کے گھر آباد کر دیئے اس نے۔“

”پھر تو بتا اچھا ہے۔“ امی کہتا۔

”میں ایک ہی مشکل ہے۔“

”تو کیا؟“

”میں ایک ٹانگ پر کیسے کھڑی ہو سکوں گی اتنی دیر کے لیے۔“

”موس میں کیا ہے ہاتھ سے کرسی کو تھامے رکھنا۔“

”بلکہ وہ مسکراتی۔“ ”یہ ٹھیک ہے۔“

”مگر تو میں سارا دیکھ رہوں۔“ امی اس سے ہمدردی جتا۔

”اسے امی کی طرف دیکھتی۔ بیگم کو ہر ایسی بات بری لگی تھی جس سے قرب کا احساس

چند ہی روز میں بیگم اور امی ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے امی نے محسوس کر لیا  
پر رعب اور طعناقی بھری بیگم دراصل ایک ٹوٹی ہوئی گڑیا ہے۔ اپنے گھر کی باتیں یاد کر  
ہوئے یا غلام علی کا کوئی قصہ سناتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں انہیں لڑائی  
کوشش میں ضبط ٹوٹ جاتا ہے پھر بچوں کی طرح ہلک ہلک کر روتی ہے۔

شہزاد کے گھر میں بیگم کی باتیں سننے والا کوئی نہ تھا۔ شہزاد کی دو بچیاں مکمل طور پر  
رہتیں تیسری بچی ابھی صرف دو ایک ماہ کی تھی۔ ان کے علاوہ جانو تھی جو ہر وقت گھر کے  
میں لگی رہتی تھی محلے والیوں کے دروہر ایسی باتیں بیان کرتا بیگم کے وقار کے متعلق تھکا۔  
شہزاد کی شادی کے بعد علی پور میں بیگم صرف دو تین مرتبہ آتی تھی۔ محلے پر وہ پہنچا  
اڑایا کرتی۔ ناک بھوں چڑھاتی ”یہ تمہارے کیا طریقے ہیں۔ اور یہ یہاں کے لوگ کیسے بیگم  
کے انداز میں نفرت کی جھلک نمایاں ہوتی۔“ ”لو بہن تمہارے خاوند کیسے ہیں بے میرے گھر  
مجال ہے جو نمک ذرا زیادہ یا کم ہو اگر گوشت زیادہ مل گیا ہے یا ذرا کم ملا ہے تو بھی ہم  
جرات نہیں ہوتی کہ اس اللہ کے بندے کے سامنے رکھیں۔ بس سمجھ لو زلزلہ آجاتا ہے تو  
دھم سے دیوار سے ٹکرا کر ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور پھر ان کی آواز گونجتی ہے شوک کی لہر  
ہے لاجول ولاقوۃ ————— توبہ ہے بہن“ خاوند کی بات سناتے ہوئے بیگم پر کفیت ملائی  
جاتی تھی۔

بات بات پر اپنے گھر کی بات کرنا گھر میں اشیاء کی افزائ کا تذکرہ کرنا اور پھر اپنے غلام  
غصے اور دبدبے کا اظہار کرنا بیگم کی عادت تھی اور صرف یہی نہیں غالباً وہ سمجھتی تھی کہ  
دوسروں کے لیے حقارت اور تضحیک کا اظہار نہ ہو تو اپنے گھر کی بات سنائی ہی نہیں جاسکتی  
اب بھلا بیگم کس منہ سے ان محلے والیوں کو اپنی تضحیک کا قصہ سنائی کس طرح بتائی کہ ان کی  
حکومت چھن چکی ہے۔ وہ معزول ہو چکی ہے۔ فی الحال یہ بات تو گھر کے چند ایک افراد  
درمیان سر بستہ راز تھی اور محلے والیوں کے سامنے بیگم اسی انداز سے بات کرتی تھی جیسے  
گھر قائم ہو اور اس کے میاں بدستور اس کے میاں ہوں۔

لہذا بیگم کے لیے محلے والیوں سے بات کرنا ممکن نہ تھا۔ شہزاد سے بات کرتی تو وہ قصہ  
کر بہنتی ”اماں پھر کیا ہوا۔ اسے بھی کر لینے دو مزے چند ایک سال سننے فیشن کی پٹی لٹی ہے  
کو“ وہ بہنتی۔

ہو یا بے تکلفی کا اظہار ہو۔ اس کی دانت میں بے تکلفی جنسی تعلق کی دلیل تھی۔ اور عجب تعلق کے لیے بیگم کے دل میں نفرت کے جذبات قائم ہو چکے تھے۔

بیگم عامل کے دیئے ہوئے تعویذ لے آتی اور وہ دونوں بیٹھ کر انہیں پانی میں گھولنے دیتے۔ ان عملیات کے بعد وہ ان کے نتائج کا انتظار کرتے۔ ایللی کو تو خیر ان عملیات پر کوئی اثر نہ تھا۔ وہ جادو سحر تعویذ یا اس قسم کی دوسری چیزوں کے اثر سے قطعی طور پر منکر تھا۔ البتہ بیگم کی تسلی کے لیے وہ کما کرتا تھا۔ ”ہاں ان چیزوں کا اثر ہوتا ہے۔“ لیکن شہزاد تو بے باک نہ ان باتوں مذاق اڑایا کرتی۔

دوپہر کے وقت دروازہ بچتا تو وہ جانو سے کہتی۔ ”جا میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے نیچے ادا رجسٹری لایا ہے۔“

”رجسٹری۔“ جانو حیرت سے پوچھتی۔

”کیا مطلب؟“ ایللی دریافت کرتا۔

پھر وہ نہایت سنجیدگی سے جواب دیتی۔ ”اماں کا عمل جو ختم ہو گیا ہے اب ابا کی طرف اطلاع تو آئے گی ہی کہ وہ قصہ ختم ہو گیا ہے اب گھر آجاؤ کیوں اماں۔“

یا جب بیگم اور ایللی جی جلائے میں مصروف ہوتے تو وہ نہایت سنجیدگی سے پوچھتی۔ ”یہ موسم کی پتلی تم ہو یا ہماری سوتیلی۔“ اس طرح وہ اکثر مذاق ہی مذاق میں ماں کے ان عملیات مضحکہ اڑایا کرتی۔ اکثر اس کی باتیں ذومعنی ہوتیں اور ایللی انہیں سن کر چونکتا۔

مثلاً ”پہلے روز ہی اس نے بیگم سے کہا تھا۔“ اماں چھوڑو ان عملیات کو بھلا جیاں جلا سے کیا ہوتا ہے، اگر یہ عمل پر اثر ہوتے تو میں تعویذ کے زور پر کسی کو اپنا نہ بنا لیتی۔“ شہزاد ایللی کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کے ماتھے کا قلم بے حد شوخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں مایوسی اور حسرت بھری تھیں۔

پھر ایک روز شہزاد کے سامنے روٹی پڑی دیکھ کر بیگم نے پوچھا تھا۔ ”روٹی کیا کرے گی۔“ اور اس نے جواب دیا تھا۔ ”میں بھی جتیاں بناؤں گی۔“ ”کیوں تمہیں کیا ہے؟“ ایللی نے پوچھا اور اس نے جواب دیا تھا۔ ”بہت کچھ ہے اوپر سے نہیں دکھتا شاید جتیاں جلائے سے جرات ملے۔“

ساتھی واپس آ جائے۔“ اور ساتھ ہی اس نے بڑی جرات اور بے باکی سے ایللی کی طرف دیکھا تھا۔ ”کیوں ایللی۔“ اس نے کہا تھا ”جانے والے واپس بھی آسکتے ہیں کیا۔“ اور پھر وہ ان جیسے آگینہ کسی ان جانے دباؤ سے چور چور ہو گیا ہو۔

لیکن اب کی بار جب سے ایللی علی پور آیا تھا وہ ان سب باتوں سے یوں بے نیاز ہو چھ وہ ایللی ہی نہ ہو۔ النادہ چھوٹے سے چھوٹے موقع پر بیگم کو ساتھ لے کر رابعہ کے عہ میں جا بیٹھا اور بیگم کی باتوں میں مصروف ہو جاتا۔ یہ دیکھ کر شہزاد بار بار ہانے ہانے میں آتی ایللی کے قریب تر آکھڑی ہوتی چوری چوری اس کا منہ سلاتی۔ چٹکیاں بھرتی نہایت باتوں میں بہت کچھ کہہ جاتی۔

### باشین

ایللی کی ظاہر بے نیازی نے شہزاد کے شوق کو بھڑکا دیا تھا۔ یہ شہزاد کی پرانی عادت تھی۔ اس بچے بچہ ہو تو وہ آگے کی سمت بھاگتی تھی اس سے دور ہوا وہ تعاقب کرتی تھی حتیٰ کہ دور اماں کے پیچھے پیچھے چل پڑتا اور پھر وہ دفعتاً ”بے نیاز ہو جاتی۔“

ایک روز جب بیگم کسی عامل کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ جانو نیچے باورچی خانے میں مصروف رہا۔ چپ چپ چپ چپ بارے میں بیٹھا ہوا تھا۔ تو شہزاد نے چپکے سے آکر اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ ایللی سے پہلے ایسے حالات میں وہ جھنجھنے کی طرح بجنے لگتا اس کی نس نس میں گویا جھنجھٹا لگتا تھا اور وہ دیوانہ وار اس کے ہاتھوں کو چومنا شروع کر دیتا تھا لیکن اس کو چپ بیٹھا رہا۔ اور پھر کہنے لگا۔

”شہزاد! میں ہاتھ اٹھا کر کہنے لگی۔“ چلو آخر ایک نہ ایک دن جانے والے نے جانا ہی

”کیا مطلب؟“ وہ بولا۔  
 ”میں پہلے ہی جانتی تھی۔“ وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی میں شکست کی آواز تھی۔  
 ”کیا؟“ ایلی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”جانتی تھی کہ اپنی حیثیت تو فلیگ شیشن کے برابر ہے۔ یہ گاڑی جو رکی ہے پھر  
 ٹھہرے گی۔“

”تم تو ریلوے یاہو کی طرح بات کر رہی ہو۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”یاہو کے گھروالی جو ہوئی۔“ وہ ہنسی۔

ایلی ہنسنے لگا۔ ”تمہیں یاد ہے پچھلی مرتبہ میں کن حالات میں میں ریل سے رخصت  
 تھا۔“

”یاد ہے۔“ وہ بولی۔ ”لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سب کچھ اس کی وجہ سے نہیں ہے  
 ”یہ کیا ہے۔“

”جو کچھ بھی ہے۔“  
 ”اس کی وجہ سنو گی۔“ ایلی نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”سن لوں گی لیکن۔“

”لیکن کیا۔“  
 ”لیکن کو چھوڑو تم سناؤ۔“

”تم نوازنا جانتی ہو شہزاد جسے تم نے نوازنا سمجھ لو وہ خود سے گیا۔“  
 ”اچھا۔“

”لیکن تمہارا کھیل کر کھلونے کو پھینک دینا بڑا اذیت ناک ہے۔“  
 ”مطلب ہے کہ میں نے پھینک دیا ہے۔“

”یہ تو وقتی پھینکنا تھا۔ وقتی پھینکنا اس قدر خوفناک تو۔۔۔۔۔“  
 ”اس ڈر کے مارے تم چلے گئے تھے۔“

”اس غصے کے مارے کہ تمہارا ایک حصہ الگ تھلگ رہتا ہے بے پروا ہے۔“  
 ”ہاں۔“

”تو اس ایک حصے کو سزا دے رہے ہو۔“ وہ ہنسی۔  
 ”کیا مطلب؟“ وہ بولا۔

”میں پہلے ہی جانتی تھی۔“ وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی میں شکست کی آواز تھی۔  
 ”کیا؟“ ایلی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔  
 ”جانتی تھی کہ اپنی حیثیت تو فلیگ شیشن کے برابر ہے۔ یہ گاڑی جو رکی ہے پھر  
 ٹھہرے گی۔“

”تم تو ریلوے یاہو کی طرح بات کر رہی ہو۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”یاہو کے گھروالی جو ہوئی۔“ وہ ہنسی۔

”کیا مطلب؟“ وہ بولا۔  
 ”میں پہلے ہی جانتی تھی۔“ وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی میں شکست کی آواز تھی۔  
 ”کیا؟“ ایلی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔  
 ”جانتی تھی کہ اپنی حیثیت تو فلیگ شیشن کے برابر ہے۔ یہ گاڑی جو رکی ہے پھر  
 ٹھہرے گی۔“

”تم تو ریلوے یاہو کی طرح بات کر رہی ہو۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”یاہو کے گھروالی جو ہوئی۔“ وہ ہنسی۔

ایلی ہنسنے لگا۔ ”تمہیں یاد ہے پچھلی مرتبہ میں کن حالات میں میں ریل سے رخصت  
 تھا۔“

”یاد ہے۔“ وہ بولی۔ ”لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سب کچھ اس کی وجہ سے نہیں ہے  
 ”یہ کیا ہے۔“

”جو کچھ بھی ہے۔“  
 ”اس کی وجہ سنو گی۔“ ایلی نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”سن لوں گی لیکن۔“

”لیکن کیا۔“  
 ”لیکن کو چھوڑو تم سناؤ۔“

”تم نوازنا جانتی ہو شہزاد جسے تم نے نوازنا سمجھ لو وہ خود سے گیا۔“  
 ”اچھا۔“

”لیکن تمہارا کھیل کر کھلونے کو پھینک دینا بڑا اذیت ناک ہے۔“  
 ”مطلب ہے کہ میں نے پھینک دیا ہے۔“

”یہ تو وقتی پھینکنا تھا۔ وقتی پھینکنا اس قدر خوفناک تو۔۔۔۔۔“  
 ”اس ڈر کے مارے تم چلے گئے تھے۔“

”اس غصے کے مارے کہ تمہارا ایک حصہ الگ تھلگ رہتا ہے بے پروا ہے۔“  
 ”ہاں۔“

”تو اس ایک حصے کو سزا دے رہے ہو۔“ وہ ہنسی۔  
 ”کیا مطلب؟“ وہ بولا۔

”میں پہلے ہی جانتی تھی۔“ وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی میں شکست کی آواز تھی۔  
 ”کیا؟“ ایلی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔  
 ”جانتی تھی کہ اپنی حیثیت تو فلیگ شیشن کے برابر ہے۔ یہ گاڑی جو رکی ہے پھر  
 ٹھہرے گی۔“

”تم تو ریلوے یاہو کی طرح بات کر رہی ہو۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”یاہو کے گھروالی جو ہوئی۔“ وہ ہنسی۔

تھیں اور اس قدر جز پکڑ چکی تھیں کہ انہیں دل سے نکالنا ناممکن ہو چکا تھا۔ وہ ان باتوں پر حد تک یقین رکھتا تھا کہ وہ اس کی شخصیت کی بنیاد بن چکی تھیں۔ یہ باتیں تجربہ بیکار شعور سے اخذ نہیں کی گئی تھیں۔ بلکہ اس کے دل کے گہرے ترین جذبات ان کا منبع تھے۔ اہلی سمجھتا تھا کہ محبت صرف ایک محبوب سے ہو سکتی ہے اور مقصود شادی نہ ہوتی تو محبت نہیں ہوتی۔ اس کے ذہن میں کسی سے محبت لگا کر بے وفائی کرنا شدید ترین گناہ تھا اس کا خیال تھا کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اہازت نہیں ہونی چاہیے۔ عورت کو مکمل آزادی نہیں چاہیے اس سے ایسا سلوک روا نہیں رکھنا چاہئے جس میں امتیاز کا عنصر ہو اسے بھڑکنی یاد نہیں سمجھتا چاہئے۔

یہ سب خیالات اس نے علی احمد ہاجرہ اور اپنی زندگی سے اخذ کیے تھے۔

اس نے اپنے باپ کی جنسی بے راہ روی کی وجہ سے بہت دکھ سنا تھا۔ اپنی والدہ مظلومیت کی وجہ سے اس کا بچپن تباہ حالی میں گزرا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر وہ اس محبت محروم رہا تھا جس کے بغیر بچے کی شخصیت پھل پھول نہیں سکتی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے شہزاد سے محبت ہے تو پھر سادی سے کیا ہے اسے سادی تنہائی میں ملنے کے کئی ایک مواقع ملے تھے۔ گھنٹوں وہ اس کے پاس کھڑا رہا تھا لیکن اس نے کوئی خصوصی خواہش محسوس نہ کی تھی اسے سادی سے مل کر ایک ان جانی خوشی ہوتی تھی کا خط پڑھ کر وہ مسرت کی ایک روح محسوس کرتا تھا۔

اگر اسے سادی سے محبت ہے تو پھر شہزاد سے کیا تھا۔ کیا اس روز جب وہ کئی سال تھی۔ اور اہلی نے اس کے ہاتھ تھام لیے تھے اس کا آواز وہ ہوس کاری پر مبنی تھا۔ اس وقت اس نے اس میں دھکی سی کیوں بجی تھی جب وہ شہزاد کا ہاتھ پکڑتا تھا تو اس کے جسم میں جھلن کیوں چلنے لگتی تھیں کیوں اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے قریب تر ہو جائے اور قریب اور قریب کیا یہ ہوس تھی کیا جسمانی قرب کی خواہش ہوس ہوتی ہے۔

لیکن محبت میں آرزو تو ضرور ہوتی ہے۔ قرب کی آرزو نہ ہو تو کیا ہو سکتی ہے۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا۔

یہ درست تھا کہ سادی کے ساتھ اس نے جسمانی قرب کی خواہش محسوس نہ کی تھی

شہزاد کا حسن اس کے دل میں احساس رقابت پیدا کرتا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ ساری دنیا اس کی طرف ہے اور وہ شہزاد کے نقاب کے ابھرے تاروں کو گنتا رہتا لیکن شاید یہی محبت کا ثبوت ہے۔ ہر مل یہ احساس اس قدر اذیت دہ تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ اس سے نجات حاصل کرے۔ وہ چوری چوری دعائیں مانگتا تھا کہ سادی کی بات میں مشکلات حائل نہ ہو جائیں سادی اس کا خوف، رقابت اور احساس گناہ خارج ہو جائے جو شہزاد کی بات سے وابستہ تھا لیکن اس میں اس قدر جرأت نہ تھی کہ اعلان یہ اس آرزو کو اپنالے کیونکہ وہ شہزاد کے اسے یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ وہ شہزاد سے بے وفائی کر رہا ہے اور یہ بات اسے عورت میں گوارا نہ تھی۔

جب سے اہلی لاہور سے آیا تھا اس نے شہزاد کی طرف خصوصی توجہ نہ دی تھی۔ اس نے شہزاد کو اپنا باند پکڑنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اس نے غور نہ کیا تھا کہ اس کے ماتھے کا قلم کب سے لگا ہوا ہے اور کب سرخی مائل۔ اس نے شہزاد کے جسم کی خوشبو کو اس شدت سے محسوس نہ کیا تھا کہ اس نے اس کا جواز یہ پیدا کیا تھا کہ وہ شہزاد سے ناراض ہے چونکہ پچھلی بار وہ علی پور آیا تھا تو شہزاد نے اس سے بے پروائی کا سلوک کیا تھا۔

بہر حال اندرونی طور پر وہ ایک شدید کشش میں مبتلا تھا اس میں اس قدر جرأت نہ تھی کہ

شعوری طور پر فیصلہ کرنا کہ آیا اسے سلوی سے محبت تھی یا شنراؤ سے یا بیک وقت دونوں سے

دیوتا

اگر شنراؤ ایک عام عورت ہوتی تو وہ ایلی کو یوں بے پروا دیکھ کر بے زار ہو جاتی شنراؤ لیے ایلی بدنامی کے ٹیکے کے سوا اور کیا تھا۔ ایلی کی وجہ سے محلے والیاں اسے طعنے دیا کرتی تھیں۔ ہاجرہ اور فرحت سمجھتی تھیں کہ شنراؤ نے جادو کے زور پر ایلی کو طوطا بنا کر اپنی انگلی پر غبار کر کے۔ حتیٰ کہ اس کا خاوند اس سے بدظن ہوا جا رہا تھا۔ اس کی اپنی والدہ شکوک سے بھری ہوئی تھی لیکن مجبور تھی۔ شنراؤ کے تیور دیکھ کر خاموش ہو رہتی بذات خود ایلی ہر روز شنراؤ سے ایک نیا جھگڑا کھڑا کر لیتا تھا تم نے فلاں کی طرف کیوں دیکھا تھا۔ تم میرے پاس بیٹھنے سے گریز کیوں کرتی ہو۔ سارا دن ایلی کے سامنے چڑھاوے چڑھتے رہتے۔ نئی نئی چیزیں پکا کر اس کے سامنے رکھی جاتیں جیسے گھر میں دیوتا بٹھا رکھا ہو۔

شنراؤ کا صرف ایک مطالبہ تھا کہ وہ دیوتا سامنے بیٹھا رہے۔ نہ تو اس کے آگے بٹھائے لیے ہاتھ پھیلائے اور نہ ہی اٹھ کر کہیں جائے لیکن اس کی پریم مرلیا مدھر گیت بجاتی رہے۔ دراصل شنراؤ فطری طور پر ”ان لنگی“ عورت تھی۔ اسے جسم سے لاگ تھی اسے اپنے گرام محبت کا ہالہ قائم رکھنے کا جنون تھا وہ پگھٹ کی پیاری تھی لیکن مگر بھرنے سے اسے ہر قدر جسمانی قرب کو صرف اسی صورت میں برداشت کرنے کے لیے تیار تھی جب پریم کے رہا جتنا رکھنے کے لیے اس میں تیل ڈالنا اذی ضروری ہو جائے۔

ایلی کی بے پروائی کو محسوس کر کے شنراؤ یوں بڑپنے لگی جیسے مچھلی جل بنا تر پتی ہے۔ ہنر کا روپ بچھتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں، ہاتھوں، ہونٹوں، اور انگ انگ سے تیل کی بوندیں نکلتی رہی تھیں۔ دیوتا کو منانے کے لیے ناری اپنی بیعت لیے کھڑی تھی۔

ایلی کو ابھی تک یہ علم نہ تھا کہ عشق میں ازلی طور پر خود کشی کا عنصر ہوتا ہے۔ عشق بیک خود عاشق کو محبوب کے وصال سے محروم کر دیتا ہے۔ اسے علم نہ تھا کہ محبت محبوب کا درد عاشق کا نہیں اور اگر کسی کی محبت حاصل کرنا مقصود ہو تو اسے محبوب بننے کی کوشش کرنا چاہیے نہ کہ عاشق۔ اور بے نیازی محبوب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ سلوی کے خیال میں کھو کر وہ شنراؤ کا محبوب بن گیا اور ناری کی تمام قوتیں اس بات پر قنہ سمیٹیں کہ ایلی

ہاتھ کا روپ جلا کر اسے وہی پرانی حیثیت بخش دی جائے اور پھر شنراؤ شنراؤ بن کر وہی پرانا ہاتھ کا روپ دھارے اور پھولدار دوپٹے لے کر قتل کی ادھر ادھر اڑتی پھرے۔

میں اتفاق کی بات تھی کہ بیگم اس وقت علی پور آئی تھی جب شنراؤ اور ایلی نے اپنے دل بدل لیے تھے۔ اور ایلی کی حیثیت محبوب کی بن چکی تھی۔ ہاتھ بدلے آئی تو ممکن ہے وہ سمجھتی کہ ایلی شنراؤ کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے اور شنراؤ اسے ہاتھ نہیں دیکھ رہی تھی کہ شنراؤ ہاتھ پھیلا رہی ہے اور ایلی دیوتا سامنے بے نیاز بیٹھا ہے۔ لہذا اس نے محسوس کیا شنراؤ غلام علی ہے اور ایلی ایک بیچ عورت جو خریدی جاسکتی ہو نتیجہ ہوا کہ بیگم کے دل میں شنراؤ کے لیے وہی جذبات پیدا ہو گئے جو غلام علی سے وابستہ تھے۔ اور خاترات کا یہ طوفان چونکہ چل نہ سکتا تھا لہذا اس کے دل کی گہرائیوں میں اکٹھا ہوتا اور اس کے اکٹھا ہونے کی وجہ سے شنراؤ اور ایلی کا مستقبل تاریک ہوا گیا۔

ب سے پہلے بیگم نے اس کا اظہار جانو کے سامنے کیا۔

جانو نے اپنی تمام تر زندگی تیاگ کے تحت بسر کی تھی۔ وہ جوانی میں خوش شکل تھی اور لای میں اس کا خاوند مرچکا تھا اور اس نے اپنی تمام تر زندگی لوگوں کے کام کاج کرنے اور محبت کے تحفظ میں بسر کی تھی۔ بیگم کی بات سن کر وہ آتش فشاں پھٹ گیا۔

”اے ہے۔“ جانو بولی ”بیگم یہاں تو آئے دن یہی کچھ ہوتا ہے اب رانی سے کون کے کہے کہ نہیں۔“

”آفرینی کس کی ہے۔“ بیگم کے دل میں غلام علی بسا ہوا تھا۔

”میں تو تمہاری ہی ہے۔“ جانو بولی۔

”اے میری ہوتی تو یہ چلن نہ ہوتے۔“

”اور شریف میاں بدھو۔“ جانو بولی۔ ”وہ سب کچھ دیکھ کر بھی لٹ سے مس نہیں ہوتا بیگم کو غلام ہے۔“

”خاوند۔“ بیگم نے کہا ”اس محلے کے خاوند تو نہ جانے کس مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔“ جانو نے جواب دیا ”بیگم کے نزدیک تو صرف ایک خاوند ایسا تھا جو خاوند کہلانے کا حق تھا اس نے بیگم کو گھر سے نکال کر ازلی محبوب کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔“

بیگم اور جانو کی یہ دلی دلی باتیں ابھریں اور پھر اس پر اسرار اصول کے ماتحت باہر نکل گئیں

جسے آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا۔

مکھلے والے جو ایلی اور شنراؤ کے قصے پر اظہار خیال کرتے کرتے اکٹامکھے سے لکھنے لگے۔  
جوش میں آگئے اور تازہ دم ہو کر اس پٹی ہوئی لکیر کو پینے لگے۔  
ایلی یہ حالات دیکھ کر اور بھی گھبرا گیا۔

### محبت نامہ

— ایک روز جب وہ سب چوبارے میں بیٹھے تھے۔ ایلی آلتی پالتی مارے دلاتا تھا شنراؤ کے ہاتھوں میں پوجا کے پھول تھے اور وہ بنس بنس آرتی پتی ہوئی تھی۔  
بیگم کے دل سے شعلے نکل رہے تھے جانو کے ہونٹوں پر تحقیر تھی تو دروازہ بجلا  
”جا دیکھ جا کر۔“ شنراؤ جانو سے مخاطب ہوئی ”نیچے ڈاکیہ کب سے محبت مند لے آئے ہیں۔“ وہ حسب معمول مسکرائی۔

”محبت نامہ“ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں ہاں وہ کہتے ہیں جادو برحق ہے۔“

دوسری مرتبہ دروازہ بجلا تو جانو نیچے اتر گئی۔

شنراؤ ہنسنے لگی ”اماں اگر آج بھی محبت نامہ موصول نہ ہو تو پھر چھوڑو ان تعویذ کو۔“

”کیسے چھوڑوں“ بیگم بولی۔ ”جس کا راج پاٹ لٹ گیا۔“ وہ رک گئی اس کی آنکھیں ڈبڈبائی چکی تھیں۔

شنراؤ پھر ہنسی۔ ”تو اماں راج پاٹ کے لیے روتی ہو نا۔“ میں سمجھتی تھی بھگت کے لیے رو رہی ہو۔“

”جس پر بیٹے وہی جانے ہے۔“ بیگم نے کہا۔

”مجھ پر بیٹے تو میں سمجھوں۔ خس کم جہاں پاک۔“ شنراؤ نے معنی خیز نگاہ ایلی پر ڈالی۔

”تیری نظر میں کوئی ہو گا۔“ بیگم نے ایلی پر جلی کٹی نگاہ ڈالی۔

شنراؤ نے قہقہہ لگایا۔ ”ہاں ہے۔“ وہ بولی۔ ”نہ بھی ہو تا جب بھی یہی سمجھتی۔“

جانو آئی تو اس کے ہاتھ میں خط تھا۔

”کیا نامیں نے کہا نہ تھا۔“ شنراؤ بولی۔

”ہندرا ہی محبت نامہ ہو گا۔“ بیگم بولی۔

”مجھے کون لکھتا ہے جی اور پھر محبت نامہ۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسی ”محبت نامے“ میں زیادہ  
”مجھے کون لکھا ہوتا ہے کہ روٹی کی تکلیف ہے۔ ان کا تو صرف روٹی کا مطالبہ ہے کھائی اور  
”نہیں موند لیں۔ انہیں محبت سے کیا واسطہ۔“

”یہ تو میرا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”مثلاً غلطی سے تمہارا نام لکھ دیا ہو۔ کھولو تو۔“ شنراؤ بولی۔

ایلی نے اسے کھولا تو وہ بھونچکا رہ گیا وہ سادی کا خط تھا۔

”یہ تو خط ہے۔“ یہ تو اخبار معلوم ہوتا ہے۔“

”اور کیا محبت کی بات مختصر ہوتی ہے کیا“ شنراؤ بولی۔

ایلی کا رنگ فق ہو گیا۔

”اور جس کے نام آیا ہے اس سے پوچھو وہ تو پیاسا ہی رہ جاتا ہے“ شنراؤ مسکرائی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے شنراؤ۔ سادی کے تمام قصے سے واقف ہو۔

”یہ تو کلج کے متعلق ہے۔“ ایلی کہنے لگا۔

”جی خط نہیں دفتر ہے۔“ جانو بولی۔

ایلی خط اٹھا کر ایک طرف چلا گیا۔

سادی کا خط پڑھ کر ایلی ایک مرتبہ پھر اسی فضا میں پہنچ گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ زینے

الے کرے میں کھڑا ہو اور سادی مسکرا رہی ہو مسکرائے جا رہی ہو سارے خط میں محبت کا تو

لکھا نام ہی نہ تھا۔ وہ خود ہنستی تھی اور ایلی کو گدگداتی تھی۔ اور ہانے ہانے لگاؤ کی بات

بجھاتی تھی۔

ایلی نے وہ خط کئی ایک مرتبہ پڑھا۔ اور وہ قطعی طور پر بھول گیا کہ وہ علی پور میں ہے اور

یہ نامائے آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے سامنے آرتی۔ پڑی ہے پوجا کے پھول بکھرے ہوئے

نہ۔ بیگم میں غصے بھرا طوفان اٹھ رہا ہے محلے میں لوگ ہونٹوں پر انگلیاں رکھے بیٹھے ہیں۔

اس روز پہلی مرتبہ وہ باہر نکل گیا۔

مکھلے سے وہ جلدی جلدی نکل گیا تاکہ کوئی بات نہ چھیڑے پھر کھیتوں میں پہنچ کر وہ کوٹلی کی

”ہنساری“ ایلی نے حیرت سے اس کی لنگڑی ٹانگ کی طرف دیکھا۔  
 ”بھئی شادی کو لنگڑے پن سے کیا تعلق“ رضائے تقہہ مار کر کہا۔ ”بلکہ لنگڑے کی پکڑ تو  
 شور ہے۔“  
 ”عجب کی بات ہے۔“ ایلی بولا۔

”بھئی اپنا اللہ مالک ہے آج تک بھی روزی پہنچتی رہی ہے اب مستقل صورت پیدا ہو  
 بنے گی۔“

اس کے بعد ایلی کا معمول ہو گیا کہ وہ روز کسی نہ کسی وقت رضا کو ملنے چلا جاتا۔ اور وہ  
 روزں باتوکلن میں بیٹھے رہتے یا شیخ ہدم کے ہاں چلے جاتے۔  
 شیخ ہدم اسے دیکھ کر شور مچا دیتا۔

”بھئی اب تو چھوڑو بھاؤ تاؤ ہمارے مسمان آئے ہیں اب تو سودا ہو گیا ساڑھے دس آنے  
 رہیں۔“ ایلی تو الیاس صاحب آئے ہیں آئیے کیا پوچھ گئے بھئی ہم سے بھی کچھ کھاپی لیا کرو  
 مال کا مال کھاؤ گے تو موٹے ہو جاؤ گے چلو ایک شطرنج کی بازی رہے او لڑکے دنا ہمیں  
 شطرنج۔“

ہدم کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے ایلی سب کچھ بھول جاتا کہ وہ دیوتا بنا بیٹھا ہے۔ سامنے  
 ٹھڑا آتی کے بھول اٹھائے کھڑی ہے اور محلے والے اس دیوتا کو شیطان سمجھتے ہیں۔ اور لاہور  
 سے لوگ آ رہے ہیں اور اسے علی احمد کو اس بات پر رضامند کرتا ہے کہ باقاعدہ طور پر پیغام لے  
 کر ملے اور منصر سے ملے۔

ایلی بڑا ہو گیا تھا۔ لہذا کچی حویلی یا محلے کے میدان میں کھڑا ہونا یا کھیلنا اس کے لیے مشکل  
 ہو گیا تھا۔ کچی حویلی اور میدان میں نئی پودنے جگہ لے لی تھی۔ اب یہ ممکن نہ رہا تھا چونکہ یہ  
 نئی روایات کے منافی تھا۔

ایلی کے تمام ساتھی اپنے اپنے کام پر چلے گئے تھے۔ رفیق یوسف اور جمیل اب ملازم تھے  
 اور مختلف مقامات پر متعین تھے محلے میں صرف رضا کا بھائی ضیاء تھا۔ رفیق کا بھائی صندر اور چند  
 ایک اور لڑکے تھے جن سے ایلی کے زیادہ تعلقات نہ تھے البتہ صندر اب بھی اپنی بیشک میں  
 لیاوت کوٹنے چھاننے میں مصروف رہتا تھا اس نے تنگ آکر اشتہاری حکیم کا کام شروع کر رکھا  
 تھا۔

طرف چلا گیا۔

اس کے سامنے سادی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ”خط کا جواب کیوں دیں گے آپ؟“  
 رہی تھی ”ان پیسوں کا بالائی کا برف کھائیے نہیں تو پتلون رفو کرا لیجیے“ وہ اپنے گلے ہوئے  
 دہرا رہی تھی۔

دوسری طرف منصر کھڑا کہ رہا تھا ”وعدہ کیجئے کہ آپ ان لوگوں سے براہ راست رابطہ  
 نہ کریں گے۔“ تیسری طرف ایمان بندوق اٹھائے اس کی جانب آ رہا تھا۔ اہل ہاتھ ل رہی تھی  
 ”بیٹے اب کیا ہو گا۔“

سادوی کے خط میں دو باتیں امید افزا تھیں۔ اس نے لکھا تھا کہ جلد ہی کوئی صاحب علی  
 آئیں گے تاکہ ایلی اور آصفی خاندان کے متعلق تحقیق کریں۔ کرتے پھر میں تحقیق میں  
 دوسرے اس نے خط میں پتہ لکھا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ جواب ضرور دیا جائے۔ اور اس پتہ پر  
 جائے اور اس کی راست گوئی کا مسئلہ اڑایا تھا۔ جس سے ظاہر تھا کہ معاملہ کو راز رکھنا ضرور  
 ہے۔

دیر تک ایلی بیٹھ کر اس کے خط کو ذہن میں دہراتا رہا پھر وہ اس کا جواب سوچنے میں مشغول  
 ہو گیا۔ واپسی پر ایلی کو خیال آیا کہ کیوں نہ رضا سے مل لوں۔ وہ اپنی بے اعتنائی پر شرمندہ  
 محسوس کر رہا تھا۔ رضا کی دوکان بند تھی اس لیے وہ اس کے گھر چلا گیا۔ ایلی کو گھر کے دروازے  
 پر دیکھ کر رضا کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

”تم یہاں۔“ وہ چلایا۔ ”یار بڑے خوش نصیب ہو جو گھر آ گئے ورنہ آج ہی میں نے،  
 خطرناک فیصلہ کیا تھا۔“

”کیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”اب بتانے کا کیا فائدہ۔ تم آ گئے ہو تو چلو معاف کر دیا۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”آؤ بیٹھو اندر۔“  
 ”تمہیں ایک خبر سناؤں۔“

”کیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”شادی ہو رہی ہے۔“

”کس کی۔“

”اپنی اور کس کی۔“



”بیگم بولی۔ ”وہ تو پہلے ہی سے نامزد ہو چکا ہے۔“

”ایلی! میں ان لوگوں کا کیا اعتبار۔ وہ تو بڑی بڑی مبارکیں دیتے تھے کتے تھے وہ اب بھی ہیں مگر انا اچھا ہے اور لڑکی کا بھائی جو آیا تھا وہ تو مشہور آدمی ہے۔ یہی کتے تھے بھی سب تو بھی کچھ بولے گا۔“ جانو نے ایلی کو جھنجھوڑ کر کہا۔

”ہو نہوں۔“ بیگم بولی ”یہ مجنوں کہاں بولے گا۔“

”تو کیا وہ لیلے کا خط تھا جو اس روز آیا تھا۔“ شہزاد مسکرائی۔

”ہے وہ اخبار؟“ جانو نے کہا۔

”پلو یہ بھی اچھا ہوا۔“ شہزاد بولی۔ ”اس کا گھر بھی بس گیا۔“

”بے گاتو جانیں گے۔“ بیگم نے کہا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔

لسان

چار ایک دن کے بعد جب ایلی اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ تو شہزاد چپکے سے دبے پاؤں اوپر آگئی۔ اور

”کے کئے گئی۔“ آخر مجھ سے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم کیوں خواہ مخواہ بھاگتے پھرتے

ایلی ہنسنے لگا۔ ”خطرناک لوگوں سے دور رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔“ اس نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔

”کب سے ہوئی ہوں خطرناک۔“ وہ بولی۔

”شروع سے ہی تھی۔ مجھے احساس اب ہوا ہے۔“

”ایلی! وہ بولی ”بات مذاق میں نہ ٹالو۔“

”میں ان سے مجھے تو سن کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ بے حد۔ تمہیں ایک ساتھی مل گیا۔“

”میں نے بے حد خوشی ہے ایلی۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”مجھے صرف یہ افسوس ہے کہ تم نے مجھے غلط سمجھا۔“ اس کی آنکھیں پر نم ہو گئیں، ”ماتھے کا قلع سرخ پڑ گیا۔“ مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ایلی۔

”میں راستے میں دیوار نہیں بننا چاہتی۔ میں تو بری طرح چھنی ہوئی ہوں۔ ورنہ

میں اتنی جرات ہے کہ سب کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ چل پڑوں۔ لیکن ایلی میرے پاس

نہیں دینے کے لیے اب کیا دھرا ہے۔ کچھ بھی نہیں میں اس قاتل نہیں کہ تمہاری زندگی کو

صفر ایلی کو دیکھ کر مسکراتا۔ اس کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ ایلی کے راز واقف ہو۔ ایلی کو دیکھ کر وہ اسے پکڑ لیتا۔ ”آؤ بھائی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو گھڑی دو کے لیے ہم بھی تو تمہارے چرنوں میں رہتے ہیں۔“ ایلی اسے دیکھ کر گھبرا جاتا تھا۔ اس کی صرف یہ تھی کہ صفر ہمیشہ ایسے انداز سے بات کرتا کہ ایلی کو شہزاد یاد آ جاتی اور اسے ہوتا جیسے صفر جان بوجھ کر شہزاد کی بات چھیڑنا چاہتا ہے جیسے وہ ایلی کو زبردستی اس بات پر کر رہا ہو کہ ایلی اسے راز داں بنالے اور راز داں بننے کے بعد وہ دونوں مل کر شہزادے کریں۔

اے ہے

ایک روز جانو ہانپتی ہوئی آئی اور سیدھی ایلی کے دروازے پر کھڑی ہوئی اور پھر ہونٹوں پر رکھ کر حیرت سے ایلی کی طرف دیکھنے لگی۔ ایلی اپنے ہی خیال میں مگن بیٹھا رہا۔ اس پر شہزاد لگی ”کب تک کھڑی رہے گی تو وہاں۔ اسے تو اپنی بھی خبر نہیں کچھ۔“

”تو کیوں پتلی بنی کھڑی ہے۔“

”اے ہے میں تو حیران ہوں۔“ جانو نے کہا۔

”پڑی ہو حیران یہاں کیا فرق پڑتا ہے۔“ شہزاد ہنسی۔

”آخر بات کیا ہے۔“ بیگم نے پوچھا۔

”ہے وہاں تو مبارکیں مل رہی ہیں۔“

”کے مبارک مل رہی ہے۔“

”ہے انہوں نے تو مجھے پکڑ لیا۔“ تھانیدار کے گھر گئی تھی یہی جو بڑی ڈیوڑھی کے اندر ہے۔ انہوں نے پکڑ لیا۔ مجھے کہنے لگیں۔ بڑا گھرتا کا ہے تم نے۔ اور اب تو سمجھ لو بات گئی۔ ہمارے گھر آئے تھے نا پوچھ گچھ کرنے۔ کیا پڑی تھی جانو جو اندر کی باتیں کرتے۔

”چھپا گئے۔ اب سمجھ لو معاملہ چل نکلا۔“

”تو کھل کے بات کرے گی یا نہیں۔“ بیگم نے اسے ڈانٹا۔

”صاف بات تو کر رہی ہوں۔“ جانو بولی۔

”خاک صاف ہے۔ اپنی تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔“ بیگم بولی۔



”مجھے بدنامی کی پروا نہیں ایللی لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں لیکن اپنی نظر میں آپ کو براہ کی پروا ہے۔ اس لیے میں تمہارا ہاتھ جھٹکتی رہی تمہیں روکتی رہی مجھے معلوم نہ تھا کہ تم میرا ہاتھ لگے۔“

”تم سمجھتے رہے کہ مجھے تم سے صرف دکھانے کی دلچسپی ہے تم سمجھتے رہے کہ میں بے پروا ہوں بے حس ہوں۔ لیکن۔۔۔“ اس کی ہچکی نکل گئی۔

ایللی دیوانہ وار اٹھ بیٹھا۔ شہزاد نے اسے روکا۔ ”میری بات سن لو۔“ لیکن شہزاد کی بات ناقابل برداشت ہوئی جاری تھیں۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔

عین اس وقت بیگم نے زینے سے سر نکالا۔ ”تمہاری خاص بات ابھی ختم نہیں ہوئی کیا۔“ اس کے انداز میں غصہ اور طعنہ تھا۔

”تمہارے دخل دینے سے کیا ختم ہو جائے گی، ماں“ شہزاد نے جواب دیا۔

”تم تو اس گھر کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔“ بیگم غصے میں چلائی۔

”یہ تو گھروالا جانے ماں تم کیوں فکر میں گھلی جا رہی ہو۔“

”وہ تو مجھے پتہ ہے کہ یہ گھر میرا نہیں۔“ بیگم کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

”تو کیا اس گھر کو بھی تباہ کرنے کا ارادہ ہے۔“ شہزاد نے مسکرا کر کہا۔

بیگم دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”آؤ ایللی۔“ شہزاد بولی۔ ”نیچے چل کر چائے پیئیں۔“ یہ کہہ کر وہ بیڑھیاں اتارنے لگی۔

ایللی بیگم کے پاس بیٹھ گیا۔ یوں بیگم کو چھوڑ کر نیچے جانے کی اس میں جرات نہ تھی۔

تک وہ بیگم کو بسلاتا رہا۔ تبلی دیتا رہا اور بیگم ٹپ ٹپ آنسو بہاتی رہی۔

## گھر میں کوئی نہیں

استحان کا نتیجہ نکلنے سے چار ایک روز پہلے ایللی لاہور روانہ ہو گیا۔ اسے نتیجہ کے متعلق کوئی دلچسپی نہ تھی چونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ پاس نہیں ہو سکتا۔ جس زمانے میں اس کے ہم جماعت شاہ شام مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ وہ کتاب کھول کر خیالات میں کھو جایا کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پوری توجہ سے پڑھے تاکہ اس کا سال ضائع نہ ہو۔ پہلے ہی وہ اتنے سال ضائع کر چکا تھا اس کے علاوہ اسے معلوم تھا کہ منصر کی خواہش ہے کہ وہ اچھے نمبروں پر پاس ہو۔ منصر اسے ایک لائق

ہمہ فاع اور ایللی چاہتا تھا کہ منصر کی توقعات پر پورا اترے لیکن جونہی وہ کتاب اٹھاتا پہلی ہی پٹیاں پڑھنے لگتا۔ کوئی ایسا لفظ آجاتا کہ اس کے خیالات کا رخ بدل جاتا اور وہ سوچ میں کھو جاتا اور پٹیاں پڑھنے کی توں اس کے ہاتھوں میں دھری کی دھری رہ جاتی۔

ایللی کو پاس ہونے کی قطعی امید نہ تھی۔ نتیجہ کے لیے لاہور جانے سے اس کا مقصد صرف ایللی کے افراد سے ملنا تھا۔

پہلے ہیس ایک ہوٹل میں رکھ کر وہ سیدھا سفید منزل میں پہنچا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ایللی کا پچھلا چہرہ دیران پڑا تھا۔ کچھ دیر وہ اس ہال نما ڈیوڑھی میں کھڑا رہا تاکہ کوئی آئے تو اسے پوچھ سکے۔ پھر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب نہ پا کر نہ جانے اسے کیا سوچھی کہ وہ

پہچان گیا۔ اور اس نے دوسری منزل کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ دیر تک کسی نے جواب نہ دیا۔ اس نے آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

ایللی نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ سامنے خود سادی کھڑی تھی۔ ایللی کو دیکھ کر سادی نے چیخ ماری اور پھر قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ ”بابی! بابی!!“

”کیا ہے؟“

”آؤ۔ آؤ۔ جلدی ہی ہی ہی ہی“ وہ ہنسنے لگی۔

”ارے کیا واقعہ۔“ دور سے بابی کی آواز سنائی دی۔

”ہے ہاگو۔ دوڑ کر۔“ سادی چیخ رہی تھی۔

لوہ ایک طرف ان بد تمیزی مچنے لگا۔ جس میں قہقہہ۔ چیخیں، آوازیں اور جانے کیا کیا شامل

ایللی گھبرا گیا۔ اور چپکے سے نیچے اتر آیا۔ نیچے صدر دروازے کے قریب وہ یوں معصوم انداز

نظر آ رہا جیسے ابھی ابھی داخل ہو اور اس شور شرابے کے متعلق اسے قطعی علم نہ ہو جو

خانہ میں چاہا تھا۔

گھر میں پر آکھڑی ہوئیں اور سلاخوں سے نیچے جھانکنے لگیں۔

مہنگا گئے کیل۔ ”بابی بولی۔“

مہنگا کے مڑھیں۔ ”سادی ہنس

مہنگا نہ بھی چھپا لیجئے۔“

”قہقہہ ہیکوں۔“

”اونہوں شرمائے نہیں۔“

”ڈریئے بھی نہیں وہ ہندوق والے چلے گئے۔“

وہ دونوں ایک ساتھ چلا رہی تھیں قہقہہ لگا رہی تھیں۔

”قربب کیوں نہیں آتے۔“

”پتلون پیچھے سے رفو کی ہوئی ہے ناس لیے۔“

”ہے ڈبلے ہو گئے ہیں۔“

”نہ بھادوں سوکھے نہ ساون ہرے۔“

اس پر وہ دونوں قہقہے لگائے لگیں پھر خاموشی چھا گئی۔

ایلی جون کا توں کھڑا رہا۔

پھر زینے میں بڑے بڑے بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ ایلی چونکا۔

ایک زینے سے سادی اتری اس کے سر پر پانچ چھ دوپٹے یوں لپٹے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی گھڑی ہو۔ جسم پر کالا اچکن تھا اور پاؤں میں فوجی بوٹ تھے۔

وہ وہیں رک گئی۔ ”کون ہے؟“ اس نے بھاری آواز بنا کر کہا ”گھر میں کوئی نہیں۔“

بولی۔

## اتنی سی چوری

ایلی خاموش کھڑا رہا۔ اوپر جنگل کی سلاخوں سے باجی کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”آپ کس سے ملیں گے۔“ وہ بولی۔

”آپ سے“ ایلی اس کی طرف بڑھا۔

سادی نے شور مچا دیا۔ ایک بار پھر سارا گھر قہقہوں سے گونجنے لگا۔

ایلی سادی کے پیچھے بھاگا وہ آگے آگے قہقہے لگاتی دوڑ رہی تھی۔

ایلی کی کوشش تھی کہ اس کے سر سے ایک دوپٹہ اتارے۔

وہ دونوں اوپر جا پہنچے ایلی زینے کے دروازے میں رک گیا۔

”بس“ باجی چلائی۔

”آگے پر چلتے ہیں۔“ سادی نے شور مچایا۔

”دوپٹہ مجھے دے دو۔“ ایلی نے کہا۔

”کہیں گھڑی باندھنے کا ارادہ ہے۔“

”روبل بناؤں گا۔“

”تو نہ روبل۔ یہ دوکان نہیں شریف زادیوں کا گھر ہے۔“ سادی ہنسی۔

ایلی جلال میں آگیا۔ ”وہ سلگا ہوا سگرٹ یاد ہے۔“ وہ بولا۔

”چھا“ وہ چلائی ”جب خلیل فاختہ اڑایا کرتے تھے۔“

”اب بھی فاختہ اڑا سکتے ہیں خلیل۔“ وہ بولا۔

”وان تو سگتوں کو دیتے ہیں۔“ سادی ہنسی۔ ”چھین کر لے جائیے۔“

”ہے ہمت“ باجی بولی۔

”تو نہوں“ سادی چلائی ”صرف دروازے تک۔“

”اور اگر چھین لیا تو۔ انعام۔“ ایلی بولا۔

”جو مانگو گے ملے گا۔“ سادی نے قہقہہ لگایا۔

”شرط یہ ہے کہ سر کا دوپٹہ اتار دو۔“ باجی بولی۔

”میں شور مچا کر محلے کو اکٹھا کر لوں گی۔ سوچ لیجئے۔“ سادی ہنسنے لگی۔

”اور اگر کوئی آگیا تو؟“ باجی نے کہا۔

”تو یک بنی دو گوش“ سادی نے قہقہہ لگایا۔

”تو تیار ہو جاؤ۔“ ایلی نے کہا ”مابدولت تشریف لاتے ہیں۔“

”حزم میں تو صرف خواجہ سرا آتے ہیں مابدولت نہیں“ سادی ہنسنے لگی۔

”کیا واقعی۔“ یاد دھمکی دے رہے ہیں۔“ باجی نے سادی کو مخاطب کر کے کہا۔

”یہ تو بھگت ہیں۔ سورا ہوتے تو خطرہ بھی ہوتا۔“ سادی چلائی۔

”خلی ملا جپتے ہیں کیا؟“

”وہ بھی رام ٹہم کی جیسی تو بن باسی ہیں آج کل“ سادی بولی۔

”بے جست بھری اور سادی کی طرف لپکا۔“

سفید منزل میں کرام مچ گیا وہ آگے بھاگ رہی تھیں۔ چیخ رہی تھیں قہقہے لگا رہی تھیں وہ

پہلے اس وقت وہ بھول چکا تھا کہ وہ سفید منزل میں آنکھ پھولی کھیل رہا ہے۔ وہ بھول چکا تھا

ہنٹ ہنٹ اس کاٹھ کباڑ سے بچتا ہوا نیچے اتر گیا۔

نیچے جا کر اس نے اس دروازے کو آزمایا جو باہر گلی میں کھلتا تھا لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ وہ

وہاں ہو گیا۔ اوپر وہ مکان کا کونہ کونہ دیکھ رہے تھے۔

بلنے تک کوئی زینے سے آئے۔

ایلی نے اس دروازے کی درز میں سے دیکھا جو سفید منزل کے اندر کھلتا تھا۔ باہر ہال نما

پڑوسی میں کچھ لوگ کھڑے تھے۔ ہر حال باہر نکلتا مشکل تھا۔

اس نے دروازے کی کنڈی کھلی رہنے دی اور پھر آہستہ آہستہ پٹ کھولنے شروع کر

دیا۔ آگے دروازہ کھلا ہوا تو انہیں وہاں دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو پھر وہ دروازے کے پٹ

کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

چند ساعت کے بعد ایک محلے دار داخل ہوا۔ ایلی کا دل ڈوب گیا۔

محلے دار سیدھا آگے نکل گیا۔ پھر وہ زینے میں جھانک کر بولا "یہاں تو کوئی بھی نہیں۔" یہ

کہہ کر وہ ایلی کی طرف مڑا۔ وہ ایلی کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا "کیوں صاحب اس کونے

میں ہے کوئی۔" ایلی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ اس کے انداز سے دوستانہ محبت نپک رہی تھی۔

"یہاں بھی نہیں نا۔" وہ بولا "میرا خیال ہے گھر والوں کو خواہ مخواہ شک پڑا ہے۔ ہے نا۔"

"جی ہاں۔" ایلی نے کہا۔

نواردار اس کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ایلی کے شانے پر رکھ دیا۔ "آؤ چلیں۔" وہ بولا

"نٹنٹ بے کار ہے۔"

اس کا خاموش ہاتھ ایلی سے سب کچھ کہہ رہا تھا لیکن گھبراہٹ کی وجہ سے ایلی نے اس کے

لگے پیغام کو نہ سمجھا۔

"جی جی۔ میں میرا مطلب ہے۔" ایلی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" اس نے ایلی کو تھپکتے ہوئے کہا۔ اور پھر اس کے قریب تر ہو گیا۔

"میں جانتا ہوں — میں سامنے گھر میں رہتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اسے باہر لے آیا۔

لورڈ سب سفید منزل سے باہر نکل گئے۔

ایلی کے دل میں جذبات کا ایک عظیم تلاطم موجزن تھا۔

کہ گلی کے سب لوگوں دروازے کھول کر سفید منزل کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ

بھول چکا تھا کہ وہ منصر کا دوست ہے۔ اس نے منصر سے وعدہ کیا ہے کہ براہ راست ان سے رابطہ

پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے گا۔ اور اسے سفید منزل کے جغرافیہ سے قطعی طور پر واقف

نہیں۔

دیر تک وہ بھاگتے رہے پھر ایلی نے سادی کو پکڑ لیا۔ سادی نے با آواز بلند چار ایک نیچے

ماریں اور دوپٹہ اپنے گرد لپیٹ لیا۔

بھد مشکل ایلی نے دوپٹہ الگ کیا۔ سادی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کانٹا۔ اس کے بل

بکھرے ہوئے تھے منہ سرخ ہو رہا تھا۔

ایلی دوپٹہ لے کر بھاگا۔

جب وہ صحن میں پہنچا تو سامنے ایک ضعیف عورت کھڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی

تھی۔ چند ایک ساعت کے لیے وہ دونوں ایک دوسرے کے دربو کھڑے رہے — پھر ایلی

گھبرا گیا۔

ضعیف عورت نے چیخا شروع کر دیا "چور چور۔"

ایلی گھبراہٹ میں اندر کی طرف بھاگا۔

چٹکی منزل سے شور مچائی دیا۔

سادی اور باقی دونوں سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگیں۔ "کون چور؟ کہاں ہے چور دلائی لک؟"

لیکن بڑھیا برابر چلاتی رہی۔ "چور چور۔ دوڑ دوڑو۔"

پھر صحن میں دو چار مردوں کی آوازیں سنائی دیں "کیا بات ہے کیا ہوا؟"

ایلی کا دل ڈوب گیا اب وہ باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

اس وقت سادی بھاگی بھاگی آئی اس نے ایلی کی بانہ پکڑ کر اسے گھسیٹا اور ایک زینے

دھکیل دیا۔

کچھ دیر تک تو وہ وہاں چپ بیٹھا رہا۔ باہر سے باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ "یہاں تو

کوئی چور نہیں ہے۔" سادی کہہ رہی تھی۔ "میں بھائی جان کے کپڑے پن کر باقی کو ڈرا رہی

تھی۔"

"اے ہے میں کیا یاگل ہوں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

دفعاً ایلی کو خیال آیا۔ ارے وہ چونکا یہ تو وہی زینہ ہے جس کے نیچے ہم ملا کرتے تھے۔

اپنے مکان کے سامنے پہنچ کر محلے دار رکا۔ ”آئیے بیٹھے۔“ اس نے ایلی سے کہا۔  
 ”بڑی مہربانی ہے مجھے جانا ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔  
 محلے دار کے مکان پر ایک سختی آویزاں تھی جس پر لکھا تھا۔ ڈاکٹر اسماعیل۔  
 ”ارے۔“ ڈاکٹر اسماعیل چلایا۔ ”یہ دیکھئے۔“ اس نے ایلی کی پتلون کی طرف اشارہ کیا۔  
 پتلون کی جیب میں سے سادی کے دوپٹے کا ایک حصہ باہر نکلا ہوا تھا۔  
 ”کیا یہ چوری کا مال ہے؟“ ڈاکٹر ہنسنے لگا۔  
 ”جی“ ایلی بولا۔  
 ”کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”دوپٹہ ہے۔“  
 ڈاکٹر نے تسمیہ لگایا۔ ”بس صرف اتنی سی چوری۔ اس کو تو تقسیم بھی نہیں کیا جائیگا۔  
 لہذا حصہ مانگنا بے کار ہے۔“  
 ایلی ہنستا ہوا رخصت ہو گیا۔

## شاہ کی سواری

گلی پر خاموشی چھا چکی تھی۔ جنگلے ویران پرے تھے۔ سفید منزل میں کوئی دکھائی نہ دے رہا تھا۔  
 دو روز ایلی چھپ کر ہوٹل میں بیٹھا رہا تاکہ اسے کوئی دیکھ نہ پائے اور یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ اس روز لاہور میں موجود تھا جب سفید منزل میں ہنگامہ ہوا تھا۔  
 اسے یقین تھا کہ منصر کی آمد پر گھر میں ایک بار پھر ہنگامہ ہو گا اور کرامو روز اس واقعہ کی نوعیت پر بحث کریں گے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ منصر کو سب سے پہلے ایلی کا خیال آئے گا اور ممکن ہے وہ اس امر کی تحقیق بھی کرے کہ ایلی لاہور تو نہیں۔  
 ایلی کو عجیب سے دہم ستارہ تھے شاید وہ علی پور میں تھانے دار کے نام جوبلی لارنگ کے نام سے مشہور تھے۔ جس تھانیدار کے ہاں انہوں نے ایلی کے متعلق تحقیق کی تھی۔ شاید ڈاکٹر اسماعیل اسے وہ راز افشا کر دے اور ہنس کر کہہ دے:

نمبر ۱ کی بات نہیں۔ کوئی چور دور نہیں آیا۔ اپنے آدمی کو چور نہیں سمجھا کرتے۔“  
 ایلی نے سوچ کر کہ ایلی نے تو راست گوئی کے تحت سچی بات بتائی وہی ہے سادی اور باقی  
 ایلی نے حقیقت حال سے آگاہ کر دیں۔ اس کے بعد اگر ایلی نے جھوٹ بولا تو منصر پر کیا  
 ہونگا۔  
 روز روزہ بیٹھا سوچتا رہا۔  
 نئے روز رات کے بارہ بجے نتیجہ کا اعلان ہونا تھا۔ ایلی نے ٹائم ٹیبل دیکھا اور گاڑی کے  
 ٹائٹن پر پہنچا وہاں سے وہ ایک دوسرے ہوٹل میں گیا اور وہاں جا کر کمرہ لے لیا تاکہ رجسٹر  
 پر اندراج ہو بروقت ضرورت اسے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکے پھر مطمئن ہو کر وہ باہر  
 آیا۔  
 غلے گندہ میں جب وہ چائے پی کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ منصر موٹر سائیکل پر آ رہا ہے۔  
 اسے آواز دی۔ منصر رک گیا۔  
 ”ارے“ وہ بولا ”آپ یہاں؟“  
 ”جی“ ایلی نے کہا۔  
 ”کب ہے؟“ منصر نے سرسری انداز سے پوچھا۔  
 ”دوہری گاڑی سے پہنچا تھا۔ ہوٹل میں سلمان رکھ کر اب آپ کی طرف جا رہا تھا۔“  
 ”کچھ دیر ٹھہرنے کا ارادہ ہے کیا؟“ منصر نے پوچھا۔  
 ”اب جو نتیجہ سننے کے لیے آیا ہوں تو۔۔۔۔۔۔“  
 ”اے“ منصر بولا ”آج تو آپ کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔“  
 ”جی“ ایلی نے کہا۔  
 ”تپ“ تو شاید پاس ہیں۔“ منصر نے سوچتے ہوئے کہا ”یا شاید۔۔۔۔۔۔“ وہ رک گیا۔  
 ”دراصل“ اس نے بات شروع کی ”مجھے آپ کا رول نمبر یاد نہیں تھا۔ کیا تھا؟“  
 ایلی نے اپنا رول نمبر بتایا۔  
 ”اے“ منصر بولا۔ ”شاید یہی تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہ تھا لیکن اپنے ایک جاننے والے کو  
 اسے نتیجہ کی ایک نقل مل گئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تو تھا اگرچہ اچھی طرح مجھے  
 نمبر یاد نہ تھا۔ اوہ۔“ وہ چونکا ”شاید میں نے پرزے پر نقل بھی تو کیا تھا۔“ اس نے جیب

”جبر پانچنے کا کیا فائدہ“ ایم۔ کے حیرانی سے چلایا۔

اتفاق سے

ایم کے سے رخصت ہو کر جب وہ پھر سائیکل پر سوار ہوا تو وہ گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا اس کی نگاہوں تلے منصر کھڑا کہہ رہا تھا۔  
”چھاتو آج آپ کا نتیجہ نکل رہا تھا۔“  
”آپ تو شاید پاس ہیں یا شاید۔۔۔ دراصل مجھے آپ کا رول نمبر یاد نہیں تھا۔ ایک جلتے والے کے پاس نتیجہ کی نقل تھی لیکن مجھے آپ کا نمبر۔۔۔ پاس ہی سمجھنے کیا کہتے ہیں اے۔۔۔ ہل کپارٹمنٹ میں ہیں آپ“  
پھر اسے ان دنوں کا خیال آیا جب وہ مشن کالج میں امتحان دیا کرتا تھا۔ اور جب پرچہ دے کر باہر آتا تو منصر آؤٹ۔ ”اوہ آپ یہاں امتحان دے رہے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں آج کل اصرار لے کے لیے جاتا ہوں۔“

”اتفاق سے کیس آپ ان دنوں سفید منزل کی طرف تو نہیں گزرے؟“  
منصر کی تمام باتیں بالتفصیل باری باری اس کے سامنے آ رہی تھیں۔ اس نے حیرت سے منصر کی طرف دیکھا تو یہ سب اتفاقات سمجھے بوجھے ہوئے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ منصر کے گرد اپنے بازو حائل کر دے۔ ”آپ پریشان کیوں ہیں پرسوں میں آپ کے ہاں گیا تھا۔ دادی لال ٹھیک کہتی ہیں۔ وہ میں تھا۔ اور اب میں پھر ایسی حرکت بھی نہ کروں گا یقین جانیئے کبھی نہیں۔“

لیکن سائیکل تیزی سے چلا جا رہا تھا اور اس کے لیے اپنی جگہ قائم رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ سفید منزل پہنچ کر منصر نے اسے اپنے کمرے میں بٹھادیا۔ ”الیاس صاحب آپ ذرا بیٹھئے۔ یہ کتب ہی دیکھئے میں ابھی آیا۔“ یہ کہہ کر وہ اوپر چلا گیا۔

ایلی کے دل میں منصر کے لیے احترام اور محبت کے جذبات موجزن تھے۔ اسے آج تک کی ایسی شخصیت سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ جس کا اظہار اس قدر انوکھا اور رنگین ہو۔

منصر کا کمرہ بھی اس کی بے پروائی، رنگینی، ذہانت اور عظمت کا مظہر تھا۔ کمرے میں رنگور کا نیم آہنگی کس قدر دلنواز تھی۔ پلنگ کی چادر بھی اس کا ایک جزو محسوس ہو رہی تھی۔

”قوال اور قریب آگئے۔“ ہمیں لڈو کھلاؤ ہمیں لڈو کھلاؤ۔“

”اپنی ماں سے مانگو اپنی اماں سے مانگو۔“ سادی تالی بجاتے ہوئے گانے لگی۔

سے کانڈ کا ٹکڑا ڈھونڈ نکالا۔ ”ہاں یہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اتفاق کی بات ہے۔“ وہ تھوڑا گیا۔

پھر آپ ہی آپ کہنے لگا۔ ”تو سمجھ لیجئے کہ آپ پاس ہی ہیں۔ پاس ہی ہوئے۔“  
ہے ہاں شاید (Compartment) کپارٹمنٹ کہتے ہیں اسے، آپ کپارٹمنٹ میں ہیں۔ صاحب آپ نے کمال کر دکھایا۔ جن حالات میں آپ نے امتحان دیا تھا۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”میں باوجود اگر کپارٹمنٹ میں آسکتے ہیں تو مجھے ڈر ہے کہ ہمیں آپ کی عزت کرنی پڑے گی۔ ہنسنے لگا۔ ”آئیے چلیں۔“

ایلی موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ گیا اتنی دیر کے بعد شاہ کی سواری رکی ترک و احتیام ایک مرتبہ پھر لاہور کے بازاروں میں چل پڑی۔ لوگ دو روپہ کھڑے ہو کر نعرے لگا رہے لیکن ان نعروں میں کبھی کبھار چور چور کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔  
دفعۃً ”بھیر میں سے ایک شخص آگے بڑھا اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔“  
”آپ کا کوئی جاننے والا معلوم ہوتا ہے۔“ منصر نے سائیکل روکے ہوئے کہا۔ ”جب میں سامنے والی دوکان سے سگرت خرید لوں۔“

وہ سائیکل سے اترا۔ اس کے روبرو ایم۔ کے کھڑا ہنس رہا تھا۔

”تم کب آئے؟“ ایم کے نے پوچھا۔

”نتیجہ سنئے آیا تھا“

”ارے نتیجہ تمہیں معلوم نہیں ہوا۔ میرا تو خیال تھا کہ تمہیں آٹھ روز پہلے ہی پتہ چلے ہو گا۔“

”وہ کیسے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”یار میرا بھائی یونیورسٹی میں ہے۔ ایک روز میں وہاں بیٹھا تھا تو منصر کا ٹیلی فون آیا تھا منصر نے اسے تمہارا رول نمبر لکھوایا تھا کہ نتیجہ مرتب ہو جائے تو اسے اطلاع دے۔ بھائی جانے آج مجھے بتایا تھا کہ آٹھ روز ہوئے منصر کو اطلاع دے دی تھی۔“

”اچھا۔“ ایلی نے حیرانی سے کہا۔

”منصر نے تمہیں اطلاع نہیں دی؟“

”نہیں تو۔“



ہماری حیثیت کا شخص ظاہر کرتا تھا۔

ننگ بھری روٹی

ایلی نے پہلائی نوالا منہ میں ڈالا تو اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ روٹی میں کوٹ کوٹ کر نمک

برہماوند

”یوں کیا بات ہے؟“ منصر نے پوچھا۔

”کچھ نہیں“ ایلی نے کہا ”ذرا گرم ہے۔“

”وہ یہ بات ہے۔“

ایلی کو فوراً معلوم ہو گیا کہ یہ سادی کی شرارت ہے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ منصر کو اس کا

نہ۔

”ارے صاحب یہ کیا کھانے کا طریقہ ہے۔“ منصر نے کہا ”آپ تو یوں کھا رہے ہیں جیسے  
مک چھ رہے ہوں۔ شاید تہذیب کے خیال سے ایسا کر رہے ہوں ہر صورت کھانے کے  
طالعے میں ہم لوگ پیٹ بھر کر بد تہذیب ہیں۔ جب تک تمیز اور تہذیب کو بلائے طاق نہ رکھ  
یں۔ ہم سے کھایا ہی نہیں جاتا۔ اور صاحب پلاؤ دیکھ کر تہذیب کسے یاد رہے گی۔ مرزا غالب  
نے تم کے متعلق کہا ہے ناکہ آم اعلیٰ ہوں اور بہت ہوں اگر میں شاعر ہوتا تو یہی بات پلاؤ کے  
حق کہتا۔“

کچھ دیر تک منصر پلاؤ کھانے میں منہمک رہا لیکن اس دوران میں اس نے چار ایک بار  
سے ایلی کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔ ”الیاس صاحب ذرا یہ ساتھ والے کمرے سے  
گلی کی بوتل تو لا دیجئے مجھے۔ معاف کرنا بھائی کھاتے وقت ہم سے تو اٹھا نہیں جاتا۔“

”کمال ہے؟“ ایلی جھٹ اٹھ بیٹھا۔

”اس لمحہ کمرے میں جائیے نا تو آپ کو بتاؤں۔“

ایلی ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گیا۔

منصر نے چلا کر کہا ”پہلے تو جی جلائیے نادائیں ہاتھ دروازے کے پیچھے سوچ گئے ہے۔“

پانک کے پاس ہی سلپیر پڑے تھے۔ کیسے گد گدے پاؤں ہیں اور اس کی وہ تصویر جو کالر میں  
پڑی تھی۔ کس قدر جاذب نگاہ تھی۔

”الیاس صاحب“ منصر نے داخل ہوتے ہوئے کہا ”اماں کہتی ہیں کہ آپ بیس کھانا کھائیں  
گے اگرچہ یہ دعوت رسمی نہیں۔ رسم کے ہم قاتل نہیں اور ہوتے بھی تو اس وقت کچھ بھی تیار  
نہیں ہو سکتا۔ اور پھر چار ایک لقمے کھانے والے کے لیے کوئی تیاری بھی کیا کرے۔ اب آپ  
تکلف بنا دیجئے کہ آپ چاول کھائیں گے یا روٹی۔ میں تو ذاتی طور پر چاول کھانا پسند کرتا ہوں۔  
لیکن دونوں چیزیں تیار ہیں۔ اس لئے تکلف برطرف۔“

”جی میں تو روٹی کھاتا ہوں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو ٹھیک ہے۔“ پھر اس نے اوپر کی طرف منہ کر کے آواز دی۔ ”بھئی الیاس صاحب روٹی  
کھائیں گے اور میں تو آپ جانتے ہیں چاولوں کے ہوتے ہوئے اور کچھ نہیں کھاتا۔“  
”تو کیا بھجوا دیں کھانا؟“ اوپر سے اماں کی آواز آئی۔

”کیوں الیاس صاحب کیا خیال ہے؟“

”جب آپ کا جی چاہے۔“ ایلی نے کہا۔

وہ ہنس کر بولا ”بھئی ہم تو جب مل جائے تب کھاتے ہیں جی کا کیا ہے وہ تو ہر وقت چاہتا ہی  
رہتا ہے۔ اپنا تو اصول ہے جب ملے کھاؤ۔ بھجوا دیجئے اماں جان“ منصر نے با آواز بلند کہا۔  
”آپ تو شاید ہاتھ دھونا پسند کریں میں تو دیسے ہی اڑا جاتا ہوں۔“ وہ ایلی سے کہنے لگا۔  
کھانے میں پلاؤ کے علاوہ تین قسم کے سالن تھے۔

”ارے“ منصر کھانا دیکھ کر چلایا ”آج تو بڑے خوش قسمت معلوم ہوتے ہیں ہم آج تو  
اتفاق سے پلاؤ ہے۔ پلاؤ کے ہوتے ہوئے آپ روٹی کھانا کیسے گوارا کریں گے۔ تعجب ہے  
صاحب اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو ارادہ بدل لیتا“ لیکن ایلی کے لیے اب اپنی بات بدانا ممکن نہ  
تھا۔ اس میں اتنی جرات نہ تھی۔

”اتفاق سے آج پلاؤ ہے۔“ منصر کے منہ سے ”اتفاق سے“ سن کر ایلی کے ہونٹوں  
پر مسکراہٹ آگئی۔

منصر نے کبھی سہوا“ بھی ایسی بات نہ کی تھی جس سے ذاتی خاندانی یا گھرانے کی عفت یا  
امارت ظاہر ہو۔ وہ کوئی ایسی بات نہ کرتا جس سے دوسرا کمتر محسوس کرے۔ وہ اپنے آپ کو پیش

”جی“ ایلی نے جی جلاتے ہوئے کہا۔

”کارنس پر دیکھئے۔“ منصر بولا۔

”یہاں تو نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو دونوں الماریاں دیکھئے۔“

”پہلے نہیں ملتی تو چھوڑیے۔“ منصر نے چلا کر کہا۔

جونہی ایلی واپس کمرے میں داخل ہوا تو منصر نے شور مچا دیا۔ ”ابو ہو ہو۔“

بے تحاشا مسکرائے جا رہا تھا۔

”یہ دیکھ لیجئے میری پلاؤ کھانے کی گرم جوشی کا نتیجہ۔“ اس نے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔

ایلی کی روٹی کی پلیٹ پر گرا ہوا تھا۔ ”تمام روٹیاں تر ہو گئی ہیں۔“ ٹھہریے میں اور مگڑاؤ۔

”اماں“ اس نے اوپر آواز دی۔ ”دو ایک روٹیاں اور بھیج دیجئے میرے لیے۔ میں

ہوں الیاس صاحب کے ساتھ روٹی کھانے میں بھی مجھے ساتھ دینا چاہیے۔ ذرا جلدی کیجئے

منصر کی بامعنی مسکراہٹ کو دیکھ کر ایلی کے کان میں آواز آئی۔ ”اتفاق سے۔“

وہ سوچنے لگا کہ کہیں منصر کو روٹی کے نمک کا راز تو نہیں معلوم ہو گیا اس نے گلاس کی

آواز نہیں سنی تھی اس کے علاوہ پانی سے صرف روٹیاں بھیگی تھیں کسی اور پلیٹ میں

بوند تک نہ گری تھی۔ ”اتفاق سے۔“ کوئی اس کے کان میں منہ ڈال کر نہ رہا تھا۔

جب منصر کھانے سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو ایلی نے دیکھا کہ پلنگ کے نیچے روٹی کا

سانوالہ اگلا پڑا ہے۔ ”اتفاق سے۔“ اتفاق سے۔ ”کمرے میں گئی ہوئی گھڑی؟

رہی تھی۔

ایلی رخصت ہونے لگا تو منصر نے کہا ”کب جا رہے ہیں آپ؟“

”کل“ ایلی نے جواب دیا۔

”جانے سے پہلے ملیں گے تو ضرور آپ“ وہ مسکرانے لگا۔

”جی ہاں۔“

”ہاں وہ ایک بات تو میں بھول گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کے علی پورے

ہوں۔ اتفاقاً وہاں جانا ہوا۔ تو پھر میں نے سوچا کہ چلے آپ کے محلے کو بھی دیکھتا چلوں۔

کے ہونٹوں پر ایک نہایت ولفریب مسکراہٹ تھی۔ ”اب مزید اتفاق سنئے جہاں میں

”جی“ ایلی نے جی جلاتے ہوئے کہا۔

”کارنس پر دیکھئے۔“ منصر بولا۔

”یہاں تو نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو دونوں الماریاں دیکھئے۔“

”پہلے نہیں ملتی تو چھوڑیے۔“ منصر نے چلا کر کہا۔

جونہی ایلی واپس کمرے میں داخل ہوا تو منصر نے شور مچا دیا۔ ”ابو ہو ہو۔“

بے تحاشا مسکرائے جا رہا تھا۔

”یہ دیکھ لیجئے میری پلاؤ کھانے کی گرم جوشی کا نتیجہ۔“ اس نے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔

ایلی کی روٹی کی پلیٹ پر گرا ہوا تھا۔ ”تمام روٹیاں تر ہو گئی ہیں۔“ ٹھہریے میں اور مگڑاؤ۔

”اماں“ اس نے اوپر آواز دی۔ ”دو ایک روٹیاں اور بھیج دیجئے میرے لیے۔ میں

ہوں الیاس صاحب کے ساتھ روٹی کھانے میں بھی مجھے ساتھ دینا چاہیے۔ ذرا جلدی کیجئے

منصر کی بامعنی مسکراہٹ کو دیکھ کر ایلی کے کان میں آواز آئی۔ ”اتفاق سے۔“

وہ سوچنے لگا کہ کہیں منصر کو روٹی کے نمک کا راز تو نہیں معلوم ہو گیا اس نے گلاس کی

آواز نہیں سنی تھی اس کے علاوہ پانی سے صرف روٹیاں بھیگی تھیں کسی اور پلیٹ میں

بوند تک نہ گری تھی۔ ”اتفاق سے۔“ کوئی اس کے کان میں منہ ڈال کر نہ رہا تھا۔

جب منصر کھانے سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو ایلی نے دیکھا کہ پلنگ کے نیچے روٹی کا

سانوالہ اگلا پڑا ہے۔ ”اتفاق سے۔“ اتفاق سے۔ ”کمرے میں گئی ہوئی گھڑی؟

رہی تھی۔

ایلی رخصت ہونے لگا تو منصر نے کہا ”کب جا رہے ہیں آپ؟“

”کل“ ایلی نے جواب دیا۔

”جانے سے پہلے ملیں گے تو ضرور آپ“ وہ مسکرانے لگا۔

”جی ہاں۔“

”ہاں وہ ایک بات تو میں بھول گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کے علی پورے

ہوں۔ اتفاقاً وہاں جانا ہوا۔ تو پھر میں نے سوچا کہ چلے آپ کے محلے کو بھی دیکھتا چلوں۔

کے ہونٹوں پر ایک نہایت ولفریب مسکراہٹ تھی۔ ”اب مزید اتفاق سنئے جہاں میں

ہل کر بولی۔  
 ”بھئی توج بھی بول دکھائے۔ آپ کو موقعہ دے رہے ہیں ہم۔“  
 ”بھئی مجھے راست گوئی پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔“ ایللی دبی زبان سے بولا۔  
 ”نہیں نہیں نہیں۔“ سادی چیخنے لگی۔ ”معافی معافی“ اور وہ قہقہے مارتی ہوئی اوپر چلی گئی۔  
 سادی کے جانے کے بعد اماں پھر بیٹھ گئی اور ایللی سے باتیں کرنے لگی۔

جب وہ منصر کے علی پور جانے کے متعلق بات کر رہی تھی تو سادی پھر درمیان میں آ  
 گئی اور معلوم ہے اماں علی پور میں الیاس صاحب کیوتروں کے ڈریوں میں رہتے ہیں۔“ وہ  
 نہ مار کر ہنسنے لگی۔ ”بھائی کہتے تھے ویسے تو وہ مکانات محلوں کی طرح ہیں لیکن پرانی وضع کے  
 بات آج کل ڈر بے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اماں“ وہ بولی ”مجھے ڈریوں میں رہنے والے کیوترو  
 ت ہند ہیں۔ بشرطیکہ اصل ہوں اور اصل تو سفید رنگ کے ہوتے ہیں ناں“ وہ قہقہہ مار کر

”فضول باتیں نہ کیا کر۔“ اماں ہنسی۔

”تو الیاس صاحب علمی باتوں کو اماں فضول سمجھ رہی ہیں۔“ وہ الیاس سے مخاطب ہوئی۔  
 ”میں کوئی الیاس صاحب پر تو فقرہ نہیں کس رہی۔ یہ تو کیوترو نہیں۔“  
 ”تو خاموش بھی ہوگی یا نہیں۔“ اماں نے مصنوعی غصے سے کہا۔  
 ”جیسے بھی آپ فرمائیں۔“ ویسے الیاس صاحب کی خصلت تو کوئے کی سی ہے چھین

لے کھاتے ہیں ویسے نہیں۔ کیوں الیاس صاحب۔“ سادی ہنسی۔

”کیا ہیں الیاس صاحب۔“ باجی داخل ہو کر پوچھنے لگی۔

”اب کیا تو بھی آگئی۔“ اماں نے باجی سے کہا۔

”میرے آنے میں تو کوئی حرج نہیں۔“ باجی نے کہا۔ ”البتہ سادی کو نہیں آنا چاہیے کیوں  
 باجی صاحب۔“

”کیوں مجھے کیوں نہیں آنا چاہیے۔“ سادی نے پوچھا۔

”اماں جان سے پوچھ لو۔“ باجی بولی۔

”اور اصل اس سارے فساد کی وجہ تسمیہ الیاس صاحب ہیں اور دیکھو تو یوں خاموش بیٹھے  
 ناچنے منہ میں زبان نہ ہو۔“ سادی نے کہا۔

اماں اسے بڑی محبت اور شفقت سے ملی۔ بات بات پر اس کی آنکھوں میں آنسو بہا  
 آتے اور وہ کمال محبت سے کہتی۔ ”تم نہیں جانتے بیٹا مجھے اپنی بیٹی سے کتنی محبت ہے۔“  
 لاڈلی بھی ہے اور تم بھی مجھے اتنے ہی پیارے ہو جتنی کہ وہ ہے لیکن۔“ وہ رک گئی۔  
 ”تمہیں کیا معلوم کہ بیٹیوں کی بات کیا ہوتی ہے اگر میری بیٹی کو تکلیف ہوئی تو میں تو  
 جی مر جاؤں گی۔“ بیٹے میرا دل ڈوب جاتا ہے اس خیال پر اس روز جب اماں آگیا تھا تو بیٹے  
 روز میرا دل بیٹھا رہا۔ دل سے ہول نہ جاتا تھا۔ اگر کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا۔“

عین اس وقت دروازے سے آواز آئی۔ ”اماں تو ویسے ہی غم کھاتی ہیں۔ جو کچھ بھی  
 اماں ہم دونوں پر بیٹے گا۔“ سادی سامنے آکر ہنسنے لگی ”کیوں الیاس صاحب“ اماں اسے دیکھ  
 گھبرا گئی۔ ”نہ بیٹی تو نہ آ۔ ویسے پردہ وردہ کی تو میں قائل نہیں لیکن سب بھائی براہمانے ہیں۔  
 کیا فائدہ۔“ وہ اٹھ کر سادی کی طرف بھاگی۔

”اچھا تو الیاس صاحب کل رات بڑی چالاکی سے روٹی پر پانی کا گلاس انڈیل دیا۔ پو  
 چلاک ہیں آپ۔“ سادی قہقہہ مار کر ہنسنی لگی ”اماں کل باجی نے الیاس صاحب کے لیے  
 روٹی پکائی تھی نا اس میں دبا کر نمک ٹھونس دیا تھا۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”تم ایللی کو دق کرتی ہو۔“ اماں ہنسی۔

”کیوں نہ کریں۔“ سادی قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ ”یہ تو صرف آپ کے سامنے بھیجی گئی۔  
 رہتے ہیں۔“

اوپر نگ سے باجی چلائی۔ ”اماں میں نے نہیں ڈالا تھا روٹی میں نمک سادی نے خود ڈا  
 تھا۔“

سادی قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ ”میں نے سوچا کہ الیاس صاحب کھائیں گے تو کچھ بھی نہ  
 شرم کے مارے اگر میں نمک ڈال دوں تو کیا حرج ہے۔ شرما تے بہت ہیں۔ دیکھ لیجئے اس وقت  
 بھی۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”اے ہے کیوں پیچھے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑی ہو تم۔“ اماں بولی۔

”بہت درد ہے آپ کو الیاس صاحب کا“ سادی نے کہا۔

”کیوں نہیں۔“ اماں بولی۔

”لیکن اماں یہ ان کی شرم جو ہے خالص ہاتھی دانت ہے یہ کیوں صاحب۔“ وہ الیاس سے

نہ تھا آتا تھا کہ ایللی شہزاد کے چنگل سے آزاد ہو سکتا ہے۔

بہن اور فرحت دونوں شہزاد کو غلط سمجھتی تھیں ان کا خیال تھا کہ شہزاد نے جان بوجھ کر ایللی کو مارا ہے تاکہ وہ اس کے ہاتھ کا پنجھی بنا رہے۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ایللی کو اپنا بنانے میں ہر ایک کا مقصد ہے اگرچہ انہیں کبھی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ وہ خصوصی مقصد کیا ہو سکتا ہے۔

ایللی کی بات ہی نہیں شہزاد کے متعلق محلے میں عام خیال تھا کہ اسے فوجوانوں کی نگاہوں پر بے لاشق ہے ان کا خیال تھا کہ شہزاد کو دیکھ کر محلے کے مرد اپنے ہوش و حواس کھو دیتے ہیں اور بے حواس کھونے کی تمام تر ذمہ داری شہزاد پر ہے۔

فرحت نے سب سے پہلے اس بات کا تذکرہ شہزاد سے کیا۔ غالباً اس کا مقصد یہ تھا کہ شہزاد کو پہچانے اور یہ بتا دے کہ جتنا کہ ایللی اب اس کے سحر سے آزاد ہو چکا ہے۔

”ہم نے کہا شہزاد۔“ وہ بولی ”سنا ہے یہاں لوگ ایللی کے متعلق تحقیق کرنے آئے تھے۔“

”ہاں“ شہزاد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”جانو نے بتایا تھا مجھے۔“

”کیا یہ سچ ہے؟“ وہ شہزاد کے قریب تر ہو کر بولی۔

”پوچھو ایللی سے مجھے کیا خبر۔“ شہزاد نے کہا۔

”میرا مطلب ہے۔“ فرحت نے کہا ”ایللی دل کی بات کب بتاتا ہے۔“

”نہی۔“ مجھے دل کی بات بتائے گا کیا؟“

”بالکل“ فرحت بولی۔

”تم سے اتنا ہی لگاؤ ہے کیا؟ اس نے پوچھا۔

”نہ تو کتنی سمجھتے ہیں۔“ فرحت نے کہا۔

”تو پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔“ شہزاد نہی۔

”کیوں؟“

”تمہاری خبر غلط ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا بس نہیں ہو سکتا۔“ وہ تہقیر مار کر نہی۔

فرحت کا رنگ فق ہو گیا۔

”وہی صورتیں ہیں۔“ شہزاد ہنستے ہوئے بولی۔ ”اگر ایللی کو مجھ سے لگاؤ ہے تو مجھے اس

پہچاننے کی ضرورت نہیں اور اگر نہیں ہے تو پھر وہ کیوں بتانے لگا۔“

”کوئے بولا نہیں کرتے۔“ ایللی نے دبی زبان سے کہا ”یہ مینا کا کام ہے۔“

”جواب دو بانی تم سے کہہ رہی ہیں۔“ سادی ہنسنے لگی ”اگرچہ مثل غلط دی ہے انہوں نے مجھ سے کوئی پوچھے تو میں کموں میری پیاری بانی تو جل پری ہے۔ ہائے اتنی پیاری ہے میری بانی کہ میرا دم لکھتا ہے البتہ کبھی کبھار ٹرنک پر گر کر بے ہوش ہو جاتی ہے اور سب ملایا کر دیتی ہے۔“ یہ کہہ کر سادی تھمتے لگتی ہوئی اوپر کی طرف بھاگی۔

سادی کے جانے کے بعد اماں کو خدا حافظ کہہ کر ایللی چلا آیا۔

## دل کی بات

جب ایللی علی پور پہنچا تو ہاجرہ اور فرحت کاہل سے واپس آ چکی تھیں۔ ان کی آمد کی وجہ سے گھر میں شور مچا رہا تھا۔ عورتیں آ جا رہی تھیں۔ فرحت اور ہاجرہ دونوں افغانستان کے متعلق یوں باتیں کر رہی تھیں جیسے ولایت سے ہو کر آئی ہوں ہر بات پر انگلیاں ہونٹوں پر رکھ لی جاتیں۔ سینے تمام لیے جاتے ”ہے میں مر گئی ایسا۔“

”ہاں بسن اور یہ تو کچھ بھی نہیں۔“

ان کے واپس آنے کے بعد ایللی کا شہزاد کی طرف رہنے کا کوئی جواز نہ رہا تھا اس بات پر ہم بے حد مسرور تھی۔ لیکن شہزاد کو اس کی مطلق پروا نہ تھی اس کے لیے گویا کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اٹنا وہ دن میں چار ایک مرتبہ اسی طرح داورے کی چال پر ناچتی ہوئی آتی۔ ”کیوں گھروالو کیا ہو رہا ہے وہ بدھو میاں کہاں ہے صبح سے آیا کیوں نہیں بہ

اب تو فرحت بھی طعنے دے دے کر آتا چکی تھی۔ البتہ محلے والیاں ہاجرہ اور فرحت کے سامنے شہزاد کے متعلق اشاروں میں باتیں کرتی رہیں۔

چار ایک دن کے بعد ہاجرہ اور فرحت ایللی کے گرد آکھڑی ہوئیں۔

ہاجرہ بولی ”ایللی ایک بات پوچھوں سچ بتاؤ گے۔“

”کیا ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”جانو کہہ رہی تھی کچھ لوگ یہاں تمہارے متعلق تحقیق کرنے آئے تھے۔“

ایللی کی زبان سے سادی کے خاندان کی بات سن کر فرحت اور ہاجرہ کے خوشی سے ہاتھ پہنا پھول گئے۔ ”کیا یہ سچ ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ وہاں بات طے ہو جائے۔“

”کیا واقعی انہی

”کیوں ایلی۔“ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولی جو لمحہ کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔  
 نے ”فرحت نے ہاتھ جوڑ دیے۔“ خدا کے لیے اسے نہ بتانا۔“  
 ”بتاتی تو نہیں پوچھتی ہوں۔“ وہ ہنسی۔ ”کیوں ایلی؟ وہ بولی ”وہ لاہور والی عورت  
 کیسی ہے وہ؟“  
 ”کیا مطلب؟“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”جس کے عزیز یہاں تحقیق کرنے آئے تھے تھانیدار کے گھر کیسی ہے وہ؟“  
 ”بہت خوب صورت ہے۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”مجھ سے بھی زیادہ۔“ وہ فرحت کی طرف دیکھ کر بامعنی انداز سے بولی۔  
 ”کوئی مقابلہ ہی نہیں۔“ ایلی بولا۔  
 ”یہی تمہارا مطلب ہے مجھ سے وہ مقابلہ نہیں کر سکتی۔“ شنراؤ نے شرارت سے کہا۔  
 ”تم تو ہندو ہو۔“ ایلی بولا۔ ”تمہارے ماتھے پر بندی ہے۔“  
 ”اور وہ مسلمان ہے۔“  
 ”ہاں ہاں۔“  
 ”مسلمان تو خوب صورتی میں ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیوں فرحت۔“ شنراؤ نے کہا۔  
 ”توبہ“ فرحت بولی۔ ”تو تو بات کا بتکلو بنا دیتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں ایلی وہ لوگ پر  
 کون؟“  
 ”بڑے اچھے لوگ ہیں۔“  
 ”خاندان کیا ہے۔“ فرحت نے پوچھا۔  
 ”خاندان کا تو پتہ نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”لیکن سنا ہے اس کے ابا کسی ریاست میں رہتے  
 ہیں۔“  
 ”ارے“ شنراؤ نے منہ بتایا۔ ”وزیر۔“  
 ”بھائی دو ہیں ایک بیر شتر ہیں اور دوسرے بڑے عمدے پر ہیں۔“  
 ”ارے“ شنراؤ نے پھر منہ بتایا۔  
 ”تو پھر ہمیں خاطر میں کیوں لانے لگے وہ۔“ فرحت بولی۔  
 ”خاطر میں نہ لاتے تو پوچھ گچھ کیوں ہوتی۔“ شنراؤ نے کہا۔

”کیوں ایلی۔“ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولی جو لمحہ کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔  
 نے ”فرحت نے ہاتھ جوڑ دیے۔“ خدا کے لیے اسے نہ بتانا۔“  
 ”بتاتی تو نہیں پوچھتی ہوں۔“ وہ ہنسی۔ ”کیوں ایلی؟ وہ بولی ”وہ لاہور والی عورت  
 کیسی ہے وہ؟“  
 ”کیا مطلب؟“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”جس کے عزیز یہاں تحقیق کرنے آئے تھے تھانیدار کے گھر کیسی ہے وہ؟“  
 ”بہت خوب صورت ہے۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”مجھ سے بھی زیادہ۔“ وہ فرحت کی طرف دیکھ کر بامعنی انداز سے بولی۔  
 ”کوئی مقابلہ ہی نہیں۔“ ایلی بولا۔  
 ”یہی تمہارا مطلب ہے مجھ سے وہ مقابلہ نہیں کر سکتی۔“ شنراؤ نے شرارت سے کہا۔  
 ”تم تو ہندو ہو۔“ ایلی بولا۔ ”تمہارے ماتھے پر بندی ہے۔“  
 ”اور وہ مسلمان ہے۔“  
 ”ہاں ہاں۔“  
 ”مسلمان تو خوب صورتی میں ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیوں فرحت۔“ شنراؤ نے کہا۔  
 ”توبہ“ فرحت بولی۔ ”تو تو بات کا بتکلو بنا دیتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں ایلی وہ لوگ پر  
 کون؟“  
 ”بڑے اچھے لوگ ہیں۔“  
 ”خاندان کیا ہے۔“ فرحت نے پوچھا۔  
 ”خاندان کا تو پتہ نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”لیکن سنا ہے اس کے ابا کسی ریاست میں رہتے  
 ہیں۔“  
 ”ارے“ شنراؤ نے منہ بتایا۔ ”وزیر۔“  
 ”بھائی دو ہیں ایک بیر شتر ہیں اور دوسرے بڑے عمدے پر ہیں۔“  
 ”ارے“ شنراؤ نے پھر منہ بتایا۔  
 ”تو پھر ہمیں خاطر میں کیوں لانے لگے وہ۔“ فرحت بولی۔  
 ”خاطر میں نہ لاتے تو پوچھ گچھ کیوں ہوتی۔“ شنراؤ نے کہا۔

معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے اس بات پر غصہ آرہا ہو کہ شہزاد سے عہد و پیمان کے بعد اب وہ یوں اپنا دامن چھا رہا ہے۔ اس کی اتنی جرات! ایک روز ہی انہیں ایک خط موصول ہوا یہ خط منصر کی والدہ کی طرف سی تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ منصر کے بڑے بھائی رانا کی شادی پر بلایا تھا۔

اب وہ رانا کی شادی پر جانے کے لیے تیار ہوئے تو شہزاد کہنے لگی۔ ”اے ہے مجھے بھی جانے پڑا میرا بھی جی چاہتا ہے کہ لڑکی کو دیکھوں۔“

”ہاں اجڑہ بولی۔“ ”یہ تو اور بھی اچھا ہے کم از کم ان سے بات تو کرو گی۔“

”مجھے تو جیسی اس قسم کی بات کرنا نہیں آتی مشکل میں پڑ جاتی ہوں۔“

”اے تو کیس جاتی ہے تو وہاں دلہن بن کر بیٹھ رہتی ہے۔“ ایللی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہر شادی میں اہل اور جہاں بیٹھ جائے وہاں سے اشنا مشکل ہو جاتا ہے اسے۔“

اس روز پہلا موقع تھا جب شہزاد نے اپنی طبعی بے نیازی چھوڑ کر اس قسم کی درخواست کی۔ ایللی اس کی بات سن کر حیران ہوا تھا اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ سادی کو ملنے کے لیے کس قدر توجہ دیتی تھی۔ شہزاد کو دیکھ کر راجہ بھی نہ رہ سکی۔ وہ بھی ساتھ تیار ہو گئی۔

جب وہ جانے لگے تو بیگم ان کے ساتھ چل پڑی۔

”اے تم کیا ساتھ چلو گی۔“ شہزاد نے پوچھا۔

”میں کیوں نہ چلوں۔“ بیگم بولی۔

”بچے گھر میں کون رہے گا۔“ شہزاد نے پوچھا۔

”میں کیا گھر کی ذمہ دار ہوں جس کا گھر وہی جانے۔“

”لیکن اہل تیرا وہاں کیا کام۔“ شہزاد نے پوچھا۔

”مجھے تو ایک کام ہیں لاہور میں۔ سانوری کب سے بلا رہی ہے اسے بھی تو ملنا ہے۔“

اور جب وہ آگے میں سوار ہوئے تو ایللی نے بیگم کی شکل دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ بڑے غصے میں تھی۔ لیکن اس وقت ایللی کو یہ خیال نہ آیا کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے؟

رانا میں اگرچہ منصر کی سی خصوصیات نہ تھیں لیکن پہلی مرتبہ ہی اسے مل کر ایللی نے محسوس کیا کہ وہ ایک منسار اور بے تکلف شخص ہے۔

”چھ تو آپ ہیں ایللی۔“ وہ اسے دیکھ کر بولا۔ ”ایللی سے میں سمجھا تھا کہ کوئی تیلی قسم کی چیز

”غلط“ شہزاد بولی۔ ”جہاں بات کرنا چاہوں وہاں ہو نہیں پاتی۔ میں تو نہ بات کی دوسری طرف کی بے مصرف باتوں میں البتہ ہوں۔“

کپارٹمنٹ کے ضمنی استحقان میں ایللی کامیاب ہو گیا۔ اب کی بار منصر کے آگے اسے نتیجے سے آگاہ کر دیا۔ اس لیے لاہور جانے کا اسے موقع نہ ملا۔

اس دوران میں ہاجرہ اور فرحت ایک بار لاہور جا کر سادی کی والدہ سے مل چکی تھیں ہاجرہ ان لوگوں سے مل کر بے حد خوش ہوئی تھی۔ ”ہائے وہ تو بہت ہی اچھے لوگ ہیں۔“ ایللی نے کہا تھا۔ ”امیر کبیر ہوتے ہوئے اتنے سادہ اور منسار ہیں وہ۔ مجھے تو یوں دکھائی ہے کہ بات بن جائے گی بس لڑکی کے ابا سے بات کرنی باقی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ان کی خاطر لینے کے بعد وہ ہمیں بتائیں گے ہے اگر ایللی کے ابا نے بات نہ مانی تو کیا ہو گا۔“

ہاجرہ نے لاہور جا کر سادی کی والدہ کے سامنے اپنے تمام حالات صاف صاف بیان کر دیے تھے جیسے کہ اس کی عادت تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ”بہن ہم تو غریب لوگ ہیں یہ تو آپ کی مہربانی ہے جو ہم پر نظر عنایت کی ہے۔ ورنہ ہماری کیا حیثیت ہے نہ اپنا گھر ہے نہ وہ ہے ساری زندگی سوکوں کی خدمت میں گزاری بس صرف لے دے کر ایک ایللی ہے وہی میری ملامت ہے ایللی ساری امیدیں ہیں لیکن آج کل کی اولاد کب امیدوں پر اترتی ہے اپنے اپنے نصیب پر نصیب کا کسی سے کیا گلہ باقی رہے ہم تو ہمارا فکر نہ کیجیے ہم تو جیسے ایللی کے خادم ہیں دے دیے سادی کے سمجھ لیجئے۔“

”ہمارے سر آنکھوں پر رہے گی لیکن ہم اس قابل نہیں کہ چاؤ جو نچلے کر کیس ہم تو نڈا خدمت گزاری کر سکتے ہیں۔“

جب وہ دونوں لاہور سے واپس آئی تھیں تو شہزاد اور بیگم ان کے گلے کے ہار میں گئی تھیں ان دونوں کے سوالات ختم ہونے ہی میں نہ آتے تھے۔ ”لڑکی کیسی ہے کتنے بن بھائی ہیں ان کے ابا کیا کرتے ہیں؟“ شہزاد کے انداز سے دلچسپی چلتی تھی لیکن ایللی کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ان تفصیلات کو جاننے پر اسے دکھ ہو رہا ہو۔

ایللی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سادی کے متعلق بیگم کا رویہ ایسا کیوں تھا؟ وہ خوش ہونا چاہیے تھا کہ ایللی اس کی بیٹی کے گھر سے مل جائے گا اور بیگم کے خیال کے مطابق وہ شہزاد کے گھر کی تباہی کا باعث تھا تو اس تباہی سے بچنے کی صرف یہی ایک صورت تھی۔

ہو گی لیکن آپ تو بڑے معقول آدمی معلوم ہو رہے ہیں۔ اور جناب کو معلوم ہونا چاہیے  
میں دولہا میاں ہوں جس کے دم قدم سے یہ رونق ہو رہی ہے۔“ وہ ہنسنے لگا  
وہ ایک بھر پور جسم کا آدمی تھا۔ پر رعب چرا کرتی جسم لیکن اس کے چہرے پر لاہور  
تھی جو منصر کی خصوصیت تھی۔

شادی کی وجہ سے سفید منزل میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مسمن کا دن پڑا ہو۔ ہر  
مصروف تھا سب بیک وقت بات کرتے تھے۔ جسے شاید کوئی نہ سنتا تھا۔ اور اس کے علاوہ  
بھانت کے لوگ آ جا رہے تھے وہ شاید غالباً اس کے رشتے دار تھے۔ اہلی حیران تھا کہ کد  
رشتے دار کہاں سے آ گئے۔ اہلی کو یہ تو معلوم تھا کہ وہ مکان کرائے کا نہیں بلکہ ان کا اپنے  
لیکن اسے اس بات کا علم نہ تھا کہ منصر کہاں کے رہنے والے تھے اگر وہ لاہور کے رہنے والے  
تھے تو پھر گھر میں سبھی لوگ اردو کیوں بولتے تھے اور پھر ان کا لہجہ اہل زبان کا سا تھا اور نہ  
نمایت مذہب اور شستہ تھی۔

ان حالات میں ظاہر تھا کہ سادی کو دیکھنے یا ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اہلی کی خواہش تھی  
کہ سادی سے ملے اسے یاد دلائے کہ وہ اپنے چھینے کی شرط جیتنے کی وجہ سے اس کی حیثیت  
ہے اور جو حکم وہ دے گا سادی کو اسے ماننا پڑے گا۔ سادی نے خود ہی کہا تھا جو مانگو گے  
کئی ایک دن وہ سوچتا رہا کہ کیا مانگوں دوپٹہ تو لے چکا اب قیص لینے کا فائدہ؟ اہلی نے کہا  
سادی کا دوپٹہ سو گھا تھا لیکن اس میں سادی کے جسم کی بو نہ تھی۔ اس میں سینٹ کی بو تھی  
تھی۔ حالانکہ وہ کئی ایک بار سادی سے ملا تھا لیکن اس نے کبھی سادی کے جسم کو بو محسوس نہ  
تھی۔ شزاؤ کے جسم کی بو کو محسوس کر کے نہ جانے اہلی کو کیا ہو جاتا تھا اس کی آنکھیں اٹھتی  
تھیں۔

نہیں نہیں قیص مانگنا بے کار ہے تو پھر کیا مانگوں؟ اس نے بہت سوچا تھا کئی ایک دن  
بعد دھنچتا اسے خیال آیا تھا۔ ہاں وہ خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ سادی سے کہوں گا کہ مجھ سے  
اکیلی ملے۔ گھر سے باہر مقبرے یا شایمار میں اور کم از کم دو گھنٹے میرے ساتھ رہے۔  
ہاجرہ فرحت رابعہ شزاؤ اور بیگم کو کوٹھے پر جاتے ہوئے اس نے حسرت سے دیکھا تھا  
کہ وہ بھی اوپر جا سکتا۔ شاید اہل اسے بلائیں۔ لیکن اتنے رشتہ داروں کی موجودگی میں  
کس طرح بلا سکتی تھیں۔ اہل کو تو شاید اپنا ہوش بھی نہ تھا چونکہ وہ انتظامات میں مصروف

ابہ شکر ہے

شزاؤ نے ایک دن پہلے رانا اہلی کے پاس آ بیٹھا۔ کہنے لگا ”ایسا صاحب کل برات میں کیا  
پڑ بلا نہیں گئے۔“

”نہر بلا“ اہلی نے رانا کی طرف استفسار بھری نگاہ سے دیکھا۔

”نہر بلا کا مطلب ”بیٹھ مین“ ہے“ وہ بولا۔

”نہر بلا کا مطلب ہے۔“ اہلی ہنسنے لگا۔ ”کہ سرے لگا کر میرا کارٹون بنایا جائے۔“



”نہیں تو رات نامے کما“ ہمارے ہاں نہ سرے ہوتے ہیں اور نہ مٹھوڑے پر سوار ہوتے۔  
 ”تو پھر“ ایلی نے پوچھا۔

”برات سفید منزل سے چلے گی اور موتی محلہ پر جا کر رکی جائے گی جہاں ہماری بہن  
 بیگم رہتی ہیں۔ برات کے آگے بینڈ بجانا ہو گا۔ بینڈ کے پیچھے دولہا اور شہرہ بلا ہوں گے  
 کے پیچھے براتی نہ کوئی ہار ہو گا نہ سرا۔ اور ابھی لوگ پیدل ہوں گے۔“  
 ”اچھا۔۔۔“ ایلیاس سوچنے لگا۔

”یہ تو آپ کی مرضی پر موقوف ہے کہ شہرہ بلا بنیں یا نہ بنیں۔ میں نے تو بھی نہ  
 بھلے کی کمی ہے اگر تمہیں منظور نہیں تو نہ سہی۔“  
 ”میرے بھلے کی؟“ ایلی نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”ہاں ہاں۔“  
 ”وہ کیسے؟“  
 ”ایک سنہرا موقعہ ہے اگر فائدہ اٹھانا چاہو تو۔۔۔“ رات نامے شرارت بھری مکران  
 جملہ مکمل کر دیا۔

”میں نہیں سمجھا۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”ویسے بات معمولی سی ہی لیکن صاحب ذوق کے لیے بڑی بات ہے۔“ وہ کہنے لگا۔  
 راستے میں جتنی کھڑکیاں اور جھروکے ہیں برات گزرے گی تو وہ سب کھلیں گی جو کھلی نہ  
 کھلی۔ وہ بھی کھل جائے گی اس وقت اور جو کبھی کھڑکی میں نہیں آئی وہ بھی کھڑکی میں آکر  
 گی اور دولہا اور شہرہ بلا کو دیکھے گی رنگ رنگ کی آنکھیں طرح طرح کی نگاہیں دولہا اور شہرہ  
 پر مرکوز ہو جائیں گی۔ صرف یہی نہیں۔ ہر کوئی کوشش کرے گی کہ ان کو صرف دیکھے  
 بلکہ اپنا آپ دکھائے بھی اور وہ جب خود اپنا آپ دکھاتی ہیں تو کیا کیا پوز بننے ہیں کیا کیا پوز  
 بننے لگا۔ اپنا خوب صورت ترین حصہ دکھاتی ہیں خوب صورت ترین انداز اگر شہرہ بلا  
 ہمارے ساتھ چلو گے تو لاہور کی ساری پدائیاں اور نہ جانے کون کون تمہاری نگاہوں کے  
 ا۔ ستادہ ہوں گی اور تمہیں اندازہ ہو گا کہ میاں کیا کیا چیز چھپی پڑی ہے۔ اسے صاحب  
 اف“ رات نامے اس ڈرامائی انداز سے جھرجھری لے کر ایلی کے جسم میں ابھی ایک لہر دوڑا۔  
 ”اگر تم صاحب ذوق ہو تو شاید تمہارے لیے کوئی دروازہ مستقل طور پر کھل جائے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”ویسے بات معمولی سی ہی لیکن صاحب ذوق کے لیے بڑی بات ہے۔“ وہ کہنے لگا۔  
 راستے میں جتنی کھڑکیاں اور جھروکے ہیں برات گزرے گی تو وہ سب کھلیں گی جو کھلی نہ  
 کھلی۔ وہ بھی کھل جائے گی اس وقت اور جو کبھی کھڑکی میں نہیں آئی وہ بھی کھڑکی میں آکر  
 گی اور دولہا اور شہرہ بلا کو دیکھے گی رنگ رنگ کی آنکھیں طرح طرح کی نگاہیں دولہا اور شہرہ  
 پر مرکوز ہو جائیں گی۔ صرف یہی نہیں۔ ہر کوئی کوشش کرے گی کہ ان کو صرف دیکھے  
 بلکہ اپنا آپ دکھائے بھی اور وہ جب خود اپنا آپ دکھاتی ہیں تو کیا کیا پوز بننے ہیں کیا کیا پوز  
 بننے لگا۔ اپنا خوب صورت ترین حصہ دکھاتی ہیں خوب صورت ترین انداز اگر شہرہ بلا  
 ہمارے ساتھ چلو گے تو لاہور کی ساری پدائیاں اور نہ جانے کون کون تمہاری نگاہوں کے  
 ا۔ ستادہ ہوں گی اور تمہیں اندازہ ہو گا کہ میاں کیا کیا چیز چھپی پڑی ہے۔ اسے صاحب  
 اف“ رات نامے اس ڈرامائی انداز سے جھرجھری لے کر ایلی کے جسم میں ابھی ایک لہر دوڑا۔  
 ”اگر تم صاحب ذوق ہو تو شاید تمہارے لیے کوئی دروازہ مستقل طور پر کھل جائے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”ویسے بات معمولی سی ہی لیکن صاحب ذوق کے لیے بڑی بات ہے۔“ وہ کہنے لگا۔  
 راستے میں جتنی کھڑکیاں اور جھروکے ہیں برات گزرے گی تو وہ سب کھلیں گی جو کھلی نہ  
 کھلی۔ وہ بھی کھل جائے گی اس وقت اور جو کبھی کھڑکی میں نہیں آئی وہ بھی کھڑکی میں آکر  
 گی اور دولہا اور شہرہ بلا کو دیکھے گی رنگ رنگ کی آنکھیں طرح طرح کی نگاہیں دولہا اور شہرہ  
 پر مرکوز ہو جائیں گی۔ صرف یہی نہیں۔ ہر کوئی کوشش کرے گی کہ ان کو صرف دیکھے  
 بلکہ اپنا آپ دکھائے بھی اور وہ جب خود اپنا آپ دکھاتی ہیں تو کیا کیا پوز بننے ہیں کیا کیا پوز  
 بننے لگا۔ اپنا خوب صورت ترین حصہ دکھاتی ہیں خوب صورت ترین انداز اگر شہرہ بلا  
 ہمارے ساتھ چلو گے تو لاہور کی ساری پدائیاں اور نہ جانے کون کون تمہاری نگاہوں کے  
 ا۔ ستادہ ہوں گی اور تمہیں اندازہ ہو گا کہ میاں کیا کیا چیز چھپی پڑی ہے۔ اسے صاحب  
 اف“ رات نامے اس ڈرامائی انداز سے جھرجھری لے کر ایلی کے جسم میں ابھی ایک لہر دوڑا۔  
 ”اگر تم صاحب ذوق ہو تو شاید تمہارے لیے کوئی دروازہ مستقل طور پر کھل جائے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”ویسے بات معمولی سی ہی لیکن صاحب ذوق کے لیے بڑی بات ہے۔“ وہ کہنے لگا۔  
 راستے میں جتنی کھڑکیاں اور جھروکے ہیں برات گزرے گی تو وہ سب کھلیں گی جو کھلی نہ  
 کھلی۔ وہ بھی کھل جائے گی اس وقت اور جو کبھی کھڑکی میں نہیں آئی وہ بھی کھڑکی میں آکر  
 گی اور دولہا اور شہرہ بلا کو دیکھے گی رنگ رنگ کی آنکھیں طرح طرح کی نگاہیں دولہا اور شہرہ  
 پر مرکوز ہو جائیں گی۔ صرف یہی نہیں۔ ہر کوئی کوشش کرے گی کہ ان کو صرف دیکھے  
 بلکہ اپنا آپ دکھائے بھی اور وہ جب خود اپنا آپ دکھاتی ہیں تو کیا کیا پوز بننے ہیں کیا کیا پوز  
 بننے لگا۔ اپنا خوب صورت ترین حصہ دکھاتی ہیں خوب صورت ترین انداز اگر شہرہ بلا  
 ہمارے ساتھ چلو گے تو لاہور کی ساری پدائیاں اور نہ جانے کون کون تمہاری نگاہوں کے  
 ا۔ ستادہ ہوں گی اور تمہیں اندازہ ہو گا کہ میاں کیا کیا چیز چھپی پڑی ہے۔ اسے صاحب  
 اف“ رات نامے اس ڈرامائی انداز سے جھرجھری لے کر ایلی کے جسم میں ابھی ایک لہر دوڑا۔  
 ”اگر تم صاحب ذوق ہو تو شاید تمہارے لیے کوئی دروازہ مستقل طور پر کھل جائے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”ویسے بات معمولی سی ہی لیکن صاحب ذوق کے لیے بڑی بات ہے۔“ وہ کہنے لگا۔  
 راستے میں جتنی کھڑکیاں اور جھروکے ہیں برات گزرے گی تو وہ سب کھلیں گی جو کھلی نہ  
 کھلی۔ وہ بھی کھل جائے گی اس وقت اور جو کبھی کھڑکی میں نہیں آئی وہ بھی کھڑکی میں آکر  
 گی اور دولہا اور شہرہ بلا کو دیکھے گی رنگ رنگ کی آنکھیں طرح طرح کی نگاہیں دولہا اور شہرہ  
 پر مرکوز ہو جائیں گی۔ صرف یہی نہیں۔ ہر کوئی کوشش کرے گی کہ ان کو صرف دیکھے  
 بلکہ اپنا آپ دکھائے بھی اور وہ جب خود اپنا آپ دکھاتی ہیں تو کیا کیا پوز بننے ہیں کیا کیا پوز  
 بننے لگا۔ اپنا خوب صورت ترین حصہ دکھاتی ہیں خوب صورت ترین انداز اگر شہرہ بلا  
 ہمارے ساتھ چلو گے تو لاہور کی ساری پدائیاں اور نہ جانے کون کون تمہاری نگاہوں کے  
 ا۔ ستادہ ہوں گی اور تمہیں اندازہ ہو گا کہ میاں کیا کیا چیز چھپی پڑی ہے۔ اسے صاحب  
 اف“ رات نامے اس ڈرامائی انداز سے جھرجھری لے کر ایلی کے جسم میں ابھی ایک لہر دوڑا۔  
 ”اگر تم صاحب ذوق ہو تو شاید تمہارے لیے کوئی دروازہ مستقل طور پر کھل جائے۔“

نہلے ساتھ ہونے نے مجھے خوب صورت بنا دیا۔ آج وہ دھوم مچی ہے اپنی کہ حد ہے اور یہ ننداری وجہ سے ہوا۔" رانا ہنسنے لگا۔

سادی سامنے کھڑی ہنس رہی تھی۔

محل کھانا — "سادی سامنے کھڑی ہنس رہی تھی۔" "مدر میں سادری سے کستی تھی ہے تجھے ایللی میں کیا دکھائی دیا جو تو اس پر رجبہ گئی۔" "پروانو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

تو یہ ہے وہ لڑکا جس کا تم نے انتخاب کیا ہے۔" موتی محلے کی کھڑکیوں سے آوازیں آرہی تھیں۔ "یہ؟" کوئی ہونٹ نکال رہی تھی۔ "ارے" کسی کی نگاہ میں تحقیر جھلک رہی تھی۔ "تو یہ بہن ہے۔" ڈھولک سر پیٹ رہی تھی۔

رانا گ موڑ

مٹی پور واپس جانے کے لیے جب وہ شیش پر پہنچے تو ایللی نے دیکھا کہ بیگم کے چہرے پر نلکھڑاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ بیگم نے تحقیر بھری نگاہ ایللی پر ڈالی اور پھر ہنس کر بولی "تم بھی بازار کو گئے کہ مجھے ساتھ لائے تھے۔" ایللی اس کی بات سن کر گھبرا گیا۔

"میں نے ان لوگوں پر وہ سکہ بٹھایا ہے کہ یاد کریں گے۔ دھاک جمادی ہے آصفیوں۔" وہ ہنس۔

ایللی کو معلوم نہ تھا کہ بیگم کا وار چل گیا ہے دراصل اس کے ذہن میں یہ بات آئی نہ سکتی کہ بیگم اس نے تعلق کو توڑنے کی کوشش کرے گی اس کا تو یہ خیال تھا کہ بیگم کی کوشش ہو کر ایللی ان کے سر سے ٹل جائے اور اسے سر سے ٹالنے کا اس سے بہتر موقع کیا ہو سکتا تھا۔ سب افراد میں جو برات پر گئے تھے اگر کسی کا مفاد اس تعلق کو توڑنے سے وابستہ تھا تو وہ لڑکھو ہو سکتی تھی لیکن بیگم —

ایللی کو معلوم نہ تھا کہ بیگم نے موقع پا کر سادی کی والدہ سے ایسے موقع پر بات کی تھی جب ان کی تہ تیہ ہو موجود تھی۔ اس نے کہا "ایللی لڑکا تو اچھا خاصہ ہے لیکن یہ نیل منڈھے چڑھتی ہے جس میں تو بچ کھوں گی لڑکے کو میری اپنی بیٹی سے محبت ہے۔ اس بات کو سبھی جانتے ہیں۔ لیکن تم ساتھ تھے تو اپنی وہ حیثیت پیدا ہوئی جو شاید کبھی نہ ہو سکتی تھی۔"

کی کہ وہ جلوس سے نکل کر سامنے کمرے میں جا بیٹھے لیکن رانا نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "واہ! وہ بولا" یہی تو نقطہ عروج ہے اور نقطہ عروج کو چھوڑ کر جانا — دولہ صاحب نے مضبوطی سے اسے پکڑے رکھا اور آنکھوں سے اوپر کی کھڑکیوں کی طرف آتش بازی مار رہا۔

"میل تو قیامتیں چھپی ہوئی ہیں۔ طوفان ہیں فتنے ہیں۔ رانا مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر بیڈنے سلائی کی آخری سرس فضا میں پھیلا کر باجے ہونٹوں سے الگ کر دیے اور سحر ٹوٹ گیا۔ اس پر سب کمرہ کی طرف بڑھے اور رانا اور ایللی کا ساتھ چھوٹ گیا۔ جب وہ کھانا کھا رہے تھے تو رانا نے ایک لڑکے کو بھیج کر الیاس کو بلا بھیجا۔ الیاس نے کہ شاید رسم کے مطابق اسے دولہا کے پاس بیٹھنا چاہیے اس لیے وہ بادل خواستہ وہاں چلا اگرچہ مزید نگاہوں پر چڑھنے سے وہ گھبرا رہا تھا۔

"الیاس صاحب" رانا اس کی طرف جھک کر بولا۔ "شکریہ شکریہ الیاس صاحب" "کیوں۔" ایللی نے پوچھا۔

"آج بھی تم نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے جسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔" "احسان کی بات بالاجنبی کی بات کر رہے ہیں آپ" ایللی نے پوچھا۔ "ہاں ہاں۔"

"لیکن اس میں احسان کی کیا بات تھی؟" "تھی" رانا مسکرایا۔

"آپ تو کہتے تھے انا اس میں میرا فائدہ ہے۔"

"اور کیا کہتے بھائی۔" رانا نے شرارت بھری نظر ایللی پر ڈالی۔ "میں نہیں سمجھتا۔" ایللی بوکھلا گیا۔

"بات یہ ہے بھی کہ تم شہ بالا نہ بننے تو ظاہر ہے کہ میرے کسی بھائی کو بنا دیا جاتا تو میرے بھائی تم جانتے ہو سبھی خوب صورت ہیں کم از کم مجھ سے زیادہ خوب صورت ہیں۔" جب ان میں سے کوئی برات میں میرے ساتھ ساتھ ہوتا۔ اور دیکھنے والے اسے دیکھتے تو ظاہر ہے کہ اپنی حیثیت تو ختم ہو جاتی۔ لوگ کہتے "اے ہے دولہا تو بس اللہ کا فضل ہی سمجھ لو۔" "لیکن تم ساتھ تھے تو اپنی وہ حیثیت پیدا ہوئی جو شاید کبھی نہ ہو سکتی تھی۔"

خون کا اثر نہیں جاتا ایللی کے باپ کو اب تک عورتوں کا شوق ہے چار بیویاں کر چکا ہے۔  
ایلی کو خبر نہ تھی کہ اتنی سی سرسری بات کر کے بیگم نے حالات کا دھماکا ہی بدل دیا تو  
اس کی زندگی کا رخ ایک ایسے موڑ کی طرف بدل دیا گیا تھا جس طرف بدنامی، رسوائی اور  
عزت کی مہیب چٹانیں کھڑی تھیں۔  
دراصل بیگم کی اپنی زندگی تباہ ہو چکی تھی اور اس کی تباہی کا باعث اس کی اپنی جہتی  
میری تھی۔ اسی وجہ سے جنس سے اسے نفرت تھی براہ راست یا بالواسطہ ہر جنسی تعلق کو توڑ  
میں درپردہ خوشی محسوس کرتی تھی۔

علی پور واپس جاتے ہوئے بیگم ایک سکندر تھی اور ایللی اور شنراؤ شریف اور سادی کے  
تاراج شدہ ریاستیں تھیں جو اس کے قدموں میں پھیلی ہوئی تھیں اس کا دل فخر سے دھڑک  
تھا۔ کیا یاد کرو گے کیا یاد کرو گے۔ گاڑی سبک رفتاری سے علی پور کو چلی جا رہی تھی۔  
ہاجرہ کے چہرے پر مسکراہٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ وہ بار بار اپنی ناک کی طرف ہر  
اور مسکراتی اور پھر ناک کی طرف دیکھنے لگتی۔ فرحت مسرور تھی لیکن اس کی سرست میں پریشانی  
اور فکر کا عنصر نمایاں تھا غالباً ”وہ سوچ رہی تھی کہ بیگم اور رابعہ خود اپنے دکھ میں گم تھیں۔  
طرح ایک روز اس کی اپنی شادی ہوئی تھی۔ اس کا خاندان محلے میں سب سے زیادہ خوب صورت  
اور لائق تھا لیکن — وہ عیسائی ہو چکا تھا اور اب وہیں لاہور میں ایک میم کے ساتھ زندگی گزار  
کر رہا تھا اور رابعہ کی گود میں اس کا اکلوتا بیٹا ایسا تھا جس کے پیدا ہوتے ہی رابعہ کے سال  
سورج غروب ہو چکا تھا۔ وہ محبت بھرے جذبات سے امی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا ہم نام  
تھا اسے گھر میں پیار سے سب امی کہتے تھے۔ کب امی بڑا ہو گا۔ دولہن بیاہ کر لائے گا اور رابعہ  
زندگی کا اندھیرا دور ہو گا۔ کبھی کبھی رابعہ سر اٹھا کر ہاجرہ کی طرف دیکھتی تو معاً ”اسے یاد آتا  
کہاں ہے اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی اور اس کا حسین چہرہ سرخ ہوتا  
اور وہ کہتی ”ہے کتنے اچھے لوگ تھے کتنے سادہ اور پیار کرنے والے اور لڑکی تو بے اتنی پائیاں  
کہ خواہ مخواہ اسے اپنانے کو جی چاہتا ہے۔“ شنراؤ اس روز مغموم سی تھی اور غلاف ملبہ

میں کھوئی ہوئی تھی۔  
فرحت اسے کہتی ”اے آج سوچ میں کیوں پڑ گئی۔“ لیکن شنراؤ اس کی بات کا جواب  
نہ چاہتی تھی۔ وہ پہلا دن تھا جب شنراؤ خاموش بیٹھی تھی جو اب تو خیر وہ بیسیوں دنوں  
کا جواب دے

ایلی ایسی ہی —!

علی پور واپس آکر ایللی نے دو خط سادی کو لکھے اور غیر از معمولی دونوں سے ایک کا جواب  
موصول نہ ہوا۔ اس کے باوجود یہ بات اس کے ذہن میں نہ آئی کہ بیاہ سے متعلقہ مصروفیت  
نہ شرط جتنے کی وجہ ہو سکتی ہے۔ ان دونوں خطوط میں اس نے مطالبہ کیا تھا کہ عہد و پیمان کے  
ساتھ اور مقبرہ یا شالامار میں چند ایک گھنٹے اس کے ساتھ

رہے۔

وہ سمجھتا تھا کہ شاید وہ خط سادی تک نہ پہنچے ہوں شاید اس سہیلی نے جس کی معرفت خط بھیجتا تھا خطوں کا راز فاش کر دیا ہو۔ شاید وہ لوگ کہیں چلے گئے ہوں شاید سسے ایک خیال آتے لیکن یہ خیال کبھی نہ آیا تھا کہ شاید بیگم نے سادی کو ایلی سے متفر کر دیا ہو جانے کیوں اسے سادی پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ اپنی نسبت شک کر سکتا تھا لیکن سادی انہوں جس عظیم کردار کا سادی نے مظاہرہ کیا تھا اس کی وجہ سے ایلی کو کبھی شک نہیں پڑا تھا کہ کوئی سادی کو درغلا سکتا ہے۔

پھر سادی کا خط دیکھ کر ایلی حیران رہ گیا۔ مضمون پڑھ کر اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ سادی نے لکھا تھا۔ پہلے چند ایک جملے نہایت سنجیدہ اور خشک انداز میں تحریر کیے گئے تھے۔ م کے نیچے پانچ چھ لائنیں لکھ کر انہیں کاٹ دیا گیا تھا اور اس قدر احتیاط سے ایک ایک لفظ کاٹا کہ یہ اندازہ لگانا ممکن نہ تھا کہ کٹا ہوا حصہ کس بات کے متعلق ہے۔ کٹے ہوئے مضمون نے تحریر تھا "خیر چھوڑیے اس بات کو۔"

اوپر لکھا ہوا تھا۔

مورخہ ۳۴ ماہ حال کو اس بات کا امکان ہو گا کہ میں آپ سے مل سکوں۔ اس روز شام تین بجے سے پانچ بجے تک آپ بوڑھے دریا کے پل پر میرا انتظار کریں۔ امید تو ہے کہ ضرور آؤں گی لیکن پانچ بجے تک نہ آئی تو سمجھ لیجئے کہ مجبوری کی وجہ سے رکنا پڑا اس صورت میں پھر اطلاع دوں گی۔

ایلی حیران تھا۔ ایسا خط تو سادی نے کبھی نہ لکھا تھا۔ مضمون کا انداز ہی نیا تھا۔ اس کے خط سادی نے تو کبھی اپنے خط کا ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا۔ وہ بے تکلف اور بے ہنگام لکھا کرتی تھی۔ اس کے خطوط اتنے لمبے ہوتے تھے کہ دیکھنے میں اخبار معلوم ہوتے تھے، آخر کیا بات تھا اس نے لکھ کر کاٹ دی تھی۔ ایلی دیر تک سوچتا رہا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ پھر شاید اس نے سوچا کہ ملاقات پر ساری بات معلوم ہو جائے گی اس لیے وہ تیاری میں مصروف ہو گیا۔ لاہور جا کر اس نے سوچا کہ شاید اسے دیر تک پل پر انتظار کرنا پڑے اس لیے اس نے اپنے ایک عزیز کا سائیکل مستعار لے لیا اور پل پر جا پہنچا۔

بوڑھے دریا کے پل پر چند منٹ انتظار کے بعد سادی کا آنا اس کے قریب

نہیں آئی تھی۔

ملی کا چہرہ انبساط کی وجہ سے گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ ایلی کو دیکھتے ہی وہ ہلکی

ہوئے آپ تو پہلے ہی سے موجود ہیں اور میں کبھی میں پہلے پہنچوں گی۔

پہلے پہنچ جاتی تو یہاں کیا کرتی تھ۔ ایلی نے کہا۔

"انتظار اور کیا۔"

"انتظار کرنے کا بہت شوق ہے کیا۔" ایلی بولا۔

"مفوق کیا کر رہی ہوں انتظار نہ جانے کب تک کرنا ہو گا۔ اب تو عادت سی ہو گئی ہے۔" نہ ہوئے اس نے تانگے والے کو پیسے دے دیئے اور تانگے سے نیچے اتر آئی۔

"ارے" ایلی چلایا "تاںگا کیوں چھوڑ دیا۔"

"ہائیں" وہ بولی "مجھے خیال ہی نہیں آیا۔"

"تو رین سوچے ہی کر ایہ چکا دیا۔" ایلی نے پوچھا۔

"آپ کو بھی تو یاد نہیں آیا جو چپکے سے کھڑے رہے۔" وہ ہنسی۔

"تم تو خیر مصروف تھا۔"

"مصروف۔"

"ہلکا شدت سے۔"

"تو میں بھی مصروف ہی ہوں گی۔" وہ ہنسنے لگی۔

"گلاب کیا کریں گے ہم نہ جانے کب کو رات خالی تانگہ آئے اوھر۔"

"مانگل جو ہے۔" وہ چلائی۔ "مجھے آگے بٹھا لیجئے۔"

"ہائیں" ایلی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ان دنوں میں لاہور میں عورتیں خیرہ نمائندہ کے بغیر دکھائی نہیں دیتی تھیں بے نقاب مائل تو نظر نہیں آتی تھیں اور آتی بھی تو میس اینگلو انڈین یا ہندو عورتیں۔ پردے کے لپٹائی ہوئی سے کی جاتی تھی اس حد تک کہ نقاب اٹھا کر چلنا بھی معیوب سمجھا جاتا۔

لاہور کے لاہور میں زیادہ تر رونق شہر کی فسیل کے اندر والے علاقوں میں پائی جاتی تھی لہذا مولیٰ بازار میں شوقین مزاج لوگ شام کے وقت جمع ہو جاتے چونکہ عورت کی بہار

لیکن سائیکل ڈولٹی ہوئی چلے جا رہی تھی۔

اس وقت قطعی طور پر احساس نہیں تھا کہ سادی کا جسم گویا اس کی آغوش میں تھا اس کی سادی کے گرد جمائے تھے۔ سادی کی پیٹھ اس کی چھاتی سے چھو رہی تھی۔ اور سادی کی ہڈی کی ہڈی بھی خوشبو آ رہی تھی۔ ایللی کی تمام تر توجہ راہ گیروں پر مرکوز تھی اسے اتنی بات کی کہ سادی کے جسمانی لمس کو محسوس کرے۔ سادی کو بھی یہ احساس نہ تھا کہ اس کی سادی سے مس ہو رہا ہے۔ اور وہ اس کے آغوش میں بیٹھی ہے۔ اسے صرف اس قرب کا نا تھا اور وہ اس احساس میں اس حد تک کھوئی ہوئی تھی کہ اسے راہ گیروں کا خیال ہی نہ آتا تھا۔ اس لیے قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ لوگ ان کی طرف حیرت سے دیکھ رہے ہیں یا تسخیر سے رہے ہیں۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے دو بچے ایک انوکھا کھیل کھیل رہے ہوں ایک نئے نئے کو آزار رہے ہوں۔ وہ مسرت سے چھلک رہی تھی، چیخ رہی تھی۔ چلا رہی تھی قہقہے لگا رہی تھی۔

ان دنوں وکالت کا فاسٹل امتحان قریب تھا اور مقبرہ وکالت کے طالب علموں سے بھرا ہوا ہر جگہ ہر پلاٹ میں ہر بیٹھ پر ہر پودے تلے طالب علم قانون کی مونی موتی کتابیں کھولے ہوئے مصروف تھے۔ ان کی آنکھیں پڑھ پڑھ کر چند ہیائی ہوئی تھیں۔ چہرے بے خوابی کی طرح سوچے سے دکھائی دے رہے تھے۔ جیسی فکر کی وجہ سے پریشان تھیں۔ قانونی باتیں کرتے کرتے ان کی آوازیں بیٹھ چکی تھیں۔

لیکن سادی اور ایللی کو ان کے وجود کا احساس نہ تھا۔ جب وہ باغ میں داخل ہوئے تو ایللی اسے چاروں طرف دیکھا دو چار ایک پلاٹوں میں چند ایک لڑکے دکھائی دیتے۔ ایللی نے ان کا سامن لیا اور سڑک کے جھیلے سے نکل کر یوں محسوس کیا جیسے باغ صرف سادی اور ایللی کے لیے مخصوص ہو۔ ان چند ایک لڑکوں کا کیا تھا جو در اپنی کتابوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ اور معلوم نہ ہوا کہ قریب کے پودوں جھاڑیوں اور پھولوں کے تختوں کی اوٹ میں جگہ جگہ لڑکھڑائی آنکھیں انہیں دیکھ رہی ہیں۔

ایللی نے ایک ویران کونے میں پہنچ کر ایللی نے کلیوں سے لدی ہوئی جینیلی کی جھاڑی کی طرف اشارہ کر کے کیا ”یہ تم ہو سادی۔“

ایللی نے حسب عادت قہقہہ لگایا۔ ”کیوں“ وہ بولی ”میں کیا جھاڑی ہوں۔“

دیکھنا کسی اور جگہ ممکن نہ تھا۔ ویسے تو شہر سے باہر اتار کھلی میں خاصی روشنی ہوتی تھی لیکن باسیر و تفریح یا خرید و فروخت کرنے والے صرف مرد ہوتے تھے۔ عورتوں کے لیے اندرون ڈبلی بازار اور اس کے ملحقہ علاقوں میں زیورات اور پارچہ جات کے چند ایک بازار مخصوص تھے اتار کھلی سے باہر کے علاقے آباد تھے۔ مال روڈ پر سارا دن الوبولتا تھا شام کو چند ایک گاڑیاں آ جاتی دکھائی دیتیں یہ علاقے صرف گوروں اینگلو انڈین اور صاحبو کے لیے مخصوص تھے۔

اس زمانے میں کسی لڑکی کو سائیکل پر بٹھا کر چلنا آسان کام نہ تھا۔ سائیکل پر آگے بند کی بات چھوڑیے ان دنوں تو اگر کوئی اینگلو انڈین لڑکی سائیکل پر سوار دکھائی دیتی تو لوگ آواز کتے نعرے لگاتے۔

سادی کی بات سن کر ایللی چونکا لیکن سادی ہنس رہی تھی ہنسے جا رہی تھی۔

”بس ڈر گئے؟“ وہ چلائی۔

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”میں بتاتی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”اور پھر پھدک کر ایللی کے سائیکل کے آگے بیٹھ گئی۔“

یوں ہوتا ہے۔ اب آپ چلائیے۔“

”لیکن اگر گر گئی تو؟“

”تو اٹھ بیٹھو گی اور پھر سے سوار ہو جاؤ گی۔ دونوں اکٹھے ہی گریں گے۔“

ایللی حیرت سے سادی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

راہ گیر انہیں دیکھ کر رک گئے تھے۔ ان کے گرد بھیڑ مچ رہی تھی۔ ”ہی ہی ہی“ وہ ہنس رہے تھے لیکن سادی راہ گیروں کی نگاہوں سے گویا بے خبر تھی بے نیاز تھی۔

”چلے جاؤ جی میں پہنچا آؤں۔“ ایک تانگے والا رک کر بولا۔

ایللی نے ہلکتی نگاہوں سے سادی کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ سادی نے بارعب آواز سے کہا ”ہم سائیکل پر جائیں گے۔“

راہ گیروں نے قہقہہ لگایا۔ ہی ہی ہی سڑک گونجنے لگی دور کھڑے پولیس مین نے انہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ ایللی گھبرا گیا۔ اس بھیڑ میں خصوصاً سپاہی سے بچنے کے لیے انہیں سائیکل ڈول رہی تھی سادی ایک ساتھ جینیں مار رہی تھی قہقہے لگا رہی تھی۔ سڑک پر جانے والے لوگ ان کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کوئی ہنس رہا تھا۔ ”ہی ہی ہی“

”چنبیلی پھولوں میں چٹ کپڑی ہے۔“ ایللی نے کہا ”اور تم عورتوں میں۔“  
 ”لیکن راہ چلنے کا ہاتھ پکڑتی ہے یہ تو۔“ سادی مسکرائی۔  
 ”اور تم پگڑی اچھاتی ہو۔“ ایللی نے کہا۔

سادی نے قہقہہ لگایا ”جیسی آپ ننگے سر رہتے ہیں۔“ وہ خوشی سے تکیا بجانے لگی۔  
 چنبیلی کی جھاڑی میں حرکت ہوئی۔ اور ٹہنیوں سے ایک سربراہر نکل آیا۔ ایک لہانگن  
 چہرہ چار ایک سفید دانت۔

ایللی گھبرا گیا۔

”ارے“ سادی نے قہقہہ لگایا ”سبحان اللہ“ وہ چلائی ”ذرا کیمراتو نکالے“ سر نے فوٹو  
 اور سبز ٹہنیوں میں گم ہو گیا۔  
 ”کون تھا یہ“ ایللی نے گھبرا کر پوچھا۔

لڈو

”کیا معلوم۔“ وہ ہنسنے جا رہی تھی۔  
 ”ارے۔“ وہ پھر چلائی۔

ایللی نے مڑ کر دیکھا۔ ان کی پشت کی طرف آنکھوں کے چار جوڑے ان کی طرف  
 رہے تھے۔ ”یہ تو تین جھاڑی معلوم ہوتی ہے۔“ وہ ہنسی۔ ایللی نے اس کا بازو پکڑ کر گھینا ٹھٹھا  
 کر دیا۔

”تم مجھے پٹاؤ گی۔“ وہ بولی۔  
 ”کیا مزار ہے گا۔“ وہ ہنسی۔  
 ”تمنا دیکھتی ہو۔“

”دیکھتی ہوں۔ کرتی نہیں۔“

”لیکن وہ تو تمہیں تمنا دیکھتے ہیں۔“

”پڑے سمجھیں۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔“

”سادی۔“ ایللی نے سنجیدگی سے پوچھا ”تم ان کی نگاہوں سے گھبراتی نہیں۔“

”نہیں تو“ وہ بولی۔ ”گنوار پن سے کیوں گھبراؤں۔“

”مجھے تو ڈر آتا ہے۔“ ایللی نے کہا۔  
 ”آپ کا کیا ہے۔“ وہ ہنسی ”آپ تو یوں ہیں جیسے گھبراہٹ میں جان پڑ گئی ہو۔ لیکن ہم  
 نہیں گھبراتے آپ۔“  
 ”جو کیا تم سے بھی گھبراؤں۔“  
 ”کیوں نہیں۔“ وہ بولی۔ ”گوری چٹی لڑکی کو دیکھ کر لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے

”ہو نموں ان کی بات نہ کیجئے۔“ کیوں“ ایللی نے پوچھا۔  
 ”نہیں“ وہ ہنسی ”چلنے کی کوئی بات نہیں۔ اخلاق مانع ہے۔“  
 ”وہ کیا ہوتا ہے۔؟“

”وہ بھی ہوتا ہے۔“ سمجھ لیجئے مجھے کوفت ہوتی ہے۔“  
 ”اور ان کی گنوار نگاہوں سے کوفت نہیں ہوتی۔“

”لو نموں۔“ وہ ہنسنے لگتی۔

”یہ تو یوں دیکھتے ہیں جیسے تم لڈو ہو۔“  
 ”ہوں؟“ وہ ہنسی۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔

”تو ہاتھ کیوں نہیں بڑھاتے آپ۔“

”لو نموں مجھے لڈو سے دلچسپی نہیں۔“

”جھوٹ“ وہ چلائی ”سفید جھوٹ۔“

”کیوں“ ایللی نے پوچھا ”وہ کیسے۔“

”آپ کے منہ سے تو کسی اور لڈو کی بو آتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بو کھلا گیا۔

”ہریت کا مطلب نہیں بتایا کرتے۔“

”کیوں؟“

”بس سمجھ لیجئے خود بخود۔“

”تو تو دو۔“ اس نے منت کی۔

”نہیں بتاؤں گی نہیں بتاؤں گی۔“ وہ بولی۔  
 ”بھاڑ میں جاؤ بھاڑ میں جاؤ۔“ وہ بولا۔  
 ”بھاڑ میں گئے تو کئی دن ہو گئے۔“  
 ”اور جلی نہیں۔“ اس نے پوچھا۔  
 ”پر بل نہیں گیا۔“ وہ بولی۔  
 ”نہ جانے کیا کہہ رہی ہو۔“  
 ”جائے کو کون جگائے۔“

دفتا“ ایلی نے محسوس کیا کہ وہ سنجیدگی سے بات کر رہی تھی۔ لیکن ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شتراد کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اسے یہ بات کیسے سمجھ میں آ سکتی تھی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آ سکتا کہ بیگم ماں ہو کر اپنی بیٹی کے خلاف بات کر سکتی ہے۔ دفتا“ ان کے قریب ہی سے چار ایک آدمی مل کر گانے لگے۔  
 ”ہمیں لڈو کھلاؤ ہمیں لڈو کھلاؤ۔“  
 ”وہ سب مل کر یوں گارہے تھے جیسے قوال گاتے ہیں۔ ان کی آوازوں میں تسخر قالیکی تسخر کی حیثیت ایسی تھی جیسے آرزو کے تھل پر حرص کے پتے چھڑکے ہوئے ہوں۔  
 ”ارے“ سادی حسب عادت تہقہ مار کر بولی۔ ”ہم تو قوالوں میں آگئے۔“  
 ایلی نے ادھر ادھر دیکھا سادی کے پیچھے پودوں کے جھنڈ میں بیٹھے ہوئے پانچ سات لڑکوں کی ٹولی سادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔  
 ”الیاس صاحب آپ بھی لگائیے آواز۔“ سادی ہنسی۔  
 ایلی گھبرا گیا۔  
 ”خدا کے لیے نہ بولو۔“ اس نے اشارہ کیا۔  
 ”کیوں نہ بولوں۔“  
 ”چلو یہاں سے چلیں۔“  
 ”ان بزرگوں کے درشن تو کر لوں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔  
 قوال قریب تر آگئے۔ ”ہمیں لڈو کھلاؤ ہمیں لڈو کھلاؤ۔“  
 ”ارے“ وہ مڑی۔

”نہیں بتاؤں گی نہیں بتاؤں گی۔“ وہ بولی۔  
 ”بھاڑ میں جاؤ بھاڑ میں جاؤ۔“ وہ بولا۔  
 ”بھاڑ میں گئے تو کئی دن ہو گئے۔“  
 ”اور جلی نہیں۔“ اس نے پوچھا۔  
 ”پر بل نہیں گیا۔“ وہ بولی۔  
 ”نہ جانے کیا کہہ رہی ہو۔“  
 ”جائے کو کون جگائے۔“

دفتا“ ایلی نے محسوس کیا کہ وہ سنجیدگی سے بات کر رہی تھی۔ لیکن ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شتراد کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اسے یہ بات کیسے سمجھ میں آ سکتی تھی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آ سکتا کہ بیگم ماں ہو کر اپنی بیٹی کے خلاف بات کر سکتی ہے۔ دفتا“ ان کے قریب ہی سے چار ایک آدمی مل کر گانے لگے۔  
 ”ہمیں لڈو کھلاؤ ہمیں لڈو کھلاؤ۔“  
 ”وہ سب مل کر یوں گارہے تھے جیسے قوال گاتے ہیں۔ ان کی آوازوں میں تسخر قالیکی تسخر کی حیثیت ایسی تھی جیسے آرزو کے تھل پر حرص کے پتے چھڑکے ہوئے ہوں۔  
 ”ارے“ سادی حسب عادت تہقہ مار کر بولی۔ ”ہم تو قوالوں میں آگئے۔“  
 ایلی نے ادھر ادھر دیکھا سادی کے پیچھے پودوں کے جھنڈ میں بیٹھے ہوئے پانچ سات لڑکوں کی ٹولی سادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔  
 ”الیاس صاحب آپ بھی لگائیے آواز۔“ سادی ہنسی۔  
 ایلی گھبرا گیا۔  
 ”خدا کے لیے نہ بولو۔“ اس نے اشارہ کیا۔  
 ”کیوں نہ بولوں۔“  
 ”چلو یہاں سے چلیں۔“  
 ”ان بزرگوں کے درشن تو کر لوں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔  
 قوال قریب تر آگئے۔ ”ہمیں لڈو کھلاؤ ہمیں لڈو کھلاؤ۔“  
 ”ارے“ وہ مڑی۔

### حور اور لنگور

پھر وہ دونوں آم چوتے ہوئے باغ میں یوں گھومنے لگے جیسے میلے پر آئے ہوئے ہوں۔ اور بلا فریک بڑے سے پلاٹ میں بیٹھ کر گپیں مارنے لگے۔ سادی بات بات پر ہنسی تہقہ لگاتی تالی بجا بجا کر ہنسی۔ وہ اپنے آپ میں اس قدر گرم تھے کہ انہیں گرد و پیش کا احساس ہی نہیں تھا انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ دور دور سے طلبا اس پلاٹ کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ وہ چپکے سے پودوں کی ٹوٹ میں بیٹھ جاتے اور پھر دور بیٹھے ہوئے ساتھیوں کو اشارے سے بلاتے۔ حتیٰ کہ ان کی تعداد تیس چالیس تک پہنچ گئی۔ پھر وہ چپکے سے پودوں کی اوٹ سے نکل کر آئے اور انہوں نے سادی اور ایلی کے گرد چاروں طرف حلقہ بنا لیا اور گانے لگے۔

”ہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت۔“

ایلی نے گھبرا کر ادھر دیکھا اس کا دل ڈوب گیا۔

وہ مجموعہ مجھوم کر گارہے تھے۔ تالی بیت رہے تھے آنکھیں مٹکا رہے تھے۔

”ارے“ سادی نے مسکرا کر ایلی کی طرف دیکھا۔



”یہ کیا بد تمیزی ہے۔“ ایلی نے زیر لب کہا۔

”وہ تو ہے۔“ سادی نے کہا۔ ”لیکن کتنے سچ ہیں۔“

لڑکے سادی کی بات سن کر تالیاں پیٹنے لگے ”ہمیر ہیر۔“

پھر سادی نے دونوں بازو اونچے کر دیئے۔ دیکھئے بھائی صاحب ”وہ یوں چلانے لگی ہیں میں مٹھائی فروش بات شروع کرنے سے پہلے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے چلاتا ہے“

”یہ بتا دیجئے۔“ وہ بولی۔ ”کہہ حور کون ہے اور لنگور کون؟“

لڑکوں نے دلچسپی اور تعجب سے سادی کی طرف دیکھا اور تھقے مارنے لگے۔

”اپنے ان سے پوچھئے۔“ ایک شوخ نوجوان ایلی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

”کیوں میرے ان صاحب“ سادی ایلی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”آپ کے لیے ہم تو ہمارا تجویز کیا ہے۔ ان لوگوں نے“

”لنگور، لنگور، لنگور“ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ ایلی نے محسوس کیا کہ ملہی کے مقابل میں وہ واقعی لنگور تھا۔ اس کی ٹانگوں میں دم لٹکنے لگی۔

”لیکن لنگور ہے کون۔“ سادی نے پوچھا

لڑکوں نے دایاں ہاتھ اٹھایا جس طرف سادی کھڑی تھی اور چلائے ”حور حور“ پھر بائیں اوپر اٹھایا اور چلانے لگے لنگور لنگور۔ ”پھر وہ ایک ساتھ بار بار اپنے ہاتھ اٹھ کر چلائے۔ ”لنگور“ وہ تنک وہ شور مچاتے رہے۔ اور سادی تھقے لگاتی رہی۔

پھر سادی ان کے ساتھ شامل ہو گئی ان کے حلقے سے ذرا ہٹ کر ایلی کی طرف اشارہ کر کے گلے لگی

”پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت۔“

لڑکے جوش میں اس کے ساتھ چلانے لگے۔ ایلی چپ چاپ گھاس پر بیٹھا ہوا دونوں مٹھا تنکا چلائے جا رہا تھا۔ اس نے دو ایک مرتبہ بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کے تیردیکھ کر لڑکوں نے حلقہ اور بھی تنگ کر دیا تھا۔ اس لیے بیٹھ رہنے کے سوا اس کے لئے چارہ کار نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب سادی رخصت ہو رہی تھی وہ بھول گئے تھے کہ سادی ایک لڑکی تھی نوجوان اور خوب صورت لڑکی۔ ان کی آنکھیں پر نم تھیں۔

”تو آپ جا رہے“ ایک نے حسرت بھری نگاہ ڈال کر کہا۔

”ہاں دونوں حور اور لنگور۔“

”خدا حافظ“ سادی نے کہا۔

”جتنے لگے۔“ خدا حافظ سادی نے کہا۔

”جتنے لگے۔“ خدا حافظ سادی نے کہا۔

”آج میں وہ دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر ان میں

دہلیک رکھی تھی اور سڑک پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔

”کس سوچ میں پڑی ہو؟“ ایلی نے پوچھا۔

”کچھ نہیں“ اس نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”آخر کیا بات ہے؟“

”کچھ بھی تو نہیں۔“

”ذرا بتاؤ کہ بھائی جان کو پتہ نہ چل جائے۔“

”وہ ہنسی۔“ کیا فرق پڑتا ہے۔“

”پھر سوچ کیسی؟“

”سوچ کے سوا اب ہے ہی کیا۔“ وہ بولی۔

”کیوں؟“

”خود کردہ راجہ ہے نیست۔“

”پیشانی ہو رہی ہے۔“

”گوںوں۔ پریشان ہوں۔“

”کیوں؟“

”میں ہوں۔“ وہ ہنسی۔

”تم تو بتا کہہ دیا کرتی تھی۔“ ایلی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”نہ کئے والی بات حائل ہو جائے تو۔“ اس نے حسرت بھری نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا۔

”نہ حائل ہونے دو۔“ ایلی بولا۔

”اگر آپ نے حائل کر رکھی ہو تو۔“

”میں نے۔“ ایللی کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔  
دیر تک وہ دونوں خاموش رہے۔

ایللی سوچ رہا تھا۔ نہ جانے دفعتاً وہ اس قدر سنجیدہ کیوں ہو گئی تھی۔ لیکن تو اس کی یہ نہ تھی۔ وہ تو ایک انبساط کا دھارا تھی جو کبھی رکنا نہ تھا۔  
”ضرور کوئی بات ہوئی ہے۔“ ایللی نے کہا۔  
”ہوئی تو نہیں“ وہ بولی ”پہلے ہی سے تھی۔“ چلو چھوڑو“ دفعتاً وہ ہنسی۔ ”بہنو مافیہ“  
”ارے تو کیا یہ مذاق تھا۔“

”ہاں“ وہ ہنسی۔ لیکن اس کی ہنسی میں خوشی کا عنصر نہ تھا۔  
”آپ نے اپنے والد صاحب سے بات کی؟“ سادی نے پوچھا۔  
”نہیں تو۔“ ایللی نے جواب دیا۔  
”کیا وہ مان جائیں گے؟“  
”پتہ نہیں۔“ وہ بولا۔ ”مجھے ڈر آتا ہے۔“  
”اچھا۔“ سادی نے آہ بھری۔

”کیا یہ ضروری ہے“ ایللی نے پوچھا۔  
”ہاں“ وہ بولی ”ان کی طرف سے رسمی پیغام کا آنا ضروری ہے۔“  
”کیوں؟“

”بڑے خاندانوں کے بڑے بکھیرے ہوتے ہیں۔ اس بات پر لوگ بضد ہیں۔“  
”اچھا۔“ ایللی نے کہا۔ ”اور۔۔۔۔۔“  
سادی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میں نے غلطی کی“  
”کیا؟“

”میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ اس معاملے میں انہیں مجبور نہ کروں گی۔“  
”کیا دیواریں ہی کھڑی ہوتی جائیں گی؟“  
”اونہوں۔ یہ تو دیواریں نہیں۔“ وہ ہنسی ”دیوار تو۔۔۔۔۔“ وہ رک گئی۔  
”کہو نا۔“

”نہ بتاتی ہے کیل۔“  
”ہاں“ ایللی جلال میں آگیا۔  
”مائی نے قہقہہ لگایا۔  
”نہیں بتاتا پڑے گا۔“ وہ غرایا۔  
”نہیں بتاؤں گی، نہیں بتاؤں گی۔“ سادی نے قہقہہ لگایا۔  
”جہلہ ہی مکمل کر دو۔“  
”ونہوں۔“

”نہیں میری قسم“ ایللی نے منت کی۔ ”کیا کوئی دیوار ہے۔“  
”ہاں“ وہ ہنسی ہے۔ ”آپ کی جانب سے۔“  
”میری جانب سے؟“  
”ہاں۔“

”جھوٹ بکواس۔ کوئی دیوار نہیں۔“  
”نورہ۔۔۔۔۔“ سادی نے قہقہہ لگایا۔

”وہ۔۔۔۔۔“ ایللی سوچنے لگا۔ ”وہ کون؟ بتاؤ نا۔“ ”جوش میں وہ بھول گیا کہ اس نے دونوں  
نوں میں سائیکل تھام رکھا تھا۔ اس نے سادی کا بازو پکڑنے کے لیے ہاتھ بدھائے۔ دھڑام  
سائیکل تانگے سے گر پڑی۔ ایللی تانگے سے اتر آیا۔

سادی نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ اور پھر چلا کر بولی ”خدا حافظ“ اور تانگا چل پڑا۔ ایللی نے  
نگل سنبھل اور تانگے کو جالینے کے خیال سے اس پر سوار ہو گیا لیکن گرنے کی وجہ سے پیڈل  
آپ ہو گیا تھا۔ اور زنجیر جام ہو چکی تھی۔ وہ سائیکل سے اتر آیا۔ اور پیڈل چلتے ہوئے سادی  
ا طرف دیکھنے لگا۔ وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہی تھی۔ ”خدا حافظ“ خدا حافظ۔“ اس کے  
نشان مل رہے تھے۔

ٹانگا

ٹل پور آتے ہوئے گاڑی میں ایللی مسلسل سوچتا رہا لیکن اسے سمجھ میں نہ آیا کہ کوئی



ہی ہی۔ اور دیکھو نا اہلی شادی کوئی کھیل نہیں کہ آج تم کو اور کل ہو جائے بھی یہ تو ہم  
بکھیرا ہے۔ پہلے نکاح نکاحا کریں۔ اتنے امیر تو ہم ہیں نہیں کہ ایک دم سب کچھ قربا  
کوئی زمانہ آیا ہے۔ دال روٹی نہیں چلتی۔ بس نکاح نکاحا ہو گا پھر تمہارا آسنا بنے گا  
کوئی فاختہ آئیٹھے گی اللہ اللہ خیر سلا۔ لو بھی راجو تو شروع کر دو آج ہی سے نکاح نکاح  
ہی ہی ہی۔ وہ ہنستے اور بات طاق پر دھری کی دھری رہ جاتی۔

اہلی سوچ رہا تھا کہ اب اسے اس انداز سے بات کی جائے کہ انہیں واضح طور پر عموں  
اخراجات کا انتظام ہو چکا ہے۔ نکاح نکاحا ہو چکا ہے فاختہ بھی موجود ہے اور ان سے مزہ  
توقیع کی جارہی ہے کہ رسم کے مطابق فاختہ کو اپنی انگلی پر بٹھا کر لے آئیں اور بنے بیٹے کو  
میں بٹھادیں۔ اس صورت میں شاید وہ اعتراض نہ کریں۔  
اہلی نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ اخراجات کون پورے کرے گا دوسرے کمال سے کیا  
رسومات کیسے ادا ہوں گی۔ رکھ رکھاؤ کیسے قائم رہے گا۔ یہ باتیں بے حد تکلیف تھیں اور  
ناخوش گوار اور تکلیف دہ باتوں پر سوچنا اہلی کو ناپسند تھا۔ طبعی طور پر وہ ذہنی فرار کا قائل تھا  
چاہتا تھا کہ کسی طریقے سے اب اسے رضامندی حاصل کرے اور وہ ایک بار سادی کے اقباس  
کر رہی طور پر پیغام پیش کر دیں۔ پھر چاہے کچھ ہو یا نہ ہو۔ پھر کے متعلق سوچنے سے اہلی  
کرتا تھا۔ غالباً وہ سمجھتا تھا کہ اس دوران میں اسے اللہ دین کا چراغ مل جائے گا اور جملہ ضرورتیں  
پوری ہو جائیں گی یا ایسا نہ ہو سکا تو شاید منصر اسے ان رسمی اخراجات سے آزاد کر کے باٹ  
اماں اس کی مدد کرے آخر اس نے اہلی کی منگنی بھی تو کی تھی اور کی بھی بڑی دھوم دھماکا  
تھی۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ بشرطیکہ ابار رضامندی دے دیں۔

ماں کے متعلق اہلی نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ اس کی دانست میں اماں تو اس بات پر  
مسرور تھی۔ وہ تو خوش تھی کہ اس کا بیٹا ایک بیاتہ عورت کے دام سے نکل رہا ہے۔ اور لڑکا  
سادی کے ہاں دو تین مرتبہ ہو آئی تھی اگر وہ اس بات پر خوش نہ ہوتی تو بھلا دال جاتی  
کیوں۔ لہذا یہ بات تو طے شدہ تھی کہ اماں اس امر میں اس کا ساتھ دے گی۔

لیکن جب اہلی نے ماں سے بات کی تو وہ حیران رہ گیا۔  
”نہ بھی“ وہ بولی ”میں اس معاملے میں نہیں آؤں گی۔“

اہلی نے حیرت سے پوچھا۔  
”جی ہاں خوشی ہے کہ تیری شادی ہو لیکن میں اس معاملے میں کیسے آسکتی ہوں۔“  
”وہ فیصلے میں غرایا۔“  
”اب اگر اس رشتے کو چھوڑ کر میں  
بڑا ہلکا ہو جاؤں تو لوگ کیا کہیں گے۔ میرے عزیز کیا سمجھیں گے۔“ پھر وہ رونے لگی  
”اے تو میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ کتنے چاؤ سے میں نے تجھے نامزد کیا تھا اور  
اب تو نہیں تجھے پوچھ کر میں نے بات چکی کی تھی۔ یاد ہے تجھے تو نے کس خوشی سے ہاں کہا  
ناب۔“ وہ خاموش ہو گئی اس کے گالوں پر آنسو یوں بنے لگے جیسے جھڑی لگی ہو۔  
”میں جی برا کرتی ہے اماں“ فرحت بولی۔

”میرا دل تو اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ایک اس کی امید  
بھی تھی۔ اس کو دیکھ کر جیتی رہی۔ خاوند کی بے زنی برداشت کی سوکھوں کی خدمت  
دہی۔ زندگی بھر محنت مزدوری کر کے اسے پالا۔“ ہاجرہ کی ہچکی بندھ گئی۔  
”میں نے عموں کیا جیسے ہاجرہ کے آنسو اس کے آسٹیاں کے ٹکٹے ہوں جو بنے جا رہے  
را کہ اٹھا اور اپنا غصہ اور اضطراب چھپانے کے لیے سوچے سمجھے بغیر زہنہ چڑھنے لگا۔  
اے کے چوبارے میں پہنچ کر وہ تھنہکا۔ شہزاد کھڑکی میں تھی جس کے قریب ہی صفدر  
سے کی کھڑکی تھی۔ اور وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ چپ چاپ وہ کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔  
”صفدر کی نگاہ اہلی پر پڑی۔“ ”آئیے آئیے۔“ وہ چلایا۔ ”الیاس صاحب آئے ہیں۔“  
”اہلی کی طرف دیکھا اور پھر منہ موڑ کر صفدر سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی۔  
”اب بولی ”مجھے اس ڈیزائن کے بندے پسند نہیں مجھے تو کوئی نئے فیشن کا نمونہ دکھاؤ۔  
پانچ می فرجوں اور پھر وہی دقناوسی چیز۔ کام کرنا ہے تو دل سے کرو ورنہ کیا فائدہ“ وہ

”اچھا۔“ صفدر نے دونوں بازو اٹھا کر یوں کہا جیسے حافظ خدا تمہارا لگاتے ہوئے بیچ  
”ابا باما اور وہ چلا گیا۔“

سٹم ہانٹ واول سٹم ہے۔  
 سٹم گیتا بڑی محنت سے نئے لڑکوں کو سمجھاتے کہ جائنٹ واول سٹم کا کیا مطلب ہے اور  
 سٹم سٹم سے کیا مراد ہے اور پھر جب لڑکا داخل ہو جاتا تو پھر بات پر اسے تاکید کرتے  
 تھے رات وہ پلینک کا خیال رکھے۔

ایلی ان کی اس بات پر بے حد محفوظ ہوتا اور بڑی سنجیدگی سے پوچھتا:  
 "ہاں میں سٹم گیتا یہ سٹم صوتی ہے تاہی اس میں صرف آواز کا خیال رکھا جاتا ہے۔"  
 "ہاں بالکل الیاس صاحب بس اس نکتہ کو آپ ہی نے سمجھا ہے لڑکے توجہ سے بات  
 نہ سنتے۔"

"درست" ایلی کہتا۔ "لیکن ہمیں پلینک کا خیال رکھنا چاہئے۔" وہ طنزاً کہتا۔  
 "ہاں" وہ خوشی سے چلاتے۔ "بس یہی ایک نکتہ ہے۔" اور پھر وہ فوراً "مثال دیتے صبح  
 آپ نے بے اوجھل لکھا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے لفظ کے پلینک کی طرف خیال نہ  
 آپ کو یہ خیال نہ رہا تھا کہ یہ لفظ جے او سے لکھا جاتا ہے۔ آپ نے یوں لکھا جیسے یہ لفظ  
 ہے لکھا جاتا ہو۔"

سٹم گیتا سے باتیں کرنے میں ایلی کو بہت لطف آتا تھا لہذا وہ اکثر سٹم گیتا کے ہاں جا بیٹھتا  
 سنی لیتے ہوئے بھی وہ سٹم گیتا سے گپ بازی کیا کرتا۔ کالج میں ایلی واحد طالب علم تھا جس  
 سٹم گیتا نے دوستانہ مراسم پیدا کر رکھے تھے اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ایلی بی اے تھا اور  
 لڑکھٹا کے کالج میں تمام طلباء میٹرک پاس تھے۔

دھما "مغل میں شور اٹھا کہ ایلی کی منیگریٹر شروہ کی شادی ہو رہی ہے۔ ہاجرہ یہ سن کر حیران رہ  
 لادھائی مٹی پوچھ گچھ کی۔ بات کی تصدیق ہو گئی تو ٹھنڈی ہو کر بستر پر آ پڑی۔

اس پر ایلی ماں کے پاس آ بیٹھا بولا ماں اب تو تمہارا یہ اعتراض بھی دور ہو گیا۔ چل اٹھ  
 مجھے ساتھ چل کہ مظفر آباد میں اب اسے ملیں۔ شاید وہ مان جائیں۔

ہاجرہ نے جب ایلی کی بات سنی تو پہلے تو وہ ادھر ادھر کے بہانے بتاتی رہی لیکن ایلی نے بار  
 لدا کی خنسی کیں حتیٰ کہ ایک روز ماں ایلی کے ساتھ مظفر آباد جانے کے لیے مان گئیں۔

ماں اور بیٹا ملنے پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ سیلاب کی وجہ سے مظفر آباد کی لائن ٹوٹی ہوئی

شہزاد فارغ ہو کر چوبارے میں ادھر ادھر گھومنے لگی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔  
 پر کپڑا دیا۔ کارنس پر پڑی سرے والی کو ایک طرف رکھا صندوق کھول کر کئے کاغذ  
 اسے سرانے پر چڑھایا اور پھر تیل کی کچی اٹھا کر مشین کو تیل دینے لگی۔  
 ایلی چپ چاپ اسے دیکھتا رہا دیکھتا رہا اور پھر مایوس ہو کر نیچے اتر آیا۔

## مسٹر گیتا

جن دنوں ایلی نے بی اے پاس کیا تھا وہ مالی بحران کے دن تھے۔ دوسری جنگ ع  
 سانپ کو گزرے سالہا سال گزر چکے تھے۔ لیکن لکیریں اب ابھر رہی تھیں۔ ہر لمحے  
 کا کھانا اچل رہا تھا نوکری حاصل کرنا ناممکن تھا۔

مجبوری میں ایلی نے ایک شارٹ ہینڈ کالج میں داخلہ لے لیا تھا یہ کالج علی پور کے  
 دروازے کے قریب ایک چوبارے میں واقع تھا جس کے ملحقہ مکان میں مسٹر گیتا کالج  
 اور واحد انسٹرکٹر کی رہائش تھی مسٹر گیتا پرانی وضع کے باعزت لالہ جی تھے۔

وہ صبح سویرے جاگتے اور چھڑی لے کر باہر چل قدمی کے لیے نکل جاتے۔ مسٹر گیتا  
 سارے کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کی چال اس قدر چست اور تیز تھی کہ  
 معاون ثابت ہونے کی بجائے التارکلوٹ معلوم ہوتی۔ لیکن مسٹر گیتا چھڑی یا چھڑی کے  
 نکلنے کے قائل نہ تھے۔ وہ ایک پرانے باعزت خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے  
 میں کسی شخص نے چھڑی یا چھڑی کے بغیر باہر نکلنے کی حماقت نہ کی تھی۔ میر کر کے  
 مندر سے ہوتے ہوئے سیدھے اپنے کالج میں پہنچتے۔ اپنے شاگردوں کو دونوں ہاتھ جوڑ کر  
 کرتے اور پھر انہیں پڑھانے میں مصروف ہو جاتے۔

مسٹر گیتا اس بات پر بے حد ناز کرتے تھے کہ ہندوستان میں صوتی شارٹ ہینڈ کالج  
 لیے انہوں نے ساری عمر جدوجہد کی تھی۔

جب کوئی نیا لڑکا کالج میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آتا تو مسٹر گیتا اپنی  
 مصروفیات چھوڑ کر اس کے پاس بہ مکمل شفقت آ بیٹھتے اور اسے سمجھاتے کہ شارٹ ہینڈ  
 سٹم جسے پٹ میں کہا جاتا تھا بالکل بے کار ہے اور ان کے نئے سٹم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ہے اور وہ آگے نہیں جاسکتے۔ مجبوراً وہ ملتان ایک رشتہ دار کے ہاں ٹھہر گئے اور انتظار کر لگے کہ کب راستہ صاف ہو اور وہ منزل مقصود پر پہنچیں۔ ملتان کے قیام کے دوران میں اہل ماں کو باہر لے جاتا اور کسی باغ یا میدان میں پہنچ کر وہ دونوں کسی دیران کوئے میں بیٹھ جاتے اہلی ماں کو سمجھاتا کہ علی احمد سے کس طرح بات کی جائے۔

”دیکھو نا اہل“ وہ کہتا ”اگر ابا نے محسوس کیا کہ شادی پر بہت خرچ اٹھے گا تو وہ کسی نہ کسی بہانے یہ رشتہ نامنظور کر دیں گے اور اگر یہ موقعہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر شاید کبھی ایسا موقع ملے اور اہل سادی ایک ایسی ناؤ ہے جو مجھے اس بھنور سے باہر نکال سکتی ہے جس میں میں فوج کھا رہا ہوں اور اگر یہ ناؤ بھی نہ رہی تو پھر — پھر تم جانتی ہو۔“ اہلی وضاحت سے اپنا سمجھا رہا تھا کہ اگر وہ ناکام رہا تو پھر وہ اپنے آپ کو از سر نو اسی بھنور کے حوالے کر دے گا: میں وہ عرصہ دراز سے ڈبکیاں کھا رہا تھا۔

اس روز پہلی مرتبہ اہلی نے اپنے منہ سے یہ تسلیم کیا تھا کہ شنوار ایک بھنور تھی اور وہ بھنور میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ درحقیقت وہ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر رہا تھا بلکہ اسے استہل رہا تھا اور دھمکی کے طور پر بوڑھی ماں کے سامنے پیش کر رہا تھا۔

لیکن ہاجرہ بار بار کہتی اگر تمہارے ابا نے شادی پر خرچ نہ کیا تو کرے گا کون اور بات بنے گی۔

”تم اس بات کی پروا نہ کرو اہل۔ یہ بعد کی بات ہے فی الحال ضروری بات یہ ہے کہ باپ چلیں اور ہمیں ان کی قدر ادا حاصل ہو جائے کہ وہ سادی کے ابا سے مل کر پیش کر دیں۔ اس لیے بات اس انداز سے کرنا چاہئے کہ وہ سمجھیں خرچ درج کا مسئلہ نہ گا۔“

”لیکن پھر شادی کیسے ہوگی کیا وہ خہیں خانہ داماد بنالیں گے۔“

”نہیں اہل —!“

”ایسی بات ہے تو میں تو جیتے ہی مر جاؤں گی۔“ ہاجرہ چلاتی — اور بات جوں کی تو ادھوری رہ جاتی۔

چار ایک روز کے بعد بعد مشکل گھٹنے گھٹنے پانی سے گزر کر وہ مظفر آباد میں علی احمد

انہیں اس حالت میں دیکھ کر علی احمد کے گھر میں شور مچ گیا راجو اور شمیم کی طرف دیکھنے لگیں۔ شمیم کی دونوں بیٹیاں اور راجو کے بہن بھائیاب شور مچانے لگے۔

”آپ ہیں۔ یا میری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے۔“

”خیر ہے۔“ راجو بولی۔

جب کایامات ہو رہی ہے تمہاری۔“ شمیم نے اہلی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہے نا آپ نے۔“ راجو نے علی احمد کو مخاطب کر کے کہا۔ ”سنئے ہیں کیا کہہ رہی ہوں

ہے اہل لگے اس حساب کے رجسٹر کو ہر وقت اسی میں کھوئے رہتے ہیں آپ۔ نہ آئے گا

لگے گا ہوش۔ میں نے کہا آپ سے کہہ رہی ہوں“

”جیسے کہہ رہی ہو کچھ راجو۔“ اندر سے علی احمد کی آواز سنائی دی۔

”مگر ہے سن لیا آپ نے۔“ وہ بولی۔

”ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے۔ ”دیکھو نا راجو یا تو بیوی گونگی ہو اور یا خاوند بہرہ ہو جیسی نہستی

وہ نہیں۔ تم تو طوطے کی طرح ٹیس ٹیس کرتی رہتی ہو اب میں بھی بہرہ نہ بنوں تو نیچے

ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگے ”کیا کہتی ہے۔“

”میں کہتی ہوں۔“ راجو چلاتی۔ ”ذرا باہر تو دیکھو لو کون آیا ہے۔“

”کوئی آیا ہے کیا؟“ وہ بولے۔

”اہل اہل کہہ جو رہی ہوں۔“

”اب احمد نے جلدی سے ننگی ہوئی قیض کو اتارا اور اسے پہننے لگے۔ ان کی عادت تھی کہ

قیض انار کر بیٹھا کرتے اور جب کوئی آتا تو فوراً قیض پہن لیتے۔

”شیم قیض پہننے دیکھ کر راجو ہنسی۔“ اے ہے کوئی باہر سے تو نہیں آئی کہ قیض پہننے

باتہ آئی ہے۔“

”اہل کی ماں۔“ انہوں نے حیرت سے کہا۔

”ساتھ اہلی بھی ہے۔ اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا جو آگئے۔ بھی راجو انہیں بٹھاؤ نا کوئی چائے

ہاں ہلکت وکٹ منگوا دو کالے کی دوکان سے لیکن بھی تم نے پہلے اطلاع کیوں نہ دی۔

کیوں راجو تم نے چائے پٹائی اور کیا کالے سے بکٹ منگوائے پھر کوئی خاطر  
تیار کیا کی تمہارے مہمان آئے ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنی صندوقچی سے ایک چونی  
لی اور راجو کو دیتے ہوئے بولے۔ "منگواؤ بکٹ۔ ذرا جلدی کرو تا جیسی ایلچی کی ماں بیٹھ جاوے۔  
بڑی ایلچی پر کیا حال ہے۔"

مسلل چار روز ہاجرہ اور ایلچی نے متعدد بار کوشش کی کہ علی احمد سے بات کی جائے لیکن وہ  
نیکالیت سے اس حد تک واقف ہو چکے تھے کہ انہوں نے کسی نہ کسی بہانے بات ٹال دی  
بات شروع کرتا تو علی احمد کہتے۔ او ہو۔ میں بھول ہی گیا۔ دیکھو تا اتنے بکھیرے ہیں کہ میں  
نہ جانتا ہوں۔ ہی ہی ہی ہی۔ سب سے بڑا بکھیرا تو یہ راجو ہی ہے۔ کیوں راجو سنا تم نے کیا کہہ  
ایں میں۔ ہونا تم بکھیرا۔ بکھیرے درد سر ہوتے ہیں اور درد دل والے بکھیرے بھی ہوتے  
ہے۔ اور راجو تم تو درد دل والا بکھیرا ہو۔ ہی ہی ہی ہی۔ سنا تم نے کیا کہہ رہا ہوں میں۔ لیکن  
تم درد سر والا بکھیرا بنی جا رہی ہو پہلے خالص درد دل والا تھی۔ تمہیں درد دل والے بکھیرے  
خیر نہیں ایلچی۔ بڑا عظیم بکھیرا ہوتا ہے یہ۔ توبہ ہے۔ اچھا ہے اچھا ہے ابھی یہ درد دل  
لاکھڑا نہ ہی ہوا ابھی ساری عمر بڑی ہے۔ کچھ دن اور سکھ کے گزار لو تو تمہاری خوش نصیبی  
دلی۔ یہ بیماری کچھ اور دیر نہ لگے تو بہتر ہے۔ کیوں راجو سنا تم نے ہی ہی ہی ہی۔

اس طرح وہ مسلسل باتیں کیے جاتے اور ایلچی کی بات پس پشت پڑ جاتی۔

کئی وقت وہ جواب دیتے۔ "ہاں ہاں بھی آج تو بات ضروری کرنی چاہئے اتنے دن ہو گئے  
ہاں نہیں آئے ہوئے لیکن بھی میں تو جا رہا ہوں ڈپٹی صاحب کو ملنے کے لیے۔ انہوں نے بلایا  
ہے بے ہمارے بڑا خیال رکھتے ہیں بات بات پر مشورہ کرتے ہیں۔ ان سے مل آؤں میں پھر  
لیجئے سے بات کریں گے۔"

اس کے بعد دیر تک وہ جوں کے توں بیٹھ رہتے۔ وہ ڈپٹی صاحب کی طرف جاتے ہی نہ تھے  
نہ لے لے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اور اگر ایلچی انہیں یاد دلاتا کہ آپ تو جا رہے تھے  
تو صاحب کی طرف تو وہ ہنس کر کہتے ہاں ہاں بھی جا رہا ہوں۔ اور پھر بیٹھ رہتے۔ اس طرح ایلچی  
اور راجو کو وہاں رہتے آٹھ روز ہو گئے۔ اور ان آٹھ روز میں ایلچی کو صبر و سکون ریزہ ریزہ ہو کر  
دیکھنے لگی طبعی طور پر مزاح اور مزاحیہ صورت حال کو محسوس کرنے سے کورا تھا۔ وہ علی احمد کی

اور یہ سیلاب، کیسے پہنچے تم۔ سنا ہے ریل کی لائن ٹوٹی ہوئی ہے اور سارا مشینری پانی میں ڈوبا  
دو دو فٹ پانی کھڑا ہے پہلے اطلاع دیتے تو ہم کوئی انتظام کر دیتے۔ خیر خیر ہمارا کیا تم  
آگئے۔ راجو راجو۔ یہ دیکھا تم نے ایلچی کی ماں کو۔ ذرا غور سے دیکھو۔ اب تو پانی  
ہو گئی ہے۔ اور راجو تمہیں معلوم ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔ ایک مرتبہ ہماری پڑوسن نے کیا کیا  
وہ ہنسنے لگے۔ ایلچی کی ماں سے اللہ رکھے کل کتنے لڑکے ہیں تمہارے اور یہ پلوٹھی کا ہے  
ہی ہی۔ وہ ہنسنے لگے۔ پھر میری طرف اشارہ کر کے بولی اللہ رکھے۔ "کیوں ایلچی کی ماں  
تجھے۔ ہی ہی ہی ہی حد ہو گئی سنا تم نے راجو۔ ہی ہی ہی ہی۔"

جب علی احمد کو معلوم ہوا کہ وہ ان سے ایک اہم بات کرنے آئے ہیں تو دفعتاً روک  
گئے۔ یہ علی احمد کی پرانی عادت تھی۔ اگر انہیں کسی بات میں خاص اہمیت دی جاتی تو وہ  
کو خاص اہمیت دینا شروع کر دیتے اور خود اپنی رائے کو اہمیت دینے لگتے۔ اور اس کے  
کسی مسئلے میں انہیں نظر انداز کر دیا جاتا تو وہ اس مسئلے کو قطعی طور پر اہمیت نہ دیتے اور  
اندازی کو درخور اعتنا نہ سمجھتے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

علی احمد نے سوچا کہ یہ لوگ اتنی دور سے چل کر آئے ہیں۔ تاکہ مجھ سے بات  
ظاہر ہے کہ مجھ سے بات کرنے کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے تو بات اتنی آسانی سے نہ  
جانی جائے۔

"ہاں ہاں ہاں ہاں۔" وہ ہنسنے لگے "بھئی اب جو تم یہاں آ پہنچے ہو تو اب باتیں ہی  
باتوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے اپنوں کے درمیان۔ ہی ہی ہی ہی۔ اب دیکھ لو راجو ہے  
راجو سے باتیں کرتے ہیں ہم۔ کیوں راجو ٹھیک ہے نا ہی ہی ہی ہی۔ یہ اور بات ہے  
کبھی جواب نہیں دے سکی لیکن کمال یہ ہے کہ لا جواب بھی نہیں ہوتی۔ کیوں راجو  
ہی۔"

"آپ میری بات چھوڑیں۔" راجو بولی۔ "ان سے بات کریں اتنی دور سے نہ  
بات کرنے کے لیے۔"

"ان سے بھی کریں گے ان سے بھی کریں گے۔ لیکن ابھی یہ لوگ سفر کر کے نہ  
پھر اتنی تکلیف جمیل کے۔ انہیں چار ایک دن آرام کرنا چاہئے۔ آرام کرو کھانا کھاؤ۔"



رتگین شخصیت، ان کے انوکھے انداز اور پر کیف انداز گفتگو سے محظوظ نہیں ہوتا تھا۔ رتگین بیٹے کی حیثیت سے دیکھتا اور اپنے مقاصد کے زائے سے ان کی باتوں پر غور کرتا اس لیے رتگین اس کی نگاہ میں دنیا داری مکر فریب چالاک کے مترادف نظر آتی۔ اسے ان کی ہر بات غصہ آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ باپ بیٹے کی لڑائی ہو جاتی تھی۔

منظر آباد میں ایللی نے مسلسل طور پر کوشش کی کہ جھگڑا نہ ہو اس لیے وہ بڑے مردانہ سے کام لیتا رہا۔ علی احمد ایللی کی اس خصوصیت سے واقف تھے اور اکثر جان بوجھ کر ایسا کرتے تھے جنہیں سن کر وہ آگتا جائے اور جھگڑ کر اٹھ بیٹھے تاکہ انہیں بات سے غصے حاصل نہ جائے لیکن ایسے حالات علی احمد ایسے وقت پیدا کرتے تھے جب انہیں بات کی نوعیت کا علم ہوتا اور بات کے متعلق کچھ کرنے کا ان کا اپنا ارادہ نہ ہوتا اس طرح بات کے ٹوٹنے کی تمام تر ذمہ داری ایللی پر عائد ہو جاتی اور علی احمد پر کوئی حرف نہ آتا۔

ان دنوں منظر آباد میں بھی وہ اسی بات سے ڈرتا تھا اسی وجہ سے اس نے ہاجرہ کو بار بار تاکید کی تھی کہ راجو یا شمیم سے بات نہ کرے کیونکہ اکثر مرتبہ ایسے حالات میں وہ راجو اور شمیم کو کہا کرتے بھی کیا معاملہ ہے کچھ پتہ تو لگاؤ یہ کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ اور بات کی نوعیت سمجھ کر وہ یوں ظاہر کرتے جیسے انہیں کچھ علم ہی نہ ہو اور پھر معاملے کی نوعیت کے مطابق عمل کرتے۔ بہر حال نویں روز بھد مشکل بات شروع ہوئی۔

## حق و انصاف

”ہوں۔“ علی احمد بولے ”تو ایللی شادی کرنا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن کر چکا ہے۔ وال روٹی کما سکتا ہے۔ لہذا ضرور کرنی چاہیے اسے شادی۔ اور ایللی کی ماں سناٹا م نے تو ایللی کی منگنی کر رکھی تھی۔ وہ کیا ہوئی۔ بھی ہم نے تو سنا تھا۔ شاید غلط ہو لیکن سناٹا تھا۔ اچھا تو کیا چاہ تھا۔“ انہوں نے ہاجرہ کے اثبات میں سر ہلانے کے بعد کہا۔ ”بہر صورت ہا اچھا کیا تھا تم نے۔ اور اگر تم اب شادی کرنا چاہتی ہو ایللی کی تو ضرور کرو۔ فوراً“ کہہ کر وہیں جا اعتراض ہو سکتا ہے بھی جیسے میرا بیٹا ہے دیے ہی تمہارا ہے میں شادی کروں یا تم کہہ کرے یا ماں کرے کیا فرق پڑتا ہے۔ تو اتنی سی بات کے لیے تم دونوں اتنا لبا ستر کر کے آئے“

”سناٹا جانے کیا ہوا ہے۔ آسمان ٹوٹ پڑا ہے یا زمین ڈوب گئی ہے حد ہو گئی۔ ہی ہی میں راجو۔“

”ہاجرہ بولی ”ایللی وہاں شادی کرنا نہیں چاہتا۔“

”تپ مجھے کیوں درمیان میں گھسیٹ لیتے ہیں۔“ راجو غصے میں بولی۔

”وہ مسکرائے۔“ خواہ مخواہ بگڑ رہی ہے بھی تو میری بیوی جو ہوئی۔“

”وہ بھی تو بیوی ہی ہے نا۔“ راجو نے شمیم کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں ہاں بالکل ہے بے شک وہ بھی بیوی ہے۔ لیکن درمیان میں گھسیٹنے والی نہیں وہ صرف بیوی ہی ہے۔“ وہ ہنسے۔

”راجو کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔“

”ہاں بھی تو میں کہہ رہا تھا ایللی کی ماں اتنی لڑکیاں جو پڑی ہیں محلے میں کسی ایک کو پکڑ لو۔“

”مگر خیر سر انجام دے دو اللہ اللہ خیر بھلا ہمیں بھی اطلاع کر دیتا۔ ایسا نہ کرنا جیسے منگنی پر کیا ہمیں خبری نہ بھیجی۔ اور ہمیں اطلاع کرو گی ایللی کی ماں تو اگر چھٹی ملی تو انشاء اللہ ضرور ہاں گا اور ان دونوں کو تو چاہے آج ہی لے جاؤ۔“ انہوں نے راجو اور شمیم کی طرف اشارہ کیا۔

”اے ہے۔“ راجو بولی۔ ”محلے میں کوئی لڑکی ہے کام کی۔“

”تو“ علی احمد بولے۔ ”یہ سمجھتی ہے بس یہی ایک کام کی تھی اور اس کے چلے آنے کے لیے پورے محلے میں کوئی کام کی لڑکی باقی نہیں رہی۔“

”آپ میری بات نہ کیا کریں۔“ راجو غصے میں بولی۔

”اچھا“ علی احمد بولے۔ ”سوچ لو۔ شمیم بھی یہی کہہ کرتی تھی۔ اور میں نے شمیم کی بات مان لی تو اب خود ہی ناراض بیٹھی ہے۔ کہتی ہے مجھ سے بات نہیں کرتے۔“

دیکھو ایلی کی ماں "علی احمد نہایت سنجیدگی سے بولے۔" ایلی کی شادی کا براہ راست  
 ہندسہ قلع ہے۔ ایک تو ایلی خود ہے جس نے شادی کرنی ہے اور دوسرے ہم سب تم  
 ہاں۔ راجو شیم اور میں جنہوں نے لڑکی کے ساتھ رہتا ہے تو ایلی کی شادی دونوں پارٹیوں  
 ہی شور سے ہونی چاہیے۔"

منجک ہے۔ "ہاجرہ نے کہا۔  
 میں راجو یہ بات حق و انصاف کی ہے یا نہیں۔"

ہمارے تو مناسب "راجو نے جواب دیا۔  
 جس کی صورت یہ ہو سکتی ہے۔" علی احمد نے کہا "یا تو ہم لڑکی کا چٹاؤ کریں اور ایلی  
 ہند کرے اور یا یہ کہ ایلی چٹاؤ کرے اور ہم اسے پسند کریں۔ کیوں راجو۔ ہے ناحق و  
 کی بات۔"

اور اگر آپ چٹاؤ ہی نہ کریں تو — "راجو بولی۔

میں موقع دوں۔ آج بات کی ہے ایلی کی ماں نے۔ ہمیں چھ مہینے کی مہلت دی جائے چھ  
 ماہ ہم لڑکی کا چٹاؤ کریں گے۔ اسے آزمائیں گے۔"

ارو ایلی کو پسند نہ آئی تو۔ "شیم نے کہا۔

تو ہر موقع دیا جائے تاکہ کوئی اور پسند کریں۔ انصاف کی بات ہے نا۔"

میں آپ پسند کرتے رہیں — حتیٰ کہ ایلی بوڑھا ہو جائے۔ "راجو بولی۔ "اچھا تو

اور صورت ہے۔" علی احمد بولے "ایلی ہمیں چار یا پانچ لڑکیوں کے نام دے دے جن سے  
 لڑکے کے لیے تیار ہے ان میں سے ہم ایک چن لیں گے۔"

میں نے لگا چار پانچ نام — وہ بولا "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔"

مجھے لڑکی تو بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ "راجو بولی۔

تو ایک لڑکی ہے جو بڑی مشکل سے تلاش کی ہے۔ "ہاجرہ نے کہا۔ "ایسی لڑکی کہاں ملتی  
 نا کہ۔"

علی احمد خاموش ہو گئے۔

میں تجلب کیوں نہیں دیتے۔ "راجو نے کہا۔

"بس میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکے کوئی۔" شیم بولی۔

"اے ہے آپ خواہ مخواہ دوسری بات چھیڑ بیٹھے۔" راجو نے کہا "یہ ایلی کی بات نہ  
 کرو۔ میں کہتی ہوں محلے میں کوئی کام کی لڑکی ہو بھی۔"

"اوہو۔" علی احمد بولے۔ "بیا سب کام کی ہوتیں ہیں۔ چاہے ناک اونچی ہو یا نیچی ہو  
 رنگ گندی ہو یا سانولا۔ آنکھ موٹی ہو یا چھوٹی۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"ہوں فرق نہیں پڑتا۔" شیم چلائی۔ "فرق نہیں پڑتا تو خود اتنی شادیاں کرنے کی  
 ضرورت تھی۔"

"ہائیں۔" وہ ایک ساعت کے لیے رکے۔ پھر ہنسنے لگے "بھئی اتنی شادیاں نہ کرنا تو ہم  
 نکتہ کا پتہ کیسے چلتا۔ اتنی شادیاں کرنے کے بعد تو یہ تجربہ ہوا۔ ہی ہی ہی ہی۔ ایلی کو تو اس بار  
 کا تجربہ نہیں جیسی اسے بتا رہا ہوں۔ ہی ہی ہی ہی ہی۔"

"لیکن۔" ہاجرہ بولی "ایلی محلے میں کسی سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔"

"ہائیں۔" دفعتاً علی احمد خاموش ہو گئے۔ "محلے میں نہیں کرے گا تو باہر اسے کون لڑا  
 دے گا۔"

"کیوں اسے کیا ہے۔" راجو بولی۔

"بھئی آخر باہر والے کسی بات پر لڑکی دیتے ہیں۔ یا دولت ہو یا عمدہ ہو یا پھر —  
 خیر۔ نہ یہاں دولت ہے نہ عمدہ۔"

"وہ تو دینے کو تیار ہیں۔" ہاجرہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہ —" علی احمد بولے "کون ہیں وہ؟"

"بڑے اونچے کھاتے پیتے ہیں باعزت خاندان سے ہیں۔ باپ ریاست میں وزیر ہیں۔  
 بڑے عہدوں پر فائز ہیں لڑکی کو ہم دیکھ آئے ہیں۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔"

"اوہ —" علی احمد بھونچکے رہ گئے۔

"بس آپ کی رضامندی اور صرف آئیر باد کی ضرورت ہے۔" ایلی بولا۔

"ہوں —" علی احمد دفعتاً سنجیدہ ہو گئے۔ "تو یہ بات ہے۔"

"آپ کے شامل ہوئے بغیر —" ایلی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

مٹلے میں میں مجبور ہوں۔ میں مجبور ہوں میں مجبور ہوں۔“

چاروں طرف ٹھہرا ہوا پانی ابھر رہا تھا۔ پانی ہی پانی ہی پانی ہی پانی۔ آسمان پانی میں گر کر ڈوب جاتا تھا۔ کہیں کہیں اس کے ٹکڑے ٹکڑے دکھائی دے رہے تھے۔  
دھنسا باہر کوئی چیخنے لگا۔ ”گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔“

”ہاں“ ہاجرہ بولی ”یہ رشتہ جو ہم نے چنا ہے۔“

”یہ رشتہ —“ علی احمد رک گئے۔“

”ہاں ہاں یہ رشتہ“ ہاجرہ نے دہرایا۔

”اس سے اچھا رشتہ نہیں ملے گا۔“ راجو بولی۔

”جو جو کچھ بتایا ہے ایللی کی ماں نے اس کے مطابق تو بڑا اچھا رشتہ ہے۔“ ٹیم نے لڑکھاتے ہوئے کہا۔

”بات کیجئے نا“ راجو علی احمد کو خاموش دیکھ کر غصے میں چیخنے لگی۔

”یہ رشتہ مجھے پسند نہیں“ علی احمد نے کہا۔

ایللی کا دل ڈوب گیا۔

”لیکن وجہ؟“ ہاجرہ غصے میں بولی۔

”وہ بہت اونچے لوگ ہیں۔“ علی احمد نے سنجیدگی سے کہا۔

”یہ تو الٹا اچھا ہے۔“ راجو دبلی زبان سے بولی۔

”میں بہت چھوٹا شخص ہوں۔“ علی احمد کہنے لگے ”اور میں اعلیٰ اور اونچے خاندان

رشتہ نہیں کروں گا۔ میں تو اپنے بچوں کا وہاں رشتہ کروں گا جہاں میری ایک حیثیت ہو

میری بات کو اہم سمجھا جائے جہاں میری عزت ہو۔ جہاں —“

”اے ہے وہ تو بڑی عزت کرنے والے لوگ ہیں۔“ ہاجرہ بولی۔

”نہیں یہاں نہیں ہو گا۔“ علی احمد نے کہا۔ ”اگر میری رضامندی کوئی حیثیت رکھتی ہے

یہاں نہیں ہو گا۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ بیٹھے اور اپنی ڈسک پر بیٹھ کر حساب کے رجسٹر میں لکھنے

مصرف ہو گئے۔

منظر آباد سے واپسی پر ایللی کے سامنے چاروں طرف پانی ہی پانی کھڑا تھا اور پانی کے

پھیلاؤ میں گاڑی ہو تک رہی تھی وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ پھیلا ہوا پانی علی احمد کا انکار تھا

یہ انکار ہی انکار اور اس پر چاروں طرف اس آسمان محیط و مسلط۔

گاڑی کراہ رہی تھی۔ ہوا شائیں شائیں کر رہی تھی۔ ہاجرہ گھٹنوں میں سر دے بیٹھی تھی

ایللی کھڑکی سے باہر ٹٹکتی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔

”دور دور“ ساوی یہ کہتے ہوئے بھاگی جا رہی تھی۔ ”نہیں میں وعدہ کر چکی ہوں“

مٹی اُتار کر رہے تھے۔  
ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ راجہ پورس ہو۔ اور منہ میں گھاس لئے سکندر کے روہرو  
بہت کھٹ کرنے جا رہا ہو۔ ”مجھ سے ایسا سلوک کرو جیسا بادشاہ شکست خوردہ غلاموں سے  
کرتے ہیں۔“

وہ محسوس کر رہا تھا کہ ان سب کو اس کی شکست کا علم تھا۔ وہ اس کے منہ کے گھاس کو دیکھ  
رہے تھے۔ وہ اس کی شکست پر خوش تھے۔ لیکن وہ سکندر کون تھا جس کے روہرو پیش ہونے  
ایسا جارہا تھا۔ نہ جانے کون تھا۔ بہر حال وہ سکندر تھا وہ فاتح تھا وہ اس کا منتظر تھا۔  
چوگان میں انہیں مل دیکھ کر رک گئی اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

”ہے تم ہاجرہ۔“ وہ چلائی ”جو جی کی ماں لویہ آگئے۔“

”کون آگئے۔“ ایک کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔

”کیا کہاں“ دوسری چلائی۔

”ہے ہاجرہ تم ہو کیا۔“

”اب کیا مل بیٹا نیا گل کھلا کر آئے ہیں۔“

”میں کتنی ہوں بسن پرانے بندھنوں کا بھی خیال کر لیا کرو۔ کب تک آگے دوڑ اور پچھلے  
اوپر عمل کرو گی۔“

”تو تو ہاجرہ لڑکے کے پیچھے دیوانی ہو گئی۔“

ہاجرہ حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کی تعداد ہر ساعت بڑھتی جا رہی تھی کوئی  
لے لے کر رک جاتی کوئی کھڑکی سے سر نکالتی۔ کوئی چھت سے جھانکتی چند ساعت تو ایلی  
لڑائیت سے ان کی طرف دیکھتا رہا پھر وہ بھاگا اندھا دھند بھاگا۔ اس نے محسوس کیا جیسے  
جتن میں ڈانٹوں نے اسے گھیر لیا ہو۔

”بے تم“ راجہ نے ایلی کو دیکھ کر سینہ تھام لیا۔ اس کی آنکھیں ابل آئیں اور وہ حیرت  
میت بنی دیکھتی رہی۔

ایلی ڈر گیا۔ نہ جانے کیا بات۔

”گو تم آگئے۔“ جانو اسے دیکھ کر ٹھٹھکی اور اس نے چیخ سی ماری شتراد کے ہاتھ  
پھیل کر پڑی اور فرش پر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اس کے قریب ہی صفدر کھڑا حیرت سے

## چھ لڑکیاں

علی پور علی پور — اس کے کان میں آوازیں پڑیں۔

ایلی چونکا — گاڑی ایک دھچکے سے رک گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ نام مانوس سا ہو۔ جیسے وہاں اسے کچھ کرنا ہو۔ اس نے سامنے  
دیکھا ہاجرہ سوٹ کیس اٹھانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ وہ سلمان اٹھانے لگا باہر پلیٹ فارم پر  
دھندلکے کا ایک پھیلاؤ تھا۔ اس پھیلاؤ میں گویا لوگ تیر رہے تھے۔ وردی والا بابو ہاتھ میں  
جھنڈی اٹھائے گھور رہا تھا۔ سر پر بسترے اٹھائے وہ ایک سرخ پوش بہاؤ کو چیرتے ہوئے جا رہے  
تھے۔

دفعۃً ایک چہرہ ان کی طرف بڑھا۔ قریب اور قریب اس چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ  
تھی۔

”تم ہو بسن۔“ چچا عماد کہہ رہا تھا۔ ”تم کہاں گئے ہوئے تھے۔ محلے میں تمہاری ڈھونڈ بگنی  
ہوئی تھی۔ ہر جگہ پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔ جلدی پہنچو جلدی ورنہ وہ چلے گئے تو پھر کیا فائدہ۔“

ذرا مہجور والی جا رہا ہوں۔ ”یہ کہہ کر اس نے ایک ڈبکی لگائی اور دھندلکے میں گم ہو گیا۔

ڈھونڈ مچی ہے۔ ہاجرہ بڑبڑانے لگی۔ ڈھونڈ کیوں مچی ہے۔ کیوں مچی ہے ڈھونڈ بگنی  
ہے۔ ڈھونڈ مچی ہے — یکے کے پیچے چیخ رہے تھے۔

جب وہ بازار میں پہنچے تو دور سے حکیم نے انہیں دیکھا اور پھر اشارہ کرنے لگا۔ بہت سے  
لوگ جھک جھک کر مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دودھ والے کا، دوکان پر لوگ ان کے

”سہ سہی اور کون۔“ رابعہ بولی۔

”سہی۔“ ایلی کا دل ڈوب گیا۔

”سہی“ ہاجرہ نے زیر لب کہا۔ ”کہاں آئے تھے۔“

”یہاں یہاں علی پور میں۔ شہزاد کے گھر پورے دو دن رہے۔“ رابعہ چلائی۔

”شہزاد انتظار کرتے رہے۔“ جانو بولی۔

”وہ اس کی بہن اور اس کی خالہ۔ تینوں۔“

”یہاں آئے تھے؟“ ہاجرہ نے حیرت سے پوچھا۔

”یہاں یہاں یہاں یہاں دو دن یہاں رہے وہ۔ اتنی پیاری ہے وہ سادی اتنی رنگین اور  
افراد پار کرنے والی اور پھر خوبصورت کوئی جواب ہے اس کا“ رابعہ نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

اک دھند لگا

ایلی کا دل دھک سے رہ گیا۔ آنکھیں دھندلا گئیں۔ پانی ہی پانی پانی ہی پانی چاروں طرف پانی  
اس پر نگاہ پڑا اور اس آسمان قریب ہی کوئی چیخ کر بولا ”گازی آگے نہیں جائے گی۔“

ایلی رونانہ وار بھاگا۔ فرحت کے کمرے میں پہنچ کر وہ دھم سے چارپائی پر گر پڑا۔ اس  
ہاتھ تکیہ میں ڈب دیا۔ پانی ہی پانی۔ تکیہ بھیگ گیا۔ اس نے سر اٹھایا کمرہ  
نمناک دھندلکے سے بھرا ہوا تھا۔ دور ہاجرہ سہی ہوئی کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی

”دھند لگائی ایک روز جوں کا توں قائم رہا۔“

”ایلی بڑھتی گئی۔ پھر مایوسی کے اس تاریک آسمان پر دھندلا گویا امید کا ایک تارا  
ایک رات کیلئے روشنی کی کرن جھلکائی۔“

نہاں میں سہی ضرور کچھ کرے گی وہ گھروالوں پر اثر ڈال سکتی ہے اس کی والدہ اس کا  
بہن اور پھر سارے کیرا موزوں غصے میں غرانے کے بعد رو پڑیں گے منصرف جوش میں  
نہاں دیدہ دلیری پر اسے مارنے کیلئے ہاتھ اٹھائے گا اور پھر اسی ہاتھ سے اپنے آپ کو پیٹنے  
اور ہاتھ پر ہاتھ پھونکے گا اور پھر وہ پڑے گا اور جوش محبت سے سادی سے بغلیں ہو جائے گا

دیکھ رہا تھا۔ چند قدم پرے بیگم اسے گھور رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے مرنے لگا ہے  
بدروح کی شکل میں واپس آیا ہو اور وہ سب ڈر اور حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے ہوں۔  
دیر تک بات کئے بغیر وہ اس کی طرف دیکھتے رہے اتنی دیر میں ہاجرہ بھی آپہنچیں۔ سہی  
پہلے رابعہ بولی۔ ”ہے ایک گھنٹہ پہلے آ جاتے تو۔۔۔“

”اتنے دن تمہاری ڈھونڈھ پڑی رہی۔“

”انتظار میں راہ سکتے رہے۔“

”ہے کتنا ظلم کیا تم نے۔“

”اتنی دیر لگا دی تم نے۔“

”آخر ملتان میں کیوں رکے رہے۔“

وہ سب باری باری بول رہے تھے۔ ایلی کو ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔  
جانے وہ کس بات پر اظہار افسوس کر رہے تھے۔

پھر رابعہ نے طلسم توڑا۔ ”ہے اتنی پیاری ہے وہ کہ کیا بتاؤں۔ اتنی رونق لگا رکھی تھی اس  
نے وہ تو یوں کھل مل گئی جیسے ہم میں سے ہو اتنی اچھی طبیعت مزاج نہیں ہو نہیں خوش  
طبیعت۔ ہنس کھ۔ تم تو اتنے خوش قسمت ہو، وہ ایلی کی طرف دیکھ کر بولی۔

”یہ تو سکندر کا نصیب لے کر آیا ہے۔“ شہزاد بولی۔

”ہے اب جلدی کرو جلدی، نیک کلام میں دیر نہ کرو۔“

”لو وہ اپنے منہ سے کہتی تھی۔ کہتی تھی میں تو تمہاری ہو گئی اب تم بنا لو بات بنے۔“

”توبہ ایسی منہ پھٹ ہونا بھی کیا۔“ بیگم نے جل بہن کر کہا۔

ایلی نے غور سے بیگم کی طرف دیکھا۔

”اوسر کیا دیکھتا ہے“ شہزاد بولی۔ اماں اور کیا کہے گی۔“ وہ ہنسی۔

”اور بہن اتنی خوبصورت اور پھر اتنی اچھی۔“

”یہ تو ساری مر مٹی ہیں اس پر“ شہزاد ہنسی۔

”کوئی ایسی بات کرو جو میرے پلے بھی پڑے۔“ ہاجرہ بولی۔ ”کس کی بات کر رہی ہو۔“

”اے وہ آئے تھے۔“ جانو نے کہا۔

”کون آئے تھے۔؟“

”آئے ہے وہی لاہور والے کیا نام ہے اس لڑکی کا۔“

اور پھر جب وہ ایللی سے ملے گا تو کہے گا۔ ”ایللی صاحب اتفاق سے۔۔۔“

لیکن جلد ہی نوٹے تارے کے وہ روشن ذرات بکھر گئے روشنی بجھ گئی اور وہی تاریکی مٹی۔

”نہیں نہیں اس معاملے میں میں مجبور ہوں۔ میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں کہ اس بات میں ضد نہیں کروں گی۔“ سادی چلاتی۔ ”خاندانی عزت“ وہ طنز سے ہنسی ”ان کی مجبوریاں آخر تسلیم کرنی پڑتی ہیں۔ ہاں اس معاملے میں مجبور ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دور بٹے چلی اور دور دور دور حتیٰ کہ۔۔۔ جوں جوں وہ دور ہوتی جاتی تاریکی چاروں طرف سے پر کرتی۔

منظر آباد سے آنے کے بعد دس پندرہ روز کے لئے تو ایللی بے حد پریشان رہا اس کے میں کئی مرتبہ خیال پیدا ہوا کہ سادی کو ساری بات لکھ دے تاکہ وہ حالات سے واقف رہے؟ پھر اسے خیال آتا کہ یہ بات خط میں لکھنے والی نہیں۔ بلکہ زبانی کرنے والی ہے لہذا وہ سچا بات کیسے بات کرے ملنے کی کوئی صورت بھی تو نہ تھی۔

آخر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ شاید صورت پیدا ہو جائے آخر کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو گی ہی۔ لیکن اس کا لاہور جانا ضروری تھا۔ علی پور میں بیٹھے تو صورت پیدا نہیں ہو سکی سادی کے خط کے انتظار میں تھا۔ خط سے حالات کا کچھ تو علم ہو گا۔ وہ علی پور کیسے آئے تھے کیا چوری آئے تھے یا سب کو علم تھا یا ممکن ہے صرف اہاں سے بات کی ہو اور پھر علی پور کے بعد ان کے تاثرات کیا تھے لیکن سادی کا کوئی خط موصول نہ ہو رہا تھا۔ ہر روز ایللی امید لگا بیٹھ رہتا۔ ڈاکیہ کی آمد کے وقت ہر آہٹ پر اس کے کان بجتے لیکن سادی کا خط موصول نہ ہوا اب مزید انتظار کرنا ممکن نہ تھا۔ لہذا اس نے لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔

گاڑی میں وہ مختلف قسم کے منصوبے بنا رہا۔

لاہور پہنچتے ہی ایسے وقت سفید منزل جاؤں جبکہ گھر کوئی نہ ہو۔ منصر دفتر کیا ہوا۔ کالج میں ہو ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی صورت نہ ملے ممکن ہے اہاں آیا ہو۔

فرض کیجئے گھر کوئی نہ ہو پھر بھی والدہ تو ہوں گی۔ اور اب شاید وہ سادی کو اس کے سے بلانا پسند نہ کریں۔ بلا بھی لیں تو وہ ان کے سامنے یہ بات کیسے کہے گا۔ بات کی نوعیت کیا ہے؟

کسی کے روبرو نہیں ہو سکتی۔ باقی کے روبرو بھی نہیں تو پھر۔۔۔ اگر وہ ایک مرتبہ سفید منزل میں چلا گیا تو پھر سب کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ لاہور آیا ہوا ہے۔ اس کے بعد سادی سے یہ ملاقات کی صورت نہ رہے گی اور اگر سفید منزل نہ جائے تو پھر سادی کو کیسے معلوم ہو گا کہ لاہور آیا ہوا ہے۔۔۔ نہیں نہیں یہ ناممکن ہے۔ سادی کو خفیہ پیغام بھیجنا ممکن نہیں۔

ایللی اسی اوجیز بن میں مصروف تھا کہ گاڑی لاہور کے سٹیشن میں داخل ہو گئی ایللی گاڑی سے اتر۔

ہوٹل میں سالان رکھ کر وہ سیدھا سفید منزل پہنچا۔ صدر دروازہ بند تھا۔ اس نے دستک۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے پھر دستک دی۔

جب ایللی نے تیسری مرتبہ دستک دی تو بوڑھا ستہ جو گلی سے گزر رہا تھا ہنس کر بولا ”میاں دیکھ تو دے رہے ہو پر دروازے پر تو تالا پڑا ہے۔“

”تالا۔۔۔“ ایللی نے حریت سے دہرایا۔۔۔ دروازے پر واقعی تالا پڑا تھا۔

”لیکن“ وہ چلایا ”یہ لوگ کہاں ہیں۔“

”میاں کیس گئے ہوں گے۔“ ستہ نے کہا۔

دیر تک ایللی وہیں کھڑا رہا کہ کسی سے پوچھے لیکن کوئی ادھر سے نہ گزرا۔ ساتھ والے گھر کا دروازہ کھٹکنا کر پوچھنے کی اس میں جرات نہ تھی۔

شام کو وہ منصر کے دفتر میں پہنچا لیکن وہاں بھی تالا لگا ہوا تھا۔ ”ارے“ وہ حیرانی سے چلایا ”ہیل بھی تالا“ سامنے دوکان پر جا کر اس نے پتلاڑی سے پوچھا۔

”کیوں بھی یہ دفتر نہیں کھلے گا آج۔؟“

”یہ دفتر“ پتلاڑی بولا۔ ”یہ دفتر تو بند۔ کیا یا بوجی۔“

”بند ہو گیا۔“

”جی آٹھ روج ہوئے بند ہوئے اسے۔“

”کیا کسی اور جگہ چلا گیا۔“

”یہ تو عالم نہیں یا بوجی۔“

دوکاندار کی بات سن کر ایللی نے محسوس کیا جیسے اس کے روبرو ایک آہنی دیوار آکھڑی ہو۔ ہوٹل میں پہنچ کر ساری رات وہ سوچتا رہا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس سے دریافت کرے لوگوں کے دوستوں سے وہ واقف نہ تھا۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ موتی دروازے کے ایک محلے

میں دھنسا ہوا تھا۔ ریت ریت ریت۔ منناک دھند لگا اور ریت!!

ادب صاحب

سادی کے یوں اطلاع دیئے بغیر چلے جانے پر ایلی غم نہیں بلکہ حیرت محسوس کر رہا تھا کم از کم اطلاع تو دی ہوتی۔ سادی کو اس کے گھر کے لوگ جانے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن یہ گمراہوں نے چالاکی سے اسے ہسلا پھسلا کر رضامند کر لیا ہو اور وہ دھوکے میں آگئی ہو پھر نے جان بوجھ کر نوکری سے استعفیٰ دے دیا ہو تاکہ ان کے لاہور میں رہنے کا جواز نہ ہے اور یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہو کہ ایلی سے سادی کا جذباتی تعلق ٹوٹ جائے۔ نہ بھی لے تو اس میں شدت نہ رہے۔ دوری اور وقت مل کر اس کی توجہ کو کسی اور طرف منحطف لے لیں میں مرثیت ہوں۔

جب اسے یہ خیال آتا تو دکھ محسوس ہوتا۔ دراصل ایلی کو منصر سے محبت ہو چکی تھی۔ منصر کا آئیڈیل بن چکا تھا۔ اور منصر کی حیثیت سے ایلی کے ذہن میں اگر سادی سے زیادہ نہ تھی تو یہ صورت میں اس سے کم بھی نہ تھی۔

منصر کا وہ حسن اس کا بانیسین رنگینی طبع اس کی خودداری اور اس کے علاوہ منصر کی نسبت سے خلوص بھری محبت کی شعاعیں سی نکلتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں ایسی شعاعیں جو کسی نہیں بلکہ محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے ہلاکی سردی میں کوئی انجمانی انگلیٹھی کے پاس جا بیٹھا ہو۔

ایلی کی سب سے بڑی بد قسمتی یہ تھی کہ وہ درپردہ منصر سے محبت رکھا بیٹھا تھا حالانکہ سادی نے کئی بار غلطوں کے ذریعے اور زبانی اسے خبردار کیا تھا۔ ”دیکھنا یہ نہ بھولنا کہ یہ سب لوگ ہل می وی وجہ سے — آپ سے التفات محسوس کرتے ہیں۔ صرف میری وجہ سے ورنہ ناگاہی چلے تو —“ سادی کی تنبیہ کے باوجود ایلی منصر کا ہو چکا تھا۔ وہ منصر کی ہدایات پر توجہ نہیں کرتا تھا لیکن ان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسے تکلیف محسوس ہوتی تھی۔

”نہیں نہیں“ وہ آپ ہی چلایا ”منصر ایسا نہیں کر سکتا۔ منصر اسے دھوکا نہیں دے گا۔ منصر کوئی مجبوری پیش آگئی ہوگی کہ انہیں لاہور کو خیر باد کہنا پڑا ورنہ منصر — اگر قطع تعلق نہ کر دے تو وہ اعلان یہ کہہ دیتا۔“ ایلی صاحب اگر آپ سادی کے راستے سے ہٹ جائیں تو منصر کا منہ منہ ہوں گا۔ پھر ایسی چال چلنے کا فائدہ۔ نہیں نہیں منصر ایسا نہیں کر سکتا۔“

میں ان کے رشتہ دار رہتے تھے جہاں رانا کی شادی پر وہ گیا تھا۔ اسے وہ راستہ اچھی طرح یاد تھا لیکن آخر وہاں جا کر وہ کس کا دروازہ کھٹکھٹائے کس سے پوچھے اور اگر انہوں نے پوچھا میں تم کوں ہو تو وہ کیا جواب دے گا۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا — ڈاکٹر وہی ڈاکٹر جس نے دوپٹے کی چوری کے موقع پر اسے تسلی دی تھی۔ ”مجھے سب معلوم ہے گھبراؤ نہیں۔“

صبح سویرے ہی ڈاکٹر کے مکان پر جا پہنچا۔

”معاف کیجئے۔“ وہ بولا ”آپ کو تکلیف دی۔“

ڈاکٹر اسے دیکھ کر ہنسنے لگا ”کیوں کیا پھر دوپٹہ چرانے کا ارادہ ہے۔“

”جی نہیں“ ایلی مسکرایا۔

”لیکن اب تو دوپٹہ چرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ لوگ تو چلے گئے۔“

”چلے گئے۔“ ایلی نے حیرت سے پوچھا ”کیوں؟“

”انہوں نے یہ مکان بیچ دیا۔ منصر صاحب نے دفتر میں استعفیٰ دے دیا اور وہ ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلے گئے ہیں۔“

”ہمیشہ کیلئے۔؟“ ایلی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

”منصر صاحب کے والد کسی ریاست میں اونچے عہدے پر فائز ہیں۔“ ڈاکٹر نے مکرانے

ہوئے کہا ”اس لئے غالباً“ انہوں نے سب کو وہیں بلا لیا ہے۔“

”لیکن —“ ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

ڈاکٹر نے اسے تھپکنا شروع کر دیا ”میرے نوجوان دوست زندگی میں ایسے واقعات اکثر

ہوتے رہتے ہیں۔ شروع شروع میں انسان دکھ محسوس کرتا ہے یہ عمر ہی ایسی ہے پھر آہستہ

آہستہ —“ وہ مسکرایا ”سب ٹھیک ہو جائے گا وقت لا جواب مرہم ہے۔ چائے پیئیں

آپ۔“

”شکریہ۔“ ایلی گنگٹیا اور گردن لٹکا کر چل پڑا۔ اسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ وہ ڈاکٹر

صاحب سے سلام علیکم کئے بغیر شکر یہ ادا کئے بغیر چل پڑا تھا۔ اس کے رد برد ایک خوفناک دھند

پھیلا ہوا تھا تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ مناظر اپنا مفہوم کھو چکے تھے آوازیں مٹ چکی تھیں

میں تبدیلی ہو چکی تھیں۔ لاہور طے کا ایک ڈھیر دکھائی دے رہا تھا اس کے رد برد تو مگر قافلے



کئی ایک روز ایلی اس سلسلے پر سنجیدگی سے سوچتا رہا۔ مگر زیادہ سوچنے سے بات لڑیم  
بچیدہ ہو گئی حتیٰ کہ وہ الجھ کر رہ گیا۔

پھر سادی کا خط موصول ہوا۔ لکھا ہوا تھا ”بھائی جان کی وجہ سے میں مجبور ہو گئی۔  
بھائی جان کے لئے اس کے سوا اور چارہ کار نہ تھا کہ لاہور چھوڑ کر یہاں ریاست گرد گل میں  
جائیں مجھے بھائی جان سے محبت ہے۔ آپ جلتے ہیں تو پڑے جلتے۔ میں بھائی جان کیلئے سب  
قربان کر دینے کے لئے تیار ہوں چاہے میری جان ہی کیوں نہ جائے۔

لیکن گھبرائیے نہیں ہمارے یہاں آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ اپنے وار  
صاحب سے بات کر کے ان کے ہاتھ پیغام بھیجنے میں سستی نہ کریں چونکہ میرے والد صاحب  
بڑے رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں اور ابا کے سامنے اپنی دال نہیں کھتی لہذا یہ کام تو آپ کو کرنا  
ہو گا۔

”یہاں کب آئیں گے آپ کی منتظر رہوں گی۔ منتظر ہوں۔“

سادی کا خط پڑھ کر ایلی کو خوشی کی بجائے الانغم ہوا اور وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا۔

”والد صاحب“ وہ زیر لب بولا ”بڑے رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں۔ والد۔۔۔ اور۔۔۔ ام“

کاجی چاہتا تھا کہ قلمہ مار کر ہنس پڑے اور دیوانہ وار چلائے ”والد صاحب ہا ہا ہا ہا“

”والد صاحب۔ والد صاحب بڑے رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں۔ ہا ہا ہا۔“

”والد صاحب۔ والد صاحب کے سامنے ہماری دال نہیں کھتی۔ ہی ہی ہی۔“

”والد صاحب سے کون بات کرے۔ اور کی بھی جائے تو کسی احسن طریق سے کی جائے

والد صاحب کی رضامندی ضروری ہے۔ انہیں خود پیغام لانا چاہئے۔“

”نہیں مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ بچوں کا رشتہ ایسے گھراؤں میں

ہو جہاں میری حیثیت ہو۔ میری عزت ہو۔ میری آؤ بھگت ہو۔ میری عزت۔۔۔“

— والد صاحب۔“

ایلی کاجی چاہتا تھا کہ دیوانہ وار باہر نکل جائے اور لوگوں کو اپنا پیغام سنائے ”تمہارے بل

والد صاحب ہیں کوئی۔ ان سے بچو۔ والد صاحب سے بچ کر رہو۔ ان سے دور رہو۔ وہ ایک نئی

جاگتی لعنت ہیں۔ بد قسمتی ہیں۔ ان کا رکھ رکھاؤ جھوٹ ہے ان کی خاندانی عظمت فریب ہے

والد صاحب ایک سردہ ہیں جو فریب سے گھر کی گدی پر آ بیٹھے ہیں۔ والدہ محترمہ نے انہیں

مرد مار کھا ہے تو کسی ذاتی غرض کی وجہ سے — والدہ محترمہ نے اپنی آسانی کے لئے  
مرد مار کھا ہے تو زور دو ان جوں کو توڑ دو۔“

انہما بیت مار کھا ہے ایلی کو اپنے باپ سے میر تھا۔ اسے علی احمد کو دیکھتے ہی غصہ آ جاتا تھا۔ باپ کی

بچپن ہی سے ایلی کو اپنے باپ سے محبت سے محروم رہا تھا۔ باپ کی وجہ سے وہ نوکرانی کا بیٹا تھا باپ کی وجہ

وجہ سے ہی والدین کی محبت سے محروم رہا تھا۔ باپ کی وجہ سے وہ نوکرانی کا بیٹا تھا باپ کی وجہ

لے سستی اور کبھی عورتوں کے لئے چلیا تھی دھوپ میں بوتل میں رہت سے پانی بھرنا پڑا

نڈا باپ کی وجہ سے محلے والیاں کہا کرتی تھیں ”بسن آخر بیٹا کس کا ہے اپنے باپ کے قدموں

پر چلے گا اور کیا وہ بھی گودی میں پلا تھا۔ یہ بھی گودی میں پل رہا ہے“

نور والد صاحب ہی کی وجہ سے آج ایلی کے ہاتھ سے سکون اور اطمینان سے زندگی بسر

کرنے کا موقعہ ہمیشہ کے لئے جا رہا تھا۔ اگر سادی چھن گئی۔ اگر اس کی پناہ گاہ ہاتھ سے جاتی رہی

نہ۔۔۔ تو۔۔۔ ایلی نے دانت بھیجنے لئے تو۔۔۔ تو میں گندی بد رو میں چھلانگ لگا دوں

میں اپنا آپ کتوں کو کھلا دوں گا۔ میں اپنے تعفن کو چاروں طرف پھیلا دوں گا۔ میں بھی گودی

میں پلں گا۔ میرے کمرے میں بھی ٹین کا سپاہی برسر پیکار رہے گا۔ والد صاحب زندہ باد

احمد باد

برائے نگاہ

پھر جوالی کو ہوش آیا تو اس کے سامنے ہاجرہ اور فرحت سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔

”کیوں ایلی“ ہاجرہ کہہ رہی تھی ”خیر تو ہے۔“

”خیر۔۔۔“ اسے بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

”جئے کیا ہوا ہے ایلی“ فرحت پوچھ رہی تھی۔

”مجھے۔۔۔“ وہ بولا ”کیوں؟“

”تمہی چنیں تو سارے محلے میں سنائی دے رہی تھیں بیٹا۔“

”چنیں۔۔۔“ اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

”نہ بیٹا“ ہاجرہ قریب آ کر بولی ”خود کو اختیار میں رکھا کرتے ہیں۔ اللہ کرے گا کوئی نہ کوئی

موت نکل ہی آئے گی۔“

”وہ تو خیر نہ جانے کب نکلے گی۔ لیکن جو صورت نکلی ہوئی ہے اسے تو دیکھو ذرا“ شہزاد

داخل ہو کر بولی۔  
 ”کیا نکلی ہوئی ہے۔؟“ ہاجرہ نے کہا۔  
 ”یہ“ شہزاد نے بڑھ کر ایلی کی ٹھوڑی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔  
 ”اب تو تو بھی نہیں آتی۔“ فرحت بولی ”آج نہ جانے کتنی دیر کے بعد شکل دکھائی ہے۔“  
 ”میری شکل —“ وہ ہنسی ”میری شکل دیکھ کر پہلے تم کب خوش ہو ا کرتی تھیں مرز  
 ایک ایلی تھا اور اب اسے اپنی سدھ بدھ نہیں رہی — کیوں ایلی“ وہ چلائی۔  
 ”اپنی سدھ بدھ پہلے کب تھی۔“ ایلی نے اسے چھیڑا۔  
 ”اچھا“ اس نے منہ پکا کر کے جواب دیا ”میں کبھی پہلے تھی۔“  
 ”اگر سمجھ لیتی تو بات نہ بگڑتی۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”نت ت — تم نے ہی سمجھا دیا ہوتا“ وہ ہنسی ”چل تجھے چائے پلاؤں۔ یہاں اکیلا  
 بیٹھا رہتا ہے فصول چل۔“ شہزاد نے اسے پکڑ لیا۔  
 ایک ساعت کے لئے ایلی نے شدت سے محسوس کیا کہ سب کے روبرو شہزاد کو اپنے  
 بازوؤں میں جکڑ اور اس کا بند بند چومنا شروع کر دے اور پھر چلا کر کہے: ”چل اگر یہی ہے تو یہی  
 سہی۔“  
 اس نے شہزاد پر ایک برہنہ نظر ڈالی اور اس کی طرف بڑھا۔  
 شہزاد بھانپ گئی اور پھدک کر پیچھے ہٹی اور پھر بھاگی۔ ”آؤنا پھر۔“ وہ چلائی۔ ”جلدی  
 آؤ۔“ ایلی بھاگا۔  
 اس وقت نہ جانے ایلی کو کیا ہو گیا تھا۔ اس وقت گویا وہ اپنے آپ میں نہ تھا۔ جیسے کوئی اور  
 روح اس کے جسم میں حلول کر گئی تھی۔ وہ بھول چکا تھا کہ ہاجرہ اور فرحت کھڑی دیکھ رہی ہیں۔  
 وہ بھول چکا تھا کہ شہزاد شریف کی بیابتا بیوی ہے وہ بھول چکا تھا کہ اسے سدا سے مت ہے۔  
 اپنا آپ بھول چکا تھا۔ اس وقت اسے کسی فرد یا اصول کا لحاظ نہ تھا۔ وہ نگاہ تھا۔ شرم و حیا سے  
 قطعی طور پر بے گانہ۔ اسے صرف ایک خواہش تھی۔ کہ اعلانیہ اپنے آپ کو کنوین میں پہنک  
 دے اور پھر بھینس کی غلاظت میں لت پت ہو جائے۔ اس کا شدت سے جی چاہتا تھا کہ سب کے  
 روبرو اپنی تذلیل کرے۔ سب کے روبرو کسی کی تذلیل کرے۔  
 شہزاد نے مڑ کر ایلی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خوف سے بھیاںک ہو رہا تھا۔ یا شاید ایلی کا

بہشتی شہزاد پر بھی اثر کر چکی تھی۔ اور اس کا چہرہ ڈر نہیں بلکہ کسی اور جذبے سے بھیاںک ہو  
 رہا تھا۔ ممکن ہے دونوں ہی باتیں درست ہوں اور ایلی کے قرب سے خائف تھی اور اس کی آرزو  
 کر رہی تھی۔  
 اگر اس وقت بیڑیوں میں ایلی کا پاؤں نہ پھسلتا اور وہ دھڑام سے نہ گرتا تو اس کی زندگی  
 میں انقلاب کا دھارا کسی اور رخ پر چل پڑتا حالات نئی کروٹ لیتے۔ لیکن گرتے ہی اس کی توجہ  
 ہٹ کی طرف مبذول ہو گئی اور اس کو یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ شہزاد اس پر جھگی ہوئی ہے اور  
 اسے اسی برہنہ نگاہ سے دیکھ رہی ہے۔  
 کچھ دیر کے بعد ایلی چارپائی پر پڑا ہوا تھا دفترا“ اسے خیال آیا کہ اس وقت اسے کیا ہو گیا  
 تھا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ عجیب سی وحشت تھی عجیب سی اس وقت اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا  
 جیسے شہزاد کا بھت ہو اور وہ خود رینگھ۔ کتنے خطرناک عزائم لئے وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔  
 اور شہزاد نے جب مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہ میں کس قدر خوف تھا — لیکن  
 اس خوف میں لذت کی جھلک تھی وحشت بھری لذت اور پھر وہ نگاہ جو شہزاد نے اس پر ڈالی تھی  
 بے درد گر پڑا تھا۔ کیا شہزاد خواہش کے مجذوبانہ اظہار کو پسند کرتی تھی لیکن وہ تخلصیے میں بھی  
 خواہش کے اظہار سے گھبراتی تھی وہ تو آرزو کی ہلکی پھلکی کی دلدادہ تھی۔ موسلا دھار بوجھاڑ کو وہ  
 کیسے پسند کر سکتی تھی۔ لیکن اس وقت — ایلی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

کیا کبھی عورتیں ایسی ہوتی ہیں آرزو کے ہلکے سے اظہار کو ناپسند کرتی ہیں۔ براماتی ہیں۔  
 لیکن مجذوبانہ وحشت بھری خواہش کے اعلانیہ اظہار کے روبرو انکار رکھ رکھاؤ احتیاط ضبط سب  
 اٹھاپش ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی نگاہ میں فخر بھری انبساط جھلکتی ہے اور ایک ساعت کے لئے  
 انہم دنیا اور پابندیوں سے آزاد ہو جاتی ہیں۔

ایلی نے کئی ایک مرتبہ دیکھا تھا کہ وہ شہزاد جو خواہش کے عملی اظہار سے ڈرتی تھی۔ اور  
 تجلیے میں بھی اس سے بچنے کی کوشش کیا کرتی وحشت بھرے اعلانیہ اظہار پر اس میں ایک  
 لبیکینت پیدا ہو جاتی جیسے سانپ کو دیکھ کر چوبیا بموت ہو کر بے حس ہو جاتی ہے اور پھر  
 لہلہام میں شہزاد کو بھول جاتا کہ وہ شریف کی بیوی ہے چار بچوں کی ماں ہے اور — گویا  
 گم ہو کر بھول جاتا تھا اور وہ بے پروا بے خوف ہو کر میدان میں آکھڑی ہوتی دعوت دیتی کہ وہ  
 وحشت طوفان بن کر چلے لیکن ایسے مواقع پر ایلی گھبرا جاتا تھا۔ اور قدم پیچھے ہٹا لیتا تھا۔ یہ دیکھ

ہاں سر۔ ”فرحت مسکرائی۔ ”نوکری گھر بیٹھے تو نہیں ملتی انسان تلاش کرتا ہے جو تے نوکری۔“ فرحت مسکرائی۔ ”لیکن یہ تو اور باتوں میں کھویا بیٹھا ہے۔“  
 ”اب تو چھوڑ اس بات کو۔“ ہاجرہ بولی ”اللہ کرے امر تر نوکری مل جائے۔“  
 لیکن دور ملے تو اچھا ہے ”فرحت نے کہا ”امرت سرے تو روز ہی آجائے گا۔ یہ نوکری مل جائے گی نہیں۔“

ایلی نے امر تر جانے کی تجویز نہ سوچی تھی۔ اسے خیال نہ تھا کہ وہ امر تر جائے گا۔ اور ایلی کی بات تو ایلی نے ویسے ہی چلا دی تھی۔ ساری بات ہی عجیب تھی۔ اسے ابھی تک معلوم نہ تھا کہ امر تر جا کر کرے گا کیا۔ کہاں ٹھہرے گا۔ کدھر جائے گا بات اس کے منہ سے یوں ہی لگتی تھی جیسے میز پر پڑا پستول آپ ہی آپ چل جائے۔ اور حیرت کی بات تھی کہ اسے اس پر تعجب محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ آخر امر تر کیوں۔ جانا ہی تھا تو لاہور جانا۔ لیکن لاہور اب اس کے لئے خوش کن جگہ نہ رہی تھی۔ لاہور سے بڑی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں جو اس کے لئے بھٹ تکلیف تھیں۔

امرت سر پہنچ کر بھی اسے شعوری طور پر احساس نہ ہوا کہ وہ وہاں کیوں آیا ہے۔ بہر صورت وطن انداز سے آوارہ گھومتا رہا۔ ہال بازار میں چار ایک چکر کاٹنے کے بعد وہ کمپنی باغ میں جا بندہ رنگ وہ بیٹھا لوگوں کو دیکھتا رہا پھر آموں والی کوٹھی کی طرف چلا گیا۔

آموں والی کوٹھی ویران پڑی تھی۔ دیواریں بوسیدہ ہو چکی تھیں دو ایک کمروں کی چھتیں بھی ہوئی تھیں۔ صحن میں گھاس پھوس اکی ہوئی تھی۔

سڑک کے کنارے وہ ایک ٹوٹے ہوئے پل پر بیٹھ گیا۔ پرانی یادیں ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں تازہ ہو رہی تھیں۔

روسی میں روسیہ اور چھو کرے چل پھر رہے تھے۔ روسیہ کھیر پکانے میں مصروف تھا۔ کھیر کی گاڑیں قطار میں پڑی تھیں۔ سکھ لڑکے کیس سکھا رہے تھے۔ بنگالی باپو پرنسڈنٹ کے کمرے سے پھلی تلنے کی بو آ رہی تھی۔ پھر دفعتاً ”آف آگیا وہ اسے دیکھ کر مسکرائے گا“  
 ”کھیر بیٹھے ہو“ وہ زیر لب مگنٹا ”نور آئے گا۔ نور۔“ نور کا نام سنتے ہی گویا لوگوں سے ہمار آگئی۔ آموں پر بور آگیا۔ کوئل کو کئے گئی۔

کرشنراد کے انداز میں ہلکی سی تحقیر جھلکتی جیسے کہہ رہی ہو۔ بس اتنی ہی جرات تھی۔ مگر ایلی کو صرف اس لئے پسند کیا تھا کہ اس نے دو تین مرتبہ جرات کا اظہار کیا تھا۔ ”شنا“ جب اس نے ضد سے سادی کا سلکا ہوا سگرت حاصل کیا تھا۔ دوپٹہ چھینا تھا اور اس رات جب وہ ملائی کے بعد سفید منزل میں لوٹ آیا تھا۔ سادی کتنی عظیم شخصیت تھی اس کی وہ بے نیازی وہ مہر وہ رعینہ۔ ایلی نے آہ بھری۔ سنہ جانے کیوں رات کے اندھیرے میں تنہا مٹل کے اس قدر قریب ہونے کے باوجود اس نے کبھی خواہش محسوس نہ کی تھی وحشت اور مجذوبہ اظہار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ سادی کے متعلق سوچتا تو ایلی کا دل بیٹھ جاتا۔ اسے دکھ ہوتا اور اس کی توجہ پھر والد صاحب کی طرف مبذول ہو جاتی۔ اس پر ایک اور قسم کا جنون سوار ہو جاتا اور پھر وہ چاہتا کسی اور طرف توجہ مبذول کرے اور یوں اپنے آپ کو محفوظ کر دیتا۔ لیکن اس کی توجہ مبذول نہ ہوتی اور وہی دیوانہ پن اس پر مسلط ہو جاتا۔ اور اس کا جی چاہتا کہ سادی دنیا سے اختتام لے۔ اپنے آپ کو تباہ کر دے۔ کسی اندھے کنویں میں چھلانگ لگا دے اور زمین کی طرح غلاطت میں لت پت ہو جائے۔ اس وقت شہزاد مڑ کر ایلی کی طرف دیکھی اس کی آنکھوں میں وحشت بھرا خوف جھلکتا جو دفعتاً ”وحشت بھری لذت میں بدل جاتا۔ اور وہ گرے ہوئے ایلی کی طرف بڑھتی۔ اس کے کپڑے تار تار ہو جاتے۔ دمچیاں ہوا میں اڑتیں۔ شہزاد کے بلوری جسم سے گلابی شعاعیں نکلتیں اور قریب اور قریب۔ اور قریب پھرنے اور رنگ کی ایک بو چھاڑ پڑتی اور وہ لت پت ہو جاتا۔

ایلی کے دل میں ایک پوشیدہ خوفناک عزم پیدا ہو رہا تھا۔ جس کی نوعیت سے وہ خود بھی واقف نہ تھا۔

جب وہ چلتے پھرنے کے قابل ہوا تو ایک روز سوچے سمجھے بغیر وہ ہاجرہ سے کہنے لگا۔

”اماں میں امر تر جاؤں گا۔“

”امرت سر۔“ ہاجرہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ”امرت سر کون ہے۔“ وہ بولا

”کس کے پاس جاؤ گے۔؟“

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہاں ایک نوکری ہے۔“

”نوکری“ ہاجرہ نے سینہ تمام لیا اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ”ہے تجھے نوکری مل جائے اکتنا اچھا ہو۔ تیرا خیال بٹ جائے۔ شغل میں لگ جائے اور ہمیں چار پیسے مل جائیں۔“

یہاں پہلے وہ شادی کو جانتا ہو۔

ایک اتنی بڑی تھوہ والی مرل سی مگر اونچی لمبی زرد رزلڑی اس کے روبرو آکھڑی ہوئی  
 پہلائی ہوئی۔" وہ بولی۔ اس نے تیم کی گھڑی اس کی طرف دھکیلی ریٹھی لمبوسات  
 اور ایک میل سے وہاں تک لمبی چوٹی لنگ رہی تھی۔ "چھوڑ بھی شادی تیم نے چڑ کر کہا۔"  
 "مائیں"۔ ایللی نے سائیں کی طرف دیکھتے ہوئے زیر لب کہا اس نے محسوس کیا  
 وہ خود بھی ایک سائیں ہو سائیں۔ اب بعد مشکل اپنا آپ سمیٹ رہا تھا۔ اس کی ناک اور  
 سے خون بہہ رہا تھا مگر اس کی نگاہیں شادی کے چوہارے پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر وہ گھسیتا ہوا  
 لٹکے چوہارے کے زینے کی طرف بڑھا اور زینے کے ساتھ بازار میں تختے پر سر رکھ کر بیٹھ  
 رہا۔ "ایلی کو خیال آیا۔ کیا شادی عورت نہیں کیا وہ محض طائفہ ہے کہ اسے سائیں کی  
 پرتیں نہیں آتے۔ کیا کٹرے کی وہ تمام حسین و جمیل پتلیاں سب طوائف ہیں۔  
 میں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ عورتیں ہیں۔ ان سب میں کہیں نہ کہیں عورت چھپی بیٹھی  
 ہے۔ لاکھ پتی جن کی موٹریں چوہاروں تلے کھڑی ہیں اور وہ نمنا شبین جو کٹرے میں آتے  
 وہ تو طائفہ کے پاس آتے ہیں مگر کی عورتیں چھوڑ کر آتے ہیں۔ عورت سے فرار ہو کر  
 نے ہیں۔ ہوں جیسی طائفہ عورت کو چھالیتی ہے اور طوائف کا روپ دھار لیتی ہے لیکن  
 ناکی اپنی تسکین تو اس چھپی ہوئی عورت میں مضمر ہے۔

دھن" ایللی کے دل میں ایک شدید خواہش پیدا ہوئی۔ کہ وہ جا کر شادی سے ملے  
 ماسے پوچھے کہ تمہاری عورت کہاں ہے اور تمہیں اپنی اصلیت کو بتانے میں کتنی تکلیف  
 لگے ہے اور تم کتنی دھکی ہو اور تمہاری زندگی اتنا بڑا المیہ ہے تو پھر تم طائفہ کیوں ہو۔  
 اور اگر اس نے ایللی کو سائیں کی طرح میڑھیوں سے لڑھکا دیا تو۔ اگر وہ چھپی ہوئی  
 عورت کو بیدار کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو اونہوں ایللی مسکرا دیا۔ اس نے اگر اس کو چنداں  
 بیٹ نہ دی جیسے یہ اگر بعید از قیاس ہو جیسے ایسا ہو ہی نہ سکتا ہو۔ میں کیا اس کا عاشق ہوں جو  
 لٹکے میڑھیوں سے لڑھکا دے گی۔ لیکن شاید اتنے سارے لکھ پتی تماش بینوں کے روبرو وہ  
 مانگنے پر مجبور ہو۔ اونہوں۔ بے کار ہے۔ جھگٹ میں ملاقات کیسی۔ وہ چل پڑا۔  
 لٹکے پتلیوں کی ہنسی سن کر پھر رک گیا۔

اسے کہہ جو دیا آج شادی کی طبیعت اچھی نہیں جیسی تو دیکھ لودروا بے پر کوئی موثر نہیں

ایلی اٹھ بیٹھا۔

آصف جا چکا تھا۔ نور کا کچھ پتہ نہ تھا آموں والی کو بھی پر وحشت برس رہی تھی۔ مگر اگر وہ  
 چل پڑا۔

گھومتے گھومتے شام کے وقت وہ کنڈرا رنگین میں جا پہنچا۔ بینکوں میں بجلی کے ہلنے سے  
 رہے تھے جنگلوں میں زرق برق لمبوات چمک رہے تھے روغنی چروں پر وہی مسکراہٹ وہی رنگ  
 وہی دعوت۔ چوہاروں میں سارنگیاں التجائیں کر رہی تھیں۔ طبلے سرایت رہے تھے۔ پان  
 دوکانوں پر دیے ہی جھرمٹ لگے ہوئے تھے لوگوں کی نگاہیں چوہاروں پر جی ہوئی تھیں۔

## شادی

دھن" دھڑ دھڑام۔۔۔ کی آواز سنائی دی۔ کنڈرا رنگین میں سب لوگ چونکے اور  
 چوہارے کے زینے سے جس کے نیچے ایللی کھڑا تھا ایک بڑا سا گیند لڑھکتا ہوا گرا اور سڑک کے  
 درمیان ڈھیر ہو گیا۔ پھر جو ایللی نے غور سے دیکھا تو گیند گویا پھٹ گیا اور اس میں سے ناکھیں  
 بازو نکل کر سڑک پر بکھر گئے۔

یہ دیکھ کر کٹرے میں ایک تپتہ بلند ہوا۔

"ہا ہا ہا۔۔۔" سبھی لوگ ہنس رہے تھے کوئی امداد کے لئے آگے نہ بڑھا۔

"ارے" ایک بولا "بھئی اب کی بار تو بڑا صبر کیا سائیں نے۔ دس بارہ دن کے بعد جو لٹا

ہے۔"

"بیچارہ کیا کرے رہا بھی نہیں جاتا بن دیکھے شادی کو۔"

"میاں عشق ہے بجا کہ نہیں ہے۔"

"ہاں بھی عشق میں تو ہڈیاں ٹوٹی ہیں سو تڑوا رہا ہے۔"

"اور وہ شادی اسے مالم ہی نہیں۔"

"کیسے ہو میاں اس کے دروجے پر تو لکھ پتیوں کی اسے لمبی کاریں کھڑی رہیں ہیں۔"

"کیا نام پایا ہے بھی اس شادی نے۔ ہر کوئی مرتا ہے اس پر کٹرے کی رانی ہے رانی

سمجھو کل ہی تھتھ کھلوائی تھی اس نے اور آج۔"

شادی۔۔۔ ایللی کے ذہن میں ایک کرن سی چمکی۔۔۔ "شادی"۔۔۔ اس نے

میں کون؟“ میراٹی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ابلیس ہنس رہا۔ ”میراٹی! وہ ذکر واپس زینے سے اتر جائے لیکن اب واپسی کی بھی ہمت نہ تھی۔  
 ابلیس جی چلا کہ دوڑ کر واپس زینے سے اتر جائے لیکن اب واپسی کی بھی ہمت نہ تھی۔  
 ”جی“ وہ بولا ”مجھے شادی کو پیغام میں پیغام لایا ہوں۔“  
 ”کون ہے“ اندر سے بڑھیا کی آواز آئی۔  
 ”میراٹی ہے پیغام لایا ہوں۔“ میراٹی بولا۔  
 ”میراٹی کی طرف سے ہے۔“ بڑھیا بولی۔  
 ”آئے دو۔“ ایک نوجوان لڑکی کی آواز آئی۔  
 میراٹی چل پڑا ابلیس چپکے سے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا  
 کر کے دروازے پر پہنچ کر میراٹی رک گیا۔  
 شادی ہنگ پر لپٹی ہوئی تھی۔ ”آ جاؤ“ وہ حسی ہوئی آواز میں بولی۔ میراٹی چلا گیا۔  
 ابلیس بات کرنے کے لئے منہ سنوار رہا تھا کہ بڑھیا آگئی۔  
 ”کہاں سے آئے ہو۔“ وہ تحسانہ انداز میں بولی۔  
 ”رہات سے آیا ہوں“ ابلیس نے جواب دیا۔  
 ”رہات سے۔“ بڑھیا چلائی۔  
 ابلیس نے سر ہلا دیا۔  
 ”کس نے بھیجا ہے کیا۔“  
 ”میں۔“  
 ”کس نے۔“  
 ”پیغام لایا ہوں۔“  
 ”کس کا۔“

”اے بیٹھ کر ذرا دم تو لینے دو اسے۔“ شادی نے کہا ”تم جاؤ اماں۔“  
 ”بیٹھو ایک ساعت کے لئے کھڑی رہی پھر میراٹی کے بلانے پر چلی گئی۔  
 ”بیٹھو جلد“ شادی نے کہا۔  
 ”پہنچنے کے قریب بڑے صوفے میں ابلی بیٹھ گیا۔“

ورنہ شادی کا چوبارہ ہو اور موٹروں سے خالی ہو۔“ پڑاڑی ہنسنے لگا اور پھر ابلی کی طرف جھوٹا  
 بولا ”اے بابو جی اگر جو کسی کو مخمل نہ آئے تو پھر دوس سے کیا سلوٹ کیا جائے۔“ ابلی سرگرم  
 ”اسے سمجھا دیا ہوں کہ بھائی میرے دو روج سے شادی کی طبیعت اچھی نہیں اس لئے  
 پانسو بچپن کے سگرٹ کے ڈبے آج نہیں بکیں گے۔ ہی ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسا  
 ”طبیعت خراب ہے۔“ ابلی نے کہا۔  
 ”یہی تو میں کہہ رہا تھا بابو جی۔“

”ابلی نہیں بابو جی بڑی ضد والی ہے طبیعت اچھی نہ ہو تو گاؤں سے نہیں ملتی۔“  
 یہ بن کر ابلی کو سوچھی پھر وہ اس چوبارے کے سامنے کھڑا تھا۔ جہاں پہلے تم اور ہم رہتے  
 تھی۔ اور اب خالی پڑا تھا۔ دیر تک وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر جو اس نے دیکھا تو اس نے  
 سامنے ایک ہی چوبارہ تھا۔ سامنے الماس کھڑی ہنس رہی تھی۔ ”آ جاؤ“ وہ بولی ”تم تو میرے ہم  
 نام ہو الیاس اور الماس میں کیا فرق ہے۔ میں الماس ہوں باقی نہیں چند روز الماس بن کر رہی  
 پھر تو“ وہ آہ بھر کر بولی ”باقی بن کر جانا ہی پڑے گا کیوں حسی“ وہ آٹکا کے بھائی سے پوچھنے لگا  
 ”جانا ہی پڑے گا نا۔“ میرے ایسے نصیب کہاں کہ ہمیشہ کے لئے الماس بن کر رہا  
 قدموں میں پڑی رہوں“

دفعتا الماس کا چہرہ بدل گیا اور ایک اتنی بڑی نتھ والی لڑکی اس کی جگہ آکھڑی ہوئی اس نے  
 آہ بھری۔

”شادی بن کر جینا میرے نصیب کہاں۔ تم دیکھتے کیا ہو“ وہ بولی ”شادی گھر ہی ہے ابلی  
 کی طبیعت اچھی نہیں۔“

پھر وہ شادی کے چوبارے کی میڑھیاں چڑھ رہا تھا جیسے واقعی شادی نے اسے بلایا ہو۔ کہ  
 میں ایک موٹے سے میراٹی کو دیکھ کر وہ گھبرا کر رک گیا۔

### پیغام بر

”کون ہے“ میراٹی نے فرعون بن کر پوچھا۔ ابلی چپکے سے دہکا کھڑا رہا۔ پھر میراٹی کو  
 زینے کی طرف آیا۔ ”کون ہے“ وہ چلا گیا۔  
 ”میں ہوں۔“

نے ایک ریٹی گھڑی مجھے دی تھی۔“  
 ”نہی۔“

”ہاں۔“  
 ”میں نے تو کبھی کبڑے نہیں بیچے۔“ وہ ہنسی۔  
 ”بھئی بڑائی کی نہیں تھی۔ اس پر اتنی لمبی چوٹی تھی۔ اور تو نے وہ گھڑی میری طرف  
 پائی اور تیرے ساتھ بت سی لڑکیاں بھی تھیں۔ اس چوبارے کی ٹپلی منزل میں چاروں  
 لڑکیاں تھیں اور محن کے درمیان میری سائیکل تھی۔“  
 ”اے اللہ“ وہ چونکی ”اچھا وہ تسلیم کے گھر مجھے یاد آیا۔“  
 ”تم وہی شادی ہو کیا۔“

”ہاں۔“

”جھوٹ۔“

”کیوں۔“

”نہیں۔ کمال وہ زرد رومی لڑکی اور کمال تم۔“ ایللی نے حیرت سے اس کی طرف

دیکھا۔ ”وہ خنرے سے بولی۔“

”پوچھیں۔“ ایللی نے کہا۔ ”لیکن کسٹریٹ میں لوگ کہہ رہے تھے سارا شرپاگل ہو رہا  
 تھا۔“

”نہی۔“ اس نے ہونٹ ہونٹ بنائے۔ ”سب اپنے مطلب کے سیانے ہیں کوئی بھی پاگل  
 نہ۔“

”تو مجھے تو میں آیا تھا۔ میں نے کہا میں بھی ایک نظر دیکھ آؤں۔“  
 ”نہی۔“

”اے اللہ! اہلک میں اشارہ کیا۔“ سب کچھ دیکھا۔“

”اے اللہ! جنوں سے پوچھا کیا۔“

”اے اللہ! ہو جاتا ہے۔“

”نہی۔“

اس کے روبرو ایک ٹیار حسین عورت لیٹی ہوئی تھی۔ چہرے پر تھکاوٹ کے آثار  
 بیل بکھرے ہوئے تھے۔ قیض ڈھیلی تھی۔ آنکھیں خمار آلود تھیں۔

”نہیں نہیں یہ وہ شادی نہیں۔“ ایللی نے سوچا ”وہ ننھ والی شادی چار مل میں  
 ہو جائے۔“ نہیں نہیں یہ کوئی اور شادی ہے۔“

”پیغام لائے ہو“ شادی نے ایللی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

”نہیں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”نہیں۔“ شادی چونک کر اٹھ بیٹھی۔

”اور تم تو کہتے تھے پیغام لایا ہوں۔“

”جھوٹ بول رہا تھا۔“

”ہائیں“ اس نے آنکھیں گھمائیں۔ ”سچ“

ایللی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”جھوٹ کیوں بولا۔“

”نہ بولتا تو مجھے آنے نہ دیتے۔“

”کیا آنا اتنا ہی ضروری تھا۔“

”اس سے بھی زیادہ۔“

”ادہ۔“ اچھا وہ قریب تر ہو گئی۔

ایللی نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر باہر کی طرف اشارہ کیا۔

دونے

شادی نے آنکھوں سے اثبات کا اظہار کیا۔ اس وقت بالی یوں مسکرا رہی تھی۔ ”جیسے“  
 اکٹھے مل کر شرارت سوچ رہے ہوں۔

”چار سال پہلے“ ایللی نے کہا ”تو مجھ سے ملی تھی۔“

”سچ۔“

”ہاں اتنی بڑی ننھ تھی تیرے ناک میں۔“ دلی پتلی تھی تو۔“

”اور ملی کیوں تھی۔“

بات کے مبارک کا پیغام لے آئے۔ ”وہ ہنسی۔  
ایلی نے جھک کر سلام کیا۔

چونچ سڑے میں اترا تو لوگ اوپر کی طرف دیکھ رہے تھے اس نے اوپر دیکھا جنگل  
میں مسکرا رہی تھی۔ ولین پر سائیں کے کھلے ہونٹوں سے لعاب نچک رہا تھا۔

بارہن میں سے گزرتے ہوئے ایلی غور سے ہربائی کی طرف دیکھ رہا تھا جو بارے  
لاہت کی سہ نشینوں اور جدید طرز کے مکانات کی بالکونیوں میں بیٹھی ہوئی تھیں۔  
بے سڑے خود داخل اور سنگار کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہربائی میں اسے شادی  
رہی تھی۔ دیکھ ہوئی چھپی ہوئی عورت محروم دکھی عورت۔ جس قدر ہائی اپنی نمائش  
قدروں دیکھ رہی رہتی ہے جس قدر نئی سنوری دکھائی دیتی ہے اسی قدر پریشان حال ہوتی ہے  
ایلی۔

اے نکل کر دفعتاً اسے خیال آیا اب مجھے کیا کرنا ہے۔ وہ چونک پڑا۔ سوچنے لگا۔  
ہل آیا ہی کیوں تھا۔ ویسے ہی سیر کے لئے۔ کیا شادی سے ملنے۔ یہ کیسے  
مجھے تو شادی کا علم بھی نہ تھا پھر۔ اے کوئی جواب نہ سوجھا۔ اس نے اپنا قدم  
رہا۔

رے رے۔ ”ایک راہ گیر اس کی طرف جھپٹا اس نے ایلی کو بازوؤں میں تھام لیا۔  
ایک بارہ میں گرو گئے۔“

اتنے بارہ کے عین کنارے پر کھڑا تھا۔

”میں گرو گئے! بارہ میں گرو گئے!!“ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

فت میں لت پت ہونے کا شوق ہے کیا۔ ”کوئی ہنسا۔

میں میں گرو گئے۔“ کوئی چلائی۔

بڑا آجاؤ۔ میں یہاں ہوں۔“ آرام باغ کے ایک چوبارے سے ایک بد شکل کسی نے  
اگر نکل کر اسے آواز دی۔

نہی ہی۔ ”چپک کے داغوں بھرا ہوس سے پھولا ہوا چہرہ اس کے روبرو آگیا۔“ یہ

”دیکھنے والا۔“

وہ ہنسی۔ ”جھوٹ! کوئی نہیں ہوتا۔“

”ہو بائی کے پاس آتے ہیں وہ نہیں آتے۔ جو شادی کے پاس آتے ہیں وہ ہو جاتے ہیں۔“  
”تم ہو گئے ہو۔“ وہ ہنسی۔

”ہو گیا ہوں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ اور پھر اٹھ بیٹھا۔

”بیٹھو۔“ وہ بولی۔

ایلی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کیوں۔“

”زیادہ پاگل ہونے کا فائدہ؟“

وہ ہنسی۔ ”تمہاری باتیں الٹی ہیں۔“

”الٹی نہیں سچی ہیں۔“

”کیسے؟“

”تم سے کون سچی باتیں کرتا ہے یہاں کوئی نہیں۔“

”یہ سچ ہے۔“ وہ بولی۔

”بھی سچ تھیں۔“

”اے ہے میں نے تمہاری تواضع نہیں کی۔“

”لو“ وہ بولا۔ ”شادی سے ملا دیا اس سے بڑھ کر اور کیا تواضع ہو سکتی ہے۔“

وہ چل پڑا۔ اچھل کر شادی نے سلیر پن لئے اور ساتھ چل پڑی۔

”تیرا نام کیا ہے؟“

”ایلی۔“

وہ ہنسی۔ ”کیا نام ہے۔ کوئی سمجھ تیلی ہو“

”ٹھیک سمجھ۔“ وہ بولا ”میں تیلی ہوں تو عطر ہے۔“

شادی نے گویا اس کی بات نہ سنی۔

”پھر آؤ گے۔“ اس نے پوچھا۔

”کون آنے دے گا۔“



کیا لت پت ہو گا، لت پت ہونا تو مردوں کا کام ہے۔

”بند کمرے کی بات بھول گیا۔“ ایک بڑھیا لاناٹھیتی ہوئی آگئی۔

”آ جاؤ آ جاؤ۔ اس کی بات نہ سنو۔“ ایک نے کہا۔

چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں آرام باغ کے چوباروں میں بیٹھی ہر کسی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

وہ رک گیا۔ اور مردانہ شان سے دانت بھیج کر بولا۔

”ہاں میں لت پت ہوں گا۔ کیوں میری مرضی — مجھے کون روک سکتا ہے۔ اگر آپ کی طرف جانے کے لئے روکائیں کھڑی کر دی گئی ہیں تو میں کنوئیں میں کودوں گا۔ لت پت ہو گا۔ لت پت ہوں گا۔ لت پت ہوں گا۔“ وہ اعلانیہ کبیلوں کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا کہا باو“ ایک مزدور رک گیا ”کیا ہو گے تم۔“

”میں“ ایللی چونکا۔

”کہہ جو رہے ہو کچھ“ مزدور بولا ”میں سمجھا شاید مجھ سے کہہ رہے تھے۔“

”تم سے نہیں کہہ رہا“ ایللی نے جواب دیا۔ اور وہ دونوں کھڑے ہو کر سامنے کی کوئی کھڑی پٹھانی کی طرف دیکھنے لگے۔

”دیکھ باو“ مزدور قریب تر ہو گیا۔ یہ جو پٹھانی ہے نا یہ سامنے چوبارے والی ہے تو ہمارے طریقے آتے ہیں کہ بس سمجھ لو آنکھیں روشن ہو جائیں پر اسے بیماری ہے۔“

”بیماری۔“ ایللی نے حیرت سے دہرایا۔

مزدور نے آنکھ ماری۔ ”وہی بیماری۔“ وہ بولا ”جو ہوا کرتی ہے۔“

کچھ دیر تو ایللی گھور گھور کر اعلانیہ کبیلوں کو جانچتا رہا پھر دفعتاً اسے شرم محسوس ہو گئی۔

کبیلوں کی باتیں بھدی اور تنگی تھیں اور وہ محسوس کر رہا تھا جیسے چوکیوں پر ٹپکی جسم ڈھیر لگے تھے پلپلاتے جسم جو نکلیں۔ بڑی بری جو نکلیں۔ اس کا وہ مردانہ عزم ختم ہو گیا تھا۔

جھک گئیں دل دھک دھک کرنے لگا — پھر جو اس نے دیکھا تو وہ آرام باغ سے دور نکلا تھا۔

پھر دفعتاً ایک عظیم شور سنائی دی۔ ادور ادور پیچھے بہت پیچھے وہ چیخ رہی تھیں پٹھان

نہیں کھانا بھاگ گیا۔

”ہاتھ پلے کچھ ہوتا تو —“

”یہ مرد کا کام ہے —“

”بند کمرے ہی میں جائے گا —“

گھبرا کر ایللی پل پر بیٹھ گیا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ ہر کوئی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ایللی نے اس کی سی مسکراہٹ، کوئی بات نہیں کی سی ہنسی۔ پیچھا کرتی ہوئی نگاہیں۔ اس نے ہنس لیا جیسے آرام باغ والیوں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہو سب کچھ۔

### ظلم جیسی

کئی ایک بار وہ آرام باغ میں ادھر سے ادھر تک اور ادھر سے ادھر تک آیا گیا۔ کئی مرتبہ ہاتھ شیدہ کو شش کی کہ کسی چوبارے کے زینے پر چڑھ جائے لیکن عین قریب پہنچ کر نہ لے کیا ہو جاتا۔ وہ محسوس کرتا جیسے سبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہوں۔ دوکان دار، راہ گیر، ٹہن اور کیسیں۔ یہ محسوس کر کے وہ گھبرا جاتا اور آگے چلنا شروع کر دیا۔

اس نے کئی مرتبہ ان میں سے ایک کا چناؤ کیا۔ کئی مرتبہ ”اچھا یہ ٹھیک ہے یہ والی واپسی پر اٹھ گا تو سیدھا اوپر چڑھ جاؤں گا۔“ لیکن جب وہ واپس آتا تو وقت پر نہ پہچان نہ پاتا اور پھر لے نکل جاتا اور پھر جب وہ آگے نکل جاتا تو اسے خیال آتا ”نہیں یہ تو اچھی نہیں۔ اس کی تین تو بے باک ہیں، تنگی نگاہیں، دیکھو تو کیسے چھاتیاں ہلا کر آگے کو بڑھاتی ہیں۔ لاجول دلا“

ایللی تنک کر چور ہو گیا۔ لیکن ابھی تک وہ آرام باغ میں گھوم رہا تھا۔ دوکانیں بند ہو چکی تھیں۔ پٹھانوں کے گرد ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا لوگ اوپر دیکھ رہے تھے اشارے کر رہے تھے لیل سے دام چکا رہے تھے کیسیں مسکرا رہی تھیں با آواز بلند گالیاں دے رہی تھیں۔ تنگ لاشیات کر رہی تھیں۔

ایللی کے دل میں نفرت کا ایک طوفان پیدا ہو چکا تھا۔ ساڑھے گیارہ بج چکے تھے کسی چوبارے بڑھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چونکہ پٹھانوں کی دوکان پر کھڑے تماش بینوں سے آنکھ بچا

مقام جیشی نے کوڑوں کی ایک بوچھاڑ محسوس کی — بو کا ایک رپلا آیا۔ جوش اور غصے  
اس نے آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دی۔ تعفن کی وجہ سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ چھیننے  
پر غصہ اور پھر ایک ہوائی —

اور پھر وہ نیچے فقیر کی طرح کچھو میں لت پت تھا۔ شرم سے اس کی گردن لنک مچی تھی۔  
اپنے آپ سے گھن آ رہی تھی۔

موت کا بدناما سند رپٹ رہا تھا۔ ایک کرسہ منظر چہرہ ابھر رہا تھا۔ بد نما دانت۔ ریختی ہوئی  
ان آنکھیں۔

پھر کوئی اسے تسلی دے رہا تھا۔ اپنا گھر ہو اپنی عورت ہو۔ اپنی بوتل ہو اپنا گلاس ہو۔ یہ چیز  
اب اس کے لیے ہے۔ غناغٹ کی نہیں۔

”محبت کا کھیل ہے۔ سووے کا نہیں۔ محبت کا۔“

”پلے پلے ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

”پلے پلے لاشی مارنے کا شوق ہوتا ہے۔ لاشی تو ٹیک نیک کر دھری جاتی ہے۔“

ایلی کو اپنے آپ سے بو آ رہی تھی۔ اس کمرے سے وحشت ہو رہی تھی۔ اس میں اتنی  
بذخہ تھی کہ سر اٹھا کر دیکھتا کہ کون اسے تسلیاں دے رہا ہے۔ اس کی باتیں سننے کی اسے  
شدت تھی۔ چسکیں بھرتا۔ ٹیک ٹیک کر چلنا یہ سب اس کے لئے بے معنی تھا۔ ایلی یوں  
کہا کرتا تھا جیسے گندم کا دانہ کھانے کے بعد وہ ننگا ہو۔ احساس گناہ اور احساس پستی چاروں  
سے پوش کر رہے تھے۔

### بوتل اپنا جام

بوتل اپنا جام  
بوتل اپنا جام

گلاس میں لاشیں پڑی تھیں۔ ان کے اوپر چادریں پڑی تھیں۔ مگر نیچے وہ سب تنگی تھیں  
ماتھے دھکے ہوئے تھل جن میں سے چپک کے داغ نکل کر چاروں طرف ڈھیر ہونے کے

کر اوپر چڑھتا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ سب ایک دوسرے پر آوازے کس رہے تھے جھینپیاں  
رے تھے۔ اس کے بلو جود ایلی وہیں ایک تاریک کونے میں کھڑا تھا۔ وہ اس گھٹ میں تھا کہ کمر  
کوئی دروازہ دکھائی دے جو لوگوں کی نگاہوں سے دور ہو لوٹ میں ہو اور وہ آنکھیں بند کر کے  
کاتوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیڑھیاں چڑھ جائے اس کا عزم اور بھی مضبوط ہوا جا رہا تھا۔ اس  
عزم کی وجہ حصول لذت نہ تھی۔ وہ خواہش کی شدت سے بیقرار نہ تھا۔ بلکہ ان حالات میں  
لذت اور عیش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت ایلی خوف اور نفرت کے طے بلے جذبات  
کے جنگل میں بری طرح پھنسا تھا ان کسبوں کی طرف دیکھ دیکھ کر اس نے نفرت سے کہا  
جھر جھری لی تھی اور اب وہ نفرت اس قدر شدید ہو چکی تھی کہ اسے کوڑے مار رہی تھی۔ اور  
مظلوم جیشی کی طرح کوڑے کھا کھا کر وہ خود کو مشتعل کئے جا رہا تھا۔

وہ کسبیاں در حقیقت اس وقت ایلی کی نگاہ میں وہ ریتیاں نہ تھیں بلکہ اس اپنی کورت  
کی جج تھیں جہاں وہ آخری ایلی پیش کرنے جا رہا تھا۔

”مجھ میں لت پت ہونے کی ہمت ہے۔“

اس وقت وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں نے دارو پنی رکھی ہو۔ اس کا سر گوم رہا تھا  
اس کی نگاہوں میں ستارے ٹکرا رہے تھے غلیظ جسموں سے گندگی کی بوچھاڑیں اڑ رہی تھیں  
ہوئے سر۔ ڈھیر ہوئے جا رہے تھے۔ خون بتا ہوا خون۔ بازو اٹھے ہوئے تھے۔ ہاتھ ٹٹل رہے  
تھے۔ ہتھکنپوں کی سونڈیں اس کی طرف بڑھ رہی تھیں تاکہ اسے گرفت میں لے لیں۔  
پھر دفعتاً ایک چیخ سی سنائی دی کسی کٹے ہوئے دھڑکی چیخ۔ تمام فضا سرخ ہو گئی۔ وہ کس  
سے یوں باہر نکل آیا جیسے اسے کوئی بھی نہ دیکھ رہا ہو۔ جیسے کسی کے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے کوئی  
فرق نہ پڑتا ہو۔

زینہ چڑھتے ہوئے اس نے نیچے شور و غل کی آواز سنی وہ رک گیا اور اس نے دونوں ہاتھ  
اوپر اٹھائے اور نعرہ لگایا ”لت پت زندہ باد۔“

ایلی کی نگاہ اوپر کی طرف اٹھی اوپر دروازے پر بھدا بد نما چہرہ اس کی طرف گھور رہا تھا  
چاروں طرف سے چپک کے داغوں کی بوچھاڑ پڑ رہی تھی۔

پھر وہ بد نما بھدا بد نما چہرہ پھیلنے لگا۔ گویا چپک کے داغوں کا بھرا تھل کسی نے ایلی کی طرف  
پسینے اور گوشت کی مکروہ بو۔ سرکٹ کر نہ جانے کہاں گر گیا لاش۔ ٹھنڈے گوشت کی

لئے بے تاب تھے۔ وہ لیٹ گیا۔ یوں لیٹ گیا جیسے خود ایک لاش ہو گئے ہوئے سر کی لاش تھوڑی اور بدلو سے بھری گلی سڑی لاش۔

جب وہ محلے میں پہنچا تو تین بجے تھے۔ فرحت کی ڈیوڑھی بند تھی۔ وہ وہاں بیٹھ گیا۔

شاید شہزاد کا دروازہ کھلا ہو۔ اسے دو ایک مرتبہ خیال آیا۔ لیکن وہ شہزاد کی طرف جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس سے بو آ رہی ہے اور وہ اب اس قاتل نہیں کہ شہزاد کی طرف جائے۔ ایک کراہتے ہوئے مظلوم حبشی کا قصر شاہی میں ملکہ کے روہدہ جانے سے کیا مطلب۔

دیر تک وہ وہاں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سوچا۔ دیکھوں تو سہی — چاہے اندر نہ جاؤں۔ دیکھوں تو سہی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

شہزاد کا دروازہ بند تھا۔ اس نے آہستہ سے اسے آزمایا شاید کھل جائے۔

”کون ہے۔“ اندر سے رابعہ کی آواز آئی۔ وہ خاموش رہا۔

”کون۔“ رابعہ پھر چلائی۔

”میں ہوں ایللی۔“

”تو ہے ایللی۔“ وہ بولی ”غصہ ذرا۔“

اعلم

اگلے روز ابھی وہ سویا ہوا تھا کہ علی احمد کا خط موصول ہوا جس میں انہوں نے لکھا ہوا تھا کہ ملازمت ملنا مشکل ہو رہا ہے۔ اور گورنمنٹ نے آوی بھرتی کرنے کی بجائے تخفیف کی ہیں بتا رہی ہے۔ لہذا ایللی کو چاہیے کہ وقت ضائع نہ کرے اور سنٹرل ٹرننگ کالج میں داخلہ کی کوشش کرے تاکہ اسے ٹیبیکنیکل تعلیم حاصل ہو جائے اور ملازمت ملنے میں تیار رہا ہوں۔

نیر نیرانی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایللی کے دل میں بڑی امیدیں تھیں۔ اس زمانے میں گورنمنٹ کم یاب تھے اور پھر بی اے سینئر گرافر کا ملنا تو قطعی طور پر مشکل تھا۔ ایللی کا ہونا کہ اسے ملازمت مل جائے گی۔

ایللی نے کئی ایک محکموں میں درخواستیں دے رکھی تھیں۔ دو ایک جگہ سے اسے انٹرویو کا کہا گیا تھا مگر یہ خط اسے انٹرویو کے دن کے بعد موصول ہوئے تھے ظاہر تھا کہ دفتر والوں نے کلام رکھنے کیلئے وہ خط دیر سے حوالہ ڈاک کئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمان تھا

دوسرے چوبارے میں۔ اور بالا خرچہ پر چڑھ گیا لیکن بیگم کا کیس نشان نہ تھا۔

واپس آ کر وہ شہزاد کے قریب کھڑا ہو گیا۔ وہ یوں پڑی تھی جیسے جھوٹ موت آنکھیں بند رکھی ہوں اور ویسے جاگتی ہو۔ اس کی پیشانی کا تل چمک رہا تھا۔ بازو چھاتی پر رکھے ہوئے تھے۔

قیض کے بدن کھلے تھے کتنا روشن جسم تھا۔ جیسے پھولوں سے بنا ہو۔ عجیب سی ہنس آ رہی تھی۔

”یہ تو محبت کا کھیل ہے“ — کوئی آہستہ سے بولی۔

”اپنی بوتل ہو اپنا گلاس ہو۔“

شہزاد کا جسم یوں دکھائی دے رہا تھا — جیسے بوتل ہو۔

اور دفنوں پر ہندوں کا راج تھا۔ یا شاید دفن والے اپنے آدمیوں کے لئے مواقع پیدا کرنا چاہتے تھے ایک جگہ وہ دلت پر انڈیو میں پہنچ گیا تھا لیکن جب وہ پولیس کا سب انسپکٹر اس کے پاس دے رہا تھا تو ایلی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی زبان میں بول رہا ہے اس کی انگریزی۔ پشتو اور پنجابی کا مرکب معلوم ہو رہی تھی۔ لہذا اس نے کورا پچہ رکھ دیا تھا اور یہ ایک ٹین کے سینما ہاؤس میں جا کر تماشا دیکھنے لگا۔ محکمہ ریل کے ایک انڈیو میں اسے ایک سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔

یہ بڑے صاحب کی آرام کرسی کے ایک بازو پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور بڑا صاحب ہنس کر سے پوچھ رہا تھا۔ ”تم اس سے مقابلہ کر سکو گے۔“ ایلی نے جواب دیا تھا صاحب غلطی گولائیوں میں تو نہیں البتہ سپیڈ میں کوشش کروں گا اور بڑے صاحب نے قہقہہ لگا کر ہنسی کہا تھا۔ ”سنا تم نے کیا کہہ رہا ہے یہ۔“ اور وہ مسکرا دی تھی اور پھر اس نے ایلی پر ایک بھری نگاہ ڈالی تھی ایسی نگاہ کہ ایلی کا دل چاہا کہ وہ ہاتھ جوڑ کر صاحب سے کہہ دے ”حضور چاہتا ہوں کہ مجھے اس مقابلے میں امیدوار تصور نہ کیا جائے۔“ اس کا نام روزی تھا اور اس کپڑوں سے دہائیٹ روز کی خوشبو آ رہی تھی۔ پھر صاحب قہقہہ مار کر رہے تھے۔ ہمیں تم پر آئے ہو کیا نام ہے تمہارا۔ اگر اب کوئی جگہ خالی ہوئی تو ہم تمہیں بلا لیں گے۔ اپنا پتہ دفتر چھوڑ جانا۔“ پھر وہ روزی سے کہہ رہے تھے ”میں روزی اب اس سے ہاتھ تو ملاؤ۔“ اور یوں باہر نکلا تھا۔ جیسے اسے نوکری کے لئے چن لیا گیا ہو۔ اس روز وہ اتنا خوش تھا کہ غم کرنے کے لئے اسے ٹین کے سینما ہاؤس میں جانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔

اتنی بار کوشش کے باوجود وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اب تو ایلی واقعی یاس ہوا جا رہا تھا اگرچہ نوکری پر جانے کی اس میں قطعی طور پر کوئی خواہش نہ تھی۔ ہاں اگر سہلی ہوئی اگر لبا انکار نہ کرتے اگر منصر سے تعلق قائم رہتا تو۔

لیکن اب — خصوصاً جب اسے اپنی بوتل اور اپنے جام سے واقفیت ہو چکی تھی جب وہ چسکیں لینا سیکھ رہا تھا۔ جب وہ لاشی ٹیک ٹیک کر چلنے سے واقف ہو رہا تھا۔ اب نوکری کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن اہل اور بہن شدت سے مصر تھیں کہ وہ داخلہ لے لے۔ اور انہیں ہنس کر کہہ رہی تھی۔ ”دو گھنٹے کا تو فاصلہ ہے۔ صرف دو گھنٹے کا خواہ خواہ کیوں دلتی غلامی رہی ہے تم نہ آسکو گے تو میں جو ہوں۔ میرے پاؤں میں مہندھی لگی ہے کیا اب تو ہاتھ لگائے۔“

جب جی ای اچھے نہیں نکلتے تو پھر کیوں رنگوں میں اپنے ہاتھ۔“

”ایلی نے جواب دیا۔“

”جی۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”جی۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”آخر کیوں۔“

”یہ ایک نوئل پروفیشن ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”یہ آپ نے کب جانا کہ ٹیچنگ نوئل پروفیشن ہے۔“

”جی جی۔“ وہ رک گیا۔ یہ تو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ دیر سے میرا مطلب ہے میرے تمام بزرگ درس و تدریس میں۔“

”اسٹوڈنٹ کی خواہش کب سے آپ نے محسوس کی۔“ ایک اور صاحب نے وضاحت کی۔

”یہ تو میری پرانی خواہش ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”تو پھر آپ نے پچھلے سال سٹیوگرانی کیوں سیکھی۔“

”جی۔ جی۔ میرا مطلب ہے۔“ ایلی کھینچا نہ ہو کر رہ گیا۔

”نوجوان۔“ ایک اور صاحب بولے ”آپ سٹیوگرانی ہیں بی۔ اے ہیں آپ کو معقول

ان کی لکت سکتی ہے لہذا یہاں داخلہ لیتا بے کار ہے۔“

ایک اور صاحب بولے۔ ایسے کیمینز پر غور کرنا سراسر غلطی ہو گی اس نوجوان نے بی۔ اے

لیکن پھر لورڈ قلعہ میں کیا ہے اور یہ دونوں مضامین سکول کے مضامین نہیں یہاں ٹیننگ میں آپ

ان کے مضامین لیں گے۔“ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولا۔

”جی میں سائنس لے سکتا ہوں میں نے دسویں سائنس ڈرائیونگ میں پاس کی تھی۔“ ایلی

نے جواب دیا۔

”جینٹلمین“ کو نے میں بیٹھا ہوا انگریز پروفیسر بولا۔ ”تمہارا سائنس کا مبلغ علم۔“ اس نے

نگاہ اٹھائی اور کہا۔ ”مجھے تو اس سے بھی کم ہے۔“

ایلی کو علم نہ تھا کہ وہ آرام سڑانگ تھا اور سائنسی تحقیق میں بین الاقوامی حیثیت رکھتا تھا۔  
 ”حضور“ ایلی چلایا ”میرے والد اور دادا عمر بھر پڑھانے کا کام۔“  
 ”پڑھانا تم نے ہے۔“ بورڈ کے صدر نے کہا ”تمہارے والد نے نہیں۔“  
 ایلی کچھ کہنے کے لیے سوچ رہا تھا کہ صدر بولا۔ ”یوے گو نکٹ دن۔“

## بین لٹ

تمام امیدواروں کو کالج کے ہوسٹل میں رہنے کی اجازت تھی۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے اس روز ہوسٹل میں شور مچا ہوا تھا بہت سے امیدوار جنہیں داخل کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا اپنا سامان باندھنے میں مصروف تھے ایلی بھی اپنا بستر باندھ رہا تھا کہ ڈارمیزی کا نوکر کچا اور مرے گزرا۔

”ارے گامے۔“ وہ چلایا ”یار آخری مرتبہ کی چائے تو پلا دے۔ سڑانگ ہو۔“

ایلی کے انداز گفتگو میں صاحبیت کا عنصر نہ تھا۔ عام طور پر امیدوار نوکروں سے یوں بات کرتے جیسے کوئی گورا کالا میں سے بات کر رہا ہو۔ وہ سب بی۔ اے، ایم۔ اے اور چونکے تھے۔ لہذا انہیں اپنی عظمت کا شدت سے احساس تھا۔

ایلی میں نہ جانے کیوں یہ بات کبھی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ اس لئے نوکر یا ایسے ہی دوسرے ان پڑھ لوگ عام طور پر ایلی سے خوش رہا کرتے تھے۔

”آخری مرتبہ کیوں باہوچی۔“ گمانے پوچھا۔

”ارے یار گامے ہمیں تو چھٹی مل گئی۔“

”نہ باہوچی بجا کہ نہ کرو۔“ وہ بولا۔

”ارے ٹھیک کہہ رہا ہوں بیوقوف اپنا تو پتہ کٹ گیا۔“ ایلی چلایا۔

”میں نے کہا باہوچی۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

”کیا ہے؟“

”جو میں ایسی ترکیب لڑاؤں کہ بات بن جائے تو۔“

”بیوقوف“ ایلی ہنسا۔ ”ابے ہمارے والد صاحب نے چار سفارشی پنچائی خیمیں ایک

پوری چار سب بے کار گئیں۔ تو کیسی ترکیب لڑائے گا۔“

”ہر روز میری بات مانو تو سمجھ لو بات بچی ہے۔“ گمانے دانت نکالے۔  
 ”ایلی ہنسا۔“  
 ”میں یہاں سے جاؤ نہیں بیٹھے رہو۔ آرام سے بیٹھے رہو باہوچی سب ٹھیک ہو جائے گا۔“  
 ”یعنی خوار خواہ بیٹھا رہوں۔ لوگ کیا کہیں گے۔“  
 ”کئی کچھ نہیں کہے گا۔ کسی کو معلوم ہی نہ ہو گا۔“ گامے نے کہا۔

”اور اگر پرنسڈنٹ نے پوچھا۔“

”کہے بین لٹ پہ ہوں۔“

”بے بین لٹ؟“ ایلی نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا کہتے ہیں اسے جن کا پھیلہ ابھی نہیں ہوا۔“ گامے نے وضاحت کی۔

”پھل“ ایلی ہنسا۔ ”ویننگ لٹ۔“

”ہی گمانے نکالے۔“ بات بچی سمجھو باہوچی مجھ پر اقین کرو۔“

”تجہ دن رہتا پڑے گا یہاں۔“

”میں بھی آٹھ درج۔“

اس روز تو ایلی رک گیا لیکن اگلے روز اسے خیال آیا کہ ایک جاہل نوکر کی بات یوں اس آٹھ درج پڑے رہتا ہوں۔ اس نے پھر سامان باندھنا شروع کر دیا۔ لیکن گامے کے اصرار پر ایک گید پھر اسے خیال آیا چلو جانے کی جلدی کیا ہے۔ بین لٹ نہ سہی آٹھ روز سینا

روز باندھ وہ کالج میں جاتا۔ بی بی کی کلاس میں تو بہت کم لڑکے تھے لیکن ایس۔ اے۔ وی ایس۔ اے۔ کارن پڑا رہتا تھا۔ اس لئے وہ ایس۔ اے۔ وی میں جا گھستا۔ اور پچھلی سیٹوں پر بیٹھ کر لڑکوں کے ساتھ بچ بچاتا۔ بوٹ زمین پر گھساتا۔ اور منہ بند کر کے گلے سے شی شی لڑکیاں پھاڑتا۔

ایلی اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ کلاس میں گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔

”بہن خولی۔ اے تک وہ محسوس کرتا رہا تھا۔ وہ پرانا احساس کتری شدت کو بیٹھا تھا۔ یا شاید اب یہ تھی کہ بین لٹ پر ہونے کی وجہ سے وہ اسے محض تفریح سمجھ رہا تھا۔

ایک دن جب ہنگامہ ہوتا تو پروفیسر غصے میں آکر حاضری کارجرٹ منگوا لیتا اور پھر ان لڑکوں

اباں صرف ایک روح اور۔ اگر آتے ہی بات نہ بنی تو سجا چاہیں دیں پر جون گئی تو ٹھونک بجا  
 اباں لوں گے۔  
 لیکن یہ ہو گا کیسے۔ "ایلی نے پوچھا۔  
 جس یہ نہ پوچھے۔ "گے جواب دیا۔

اگھیا

ایلی پور پہنچنے کے بعد دوسرے چوتھے روز ہی شہزاد نے ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا اسے پلنگ پر بٹھا دیا  
 رذہاں کھڑی ہو کر سنجیدگی سے کہنے لگی۔  
 "ایلی یہ تمہیں کیا ہو گیا۔"  
 "ایلی ہو گیا ہے۔" اس نے حیرت سے دہرایا۔  
 "یہ تم کیا کر رہے ہو؟"  
 "ایلی کر رہا ہوں۔ بیٹھا ہوں۔" ایلی نے دیا۔

"ہت کو مذاق میں نہ ٹالو" وہ بولی۔ "جب سے تم امر تر سے آئے ہو تمہارا انداز ہی بدل  
 ہے۔ نگاہ بدل گئی ہے۔ تم نے مجھے کیا سمجھا ہے ایلی۔"

شہزاد کی آواز جذبات سے کانپ رہی تھی۔  
 "میں سمجھتی تھی تمہیں مجھ سے محبت ہے۔" اس کی آنکھیں ننناک ہو گئیں۔ "چلو محبت  
 کی۔ مجھ سے محبت کون کرتا ہے۔ اور۔ اور میرے پاس اب ہے ہی کیا جو میرے ساتھ محبت  
 ہائے۔ لیکن لیکن پھر بھی میرا خیال تھا کہ تمہارے دل میں میری عزت ضرور ہے۔ لیکن۔"  
 روکی لگی نکل گئی۔

"تربات کیا ہے۔" ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہت۔" وہ غصے میں بولی۔ "تم تو مجھ سے یوں سلوک کرنے لگے ہو جیسے میں بازار میں  
 ٹالہل۔ جیسے۔" وہ رک گئی۔ "بازار میں بیٹھی ہوئی بھی یہ برداشت نہ کر سکے گی۔"  
 "روا چلتے ہوئے چھپرتے ہو۔ انگلیاں کھبوتے ہو۔ ہاتھ پائی کرتے ہو۔ سب کے سامنے  
 "وہ رک گئی۔

ایلی کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ "میرا خیال تھا کہ تم میں جرات ہے۔" اس

سے پوچھتا جن کے نام رجسٹر میں درج نہیں تھے کہ وہ جماعت میں کیوں بیٹھے ہیں۔ اس کا ہاں  
 باری لڑکے اٹھ کر اپنی شان نزول کی وجہ تسمیہ بتاتے۔  
 "صاحب میرے کیس کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔"  
 "میرا کیس بھی زیر غور ہے۔"  
 "جی میرا نام تو چننا جا چکا ہے ابھی رجسٹر میں اندراج نہیں ہوا۔"

پہلی مرتبہ جب ایلی سے پوچھا گیا اس نے جواب میں کہا۔ "جناب میں بیٹن لست  
 ہوں۔"

"بیٹن لست۔" پروفیسر نے دہرایا لڑکوں نے قہقہہ لگایا۔  
 "تمہیں کس نے بتایا کہ تم ویننگ لست پر ہو۔" پروفیسر نے پوچھا۔  
 "جناب مجھے گامے نے بتایا ہے۔" ایلی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔  
 "گاما۔" پروفیسر بھگت سنگھ گھبرا گیا۔ "گاما کون۔"  
 "ہمارا باورچی۔"

اس پر جماعت کے لڑکے قہقہہ مار کر رہے۔ ڈسکیں بجنے لگیں۔ سیٹیوں کی آوازیں  
 ہوئیں اور پروفیسر بھگت سنگھ غصے سے احتجاجاً "کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے  
 سبھی شور مچا رہے تھے۔ "ارے وہ بیٹن لست کون سا ہے۔" وہ سب محبت اور احرام  
 نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ کلاس میں  
 کامرکز بننے میں کتنی لذت ہے۔

لیکن یہ سب کچھ محض تعین تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ایلی کا وہ حجاب اٹھ گیا تھا  
 بنیادی طور پر وہ ابھی تک دی ایلی تھا۔ احساس کمتری کا مارا ہوا ڈر اور خوف کے جذبات  
 ایلی۔

آٹھ روز کے بعد کالج پندرہ دن کے لئے بند ہو گیا۔ پھر دفعتاً "ایلی کو خیال آیا کہ ہاتھ  
 تک بیٹن لست پر ہی تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ کہ ایک نوکر کے کہنے پر وہ اپنے  
 کو احمق بنائے ہوئے تھا۔

"صرف ایک روح کے لئے پاؤں۔" گاما اس کی منتیں کر رہا تھا۔ "جب کالج بند  
 صرف ایک روح کے لئے یہاں آجائیں صرف ایک روح کے لئے۔ جس اتنے دنوں

بکھائی نہیں۔ جب بھی وہ میرے پاس آیا تو اس کی نگاہ میں نہیں انور ہوتی تھی۔ گویا وہ اپنے ہوتے تھے۔ وہ اور انور۔ ”وہ یوں ہنسی جیسے چینی کا پیالہ ترختا ہے۔“ اور میں میں نہ ہنسی نہیں۔ اکیلی ساتھی کے بغیر۔ انور سے ملانے کے لئے مجھے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور نہ۔ تم سدا کو بھولنے کے لئے تم — مجھے استعمال کر رہے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ درکے سے باہر نکل گئی۔ ایلچی چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا۔

اس کے ذہن میں ایک خلا پھیل رہا تھا۔ ایک دھند لگا۔

شروع کتنی تھی۔ امر ترے واپسی کے بعد ایلچی کا گویا نقطہ نظری بدل گیا تھا۔ اس کے پیروں ایک خوبصورت عورت تھی۔ وہ اس کی طرف یوں دیکھتا تھا جیسے بچہ مٹھائی کی ایک طرف دیکھتا ہے ایلچی کی نگاہ میں شہزاد کے ماتھے کی بندی معدوم ہو چکی تھی۔ اس کی لڑکیوں ایلچی کی نگاہ سے گویا او جمل ہو گئی تھیں۔ ان کی بجائے شہزاد کے جسم کی گولیاں آتی تھیں۔ اس کے کولھے مٹکنے لگے تھے۔ اس کی کرریشی جھولنے کی طرح جھولنے لگی اس کی سڈول پنڈلیاں برہنہ ہو گئی تھیں۔ اس کی نگاہ میں شہزاد دیوی نہیں رہی تھی۔ شہزاد کرب اس کی جبین میں سجدے بیتاب نہ ہوتے تھے۔

لیکن ایلچی اس واضح تبدیلی سے بے خبر تھا۔ اور اس سے بے خبر رہنے کے لئے اس نے کئی دلائل اور دلائل پیدا کر رکھے تھے۔

ایلچی خود ہوس کار نہ تھا۔ اور ہوس کاری سے اس قدر بیگانہ تھا کہ محبت کا بہانہ بنائے بغیر وہ کوئی کاکھیل نہیں کھیل کر سکتا تھا۔ اس کی ہوس کاری درحقیقت جذبہ کسری سے بچنے کا قہر شہزاد بھوکی نگاہیں ڈال کر وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ مرد ہے اور اس قاتل ہے کہ محبت کر سکے۔ درحقیقت وہ اپنی اہلیت کا سرٹیفکیٹ پیش کر رہا تھا۔

ایلچی اس کی وجہ سدا سے محرومی ہو۔

اکٹل

ایلچی دہل۔ بیٹھا رہا حتیٰ کہ سائے ڈھل گئے۔ شام پڑ گئی۔ پھر دیئے جل گئے اور لوگ اٹھ بھاگ کر لٹ گئے لیکن وہ جوں کا توں بیٹھا رہا۔

ایلچی نے آکر شور مچا دیا۔ ”یہ کیوں بیٹھا ہے۔ اٹھ باہر آ۔ یہاں کیا کر رہا ہے تو۔“

نے سوچ کر کہا۔

”جرات۔“ وہ ہنسی۔ ”جرات کی بات کر رہے ہو مجھ میں وہ جرات ہے کہ تم سب سڑک انگلیاں ڈال لو۔ جرات چھوٹی اور گری ہوئی باتوں میں نہیں ہوتی۔ تم نے ہمارا تعلق چھٹی کر دیا ہوئی بات بنا دیا ہے۔ کیا ہوس کے لئے جرات پیدا کروں۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”روتی کیوں ہو۔“ ایلچی کچھ کہنے کے لیے بولا۔

”روؤں نہ تو کیا کروں۔“ وہ بولی۔ ”میں سمجھی تھی کچھ پایا ہے اب معلوم ہوا کہ کویا نہیں۔“

”تم سمجھتے ہو میں تمہاری طرف اس لئے بڑھی تھی کہ مجھے ہوس پوری کرپنے کا شوق تھا۔ جسم کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی ہوس تھی۔“ ایلچی نے تو ہوس پوری کرنے کے ذریعے ہوس توڑ دیئے میں نے اپنے خاوند سے تعلق توڑ لیا میں نے اس سے بات کرنی چھوڑ دی۔ منہ نہ چھوڑ دیا۔ اور تم سمجھتے ہو کہ میں ہوس پوری کرنے کے لئے تمہاری طرف بڑھی تھی۔“ وہ رکتی کمرے میں کمری خاموشی چھا گئی۔ ایلچی چپ چاپ بیٹھا تھا۔

”میں بھی احمق ہوں۔“ وہ بولی ”جو یہ سمجھ بیٹھی کہ میں تمہاری نگاہ میں بہت کم ہوں۔ مجھے کسی کی نگاہ میں بہت کچھ ہونے کی ہوس تھی۔ میں نے سمجھا مجھے دو جہل کی امان مل گئی۔ میں نے لوگوں کی نگاہ میں ذلیل ہونا گوارا کیا میں نے لوگوں کے طعنے سننا گوارا کیا میں نے اپنی ماں کی زبان سے وہ وہ لفظ سنے جو کوئی سن کر برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہاری ماں بہن کے نیچے طعنے سنے اور ہنستی رہی۔ میں نے تمہارے طعنے سنے تم یہ سمجھتے رہے اور مجھے ہر میں ہر آتے جاتے کو مسکرا مسکرا کر اپنے دام میں پھنساتی ہوں۔ تاکہ اپنی ہنگام کو ٹھنڈا کر سکوں۔ میں نے تمہارا جلا پا بھی برداشت کیا اور یہ سب کس لئے۔ کیا سلسلہ ملا مجھے۔ کہ اب مجھے — تم — اپنی ہوس کا شکار بنا رہے ہو تمہاری نگاہ میں میری کوئی وقعت نہیں تمہارے لئے میں ایک دل بسلاوا ہوں۔ ہوس پوری کرنے کا ذریعہ ہوں۔“

وہ رونے لگی۔

ایلچی چپ چاپ بیٹھا تھا۔

”یہ میری اپنی بد قسمتی ہے۔ خاوند ملا جو پہلے ہی کسی کی محبت میں پاگل تھا۔ اس نے مجھ



ایلی کو خاموش دیکھ کر اس نے شنراؤ کو آوازیں دیں۔ ”دیکھ تو اسے کیا ہے۔ یہ کیسا بنا بیٹھا ہے۔“ ”کیا ہے۔“ شنراؤ داکٹائی ہوئی آواز میں بولی۔  
 نوبچے کے قریب بیگم آکر بولی۔ ”بہ بدھ مہاراج یہاں آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔“  
 پھر ہاجرہ اور فرحت آگئیں۔ وہ دونوں چیختی چلاتی رہیں۔ لیکن ایلی جوں کا توں رہا گیارہ بجے کے قریب شنراؤ آئی۔

”اب کیوں مجھے ذلیل کر رہے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”خدا کے لئے مجھے معاف کرنا نہ بد غصے میں کیا کیا بک گئی ہوں۔“

”نہیں تم نے تو کچھ نہیں کہا۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”تو پھر تم اس طرح کیوں بیٹھے ہو۔“ وہ بولی۔

”کس طرح بیٹھوں۔“

”جس طرح روز بیٹھتے ہو۔ ہنسو کھیلو۔“

”کیسے کھیلوں کیسے ہنسوں کب تک ڈھیٹ بن کر ہنستا رہوں۔“

”چلو اب اٹھ بیٹھو۔“ شنراؤ نے پیار سے اپنا ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیا۔  
 ”شنراؤ“ وہ بولا۔

”جی۔“

”میری ایک بات مانو گی۔“

”کیا۔“

”چلو کہیں چلے جائیں۔“

”چلے جائیں۔“

”ہاں کہیں بھاگ جائیں۔“

”پاکل ہو گئے ہو۔“ وہ ہنسی۔ ”میرے ساتھ بھاگ کر۔ اپنی زندگی تباہ کر گئے کیا۔“

”ویسے بھی تو تباہی ہے۔“ وہ بولا۔

”ایسی باتیں نہیں کیا کرتے“ وہ اس قریب تر ہو گئی۔

”مجھ سے اب برداشت نہیں ہو۔ تم میں پاکل ہوا جا رہا ہوں۔“

”ایسی باتیں نہ کرو۔“ وہ بولی۔ ”مجھے اکساؤ نہیں۔ اگر ایک مرتبہ میں نے برقی لے ڈالے

میرا بس چلے تو میں اسے کاٹ کر تمہیں دے دوں۔“ وہ اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوتے بولی۔  
 ایلی نے شنراؤ کا ہاتھ تھام لیا۔

”ہون۔“ بیگم اندر آکر ہنسی۔ ”یہاں تو کچھ اور ہی ہو رہا ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔  
 شنراؤ نے بیگم کو دیکھ کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ بلکہ دوسرا ہاتھ بھی ایلی کو دے دیا۔  
 ”تو بے حیائی کی کوئی حد ہوتی ہے۔“ بیگم چلائی۔

”نہیں ام۔“ شنراؤ نے ہنس کر کہا۔ ”بے حیائی کی حد نہیں ہوتی حیا کی ہوتی ہے۔“

”تو بے لڑکی۔“ وہ چلائی۔ ”تو یہ گھر رنڈی کا چوبارہ بنا رکھا ہے۔“

”ہی ہی۔“ چوبارہ۔ ”وہ ہنسی۔

”شرم نہیں آتی“ بیگم بولتی کبھی ہوئی باہر نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی شنراؤ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”تمہیں پانے کے لئے ایلی مجھے نہ جانے کیا کیا دینا پڑے گا۔ لیکن میں سب کچھ دے دوں۔“

”سب کچھ۔“ خوشی سے لیکن تم میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو۔ سب مجھے رنڈی سمجھتے ہیں۔“

”سمجھیں۔ لیکن تم مجھے رنڈی نہ سمجھو۔“ اس کی ہچکی نکل گئی۔

ایلی کی نگاہ میں اس کے جسم۔۔۔ کی گونیاں سمٹ کر معدوم ہو گئیں۔۔۔ شنراؤ کا چہرہ

سے ٹپٹپ ہو گیا۔ دیوی لوٹ آئی۔ اس کے ماتھے کا تل روشن ہو گیا۔

اس روز شنراؤ کی باتوں نے ایلی کو چونکا دیا وہ ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔

پھر اس پر پندرہ روز اس نے سوچنے میں گزار دیئے۔ کیا مجھے سادی سے محبت ہے یا شنراؤ۔

اس روز جب میں نے پہلی مرتبہ شنراؤ کا حنا مالیدہ ہاتھ تھاما تھا کیا اس لئے تھاما تھا کہ مجھے

سے محبت ہو چکی تھی یا اس لئے کہ وہ ایک بائیک عورت تھی جسے آسانی سے حاصل کیا جاسکتا

تھا۔ کیا مجھے سادی سے محبت ہے۔ کیا میں نے محسوس کرنے کے بعد اس سے محبت جتائی تھی

جانی پل ”جو جی چاہے کرو۔ تمہارے بس میں ہوں۔“  
 شہزادی آنکھوں میں محبت بھری چمک لہرائی۔ ”میں آؤں گی“ وہ بولی ”میں خود تم سے ملنے  
 یگی میں لاہور آؤں گی۔“  
 ”م“ وہ بولا ”لاہور آؤں گی۔“

تم سے ملنے کے لئے میں سات سمندر پار جا سکتی ہوں یہ تو لاہور ہے۔“  
 لاہور بورڈنگ پہنچنے ہی گما دوڑا ایللی کے پاس آیا۔ ”آگے بابو جی بڑا اچھا کیا میرا انعام ساتھ  
 لیا ہے۔“

ایللی نے حیرت سے گامے کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی اسے اپنی بات پر اس قدر یقین تھا۔  
 ایللی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ معجزہ کیسے رونما ہو گا۔  
 اگلے روز جب ایللی کلاس میں پہنچا تو ایک نہیں چھ لڑکے غیر حاضر تھے وہ لڑکے جن کو چن لیا  
 باہر جن کے نام رجسٹر میں درج تھے۔ دفعتاً ”ایللی کی نگاہ سے گویا پردہ ہٹ گیا۔“

گمانہ لگا۔ ”بابو جی ہر بار ایسا ہوتا ہے کسی کو نوکری مل جاتی ہے کوئی کسی اور لین میں چلا  
 آئے۔ کوئی ویسے ہی نہیں آتا۔ ہر سال دس ایک بابو چھٹیوں کے بعد نہیں لوٹتے۔ بس پھر جو  
 باہر اس کا نام رجسٹر پر آ جاتا ہے۔ ہاں بابو جی تو ڈاٹری ملاحظہ ہو گا۔ نہ جانے کتنے اس میں  
 لگ جائیں گے۔“

پچھتے روز ہی ایللی نے جماعت میں شور مچا دیا۔ جی میرا نام آپ بولتے ہی نہیں میں بیٹھن  
 نہ لگا ہوں میرا نام رجسٹر میں نہ ہو گا تو حضرات کیسے پوری ہوں گی۔“ ایللی کا نام رجسٹر  
 پر درج کر لیا گیا۔

سٹرل ٹرننگ کالج کی عمارت بھائی دروازے کے قریب ایک وسیع چوگن میں واقع تھی۔  
 طرف کالج کی عمارت تھی جس کے شرقی اور غربی پہلو میں بڑے بڑے لان تھے۔ شال میں  
 ٹانگ کی عمارت ایک وسیع دائرے میں بنی ہوئی تھی۔ صدر دروازے کے ارد گرد دو روہ  
 بند تھے جن کے اوپر چوبارے بنے ہوئے تھے اوپر کی منزل میں بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ لالہ  
 غلام تھے نچلے کمروں میں ملاقات کا کمرہ۔ کومن روم اور دیگر کمرے تھے۔ ان کمروں سے  
 ٹانگ کے بعد بورڈنگ کا وسیع صحن تھا جس میں لان بنے ہوئے تھے ایک باغیچہ تھا۔ لان کے  
 ٹانگ ایک لکڑی دیوار تھی جس میں سات دروازے کھلتے تھے۔ نیز دروازے کے اندر داخل

کیا یہ غلط ہے کہ کل کھوٹے کی غفٹ مٹانے کے لئے میں نے اسے جیتنے کی کوشش کی تم  
 اپنی انا کو تسکین دینے کے خیال سے اسے جیت لیا تھا۔ تو کیا مجھے ساری اور شہزادوں سے  
 نہیں۔ تیم سے بھی تو مجھے محبت نہ تھی میں نے اپنے باپ سے انتقام لینے کے لئے اس سے  
 رچائی تھی۔ تو محبت کیا ہے کیا مجھے کسی سے بھی محبت نہیں ہے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آ  
 اس کے باوجود ایللی کے دل میں شہزاد کا احترام تھا اس کی آرزو تھی لیکن ساری کے  
 کے دل میں ایک جذبہ تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ اسے پالے اور پھر اس کے ساتھ ہی اس کے  
 چھپی ہوئی آرزو تھی کہ وہ شہزاد کے سحر سے نکل کر نارمل زندگی بسر کرے ساری بات  
 الجھاؤ تھی۔ اور اس الجھاؤ سے لکنا نامکن تھا۔ سوچ سوچ کر وہ تھک گیا اور پھر اس  
 آپ کو حالات کے رحم و کرم پر پیٹک دیا چلو کہیں تو کنارے لگوں گا۔  
 لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ افق سے پرے ایک طوفان اٹھنا ہو رہا ہے۔

## ایللی۔ اے۔ وی

پندرہ روز کی چھٹی گزارنے کے بعد واپس سٹرل ٹرننگ کالج لاہور جانے کا سوال  
 نہیں ہوتا تھا۔ ایک معمولی سے نوکری بات کا یقین کر لیتا۔ کتنی مضحکہ خیز بات تھی۔ اگر  
 شہزاد ایللی سے بات نہ کرتی اگر وہ ایللی سے احتجاج نہ کرتی۔ اگر ایللی کی نگاہ میں شہزاد کا نام  
 رہتا اور اس کا ماتھے کا قل ظلوغ نہ ہوتا اور وہ سوچ میں نہ کھو جاتا تو وہ غالباً لاہور نہ جا  
 اس کی زندگی کا دھارا کسی اور طرف بہتا۔ لیکن اس ایک چھوٹی سی تفصیل نے حالات کار  
 دیا۔

ایللی کو گامے کی بات کا چنداں یقین نہ تھا۔ وہ صرف اس خیال سے لاہور جا رہا تھا کہ  
 روز کے لئے سینما دیکھیں گے۔ شاید کسی نوکری کا پتہ چل جائے۔ شاید شادی کے مغلطی  
 ملے۔ نہیں تو سیر ہی سہی۔

جب وہ روانہ ہونے لگا تو شہزاد آگئی۔  
 ”تم اس قدر خاموش کیوں ہو“ وہ بولی ”میں کیا کروں اگر تمہارا ہاتھ نہ روک نہ  
 نگاہ میں آپ گر جاتی ہوں اور روک دوں تو مجھے دکھ ہوتا ہے چونکہ تم برف کی طرح  
 ہو۔ کیا کروں میں۔“

”پھر“

”جہلی میں یہاں ہوں۔“

”یہاں تو ہو لیکن کس طرح آئے ہو۔“ جی کے بولا۔

”جہلی میں اسی کالج میں ہوں۔“

”ایک کلمہ“

”ہاں تم بھی یہاں داخل ہوئے ہو۔“

”بالکل۔۔۔ لیکن یار یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنے دن سے ہم دونوں یہاں ہیں اور ایک

رہے کو دکھانک نہیں۔“

”تم تو بی بی میں ہو گئے۔“

”ہاں ہاں۔“

”میں تو ایسے وی میں ہوں۔“

”پھر بھی رہتے تو اسی بورڈنگ میں ہوتا۔“

”جی کے نے ایللی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا اسے ملاقاتی کمرے سے باہر لے گیا۔ وہ ناچ رہا

بانا تھا تانیاں بجا رہا تھا۔ ”یار یہ تو بہت اچھا ہوا۔ بہت اچھے بہت اچھے دونوں اکٹھے رہیں

لوہر کو لوہر۔“ وہ اسے ڈیوڑھی سے ملحقہ ایک کمرے کی طرف لے گیا۔

”یہ کدھر لے جا رہے ہو۔“ ایللی نے پوچھا۔

ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ کر اس نے ایللی کو کرسی میں بٹھا دیا۔ ”اب آرام سے

لو۔ وہ چائے پلاؤں گا تمہیں کہ ناؤ گھر بھول جاؤ گے۔“

”لیکن یہ کمرہ کس کا ہے۔“ ایللی نے پوچھا۔

”میرا اپنا کمرہ ہے۔“ پال نے چھاتی ٹھونک کر کہا۔

”لیکن یہاں تو ڈار میٹروں میں رہتے ہیں سب۔“

”پڑے رہیں میں تو ان خچر پاتری اسٹبلوں میں نہیں رہ سکا۔ اور اب تم بھی یہیں رہو

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ابھی اپنا سامان یہاں منگوالو۔ دیے تو چار سیٹوں کے لئے ہے لیکن ہم اسے

ہوتے ہی ایک بہت لمبا صحن۔ جس کے ساتھ ساتھ ایک برآمدہ اور ایک بہت لمبا کمرہ ملا تھا۔  
لمبا کمرہ ڈار میٹری کمرہ تھا۔ اسی ساخت کی کل چھ ڈار میٹریاں تھیں ہر ڈار میٹری میں دو دروازے  
کے رہائش کی جگہ تھی۔ ساتویں ڈار میٹری میں کچن نوکروں کے رہنے کی جگہ اور ڈار میٹری  
تھے۔

چند ایک ڈار میٹروں میں ہر سیٹ کے بعد ایک چھوٹی سی پارٹیشن لگی تھی۔ یہ ڈار میٹریاں  
ٹی کے طلباء کے لئے مخصوص تھیں۔ پارٹیشن کے بغیر جتنی ڈار میٹریاں تھیں وہ سب لڑکوں  
دی کے طلباء کے لئے تھیں۔ بورڈنگ میں داخل ہونے کے لئے صدر دروازے کے علاوہ  
راستہ نہ تھا۔ ڈار میٹروں کے گرد اونچی دیواریں بنائی گئی تھیں۔ باہر کھلنے والی کھڑکیوں پر لمبے  
مضبوط جالی لگی ہوئی تھی۔

یہ بورڈنگ دوسرے کالجوں کے عام بورڈنگ کی طرح نہیں تھا۔ یہاں بہت سی قدور  
پابندیاں تھیں۔ باہر کا مہمان بورڈنگ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مہمان کو ملنے کے لئے پورے  
باہر ملاقاتی کمرے میں جانا پڑتا۔ رات کو دس بجے صدر دروازہ بند کر دیا جاتا اس کے بعد کسی  
اندر آنے کی اجازت جا کر رجسٹر میں حاضری لگاتے اور غیر حاضر طلباء کی رپورٹ کی جاتی اور طلباء  
طور پر غیر حاضر رہنے والے کو کالج سے نکال دیا جاتا۔ ایللی کو وہاں پورے آٹھ مہینے گزارنے تھے۔  
اسی روز نہ جانے کیوں وہ چلتے چلتے ملاقاتی کمرے میں رک گیا اچھا خاصہ کمرہ ہے اس نے  
سوچا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور پھر سوچتے سوچتے نہ جانے کہاں جا پہنچا۔ اگر منصر لے آئے تو  
یہاں آئے گا اور پھر۔۔۔

”ارے تم۔“ جی کے اندر جھانکتے ہوئے چلایا۔

ایللی چونکا۔

”تم یہاں۔۔۔ کس سے ملنے آئے ہو۔ کیا مجھ سے؟“

”تم جی کے تم یہاں۔“ ایللی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تمہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں“

”تم یہاں ہو۔“ ایللی تعجب سے بولا۔

”تم کس سے ملنے آئے ہو۔“

”کسی سے بھی نہیں۔“

بچیدہ اور خاموش تھیں اس کے باوجود ان کا توجہ کا مرکز ہوتا۔ وجہ فقط یہ تھی کہ اس زمانے میں کسی کالج میں مخلوط تعلیم رائج نہ تھی۔ سنٹرل ٹریننگ کالج واحد کالج تھا جس میں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ تعلیم پاتی تھیں۔ اسی وجہ سے گورنمنٹ اور مشن کالج کے طلباء بھی بھانے بھانے سنٹرل ٹریننگ کالج آیا کرتے تھے تاکہ ایک نظر انہیں دیکھ سکیں اور اگر ممکن ہو تو — شاید کوئی رات نکل آئے۔

بی بی کے پانچ چھ لڑکے تو ہر وقت ان کے گلے کا ہار بنے رہتے تھے۔ وہ جیب میں زائد پنسل اور قلم رکھتے اس بات کے منتظر رہتے کہ کب ان میں سے کسی کے قلم کی سیاہی ختم ہو یا پنسل کا ٹکڑا ٹوٹ جائے تاکہ انہیں پنسل یا قلم پیش کر سکیں۔

وہ بڑی محنت سے کلاس کے لکچروں کے نوٹ لکھتے اور بورڈنگ آکر ہا سناور کر انہیں نقل کرتے کہ شاید لڑکیوں کو نوٹ پڑھنے کی ضرورت محسوس ہو۔ جیب میں زائد رومال اٹھائے ہوتے نہ جانے کب کوئی لڑکی لان میں بیٹھنا چاہے تاکہ وہ فوراً رومال گھاس پر بچھا دیں۔ ان لڑکیوں کو کوٹ بردار کہا جاتا تھا چونکہ وہ لڑکیوں کے کوٹ اٹھاتے پھرتے تھے۔ اکثر لڑکے طنز سے انہیں دکت بردار کہا کرتے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ کوٹ برداری ایک بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا اور کوئی لڑکی کسی کو اپنا کوٹ اٹھانے کے لئے وہ دیتی تو وہ لڑکا پھولے نہ سماتا اور اس بات پر فخر کرنا دوسرے لڑکے اس کا مذاق اڑاتے درپردہ اسے تحسین بھری نظروں سے دیکھتے۔

ایلی کے لئے یہ محور قطعی طور پر دلچسپی سے خالی تھا۔ ان چھ میں نہ تو کوئی سادی تھی اور نہ ٹیڑھ۔ اور پھر وہ تھیں بھی کیا ایک دو تو والدہ قسم کی تھیں ایک دو وہ چیزیں بن چکی تھیں جو کتابیں جمع ٹیک جمع دلاپن جمع جلی کٹی نگاہ جمع نسوانیت کا فقدان کا مجموعہ ہوتی ہیں دو ایک البتہ فعلی صورت تھیں مطلب ہے اچھی خاصی وہ خاموش رہتی تھیں۔ ہنسی نہ تھیں کہ کوئی ان کی باتوں کو التفات نہ سمجھ لے۔ آنکھیں نہ منکاتی تھیں کہ کوئی ان کی چتون کی جنبش کو اشارہ نہ کجے لے کل کر بات نہیں کرتی تھیں کہ کوئی بات منہ سے نکل نہ جائے۔

ایلی کے کالوں میں ابھی تک سادی کی باتیں گونجتی تھیں اس کی نگاہوں میں شہزاد کے ماتھے والی عتارف کی طرح چمک رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ایلی کے لئے وہ چھ لڑکیاں جاذب نظر جماعت میں بیٹھے ہوئے وہ یہ آرزو کرتا کہ جلدی پیڑ ٹھہرے ختم ہو اور وہ برآمدے سے گزرنے لگے۔

ڈبل سیٹر بنالیں گے۔  
”لیکن پرنسڈنٹ۔“

”لالہ جی۔“ وہ چلایا ”لالہ جی میری ہریات مانتے ہیں۔ ان کا فکر نہ کرو۔“  
ایلی کا سامان اسی روز جی کے کمرے میں آگیا اور وہ دونوں وہاں اکٹھے رہنے لگے۔

## چھ لڑکیاں

سنٹرل ٹریننگ کالج میں زندگی ایک محور کے گرد گھومتی تھی۔ اور یہ محور چھ لڑکیاں تھیں یہ لڑکیاں بی بی گھاس کی طلبا تھیں۔ دن بھر کالج کے وقت بی بی کے طلباء شدت سے محو کرتے کہ وہ کلاس میں بیٹھی ہیں۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سن رہی ہیں۔ ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہی ہیں۔ صرف لڑکے ہی نہیں۔ بیشتر پروفیسر بھی ان کی موجودگی شدید احساس رکھتے تھے۔

ایس اے وی کے طلباء کو یہ احساس ہو تاکہ ساتھ والے کمرے میں لڑکیاں ہیں ایک نم چھ۔ اور ان کے اپنے کمرے میں کوئی بھی نہیں۔ اور ابھی جب وہ حساب کا پیڑ ختم کرے برآمدے سے گزر کر جغرافیہ پڑھنے کے لئے جائیں گے تو راستے میں گزرتے ہوئے انہیں دیکھ گئے۔ وہ بچی نگاہ کئے بیٹھی ہوں گی۔ یوں کام میں منہمک ہوں گی۔ جیسے کچھ خبری نہ ہو مگر ان کے باوجود انہیں سب خبر ہوگی۔ ہر لڑکا یہ سوچتا کہ وہ اس کی چال دیکھیں گی۔ یہ دیکھیں گی۔ اس نے کیسے کپڑے پہن رکھے ہیں ٹائی کس رنگ کی ہے۔ بال کیسے بناتا ہے۔ اور اس کا لہجہ کس قدر رومانیک ہے کالج سے فارغ ہو کر جب وہ بورڈنگ میں آتے تو آپس میں ان کے متعلق بحثیں کرتے۔

”بھئی مس رومو بڑی چالاک ہے بن دیکھے بات تاڑ جاتی ہے۔“  
”یار آج مس میتا نے حد کر دی۔ دفعتاً ایسی نگاہ ڈالی کہ اپنے ہوش گم ہو گئے۔“  
”آج مس راواہاشام کے ساتھ نک شاپ میں گئی تھی۔“  
”اور وہ دیکھا تھا تم نے مس میتا نے کیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یار بڑا لکڑنٹ۔“  
”اے۔“

وہ لڑکیاں چنداں خوب صورت نہ تھیں نہ ہی ان میں زندگی کی خصوصی چمک تھی۔

## موٹی موٹی کتابیں

سنٹرل ٹرننگ کالج میں داخل ہوتے ہی ایللی پنجاب پبلک لائبریری کا ممبر بن گیا تھا جس سے اسے بیک وقت آٹھ کتابیں مستعار مل سکتی تھیں اور وہ ہر پینتے موٹی موٹی مختصم کتابیں جن کو لایا کرتا تھا ایللی نے کتابوں سے از سر نو دلچسپی پیدا کر لی تھی۔ اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ لڑکے لڑکیوں سے کتابوں کی باتیں کیا کرتے تھے۔

”آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے کیا۔“

”فلاں مصنف نے تعلیم کے متعلق ایک انوکھی تصویر پیش کی ہے۔“

”ہنریات میں دلچسپی ہو تو فلاں مصنف کا مطالعہ کرو۔“

ایللی کالج کے اوقات میں کتابیں لانے کا خاص پروگرام بنایا کرتا تھا۔ اگرچہ اسے کافی لڑاکا لگتا پڑتا لیکن لائبریری سے آتے ہوئے وہ ایسا راستہ اختیار کرتا کہ واپسی پر اسے کالج کے برآمدے سے گزرتا پڑے اور وہ کتابوں کے اس انبار کو یوں اٹھائے برآمدے سے گزرتا جیسے اسے خبری نہ ہو کہ وہاں بی بی کلاس میں لڑکیاں بیٹھی ہیں اور وہ اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہی ہیں۔ جب وہ کتابیں اٹھائے ہوئے ہوتا اس وقت اس کے لئے ضروری ہو جاتا کہ وہ لڑکیوں کی طرف قطعی طور پر نہ دیکھے لیکن وہ اس انداز سے اٹھاتا کہ ان کی پشتیں واضح طور پر دکھائی دیں۔

جاہ کی صحبت کی بدولت ایللی چند ایک مشہور مصنفوں کی کچھ کتابیں پڑھ چکا تھا اس مطالعہ کی ابتداء برٹنڈرسل سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے کسلے ہالڈین شاپن ہارنٹیا کی چند ایک کتابیں پڑھی تھیں۔ پھر انصار منصر سے متاثر ہو کر اس نے داستودسکی اور انگریزی نظموں کا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے مطالعہ سے براہ راست خاص دلچسپی نہ تھی۔ جب بھی سادی کی یاد اسے ستاتی تو وہ اپنی توجہ منعطف کرنے کے لئے نظمے یا برگستان کی کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش کرتا یا جب کبھی شہزاد کے رویے سے وہ محسوس کرتا کہ وہ کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہو رہی ہے تو وہ احتجاجاً ”کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور بھد مشکل اس کے چار ایک صفحات پڑھتا لیکن پھر اسے نفس مضمون سے دلچسپی محسوس ہونے لگتی اور اس طرح اس کا مطالعہ منفی حیثیت چھوڑ کر اثباتی حیثیت اختیار کر لیتا مگر حال مطالعہ اس کے لئے محض فرار تھا۔

سنٹرل ٹرننگ کالج میں بھی اسے زیادہ تر دلچسپی کتابیں لانے اور ان کی نمائش کرنے سے نہیں کتابیں جو وہ لاتا تھا۔ تمام فلسفے سے متعلق ہوتی تھیں۔ یا فزیکس کے ایسے مسائل کے متعلق جن میں فلسفے کا رنگ حاوی تھا۔ ناول پڑھنے سے اسے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ چونکہ ناول کا متن و بحث کی داستانیں ہوتی تھیں اور پڑھتے ہوئے اسے شہزاد کا کمرہ یاد آجاتا سادی کے ناول کی وہ بیڑھیاں جہاں وہ رات کے اندھیرے میں ملا کرتے تھے اس طرح مطالعے کا مقصد یہ بن جاتا۔ اس سنجیدہ قسم کے مطالعے سے اس کے جذبات کی چھلکن تو دور نہ ہو سکتی البتہ ان کے چہرے پر عجیب قسم کی کرخشکی سی پیدا ہو گئی۔ جیسے زیادہ ابلے ہوئے انڈے پر ہوتی ہے اس کی لچرہ لچرہ ہوا جا رہا تھا ٹھوڑی ٹھٹکی آ رہی تھی۔ اور پیشانی پر گہری تیوری قائم ہوئی جا رہی تھی۔

شاید ایللی ان نمائشی کتابوں کو کبھی نہ پڑھتا لیکن جی کے کے طعنوں نے اسے مجبور کر دیا ان ناولوں سے غصے پانے کیلئے چاروں چار اسے ہر روز وہ کتابیں کھول کر بیٹھنا پڑتا۔

جی کے کے

جی کے کے ایک نہیں بلکہ دو مزاج تھے۔ وہ بیک وقت بے حد خوش مزاج اور بہت دکھی تھا۔ ان دو مزاجوں کی کھینچا تانی جی کے کی زندگی کا حاصل تھی۔ جب وہ چپ ہوتا تو بالکل ٹاپ ہو جاتا۔ اس کی طوطا نما خمدار ناک کی دیوار پر بد مزاجی کا ڈھیر لگ جاتا۔ اس کی چھوٹی ہانڈا آنکھوں میں دکھ کے انبار لگنا شروع ہو جاتے۔ جب وہ بات کرنے کے موڈ میں ہوتا تو وہ اٹھ کھڑے جاتا۔ شور مچاتا۔ مذاق کرتا۔ شوخ باتیں کرتا۔ اس وقت اس کی کیفیت یوں ہوتی جیسے اس کی بوتل کھل گئی ہو۔ چھینٹے اڑتے بلبے اٹھتے اور سب کو بھگودیتے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ جی کے کا اصلی مزاج کونسا تھا اور نقلی کونسا۔

مخصوصت ایللی کے نزدیک جی کے کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی انا پسندی تھی۔ وہ اپنے خیالات کو درست سمجھتا تھا اپنی بات کو حق تصور کرتا اپنے جذبات کو خارجی حالات کا مناسب ”عکس سمجھتا تھا۔

جی کے کی انی طور پر آقا طبیعت کا مالک تھا۔ اس کا برتاؤ محبت و رحمت کر خنکی خود اعتمادی اور انا پرستی کا مجموعہ تھا۔ وہ اپنے حلقے کا از خود سردار بن جاتا اور پھر سردار بن لیا جاتا۔ اس بات پر

جی کے کالج کی ان چھ لڑکیوں سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔  
”لا حول ولا قوۃ“ وہ چلاتا۔

”یہ لڑکیاں سب کے اعصاب پر سوار ہیں۔ اور پھر لڑکیاں کہاں وہ تو بیشتر عورتیں ہیں والدہ کی عورتیں۔ کیوں ایلی کیا تمہیں والدہ قسم کی عورت سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔“  
”جی کے کالج سن کر ایلی کا دل دھک سے رہ جاتا۔ اس کے روبرو صغیہ آکھڑی ہوتی اور بچہ بنا بیہ ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی۔ خانم گورے گدے سے ہاتھوں سے اس کے گلے ملتی۔ ایلی کو والدہ قسم کی عورت سے دلچسپی نہیں بلکہ عشق تھا۔ عورت در حقیقت اس کے ذہن میں بھرے بھرے جسم کی ایک گود تھی جس کے پہلوؤں پر بازو اور ہاتھ لٹکتے تھے جو سسلانے اور چمکنے کے لئے بے قرار تھے لیکن ایلی نے کھلے طور پر اس شدید جذبے کو کبھی اپنایا نہ تھا۔“  
”لا حول ولا قوۃ“ وہ گویا شدت جذبات کا اظہار کرتا۔ نہ جانے کیوں یہ سب پاگل ہو رہے ہیں۔ کیوں پاگل ہو رہے ہیں۔ بتاؤ نا۔ بول۔“ جی کے ترنگ میں آجاتا ”جواب دو۔“

”یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔“ ایلی کو جی کے پر غصہ آنے لگتا۔

”کیا مطلب“ وہ چلاتا ”نوجوان والدہ قسم کی عورتوں کو پسند کریں۔ عجیب بات نہیں کیا۔“

”نوجوان نہ کریں تو کیا بوڑھے کریں گے۔“ ایلی جواب دیتا۔

”تم بھی بے وقوف ہو۔“ جی کے جوش میں آجاتا۔

”ہم دونوں ہی بے وقوف ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تمہیں اپنی حماقتوں کا احساس نہیں۔“

”بالکل غلط۔“ وہ چلاتا ”تم ہو گے ہم تو نہیں۔ ہم تو دانش ور ہیں۔ دراصل یہ فرائیڈ پڑھ کر تم اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہو۔ تم سے بات کرنا بے کار ہے تم نہیں سمجھ سکتے۔“  
جی کے اٹھ کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ وہ خاموش وہ جاتا۔ اس کی ناک پر بد مزاجی کے ڈھیر لگ جاتے آنکھوں سے دکھ جھاگتا۔ مظلومیت کی پھوار پڑتی۔

جی کے کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے آپ کو بے حد مظلوم سمجھتا تھا۔ اسے یہ خیال تھا کہ وہ قربانی کا کبرا ہے۔ دوسروں کے مفاد کے لئے وہ اپنے خیالات یا مفاد کی قربانی نہیں دیتا تھا سمجھتا تھا کہ دے رہا ہے۔ لہذا وہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا تھا ایلی — اس قسم کے خیالات سے اسے مستفید کرتا تھا لیکن اس کے باوجود ایلی سمجھتا تھا کہ وہ خیالات غلط ہیں۔ ایک

ایلی کو بے حد غصہ آتا تھا۔ ایلی میں سردار بننے کی نہ تو ہوس تھی اور نہ اہلیت۔ وہ بہت کم کے پیچھے چلنے پر مجبور تھا لیکن جب پیچھے چلتا تو محسوس کرتا کہ اسے پیچھے چلنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اور یہ زیادتی ہے۔ لہذا اسے غصہ آتا شروع ہو جاتا دراصل ذہنی طور پر ایلی میں شدت کی انفرادیت موجود تھی ذہنی طور پر ایلی مضبوط تھا لیکن طبعی طور پر بے حد کمزور اور بودا تھا اس لیے جی کے کی اتنا پرستی سے بے حد تالاں تھا۔

مثلاً ”ایلی کی کتابوں کو دیکھ جی کے طنز“ چلاتا۔

”ارے یہ کتابیں پڑھے گا کون۔“

”کچھ نہ کچھ تو دیکھ لوں گا۔“ ایلی جواب دیتا۔

”کیوں ان میں تصویریں ہیں کیا۔“ جی کے کی طنز شدت اختیار کر لیتی۔

”نہیں تو۔“

”تو پھر دیکھنے کا کیا مطلب؟“

”مطلب ہے کچھ نہ کچھ پڑھوں گا۔“

”یہ فرائیڈ۔ دانش۔ ایلس۔ جیم جینز ورڈز ور تھ۔ انہیں پڑھو گے تو تم۔ لیکن مجھے کون؟“

”تم جو ہو تمہاری مدد سے کچھ پتہ چل ہی جائے گا۔“ ایلی طنز کرتا۔

”اونہوں۔ بجھی ہم تو حساب دان ہیں۔ حساب کا کوئی مسئلہ لے آؤ۔ لیکن یہ غلط

اور نفسیات اور جنسیات یہ اپنے بس کا روگ نہیں۔“

جی کے کی ان باتوں کی وجہ سے ایلی کو لازماً ہر روز کسی ایک کتاب کو کھول کر بیٹھا پڑنا — پھر وہ بھول جاتا کہ اسے صرف کتاب کھول کر بیٹھنا ہے پڑھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ پڑھنے کی جگہ وہ سادی کی خوش گہیوں کے متعلق سوچ سکتا ہے شہزاد کے حسین جسم کا تصور کر سکا ہے پہلوئے حور میں لنگور کے واقعہ پر غور کر سکتا ہے لیکن اس واقعہ پر غور کرنا تو ایلی کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا۔ اب تو یہ صورت پیدا ہوئی جا رہی تھی کہ سادی کا خیال آنا تو اسے نہیں لگتی اور وہ شدت سے محسوس کرتا کہ سادی ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔ نہ جانے کہاں چلی گئی۔ اگر وہ رہتی وہیں لاہور میں رہتی تو والد صاحب کا انکار بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا۔ کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی۔

دوست کا اسے یوں جھٹلانا — اور پھر دوست بھی ایسا جس کے لئے اس نے کیا نہ کیا ہو۔  
چپ ہو جانے سے پہلے جی کے ایل کی طرف ایک نگاہ ڈالتا بالکل وہی "واؤ ٹو میٹس" والی  
نگاہ۔ اور پھر سیرز کی طرح آرام کرسی میں گر جاتا اور ایل کی متوقع خنجر کے وار کا انتظار کرنا  
— پھر اسے غصہ آتا کہ متوقع وار میں تاخیر کیوں کی جارہی ہے۔ تاخیر کا مقصد یہ ہے کہ کئی  
کے کے کرب میں اضافہ کیا جائے۔

ایل کی کو یہ سب باتیں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ اسے صرف جی کے کی پھولی ہوئی ناک نثر  
آتی تھی جس پر بد مزاجی کے انبار لگے ہوتے۔

پھر ان کے دوستوں میں سے کوئی آجاتا۔ مثلاً "بیا شام پریم رائے یا چلن۔

"ارے تم دونوں اندر بیٹھے ہو۔" شام چلاتا "ہائیں یہ الیاں اتنی موٹی کتب پڑھ رہا  
ہے۔"

"یہاں تو بڑی بڑی کتابیں پڑھی جاتی ہیں اس کمرے میں۔" جی کے بڑے رعب سے  
جواب دیتا۔

"کیا ہے یہ۔" شام پوچھتا۔

"تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی پوچھنے کا فائدہ۔"

ایل کی کو اس بات پر اور بھی غصہ آتا۔ لو۔ ابھی ان موٹی کتابوں پر مستنصر کر رہا تھا اور اب ان  
پر فخر کا اظہار کر رہا ہے اور وہ بھی ایسے انداز میں جیسے وہ کتابیں اس کی اپنی ہوں اور اس نے ایل  
کو پڑھنے کے لئے مستعار دی ہوں اور ساتھ ہی نفس مضمون کو سمجھنے میں ایل کی امداد کا بیڑا  
اٹھائے ہوئے ہو۔

جی کے اکثر ایل کی پر بھی فخر کا اظہار کیا کرتا تھا۔ لیکن اس اظہار میں ایل کی عظمت کا عنصر نہ  
ہوتا بلکہ ایل کی عظمت کا پہلو نکلتا۔ مثلاً دوسروں کے رویہ وہ ایل کی دوستی پر فخر کا اظہار کرتا تو  
ایسے محسوس ہوتا جیسے کہہ رہا ہو۔ دیکھا ہم وہ ہیں جس کے ایسے دوست ہیں۔

ایل کیوں کے متعلق کئی ایک مختلف زاویے نظر رائج تھے۔ بابا کا نقطہ نظر بہت دلچسپ تھا بابا کا  
آنزک تھا اس کی عمر چالیس برس تھی چہرہ ڈھلک چکا تھا۔ جسم میں تیل کی سی بے بسی تھی۔

اس عمر کے باوجود بابا بنیادی طور پر محبوب واقع ہوا تھا۔ لڑکیوں کی بات چٹھڑ جاتی تو ہنس کر  
ماتے۔ تم کوئی لڑکیوں کی بات کر رہے ہو۔ سارا دن سبھی لوگ لڑکیوں کا رونا روٹے ہیں۔ ہم  
نہ کوئی لڑکی نہیں دیکھی یہاں۔"

"ایل۔" ایل کی چلایا۔ "ایک نہیں چھ ہیں چھ۔"  
"ہوں گی بھائی۔" وہ بے پروائی سے کہتا "لیکن ہم نہیں مانتے اگر وہ لڑکیاں ہیں تو بھائی خود  
ادھارے پاس کھینچی چلی آئیں گی۔ آج تک تو ایسا کبھی نہیں ہوا اور خود بخود ہماری طرف نہ  
چلی آئے۔"

"دیکھا تو کرتی ہیں تمہاری طرف۔" ایل کی نے اسے چھیڑا۔

"ایل۔" جی کے چیختا۔ "وہ تو والدہ قسم کی ہیں تمہارے جوڑ کی ہیں۔"

"ابے تجھے کیا پتہ؟" بابا ہنستا۔ تو دو اور دو چار کے سوا کیا جانتا ہے جو والدہ قسم کی ہوتی ہیں۔  
تو اپنا اپنی گود ہری رکھنے کے لئے لڑے تلاش کرتی ہیں۔ ہاں اگر لڑکی ہو تو وہ البتہ "وہ اپنے  
پہ پاتھ پھیر کر کہتا "مرد ڈھونڈے گی۔ دیکھ لیتا ایک نایک دن ہمارے پہلو میں پہنچ کر رہے گی  
ان میں کوئی لڑکی ہے تو۔ اور اگر نہیں تو بٹاؤ سب کی سب تمہیں کشیں۔" وہ شام سے کہتا  
ہم گود میں بیٹنے کے قابل نہیں بٹھانے کے ہیں۔"

بابا کی شخصیت میں ایک عجیب سی مٹھاس تھی اس کے انداز میں جذباتی گرمی منعکس ہوتی  
تھی۔ ایک عجیب سا لگھ۔ اس سے چاہے بات کرو نہ کرو ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ تمہارے پاس  
بٹھا ہوا۔ تمہارے دکھ درد میں برابر کا حصہ دار ہو۔ اول تو وہ بحث کرنے کا عادی ہی نہیں تھا اور  
دوسری دوسرے کو جھٹلاتا بھی تو دوسرا محسوس کرتا کہ درحقیقت دل ہی دل میں وہ اہل کا ہم  
سا ہے ویسے ازراہ مذاق اختلاف رائے کا اظہار کر رہا ہے۔

شلم گویا مٹھتی ہوئی سورج کی ایک کرن تھی۔ جہاں بھی وہ پہنچ جاتا۔ وہ جگہ انبساط کے دودھیا



”اچالے سے منور ہو جاتی۔ سنجیدہ سے سنجیدہ بحث کے دوران میں شام آجاتا تو بحث خوش فہم گفتگو میں بدل جاتی دلائل رنگین اشارات کا انداز اختیار کر لیتے۔“

شام ایم۔ ایس۔ سی کر چکا اور اب بی ٹی میں اس لئے داخل ہوا تھا کہ اس نئے ٹی نوکری ملنی ہے حد مشکل تھی۔ لیکن اس کے رویے سے کبھی ظاہر نہیں ہوا تھا کہ وہ ایم۔ ایس۔ سی ہے۔ اس سے پوچھتے ”یار تم ایم۔ ایس۔ سی ہو۔“ تو وہ ہنس کر کہتا ”ایم۔ ایس۔ سی ہو۔“ تو اب اے بی سی میں کیوں داخلہ لیتا۔“

”کیسے؟“

”ہیں کمزوروں کے ساتھ ٹرک میں رکھی ہے تا اس لئے ٹرک نہیں کھولتا۔“

”لوگوں کو معلوم ہے کہ تمہارے ارادے خطرناک ہیں۔“ جی کے ہنستا۔

”ارے یار اتنے دوست ہیں لیکن کوئی نہیں بتاتا انہیں۔ آجکل سچا دوست کہاں ملتا ہے۔“

”تو میں بتا دوں۔“ بابا چلاتا۔

”تو سن لو نیکی اور پوچھ پوچھ۔“ شام چلاتا۔

”کس کو بتاؤں؟“

”ہاں باری سب کو بتا دو“ ممکن ہے کسی کا دل پسند جائے۔“ شام سنجیدگی سے کہتا۔

شام کی باتوں سے یہ محسوس نہ ہوتا تھا کہ وہ دکھاوے کی بات کر رہا ہے۔ یار تکین گفتگو کی لڑ کر رہا ہے۔ اس کے انداز میں ایک عجیب قسم کی عجز اور خلوص تھا جو ایلپی کو بے حد پیارا تھا۔

ایلپی کو پڑھتے دیکھ کر شام جی کے کی طرح طنز نہیں کرتا تھا اس کے برعکس وہ حیرت سے اور کہتا۔

”یار تم اتنی بڑی بڑی کتابیں پڑھتے جا رہے ہو اور یار لوگ اس پاکٹ بک میں کھوئے ہیں۔“

”کون سی پاکٹ بک۔“ ایلپی پوچھتا۔

”کون سی لڑکیاں اور کون۔“

”کون سی لڑکی۔“

”کون سی۔“ آج ایک نے رحم کھا کر اٹھانے کے لئے کوٹ دے دیا مجھے جب سے نشہ سا

اچالے سے منور ہو جاتی۔ سنجیدہ سے سنجیدہ بحث کے دوران میں شام آجاتا تو بحث خوش فہم گفتگو میں بدل جاتی دلائل رنگین اشارات کا انداز اختیار کر لیتے۔“

شام ایم۔ ایس۔ سی کر چکا اور اب بی ٹی میں اس لئے داخل ہوا تھا کہ اس نئے ٹی نوکری ملنی ہے حد مشکل تھی۔ لیکن اس کے رویے سے کبھی ظاہر نہیں ہوا تھا کہ وہ ایم۔ ایس۔ سی ہے۔ اس سے پوچھتے ”یار تم ایم۔ ایس۔ سی ہو۔“ تو وہ ہنس کر کہتا ”ایم۔ ایس۔ سی ہو۔“ تو اب اے بی سی میں کیوں داخلہ لیتا۔“

لڑکیوں کی بات چھڑ جاتی تو وہ ہنس کر چلاتا ”یار ہم تو فیل ہو گئے کوئی اپنی طرف تو دیکھو نہیں حالانکہ قسم ہے پر ہمتا کی منہ پر روز کریم مل کر آتا ہوں۔ شیو کے بعد اسٹریٹ لگتا ہوں۔ بال بڑی احتیاط سے بناتا ہوں۔ کلاس میں جان بوجھ کر چمکدار باتیں کرتا ہوں۔ ذہانت اور رنگین سے بھرے ہوئے جتنے جملے یاد ہیں ان کا بروقت بر محل استعمال کرتا ہوں لیکن سب بے گورہ دیکھتی ہی نہیں اپنی طرف۔“

”کون سی نہیں دیکھتی۔“ جی کے پوچھتا۔

”کوئی سی ہے دیکھ لے بھائی اس میں کیا ہے۔ بھوکے کیک پیسٹری نہیں مانگا کرتے اور میاں وہ انگریز نے کہا ہے نا بھی کیا خوب کہا ہے۔“ ”بیکرز آرٹسٹ چوزرز“ مگتے کس نہ چٹاؤ کریں۔“

”اے فکر نہ کر۔“ بابا چلاتا۔ ”خود آجائیں گی ایک نہ ایک روز۔“

”فی الحال خط ہی بھیج دیں۔“ شام چلاتا۔

”جو خط آگیا تو مصیبت پڑ جائے۔ جی کے شور مچاتا۔ پر ہمتا کے لئے مصیبت پڑ جائے۔ جلدی پڑے“ شام کہتا ”اس خیریت ہی خیریت سے تم ہم تک آ گئے۔ ڈر ہے کسی روز نہ نہ کھالوں۔“

”زہر خریدنے جاؤ گے تو مجھے بتا دیتا۔“ ایلپی کہتا۔

”تو تو بتائے دیتے ہیں۔“ شام ہنستا۔

”بک تھا اس لی مرچا۔ ہے ہو خریدنے۔“ ایلپی پوچھتا۔

”یہ۔“

رائے کے علاوہ اور لڑکے بھی تھے مثلاً "جان تھا۔ لیکن وہ تو گونا گوا تھا۔ بات سن کر ہنس دینے لگا۔ اس نے بھی کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ ان سب میں بیٹھ جاتا بیٹھا رہتا۔ ان کی باتیں سنتا رہتا اور مکرانا رہتا۔ اس نے بھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا۔

پھر رائے تھا ایک جذباتی لڑکا تھا کئی ایک باتوں میں تو وہ جمل سے بہت ملتا جلتا تھا مثلاً "اپنی باتیں اور محبوبوں کی باتیں سنانے کے لئے اسے ایک رازدوں کی اشد ضرورت تھی ضروری نہ تھا۔ رازدوں قابل اعتماد ہو یا اچھا مشورہ دے سکے یا کچھ اور جہاں تک رائے کا تعلق تھا رازدوں کی چوکی چنداں ضرورت نہ تھی چونکہ اسے صرف ایک ایسے فرد کی ضرورت تھی جو اس کی باتیں سن کر اسے روکے نہیں ایسا مشورہ نہ دے جو اسے قابل قبول نہ ہو۔ جب وہ حماقت کرنے لگا تھا تو عقل کی بات بتا کر اسے روکنے کی کوشش نہ کرے بلکہ حماقتوں میں اسے شہرہ دے۔ اس لڑکی کو جسے وہ حسین سمجھتا تھا عام لڑکی نہ سمجھے بلکہ اسے اہمیت دے اور اس میں وہ بالکل دیکھے جو بظاہر بالکل دکھائی نہیں دیتی ہوں۔ غرضیکہ اسے ایک سامع رازدوں کی ضرورت تھی۔ اور اس رول کے لئے ایلی بے حد موزوں تھا اس لئے رائے اسے اپنے تازہ ترین کارنامے ادا کرتا تھا۔

ایلی نے بھی غور سے رائے کی بات نہ سنی تھی اگرچہ وہ اس انداز سے سنتا تھا جیسے واقعی بے غور اور اناہک سے سن رہا ہو۔

بہر حال رائے کے قصے ایلی نے بھی نہ سنے تھا اس کے باوجود اسے ان کے متعلق چند ایک باتیں کا محض احساس تھا مثلاً "رائے کی ایک محبوبہ گاؤں میں رہتی تھی اور وہ اسے ملنے کے لئے شہر سے بے قرار تھی۔ اور ہر پندرہویں روز اسے گاؤں بلا بھیجتی اور اگرچہ اس کے والدین کو اس کا رائے سے ملنا قطعی طور پر ناگوار تھا تاہم وہ رائے کے الفاظ سے اس قدر بولڈ تھی کہ اسے اپنے گھر گھرنے اور پھر رات کے اندھیرے میں چپکے سے ملتی۔ اس پر بوڑھی ماں شدت غم سے پہلو دیتی۔ باپ احتجاج کے طور پر بار بار کھانتا لیکن وہ بڑی بولڈ لڑکی تھی اور اس کی اس نفیسی کی وجہ سے رائے کو اس سے والہانہ محبت تھی رائے کی دوسری محبوبہ شہر میں رہتی تھی۔ شہر سکول میں استانی تھی اور اتنی قبول صورت اور اڈوانڈ تھی کہ سبھی کر پچھن نوجوان

طاری ہے۔ طبیعت اتنی خوش ہے کہ جو مانگو گے ملے گا۔ جو کو منظور۔ کو تو کچھ سے ایک کھلا دوں۔" وہ اپنے جیب ٹوٹا۔ "لو۔ پورا سوا روپیہ ہے کھالو جو کھانا ہے آج پچھتاؤ گے۔ ایسے سہرے مواقع روز نہیں ملتے۔"

والدہ قسم کی لڑکیوں کے متعلق جی کے شام سے پوچھتا۔ "یار تمہیں ان سے کون آتی۔"

شام منہ بنا کر جواب دیتا۔ "بے حد" اس کے انداز سے سخت نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ "آتی ہے اور جب وہ لڑکیوں کی طرح چونچلے کرتی ہیں تو جی چاہتا ہے کہ منہ پر یہ تھپڑ مارے شام جوش میں آکر تھپڑ چلاتا۔"

"ہوں۔۔۔۔۔"

"ہے نا۔۔۔ جی کے کہنا۔"

"بالکل" شام جواب دیتا۔ "میرا تو اور بھی جی چاہتا ہے۔"

"کیا؟"

"یہ تھپڑوں۔" شام پھر بازو ہوا میں زور سے گھماتا۔ "پھر دھنستا" اپنی اس حرکت پر قدر ندامت محسوس کروں کہ اس کے قدموں میں گر جاؤں اور پھر وہ مجھے اٹھا کر گود میں لے لے اور پھر لوری دے کر سلا دے۔ یار مجھے زندگی میں کبھی کسی نے لوری دے کر نہیں سلا یا۔ نا تو باپن میں ہی چھوڑ کر چلی گئیں تھیں۔

شام کا بات کرنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ اس کی بات پر نکتہ چینی کا سوال ہی پیدا نہیں تھا۔ وہ سچ کہہ دیتا تھا۔ حالانکہ سچ کی نوعیت اس قسم کی ہوتی تھی کہ اسے کہہ دینے میں جرات کی ضرورت ہوتی ایلی بھی چاہتا تھا کہ وہ سچی بات کہہ دے لیکن اس میں بھی جرات نہ ہوتی وہ ڈرتا تھا کہ لوگ کیا سمجھیں گے وہ ڈرتا تھا کہ لوگ اسے اخلاق سے گرا ہوا سمجھ گئے۔ لیکن شام جب بھی اس قسم کی بات کرتا تو اس طرح سے اسے ادا کرتا جیسے اس میں اسے یا لوگوں کے دلوں میں نفرت احتجاج یا کچھ اور پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایلی چاہتا تھا کہ وہ شام کی طرح باتیں کر سکے۔ سچی باتیں جن میں رنگینی اس قدر غالب ہوتی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں کوئی اور رد عمل پیدا نہیں ہونے دیتیں۔ لیکن ایلی کی یہ خواہش خلی خواہش رہی اور اس میں اتنی جرات نہ پیدا ہو سکی کہ اس پر عمل کر سکے۔

ہوا۔ پہلے تاکہ اسے حوصلہ ہو۔ اس کا جی چاہتا کہ مڑ کر بھاگ لے۔ نہیں نہیں وہ سوچتا یہ بات نہیں کیا کہے گی وہ۔ مجھے تو یوں گزر جانا چاہیے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ آخر بات کیا ہے نہ وہی مڑ رہی ہے نا اور کیا اور لڑکی بھی وہ جو مجھے قطعی پسند نہیں۔ پھر گھبراہٹ کیسی۔ وہ لڑکی اٹھا کر یوں چلے گئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ لیکن جب وہ لڑکی کے قریب پہنچتا تو اس لڑکی جھٹک جاتی۔ نگاہیں کوئے تلاش کرنے لگتیں اور دل بیٹھ جاتا پسینے چھوٹ جاتے۔

لڑکی اٹھ کر یوں چلے گئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ لیکن جب وہ لڑکی کے قریب پہنچتا تو اس لڑکی جھٹک جاتی۔ نگاہیں کوئے تلاش کرنے لگتیں اور دل بیٹھ جاتا پسینے چھوٹ جاتے۔

ایلی کی بات چھوڑیے اسے تو ان چھ لڑکیوں میں چنداں دلچسپی نہ تھی اور ایسی لڑکیوں کے دل میں کبھی قائم کیا جاسکتا ہے بھلا۔ جنہیں انسان جب جی چاہے جا کر مل سکے۔ ان حالات میں کبھی کبھار ایلی کی دانت میں نا ممکن تھا۔

ایلی کی دانت میں محبت کے لئے ضروری تھا کہ بند شیش ہوں قیود ہوں۔ پردے اور این مائل ہوں۔ برقعہ ہو گھونگھٹ ہو۔ نگاہ ترچھی۔ مسکراہٹ زیر لبی ہو۔ دور سے آئے ہوں۔ ساتھ سے کبھی اڑانے کے بہانے سلام کیا جائے لولیر لکھے جائیں۔ اور یہ کیا ہوا اس دیکھنے مزار کیسے ہیں۔ لاجول ولا قوت۔

لڑکیوں کے بارے میں ایلی کو شام کا طرز عمل بے حد پسند تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی لڑکی لڑکی سے اکیلے میں ملے اور کسے جسٹ اے منٹ مس یہ تو بتائیے کہ بھلا آپ کو دیکھ کر ہاتھ کچھ کیوں ہونے لگتا ہے۔ گردن کیوں لٹک جاتی ہے۔ نگاہیں کوئے کیوں تلاش کرتی ہیں۔ اور اگر وہ جواب میں تھپڑ مار دے تو اس کا ہاتھ پکڑنے کی بجائے جھٹ جیب سے اور روٹی نکالے اور کسے اب ایک تکلیف اور کیجئے ذرا چوٹ پر تھپڑ لگا دیجئے مجھے جگہ دکھتی

فخر

شام سے دلچسپی کی ایک وجہ اور بھی تھی دونوں کو اسفند یار سے بغض تھا۔ اسفند نہایت فخری مشاعر اور ذہین لڑکا تھا۔ وہ کسی ٹڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا اور ریفریشر کورس کے لئے بی ایس میں داخل ہوا تھا۔ وہ راہ چلنے لڑکے کو روک لیتا۔ ”کہاں جا رہے ہو بھائی کینے وقت ہو گھڑتا ہے۔“ اور اس کے قریب تر ہو جاتا اور قریب حتیٰ کہ آپ محسوس کرتے کہ ابھی وہ ہاتھ بٹھک کر ہو کر آپ کا منہ چوم لے گا۔ اور اس طرح ہمیشہ کے لئے آپ کا دوست بن

جو گرد نواح میں رہتے تھے اس پر ہزار جان سے عاشق تھے اسے راہ چلنے چھوڑتے تھے لیکن اس کے سوا اسے کوئی پسند نہ تھا چونکہ اسے رائے سے محبت تھی۔

رائے کی تیسری محبوبہ لاہور ہی میں تھی۔ وہ بے حد معصوم اور خوبصورت تھی۔ ان معصوم تھی کہ ان دنوں ایک بد معاش لڑکے نے اسے قابو میں کر رکھا تھا۔ اور وہ بچاری ان بد معاش سیدھی راہ سے بھٹک گئی تھی ہر صورت رائے جانتا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب وہ سمجھ جائے کہ وہ بد معاش نوجوان محض اپنا مطلب پورا کر رہا ہے اور پھر وہ ایک نئے شوق اور تازہ عزم سے رائے کی طرف لوٹے گی اور ان کا رومان پھر سے تازہ ہو جائے گا۔ ان دنوں رائے کی سب سے بڑی خواہش یہ نہ تھی کہ گاؤں والی محبوبہ اسے بلائے یا شہر والی محبوبہ کو نوجوان دق کرنا چھوڑ دے یا لاہور والی محبوبہ کی آنکھیں کھل جائیں۔

ان دنوں تو اس کی صرف یہ خواہش تھی کہ کلج کی ان چھ لڑکیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کا رومان چل پڑے اور اسے ہر ماہ دو بار اتنی دور گاؤں تک سفر نہ کرنا پڑے۔

اس سلسلے میں وہ اکثر ایلی سے مشورہ طلب کیا کرتا تھا۔

”یار ایلی کوئی ایسی تجویز بتاؤ کہ اپنی بات بن جائے۔“

اور اگر ایلی جواب دیتا۔ ”لو۔ اس میں کیا ہے جا کر کسی کا ہاتھ پکڑ لو۔“

”اور اس نے تھپڑ مار دیا تو۔“

”تھپڑ مار دیا تو سمجھ لو بات پکی ہو گئی۔“ ایلی کہتا۔ ”ایکپہرٹس کا یہی فیصلہ ہے۔“

”کیسے؟“

”سیدھی بات ہے اگر ہاتھ چھوڑ دیا تو سمجھو بات ٹوٹ گئی۔ پکڑے رکھا تو تعلقات قائم ہو گئے اور اگر جرات کر کے اسی وقت آغوش میں لے لو تو ہمیشہ کے لئے اس کے دل میں ملا جاوے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ رائے جواب دیتا۔ ”لیکن کبھی یار اکیلے میں کوئی ملے تو بات بننے والا کوشش میں لگا تھا کہ کبھی اکیلے میں کوئی مل جائے۔“

ویسے ایلی کو کئی مرتبہ وہ اکیلے میں ملتی تھیں لیکن ایلی نے کبھی ہاتھ تھامنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ہاتھ تھامنا چھوڑ — اس وقت نہ جانے کیا ہو جاتا تھا۔ دور سے کوئی ایلی چلی آتی دکھائی دیتی تو ایلی کا دل دھک سے رہ جاتا جیسے لڑکی نہیں جگا ڈاکو آ رہا ہو۔ اس کا جی چاہتا کہ کوئی

جائے گا۔

وہ السلام علیکم کہہ کر جی کے کے کمرے میں آ پہنچا۔ ”بھائی تم ملنے ہی نہیں کی مڑے ہوں نہ جانے کہاں گم رہتے ہو تم دونوں۔ یاد وہ ایک مشکل آن پڑی تھی۔ میں نے کڑھائی سے جا کر پوچھوں اپنے کو تو حساب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہاں اسے بی کو رس وار صرف تم ہو۔“

شام کی ڈار میٹری میں جا کر وہ شام سے پوچھتا۔ ”بھئی وہ چنگ آف کسٹری میں کوئی لڑکے یا لڑکیاں کچھ ہم بھی پڑھ لیں پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک زمانے کے بعد پھر کے چکر میں پڑ پڑھ گئے اب عادت بنتے بنتے بنے گی۔“

اسفند ہر ایک سے ملتا تھا۔ بڑے پیار سے ملتا تھا۔ پیار کا اظہار کرتا تھا اپنی ذہنی کمزوری اظہار بھی کرتا تھا محبت بھری نگاہیں بھی ڈالتا۔ قریب تر ہو کر اپنا بازو آپ کے شانے پر رکھ دیا یا آپ کا بازو اپنی بغل میں ڈال لیتا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں کسی اصول کے تحت لوگ بور سمجھتے تھے بور کا لفظ تو خیر اس زمانے میں رائج نہ تھا لیکن لڑکے اس سے کئی کڑھ تھے۔ اس کی مٹاس کثیف محسوس ہوتی اس کا قرب کھلتا ایسے محسوس ہوتا جیسے ایک نرم لیس دار چیز آپ سے چٹنی جا رہی ہو۔

نہ جانے قدرت کے کس قانون کے تحت اسفند کے آتے ہی دفعتاً یاد آیا کہ آپ ضروری کام سے کہیں جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر آپ اپنا پروگرام بدل دیتے کسی اور سمت کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیتے۔

شاید اس کی وجہ لڑکیوں ہوں؟

اسفند سب سے بڑا کوٹ بردار تھا۔ وہ ہر وقت لڑکیوں کے جھرمٹ میں رہتا ہر وقت طواف کرتا۔ چاہے وہ واضح طور پر اس امر کا اظہار کرتیں۔ موڈ آف ہے آپ جائے چاہے ساتھ منہ موڑ لیتا یا پوچھ لیتا۔ ”کیوں اسفند صاحب آپ لائبریری کو جا رہے ہیں؟“ اسفند اپنی جگہ سے نہ ہٹتا اور ہزار طنز کے باوجود اس کے ہونٹوں پر وہ یسوار مسکراہٹ رہتی۔ اس کی طبیعت محاسن جو کی توں قائم رہتی اخلاق بدستور خوش گوار رہتا اس کی بات جاری اور ساری رہتیں حالانکہ باقی لوگ وضاحت سے اس امر کا اظہار کر چکے ہوتے کہ اس میں گنجائش نہیں لیکن اسفند کا رویہ یہ ظاہر کرتا کہ وہ اپنے پیارے دوستوں کو چھوڑ کر نہیں

تھا بے دماغ نہیں۔ چاہے اس کا اپنا حرج ہی کیوں نہ وہ آداب محفل کو نظر انداز کرنے کے لئے نہیں۔ لڑکیوں کو آئیں کریم کھانے کی دعوت دیتا تو اکثر وہ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا کہ ”آئیں کریم کھانا ہی نہیں۔“

مراسفند فوراً ”بولتا“ کھانا تو نہیں لیکن تمہارے جیسا پیارا دوست کے تو انکار نہیں کروں۔“

”میاں یہ بل شام یا موہن ادا کرے گا۔“ ویسے کسی دوسرے کی دعوت میں بھی اسفند کا یہ کچھ ایسا ہوتا اور وہ انہماک اور شوق سے لوگوں کو کھلاتا تاکہ ہر کسی کے دل میں احساس پیدا ہو تاکہ دعوت اسفند کی طرف سے تھی۔

ان ہی باتوں کی وجہ سے لوگ اسفند سے گھبراتے تھے لیکن ان باتوں کی وجہ سے تو صرف لڑکیوں کو گھبرانا چاہیے تھا جو لڑکیوں کے حلقے میں رہتے تھے۔ وہ لڑکے جنہیں لڑکیوں کے حلقے دور کا تعلق بھی نہ تھا انہیں گھبرانے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن اسفند کے متعلق ان کے بات بھی اسی قسم کے تھے اور یہ وہاں قدر عام ہو چکی تھی کہ ایک روز ہنگامہ ہو گیا۔ ہوٹل لاسٹروڈ دروازے سے باہر برگد کے درخت کے نیچے وسیع میدان میں شور شرابے کی آوازیں آئیں۔ تمام لڑکے بورڈنگ سے باہر نکل آئے ادھر کالج سے بھی لڑکے آ موجود ہوئے برگد لڑکے دو لڑکے آپس میں لڑ رہے تھے۔ لڑائی نے ہاتھ پائی کی صورت اختیار نہ کی تھی۔ دونوں ہاتھ سے جج رہے تھے۔

”گلبے جا بے تیری حیثیت کیا ہے کل کالوڑا ہے۔ تو ہمارا کیا مقابلہ کرے گا۔ میں وہ کینہ لانا کینہ ہوں کہ۔۔۔“

”گلبے ہٹ بے بڑا آیا ہے کہیں سے۔ میرے روبرو تیری دال نہیں گل سکتی۔ تو میری نگاہ سے واقف نہیں شکل و صورت تو دیکھ اپنی بھگووان کی سوگند جیسے چھپکلی ہو۔“

”گلبے جا۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔“

اس طرح دیر تک وہ چلاتے رہے۔

”بات کیا ہے بات کیا ہے۔“ لڑکوں نے چاروں طرف سے شور مچا دیا۔  
بورڈنگ اور کالج میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ لڑکے بھاگے بھاگے آ پہنچے۔

چاروں طرف خبر مشور ہو گئی کہ برگد تلے جھگڑا ہو رہا ہے۔ ایک لڑکا کہتا ہے میں کب  
ہوں دوسرا کہتا ہے کہ تیری کیا حیثیت ہے اپنے سامنے۔ میں بہت بڑا کمینہ ہوں۔ عجیب جھگڑا  
تھا۔ لہذا سب برگد کے درخت کی طرف بھاگے حتیٰ کہ پروفیسر اور چھ لڑکیں بھی آ پہنچیں۔  
دونوں لڑکے بڑی شدت سے چلا رہے تھے منہ سے کف جاری تھا آستینیں ہٹکی ہوئی تھیں  
جیسے ابھی ہاتھ پائی کی نوبت آ جائے گی۔

”میں کہتا ہوں میں کمینہ ہوں میں۔“ ایک چیخ رہا تھا۔

”اے جا۔“ دوسرا کہہ رہا تھا۔ ”تو کیا ہے تیری اوقات کیا ہے۔“

جب سے لڑکوں نے جھگڑے کا انداز دیکھا تو چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ لڑکے فوراً تازے  
کہ یہ جھگڑا نہیں کچھ اور ہے نہ جانے مداری کے پٹارے سے کیسا سانپ نکلے گا۔  
دیر تک چیخ چیخ جاری رہی۔ حتیٰ کہ سب لڑکیں آ پہنچیں پروفیسر بھگت سنگھ بھی آگئے۔ لالہ  
جی تو دور سے تماشہ دیکھتے رہے لیکن پروفیسر بھگت سنگھ بڑے سادہ لوح اور مخلص تھے وہ گہرائے  
انہوں نے بچاؤ کرانے کی کوششیں کیں۔

عین اس وقت دونوں لڑکوں نے جھگڑے کا نقطہ عروج پیدا کر دیا۔

ایک بولا۔ ”اے کمینگی میں میں تیرا باپ ہوں۔“

”بے جا۔“ دوسرا چلایا۔ ”گلیسکو بے بی تو دیکھو۔“ ”جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش ہے  
اور آیا ہے ہم سے مقابلہ کرنے اے میں تیرے باپ کا باپ ہوں وہ کمینہ ہوں میں۔“

”میں خالی کمینہ نہیں ذلیل بھی ہوں۔“

”کس قدر ذلیل ہو تم“ دوسرے نے غصے سے پوچھا۔ ”میں“ پہلا بولا ”میں پروفیسر  
سنگھ کا جوٹھا کھا سکتا ہوں۔“

”اے بس۔“ دوسرا چلایا۔ ”اے میں کہتا کا جوٹھا کھا سکتا ہوں۔“

پہلا بولا۔ ”میں اسفند کا جوٹھا کھا سکتا ہوں۔“

دوسرا خاموش ہو گیا۔ ”بھئی میں اسفند کا جوٹھا نہیں کھا سکتا۔ میں ہار گیا ہار گیا۔“

چاروں طرف سے تفتوں کا شور اٹھا۔

چاروں طرف سے تفتوں کا شور اٹھا۔  
لڑکوں نے بڑھ کر پہلے لڑکے کو شانوں پر اٹھا لیا۔ اور اسے لے بھاگے جیت گیا!!! جیت  
جیت گیا!!! وہ چلا رہے تھے اس سے بڑی ذلت نہیں ہو سکتی زندہ بلا شام زندہ بلا شام۔  
”اے“ ایلی حیرت سے چلایا۔ ”یہ تو شام ہے۔“

لوح اسفند کھڑا مسکرا رہا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے شام نے اس کا نام ہی نہ لیا ہو۔ اور  
ابھی ہو تو محض مذاق اور تفریح کے طور پر لیا ہو۔

لیکن بھگت سنگھ چلاتے جا رہے تھے ”ملا تفتوں نے میرا نام خواہ مخواہ لے دیا ارے میں تو  
گرا کا پارا ہوں۔ مجھے کیوں تھمتیے ہو اپنے جھگڑوں میں۔“

پھر شام چپکے سے ایلی کے کان میں کہہ رہا تھا۔ ”وہ پچھاڑا ہے آج کہ سلا کبھی اٹھ نہ سکے  
گی“ اور اسفندیوں دیکھ رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ کسے بھائی؟

اس روز رات کو بورڈنگ میں بہت ہنگامہ ہوا۔ ہر ڈار میٹری میں لڑکے اس ڈارے کو دھرا  
رہے تھے جو اس شام برگد کے درخت کے نیچے شام نے کھلا تھا۔ ”میں کمینہ ہوں۔“ ایک ڈار  
بڑی سے آواز آتی۔ ”اے تیری کیا ہمت ہے جو ہمارے ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کرے۔“  
”ہری ڈار میٹری سے کوئی چلاتا۔“ ”اے جا بے۔“ تیسری ڈار میٹری سے شور بلند ہوتا۔ اوپر  
چہارے میں کھڑے لالہ جی مسکرا رہے تھے ”میں کہتا ہوں بھئی۔“ وہ کہہ رہے تھے ”اس بات کا  
ٹنٹیل شام کو ہو چکا اب کوئی اور دعوے کرو۔“

ڈائنگ ہل میں کومن روم میں لان میں ہر جگہ لڑکے باتیں کر رہے تھے۔

”یار شام نے وہ مار دی ہے وہ مار دی ہے اسفند کو کہ چاروں شانے چت گریا ہے۔“

”ارے لڑکیوں کو دیکھا تھا مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔“

”لب اسفند کا لڑکیوں پر جادو نہیں چلے گا۔“

”اونوں“ اندر شام کہہ رہا تھا ”یار اپنی محنت بیکار مکنی۔ اسفند پر تو کوئی اثر ہی نہیں ہوا مجھ  
سے پوچھ رہا تھا یار یہ گڑبڑ کس بات پر تھی اپنی سمجھ میں نہیں آیا کچھ۔ اب تباؤ ایسے آدمی سے  
کلی کیا کرے۔“

”ارے نہیں یار بنتا ہے۔“ ایک نے جواب دیا۔

”ہل اندر سے تو چکنا چور ہو گیا ہے۔“

ہی سڑکراہی جگہ پر آگئی۔ ”اچھا“ وہ بولا ”جا کر شام باؤ سے کو ہم نے تمہاری سب  
ہاکی سیف کر دیں۔“

”ہا کر دیں۔“ گھما پوچھنے لگا۔

”تو کیوں کو خوش کرنے کے لئے جو تماشہ کھیلا ہے۔ شام نے۔“ جی کے نے وضاحت کی۔

”جی جو تماشہ پچھلے سال ہوا تھا اس کا تو جواب نہیں۔“

”ہاں جی کے نے حیرت سے گامے کی طرف دیکھا۔

”وہوں“ گھما مسکرا کر بولا ”جی یہ تو کچھ بھی نہیں۔ جی پچھلے سال ایک باؤ تھے ایس بی میں  
میں نے توحہ کر دی تھی۔ سات کی سات لڑکیوں کو ساتھ لئے پھرتے تھے بس سمجھ لو اندر

دلان تھے وہ اپنے وقت کے —

”ساتھ لئے پھرتے تھے سات کی سات“ ایلی نے حیرت سے دہرایا۔

”جی“ گھما بولا۔ ”کالج والوں نے دھمکیاں دیں لالہ جی نے کما نکل دیں گے بورڈنگ سے

لیئے لکھ کر بھیج دیا کہ کالج سے نام کاٹ دو پر اس پٹھے نے جرا پر داہ نہ کی۔ اور خدا جھوٹ

بلائے پڑی۔ ہر روج رات کے وقت وہ یہاں آ جاتی تھیں۔ سب لڑکیاں بورڈنگ کے باہر

لے لان میں اور باؤ جی دیوار پھلانگ کر باہر نکل جاتے تھے لان میں۔ پھر وہ آدمی آدمی رات

دہلی گھومتے رہتے تھے۔ سب کو معلوم ہوتا کہ وہ کالج کے لان میں گھوم رہے ہیں لالہ جی کو

ناہ نہ ہوتا پھر جب وہ دیوار پھلانگ کر واپس آتے تو لالہ جی پوچھتے چوٹ تو نہیں لگی اور وہ ہنس

خواب دیتے لالہ جی میری الماری میں ٹیپنر رکھی ہوئی ہے۔ لگا لوں گا تو ٹھیک ہو جائے گی یہ

نہیں۔“ گھما ہنسنے لگا۔

گھما نہیں کر رہا تھا تو ام کے داخل ہوا۔

”تم نے تم“ جی کے چلایا ”تم کہاں۔ اور تم بورڈنگ کے اندر کیسے آ گئے۔؟“

”مے کے ہنسنے لگا“ دیکھ لو۔“ وہ بولا پھر گامے کو دیکھ کر اس سے مخاطب ہوا۔

”کیاں بھی گامے کیا حال چال ہے۔“

گامے کی آنکھوں میں عجیب سا تبسم چھلک رہا تھا ”اچھا ہوں باؤ جی بڑی مہربانی ہے۔ اور باؤ

میں عمر ہے آپ کی ابھی آپ ہی کی بات کر رہا تھا۔“

”آپ ہی کی بات“ جی کے نے حیرت سے گامے کی طرف دیکھا۔

”نہ چکنا چور نہیں۔“ دوسرا بولا ”بھئی وہ تو مٹی کا پتلوان ہے اوھر کر لیا لوھر لٹو کر لگا  
مید۔“

”جھگوان جانے ٹھیک کہتے ہو“ شام ہنسنے لگا ”مٹی کے پتلوان کو کون کر اسکتا ہے۔ باؤ  
سے ہم نے اسے بخش دیا۔ معاف کر دیا۔“

شام کے اس اعلان پر ہوٹل کے سب لڑکے تھللا اٹھے۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔  
”ارے یار سنا تم نے اتنی بڑی فتح حاصل کرنے کے بعد شام اسفند سے ہار گیا۔“

”نہیں یار اسفند نہیں ہار سکتا۔“

جا کر پوچھ لو۔“

لڑکے شام کے پاس آئے۔ لڑکوں کو اس کا بہت غم تھا اسفند کو پچھاڑنے کے لئے شام کو

واحد پتلوان تھا۔ اگر اس نے بھی میدان چھوڑ دیا تو ہو گا کیا۔ یہ خیال ان کے لئے سونہاں لہجہ

رہا تھا۔ بھی چاہتے تھے کہ اسفند کے ساتھ جنگ جاری رہے اگرچہ کسی کو بھی علم نہ تھا کہ

اسفند کے خلاف کیوں تھے۔ اسفند نے بھی کسی لڑکے کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اس کے

باوجود اسفند ایک ایسا پلپلا کیڑا تھا کہ ہر لڑکے کا جی چاہتا تھا کہ پاؤں سے مل دے۔

جی کے کی ٹاک پر ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ”لہذا“ وہ چلا رہا تھا۔ ”یہ سب کیا ہے کیا ہے یہ

دکھلاؤ اور کیا۔ مقصد یہ ہے کہ لڑکیوں پر اثر ڈالا جائے۔“

ایلی خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”خالی۔ اگیزیشن خالی کیوں غلط ہے۔“ اس نے ایلی کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”بڑا بد معاش ہے یہ شام۔ لڑکیوں کے دل میں اپنی جگہ بنا رہا ہے۔“

میں اس وقت گھانا نوکر داخل ہوا۔

”کیوں گامے کیا بات ہے۔“ جی کے نے پوچھا۔

اندر مہاراج

”جی۔ جی وہ۔“ گھما بولا ”شام باؤ نے حلوہ بھیجا ہے کہتے ہیں گاؤں سے آیا ہے۔“

”حلوہ دکھاؤ۔“ ارے یہ تو گاجر کا ہے۔“ جی کے پلٹ کر دیکھ کر چلایا حلوے کو دیکھ کر لگا

بیشہ ہو بل  
 دیر تک ایم کے اور ایللی لاہور کی ویران سڑکوں پر چلتے رہے۔ ایک دو مرتبہ ایللی نے کہا مجھے  
 جانے دو بار۔ لیکن ام کے نے بس تھوڑی سی دور اور کہہ کر اسے مطمئن کر دیا۔ پھر وہ  
 یوں کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ اور ایللی کو خیال ہی نہ رہا کہ اسے واپس جانا ہے اور ٹانوس  
 لےنے میں ہوائی دور نکل آیا ہے کہ واپس بورڈنگ میں پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔ ام کے اسے  
 ہنگامی میں لڑکیوں سے متعلق کارنامے سنا رہا تھا۔  
 ایک وسیع کوٹھی کے سامنے ام کے رک گیا۔ کوٹھی کے چاروں طرف قد آدم دیوار بنی  
 لی تھی۔ اور سڑک کی جانب ایک بہت بڑا دروازہ تھا۔  
 "ایک بات مانو گے" اس نے ایللی سے کہا "اگر تم صرف پندرہ منٹ یہاں میرا انتظار کرو تو  
 ہاپے دوست سے مل کر واپس آ جاؤں گا پھر ہم اکٹھے واپس جائیں گے تم بورڈنگ چلے جانا  
 میں پہلی دروازے چلا جاؤں گا۔"  
 اس وقت آدمی رات ہو چکی تھی ایللی اس ویران جگہ انتظار کرنے کے لئے تیار نہ تھا لیکن  
 وہ واپسی کے راستے کا بھی تو علم نہ تھا۔ اس لئے مجبوری میں اس نے ام کے کی بات مان لی۔  
 بڑے دروازے کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔  
 دیر تک ایللی وہاں بیٹھا رہا پھر وہ گھبرا کر ٹپٹپٹ لگا۔ ام کے کو گئے تقریباً "آدھ گھنٹہ ہو چکا تھا۔  
 کہ کمری نے ساڑھے بارہ بجائے۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے ٹپٹپٹے ٹپٹپٹے تھک  
 لائے گیا۔

دلہن مکان کے اندر سے شور اٹھا۔ لوگ دوڑ رہے تھے۔ کون ہے؟ کیا ہے؟  
 لایک عورتیں چیخ رہی تھیں۔ ایللی وہ آوازیں سن کر چونکا۔ پھر اس نے سمجھا شاید کوئی  
 "ہو" ہوئی کوئی بات۔ پھر قریب ہی لوگ چل پھر رہے تھے ٹھک ٹھک جیسے کوئی اونچی  
 پاؤں فرش پر مار رہا ہو۔

پھر عوام سے صدر دروازہ کھل گیا۔ کچھ لوگ لائین اٹھائے باہر نکل آئے۔ ایللی بیٹھے  
 لپچ لپچان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کون ہیں یہ لوگ۔ وہ سوچ رہا تھا۔  
 ایک نوجوان ہاتھ میں لٹھ سنبھالے دوسرے میں لائین پکڑے اس کے قریب آیا اس کے

"جی ہاں" گناہ بولا "تم وہ رستم زمین ہو۔"

"دیکھ لو" ام کے ہنسنے لگا۔

"بالکل بکواس جھوٹ" جی کے بولا "تمہیں تو بات کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔"

"اب بھی نہیں آتا۔" وہ بولا۔

"تو پھر۔"

"صرف ہانہ پکڑنے کا ڈھنگ آتا ہے۔" ام کے ہنسنے لگا۔

"اکٹھی سات بانہیں۔" ایللی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں" ام کے بولا۔ "میں تو ایک ہی پکڑتا تھا باقی چھ میری ہانہ پکڑتی تھیں" طور تہ

کر ہنسنے لگا۔

"اچھا تو یہ آپ کے بھی دوست ہیں۔" لالہ جی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

پھر ام کے سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "کو بھی آج کل کہیں ہو۔ کیا ابھی قصور ہی میں ہو۔"

"جی ہاں" اس نے جواب دیا۔ "لیکن وہ مجھے پسند کرنے والے ہیں۔"

"کیوں وہاں بھی کیا لڑکیوں کا قصہ ہے" لالہ جی ہنسے۔

"نہیں لالہ جی۔"

"تو پھر کیوں"

"ویسے ہی جلتے ہیں۔" ام کے ہنسنے لگا۔ "شرمیں تو ہوں گی نالائکیں" جی کے نے

جی سے کہا۔

"شرمیں تو وہ وہ چیز ہے کہ لالہ جی کیا بتاؤں" طوفان پھا ہے۔"

"کیا رات یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔" لالہ جی نے پوچھا۔

"نہیں لالہ جی۔" ام کے بولا "البتہ جی چاہتا ہے کہ پھر سے کالج میں داخل ہو جاؤں۔"

"تو ہو جاؤ۔" لالہ جی بولے۔

"نکریں گے آپ" ام کے ہنسنے لگا۔

لالہ جی کے جانے کے بعد کچھ دیر وہ باتیں کرتے رہے پھر ام کے کے تیار ہو گیا۔

"اچھا یا ر میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام ہے پھر آؤں گا۔ اب تو آئی رہی ہو۔"

پھر ایللی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "چلو یا ر ذرا کچھ دیر میرے ساتھ چلو پھر واپس آ جاؤ۔"



بیچے دو مرد تھے اور ایک اوجیز عمر کی میم تھی۔

”کون ہو تم۔“ اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”میں ہوں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”یہاں کیوں بیٹھے ہو۔“

”تھک گیا تھا بیٹھ گیا۔“ ایلی نے بے پروائی سے کہا۔

اس پر میم آگے بڑھی اور انگریزی میں پوچھنے لگی۔

”زنانہ بورڈنگ ہاؤس کے سامنے بیٹھنے کا مطلب۔“

”زنانہ بورڈنگ ہاؤس۔“ ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”مجھے یہ معلوم نہ تھا۔“

”لیکن تم ہو کون۔“ وہ بولی۔

زنانہ بورڈنگ کا نام سن کر ایلی کو خیال آیا کہ ضرور ام کے نے کوئی شرارت کی ہوگی۔ اس

خیال پر وہ محتاط ہو گیا۔ ”دیکھئے محترمہ“ وہ بولا ”میں راہ گیر ہوں بھائی دروازے جانا ہے تھک

گیا۔ تو ذرا سستانے بیٹھ گیا مجھے علم نہ تھا کہ یہ زنانہ بورڈنگ ہے۔“

”کیا کرتے ہو“ وہ بولی۔

”پڑوسی ہوں۔ کام سے لاہور آیا ہوں۔“

”ہوں۔“ وہ غور سے ایلی کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس کا رویہ بدل گیا۔ بولی ”تم

نے ادھر سے کوئی آدمی گزرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے کیا۔“

”نہیں تو۔“ وہ بولا ”کیوں کیا بات ہے۔“

”یہاں چوری کی وارداتیں ہو رہی ہیں آج کل“ وہ بولی۔

”اچھا“ ایلی نے کہا۔ ”تو مجھے چلے جانا چاہیے یہاں سے۔“

”ٹھہرو۔“ لائین والا جوان چلایا۔

”نہیں نہیں جانے دو شریف آدمی ہے۔“ میم نے کہا۔ اور ایلی چپ چاپ چلا رہا۔

ابھی چند ہی قدم چلا ہو گا کہ اندھیرے سے ایک سایہ اس کی طرف لپکا۔ وہ گھبرا کر روک

”ڈر گئے کیا۔“ ام کے کی آواز آئی۔

”ارے تم ہو۔“

”یہاں میں ہوں۔“

”کسی سبلی سے ملے آئے تھے کیا۔“

”ہرے پار“ وہ بولا ”مصیبت یہ ہوئی کہ دیوار پھلانگتے ہوئے کسی چوکیدار نے دیکھ لیا۔“

”کیا دیوار پھلانگ کر اندر گئے تھے۔“

”دور کیا صدر دروازے سے جاتا۔ بیٹا زنانہ بورڈنگ ہے اندر جانے دیتا ہے کوئی۔“

”کئی روز مار کر بھر کس نکل دیں گے تمہارا۔“ ایلی نے کہا۔

”پار کیا کروں“ ام کے بننے لگا۔ ”اس ظالم سے ملے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ جان من ان

کے دل میں عزت اور محبت پیدا کرنی ہو تو دلیری دکھانی پڑتی ہے سیکھ لو گر یہ ہم سے۔“

ایلی کے رو بہ سلاوی آنکھڑی ہوئی۔ ”نہ“ وہ بولی ”یوں نہیں ملے گا دوشہ لیتا ہے تو خود آکر

ہاتھ کر لے جاؤ۔ پھر ہانوں گی آپ کی ہمت۔“

ہر ایک بزرگ کی گٹھڑی لڑھک کر اس کے پاؤں میں آگری اور سادی مسکرا کر کہنے

”گوتھت کے پٹ کھول رہے تو ملیں گے رام۔“

نہ جانے ام کے کیا کہہ رہا تھا۔ غالباً وہ زنانہ بورڈنگ میں داخل ہونے کا قصہ یا تفصیل

نہ دہا لے بتا رہا تھا کہ اس کی سبلی کس قدر حسین ہے اور کتنی رنگین۔ لیکن ایلی کے

یک اور حسین رنگین تصویر کھڑی تھی۔ وہ اس سے باتیں کر رہی تھی۔ ”میں یہاں ہوں

ٹام۔ اگر ہمت ہے تو یہاں آ جاؤ۔ آ جاؤ نا۔ ابھی جاؤ آ جاؤ گے تو سب کچھ مل جائے

۔ کچھ لیکن تم کیوں آنے لگے۔ نہ جانے تمہیں کس کی لگن لگی ہے تمہارے لئے تو میں

رنگ تھی۔“

ایلی طرف شڑاؤ کھڑی اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

پھر نثر بخا ہی سی۔ ”وہ آہ بھر کر کہہ رہی تھی۔“ ”تمہارے لئے باعث تفریح ہوں نا۔ یہ

ٹافٹ فٹ فٹ سی ہے اور میں تمہیں دے ہی کیا سکتی ہوں۔ میرے پاس ہے ہی کیا جو

گے روز سارا دن ایلی اسی خیال میں کھویا رہا اسے بار بار زنانہ بورڈنگ کا خیال آتا اور پھر

بھول تے سلاوی کی سفید منزل آجاتی اور وہ اس کے پیچھے بھاگتا اور دو بھینس جینٹ

لگے لگے آگے!! ”سارا دن وہ اسی خیال میں کھویا رہا شام کے وقت چپ چاپ

چپ چاپ

بیمہ اور اپنے دل کو ہلکا کر لے۔ اس کے انداز بیان میں دکھ تھا اس کے تبسم میں

بیمہ کسی سے محبت کرنی پڑے گی۔ ہاں۔ ابھی فوراً ”ورنہ زندگی کیسے کئے گی۔ لیکن مجھ  
بت کرنے والا کوئی بھی تو نہیں ماما جی بچپنے ہی میں چلی گئیں۔ کوئی بڑی بہن ہوتی تو شاید  
بت بانی میری کوئی بہن نہیں اور پتا جی — لیکن کبھی پتا نے بھی محبت کی ہے۔  
— آج تک مجھ سے کسی نے محبت نہیں کی اور اب انہوں نے میرا ناطہ ایسی لڑکی سے جوڑ  
پتا زرد پوشہ اوڑھتی ہے۔ مجھ سے زیادہ دکھی کون ہو گا۔“ وہ باتیں کئے گیا اور ایلچی چپ

انہوں نے تعجب سے اس گلی کی طرف دیکھا جس کی طرف لوگ بھاگے جا رہے  
ان کے گلے میں ہار تھے۔ ہونٹوں پر تبسم اور انداز میں عجب جوش و خروش تھا۔  
”یہاں کیا شادی ہے؟“ شام نے پوچھا۔  
”معلوم نہیں۔“ ایلچی نے جواب دیا۔  
”سلاٹوں کی معلوم ہوتی ہے۔“

اور پتا

”چلو یار چلیں ہم بھی شادی میں شریک ہو جائیں۔ دیکھیں تو بن بلائے مسمان بننے میں کیا  
ہے۔“ گلی میں داخل ہوتے ہی شام نے حیرت سے چیخ سی ماری ”ارے۔“ وہ بولا ”یہ تو چکلا  
سب بیوائیں بیٹھی ہیں۔“ پہلی مرتبہ شام کی ہنسی میں دکھ کا عنصر نہ تھا ”آؤ یار آؤ۔“ وہ  
لاٹھ چلا دیا۔ ”دیکھیں تو یہ نظارہ بھی تو شادی سے کم نہیں۔“  
گلی میں جگہ جگہ کھلے دروازوں اور کھڑکیوں میں بیوائیں بیٹھی تھیں۔ ہر بیویا کے سامنے  
کڑے اس کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ ویسے ہی گھور رہے تھے۔ کچھ  
بجڑ رہے تھے۔

پتے کی کھلے دروازے پر شام رک گیا۔ کچھ دیر تو وہ اسے جانچتا رہا پھر وہ بھول گیا کہ کہاں  
ہے اور اس کی منگیتر کس رنگ کا دوپٹہ پہنتی ہے اور وہ کالج کا طالب علم ہے۔ وہ ایسے

کالج کے لان کے ایک اندھیرے کونے میں جا بیٹھا اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ کسی سے ملے  
کے کے پاس بیٹھے۔

زرد دوپٹہ

لان میں بیٹھے بیٹھے دفعتاً اسے احساس ہوا کہ قریب ہی کوئی ٹھنڈی آہیں بھر رہا ہے  
چونکا سامنے پیڑ کے پیچھے کوئی بیٹھا تھا۔ شاید کوئی لڑکی ہو۔ وہ گھبرا گیا۔ لیکن اس نے اٹھ کر  
مناسب نہ سمجھا۔ پھر کچھ دیر کے بعد پودے کے پیچھے کسی نے ماچس جلا کر سرگٹ سلگایا۔  
شام کو پہچان کر وہ چلایا۔

”تم ہو شام۔“ وہ بولا شام اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔

”شام آپہں کیوں بھر رہے تھے؟“ ایلچی نے پوچھا۔

”اب عمر بھر آپہں ہی بروں گا اور کیا۔“

”لیکن کیوں۔“

”یار کیا بتاؤں۔“ شام بولا ”مسخروں نے میری منگنی ایک ایسی لڑکی کے ساتھ کر دی ہے۔“

زرد دوپٹہ اوڑھتی ہے۔“

”تو کیا ہوا؟“

”اپنی تو زندگی ہی تباہ ہو گئی۔“

”کیوں؟ کیا وہ خوب صورت نہیں؟“

”جو سر پر زرد دوپٹہ اوڑھ سکتی ہو وہ کیا خوب صورت ہو سکتی ہے۔ تمہیں نہیں معلوم  
ایساں؟“ شام دفعتاً سنجیدہ ہو گیا ”میں ایسی لڑکی سے محبت نہیں کر سکتا جو زرد دوپٹہ اوڑھتی  
ہو۔“ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ شام اور یوں سنجیدہ ہو یہ بات ایلچی کے لئے حیران کن تھی۔  
”لیکن تمہاری منگنی کب ہوئی؟“ ایلچی نے پوچھا۔

”آج۔ ابھی ابھی وہاں سے آ رہا ہوں۔ چلو یار چلیں۔ کس چلیں کسی ایسی جگہ چلیں جہاں  
جا کر کھو جائیں سب بھول جائیں۔“

ایلچی چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔ کچھ دیر تو وہ خاموشی سے چلتے رہے پھر شام سے  
نہ ہو سکا اور وہ باتیں کرنے لگا۔ دراصل وہ اپنی دکھی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ کسی سے

”یہیں نہیں آئیں گے۔“ وہ چلایا ”آئیں گے ضرور آئیں گے۔“  
”تو پھر آجاؤ۔“ وہ نہایت قہج انداز سے ننگے اشارے کرنے لگی۔

”جی، جوش میں بھی۔“ ایک بولا۔

”خود جوش میں آنے کا فائدہ ہمیں جوش دلانے تو بات ہے۔“ شام چلایا۔

”اگ اپنے گئے“ بھی بات تو ٹھیک ہے۔“ ایک نے کہا۔

”میرا نہ نہایت بے حیائی سے اپنی قیص اتار دی اور لپک کر سرخ قیص کھوئی سے اتار کر  
بگ۔ اس کی میلی اکتیا دیکھ کر سب چلانے لگے۔

”ذرا آہستہ ذرا آہستہ اتنی جلدی اچھی نہیں ہوتی۔“ شام نے کہا۔

”سرخ قیص پہن کر وہ شام سے مخاطب ہو کر بولی ”آب مرو کا پچہ ہے تو۔“

”ہیں تو مرد ہو۔“ وہ بولا ”پچہ نہیں ہوں۔“

اس پر لوگ ہنسے۔

”تو پھر آتا۔“ وہ بولی۔

”آئیں گے آئیں گے۔ کل آئیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ آگے چل پڑا۔

اسی طرح وہ ہر جگہ رک کر باتیں کرتا رہا۔ اہلی کو اس پر غصہ آرہا تھا۔ فضول ایسی باتیں  
نہ جانے شام کو کیا ہو گیا ہے اور پھر ایسی غلیظ جگہ اور وہ عورتیں لاجول ولا قوۃ وہ کیا  
نہا نہیں۔

”دفعہ“ شام کی نگاہ ایک اندھیری کوٹھڑی پر پڑی جہاں کوئی جی روشن نہ تھی۔ اور دروازے  
اہل ایک بڑھیا بیٹھی حقہ پی رہی تھی۔

”ارے“ وہ چلایا ”یہ داوی اہل میں کس امید پر بیٹھی ہے۔ آؤ الیاس آؤ۔“

”کس کے قریب جا کر شام کہنے لگا ”مائی تم یہاں کس لئے بیٹھی ہو؟“

”وہ خاموش بیٹھی حقہ چیتی رہی۔

”کیا تم بھی بیٹھی ہو۔“ شام نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

”کہا نہیں“ وہ بولی۔

”کیا تمہارے پاس بھی کوئی آتا ہے مائی۔“ شام نے پوچھا۔

”جی، اتنا ہی ترس آتا ہے تو تم خود کیوں نہیں آجاتے۔“ وہ نہایت بے شری سے کہنے لگی۔

خصوصی رنگ میں چمکنے لگا۔

”کیوں جی۔“ وہ بیسوا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”کوئی ہے مل وال۔“

بیسوا نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دی۔ دروازے کے سامنے کھڑے لوگوں  
نے شام کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں حیرت جھلکی کوٹ پتلون میں مسکراتا ہوا بیسوا  
اس گلی میں شاید کبھی نہ دیکھا گیا تھا چونکہ وہ جگہ مزدوروں اور جاٹوں کے لئے مخصوص تھی  
نسب بیسوا میں نچلے درجے کی تھیں۔

”ہے کوئی مل وال۔“ شام نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

بیسوا پھر مسکرائی اور اپنی چٹن سے اشارہ کیا۔ جیسے کہہ رہی ہو بہت ہے آجاؤ۔

”تو ذرا دکھاؤ نا ہمیں“ شام مسکرایا۔

اس پر لوگ ہنسے لگے۔

”کچھ ہو تو دکھائے۔“ ایک نے قہقہہ مارا۔

”سب لٹا ہوا ہے۔“ دوسرا بولا۔

”نہیں نہیں ضرور کچھ چھپا کر رکھا ہو گا۔“ شام بولا ”کیوں۔۔۔ مہارانی ہے یا یہ بات“

بیسوا نے اپنی آنکھیں شام کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

”اندھ صندوق میں ہو گا۔“ ایک بولا ”میں تو نہیں۔“

”اونہوں۔“ دوسرے نے کہا ”صندوق جی تو لٹ گئی۔“

بیسوا نے غصے بھری نگاہ سے لوگوں کی طرف دیکھا اور دروازہ بند کر لیا لوگوں نے قہقہہ لگا

اور دوسرے دروازے کی طرف چل پڑے۔

شام کی باتوں پر اہلی خواہ مخواہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ ایسی بے تکلف باتیں کرنا اور

ایسی جگہ جہاں پائے جانا بھی باعث شرم تھا۔ نہ جانے شام کو کیا ہو گیا ہے۔

”چلو چلیں۔“ اس نے شام سے کہا ”یہ جگہ ٹھیک نہیں۔“

”جائیں گے کہیں“ وہ بولا ”دیکھو تو کتنی رونق ہے۔ ایسی جگہ کہیں ملے گی ہمیں دلہ۔“

دوسرے دروازے پر جا کر وہ چلایا۔ ”اونہوں دیوی یہ کیا قیص پہن رکھی ہے۔ بڑا

کی چھی چھی۔ سرخ قیص پہنو تو ہمیں جوش بھی آئے۔“

بیسوا نے اس کی طرف دیکھا۔ ”خالی باتیں ہی بناؤ گے یا آؤ گے بھی۔“

یابی تمام تر توجہ بورڈنگ کے پچھواڑے کے ایک مکان پر مرکوز ہو چکی تھی اور وہ روز ایل  
کے ساتھ لاجونٹی بچاری سارا سارا دن دھوپ میں کھڑی رہتی ہے۔ پاگل لڑکی اس طرح وہ  
خواب کرے گی۔ لیکن بابا کے سمجھانے کے باوجود لاجونٹی اپنے مکان کی کھڑکی میں  
بٹو کر بٹو کر دیکھنے پر مجبور تھی۔

بٹو

لاجونٹی کا قہقہہ بھی عجیب تھا۔ سب سے پہلے لاجونٹی کو شام نے دیکھا تھا۔  
میں دوا دوا ایل کے پاس آیا ”لو بھئی“ وہ چلانے لگا ”اپنا تو جیون سپھل ہو گیا۔“  
”کیسے“ ایل نے پوچھا۔  
”اپنا بھی ایک گاہک پیدا ہو گیا۔“  
”میں کیا کالج والیوں میں سے کوئی مریاں ہو گئی۔“

”نہیں۔ وہ سب سخت مٹی سے بنی ہیں۔ یار ان پر اثر ہی نہیں ہوتا۔ انہیں وہ وہ باتیں  
کہیں کہ ذرا شرم ہوتی تو میرے پریم میں ڈوب جاتیں۔ اور صرف باتیں ہی نہیں تماشے  
لے ہیں کرب دکھائے ہیں مسخراہن کر رانیوں کو محفوظ کیا ہے اور پھر کلاس میں وہ وہ برلینٹ  
ہاکی ہیں۔ اپنی لیاقت کی دھاک بٹھادی ہے۔ اتنا اثر ڈالا ہے کہ کوئی حد نہیں۔“  
”تو کیا ان سب باتوں کا اثر نہیں ہوا۔“ ایل نے پوچھا۔

”اثر تو ہوتا ہے۔ ہنساتا ہوں تو ہنستی ہیں۔ اتنا ہنستی ہیں اتنا ہنستی ہیں کہ پیٹ میں بل پڑ  
لین۔ چکرات بات کرتا ہوں تو اتنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر دیکھتی ہیں جب لیاقت کی  
سمتا ہوں تو مڑ مڑ کر دیکھتی ہیں۔“

”ایل نے پوچھا۔“

”میں جب ایک منٹ تو بیٹگی رہتی ہیں پھر بے خشک ہو جاتے ہیں تو سالی پھر سے اڑ جاتی ہیں  
مجھے جانتی ہی نہ ہوں۔“

”گھر میں کیا گاہک کون ہے۔“ ایل نے پوچھا۔

”میں نہیں یاد کون ہے۔ کوئی سکول کی دکھتی ہے۔ ہماری ڈار میٹری کے پچھواڑے میں ان  
کے ساتھ ایک روز میں نے دیے چیمیز خانی کے لئے دو ایک اشارے کر دیئے تھے اب سالی

شرم کے مارے ایل ڈوب گیا۔ پھر وہ بھاگ پڑا۔

”ارے ٹھہرو تو۔ میں نے کہا ٹھہرو نا۔“ شام چلا رہا تھا۔ لیکن ایل بھاگے جا رہا تھا۔ پچھو  
شام آ رہا تھا۔ اور کھلی کے سب تماشا بین ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ٹھہراؤ

ٹرننگ کالج کی زندگی کے پہلے دور میں ایک مسلسل کش کش تھی اضطراب تھا ہر کئی  
جوش تھا۔ پر امید تھا۔ کوشاں تھا۔ لیکن چھ ایک ماہ کے بعد لڑکیوں کی زندگی نے دوسرا رخ  
لیا۔ بیشتر لڑکے جو لڑکیوں پر اثر ڈالنے کے لئے بے تاب تھے۔ مایوس ہو گئے۔ اور ان کی توجہ  
کسی اور طرف متعطف ہو گئی۔

ادھر لڑکیوں نے اپنا اپنا حلقہ اور اپنا اپنا مرکز متعین کر لیا۔ اس طرح زندگی میں ایک ٹھہرو  
پیدا ہو گیا۔ جیسے گدلے پانی کا بھرا گلاس کچھ دیر کے بعد پھر کر صاف ہو جاتا ہے گرد و غبار  
بیٹھ جاتا ہے۔

لڑکیوں کی وہ پر شور محفلیں ختم ہو چکی تھیں۔ اب ہر لڑکی نے امتحان کی تیاری کے لئے  
ایک مخصوص کونہ مقرر کر لیا تھا مثلاً ”مس روماس اس بیچ پر بیٹھا کرتی جو لان کے ٹیبل کے  
میں جھاڑیوں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ مس راد ہانے سائنس روم کے عقب میں بنی ہوئی گیلی  
اپنے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ جس سے ادھر ادھر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کالج کے لان میں  
پڑے ہوئے بیچ سب غائب ہو چکے تھے اور مخصوص مقامات پر رکھ دیئے گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ امتحان کی تیاری اکیلے میں تو نہیں ہو سکتی ایک ساتھی کا ہونا ضروری ہوتا ہے  
اور ایک سے زیادہ ساتھی ہوں تو بھیڑ لگ جاتی ہے اور پوری توجہ سے کام نہیں ہوتا۔ مثالاً  
وجہ سے لڑکیاں تقریباً ”تقریباً“ عفا ہو چکی تھیں۔ عام طور پر وہ دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ بلکہ کمال  
خاص لیکچر ہوتا تو وہ اپنے اپنے ڈربوں سے نکل آتیں اور لیکچر ختم ہونے کے بعد پھر وہیں لوٹ  
جاتیں۔

رائے نے پھر سے گاؤں جانا شروع کر دیا تھا۔ اور ہریار گاؤں سے واپس آنے کے بعد ایل  
کو اس لڑکی کے قصے سناتا جو اتنی بولڈ تھی کہ حد نہیں اور جس کی بولڈنس کی وجہ سے اس کے  
پیرش نے احتجاجاً ”کھانسا اور تیوری چڑھانا چھوڑ دیا تھا۔

کھڑکی میں یوں جی رہتی ہے جیسے سریش لگا کر جوڑ دیا ہو کسی نے اپنے لئے جی تھی ہو رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ایلی بولا۔ ”تمہیں بھی لکھنے کے لئے ایک کھوئی ہی چاہیے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ شام ہنسا۔ ”لیکن وہ تو خود لنگ رہی ہے۔“

”یہ تو بلکہ اور بھی اچھا ہے“ ایلی نے کہا۔ ”پکا پکایا مل گیا۔“

”اونسوں“ وہ بولا ”یار لوگوں کو تو مار کر کھانے کی لت پڑی ہے۔“ عجیب بات ہے؟“

”اگر وہ لنگ جائے تو اپنی طبیعت نہیں جیتی اور اگر وہ پروانہ کرے تو ہم خود لنگ جاتے ہیں۔“ ایلی ہنسنے لگی۔

”ایک بات اور ہے“ شام بولا۔

”وہ کیا؟“

”لاجونتی کی عمر بہت چھوٹی ہے۔“

”اس میں کیا برا ہے۔ جتنی چھوٹی عمر ہوگی۔ اتنا جذبہ بے لوث ہو گا۔“

”اونسوں۔ ہمیں تو شیار چاہیے جو ہمیں لوریاں دے دے کر سلائے پٹ پٹ کرے گا۔“

اپنے بازوؤں میں سنبھالے۔“

اسی شام وہ دونوں بورڈنگ سے نکل کر اس مکان کی طرف سیر کے لئے نکل گئے جہاں

لاجونتی کا گھر تھا تاکہ قریب سے لاجونتی کو دیکھ سکیں۔

لاجونتی چودہ سال کی لڑکی تھی۔ اس کا رنگ سناٹا تھا لیکن نقوش جاذب نظر تھے۔

میں عجیب دیوانگی سی تھی اور انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے محبت کی دنیا کے طور طریقے

ابھی ناواقف ہو جیسے کوئی دلہیز پر کھڑا ہو اور زندگی کے ایوان میں داخل ہونے کے لئے بہانہ

ہو۔

والیسی پر ایلی کو سوجھی۔ ”یار ایک بات کہوں برا مزار ہے گا جو تم مان جاؤ تو۔“

اس روز انہوں نے مل کر سازش کی کہ کسی طرح بابا کو یہ غلط فہمی دے دی جائے کہ

لاجونتی اسے دیکھنے کے لئے کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے۔ چونکہ بابا جس ڈار میٹری میں رہتا تھا

سے بھی لاجونتی کا مکان صاف دکھائی دیتا تھا۔

اس مذاق کی وجہ یہ تھی کہ ایلی بابا کی باتیں سن کر تنگ آچکا تھا۔ بابا یوں بات کیا کرتا تھا

ایلی کی اس پر رنج بھی ہوئی ہو۔ اسے یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔

جہاں بڑی ہوئی ہیں اور جوان لڑکیاں بھلا بابا سے کیسے محبت کر سکتی ہیں۔

چھ روز میں ایلی نے بابا کو یقین دلادیا تھا کہ لاجونتی اس پر دل و جان سے نذا ہو چکی

اور اس کے لئے ہر وقت کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے۔

اس کے بعد بابا روز ایلی کو لاجونتی کے قصے سنایا کرتا تھا۔ اور ایلی سمجھتا کہ بابا نے ایک الف

ایلی بابا بار کھی ہے۔ جسے حقائق سے کوئی تعلق نہیں اس لئے وہ بابا کے قصے یوں سنا کرتا تھا

طوطا جیٹا کی کہانیاں ہوں اس نے انہیں کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ دل ہی دل میں وہ بابا کی

نہ پرہیز کرتا تھا پھر ایک روز رات کے نو بجے کے قریب بابا ایلی کے پاس آیا۔ اس وقت وہ

پانچ گھنٹے کر آیا تھا۔

”اے۔“ ایلی نے کہا ”آج تو دو لہا بنے ہوئے ہو۔“

”ہاں یار۔ آج وہاں جانا ہے نا۔ اس لئے میں نے کہا ذرا اچھے کپڑے پہن لوں۔“

”کھل جاتا ہے؟“

”ہی دیں“ بابا بولا۔ اس نے اشارہ کر کے کہا۔

”وہاں کہاں؟“

”لاجونتی نے بلایا ہے۔“ بابا نے اس کے کان میں کہا۔

”اے۔۔۔۔۔“ ایلی کو بھولی ہوئی لاجونتی یاد آگئی۔ اس نے بلوایا ہے۔“

”ہاں“ وہ بولا ”پچھاری کتنے دنوں سے بلا رہی ہے۔ کتنی ہے گھر والے کیس گئے ہوئے

مگر میں وہ اکیلی ہے۔“

”اے۔“ ایلی سمجھ رہا تھا کہ بابا ویسے ہی گپ چلا رہا ہے۔ یا شاید لاجونتی اسے بلا رہی ہو۔

”ذرا میرے ساتھ چلو گے۔“ بابا نے کہا ”وہاں تک۔“

”کھل؟“

”ایسے معاملے میں ساتھی ہو تو اچھا رہتا ہے۔ صرف مکان تک چلنا پھر چلے آنا۔“ بابا نے

”گپ“ ایلی نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں اور کب۔“

ایلی ابھر نکل آیا لیکن باہر آتے ہی اس نے محسوس کیا جیسے کوئی بات ہو۔ کہیں شام نے کچھ ہاتھ نہیں دیا۔ شاید زرد دوپٹے والی منگیت کی وجہ سے وہ رک گیا۔ اور پھر سے دبے پاؤں شام کی پہنچ کی طرف چل پڑا۔ اب کی بار وہ اس سمت سے داخل نہ ہوا جہاں داس کی سیٹ تھی بلکہ پہلی طرف سے داخل ہو کر دبے پاؤں شام کی سیٹ کی طرف چلا آیا۔ چارپائی کے نیچے بیٹھ کر وہ رک گیا۔ واقعی یہ تو سو رہا ہے۔ اس نے سوچا۔ خواہ مخواہ تنگ کرنے کا فائدہ۔ تمام میں نہیں جگاتا۔ وہ چارپائی کے قریب تر ہو گیا۔ پھر اس نے جانے کس خیال پر لپکنے کی طرف سے چادر کا پلو اٹھایا۔ ارے وہ پھونپکا رہ گیا۔ بستر میں شام نہیں تھا۔ چارپائی پر رہتے اور کوٹ اور جانے کیا کیا یوں رکھا ہوا تھا جیسے کوئی سویا ہوا ہو۔

جب ایلی اپنے کمرے میں پہنچا اس وقت تقریباً بارہ کا وقت تھا۔ ان دنوں جی کے اور ایلی نے کمرے کو چھوڑ کر بورڈنگ کے ہسپتال کے ان ڈور وارڈ میں رہتے تھے۔

ایک روز فٹ بال کھیلنے ہوئے جی کے گر پڑا تھا اور اس کی شن بون ٹوٹ گئی تھی۔ اور ڈاکٹر اس کی ٹانگ کو پلستر کر دیا تھا۔ چونکہ بورڈنگ اور کالج کے تمام لڑکوں سے جی کے کے مراسم اور ان کے کمرے میں اکثر بھیڑ مچتی رہتی تھی لڑکے اس کی عیادت کو آتے تھے ہر وقت کوئی لڑکی کے کے پاس بیٹھا رہتا تھا اس بات کو محسوس کر کے لالہ جی نے خود انہیں کنا تھا کہ وہ انڈور وارڈ میں چلے جائیں تو ان کے لئے آسانی رہے گی۔

انڈور وارڈ بورڈنگ کے ساتھ ملحق تھا لیکن وہ بورڈنگ سے الگ سمجھا جاتا تھا۔ اور وارڈ رہنے والے ان تمام پابندیوں سے مبرا تھے جو بورڈنگ میں رہنے والوں پر عائد تھیں۔ مثلاً ان میں دس بجے باقاعدہ حاضری لگتی تھی اور پھر باہر کے دروازے مقفل کر دیئے جاتے تھے لڑکی کی اجازت کے بغیر کوئی شخص نہ تو باہر جا سکتا تھا اور نہ اندر داخل ہو سکتا تھا۔ اس بورڈنگ میں مہمانوں کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ ان ڈور وارڈ میں یہ پابندیاں نہ تھیں۔ لالہ جی کا ایک دروازہ باہر کھلتا تھا۔ اس لئے وہ باہر جانے یا اندر آنے کے لئے قطعی طور پر افسوس اور باہر کے مہمان بے روک ٹوک ان کے پاس آ سکتے تھے۔

لالہ جی کا ایک فراخ بال کمرہ تھا جس میں متعدد کھڑکیاں اور دروازے تھے اس کی ساخت بالکل سے مختلف تھی۔ دراصل یہ ایک نیا ونگ تھا جو حال ہی میں بنایا گیا۔ اور چونکہ ابھی تک مکمل نہ ہوئے تھے اس لئے نہ تو وہاں کوئی نرس تھی نہ ڈاکٹر صرف چار ایک خالی بیڈ

”ابھی۔۔۔ ایلی نے حیرانی سے بابا کی طرف یوں دیکھا۔۔۔ جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ دونوں چل پڑے ایلی سمجھ رہا تھا کہ شاید بابا کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ چپ چاپ چلتے گئے۔ ایلی ہی دل میں بابا کی سادہ لوجی پر ہنس رہا تھا۔

لاجونی کے مکان کے نیچے وہ دونوں رک گئے۔ بابا نے کھڑے ہو کر سرگٹ سلگنا شروع کیا۔ بابا نے ایک ایک دو ماچیس جلائیں اور انہیں بجھا دیا تاکہ انہیں وہاں رکنے کا بہانہ ملے۔ جب وہ نے چوتھی ماچس جلائی تو آہستہ سے مکان کا دروازہ کھلا۔ ہاتھ میں لائٹن اٹھائے اندر دروازے میں کھڑی تھی۔ ”اچھا بھئی۔“ کہہ کر بابا اندر داخل ہو گیا۔ اور ایلی حیرت۔ بھٹی بھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا۔

## ونڈر لینڈز

وہاں سے واپس آتے ہی ایلی شام کی طرف گیا۔ وہ شام کو لاجونی اور بابا کی ملاقات کا دن سنانے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ ڈارمیٹری میں شام اسے دکھائی نہ دیا تو اس نے گونڈ لورہ سے پوچھا کہ شام کہاں ہے۔

”میں تو تھا ابھی۔“ وہ بولے ”شام کسی اور ڈارمیٹری میں بیٹھا گئیں ہلک رہا ہو۔“ دیر تک ڈارمیٹریوں میں گھومتا رہا۔ جب وہ باہر آنے لگا تو راستے میں لالہ جی مل گئے۔ ”کے تلاش کر رہے ہو۔“ وہ بولے۔

”شام کو ڈھونڈ رہا ہوں۔“ ایلی نے کہا۔ ”کیس جھٹی پر تو نہیں گیا۔“ ”نہیں وہ تو حاضر ہے۔“ وہ بولے ”داس کہہ رہا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہے اور۔“ ”کیا ہے۔“

”اوہ“ ایلی بولا ”طبیعت خراب ہے۔“ ”لالہ جی کے جانے کے بعد وہ پھر سے شام کی ڈارمیٹری میں داخل ہوا۔ ”شام کہاں ہے۔“ اس نے داس سے پوچھا۔

”اس کی طبیعت اچھی نہیں“ داس نے جواب دیا ”سو گیا ہے۔“ ایلی شام کی سیٹ کی طرف جانے لگا تو داس نے اس کی پانہ پکڑ لی۔ ”نہیں بار۔۔۔“ ”اے نہ جگاؤ۔ مشکل سے آنکھ لگی ہے۔“

ہاں کل گیا تاکہ چپ کر خط پڑھ سکے۔

دانش، وہ ایک محبت بھرا خط تھا۔ جی کے اور یہ جذبات! اہلی حیرت ہے اس سوئی ہوئی گھڑی کے لئے دیکھ رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا سمجھے کیا جی کے کی وہ شخصیت جس سے اپنی تمام غماض ایک ہروپ تھی۔

اہلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ابھی اسے انسانی کردار کے تضاد کا شعور نہ تھا۔ اس نے اوروں کا اور سوچ بچار میں کھو گیا۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ ہر وہ چپکے سے باہر نکل گیا۔

باہر گر کے درخت کے نیچے ساوی گھڑی ہنس رہی تھی۔ ”آؤ ہمارا جی آئیں نوں“ وہ رائے لگی اہلی نے ماہس کی ڈبیہ ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔ سگرت ہونٹوں میں دبا رکھا تھا جسے ادا بول گیا تھا۔

ملائی نے اس ان سگرت کی طرف دیکھا۔ ”سگرت خود لگائیں گے ہمارا جی یا میں لگاؤں۔“ وہ مسکرائی اہلی چونکا اس کو وہ رات یاد آگئی جب وہ سفید منزل کی سیڑھیوں میں ضد کے بدلے کہ ساوی خود سگرت سلگا کر دے۔

”تو ہے۔“ ساوی بولی ”کوئی ایسا ضدی بھی نہ ہو۔“

اہلی نے سگرت سلگایا اور پھر کالج کی طرف چل پڑا۔

کالج کی عمارت چاندنی میں چمک رہی تھی۔ عمارت کی چھت پر شہزاد گھڑی تھی۔ ارے وہ گہرا کر کا واقعی کالج کی چھت پر کوئی تھا۔ نہ جانے کون ہے۔ کوئی ہو گا اس نے سوچا۔ شاید بیکار ہو۔ وہ سمجھا گیا کالج کا چوکیدار بہت سخت آدمی تھا۔ وہ پرنسپل کو رپورٹ کرنے سے نہ ہٹا تھا۔ اسی وجہ سے لڑکے رات کے وقت ادھر آنے سے ڈرتے تھے۔

اٹھانے اپنا رخ بدل لیا۔ وہ مغربی سمت کو چل پڑا جس طرف کالج کا لان تھا۔ اس وقت لان چاندنی میں جھلکا رہا تھا۔ اہلی کا جی چاہتا تھا کہ کسی بچ پر بیٹھ کر اس پھیلی ہوئی چاندنی کو نیچے جواسے ساوی اور شہزاد کی یاد دلا رہی تھی لیکن لان میں جانا خطرناک تھا۔ اوپر سے چوکیدار نے دیکھ لیا تو۔ لان میں کوئی بچ بھی تو نہ تھا۔ تمام بچ لڑکوں نے لان سے اٹھا کر اس سے لمحہ مٹا رکھا دیتے تھے جہاں بڑی بڑی جھڑیاں تھیں۔ اہلی ان جھڑیوں کی طرف چل پڑا۔

دفعتاً وہ رکا۔ ان جھڑیوں سے آوازیں آرہی تھیں۔ وہ محتاط ہو گیا اور ایک پودے کے

پڑے ہوئے تھے۔ لہذا جی کے اور اہلی نے اپنا تمام سامان کتابیں صندوق چار پائیاں میز کے وہاں منتقل کر دی تھیں۔

چونکہ جی کے ڈیڑھ ماہ سے صاحب فراش تھا اس لئے کالج اور بورڈنگ کے لڑکے اکثر آئے تھے وہاں آجایا کرتے۔ سارا سارا دن وہاں تاش کھیلا جاتا کیرم چلنا۔ شطرنج کی بازیائیں جاتیں۔ اس طرح وہ کمرہ کو من روم کی حیثیت اختیار کر گیا تھا ایک ایسا کومن روم جہاں ہر دھماچو کڑی رہتی۔ اور جہاں شور مچانا اور دنگا فساد کرنا قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا تھا۔

وارڈ میں منتقل ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ اہلی کو ہر وقت بورڈنگ میں رہا ہونے یا وہاں سے باہر جانے کی اجازت مل چکی تھی۔ دروازے پر بیٹھا ہوا چوکیدار اسے دیکھ آپ ہی آپ اٹھتا اور پھر بن پوچھے آہنی دروازہ کھول دیتا۔ شام کی ڈارمیٹری سے نکل کر جب باہر آیا تو چوکیدار نے حسب معمول دروازہ کھول دیا اس وقت گیارہ بجے تھے جب وہ کمرے داخل ہوا۔ تو بتی جل رہی تھی اور جی کے لڑکوں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے لکھے ہر پڑا تھا اور قلم ہاتھ میں تھا۔

وہ چپ چاپ اپنے بستر کی طرف بڑھا۔ بستر جھاڑے ہوئے اس نے جی کے سے پوچھا۔ ”کیا لکھ رہے ہو؟“

جی کے نے کوئی جواب نہ دیا۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں۔“ اہلی نے کہا۔

کوئی جواب نہ پا کر وہ مڑا۔ جی کے کے قریب گیا۔ جی کے اسی طرح بیٹھا بیٹھا مگنا تھا بڑی محنت کر رہا ہے بیچارہ۔“ اہلی نے سوچا۔

دفعتاً اس کی نگاہ پیڑ پر بڑی عنوان کو دیکھ کر وہ چھوچکا رہ گیا۔ لکھا تھا میری پیاری سفینہ۔ ارے سفینہ کون تھی اور پھر پیاری جی کے اور پیاری۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے اہلی کے کے سب قریبی رشتہ داروں کو جانتا تھا اسے جی کے کی ہمیشہ والدہ کے نام معلوم تھے۔ سفینہ کون تھی۔ کیا جی کے بھی کسی کی محبت میں گرفتار تھا۔ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے لڑکیوں سے محبت کرنے کے شغل سے سخت نفرت تھی وہ محبت کا مذاق اڑایا کرتا تھا اول ہوس سے تعبیر کرتا تھا۔ مراط مستقیم پر چلنے والا شخص کسی کو میری پیاری سفینہ لکھے ایک دلچسپ دان۔ ایک اصولی آدمی۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا شاید یہ خط کسی عزیز کو لکھا ہو۔ اہلی نے یہ



لیکن بچہ چھپ گیا۔  
 ”بھگوان کی سوگند میں زہر کھالوں گا۔“ کوئی چلا رہا تھا۔ ”میرے پاس ہے۔ میرے نزدیک میں پڑی ہے سچ کہہ رہا ہوں۔ صبح آؤ گی تو دکھا دوں گا۔“  
 ”زہر — ٹریک — ارے“ ایلی نے شام کی آواز پہنچان لی۔  
 شام یہاں — اور یہ ساتھ کون ہے۔ ایلی چپکے سے بیٹھ گیا تاکہ کسی کو نظر نہ آئے۔  
 دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر آواز آئی — ”بس اس قصبے کا یہی انجام ہو گا۔“

ہلا سبک

امتحان کے قریب آنے پر لڑکوں کے پریکٹیکل لیسنر شروع ہو گئے اور اسباق کی تیاری میں صرف ہو گئے پھر انہیں پریکٹیکل کے لئے مختلف سکولوں کی جماعتیں مل گئیں جہاں انہیں بچوں کو ایک مینے کے لئے عملی طور پر پڑھانا تھا۔

ایلی اور ایس ڈی کے طلبہ کی ڈیوٹیاں مختلف سکولوں میں لگ گئیں۔ کسی کو دلی دروازے کے درے میں متعین کر دیا گیا کسی کو بھاٹی دروازے اور کوئی شیرانوالے بھیج دیا گیا۔ ان فہمائشوں کی وجہ سے کالج کی زندگی کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ کالج لان کی جھاڑیوں میں رکھی ہوئی نام نہانیں ویران ہو گئیں۔ جماعتوں کے کمرے خالی دکھائی دینے لگے۔ بورڈنگ میں آنے جانے اور ملنے لانے کے اوقات اور بورڈنگ کے معمولات بالکل بدل کر رہ گئے۔

خوش قسمتی سے ایلی کی ڈیوٹی سنٹرل ماڈل سکول میں لگ گئی جو ان کے ہوسٹل کے متصل واقع تھا۔ اس بات پر اسے بے حد خوشی تھی۔ اس کے علاوہ سنٹرل ماڈل سکول لاہور کے تمام سکولوں میں ایک معیاری سکول مانا جاتا تھا۔ وہاں کے اساتذہ جدید طریقہ تعلیم سے واقف تھے اور بچہ بہت ذہین سمجھے جاتے تھے۔

پہلی مرتبہ جب ایلی سنٹرل ماڈل سکول کی جماعت میں داخل ہوا تو کلاس ٹیچر نے اس کی فہمائشوں کو دیکھا لڑکے ایک دوسرے کو کہنی مار کر ہنسنے لگے۔

کلاس ٹیچر ایک بھاری اور بھدے جسم کا شخص تھا۔ اس کے ماتھے پر دائمی شکن تھا جیسے وہ کھانا کھود دیا گیا ہو۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ چہرے پر بے حسی کا دبیز پردہ پڑا تھا۔ اور ہونٹ مسڑھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی جسے وہ بار بار میز پر بجاتا تھا۔

”میں سنٹرل ٹریننگ کالج سے آیا ہوں۔“ ایلی نے کہا ”میرا نام ایلیاس ہے۔“  
 ”ہوں“ کلاس ٹیچر نے اسے گھورتے ہوئے کہا اور ویسے ہی بیٹھا رہا۔ پیچھے لڑکوں کی ہنسی کی

”اوہ“ وہ بولی ”پھر وہی بات۔“  
 ”بھگوان جانے میں جھوٹ —“

اس کی بات اودھوری رہ گئی باغیچے میں خاموشی چھا گئی پر اسرار خاموشی ایلی نے محسوس کیا کہ اسے وہاں سے چلے جانا چاہئے وہ اٹھ بیٹھا اور دبے پاؤں باہر نکل آیا پھر وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑا کمرے میں پہنچ کر اس نے بجلی بجھادی اس کے دل میں ایک عجیب طوفان چاہوا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ سب اپنی اپنی دھن میں کھوئے ہوئے تھے۔ ہر کوئی لاپرواہ

آواز یوں دفعتاً بند ہو گئی جیسے کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

”ایسی باتیں مت کیجئے۔“ کوئی بولی۔

”تو کیسی باتیں کروں۔“

”پیار کی باتیں۔“

”اس پیار نے اپنا دیوالیہ نکال دیا ہے۔“

”کیوں۔“ وہ بولی۔

شام ہنس۔ ”بس صبح شام مر رہے ہیں۔ پڑھنے کی فرصت کسے ہے۔ اور بھگوان جانے امتحان میں بطح کا ایڈاٹلے گا مرغی کا نہیں۔“

ایلی ہنسنے لگا واقعی شام ہے اس نے سوچا۔

وہ ہنسی۔

”لیکن کچھ پرواہ نہیں۔“ شام نے کہا۔ ”چاہے شتر مرغ کاٹلے پر اگر تم نے ایسی بے پرواہی کی تو پھر —“

”اوہ“ وہ بولی ”پھر وہی بات۔“

”بھگوان جانے میں جھوٹ —“

اس کی بات اودھوری رہ گئی باغیچے میں خاموشی چھا گئی پر اسرار خاموشی ایلی نے محسوس کیا کہ اسے وہاں سے چلے جانا چاہئے وہ اٹھ بیٹھا اور دبے پاؤں باہر نکل آیا پھر وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑا کمرے میں پہنچ کر اس نے بجلی بجھادی اس کے دل میں ایک عجیب طوفان چاہوا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ سب اپنی اپنی دھن میں کھوئے ہوئے تھے۔ ہر کوئی لاپرواہ

اس کے انداز میں اس قدر واضح دھونس تھی کہ ایللی جھٹ بولا اٹھا ”جی کرتا ہوں۔ کرتا کرتا“

”وعدہ کرو کہ جو جدید طریقے تعلیم کے تم نے سیکھے ہیں وہ میری جماعت پر نہیں برتو گے۔“

نہیں آج ہے بھول جاؤ گے۔ وہ محض باتھی کے دانت ہیں۔“

ایللی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”یہ ڈنڈا ہے۔“ کلاس ٹیچر چھڑی ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس کا استعمال فرائضی سے کرنا ہو“

”جی ہاں۔ جی ہاں۔“ ایللی چلایا۔

”سبق پڑھا کر یاد کرانا ہو گا چاہے سمجھیں یا نہ سمجھیں۔“

”جی۔“

”ہمیں نتیجہ دکھانا ہے پڑھانا نہیں۔“

”جی اچھا۔“

”تو تم وعدہ کرتے ہو۔“

”جی کرتا ہوں۔“

”تو جاؤ پڑھاؤ۔“ اس نے ڈرائائی انداز سے جماعت کی طرف اشارہ کیا۔

”بہت اچھا“ کہہ کر ایللی چل پڑا۔

”ٹھہرو۔“ وہ بولا — ”تم ڈنڈا تو بھول گئے۔“

”اوہ۔“

کلاس ٹیچر نے چھڑی ایللی کے ہاتھ میں بٹھاتے ہوئے کئی بار پھر اسے ڈانٹا۔

”شہزادہ جو اسے بھولے۔ ورنہ تمہاری رپورٹ —“

ایللی کانپتے ہوئے جماعت میں داخل ہو گیا۔

لڑکے کھڑے ہو گئے۔

”سٹ ڈاؤن“ ایللی نے کہا اور پیشانی سے ہینہ پونچھنے لگا۔

لڑکے جوں کے تو کھڑے رہے۔

”سٹ ڈاؤن۔“ اس نے دہرایا۔

آوازیں آرہی تھیں۔

ایللی نے ایک بار پھر ملتجیانہ نگاہ سے کلاس ٹیچر کی طرف دیکھا لیکن وہ جوں کا توں بیٹھا۔

”تو مجھے کب سے کام شروع کرنا ہے۔“ ایللی نے پوچھا۔

”ہوں۔“ کلاس ٹیچر کی تیوری اور گمری ہو گئی۔

لڑکے قہقہے مار کر ہنس پڑے۔

اس پر کلاس ٹیچر کی توجہ لڑکوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس نے چھڑی اٹھا کر زور سے بڑ بڑا۔ اور پھر اٹھ بیٹھا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے۔“ وہ غرایا۔

”کیا اسے اپنی خیزداری کے متعلق کچھ علم ہے۔“ ایللی نے سوچا۔

”اوہر آؤ وحید۔“ وہ غرایا۔ نیچے اترو۔

ایللی نے محسوس کیا جیسے وہ بھی اس جماعت کا ایک لڑکا ہو اور کلاس ماسٹر نے وحید کی طرح اسے بھی نیچے بلا رکھا ہو اور اب وحید کے بعد اس کی باری ہو۔ گھبرا کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا اور برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد کلاس ٹیچر باہر نکلا۔

”ہوں۔“ وہ ایللی کو ڈانٹتے ہوئے بولا۔ ”تو تمہیں ملی ہے یہ جماعت۔“

”جی۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”اور ایک ماہ میں تم اس کا ستیاناس کر دو گے؟“

ایللی محسوس کر رہا تھا کہ اب وہ لگے گا۔ ”نکالو ہاتھ۔“

”دیکھو۔“ کلاس ٹیچر نے اسے پھر ڈانٹا۔ ”کیا تمہیں علم ہے کہ ایک ماہ کے بعد مجھے تمہارا رپورٹ دینا ہوگی۔“

”جی۔“ ایللی بولا۔

”اور اگر میں نے گندی رپورٹ دی تو تم فیل کر دیئے جاؤ گے۔“

”جی۔“

”اگر مجھ سے اچھی رپورٹ لیتی ہے۔“ وہ بولا ”تو وعدہ کرو۔“



نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن خط پڑھنے کے بعد ایللی کے مفروضات کا محل دھڑام سے  
اوپر اٹھ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بہرحال اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ جی کے  
دلے بدلے مؤثر حقیقت اس راز کی وجہ سے تھے جسے وہ یوں سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ نہ  
بنا وہ کون لڑکی تھی۔ نہ جانے وہ کہاں رہتی تھی۔ نہ جانے وہ دونوں کبھی ملتے بھی تھے یا  
نہیں۔ البتہ ایک بات اس خط سے واضح تھی کہ جی کے اپنی محبوبہ کے سامنے سرخوں ہونے کا  
اہل نہ تھا۔ اس کے انداز میں پردگی نہ تھی لیکن اس کے باوجود جی کے کے جذبات کی شدت  
ہاتھ کن تھی۔

جس روز وہ ایک دوسرے سے جدا ہونے والے تھے ایللی کے منہ سے بات نکل گئی۔  
”جی کے“ وہ بولا ”مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہاری زندگی میں دکھ کا عنصر اس حد تک حاوی  
ہو گیا تھا کہ تمہارا رویہ بد مزاجی کا شائبہ ہے۔“

اس پر جی کے کی ٹانگ یوں تن گئی جیسے کسی نے تلوار نکال لی ہو لیکن وہ خاموش رہا۔  
”پہلے مجھے تمہاری محبت کا علم نہ تھا۔“ ایللی نے کہا ”لیکن اب میں جانتا ہوں کہ تم دکھی  
ہو۔“

”نہیں نہیں۔“ جی کے سنجیدگی سے بولا۔ ”میرے دکھ کو چھوڑو۔ مجھے تو صرف یہ دکھ ہے  
کہ وہ دکھی ہے۔ اس کے دکھ کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا اور — اور —“ جی کے کی  
انگوٹوں میں آنسو آگئے۔

”اس کے لئے محرومی کے سوا کچھ نہیں کچھ نہیں۔ مجھ سے اس کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔“  
اس وقت وہ سلمان باندھ رہے تھے۔

”کب سے دکھی ہے۔“ ایللی نے پوچھا۔

”بہل سے“ وہ بولا۔

”ازل سے!“

”بہل۔ ازل سے۔“ جی کے نے بڑے دکھ سے کہا۔ صدیاں گزر گئیں۔ صدیاں۔ اب تو  
کچھ بچاری کی ہڈیاں بھی گل سڑ گئی ہیں۔ ایک ڈھانچہ رہ گیا ہے اور وہ صرف اسی لئے جی رہی  
ہے صرف ایک آرزو۔ ”ایک امید کی زور پر۔“ جی کے کے منہ سے ایک سسکی سی نکل گئی اور  
”ازل سے“ کی طرف دوڑا۔ غالباً وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے اس عالم میں دیکھے۔

”سچی محبت کا تو اپنے کو پتہ نہیں کچھ البتہ پیار کرتی ہے۔ جیسے میں بچے کو کیا کرتی ہوں۔ اس  
عمر میں ماما مل گئی اور مجھے کیا چاہئے۔“

”تو کیا ماما کی تلاش تھی تمہیں۔“

”سچی کو ہوتی ہے۔ کیا تمہیں نہیں!“ وہ ہنسنے لگا۔ ”یاد رہے فلسفہ چھوڑو۔ مجھے تو غم کھائے ہوا  
رہا ہے اب میں کیا کروں گا۔ ہم کیسے دن گزارا کریں گے۔ پرمانہ کرے ہم دنوں میں ہو  
جائیں۔“

شام کی باتیں عجیب تھیں۔ اس کی شخصیت میں عجب مٹھاس تھی اور سب سے بڑھ کر  
کہ وہ تمام باتیں بلاتامل کہہ سکتا تھا جو ایللی کے دل میں بھی تھیں لیکن وہ انہیں زبان پر لائے  
اپنے آپ سے اظہار کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ ڈرتا تھا غالباً اسی وجہ سے ایللی کو شام سے بہت  
تھی۔

اس روز شام کی بات سن کر ایللی نے محسوس کیا جیسے اس نے ایللی کے دل کا راز فاش کر دیا  
ہو۔ جیسے وہ ایللی کے اس راز سے کما حقہ واقف ہو اور اس بات کو اچھی طرح جانتا ہو کہ ایللی  
شزاو سے کیوں محبت تھی۔ اور وہ ایللی کا راز فاش کر رہا تھا۔ راوہا کا تو محض بہانہ تھا۔

ایللی کو پسینہ آگیا اس کی زبان بند ہو گئی اس کے بعد نہ جانے شام کیا کہہ رہا تھا۔ شاید  
سرسری جسم کی تعریف کر رہا تھا۔ یا اس کے جسم کے غم و ہنج کی بات کر رہا تھا۔ ایللی کے  
اس وقت شزاو کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ کہہ رہی تھی۔

”میں نے اس سودے میں کچھ پایا نہیں کھویا ہے۔ ایللی میں نے اپنا آپ کھو دیا ہے۔  
جانتے ہیں کہ میں اپنے آپ سے گئی ہوں۔ ایک تم ہو جس نے آج تک اس بات کو نہیں پایا۔“

جی کے کی ٹانگ ٹھیک ہو چکی تھی لیکن وہ ابھی تک اسی کمرے میں مقیم تھی۔  
آخری ایام میں کمرہ بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بیماری کے ایام میں جی کے کی طبیعت  
کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔

جس روز سے ایللی نے اس کا محبت نامہ پڑھا تھا جی کے کے متعلق ایللی کا نقطہ نظر  
تھا پہلے اس کا خیال تھا کہ جی کے جذبات سے قطعی طور پر عاری ہے۔ دوستوں سے تو وہ  
طور پر اظہار محبت کیا کرتا تھا لیکن ایللی کے اندازے کے مطابق وہ لڑکیوں سے محبت کرنے  
نہ تھا چونکہ بنیادی طور پر وہ خود پسند شخص تھا۔ اور جو اس حد تک خود پسند ہو ایللی کے

ایلی کی طرف جاتے تھے اور بہانے بہانے اس سے بات کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ایلی نے سمجھ لیا کہ اس سبز گھڑی کے پٹ کھل جائیں اور وہ ایک جھٹک دیکھیں صرف ایک لمحے کے لئے۔ اس روز بھی گاڑی سبز میدانوں میں بھاگ رہی تھی اور دور پہاڑیوں کی چوٹیاں ابھی دیکھی تھیں جن پر نیلا آسمان تار ہوا تھا۔

ایلی نے سوچا کہ آج بارہ برس ہو چکے تھے۔ بارہ برس۔ اب شہزاد چار بچوں کی ماں بن چکا تھا۔ ایلی کی زندگی میں ذرا فرق نہ آیا تھا۔ اس کا چہرہ ویسے ہی جاذب نظر تھا۔ اس نے کافی دیے ہی روشن تھا۔ اس کا جسم ویسے ہی خم و پیچ سے بھرپور تھا۔ آنکھیں اسی مدد بھری تھیں۔ ڈولتی تھیں۔ ایلی کو شہزاد کا قرب حاصل ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ اب شہزاد نے اسے آنکھوں پر بٹھا رکھا تھا۔ اور صرف یہی نہیں دس سال سے اس نے ایلی کو بٹھا رکھا تھا۔ اب تو بات اتنی پرانی ہو چکی تھی۔ کہ لوگوں نے اسے تسلیم کر لیا تھا اور اسے بڑا ہوش ہو گئے تھے۔

ایلی مسلسل دس سال سے شہزاد سے شادی رہا تھا۔ اسے شکوہ تھا کہ شہزاد اس کے لئے ایک نیا آدمی ہے۔ اس سے دور رہتی ہے۔ اس سے صرف کھیلنا مقصود ہے جیسے ایلی کھلونا ہو۔ ایلی شہزاد کو صرف ایلی کے اس جذبہ کو قائم رکھنے کا شوق ہے جو اس کے دل میں لے لئے موجود تھا اسے بذات خود ایلی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ایلی سوچ رہا تھا۔ ہاں واقعی شہزاد کی محبت کی قدر نہیں کی بلکہ اسے کبھی تسلیم تک نہیں کیا۔ اور وہ ہمیشہ اس بات کا اہم اس سے جسمانی قرب پیدا کرے۔

ایلی کے آنے کے بعد ایلی نے دفعتاً محسوس کیا تھا کہ شہزاد اس کی محبت میں اس کی ایک رکاوٹ ہے اور اسی وجہ سے اس کی زندگی نارمل نہیں رہی۔ نہیں رہ سکتی۔ یہ سب ملنے کے بعد اس نے شدت سے محسوس کیا تھا ایک شادی شدہ عورت سے باہم بد قسمتی ہے۔

ایلی سوچنے لگا اس میں شہزاد کا کیا قصور کہ وہ شادی شدہ تھی۔ شہزاد نے تو اس کا ہاتھ مانتا تھا۔ ایلی نے اس کا ہاتھ مانتا تھا اور ہاتھ مانتے ہوئے تو اس کو احساس نہ تھا کہ اسے محبت ہے اس وقت تو محض ہوس کی وجہ سے اس نے ہاتھ مانتا تھا۔ مانتا کہ اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ صرف ایک حسین عورت کا قرب۔ اور وہ قرب اسے حاصل ہو گیا تھا۔ اب وہ

ایلی حیرت سے اس کو بھاگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ زندگی کس قدر عجیب ہے۔ کدھر کتنے عجیب تھے اور اس کے سوچے ہوئے خیالات اور پڑھی ہوئی باتیں اور سمجھے ہوئے اصول کس قدر غلط تھے۔

باہر میدان میں برگد کے پتے جھڑ رہے تھے۔ زمین خشک پتوں سے بھری ہوئی تھی۔ درخت کے تلے سلمان رکھے اسفند ٹھل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی ملاحت تھی۔ مائے برآمدے میں کلاس ٹیچر چھڑی سنبھالے کھڑا تھا۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ سب بے بس لپانج ہوں۔ نہ جانے وہ کون تھی جس نے کلاس ٹیچر کے ماتھے پر تیوری کندہ کر دی تھی جس نے اسفند کو پلپلاہٹ بخش دی تھی نہ جانے وہ کون تھی جس نے کے جی کے ٹاک کو دھار دیدی تھی۔ دور کوئی چکی ہو تک رہی تھی۔ وہ وہ وہ!

## سیس نوایا

گاڑی میں بیٹھے ہوئے ایلی ایک انجانوی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ عرصہ دراز کے بعد وہ شہزاد کے پاس جا رہا تھا۔ وہ شہزاد جو علی پور میں صرف اس لئے بیٹھی تھی کہ اسے ایلی کے آنے کا انتظار تھا۔ ایلی کو بار بار شام کی بات یاد آ رہی تھی۔ عورت میں صرف ایک خوبی ہوتی ہے صرف ایک کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اس ایک خوبی کے لئے مرد اسے چاہتا ہے۔

ہاں۔ شام سچ کہتا تھا۔ عورت میں صرف ایک خوبی ہوتی ہے۔ لیکن شہزاد میں تو بیسیوں خوبیاں ہیں۔ وہ اتنی دیر سے ایلی کا انتظار کر رہی ہے۔ اس سے محبت کر رہی ہے۔ بے لاگ محبت جس میں ہوس کا عنصر نہیں اور اس نے اس محبت کے لئے سب کچھ کھو دیا ہے۔ کچھ پانے کی امید نہیں۔ اس میں حسن ہے رنگینی ہے جرات ہے۔ کتنی جرات ہے اس میں۔ ایلی کے لئے وہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے لوگوں کی جلی کٹی باتیں سننے کے لئے تیار ہے۔ ایلی کے دل میں شہزاد کے لئے نئے جذبات ابھر رہے تھے۔ وہ شہزاد کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کھڑکی سے باہر ہرے بھرے کھیت دوڑ رہے تھے۔ دور پہاڑوں کی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں اور اس کے اوپر نیلا آسمان۔ پھر اسے وہ دن یاد آ گیا جب وہ براتیوں کی حیثیت سے شہزاد کو لا رہے تھے۔ جب شہزاد زبانی ڈبے میں سبز گھڑی بنی بیٹھی تھی اور محلے کے لڑکے باری باری

صرف اس لئے دکھی تھا کہ وہ شہزاد کو اعلانیہ اپنانا چاہتا تھا۔ یہ تو ایک ناممکن خواہش قرار پوری نہ ہو سکتی تھی لہذا اسے آتش رقابت میں جلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ شہزاد کے فو ابھرے ہوئے تاروں کو گنا کرتا تھا۔

ایلی کو ان باتوں پر از سر نو ندامت ہو رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے قدر نہیں کی۔ اس کی محبت کی قدر نہیں کی۔ اس کی قربانی اور جرات کی قدر نہیں کی۔ ”نہیں نہیں۔ اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ وہ دیوی ہے دیوی۔ اور میرا کام ہے اس کے آگے سب نوانا۔“

ہاں ہاں۔ اب میں اس کے پاس پہنچ لوں اب کی بار۔

محلے کا میدان ویران پڑا تھا۔ غالباً محلے کے لڑکے دوسری طرف کھیل رہے تھے غالباً گرمی کی وجہ سے اپنے اپنے مکانات کی چھتوں پر جا چڑھی تھیں۔ اس وقت شاہ ہوں گے لیکن گرمیوں میں رات کے ۹ بجے تک تو میدان میں چل پھل رہا کرتی تھی۔ ایلی نے اوپر کھڑکیوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ رابعہ کی کھڑکی بند تھی۔ اوپر کے چہارہ کھڑکی کھلی تھی۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ جب وہ چھتی گلی میں داخل ہوا تو مائی نتھی کی سن کر ڈر گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں کوئی نہیں۔ مائی نتھی اتنی لاغر اور نحیف تھی کہ بچہ کے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی وہ ایلی کو دکھائی نہ دی تھی۔

”کون ہے؟“ مائی نتھی نے پوچھا۔

”میں ہوں۔“ ایلی نے اسے پہچانے بغیر جواب دیا۔

”میں کون۔“ اس نے پوچھا۔

”ایلی۔“ وہ بولا۔ ”سلام کہتا ہوں۔“

”ہے اپنا ایلی ہے۔“ اللہ تجھے خوش رکھے۔ تیرا گھر آباد ہو۔ ہے۔ اب کی بار تو بتا سے آیا ہے تو خیر سے تو ہے نا۔“

”ہاں ہاں۔“

”اے اچھا کیا دیر سے آیا تو۔ یہاں روز آکر کیا کرتا ہے تو نے۔ لڑکے اپنے کام پر مشغول لگتے ہیں۔ اچھا ہوا جو دیر سے آیا تو۔ جان چھنی تیری۔ اس دلدل میں پھنس کر تو نے کیا کیا خواہ خواہ۔ اس کے تو لچھن ہی ایسے ہیں۔“

ایلی اس کی بات سن کر چونکا۔ نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ ایلی نے اس کے بے معنی باتوں نہیں پلنے کے لئے بات کا رخ بدلا۔

”تو خیریت سے ہے ناں۔“

”ہند جبر اچھا کرے بیٹا میرا۔“

”چھانو کل ملوں گاں۔“ کہہ کر وہ چل دیا۔

لیکن وہ رہ رہ کر اس کی بات یاد آ رہی تھی کس کے لچھن کی بات کر رہی تھی۔ وہ اور دیر نہ لے گا کون سا فائدہ جتا رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

آگے ماراج

رابعہ کا چہارہ منتقل تھا۔ شہزاد کو حیرت میں ڈالنے کے لئے وہ دبے پاؤں اوپر چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچ کر وہ رک گیا اور چہارے کا جائزہ لینے لگا۔ اندر شہزاد چوکی پر بیٹھی تھی۔ اس کا تذبذب صفر انڈوں بیٹھا تھا۔ صفر نے اپنی آنکھیں شہزاد پر گاڑ رکھی تھی۔ اس کے رہے پر عجب سا تبسم تھا۔

ایلی یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے زینہ بیٹھتا جا رہا ہو اور وہ گرجا جا رہا ہو۔ اس نے ہمدھمک اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر آخری سیڑھی پر چڑھ کر روشنی میں آکھڑا ہوا۔

ایلی کو دیکھ کر صفر گھبرا گیا اور فوراً سرک کر پیچھے ہو گیا۔ ایک ساعت کے لئے شہزاد کی لموں میں تذبذب لہرایا۔ پھر وہ سنبھل کر بولی۔

”آگے ماراج۔“ اس کی آواز میں خوشی کا عنصر نہ تھا۔

”ہی۔ آگے۔“ وہ بولا غالباً اس کی آواز میں دھار تھی۔

”تو آ جاؤ۔“ وہ ہنسی۔

”کئی خشک تھی وہ ہنسی۔“

ایلی سوٹ کیس اٹھائے آگے فرحت کے گھر کی طرف نکل گیا۔

فرحت اور امل سے باتیں کرتے ہوئے وہ مسلسل شہزاد کے چہارے کی طرف دیکھتا رہا کہ اب آکر اسے لے جائے۔“

”میں تجھے کر لے کھاؤں۔ لوکب سے اوھر چائے بنی پڑی ہے چلو چائے تو پی لو پہلے۔“

لیکن اس روز شہزاد فرحت کی طرف نہ آئی۔ البتہ اس کے آنے کے چند منٹ بعد جھومتا ہوا آیا اور رسمی طور پر ایلی کی مزاج پر سی کرتا ہوا اپنے مکان کی طرف چلا گیا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ یہی نہیں کئی ایک باتیں غیر معمولی تھیں۔ اور پھر اس کا دل شہزاد کے اس قدر قریب بیٹھنا اور آنکھوں میں وہ تبسم اور پھر ایلی کو دیکھ کر گہرا کرچہ ہنسنے کا یہ سب باتیں بڑی عجیب تھیں۔ پھر شہزاد کا وہ روکھا لہجہ اور خشک رویہ۔ یہ سب کیا تو ایلی سوچ رہا تھا۔ نہ جانے اس کا کیا مطلب ہے۔

اس کی نگاہوں تلے میں نقیہ آگئی۔ ”اے اچھا کیا جو تو دیر سے آیا۔“ وہ بولی ”اچھا کیا جو جان چھٹی اس کے تو پچھن ہی ایسے ہیں۔“

دفترا میں نقیہ کی بے ربط باتیں معافی سے بھر گئیں۔ ان میں منہمک پیدا ہو گیا خطرناک، ڈراؤنا منہمک۔ ایلی بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے زلزلہ آیا ہو۔ دیوار گھوم رہے تھے جھول رہے تھے۔ چاروں طرف سے اندھیرا یورش کر رہا تھا۔ وہ دیوار اٹھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ شہزاد کے چوہارے میں جا گھسے اور با آواز بلند اس سے کہے۔

”اچھا کیا جو میں دیر سے علی پور آیا۔ میری جان چھوٹ گئی۔“ اور پھر وہ واپس آکر آرام سے سو جائے۔

## رت آئے رت جائے

ساری رات وہ کانٹوں پر پڑا رہا۔ اس کے ذہن میں عجیب و غریب منظر آرہے تھے۔ اب وہ کھڑکیوں میں کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ ان کے مکانات کھڑکیاں ایک دوسری سے جڑی ہوئی تھیں۔ صدف نے اپنی آنکھیں شہزاد کی آنکھوں میں ڈال رکھی ہیں۔ وہ مسکرا رہا ہے۔ شہزاد اسے اشارے کر رہی ہے۔ ابھی نہیں ذرا ٹھہر جاؤ۔ پتہ ہے۔

پھر اسے خیال آتا کہ اب وہ چپ چاپ کھڑکی سے پھلانگ کر شہزاد کے چوہارے میں آتا ہے اب وہ دبے پاؤں اس کی چارپائی کی طرف بڑ رہا ہے۔ اب اس نے شہزاد کو جگایا۔ شہزاد آنکھیں کھول دیں اور اور — اس خیال پر ایلی تڑپ اٹھتا۔ آگ کا ایک شعلہ نہ جلنے لگا۔

پھر اسے خیال آتا کہ اب وہ چپ چاپ کھڑکی سے پھلانگ کر شہزاد کے چوہارے میں آتا ہے اب وہ دبے پاؤں اس کی چارپائی کی طرف بڑ رہا ہے۔ اب اس نے شہزاد کو جگایا۔ شہزاد آنکھیں کھول دیں اور اور — اس خیال پر ایلی تڑپ اٹھتا۔ آگ کا ایک شعلہ نہ جلنے لگا۔

سے اٹھتا اور اس کے تن بدن کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا



”تو پھر روتی کیوں ہو؟“  
 ”رورہی ہوں کیا؟“ وہ تہقہ مار کر نہی۔  
 ”تم خواہ مخواہ جھگڑتی ہو۔“ ہاجرہ بولی۔ ”چھوڑو اب۔“  
 ”آچائے پی لے۔“ فرحت نے شہزاد سے کہا۔  
 ”پلاوے۔“ شہزاد نے جواب دیا۔ ”ہمارے ہاں کوئی پینے نہ آئے تو پھر ہمیں ہی پینے کے لئے آنا ہو گا۔ کیوں مہاراج۔“ وہ ایللی کی طرف مخاطب ہوئی۔ ”ہم درشن کرنے کے لئے آئے ہیں۔“

ایللی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔  
 ”دکھنا دو نا۔“ فرحت ہنسنے لگی۔  
 ”دیں گے۔“ شہزاد بولی۔ ”دیو تابات تو کریں۔“  
 ”یہ دیو تاپتھر کا نہیں بنا“ ایللی نے کہا۔  
 ”ہم کب کہتے ہیں۔“ وہ نہی۔  
 ”کہتی نہیں سمجھتی ہو۔“ ایللی نے روکے انداز سے جواب دیا۔  
 ”اونہوں۔“ شہزاد بولی۔ ”ابھی نہیں۔ ابھی مہاراج غصے میں ہیں۔ ابھی وال نہیں گئے۔“

ایللی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔  
 ”دکھنا دو نا۔“ فرحت ہنسنے لگی۔  
 ”دیں گے۔“ شہزاد بولی۔ ”دیو تابات تو کریں۔“  
 ”یہ دیو تاپتھر کا نہیں بنا“ ایللی نے کہا۔  
 ”ہم کب کہتے ہیں۔“ وہ نہی۔  
 ”کہتی نہیں سمجھتی ہو۔“ ایللی نے روکے انداز سے جواب دیا۔  
 ”اونہوں۔“ شہزاد بولی۔ ”ابھی نہیں۔ ابھی مہاراج غصے میں ہیں۔ ابھی وال نہیں گئے۔“

”ہاں ہاں۔“ ایللی بولا۔ ”ابھی چولہے پر چڑھائے رکھو۔“  
 ”ایللی سے جیتے تو جانیں۔“ فرحت بولی۔ ”ہمیں کو لا جواب کرنا آتا ہے تمہیں۔“  
 ”گرو مہاراج سے کیسے جیتوں۔“ وہ بولی۔  
 ”عین اس وقت جانو آگئی۔“

”ہے ایللی آیا ہے۔“ کب آیا تو۔ اب کی بار تو تیری شکل ہی نہیں دیکھی۔“ پھر وہ شہزادے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”وہ آیا ہے۔ تیرا صفدر ادھر بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔ کتا ہے سارے بار جا رہا ہوں۔ بندے ٹھیک کرانے ہیں تو دیدے۔“  
 ”ہے میں تو بھول ہی گئی۔“ شہزاد چلائی۔ ”میں ذرا بتا آؤں اسے۔“ اور پھر ایللی کی طرف دیکھے بغیر بھاگ گئی۔  
 ایللی نے محسوس کیا جیسے صفدر کی آمد کی بات سننے شہزاد کا رنگ ہی بدل گیا ہو۔ نہ جانے؟

”تو پھر روتی کیوں ہو؟“  
 ”رورہی ہوں کیا؟“ وہ تہقہ مار کر نہی۔  
 ”تم خواہ مخواہ جھگڑتی ہو۔“ ہاجرہ بولی۔ ”چھوڑو اب۔“  
 ”آچائے پی لے۔“ فرحت نے شہزاد سے کہا۔  
 ”پلاوے۔“ شہزاد نے جواب دیا۔ ”ہمارے ہاں کوئی پینے نہ آئے تو پھر ہمیں ہی پینے کے لئے آنا ہو گا۔ کیوں مہاراج۔“ وہ ایللی کی طرف مخاطب ہوئی۔ ”ہم درشن کرنے کے لئے آئے ہیں۔“

ایللی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔  
 ”دکھنا دو نا۔“ فرحت ہنسنے لگی۔  
 ”دیں گے۔“ شہزاد بولی۔ ”دیو تابات تو کریں۔“  
 ”یہ دیو تاپتھر کا نہیں بنا“ ایللی نے کہا۔  
 ”ہم کب کہتے ہیں۔“ وہ نہی۔  
 ”کہتی نہیں سمجھتی ہو۔“ ایللی نے روکے انداز سے جواب دیا۔  
 ”اونہوں۔“ شہزاد بولی۔ ”ابھی نہیں۔ ابھی مہاراج غصے میں ہیں۔ ابھی وال نہیں گئے۔“

ایللی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔  
 ”دکھنا دو نا۔“ فرحت ہنسنے لگی۔  
 ”دیں گے۔“ شہزاد بولی۔ ”دیو تابات تو کریں۔“  
 ”یہ دیو تاپتھر کا نہیں بنا“ ایللی نے کہا۔  
 ”ہم کب کہتے ہیں۔“ وہ نہی۔  
 ”کہتی نہیں سمجھتی ہو۔“ ایللی نے روکے انداز سے جواب دیا۔  
 ”اونہوں۔“ شہزاد بولی۔ ”ابھی نہیں۔ ابھی مہاراج غصے میں ہیں۔ ابھی وال نہیں گئے۔“

ایللی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔  
 ”دکھنا دو نا۔“ فرحت ہنسنے لگی۔  
 ”دیں گے۔“ شہزاد بولی۔ ”دیو تابات تو کریں۔“  
 ”یہ دیو تاپتھر کا نہیں بنا“ ایللی نے کہا۔  
 ”ہم کب کہتے ہیں۔“ وہ نہی۔  
 ”کہتی نہیں سمجھتی ہو۔“ ایللی نے روکے انداز سے جواب دیا۔  
 ”اونہوں۔“ شہزاد بولی۔ ”ابھی نہیں۔ ابھی مہاراج غصے میں ہیں۔ ابھی وال نہیں گئے۔“

”ایا ہے تو ٹھیک ہے۔“ وہ بولی ”میں کیا جانتی نہیں کہ آیا ہے۔“

ایلی کو دھچکا سا لگا۔

”چائے نہیں پلائے گی کیا۔“ ایلی نے دل کڑا کر کہہ دیا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ ویسے ہی کام میں مصروف ہوئی۔ ”جا جانو لے آجائے۔ لگا دے اس میز پر۔“

یہ انتہا تھی۔ ایلی کا جی چاہا کہ اٹھ کر چلا جائے لیکن وہ ضبط کئے بیٹھا رہا۔ جانو چائے لانے کے لئے نیچے چلی گئی تو اس نے شنراؤ پر نگاہیں گاڑ دیں لیکن وہ اس قدر مصروف تھی کہ اس نے انہیں اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

”یہ مفرد یہاں کب سے آتا ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”جب میں بلاتی ہوں آتا ہے۔“ اس نے روکھے انداز سے جواب دیا۔

”دن میں کئے بار بلاتی ہو۔“

”جتنی بار دل چاہے۔“ وہ بولی۔

”بہت دل چاہتا ہے تمہارا۔“ ایلی نے نفرت سے پوچھا۔

”اپنا اپنا دل ہے۔“ وہ بولی۔ ”مجھ پر کون بندشیں ڈال سکتا ہے۔“

ایلی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ وہی شنراؤ تھی جو ابھی ابھی فرحت کے پاس بیٹھے ہوئے اسے دیوتا کہہ رہی تھی۔

”شنراؤ کیا تمہیں معلوم ہے۔“ ایلی نے کہا ”کہ وہ ایک اوباش آدمی ہے۔ شرابی ہے اور اسے کسی کی عزت کا خیال نہیں۔“

”جس کی عزت ہو وہ سوچے یہ باتیں۔ مجھے ان سے کہا۔“ اس نے جملے کٹے انداز سے ختم کر دیے۔

ایلی اٹھ بیٹھا اور شنراؤ کی طرف بڑھنے لگا۔

”نہ مہربانی کرو۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر طنزاً بولی۔ ”مجھے آرام سے جینے بھی دو گے یا نہیں۔“

”لیکن تم نہیں سمجھتی۔“ وہ چلا یا۔

”میں سمجھتا نہیں چاہتی۔ مجھے کوئی نہ سمجھائے۔“

”تو کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”چلا جاؤں گا اہلی“ ایلی نے کہا۔

”دو ایک دن میں مل۔“ فرحت نے کہا۔

”ہاں۔“ وہ بولا ”دو ایک دن میں“

”اور اگر شنراؤ سے صلح ہو گئی پھر بھی۔“ فرحت نے چمک کر کہا۔

”اے ہے تو چھوڑو۔ خواہ مخواہ ایسی بات کرتی ہے۔“ ہاجرہ بولی۔ اور دیکھ شنراؤ سے

ہنسنے جدا ہونا غصے میں نہیں۔ کیا فائدہ ہے؟“

”اس بے چاری نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔“ الٹا اس نے تو ہم سے بہت ہی اچھا سلوک

ہے۔“ ہاجرہ نے کہا۔

”ہوں۔“ ایلی بولا اور چل پڑا۔

## اجنبی عورت

میٹھیوں کے قریب پہنچ کر دھنستا اس نے باہر جانے کا ارادہ بدل دیا اور شنراؤ کے کمرے کی طرف چل پڑا وہ سوچ رہا تھا شاید یہ میرا وہم ہے ناحق اس پر شک کر رہا ہوں۔ شاید کوئی بات نہ ہو۔

اسے وہ دن یاد آگیا۔ جب سنٹر ٹینگ کالج میں جانے سے پہلے وہ رابعہ کے چہرے سے شنراؤ سے ملا تھا۔ شنراؤ اس کے رویہ آکھڑی ہوئی۔

”تم سمجھتے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”کہ میں تمہاری طرف اس لئے بڑھی تھی کہ مجھے پوری کرنا تھی۔“ الٹا میں نے تو ہوس پوری کرنے کے سب راستے بند کر دیئے ہیں۔ میں اپنے خاوند سے بگاڑ کر لیا۔ میں اس کے ساتھ نہیں جاتی۔ یہاں میں کس لئے بیٹھی ہوں۔ لئے کس امید پر۔“

ایلی گھبرا گیا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ یقیناً اس کا وہم تھا۔ ناحق اس پر شک تھا۔ جب وہ شنراؤ کے کمرے میں پہنچا تو وہ چپ چاپ بیٹھی مشین پر کام کر رہی تھی۔

”یہ دیکھ کون آیا ہے۔“ جانو چلائی۔

شنراؤ چپ چاپ کام کئے گئی۔

”میں نے کہا ایلی آیا ہے۔“ جانو بولی۔

ہاں ہاتھ لگوں سے ملے۔ رضا تو امر تر جا چکا تھا۔ چلو ہم کی طرف ہی سہی یا بھا اور جاہ کے  
مڑا جائے۔ لیکن یہ محسوس کر کے کہ اس کا چہرہ ضبط کے باوجود بھیاںک دکھائی دے رہا ہے۔  
باز قریب کی طرف چلا گیا اور نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔

وہ سوچ رہا تھا میں کیا کروں؟ کیا کروں میں؟

شہزادہ شہزادہ نہیں تھی۔ کہاں وہ ہنسی کھیلتی مسکراتی ہوئی شہزادہ اور کہاں یہ عورت۔ ایسا  
لوں ہوتا تھا جیسے وہ ایک اجنبی عورت ہو جسے ایلہ نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ ہنسی تو وہ تھی مگر  
نہ کی وہ ہنسی کسی اور کے لئے مخصوص ہو چکی تھی اور پھر صفر کے لئے۔ ایلہ کے دل میں  
بہی ہنسی۔ اگر شہزادہ ویسے ہی ٹھکرا دیتی تو اسے تکلیف نہ ہوتی۔ کسی ایسے کے لئے ٹھکراتی  
رہی شیت کا مالک ہوتا۔ جس کی کوئی شخصیت ہوتی۔ کچھ بھی ہوتا لیکن صفر ایک خود غرض  
لڑکا۔ یہ سوچ کر اس کا دل ڈوب جاتا۔

اس وقت اس کی نگاہوں کے سامنے صفر ابھرتا۔ اس کی آنکھوں میں تحقیر بھری مسکراہٹ  
ملتی اور وہ ایلہ کی طرف دیکھتا۔

”میں نے تو کہا تھا بانٹ کر کھائیں کتنی منتیں کی تھیں کہ ہمیں بھی اس دلہیز پر بیٹھنے کی  
بات دو۔“ وہ قہقہہ لگاتا۔ ”لیکن تم کب سنتے تھے“ — پھر وہ اڑیاں اٹھا کر گلے لگتا  
لانا خدا تمہارا۔“ — اور یوں اشارے کرتا جیسے کہ رہا ہو۔ ”اب چھٹی کرو بھائی۔“  
— پھر وہ شہزادہ کی طرف متوجہ ہوتا اور دوسرا مصرع اسے مخاطب کر کے کہتا ”اے دلربا ہوں  
لڑکا۔“

مگر بچ کر بھی ایلہ کو سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ بہر حال ایک بات واضح تھی اس کا ایلہ  
ارٹا رہتا لیکن ہو چکا تھا۔ اسے جانا ہی ہو گا۔ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ  
لانے جائے۔ شاید کسی روز شہزادہ کے۔ تم خود مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ سبھی کچھ برداشت  
رہتا تھا لیکن یہ الزام برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے شہزادہ سے بے وفائی کی۔

چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے ثابت کر دی کہ شہزادہ اس سے بے وفائی کر رہی ہے لیکن اس  
کے ہاں کوئی ثبوت نہ تھا۔ بات تو واضح تھی۔ شہزادہ کی ہر حرکت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی  
انتہا توجہ صفر پر مرکوز ہو چکی ہے اور اب وہ ایلہ کو محض ایک رکاوٹ سمجھ رہی ہے۔ لیکن وہ  
چاہتا تھا کہ ڈرامائی انداز سے اس وقت ان کے سر پر جاکھڑا ہو جب وہ ایک دوسرے سے محبت کا

”مجھ سے یہ سوال پوچھنے کا کسی کو حق نہیں۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے  
نفرت کے شرارے نکل رہے تھے۔

”شہزادہ یہ تم کہہ رہی ہو۔“ وہ چلایا۔

وہ خاموش رہی۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں؟“

”میں کیا مجرم ہوں کہ جواب دیتی پھروں۔“

وہ چپ چاپ پھر سے کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ مشین چلانے لگی۔ دیر تک وہ دونوں چپ چاپ  
بیٹھے رہے۔

کچھ دیر کے بعد جانو کی نیچے سے آواز آئی۔

”یہ آگیا ہے صفر۔“ وہ بولی۔

”اچھا میں آئی۔“ یہ کہہ کر وہ فلاں نہیں بھرتی ہوئی میز ہیاں اترنے لگیں

ایلہ چپ چاپ اٹھا اور نہ جانے کدھر کو چل پڑا۔ اس کے حواس معطل ہو چکے تھے۔ اسے  
کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دماغ میں ایک بھیاںک خلا پھیل رہا تھا۔ اس وقت نہ اسے غم تھا نہ  
غصہ۔ اس کا ذہن ایک سادہ ورق میں تبدیلی ہو چکا تھا۔ اس کے ارد گرد چاروں طرف لامحدود  
وسعتیں پھیل گئی تھیں۔ اور ان میں ایلہ گویا کھو گیا تھا۔ وہ بوجھل اور بھیاںک خلا یوں جھول رہا  
تھا جیسے سمندر ہو۔ اس میں لہریں اٹھ رہی تھیں اور ایلہ کی ناؤ جھول رہی تھی۔ بہہ رہی تھی۔  
یسے جا رہی تھی۔ نہ بادبان تھے نہ چپو۔ نہ کوئی راستہ نہ منزل۔

سارا دن نہ جانے وہ کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔ محلے والے اسے دیکھ کر رک جاتے۔

”ایلہ ہے۔ کب آیا تو۔ ارے۔“ وہ چلاتے۔ ”یہ تجھے کیا ہوا ہے۔ اپنی شکل کی طرف تو  
دیکھ۔ بیمار ہے کیا؟“

پہلے تو اس نے یہ بات سن کر تعجب کا اظہار کیا۔ پھر اس نے کہنا شروع کر دیا۔ ”ہاں بھلا  
ہوں۔“

”کیا بیماری ہے؟“ وہ پوچھتے۔

”بخار آتا رہا ہے۔“ وہ جواب دیتا۔

لوگوں کو ایسے سوال کرتے دیکھ کر اس نے اپنا پروگرام بدل دیا۔ اس کا ارادہ تھا کسی

مطلوعِ سکوت طاری تھا۔ تمام آوازیں بند ہو چکی تھیں البتہ احاطہ میں چگاڑوں جیج رہی تھیں۔ سکوت کو اور بھی بھیاںک بنا رہی تھیں۔ احاطے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ شہزاد کے لئے بھی خاصا اندھیرا تھا۔ اندر چوبارے میں ایک چھوٹا سا دیا جل رہا تھا۔ جس کی مدھم مدھم بجائی کے ایک حصے میں پڑ رہی تھی۔

اگر صفر نے آتا تھا تو شہزاد نے دیا کیوں جلا رکھا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ شاید اس لئے کہ اس کی بجائے اس کے آنے میں اسے دقت نہ ہو۔ وہ کھڑکی پر نگاہیں جمائے سوچتا رہا۔ مسجد کی گھڑی نے بجنا شروع کیا اور وہ چونکا۔ دو بج گئے۔

پھر وہ دبے پاؤں نکلا اور شہزاد کے سرہانے آکھڑا ہوا۔ وہ بازو سرتلے رکھی بے خبر سو رہی تھی۔ اس کی عادت تھی۔ ایلی کا دل چاہا کہ اسے جگا دے اور پھر اس کے پاؤں پر سر رکھ کر دلائے لیکن اسے شہزاد کے قہقہے یاد آ گئے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایلی دکھی ہے۔ دکھی کی سبب ناراض ہی سہی اور وہ جان بوجھ کر صفر کے ساتھ قہقہے لگا رہی تھی۔ اور پھر جب وہ لڑکتی اس کے پاس آیا تھا تو کس بے اعتنائی سے اس نے کہا تھا۔ جانو اسے چائے پلا دے۔ یہ کی بھاری کو بھیک دی جاتی ہے۔

چند منٹ وہاں رک کر وہ شہزاد کے چوبارے میں داخل ہو گیا۔

وہاں وہ صندوقوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا۔ بہت رات بیت چکی اب تو صفر نہیں آئے گا۔ اسے اس بات پر دکھ ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کی سب سے بڑی خوشی بات پر منحصر تھی کہ صفر کھڑکی پھلانگ کر آجائے۔ اگر شہزاد کو جگائے اور شہزاد اس کے لئے پانی ڈال دے پھر ایلی چپکے سے باہر نکلے اور ان کے روبرو آکر کہے۔

”اب عرض ہے محترمہ۔“

اور پھر چپ چاپ اپنے گھر آجائے اور اگلے روز صبح سویرے ہی بیٹھ کے لئے علی پور کو بلا کر دس گھڑی نے تین بجادیئے۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ اس کی آرزو پوری نہ ہو سکے۔ شاید وہ اس لئے نہیں مل رہے تھے کہ ایلی وہیں تھا اور شہزاد کو ڈر تھا کہ کہیں بھانڈا پھوٹ جائے۔ پھر وہ اعلانِ قہقہے کیوں مارتی تھی۔ ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

بہر صورت کوئی ثبوت تو ضرور ہونا چاہیئے۔ شاید شہزاد کے ٹریک میں صفر کے محبت نامے ملے۔ صفر نے ضرور خط لکھے ہوں گے۔ جیسے وہ خود شہزاد کو لکھا کرتا تھا۔

اظہار کر رہے ہوں تاکہ وہ شہزاد کی بیوفائی اور اپنی مظلومیت کی دھماک بٹھا دے اور پھر ایک عاشق کی طرح ان کے راستے سے ہٹ جائے اور باقی ساری زندگی اس بے وفا محبوب کی یاد میں رو کر بسر کر دے۔

رات تک وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

## رت جگا

فیصلہ کرنے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ رات کے وقت وہ دونوں ضرور ملے ہونگے صفر نے اپنی کھڑکی سے پھلانگ کر شہزاد کے چوبارے میں آجاتا ہو گا۔ شہزاد ایلی ہی تھی اس کی ماں بیگم کہیں گئی ہوئی تھی۔ جانو گھر کا کام ختم کرنے کے بعد اپنے گھر چلی جایا کرتی تھی صرف شہزاد اور اس کی چار بچیاں چوبارہ میں رہ جاتی تھیں۔ پھر رکاوٹ کوئی تھی۔ وہ ضرور ملے ہوں گے ضرور۔

بارہ بجے تک وہ چپ چاپ پڑا رہا۔ اس نے ہمانہ بتایا جیسے سو رہا ہو۔ پھر وہ چپ چاپ اٹھ اور دبے پاؤں شہزاد کے چوبارے کی طرف چل پڑا۔ وہ اس دروازے میں جا کھڑا ہوا جو شہزاد کے کونے پر کھلتا تھا۔ اور حالات کا جائزہ لینے لگا۔ شہزاد کی بچیاں باہر صحن میں سوئی ہوئی تھیں اور وہ خود اندر کھڑکی میں کھڑی غالباً ”صفر سے باتیں کر رہی تھی۔ اسے یوں مصروف دیکھ کر وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا اور رابعہ کے خالی چوبارے میں جا کر چھپ گیا۔

وہاں کھڑا ہو کر وہ شہزاد کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اسے ان کی گفتگو کے متعلق کچھ علم نہ ہو سکا چونکہ وہ ان سے کافی دور تھا لیکن ان کے قہقہے ایلی کو غلطی دے رہے تھے۔ وہ کتنی خوش نظر آ رہی تھی۔

پھر دھننا! اس نے ہنسا موقوف کر دیا اور وہ زیر لب باتیں کرنے لگے۔ ضرور وہ لے لی تفصیلات ملے کر رہے تھے۔

تقریباً ”آدھ گھنٹے کے بعد شہزاد چلائی۔

”ہے۔ آدھی رات ہو چکی ہے اب مجھے نیند آئی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے آخری نند لگایا اور پھر باہر چارپائی پر آکر لیٹ گئی۔

دیر تک ایلی وہاں کھڑا رہا۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔

ہانہ خدا

مگر آکر بھی وہ سونہ سکا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد صبح ہو اور وہ کانڈ روشنی میں پڑھ سکے۔  
پڑ کے اس کانڈ پر سرٹے کی جگہ واضح طور پر صفر لکھا ہوا تھا اور اختتام پر شزاو۔ ایل  
نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی کہ اسے نفس مضمون کے متعلق کچھ علم ہو جائے لیکن وہ  
نوش بے حد مدہم تھے اور ان سے کوئی اندازہ نہ لگ سکتا تھا۔

مارادون وہ اس خط کو پڑھنے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ اس نے خورد بین مہیا کی۔ آئینہ استعمال  
کیا۔ اس کانڈ کی فوٹو لی اور آخرش اس پر سیاسی ملی تاکہ دباؤ سے بنے ہوئی الفاظ کی سفیدی واضح  
ہو جائے۔ لیکن اس کی کوئی ترکیب کامیاب نہ ہوئی۔

اس پر دفعتاً اسے غصہ آگیا۔ میں بھی کمینہ ہوں وہ سوچنے لگا۔ جو ثبوت مہیا کر رہا ہوں کیا  
شزاو کی ہر حرکت ایک واضح ثبوت نہیں ہے۔ کیا اس کا برتاؤ واضح ثبوت نہیں ہے۔ تو پھر  
ثبوت کیوں۔ یہ سوچ کر اس نے اہل کو بلایا۔

”اہل۔“ وہ بولا ”اہل۔ میں خان پور جا رہا ہوں۔“

”اچھا۔“ ہاجرہ کی باچھیں کھل گئیں۔ ”کب؟“

”آج رات کی گاڑی سے۔“

”آج“ وہ گھبرائی۔ ”اے ہے دو چار دن تو رہ لے۔“

”اہل تم بھی حد کرتی ہو۔ اگر وہ خوشی سے جاتا ہے تو روکو نہیں۔“ فرحت بولی۔

”تو خوشی سے جا رہا ہے ایل؟“ ہاجرہ نے پوچھا۔

”تو کیا مجبوری سے جا رہا ہوں۔“ ایل نے جواب دیا۔

”تو شزاو سے ناراض ہو کر تو نہیں جا رہا؟“ ہاجرہ بولی۔

”واہ اہل۔“ فرحت چلائی۔

”بے کوئی بری بات کر رہی ہوں کیا؟“ ہاجرہ نے معصوم انداز سے کہا۔

”تو بھی بڑی بھولی ہے اہل۔“

”مجھے نہیں آتیں ٹیڑھی باتیں۔“ ہاجرہ نے کہا ”بے کسی سے ناراض ہو کر کیوں جدا ہو  
لے۔“

اس نے شزاو کا صندوق کھول کر اس کی ہر چیز باہر نکال کر دیکھی لیکن اس میں کوئی خط  
تھا البتہ اس میں کئی ایک ایسی بیکار چیزیں پڑی تھیں جو کسی زمانے میں ایل نے اسے دی تھیں  
مثلاً ایل نے ایک مرتبہ شزاو کو ایک کھلونا دیا تھا۔ سیاہ لکڑی کا بنا ہوا ایک چلبلی کپڑا اور ایل  
نے یہ کپڑا دیتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

”جانتی ہو یہ کون ہے؟ یہ تمہارے میاں ہیں دیکھ لو۔“ پہچان لو۔“

اور شزاو نے قطعہ لگایا تھا۔

پھر وہ تسبیح تھی جو اند میرے میں روشن دکھائی دیتی تھی۔ اس کے علاوہ ٹریک میں شزاو نے  
اپنی پرانی پمپی ہوئی دو بنیاں سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔

جب بھی ایل شزاو سے ملتا تو وہ تقاضا کیا کہ شزاو اسے اپنی پرانی میلی بنیان دے۔ ایل کو  
شزاو کے جسم کی بو سے بہت محبت تھی۔ وہ اس کی پسین ہوئی میلی بنیان پہن کر بے حد صدمت  
محسوس کیا کرتا تھا کہتا تھا۔ یہ بنیان پہن کر میں محسوس کرتا ہوں جیسے تم مجھ سے بھل گئے ہو۔ اسی  
لئے شزاو اپنی پرانی بنیاں سنبھال کر رکھا کرتی تھی کہ ایل آئے تو اسے تنہا دے۔

ایل ان سب چیزوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے ان چیزوں کو دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا۔  
مایوس ہو کر اس نے صندوق بند کر دیا۔

دفعتاً اس کی نگاہ لیٹر پیڈ پر پڑی۔ ہائیں۔ اس نے سوچا، لیٹر پیڈ۔ شزاو نے تو کبھی لیٹر پیڈ  
استعمال نہیں کیا۔ جب بھی اسے خط لکھتا ہوتا تھا تو وہ اپنی بچیوں کی سکول کی کاپی سے ورق چٹا  
لیا کرتی تھی۔ پھر یہ پیڈ۔

اس نے پیڈ کو اٹھا لیا۔ اچھا خاصا خوب صورت پیڈ تھا۔ ابھی نیا ہی تو تھا۔ صرف پندرہ ایک  
ورق ہی چھڑے گئے تھے۔

ارے — وہ پیڈ اٹھا کر دیئے کے پاس جا بیٹھا۔ اوپر کے ورق پر الفاظ کھدے ہوئے نظر  
آ رہے تھے جیسے کسی نے پنسل سے کسی ورق پر کچھ لکھا ہو اور نچلے ورق پر دباؤ کی وجہ سے  
نشانات پڑ گئے ہوں۔

اس نے پیڈ کا اوپر کا ورق چٹا لیا اور اسے دیکھنے لگا لیکن روشنی کافی نہیں تھی اس لئے  
کچھ پڑھ نہ سکا بہر حال الفاظ واضح طور پر موجود تھے۔

اس نے وہ کانڈ اٹھایا اور دبے پاؤں چپ چاپ گھر واپس آگیا۔

”اگر وہی ہے میں۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

”ایک دن جانا ہی پڑتا ہے بیٹا۔“ میں بولی ”چلو اچھا ہی ہوا تو بھی کام کاج پر گئے گا۔“  
 ابلی کا سر جھک گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ان سب نے کوہر کی نوکری اس کے سر پر گرا  
 ۔۔۔ شرمساری اور ذلت سے لت پت وہ چل پڑا۔ اس کے قدم بوجھل ہو رہے تھے۔ گردن  
 ہائیرائٹ گیا تھا۔ سامنے ایک خلا تھا۔ ایک دھندلا تاریکی جو منہ کھولے بیٹھی تھی۔ دور  
 ہار اسی فون چلا رہا تھا۔  
 ملا خدا تمہارا۔ اے دلربا ہوں میں فدا۔

”تو پھر ان دونوں کو منادے۔“ فرحت ہنسنے لگی۔

”ہاں ہاں۔“ ہاجرہ بولی ”اس میں کیا حرج ہے۔“

”تو اس کی باتیں نہ سن میں۔“ ایللی نے کہا۔

”مجھے نہیں سمجھ میں آتیں یہ باتیں۔ میرا دل تو صاف ہے۔“ ہاجرہ بولی۔

”کچھ زیادہ ہی صاف ہے میں۔“ فرحت ہنسی۔

”چل میرے ساتھ شہزاد کی طرف۔“ میں نے فرحت کی بات پر غور کئے بغیر کہا۔

”نہیں میں چھوڑ اس بات کو۔“ ایللی گھبرا کر بولا۔

ایللی رخصت ہونے لگا تو جانو نے شور مچا دیا۔

”کچھ خبر ہے یا اپنی ہی دھن میں غرق رہو گی۔“ وہ شہزاد سے کہنے لگی جو اس وقت منور

سے باتوں میں مصروف تھی۔

”کیا ہے؟“ شہزاد بولی۔

”ایللی خان پور جا رہا ہے۔“

شہزاد نے قہقہہ لگایا ”تو پھر؟“

”اے میں کتنی ہوں واقعی وہ جا رہا ہے۔“ جانو چلائی۔

شہزاد پھر ہنسی۔ ”تو کیا کروں؟“ وہ بولی ”کیا گھوڑا گاڑی جوت کر لاؤں۔“

”بے کیا باتیں کر رہی ہے تو۔ ابھی کل تو —“ جانو رک گئی۔

”بہت منادیکھا میں نے۔“ شہزاد نے کہا ”اب نہیں —“

ایللی نے سنا۔ اس کے دل پر کسی نے گویا جلتی ہوئی میخ گاڑ دی۔

محلے کے چوگان میں محلے والیوں نے ایللی کو روک لیا۔

”کون جا رہا ہے میں؟“ ایک کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔

”اپنا ایللی ہے۔“ میں نے کہا۔

”جا رہا ہے۔ علی پور چھوڑ کر جا رہا ہے۔“ دوسری بولی۔

”ہے شہزاد کی کھڑکی خالی ہے۔“ ایک نے طعنہ دیا۔

”وہ ادھر دوسری کھڑکی میں کھڑی ہے نا۔ اس لئے۔“

”بے کتنی کھڑکیاں کھلتی ہیں اس کے چوبارے میں۔“





”کیوں؟“

”بس سگ ناتہ لیلے۔“ شام ہنسا۔ ”وہ میرے لئے بیس رک جائے تو پھر میں کس کا سگ ہوں کیا؟“

”رک گئی ہے؟“ ایلی بولا۔

”ہاں۔ اس نے یہاں نوکری کر لی ہے۔“

”اور تم؟“

”میں نے لاء کالج جان کر لیا ہے۔ کالج تو بمانہ ہی ہے۔“ شام نے آنکھ ماری۔ ”مطلب ہے جہاں فیزکس بوتل وہاں سلیکس بے بی۔“

شام ایلی کو اپنے نئے بورڈنگ میں لے گیا۔ لیکن کمرے میں پہنچے ہی جب اس نے روشنی میں ایلی کی طرف دیکھا تو چلانے لگا۔

”ارے تم۔ تمہیں کیا ہوا؟“

”مجھے۔“ ایلی نے جھوٹ موٹ دہرایا۔ ”کیوں مجھے کیا ہے؟“

”دایہ سے پیٹ چھپاتے ہو۔“ شام چلایا۔

”تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

شام کی آنکھ میں چمک لرائی۔

”بتاؤں؟“ وہ بولا۔

”ہاں بتاؤ۔“

”نفس س س س۔“ وہ چلایا۔ ”پنچر۔“

”پنچر“ ایلی نے بتادنی حیرت سے دہرایا۔

”وہ پنچر ہوا ہے کہ ساری ہوا نکل گئی ہے۔“ کیوں اب بولتے نہیں۔“ شام پلا۔

”بولو نا۔“

”سچ کہتے ہو۔“ ایلی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”ارے۔“ شام اس کی آنسو دیکھ کر گھبرا گیا۔

سب ختم ہو گیا۔ ”ایلی بولا ”وہ تخت وہ تاج و شہنشاہی سب۔ صرف میں باقی رہ گیا ہوں۔“

اور شاید میں بھی ختم ہو جاؤں۔“

”شام نے بات کو مذاق میں ٹالنے کے لئے کہا ”ابھی تک میرے ٹرنک میں ڈیر ہے اور ہلیاس، بھگوان کی سوگند بس ساری عمر ٹرنک میں پڑی رہے گی۔ نہ مجھ میں کھانے کی پٹا ہے نہ تم میں ہوگی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”نہیں شام“ ایلی بولا ”ساری زندگی چوہٹ ہو گئی۔ بساط ہی الٹ گئی۔ اب جینا بے کار

”میں کے بل وجود جنے جاؤ گے بیٹا۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ زندگی پٹ سے

ت ہو جائے گی۔ بساط پھر قائم ہو جائے گی۔ غم نہ کھاؤ۔“

”غم تو اب لگ گیا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”ایک بات پوچھوں۔؟“ شام نے کہا۔

ایلی نے اثبات میں اشارہ کیا۔

”اس نے بے وفائی کی۔ بس یہی بات ہے نا؟“

”ہاں۔“ ایلی بولا ”پہلے تخت پر بٹھایا۔ پھر مور چھل کرتی رہی اور پھر دھکا دے کر وہاں سے رانا۔“

”بس تم سمجھ لو رشی منی بن گئے۔ تمہارا کلیان ہو گیا۔“

”کیوں؟“

”جس نے کامیابی دیکھی۔ تخت پر بٹھایا گیا۔ مور چھل کروایا۔ وہ مکمل نہیں ہوتا جب تک

لوہج پر سے گرایا نہ جائے۔ سمجھ لو تمہارا کلیان ہو گیا۔ آؤ تمہیں بیڑ پلاؤں۔“ وہ چلانے

لگا۔ ”لوہج پر سے پنچر لگ جائے گا۔ پھر سے تخت پر بٹھا دے گی۔ مور چھل کرے گی۔ آؤ

لب لپٹا آپ سنبھالو۔“ شام کہنے لگا۔ ”جو تیاں کھانا تو اپنا پرانا پیشہ ہے۔ تم تو یوں شکل بنائے

نہ ہو جیسے پہلی بار جو تاکھایا ہو۔ ہمت کرو۔“

”مجھے نصیحتیں کرتا ہے بے سارے۔“ ایلی جلال میں آگیا۔

”کر لینے دو۔ کر لینے دو۔“ شام چلایا۔ ”تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ میری نصیحتوں سے تم نے کونا

لا ہے۔ لیکن اپنی بات بن رہی ہے۔ کر لینے دو نصیحتیں مجھے۔“

”کیوں؟“ ایلی نے پوچھا۔

”پیار ایلی۔“ شام بولا ”ساری عمر بیت گئی ہے۔ ہمیشہ مجھے ہی پنچر ہوتا رہا۔ ہمیشہ لوگ مجھے

میں آج آپ مع کر لیا تھا۔ از خود۔

ابھی کی چوتھی بیوی راجو، جو کسی زمانے میں دورا ہے کی رانی تھی اب چار دیواری سے ہونے لگی خاتون بن کر رہ گئی تھی۔

نہ اس کی نگاہوں میں شوخی تھی نہ انداز میں نمائش اور نہ چال میں منک جو نگاہوں کو دلتا ہے۔ اس کی یہ تبدیلی حیرت انگیز تھی۔ لیکن اس سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ اپنی ابھی تک اس قلعے کی تسخیر میں جوں کا توں منہمک تھا۔ اس کے علاوہ علی احمد کے گھر ہستیوں کی آمد و رفت قطعی طور پر ختم ہو چکی تھی۔ ممکن ہے علی احمد نے خود ہی اس کو دبا دیا ہو یا شاید اس کی وجہ راجو کا رویہ ہو۔ بہر حال علی احمد کا گھر اب ایک گھر تھا۔

ریش علی احمد تھے۔ شیم اور اس کی دو بیٹیاں۔ نانہ اور انجم، اور راجو کے دو بیٹے شیر

لی کے پلے شوہر سے تھا اور نصیر جو علی احمد سے تھا۔

ابھی کو ایک روز تو ایلی کھویا کھویا رہا۔ پھر محض اتفاق سے اس کی توجہ کتاب پر مرکوز اور شہزاد کو بھولنے کے لئے — اپنے کھوئے ہوئے تخت و تاج کو بھولنے کے لئے

میں لگو گیا۔

ملا وہ کتابیں پڑھنے میں مصروف رہتا اور جب مطالعہ سے اکتا جاتا یا جب سادی اور اب کے صفحات سے جھانک کر مسکراتیں، اشارہ کرتیں تو وہ کتاب پھینک کر جمیل کی بلاتا۔ اور جمیل فارغ ہوتا تو وہ اسے اپنے دوستوں کی محفل میں لے جاتا جہاں وہ تاش

میں ہانکتے اور حالات حاضرہ پر بحث کرتے۔

ملا کے ساتھی تو بہت تھے لیکن ان میں صرف دو ایسے تھے جنہوں نے ایلی کو اپنی طرف

لے کر لیا اور راز۔

نہ بڑے عمر کا دلا پتلا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ پچکا ہوا تھا۔ جسم مضنی تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی

تھیں۔ ناک اس حد تک ابھری ہوئی تھی کہ سوائے ناک کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن

انسان بے حد دلچسپ تھیں۔ ان میں رنگینی یا مزاح کی جھلک نہ تھی۔ اس کے برعکس ان

کی ہوتی اور نفی کو یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ کوئی اچھے کی بات کر رہا ہے یا اس کی شخصیت

میں یہ احساس ہی نہیں رہا تھا کہ وہ عورت ہے۔ غالباً ناامیدی اور مایوسی کی شدت کی وجہ سے

ی نصیحتیں کرتے رہے۔ بھگوان جانے یہ پہلا موقع ملا ہے جب میں تمہیں نصیحت کر سکا ہوں۔

دل چھوٹا نہ کرو۔

”بائے بائے۔“ ہوٹل میں پہنچ کر شام چلایا ”چار بوتل۔ اچھی سی لائٹ۔“ وہ ہنسلہ ”تیر کی

تخت پر بٹھائے اور مور جھیل کرے۔“

خانپور پہنچتے ہی سب سے پہلے اسے جمیل مل گیا۔ جب ایلی پلیٹ فارم پر قلی ڈھونڈ رہا تھا

اس نے دیکھا کہ بریک کے قریب جمیل کھڑا ہے۔

”ارے تم۔“ وہ حیرت سے جمیل کی طرف دیکھنے لگا۔

جمیل مسکرا رہا تھا۔

”میں تو یہیں ملازم ہوں۔ ابھی ٹھہروا کٹھے چلیں گے۔“

خانپور کے اس صحرائے اعظم میں جمیل ایلی کے لئے واحد نخلستان تھا۔ اگرچہ ایلی کو جمیل سے حجاب سا محسوس وہ رہا تھا۔ چونکہ جمیل صفر کا چھوٹا بھائی تھا اس لئے وہ جمیل پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی میں کیا المیہ واقع ہوا ہے۔

آج تک ایلی نے شہزاد کو راز بنائے رکھا تھا۔ اس نے شہزاد کے متعلق اپنے کسی دوست سے بات نہ کی تھی۔ لیکن اب اس عظیم شکست کے بعد اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ہر کسی کو راز کر اپنی کٹھانٹائے اور راہ چلتوں کو بتائے کہ اس نے ایلی سے کیا سلوک کیا ہے۔ ہرے لے۔ کو خبردار کرے کہ کبھی کسی عورت پر بھروسہ نہ کرے کبھی اس کی محبت پر اپنی خوشی کا انحصار

رکھنا۔ لیکن ایلی یہ بات جمیل سے نہیں کر سکتا تھا۔ صفر کے چھوٹے بھائی سے یہ بات کرنا اسے گوارا نہ تھا۔

## محفل

علی احمد کے گھر میں کئی ایک تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔

مثلاً ان کی تیسری بیوی شیم جو کشمیر کے سیب کھا کھا کر پلی تھی۔ اور علی احمد کے گڑ

بیان کے مطابق بذات خود ایک سیب تھی اب قطعی طور پر اپنی شخصیت کھو چکی تھی۔ شیم

سیب اب گل سڑ گیا تھا۔ صرف یہی نہیں وہ اس حد تک اعتراف شکست کر چکی تھی کہ اب

میں یہ احساس ہی نہیں رہا تھا کہ وہ عورت ہے۔ غالباً ناامیدی اور مایوسی کی شدت کی وجہ سے

”ہاں یار۔“ وہ سنجیدگی سے کہتا ”مجھے احساس نہ تھا کہ میں اتنی باطنی بات کر رہا ہوں۔“  
 تو کسی ہی بن سوچے سمجھے برسبیل تذکرہ کچھ کہنے کے لئے بات کر رہا تھا۔  
 مثلاً ”اگر وہ دفعتاً خاموش ہو جاتا تو جمیل پوچھتا:  
 ”کیوں نفی! تم کس سوچ میں پڑے ہو؟“  
 نفی چوکتا ”کیا میں واقعی سوچ میں پڑا تھا؟“  
 ”ہاں ہاں۔“ راز چٹکی بجا کر گنگنا تا ”کس سوچ میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا؟“  
 اس پر نفی چیخا ”یار اس کا اگلا مصرع کیا ہے؟“  
 راز اپنے آپ پر کیفیت طاری کر کے ”آنکھوں میں مستی پیدا کر کے دوسرا مصرع گاؤ۔“  
 ”دلبر کا کما کر ٹایا دل کا کما کر نہ۔“  
 ”انہوں۔“ نفی چلاتا۔ ”بات نہیں بنی۔ کش کش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“  
 ”کرنا۔ اور کیا؟“

گھونٹ

نفی کے مشاغل بے حد دلچسپ تھے۔ وہ حقہ پیتا تھا۔ چائے کا شوقین تھا۔ بحث میں بڑے  
 دن سے حصہ لیتا تھا۔ شطرنج اور تاش کھیلتا تھا۔ شعر کہتا تھا اور فرصت کے اوقات میں کپڑے پر  
 لائی گئی سے رنگین چیزیاں کاڑھتا تھا اور ہر رات بیگم کو پیتا تھا۔  
 راز کو گانے کا شوق تھا۔ جب وہ گاتا تو اس کی آنکھوں میں عجب مستی چھلکتی۔ برج کھیلنے کا  
 ذوق تھا بشرطیکہ سٹیکس سے کھیلا جائے اور شوق کے باوجود ہارنے لگتا تو دفعتاً ”یا تو اسے کام یاد  
 ہانا اور یاد دے ہی کھیلتا چھوڑ دیتا۔ اس کی باتیں رنگین ہوتی تھیں۔ اپنے والد صاحب کے  
 خلق قصبے سنانے کا ضبط تھا جو بنگال کی طرف کسی علاقے میں بڑے عمدے پر مامور تھے۔  
 جمیل ایک خاموش لڑکا تھا لیکن اس کا دل جذبات اور ذہن خیالات سے بھرا ہوا تھا۔ وہ چاہتا  
 تھا کہ اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرے۔ لیکن جہاں تک بات کرنے کا تعلق تھا اس پر  
 ایک جلب مسلط تھا۔ اس حجاب کی وجہ سے اس کی طبعی جولانی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ غالباً اس کی  
 شائستگی کمتری کی شدت تھی۔ وہ ملنسار تھا لیکن اس کی یہ عادت گونگے پن کی وجہ سے اذیت  
 پہنچا دیتی تھی۔ پھر ایک روز اسے اتفاق سے اس اذیت سے نکلنے کا ایک راستہ مل گیا اور اسے  
 گویا کہ شراب کے چند گھونٹ پینے سے وہ اپنے گونگے پن کو دور کر سکتا ہے اور سوسائٹی  
 میں ایسے ہی چمک سکتا ہے جیسے راز چمکاتا تھا۔ غالباً اس سے پہلے اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس  
 لڑکے اور ذہن جذبات و خیالات سے بھرے ہیں۔ اس روز اسے اپنے خیالات و جذبات اپنی زبان  
 سے نکال کر حیرت ہوئی اور اسے یقین ہو گیا کہ اس نے چھپے ہوئے خزانے کی کنجی پالی ہے۔

”تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کیا سوچ رہے تھے۔“ جمیل اسے چھیڑتا۔  
 ”ٹھہرو۔“ نفی چیخا ”ایک سیکنڈ۔“ ہاں ٹھیک ٹھیک سوچ رہا تھا میں واقعی۔  
 رہا تھا کہ کیا واقعی مجھ میں اس قدر ضبط ہے کہ دو دن بیوی کو پیٹے بغیر رہ سکوں۔“  
 معصومیت سے کہتا جیسے بیوی کو پیتا خاوند کے لئے نارمل بات ہو بلکہ اس کا فرض ہو۔  
 یا راہ چلتے ہوئے دفعتاً ”نفی رک جاتا۔“ ”یار! عجیب بات ہے۔“ وہ گویا اپنے  
 مخاطب ہو کر کہتا۔ ”ہے نا عجیب بات۔“  
 ”کیا بات ہے؟“ ابلی پوچھتا۔  
 ”یار حد ہو گئی۔“ نفی سر جھکاتے ہوئے سنجیدگی سے کہتا۔ ”یہ جو ٹانگ شائستگی  
 ہوئی حویلی ہے نا۔ یہ سامنے میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اس حویلی سے پورے  
 ہوں اور اس کا ایک ایک کرا اور والان جانتا ہوں۔ حالانکہ میں کبھی اس کے اندر  
 ہوا۔ بلکہ اس سے پہلے میں نے اسے باہر سے بھی کبھی نہیں دیکھا۔ اس راستے  
 نہیں میں۔ ہے نا عجیب بات۔“ یہ کہہ کر نفی آنکھیں بند کر لیتا اور پھر کہتا: ”یار!  
 ڈیور می ہے۔ دو دروازے ہیں۔ باباں دروازہ ایک کمرے میں کھلتا ہے۔ اس  
 والان ہے۔ والان میں ہرن کے سینک دیوار پر لگے ہوئے ہیں۔“

فی اور شاید اس سگودنے ایللی کو تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔

ایللی کی آمد پر جیل کی تمام توجہ ایللی پر مرکوز ہو گئی۔ وہ اس کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کا نگار رہتا تھا۔ اپنی گونگی محاس سے اس کی تنگی اور اضطراب کو دور کرتا اور ہر وقت اس کے ہاتھ ریت اس پر جیل کی بیوی جو مہما "خاندان کو جذب کر لینے کی قائل تھی۔ بزمی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیل کے گھر میں مشکلات پیدا ہو گئیں۔

گھر میں اسے کتابوں میں منہمک دیکھ کر علی احمد ہنستے۔

"ہیکو نا نصیر کی ماں! ہمارا ایللی بھی عجیب شے ہے۔ جب پڑھنے کے دن تھے تب سینما دیکھتا راجا اب جب پڑھنے کے دن ختم ہو چکے ہیں تو کتابوں کا کیرا بنا ہوا ہے۔ ہی ہی ہی۔" وہ ہنستے۔ "کیوں ایللی؟"

"اب اللہ رکھے جو ان ہو گیا ہے۔" راجو کہتی۔ "اب اس کی شادی کی فکر کیجئے نا۔" "یہ کسی کی شادی کا فکر کیوں کرنے لگے۔" شیم بولتی "یہ تو اپنی ہی ٹانگ جھانک میں لگے رہے ہیں۔"

"تو نصیر کی ماں۔" وہ ہنستے۔ "اسی کے لئے ٹانگ جھانک کرتا ہوں۔ تم سمجھتی ہو اپنے لئے لڑاؤں۔ لا حول ولا قوۃ" وہ چلاتے۔

"وہیں کیوں نہیں کر دیتے جہاں وہ چاہتا ہے۔" راجو بولتی۔

"وہاں کیسے کر سکتے ہیں۔" علی احمد جواب دیتے۔

"کیوں نہیں کر سکتے؟"

"وہ لوگ تو بہت بڑے ہیں اس لئے۔"

"پھر کیا ہوا؟" شیم بولتی۔

"میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔" راجو ہنستی۔

"بھئی تمہارے ہی بھلے کی سوچتا ہوں۔" علی احمد منہ پکا کر لیتے۔

"تمہارے بھلے کی۔ وہ کیسے؟"

"بھئی۔" علی احمد جواب دیتے۔ "اگر وہاں ایللی کا بیاہ کر دوں تو کیا وہ تمہاری قدر کریں گے لوگ! مل! حمیس! دیکھ کر ناک بھوں چڑھائیں گے۔ کہیں گے یہ کیا چیز ہے نہ شکل نہ صورت نہ نہ ہاتھ نہ تھانہ نہ تہذیب نہ تعلیم۔ یہ کیا چیز ہے ہی ہی ہی۔" وہ ہنستے "تو بھی شیم! تم ہی

نقی کو شراب سے خاص دلچسپی نہ تھی چونکہ اس کی شخصیت ہی میں مسک کا عنصر تھا۔ راز کے لئے شراب محض ایک پھلجھڑی کی حیثیت رکھتی تھی جس سے کھیلنا اسے پسند تھا لیکن اس پھلجھڑی کی حیثیت محض تفریحی تھی۔ وہ اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے اس کا محتاج نہیں تھا۔ ایللی کے لئے شراب کا اثر خاصہ تکلیف دہ ہوتا تھا پی کر اسے وہ دن یاد آ جاتا جب وہ اور ناصر ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ جب ناصر نے چلا کر کہا تھا۔

"میرا دو بڑے۔"

اور ایللی کو یہ فکر وامن گیر ہو گیا تھا کہ شراب پلانے سے ناصر کا مقصد صرف یہ ہے کہ ترمگ میں آکر ایللی سلوی کے اس رومان کا راز کہہ دے اور ایللی نے عزم کر لیا تھا کہ چاہے وہ نشتے میں دھت ہی کیوں نہ ہو جائے وہ ناصر کو حقیقت حال سے آگاہ نہیں کرے گا اور یہ سوچ کر وہ پتھر بن گیا تھا۔ اس کے بعد جب کبھی اسے شراب پینے پر مجبور کیا جاتا تو اس پر وہی کیفیت ملاری ہو جاتی۔ وہ محسوس کرتا جیسے اس کے ساتھی ناصر ہوں اور اس کا راز پالنے کے لئے بروستی پلا رہے ہوں۔

ایللی نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو کئی بار سمجھایا تھا کہ یہ خیال غلط ہے وہاں کوئی ناصر نہیں۔ پینے سے مقصد صرف تفریح ہے لیکن سب بیکار۔ گلاس ہونٹوں سی لگاتے ہی خواہ مخواہ وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کہیں شہزاد کی بات نہ چھیڑ دے۔ بہر حال شراب بیشہ کے لئے اس پر حرام ہو چکی تھی۔ اس کے لئے وہ گھونٹ تلخ بن جاتا۔ جس کے بعد اس پر جود ری ہو جاتا۔ جسم منوں بوجھل ہو جاتا۔ سر چکراتا۔

ایللی کے لئے جمیل، نقی اور راز کی محفلیں یوں تھیں جیسی کسی طوفان زدہ دولتی ہوئی کشی کے لئے کنارہ ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر وقت اسی محفل میں بیٹھا رہے لیکن جب وہ وہاں پہنچتا تو نہ نے کس اصول کے تحت اسے اپنی گزشتہ تباہی پھر سے یاد آ جاتی اور وہ محفل میں بیٹھ کر پھر اپنے آپ میں کھو جاتا۔ کنارے پر پہنچ کر پھر سے طوفان بیتا شروع کر دیتا۔

ایللی نے اپنا راز جمیل سے نہ کہا لیکن جمیل کے طرز عمل سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سب جانتا ہو۔ سمجھتا ہو اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ خود جمیل نے کبھی شہزاد کی بات نہ کی تھی۔ جمیل نے ایللی کو کبھی نہ بتایا تھا کہ وہ دکھی ہے۔ شاید اس لئے کہ اسی مزید دکھ نہ۔ جمیل نے ایللی کی آمد پر اس کی کیفیت بھانپ کر خاموش، بے لاگ ہمدردی کی گود پھیلا دی

دیپالپور میں اس کا ساتھی کوئی نہ تھا۔ کوئی دوست نہ تھا اس لئے وہ اکیلا ریت کے تودوں کی طرف نکل جاتا اور پھر کسی ٹیلہ نما تودے کے سائے میں بیٹھ کر ماضی کی یاد میں کھو جاتا۔

ان دونوں وہ سالوی کو بھول چکا تھا۔ اس کے صبح و شام شنراؤ کے خیال سے پر تھے۔ شنراؤ کی زندگی پر یوں مسلط و محیط تھی کہ کسی اور کی گنجائش نہ رہی تھی۔ سالوی کا خیال — ایک سرت بھرا جام تھا۔ جس میں رنگ تھا لطافت تھی۔ اس کے برعکس شنراؤ کے خیال میں تلخی تو دم تھا اور اسی لئے شدت تھی۔ شنراؤ نے اسے بے عزت کر کے اپنی محفل سے نکل دیا۔ اس کے احساس خودی پر کاری زخم لگایا تھا جسے یاد کر کے وہ تڑپتا تھا اور اس تڑپن، گھٹاؤ اور ریت کی وجہ سے شنراؤ کا خیال اس کے دل میں گھر کر چکا تھا۔ ایلی دراصل ایک غم خور نوجوان اور اس کا ایمان تھا کہ عشق کو محرومی اور غم سے تعلق ہے — اس کے برعکس سرت اور ٹی ٹی تفریق یا عیاشی کا نام ہے۔ شنراؤ سے ایلی کی محبت اب عشق میں بدل چکی تھی۔ اس نے آجیں بھرت ریت کے تودوں تلے بیٹھ کر روٹا، کروٹیں لیتا اس کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔

اس کے علاوہ شنراؤ کا خیال آتے ہی اسے اپنے رقیب کا خیال آجاتا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوں گے۔ نگاہوں میں نگاہیں ڈالے ہاتھ میں ہاتھ دیئے وہ ہنس رہے ہوں گے۔ اشاروں میں باتیں کر رہے ہوں گے عمد و بیان — اب وہ مل رہے ہوں گے۔

ایلی کے دل پر ایک چوٹ لگتی۔ وہ گھائل ہو کر تڑپتا۔ اس تڑپنے میں اسے لذت محسوس لگتا شاید دل ہی دل میں وہ انتقام لینے کی آرزو کو پال پوس رہا ہو۔

دیپالپور میں پہلی مرتبہ اسے بچوں کو پڑھانے کا موقع ملا۔ لیکن وقت یہ تھی کہ وہاں کے غلطی طور پر بچے نہ تھے۔ نویں جماعت کے طلبہ ایلی سے زیادہ طاقت ور اور قدم میں لمبے تھے۔ پہلی مرتبہ جب وہ جماعت میں داخل ہوا تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لیکن جلد ہی وہ اپنے ہمکنار کو گھیرا اسے اتنی فرصت نہ تھی کہ دوسروں کے متعلق سوچے۔

اس کے ہم کار اساتذہ سب کے سب گویا ایک سانچے میں ڈھلے تھے۔ ان کی چال ڈھال، ہال میں ایک رسمی اور مصنوعی وقار تھا۔ ان کی حرکات بھدی اور بے جان تھیں۔ اور ان کی نیت ایک ہی سمت میں چلتے تھے۔ ایلی نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ سب کو لوہے کے تیل

انصاف کرو۔ میرا کیا ہے۔ اپنا گزار تو ہو جائے گا۔ چند جماعتیں بھی پڑھی ہیں۔ اچھی بری بات بھی کر لیتا ہوں لیکن نصیر کی ماں کا کیا ہو گا۔ ہی ہی ہی۔ اب نہیں بولتی۔ ہو گئی بولتی بند۔ ان کا تقہ گو بختا۔

”آپ سے کون سر کھپائے۔“ راجو جواب دیتی اور پھر اٹھ کر اندر چلی جاتی۔ اس پر علی ابو بھی اپنی میلی دھوئی سنبھالتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑتے۔

”اب دے نا جواب۔ کیوں نصیر کی ماں۔“

”نہ میں نہیں دیتی۔“

”کیسے نہیں دے گی۔ ہی ہی ہی۔“ وہ ہنستے۔

”چھوڑو بھئی۔“ اندر راجو تنک کر نخرے سے کستی۔

”حافظ قرآن ہوتی تو چھوڑ دیتے لیکن تو کیا سمجھ گی اس لطیف اشارے کو۔ ذات کی ہوئی رنگر پلی دولت پور میں۔ ہی ہی ہی۔“

دھنستا، ٹھیس اور اس کی دونوں بچیاں ناظمہ اور انجم محسوس کرتیں کہ ٹین کا سپانی نمودار ہو رہا ہے اور وہ گھبرا کر کھسک جاتیں اور اندر اپنے کمرے میں جا پناہ لیتیں اور ایلی کو سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ اور وہ اٹھ کر جیل کی طرف چل پڑتا۔

## دیپال پور

چار ایک ماہ خانپور کے بعد ایلی کی تعیناتی دیپالپور ہو گئی۔

دیپالپور ایک وسیع صحرا تھا جس میں یہاں وہاں دور دور مکانات بنے ہوئے تھے۔ اس وسیع صحرا کو دیکھ کر ایلی نے محسوس کیا کہ جیسے بطن تلاب میں آ پینچی ہو۔ ایلی ذہنی طور پر خود ایک ویرانہ تھا دیوانہ ویرانے میں مل گیا۔ اسے ریت کے اس پھیلاؤ کو دیکھ کر سکون سا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے گھر آ گیا ہو۔ وہاں پہنچ کر ایلی نے جانا کہ خانپور میں محفل جما کر اپنے آپ کو بھلانے کی کوشش غلطی تھی۔ اس کی زندگی میں دورخی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ دل کے ویرانے کو بھولنے کے لئے نکلستانوں کا تلاش تھا۔ دیپالپور پہنچ کر اس نے شدت سے محسوس کیا کہ اپنی اصلیت کو بھولنے کی کوشش سے سکون حاصل نہیں ہوتا بلکہ اپنی اصلیت میں ڈوب جانے سے حاصل ہوتا ہے۔ اسے تسلیم کر لینے میں راحت ہے جھٹلانے میں نہیں۔

ایلی۔ اگرچہ وہ فقط میٹرکولیت تھا لیکن نہایت اچھی انگریزی لکھتا تھا اور ایلی کو یہ جان کر  
 بتائی کہ محمود کنسٹرکشنز آفسورڈ ڈکشنری کو دو مرتبہ یوں پڑھ چکا تھا جیسے ناول پڑھتے ہیں۔  
 چند ماہ پہلو پر رہنے کے بعد ایلی کو دھرم سالہ بھیج دیا گیا جہاں صحرا کی جگہ پہاڑوں نے لے  
 اور تودل کے نیچے بیٹھنے کی بجائے وہ چیل اور دیواروں تلے بیٹھ کر آہیں بھرنے میں مصروف  
 ہو گیا۔

دھرم سالہ سکول میں وہ اکیلا مسلمان بچہ تھا۔ چونکہ فارسی کا مولوی چند ایک ماہ ملازمت  
 کرنے کے بعد لمبی رخصت لے کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہاں پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ وہ  
 مسلمان ہے۔ اس سے پہلے ایلی نے کبھی مذہب کے نقطہ نظر سے زندگی کو نہ دیکھا تھا بلکہ جہاں  
 تک مذہب کا تعلق تھا وہ س سے قطعی طور پر کورا تھا۔ اگرچہ دسویں جماعت میں اس نے کئی  
 ایک روزے رکھے تھے اور زندگی بھر وہ عید کی نماز پڑھنے جاتا رہا تھا۔

مرف علم ہی کی بات نہیں جذبے کے لحاظ سے بھی وہ مسلمان نہ تھا۔ پہلی مرتبہ جب منصر  
 نے اس کے دہرہ اپنے اسلامی جذبے کی وضاحت کی تھی تو اسے بات سمجھ میں نہ آئی تھی اگرچہ  
 بات کی رنگینی سے متاثر ہوا تھا۔

اس روز وہ دونوں سفید منزل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ منصر نے جذبہ اسلام کی بات کی تو ایلی  
 کی انہی گل گئی۔ چونکہ منصر میں کوئی بات بھی اسلامی رنگ کی نہ تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ نماز  
 نہیں پڑھتا تھا۔ روزے نہیں رکھتا تھا اور عاشق مزاج تھا۔

ایلی نے طوا "منصر سے کہا:

"اچھا تو آپ مسلمان ہیں؟"

"بالکل۔" منصر جوش میں آکر بولا۔ "الحمد للہ کہ میں مسلمان ہوں۔"

"مجھ میں نہیں آتا۔" ایلی نے کہا۔ "آپ کیسے مسلمان ہیں۔"

"ٹھہریے۔" منصر ایک سیکنڈ کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "دیکھئے اگر اس وقت چھت  
 ہن ہائے اور جبرائیل اتریں اور آکر مجھ سے کہیں۔ مجھے باری تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ فرمایا ہے  
 کہ انصار منصر کو ہمارا اسلام پہنچا دو اور کہو کہ اسلام جھوٹا مذہب ہے اور عیسائیت سچی ہے۔ تو میں  
 جبرائیل سے کہوں گا کہ باری تعالیٰ کو میرا سلام دو اور کہو حضور کا ارشاد گرامی موصول ہوا۔  
 کہ کاکم مر آنکھوں پر لیکن انصاری منصر مسلمان ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔"

سارے مدرسے میں صرف ایک شخص تھا جس کا انداز مختلف تھا۔ اس کا نام محمود تھا اور  
 سکول کا کلرک تھا۔ شاید اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ وہ استاد نہ تھا۔ تو کیا استاد کا وہ رویہ اور  
 انداز بچوں کو پڑھانے کے مشغلے کی قیمت تھی جو وہ ادا کر رہے تھے۔ ایلی کمری سوچ میں پڑ گیا  
 اس کے علاوہ محمود کی عمر بہت چھوٹی تھی۔ وہ عنوان شباب میں تھا۔ اگرچہ اس کی شکل ہی  
 چکی تھی اور ایک بچی بھی تھی۔ محمود کا قد چھوٹا تھا اور اس کا جسم گٹھا ہوا تھا۔ بال گٹھے اور بھر  
 کالے تھے رنگ میلا میلا سا تھا۔ بھنوں میں گھٹی تھیں۔ پیشانی سے شدت کا اظہار ہوتا تھا  
 ہونٹوں میں شرارت دہی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غصہ جھلکتا تھا اور بھوؤں سے شوقی اور لالہ  
 شپکا اور ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ روی ٹوپی جو وہ پہنتا تھا اور نمازیں جو وہ باقاعدہ پڑھتا تھا محسوس  
 جھوٹ تھیں۔

محمود کے کردار کا سب سے بڑا جزو جذبہ اور اسکی شدت تھی۔ یہ جذبہ گہری کے ہند  
 کی طرح مذہب اور عورت کے درمیان گردش کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں بے باک  
 ذہانت تھی۔

محمود سے مراسم پیدا ہونے کی وجہ محض یہ تھی کہ ایلی کو جو مکان رہنے کے لئے ملا وہ محمود  
 کے مکان کے بالکل قریب تھا۔ ابتدا میں ایلی نے محمود کے لئے کوئی جاذبیت محسوس نہ کی تھی۔  
 غالباً نہ ہی ایلی اسے متاثر کر سکا تھا۔ چند ایک مرتبہ ان کی ملاقات ہوئی۔ پھر محمود نے آنا  
 شروع کر دیا۔ محمود کو صرف دو چیزوں سے دلچسپی تھی۔ ایک تو ایلی کی کتابوں سے اور دوسرا  
 اس کے مکان کے جنرل انفریوے۔ چونکہ اس کے چوبارے سے محلے کے بیشتر مکانات دکھائی  
 دیتے تھے۔ محمود کو عورتیں دیکھنے کا شوق تھا اور عورتوں کے لئے اس کی شخصیت میں ایک ذوق  
 جاذبیت تھی۔ محمود کو دیکھ کر وہ چڑچاٹیں۔ انہیں یوں غصہ آنے لگتا جیسے انہیں چھینا گیا ہو۔  
 پھر نہ جانے کس اصول کے تحت وہ غصہ دفعتاً روپ بدل لیتا اور عورت محمود کو لے کے  
 بڑی بے باکی سے باہر نکل آتی۔

ایلی کو محمود کی اس خصوصیت کا نہ تو علم تھا اور نہ اس سے کوئی دلچسپی تھی۔ ان کے ملاپ  
 کی تمام تر وجہ انگریزی نہایت تھی۔ اگرچہ وہ فقط میٹرکولیت تھا لیکن نہایت اچھی انگریزی

”چہا تم جاؤ۔ کمند۔“

کمند بھی چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

ایلی کے دل پر ایک نہیں لگی۔ اس نے جماعت کی طرف دیکھا۔ سبھی لڑکے سر اٹکائے بیٹھے۔

ایلی کی نگاہوں سے گویا پردہ ہٹ گیا۔

”میں مسلمان ہوں۔“ نہ جانے کون اس کے دل میں چیخ رہا تھا۔

”اللہ کہ میں مسلمان ہوں۔“ آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جماعت سے باہر نکل گیا۔

اگلے روز ابھی وہ رام دین کے بھنور میں ڈبکیاں کھا رہا تھا کہ ڈاکیا آگیا اور اس نے ایک

ایلی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ لفافے پر غیر مانوس خط میں اس کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ نہ جانے کس کا

پتہ ہے۔ پتہ بھی تو کئی ایک لکھے ہوئے تھے۔ علی پور کا پتہ۔ خانپور کا پتہ اور دھرم سالہ کا۔ جا

ہیں لگی ہوئی تھیں۔

اس نے لفافہ کھولا۔ ایک چھوٹے سے کاغذ پر سرخی میں ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں

اچھا کیا کہ مجھ کو فراموش کر دیا

اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر دفعتاً اسے خیال آیا اور اس نے لفافے کی مہر پر پڑھنے کی

ٹک کی۔ لفافے کی پشت پر صاف طور پر مہر لگی ہوئی تھی۔ گرد کل بیٹھ۔

”کرے۔“ اس کا دل ڈوب گیا۔ وہ خط کو سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔

عجب کی سیانی تھی۔ نہ وہ سرخ تھی نہ — شعر کے نیچے ایک وجہ سا پڑا تھا۔ دفعتاً

خیال آیا وہ۔ خون۔ پھر اسے معلوم نہیں۔

”جسہ لک۔ وہ خلا۔“

لا بھل گیا کہ وہ رام دین ہے۔ کرے کی کانٹس پر سلاوی کی مورتی رقص کرنے لگی۔ وہ

ماہرست بھری حرکات سے عاری تھا۔ اس کے بال کھلے تھے۔ سیاہ لباس زیب تن تھا۔

ماہرست حزن و ملال تھا۔ نرت میں اداسی اور غم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

اس کے بعد ایلی کا خیال سلاوی پر مرکوز ہو گیا۔ شہزاد کی صورت دھندلی پڑتی گئی۔ صفدر کے

جہان معنی ہوتے گئے:

ایلی اس نقطہ نظر سے قطعی طور پر ناواقف تھا۔ صرف ناواقف ہی نہیں اس لئے اس نے ایسے جذباتی نقطہ نظر کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہ تھی۔ خصوصاً مذہب کے بارے میں۔ اس کے برعکس جذباتی طور پر وہ مسلمان ہونے پر شرمندگی محسوس کیا کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مذہبی نقطہ نظر کا قائل ہونا ذہنی وسعت کے فقدان کا اظہار کرنے کے مترادف ہے۔ اسی وجہ سے وہ نہایت طور پر مذہب سے بے تعلقی اور بے زاری کا اظہار کرنے کا دلدادہ تھا۔ اور کفر و الحاد کی بات کر میں دلچسپی لیا کرتا تھا۔

## رام دین

دھرم سالہ میں پہلی مرتبہ ایلی کو احساس ہوا کہ وہ مسلمان ہے۔

اس روز وہ حسب معمول پڑھا رہا تھا۔ پڑھاتے ہوئے اس نے پیاس محسوس کی۔

”دین محمد۔“ وہ چلایا۔ چونکہ اس کی جماعت میں صرف ایک مسلمان لڑکا تھا جو اسے پانی

کر دیا کرتا تھا۔

اس روز دین محمد حاضر نہ تھا۔

”رام لال۔“ وہ بولا۔ ”مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔“

رام لال جوں کا توں اپنے ڈسک پر کھڑا رہا۔

”تم جانتے نہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”جی ماسٹر جی۔ میں ہندو ہوں۔“

”تو کیا ہوا؟“ ایلی ہنسنے لگا۔

”جی میں بھر شٹ ہو جاؤں گا۔“

ایلی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ”دیکھو رام لال۔“ وہ اسے سمجھانے لگا۔ ”اگر تم میرے ہاتھ کا

پانی پیو گے تو بے شک بھر شٹ ہو جاؤ گے لیکن اگر تم مجھے پانی لا دو تو اس میں بھر شٹ ہونے کا

کیا بات ہے؟“

اس پر بھی رام لال جوں کا توں کھڑا رہا۔

”جاؤ نا۔“ ایلی کو غصہ آگیا۔

”جی میں بھر شٹ ہو جاؤں گا۔“ وہ بولا۔



”ٹھیک ہے۔ اگر وہ صغیر کو چاہتی ہے تو ٹھیک ہے بلکہ اور بھی اچھا ہوا۔ جن مہینوں  
لاکھوں پائے۔“

سانے سادی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ دھرم سالہ کے سرسبز پہاڑوں پر دوڑ رہی تھی۔ اسے  
بلا رہی تھی۔ ایللی نے سونا اٹھالیا۔ کندھے پر بیگ ڈال لیا اور باہر نکل گیا۔

اسی طرح اس نے دو ماہ بسر کر دیئے۔ وہاں وہ صرف دو ماہ کے لئے بھیجا گیا تھا۔ لاہور  
پہاڑوں کی خاک چھانتا رہا۔ سادی کے ساتھ وادیوں اور چوٹیوں پر گھومتا رہا۔

وہ اسے کہتا: ”نہیں نہیں سادی۔ میں نے تمہیں فراموش نہیں کیا۔ کیسے فراموش کر سکا  
ہوں لیکن کیا کروں۔ میرے بس کی بات نہیں۔ کاش کہ تم والد صاحب کی رضامندی کی شرط نہ  
لگاتیں۔“

اور سادی جواب میں کہتی: ”میرا بس بھی تو نہیں چلتا۔ میں کیا کروں۔“

اور پھر وہ دونوں ہانہ میں ہانہ ڈال کر چل پڑتے جیسے اس مجبوری کو بھولنے کی کوشش میں  
سرگرداں ہوں۔

### ہیڈ ماسٹر

دھرم سالہ کے بعد اس کی تعیناتی جلاور میں ہو گئی اور وہ جلاور چلا آیا۔ جلاور لاہور کے  
قریب ایک مشہور قصبہ ہے۔ وہاں کا مدرسہ نہایت فراخ اور خوبصورت تھا اور اس کے ساتھ  
بہت فراخ گراؤنڈ اور باغ اور پارک ملتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک کالج ہو۔

جب پہلے روز اس نے سکول کا ہیڈ دیکھا جس میں گیارہ بیک پاپ بنیں بن رہی تھیں۔  
ایللی پر نشہ ساطاری ہو گیا۔

سب سے حیران کن چیز جو جلاور اسکول میں نظر آئی سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس نے نئی ایک  
سکولوں کے ہیڈ ماسٹر دیکھے تھے۔ وہ سب گویا ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے  
رسمی وقار اس قدر چھایا رہتا تھا۔ جیسے دور کا سفر کرنے کے بعد جو تپ پر غبار کی تہ جم جاتی ہے۔  
غبار کی اس دبیز تہ کی وجہ سے ان کے چہرے بے حس اور مردہ نظر آتے تھے۔ ان کی گردنیں  
گویا مکلف ہوتیں جو بڑے تکلف سے حرکت کرتیں۔ آنکھیں نہ تو ہمدردی نہ اہمیت کا  
چمک سے واقف ہوتیں۔ وہ دیکھتی نہیں بلکہ کریدتی تھیں۔ نکتہ چینی کرتیں۔ وہ ب

”آئیے آصفی صاحب۔“ وہ ایللی کو دیکھ کر چلایا۔ ”تو آپ ہیں ہمارے نئے ٹیچر۔ اگر آپ  
فیضی کا خط نہ دیتے مجھے کچھ دیر اور تو میں کسے ہی والا تھا کہ آپ کون سی جماعت میں داخلہ  
پاتے ہیں۔“ اس نے بھرپور تہنیت لگایا۔ ”اب آپ ہی بتائیے آصفی صاحب۔ اگر سکول میں  
بے اساتذہ آجائیں تو کس قدر مشکل ہو جاتی ہے۔ کیسے پتہ چلے کہ استاد کون ہے اور سٹوڈنٹ  
ان؟ خیر خیر مگر ایک بات ہے۔ آپس کی بات ہے میں کسی سے کون گمان نہیں۔ یہ بتائیے کہ  
دعوت کو سنبھال بھی لیں گے۔“ شیخ مسعود نے پھر تہنیت لگایا اور پھر ایللی کی گھبراہٹ کو سمجھ کر  
آزاد بات بدلی۔ ”چلے وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے کھانا کیوں نہ کھالیں۔ کتے ہیں پہلے طعام  
مکمل کلام۔ آئیے۔ گھر سے میرا کھانا آیا ہوا ہے اور وہ مقدار میں اتنا ہوتا ہے کہ دو شخص بیٹ بھر  
نہ کھائیں پھر بھی بچ جاتا ہے۔“

شیخ مسعود باتیں کرتے ہوئے آگے آگے جا رہے تھے۔ ایللی ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔  
”لیکن ایک بات ہے۔“ وہ ڈھکے ہوئے دسترخوان کے قریب جا کر کہنے لگے۔ ”شرط لگاؤ۔  
اگر میری بیوی نے آج وال کے علاوہ کچھ بھیجا ہو۔ خدا کی قسم۔ بیگم ولی اللہ سے کم نہیں۔ جب  
مکمل آنا ہو سو فیصدی وال پکاتی ہے۔“

یہ کہہ کر شیخ نے دسترخوان ہٹا دیا اور برتن کو دیکھ کر بے تحاشہ تہنیت لگایا:

ہم کو جب وہ لوٹے تو وہ زبردستی اہلی کو پکڑ لیتا:

”اب کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گا۔“

کھانا کھانے کے بعد وہ کوئی قصہ چھیڑ لیتا اور اہلی سوچتا کہ کب بات ختم ہو اور وہ اجازت مل کرے۔

طبی طور پر اہلی ایک تنہا شخص تھا۔ اس کی نشوونما کے لئے تنہائی بے حد ضروری تھی جیسے ہڈوں کے لئے کھلا ضروری ہوتی ہے۔ سوسائٹی میں بیٹھ تو جاتا تھا اور بات بھی کر لیتا تھا لیکن اس سوسائٹی میں بیٹھ کر سکون یا خوشی حاصل نہ ہوتی تھی۔ اس کے برعکس اس پر ایک اضطراب چھائے رہتا۔

اس کے علاوہ سادی اس کی منحصر رہتی تھی کہ کب اسے تنہائی حاصل ہو اور وہ دونوں بیٹھ کر بات کریں۔

صرف اس وجہ سے اہلی چند ایک روز ہی میں شیخ مسعود کی مصاحبت سے اکتا گیا لیکن اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ زبردستی اپنے آپ کو الگ کر سکے۔ ہمارے تو وہ بتاتا تھا یا چوری چوری رک جانے کی کوشش کرتا سب کوششیں بے کار ہو جاتیں چونکہ شیخ مسعود اسے ڈھونڈ نکالتا اور ہر شے سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔

ماہقی

جلورا میں اہلی نے صرف چند ایک ساتھی بنائے اور وہ سب متفقہ طور پر شیخ کے متعلق اچھے رائے نہیں رکھتے تھے۔ سکول کے اساتذہ بھی جہاں تک ممکن تھا اس سے دور رہنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ اہلی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر لوگ اس کے خلاف کیوں تھے بلکہ شیخ کی شخصیت کے کئی ایک روشن پہلو تھے۔ ممکن ہے دو ایک تاریک بھی ہوں۔ تاریک بالوں میں نہیں ہوتے۔

جلورا میں سکول کے قریب ہی اہلی اور افضل نے مل کر ایک مکان لے رکھا تھا اور کام کاج کے لئے ایک نوکر رکھ لیا تھا۔ افضل ڈاکھانے کا ایک کلرک تھا۔ وہ ایک دہلا پتلا قد آور نوجوان قد مسلسل کلرک کی وجہ سے اس کا چہرہ لمبا ہو چکا تھا۔ منہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں لیکن آنکھوں میں اب پیرائش کے بجائے شرارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہ تضاد کئی بار اہلی کو چونکا دیتا۔

”لو دیکھو آصفی صاحب۔ میں نے کمانہ تھا۔ ہی ہی ہی ہی۔“ وہ قہقہے پر قہقہہ مارنے لگے شیخ مسعود ایک عجیب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی طبیعت بیک وقت رسمی اور غیر رسمی تھی۔ کبھی وہ اعلیٰ قسم کا سوٹ پہنے مدرسے میں آ جاتا اور انگریزی بولنا شروع کر دیتا۔ کبھی کبھی پیسے آوارہ ہوتا اور دفتروں کی طرح باتیں کرتا۔ اسے کام کرنے کا جنون تھا اور وہ اکیلے بیٹھنے سے بے حد خائف تھا جیسے اسے خود سے ڈر لگتا ہو۔ دفتر میں بھی اکیلا نہ بیٹھتا بلکہ اساتذہ کو بلا کر اپنے گرد ایک بھیڑ لگا لیتا اور پھر ان سے بے تکلف دوستانہ باتیں کرتا۔ ان کے دورو گالیاں ریت قہقہے لگاتا۔ گالی دینا اس کی عادت تھی۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ غصے میں چل دے یا ہا ہے، بے تکلفی کے اظہار کے لئے یا دیے ہی عادت پوری کرنے کے لئے۔ نہ جانے کس اصول کے تحت قہقہے مارتے مارتے دفعتاً ”وہ غصے میں آ جاتا اور پھر منظر ہی بدل جاتا۔ عام طور سے وہ بے تکلف گفتگو کے دوران میں اپنی طبیعت کی ستم ظریفی کے متعلق باتیں کرنے کا عادی تھا۔

”میں وہ ——— شخص ہوں۔“ وہ گالی دے کر کہتا۔ ”جو گرگٹ کی طرح اوتا بدلتا رہتا ہے۔ خدا کی قسم۔ آج تک اپنی طبیعت کا جتنی منتر سمجھ میں نہیں آیا۔ ہنس تو یقین نہ کیجے کہ ہنس رہا ہوں۔ اور غصہ۔ غصہ تو اس حد تک آتا ہے مجھے اور اس قدر آتا ”فانا“ کہ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ایک بندوق خریدی تھی کہ چور چکار سے محفوظ رہوں لیکن اسے کھول کر اس کے کل پرزے الگ الگ صندوقوں میں بند کر رکھے ہیں کہ جب تک انہیں اکٹھا کر کے جوڑوں تب تک شاید غصہ اتر جائے اور نہ بھی اترے تو یکدم دہائی تو بچا سکے۔“

اس کی باتیں بے جوڑ ہوتی تھیں۔ بیٹھے بٹھائے اسے کوئی نہ کوئی خیال آ جاتا اور وہ فوراً اٹھ بیٹھتا اور اس خیال کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیتا۔

اس عجیب و غریب طبیعت کے باوجود اہلی کو شیخ مسعود بے حد پسند آیا لیکن رفت یہ خلی کشا مسعود اہلی کو کسی وقت بھی تو اکیلا نہ رہنے دیتا تھا۔ سکول بند ہوتا تھا تو وہ اسے بلا لیتا:

”چلو آصفی صاحب۔ تمہیں شر دیکھا لاؤں۔ بڑے بڑے دلچپ لوگ ہیں یہاں۔“ وہ دونوں شہر کی طرف چل پڑتے۔ راستے میں شیخ گھیس ہانکتا جاتا اور ہر آتے جاتے سے

اور بے تکلفی سے باتیں کرتا۔

”ارے۔“ چلتے چلتے وہ چونکا۔ ”آج بدھ ہے نا۔ آج تو مجھے چک بیس جانا تھا۔ ہے آئے والے۔“ وہ شور مچا دیتا اور پھر زبردستی اہلی کو تانگے میں سوار کر کے وہ چک بیس کو چلے جاتے۔



بہت فحش پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا! وہ سوچتا۔  
 ہر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ایللی کی طبیعت میں شیخ کے لئے نفرت پیدا ہو گئی  
 اور شیخ ایللی پر شک کرنے لگا اور جاوڑا میں ایللی کی زندگی کا دھاراکسی اور رخ پر بننے لگا۔

### ایللی مولوی

یہ جانے ایک روز بیٹھے بٹھائے شیخ کو کیا سوچیں ایللی سے کہنے لگا:  
 ”ہمنی۔ آؤ ہمیں تماشہ دکھائیں۔“

شیخ اسے دفتر میں لے گیا۔ پھر اس نے مولوی رحمت اللہ عربی ماسٹر کو بلا بھیجا۔ پہلے تو عربی  
 ماسٹر نے اس نے چند ایک سوالات کئے پھر جوش میں آکر انہیں ڈانٹنے لگا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔  
 یہ پلانے کو آگ دکھادی گئی ہو — شیخ مسعود نے انہیں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ غلیظ  
 لکایاں۔

اس پر عربی ماسٹر کا رنگ فق ہو گیا۔ انہوں نے بولنے کی کوشش کی لیکن زبان سے مہمل  
 لفظوں کے سوا کچھ نہ نکل سکا۔ ظاہر تھا کہ شدت و غصہ اور بے بسی کی وجہ سے مولوی صاحب  
 بات غیر ہوتی جا رہی تھی۔ جوں جوں ان کی حالت غیر ہوتی توں توں شیخ کا جوش بڑھتا۔  
 آخر مولوی صاحب کے لئے حالات ناقابل برداشت ہو گئے۔ ناقابل برداشت تو ہو پہلے ہی  
 لیکن مولوی صاحب کو یہ خیال نہ آیا تھا کہ مزید بے عزتی سے بچنے کے لئے وہ کمرے سے  
 اڑ پڑ جائیں۔ یہ خیال آتے ہی وہ دروازے کی طرف بڑھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ  
 دروازے کے باہر اساتذہ اور طلبہ کی بھیڑ لگی ہے تو انہیں مزید بے عزتی کا احساس ہوا اور اس  
 احمدمدہ ہوا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

مولوی رحمت اللہ جاوڑا کے ایک معزز شخص تھے۔ صوم و صلوة کے پابند تھے۔ اکثر جمعہ  
 نماز جامع مسجد میں خطبہ پڑھتے۔ کم گو تھے اور مدرسے کا کام بڑی محنت سے کرتے تھے۔  
 جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے غصے میں ڈویڑنل اسپیکٹر کو ایک پرائیویٹ خط لکھ دیا جس  
 میں انہوں نے اس واقعہ اور شیخ کی زیادتی کا قصہ تفصیل سے بیان کر دیا۔

اس واقعہ پر ایللی بھی بھونچکا رہ گیا۔ کیا یہ تماشہ تھا؟ کیا یہ بات شیخ کے لیے مذاق کی حیثیت  
 کی تھی؟ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔

کی طرح کٹ دیتی تھی۔ سیدھی بات میں الجھاؤ ڈالتا۔ دوسروں کو بیانا اور سنجیدہ ترین مسئلہ  
 نہی میں ٹال دینا اس کے بامیں ہاتھ کا کرتب تھا۔

ایللی کے یہ ساتھی اس کے شیخ کے ساتھ زیادہ میل ملاپ رکھنے کے حق میں نہ تھے۔  
 سمجھتے تھے کہ شیخ مسعود قابل اعتماد آدمی نہیں۔ ایللی سمجھتا تھا کہ شیخ کے متعلق ان کے اندازے  
 درست نہ تھے۔ اس کے علاوہ ان سب کی خواہش تھا کہ مل بیٹھیں۔ کہیں ہانگیں۔ ہنس کھیل  
 یا گھومیں پھریں۔ شاید اس لئے وہ ایللی کے شیخ سے زیادہ میل جول رکھنے کے خلاف تھے۔

جاوڑا اسکول میں آتے ہی ایللی کی حیثیت شیخ کے مصاحب کی طرح ہو گئی۔ وہ اس کا مشیر  
 بن سکتا تھا چونکہ شیخ اپنی مرضی کا مالک تھا اور کسی کے مشورے پر عمل کرنے کے لئے تیار نہ  
 تھا۔ اسے کسی پر اعتماد نہ تھا۔ اس کے علاوہ ایللی اپنے احساس کمتری کی وجہ سے کسی کا مشیر نہ بن  
 سکتا تھا۔

اسکول سے فارغ ہو کر شیخ ایللی کو اپنے گھر لے جاتا۔ کھانا کھا کر وہ ایللی سے کہتا:  
 ”دو ایک خط لکھ لیں تو کیا حرج ہے۔“

اور پھر اٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بند کرنا شروع کر دیتا۔ ساتھ ہی قہقہہ مار کر  
 ہنستا:

”بھئی آصفی! معلوم ہے میں دروازے کیوں بند کر رہا ہوں۔ جو نہی مجھے خط لکھنے کا خیال  
 آیا تو ساتھ ہی بے سوچے سمجھے میں نے دروازے بند کرنے شروع کر دیئے تاکہ خط لکھواؤں تو  
 کوئی سن نہ لے۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگتا۔

”تو کیا کانفی ڈنشل خط لکھوانے ہیں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”عام سرکاری خط ہیں لیکن میرے لئے ہر خط کانفی ڈنشل ہے۔  
 میری طبیعت ہی ایسی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ساری دنیا میری دشمن ہے۔ سب میرا  
 بعید جاننے کی کوشش میں لگے ہیں۔ رات کو جب میں کمرے میں سوتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کدھر  
 سے مجھ پر وار کیا جاسکتا ہے۔ کھڑکیاں کھول کر نہیں سوتا چاہے کتنی گرمی ہو۔ چونکہ مجھے خیال  
 آتا ہے کہ کوئی کھڑکی سے پتہ تول چلائے گا اور خود بھاگ جائے گا۔“ شیخ مسعود ہنسنے لگا۔ ”میری  
 طبیعت ہی ایسی ہے۔“

اس قسم کی باتیں سن کر ایللی کو شیخ پر ترس آتا تھا اور ساتھ ہی ڈر بھی۔ اس حد تک غلطی اور

اس سے جواب طلبی کی ہے۔ بے چارہ پٹ جائے گا۔

ایلی کو موقع مل گیا۔ بولا: ”ہاں آپ نے واقعی مولوی صاحب سے زیادتی کی تھی۔“  
”جواب سس طرح سے اس کا تذکرہ کریں۔“ شیخ نے ہنس کر پوچھا۔

”ہر سس تو بہتر ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”ہمیں معافی مانگ لوں۔“ شیخ چلایا۔

ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہمیں میں معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں۔ بشرطیکہ وہ کانفہ پر اپنے ہاتھ سے لکھ دے کہ میں مدتی دل سے معاف کروں۔“

شیخ کی یہ بات سن کر ایلی کے دل میں بھر سے اس کے لئے احترام پیدا ہو گیا۔

اس کے بعد مسلسل دو روز سارا شاف مولوی صاحب کی فتنیں کرنے میں لگا رہا کہ شیخ کو کر دیں اور تحریر لکھ کر دیدیں۔ مولوی صاحب اس پر آمادہ نہ تھے لیکن آخر کار انہوں نے ایلی صاحب کو مجبور کر دیا اور انہوں نے یہ تحریر لکھ دی کہ اگرچہ شیخ کا طرز عمل ناروا تھا تاہم اراضی نامہ ہو گیا ہے اور انہوں نے شیخ کو معاف کر دیا ہے۔

یہ تحریر حاصل کرنے کے بعد شیخ نے سکول بند ہونے پر مولوی صاحب کو اپنے کمرے میں ایلی کے سب اساتذہ اور طلبہ جا چکے تھے اور پھر سے انہیں لاتعداد فتنیں گالیاں دیں اور جان کر ایلی سخت کلمات کہے کہ وہ پھر غصے میں آکر انسپٹر کو شکایت کریں۔ شیخ کا یہ اقدام سوچے بچانے کے مطابق تھا۔ بلکہ ایک چہڑی کو آگ لگانے کے لئے ان کے گھر بھیجا۔ چہڑی اس نے ایلی صاحب کو بتایا کہ انسپکٹر نے شیخ کی بھی جواب طلبی کی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ مولوی صاحب کے خلاف شکایت کا ایک اور خط لکھیں۔ جب اسے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ مولوی صاحب نے غلط لکھ دیا ہے تو شیخ نے انسپٹر کو اپنی طرف سے خط لکھا جس کا نفس مضمون یہ تھا:

”مولوی رحمت اللہ میرے باپ کی جگہ ہیں ان کی عزت کرتا ہوں۔

عرصہ چھ ماہ کا ہوا کہ وہ اونٹ سے سر کے بل گر پڑے تھے۔ ان کے سر

باجوت آئی تھی جب سے ان کا ذہن کا توازن ٹھیک نہیں۔ کبھی کبھی

سبب وجہ ناراض ہو جاتے ہیں اور پھر خود ہی مجھے معاف کر دیتے ہیں۔

لہذا وہ جلورامیں رہنا نہیں چاہتے۔ اس کی وجہ خانگی امور ہیں۔ بہر حال

اسے سوچ بچار میں کھوئے دیکھ کر شیخ بھی تاڑ گیا کہ ضرور مولوی کے واقعہ نے اس پر گہرا اثر کیا ہے۔ یہ محسوس کر کے شیخ نے ایلی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے مولوی صاحب کا تذکرہ شروع کر دیا۔

”یہ مولوی لوگ بھی عجیب لوگ ہیں۔“ وہ بولا۔ ”انسان اتنا بھی مسئلے مسائل میں نہ کمر جائے کہ اسے یہ تمیز ہی نہ رہے کہ اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ مولوی خود تو بے حد شریف اور بے زبان ہے لیکن اس کی بیوی اس کی شرافت اور بے زبانی کا خاطر خواہ فائدہ حاصل کرتی ہے۔“ شیخ نے قہقہہ مارا۔ ”اویڑ عمر کی عورت خود کیا فائدہ حاصل کرے گی لیکن اس کی بیٹیوں جو۔“ شیخ نے ایلی کو آنکھ ماری اور پھر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

ایلی کو اس کی ہنسی بری لگی لیکن اس میں اس قدر جرات نہ تھی کہ اعلائیہ احتجاج کرتا۔ بہر حال اس شام ایلی گھٹا گھٹا رہا اور شیخ ہر ممکن طریقے سے دلچسپ اور مزاحیہ باتیں بنا کر اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

جب ایلی گھر پہنچا تو وہاں تمام ساتھی بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سب غصے میں تھے۔ ایلی پر وہ یوں برس پڑے جیسے مولوی کی بے عزتی اسی کی وجہ سے ہوئی ہو۔ افضل غصے سے کانپ رہا تھا شیر کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور اس روز وہ بھول گیا کہ اس کی بیوی دیکھ رہی تھی کہ ایلی کے مکان میں بیٹھا ہے۔ سب شیخ کو گالیاں دے رہا تھا۔ احمد سر جھکائے بیٹھا تھا اور چوہڑی مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا: ”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ تمام شرارت الیاس آصفی کی ہے۔“ پانچ چھ روز کے بعد ڈویژنل انسپکٹر سے دو خط موصول ہوئے۔ ایک تو شیخ کے نام تھا جس میں لکھا تھا کہ جواب دے کہ اس نے ایسا سلوک مولوی سے کیوں روا رکھا اور دوسرا خط بیڈاڑ کے توسط سے مولوی صاحب کے نام تھا جس میں ان سے اس امر کی جواب طلبی کی گئی تھی انہوں نے براہ راست انسپکٹر کو خط کیوں لکھا۔

شیخ نے اپنے نام کے خط کے متعلق تو کسی سے تذکرہ نہ کیا لیکن مولوی صاحب کے خط کا اس قدر تشویر کہ بیچے بیچے کو علم ہو گیا کہ انسپکٹر نے الٹا مولوی صاحب کو ڈانٹا ہے۔

اس روز رات کو شیخ ایلی کو اپنے گھر لے گیا۔ کہنے لگا:

”بھئی آصفی۔ میں سمجھتا ہوں مولوی صاحب سے زیادتی ہوئی ہے۔ ایک تو اس روز تذکرہ نے انہیں بلاوجہ برا بھلا کہا حالانکہ وہ محض مذاق تھا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا اور اب انہیں

پتھر صورت تمہید تھی۔ بیگم نے محلے کے چار بزرگوں کو بٹھا کر کہا کہ میں تو ہرگز اس بات کے ساتھ نہ رہوں گی۔ اور یہ فیصلہ کرا لیا کہ وہ لا پور رہے اور مولوی صاحب انہیں ہندو فرج بھیجے رہیں۔ اس فیصلے کے بعد وہ بچیوں کو لے کر چلی گئی اور مولوی صاحب تنہا رہ گئے۔

ملات کو یوں بدلنے دیکھ کر مولوی صاحب بھونچکے رہ گئے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ملات چاروں طرف آگ سی کیوں لگ گئی ہے۔ کیوں لوگ انہیں پاگل سمجھنے لگے ہیں۔ یہ اور گہرا ہٹ سے ان کی شکل و صورت میں دیوانگی کی جھلک پیدا ہو گئی۔

شیخ مسعود واحد آدمی تھا جو حالات کے رخ کو سمجھ رہا تھا۔ مولوی صاحب کا ذکر آ جاتا تو وہ نے گا اور خوش ہوتا جیسے کسان اپنی بوٹی ہوئی فصل کاٹنے وقت خوشی سے پھولا نہیں ساتا۔ شیخ ہنس کر دلی پر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے اپنی اس صنائی میں مزید تیل بوٹے کاڑھنے کا ارادہ کر لیا۔

اس نے اپنے ایک سکھ شاگرد سو بھانگہ کو جو سکھوں کے ایک چک میں مل سکول کا ہیڈ رہتا تھا اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مولوی صاحب کو اپنے سکول میں لے لینے کی پیش کش کرے اور بعد میں ذرا ان کے مزاج صاف کرنے کا انتظام کرے۔

الہ پڑ صاحب کو بھلا بات کی حقیقت سمجھنے کی کیا ضرورت تھی وہ تو صرف لقمہ و نسق چلانے اور تھے انہوں نے سکھ ہیڈ ماسٹر کے اس اقدام کی تعریف کی اور مولوی رحمت اللہ وہاں لے کر دیئے گئے۔ ہیڈ ماسٹر سو بھانگہ کے توسط سے مولانا کو چک میں کوٹھڑی مل گئی۔ اور وہ کمپری کے عالم میں جا پڑے سو بھانگہ نے پہلے ہی چک میں مشور کر دیا کہ ان کے دماغ کو تیز ہے۔

ایک روز مولانا نے جوش اسلام میں آ کر با آواز بلند اذان فرمادی۔ سو بھانگہ کا اشارہ تو پہلے ہی تھا کہ لوگ مولوی صاحب پر پل پڑے۔ انہوں نے پیٹ پیٹ کر انہیں ادھ موا کر دیا اور ان سے ان کا سامان نکال کر باہر پھینکوا دیا۔ سامان کیا تھا۔ ایک بستر، ایک لوٹا، ایک جائے نماز ایک کتبچہ۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ چک سے دیس نکالا ملنے کے بعد مولوی صاحب نے عالم مجبوری طے کی اس واحد مسجد میں قیام کیا جو وہاں سے چار میل دور بر سر راہ مسافروں کے نماز کے لئے بنائی تھی اور جو چار مربع فٹ انیٹوں کے چبوترے پر مشتمل تھی۔ اس علاقے میں

میں نہیں چاہتا کہ ان کی بہتری میں حائل ہوں۔ مولوی صاحب کا معافی نامہ ارسال خدمت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے مجھے معاف کر دیا۔ اگرچہ میں نے کوئی گستاخی نہیں کی تھی۔ سہواً کوئی بات منہ سے نکل گئی ہو جسے غلط فہمی کی وجہ سے انہوں نے برا مان لیا ہو تو مجھے علم نہیں۔“

ایم معروف ولایت سے ہیر سٹری کی ڈگری لے کر نئے نئے ہندوستان میں آئے تھے اور آتے ہی کالج میں پروفیسر ہو گئے تھے۔ پھر چند ماہ کے بعد محکمہ میں ڈویژنل انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ وہ ایسے ہتھکنڈوں سے واقف نہ تھے اور چونکہ طبعی طور پر کسی کا برا نہیں چاہتے تھے لہذا شیخ مسعود کے اس خط سے جو مولوی رحمت اللہ کے دوسرے شکایتی خط کے ساتھ موصول ہوا تھا انہیں یقین ہو گیا کہ واقعی مولوی صاحب کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں۔ انہوں نے مولوی صاحب کے لئے بے انتہا ہمدردی محسوس کی۔ اپنے ڈپٹیوں کو بلا کر انہیں ساری بات سمجھائی کہ وہ دورے پر جائیں تو کوئی مناسب مقام تلاش کریں جہاں مولوی صاحب کو تبدیل کیا جائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں بھی ڈپٹی یا معروف جاتے کمال ہمدردی سے کہتے:

”ہمارے ایک عربی مولوی ہیں جو بڑے معزز اور شریف آدمی ہیں البتہ ذرا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ان کا۔ اگر آپ انہیں اپنے سکول میں لے لیں تو کیا اچھا ہو۔“

افران کی اس بے پناہ ہمدردی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب کی دیوانگی پر مرثیت ہو گئی اور ڈویژن کے کونے کونے میں مولوی صاحب کے دماغی عارضے کا پرچار ہو گیا۔ اور شیخ مسعود نے اسے ہوا دی۔

مولوی صاحب کی بیگم کے کانوں تک بات پہنچی تو اس نے سر بیٹ لیا۔ کہنے لگی:

”میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ وہ باؤلا ہے کوئی مانتا ہی نہ تھا۔“

یہ بات ان کی بیوی کے حق میں تھی چونکہ وہ مولوی صاحب سے الگ آزادی میں رہنا چاہتی تھی۔ اسے بہانہ مل گیا۔ ایک روز دغتاً اس نے شور مچا دیا جب مولوی صاحب دغتہ پڑھنے میں معروف تھے۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اس پر بیگم نے پینتر ابدلہ:

”دہائی خدا کی اب لوگوں کو دکھانے کے لئے جائے نماز پر جا بیٹھا ہے۔“

”وہ چل چلو“ چودھری مسکرا رہا تھا۔ کہ زندگی بھر شیخ کو معلوم نہ ہو کہ کون چال چل  
بدلیں چاروں شانے چت گرا ہو۔“  
اس رات دیر تک ایلی کے مکان پر کانفرنس ہوتی رہی۔ طے پایا کہ فوری اقدام کیا جائے مگر  
شیخ کو علم نہ ہو کہ وار کدھر سے ہو رہا ہے ورنہ اگر وہ خبردار ہو گیا تو حملہ کرے گا اور اس میں  
شد کرنے کی عظیم صلاحیت ہے۔ جاوے کے تمام لوگ مل کر بھی اعلانیہ اس کا مقابلہ نہیں کر  
سکتے تھے۔

حلقہ کی تباہی و تباہی کو طے کرنا ایلی کے ذمے کر دیا گیا۔  
اس کے بعد ایلی اور افضل کا گھر سازش کے اڈے میں بدل گیا۔ افضل کی آنکھوں میں  
ہلہول چلنے لگیں جیسے تلخ تلاب میں آہنجی ہو۔ چودھری کے گل ابھر کر گلہابی ہو گئے۔ احمد  
نے فزاید غدوغل میں ہلکی سی بیداری پیدا ہو گئی۔ شبیر میں خارجی دنیا میں اس حد تک دلچسپی  
باہولی کہ وہ بیوی کو بھول گیا۔ اور مسلسل گھر سے باہر وقت گزارنے لگا۔  
ایلی کا مکان چونکہ گلی کی کڑے واقع تھا اس لئے اسبلی نل بن گیا۔ وہاں بحث مباحثے ہونے  
لگے۔ فرزندار میں پیش ہونے لگیں۔ پلان بننے لگے۔ تفصیلات طے ہونے لگیں۔ ایک روز جب  
مرگم بحث تھے تو دروازہ بجا اور شبیر داخل ہوا:  
”کچھ ہوش بھی ہے۔“ وہ بولا۔

”بہم ہوش و حواس کی دنیا سے نکل آئے ہیں۔“ افضل نے جواب دیا۔  
”اب تو ایک دھن سونو ہے۔“ چودھری نے اپنی زندانہ آنکھوں کو کھماتے ہوئے کہا۔  
”لوٹنوں۔ یہ غلط بات ہے۔“ شبیر بولا۔ ”اگر بات نکل گئی تو سازش دھری کی دھری رہ  
لے گی۔ دنگل شروع ہو جائے گا۔“

”نہ بھی۔“ جمل بولا۔ ”ہم تو سازش کے قائل ہیں، دنگل کے نہیں۔“  
”دنگل تو ان پڑھ اور غیر منہب آدمیوں کا کام ہے۔“  
”ہے نا۔“ شبیر نے رازدارانہ طور پر کہا۔ ”تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ سازشیں کیا یہ  
”ابھی ختم ہے۔“

اس بات پر افضل بگڑ گیا۔  
”ٹھہری تو ہیں کرتے ہو؟“ وہ بولا۔ ”ہم جو پیدائشی کیا خاندانی طور پر مانے ہوئے سازش

صرف وہی پناہ گاہ انہیں مل سکی۔ انہوں نے اپنا سامان وہاں رکھ دیا اور خود اللہ کی یاد میں بیٹھ  
گئے۔ پھر ایک روز سو بھانگہ کے اشارے پر کوئی ان کا بستر اٹھا کر لے گیا۔ جب وہ سکول سے  
واپس آئے تو بستر کا کچھ پتہ نہ تھا۔ رات کو سردی کی وجہ سے وہ اگڑ گئے اور اگلے روز سکول میں  
لوکے ان کے گرد جھگڑا کئے انہیں چھیڑ رہے تھے  
”پاکل پاکل۔“

پھر معلوم نہیں کہ انہیں کیا ہوا۔ زمین نکل گئی یا آسمان نے ڈھانپ لیا۔

## سازشی

مولوی صاحب کے اس البیہ پر ایلی ششدر رہ گیا۔ ملازمت کی دنیا سے متعلق یہ پہلی  
جھلک تھی جو اس نے دیکھی تھی۔ ملازمت میں سازش کا یہ پہلا تجربہ تھا آج تک وہ زندگی کو گریبا  
کنارے پر بیٹھ کر دیکھتا رہا تھا۔ اس کے روبرو سنٹرل ماڈل سکول کا نیچر کھڑا چھڑی ہلا رہا تھا۔  
”بھول جاؤ۔ جو کچھ تم نے پڑھا ہے سب بھول جاؤ۔ کتابوں کی دنیا کو فراموش کر دو۔“  
چھڑی آگے بڑھا رہا تھا۔ ”یہ لو اسے استعمال کرنے میں درلغ کیا تو پٹ جاؤ گے۔“

دوسری طرف شیخ مسعود مقدمہ مار کر نہیں رہا تھا:  
”دیکھا۔ کیسا تماشا دکھایا تمہیں۔ بیوقوف کہیں کا۔ میری شکایت کرتا ہے۔ میری۔ مری؟  
بچہ جنگلی سڑ سے کھیلنا چاہتا ہے۔ بے وقوف دیوانہ۔“

ایک طرف مولوی خود کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بھیانک ہو رہا تھا۔ آنکھیں کھنچ گئی تھیں۔ ہونٹ  
سو جے ہوئے تھے۔ ”یا اللہ۔“ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ”یا اللہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”یا اللہ۔“ ایلی دانت پس کر بولا۔ ”یہ تیری دنیا ہے کیا۔“  
اللہ تعالیٰ کے خلاف اسے ایک اور شکایت پیدا ہو گئی اس زمانے میں وہ اس مشہور شعر  
قائل تھا۔ انسان پر ایک اور ظلم۔ اللہ تعالیٰ کی ایک اور توہین۔

”سور۔ سور۔ جنگلی سور۔“ ایلی کے کانوں میں آوازیں آرہی تھیں۔ مگر  
اس کے تمام ساتھی غصے سے بھرے بیٹھے تھے۔

”اب ہمارے ہاتھ سے بچ کر نہ جائے۔“ افضل کی ٹانگ ہل رہی تھیں۔ آنکھیں ٹرات  
سے چمک رہی تھیں۔



ہیں۔

”تو خاندانی سازشی کو معلوم ہونا چاہئے ابھی آدھ گھنٹہ ہوا۔ آپ کے دروازے پر فوراً  
مسعود کھڑا تھا اور وہ یہاں پورے پانچ منٹ کھڑا رہا۔“

”ارے۔“ سب کے منہ سے چیخ نکل گئی اور پھر محفل پر سناٹا چھا گیا۔

”ابھی تو شیخ پروار نہیں ہوا اور وہ مطمئن ہے اس کے باوجود وہ اس قدر شکی مزاج واقع ہوا  
ہے کہ فضا کو سونگھنے سے نہیں چوکتا۔ جب وار ہو جائے گا پھر تو وہ ساری ساری رات ہتھی کے  
چکر کاٹے گا جیسے مسلمان بادشاہ بھییں بدل کر رعایا کا حال جاننے کے لئے گھوما کرتے تھے۔“  
”بھئی یہ تو ٹھیک ہے۔“ افضل بولا۔

”اور اس گھر میں جو بات ہوتی ہے وہ آدمی گلی تک سنائی دیتی ہے۔“

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چندہ کر کے ایک پرانا ہارمونیم خرید آگیا۔ چند ایک تاش کر لڑیاں  
منگوائی گئیں جب بھی بحث کا آغاز ہوتا تو ایک آدمی ہارمونیم بجانے پر تعینات کیا جاتا۔ تاکہ بے  
کے شور میں بات سنائی نہ دے اور سازشی ہر وقت تاش کے پتے تھامے رہتے تاکہ کوئی آجائے  
تو سمجھے تاش کھیلنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد کہیں سے ایک پرانا ٹاپ رائٹر حاصل  
کیا گیا اور شیخ کے خلاف گناہ چٹھڑوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

ان چٹھڑوں کا انداز انوکھا تھا اور ایلی نے التزام ”انہیں ایسی شکل دی کہ وہ عام گناہ جنہوں  
سے ہٹ کر ہوں تاکہ افسران بالا انہیں دلچسپی سے پڑھیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ نہایت  
مختصر ہوتیں۔ زبان میں دفتری انداز مفقود ہوتا۔ کوشش کی جاتی ان میں مزاح کا رنگ غالب  
رہے، مظلومیت اور شکایت کا عنصر نہ ہو۔

ڈویژنل انسپکٹر کو روز ایک چٹھی لکھی جاتی جس کا مستقل عنوان جاوڑا لیٹین تھا۔ مسئل  
عنوان کے نیچے ایک ذیلی عنوان ہوتا۔ اس کے نیچے سیریل نمبر اور نیچے نفس مضمون۔

مثلاً

فلاں سال میں ۱۲۰۰ روپیہ ہمارے ریلیف فنڈ اکٹھا کیا گیا۔ چار صد روپیہ سرکاری بک میں ملنا  
کرایا گیا۔

باقی آٹھ سو روپیہ کیا ہوا؟

باقی آٹھ سو روپیہ کیا ہوا؟

ناچور

ان کے خطوط وجہ سے ڈویژنل دفتر میں ایک شور مچا گیا۔ پرانے افسران حیران تھے کہ  
ایم خط کیسے ہیں؟ ایسے گناہ خط تو کبھی موصول نہیں ہوئے تھے۔ مسٹر معروف انہیں پڑھ کر  
بڑھ ہو رہے تھے۔ غالباً ”انہیں اس بات پر خوشی ہو رہی تھی کہ اپنے ملک میں بھی ایسے لوگ  
دور ہیں جو ایسے رنگین قسم کے شکایتی خط لکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔“

شیخ مسعود کو جب معلوم ہوا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یا اللہ یہ کیسے گناہ خط  
؟ اور ان کا جواب کس طرح دیا جاسکتا ہے؟ اور لکھنے والا کون ہے؟ اور یہ انداز اسے کچھ سمجھ  
نہیں آ رہا تھا لیکن شیخ کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں گویا خانوں سے باہر نکل آئیں۔ پھر  
بے معلوم ہوا کہ خطوط کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے تو اس پر ایک وحشت اور دیوانگی طاری ہو  
گئی۔

اس نے ایلی کو اپنے کمرے میں بلایا اور چاروں طرف کے دروازے بند کر کے کہنے لگا:  
”کیوں بھئی آصفی صاحب۔ آج کل کچھ دور رہتے ہیں۔ کیا وجہ ہے۔ مجھ سے ناراضگی ہے

کیا؟

ایلی نے ایک ساعت کے لئے سوچا کہ اسے کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ بہر صورت ایلی طبعی  
اور پریمی رویے کا حامی نہ تھا لہذا اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ عام سازشی نہیں بنے گا اور یہ نہ  
کے گا۔ ”اچھا۔ یہ بات ہے۔“ یا ”آخر بات کیا ہے۔“

”بالکل۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”میں آپ سے سخت ناراض ہوں اور جان بوجھ کر آپ سے  
لڑ رہا ہوں۔“

شیخ بھونچکا سا رہ گیا۔ ”کیا وجہ ہے؟“ اس نے کہا۔

”وجہ آپ کو معلوم ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ الٹا چور ہو۔

شیخ اور گھبرا گیا۔ ”مجھے معلوم نہیں۔ میں نہیں سمجھا۔“ وہ بولا۔

”آپ سمجھتے نہیں جانتے ہیں لیکن کسی سے کہتے نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ اور شیخ کو  
دل پریشانی سے بچانے کے لئے اس نے بات کی وضاحت کی۔ ”دیکھئے شیخ صاحب۔“ وہ بولا۔  
”زشتہ دو تین روز سے آپ پریشان ہیں۔ آپ کا چہرہ۔ آپ کی چال ڈھل۔ آپ کی باتیں پکار

پکار کر کہہ رہی ہیں کہ کوئی اہم واقعہ ہوا ہے جس کی وجہ سے آپ گھبرائے ہوئے ہیں اور سوچ بچار میں پڑے ہیں۔ صرف آپ کی زبان خاموش ہے باقی تمام اعضا چلا چلا کر وہ راز کہہ رہے ہیں لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ وہ راز آپ نے دل میں چھپا رکھا ہے۔ ”ایلی ہنسنے لگا۔  
شیخ کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ حیرت سے ایلی کی طرف دیکھ کر ”کیا واقعی؟“  
بولاً۔ ”تو کیا آپ اسی لئے مجھ سے ناراض ہیں؟“

”ناراض اس لئے ہوں۔“ ایلی نے کہا۔ ”کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں اور آپ مجھے بات نہیں بتا رہے۔“

شیخ نے تہقہ لگایا۔

”اب ہنسنے نہیں شیخ صاحب۔“ ایلی جلال میں آکر بولا۔ ”ایسا راز رکھنے کا فائدہ جس کا آپ کے جسم کا بند بند اعلان کر رہا ہے۔“

”تو کیا تمہیں معلوم ہے وہ راز؟“

”اومنون۔“ ایلی بولا۔ ”مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ آپ کوئی اہم بات چھپا رہے ہیں جسے آپ بہت اہم سمجھتے ہیں۔ اگرچہ مجھے اسے جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ صرف اسے بتائیے جس پر آپ کو اعتماد ہے۔“

”اعتماد تو مجھے کسی پر بھی نہیں۔“ شیخ ہنسنے لگا۔

”تو نہ بتائیے۔ لیکن پھر یہ بھی ضروری ہے کہ آپ ضبط سے کام لیں اور یہ بھی ظاہر نہ ہونے دیں کہ کوئی چیز اندر ہی اندر آپ کو کھائے جا رہی ہے۔“

شیخ کھیانہ ہو گیا۔

ایلی ڈرتا تھا کہ کہیں شیخ اسے اس امر میں راز دیاں نہ بتالے۔ اس حد تک وہ ہر دہل لڑا کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ بہر حال اس کی باتیں سن کر شیخ اور بھی گھبرا گیا اور ایلی کو شیخ سے دور رہنے کا جواز مل گیا۔

مسلل ایک ماہ کی جواب طلبیوں پر شیخ کے ممبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اسے شک تو ہر اس پر تھا لیکن اسے یہ ثبوت نہ مل سکا کہ کون اس کے خلاف خط لکھ رہا ہے اور شکایت کی نوعیت اس قسم کی تھی کہ انکا جواب اس سے بن نہ آتا تھا۔ اس کے پرانے جھگڑے سب لیں ہو چکے تھے۔

شاہد اسی وجہ سے اس نے ایک نیا طریقہ کار آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر ایک خصوصی سٹاف بنگ بانی اور اساتذہ کو جمع کر کے سب کے سامنے اس نے وہ راز افشا کر دیا۔

”حضرات۔“ وہ بولا۔ ”یہ میٹنگ میں نے اس لئے منعقد کی ہے کہ میں آپ سے برادرانہ طور پر بات چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ کوئی شخص میرے خلاف مسلسل شکایات لکھ کر بھیج رہا ہے اس معاملے کو چلتے ہوئے دو ماہ ہو چکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جس صاحب کو مجھ سے لڑت ہے اور یہ مہم چلا رہا ہے وہ میرے روبرو آجائے اور میں حلف اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کروں گا۔ بلکہ میں اس سے سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں اور اس کی جائز بات دور کرنے کے لئے کوشش کروں گا۔“

شیخ یہ کہہ کر رک گیا۔ تمام اساتذہ سر جھکائے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ دیر تک وہ انہیں اس سے کریدتا رہا۔

ایلی اٹھ بیٹھا۔

”میں دو ایک باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”پوچھئے آصفی صاحب۔“

”یہ بتائیے کہ شکایات کی نوعیت کیا ہے؟“

ایک ساعت کے لئے شیخ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر حسب عادت بات ٹالنے کے لئے اس نے کہا: ”معمول قسم کی شکایات۔ اوہر اوہر کی۔“

”لیکن حضور۔“ چودھری کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ ”ایسی گمنام شکایات کو کوئی اہمیت نہیں دی لہ کر کے دیتے۔ خود ہی تھک کر رک جاتے گا۔“

”آپ کو کسی پر شک ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”نہیں تو مجھے آصفی صاحب آپ پر بھی ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

ملا اسٹاف تہقہ مار کر ہنس پڑا۔

”یہ خط۔“ شیخ نے وضاحت کی۔ ”جدید انگریزی میں لکھے جاتے ہیں اور جدید ترین ٹیپراس لٹ میں صرف آپ ہیں۔ اور اسپیکر صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ ان لوگوں کے نام لکھ بھیجوں یا نہ لکھ شک ہے۔“

”ہاں ہاں تو ضرور لکھئے میرا نام۔“ ایلی نے جواب دیا۔

ایلی نے بلی گویا جلورے کا بن کر رہ گیا۔“

”معروف صاحب کی کیا بات ہے؟“ ایلی نے بلی زبان سے پوچھا۔

”جی ہاں، مجھے تو معلوم نہیں۔ تم تو جانتے ہو اپنے ان سے تعلقات ہیں۔ سبھی افسر عزت رکھتے ہیں۔ دوستانہ سلوک سمجھ لو۔ یہ ان کی محبت ہے ورنہ — خیر خیر تو وہیں چائے پارٹی بیٹھے تھے۔ اتفاق سے جلورے کی بات چل پڑی تو میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب سے کہا ہمارا ارادہ ہے وہیں جانے کا۔ اپنا لڑکا ہے نا وہیں۔ اس بات پر مسٹر معروف چونکے۔ اچھا تو الیاس وہیں ہے نا کل — آپ ہی نے تو تعیناتی کی تھی، میں نے جواب دیا۔ اس پر وہ بولے۔ ”تو اسے“

”اوہ ایک دن کے لئے اور جب وہ یہاں آئے تو ذرا میری کوٹھی پر بھیجوا دیتا۔ ہی ہی ہی ہی۔“

ایلی نے ہنسنے لگے۔ ”وہ تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ سبھی افسر تمہیں جانتے ہیں۔ کبھی بلکہ اکثر ان میں تمہارا تذکرہ آجاتا ہے نا اس لئے۔ دوست جو ہوئے اپنے۔ کیوں نصیر کی ماں۔ تو کیا دیکھ رہے ہو۔ جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو بات کو۔ میں بتاؤں بالکل بیکار ہے سمجھ کا خانہ ہی نہ ہو تو پھر کوشش بیکار ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔ کیوں غصہ۔ کیا یہ غلط ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔“

”اچھا جی ایلی آج شام کو تم معروف صاحب سے ضرور مل لینا۔ ان کی کوٹھی سے واقف بن لو۔ دایا کی دوکان کے بائیں ہاتھ صدر میں۔ تم شام کو آٹھ بجے پہنچ جانا ورنہ وہ کلب ولب لے جاتے ہیں۔ بیرے کو بلا کر کتنا میں آصفی صاحب کا بیٹا ہوں۔ وہ مجھے جانتا ہے جب جاؤ بڑی لمحات کرتا ہے۔ جملیہ ہے نا۔ یہ جملیہ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں اور معروف صاحب کو دانا کہ تم آصفی صاحب کے بیٹے ہو ورنہ شاید انہیں یاد نہ رہے۔ ہی ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگے۔ ”یہ نہ ہو کہ تمہیں واپس لوٹا دیں۔ ہی ہی ہی ہی ہاں بھی تم جیسے ماتحت تو ان کے سینکڑوں رہ چکے ہوں۔“

”آصفی صاحب سے دوستانہ جو ہوا۔“ نصیر کی ماں نے طنزاً کہا۔

”جی ہاں ہنسنے لگے۔“

”گلاب چمکڑوں نے بھی بات کرنا سیکھ لیا۔ ہی ہی ہی ہی۔ سن رہی ہو غصہ۔ چیونٹیوں کی طرح پرکھل آئے۔ کتنی ہے میں پرندہ ہوں۔ ہی ہی ہی ہی۔“

”معروف ایک خوبصورت رنگین مزاج، خاموش اور نہایت سے بھرے ہوئے نوجوان

”تو پھر اقبل کرونا کہ تمہیں مجھ سے شکایات ہیں۔“ شیخ ہنسنے لگے۔

”ہاں۔ مجھے آپ سے دو شکایات ہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”پہلی شکایت یہ کہ آپ نے دو ماہ تک ہم سے یہ بات چھپائے رکھی ورنہ شاید حالات اس حد تک نہ بگڑتے اور دوسری شکایت یہ کہ آپ ہم سب سے تو مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم آپ پر اعتماد کریں لیکن آپ کو ہم سے کسی شخص پر اعتماد نہیں۔“

سارا شاف حیرت سے ایلی کی طرف دیکھنے لگا۔

## مسٹر معروف

عین اس وقت تار والا ڈاکو داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر شیخ از سر نو گھبرا گیا۔

”کیوں؟“ وہ بولا۔ ”کوئی تار ہے کیا میرے واسطے؟“

”نہیں جی۔“ وہ بولا۔ ”الیاس آصفی کے نام کا ہے۔“ اس نے ایک تار ایلی کی طرف پھرا

دیا۔

ایلی نے تار کھول کر پڑھا۔

”کیوں خیریت تو ہے؟“ شیخ نے پوچھا۔

”جی ہاں بالکل۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”والد صاحب نے مجھے خانپور بلایا ہے۔“

”خیر سے بلایا ہے کیا؟“

”لکھا ہے مسٹر معروف تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”مسٹر معروف تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن کیوں؟“

”مجھے نہیں علم۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”وہ والد صاحب کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔“

”شاید میری تعیناتی کی بات ہو کوئی۔“

ایلی خانپور پہنچا تو گھر میں سب لوگ اطمینان سے بیٹھے تھے۔ اس کا خیال تھا نہ جانے تھی

اہم بات ہو جس کے لئے مجھے بلایا ہے۔ شاید مسٹر معروف کو شک پڑ گیا ہو کہ وہ جلورہ میں

ایڈیٹر ہے یا کسی نے بھید کھول دیا ہو۔ ممکن ہے شیخ مسعود نے خود شکایت کی ہو۔ بہر صورت

بات اہم تھی لیکن وہاں جا کر اس نے محسوس کیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

”اچھا ایلی آیا ہے۔“ علی احمد نے اس کی آمد کی خبر سن کر کہا۔ ”بہت اچھا کیا جو آئے؟“

وہ اگرچہ چلے تو ہمیں بتاؤ کہ وہ کون ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ایک دوست کا لڑکا ایسے میں ملے۔ گڈ بائٹ۔“

معروف صاحب نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور ایللی گھر چلا آیا۔

اگلے روز معروف نے غالباً علی احمد سے بھی بات کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا دن وہ اسے تعین کرتے رہے۔

”مکھونا ایللی۔ ایسے لوگ ملازمت میں کبھی فائدے میں نہیں رہے جو اس قسم کی سازشوں میں حصہ لیتے ہیں ہمیشہ اپنے افسر سے بنا کر رکھنی چاہئے۔ چاہئے دوسروں سے اس کا ملکہ کیا بھی ہو ہمیں اس سے کیا۔ تم ہمیشہ ہیڈ ماسٹر کا ساتھ دینا اور بلکہ اگر تمہارا کوئی جاننے والا اس سازش میں شریک ہو تو اسے بھی خبر دوا کر دینا۔ اس کا بھلا کر دینا چونکہ معروف صاحب بہت سخت ایکشن لیں گے۔ یہ تو ان کی مہربانی ہے کہ تمہیں خود بلا کر بات سمجھا دی ہے۔ تم میرے بیٹے ہو اس لئے۔ ورنہ تمہاری کیا حیثیت ہے۔ ایک معمولی ٹیچر۔ ایسے سینکڑوں ٹیچر مارے جاتے پھرتے ہیں کون پوچھتا ہے جی۔ اور ڈگریاں ان کی قیمت کیا ہے آج کل۔ اگر تم میرے بیٹے نہ ہوتے تو کیا تمہیں نوکری مل جاتی۔ اچھی توبہ کرو۔ کون پوچھتا ہے۔ ہی ہی ہی۔ کیوں نصیر کی ماں۔“

گڈی میں بیٹھے ہوئے ایللی سوچ رہا تھا کیا مسٹر معروف کا مجھے بلانے سے یہ مقصد تھا کہ بلور کے حالات سے واقفیت حاصل کرے۔ اونہوں۔ معروف کو صحیح حالات جاننے کی خواہش تھی۔ اسے اس بات سے دلچسپی نہیں کہ نظم و نسق کی خرابیوں کو دور کیا جائے۔ انہیں تو صرف یہ فکر امن گیر ہے کہ کسی جائز یا ناجائز طریقے سے نظم و نسق قائم کیا جائے قائم رکھا جائے۔ انہوں نے مجھے بلوایا تھا تاکہ میری معرفت ان لوگوں کو ڈرا دیا جائے کہ ایسی سازشوں کا نتیجہ کیا نہیں ہوتا اور سازشیوں کو اسپیکٹر صاحب سخت سزا دینے کے قائل ہیں۔

بلور پہنچ کر ایللی نے ساری بات کارنگ ہی بدل دیا۔ سازشیوں کی محفل میں اس نے ایسی باتیں کہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مسٹر معروف انصاف کرنے کے قائل تھے لیکن وہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتے تھے جو جرات سے شکایت نہیں کر سکتے اور شیخ صاحب کے پاس جا کر ملنے انہیں بتایا کہ معروف آپ کے بڑے مداح ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ آپ ان لوگوں سے نمونہ کر لیں جنہیں آپ سے شکایت ہے تاکہ جاور اسکول کی مزید بدنامی نہ ہو۔

تھے۔ وہ عام اسپیکٹروں سے قطعی طور پر مختلف تھے اور ان کا انداز بالکل انوکھا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ براہ راست اس عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ ویسے عام طور پر محکمہ تعلیم کے افسر بتدریج ترقی کرنے کے بعد ڈیوٹی اسپیکٹر بنا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ غالباً وہ پہلے ڈیوٹی اسپیکٹر تھے جو ولایت سے ڈگری حاصل کر کے آئے تھے۔ پرانے افسروں کا طرز عمل تحصیل دار اور پٹواری کے بین بین ہوا کرتا تھا۔ وہ دیکھنے کی بجائے گھورتے۔ بات کرنے کی بجائے ڈانٹنے اور اساتذہ سے دور رہتے تھے۔ اس کے برعکس معروف نہایت اخلاق سے ملنے یوں باتیں کرتے جیسے وہ افسر ہی نہیں اور ڈانٹنے کے فن سے تو وہ بالکل ناواقف تھے۔

ایللی معروف سے مل کر حیران رہ گیا۔ معروف نے اسے پاس بٹھالیا۔ سرگٹ پیش کیا اور پھر یوں باتوں میں معروف ہو گئے جیسے ایللی کو صرف ٹیبل ٹاک کے لئے بلایا ہو۔

پھر دفتراً انہوں نے موضوع بدلا اور جاورا کے متعلق پوچھنے لگے۔ کیا وہ اچھی جگہ ہے؟ موسم کیسا ہے؟ لوگ کیسے ہیں؟ سکول کیسا ہے؟ آپ کا دل لگ گیا کیا؟

پہلے تو ایللی بے پروائی سے ان کے سوالات کا جواب دیتا رہا پھر دفتراً اسے خیال آیا کہ شاید جاورا ایجنٹ کا بھید پانے کے لئے اس سے حالات پوچھ رہے تھے۔ اس پر ایللی سوچ میں پڑ گیا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شیخ کے خلاف کوئی بات نہ کرے گا۔

”ہاں تو الیاس صاحب۔ آپ کے سکول میں تو پارٹی بندی نہیں ہو گی کوئی؟“ معروف نے پوچھا۔

”میں نے تو نہیں دیکھی۔“ وہ بولا۔

”ہیڈ ماسٹر تو وہاں کے بہت قاتل اور کارکن آدمی ہیں۔“

”جی ہاں۔“ ایللی نے کہا۔ ”اور بے حد دلچسپ ہیں۔“

معروف صاحب نے طرح طرح سے ایللی کو بات کرنے پر اکسایا لیکن اس نے انہیں سرسری جواب دیکر ٹل دیا۔

آخر انہوں نے واضح بات کی:

”دیکھو الیاس۔ میں نے تمہیں صرف اس لئے بلایا ہے کہ جاورا اسکول میں سخت گڑبڑ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کچھ لوگ ہیڈ ماسٹر کے خلاف سازش کر رہے ہیں اور چونکہ میرا اصول ہے کہ ایسے سازشیوں کو سخت سزا دیتا ہوں اس لئے تم خاص طور پر خیال رکھو۔ ایسے لوگوں سے بات

”یہ ہی رعب ڈالتی ہے اور کیا۔“  
”ہوں۔“ شیر بولا۔ ”یہ نہ کہو تم اس سے واقف نہیں۔ وہ کر مزرے گی۔ وہ بڑی  
دلاورت ہے۔“

”تو پھر نہ آیا کرو یہاں۔“ افضل بولا۔

”تم سب سے نفرت ہے۔“ شیر بولا۔ ”وہ اس مکان کو بہت برا سمجھتی ہے۔ کوئی  
بہن نہیں کہ وہ شیخ کے گھر جا کر اسے صورت حال سے مطلع کر دے۔“  
”تو پھر کیا کیا جائے۔“ احمد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”کرنا کیا ہے۔“ چودھری نے کہا۔ ”آخر ایک نہ ایک دن تو بات نکلے گی۔“

شیر کی بیوی کے رخ کو بدلتا آسمان کلام نہ تھا۔ اسے راز فاش کرنے سے باز رکھنے کی صرف  
ایک صورت تھی کہ شیر کو وہاں آنے سے منع کر دیا جائے۔ لیکن شیر نے اعلان کر دیا۔ ”میں  
یہاں چاہے لاکھ کوشش کروں میں تم سے ملنے سے باز نہ رہ سکوں گا۔“

”تو پھر اپنی بیوی کا ذمہ لو کہ وہ ایسی واہیات حرکت نہ کرے گی۔“ افضل نے کہا۔  
”نہ بھلائی۔“ وہ بولا۔ ”یہ میرے بس کا روگ نہیں۔“

اس نئے جھیلے کی وجہ سے کڑوالے مکان کا نقشہ ہی بدل گیا۔ وہ سب گہری سوچ میں پڑ  
گئے۔

شیر کی بیوی کو ہر اس مکان سے نفرت تھی۔ جس میں کوئی عورت نہیں رہتی تھی۔ اس  
کے ذہن کے مطابق صرف وہی مرد معزز ہو سکتا تھا جس کے گھر ایک اپنی بیٹا بیوی ہو اور  
بزرگ افضل اور اہلی کے گھر میں کوئی عورت نہ تھی۔ لہذا ساری دنیا کے گنہ اس مکان میں  
آئے تھے۔ وہاں تاش کھیل جاتا تھا۔ واہیات گفتگو ہوتی تھی۔ شراب پی جاتی تھی۔ جوا کھیل جاتا  
تھا۔ یہاں آتی تھیں۔

ان حالات میں اس مکان اور اس کے کینوں کے خیالات کو بدلتا قطعی طور پر ممکن نہ تھا۔  
”بھئی کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ افضل بولا۔

”اچھا۔“ اہلی نے کہا۔ ”میں کوشش کروں گا۔“ لیکن اس کے باوجود اسے سمجھ میں نہیں  
آتا کہ کس طرح کوشش کرے۔

ملری رات وہ سوچتا رہا پھر دفعتاً اسے دعوت کا خیال آ گیا جو شیر نے انہیں کھلائی تھی۔

اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اہلی واپس جاؤرا پہنچا تو جلور اسکول کی سازش اور نفرت  
پکڑ گئی۔ وہ لوگ جو تقریباً سازشیوں کا ساتھ دے رہے تھے اس میں نمایاں حصہ لینے لگے  
بلٹین کے لئے تازہ مواد دستیاب ہونے لگا۔ اور شیخ مسعود اس کا مقابلہ کرنے کی امید کو بیٹھے  
اور انتہائی خطرناک اقدام کو عمل میں لانے کی سوچنے لگے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ڈپٹی کمشنر  
پیشیل پولیس، سی آئی ڈی اور سول پولیس سے خط و کتابت شروع کر دی۔ اپنے پرانے  
ہتھیاروں کے مطابق وہ اس بات کے قائل تھے کہ دشمن پر سخت وار کرنا چاہئے تاکہ وہ اپنے ہتھیار  
کی کوشش میں لگ جائے اور مزید وار نہ کر سکے۔

## ضدی عورت

پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک روز جب وہ سب مل کر ایک نئی سکیم پر بحث کر رہے تھے تو  
شیر کا بھانجہ جلوہ داخل ہوا۔ اس کی عمر نو سال کی ہوگی۔

”کیوں کیا بات ہے۔“ شیر اسے دیکھ کر چلایا۔ ”کیا مجھے بلایا ہے؟“

”جی نہیں خاں صاحب۔“ وہ بولا۔

”تو پھر؟“

”پیغام دیا ہے۔“

”اچھا۔“ شیر بولا۔ ”تو ٹھہرو میں ابھی سنتا ہوں۔“

”جی۔“ جلوہ نے کہا۔ ”انہوں نے کہا ہے کہ سب کے سامنے دینا پیغام سب کے  
سامنے۔“

”اچھا تو دے۔“ افضل چلایا۔

”جی انہوں نے کہا ہے کہ جاکر کہند اگر خان صاحب اس گھر میں پھر داخل ہوئے تو میں

شیخ کے گھر جا کر ساری بات بتا دوں گی۔“

”کیا کہا؟“ سب کے منہ کھلے کھلے رہ گئے۔

”جی یہی کہا تھا۔“

”کس نے کہا ہے؟“ اہلی نے پوچھا۔

”شیر کی بیگم نے اور کس نے۔“ افضل بولا۔

اس دعوت کے کوائف بھی انوکھے تھے۔

## کریلے

ایک مرتبہ انہوں نے شیر کو مجبور کیا کہ وہ انہیں دعوت کھلائے۔ پہلے تو شیر انہیں جانا دیا لیکن آخر اس نے محسوس کیا کہ دعوت کھلائے بغیر چارہ نہیں اس نے ایک دن مقرر کر دیا۔ مقررہ دن وہ سب تیار بیٹھے رہے کہ کب بلاوا آئے۔ آخر شیر آیا اور کہنے لگا: ”تو بھی ابھی کھانا آتا ہے۔“

”آتا ہے کا کیا مطلب؟ افضل نے کہا کیا ہم تمہارے گھر نہ جائیں گے؟“

”نہیں یار۔“ وہ بولا۔ ”وہاں جا کر کھانے کا کیا مزہ۔ یہیں بھجوا دیتا ہوں میں تم میری بیوی کی علوت سے واقف نہیں کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو سارا مذاکرہ ہو جائے گا۔“

اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ شیر کا بھانجا جاوہ ہاتھ میں ٹرے اٹھائے ان کے گھر کی طرف آ رہا ہے۔ لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے ہاں آئے کے بجائے وہ سیدھا آگے نکل گیا۔

انہوں نے جاوہ کو آوازیں دیں شور مچایا مگر وہ چپ چاپ سیدھا نکل گیا۔

”یتیم کی سبیلی کے ہاں کھانا پہنچانے گیا ہے“ شیر بولا۔ ”ابھی واپس آکر ہمارا کھانا لے آئے گا۔ کھیراؤ نہیں۔“ کچھ دیر کے بعد جاوہ وہی بھرا ہوا ٹرے اٹھائے واپس آ گیا۔ اسے دیکھ کر شیر بولا۔

”اچھا تو کیا وہ لوگ گھر نہیں ملے؟ اچھا تو انہیں پھر دے آتا۔ یہ ہمیں دے دو۔“ شیر نے کچھ اس انداز سے بات کی کہ افضل اور ایللی کو سمجھ میں نہ آیا۔

در اصل بات یہ تھی کہ شیر کی بیوی ایللی اور افضل سے مشینوں کا کھانا پکانے کے لئے چار نہ تھی۔ اس لئے شیر نے یہ بمانہ بنایا تھا کہ مسجد میں دو ولی اللہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کی دعوت کرنا ہے۔ یتیم اس کی چال میں آگئی اور اس نے کھانا تیار کر دیا۔ جب جاوہ کھانے کے مسجد کی طرف روانہ ہوا تو وہ حسب علوت دروازے میں کھڑی دیکھ رہی تھی کہ کھڑا لے گیا پر تو نہیں رکتا اور شیر کی ہدایات کے مطابق جاوہ سیدھا نکل گیا تھا اور موڑ مڑنے کے بعد کچھ دیر وہاں انتظار کرتا رہا تھا تاکہ یتیم شیر مطمئن ہو کر اپنے کام کاج میں لگ جائے اور وہ کھانا لے کر

ہرمل ایللی اور افضل کو اس بھید کا علم نہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شیر نے فتیں کر کے بیوی زہر پلانے پر تیار کر لیا ہے۔

اس رات اسے خیال آیا کہ یتیم شیر کو راضی کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے اگلے روز ایللی نے رازدارانہ جاکھ کھٹایا۔

”ہیں بھئی۔“ ایللی نے پوچھا۔ ”شیر کہاں ہے؟“

”وہ تو ابھی سکول سے نہیں آئے۔“ جاوہ بولا۔

ایللی نے با آواز بلند چلا کر کہا۔ ”لیکن شیر تو آج سکول آیا ہی نہیں تھا۔“ اس کا مقصد یہ تھا کہ یتیم ہاتھ سن کر چونک جائے۔

مگر تو سکول ہی گئے تھے ”جاوہ نے کہا۔

”میں نے کہا جاوہ۔“ ایللی بڑے رازدارانہ انداز سے بولا۔ ”تمہارے گھر جب بھی کریلے لیا تو تیار توڑے سے مجھے دینا۔ اتنے اچھے کریلے تمہارے ہاں بنتے ہیں کہ جواب نہیں۔ یار نے کریلے بے حد پسند ہیں۔“

جاوہ چپ چاپ کھڑا تھا۔

ایللی نے آواز اور آہستہ کر لی اور بولا۔ ”چاہے چرا کر کھلاؤ لیکن صرف ایک بار کھلا دو۔ اب ایک مرتبہ تمہارے گھر کے بچے ہوئے کریلے کھائے ہیں۔ اس روز جب شیر نے ہماری انت کی تھی۔ کھلاؤ گے یار؟“ اس نے کہا۔ ”گھر نہ بتانا۔ چوری چوری کھلا دینا۔ ضرور۔“

ایللی نے اچھی طرح علم تھا کہ شیر کی یتیم بڑے غور سے اس کی ہر بات سن رہی ہے اس لئے اس نے بڑی ہمت فتیں کریں اور پھر چلا آیا۔

مگر اس نے افضل کو کہا۔ ”بھئی پتھر تو پھینک آیا ہوں اب پتہ نہیں کیسی لہرس اٹھیں گی۔“

”کیا پتھر پھینکا ہے؟“ افضل نے پوچھا۔

”ہاں سمجھ لو پتھر تھا۔ اب تو لہرس دیکھو۔“

رات کو شیر آیا تو اس نے آتے ہی شور مچا دیا۔ ”یار یہ کیا سحر کر دیا تم نے الیاس حد ہو

”ایلی بولا۔“ شیخ سے جا کر شکایت کرنے کا خطرہ تو مل گیا۔  
 ”رے۔“ شبیر چلایا۔ ”تو کیا اس لئے یہ تیر چلایا ہے۔“  
 ”جور کیا دعوت کھانے کے لئے؟“ ایلی ہنسنے لگا۔

”میں تو دعوت کھانے کے لئے ہی آیا ہوں۔“ محمود داخل ہو کر بولا۔  
 ”رے تم؟“ ایلی اسے دیکھ کر چلایا۔ ”تم یہاں کمال؟“  
 ”دیکھ لو۔“ وہ بولا۔ ”ڈھونڈ ہی نکالا تمہیں۔“  
 ”لیکن اس وقت کو کسی گاڑی سے آئے ہو؟“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”گاڑی کا تو وقت نہیں۔“ افضل بولا۔  
 ”میں موٹر سے آیا ہوں۔“ محمود مسکرانے لگا۔  
 ”بس سے اس وقت؟“

”تو کیا کار سے آئے ہو۔“ ایلی نے طنزاً کہا۔  
 ”ہاں ہاں کار سے بیٹھ کر سب کتنا سناؤں گا۔“

”چھا تو بیٹھ جاؤ۔“ ایلی نے کہا۔ ”پہلے ہماری بھیجن منڈلی کی کتھان لو پھر تمہاری کتھا بھی  
 سنائیں گے۔ چلو بھی۔“ ایلی چلایا۔ ”پہلے کلام پھر کلام۔“

اس پر اس کے ساتھی دو حصوں میں بٹ گئے۔ دو ایک طرف بیٹھ کر ہارمونیم بجانے لگے۔  
 ہاتھ کھینچنے میں معروف ہو گئے۔ کھیلتا تو کیا تھا وہ یوں شور مچانے لگے۔ جیسے تاش کھیل رہے  
 تھے۔ ایلی نے اٹھ کر اپلوں کے ڈھیر تلے سے ٹاپ مشین نکالی اور ٹاپ کرنے لگا۔

”رے۔“ محمود حیرت سے چلایا۔ ”یہ کیسی کتھا ہے۔“  
 ”یہ سازش ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”سازش۔“ محمود کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

لب کی بار محمود آیا تو اس کا حدودا روبر بدلہ ہوا تھا۔ وہ روی ٹوپی اور شلوار عائب تھیں  
 ٹراک کی جگہ پتلون نے لے لی تھی اور سر ننگا تھا۔

جب وہ دونوں اکیلے ہوئے تو انہوں نے بات چیت چھوڑی

”کیوں کیا بات ہے؟“ افضل نے پوچھا۔

”بات؟“ وہ بولا۔ ”بات کہاں تو معجزہ ہو چکا ہے۔“

”معجزہ۔“ افضل نے دہرایا۔ ”کچھ پلے بھی پڑے یار۔“

”بات بتانے سے پہلے میں تمہیں پچھلا قصہ سنا دوں۔“ شبیر نے کہا۔ جب پہلی مرتبہ تم نے  
 مجھ سے دعوت کھلانے کی بات کی تھی تو میں نے اپنی بیوی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔  
 تمہارے لئے دعوت پکائے یہ تو وہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے میں نے اسے کہا تھا کہ مجھ میں  
 مولوی ٹھہرے ہوئے ہیں ان کی دعوت کرنی ہے۔“  
 ”رے۔“ افضل چلایا۔

”اچھا۔“ ایلی بولا۔ ”جس جی جادو پہلے خوان لے کر آگے چلا گیا تھا۔“

”بھئی بیگم تو تمہارا نام تک سننے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن آج۔ معلوم ہے آج کیا مطالبہ

کیا ہے اس نے؟“

”کیا؟“ افضل بولا۔

”کہ کل تمام سالان خرید کر لاؤ میں ان کی دعوت کروں گی۔“

”کس کی؟“ افضل چلایا۔

”بھئی تمہاری اور کس کی۔“ شبیر ہنسنے لگا۔ ”مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔  
 جانے آصفی نے وہاں جا کر کیا کیا ہے۔ نقشہ ہی بدل گیا ہے گھر کا۔“

”لیکن یہ ہوا کیسے؟ ساری بات بتاؤ یار۔“ افضل بولا۔

”گھر لوٹا تو پہلے تو جواب طلبی ہوئی کہ بتاؤ آج سکول کیوں نہیں گئے تھے اور گئے کہاں تھے۔  
 پھر دوسری جواب طلبی ہوئی۔ کہنے لگی اس روز مجھے دھوکا دیا تھا تھا۔ دعوت دوستوں کی کی تھی اور  
 بہانہ مولوی صاحب کا بنایا تھا۔ بیگم کو یہ شکایت ہے۔“ وہ ہنسنے ہوئے بولا کہ اگر دوستوں کی  
 دعوت کرنی تھی تو مجھے بتایا ہوتا کہ میں دل لگا کر پکاتی۔ میں نے تو ویسے ہی بے پروائی سے کھا  
 پکایا تھا۔ حیرت ہے یار۔“

”تو تیر نشانے پر بیٹھا۔“ ایلی ہنسنے لگا۔

”بیجان اللہ کیا تیر ہے اور کیا تیر انداز ہے۔“ شبیر نے کہا۔ ”ایسی بات کرو دکھائی ہے تم نے

جو میری دانست میں ممکن ہی نہ تھی۔“



”مخود ہی کہتے ہو۔ نوکر رو کر کتھائے تو اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔“  
 ”لیکن جذباتی پہلو اختیار کیسے کیا جائے۔“ اس نے پوچھا۔  
 ”یہ تو آسان ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”نئے کپڑے پہنے تو شوق بھری نگاہوں سے دیکھو اور کو  
 نڈیا باریا لگتا ہے۔“  
 ”یہ تو میں کرتے کرتے تھک گیا۔“ وہ بولا۔ ”خوش تو ہو جاتی ہے وہ مگر میری طرف نگاہ بھر  
 نہیں دیکھتی۔“  
 ”غوب صورت ہے؟“

”ایلی خوبصورت تو نہیں لیکن میم ہے۔“  
 ”ہم۔“ ایلی اچھل کر بیٹھ گیا۔  
 ”موجودہ کی ہوتی تو کیا تم سے ہی پوچھتا آکر۔“  
 ”ہمارے کیسے آئے تھے؟“  
 ”اس کی کار ہے۔“ وہ بولا۔  
 ”اے تو کیا اس نے اپنی کار دے دی تمہیں یہاں آنے کے لئے؟“  
 ”نہ پچھلے آئی تھی۔“ وہ ہنسا۔  
 ”خود۔۔۔؟“

”ایک ساعت کے لئے خاموشی چھائی رہی۔  
 ”اے وہ کہاں ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”واپس چلی گئی۔“  
 ”واپس کہاں؟“  
 ”آئی پور۔“

”تو کیا وہ تمہاری شوفر ہے اور تم پوچھ رہے ہو کہ کیا کروں بھی واہ۔“ ایلی ہنسا۔ ”جو آتا  
 اٹھتا ہے وہ قوف بناتا ہے۔“  
 ”تین کرو۔“ محمود بولا۔ ”میں خود بھی بے وقوف بنا ہوا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“  
 ”کیا نہیں آتا سمجھ میں؟“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”کچھ بھی تو نہیں آتا۔“ وہ بولا۔ ”کسی وقت میری ہر بات مانتی ہے۔ کسی وقت بات نہیں

”کہاں ہو تم آج کل؟“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”یہی تو مجھے معلوم نہیں۔“ محمود نے کہا۔  
 ”آخر کیسے تو ہو گے۔“  
 ”یہ تو ٹھیک ہے۔“  
 ”کیا دیہ پالپور ہو؟“  
 ”نہیں تو۔“ وہ بولا۔ ”مجھے تبدیل کر دیا ہے۔“  
 ”کہاں؟“

”لا پلور۔“  
 ”لائل پور میں تو کوئی گورنمنٹ سکول نہیں۔“  
 ”کوئی نہیں۔“ وہ مسکرایا۔  
 ”تو پھر؟“ میں نے ویلفیئر کے محکمہ میں نوکری کر لی ہے لیکن۔“  
 ”یار میں یہاں کام نہیں کرنا چاہتا۔“ محمود نے جملہ ختم کیا۔  
 ”کیوں؟“

”اس محکمہ میں تو عورتیں ہی عورتیں ہیں۔“  
 ”اس میں کیا دقت ہے۔“

جس انفر کے ساتھ میں ہوں وہ تو ہر بات میں جذباتی پہلو مد نظر رکھتی ہے۔ بھول  
 دیکھ لے تو یوں خوشی سے ٹاہتی ہے جیسے نہ جانے کیا دیکھ لیا ہو۔ کوئی نوکر آکر اپنا دکھڑا روئے تو  
 آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ ہر بات میں ذاتی زاویہ ہر معاملے میں پرسل دیونہ بھی ان کے  
 ساتھ میرا گزارہ نہیں۔“

”تم بھی جذباتی پہلو اختیار کر لو۔“

”عورت کے ساتھ میں تو صرف ایک ہی پہلو اختیار کر سکتا ہوں۔“ وہ ہنسنے لگا۔  
 ”تو کر لو۔“ ایلی نے کہا۔

”نوکری ہاتھ سے جائے گی۔“

”جانے لگے تو سامنے جا کر رو رہا۔ وہ بھی رو پڑے گی بات ختم ہو جائے گی۔“  
 ”ج۔“ محمود کی آنکھوں میں عجیب چمک لہرائی۔

قد نے اپنی چیزیں سوٹ کیس میں رکھنی شروع کر دیں اور کہنے لگا۔ ”یار مجھے اس محکمے  
میں بھی اپنا انجام اچھا معلوم نہیں ہوتا۔“  
ایلی جرن تھا کہ ایسے سازگار حالات کے باوجود محمود وہاں سے تباہ کرنا چاہتا تھا۔ کتنی  
سکین بات تھی اور پھر محمود جو طبعی طور پر لیڈر مین واقع ہوا تھا۔ جو عورتیں سے دوریوں  
پر کرتا تھا۔ جیسے کسی آبی جانور کو صحرا میں پھینک دیا گیا ہو۔ زندگی کس قدر عجیب تھی۔

الو رجنک

محمود کے جانے کے بعد ایلی سکول گیا تو شیخ کے تیور بالکل بدلے ہوئے تھے۔  
”کیسے آگنی صاحب۔“ شیخ اسے دیکھ کر بولا۔ ”بڑے مصروف معلوم ہوتے ہیں آپ آج  
ایلی نے محسوس کیا کہ شیخ کی بات طنز بھری تھی۔ ”جی ہاں۔“ وہ بولا۔

”عجب مصروفیت ہے کہ آدھی رات تک گھربا جے بجتے ہیں۔“

”وہ تو ہمیں گے۔“ ایلی نے کہا۔

”تو نہیں منائی جارہی ہیں۔“

”جی ہاں۔“ ایلی نے کہا۔

”تج ہے“ شیخ بولا۔ ”دشمن پر وار ہو رہے ہوں تو خوشی تو ہوتی ہے۔“

نہ جانے کیوں ایلی شیخ کی اس بات پر بگڑ گیا۔ ”اگر آپ اس بات پر مصر ہیں کہ میں آپ کو

نہ بکھاؤں تو چلے یونہی سی۔“

شیخ نے قہقہہ لگایا۔

”شا صاحب آپ کے قہقہے نہ گئے۔“

”کوشش تو بہت کی لوگوں نے۔“ شیخ ہنستے ہوئے بولا۔

”جی۔“ ایلی بولا۔ ”مجھے یہی حیرت ہے۔“

”ہمارا آئیے تو سہی۔“ شیخ نے اپنا رویہ بدلا۔

لیکن نہ جانے کیوں ایلی کو غصہ آگیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی زمانے شیخ سے ناراض ہو جائے

لیکن لارنٹی سے نجات حاصل ہو جس میں پھنسا ہوا تھا۔ اس دورخی پر اسے اپنے آپ سے

سختی۔ کسی وقت بات بات پر ضد کرتی ہے۔ جیسے ہر بات میری خواہش کے خلاف کرنے کی تم  
کھائے بیٹھی ہو۔ کسی وقت ایسا ہوتا ہے۔ جیسے مجھ سے بہت قریب آگئی ہو لوہ پھر ایک ساعت  
میں یوں دور چلی جاتی ہے۔ جیسے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ نہیں یار۔“ وہ چلایا۔ ”میں توبذ سے  
آگیا چکا ہوں۔ اگر میں اس زمانہ محکمے میں کام کرتا رہا تو کسی روز موقوف ہو جاؤں گا۔“  
محمود کے آنے پر ایلی مسلسل دو روز اس کے پاس بیٹھا رہا وہ دونوں کنبوں کی باتیں کرتے  
رہے آکسفورڈ یونیورسٹی کے محوروں پر بحث کرتے رہے عورت کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر  
بات کرتے رہے۔

پھر محمود نے سوشل ورکروں کی بات چھیڑ دی۔ ”یار ایلی یہ دنیا ہی زلی ہے۔“ وہ بولا۔ ”  
قوم جسے عورت کہتے ہیں۔ عجیب قوم ہے۔ قہقہوں میں روتی ہے۔ آنسوؤں میں ہنستے ہے۔ نہ  
کہہ کر پچھتاتی ہے ہاں کہتے ہوئے ہنکتی ہے۔ میں آج کل الف لیل کی دنیا میں جی رہا ہوں  
— وہاں خواجہ سرا ہیں جنت ہیں۔“

ایلی حیرت سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ حتیٰ کہ دروازے سے پوم پوم کی آواز آئی۔

”ارے یہ کیا ہے؟“ ایلی چلایا۔

محمود کا رنگ فق ہو گیا۔

”کار کا ہارن معلوم ہوتا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”ہاں۔“

”کیا وہ خود لینے تو نہیں آگئی؟“

”ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔“

”اس نے کہا تھا کہ میں آؤں گی۔“

”نہیں تو۔“ وہ بولا۔ ”اس نے کہا تھا زیادہ سے زیادہ ایک روز رہنا پھر چلے آنا اور آج“

روز ہو چکے ہیں۔“

”تو یقیناً“ وہی ہے۔“ ایلی نے کہا۔

محمود اٹھ کر باہر چلا گیا اور چند ساعت میں آکر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یار وہی ہے کتنی؟“

چونکہ تم وعدے کے مطابق کل نہیں پہنچے تو میں لینے آئی ہوں۔“

”ارے۔“ ایلی چلایا۔ ”اچھا افسر ملا ہے تمہیں۔“

نہیں بے بس کرو کیوں میرا دیوالہ نکالنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہو۔ ابے او خبیثو کیوں اس نیک  
ان کو دھوکا دے رہے ہو۔ کیوں میرا گھر جاڑ رہے ہو۔“ لیکن دل ہی دل میں وہ بھی خوش تھا۔  
نیک بے بسیم اس پر پابندیاں عائد نہیں کرتی تھی۔

### نت۔ بیچارا

بیم شیر کی اس تبدیلی کی وجہ صرف کرپے نہیں تھے۔ ایلی نے بہت جلد محسوس کر لیا تھا  
کہ نکل کرپے دیا ثابت نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ ان بنیادی باتوں کے متعلق کوئی بات نہ  
پہنچ جائے جن کی بنا پر بیم شیر کو ان کے خلاف شکایت تھی۔

ایلی ابھی زندگی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ زندگی کا تار و پود کیا ہے۔ وہ صرف  
ہر ایک تیوریوں سے واقف تھا۔ جو اس نے کتابوں میں پڑھی تھیں۔ اور اسے شوق تھا کہ  
نہروں کو کام میں لائے اور دیکھے کہ زندگی میں وہ کیا اثر پیدا کرتی ہیں۔ اس نے ان چند  
نکات کو آڑا دیکھا تھا اور اسے خاصی کامیابی حاصل ہوئی تھی اس لئے ان خیالات کو مزید  
نہانے میں اسے راحت ہوتی تھی۔

ایک روز اس نے بڑی سنجیدگی سے شیر کو کہا تھا۔ ”شیر میرا ایک پیغام بیم تک پہنچا دو۔“  
شیر گہرا کیا۔ ”نہیں یار چھوڑو اس بات کو اس نیک بخت کو زیادہ دق نہ کرو کیسے وہ بالکل  
نکال جائے۔“

نہیں یار وہ بولا۔ ”یہ خالی کرپے دیر تک نہ چلیں گے۔“  
نہیں کر کے اس نے شیر کو منایا تھا اور شیر نے ایلی کی ہدایات کے مطابق اپنی بیم کو پیغام  
دیا تھا۔

”میں نے کہا۔“ شیر نے بیم سے کہا۔ ”ایک کام کرو تو بڑی مہربانی ہوگی ثواب کا کام  
نہیں کیا ہے؟“ وہ بولی۔

”یہ جو الیاس ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ کسی اچھی لڑکی سے اس کی شادی ہو جائے۔“  
”اچھا کرنا کیوں نہیں۔“ بیم غصے میں چلائی۔

”کی اچھے رشتے کی تلاش ہے اسے۔ اچھی لڑکی ملے تو کرے۔“

نفرت محسوس ہوتی تھی۔

”نہیں شیخ صاحب۔“ وہ بولا۔ ”اس وقت فرصت نہیں۔“

ایلی کے اس رویے کی وجہ سے شیخ ایلی کے ساتھیوں کو بلواتا اور ان سے کہتا بھی میٹھی اور  
آصفی کی صلح کرادو اور وہ سب مل کر ایلی کو مجبور کر دیتے پھر یہ قافلہ شیخ کے گھر جا پہنچے۔  
وہاں پہنچ کر ایلی صاف صاف بھری محفل میں کہتا۔ ”مجھے شیخ صاحب کے خلاف کوئی شکایت  
نہیں صرف اس بات کا رنج ہے کہ وہ مجھ پر شک کرتے ہیں اور پھر ان میں اتنی جرات نہیں کہ  
صاف صاف منہ پر کہہ دیں۔ نہیں صاف صاف نہیں کہتے بلکہ عورتوں کی طرح طعنے دیتے  
ہیں۔“ اس پر شیخ تسمیں کھاتا کہ مجھے آصفی پر شک نہیں۔

شیخ کی یہ بات سنتے ہی چودھری شور مچا دیتا۔ ”چلو بھی صلح ہو گئی اب کوئی جھگڑا نہیں رہا  
اب آصفی شیخ صاحب سے بغل گیر ہو جائے۔ اٹھو آصفی۔“ افضل اس کی ہل میں ہل ملا کہ شیر  
آہستہ سے چلا تا۔ ”اور مٹھائی۔“ ”وہ تو ہوگی ضرور ہوگی۔“ چودھری چیخا۔

پھر وہ سب بیٹھ کر مٹھائی کھاتے اور قہقہے لگاتے ہوئے ایلی کے گھر کی طرف چل پڑے۔  
وہاں جا کر باجے بجنے شروع ہو جاتے۔ تاش کی بازی لگ جاتی اور ایلوں کے انبار تلے سے ہپ  
کی مشین نکل آتی اور چودھری قہقہہ مار کہتا۔ ”لو بھی آصفی آٹھ دن کے بعد شیخ سے ہجر ہو جاتا  
یار تمہارا کیا بگڑے گا ہمیں مٹھائی مل جائے گی کیا حرج ہے۔“ شیر قہقہہ لگاتا۔ ”ضرور ضرور۔“  
احمد تلی بجاتا۔

”بگڑ جائے گا بگڑ جائے گا۔“ افضل سنجیدگی سے کہتا۔ ”میرا ذمہ رہا۔ لیکن تم صلح کرانے میں  
دیر نہ لگانا۔“

چودھری چلاتا۔ ”اس کا ذمہ میں لیتا ہوں۔“  
ان کے لئے یہ ایک نیا شغل تھا۔ جیسے یہ لڑائی اور صلح کا ڈرامہ ڈرامہ در ڈرامہ کی حیثیت  
رکھتا ہو۔ ان کے نزدیک اس نئی بات نے سازش کو صلح اور جنگ کے ایک دلچسپ کھیل میں  
تبدیل کر دیا تھا۔

پھر وہ بیم شیر تھی۔ ان سب نے اس کے پکوانوں کی تعریفیں کر کے اسے بالکل رام کر لیا  
تھا۔ ہر مینے وہ ان کو دعوت دیتی اور وہ اس کے گھر جا کر کھانا کھاتے اور کھانے کے دوران ہر  
اہتمام سے اس کے پکانے کی تعریفیں کرتے ان کی تعریفیں سن سن کر شیر زرب کہتا۔ ”ارے“

”آخر کسی قسم کی لڑکی چاہیے اسے۔“ بیگم نے پوچھا۔ ”ہے بیچارہ۔“

”میں ایک ہی شرط ہے اس کی۔“

”کیا؟“

”لڑکی مغرب زدہ نہ ہو۔“

”کیا ج۔“ وہ حیران رہ گئی۔

”اچھا۔۔۔ میں تو سمجھتی تھی۔۔۔“

شیر ترقہ مار کر ہنسا۔ ”مجھ سے پوچھ رہا تھا کیا تمہاری بیگم کی کوئی چھوٹی بہن ہے۔ جس کی لڑکی نہ ہوئی ہو۔“

شیر اور ایللی کو اچھی طرح سے علم تھا کہ بیگم شیر کی کوئی چھوٹی بہن نہیں اور اصولی طور پر ایللی کے جھیلے میں پرنے کی قائل نہیں اس لئے انہوں نے یہ پیغام اسے بھیجا تھا تاکہ بات لی نہ جائے اور اس کے نتائج بھی پیدا نہ ہوں۔ اس پیغام کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ بیگم شیر الیاس کو ہار کئے گئی۔ اور ایللی مطمئن ہو گیا چونکہ وہ جانتا تھا کہ جسے چند بار بیچارہ کہہ دیا جائے اس کے خلاف غصہ نہیں رہتا۔

### پہچانی ہڈیاں

محمود کے جانے کے بعد ایللی کو ایک خط موصول ہوا۔ جمیل نے ایللی کو خان پور بلایا تھا کہ لکڑی ضروری معاملہ ہے۔

خان پور پہنچ کر وہ سیدھا جمیل سے ملا۔

”کیوں خیر ہے؟“ اس نے پوچھا۔

جمیل حسب عادت مسکرا دیا۔ ”گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں۔ نقی نے کہا تھا بلاؤ۔“

”کیوں؟“

”وہ آج کل پریشان ہے۔ یار اس کا کچھ کدو اس نے اپنی زندگی بہت تلخ کر رکھی ہے۔ روز بھر کو بیٹتا ہے۔ روز رات کو ان کے گھر میں ہنگامہ مچا ہوتا ہے۔ محلے والے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ راہ گیر کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

”تو کئے نا اپنے ماں باپ سے۔“ وہ بولی۔ ”میں نے تو سنا ہے کہ ماں باپ کا کما نہیں ملتا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ شیر بولا۔

”جو ماں باپ کا کما نہیں ملتا وہ کیا انسان ہے۔“ وہ غصے میں بولی۔

”نہیں تم نہیں سمجھتی بیگم۔“ وہ بولا۔ ”اسے ماں باپ کے چٹاؤ پر اعتماد نہیں۔“

”بچے ماں باپ کے چٹاؤ پر اعتماد نہیں۔“ بیگم چڑ گئی۔

دیکھو نا۔“ وہ بولا۔ ”اس کی چار مائیں ہیں۔“

”چار مائیں۔“ وہ چلائی۔

”ہاں۔“ شیر نے کہا۔ ”والدہ اپنی دھن میں لگے ہیں۔ والدہ کی کوئی مانتا نہیں۔“

”تبت تبت۔“ بیگم پیچ گئیں۔ ”بیچارہ۔“

”کل بھری محفل میں کہہ رہا تھا۔۔۔“ شیر رک گیا۔ ”لیکن چھوڑو اس بات کو۔“

”کہو تو کیا کہہ رہا تھا۔“ وہ مصر ہو گئی۔

”چلو چھوڑو۔“ شیر نے کہا۔

”چھوڑو کیوں۔“

”تم برا مانو گی۔“

”نہیں میں نہیں مانتی برا۔“

”سچ؟“

”کہہ جو دیا۔“

”کہہ رہا تھا میں نے آج تک کوئی ایسی عورت نہیں دیکھی جو اچھی لڑکی کا چٹاؤ کر سکتی ہو۔“

صرف ایک بیگم شیر ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”ویسے ہی اناپ شاپ بکتے رہتے ہیں یہ۔“ وہ بولی۔

”نہیں نہیں وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔“

”اچھا۔۔۔“ وہ بولی۔ ”تو کیا میں نے یہاں شادی ایجنسی کھول رکھی ہے۔ میں کیا

کروں۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ بولا۔ مقصد یہ ہے کہ الیاس چاہتا ہے کہ اگر کوئی رشتہ لے تو تم باکر

پانچ نے بڑا لودھم چا رکھا ہے۔ محلے میں روز لڑائی روز لڑائی مجھے اس کی بات تو بری نہ

لگتی تھی۔ لیکن جو جواب دوسرے نے دیا اسے سن کر کباب ہو گیا میں۔

دوسرے نے کیا کہا؟ ایللی نے پوچھا۔

یہ لگا۔ ”چھوڑو جی کس کی بات کرتے ہو۔ وہ نئی تو مستی پر آئی ہوئی کتیا ہے۔ کتیا۔“ وہ

مٹا ہی نہیں کتیا۔ اور پھر سوچے تو بیگم سے لڑنے کو کتیا سے کیا تعلق۔ بڑی گہری بات

کی ملنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آئی۔

”تو پھر اسے کیوں پیٹتے ہو۔“ ایللی نے پوچھا۔

”اگر اس نفلے کا مجھے علم ہوتا تو۔۔۔“

”تو کیا بے خبری میں پیٹتے ہو۔“

”ہاں یار اب جو تم نے کہا تو مجھے خیال آیا کہ واقعی بے خبری میں یہ عمل ہوتا ہے۔ مثلاً

لے کوئی دواہلت بات کی اور مجھے غصہ آیا۔ یہاں تک تو شعور ہوتا ہے۔ پھر جو ہوش آتا ہے

تو بہت رہا ہوتا ہوں اور وہ چیخ رہی ہوتی ہے۔“

”تو اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔“

”یار تم سے پڑھے لکھے ایسی بات کریں حیرت ہے۔ تم سمجھتے ہو جیسے میری انا گھوڑا ہو اور

مارا ہوں۔ اس کے برعکس مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری انا سوار ہے اور میں گھوڑا

ہوں۔ اسے قابو میں کیسے رکھوں۔ ہاں یار۔“ دھنکا۔ اسے یاد آیا۔ ”جس بات کے لئے

ہاتھ نہیں بلایا ہے وہ تو سنو۔ میں تو عجیب مصیبت میں مبتلا ہوں۔ سمجھ لو پاؤلا ہو رہا ہوں۔

بیٹے یار تم یہ بیگم کے قے کو کیوں لے بیٹھے یہ تو پرانا روگ ہے۔ نہ جانے میرا یا بیگم کا

فلان لگا شاید اس معاملے میں میں ہی مظلوم ہوں۔ خیر خیر اس قے کو چھوڑو۔ میں سمجھتا

ہوں کہ لے اس کی ہڈیاں چاچھلاتی رہتی ہیں۔“

”ہائے تو کسکو۔“ جمیل نے کہا۔

”میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے۔“ نئی بولا۔ ”کہا تو چائے بنانے کو ہے پتہ نہیں شاید

نہاں سے یا ستو گھول دے۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”پتہ ہے کل کیا ہوا۔ حقہ جو بھرا اس نے تو میں

”اچھا تو کیا اس لئے بلایا ہے مجھے؟“

”نہیں وہ تو کوئی اور معاملہ ہے۔“ جمیل نے کہا۔

”مجھے نہیں معلوم۔ نئی خود بتائے گا۔ لیکن نئی کے گھر کے جھگڑے کے بارے میں بہ

سوچو یار ہم سب بڑے پریشان ہیں۔“

شام کے وقت جب وہ نئی کے ہاں پہنچے تو وہ ارد گرد اوزار رکھے جوتے کا تلاسی رہا تھا۔

”ارے تم یہ کیا کر رہے ہو۔“ ایللی نے پوچھا۔

”جو تا سینا سکھ رہا ہوں۔“ نئی نے جواب دیا۔

”اور وہ چڑیاں کیا ہوئیں جو تم کپڑے پر کاڑھا کرتے تھے۔“

”اڑ گئیں۔“ وہ بولا۔

”لیکن کوئی اور ہالی منتخب کرتے۔“ ایللی نے کہا۔

”یہ ہالی تو نہیں۔“ نئی نے اپنی تھوٹی اٹھائی۔ ”ایک روز سوچ رہا تھا کہ آخر ہر نیا جو تاجر

میں خریدتا ہوں۔ میرے پاؤں کو کٹا کیوں ہے۔ یہ بات میں عرصہ دراز سے سوچتا تھا۔ یعنی

مطلب ہے کہ ذہن میں تھی یہ بات تو مجھے خیال آیا کہ یہ موچی لوگ شینڈرڈ ساز کے جوتے

بناتے ہیں۔ یعنی اوسط ساز کے اور جس کے پاؤں اوسط سے ہٹ کر ہوں انہیں جوتے کانٹے ہیں

لہذا میں نے سوچا کہ اپنے پاؤں کے مطابق جو تا سینا چاہئے یہ بات دیر سے میرے ذہن میں تھی۔

اب کی بار نہ جانے کیسے عمل میں آگئی۔ وہ یوں ہوا کہ ایک روز میری جب میں بیس روپے

اور میں اتفاقاً اس بازار میں جا نکلا جہاں موچیوں کے اوزار بکتے ہیں تو میں نے اوزار خرید لئے

پھر جو تا سینے میں کیا دیر لگتی ہے۔ یہ جو ہمارے مکان سے باہر موچی بیٹھتا ہے۔ اس سے ہانکا لگا

سکھ لیا۔ اللہ اللہ۔ خیر سلا۔ اب سوچتا ہوں کہ آخر چینی موچی کا مکمل کیا ہے۔ کیا باگہ

خوبصورت شکل کا جو تا نہیں بناتے بلکہ ایسا جو تا بناتے ہیں جو پاؤں پر فٹ بیٹھے۔“

”سنا ہے تم نے بیگم کو پیٹنے کا شغل تیز کر دیا ہے۔“ ایللی نے بات بدلی۔

”ہاں یار۔“ نئی بولا۔ ”میں نے بھی سنا ہے۔ کل رات کو میں جو اپنی بیٹھک سے باہر نکل

کر ایک بند دوکان پر جا بیٹھا۔ ویسے ہی جا بیٹھا۔ میں نے سوچا چلو آتے جاتے لوگوں کا تماشہ دیکھو

تو دو محلے والے آکھڑے ہوئے وہاں۔ انہوں نے یا تو مجھے دیکھا نہیں اور یا پہچانا نہیں۔ اندھا ہوا

بہزورات کے وقت ہوتی ہے۔ آدمی کئی تو میں نے ایسے ہی ان جانے میں عبور کر لی۔ اب جو مراٹھ کر دیکھتا ہوں تو سامنے ایک کھڑکی میں بیٹھی ہے۔ میں گھبرایا۔ ادھر دیکھتا ہوں تو ایک دروازے میں کھڑکی ہے۔ ایک ادھر چوکی پر بیٹھی ہے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں چپکے سے گزر رہا ہوں۔ طبیعت مکدر تو ہوئی لیکن میں نے سوچا اب آج گیا ہوں تو نکل ہی جاؤں۔

”ابھی چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ دفعتاً میری نگاہ اس پر پڑی۔ وہ چوبارے کے جنگلے میں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر میں خواہ مخواہ رک گیا۔ عجیب انداز سے بیٹھی تھی نہ تو وہ راہ گزروں کو دیکھ رہی تھی اور نہ اپنا آپ دکھا رہی تھی۔“ نفی مسکرایا۔ ”اسے خبر ہی نہ تھی کہ وہ بیٹھی ہے یا کئی ہے یا کامل بیٹھی ہے۔ باورچی خانے میں بیٹھی ہے یا پلیٹ فارم پر یا چپکے میں۔ دونوں انہوں کا پیالہ بنا کر اس میں ٹھوڑی رکھی ہوئی تھی اور خود کوٹھوٹی ہوئی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے روٹی روٹی ہو۔ بال کھلے تھے پریشان حال کپڑے بے پردہائی سے پہنے ہوئی۔ بس صرف ہونٹوں پر لپٹک گئی تھی اللہ اللہ خیر سلا۔

”اسے دیکھ کر مجھے صرف یہ خیال آیا کہ یہ یہاں کیوں بیٹھی ہے۔ چند ایک ساعت تو میں لے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے سوچا چلو چھوڑو مجھے کیا لیتا دیتا ہے۔ بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے اپنا کیا لیتی ہے۔ میں چل پڑا لیکن یہ سوال میرے دل میں کانٹا سا لگا رہا کہ یہ یہاں کیوں بیٹھی ہے۔ دو قدم باہر رک گیا۔ مجھے غصہ محسوس ہونے لگا۔ آخر یہ کیوں یہاں بیٹھی ہے۔ پھر رک گیا۔ پھر اپنے آپ کو سمجھانے لگا۔ لیکن غصہ بڑھتا ہی گیا۔ حتیٰ کہ میں مجبور ہو گیا۔ جی میں آیا کہ جا کر باہر ہوں تو اس میں حرج کیا ہے۔

”میں واپس آیا۔ لیکن جب اس کے چوبارے کی میز چھایاں چڑھنے لگا تو خیال آیا کہ آخر اوپر بالکون کا کیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا فضول خیال ہے۔ اگر اس نے کہہ دیا کہ بیٹھی ہوں تجھے کیا۔ تو جواب دوں گا۔ اس خیال پر میں آگے چل پڑا۔ لیکن آگے قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ ہر قدم کے بعد رک جاتا۔ غصہ دم بہ دم بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر صورت اتنی بار رہا۔ میں کہ میں نے آگے جانا ہے کار ہے اور پھر اس قدر غصے میں آچکا تھا کہ کوئی اور بات ذہن میں نہ رہی۔ لہذا میں نے ایک تانکا لیا اور تانکے والے سے کہا کہ مجھے گھر لے چل۔ گھر پہنچ تو گیا لیکن بالکل ہی رو رہا کہ مجھے یہ خیال آتا کہ وہ وہاں کیوں بیٹھی ہے اور وہ غصہ جو مجھے آرہا تھا۔ وہ میں نے سب بیوی پر نکالا۔ پیٹ پیٹ کر اس کا پلستر نکال دیا۔ میرے اپنے ہاتھ دیکھنے لگے۔ پھر تھک

حیران یا اللہ یہ کیا بھرا ہے چلم میں۔ کسے کئی تمباکو ہے۔

”چلم التا کر دیکھا تو گدھی نے چائے کی پتی ڈال رکھی تھی چلم میں۔“ وہ ہنسنے لگی۔ مہر لوگ کہتے ہیں۔ میں بیٹھا ہوں اسے۔“

”ہاں تو وہ بات سنا رہے تھے تم۔“ جمیل نے کہا۔

”یہ کیا خرافات ہیں۔“ نفی نے کہا۔ ”بھئی یہ زندگی ہے۔ شکر کرو کہ ہم جنہیں اتنی اہم دیتے ہیں اور جب بھی کوئی خاص واقعہ پیش آتا ہے تو ہمیں سلتے ہیں۔“

”لیکن اتنی دور سے بلانا یہ کیا زیادتی نہیں؟“

”میں نے تو نہیں بلایا۔“ نفی بولا۔ ”میں نے تو جمیل سے کہا تھا کہ میں جاوے ہوا کہ چونکہ میں چاہتا تھا کہ تمہارا مشورہ لوں۔ بات ہی کچھ ایسی تھی میں گھبرا گیا اور جاوے جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ پھر جمیل نے کہا کہ تم وہاں نہ جاؤ۔ اسے یہاں بلاؤ۔“

”ہاں۔“ جمیل بولا۔ ”میں نے سوچا چلو ہمیں بھی مل جائے گا۔ اپنے بھی دو دن خوشی سے گزرے جائیں گے۔“

## تو——یہاں

”ہاں تو بات بڑی الٹی سی ہے“ نفی نے قصہ بیان کرنا شروع کیا۔

”پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں۔“ وہ بولا۔ ”کہ میں یہاں چپکے میں کبھی نہیں گیا۔ نہ ہی مجھے وہاں جانے سے کوئی دلچسپی ہے۔ سمجھ لو میرے دماغ میں یہ خانہ سرے سے خالی ہے۔ مجھے بھی علم نہ تھا کہ چپکلا کہاں واقع ہے شاید کہیں کسی جگہ اس کے جائے وقوع کے متعلق سنا ہو ضرور سنا ہو گا۔ لیکن مجھے شعوری طور پر علم نہ تھا کہ وہ کہاں واقع ہے۔“

”ایک روز۔“ وہ بولا۔ ”مجھے جلدی تھی۔ ایک دوست سے ملنے کے لئے چند محلے کی طرف جا رہا تھا۔ کابلی دروازے پہنچا تو میں نے چپکے کی گلی کی طرف دیکھ کر سوچا کہ راہ چوڑک سے گھوم کر کیوں جاؤں۔ اسی گلی سے کیوں نہ نکل جاؤں ضرور یہ گلی آگے کہیں نہ کہیں لگ جائے گی۔ بند گلی تو معلوم نہیں پڑتی۔ اس طرح پہلی مرتبہ میں چپکے کی گلی میں داخل ہوا۔ اپنی ہی دھن میں چلا جا رہا ہوں کچھ سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کس سوچ میں پڑا تھا۔ میں نے سنا کہ اپنی ہی دھن میں نہیں۔ شام کا وقت تھا۔ ابھی بتیاں جل رہی تھیں۔ اس وقت وہاں بھیڑ نہیں تھی۔

کہ قلعہ کیا کہ وہاں جاؤں اسے بک کروں۔ منہ مانگے دام دوں اور پھر لڑنے کی بجائے اس  
ہاتھی کوں شاید اس اقدام سے دل کی بھڑاس نکل جائے تو صاحب۔ ”نقی نے قصہ بیان  
رہے ہوئے کہا۔ ”اس روز میں نے نما و صو کر اچھا لباس پہنا اور بن سنور کر رات کو وہاں جا

اٹھیں اس کے حواریوں نے جب دیکھا کہ میں رات رہتا چاہتا ہوں اور میرا دنگا فسلو کا ارادہ  
میں تو انہوں نے مزاحمت نہ کی۔ البتہ حرامیوں نے مجھ سے بہت پیسے مانگے۔ ظاہر تھا کہ مجھے  
لگ رہے ہیں۔ خیر میں نے کہا جو مانگو گے دوں گا۔

”تو جناب۔“ نقی بولا۔ ”میں وہاں ٹھہر گیا۔ لیکن ایمانداری کی بات ہے کہ میں اس کے ہاں  
لڑنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔ یعنی میں صرف باتیں کرنا چاہتا تھا اور بس ٹھہرنا تو محض بہانہ تھا۔ خیر۔

لی اور بانو

”جب ہم اکیلے رہ گئے تو عجیب بات ہوئی۔ اب میں چپ چاپ کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا  
تھا اور وہ کن اکھیں سے میری جانب دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ آخر میں نے بات شروع  
کائن نے کہا۔ ”بیانا مجھے تو یہاں کیوں بیٹھی ہے۔“

”وہ بولی۔ تو اس بات کو چھوڑ۔ تجھے اپنے کام سے واسطہ۔ میں نے کہا۔ میں تو آیا ہی اس  
تے اہل کہ تجھ سے پوچھوں کہ آخر بات کیا ہے؟ تو یہاں کی نہیں۔ نہ تو یہاں کی دکتی ہے۔  
نہی کوئی حرکت ایسی ہے۔ جو ظاہر کرے کہ تو یہاں کی ہے بلکہ تجھے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا  
ہے جیسے کوئی مچھلی ریت پر پڑی ہے۔ تو تو یہاں دم توڑ رہی ہے۔“

”پھر میں نے اس سے محبت بھرے انداز سے بات کرنی شروع کی کیونکہ ویسے تو وہ میرے  
بہنو بہن نہ دیتی تھی۔ میں نے کہا۔ دیکھ بانو، چونکہ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اس کا نام بانو  
ہے اس بازار میں وہ بیٹھی ہیں جو جسم ہی جسم ہوں اور تو تو جسم ہے ہی نہیں۔ یوں معلوم  
ہو گیا ہے تو بغیر جسم کے ہو۔ یہ روٹی روٹی آنکھیں یہ کھوٹی کھوٹی نگاہ۔ جیسے کوئی راستہ بھول  
ہو اور رو دور تھک گیا ہو۔“

”مجھ سے بار بار کہتی رہی تو چھوڑ اس قصے کو لیکن میں نے اپنی رٹ نہ چھوڑی پھر وہ  
پوچھی۔ ”تو کون ہے۔“ میں نے اسے اپنا نام اور کام بتایا۔ اپنا گھر کا پتہ دیا۔ پھر وہ پوچھنے لگی۔

بار کر سو گیا۔

”اگلے روز پھر وہی چکر۔ دفتر گیا تو وہاں کام کرتے کرتے رک جاتا اور وہی خیال آتا کہ وہ  
وہاں کیوں بیٹھی ہے۔ ہزار سمجھایا لیکن بے کار۔ اب میں دفتر میں خواہ خواہ لوگوں سے الگ رہا  
ہوں بے کار باتوں پر لڑ رہا ہوں حتیٰ کہ صاحب سے جا کر الجھ پڑا۔

”پھر میں نے سوچا یہ تو بری بات ہے گھر چلو ورنہ گز بڑ کر بیٹھوں گا۔ تو میں طبیعت خراب  
ہونے کا بہانہ بنا کر گھر چلا آیا۔ راستے میں اپنی اس حماقت پر سوچتا آیا۔ چلتا رہا اور سوچتا رہا چلتا رہا  
اور سوچتا رہا۔

”اب جو آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں تو اس کے چوہارے کے نیچے کھڑا ہوں۔ یعنی گھر کو پیچھے  
چھوڑ کر ایک میل آگے نکل گیا اور مجھے علم ہی نہ ہوا کہ آگے نکل آیا ہوں یا کہل جا رہا ہوں۔  
یا راستہ غیر مانوس ہے۔“

چوہارے میں کوئی بھی نہ تھا۔ میرا مطلب ہے جنگلے میں کوئی نہ تھا۔ اس وقت کون ہوتا  
بھلا دوسرے کو دہجے کون طائفہ باہر بیٹھتی ہے۔

”وہاں جو ہوش آیا تو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں اور اس قدر شدت  
سے غصہ آیا اپنے آپ پر کہ اب اپنے دل کی بات ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لہذا اب  
مجھے اوپر چڑھنے سے کون روک سکتا تھا۔ اوپر چوہارے میں وہ میلے کیلے کپڑوں میں چارپائی پر  
بیٹھی تھی۔ میں نے اوپر جاتے ہی اس سے لڑنا شروع کر دیا۔ وہی بات ہوئی تھی۔ ”نقی بولا۔ ”نہ  
جان نہ پہچان بڑی خالہ جی سلام۔ میں نے کہا۔ تو یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ اور تیرا یہاں بیٹھنے سے  
کیا مقصد ہے؟ اور تو کیا طائفہ ہے؟ پھر تیرا یہاں کیا کام؟

”پہلے تو حیرت سے میری طرف دیکھتی رہی پھر ہنسنے لگی۔ سمجھتی ہو گی کوئی پاگل ہے۔ ہر  
اس کے حواری آ گئے۔ انہوں نے آکر مجھ سے الجھنا شروع کر دیا اور غصے سے میرا دلگ اور بھی  
چل گیا اور میں نے اتنا اوہم چلایا اور ان سے اتنی مار کھائی کہ کیا بتاؤں۔ پھر لوگوں نے مجھے  
چھڑایا اور تانگے میں ڈال کر گھر بھجوا دیا۔

”اگلے روز پھر وہی جنون۔ میری زندگی گویا حرام ہو گئی۔ بس یہی دھن جی میں سلاتی تھی کہ  
وہاں جاؤں اور جا کر اس سے لڑوں۔ چار ایک روز تو میں نے زبردستی اپنے آپ کو روکے رکھا پھر  
مجھے خیال آیا کہ یہ بھوت ایسے نہیں اترے گا۔ سمجھانا بھجھانا فضول ہے۔ لہذا میں نے سوچ سوچ



پہلے تو مکان سے اس کے چلانے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر دفعتاً "جیج دیکار شروع ہو گئی وہ دھڑا دھڑا اور نہ جانے کس چیز سے بیگم کو زد و کوب کر رہا تھا اور وہ جیج رہی تھی چلا رہی تھی۔

"خوارے اور پیٹ اور پیٹ۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں تیری ہڈیاں تو زردوں گا۔"

"خوارے زردے۔ ایک بار میں قصہ ختم کر دے۔"

"نہ قصہ ختم کروں گا کہ دنیا دیکھے گی۔"

"پڑوسی چاروں طرف سے اکٹھے ہو گئے۔"

"اب چھوڑ بھی کہ مار کر ہی دم لے گا۔" ایک نے کہا۔

"کیا قیامت اٹھا رکھی ہے تم نے۔" دوسرا بولا۔

"نقی صاحب اے نقی صاحب۔"

"وہ ایک محلے والے بیٹھک میں آگئے۔" کیوں صاحب یہ کیا آئے دن کافلو سے ہمارا ناک

لامد آیا بھائی صاحب۔"

"ایلی اور جمیل خاموش بیٹھے تھے۔"

"اندر جھگڑا ہوتا ہی جا رہا تھا۔"

"اس پر محلے والے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ لوگوں نے نقی کو پکڑ لیا لیکن وہ ویسے ہی

بٹے جا رہا تھا۔" اندر میر خدا کا حقے میں تو چائے ڈالتی ہے اور چائے بناتی ہو تو پان کا زردہ ڈال دیتی

"وہ جیج رہا تھا۔"

"چلو چلیں۔" جمیل نے ایلی سے کہا۔

"لیکن یہ گڑبڑ۔" ایلی نے پوچھا۔

"یہ تو یوں ہی رہے گی۔" جمیل بولا "کوئی مدد نہیں کر سکتا کوئی دخل نہیں دے سکتا۔"

"لیکن۔" ایلی بولا۔

"بے کار ہے نقی کا بھید کسی نے نہیں پایا۔"

"کیا واقعی۔"

"دونوں بیٹھک سے باہر نکل آئے۔"

"باہر بازار میں چراغ جل رہے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا آسمان پر گلابی بادل تیر رہے

"تو مجھے حق میں لے گا۔" اس پر میری ہنسی نکل گئی۔

"میں نے کہا۔ تو غلط سمجھ رہی ہے۔ مجھے تیری ہوس نہیں۔ مجھے عورتوں سے کچھ دلچسپی نہیں اور نہ ہی میں تیری محبت کا مارا ہوا ہوں۔ میں تو صرف یہ پوچھتا ہوں کہ تو میل کیسے آگئی۔ یہ تیری جگہ نہیں۔"

"قصہ کو تاد۔" نقی بولا۔ "پھر وہ میرے پاس آ بیٹھی اور کھل مل کر باتیں کرنے لگی۔ روٹی رہی۔ کتنے لگی میرے نصیب۔ پھر میں نے بحث چھیڑ لی اور پھر مجھے غصہ آنے لگا اور جب اس نے دونوں بائیں میری گردن میں ڈال کر ہونٹ میری طرف بڑھائے اور بولی۔ اب چھوڑ بھیجنا۔ تو غصے میں میں نے اسے یہ تھپڑ مار دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گری اور اس نے شور مچا دیا اور پشٹراں کے کہ حواری آجینتے میں بھاگ آیا اسے ملے مجھے دس دن ہو چکے ہیں۔ اب یہ حالت ہے کہ چاہے میں یورپ کو جاؤں یا پتھم کو مجھے اس وقت ہوش آتا ہے جب میں اس کے چوہارے تلے جا پہنچتا ہوں اور ہوش آتا ہے تو وہاں سے بھاگتا ہوں۔ سارے چٹکے میں چرچا ہو رہا ہے۔ لوگ گردن اٹھا اٹھا کر مجھے دیکھتے ہیں۔ انگلیاں اٹھا اٹھا کر میری طرف اشارے کرتے ہیں۔ طاقتوں کے بھڑوے مجھے دیکھ کر ہستے ہیں۔ رنڈیاں میرا مذاق اڑاتی ہیں۔ اور وہ بانو۔ وہ تو مجھے دیکھ کر یوں ساکت ہو جاتی ہے۔ جیسے پتھر ہو گئی ہو۔ اس نے ہنسا مسکراتا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو وہ ڈر کے مارے باہر بھی نہیں جھانکتی عجب تماشہ ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

"پھر دفعتاً اسے خیال آیا "یار وہ چائے تو مدت سے بنی ہوئی ہوگی میں لایا ہی نہیں۔" وہ اندر چلا گیا اور چند ساعت کے بعد چائے کا ٹرے اٹھائے ہوئے آیا۔ آتے ہی اس نے چائے بنا شروع کی۔

"ہاں۔" وہ چائے بناتا ہوا بولا۔ "تو تمہاری نفسیات کیا کہتی ہے۔ الیاس آصفی۔ یہ سب گڑبڑ گونا گونا کیا ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے مجھ سے۔ یار ایسی عجیب و غریب باتیں کیوں ہوتی ہیں۔ کوئی بات بھی تو سیدھی نہیں ہوتی۔ ہر بات الٹی ہر واقعہ پیچیدہ اب بتاؤ میں کیا کروں؟"

"ارے۔" وہ چائے کی طرف دیکھ کر چلا یا۔ "یہ کیا چیز ہے؟"

"چائے کا رنگ ہلکا پیازی تھا۔ جیسے چائے نہیں بلکہ پشاور قہوہ ہو۔"

"لو۔" وہ بولا۔ "پھر اس نے گڑبڑ کر دی۔ نہ جانے قہوہ بنا دیا ہے یا کیا حد ہو گئی۔" نقی نے

چائے دانی اٹھالی اور اندر چلا گیا۔

تھے۔

بیشک کے پاس ہی ایک عورت کو دیکھ کر وہ رک گئے۔

وہ ان کے قریب آگئی۔ ”یہ نیا محلہ ہے نا؟“ اس نے پوچھا۔

”جی۔“ جمیل نے جواب دیا۔

”مجھے نئی صاحب کے گھر جانا ہے۔“ وہ بولی۔ ”مکان نمبر ۳۰۳ آپ کو معلوم ہو کیا؟“

”نئی صاحب کے ہاں۔“ جمیل نے حیرانی سے پوچھا۔

”جی وہ دبلے پتلے صاحب ہیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ میں ملازم ہیں۔“

”آپ کون ہیں؟“ جمیل نے پوچھا۔

”میں ———“ وہ رک گئی۔

”ان کی رشتہ دار ہیں کیا؟“ جمیل نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ بولی ”میں ان کی جان پہچان ہوں۔ مجھے ان سے ضروری ملنا ہے۔“

”آپ کا نام بانو ہے نا۔“ ایللی نے کہا۔

حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”بانو ———“ جمیل نے حیرانی سے عورت کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں۔“ وہ بولی۔

”ارے تم کہاں جا رہے ہو۔“ نئی نے بیشک سے سر نکال کر انہیں آواز دی۔ ”یہ لہجے

نئی آگیا۔“ ایللی نے کہا۔

بانو کو یوں اپنے گھر کے دروازے پر دیکھ نئی کی آنکھیں ابل آئیں ایک ساعت کے لئے۔

جھپکا پھر وہ دیوانہ وار آگے بڑھا۔ بانو سمٹ کر رک گئی، خوف سے اس کی آنکھیں پھرا گئیں۔

لیکن جسم کے بند بند میں سپردگی موجیں مار رہی تھی۔ باہر بازار میں چراغ جھللا رہے تھے۔ گلابی

بادل دھندلا رہے تھے۔ ہوا رک کر سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ نئی بانو کی طرف یوں بدھ رہا تھا۔

جیسے وہ ایک خوفناک موج ہو۔ بانو ڈوب جانے کی شہر تھی۔ ”چلو۔“ جمیل نے ایللی کو ہنسی ماری

اور وہ چپ چاپ چل پڑے۔

انکوائری

جب ایللی واپس جلور پہنچا تو وہاں شور مچا ہوا تھا۔ اس کے تمام ساتھی گھر پر جمع تھے۔

”ارے۔“ افضل چلایا۔ ”ایللی آگیا۔“

ایللی آگیا ایللی آگیا چاروں طرف شور مچ گیا۔

”ہرے موقع پر آئے ہو ورنہ تمہیں تار دیئے والے تھے۔“ چودھری بولا۔

”آخر بات کیا ہے۔“ ایللی نے پوچھا۔

”پانہ چل گیا۔“ افضل نے شور مچایا۔

”اور شیخ کی بات بتاؤ نا۔ اس سال جاری ہیں بری حالت ہے۔“ شبیر نے کہا۔

”صاف بات کرو یا ر اسے پریشان کیوں کر رہے ہو۔“ افضل بولا۔

”جو پودا بویا تھا۔ اسے سمجھ لو پھل لگا ہے۔“

”پارا انکوائری ہو رہی ہے۔“

انکوائری کی خبر سن کر ایللی ساکت رہ گیا۔

”ہاں ہاں۔“ شبیر بولا۔ ”خود مسٹر معروف انکوائری کے لئے آرہے ہیں۔“

”خود؟“

”ہاں ہاں۔“

”کب؟“

”کل صبح۔“

لگے روز سکول پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مسٹر معروف شیخ صاحب کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ باہر

اتنا کے دل دھڑک رہے تھے اور وہ انتقاماً لڑکوں کو گھور گھور کر اپنے دل کی بھڑاس نکال

رہے تھے۔ سازشیوں کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔ ان کے انداز میں گہرا ہٹ تھی۔ لیکن ہونٹ

چبھتے تھے۔ چڑاسی مودبانہ ستولوں پر بیٹھے تھے۔ ڈرل ماسٹر خصوصی طور پر کھرج میں

لٹ ہنڈ کر رہا تھا اور ایللی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ اسے بار بار افضل کی بات یاد آرہی تھی۔

”ایللی سے کہا تھا۔“ تمہارے ساتھیوں میں جرات نہیں۔ نہ یہ بات کر سکیں گے نہ سامنے

آئے۔ اب سوچ لو۔ آیا سامنے آتا ہے یا نہیں۔ دونوں پہلو ہیں۔ اگر تم سامنے نہ آئے تو

تمہارا کیا کر لیا بے کار جائے اور اگر سامنے آگئے تو شاید زور میں آجاؤ اور فائدہ کچھ بھی

نہ ایللی سوچ رہا تھا۔

مطالعہ کوئی اور شخص ایک سال سے مسلسل اس سکول کی شکایت بھیج رہا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ انہوں نے پوچھا۔ اساتذہ خاموش بیٹھے رہے۔

بی اور مدعا الیہ

”جو آپ کی خاموشی سے ظاہر ہے کہ آپ کو میرے خیال سے اتفاق ہے۔“ مسٹر معروف اڑا کھینے لگے۔ ”لہذا اگر آپ میں ہی وہ صاحب موجود ہیں۔ جو ایسے خط لکھ رہے ہیں۔ تو وہ بات کریں اور اگر آپ میں سے کوئی شخص ان خطوط کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہے تو بچے کہ انکواری ختم ہو گئی۔ کیونکہ اگر آپ میں سے کسی شخص کو کوئی شکایت ہی نہیں تو اہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

اہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر شیخ کا چہرہ بھیاک ہو گیا۔ لیکن مسٹر معروف نے اسے اہیت نہ دی۔

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں الیاس صاحب۔“ معروف نے پوچھا۔  
”میں یہ پوچھتا ہوں۔“ اہی نے کہا۔ ”کیا گتام خط لکھنے والے نے انکواری کا مطالبہ کیا۔“

”مسٹر معروف کچھ دیر تک خاموش رہے پھر بولے۔“ میرے خیال میں نہیں۔“ تو آپ خود انکواری کے لئے تشریف لائے ہیں۔ لہذا مدعی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں۔“ اہی نے کہا۔

”ہوں۔“ مسٹر معروف مسکرائے۔ ”کیا آپ چاہتے ہیں کہ انکواری ہو۔“  
”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”مسٹر معروف نے تمام اساتذہ کو مخاطب کر کے کہا کیا آپ میں سے کوئی صاحب چاہتے ہیں انکواری ہو۔“

سب لوگ خاموش بیٹھے رہے۔

”میری ایک گزارش اور ہے۔“ اہی نے کہا۔

”کہو۔“ معروف بولے۔

”ابھی آپ نے فرمایا ہے کہ شکایات کسی فرد کے خلاف نہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ مدعا الیہ

طبعی طور پر وہ سامنے آ جانے کا قائل تھا۔ وہ صرف اس پہلو پر غور کر رہا تھا کہ میرے سامنے آ جانے سے باقی ساتھیوں کو نقصان نہ پہنچے۔

سکول کے بچوں کو چھٹی دینے کے بعد مسٹر معروف نے اساتذہ کی میٹنگ بلائی۔ بل کرے میں وہ سب خاموش بیٹھے تھے۔ مسٹر معروف شیخ صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔ اساتذہ بیٹے انتظار کر رہے تھے۔ مسٹر معروف کا شیخ سے برتاؤ ایسا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شیخ مسعود کی ہر بات کو اہیت دیتے ہیں۔ ان کے ہر مشورے پر عمل کرنے کے لئے جتلب ہیں۔ باتوں کے دوران میں وہ نجی نگاہ سے اساتذہ کے رد عمل کا جائزہ لے رہے تھے یا شاید یہ دیکھ رہے تھے کہ جو اثر وہ پیدا کرنا چاہتے تھے کیا وہ پیدا ہو رہا ہے۔

شیخ صاحب نہایت مودبانہ بیٹھے تھے۔ لیکن ان کے چہرے سے فکر کے آثار مرشح تھے۔ ان کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے جبک اور گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

دفعہ ”معروف صاحب نے اساتذہ کو خطاب کرنا شروع کیا۔

”اساتذہ کرام۔“ وہ بولے۔ ”میں آپ کے سکول میں انکواری کے لئے آیا ہوں۔“

”کوائف یہ ہیں کہ تقریباً ایک سال سے جلورا سے گتام شکایتی خط موصول ہو رہے ہیں۔ ان خطوط کا انداز انوکھا ہے۔ روز ایک خط بھیجا جاتا ہے۔ جس میں صرف ایک شکایت درج ہوتی ہے، وہ بھی نہایت اختصار سے گتام خط لکھنے والا یقیناً کوئی ذہین آدمی ہے اور یہ بات بھی قابل ستائش ہے کہ یہ شکایت کسی خاص آدمی کے خلاف نہیں ہوتی۔ ہر مل ظاہر ہے کہ آپ میں سے کوئی ایک یا چند لوگ مل کر یہ خطوط بھیج رہے ہیں۔ میں صرف آج اس لئے آیا ہوں کہ اس کے متعلق انکواری کروں۔ لیکن انکواری جیسی ہو سکتی ہے۔ جب مدعی اور مدعا الیہ دونوں موجود ہوں۔ مدعی شکایت پیش کرے۔ مدعا الیہ اس کا جواب دے اور میں انکوائری کی حیثیت سے دونوں پارٹیوں کے دلائل سن کر اس کا فیصلہ کروں۔ لہذا میں آپ کی نہ مت میں ایک درخواست کروں گا کہ جو بھی مدعی ہے وہ اپنا آپ ظاہر کرے۔“

مسٹر معروف خاموش ہو گئے۔ کمرے پر سکوت طاری تھا تمام اساتذہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ مسٹر معروف نے چند ایک منٹ انتظار کیا۔ وہ اساتذہ کو جانچتے رہے لیکن پھر مزید دلائل کے لئے کہنے لگے۔

”دیکھئے۔“ وہ بولے۔ ”یہ بات تو میں تسلیم کرنے کے لئے قطعی طور پر تیار نہیں کہ یہ

”جی۔“ ایلی نے کہا اور اس کا دل بری طرح سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔

”کیا دلچسپی ہے؟“ معروف بولے۔

”مجھے خطوں کی نوعیت کا علم ہے۔“  
”وہ کیسے؟“  
”وہ ایسے کہ وہ خط میں نے لکھے ہیں۔“ ایلی نے گہرا کر کہا اور اس کا سر زمین سے یوں اڑ گیا جیسے ہوائی کو آگ دی گئی ہو۔

”مستر معروف نے حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔  
اساتذہ کرام نے گردنیں اٹھالیں۔ ہل کرے میں سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ چودھری کی آنکھ چمکی۔ شبیر نے آہیں بھرا شروع کر دیا۔ احمد اور ڈرائیونگ ماسٹر مسکرا رہے تھے۔“

”تو آپ مدعی ہیں۔“ مسٹر معروف بولے۔  
”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”مجھے ذاتی طور پر کوئی تکلیف نہیں کوئی شکایت نہیں۔“

”دیکھئے الیاس صاحب۔“ مسٹر معروف نے پینتر بدلا۔ ”میں یہاں انصاف کرنے نہیں آیا۔ میرا فرض یہ ہے کہ آئین اور قوانین کے مطابق نظم و نسق بحال رکھوں۔ سمجھے۔“

”جی۔“ الیاس نے کہا۔ ”میں آپ سے انصاف نہیں مانگ رہا۔ شکایات شیخ مسعود کے خلاف نہیں۔ یہ خطوط آپ کو صرف اس لئے لکھے گئے کہ ایسے افعال کا ارتکاب کیا جا رہا ہے کہ آپ کے نظم و نسق کی توہین ہو رہی ہے آپ ہی مدعی ہیں آپ ہی مدعا الیہ ہیں۔“

”تو آپ ان شکایات کی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے تیار نہیں۔“  
”اس کی ضرورت نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو مجھے کیسے علم ہو کہ جو آپ نے لکھا ہے وہ درست ہے یا نہیں۔“  
”شکایت کے ساتھ متعلقہ ریکارڈ کا حوالہ دیا ہے آپ ریکارڈ دیکھیں۔ گواہوں کی کیا ضرورت ہے؟“

”مستر معروف بولے۔“ لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ ریکارڈ دیکھوں۔“ مسٹر معروف

بھی کوئی نہیں ہے تو پھر مدعی کے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ ”کچھ دیر تک مسٹر معروف خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بولے۔“ الیاس صاحب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس کیس سے غامضی دلچسپی ہے۔“

”جی۔“ ایلی نے کہا اور اس کا دل بری طرح سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔

”کیا دلچسپی ہے؟“ معروف بولے۔

”مجھے خطوں کی نوعیت کا علم ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”وہ ایسے کہ وہ خط میں نے لکھے ہیں۔“ ایلی نے گہرا کر کہا اور اس کا سر زمین سے یوں اڑ گیا جیسے ہوائی کو آگ دی گئی ہو۔

”مستر معروف نے حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔

اساتذہ کرام نے گردنیں اٹھالیں۔ ہل کرے میں سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ چودھری کی آنکھ چمکی۔ شبیر نے آہیں بھرا شروع کر دیا۔ احمد اور ڈرائیونگ ماسٹر مسکرا رہے تھے۔“

”تو آپ مدعی ہیں۔“ مسٹر معروف بولے۔

”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”مجھے ذاتی طور پر کوئی تکلیف نہیں کوئی شکایت نہیں۔“

”دیکھئے الیاس صاحب۔“ مسٹر معروف نے پینتر بدلا۔ ”میں یہاں انصاف کرنے نہیں آیا۔

میرا فرض یہ ہے کہ آئین اور قوانین کے مطابق نظم و نسق بحال رکھوں۔ سمجھے۔“

”جی۔“ الیاس نے کہا۔ ”میں آپ سے انصاف نہیں مانگ رہا۔ شکایات شیخ مسعود کے

خلاف نہیں۔ یہ خطوط آپ کو صرف اس لئے لکھے گئے کہ ایسے افعال کا ارتکاب کیا جا رہا ہے کہ

آپ کے نظم و نسق کی توہین ہو رہی ہے آپ ہی مدعی ہیں آپ ہی مدعا الیہ ہیں۔“

”تو آپ ان شکایات کی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے تیار نہیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو مجھے کیسے علم ہو کہ جو آپ نے لکھا ہے وہ درست ہے یا نہیں۔“

”شکایت کے ساتھ متعلقہ ریکارڈ کا حوالہ دیا ہے آپ ریکارڈ دیکھیں۔ گواہوں کی کیا

ضرورت ہے؟“

”مستر معروف بولے۔“ لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ ریکارڈ دیکھوں۔“ مسٹر معروف

”لیکن آپ تو پنجابی بول رہی ہیں۔“ ایللی نے کہا۔

”خلی بولنا ہے سمجھتا نہیں۔“ وہ بولی۔

ایللی قہقہہ مار کر ہنسا۔ اس نے محسوس کیا کہ کار میں تین بچے بیٹھے تھے۔ میم دیم کوئی نہ تھی۔ اس لئے وہ چلا چلا کر باتیں کرنے لگا۔

”میرا نامار تھا۔“ محمود نے پوچھا۔

”کیا تار؟“ ایللی نے کہا۔

”جو میں نے تمہیں دیا تھا کہ میں آ رہا ہوں تیار رہنا۔“ محمود نے کہا۔

”نہیں تو۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”اچھا تو تمہیں پہلے سے علم نہ تھا کہ میں آ رہا ہوں۔“

”نہیں تو۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”عجب کی بات ہے۔“ اس نے کہا اور پھر وہ ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے حتیٰ کہ

ایللی کو یہ خیال بھی نہ رہا کہ موٹر میں کوئی اور بھی موجود ہے یا موٹر مسلسل چلے جا رہی ہے۔

دو گھنٹوں کو دیکھ کر دفعتاً ”ایللی کو خیال آیا کہ اس کے پاس سگریٹ ختم ہو چکے تھے۔

زرا روکنے میں سگریٹ خرید لوں۔“

کار سے باہر نکل کر وہ حیران رہ گیا۔ ارے۔“ وہ چلایا۔ ”یہ کونسی جگہ ہے؟“

غالباً وہ سمجھ رہا تھا کہ کار جاورا کے چکر کاٹ رہی ہے۔

”کونسی جگہ ہے۔“ محمود نے ہنس کر پوچھا۔

”یہ تو لاہور معلوم ہوتا ہے۔“

”اور کیا پشاور ہو۔“ محمود نے کہا۔

”کیوں پریشان کر رہے ہو اپنے دوست کو۔“ مسز فلپ نے کہا۔ ”یہ تو جاورا کا بازار ہے۔“

لیکن میں واپس کیسے جاؤں گا؟“ ایللی نے پوچھا۔

”رات کی گاڑی سے چلے جانا۔ صبح پہنچ جاؤ گے۔“ محمود نے کہا۔

”بیماری کی عرضی دے دیتا۔“ مسز فلپ نے کہا۔ ”آخر میڈیکل سارٹیفکیٹ کس مرض کی

”اے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ محمود چلایا۔ تم ہمارے ساتھ ہی چلو۔“

ڈرائیونگ ماسٹر کہہ رہا تھا۔ ”اب اس انکوائری کا نتیجہ کیا نکلے گا۔“

## پوم پوم

میں اس وقت باہر سے پوم پوم کی آواز آئی اور پھر محمود ہنستا ہوا اندر آ گیا۔

”چلو۔“ ”وہ بولا۔“ ”جلدی کرو۔ جلدی۔ ابھی واپس آ جانا۔“

”کہاں جانا ہے۔“ ایللی نے پوچھا۔

”یہاں باہر تک۔ چلو۔ یار۔ باہر کار کھڑی ہے۔“ وہ بولا۔

”کار۔“ ایللی نے دہرایا۔

”ہاں ہاں۔“ محمود بولا۔ ”تم سے چند ایک ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

”اچھا۔“ ایللی بولا اور وہ دونوں باہر چلے گئے۔

دروازے کے باہر میدان میں کار کھڑی تھی۔

”بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ۔“ محمود بولا۔ ”بھئی بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ بڑی ضروری باتیں ہیں۔“

محمود نے اسے گاڑی میں دھکیل دیا اور جو خنی وہ کار میں داخل ہوئے گاڑی چل پڑی۔

اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ میم کو بیٹھے دیکھ کر ایللی چلایا۔ ”ارے یہ تو میم ہے۔“

”تو پھر کیا ہوا۔“ محمود ہنسا۔ ”تمہیں کیا کہتی ہے۔“ اس نے زہر لب کہا۔

”لیکن تم تو کہتے تھے باتیں کریں گے۔“

”باتیں ہی تو کریں گے۔“

”اس کے ہوتے ہوئے۔“ ایللی نے پوچھا۔

”باتیں کرنا جرم تو نہیں۔“

”لیکن یار۔“ ایللی بولا۔

”میڈم یہ میرا دوست کہہ رہا ہے۔“ محمود نے میم کو مخاطب کر کے کہا۔ ”کہ آپ کی

موجودگی میں بات نہیں ہو سکتی۔“

وہ مڑ کر دیکھے بغیر پنجابی میں کہنے لگی۔ ”ہام پنجابی نہیں سمجھتا۔“

”معاف کیجئے۔“ محمود بولا۔ ”ہمیں شک ہے کہ آپ سمجھتی ہیں۔“

”شکی مجاہ اچھا نہیں ہوتا۔“ وہ پنجابی میں بولی۔

اس کا نیا خاوند مسٹر فلپ ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھا۔ لیکن خوبصورت کے علاوہ اس میں کوئی بات نہ تھی۔ جو مسٹر فلپ کی شخصیت کو جذب کر سکتی۔ درحقیقت مسٹر فلپ سے شادی کرنے سے مسٹر فلپ کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔

مسٹر فلپ ایک فیکٹری میں ملازم تھا اور اس کی ملازمت اس نوعیت کی تھی کہ تنخواہ میں مزارہ ممکن نہ تھا۔ وہ ہمیشہ حاجت مند رہتا۔ یہ حاجت مندی مسٹر فلپ کی اپنے خاوند سے دلچسپی میں گویا سونے پر سامے کا کام دیتی تھی۔ تنخواہ ملنے ہی مسٹر فلپ ایک معقول رقم بذریعہ تار مسٹر فلپ کو مئی آرڈر کرویتی۔ پھر مسٹر فلپ کے خطوں کا ایک نامنا بندھ جاتا۔ ”فلپ ڈارلنگ تمہیں مزید روپے کی ضرورت تو مجھے لکھو فوراً اطلاع دو۔ نہیں ڈارلنگ گھٹیا سگریٹ نہ پینا۔ اگر پورے دل میں اعلیٰ سگریٹ دستیاب نہ ہوتے ہوں تو مجھے لکھو تاکہ میں نیا شہر سے پٹنی بھیج دوں۔

مسٹر فلپ میں ماما کا ایک طوفان دبا پڑا تھا۔ چونکہ سولہ شادیوں کے باوجود اس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اور وہ مسٹر فلپ کا یوں خیال رکھتی تھی۔ جیسے اس کا اکلوتا بیٹا ہو۔ مسٹر فلپ اس کی اس کڑوری سے واقف تھا اور دل کھول کر اس کے ماما بھرے جذبات کو حرکت میں لانے اور ان میں شدت پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کیا کرتا تھا۔ وقت یہ تھی کہ وہ بہت دور دراز مقام پر لڑکی کرتا تھا اور مسٹر فلپ کو خالی خطوط پر گزارا کرتا پڑتا تھا۔ شاید اسے خاوند کی جسمانی موجودگی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی ہو مگر مسلسل تنہائی اسے کھائے جا رہی تھی۔

جب کبھی مسٹر فلپ کو اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہوتا تو اسے غصہ آ جاتا۔ اس وقت اس کا بھی چاہتا کہ کوئی ایسا ساتھی ہو جس پر وہ اپنا غصہ اتار سکے۔ یہ کیا زندگی ہوئی کہ لڑنے والا بھی کوئی نہ ہو۔ پیار کرنے والا نہیں نہ سہی۔ لڑنے والا بھی ہو تو۔ اس وقت وہ بغیر وجہ اپنے انجمن سے لڑنے کی شدت سے کوشش کرتی مگر اس کے ماتحت نہ جانے کس مٹی سے بنے ہوئے تھے۔ جواب میں سر جھکا کر اس کے روبرو کھڑے ہو جاتے۔ ”لیس میڈم ساری میڈم۔“

ان بات پر میڈم کو اور غصہ آتا اور آنکھیں دکھاتی منہ بناتی اور فر فر انگریزی بولتی جسے سن کر ان کے رہے سے اوسان بھی خطا ہو جاتے اس پر مسٹر فلپ مایوس ہو کر کمرے میں جا کر رو دیتی لانے سے دل کی بھڑاس نہ نکلتی تو مسٹر فلپ کو ایک لمبا خط لکھنا شروع کر دیتی۔

مسٹر فلپ کے دفتر والے سمجھتے تھے کہ میڈم کی بات سمجھ میں نہیں آتی کبھی ہنسی ہے ہنسنے لگتا ہے کبھی بغیر وجہ گرجنا شروع کر دیتی ہے۔ خواہ تنخواہ ابھرتی ہے۔ منہ کو آتی ہے اور پھر بیٹھ

”کہاں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”نیا شہر۔“ محمود نے جواب دیا۔

”لیکن تم تو لائل پور ہونا۔“ ایللی نے پوچھا۔

”اونوں۔“ محمود بولا۔ ”دفتر تبدیل ہو کر نیا شہر میں چلا گیا ہے۔“

”اب غصہ میں آنے کا کیا فائدہ۔“ مسٹر فلپ نے کہا۔

”محترمہ۔“ وہ بولا۔ ”اس شخص نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔“

”کوئی نئی بات ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”تو چھوڑو۔“ وہ بولی۔

اور موٹر پھر چل پڑی۔ رات لاہور رکنے کے بعد اگلے روز وہ تینوں نیا شہر جا پہنچے۔

## مسٹر فلپ

مسٹر فلپ اوجڑ عمر کی عورت تھی۔ لیکن وہ یوں چلتی پھرتی اٹھتی تھی۔ جیسے ابھی جوان ہوئی ہو اور اسے اس انوکھی زندگی سے جو اس کے گرد پھیلی ہوئی تھی۔ والمانہ عشق قلمہ و مسرت بھری حیرت سے ہر چیز کی طرف دیکھتی جیسے اس نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا ہو۔ بچوں کی طرح تالیاں بجاتی اور پھر چاہتی کہ کسی اور کو کھائے۔ اس تازہ مسرت میں کسی اور کو اپنا شریک بنائے۔ اس کے لئے زندگی سکون اور اطمینان نہیں بلکہ مسلسل حرکت مسلسل مسرت اور مسلسل تنگ و دو تھی۔ غالباً اسی وجہ سے وہ زندگی کی خوشیوں میں پندرہ افراد کو شریک کر چکی تھی اور اب مسٹر فلپ اس کا سولہواں خاوند تھا یا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس قدر ذہانت اور چمک کی مالک تھی کہ کوئی اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا اس کے ہمراہ چلتے تو تھے لیکن بہت جلد تھک کر پیچھے رہ جاتے۔ پھر وہ محسوس کرنے لگتی کہ وہ اکیلی ہے تنہا ہے۔ اس بات پر اسے غصہ آنے لگتا۔ اس وقت اس کی خواہش ہوتی کہ کوئی اس سے محبت کرے یا لڑے، بھٹ کرے، اپنا پانی سے بھی گریز نہ کرے۔ اسے جمود سے نفرت تھی۔ سکون ایک بھیانک چیز دکھائی دیتی تھی۔ اسے ہر بات گوارا تھی۔ سکون سے نکال کر پھر سے محترمہ کر دے چاہے وہ حرکت کس قدر شدید اور خطرناک کیوں نہ ہو بلکہ ہو تو اور بھی اچھا۔ مسٹر فلپ کے لئے واحد خطرہ سکون تھا۔

میڈم کو اس بات پر غصہ آتا کہ ابھی یہ لڑکی مناسب طریقے سے باتیں کر رہی تھی اب منہ بننے لگی لفظوں کو روکنے لگی۔ آنکھیں چمکانے لگی۔ رکنے لگی۔ کھل متاگئے یہ کیا کڑ بڑ ہے۔ سمجھنے لگی کہ لڑکیوں محمود کے رد برو آ کر دھک جاتی ہیں۔ اسے پتہ نہ تھا کہ محمود اپنے ماتھے کی ٹخن آتا رہتا ہے۔ دو ایک بار میڈم نے اعلان یہ محمود سے اس تبدیلی کی بات کر دی جو اس کی موجودگی میں لڑکیوں میں ظاہر ہوتی تھی۔ اس پر محمود گھبرا گیا اور اسے غصہ آ گیا اور اس کا میڈم سے اور بھی سخت ہو گیا۔

ایک روز جب میڈم نے کہا۔ ”تم نے دیکھا کلرک جب اس لڑکی نے تمہیں دیکھا تو اس ہاتھ میں پن ٹیک کرنے لگا۔ حتیٰ کہ خط بدل گیا۔“

میڈم کی ایسی بات پر محمود کو غصہ آتا تھا۔ ”تو پھر تمہیں کیا۔“ وہ دل میں کہا کرتا۔ اس روز اسے بہت ہی غصہ آیا۔

وہ ابھی غصے میں بھرا بیٹھا تھا کہ مالی پھول لے آیا۔ میڈم نے پھول دیکھ کر گویا خوشی سے چیخ ماری۔ ”یہ دیکھا تم نے کلرک۔“ وہ چلائی ”کتنے خوبصورت پھول ہیں یہ دیکھو تو۔“

محمود نے منہ موڑ لیا۔ ”نہیں میں نہیں دیکھتا۔“ اس کے منہ سے نکل گیا۔

میڈم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

کئی ماتحت نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ شاید اسے غلطی لگی ہو۔ شاید کلرک نے غلطی سے نہ کر دی ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ادنیٰ ماتحت مجھ سے لڑنے کی کوشش کرے۔

”تمہیں دیکھنا پڑے گا۔“ وہ شدید جوش میں بولی۔

”یہ میرے فرائض میں سے نہیں ہے۔“ محمود نے گھور کر میڈم کی طرف دیکھا۔

میڈم کا منہ سرخ ہو گیا۔ شاید خوشی سے پھر وہ غصے میں چلانے لگی۔ یا شاید لڑائی کے اس نئے انداز پر خوشی سے چیخ رہی ہو۔

”یہ کوئی بات کرنے کا طریقہ نہیں ہے کلرک۔“ وہ بولی۔

”میڈم یاد رکھئے کہ میرا نام کلرک نہیں محمود ہے۔“ محمود نے کہا اور پھر خراں خراں ہل پڑا۔ جیسے شاہ کا پارٹ ادا کرنے کے بعد ایکٹر بڑے رعب سے سٹیج سے باہر چلا جاتا ہے۔

میڈم حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

اگلے روز جب محمود دفتر آیا تو وہ جان بوجھ کر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ ورنہ عام طور پر اس

کر آنسو بہانے لگتی ہے۔ نہ جانے کیسی افسر ہے گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ ابھی معطل کر کے کی دمکی دے رہی تھی اب چڑاسی کے ہاتھ بادام بھیج دیئے کہ پشاور سے آئے ہیں تم بھی کلو۔

”محمود نے جب نئی آسامیوں کا اشتہار دیکھا تو تقریباً ایک عرضی دے دی تھی۔ اس وقت اسے علم نہ تھا کہ ویلیفیر کے محکمہ میں زیادہ تر کارکن عورتیں اور محکمہ کا چیف بھی عورت ہے۔ عورتوں کے متعلق محمود کا رویہ عجیب تھا۔ اگرچہ وہ عاشق قسم کا فرد نہ تھا پھر بھی اسے عورتوں سے بے حد دلچسپی تھی۔ ایسی دلچسپی جو ایک نارمل مرد عورت سے محسوس کرتا ہے۔ لیکن ماتحت ہی اسے عورت سے ڈر لگتا تھا۔ وہ ان سے گھبراتا تھا۔ ساتھ ہی انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی شدید کوشش کرتا۔ یہ ظاہر نہ ہونے دیتا کہ توجہ جذب کرنے کی کوشش کر رہا ہے یا انہیں خیراز معمول اہمیت دے رہا ہے بلکہ اس کے برعکس وہ بے پروائی کا لبادہ اوڑھے رکھتا اور ماتحت پر یوں تیوری جمالیتا جیسے نسوانی سحر سے مستنہ ہو۔ پھر موقع ملے پر ایک شدت بھری نگاہ ڈالتا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا۔ گلیڈ آئی چکاتا اور پھر تیوری چڑھا کر یوں منہ موڑ لیتا جیسے جانتا ہی نہ ہو۔

## میڈم اور محمود

جب وہ نیا نیا اس محکمے میں گیا تو عورتیں ہی عورتیں دیکھ کر گھبرا گیا۔ لیکن اس گھبراہٹ کے ساتھ ہی دلچسپی بھی محسوس کی۔ بہر حال اس نوکری میں سب سے بڑی وقت یہ تھی کہ اسے محکمہ کی چیف یعنی میڈم سے کام کرنا پڑتا تھا۔ میڈم کو دیکھتے ہی محمود نے تیوری چڑھائی اور یوں کام میں محو ہو گیا۔ جیسے اسے عورت اور مرد کی تمیز ہی نہ ہو۔ لیکن ویلیفیر کی کئی ایک کارکن بڑی بائگی تھیں۔ کئی ایک شوخ تھیں۔ ایسے حالات میں بھلا ہر وقت پیشانی پر تیوری چڑھائے رکھنا کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ لہذا جب میڈم کی توجہ ادھر ہوتی تو وہ کارکن پر آنکھ چکاتا اور پھر کام میں مصروف ہو جاتا۔

آنکھ چکا کر دفعتاً پھر سے پھر ہو جانے کے فن میں محمود کا جواب نہیں تھا۔ لیکن وقت یہ تھی۔ کارکنیں بالکل ہی نوجوان تھیں۔ وہ اس کی نگاہ کی متحمل نہ ہو سکتی تھیں۔ پھل کر موم جاتیں اور موم سے چھینے اُڑتے اور میڈم پر جا پڑتے۔ اس پر میڈم کو غصہ آ جاتا۔



کہ کلرک کو مردوں کا سا برتاؤ کرنے کا حق ہے یا شاید اس لئے کہ اس کا خاوند اتنی دور کیوں رہتا ہے وہ غصے سے بھوت بن جاتی۔ ہر صورت میڈم اور محمود کے درمیان عجیب چپقلش برپا ہو گئی۔ غالباً محمود کی خواہش تھی کہ کسی وجہ سے میڈم ناراض ہو کر اسے واپس اپنے گھر میں بھیج دے۔ اس لئے اس نے جان بوجھ کر میڈم کی باتوں کو رد کرنا شروع کر دیا اسے غلط طور پر علم نہ تھا کہ ایسی باتیں کر کے وہ میڈم کو احساس دلا رہا ہے کہ وہ کلرک نہیں مرد ہے اور میڈم چیف کے علاوہ عورت بھی ہے۔

اس کے بعد محمود نے مسز فلپ کے نجی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ یہی تو وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کے معاملات میں دلچسپی لے اس سے جھگڑے مشورے دے تاکہ اسے ایک ماضی کی موجودگی کا احساس ہو

اگرچہ مسز فلپ تنخواہ ملتے ہی ایک معقول رقم مسز فلپ کو بھیج دیا کرتی تھی۔ لیکن جلد ہی فک کی زیادتی کا تذکرہ ہوتا اور عام ضروریات مثلاً "سگریٹ و سکی کافی کی کمی کی شکایت ہوتی۔ مسز فلپ پھر کچھ روپیہ بھیج دیتی۔ لیکن جلد ہی پھر ایسا ہی خط موصول ہوتا۔ پھر روپیہ بھیجنے کے علاوہ صبح شام مسز فلپ کی پریشانیوں کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ اس نے کبھی ان مطالبات کا برانہ نہ کیا بلکہ اکثر وہ اس قدر روپیہ ارسال کر دیتی کہ خود اپنی ضروریات میں تخفیف کرنی پڑتی اور اب بھی ہوتا تھا کہ اسے خود کھانے پینے کے لئے قرض لینا پڑتا تھا۔

### سزھواں لے پالک

ایک روز جب وہ مسز لے پالک کو دوسری قسط ارسال کر رہی تھی تو محمود نے کہا۔ "میڈم یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ آپ نقد روپیہ بھیج دیتی ہیں اور مسز فلپ اسے اوھر اوھر نقد کر دیتے ہیں اور سگریٹ اس کی تمام ضروریات و سکی کی پوری ہوئے بغیر رہ جاتی ہیں۔"

"تو میں کیا کروں۔" میڈم چلائی۔  
"یہ بات ہے۔" محمود بلا۔ "روپیہ کی جگہ سگریٹ و سکی چائے کافی وغیرہ بھیجے تاکہ ضروریات پوری ہو جائیں۔"

"ج"۔ وہ چلائی اور بچوں کی طرح خوشی سے تلبیاں پلٹنے لگی۔ "یہ بات تو مجھے سوچھی ہی ملے۔"

"جی تو سمجھا رہا ہوں۔" وہ ہنسا۔

کا دستور تھا کہ آتے ہی پہلے میڈم سے ملا کام کاج کے متعلق پوچھتا اور پھر کام میں مصروف ہو جاتا۔

کچھ دیر کے بعد ملی آیا۔ "میں صاحب بلاتی ہیں۔"

"اچھا محمود نے کہا۔" کام سے فرصت ہو گئی تو آؤں گا۔"

ملی کو گئے ابھی دیر نہ ہوئی تھی کہ میڈم خود آگئی۔ وہ بولی۔ "مجھے پھول نہیں دکھائے بلکہ خط کا جواب لکھواتا ہے۔"

"ہوں" محمود نے سر ہلایا اور اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔

اس روز میڈم بے حد خوش تھی وہ بار بار محمود کے کمرے میں آتی اور اسے کوئی نہ کوئی بات سمجھا کر یا بتا کر چلی جاتی اور کچھ دیر کے بعد پھر لوٹ آتی۔ محمود کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا رویہ کیوں بدلا ہوا ہے۔ اس نے کلرک کی جگہ مسز محمود کہہ کر اسے پکارنا کیوں شروع کر دیا ہے۔

شاید وہ یہ سمجھتا تھا کہ میڈم اس کی امداد کے بغیر کام نہیں چلا سکتی تھی۔ چونکہ دفتر کے دوسرے کلرک قابلیت اور ذہانت سے خالی تھے اور روز مرہ کے معمولی کام کے علاوہ کچھ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ محمود کو اپنی قابلیت پر اعتماد تھا اور یہ اعتماد مزید مشکلات کا باعث تھا۔ ایک روز میڈم محمود کا لکھا ہوا خط پڑھ کر بولی۔ "ٹھیک ہے لیکن متاثر کے لفظ کے بچے ٹھیک کر لو۔"

"ہوں۔" محمود بولا اور اس نے میڈم کے سامنے وہ خط لفافے میں بند کر کے ڈیسک پر رکھ دیا۔ "اسے ابھی ڈسپچ کر دو۔" وہ بولا۔

"لیکن میں کہہ رہی تھی متاثر کے بچے ٹھیک کر کے بھیجو۔"

محمود بڑے اطمینان سے خط کی نقل اٹھائی پھر آکسفورڈ ڈکشنری لے کر وہ نقل اور ڈکشنری میڈم کی طرف بڑھا دی۔

اس بات پر میڈم بخپا ہو گئی۔ "میں نے کہا تھا کہ تم بچے دیکھ لو۔"

"میں تو وثوق سے جانتا ہوں کہ بچے ٹھیک ہیں۔" محمود بولا میڈم اپنی تسلی کر لیں۔

محمود کے اس کے اس قسم کے طرز عمل سے میڈم چونکی اور اسے محسوس ہوتا کہ وہ ایک مرد سے بات کر رہی ہے کلرک سے نہیں۔ غالباً اسے اپنا خاوند یاد آ جاتا اور پھر شاید اس خیال

پہلے پہل نکلی۔ تو پھر اس کا زاویہ نگاہ بدلنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے صورت حالات کو  
چمکے لئے اس نے آٹھ یوم کی رخصت لی۔ اور اطلاع دیئے بغیر نئے شہر آگیا۔ دن بھر وہ  
نیا شہر روٹ روٹ میں بیٹھا رہا۔ جب رات پڑی تو چھپ کر گھر آیا۔ آکر اس نوکر سے ملا جس  
اطلاع ہم پہنچائی تھی۔ نوکر ہنس کر بولا۔ ”صاحب وہ تو اس وقت بھی اندر کمرے میں بیٹھے  
ہو۔ وہیں ایک عورت ہے اور میڈم ہے۔“

یہ سن کر مسٹر فلپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے سب نوکروں کو اکٹھا کیا۔ ایک  
طرف کیا۔ جس کے مطابق ایک نوکر نے بجلی کا مین سوچ بند کر دیا اور باقی سب نے اس  
پر ہاتھ بول دی جس میں ایلی محمود میڈم اور نانہہ پرچے دیکھنے میں مصروف تھے۔

بجلی بند ہوتے ہی کمرے میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ محمود نے ایک چنگھاڑی ماری۔ میڈم  
نے لگی۔ نانہہ چیخ رہی تھی۔ ایلی حیران تھا کہ ماجرہ کیا ہے ایک جو تا اس کے سر پر پڑا۔ ارے  
ٹوٹا۔

کمرے میں سے عجیب و غریب آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ڈر گیا۔

کمرے کی ایک کھڑکی کھلی تھی۔ محمود نے باہر چلا گیا لگا دی اور پھر جیتنے لگا۔ ”ایلی“

نور کی آواز سن کر ایلی کا دل بیٹھ گیا اس نے خطرے کو شدت سے محسوس کیا اور وہ کھڑکی  
کھل بھاگ اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ محمود اور ایلی چپ چاپ دیران گلی میں دوڑ  
پڑے۔

”لیکن بات کیا تھی۔“ ایلی پوچھ رہا تھا۔

”ناہوش۔“ محمود کا رویہ اسے اور بھی ڈرا رہا تھا۔

”لیکن تمہارے قریب پہنچ کر محمود رک گیا۔ بولا۔ ”گھر جانے میں خطرہ ہے۔“

”لیکن کیوں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”مگر وہ پولیس لے کر ہمارے گھر آئیں۔“

”لیکن کون۔“ ایلی نے پوچھا۔

”نہی۔“ محمود بولا۔ ”جو وہاں میڈم کے گھر آئے تھے۔“

”تو کتنے کون؟“ ایلی نے پوچھا۔

”ج۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”تمہارے بغیر۔“ وہ دفعتاً رک گئی۔ اس لفظ  
غالباً پہلی مرتبہ واضح طور پر اس حقیقت کا اظہار کرتے کرتے اس نے خود کو روک لیا۔ محمود  
بھی بات کو پانہ سکا اور مسٹر فلپ اس حقیقت کو واضح طور پر پانے کے بعد شدت سے اسے فخر  
انداز کرنے اور بھول جانے کی کوشش میں کھو گئی۔ جب ایلی ان کے ساتھ نیا شہر پہنچا تو ان دونوں  
کی کچھ ایسی کیفیت تھی۔ وہ پانہ سکا تھا وہ پاچکی تھی۔ لیکن نظر انداز کرنے کی کوشش میں شدت  
سے مصروف تھی اور مسٹر فلپ نقد روپیہ کی جگہ اشیاء کی چینی موصول کر کے حیران رہ گیا تھا  
ایسی بات تو کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس کی پیاری بیوی تو ہمیشہ اسے نقد روپیہ بھیجا کرتی تھی اور سی  
آرڈر سے نہیں بلکہ تار کے ذریعے اور آج غیر معمولی سگرت کے ڈبوں اور دسکی کی بوتلوں کی  
پٹی اس کے روبرو پڑی تھی۔ خیر اشیاء تو کچھ بری نہ تھیں لیکن وہ اس افراط سے بھیجی گئی تھی کہ  
مہینہ بھر مطالبہ کرنے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ اور نقد روپیہ وصول کرنے کی کوئی امید نہ تھی۔  
یہ دیکھ کر وہ چڑ گیا۔ نہ جانے میری بیوی کو کون ایسے گرتا رہا ہے۔ ورنہ وہ تو مز  
محسوس کرنا جانتی ہے۔ سوچنا نہیں۔

مسٹر فلپ نے اس بھید کو جاننے کے لئے اپنے ذرائع استعمال کرنے شروع کر دیے اور  
غالباً گھر کے کسی نوکر نے مسٹر فلپ کو صورت حالات سے واقف کر دیا۔

ایلی کے نیا شہر پہنچنے پر میڈم کو یاد آیا کہ ویلفیر کے طالب علموں کے پرچے جو اس کے ہاں  
دیکھنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ انہیں چیک کر کے واپس کرنے کی تاریخ سر پر آنا  
پہنچی تھی۔ اس لئے اس نے محمود کو بلایا اور اس نئی مشکل کا تذکرہ کیا۔

محمود نے کہا۔ ”میڈم اس میں کیا مشکل ہے۔ اگر ہم چار شخص بیٹھ جائیں تو ایک رات  
میں بارہ سو پرچے ختم کر دیں گے۔ میں ہوں ایلی ہے۔ آپ ہیں اس کے علاوہ آپ کی ڈی  
نانہہ ہے۔“

میڈم کو یہ تجویز پسند آئی اور ایک رات وہ چاروں میڈم کی کوٹھی کے بڑے کمرے میں  
بیٹھ گئے۔ تاکہ پرچے دیکھ کر صبح سویرے انہیں واپس بھیجوا دیں اور اس اہم فرض سے بیکار  
ہو جائیں۔

اور مسٹر فلپ کو جب معلوم ہوا کہ میڈم کا ایک کلرک اسے ایسے دیے مشورے سے ہوا  
ہے تو اس نے سوچا کہ اس مصیبت کو کسی طرح شروع شروع میں ہی ٹالنا چاہیے ورنہ اگر سزا

”کیا ہے کہ اگر جلدور اسکول میں مزید کسی قسم کی گزربز ہوئی تو زبردست ایکشن لیا جائے گا۔  
جب وہ گھر پہنچا تو افضل خاموش بیٹھا تھا۔ ”تم آگئے۔“ وہ بولا۔

”ہوں۔“ ایللی نے کہا۔

”کلیں رہے اتنے دن۔“

”پہن گیا۔“

”ہوں۔“ وہ خاموش بیٹھا حسب عادت پاؤں ہلاتا رہا۔

”ایلی۔“ وہ بولا۔

”مئی۔“

”جیس معلوم ہوا۔“

”کیا؟“

”تمہاری تبدیلی ہو گئی ہے۔“

”ہی۔“

”تم جاؤ گے؟“

”جانی پڑے گا۔“

”ہوں۔“ تم چلے جاؤ گے تو میں کیا کروں گا۔“ افضل کی آواز کانپ رہی تھی۔

”اگر ہمیں معلوم ہوتا۔“ شبیر بولا۔ ”تو یہ کام ہی نہ کرتے۔“

”پتہ ہے۔“ احمد نے کہا ”شیخ کی ترقی رک گئی ہے۔“

”اس سے ہمیں کیا فائدہ۔“ افضل نے کہا۔ ”پتہ ہے مولوی کا کیا حشر ہوا۔“

”کیا؟“ شبیر نے پوچھا۔

”پانگل خانے میں ہے۔“

”کیا واقعی۔“ ایللی نے پوچھا۔

”جی۔ ایک آدمی خود مل کر آیا ہے اسے ہوش کھو بیٹھا ہے۔ ہماری محنت بالکل اکارت گئی۔

”لی کو بچا سکے نہ شیخ کو توڑ سکے پتہ ہے مسٹر معروف نے کیا کہا تھا۔“ شبیر نے پوچھا۔

”گلب۔“

”تمہارے جانے کے بعد ایک دن پھر آئے تھے۔“ شبیر بولا۔ ”سب اساتذہ کو اکٹھا کر کے

”معلوم نہیں۔“ لیکن مجھے خطرے کی بو آتی ہے۔ دشمن وار کرنے سے نہیں چمکے گا۔“

”تو پھر۔“ ایللی نے پوچھا۔

”ہمیں گھر نہیں جانا چاہیے۔“

”لیکن اس وقت گلیوں میں آوار گردی کرتا بھی تو ٹھیک نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ چلایا۔ ”چلو ریلوے سٹیشن کے مسافر خانے میں جا بیٹھیں۔“

صبح سویرے ہی محمود نے ایللی کو کہنی ماری۔ ”اب دن چڑھنے کو ہے۔“ وہ بولا۔ ”اب یہاں

بیٹھنا ٹھیک نہیں۔“

”تو پھر جائیں کہاں۔“

”باہر دور۔ کسی دیرانے میں۔“ محمود بولا۔ ”جب تک ہمیں صورت حال کا علم نہ ہو ہمارا

پایا جانا ٹھیک نہیں۔“ وہ دونوں نیا شہر کی مشہور ندی کرن کی طرف چل پڑے اور ٹیلوں میں جا

چھپے۔

اوجھڑ میڈم کو جب معلوم ہوا کہ یہ حرکت اس کے خاوند نے کی تھی اور اسے شک تھا کہ

میڈم اور محمود کے درمیان ناجائز تعلقات ہیں تو وہ ضد میں آگئی اور ایک جیل سے اس نے اپنے

شوہر کو خاموش کر دیا ”ناجائز تعلقات کو جائز بھی بنایا جاسکتا ہے۔ مسٹر فلپ مجھے روکنے والے تم

کون ہو۔“

پھر مسٹر فلپ اس کے قدموں میں گر کر رہا تھا۔ اظہار محبت کر رہا تھا اور میڈم یوں پھر

بنی بیٹھی تھی جیسے وہ ماں جو — اپنا اکلوتا بیٹا سپرد خاک کرنے کے بعد قبرستان سے لوٹی ہو۔

غالباً وہ اپنے ستر ہواں لے پانک کے متعلق سوچ رہی تھی اور اس کا ستر ہواں لے پانک اس

موہوم خطرے سے بے خبر سما ہوا بیٹھا تھا۔

**پہلی ٹھوکر**

ایللی واپس جلدور پہنچا تو سکول پر سکوت طاری تھا۔ اساتذہ اس تھے اور ایللی کے ساتھی

گھنٹوں میں سردیے بیٹھے تھے۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ شیخ مسعود اور وہ خود تبدیل کر دیے

ہیں اور جلدور کے تمام اساتذہ کو وارننگ کا ایک خط موصول ہوا ہے۔ جس میں مسٹر معروف نے

وہیں اس کے ساتھ میں تمہاری قابلیت کا بھی معترف ہوں۔" شیخ کی آواز جذبے سے کلاب  
 لہجہ اس کی آنکھیں غم ناک تھیں۔  
 میں حرا ہی سی لیکن ایسے آدمی کی دوستی اچھی ہوتی ہے۔" ہاتھ ملاتے ہوئے وہ کہنے  
 لگا "تمہاری میں میری یہ پہلی ٹھوکر ہے۔"  
 ٹھوکر تو لگی ہی نہیں۔" افضل مسکرا کر بولا۔  
 "مگر ہے۔" شیخ نے جواب دیا۔  
 صرف ترقی ہی بند ہوئی ہے نا۔" افضل نے کہا۔  
 "ٹھوکر دل پر لگتی ہے تنخواہ پر نہیں۔ اچھا خدا حافظ۔"

پرائیوٹ

جلد را چھوڑنے کے بعد ایللی کا دل پھر سے اچٹ ہو گیا۔ محبت کے متعلق اس کے احساسات  
 لہجہ پیدا ہو چکی تھی۔ اب زندگی میں پہلی مرتبہ اسے دوسرے پہلو کی تلخی کا احساس ہوا تھا۔  
 ایللی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کیا یہ زندگی ہے۔ کیا زندگی میں انصاف کو دخل نہیں۔ کیا اللہ میاں  
 لہجہ مسرور کی طرح خالی ایڈ مسٹریشن کر رہے ہیں۔ کیا وہ بھی ایک ہیڈ ماسٹر ہیں۔  
 سکول کی فضا سے وہ بے زار ہو چکا تھا۔ یہ ادارے جہاں ملک کی آئندہ نسلوں کی تشکیل ہو  
 گی۔ اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر کی عجیب و غریب ذہنیوں کی وجہ سے تعفن سے بھرے ہوئے  
 لہجہ اساتذہ کے انداز میں خود پرستی جاہلیت اور جھوٹے وقار کی جھلک تھی اور ان پر بے حسی کا  
 لہجہ لگا ہوا تھا۔ ان کے خیالات میں وسعت کا فقدان تھا۔ گھریلو معاملات کے الجھاؤ کا عکس ان  
 لہجہ لہجہ میں جھلکتا تھا۔ وہ علم کی ظاہری شکل پر مرکوز تھے۔ مفہوم ان کی نگاہ سے اوچھل  
 لہجہ لہجہ کی نگاہ میں وہ سب کیڑے تھے۔ ریٹنگنے والے کیڑے، سینٹرل ماڈل سکول کے کلاس  
 لہجہ لہجہ کی طرح وہ چھڑی کے سہارے چل رہے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ چھڑی ہاتھ میں ہو تو  
 ہر مشکلات دور ہو جاتی ہیں۔

اور ایللی کو سب سے بڑا ڈر تھا کہ ایک روز وہ بھی ویسا ہی ہو جائے گا۔ وہ بھی خلاصوں میں  
 لہجہ لہجہ کی تلویوں کو علم سمجھنے لگے گا۔ بچوں کے ذہن پر آہنی پابندیاں ڈالنے کو اخلاق سے تعبیر  
 لہجہ لہجہ کا اور پھر وہ بھی ہیڈ ماسٹر بن جائے گا۔ اس خیال پر اس کا دل دھک سے رہ جاتا۔

وعظ فرمایا تھا۔"  
 "کیا کتنا تھا۔"  
 "کہنے لگے۔ سب ہیڈ ماسٹر ایسے ہی ملیں گے۔ تم خود ہیڈ ماسٹر بنو گے تو ایسے ہی ہو جاؤ  
 گے۔"

"سچ کہتا ہے۔" افضل بولا۔  
 "اللہ بچائے۔" ایللی نے کہا۔  
 اور وہ سب گہری سوچ میں پڑ گئے۔  
 دروازہ بجا تو وہ چونکے۔  
 "میں اندر آ سکتا ہوں۔" کسی نے باہر سے پکارا۔  
 "آ جاؤ میاں۔" افضل بولا۔ "میاں۔"  
 کسی نے نووارد کی طرف نہ دیکھا۔  
 "یہ شیخ مسعود بڑا حرا ہی ہے۔" افضل بولا۔ "اس کا ہم کچھ نہ بگاڑ سکے۔"  
 "یہ تو غلط ہے۔" نووارد نے کہا۔  
 "انہوں نے نووارد کی طرف دیکھا۔ سامنے خود شیخ مسعود کھڑا مسکرا رہا تھا۔  
 "تم نے میری وہ پٹائی کی ہے۔" وہ تہقیر مار کر ہنسا۔ "جو آج تک کوئی نہ کر سکا تھا۔ میں  
 تمہاری عظمت کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔"  
 "نہیں شیخ صاحب۔" افضل نے کہا۔ "جو تم نے مولوی کے ساتھ کیا ہم اس کا انتقام نہیں  
 لے سکتے۔"

"اچھا تم مولوی کا انتقام لے رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا یا اللہ آخر آصفی کا میرے خلاف  
 ہو جانا کس وجہ سے ہے میں نے آج تک آصفی کے خلاف کچھ نہیں کیا لہذا مجھے آصفی سے الگ  
 لگاؤ سا ہے۔ کیوں آصفی صاحب کیا یہ سچ ہے کہ تم مولوی کا انتقام لے رہے تھے۔" "سچ ہے۔"  
 ایللی بولا۔

"ہاں۔" شیخ نے سر جھکا لیا۔ "مولوی سے مذاق میں زیادتی ہو گئی۔"  
 "بہر حال میں چاہتا ہوں کہ ہم دوستوں کی طرح جدا ہوں۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔  
 آج سے تم میرے دوست ہو۔ ہمیشہ ہی تھے۔ میرے دل میں تمہارے خلاف فضا

نہ لے پر مچاتی پھرے گی۔

اے ری میں تو پریم دیوانی میرا درد نہ جانے کو

ملدی کے نعوش ایللی کے دل سے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ غالباً اس لئے کہ اس کا چہرہ بہ جسم دکھائی دیتا۔ اس کا جذبہ ہمیشہ جوان نظر آتا۔ اس کا خیال ہمیشہ ایللی کے دل میں زندگی رہتا۔ اس کا تصور پیش کرتا۔ سادی کے خیال کے ساتھ آتش رقابت کی جلن محسوس نہ ہوتی۔ اس سادی کی محبت پر کبھی شک پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس نے کبھی کسی رقیب کے وجود کے انکار کے متعلق نہ سوچا تھا۔ کوئی خیالی رقیب پیدا نہ کیا تھا۔ شاید اس کی ضرورت نہ محسوس کی۔ یہ سادی کا خیال ایللی کے لئے زندگی اور رنگینی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ اکثر سوچتا اگر وہ ملتی سے منسلک ہو جاتا۔ اگر رکاوٹیں نہ ہوتیں اگر ابایوں قطعی طور پر انکار نہ کرتے اگر ان کے انکار کے باوجود وہ آگے قدم بڑھا سکتا۔ اگر سادی یہ اعلان نہ کرتی کہ وہ اس سلسلے میں مجبور ہے۔ اگر اس کے انداز میں قطعیت نہ ہوتی۔ اگر وہ اتنی دور گروکل ریاست کو مراجعت نہ کر دیتا۔ ایسی ریاست جس کا وجود ایللی کے لئے اس قدر مہموم تھا۔ جیسے وہ الف لیلیٰ کا شہر ہو۔ تو ایللی سادی سے شادی کر کے کتنی اچھی زندگی بسر کر سکتا۔ لیکن شاید یہ خیال اسے صرف اس لئے آقا کا کہ وہ سادی سے شادی کر کے شہزاد سے انتقام لے سکتا تھا۔

جلور سے تبدیل ہو کر جب وہ چمک بالا پہنچا تو چند ہی دنوں کے بعد اسے جمیل کا ایک تار لکس میں لکھا تھا گرد کل ریاست سے ایک خط موصول ہوا ہے یہاں آؤ تو ملے گا۔

### نٹالو اور چنگاری

بہت دور خان پور پہنچا تو علی احمد پنچے جھاڑ کر اس پر جھپٹ پڑے۔

”یہ ایللی نے تو حد کر دی۔“ وہ بولے۔ ”مستر معروف کہہ رہے تھے کہ انکوٹری میں وہ بٹلی کیس آپ کے فرزند نے کیا بتاؤں اس کو تو وکیل ہونا چاہئے تھا۔ ہی ہی ہی۔“ وہ نے ”مستر معروف نے ایللی کی بڑی تعریف کی اور نصیر کی ماں پتہ ہے کیا کہنے لگتے۔ آخر کیوں نہ ہو کہ باپ کا بیٹا ہے۔ ہی ہی ہی۔ ساری تان مجھ پر توڑ دی۔ لیکن ایک بات ہے نصیر کی ماں نے تھے دستور کے مطابق ایللی کو پسند کر دینا چاہئے تھا۔“

”وہ کیا ہوتا ہے۔“ راجو نے پوچھا۔

”نہیں نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“

جلور کی سازش سے ایک فائدہ ضرور ہوا تھا۔ اس کے ذہن سے شہزاد کی بے وفائی کی کمی دور ہو چکی تھی۔ اگرچہ کائنات ویسے ہی لگا تھا لیکن اب وہ دردِ شیشے درد کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ شہزاد کی بے وفائی نے ایللی کے جذبے کو کم نہیں کیا تھا لہذا اسے قائم کر دیا تھا۔ تعزیت پیش دی تھی۔ طبعی طور پر ایللی بے وفا محبوب سے محبت کرنے والا شخص تھا۔ اس کے نزدیک محبت فرحت بخش جذبہ نہ تھا۔ بلکہ فرحت بخش جذبات تو اس کی نگاہ میں عیش پرستی کے مظہر تھے اور محبوب پر شک و شبہ کرنے کی عادت جو اس نے پال رکھی تھی اسی وجہ سے تھی۔ اگر محبوب بے وفائی نہ کرے تو اس کی محبوبیت کی حیثیت قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ اس پر مہموم بے وفائی تھوپ دی جائے اور خیالی رقیب قائم کر کے محبت کے جذبہ کو حقیقی بنالیا جائے۔

جب سے وہ شہزاد کے گھر سے نکلا تھا۔ ایللی کے ذہن میں شہزاد کی محبوبیت کو چار ہانڈ لگے تھے۔ اب وہ بے وفا حسینہ ایللی کے تخیل میں رقیب سے ہنسی کھیلتی نظر آتی تھی اور ایللی کی طرف دیکھ کر نفرت بھرا تہقنہ لگاتی ”تم۔“ اس کے ہونٹ تحقیر سے بڑا سا بن جاتے اور اس کا تہقنہ گو بختل اس پر ایللی محسوس کرتا کہ واقعی اسے شہزاد سے محبت ہے اور اس کی محبت کو عیش پرستی سے دور کا واسطہ بھی نہیں

اب وہ ایک سچے عاشق کی طرح اس امید پر جی رہا تھا کہ ایک روز شہزاد کی آنکھیں کھلیں گی اور وہ محسوس کرے گی کہ واقعی ایللی اس کا سچا عاشق تھا اور رقیب تو صرف مطلب پرستی کے لئے اس کا ساتھ بنا ہوا تھا۔ پھر وہ عفو کی طلب گار ہوگی اور آکر اس کے قدموں پر گر پڑے گی۔ مگر وہ سوچتا۔ میں اسے قدموں میں گرنے نہیں دوں گا۔ اس نے مجھے ذلیل کیا تھا لیکن میں اسے ذلیل نہ ہونے دوں گا۔ قدموں پر گرنا تو میرا کام ہے۔ میں قدموں پر گر پڑوں گا اور اس کا ہاتھ بڑھ کر مجھے تھپکے گا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جائے گی اور وہ رک رک کر کہے گی۔ مجھے معاف کر دو ایللی مجھے معلوم نہ تھا اس وقت میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں گا۔

پھر —

لیکن پھر کا کیا سوال۔ جس مقصد کے لئے وہ جی رہا ہے۔ وہ تو پورا ہو چکا ہو گا۔ پھر اس کا زندہ رہنے کا بھلا کیا فائدہ۔ پھر اس کے قدموں میں پڑے پڑے اس کی روح قفس غصہ سے پرواز کر جائے گی اور یہ دیکھ کر شہزاد کی چینیوں نکل جائیں گی اور وہ بیرنگن ہو جائے گی اور کئی کئی

”ہی ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”تمہیں کیا معلوم کہ کیا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نوکری سے چھٹی۔“

”ہے۔“ وہ چلائی۔

”ہاں۔“ علی احمد بولے ”لیکن ہمارا بیٹا ہے نا۔ سمجھی۔ کیا سمجھی؟“

ایلی کو اس پر غصہ آگیا۔

”یعنی آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی وجہ سے میں نوکری پر قائم ہوں۔“ ایلی نے دبا زبان سے کہا۔

”بالکل۔“ وہ بولے۔ ”ورنہ ایک دن بھی نوکری نہیں کر سکتے تم۔“ علی احمد جلال میں آ گئے۔

”یعنی مجھ میں ذاتی طور پر قابلیت نہیں کہ نوکری پر فائز رہ سکوں۔“

”لو۔“ راجو بولی۔ ”ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ معروف ایلی کی تعریف کر رہے تھے۔“

”ہی ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”تمہیں کیا پتہ۔ قابلیت کئی قسم کی ہوتی ہے۔ یہ قابلیت جو ایلی

میں ہے۔ نوکری شاہی کی قابلیت نہیں۔ یہ تو اپنے ہی پر چلانے کی قابلیت ہے۔ نہ یہ تیل دیکھ سکا

ہے۔ نہ تیل کی دھاریہ تو پٹرول میں چلتی ماچس پھینک سکتا ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

پھر انہوں نے ایلی کو نصیحت کرنا شروع کر دیں۔

”دیکھو ایلی۔ نوکری میں ہمیشہ اپنے امی جیٹ افسر کا ساتھ دینا چاہئے۔ سمجھے چاہے وہ اچھا ہو

یا جبرا غلطی کر رہا ہو یا ظلم۔ تمہیں اس سے کیا اور یاد رکھو تم پر کوئی ظلم نہیں کرے گا۔ کیے

کرے گا کیا اسے معلوم نہیں کہ تم کس کے بیٹے ہو اور ہمارے معروف سے کتنے تعلقات ہیں۔

یہ لوگ آنکھوں کے اندھے ہوتے ہر بات کی خبر رکھتے ہیں اور دیکھو نا اگر اپنے افسر کے خلاف

کوئی کارروائی کرنی ہو تو۔“ وہ بولے۔ ”تو خود کچھ نہیں کیا کرتے بلکہ دوسروں کو اکسا دیتا۔ دوتا

ہے نا تم نے نصیر کی ماں تم سے کیا چھپا ہے ہی ہی ہی ہی۔ ذرا ایلی کو سمجھا دو یہ مگر برا آرام

رہتا ہے۔“

ایلی کی باتوں سے اکتا کر ایلی جیل کی طرف چل پڑا۔ راستے میں نقی کے مکان پر رک گیا۔

دروازہ کھٹکھٹایا۔

”نقی صاحب کہاں ہیں؟“ اس نے نوکر سے پوچھا۔

”جی وہ تو شکار پر گئے ہیں۔“ نوکر نے کہا۔

”شکار پر؟“

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔

”کسی خاص تقریب پر گئے ہیں کیا؟“

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔ ”وہ تو اکثر شکار پر جاتے ہیں۔“

”ارے۔ وہ تو جوتے سیا کرتے تھے۔“

”جی ہاں جی۔“ نوکر ہنسا۔ ”پہلے جوتے سیا کرتے تھے آج کل شکار کھیلنے ہیں۔“

”ارے۔“ ایلی ہنس پڑا۔ ”پہلے چڑیاں کاڑھتے تھے۔ پھر جوتے سینے لگے اور اب شکار۔“

الٹا مٹھا

ایلی کو دیکھ کر جیل کی باچھیں کھل گئیں۔

”یار تم آگئے۔“ وہ بولا۔ ”بڑا اچھا کیا تم نے دو چار روز رونق رہے گی۔ مزا آجائے گا۔“

”اور وہ خط؟ کیا صرف مجھے بلانے کا بہانہ تھا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ بولا۔ ”تمہاری قسم۔ تم سے جھوٹ نہیں۔ تم سے جھوٹ نہیں بولا۔

آج تک کوئی چالاکی نہیں کی۔“

ایلی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ”پتے ہوئے ہو کیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”بھئی واہ۔“ وہ ہنسا۔ ”یہ کیا چھپانے کی بات ہے۔ بڑی بہادری کی تم نے کہ بوجھ لیا۔ اے

بلال جب خاموشی سے تمہاری بات سنوں تو سمجھ لو کہ خالی ہوں اور جب بات کروں تو سمجھ لو کہ

قائم ہوں۔“

”نفس وشر نہیں ہوتا اونہوں۔ زبان سے رنگ اتر جاتا ہے۔ بس اتنا صرف اتنا۔“ وہ

نہوش ہو گیا۔

”تم سمجھتے ہو۔“ جیل بولا کہ صرف تمہیں ہی سو جھتی ہیں۔ یہ غلط ہے شاید مجھے تم سے

بھی زیادہ سو جھتی ہیں تم سے بھی زیادہ انوکھی۔ لیکن جب تک مالٹا مٹھا کا ادھیا اندر نہ ہو زبان

لگ رہتی ہے۔ سال کو وہ رنگ لگا ہوا ہے کہ اترتا نہیں۔ تم پی کر آپے میں نہیں رہتے میں پی

کر اپنے آپ میں آ جاتا ہوں۔ بس اتنا فرق ہے۔“





## تجدید

### کیرا اور کویا

ایلی کے بن باس کو چار سال گزر چکے تھے۔

یہ چار سال اس نے مسلسل مطالعہ میں صرف کیے تھے۔ جس کی وجہ سے اس کے خیالات میں خاصی چٹنگی پیدا ہو چکی تھی مطالعہ سے حاصل کئے ہوئے کئی ایک نظریات کو وہ عملی زندگی میں آزما چکا تھا۔ اب اس میں خود اعتمادی پیدا ہو رہی تھی۔ اگرچہ بنیادی طور پر اس کے کردار اور شخصیت کی دیواریں اسی احساس کمتری پر کھڑی تھیں، لیکن اب اس کے برتاؤ سے اس حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ گونگا نہ رہا تھا۔ بلکہ اس کی گفتگو میں ایک جاذبیت پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے دوست اور ساتھی اس کی باتیں سننے اور سر دھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایلی نے الزما "زندگی کے متعلق ایک انوکھا نکتہ نظر استوار کر رکھا تھا۔ جو رسمی زاویوں سے ہٹ کر قلم دراصل اس کا انسٹیکول سلف ایک کولے کی حیثیت رکھتا تھا جس کے لئے اس کی جذباتی اتاکیرنے کی طرح چھپی ہوئی تھی۔ مطالعہ نظریات اور چٹنگی خیالات کا اس کے جذباتی اندر پر کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ جذباتی طور پر وہ ایک بچہ تھ۔ وہ بچہ مار کھا کر روتے روتے سو گیا تھا۔ ایلی کو یہ خوف دامن گیر رہتا کہ بچہ پھر نہ جاگ پڑے۔ اسے ڈر تھا کہ وہ جاگ پڑے گا۔ اور ہر سے بسورنا شروع کر دے گا۔ اس بات کا مطالبہ کرے گا۔ کہ میں اسے جھکے ہاتھ سے اس کی وابستگی جوں کی توں قائم تھی۔ اس کے گرد و پیش کئی ایک نوجوان لڑکیاں تھیں جو پردوں سے

جانبی نہیں قہقہے لگا کر آواز نشر کرتی تھیں۔ شرابا کر چھپ کر ڈھونڈنے کی دعوت دیتی تھیں۔ ان میں دلفری تھی حسن تھا رعنائی تھی۔ لیکن مانتا نہ تھی۔ وہ جنگاتی تھیں تھپک کر سلاتی نہ تھیں ان میں پردگی تھی۔ لیکن گردنیں اٹھانے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس لیے وہ ایلی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں اور مانتا بھری تھپکی کی عدم موجودگی میں ایلی اپنے محنت سے پیدا کئے ہوئے انسٹیکول کوئے میں سوتا رہا۔ وہ ڈر تھا کہ کہیں بچہ جاگ نہ پڑے اسے آرزو تھی کہ وہ جاگ اٹھے۔ ڈھکی چھپی آرزو اور متا بھرے ہاتھ اسے تھپکیں تھپکتے تھپکتے اٹھا کر متا بھری گود میں ڈال لیں۔

اسی ڈر کے مارے چار سال وہ علی پور نہ گیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں سویا ہو بچہ پھر سے نہ جاگ پڑے وہ کویا جو اس نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ ٹوٹ نہ جائے اور لوگ اس حقیقت سے واقف نہ ہو جائیں کہ وہ وہی پرانا کیرا ہے۔ پلپلا۔ ریگلتا ہوا کیرا۔

اس کے باوجود جب کبھی علی پور سے کوئی آتا۔ وہاں سے خبر آتی تو ایلی کے کان کھڑے ہو جاتے۔ بظاہر بے پروائی دکھاتے ہوئے بڑی توجہ سے علی پور کی باتیں سنتا اور پھر تنہائی میں بیٹھ کر اپنے اٹھاک سے خبروں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جوڑتا اور پھر اندازے لگاتا کہ شنراؤ کا کیا حال ہے اور صفدر اور شنراؤ کے تعلق کے متعلق محلے والوں کا کیا خیال ہے کیا شریف حالات سے بے خبر ہے۔ کیا شنراؤ شریف کے ساتھ نہیں جاتی۔

شروع شروع میں محلے۔ جو خبریں آتی تھیں ان میں شنراؤ اور صفدر کا بہت چرچا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر دم نکلتا ہے وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر آوازیں دیتی رہتی ہے۔ وہ منڈیر سے جھانکتا ہے۔ "چچی سودا منگواؤ گی۔ آج تو کرلیے پکاؤ اور وہ جو زیور تم نے بولا تھا۔" کھڑکی میں کھڑا رہتا ہے دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں۔ وہیں کھڑے دوسرے ٹیم ہو جاتی ہے۔ نہ جانے ان کی باتیں ختم کیوں نہیں ہوتیں رات کو گرامو فون کو سرہانے بیٹھ کر گیت سنتے ہیں۔ آدمی رات بیت جاتی ہے۔ لیکن وہ اللہ کے بندے نہیں تھکتے۔

پھر آہستہ آہستہ باتیں رنگ بدلتی گئیں۔ صفدر کے شراب کے نشے میں دھت رہنے کی تمنا چل نکلی توبہ ہے۔ ہر وقت بوتل منہ سے لگائے رہتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ شنراؤ کا مال ہے لیکن لٹائے مفت کی توکتے ہیں قاضی بھی نہیں چھوڑتا اور صفدر تو بیچنے کا شرابی ہے پی کرونگا رہا ہے۔ بیوی کو بیٹتا ہے۔ جیج جیج کر شعر گاتا ہے۔

بہنیں خیر منائے گی۔ ہی ہی ہی ہی وہ ہنسنے لگے۔“  
جب وہ علی پور پہنچے تو محلے کا احاطہ محلے والیوں کی آوازوں سے گونجنے لگا وہ سب علی احمد کو  
پہنے لگیں۔

قلہ

”نہا“ ایللی کو خیال آیا۔ وہ گھبرا گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ احاطے کے میدان میں کھڑے  
ہاٹھارے سے خالی نہیں۔ اس نے چند ایک لمبے لمبے ڈگ بھرے اور ڈیوڑھی میں جا کر رک  
لیا اس کا دل ابھی تک دھڑک رہا تھا۔ باہر چیلیں جھج رہی تھیں۔ کوئے کائیں کر رہے  
تو ان میں علی احمد کے قہقہوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔  
”کون؟ علی احمد آیا ہے؟“

”نہا“ ایک مختلف نوعیت کی آواز سنائی دی۔ انوکھی۔ سرلی۔ پنجم آواز۔ ایللی کا دل ڈوب  
بد جسم میں لہرسا چلنے لگیں۔

”ہے یہ تو سارا قافلہ ہے کسی کو چھوڑ تو نہیں آئے پیچھے۔“  
”تو گھبراؤ نہیں۔“ علی احمد بولے۔ ”بسمی ساتھ ہیں۔ بسمی۔“ علی احمد نے قہقہہ لگایا۔ ”تو  
بات سنا شننا سنا ہے تو نے اپنے میاں کو علق کر دیا ہے۔“  
”وہ کیسے۔“

”لوگ کہتے ہیں کہ تو نے اسے رٹا کر دیا ہے۔“  
”عمر عمر کی بات ہوتی ہے، وہ ہنسی۔“  
”عمر تو ڈیوڑھی کی ہے۔ کیوں چاچی۔ جھوٹ کہتا ہوں کیا؟ ہی ہی ہی ہی۔“  
”اب کیا رہا ہے پیچھے۔“ پنجم گونجی۔  
”نگاہیں کھا گئیں تجھے۔“ علی احمد نے قہقہہ لگایا۔  
”نگاہوں کی بھیٹ جو چڑھا دیا اپنے آپ کو۔“ ماں مدھم آواز میں بولی۔

”ہی ہی ہی ہی۔“ علی احمد کا قہقہہ ایللی کے بند بند میں ٹپنے لگا۔ ایللی نے کانوں میں انگلیاں  
لٹکائیں۔

محلے میں کئی ایک تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ عورتوں نے احاطے کے میدان میں بیٹھ کر چر خا

اگرچہ ایللی کو یقین تھا کہ اسے ان باتوں سے قطعی دلچسپی نہیں اسے قطعی طور پر پروا نہیں  
کہ شہزادہ کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے یا بازار میں صفدر نمازیں پڑھتا ہے یا شراب کے نشے میں  
دمت رہتا ہے۔ ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن یہ باتیں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ صفدر  
کے شراب پی کر چلانے کی بات سن کر اسے بے حد خوشی ہوتی تھی۔ ایسی خوشی جس کا اعتراف وہ  
اپنے آپ سے بھی نہیں کرتا تھا ایک پرائیویٹ خفیہ خوشی۔ اب شہزادہ کو سمجھ آئیگی۔ اب وہ  
جانے گی کہ سچے اور جھوٹے عشق میں کیا فرق ہوتا ہے۔

ان چار برس میں علی پور جانے کے کئی ایک موقع ملے تھے لیکن ایللی نے جان بوجھ کر علی  
پور جانے سے احتراز کیا تھا وہ علی پور سے ڈرتا تھا۔ وہ شہزادہ کی آواز سننے سے ڈرتا تھا وہ آواز جو  
محلے میں گونجتی تھی جس کے سرے محلے والیوں سے قطعی طور پر مختلف تھے۔ جس میں لے تھی  
زیروم تھا۔ وہ عجیب سی جھنجھلاہٹ تھی۔ جو سیدھی دل پر اثر کرتی اور پھر نس نس میں دھکی سی  
بجتی۔

ہر سال جب سکول گرمی کی چھٹیوں کی وجہ سے ڈیڑھ ماہ کے لئے بند ہو جاتا تو ایللی مشکل  
میں پڑ جاتا چھٹیاں گزارنے کے لیے جب وہ خان پور جاتا تو کوئی نہ کوئی علی پور کی بات چھیڑ دیتا۔  
مثلاً علی احمد کہتے۔

”نصیر کی ماں کتنی خوشی کی بات ہے کہ ایللی چھٹیاں ہمارے پاس بسر کرتا ہے۔“

”بے چارہ اپنی ماں سے ملنے سے بھی گیا۔“ راجو دبی زبان سے کہتی۔

”اس کا نام زندگی ہے نصیر کی ماں۔“ علی احمد چلاتے ”کبھی دھوپ کبھی چھاؤں۔“

”میں نے کہا۔“ راجو اسے دیکھ کر بولی ”ایللی آیا ہے۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“ راجو کہتے کہتے رک گئی۔

”لیکن کیا۔“ علی احمد چلانے لگے۔

راجو کی آواز مدھم پڑ گئی۔ ”ہم تو علی پور جا رہے ہیں۔“

”تو پھر۔۔۔۔۔ تو مطلب کی بات کر۔“

”مطلب یہ۔“ اس کی آواز اور مدھم پڑ گئی۔ ”وہ کہاں رہے گا چھٹیوں میں۔“

”ہی ہی ہی ہی۔“ علی احمد نے نصیر کی ماں تو بھی ہمیشہ باؤنڈری لگاتی ہے۔ اسے بھی ساتھ  
لے چلو آخر ایک دن جانا ہی پڑے گا۔ آج نہیں کل سہی۔ کل نہیں پرسوں۔ بکرے کی ماں

”اے ایل ہے۔“ وہ اسے دیکھ کر چلاتیں۔ اے اتنی دیر کے بعد دیکھا ہے تجھے۔ جی نہیں  
 پہنچا تھا تو اوطن آنے۔ اے تو نے تو حد کر دی۔ محلہ چھوڑا تو بالکل ہی چھوڑ دیا پہلے تو باہر جانے  
 ہم نہ لیتا تھا۔ پھر جو چھوڑا تو بالکل ہی چھوڑ دیا۔“

”اے ہے۔ اب تو لڑکیاں جوان ہو چکی ہیں۔ پھر بھی یہ اپنی ہٹ سے باز نہیں آتی۔ اوھر لالہ منہ والا شرابی روز پئی کی بیوی کو پیٹتا ہے پھر ڈھیٹ کہیں کا اسے آدازیں دیتا ہے چیختا ہے ہاناے نہیں کرتا ہے اور جب کھڑی نہیں کھلتی تو پھر سے بیوی کو پیٹنے لگتا ہے۔ توبہ ہے۔ اتنے بائرم ہو گئے ہیں۔ کہ توبہ ہے نہ کسی کی شرم نہ لحاظ۔“

ایلی ان کی باتیں سن سن کر ان ٹکڑوں کو جوڑتا رہا بہر حال وہ خوش تھا۔ ہنگامہ ہوا اچھا ہوا

”مجھ میں آگیا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ سچا عشق کسے کہتے ہیں۔“

فوقی کے بلوجود ایسی باتیں سن کر اس کے دل پر ٹھیس لگتی۔ اس نے اپنا آپ تباہ کر لیا  
 بندہ ٹھوس مٹوا دیا۔ اپنی جوانی برباد کر دی۔

انہوں نے ایلی کو گلے سے لگایا۔ اس کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ ”ہے ایلی تو تو ہم سے  
بڑے بھی گیا پہلے ہمارے پاس رہ کر ہمارا نہ تھا۔ اب ساتھ ہم کو بھی چھوڑ دیا۔ تیرا جی نہیں  
تھا اُلی پور آنے کو اس سے تو وہی دور اچھا تھا۔ تمہیں دیکھ تو لیتے تھے۔ اب تو دیکھنے سے

اب محلے میں کئی ایک بابے آگئے تھے ان پر ایسے ریکارڈ چلتے جو ہنسناتے نہیں بلکہ گانے تھے اور گانے کے بول دور دور تک صاف سنائی دیتے تھے روز رات کے وقت کوئی نہ کوئی بجا بجتے لگتا اور دیر تک گیتوں کی آوازیں محلے میں گونجتیں اکثر ایسا ہوتا کہ دو بچوں کی آپس میں شرط باندھی جاتی اور وہ باری باری ریکارڈ بجاتے مقابلے کے شوق کی وجہ سے بابے والے نئے نئے ریکارڈ خریدتے تاکہ حرفوں سے بازی لے جائیں۔

محلے والیوں نے ان کے باجے کے خلاف ضرور احتجاج کیا ہو گا۔ ظاہر تھا کہ ان کی آواز مٹا اب وہ اثر نہ رہا تھا۔ بولتیں تو وہ اب تھیں۔ انہیں تو بولنے سے دلچسپی تھی اثر پیدا کرنے سے نہیں محلے کے جوان اب ان باتوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ بولتی ہیں تو بڑی بولیں آپ بے تھک جائیں گی۔ بہر حال ابھی تک ان میں اتنی جرات پیدا نہ ہوئی تھی کہ بوڑھوں کی بات کاٹیں یا ان کی بات کا جواب دیں۔

## بکھری کہانی

ری لکائی

اتنی دیر کے بعد اہلی سے مل کر محلے والیاں بے حد خوش ہوئیں گویا انہوں نے اس کے

”چونکہ کون ہے؟“

”ٹھہری سے دبی ہوئی سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ ایللی گھبرا گیا۔“

اس نے چوٹی کو اٹھایا۔ ہاتھ پر تل دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا اس نے چوٹی کو چھوڑ دیا۔ دم سے ٹھہری پھر سے گر گئی۔ سسکیوں کی آواز اور بلند ہو گئی۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ ٹھوکر مار کر اس ریٹی ٹھہری کو پرے ہٹا دے اور پھر خرابی خرابی کرے سے باہر نکل جائے جیسے ہیرو شیخ سے لکھا ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ریٹی ٹھہری کو اٹھا رہنے سے لگالے۔

اس کا جی چاہتا تھا ٹھہری پر ڈھیر ہو جائے۔ اسے بانسوں میں سیٹ لے اور دبی آواز سے لے قدموں پر گرنا تمہارا کام نہیں دیوی یہ تم کیا کر رہی ہو۔“

اس کا جی چاہتا تھا کہ کچھ نہ کہے۔ بیٹھا رہے۔ ”کیا اپنے شرابی محبوب سے آگیا گئیں۔ کیا لہ بھلا دے کے لیے کوئی اور نہیں ملتا۔“

”مجھے صاف کر دو۔“ وہ اس کے قدموں میں مری ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ اس کی طہ کا اعتراف کس طرح ہو سکتا تھا۔ اس سے عظیم تر لمحہ اس کی زندگی میں کیا ہو سکتا تھا۔ وہ فٹ تھا اس کی تدلیل پر خوش تھا۔ اس کے اعتراف شکست پر خوش تھا۔ وہاں وہ چاہتا تھا کہ یوں نا بیٹھا رہے۔ دیوتا بن کر بیٹھا رہے اور اس کے قدموں پر وہ سرنگوں رہے۔

تمام دنیا پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کائنات گویا رک گئی تھی۔ روئے زمین پر کوئی اور نہ تھا۔ صرف دیوتا اور پشین پجاری، کائنات کی تخلیق کا مقصد پورا ہو رہا تھا۔ صرف وہ دونوں باقی رہ گئے تھے۔ یا پھر ایک خلا تھا۔ وسعتوں کو گھیر۔ ر میں لے ہوئے ایک عظیم تر خلاء۔ صدیوں خاموش طاری صرف ہچکیاں۔ لمبی۔ دبی۔ دبی ہچکیاں پھر کپڑوں کی ٹھہری میں لگتی حرکت ہوئی۔ پیشانی کا سیاہ تل ابھرا۔

”میں میں۔۔۔ تم۔“ ابدیدہ ہچکی نے اس کی بات کاٹ دی

”تم ہو؟“ ایللی نے نفرت بھرے انداز سے کہا بتاؤنی نفرت۔

”ہاں۔۔۔ میں۔“

”تم۔“ ایللی کی نگاہ کند چھری کی طرح پڑی۔

”ہاں میں۔ چور چور ہو کر تمہارے قدموں میں آگوری ہوں۔“

بھی گئے۔“

ہاجرہ روئے جاری تھی۔ اس کے پیچھے فرحت چپ چاپ کھڑی تھی۔ ایللی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

”چل ادھر فرحت کی طرف۔“ ہاجرہ بولی۔ ”تو کیا ادھر علی احمد کے گھر رہے گا۔ اکیلا ہی۔ نہ بیٹا چل ہمارے ساتھ رہ جیسے ہمیشہ رہا کرتا تھا۔“

فرحت کی طرف جا کر رہنا۔ گویا پھر سے منجد حار میں کودنے کے مترادف تھا۔ وہاں شہزاد تھی۔ صرف ایک چھت اور ایک زینہ حائل تھا ایللی ادھر جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس لیے چپ چاپ کھڑا رہا۔

”تو بھی حد کرتی ہے ایل۔“ فرحت بولی۔ ”اگر ایللی کا جی ادھر رہنے کو چاہتا ہے۔ تو تو اسے کیوں مجبور کرتی ہے۔ ادھر لے جا کر خواہ مخواہ پھر سے مصیبت سر پر کھڑی کرنی ہے کیا۔ مشکل سے جان چھٹی ہے پہلے ہی۔“

”اچھا“ ہاجرہ بولی۔ جس طرح تو خوش رہے۔ جیسے تیری مرضی۔“

ایللی کو یقین تھا کہ شہزاد علی احمد کے گھر آنے کی جرات نہ کرے گی اور اگر آئی بھی تو اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ اس کا سامنا کر سکتا ہے اسے تو صرف ایک بات کا ڈر تھا کہ کسں وہ اکیلے میں ایللی کے دربار آ کھڑی ہو پھر اسے خیال آتا کہ آخر وہ کیوں آئیں گی۔ اس کی آمد کا خطرہ دراصل محض خوش فہمی ہے۔ آخر اسے آنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

چار ایک دن کے بعد ایک روز علی احمد اور گھر کے جملہ لوگ علی احمد کے کسی دوست کے ہاں جانے کے لیے تیار ہو گئے انہیں صرف چند ایک گھنٹے کے لیے باہر رہنا تھا۔ ایللی نے اس بات کو چنداں اہمیت نہ دی۔ اس لیے وہ کتاب اٹھا کر ایک الگ کمرے میں جا بیٹھا اور مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

ہاں۔۔۔ ہوں

اسے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور پشتراس کے کہ ”سراٹھا کر دیکھتا ریٹی کپڑوں کی ایک خوشبودار ٹھہری اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی ٹھہری کے اوپر والے سرے پر سیاہ ناگن سی بل کھائے ہوئے تھی۔“

”جی خدا میں کر بیٹھ گئے ہو تم۔“

ابی بھونکارا گیا اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔

”تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔“

”میرا حال تم کو سمجھتا ہوں۔“

”ہونہ“ نفرت سے اس کی ناک دھار بن گئی۔ ”تم — مجھے سمجھتے کیا تم۔ تم مجھے کیا بوجھ، تم میں اتنی وسعت ہی نہیں کہ دوسرے کو سمجھ سکو۔ دوسرے کو دیکھ سکو۔ سمجھنا تو

رہا ہے۔“

”جی“ وہ فسمے میں بولا ”میں تمہیں نہیں سمجھ سکا۔ نہیں سمجھ سکتا۔“

”خود پرست شخص کسی کو نہیں سمجھ سکتا۔“

”جی میں خود پرست ہوں۔“

”تمہاری خود پرستی نے ہم سب کو تباہ کر دیا۔“

”اس شرابی کو بھی —“ اس کی آواز میں تسخر تھا۔

”ہاں اس ٹلی کے کیڑے کو بھی۔“

”ٹلی کا کیڑا؟“

”ہاں۔ اس کا مقصد مجھے لوٹنا تھا۔ اس نے مجھے دل بھر کر لوٹا۔ اور میں جان بوجھ کر لٹتی لی۔ مجھ میں اب بھی اپنا آپ لٹانے کی جرات ہے۔“

”کوہ —“

”تمہاری طرح نہیں کہ مجھے اکیلی چھوڑ کر چلے گئے۔“

(۱۱)

”میں چلا گیا؟“

”تمہیں مجھ پر اعتماد نہ تھا۔ تم کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے تم میں اتنی وسعت نہیں۔ تم شک

کنڈار پر بیاہ کرتے ہو۔ محبت کرنا نہیں جانتے۔“ آج تم بھی میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ گری ہوئی

پٹلیاں میں روند رہے ہو میں صرف تمہارے سامنے گری ہوں۔ کسی اور کے سامنے نہیں۔ اتنی

دلہائی بھی نہ سمجھو مجھے۔“

شہزاد کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے دلوں بازو سینے پر تہ کیے ہوئے تھے

دلہائی کھڑی تھی جیسی جلتے ہوئے جہاز میں کوئی کیسا بیانا نکال رہا ہو۔

”جو شرابی کے ہاتھ کا گلاس بنے —“

”تم مجھے شرابی کے ہاتھ دے گئے تھے نا۔“

”میں دے گیا تھا؟“ نفرت سے اس نے ہونٹ بھیج لیے۔

”تم نہ جانتے تو —“

”اب کیا رکھا ہے؟“ وہ بولا۔

”سچ ہے“ وہ اٹھ بیٹھی۔ اس نے معافی بھرے انداز سے چہرے سے بل ہٹائے اور اپنا منہ

ننگا کر کے بولی۔ ”اب کیا دھرا ہے۔“

وہ اسے دیکھ کر چونکا۔ اس کے روبرو وہ شہزاد نہ تھی۔ ایک لٹا پٹا چہرہ۔ ویران آنکھیں۔

ہڈیوں بھرے گل، داغ دار جلد، بجھا پ، وہ اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ جیسے کسی نے اس کے

سینے پر گھونسا مار دیا ہو۔ اس کا دل ڈوب گیا۔

”ہاں“ وہ بولی ”اب کیا رکھا ہے۔ ویرانی، تباہی لئے ہوئے کو کون منہ لگاتا ہے۔ چور چور ہو

جائے تو کون ٹکڑے چتا ہے۔“ وہ خاموش کھڑی رہ گئی۔

کمرے کی فضا گویا منوں بوجھل ہو گئی۔

ایک اواس بھاری خاموشی چھا گئی۔

دور کوئی کراہ رہا تھا۔ رو رہا تھا۔ سسکیں لے رہا تھا۔

”مجھے معلوم تھا۔“ وہ بولی ”اب تم بھی منہ نہ لگاؤ گے۔ اب رکھا ہی کیا ہے۔“ اس نے

سکی زدہ قدم لگایا۔

”تو پھر“ وہ بولا۔

”پھر — ہونہ —“

”آخر پھر مجھ پر نوازش کیوں کی گئی؟“

”تم پر میں کیا نوازش کروں گی؟“

”تو کیا یہ نئی چال ہے؟“

”چال“ وہ قدم مار کر نہی۔ اس نہی میں دھار تھی۔ ایسی دھار جس کا رخ اس کی اپنی

طرف تھا۔

”گنہہ بخشوانے آئی تھی۔ کیا؟“

دیر تک وہ یوں ہی کھڑی تنگی باندھ کر ایلی کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی نگہ تلے ایلی ایک انجانی گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اسے لٹا پٹا دیکھ کر وہ محسوس کر رہا تھا کہ اسے وہ اکیلا نہیں چھوڑ سکتا جیسے اس کا ساتھ دینا اس پر فرض ہو چکا ہو۔

سکھ میں چاہے وہ اس کا ساتھی نہ بننا لیکن دکھ میں وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اب شزلو کے پاس رہا کیا تھا۔ جوانی ڈھل گئی تھی۔ جو بن ختم ہو چکا تھا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر اس کے قدموں پر گر جائے اور رد کر اس سے معافی مانگ لے لیکن اس میں اتنی جرأت نہ تھی۔

وہ فٹا "وہ آگے بڑھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ایلی کا سر تھام لیا "لیکن تم یوں چہ کی طرح کیوں دیکھ بیٹھے ہو۔ کیوں منہ چھپائے پھرتے ہو۔ کبھی علی پور نہیں آئے۔ اور اب آئے تو سامنے کیوں نہیں آتے۔ مجھ سے دلچسپی نہیں تو نہ سہی مجھے اس کی ضرورت نہیں لیکن مجھ سے نفرت ہی سہی اعلانیہ نفرت کرو تھو کو، میرے منہ پر تھو کو۔ تھو کر مار کر مجھے باہر نکل دو۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے ایلی کا منہ اپنی طرف موڑ لیا۔

ایلی نے یوں محسوس یا جیسے پٹانے کو آگ دکھا دی گئی ہو۔ بھن سے اس کا سر ہولائی کی طرح چل گیا اس نے ان جانے میں اٹھ کر شزلو کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور پھر دیوانگی بھرے جوش سے اس ریٹی گھڑی کو سمیٹ کر اپنی گود میں ڈال لیا۔ پھر وہ نہ جانے غصے میں جوش میں یا نفرت کی شدت کی وجہ سے چیخنے لگا۔

"تم کہنی ہو۔ حرام زادی ہو۔ فاششہ ہو۔ تمہیں دوسروں کو تباہ کرنے میں دلچسپی ہے تم انسانوں سے کھیلتی ہو۔ تم حرام خور ہو۔"

"ہاں ہوں۔" وہ بولی "کرلو میرا کیا کرتے ہو۔" اور پھر گھڑی سی بن کر پڑ گئی۔

ایلی نے اس گھڑی کی طرف دیکھا۔ جو اس کی گود میں پڑی تھی۔ پھر فٹا "اس کے ذہن میں گاڑی کی کوک سنائی دی۔ گاڑی اونچے اونچے ٹیلوں کے درمیان چھکا چھک چلی جا رہی تھی۔ ایک ڈبے میں مونگیا رنگ کی گھڑی پڑی جمول رہی تھی۔

"ارے یار غضب ہو گیا۔ تباہی برپا دی، لٹ گئے۔ برباد ہو گئے۔" ار چند چلا رہا تھا۔ پھر گھڑی کے پٹ کھلے اور دو حنائی ناگ باہر نکلے۔

سارے عالم پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایلی نے گود میں پڑی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ "یہ میں نے کیا کر دیا پھر سے اپنے آپ کو بدرو میں پھینک دیا۔ یہ میں نے کیا کر دیا" غصے سے اس کا منہ

منہ ہلکا "کرلو میرا کیا کر سکتے ہو۔ کرلو میرا کیا کر سکتے ہو۔" کوئی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ غصے سے ایلی کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ اس ریٹی گھڑی پر پل پڑا۔

لٹا

اگلے روز جب وہ جنگل میں بیٹھا پڑھ رہا تھا تو نیچے زینے سے شور بلند ہوا۔ "راجو غصیم۔ کوئی ہے یہی اس گھر میں کہ کاتوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہو۔"

ایلی شزلو کی آواز سن کر چونکا۔ وہ تو علی احمد کے گھر کبھی نہ آئی تھی۔ کبھی آتی بھی تو سہل میں ایک مرتبہ۔ لیکن اس طرح گھر والوں کو آوازیں دے رہی تھی جیسے روز کی آنے والی ہو۔ اور پھر اس کی آواز اسی طرح گھنٹی کی طرح بج رہی تھی جیسے سن جوں کاتوں قائم ہو۔ بات کا انداز اسی رہا تھا۔ جیسے بیٹھ ہوا کرتا تھا۔

"ہی ہی ہی" علی احمد ہنستے ہوئے آگے بڑھے "لو" وہ بولے "ہماری قسمت مفت میں جاگ اٹھی"

"کس نے جگادی آپ کی قسمت" راجو نے پوچھا۔

"دیکھ لو شزلو آئی ہے ہمارے گھر۔"

"لب تو آئے گی ہی۔"

"کیوں" علی احمد بولے۔

"اب سودا بک گیا۔" شزلو چلائی "اب خطرہ کیا۔"

"ابھی تو گودام بھرے ہیں۔" علی احمد بولے۔ "کیوں نصیر کی ماں ٹھیک ہے نا۔"

"تم آپس میں ہی فیصلہ کرلو۔" راجو ہنسنے لگی۔

"جی تو میں آئی ہوں" شزلو نے کہا۔ "میں نے کہا آج ردیرو فیصلہ ہو جائے۔"

"تو آؤ بیٹھو۔ ہمارے پاس تو کبھی بیٹھی ہی نہیں تو۔ بس کھڑکیوں پر چیل کی طرح منڈلاتی رہتی ہے۔"

کبھی ہمیں بھی موقعہ دیا ہوتا۔ ہی ہی ہی "علی احمد ہنسنے لگے۔

"جیسے سدھ بدھ ہی نہ ہو اسے کیا موقعہ دینا" وہ ہنسی۔

"لب آئے گی بھی اندر یا ان کی باتوں میں الجھی رہو گی۔" اندر سے راجو بولی۔

بچہ احاطے کے میدان میں چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ ایلے نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ چاندنی بڑی منج بھی پیدا کر سکتی ہے محلے میں چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔ برتن بج رہی تھیں چارپائیاں گھسیٹی جا رہی تھیں — دروازوں کے پٹ بند ہو رہے تھے۔

آہستہ آہستہ محلے پر خاموشی طاری ہوئے جا رہی تھی۔ خاموشی کے وقفے لمبے ہوتے جا رہے تھے پھر محلے کی مسجد سے نمازی وظائف سے فارغ ہو کر گھروں کو لوٹ رہے تھے قدموں کا آواز آوازیں آرہی تھیں ٹپ ٹپ قدموں کی چلپ آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتی تھی۔ دروازہ چراؤں کر کے کھلتا اور ٹھک سے بند ہو جاتا۔ پھر خاموشی چھا جاتی۔ چند ساعت کے بعد ٹپ ٹپ قدموں کی آواز آتی آہستہ آہستہ مدہم ہوتی جاتی اور پھر چراؤں ٹھک کے بعد پھر ٹپ ٹپ قدموں کی آواز آتی آہستہ آہستہ شروع ہو جاتا۔

بچہ

احاطے کے میدان کے عین درمیان میں کنوئیں کو منڈیر کے قریب بامجا ڈھیر ہو رہی تھی۔ بچہ ایک مسئلہ تھی۔ جو سارا دن نہ جانے کہاں کہاں گھومتی پھرتی اور شام کے وقت محلے کے محلے میں آ جاتی اور کنوئیں کی منڈیر کے قریب رات بسر کرتی تھی۔

بچہ کو اپنی سندھ بدھ نہ تھی۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ لیکن جسم پھولا ہوا تھا۔ غالباً لاکھوں سالوں میں حیات مفقود ہو چکی تھی۔ اگر کوئی بامجا کے جسم پر چٹکی بھرتا تو بامجا کو قطعی احساس نہ ہوتا وہ آپ ہی آپ بیٹھی ققمہ مار کر ہنسنے لگتی یا پھوٹ پھوٹ کر روتی یا چیخیں مارتی۔ اس کے جسم پر ایک لمبا چنڈ پڑا رہتا تھا۔ سر اور جسم میں جو میں چلتی تھیں اور رات کے میں بیٹھے بیٹھے اس کا پیشاب اور پاخانہ خطا ہو جاتا تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ بامجا کون ہے، کہاں سے آئی ہے، کس کی بیٹی ہے اور اس کی یہ حالت کیوں ہو گئی ہے؟

کوئی کتا کہ وہ امیر کبیر گھرانے سے ہے اور کشتہ محبت ہے۔ محبت کی شدت کی وجہ سے ہو گئی ہے کوئی کتا کہ نوجوانی میں غنڈوں نے اس سے زیادتی کی اور اس عفت مآب لڑکی کو قتل کر دیا تھا کہ وہ ہمیشہ کی لیے ہوش کھو بیٹھی۔

رات کے وقت محلے کے کتے اسے چائے رہتے تھے پھر نہ جانے کون کتا اسے چاٹ گیا کہ

”آئی ہوں۔ یہاں تو صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔“

علی احمد ہنسنے لگے ”بھئی بڑی تیز ہے یہ شہزادو۔“

”ابھی کیا دیکھا ہے۔“ وہ اندر جانے کی بجائے سیدھی ایلے کی طرف آتے ہوئے بولی اور بے پردائی سے بر سیل تذکرہ ایلے سے مخاطب ہو کر کہنے لگی ”تو یہ کیا پڑھنے کی جگہ ہے۔ اور یہ وقت پڑھنے کا ہے۔ میرا یہ خط تو ڈال آؤ ذرا ڈاک میں۔“ شہزاد نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور پھر جیسی کوئی بات ہی نہ ہو۔ علی احمد سے بولی۔ ”اے ہے مہمان آئے ہیں کچھ تواضع کرو۔ کچھ منگو آؤ نا شہزاد آئی ہے۔“

ان کی گھبراہٹ دیکھ کر شہزاد مسکرائی پھر مڑ کر ایلے سے کہنے لگی ”یہ خط تمہارے لیے ہے کہیں ڈاک میں ڈالا تو میں پٹ جاؤں گی۔“

ایلے نے دیکھا تو لفافے پر شریف کا پتہ لکھا ہوا تھا۔

لفافہ کھولا تو اندر مختصر طور پر لکھا ہوا تھا۔ ”مجھ سے آج ہی ملو میں نے تم سے بہت باتیں کرنی ہیں وہ بیشک جو احاطے میں کھلتی ہے۔ اس کی تیسری کھڑکی اندر سے کھلی ہو گی کھڑکی میں اندر تارچ پڑی ہو گی۔ اٹھا لیتا۔ بارہ بجے سے پہلے نہ آنا۔“

رابعہ کے چوہارے کے نیچے کی بیشک جس کی کھڑکی احاطے کے میدان میں کھلتی تھیں سال ہا سال سے بند پڑی تھی۔ اس میں گھر کا کٹھ کبار ڈھیر کیا ہوا تھا۔ رابعہ اور شہزاد کے مکان کا صدر دروازہ چھٹی گلی میں کھلتا تھا جسے گیارہ کہتے تھے۔ لیکن یہ ڈیوڑھی مشترکہ تھی۔ یہاں سے چار ایک مکانات کو راستے جاتے تھے۔ اس لیے صدر دروازے کو چوری جیسے شہزاد کے گھر جانے کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میدان میں کھلنے والی بیشک کی کھڑکی ان کے گھر میں داخل ہونے کا براہ راست ذریعہ تھا وہ بھی صرف اس لیے ممکن العمل تھا کہ رابعہ ان دونوں باہر گئی ہوئی تھی۔ اور شہزاد نہ جانے کس وجہ سے اپنے چوہارے میں آگئی تھی شاید اس کی وجہ صدر ہو۔ جس کا مکان شہزاد کے چوہارے سے عین ملتی تھا۔

اس رات وہ جنگل میں لینا ہوا سوچ رہا تھا۔ گھر کے زیادہ تر لوگ اوپر چھت پر سوئے تھے باہر صحن میں زینے کے پاس ہاجرہ کی چارپائی تھی۔ جس کے پاس ہی وہ جائے نماز پر بیٹھی نہ جانے کیا پڑھ رہی تھی۔ انہی دونوں ہاجرہ نے دلی کے ایک بزرگ جنہیں حاجی صاحب کہتے تھے کی بیعت کر لی تھی اور نمازوں اور وظائف میں مصروف رہتی تھی۔



”جے لڑکی یہ مرد تو اندھے ہو جاتے ہیں۔“

”میں کہتی ہوں اسے پکڑ کر باندھ دو۔ اور صبح گدھے پر بٹھا کر شہر میں پھراؤ۔“

لیکن عورتوں کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ تلاش کے باوجود کوئی نہ ملا۔

ابنہ اتنا ضرور ہوا کہ محلے والے چوکنے ہو گئے اور محلے والیوں کی دلچسپی اس حد تک بڑھ گئی کہ جب بھی رات کے وقت کسی کی آنکھ کھلتی یا نیند نہ آتی تو وہ اٹھ کر کھڑکی سے جھانک رک پھرتی تھیں تاکہ دوڑائی کہ ماجھا کے ڈھیر کے پاس کوئی اور ڈھیر تو نہیں پڑا۔

ابو کے اس انکشاف کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ محلے کے جوان اور عمر رسیدہ کنوارے محلے والوں کے شبہات کا مرکز بن گئے۔ اور رات کے وقت میدان میں جانا خطرہ مول لینے کے خلاف ہو گیا۔

### ہاں میں آگیا

گھڑاں نے بارہ بجائے۔ اہلی چپ چاپ میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ محلے پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

اہلی نے اٹھ کر اپنے گھر کا جائزہ لیا علی احمد کوٹھے پر چوہارے میں تھے۔ خمیم اور اس کی دوں بچیاں اندر کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ خمیم کے خرائٹوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ بنگلے کے باہر دالان میں ہاجرہ تھی۔ لیکن حاجرہ کے متعلق اہلی کو کوئی گھبراہٹ نہ تھی۔

وہ چپ چاپ اٹھا۔ دبے پاؤں غسل خانے میں گیا۔ باہر صحن کا جائزہ لیا۔ دالان میں ہاجرہ گھڑی بنی پڑی تھی۔ اس نے بیڑھیوں کا دروازہ کھولا۔ اور انتظار کرنے لگا۔ پھر وہ چپکے سے نیچے اترنے ڈیوڑھی میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ ڈیوڑھی مشترکہ تھی۔ ڈیوڑھی کے پیچھے چھ سات بکلت تھیں وہ رک گیا دیر تک کھڑا رہا پھر اس نے دروازہ کھولا اور باہر میدان کا جائزہ لینے لگا۔

باہر نکل کر اس نے ڈیوڑھی کا دروازہ بند کیا اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ کنوئیں کے منڈیرے کے پاس ماجھا کا ڈھیر پڑا تھا۔ جو اس کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔

دھنستا! وہ چونکا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ماجھا سے دس فٹ کے فاصلے پر کوئی دیوار لگ کر کھڑا تھا۔ اہلی کو نے میں چھپ گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ یقیناً ”وہ محلے کا آدمی نہ تھا۔ لہذا جسم گول مٹول تھا۔ کپڑے پھٹے پرانے تھے اور منہ پر وحشت سی برس رہی تھی۔ یقیناً ”وہ

ماجھا پیٹ سے ہو گئی۔ لوگوں نے حیرت سے ماجھا کی طرف دیکھا۔ مردوں نے ٹکئیں جھکا لیں عورتوں نے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ لیں۔ اور اس سے عجیب و غریب قسم کے استفسارات کرنے لگیں۔ دیر تک وہ اس ٹوہ میں لگی رہیں کہ بکار خویش ہشیار والا معاملہ تو نہیں لیکن دہل تو سدا بدھ ہی نہ تھی لہذا بات ختم ہو گئی۔ معینہ وقت پر بعد مشکل عورتیں اسے کمرے میں لے گئیں۔ ماجھا کے ہاں ایک واقعی چاند سے مکھڑے والا بچہ پیدا ہوا۔ اور چند روز زندہ رہ کر مر گیا اور ماجھا فراغت پا کر سیدھی کنوئیں کی منڈیر کے قریب جا کر ڈھیر ہو گئی اور اسی طرح قہقہے مارنے پینچنے اور رونے میں مصروف ہو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

پھر ایک روز آدمی رات کے وقت محلے میں شور مچ گیا۔

ابو بہت دیر کے بعد دوکان سے واپس گھر آیا۔ ان دنوں کسی تھوڑی سی وجہ سے دوکان پر سلائی کا کام بہت زیادہ تھا۔ جب وہ احاطے کے میدان کے قریب آیا تو اس نے دیکھا کہ ماجھا کے ڈھیر کے قریب ایک اور ڈھیر لگا ہوا ہے۔ وہ چونک کر رکا۔ دوسرے ڈھیر میں حرکت ہوئی ”کون ہے۔“ وہ چلایا ڈھیر میں پھر حرکت ہوئی۔ ایک سایہ سا بلند ہوا۔ اور تیزی سے گلی کی طرف بڑھا۔

ابو نے شور مچایا۔

اس پر محلے کی بوڑھیاں کھڑکیوں میں آکھڑی ہوئیں۔

”کون ہے؟“ ماں چلائی۔

”میں ہوں میں۔“ ابو بولا ”میں کوئی تھا۔“

”کہاں تھا کوئی۔“ دوسری بولی۔

”میں ماجھا کے پاس۔“

”ہے کون ہے۔ کالے منہ والا۔“

”معلوم نہیں ماں میں آیا تو کوئی تھا۔“ میرے سامنے بھاگ کر گیا ہے۔

اس پر محلے کے دو ایک مرد لائین اٹھائے باہر نکل آئے اور اسے تلاش کرنے لگے۔

ادھر عورتیں ہونٹوں پر انگلیاں رکے بد دعائیں دینے لگیں۔

”نہ جانے کون بے شرم ہے۔ بے کیا زمانہ آیا ہے۔“

”اور پھر ماجھا کے پاس ماں۔ وہ تو منڈی کا بورا ہے۔“

دوڑی آئیں اسے رکھے رہی تھیں۔ اس پیش منظر کے عقب میں ایک ریلی آواز دکھ بھرے  
 وہ میں کوئی دکھ بھرا گیت الپ رہی تھی۔  
 سہا سنگھاسن پر براجمن تھا۔ سامنے گویوں کو بھیڑ لگی ہوئی تھی۔  
 لاد نہ جانے کہاں ماجھا کراہ رہی تھی۔

اس کے بعد یہ اس کا معمول ہو گیا۔ رات کو وہ دیر تک پڑھتا رہتا پھر لمپ بجا کر محلے کی  
 لڑکیوں کے قدموں کی ٹپ ٹپ جیسے نین کی چھت پر بوندیں گر رہی ہوں۔ ٹپ ٹپ چراؤں  
 کی اور پھر خاموشی کا وقفہ شروع ہو جاتا اور پھر دور سے ٹپ ٹپ کی مدھم آواز پھر سے سنائی  
 دیتی آتی اور پھر مدھم پڑتی جاتی اور آخر چراؤں دروازہ کھلتا اور ٹھک سے بند ہو جاتا۔ اور  
 پہرٹی کا ایک اور وقفہ شروع ہو جاتا۔

رات کے بارہ کے قریب گلی سے ایک سلیہ ابھرتا اور پھر میدان کے کسی نہ کسی کونے میں  
 باکرا ہوتا۔  
 ایللی کو اس سائے سے بے حد دلچسپی ہو چکی تھی۔

### ایلی چھاؤں

ایلی کی نیت میں وہی دورخی ابھر رہی تھی۔ وہی دھوپ چھاؤں جو غالباً بچپن ہی سے اس  
 لاد میں دبی بیٹھی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا کہ اس کا کھویا ہوا تخت واپس مل گیا تھا۔  
 لاد ہر کسی حسینہ کا محبوب تھا۔ حسینہ نہ سہی لیکن اب بھی وہ محلے کی محبوب تھی۔ اس کی  
 بہت کواں کے جسم اور خدوخال سے تعلق نہ تھا۔ اس کی باتیں اس کا انداز اس کا کردار اس  
 شخصیت کے ضامن تھے۔ اس کے علاوہ ایللی کو رو کر بتاتی کہ صفدر نے کس طرح اس سے  
 لڑائی کس طرح اس کا زیور چرایا۔ کس طرح مالی مفاد کے خیال سے اسے بے وقوف بنایا۔  
 لاد ایللی محسوس کرتا جیسے وہ ایک رہبر ہو ایک ایسا عاشق ہو۔ جس کا نام رانجھا اور مینوال  
 پانچ ماٹھوں کی فہرست میں لکھے جانے کے قابل ہو۔

لیکن اس خوشی کے ساتھ ہی بیٹھے بٹھائے اسے خیال آتا کہ وہ ایک ماجھا کے قریب میں  
 لاد ہے۔ اس کی زندگی غلامت سے بھری ہے۔ اس کی محبت دراصل جسمانی حرص۔ اور

مغص ماجھا کے لیے وہاں کھڑا تھا۔

پھر دھنسا۔ اسے خیال آیا کہ وہ خود بھی وہاں کسی ماجھا کے لیے کھڑا ہے ان دونوں میں کچھ  
 زیادہ فرق نہیں تھا اس کے دل میں اس کا معلوم مغص کے لیے ہمدردی سی پیدا ہو گئی۔ وہ ماجھا  
 کے لیے کتنا بڑا خطرہ مول لے رہا تھا اور ماجھا وہاں گندگی میں لتھڑی پڑی تھی۔ اس سے بڑا آئی  
 تھی۔ سوچے ہوئے پنڈے کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہ تھا۔

ایلی نے جب سے نارچ نکالی تھیں دلیلا نامعلوم مغص دیوانہ وار بھاگا۔ ایللی نے نارچ کل کر  
 دی چند ساعت کے لیے انتظار کیا۔ پھر وہ چھلکتیں مارتا ہوا میدان پار کرنے لگا۔ کڑی کے پت  
 کھل گئے اس نے اندر سے بند کر لیا۔ اور پھر نارچ کی روشنی میں کاتھ کباڑ سے بھری ہوئی  
 بیٹھک میں دبے پاؤں چلنے لگا۔ میڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ چوبارے کی طرف بدھا تو راہبہ کے  
 کمرے سے شزاو نے جھانکا "تم آگئے۔" خوشی سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

ایلی نے محسوس کیا کہ شزاو ایک ماجھا ہے۔ اور اس سے صفدر کے تعفن کی بو آ رہی ہے۔  
 اس کے دل کو دھچکا سا لگا۔ میں کیوں آیا ہوں۔ کیوں پھر سے اپنے آپ کو تعفن میں جھونک رہا  
 ہوں۔ اس کے دل سے آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے اندر میں جھجک تھی۔ شزاو اس کے  
 قریب آکھڑی ہوئی۔ "تم جیج آگئے ہو ایللی"

"ہاں میں آگیا۔" وہ بولا۔

"مجھے یقین نہیں آتا" وہ بولی۔ "میں سمجھتی تھی تم اب نہ آؤ گے کیا واقعی تم نے مجھے  
 معاف کر دیا ہے۔ کیا واقعی۔" وہ اس کے ساتھ چٹ گئی۔

آہستہ آہستہ صفدر کا تعفن ختم ہوتا گیا۔ اور بو کی بجائے شزاو سے وہی خوشبو آنے لگی  
 جس سے وہ بہت مانوس تھا۔

اس کا انداز وہی تھا۔ وہی حرکات۔ وہی آواز۔ وہی باتیں۔ بالکل صرف اس کے چہرے پر  
 معصومیت نہ تھی۔ انداز میں شوخی نہ تھی۔ اب اس تھیلی میں وہ مینڈک نہیں بھدکتا تھا۔  
 خدوخال میں ایک عجیب سی موہوم بے حسی آچکی تھی۔ لیکن یہ سب باتیں فنی تھیں۔ سب  
 سے اہم بات تھی کہ سالہا سال کی گم نامی کے بعد آج پھر اسے تخت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اور وہ اسے  
 مور چھل کر رہی تھی۔ اور اس کے گرد خوشبو کی طرح منڈلا رہی تھی۔ اور لمبی لمبی زلفیں پیار  
 سے اس کے گالوں کو چھو رہی تھیں اور ریشمیں لمبوسات اس کے قدموں میں پڑے ہوئے تھے

بہم آئے تو ہے نا۔" وہ ہنس کر کھڑکی سے ٹل جاتی۔  
ابلی اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سب ڈرامہ اس کے لیے کھیلا جا رہا ہے۔ صبح کے وقت اسے  
زب اور لگاؤ کا احساس دینے کے لئے صرف یہی ایک طریقہ تھا۔ جب وہ جنگل میں بیٹھا پڑھ رہا  
ہو تو شہزادہ کسی کو مخاطب کر کے پوچھتی۔  
"کیوں جی کیا ہو رہا ہے۔"

ابلی جھٹ اوپر دیکھتا اور کتاب کی طرف اشارہ کرتا۔  
"لو ہو چئی۔" وہ چلائی "سارا دن بس آلو ہی چھیلی رہتی ہو۔"  
ابلی کتب بند کر کے بیٹھ جاتا۔

"تو میں نے کہا زینب ذرا میری طرف منہ کرو تو بات کروں تم سے۔"  
"اے ہے۔" زینب چیختی۔ "میرے منہ پر کیا دھرا ہے۔ جو تم دیکھو گی۔"  
"جہیں کیا معلوم۔" شہزادہ ہنسی۔

"آخر کیا بات ہے۔" زینب پوچھتی۔ "جو مجھ سے کرو گی۔"  
"بات کا کیا ہے کوئی زبان سے تھوڑی سی کی جاتی ہے۔ آئے سائے بیٹھ جاؤ تو بات بن  
آئی ہے چاہے منہ سے نہ بولو۔"

"ہے مجھے سائے بیٹھا کر اب کیا بات بتاؤ گی۔" زینب حیرت سے چلائی اور ہنس ہنس کر ابلی  
ار اعلیٰ ہو جاتا۔

مردہ کھڑکی سے جانے لگتی تو چیخ کر کسی سے کہتی۔ "ابھی آئی ہیں۔"

مردہ پر تھو کو

نیک روز رات کے نو بجے کے قریب جب ابلی محلے کی آوازیں سننے میں مصروف تھا دھتتا  
لاٹکے مکان کے عقب سے شور و غل بلند ہوا۔ کوئی چیخیں مار رہی تھی۔ محلے والیاں کھڑکیوں  
کا کڑی ہوئیں۔

"کون ہے اس؟"

"اے ہے وہی سیکنہ ہے۔ اس شرابی کی بیوی اور کون۔"  
"میں جانوں اسے پیٹ رہا ہے۔"

اس کی ملاقاتیں اپنی پرانی رہنمائی کو چکی ہیں۔ ان میں وہ شوق نہیں۔ وہ انتظار نہیں۔ وہ شرفی  
نہیں۔ اسے محبت نہیں کہا جا سکتا۔ اب وہ ایک تعلق تھا ایک بھونڈا بھدا انعام سا تعلق جو عورت  
اور مرد کے درمیان ہوتا ہے۔

پہلے اسے یہ شکایت ہوتی تھی کہ شہزادہ اسے قرب بخشے سے بچکپاتی ہے۔ وہ جان بوجھ کر  
اس سے دور رہتی ہے۔ اور قریب ہوتے ہوئے بھی نہ جانے کمال ہوتی ہے۔ اب جب اس  
سے رات کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اب وہ محسوس کرنے لگا تھا۔ کہ اپنی محبوبیت اور  
رہنمائی کے باوجود شہزادہ ایک اجنبی ہے۔ اور وہ خود تعفن کا شیدائی۔ اس خیال پر اسے اپنے آپ  
سے نفرت پیدا ہوتی۔ اور وہ شہزادہ سے نفرت کرتا اور اپنی زندگی کو ذلت بھری حماقت کے حجابوں  
بھکتا۔

رات کے بارہ بجتے تو ابلی میں تعفن کا شیدائی ابھرتا۔ ابھار کی دھن اس پر جڑے کے  
بڑھے کی طرح سوار ہو جاتی۔ لیکن جب وہ شہزادہ کے پاس پہنچتا تو تخت پر بیٹھ کر موردِ محفل کرانے  
ہوئے اسے محسوس ہوتا جیسے وہ ہزار داستان کا کوئی شہزادہ ہو اور سوتے جاگتے کا دلچسپ کھیل  
کھیل رہا ہے۔

صبح کے وقت شہزادہ کھڑکی میں سوار ہو کر کسی نہ کسی سے باتوں میں مصروف رہتی۔ "میں  
نے کہا میں جی یہاں کھڑکی کس کی راہ دیکھ رہی ہو۔"

"ہے لڑکی کیا کہہ رہی ہے تو" اس ہونٹ پر انگلی رکھ لیتی۔

"میں نے کہا چاچی" شہزادہ چیختی۔ "کیا پکا ہے آج۔"

پھر وہ شیم سے مخاطب ہوتی۔ "میں نے کہا وہ اپنے علی احمد کو کہاں چھپا رکھا ہے تم نے۔"

"میں کیا جانوں" شیم جل کر کہتی "پوچھو راجو سے جو اسے بغل میں دبائے بیٹھی ہے۔"

"ہے آخر تمہارا بھی تو حق ہے" وہ ہنسی۔

"نہ بہن میں اس سوئٹھ کی گانٹھ کو لے کر کیا کروں گی۔" شیم بولتی۔

اس پر علی احمد چوہارے سے نکل کر منڈیر پر آکھڑے ہوتے۔

"کیوں بھی شہزادہ۔" وہ چلائے۔ "اب تو ہم کو بھی کبھی کبھی یاد کر لیتی ہو۔"

"جی" وہ بولتی "وقت وقت کی بات ہے۔ برا وقت کسی پر نہ آئے۔"

"ہی ہی ہی ہی" علی احمد ہنستے "لیکن چیز دی جو برے وقت کام آئے۔"

”کوئی نئی بات ہے، بس جاہل روز پیتا ہے، روز پیتا ہے۔“

”ہے نہ جانے پھر وہ کیوں رہتی ہے شرابی کے گھر میں۔“

”پوچھو اس سے۔“

”میں جانوں میں ایسی بھی ہوتی ہیں کئی ایک۔“

”ایسی کیسی۔“

”جنہیں ہڈیاں تڑوانے کا شوق ہوتا ہے۔“

”ہے نہیں پھوپھی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”لو تمہیں کیا معلوم کیا کیا ڈھنگ آتے ہیں ایسیوں کو۔“

”سیکنہ تو ایسی نہیں۔“

”بس تو رہنے دے میری زبان نہ کھلو۔“

میں نے کہا میں ان کی بھینکن بتا رہی تھی مجھے کہہ رہی تھی۔ جو صندر نہ پئے تو بیوی کا پی نہیں لگتا گھر میں۔“

”ٹھیک تو ہے شرابی جی نہیں لگائے گا تو کون لگائے گا۔“

”اب لڑکی یہ صندر سمجھ لے چار دن کا مہمان ہے جب سے اس کا گھر چھوٹا ہے۔“

”کس کا ماں؟“

”اے ہے آہستہ بول“ ماں بولی۔ ”اپنی شہزاد کا تب سے کہتے ہیں پرٹ پیتا ہے۔“

”وہ کیا ہوتی ہے ماں؟“

”اے ہوتی ہو گی کچھ۔ دی جو مٹی کے تیل سے بنتی ہے جسے بھک سے آگ لگتی ہے۔“

سارا کلیجہ جل چکا ہے۔

ابھی وہ باتیں ہی کر رہی تھیں کہ چھتی گلی سے شور سنائی دیا۔ اور پھر صندر میدان میں

کھڑا ہوا وہ لڑکھڑا رہا تھا اسے دیکھ کر عورتوں نے کھڑکیوں کے پٹ بند کر دیے اور دروازے

دیکھنے لگیں ابلی پھلانگ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اسے صندر کے ردہرو جانے سی ڈر لگتا تھا۔ شرمندہ

محسوس ہوتی تھی۔

صندر میدان کے درمیان کھڑا ہو کر چیخنے لگا۔ ”سب چلی گئیں۔“ وہ بولا ”سب چلی گئیں

مجھے دیکھ کر سبھی چلے جاتے ہیں۔“ وہ رک گیا۔

پھر اس نے پتھر اٹھا کر شہزاد کی کھڑکی پر دے مارا۔ ٹک سے آواز آئی۔ ”یہ کھڑکی بھی بند  
”وہ دیوانہ وار چلانے لگا“ اب یہ کبھی نہیں کھلے گی کبھی نہیں کھلے گی۔ کھولو، کھولو“ وہ  
”صرف ایک بار صرف ایک بار سب کھڑکیاں کھول دو۔ اور پھر میرے منہ پر تھوک کو مجھے  
”کچھ کر۔ خدا کے لئے وہ بیٹھ کر رونے لگا۔

برقوں نے مردوں کو آوازیں دینا شروع کر دیا

”یہ بیٹھا رو رہا تھا کہ محلے کے دو ایک مرد میدان میں اتر آئے۔

صندر ”اجو درزی بولا“ ”یہ کیا تماشہ دکھا رہے ہو۔“

”کھا تو نہیں رہا۔“ صندر نے جواب دیا۔ ”تماشہ بن گیا ہوں۔“

”یہاں بنتے ہو۔“

”میں نہیں بنتا۔“ وہ بولا ”مجھے حالات نے بنا دیا ہے۔ تمہاری قسم بھائی صاحب وہ

ہے کہ۔۔۔“ وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ اس نے ایک نظر اوپر کھڑکی پر ڈالی اور پھر

”میں نہیں میں نشے میں نہیں ہوں میں ہوش میں ہوں۔“

”بزرگ بولے۔

”انہ پیا کرو۔“

”ہوش میں آتا ہوں چچا۔ ویسے مردوں طرح پڑا رہتا ہوں۔ جیسے یہ باجھا پڑی ہے۔“

”جو۔“ ”اجو نے کہا۔

”ماجاؤں“ صندر بولا ”سب نے کھڑکیاں بند کر لی ہیں۔

”گھر جاؤ۔“

”گھر“ وہ تہقہ مار کر ہنس ”اپنا گھر۔ ہی ہی ہی۔“

”اے اسے شافوں سے پکڑ لیا اور محسوس لگے۔

”میں میں ہوش میں ہوں۔۔۔ ہوش میں ہوں۔۔۔ تمہاری قسم“

”کے جانے کے بعد محلے کی بوڑھیوں نے پھر مات شروع کر دی۔

”یہ کیا حالت بن گئی ہے اس کی۔“

”اے بھی تو پیا کرتا تھا یہ۔“

”بیٹے کی بات چھوڑو اب جو دو سال میں دو سرائش ہے۔ اس ۱۲۔ یہ لکھا ہے۔

### نقشِ ناشیدائی

ابھی وہ بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھے کہ احاطے کے میدان میں شور بلند ہوا ”حرامزادہ جائے گا کلا۔“ پھر پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ چاروں طرف کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ بوڑھیاں چلانے لگیں۔

”کسے پکڑ لیا میں؟“

”پتہ نہیں۔“

”اسی حرامی کو میں۔“

”اے کس کو۔“

”کیونہ — ساجھا کو پکڑے بیٹھا تھا۔“

”اے اللہ“ چاروں طرف سے شور بلند ہوا۔

مرد جو تکی پہن کر باہر کی طرف بھاگے۔ عورتوں نے لائینیں جلائیں۔ ایک ہنگامہ مچا ہو گیا۔

”میں جاتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”مگر میں سب کو پتہ چل جائے گا کہ میں موجود نہیں۔“

”پتہ چل جائے گا۔“ وہ بولی اور اس نے ایلی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس پر ایک چادر

لٹائی اور پھر کھڑکی کھول کر ایلی کو اسی طرح ساتھ لپٹائے کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔

”یہ کیا کر رہی ہو۔“

ایلی جا بجا۔

”ٹونوں۔ مرو نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔“ شہزاد نے گرفت اور مضبوط کرتے ہوئے کہا

”ہاں آواز بلند چلانے لگی۔“

”کون ہے یہ میں؟“

”مہ جائے کون ہے“ میں نے جواب دیا۔

”دورا دیکھو تو۔ کیوں چچا دیکھا اے۔“

”مگر باہر کا ہے۔“

”ہے۔“

”دوسرا نشہ کون سا میں۔“

”اے آہستہ بات کر لڑکی۔ اگرچہ اس کی کھڑکی بند ہے پر وہ سب کچھ سن رہی ہے۔“ میں نے شہزاد کی کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

اس رات جب ایلی شہزاد کے پاس پہنچا تو وہ غیر از معمول خاموش تھی۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ روٹی روٹی ہے۔

”تم او اس کیوں ہو۔“ ایلی نے پوچھا۔

”نہیں تو“ شہزاد نے آنسو پونچھ کر کہا۔

”رو تو رہی ہو۔“ وہ بولا۔

”کیوں کیا صفر کا غم ہے۔“ ایلی نے اسے طعنہ دیا۔

شہزاد کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ”ایلی“ وہ بولی ”مجھے اس کا طعنہ نہ دیا کرو۔“

”کیوں کیا جھوٹ ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”نہیں جج ہے۔“ وہ بولی ”لیکن —“

”لیکن کیا؟“

”اس کا ساتھ دے کر میں نے اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہ سے گرا دیا۔ میں خود اپنی نگاہ سے

مگر گئی ہوں۔“

”کیوں“ ایلی نے پوچھا ”کیا میرا ساتھ دے کر تم لوگوں کی نگاہ سے نہیں گری تھیں۔“

”نہیں“ بولی۔

”بدنام نہیں ہوئی کیا؟“

”ہوئی ہوں۔ لیکن میں ذلیل نہیں ہوئی۔ انا مجھے فخر ہے کہ میں نے تمہارا ساتھ دیا۔“

”یہ کیا دلیل ہوئی؟“ ایلی نے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتہ کیوں بدنامی کے بلوجود میری تذلیل نہ ہوئی بلکہ میری گردن لوہی رہی۔“

لوگ باتیں کرتے رہے۔ جکتے رہے میں نے ذرا بھر پروا نہ کی۔ لیکن چھوٹے آدمی کو نہ لگا کر

ذلیل ہو گئی۔ شہزاد کے منہ سے بے ساختہ ایک دہلی ہوئی ہنسی نکل گئی۔ ایلی حیران تھا اس نے

شہزاد کو ایسی بے بسی اور خود ترسی کی حالت میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

لبن کچھ دیر کے بعد اس دھیری کا ایللی کے دل پر عجیب سا رد عمل ہوتا۔ اس کے دل میں  
 حلق عجیب و غریب شبہات پیدا ہوتے۔ شاید اس وقت جب میں شہزاد کے پاس تھا۔  
 کسی اور کو دوسرے کمرے میں چھپا رکھا ہو۔ شاید میرے علی پور سے جانے کے بعد  
 وہاں ہی دروازہ کسی دوسرے کے لیے بھی کھلتا ہو۔ شاید بیک وقت وہ کئی ایک سے کھیل  
 رہا ہو۔

پہلے کے دل میں شبہات یوں جھنسناتے جیسے طوائف کی دکان پر کھیاں جھنسناتی رہیں۔ اس کی  
 پانچ عجیب و غریب مناظروں آکھڑے ہوتے جیسے وہ خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہوں۔ "پھر  
 یہ گارو اسے اپنی چنگل میں لے لیتا اور وہ کرب سے ترہکا۔ یہ کرب اس حد تک شدت  
 کر لیتا کہ ایللی کا سانس بند ہو جاتا۔ دل ڈوبنے لگتا اور سینہ پھٹنے لگتا۔ شاید یہی جذبہ رقابت  
 میں اس کے لیے تازیانہ بن جاتا۔

اس رات شہزاد کے گھر سے واپس آنے کے بعد اسے احساس رقابت کا شدید دورہ پڑ گیا۔  
 اس سے سب لوگ جاچکے تھے۔ عورتوں نے کھڑکیاں بند کر لی تھیں محلے پر سناٹا چھایا ہوا  
 تو بھی کسی منڈیر کے پاس مابھا کا غلیظ ڈھیر لگا تھا۔ سامنے کی دیوار کے قریب تن کے ساتھ  
 انہی شیدائی بندھا ہوا تھا۔ ایللی جوش رقابت سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ عین اسی طرح  
 رے کے بند کھولنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

ایللی کو خیال آیا۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔  
 انہی کی دیوانہ وار جدوجہد سے ایللی کو یہ شبہ گزرا کہ وہ اس قید سے مخلص پانے کے لیے  
 نہیں کر رہا۔ بلکہ مابھا کے تعفن کی لذت کا ایندھن اسے مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنا آپ  
 اس غلاظت بھرے کنویں میں چھلانگ لگا دے۔ اگر وہ انہی کو کسی ایسی جگہ باندھے جہاں  
 بڑا کاترب حاصل کرنے کا امکان نہ ہوتا تو غالباً وہ صبح تک چپ چاپ دیوار سے لگا کھڑا

ایللی نے محسوس کیا کہ ان دونوں میں کتنی مناسبت تھی۔ دونوں ہی مابھا کے دیوانے تھے۔  
 ایللی اتنا تھا کہ اس مابھا سے خوشبو آتی تھی۔ وہ گونگی تھی اس کے تکلم میں شوخی تھی۔  
 لی چاہتا تھا کہ وہ بے پاؤں اتر کر اس مابھا کے دیوانے کو کھول کر آزاد کر دے، لیکن پھر خیال  
 لا رہا جو اس کے گرو لپٹا ہوا تھا۔ اس کا بندھن نہ تھا۔ اس کا بندھن تو مابھا تھی، اس

نیچے سے کسی نے جواب دیا۔  
 سامنے جنگل سے شیم چلائی "شہزاد یہ ساتھ کے چمنائے کھڑی ہو۔" شہزاد قہقہہ لگا کر ہنسی۔  
 "جانوں تو نہیں" شیم نے پوچھا۔  
 "لو تم بھی حد کرتی ہو۔ بھلا جانوں کو بغل میں دبانے کو کس کا جی چاہے گا۔"  
 میدان میں پھر شور مچ گیا۔ وہ اسے لوہے کی تال سے باندھ رہے تھے۔  
 "یہ ٹھیک ہے، یہ ٹھیک ہے۔" وہ چلا رہے تھے۔  
 "رات بھر تو یہاں تن سے بندھا رہے صبح بات کریں گے۔"  
 ہر کوئی اپنا اپنا مشورہ دے رہا تھا۔  
 ایللی سوچ رہا تھا ایک دن وہ بھی اسی طرح پکڑا جائے گا۔ اور وہ سب اس کے منہ پر تھوکیں  
 گے۔

"میں چلتا ہوں۔" وہ گھبرا کر بولا۔  
 "نہ جاؤ۔" وہ بولی۔ "مجھے ڈر لگتا ہے۔"  
 "تمہیں ڈر لگتا ہے کیا؟ تمہیں؟"  
 "ہاں" وہ بولی "اب تو ہر بات پر ڈر لگتا ہے۔"  
 "اور اس وقت تو یوں بڑھ کر کھڑی ہو۔"  
 "اس وقت تم جو ہو سو ہو۔ تم ساتھ ہو ایللی تو میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ کسی سے نہیں۔"  
 "آہستہ بولو۔" وہ چلایا "کوئی سن لے گا۔"  
 "پڑا سن لے۔" وہ بولی "اس دوزخی سے نجات ملے۔"  
 "یہ کون ہے تمہارے ساتھ۔" اس نے پوچھا۔  
 "سہیلی ہے میری" وہ ہنس کر بولی۔  
 "تیری سہیلیوں کا بھی شمار نہیں لڑکی۔" اس نے بولی۔

ایللی پھر گھبرا گیا۔ اس نے جھکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بھاگ کر چلا آیا۔  
 شہزاد کی دیدہ دھیری کو دیکھ کر ایللی بے حد خوش ہوتا تھا شاید اس لیے کہ اس کی دھیری میں  
 عجیب سی رہنمائی کی جھلک ہوتی تھی یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کر ایللی خود بے حد ڈر پوک واقع ہوا  
 تھا۔ اس لیے وہ دوسروں کی دھیری سے بے حد متاثر ہوتا تھا۔

”آخر بات کیا ہے؟“

”مجھے انہوں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔“ ہاجرہ نے کہا۔

”بس نے بتا دیا ہے۔ کیا بتا دیا ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”مافی صاحب نے۔“ بولی۔

”کون مافی صاحب؟“

”نہ پتا“ وہ بولی۔ ”آہستہ بول۔ سب جاگ انھیں کے کیا فائدہ۔“

”لیکن میں مجھے کچھ پتہ بھی چلے۔“

”اوسر آ۔ اوسر میں تجھے بتاؤں“ وہ اسے ملحقہ کمرے میں لے گئی۔

”مافی صاحب میرے مرشد ہیں“ وہ بولی ”وہ بڑے کامل بزرگ ہیں۔ ابھی ابھی انہوں نے ہنجوڑ کر جگایا اور کسے لگے ایلی اوسر جا رہا ہے۔ اسے روک لے۔ اور میں گھبرا کر جاگ پڑی

بکا رہی ہوں کہ تم کھڑے ہو۔“

ایلی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ”اے تم بھی حد کر دیتی ہو۔ وہ بولا ”کون جا رہا ہے کہاں جا رہا ہے۔ میں نے تو پیشاب کرنے کے لئے اٹھا تھا تمہارے مرشد کو غلطی لگی ہے۔“

”نہ نہ نہ“ ہاجرہ چلائی ”ایسا نہ کہو۔ تم نہیں جانتے۔ تمہیں معلوم نہیں۔“

”تو نہیں ہو گا۔“ ایلی بولا ”اب آرام سے سو جاؤ۔“

اس کے بعد دیر تک ایلی جاگتا رہا۔ لیکن اسے شک تھا کہ ہاجرہ ابھی جاگ رہی ہے۔ اس ارشد نے کیا کڑ بڑ ڈال دی تھی۔ خواہ مخواہ پھر جب ہاجرہ خرائے لینے لگی تو ایلی نے دیکھا کہ

اٹا پھرتے تھے اور اوسر جانا بالکل بے کار تھا۔ لہذا اس نے اوسر جانے کا خیال ترک کر دیا۔

اگلے روز ہاجرہ ایلی کو فرحت کے ہاں لے گئی اور ابتدائی خاطر تواضع اور فحش کرنے کے

کئے گئی۔ ایلی میری ایک بات مان لے صرف ایک بات اس کے بعد جو جی میں آئے کرتا۔

”کون نہیں کوں گی۔ صرف ایک بات مان لے میری خاطر۔“

”کیا بات ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”مافی جاگ مافی صاحب کی بیعت کر لے۔ بس اور کچھ نہیں۔“

”بیعت؟“ ایلی نے حیرت سے پوچھا ”وہ کیا ہوتی ہے۔“

”لگ بھگ ہوتی ہے۔“ وہ بولی ”چاہے کچھ بھی ہو وہ تو کر لے۔“

کافقہ تھ۔

چاہے کچھ بھی ہو اس نے سوچا اور چپ چاپ اٹھ کر دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ میدان

میں پہنچ کر اس نے تل کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ بھاگ گیا۔ اس نے سوچا۔ ڈر کر ہاگ

گیا۔ وہ واپس اوپر آگیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

دفعۃً اس کی نگاہ میدان پر پڑی۔ مابھا کے ڈھیر کے قریب ہی ایک اور ڈھیر اس کی طرف

آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔

وہ چپکے سے لیٹ گیا۔ جیسی کوئی بات ہی نہ ہو۔

دور مابھا دور، دور، دور کر کے کسی کتے کو دھتکار رہی تھی۔

محلے کی چمکادڑیں چیخ رہی تھیں۔ دور بہت دور کوئی گاڑی ہو تک رہی تھی۔

نہ جاؤ نہ جاؤ

ایک روز رات کے ایک بجے کے قریب شہزاد کی طرف جاتے ہوئے جب وہ ہاجرہ کی

چارپائی کے قریب پہنچا تو ہاجرہ دفعۃً چونک کر بیدار ہو گئی اس نے چارپائی سے ایک دست لگای

اور آکر ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

ہاجرہ کے جاگنے پر ایلی قطعی طور پر نہ گھبرایا۔ چونکہ وہ رات کو اکثر اٹھ کر پیشاب کرنے کا

عادی تھا۔ بچپن ہی سے ایلی کو مسلسل ابول کی شکایت تھی۔ سہمی جانتے تھے۔ کہ وہ بار بار

پیشاب کرنے کا عادی ہے اگر ہاجرہ نے اسے دیکھ لیا تو اس میں گھبراہٹ کی کوئی بات نہ تھی۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ ایلی نے دوبارہ لیا۔

ہاجرہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس چھلایا ہو تھا۔

”تم اوسر نہ جاؤ ایلی“ ہاجرہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”کہہ رہی“ ایلی نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

”میں تمہاری منت کرتی ہوں“ وہ اپنی ہی دھن میں بولتی گئی۔ دیکھو میں پاؤں پڑتی ہوں۔“

”لیکن کس لیے اے اے“ ایلی تک کر بولا۔

”نہ بیٹا میری بات مان لے۔“





ہو۔ تو وہ مطمئن ہو گیا۔

دلی کی طائفہ کو دیکھ کر ایلی بہت حیران ہوا۔ طائفہ تو اس نے لاہور اور امرتسر میں بھی دیکھی تھیں لیکن یہاں بات ہی کچھ اور تھی۔ انہیں دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسبیاں ہیں اور بازار میں کاروبار کے لئے بیٹھی ہیں۔

ان کی گفتگو نہایت سنجیدہ تھی۔ انداز میں نمائش نام کو نہ تھی بلکہ ایک عجیب سے لاسٹنڈ اور گھریلو انداز کی آمیزش تھی۔ احمد صرف ان بیٹھکوں پر جاتا تھا جہاں محفل نہ لگی ہو تاکہ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے کا موقع ملے۔ دو ایک سے اس نے گانے کی بھی فرمائش کی۔ ان کا گنگنا کس قدر پیارا تھا۔ چونکہ اس وقت وہ رسمی ساز کے شور و شغب سے پاک تھا۔ وہ یوں بیٹھی گاری تھی جیسے کوئی گھر والی ہنڈیا پکاتے ہوئی گنگنا رہی ہو۔

ہو کے رہے گا

اگلے روز صبح سویرے جلیل اور ایلی حاجی صاحب کی طرف چل پڑے۔

دیر تک وہ ملی ماراں کی گلیوں میں گھومتے رہے۔ آخر ایک مکان پر پہنچ کر جلیل نے دھک دی۔ ایک نوجوان لڑکا باہر نکلا اور انہیں ایک کمرے میں بٹھا کر اندر چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد حاجی صاحب تشریف لائے۔

ان کا قہہ درمیانہ تھا۔ عمر چالیس سے متجاوز۔ رنگ گندمی تھا۔ خدوخال نستعلیق تھے جسم دھلا پتلا۔ چہرے پر جلال اور دب دہے کی بجائے بے بسی اور عجز چھایا ہوا تھا۔ البتہ ان کی سرے سے بھری ہوئی آنکھیں بے حد منور اور نرم آلود تھیں اور ان کا سر حرکت کر رہا تھا۔

”کیا یہ ہیں — حاجی صاحب؟“ ایلی نے اپنے آپ سے کہا اور اس کے دل سے خوف اور گھبراہٹ دور ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ حاجی صاحب ایک انسان ہیں۔ نہ تو دیوتا ہیں اور نہ پیر یا دلی! ان سے بات کی جاسکتی ہے اور ان کی بات کٹلی جاسکتی ہے۔

جلیل حاجی صاحب سے باتیں کر رہا تھا اور ایلی سوچ رہا تھا۔

جلیل سے باتیں کرنے کے بعد حاجی صاحب ایلی کی طرف متوجہ ہوئے۔

”آپ کے مزاج اچھے ہیں۔ اور سب طرح خیریت ہے۔ جملہ متعلقین اچھے ہیں۔ تم بھی

آپ کہاں ملازم ہیں۔“

انہوں نے ایسے بیسیوں سوال کر ڈالے۔ اور ایلی رسمی طور پر ان کے جوابات دیتا چلا گیا۔ پھر حاجی کے ہمراہ جامع مسجد کی طرف چل پڑے۔

پھر قدم کے بعد کوئی نہ کوئی راہ گیر حاجی صاحب کو جھک کر سلام کرتا اور وہ بڑے اخلاق اس سے باتیں کرتے اور پھر جلد ہی رخصت طلب کر کے آگے چل پڑتے۔ ان کا سراپی حرکت کر رہا تھا۔ جیسے گردن اور سر کے درمیان ایک زم تار لگا ہو جو سر کے بوجھ کی وجہ سے جھل رہا تھا۔

جامع مسجد پہنچ کر حاجی صاحب نے وضو کیا۔ پھر ایلی سے کہا۔

”جلیل وضو کر لو۔“

ایلی کو وضو کرتے دیکھ کر حاجی صاحب خاموش رہے۔ جلیل نے ایلی کو ٹوکا۔

”تو نہیں۔“ جلیل بولا ”ایسے نہیں بلکہ —“

حاجی صاحب نے جلیل کی بات کاٹ کر کہا۔

”نہیں کرنے دیجئے جیسے بھی یہ کر رہے ہیں ٹھیک ہے۔“

ایلی نے حیرانی سے حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔ یہ عجیب پیر ہے جو احکام صلوات نہیں کرتا۔ اکی آواز اس قدر مدہم ہے۔ پیروں کی آواز تو خلق کے نچلے پردے سے نکلا کرتی ہے اور اچاندہ ہوتا ہے۔ یہ تو بڑے ملائم انداز سے بات کر رہا ہے جیسے معذرت کر رہا ہو۔ بلکہ اس کا نام تر و جوانی کا معذرت ہے۔

ایلی کو خشک پڑنے لگا کہ وہ پیر نہیں بلکہ کوئی تاجر ہے جس نے پیری مریدی کا دھند اچلا رکھا ہے۔ پیر تو ہونے والے مریدوں کو ڈانٹتے ہیں۔ دھمکاتے ہیں۔ ایلی کو براہ راست کسی پیر سے مل نہیں پڑا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ پیر کیسے ہوتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیسے اس نے اندازہ لگایا کہ پیر بڑے بارعب اور جلالی ہوتے ہیں اور مریدوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔

باہر

پھر محل اسے یقین ہو گیا کہ حاجی صاحب نے پیر بننے کا دھونگ رچا رکھا ہے۔ وضو کرنے کے بعد انہوں نے ایلی کو اپنے رویو بٹھایا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اور کچھ

رہا نہیں تو بسم اللہ۔“

”بت خوب۔“ حاجی صاحب نے کہا۔ اور از سر نو اس کے ہاتھ تھام کر بیٹھ گئے۔

”ایک بات اور ہے۔“ ایلی نے پھر انہیں ٹوکا۔

”ہاں ہاں۔“ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”اس وقت میرے دل میں سپردگی یا حوالگی کا جذبہ موجود نہیں ہے۔“

حاجی صاحب نے پیار بھری نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔

پار ایک منٹ وہ یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں کی چمک

کمزور بڑھ گئی تھی۔ اور چہرے پر ایک عجیب قسم کی مسرت پھیلی ہوئی تھی۔

وہ جلیل سے مخاطب ہوئے۔

”جلیل صاحب۔“ وہ بولے۔ ”آپ والدہ محترمہ کو میرا سلام دیں۔ ان سے کہیں کہ آپ

میں عزم کی تقیل کر دی گئی۔ لیکن ان سے کہہ دیں کہ۔۔۔“

جلیل نے ان کی بات کاٹ کر کہا ”لیکن حاجی صاحب بیعت۔۔۔“ اور پھر با معنی انداز

میں ایلی کی طرف دیکھنے لگا۔ ”کوئی بات نہیں۔“

وہ بولے ”ایلی صاحب ہمارے دوست ہیں۔ تخلص ہیں اور ہم اپنے دوست سے کوئی بات

چھپا کر نہ کریں گے۔“

ایلی نے پھر حیرانی سے حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔

”معاف کیجئے گا۔“ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”چونکہ ہمارے دل میں آپ کی دوستی

کی خواہش ہے لہذا اس خواہش کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو آپ کا دوست سمجھتے ہیں۔ چاہے

آپ کے دل میں ایسی خواہش ہو یا نہ ہو۔ آپ کے دل میں بھی پیدا ہو جائے گی۔ انشاء اللہ

بکھینچے گا مگر آپ کے دل میں اللہ کی دوستی کی خواہش پیدا ہو جائے تو یقیناً آپ اللہ کے دوست

بن جائیں گے۔ خواہش بڑی چیز ہے ایلی صاحب۔۔۔ ہاں تو جلیل صاحب آپ والدہ محترمہ

سے کہہ دیں۔“ حاجی صاحب نے جلیل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ان سے کہہ دیں کہ جو ہوتا ہے

لو کر رہے گا۔ ہمارا مطلب ہے جس بات کا والدہ محترمہ کو ڈر ہے وہ ہو کر رہنے والی ہے۔ جو اللہ

کو منظور ہے وہی ہو گا۔ ڈرنے کی بات نہیں۔ اللہ بستر کرے گا۔ اسی میں بستر ہے۔“

”اور“ حاجی صاحب نے کچھ وقفے کے بعد کہا۔ ”والدہ محترمہ سے کہیں کہ ابھی وقت

”ایک بات پوچھوں۔“ ایلی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ حاجی صاحب بولے۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“

”آپ کی والدہ کے حکم کو بجالا رہا ہوں۔“ وہ بولے۔

”تو سن لو۔“ ایلی نے سوچا۔ ”اپنے مرید کا حکم بجالا رہا ہے۔ کسی حیر نے کبھی مرید کے

متعلق ایسی بات کی ہے کیلہ لاجول ولا قوت۔“

”پھر بھی۔“ ایلی نے پوچھا ”اس عمل کو کیا کہتے ہیں۔“

”اسے بیعت کہتے ہیں۔“

”بیعت کیا ہوتی ہے۔“

”بیعت ایک تعلق ہوتا ہے جیسے دوستی ہوتی ہے۔“

”دیکھئے حاجی صاحب۔ میں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔“

”فرمائیے۔“

”اگر آپ اپنی طاقت سے مجھے نیک بنا دیں تو مجھے ایسی نیکی مطلوب نہیں۔“

”کیوں۔“ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

”میں وہ نیکی چاہتا ہوں جو میرے دل سے نکلے۔ کسی کی بخشش ہوئی نہ ہو۔“

وہ ہنسنے لگے۔

”سبحان اللہ۔ سبحان اللہ آپ بہت سمجھدار ہیں۔“

”ارے۔“ ایلی حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا ”یہ تو بالکل ہی تاجر ہے۔“

”مگر آپ اپنی نیکی اور عبادت کے زور سے مجھے اللہ سے ملا دیں۔“ ایلی نے کہا تو ابھی

مجھے منظور نہیں۔ ملنا ہے تو میں اپنے زور پر ملوں گا۔ اس کے علاوہ وہ بولا ”میں نہیں چاہتا کہ

بدلوں۔ میں اسی طرح رہنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ ہوں۔“

”بہت اچھے۔ بہت اچھے۔“ وہ بولے۔ ”نہایت اچھے خیالات ہیں آپ کے۔“

”ارے۔“ ایلی نے پھر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ”بالکل ہی بنیاد میں کامرشد ہے۔“

”باقی رہا تعلق کا سوال۔“ ایلی نے کہا تو ابھی میرا اور آپ کا تعلق پیدا نہیں ہوا۔ تعلق تو

دل کی بات ہے جو آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے اور پھر بڑھتا ہے۔ اگر آپ والدہ صاحبہ کا فریاد پورا

ایلی کا جواب سن کر حاجی صاحب چونکے۔  
”خوب۔“ وہ بولے۔

”ہاں آپ نے کبھی چلوڑی کی سیر کی ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔  
”ہاں۔“ وہ بولے۔ ”ہم تو بھائی دیں رہا کرتے تھے۔“  
”یہاں رہا کرتے تھے۔“

”ہاں۔“ کیمٹ کی دکان تھی۔ ٹکلتے میں ہیڈ آفس تھا۔ بمبئی اور دلی میں برانچیں  
”نہیں۔“

”اے۔“ ایلی چونکا۔ ”تو کیا کھانا پڑ گیا۔“  
”نہیں تو۔“ وہ بولے۔ ”بس چھوڑ دیا کاروبار۔“  
”کیوں۔“ اس نے پوچھا۔

”اللہ میاں نے اپنی طرف بلا لیا۔“  
”اللہ میاں سے دوستی ہے کیا۔“  
”نہیں۔“ وہ مسکرائے۔ ”ابھی تو معمولی جان پہچان ہوئی ہے۔“  
”ایک بات پوچھوں۔“ ایلی نے کہا۔

”ضرور پوچھئے۔ جو جی چاہی پوچھئے۔“  
”اللہ میاں کیسے ہیں۔“

”بہت پیارے ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”بہت ہی پیارے۔“  
”وہ تو بہت سخت ہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”اللہ صاحب مسکرائے۔“ سخت ہوتے تو کیا ہم سب اس قدر بگڑے ہوئے ہوتے۔“  
ایلی کو یہ خیال کبھی نہ آیا تھا۔ اس نے اس زاویے سے اللہ تعالیٰ کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس  
کے نزدیک اللہ تعالیٰ ایک عظیم ہستی تھی۔ بے نیاز۔ بے پروا!

”ایلی صاحب!“ وہ بولے۔ ”اللہ تعالیٰ سے دوستی کر کے دیکھو۔ اس قدر مخلص دوست  
میں مل سکتا۔“

”میں اس قابل نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”قابلیت اور اہلیت وہ خود عطا کرتے ہیں۔“ حاجی صاحب نے کہا ”صرف ان کی دوستی کی

نہیں آیا۔۔۔۔۔ وقت آئے گا۔ ضرور آئے گا اور بہت اچھا ہو گا۔ بہت اچھا۔ ماشاء اللہ ایلی  
صاحب کے خیالات بہت بلند ہیں۔ انشاء اللہ بہت اچھا ہو گا۔ گھبراہٹیں نہیں۔ ایک وقت آئے گا  
جب ایلی صاحب بہت اچھے لوگوں سے ملیں گے۔ ان کی خوشنودی حاصل ہو گی۔ انشاء اللہ۔

## جادو کی مرہم

اسی روز شام کے وقت وہ دوبارہ حاجی صاحب سے ملے تو وہ تیار بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی  
بولے۔

”جلیل صاحب۔ آپ آگئے۔ اچھا کیا آپ نے۔ اب آپ نماز سے فارغ ہو لیں۔ جب  
تک میں ایلی صاحب کو دلی کی سیر کرا لوں۔ کیوں ایلی صاحب۔ آپ دلی کی سیر کریں گے۔  
آئیے۔“

ایلی نے پھر حیرت سے اس عجیب و غریب پیر کی طرف دیکھا۔ درحقیقت اب وہ قطعی طور پر  
بھول چکا تھا کہ حاجی صاحب پیر، دلی یا اللہ لوک ہیں۔ اب وہ انہیں تاجر بھی نہیں سمجھتا تھا۔ نہ  
ہی بنیا۔ اب حاجی صاحب اس کے نزدیک ایک خوش مزاج با اخلاق اور اخلاص سے بھرانا  
تھا۔

وہ دونوں چل پڑے۔

ایلی حیران تھا کہ یہ منحنی سرمد چشم نحیف و زار آدمی اسے کہاں لے جائے گا۔ وہ بھلا اسے  
دلی کی کیا سیر کرا سکتا ہے۔ دلی کی سیر تو احمد نے کرائی تھی۔ واہ واہ کیا چیزیں دکھائی تھیں۔ لیکن  
احمد کے ساتھ جانے میں ایک قباحت ضرور ہوئی تھی۔ احمد کا طائفہ کے ساتھ کچھ ایسا طرز عمل  
تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان کا بھڑوا ہو۔ وہ اسے اہمیت ضرور دیتی تھیں لیکن ایسی اہمیت  
جیسے بھڑوے کو دی جاتی ہے۔ وہ اس سے یوں بات کرتی تھیں جیسے وہ ان کا دوست نہ ہو بلکہ ہم  
کار ہو۔

”آپ نے دلی کی سیر کی ہے کیا۔“ حاجی صاحب نے پوچھا۔

ایلی چونکا۔ ”جی ہاں۔“

”کون کون سی جگہ دیکھی ہے۔“ وہ بولے۔

”جی چلوڑی میں گیا۔“

خواہش پیدا کرو۔ صرف خواہش۔“

”خواہش تو خود پیدا ہوتی ہے زبردستی پیدا نہیں کی جاسکتی۔“ ایلہ نے کہا۔

”تو یہ خواہش ان سے مانگو۔ اللہ میاں سے یا راندہ خوبصورت سے خوبصورت عورت کے یارانے سے کہیں زیادہ رنگین ہے۔“

حاجی صاحب کی باتیں عجیب تھیں۔ ایلہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس شخص کا تخیل کس قدر رنگین ہے۔ اس کی غناک نگاہ میں کتنی وسعت ہے۔

”کیا آپ نے کبھی عورت سے بھی یاراندہ لگایا تھا۔“ ایلہ نے پوچھا۔

وہ مسکرائے۔ ”ہاں ہاں۔“

”مجھے بتائیے۔“ ایلہ بولا۔

”ہم نے ایک مرہم بنایا تھا۔“

”کیسا مرہم۔“

”ہم نے بہت سی ادویات سے ایک مرہم تیار کیا اور پھر سات روز ایک وظیفہ کیا ایسے مقام پر وظیفہ کیا تھا جو لائق و دوق ویراندہ تھا۔ بمبئی میں سمندر کے ساحل کے پاس ایک پرائیویٹ ہاؤس تھا جو مسماں ہو چکا تھا۔ اس میں بیٹھ کر ہم نے وظیفہ پڑھا اور پھر مرہم مکمل ہو گیا۔ وہ وظیفہ بھی اس مرہم کا ایک جزو تھا۔

”لیکن وہ مرہم کیوں بنایا آپ نے۔“

وہ مسکرائے۔ ”بھائی نوجوان تھے۔ عورتوں کا شوق تھا۔ ان دنوں جی چاہتا تھا کہ ایسا چیزا تھ لگے کہ جس عورت سے آنکھ چار ہوں وہ دل و جان سے ہم پر غار ہو جائے۔ ان دنوں جونی کا جوش تھا۔ روپیہ عام تھا۔ صحت ماشاء اللہ جو بن پر تھی۔ عاشق مزاج لڑکپن ہی سے تھے۔“

ایلہ سننے لگا۔ وہ بالکل بھول گیا کہ یہ وہی حاجی صاحب ہیں جن کی بیعت کرنے کے لئے وہ

علی پور سے دلی آیا تھا۔

”مرہم کا نسخہ ہمیں بڑی تلاش سے ملا تھا۔“ حاجی صاحب نے پھر قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ ”ایک سادھو سے ہمیں یہ نسخہ ملا بہت گیمانی قسم کا سادھو تھا۔ اس نے سالہا سال تپس کی تھی لیکن گیمانی ہونے کے باوجود بڑا مہوجی آدمی تھا۔ میں نے صبح شام اس کی خدمت کی تو ایک روز بولا۔

”اے عقل کے اندھے۔ مانگا بھی تو کیا مانگا تو نے۔ بھگوان کے دامن مانگا۔ یہ نہیں تو

مانگنے کی بدھی مانگا۔ اس سے تو یہی اچھا تھا کہ سندر تا بھری نار بننے کی رکشا کرتا۔ نار میں ہلاکتی ہے اگر کچھ بننا ہو تو محبوب بنو۔ عاشق نہ بنو۔ لگن نار مانگی تو کیا مانگا۔ اپنے آپ کو بھسم کر لے تو کیا ہو گا؟ اچھا اب جو مانگا ہے وہی پاؤ گے۔“

ایلہ حیرت سے حاجی صاحب کی بات سن رہا تھا۔

”ہیں تو ایلہ بھائی ہم نے وہ مرہم بڑی محنت سے تیار کیا۔ اس مرہم کی خاصیت یہ تھی کہ ہر ایک سٹائی آنکھ میں لگا کر جس عورت کی آنکھوں سے آنکھیں ملاؤ۔ وہ تمہارے پیچھے چلے گی۔ تمہاری گرویدہ ہو جائے گی۔“

”اچھا۔ تو پھر آپ نے وہ مرہم آزمائی۔“ ایلہ نے پوچھا۔

”صرف ایک بار۔“ وہ بولے۔

”اس کا اثر ہوا۔“

”ہاں۔ اس قدر اثر ہوا۔ اس قدر اثر ہوا کہ —“ وہ رک گئے۔

### لب خالی طلب

”شام کا وقت تھا۔ بمبئی کا موسم بڑا خوشگوار تھا۔ وہ مرہم لگا کر ہم چوہائی کے ساحل پر جا گئے۔ اس وقت ساحل کے باغیچے میں بیچ پر ایک پارسی خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت خوبصورت تھی۔ اگرچہ نوجوان نہ تھی۔ ہم اس کے پاس جا بیٹھے اور اس تک میں رہے کہ کب وہ ادھر سے لوڑ اس سے آنکھیں چار ہوں۔

جب آنکھیں ملیں تو وہ گویا ہمیں دیکھ کر بھونچکی سی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ ٹھنکی بانہہ کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک تو ہمیں اس کا بہت لطف آیا۔

”گھبرانے کی کیا بات تھی۔“ ایلہ نے پوچھا۔

”بھئی۔“ وہ بولے۔ ”کیا وہ نگاہیں جھکائے رکھنے والی عورت۔ اور کہاں آنکھوں میں صفا ڈال کر دیدہ دلیری سے ٹھنکی بانہہ کر دیکھنے والی۔ نہ اس کی نگاہ میں شرم تھی نہ ہنس۔ اور پھر اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ سچ پوچھو تو اس وقت اس میں گھبرائیت نہ رہی تھی۔“

”آئیے ایللی صاحب۔ آپ کو اللہ کے بندوں سے ملائیں۔ ہمارے پاس اور کیا ہے۔ بس مانفرفنی والی بات ہے۔“

”جی اچھا۔“ ایللی نے جواب دیا۔

علی ماسٹر

— ”تو کن سے ملیں گے آپ عقل والوں سے یا دل والوں سے یہ دلی تو اللہ کے بندوں سے بھری پڑی ہے۔ ایک سے ایک انوکھا ہے۔ ایک سے ایک زالا ہے۔ دلی پر خدا کا پتہ کرم رہا ہے۔ اس شہر سے انہیں بست لگاؤ ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کے لئے خزانوں کے نہ کھول رکھے ہیں۔ جس کی جتنی ہمت ہو اٹھالے۔ اور بھائی ہم تو ابھی مبتدی ہیں اس مکتب میں ابھی الف کے چکر سے نہیں نکلے۔ ہاں تو جتا بیٹے عالم سے ملیں گے یا.....؟“

”جی۔ عالم سے ملائیے۔“ ایللی نے جواب دیا۔ ایللی ابھی عقل کے چکر سے نہیں نکل پایا تھا ابھی اسے معلوم نہ تھا کہ دل کسے کہتے ہیں۔ اس کی دانست میں انسان کی نفسیات میں صرف دو چیزیں اہم تھیں۔ عقل ذہن۔ ایللی کو یہ علم نہ تھا کہ دل کسے کہتے ہیں۔ قلب کیا ہے اور روح کس بلا کا نام ہے۔

چوبارے پر چڑھتے ہوئے حاجی صاحب کہنے لگے ”جن صاحب سے آپ کو ملانے جا رہے ہیں ان کا نام محمد حسین ہے۔ عمر بھر عربی پڑھاتے رہے ہیں۔ ماشاء اللہ۔“

”علی ماسٹر!“ ایللی کے ذہن میں حقارت کی ایک رو دوڑ گئی۔ عربی ماسٹر بھلا کیا عالم ہو گا۔ انہیں تو علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ وہ عربی ماسٹروں سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ وہ حلق کے لچے پردوں سے بات کرتے۔ بار بار لاجول پہنچتے اور تہذیب جدید کی ہر بات پر ناک بھوں پٹختے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں انگریزی زبان سے چڑھتی۔ جسے انگریزی زبان سے چڑھو وہ کوئی نام ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ چپ چاپ حاجی صاحب کے پیچھے پیچھے زینہ چڑھنے لگا۔

ایک مختصر سی بیشک میں چاندنی کافر ش ہو رہا تھا۔ یہاں وہاں کئی ایک ضخیم کتابیں پڑی تھیں۔ ان کے درمیان چار ایک ڈیک نما چوکیاں رکھی تھیں۔ ایک ایسی ہی چوکی کے پاس ایک ڈیکرے بدن کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سادہ کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔ کھدر کا لمبا چنڈ لہلہا رہا۔ سامنے چار ایک لوگ بڑے احترام سے بیٹھے تھے۔

ایللی بہت محفوظ ہو رہا تھا۔

”بہت جلد ہم اس سے آگے آئیں گے۔“ انہوں نے پھر بات شروع کی۔ ”پھر ہم نے دیکھا کہ ایک اور مینار سڑک پر چل رہی ہے۔ ہم نے اس سے آنکھیں ملائیں تو وہ چلتے چلتے رک گئی۔ اب وہ کھڑی ہماری طرف دیکھ رہی ہے۔ اسی طرح آدھ کھٹے میں ہمارے گرد تین عورتیں کھڑی ہو گئیں۔ اس پر آئے جانے والوں نے مشکوک نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک سپاہی آگیا۔ اس کے روبرو ہم تو گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ لیکن وہ اسی طرح ٹکٹلی ہتھ کر ہماری طرف دیکھتی رہیں۔ اس نے تحقیقات شروع کر دی اور ہم وہاں سے کھسک آئے۔“

”پھر اسی رات ہم تعظیم دیکھنے چلے گئے۔ ہمارے اگلے صوفے پر دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ جب وقفہ آیا تو ان دونوں نے سڑک دیکھا۔ ہم پہلے ہی ناک میں بیٹھے تھے۔ ہم نے خوب آنکھیں چار کیں۔ ان کی بھی وہی حالت ہوئی۔ اب وہ مستقل طور پر منہ موڑ کر بیٹھ گئیں۔ کھیل شروع ہو گیا لیکن وہ اسی طرح سٹیج کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی رہیں۔ ان کے لواحقین نے ہزار کوششیں کیں کہ وہ سیدھی ہو کر بیٹھیں لیکن لڑکیوں نے ان کی بات کی کوئی پروا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ہنگامہ ہو گیا اور ہم وہاں سے بھی بھاگے۔“

”عجیب مرہم تھا وہ۔“ ایللی بولا۔

”ہم نے تو یہ محسوس کیا کہ جس کی طرف ہم دیکھتے تھے اس کی روح گویا شل ہو جاتی تھی اور خالی جسم رہ جاتا اور پھر اس جسم سے خوف آنے لگتا۔ ناسایت تو گویا ختم ہو جاتی۔ یعنی گلاب کے بجائے کدو کا پھول رہ جاتا جس میں نہ بو ہوتی نہ باس۔ یہ دیکھ کر ہمیں احساس ہوا کہ طلب ہی واحد چیز ہے حصول کی کوئی حیثیت نہیں۔ بس ہم نے وہ مرہم سمندر میں پھینک دیا۔ اور دل میں ساگنی کہ کیوں نہ ایسی طلب پیدا کریں جہاں حصول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خالی طلب۔ بس دھنستا“ طبیعت نے پلٹا کھایا اور سب کچھ چھوڑ دیا۔ سب کچھ کاروبار، شوق، تفریح“ سب کچھ۔“

کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہو رہے پھر بولے۔

”ایللی صاحب یہ تو سب بھانے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہیں جب چاہیں اپنی طرف بلا لیتے ہیں۔ ہم پر بھی کرم کر دیا انہوں نے۔ ان کی کرم نوازیاں ہیں۔“ وہ خاموش ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد وہ کہنے لگے۔

من لیجے کہ ہمارے اندازے کی بنیادیں کیا ہیں۔ پہلی حالت میں اس پر کبھی بیٹھتی ہے اور کبھی بیٹھ مٹھاس پر بیٹھتی ہے۔ پھر اس میں سنڈی پڑتی ہے اور صاحب من! سنڈی ہمیشہ اپنی چیز میں پڑتی ہے اور بلاخر اس پر نہ کبھی بیٹھتی ہے نہ سنڈی پڑتی ہے نہ چپوٹی منہ لگاتی ہے نہ کوئی اور جانور تو ظاہر ہوا کہ تیسری حالت میں وہ زہر ہو جاتا ہے۔

اس پر واہ سبحان اللہ کا شور مچ گیا۔  
ابھی وہ دونوں اصحاب جو گوؤ کے ذائقے کے متعلق پوچھنے آئے تھے اجازت حاصل کر رہے تھے کہ چھ سات لوگ اور آگئے۔ انہوں نے آتے ہی ایک نیا مسئلہ پیش کر دیا۔  
ان میں سے ایک صاحب کہنے لگے۔

”مولانا! آپ کو یاد ہو گا کہ اجیر شریف کے گزشتہ عرس میں ہم آپ کو اجیر شریف میں لے گئے۔ اس روز جمعرات کا روز تھا۔ آپ ہمیں اس حجرے میں لے گئے تھے جہاں آپ رہے ہوئے تھے اور شاید آپ کو یاد ہو کہ آپ نے ہمیں مسئلہ ارتقاء سمجھایا تھا۔“  
”شاید۔“ مولانا بولے۔ ”ہمیں یاد نہیں۔ خیر آپ بات کیجئے۔“  
اس کے بعد ایک اور صاحب بولے۔ کہنے لگے:

”مولانا! عرس کے روز ہم دلی میں آپ سے ملے تھے۔ اسی دوران خانے میں۔ بلکہ باتوں

مابین آپ نے اجیر شریف کا ذکر کیا تھا۔“  
”اب سوال یہ ہے کہ۔“ ایک اور صاحب کہنے لگے ”کیا یہ ممکن ہے مولانا کہ ایک شخص دو وقت دو مختلف مقامات پر موجود ہو۔ اگر یہ ممکن ہے تو یہ فرمائیے کہ ایسے صاحب کا روحانی درجہ کیا مرتبہ ہو گا۔“

مولانا ہنسنے لگے۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد بولے ”روحانی طور پر اچھے مرتبے اور مقام لے اصحاب کے لئے عین ممکن ہے کہ وہ بیک وقت دو مختلف مقامات پر موجود ہوں۔ سبحان! کیا مرتبہ ہے۔“ وہ رک گئے۔

”آخر علی ماسٹری ہے نا۔“ ایللی نے سوچا۔ ”خود ستائی سے کیسے بچ سکتا تھا۔“  
”کوئی توقف کے بعد مولانا نے کہا ”جناب عالی! ایک شرط لازم ہے اس سلسلے میں“ وہ یہ کہ دو وقت دو مقامات پر حاضر ہونے والے صاحب کو یہ احساس ہو کہ وہ بیک وقت دو مقامات پر موجود ہے۔ اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں یہ شعور ہے کہ ہم اس روز دلی میں موجود تھے

ماسٹر صاحب جملہ لوگوں سے مخاطب تھے۔ وہ انہیں سمجھا رہے تھے کہ ہر چیز میں ہونا وہ بیک وقت غیر از امکان نہیں۔

وہ بڑی روانی سے اردو بول رہے تھے۔ ایللی کے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ انگریزی کا کوئی لفظ استعمال کے بغیر وہ اپنا مفہوم واضح کر رہے تھے۔ ایللی غور سے ان کی بات سنتا رہا لیکن اسے خاک سمجھ نہ آیا۔ چونکہ وہ ان الفاظ اور اصطلاحات سے قطعی ناواقف تھا۔ البتہ ایللی پر محمد حسین کی شخصیت نے خاصا اثر کیا۔ ان کی طبیعت میں سادگی تھی۔ ان کی باتیں جذبہ سے سرشار تھیں اور ان کا انداز دوستانہ تھا۔

جب وہ جزو اور کل کا مسئلہ سمجھا چکے تو سامعین نے جو پہلے ہی اثر اور احترام سے بیٹھے بیٹھے تھے اجازت حاصل کی اور رخصت ہو گئے۔

اس وقت مولانا نے حاجی صاحب کو دیکھا۔ بڑی تعظیم سے انہیں ملے۔ ایللی سے شفقت بھرا مصافحہ کیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ ابھی چند ایک منٹ ہی ہوئے تھے کہ دو اصحاب آگئے۔ آتے ہی کہنے لگے۔

”مولانا! ایک مشکل درپیش ہے۔ امداد کے لئے حضور کی طرف رجوع کیا ہے۔“  
”کہئے کہئے۔“ مولانا نے بے تکلفی سے کہا۔  
”گستاخی معاف۔“ وہی صاحب بولے۔

”شوق سے پوچھو میاں۔ جو جی میں آئے پوچھو۔ جو جی میں آئے کو۔ اگر ہماری دانست میں بات آئی۔ تو بیان کر دیں گے۔ صحت کے ضامن نہیں اپنا اپنا خیال ہے۔ میاں اپنی اپنی رائے ہے۔ علم تو وہ سمندر ہے جس کا کنارہ نہیں۔ ابراہیم تو میاں ابھی کنارے پر بیٹھے ہیں۔ علم کی تو ہوا بھی نہیں لگی۔ ہاں ہاں شوق سے کو۔“

”سوال یہ ہے حضور مولانا کہ گوؤ کا کیا ذائقہ ہے۔“  
ایک ساعت کے لیے مولانا نے سر جھکا لیا۔ خاموش بیٹھے رہے۔ پھر سر اٹھا کر مسکراتے لگے۔ بولے۔

”میاں ہمارا اندازہ ہے کہ گوؤ کے تین ذائقے ہوتے ہیں۔“  
”تین ذائقے۔“ ایللی حیرت سے مولانا کی طرف دیکھ رہا تھا۔  
”پہلے اس میں مٹھاس ہوتی ہے۔ پھر وہ کٹھاس سے بھر جاتا ہے اور آخر زہر بن جاتا ہے۔“



نہی جسے وہ بار بار لگاتا اور یوں مولانا کی طرف دیکھتا جیسے کسی جرثومہ پر تحقیق کر رہا ہو۔  
اگلے روز وہ شام کو علی پور جانے والے تھے۔ دوسرے کو احمد بولا "ایلی صاحب چلے آپ کو  
پہلی بائی سے ملا لاؤں۔ بڑے غضب کی چیز ہے۔"  
جب وہ دونوں پہلی بائی کے چوبارے پر پہنچے تو وہ میلے کچیلے کپڑے پہنے کھڑکی میں فرش پر  
بٹھی تھی۔

"آؤ احمد۔" وہ بے تکلفانہ انداز سے بولی۔ "بڑی دیر کے بعد آئے ہیں آپ۔"  
احمد نے آداب عرض کی اور اس کے پاس جا بیٹھا۔  
"تشریف رکھئے نا۔" وہ ایلی سے کہنے لگی۔

ایلی چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گیا۔  
"یہ کون صاحب ہیں۔" اس نے احمد سے پوچھا۔  
"یہ میرے بھائی ہیں۔ الیاس آصفی۔"

"الیاس صاحب۔" وہ بولی۔ "میں نے آپ کی تصویر کہیں دیکھی ہے۔"  
"یہ تو خود تصویر ہیں۔ ان کی تصویر کیا ہوگی۔" احمد بولا۔  
"کیا مطلب۔"

"بولتے نہیں۔ تصویر بن کر بیٹھ رہتے ہیں۔" احمد نے قہقہہ مارا۔  
"جنہیں دیکھنا ہو وہ بولتے نہیں۔" ایلی نے بعد مشکل ایک بھڑکی بات کی۔  
"ارے۔" وہ ہنسی۔ "تو آپ دیکھتے ہیں۔"

"جی۔" ایلی نے بائی پر بھرپور نگاہ ڈالی۔  
"دیکھنا تو اچھی چیز نہیں۔" وہ بولی۔ "خواہ مخواہ خطرہ مول لیا۔" وہ مسکرائی۔ "اس سے تو  
دیکھنا کس اچھا ہے۔"

"تو جی آپ دیکھتی نہیں۔" احمد ہنسنے لگا۔  
"ہمارا کیا ہے۔" اس نے ایک آہ بھری۔ "ہماری طرف بھی دیکھتے ہیں اور کوئی بھی نہیں  
دیکھ لور اپنی یہ حالت ہے کہ بت کہیں چت کہیں۔"  
"تو آپ بیک وقت دو جگہ ہوتی ہے۔" ایلی نے کہا۔  
"نہی۔" ایک جگہ رہیں تو جیون کیسے کئے۔ اور یہ جو روپ ہے یہ تو نفلی ہے۔"

اجیر شریف کی حاضری کا نہ ہمیں شعور ہے نہ احساس نہ علم لہذا مرتبے کا سوال ہی پیدا نہیں  
ہوتا۔"

پہلے دو آدمیوں نے اس پر شور مچا دیا۔ بولے "حضرت! ہم نے تو بے قانگی ہوش و حواس  
آپ کو وہاں دیکھا ہے۔ آپ سے ملاقات کی ہے۔ آپ نے ہم سے گفتگو فرمائی ہے۔"  
"بالکل بالکل۔" مولانا نے کہا۔ "ہم آپ کی بات جھٹلاتے نہیں۔ یقیناً" آپ درست  
فرماتے ہیں۔ آپ نے ضرور ہم سے ملاقات کی ہوگی۔"  
"تو پھر۔ تو پھر۔" انہوں نے شور مچا دیا۔

"میاں۔" وہ بولے۔ "وہ قادر مطلق بہت بڑا شعبہ باز ہے۔ اگر وہ چاہے کہ کوئی فرد  
جگہ موجود دکھائی دے تو یہ اس کی شعبہ بازی ہے۔ البتہ اگر ہم الزام اپنی مرضی سے اور  
ارادے سے دو جگہوں پر موجود ہوتے اور ہمیں اس امر کا شعور ہوتا تو اور بات تھی۔ کیوں ملتی  
صاحب؟" انہوں نے حاجی صاحب سے پوچھا۔  
"آپ بہتر جانتے ہیں۔" حاجی صاحب بولے۔

## پہلی بائی

حاجی صاحب سے رخصت ہونے کے بعد ایلی گھر آکر پڑ رہا۔ اس روز وہ عجیب خیالات میں  
کھویا ہوا تھا۔ حاجی صاحب کی دنیا عجیب دنیا تھی۔ وہ مرہم و عالم اور نبیلے کیا کیا محسوس کرنے لگا  
تھا جیسے حاجی صاحب کی دنیا ایک وسیع دنیا ہو جس کا صرف ایک کونہ اس نے دیکھا تھا۔ کیا وہ عمل  
ماثر واقعی دو جگہوں پر بیک وقت موجود تھا یا وہ محض ایک ڈھونگ تھا۔ کیا مگر کا ذاتہ اس نے  
عقل کے زور پر بتایا تھا۔ بہر حال وہ حیران تھا۔ اس کے رو برو وہی عربی مولوی بیٹھا ہوا تھا اس کا  
اپنا مرشد برٹریڈ رسل مودیانہ مولوی کے سامنے جھکا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی راستہ دکن  
برنارڈشا، ایچ جی ویلز، کانکا، سلہ لگراف، جینز، سب مودیانہ بیٹھے تھے۔ اور مولوی انہیں سجدہ  
تھا۔

"میاں!" وہ کہہ رہا تھا۔ "تمہیں اللہ کی دین حاصل ہے لیکن تمہیں اللہ کی دین کا احساس  
نہیں۔ اپنے علم میں اللہ کو بھی شامل کر لیجئے۔ پھر دیکھئے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔"  
کونے میں فرماؤ مشتبہ نگاہوں سے مولانا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک احمدی

”وہ دھن کیسے ہے۔“ احمد نے کہا۔ ”کچھ موڑ موڑ مسکات جات۔“

اور وہ گمانے لگی۔ دفعتاً اس کے چہرے کا عالم ہی بدل گیا۔ پہلے اس پر بے نیازی کی دھڑکتی ہوئی تھی۔ جمل اور بے نیازی جس میں قنصع نہ تھا لیکن جو غنی اس نے آہستہ آواز میں کہا شروع کیا بے نیازی ختم ہو گئی۔ ایک مبسم تڑپ ایک دلفریبی جیسے دفعتاً ”محبوبیت کی وہ کیفیت ختم ہو گئی ہو۔ جو خود بخود بلا جدوجہد بغیر خواہش اور کوشش کے چھائے ہوئے تھی۔ اب وہ محبوبیت پیدا کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ دونوں کیفیات میں کتنا فرق تھا۔ پہلے وہ خدا بنی بیٹھی تھی۔ بے نیاز لا شعوری محبوبیت سے سرشار۔ اب نہ جانے کیا بن گئی تھی۔ کیا واقعی خواہش ذات خود محبوبیت کی کٹ تھی۔

### مہارانی

علی پور آتے ہوئے راستے میں ایلی دلی کے تاثرات میں سرشار رہا لیکن علی پور پہنچ کر جب وہ پہلے روز شہزاد سے ملا تو وہ تاثرات سب کے سب یوں کالور ہو گئے جیسے صبح کی دھند سورج کی شعاعوں سے صابون کے بلبلیوں کی طرح اڑ جاتی ہے۔

”ہمارے مرشد ہی کسی کے مرید بن آئے تو اب ہمارا کیا ہو گا۔“ شہزاد نے کہا۔ ”ہمیں کئی حیثیت ہی نہ رہی نا۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”تم تو مہارانی ہو۔“ وہ بولا ”اور مہارانی مہارانی ہی ہوتی ہے۔“

”جب مہاراج ہی بھکشو ہو جائیں تو مہارانی کہاں رہی۔“

”جسے تم سا خزانہ ملا ہوا ہو وہ بھلا بھکشو کیوں بنے۔ بھکشو تو وہ بنتا ہے جس۔“

”کچھ نہ ہو۔“

”ہاں تو پھر حاجی صاحب نے کیا کہا۔ مجھے سب کچھ بتاؤ نا۔“ شہزاد اس کے قریب تر ہوا، تم حاجی صاحب نے کہا۔ ”اس کا مرشد بہت زبردست ہے۔ اس کو سنبھالنا اپنے بس کا رولہ نہیں۔“

”ج۔“

”تمہاری قسم۔ وہ دہلا پٹلا حاجی چاہے کچھ بھی ہے لیکن صاحب نظر ضرور ہے۔“

”وہ کیا ہوتا ہے۔ صاحب نظر۔“

”اور اصل چیز کئی میں باندھ کر رکھی ہوئی ہے۔“ احمد ہنسا۔

”اونہوں۔“ وہ بولی۔ ”اصلی چیز خاک میں مل چکی ہے۔“

”خاک میں مل کر ہی تو سوتا بنتا ہے۔“ ایلی نے ایک اور نمائشی فقرہ چست کیا۔

”بنتا ہو گا۔ ہم تو مٹی بن کر رہ گئے۔“

”اے تو بیٹھی کیا کر رہی ہے پیلی۔“ اس کی ماں نے غصے سے اوھر دیکھا۔ ”اٹھ اب تیار ہو۔“

”بیٹھ لینے دے ماں۔“ وہ بولی۔ ”بیٹھ لینے دے کچھ دیر اور۔ ساری عمر تیار ہی ہونا ہے نا۔“

پہلی کے انداز کو دیکھ کر ایلی نے محسوس کیا جیسے مولانا پہلی کا بھیس بنا کر بیٹھے ہوں۔ یہ بالی حقیقت سے کس قدر قریب ہے۔ دیے دیکھنے میں کس قدر دور۔ یہ حقیقت کیا چیز تھی۔ اسے یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اسی شدت سے محسوس کرتا تھا۔ حقیقت ایلی کے لئے وہ مقام تھا جہاں سے ہر چیز اپنی تمام تر عمرانی میں پورے طور پر دکھائی دیتی ہے۔

دیر تک وہ دونوں پہلی کے پاس بیٹھے رہے۔ احمد کو نہ جانے کیا سوچھی وہ نیچے جا کر بہت سے چلتوزے لے آیا اور وہ تینوں بچوں کی طرح چلتوزے کھاتے رہے۔ احمد نے بہت سے چلتوزوں کے مغز نکال کر پہلی کو پیش کیے۔

”اونہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”خود توڑ کر کھانے میں مزہ ہے احمد۔ مغز نہ دو مجھے“

چلتوزے کھانے کا سارا رومان ختم ہو جاتا ہے۔

”آپ کو رومان سے دلچسپی ہے کیا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہے۔“ وہ بولی۔ ”لیکن ہمارے لئے رومان کچھ اور چیز ہے۔ یہ رومان نہیں۔ اس کی حقیقت ہم پر اس حد تک آشکار ہو چکی ہے کہ کسی گنتی شمار میں ہی نہیں رہا۔“

”ہمیں بھی پتہ چلے۔“ ایلی بولا۔

”اونہوں۔“ وہ مسکرائی ”چل بھی جائے تو بھی نہ چلے گا۔ آپ کی دنیا اور ہے ہماری اور۔“

آپ دیکھتے ہیں اور ہم پر دکھنا لازم ہے۔ رہا دیکھنا تو میں دیکھ دیکھ کر آتا گئی ہوں۔ پھر بھی دکھنا پڑتا ہے۔ آنکھیں بند کر لوں پھر بھی دکھتا ہے۔“

اس کی بات سن کر ایلی خاموش ہو گیا۔ اسے کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی۔

”تم شادی کر لو ایللی۔“

”یہ تم کہہ رہی ہو۔“

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”میں یہ بخوشی برداشت کر لوں گی۔“

”تو پھر بات کیا بنی۔“

”ہاں تم مجھ سے الگ نہ ہونا۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔“

”نہیں شنزاد۔“ وہ بولا ”یہ ہو کے رہے گا۔“

”کیا ہو کے رہے گا۔“

”ہم ایک دوسرے کے ہو کے رہیں گے۔“

”وہ تو ہم ہیں ہی۔“ وہ بولی۔

”اعلانیہ ہو کے رہیں گے۔“

وہ قہقہہ مار کے ہنسنے لگی۔ ”اعلانیہ ہی تو ہیں۔ سبھی جانتے ہیں۔ خود شریف جانتا ہے۔“

”شریف جانتا ہے۔“ ایللی نے دوہرایا۔

”ہاں۔ وہ صفر کے متعلق مجھے طعنہ دیتا تھا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ میں نے کہا

لہذا رہا ہے مجھے تو ایللی کا دو۔ اس شرابی اور کینے کا طعنہ نہ دو۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں

نہاری ہو چکی ہوں۔ صاف بتا دیا۔“

”تو وہ؟“

”وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔“ وہ بولی۔ ”کوئی بات نہیں کی۔ مجھے خود معلوم نہیں ایللی کہ میں

کس لئے تمہاری ہو گئی۔ تمہارے پاس دھن نہیں۔ دولت نہیں۔ خوبصورتی نہیں۔“

”خوبصورت تو میں ہوں۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”آئینہ دکھاؤں۔ نہ تم بچے ہو نہ جوان ہو۔ نہ جانے کیا ہو تم۔ مجھے جسمانی ہوس نہیں تم

سے کچھ بھی نہیں پھر بھی میں تمہاری ہو چکی ہوں۔ پتہ نہیں کیوں۔ حالانکہ تمہیں مجھ پر

تکڑو نہیں۔ کبھی نہیں ہوا۔ تم ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتے رہے۔ پھر بھی۔“ اس

لگائی نکل گئی۔

ایللی نے شدت سے محسوس کیا جیسے شنزاد پہلی بائی ہو۔ جس نے کہا تھا ”سب ہمیں دیکھتے

تھا لیکن دیکھتا کوئی بھی نہیں“ شنزاد کو محلے کے سب جوان بوڑھے دیکھتے تھے۔ لیکن شاید اسے

”اس نے مجھے دیکھ کر تمہاری طاقتوں کا اندازہ لگا لیا۔ مجھ میں تمہارا پر تو دیکھ لیا۔“

ایللی کا جی چاہتا تھا کہ وہ شنزاد کو سب کچھ بتا دے۔ وہ پیغام جو حاجی صاحب نے ایللی کو دیا تھا

”ہو کے رہے گا۔ ہو کے رہے گا۔“ ایللی کے دل میں کوئی چلا رہا تھا۔ ”ہو کے رہے

گا۔“ اس کی زبان پر بار بار آتا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ نہیں چاہتا تھا کہ شنزاد کو اس راز سے

آگاہ کرے۔ شاید اسے یہ خوف دامن گیر تھا کہ شنزاد اسے رد کر دے گی۔ جیسے وہ ہمیشہ کیا کرتی

تھی۔ بہر صورت اس نے بات پھر سے چھیڑی۔ بولا۔

”شنزاد ایک بات کہوں۔“

”کہو۔“ وہ بولی۔

”اس طرح کیسے زندگی بسر ہو گی۔“

”کس طرح۔“ اس نے پوچھا۔

”اس طرح چھپ چھپ کر ملنے سے انجام کیا ہو گا۔“

”انجام تو ہو چکا۔“ وہ بولی۔ ”میں نے تمہیں کھو کر پایا۔“

”لیکن میں نے تو تمہیں نہیں پایا۔“

”تم نے کھویا ہی نہیں تھا۔ پھر پانے کا کیا سوال ہے۔“

”نہیں شنزاد۔ ہماری زندگی ایک ڈھونگ ہے۔ ایک مسلسل جھوٹ۔ فریب۔ ہم دوسروں

کو دھوکا نہیں دے رہے۔ خود کو دھوکا دے رہے ہیں۔ خود فریب کھا رہے ہیں۔“

”فریب ہی سہی۔“ وہ بولی۔ ”مجھے یہ فریب کھانے ہی دو۔ اتنی زندگی بیت گئی ہے۔ اب

باقی رہا کیا ہے۔“

”نہیں شنزاد۔“ وہ بولا چلو کہیں چلے جائیں۔ اب بھی وقت ہے۔“

”میری طرف دیکھو۔“ وہ بولی۔

ایللی نے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا ہے؟“

”دیکھا۔“ وہ بولی ”کیا اب بھی یقین نہیں۔ میں چھ بچوں کی ماں ہوں۔ چھ بچوں کی۔“

”تو پھر؟“

”اپنی زندگی تو میں نے تباہ کر لی۔ اب تمہاری زندگی تباہ کیسے کروں۔“

”اس طرح تو بہت آباد ہے۔“ وہ بولا۔

”پتھر سے کچھ زیادہ دور نہیں۔“  
ایلی نے لگا ”یہ تو اتنا اچھا ہے۔“

”سب معلوم ہو جائے گا۔“ جمیل چلانے لگا۔ ”وہ اچھا ہو گا وہ اچھا ہو گا۔ برخوردار کہہ سبھ اہلے کا تم کو۔ بڑا رانی خان بنا پھرتا ہے۔ عزت والا گنا جاتا ہے۔ اور ہم، ہم کو لوگ رذیل ہیں۔ حالانکہ تو ہم سب کا پیر و مرشد ہے۔ لیکن ایسا فریب دے رکھا ہے لوگوں کو کہ وہ بہت سمجھتے ہیں۔ اچھا بیٹا۔ تو بھی کیا یاد کرے گا۔“

ایلی نے حیرت سے جمیل کی طرف دیکھا۔ جمیل نے تو اس سے کبھی ایسی باتیں نہ کی تھیں۔

”ارے۔“ دفعتاً اسے خیال آیا۔ ”گوگٹے کو زبان ملی ہوئی ہے۔ یار نے پی رکھی ہے۔“  
”ہی پی رکھی ہے۔“ جمیل بولا۔ ”پھر تمہیں کیا تکلیف ہے سالے۔ لوگوں کو کیا تکلیف۔ ہم جو بی چاہے کریں۔ کوئی ہے سالہ جو پوچھنے کی جرأت رکھتا ہو۔“

شام کو سیر کے بہانے جمیل اسے شہر لے گیا۔ ایلی چونکہ نووارد تھا۔ وہ شہر سے واقف نہ تھا۔ جمیل کے ساتھ ساتھ چلے گیا۔

”ارے۔“ دفعتاً ایلی چونکا۔ شہر کے لڑکے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ کہہ رہے تھے۔ ”ارے دیکھ وہ ماشرجی جا رہے ہیں۔“ ”ایک ساعت کے اندر چونکا۔ پھر اپنی طبعی بے نیازی کی وجہ سے سب بھول گیا۔ دفعتاً اس نے دیکھا کہ وہ چپکلے اکڑا ہے۔

”ارے۔“ وہ چلایا۔ ”یہ کہاں لے آئے ہو مجھے۔“

”ابھی دیکھ تو۔“ جمیل بولا ”آج ڈیرے کے بچے بچے کو پتہ چل جائے گا کہ تو شرابی اور نڈا ہے اور کل وہ سکول میں تیرا مذاق اڑائیں گے۔ ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

پھر جمیل اسے باری باری ہر چوبارے پر لے گیا اور بڑے اہتمام سے اس نے بائوں سے اگتعارف کرایا۔

”یہ الیاس آصفی ہے۔ میرا بھائی ہے۔ اور یہاں گورنمنٹ سکول میں ماسٹر ہے۔“

”سب کی سب جمیل کے ڈیرے سے تبارے پر افسوس کا اظہار کرتیں تو وہ چلا کر کہتا۔ ایلی جو یہاں ہے۔ بس سمجھ لو میں یہاں ہوں۔ میری جگہ یہ حاضری دیا کرے گا۔ کوئی کام ہو

کوئی نہ دیکھ سکا تھا۔ وہ بھی پہلی بائی کی طرح ہر وقت دو جگہ موجود رہتی تھی۔ قریب ہو کر دور رہتی۔ دور ہوتے ہوئے اس قدر قریب آ جاتی۔ اس کی دورخی کو ایلی نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ ایلی کے لئے ایک معرہ تھی۔ اس میں ماجھا پہلی بائی دیوی مدارانی اور نہ جانے کون کون براہمن تھیں۔

چٹھیاں ختم ہونے پر جب وہ آخری مرتبہ شنراؤ سے ملا تو اس نے پھر سے تذکرہ چھیڑا۔  
”چلو شنراؤ۔ کہیں چلے جائیں۔“

لیکن شنراؤ نے اس کی بات نہ سنی۔ ”اب کہاں جانا ہے۔“ وہ بولی پھر اس نے بات کا موضوع بدل دیا۔

### بنو گورابنو

ایلی کا تبارہ ڈیرہ میں ہو چکا تھا۔ اس کے اس تبارہ پر سب حیران تھے۔ رام پور سے جلد مخلص پالینا حیرانی کی بات تھی۔ رام پور دور دراز مقام پر آباد تھا۔ دریائے سندھ کے اس پار جہاں جاتے جاتے دو دن لگ جاتے تھے۔ اگرچہ جگہ نہایت اچھی تھی اور وہاں کا ہیڈ ماسٹر تو دیوتا خصلت کا ایک ہندو تھا۔ اس کے علاوہ رام پور کا سکول بے حد خوبصورت تھا۔ اس کے ساتھ ملحقہ زمین بہت وسیع و عریض تھی جس پر باقاعدہ کھیتی باڑی کی جاتی اور اس کی آمدنی اس قدر ہوتی تھی کہ سکول میں غرابا کے بچے مفت تعلیم حاصل کرتے تھے۔ بلکہ ان کی کتابیں اور کپڑے بھی اسی فنڈ سے دیئے جاتے تھے۔ اور بورڈنگ میں جو کھانا پکنا تھا وہ بھی اسی فنڈ سے پکا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس سکول میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو ایک تو تعلیم، دوسرے کھانا کپڑے اور کتابوں پر کوئی خرچ نہ اٹھنا تھا۔ بلکہ اس کے علاوہ کئی ایک اور ضروریات کے لئے امداد ملتی تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود اساتذہ وہاں جانے سے گھبراتے تھے۔ اس کی وجہ رام پور کی دوری تھی۔

جب ایلی رامپور سے بدل کر ڈیرہ آیا تو چار ایک دن کے بعد جمیل آدھکا۔ جمیل ڈیرہ کے شیش پر ملازمت کر چکا تھا اور شہر کے پیشتر لوگ اس سے واقف تھے۔ جمیل نے آتے ہی شور مچا دیا۔

”تو ایلی صاحب ڈیرہ میں تبدیلی ہو گئے ہیں۔ کاش کہ میں بھی ڈیرہ میں ہوتا۔ مگر کچھ ہوا

سیدھی سکول چلی جانا اور الیاس آصفی کا پوچھ لیا۔

ایلی سخت گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا مگر جمیل کے سامنے بے بس تھا۔

آخر کار جمیل ایلی کو لے کر ایک چوبارے میں جا پہنچا۔

”یہ گھر میرا خاص گھر ہے۔ وہ بولا۔

”ان کے مجھ سے پرانے مراسم ہیں۔ آؤ تمہیں ملاؤں۔ ہاں بھی حساب سے کھڑی ہو جاؤ۔

یہ ہے سب سے بڑی بنو۔ اور یہ منجھلی گوری اور یہ چھوٹی بنو۔ بیٹھ جاؤ۔ اب سب بیٹھ جاؤ۔“

وہ تینوں بیٹھ گئیں۔

اتنے میں باہر سے کسی نے آواز دی اور دو خوش پوش پٹھان داخل ہوئے۔

”ارے بھی۔“

جمیل انہیں دیکھ کر چلایا۔ ”مکابک خواہ مخواہ منہ اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔“

نو واردوں نے تینوں بنوں کی طرف دیکھا۔

بنو اٹھی اور ان کے قریب جا کر کہنے لگی۔ ”آپ کچھ دیر کے بعد آجائیں۔ ان کے جانے کے بعد۔“ اس نے دروازہ بند کر دیا اور واپس اپنی جگہ آ بیٹھی۔

”ہاں تو“ جمیل بولا ”ان کی صفات سنو۔ یہ بنو تو مریم ہے۔ ایسی مریم جو ہر قسم کی جلن دور کرتی ہے پھوڑا ہو پھنسی ہو۔ غم و تنگدہ ہو۔ عشق ہو۔ روپے پیسے کا نقصان ہو جائے۔ پریشانی ہو۔ کچھ ہو۔ اس کے پاس آ جاؤ۔ ایسا پھار رکھے گی سب غم دور۔ کیوں بنو۔“

ایلی نے بنو کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ خود دکھ بھری بوتل ہو۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ آنکھیں ننناک تھیں۔

”اور یہ دیکھو گوری یہ گوری نہیں گورا ہے۔ تم نے بھی گورے دیکھے ہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ یہ اس کتنی فوج کا گورا ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھو بلی ایسی ہیں اور یہ ہر وقت مسکاتی ہے ہر وقت۔ بارش ہو دھوپ ہو گرمی ہو سردی ہو۔ اس بوتل سے ہمیشہ چھینٹے اڑتے ہیں۔ یہ نہیں بہلا سکتی ہے۔ بچہ بن کر تم سے کھیلے گی۔ ہنسے گی۔ دکھ دور نہیں کر سکتی لیکن ہنسا سکتی ہے۔ کھلا سکتی ہے۔ ہے تو گورے کی طرح حرامی مکر ساتھی بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کچھ دیر کی ساتھی۔

”اور یہ بنو۔“ اس نے چھوٹی کی طرف دیکھ کر کہا ”بس دیکھ لو اسے۔ یہ تو خالص پٹانہ۔“

بنو چلا پٹانہ۔ نہ کوئی اسے چلا سکتا ہے نہ کوئی اس سے کھیل سکتا ہے۔ اگر اضطراب پیدا ہو۔ اگر دیوانگی حاصل کرنی ہو۔ اگر اطمینان کھونا ہو۔ اگر طوفان کے ہتھکڑے دیکھنے ہوں تو اسے آلو۔ یہ ایک ہنگامہ ہے۔ بارود ہے منجھل پوٹاش ہے۔“

اور ایلی یہ میرا اپنا گھر ہے۔ یہاں میں نے دو سال گزارے ہیں دو سال۔ اور اب یہ تمہارا ہے مجھے اور اگر تم نے یہاں باقاعدہ حاضری نہ دی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔“

اگلے روز جب ایلی سکول گیا تو اس کی طرف انگلیاں اٹھ رہی تھیں۔ لڑکے اسے دیکھ کر مار رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح ان لڑکوں کو کنٹرول کرے گا۔ کس طرح ان ماننے استلو کی حیثیت سے کھڑا ہو گا۔ لیکن اس معاملے میں اسے اپنے آپ پر اعتماد تھا۔ اس کی رسمی استلو کی طرح بچوں سے سلوک نہ کیا تھا۔ اس نے کبھی رسمی طور پر سبق نہ پڑھایا۔ اس کی باتیں سن کر لڑکے تعجب سے اس کی طرف دیکھتے جیسے انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ ہو۔ پھر آہستہ آہستہ مسکراتا شروع کرتے اور بالاخر اس کے دوست بن جاتے۔ خاص طور پر بٹان لڑکے جنہیں کنٹرول کرنا مشکل سمجھا جاتا تھا۔

نویں جماعت میں داخل ہو کر اس نے پہلے ہی سبق میں چپکے کے موضوع پر اظہار خیال کر دیا تاکہ بچوں کے دل کی بات پھوڑا نہ بن جائے۔

اور میں وہ واحد شخصیت جس نے ایلی کو متاثر کیا، غلام کی تھی۔ اس کا نام غلام علی تھا۔ ایلی اسے غلام کہتے تھے بلکہ وہ خود اس بات پر مصر ہوتا کہ اسے غلام کہا جائے۔ وہ کہا

”بھئی گھروالوں نے مجھ پر زیادتی کی ہے کہ علی کی غلامی کا اعزاز بخش دیا۔ اس اعزاز کا میں شکر۔ اتنی عظیم شخصیت کی غلامی۔ سنہ بھی میں تو اللہ کے ہر بندے کا غلام ہوں۔ اللہ ان کا۔ سب کا۔“

غلام کا رنگ گورا تھا۔ جسم بھرا بھرا اور خود خدال میں جاذبیت تھی۔ اس کی آنکھیں بے حد پر نوران کارنگ شرعی تھیں۔ نکھرا نکھرا اور ان میں شرارت یوں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کی معزز چہرے پر ان آنکھوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ان میں ہر وقت سوڑے کی مٹکائی نظر آتی تھیں۔ ایک عجیب سی پھوار پڑتی اور دیکھنے والوں کو اثر سے بھگو دیتی۔

غلام کی آنکھوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا کہ ابھی وہ نظر بھر کر راہ چلتی ہوئی خاتون کو دیکھے گا تو

جب وہ غلام کے گھر پہنچے تو ایک بچے نے دروازہ کھولا۔ اور بیٹھک کی طرف اشارہ کر کے بل بیٹھک میں میز پر چند ایک کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ دو کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک طرف کھانا تھا۔ دوسری طرف فرش بچھا ہوا تھا اور فرش کے ایک کونے پر جائے نماز پر غلام نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ جائے نماز کے ساتھ ہی ایک ستار رکھی ہوئی تھی۔

وہ سب چپ چاپ بیٹھ گئے۔ الطاف نے ایک رسالہ اٹھا لیا اور اسے دیکھنے لگا۔ اس نے اسے ایک گھنٹہ پڑھا۔ اسے کھولا تو اس میں سے طبلے کی جوڑی نکل آئی۔ پھر اس نے اسے گولے کو جو وہ ساتھ لایا تھا، توڑ کر اس پر لگانا شروع کر دیا۔ ایلی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ باقیہ آئے کا گولا طبلے پر لگایا جاتا ہے۔

غلام نے سلام پھیرا اور پھر کسی سے بات کئے بغیر سلام علیکم کئے بغیر ستار اٹھالی اور اسے لگا۔ اس کے ساتھ ہی مدھم لے میں اس نے طبلہ بجانا شروع کر دیا۔ وہ خاموش بیٹھے تھے۔ ستار گویا کراہ رہی تھی۔ اور طبلے کی تھپ دل میں اترتی جا رہی تھی۔ باہر بھول گیا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ کون ہے اور اسے کیا کرنا ہے۔ کوئی دس منٹ کے بعد مدھم مدھم کی آواز آئی اور ساز ختم ہو گیا۔ غلام سنبھلا۔ اٹھ بیٹھا۔

”موت کیجئے۔“ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولا ”میں نماز میں مصروف تھا۔ آپ کو انتظار کی تکلیف پڑی۔“

”لیکن آپ تو ستار بجا رہے تھے۔“ ایلی بولا۔

”نہیں تو۔“ غلام بولا ”میں تو نماز کے بعد دعا مانگ رہا تھا۔“

”دعا مانگ رہے تھے۔“ ایلی نے دوہرایا۔

”جی۔“ غلام نے کہا ”دعا زبان سے نہیں مانگی جاسکتی۔ دل کے تاروں کی لرزشوں سے پہنچتی ہے۔“

”گور یہ ستار غلام کا دل ہے۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”جیسا کہ ہے۔“ غلام بولا ”میری ساری کائنات یہ ستار ہے اسی سے نماز پڑھتا ہوں۔ اسی سے دعا مانگتا ہوں۔ یہی بھگتی ہے۔ یہی نزول ہے۔“

مڑے کی دو بوتلیں کھلیں۔ رنگ پچکاری کی پھوار پڑی۔ پگھٹ جھول کر پاس آگیا۔

وہ مسرور ہو کر اس کے پیچھے چل پڑے گی۔ ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر اس کے قدموں میں آکرے گی لیکن غلام عورت کو دیکھ کر نگاہیں جھکا لیتا تھا اور الزما ”اس کو شش میں لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ نگاہ بھر کر کسی عورت کو دیکھ نہ لے۔ ایلی نے اس کی آنکھوں کو دیکھ کر محسوس کیا جیسے اس نے دلی والے حاجی صاحب کی بنائی ہوئی مرہم کی دو سلائیاں آنکھوں میں لگا رکھی ہوں۔“

## غلام

غلام سے ایلی کی ملاقات الطاف اور اسد کی وساطت سے ہوئی تھی۔

الطاف ان لوگوں میں سے تھا جو ہر نووارد سے تعلقات پیدا کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔

اور بلا محکف اسے کھانے کی دعوت دینے کے مشتاق۔

الطاف کی دعوت اس کے چھوٹے بھائی ارشد نے دی۔ ارشد نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

وہ تین بھائی تھے۔ الطاف، اسد اور ارشد۔ اسد سکول سے تحصیل علم کر چکا تھا اور اب لاہور کالج میں تعلیم پاتا تھا۔ ارشد کی بات سن کر ایلی نے اسے ٹال دیا۔ کہنے لگا۔

”بھئی۔ ہم تمہارے بڑے بھائی سے واقف نہیں۔ ان سے جا کر کہنا کہ ناواقفوں کو کھانا

کھانا اچھا نہیں ہوتا۔“

شام کو الطاف خود آگیا۔

”السلام علیکم۔“ وہ بولا ”میرا نام الطاف ہے۔ میں ارشد کا بڑا بھائی ہوں۔ لیجئے اب تو ہماری

واقفیت ہو گئی۔ اب چلئے گھر۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

الطاف کی معصومیت اور سادگی سے ایلی بے حد متاثر ہوا۔

اسی روز کھانے پر جب الطاف کو معلوم ہوا کہ ایلی کو راگ سے دلچسپی ہے تو وہ بولا چلئے

آپ کو اپنے ایک دوست سے ملاؤں۔ اسے موسیقی سے دلچسپی ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے بھیلے بھائی اسد کو اشارہ کیا اور وہ گوندھے ہوئے آئے کا گولا اچھا

ہوا ان کے ساتھ چل پڑا۔ جتنا ہی الطاف سادہ طبیعت تھا اتنا ہی اسد بھڑکیلا تھا۔

وہ یوں بات کرتا تھا جیسے ابھی ابھی ولایت سے تحصیل علم کر کے آیا ہو۔ بہر حال اسد کی نبت

ایلی کو اس آئے کے گولے میں زیادہ دلچسپی تھی۔ ایک انگریز ریٹائرڈ خوبصورت جوان جس نے

ایک اچھا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا وہ آئے کے گولے سے کیور کھیل رہا تھا۔ اور یوں برسر

”جسے چاہوں بناؤں۔“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”ہاں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نشہ اندر سے نکلتا ہے اپنے اندر سے جتنا گڑ تھمارے اندر ہے  
 بیٹھا ہو گا۔ ہر صورت میں ہو جائے گا۔“  
 ”ہمیا تم میں گڑ ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”تھا۔“ وہ بولا ”بہت تھا۔ بے انداز تھا لیکن میں نے تو سارا بیر ہوٹیوں کو کھلا دیا۔“  
 ”ہوں۔“ ایلی ہنس۔ ”تو تمہاری زندگی میں بیر ہوٹیاں تھیں۔“  
 ”تھیں۔“ وہ بولا ”بھائی صاحب۔ بیر ہوٹیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میری زندگی کی داستان بے  
 مدھنصر ہے۔ عورت شراب اور راگ۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ جس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ لیتا تھا۔  
 آپ ہی چلی آتی تھی۔ یوں چلی آتی تھی جیسے پینازم کے زیر اثر ہو۔ اور پھر اپنی عادت تھی کہ  
 را کیر کو آنکھ بھر کر دیکھتا تھا حتیٰ کہ ان کا کیولگ جاتا تھا۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”میں نے تو اپنا سارا  
 ران بیر ہوٹیوں کو کھلا دیا۔ اگر دس ایک سال پہلے مرشد مل جاتے تو آج تک بہت بڑا ولی بنا  
 تمہاری قسم۔“  
 ”لور اب؟“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”لب تو کچھ ذرے رہ گئے تھے۔ سارا ہی لٹا بیٹھا تھا۔ شکر ہے اللہ کا اگر اس کا کرم نہ ہوتا تو  
 سنہ جانے کیا ہوتا۔“  
 ”غلام۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”تم نے مرشد کی جستجو کی تھی کیا؟“  
 ”لوں۔“ وہ بولا۔ ”مجھے تو شعور بھی نہ تھا کہ مرشد کسے کہتے ہیں۔ کبھی اس زاویہ نگاہ  
 دکھائی نہ تھا۔ خیال بھی پیدا نہ ہوا تھا۔“  
 ”تو پھر کیسے مل گیا؟“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”جس اللہ نے دے دیا۔ بیٹھے بیٹھے دے دیا۔ کرم نوازی کر دی۔“  
 ”آخر کس طرح۔“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”یہ بھی اک راز ہے۔“ وہ بولا اسے راز ہی رہنے دو۔ تم اسے سن کر کیا کرو گے۔“  
 ”مجھے تو اللہ پر اعتماد ہی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”ہاں ہاں۔“ اس نے ایک بھر پور نگاہ ایلی پر ڈالی۔ ”تمہیں اعتماد نہیں ہے“ اسے تو  
 گھس نے ستار اٹھائی اور بجلانے لگا

گوپوں کی قطاریں رقص کرنے لگیں۔ دور کنیا کی مری کی مدھم سرس گونج رہی تھیں۔ ایک  
 ساعت کے لئے ایلی بھونچکا رہ گیا۔

ارے۔ یہ کیا چیز ہے۔ یہ نمازیں یہ دعائیں یہ لرزشیں اور یہ نگاہ۔ بس ایک ساعت میں نہ  
 جانے کیا کر دیا۔ ایلی غلام کا غلام بن گیا۔ اس کے بعد ایلی کا دستور ہو گیا۔ سکول سے فارغ  
 ہونے کے بعد رات کا کھانا کھا کر وہ غلام کے پاس جا بیٹھتا۔ غلام جانے نماز پر ستار بجاتا۔ ایلی اپنا  
 سر گھٹنوں میں دیئے بیٹھ رہتا۔ اس کی آنکھوں سے شپ شپ آنسو گرتے۔ بے مقصد آنسو۔ غم  
 کے نہیں وافر جذبات کے آنسو۔ حتیٰ کہ عشا کی نماز کا وقت ہو جاتا۔ اور غلام اٹھ کر نماز پڑھنے  
 لگتا اور ایلی گھر چلا آتا۔

## کرم نوازی

چند ہی دنوں میں ایلی غلام کا بے تکلف دوست بن گیا بلکہ ایلی کو غلام سے محبت ہی ہو گئی۔  
 غلام کی طبیعت میں ہلاکی رہ گئی تھی لیکن نہ جانے اس رہ گئی کے دھارے کا رخ کدھر کو مڑ گیا  
 تھا۔ اس رنگ پکاری نے روپ بدل لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی طبیعت میں ہلاکی سلا کی تھی۔  
 سادگی اور عجز اور بے نیازی ایلی محسوس کرتا تھا جیسے غلام، وہ سکی کی ایک ایسی بوتل تھا جس میں  
 سے شراب انڈیل کر آب زمزم بھر دیا گیا تھا۔

ایک روز ایلی نے بے تکلفی سے پوچھا۔ ”غلام! تم غلام کیوں ہو؟“  
 غلام نے جواب دیا۔ ”میں لوگوں کا غلام بننا چاہتا ہوں۔ لیکن نہیں بن سکا۔ اپنا غلام نہیں  
 بننا چاہتا لیکن ہوں اور۔۔۔۔۔۔“

”پھر غلام کیوں کہلواتے ہو۔“

”اس لئے کہ میں غلام ہوں۔ اپنے مرشد کا غلام ہوں۔“

”تو کیا تمہارا کوئی مرشد بھی ہے۔“

”ہاں ہے۔“

”میں تو تمہیں مرشد بنانا چاہتا تھا۔“ ایلی نے کہا۔

”تو بناؤ۔ چاہے کسی کو بناؤ۔ مجھے بناؤ یا میرے حضرت صاحب کو بناؤ یا کسی پتھر کو بناؤ یا کسی  
 بالی کو بناؤ لیکن بناؤ ضرور۔ بے مرشد جینا تو بالکل ایسے ہی جیسے بے چوار کی بناؤ۔“



ایلی نے کچھ کتا چاہا تو غلام نے ہاتھ کے اشارے سے چپ کرادیا۔

”باتیں کرنے سے کچھ نہیں ملتا۔“ وہ بولا ”سنو۔ سن سن کر کان بھر لو۔ پھر یہ بوند بوند دل میں ٹپکے گا اور ایک روز دل کی تازہ جو ریت میں پھنسی ہوئی ہے ان بوندوں کے پانی میں بہہ نکلے گی۔ سنو۔“ اور وہ مدھم مدھم آواز میں گانے لگا۔

میں چوہڑی سرکار دی ہاں میں چوہڑی

## نورانی

ڈیرہ میں ایلی کی زندگی کا مرکز غلام بن گیا۔ غلام کی ستار نے نہ جانے ایلی پر کیا جادو کر دیا۔ اس کی تاروں کی لرزشوں نے ایلی کے دل میں ایک خلا پیدا کر دیا۔ اس سے پہلے جب بھی اس کے دل میں جذبہ پیدا ہوتا تھا تو وہ فوراً ”شہزاد پر مرکوز ہو جاتا تھا اور وہ شہزاد کے تصور میں کھو کر رہ جاتا۔ لیکن غلام کی ستار نے گویا اسے شہزاد سے بے نیاز کر دیا۔ اب اس کے دل میں جذبہ پیدا ہوتا تھا لیکن وہ شہزاد پر مرکوز نہ ہوتا۔ اس کا کوئی بھی مرکز نہ ہوتا تھا۔ ایک لاشعری بے مرکز جذبہ جیسے دفعتاً اس کے دل کا سوتا سمندر بن گیا ہو۔ ایک بے نام غم بے کنار بحر۔ اس کے لئے یہ کیفیت بالکل انوکھی تھی۔

پھر ایک روز نورانی آگیا۔

ایلی وہاں ایک سالم مکان میں رہتا تھا۔ اس مکان میں دو کمرے ایک بلورچی خانہ ایک غسل خانہ۔ ایک برآمدہ اور صحن تھا۔ ان کے علاوہ ایک الگ سی بیٹھک تھی۔ ایلی کا سالن اس حد تک مختصر تھا کہ گویا تھا ہی نہیں۔ ساری چیزیں سمٹ کر ایک کمرے میں سما گئی تھیں اور باقی ب کمرے خالی پڑے تھے۔

ایک روز دروازہ بجا اور ایک سیاہ قام فریہ قسم کا آدمی اندر داخل ہوا۔

”معاف کیجئے گا۔“ وہ بولا ”میرا نام نورانی ہے اور میں محکمہ تعلیم میں اسٹنٹ انسپکٹر ہوں۔ میرا تہذیبیہاں ہو گیا ہے لیکن ابھی مکان کا بندوبست نہیں ہوا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں چند روز کے لئے آپ کی بیٹھک میں ٹھہر جاؤں۔ میں آپ کو کرایہ ادا کروں گا۔ اور جب بھی آپ چاہیں گے بیٹھک خالی کر دوں گا۔“

ایلی نے غور سے اس لمبے ترنگے آدمی کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ چہرے

سی کر نکلی تھی۔ ماتھے پر تیوری چڑھی تھی۔ آنکھوں میں عجیب سی خوفناک کشش تھی اور زلزلہ۔ جہاں اللہ کیا نورانیت ہے۔ ایلی نے سوچا۔

”جہاں اچھا۔“ ایلی نے کہا ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ فی الحال۔“

”شکریہ“ نورانی نے کہا اور بے تکلفی سے اپنا سوٹ کیس اور بستر اٹھا کر بیٹھک میں گھس

نورانی خاموش طبع آدمی تھا۔ سارا دن یا تو چپ چاپ بیٹھا کام میں مصروف رہتا اور یا باہر رہ کر چلا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کے لئے اس کی موجودگی نہ ہونے کے برابر رہی۔ وہ آپس کی کجگفتگو کرتے تھے۔

”کیسے نورانی صاحب“ ایلی اس کے پاس جا کھڑا ہوتا۔

”ہاں دیکھ لیجئے۔“ وہ جواب دیتا اور بدستور کام میں مصروف رہتا۔

”آپ تو ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔“

”مصروف رہنا اچھا ہوتا ہے۔“ وہ جواب دیتا۔

نورانی کے منہ پر کبھی تبسم نہ آیا تھا۔ قلعہ مار کر ہنستا تو گویا اس کی سرشت کے منافی تھا۔

اور قہر خیز بات تھی کہ نورانی دودھ بہت پیتا تھا۔ ہر وقت اس کی میز پر دودھ سے بھرا ہوا

ٹیپا رہتا کام کرتے کرتے وہ گلاس اٹھاتا۔ دو چار گھونٹ پی کر پھر رکھ دیتا۔ حیرت کی بات

تاکہ اتنا دودھ پینے کے باوجود نورانی کے چہرے پر دودھ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ چہرے کی

رنگی اور تازہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اور ماتھے کی تیوری یوں دکھائی دیتی تھی۔ جیسے لوہے میں سنج کی

سے گیری کھود دی گئی ہو۔

ایک روز غلام آگیا۔ اس وقت ایلی نورانی کے پاس کھڑا تھا۔ ایلی نے غلام کا نورانی سے

دست کرا دیا۔

## طلب کا مشکہ

ایں شام جب غلام علی اور ایلی اکٹھے بیٹھے تھے تو نورانی کی بات چل پڑی۔

”عجیب بات ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”یہ شخص اتنا دودھ پیتا ہے لیکن اس کے چہرے پر اتنی

گلابی حیرت ہوتی ہے۔“

کہ جس طرح اس مشکل سے مخلصی حاصل کرے۔ اس کا ذہن سرکار قبلہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اسے رو بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے حاجی صاحب آکھڑے ہوتے۔ ان کا سر روئی کے گالے کی طرح ہلتا۔ ان کی روشن آنکھیں۔ چمکتیں۔ ”وقت آئے گا۔“ وہ مسکرا کر کہتے۔

پھر عربی مولوی کی کرخت آواز گونجتی۔

”اس شعبہ باز قادر مطلق کے تماشوں کی حد ہے کوئی۔ دم مارنے کی گنجائش بھی ہو۔“ وہ ہنسنے لگا۔

ایک روز بیٹھے بیٹھے ایللی نے غلام سے حاجی صاحب کا تذکرہ چھیڑ دیا اور شہزاد کی بات چھوڑ کر باقی سب کھانی سادی۔

غلام مسکراتا رہا۔

جب ایللی بات ختم کر چکا تو وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ ”ہاں وقت آئے گا۔ تمہارے ماتھے لکیر ظاہر لڑی ہے کہ تمہیں سرکار قبلہ ملیں گے۔ ضرور ملیں گے۔ میں نے پہلے ہی دن دیکھ لیا تھا۔ آؤ اب ان آنے والے حضور کا ذکر کریں۔“

اس نے ستار اٹھالی اور مدھم آواز میں گانے لگا۔

”اب ہونہ آئے کن دھو تین بھرائے۔ اب ہونہ آئے۔“

اس روز پہلی مرتبہ ایللی کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کوئی سرکار قبلہ اس کی زندگی کو بھی نور کر دیتا۔

چونکہ ایللی کو ان ٹھہریوں اور خیالوں کے بولوں سے بے حد دلچسپی تھی جو غلام گایا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے غلام سے کہا کہ یہ گیتوں والی کاپی مجھے دے دو میں نقل کر کے لوٹا دوں گا۔

”کاپی۔“ غلام بولا۔ ”لیکن یہ تو میرے سرکار قبلہ کی کاپی ہے۔“

”اس میں تو گیت لکھے ہوئے ہیں۔“

”اس میں گیت ہیں۔ مناجاتیں ہیں۔ تو الیاں ہیں یہ سب تو الیاں گیت اور راگ سرکار قبلہ کے ہیں۔ میں چاہے کچھ بھی گاؤں روئے سخن ان کی طرف رہتا ہے۔ اس برات کے دو لہا وہی جڑ۔ صرف وہ اور بس باقی سب ہوس۔“ غلام نے ایک دلدوز نغمہ لگایا۔

بہر حال ایللی نے وہ کاپی غلام سے لے لی اور گھر چلا آیا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔

”اومٹوں۔“ غلام نے جواب دیا۔ ”بھئی وہ تو لوہے کا آدمی ہے۔“

”لوہے کا آدمی۔“ ایللی نے دہرایا۔

”ہاں ہاں۔“ غلام بولا۔ ”ضرور وہ کوئی چیز استعمال کرتا ہے۔ سکھایا پکلا۔ اس لئے اس کا

جسم لوہے کی خصوصیات کا حامل ہے۔“

”سکھایا۔“ ایللی نے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔“

”وہ تو زہر ہوتا ہے۔“

”ہوتا ہے۔“

”تو پھر۔“

”پھر کیا۔“ غلام بولا۔ ”تمہارے چہرے پر بھی تو کڑکلی ہے۔“

”میں تو سکھایا نہیں کھاتا۔“

”یہ تمہارے خیالات کی وجہ سے ہے۔“ وہ بولا۔ ”تمہاری شخصیت میں طعاس نہیں تھی

ہے۔ جذبات میں رنگ نہیں شدت ہے۔ تمہارا صفر اسودا کی شکل اختیار کر چکا ہے۔“

”ارے۔“ ایللی چلایا۔ ”تم طب جانتے ہو۔“

”جانتا ہوں۔“

”واقعی۔“

”ہاں۔ طب ہمارے خاندان میں صدیوں سے چلا آتا ہے۔ میں بھی سکھایا استعمال کیا کرتا

تھا۔“

”کیوں۔“

”تمام تماش بنی کرتے ہیں۔“

”لیکن تمہارے چہرے پر تو دودھ ہی دودھ ہے۔“

”یہ میرے سرکار قبلہ کی کرم نوازی ہے۔ ان کی دین ہے۔“

ایللی کے لئے سرکار قبلہ اور کرم نوازی ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ وہ ہر موضوع پر بات

کر سکتا تھا۔ لیکن سرکار قبلہ اور کرم نوازی پر پہنچ کر گویا اس کے پر جل جاتے اور پھر وہ ایک بے

بس کپڑے کی طرح ریختل۔ اس پر احساس کمتری کا منوں بوجھ پڑ جاتا۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا

ایلی کو عرصہ دراز سے مسلسل بول کی شکایت تھی۔ اس رات شرمندگی کی وجہ سے ساری رات وہ پیشاب کرتا رہا۔

### سلسل البول

ایلی کی یہ سلسل البول کی شکایت بھی ایک عجیب قصہ تھا۔

جس زمانے میں وہ کلچ میں پڑھا کرتا تھا تو اس کی نور احمد سے بڑی دوستی تھی۔ نور احمد ان کا دور کارشتہ دار تھا اور لاہور پولیس میں نوکر تھا۔ جب کبھی میس فیس کی عدم ادائیگی کی وجہ سے ایلی کی حاضری بند ہو جاتی اور اسے بورڈنگ میں کھانے سے جواب مل جاتا تو نور احمد اسے اپنے ساتھ لے جاتا۔ اور اپنے گھر میں اپنے ہاتھوں سے کھانا پکا کر اسے کھلاتا۔ نور احمد کی شادی ہوئی لیکن اس کی بیوی مرچکی تھی اور وہ عرصہ سے اکیلا رہتا تھا۔

نور احمد کو ایلی سے برادرانہ قسم کی محبت تھی اور ایلی کو نور احمد سے بڑی عقیدت تھی کیونکہ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود نور احمد بہت سیانا تھا اور اسے لاہور کا بے پناہ تجربہ تھا۔ ایک مرتبہ نور احمد کو نہ جانے کیا تکلیف ہو گئی اور وہ چھٹی لے کر علی پور آگیا۔ اس زمانے میں ایلی کو گرمی کی چٹیاں ہو چکی تھیں اور وہ علی پور ہی میں تھا۔ نور احمد آتے ہی ایلی سے ملا۔ کہنے لگا:

”بھئی ذرا باہر چلنا ہے۔“

”لیکن کھل۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ذرا باہر جانا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

طبعی طور پر نور احمد کھل کر بات کرنے کا عادی نہ تھا۔ وہ ہر بات کو راز رکھتا اور صرف اسی بات کا اظہار کرتا جسے وہ ضروری سمجھتا۔

شہر سے باہر جا کر وہ پرانے مقبروں میں گھومتے رہے اور نور احمد ان مقبروں کی ٹوٹی ہوئی دیواروں سے چوٹا اکیڑتا رہا۔

”یہ کس لئے ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”یہ بھی ہے۔“ نور احمد نے جواب دیا۔

”لیکن کس لئے اکٹھا کر رہے ہو۔“

سردیوں کے دن تھے۔ اس لئے اس وقت گیت نقل کرنا مشکل تھا۔ اس نے سوچا چلو کل نقل کر لوں گا اور شام کو کاپی لوٹا دوں گا۔ کیونکہ غلام نے تاکید کی تھی کہ گیت نقل کر کے جلد کاپی لوٹا دے۔

رات کے دو بجے کے قریب دروازہ بجا۔ ایلی جاگ پڑا۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچا۔ نہ جانے کون ہے۔ شاید پڑوس کے دروازے پر ہو۔

دروازہ پھر بجا۔ شاید نورانی کا دوست ہو کوئی۔ یہ سوچ کر وہ خاموش پڑا رہا۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی کوئی باتیں کر رہا تھا۔ پھر باتوں کی چاپ سٹائی دی اور نورانی اور غلام اس کے سرہانے آکھڑے ہوئے۔

”ارے تم ہو۔“ ایلی چلایا۔

”ہاں۔“ غلام مسکرایا۔

”حیرت ہے۔“

”مجھے وہ کاپی دے دو۔“

”کاپی۔ کیا کاپی لینے کے لئے آئے ہو۔“

”ہاں۔“

”اس وقت۔“

”ہاں۔“

”کیوں۔“

”بھئی۔ وہ مجھے سونے نہیں دیتے۔ فرماتے ہیں کہ ہماری کاپی اس پیشاب کے ٹکے میں کیوں پھینک آئے ہو۔“

”ارے۔“ ایلی کا دل ڈوب گیا۔ ”تو کیا میں پیشاب کا منکا ہوں۔“

”مجھے کیا معلوم۔“ غلام نے کہا۔ وہ بہتر جانتے ہیں۔“

غلام تو کاپی لے کر چلا گیا لیکن ایلی کو رات بھر نیند نہ آئی۔ جب بھی وہ آنکھ بند کرتا تو اس کے رو بہد ایک بڑا سا منکا آ جاتا اور اس میں سے بدبو آتی۔ اور اس کا دماغ پھٹنے لگتا۔ وہ دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کر رہا تھا اور طنزاً ”حاجی صاحب سے کہہ رہا تھا۔“ آپ تو کہتے تھے وقت آئے گا لیکن اب یہ پیشاب کا منکا۔“

زنی کتا

ان دنوں اس کا خالہ زاد بھائی جو میڈیکل کالج میں تعلیم پانے کے بعد جس کے ساتھ  
ایچہ ہاتھ نہ تھا۔ ولایت میں ایم ڈی کی ڈگری حاصل کرنے چلا گیا۔ واپس وطن لوٹا اس کے  
ہاتھ اس کی آئرش بیوی بھی تھی۔ ایللی نے ڈاکٹر آصفی کو خط لکھا جس میں اس نے اپنی تکلیف  
عہ متعلق فکر مندی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نے اسے لاہور بلا لیا۔

جب ایللی لاہور پہنچا تو ڈاکٹر نے اسے کہا:

”دیکھو بھائی جو علاج کرنا ہے تو آٹھ روز میرے پاس رہو۔ یہاں تمہیں صرف ایک  
تکلیف ہوگی۔ ہم لوگ رات کا کھانا پونے آٹھ بجے کھاتے ہیں اور پھر آٹھ بجے لیٹ کر سو  
جاتے ہیں۔ یہ بندش تم پر بھی رہے گی۔“  
ڈاکٹر نے رات کے آٹھ بجے ایللی کو ایک کمرے میں بند کر دیا جس کے ساتھ ایک چنڈ ہاتھ نہ

تھا

”لیکن میں پیشاب کہاں کروں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”تمہارے کمرے میں دو کھڑکیاں ہیں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”باہر باغیچہ ہے۔ جب چاہو  
باہر نکل کر پیشاب کر لو۔ لیکن ڈاکٹر رک گیا۔“ ذرا احتیاط سے باہر باغیچہ میں جانا۔“

”کیوں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”رات کو کتا کھلا ہوتا۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔

ایللی روز ڈاکٹر سے کہتا کہ وہ اس کا معائنہ کریں لیکن ڈاکٹر صاحب کسی نہ کسی بہانے ٹال  
دیتے۔ آٹھویں روز ایللی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے اپنا سامان باندھا اور علی پور جانے کی  
تہائی کر لی جب ڈاکٹر نے سنا کہ وہ خفا ہو کر جا رہا ہے تو اس نے جلدی سے کاپی اٹھائی اور میز لگا  
کر بیٹھ گیا۔

”ہاں بھئی ایللی۔“ وہ بولا۔ جانے سے پہلے ہسٹری تو بتا جاؤ۔“

ایللی کا غصہ اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ وہ ڈاکٹر آصفی سے علاج کرائے پر رضامند ہی نہ تھا لیکن  
لہا کی آئرش بیوی نے آکر ایسی باتیں کیں کہ وہ کیس ہسٹری دینے پر مجبور ہو گیا۔  
”ہاں بھئی ایللی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ تمہیں دن میں کتنی مرتبہ پیشاب آتا ہے۔“

”کام آئے گا۔“

”کس کام۔“

”دوائی کے طور پر۔“

”یہ دوائی بتائی ہے کیا۔“

”ہاں۔ ہاں۔“

”کس کے لئے۔“

”اپنے لئے۔“

”تیار ہو۔“

”ہاں۔“

”کیا بیماری ہے۔“

”سوزاک ہو گیا ہے۔“

”ارے۔“ ایللی اچھلا۔

نور احمد نے یوں سر سری بات کی تھی جیسے کوئی بات نہ ہو جیسے سوزاک نہ ہو اسرور ہو  
گئی۔ یہ نور احمد کی عادت تھی۔

گھر پہنچ کر نور احمد نے ایک کورا گھڑا لیا۔ وہ پرانا چونا دھو کر اس میں ڈال دیا اور پھر اسے پانی  
سے بھر دیا گرمیوں کے دن تھے۔ وہ دونوں سارا دن اکٹھے بیٹھے گیس ہانکتے رہتے اور نور احمد ہر  
دس منٹ کے بعد ایک گلاس شلے میں سے بھرتا اور غٹ غٹ پی جاتا۔ ایللی نے پیاس محسوس  
کی۔ نور احمد بولا۔

”یہی پانی پیو نا۔“ تمہارے لئے بھی بہت فائدہ مند ہو گا۔ جگر کی گرمی اٹھائے گا۔“

اس کے بعد ہر دس منٹ بعد وہ دونوں اکٹھے پیشاب کرتے اور پھر ایک ایک گلاس پانی پی کر  
پھر سے بیٹھ جاتے۔ دس پندرہ دن کے بعد ایللی نے محسوس کیا کہ اسے سلسل البول کی شکایت ہو  
گئی ہے لیکن اس نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ دو ایک سال گزر گئے۔

اس کے بعد ایللی نے محسوس کیا اسے سلسل البول کی بیماری ہو چکی ہے۔

”میں نے کبھی گنا نہیں۔“

”پھر بھی اندازاً۔“

”یہی آٹھ دس بار۔“

”اور پیاس کی کیا حالت ہے۔“

”بار بار پانی پیتا ہوں۔“

”کے بار۔“

”بس ایک چکر ہے۔ ادھر گلاس پانی کا پیا ادھر پیشاب کیا۔ دونوں عمل ساتھ ساتھ چلے

ہیں۔“

”سردیوں میں زیادہ آتا ہے یا گرمیوں میں۔“

”دونوں موسموں میں ایک سا۔“

”اچھا تو یہ بتاؤ کہ دن میں کون سے وقت زیادہ پیشاب کرتے ہو۔“

”کیا مطلب۔“

”صبح کے وقت زیادہ یا شام کے وقت۔“

”سونے سے پہلے۔“

”شام کو یا رات کو۔“

”لیٹ جانے کے بعد۔ چاہے جس وقت لیٹ جاؤں۔ جب تک نیند نہیں آتی تب تک۔“

”اچھا تو اب ان گزشتہ آٹھ دنوں کے کوائف لکھو دو مجھے۔“

”جی۔“

”کل رات لیٹنے کے بعد سونے تک کے مرتبہ پیشاب کیا۔“

ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

”اندازاً۔“

”کل تو نہیں کیا۔“

”ہوں۔ اچھا پرسوں۔“

پرسوں بھی نہیں۔“

”ایک بار بھی نہیں۔“

سارا دن تو کرتا رہا تھا۔“

”دن کی بات چھوڑو۔ بستر پر لیٹنے اور سونے کے درمیان کے وقفے کی بات کرو۔“

ایسوں۔“

”نہیں۔“

ڈاکٹر آصفی نے قہقہہ لگایا۔ بولا۔ ”دیکھو ایلی میں نے تمہیں آٹھ دن انٹر آبزرویشن رکھا

ہے اور گزشتہ آٹھ روز تم نے سوتے وقت پیشاب نہیں کیا حالانکہ یہ وہ وقت ہے جب کہ

تمہیں تمہارے بیان کے مطابق بہت زیادہ پیشاب آتا ہے۔ اگر تمہاری اس بیماری کو ایک خیالی

یخ کا ڈر روک سکتا ہے تو بتاؤ یہ بیماری جسمانی ہوئی یا ذہنی۔ میری جان! تمہیں کوئی بیماری

نہیں۔“

ڈاکٹر آصفی کا قہقہہ دیر تک گونجتا رہا حتیٰ کہ علی پور جاتے ہوئے گاڑی کی چمکا چمک میں بھی

”ڈاکٹر کے قہقہے کی آواز سنتا رہا۔“

آج پھر وہ ڈاکٹر کی آواز سن رہا تھا۔ ”ہی ہی ہی۔ ایلی بھی تمہارا علاج تو سہل ہے۔“

فصل خانے میں ایک کتاب بندھ لو ہی ہی ہی۔“

پیشاب کا منکا پیشاب کا منکا!

”ہیو۔ ہیو۔“ نور احمد چہلنے کے گھڑے سے پانی نکل کر اسے دے رہا تھا۔ ”یہ تمہارے جگر

کی گرمی اٹھالے گا۔“

اگلے روز صبح سویرے ایلی کے سر پر ایک دھن سوار تھی۔ صرف ایک دھن۔

### پس پاٹ چور

اس روز وہ سکول بھی نہ گیا بلکہ سیدھا ہسپتال پہنچا۔ انچارج ڈاکٹر محمد علی اس کا اچھی طرح

سے واقف تھا۔ وہیں اس نے ایلی کی تمام کیس ہسٹری بڑے غور سے سنی۔ پیشاب ٹٹ کیا اور

بھڑولا۔

”ایس صاحب۔ ہمارے ہاں کیمیکل امتحان کا سامن تو ہے لیکن مائیکرو سکوپک ٹٹ کا

انتظام نہیں لہذا آپ علاج کرانا چاہتے ہیں تو لاہور چلے جائیں۔ وہیں کے سول سرجن میرے

لاست ہیں۔ ان کے نام خط لکھ دیتا ہوں۔ آپ ان سے جا ملیں وہیں مائیکرو سکوپک ٹٹ کا

انتظام ہو جائے۔“

ڈاکٹر محمد علی کا خط دیکھ کر سول سرجن اسے بڑی گرجوٹی سے ملا۔

”کیا آپ پیشاب ساتھ لائے۔“ اس نے پوچھا۔

”میں تو ڈیرہ سے آیا ہوں۔“

”اوہ ٹھیک ہے۔“ وہ بولا۔ ”یہ تو کیس ہی مختلف ہے۔ فریکوئنسی آف یورن کی شکایت ہے نا۔“ انہوں نے ایک اسٹنٹ کو بلایا۔ ”بھئی انہیں پس پاٹ دے دو اور غسل خانہ دکھا دو۔“ لہجے صاحب آپ پیشاب لے آئے۔“ انہوں نے گھڑی دیکھی۔ ”گیارہ بجے ہیں ابھی بت وقت ہے۔ آپ شام تک ڈیرہ واپس پہنچ سکیں گے۔“

سول سرجن کے اسٹنٹ نے اسے پس پاٹ پکڑا دیا۔ وہ غسل خانے میں جا بیٹھا۔ بارہ بج گئے لیکن اسے پیشاب نہ آیا۔ جیسے پیشاب کا سلسلہ ہی موقوف ہو چکا ہو۔ ایک بجے اس کی پریشانی بڑھنے لگی۔ دو بج گئے چار بج گئے۔

باہر ڈاکٹر چلا رہا تھا۔ ارے بھئی وہ فریکوئنسی آف یورن کا مریض کیا ہوا۔

”کچھ پتہ نہیں صاحب۔“

”کیا اسے ابھی تک پیشاب نہیں آیا۔ مسخرو تو نہیں کوئی۔“

”نہیں پس پاٹ چرا کر نہ لے گیا ہو۔“ کپاونڈر نے کہا۔

”ارے بھئی دیکھنا ڈاکٹر قلعہ مار بولا۔“

ایلی نے چپ چاپ خالی پس پاٹ زمین پر رکھا اور غسل خانے کے پچھلے دروازے سے باہر نکل کر بھاگا گاڑی ڈیرہ کو جا رہی تھی۔ وہ شور مچا رہی تھی۔ پیشاب کا منکا!

ڈاکٹر آصفی قلعہ مار رہا تھا۔ ”کتا پال کتا۔“

”میری کاپی دے دو کاپی۔“ غلام چلا رہا تھا۔

”مسخرا۔ مسخرا۔“ سول سرجن ہنس رہا تھا۔

”نہیں نہیں۔ پس پاٹ چور۔“ کپاونڈر ہنس رہا تھا۔

ایلی کی اس ذہنی پریشانی کا کوئی علاج نہ تھا۔ صرف ایک چیز تھی جو اس کی پریشانیوں اور خفتوں کو جذب کر سکتی تھی۔ جذب کر لیتی تھی۔ اور وہ غلام کی ستار تھی۔ وہی غلام جس کے آقا ایلی کو پیشاب کا منکا سمجھتے تھے لیکن ایلی کے لئے غلام اور اس کے

اسے درد رہتا ممکن نہ تھا اس لئے سیشن سے وہ سیدھا غلام کے گھر پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔

”کون ہے۔“ غلام کی آواز آئی۔

”پیشاب کا منکا۔“ ایلی نے اپنی خفت مٹانے کے لئے کہا۔

”آہا ابھی آیا۔“ بسم اللہ بسم اللہ۔“ وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ”اتنے دن کس

”میں تمہارا ہمارا ساتھ۔ تم پوتر ہم پلید تم نگ پچکاری۔ ہم پیشاب کے منکے۔“

غلام نے قلعہ لگایا۔ ”تم تو بڑے خوش قسمت ہو بھائی جو صرف پیشاب کے منکے ہو۔ پتہ بچے کیا خطاب ملا ہے۔“

”کیا؟“

غلام مسکرایا۔ ”فرمایا۔ تم تو زانی نفس ہو۔“

”کیا واقعی۔“

”تمہاری قسم۔“

اس ایک جملہ نے ایلی کو اس قدر تسکین دی۔ اس قدر تسکین دی جو دنیا بھر کے ڈاکٹر نہ لے سکتے تھے اور اس کی زندگی میں جو یہ نئی تنگی پیدا ہوئی تھی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد کے دن ستار کی تاروں کی لرزشوں نے صابون کے بلبلیوں کی طرح اڑا دیئے اور وہ اس کراہتی لہار کے پہلو میں بیٹھ گیا جیسے تار کو کھینچنے والی کیل ہو جو ستار کے بازو پر لگی ہوئی تھیں۔

دکھانم

ایک روز شام کے وقت ایلی بیٹھک کے باہر سڑک کے کنارے چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں بیٹھا کام کر رہا ہے۔ بیٹھک کے باہر سڑک کے کنارے چبوترہ تھا جس پر بعد دوپہر پہ آجاتی تھی۔ نورانی اس چبوترے پر بیٹھ کر کام کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے بیٹھے کا انداز نہالا۔ سڑک کی طرف پیٹھ کر لیتا میز دیوار کے ساتھ لگا لیتا۔

ڈیرہ میں وہ سڑک خاص طور پر مشہور تھی۔ چونکہ شام کے وقت ہندو خواتین پنڈتائیاں نکلتی اور لالائیاں اس سڑک پر سیر کرتی تھیں۔ شوقین مزاج لوگوں نے اس سڑک کو پگھٹ نام سے رکھا تھا۔

ایلی اٹھ بیٹھا۔ ایلی کے قریب آ کر کہنے لگا۔ ”الیاس صاحب اگر میں کسی عورت کی آنکھ اٹھا کر دیکھ لوں۔ نگاہیں چار ہو جائیں تو وہ میری تلاش میں آپ کا دروازہ نہ کھٹکھٹائے۔“

”شرط رہی۔“ ایلی چلایا۔

یہ بھی۔ شرط نہ لگاؤ۔“ نورانی پھر سے کرسی پر بیٹھ کر بولا۔

”رہتے ہیں آپ۔“

ہاں۔ وہ بولا۔ ”خواہ مخواہ آپ ہار جائیں گے۔“

ارے۔“ ایلی چلایا۔ ”اس قدر زعم ہے۔“

اس سے بھی زیادہ۔“ نورانی نے کہا۔

”شرط رہی۔“

بھلا۔“ وہ بولا۔ اگر آپ مصر ہیں تو۔“

مصر ہے۔“ ایلی بولا۔

لیکن اس میں دو چار شرائط ہوگی۔ عورت میں خود منتخب کروں گا۔ ایلی نے کہا۔

غور۔“ وہ بولا۔

اگر آپ کوئی شرط عائد کرنا چاہیں تو۔“ ایلی نے پوچھا۔

اے۔“ نورانی نے کہا۔ ”پہلی شرط یہ ہے میرا نام اور پتہ نہ بتانا ورنہ بدنامی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے۔“

دوسری بات یہ کہ مجھے مناسب موقع دیا جائے کہ میں عورت کو اچھی طرح دیکھ لوں۔“

”ٹھیک۔“

تیسری بات یہ ہے۔ شرط نہیں منت ہے۔“

”ایلی۔“

”میں معصوم بچی کو نہ منتخب کرتا۔ اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔“

لی نورانی کے یقین کامل پر حیران تھا۔

دن ایلی سوچتا رہا۔ اس مسئلے پر نہ وہ غلام سے بات کر سکتا تھا نہ اسد سے اور نہ کسی اور سے چونکہ اس نے نورانی سے وعدہ کیا تھا کہ اس شرط کے بارے میں کسی سے ذکر نہیں

ایلی خود کئی بار شام کے وقت بیٹھک سے باہر چوتھے پر کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ ہندو خانہ جو ادھر سے گزرتی تھیں عام طور سے خوبصورت ہوتی تھیں لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی ان کے چروں پر شرم و حیا کی سرخی جھلکتی تھی۔ آنکھیں ہمیشہ جھکی جھکی رہتیں اور چہنچہ کے کونے تلاش کرتیں اور جسم اپنا اعلان کرنے کی بجائے سنا سنا رہتا۔ ایلی کو انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے عصمت و عفت اور شرم و حیا کی پہاڑیوں پر ننھے ننھے جسمے اٹل رہے ہوں لیکن نورانی کا رویہ عجیب تھا۔ وہ سڑک سے منہ موڑ کر کیوں بیٹھ رہتا تھا اسے بد صورتی کا احساس تھا۔ کیا واقعی؟

ایک روز ایلی نے طنزاً ”نورانی سے کہا۔“ نورانی صاحب۔ آپ سڑک کی طرف نہ کر کیوں نہیں بیٹھتے۔ کیا آپ کو یہ ڈر ہے کہ کوئی راہ چلتی آپ کو دیکھ کر آپ کی محبت میں ابر ہو جائے۔“

نورانی نے کام سے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔ ”کیا فائدہ۔“

”کیا مطلب۔“

”یہاں سے بچیاں گزرتی ہیں۔ خواہ مخواہ کسی کو الجھن میں ڈال دوں تو۔“

ایلی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ”کیا واقعی اس خیال سے آپ سڑک کی طرف پیٹھ کر کے چاہیں۔“

”ہاں یہ ڈر ہے۔“ وہ بولا۔

”ارے۔“ ایلی چلا اٹھا۔ ”کیا آپ خود کو حسین سمجھتے ہیں۔“

”نہیں ایسی بات نہیں۔“

”تو پھر۔“

”الیاس صاحب کشش اور چیز ہے حسن اور۔“

”تو کیا آپ میں کشش ہے۔“

”بالکل ہے۔“

”ہمیں تو نہیں محسوس ہوتی۔“

”آپ عورت نہیں ہیں اس لئے۔“

”ارے۔“



”خود گونگے ہیں شاید۔“ گورا بولی۔

”ہی۔“ ایلی نے کہا۔ ”بولنا نہیں جانتے۔ دیکھنا جانتے ہیں۔ تاجر ہیں نا اس لئے۔“

”ہاجر ہیں۔“ بنو نے کہا۔

”ہی۔“ موثروں کا کاروبار ہے۔“

”سب دیر تک کہیں ہانکتے رہے لیکن نورانی اسی طرح گھٹا گھٹا کم صم بیٹھا رہا۔ پھر اس نے

”کوئی ماری۔“

”کوئی ہے؟“

”یہ ہے۔“ ایلی نے اعلانیہ بنو کا ہاتھ پکڑ کر نورانی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

بنو نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ نورانی نے بلا تکلف بنو کا بازو کھینچ کر اسے اٹھالیا اور

بلا ہوا لمحہ کمرے میں لے گیا۔ بنو اور گورا حیرانی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”گورا نہیں۔“ ایلی بولا۔ ابھی آجائیں گے۔ کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔“

”ایسی ویسی بات ہو بھی تو کیا ہوا۔“ بنو بولی۔

”ہیں بھی لے چلے کوئی۔“ گورا ہنسی۔

”جیس نہیں البتہ۔“ ایلی نے بنو کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے کمرے کی طرف چل پڑا۔

”بیچ رہی تھی۔“ یہ کیا مذاق ہے۔“

کمرے میں پہنچ کر ایلی نے کہا۔ ”مذاق نہیں۔ جمیل نے کہا تھا کہ تم دکھ جذب کر لیتی ہو۔“

”ناب۔“ میں دکھی ہوں۔ بنو! میرا کچھ کرو۔“

”لاہنے لگی۔“

”گورا نہ بنو۔“ وہ بولا ”ہنسی سے دکھ دور نہیں ہوتا۔“

”تو پھر۔“ وہ بولی۔

”تسے کیا پتہ دکھ کیسے دور ہوتا ہے۔“

”مٹے بھی تو پتہ نہیں۔“ وہ بولی۔

”گھما گھما رہی مرضی۔“ وہ بولا اور اس نے بنو کے ہاتھ میں بیس روپے تھما دیئے۔

”کیسے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”گولوں کے دن ہیں۔ ریوڑیاں اور مونگ پھلی کھا لیتا۔“

کرے گا۔ ان کے مکان کے گرد لڑکیاں تو بہت رہتی تھیں اور وہ چلا چلا کر اپنی موجودگی کا پیغام  
ان تک پہنچاتی رہتی تھیں۔ سڑک پر آنے جانے والی ہندو خواتین بھی تھیں لیکن ایلی نے سہا  
ایسی عورت کا انتخاب کیا جائے جو اس قدر جہاندیدہ ہو کر اسے فریفتہ کرنا آسان کام نہ ہو۔  
”بنو! دفترا“ اسے خیال آیا اور وہ اچھل پڑا۔ طائفہ بھلا کب کسی کی بنتی ہے۔  
اسے کسی کا ہو جانے کا چاؤ بھی نہیں ہوتا اور پھر بنو تو واقعی پٹانہ ہے۔

## بہرو پیئے

اگلے روز رات کے نو بجے کے قریب نورانی اور ایلی گھر سے نکلے۔ دونوں نے کالے کمرے  
اوڑھ رکھے تھے تاکہ کوئی انہیں پہچان نہ لے۔ سرائے پر پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ ایلی آگے  
آگے جا رہا تھا نورانی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

جب وہ چنگے میں پہنچے تو نورانی رک گیا۔

”اچھا تو طوائف کا انتخاب کیا ہے آپ نے۔“

”یہ شرط تو نہ تھی کہ یہاں کی نہ ہو۔“ ایلی نے کہا۔

”مشکل کام دیا ہے آپ نے۔“ نورانی بولا۔ ”لیکن کچھ پروا نہیں چلے۔“

بنو کے گھر جا کر ایلی نے کمرے اور پگڑی اتاری اور بے تکلفی سے ان سے باتیں کرنا لگا۔

”آئیے۔“ وہ بولا۔ ”آپ کو اپنے ایک دوست سے ملاؤں۔ یہ آج ہی دلی سے آئے ہیں۔“

صرف ایک روز کے لئے ٹھہریں گے یہاں ڈیرے میں۔“

”آپ کی تعریف۔“ بنو بولی۔

ایلی نے جھٹ جواب دیا۔ عظمت خاں۔“

”بڑا ٹھاٹھ دار نام ہے“ گورا ہنسی۔

”خود بھی تو ٹھاٹھ دار ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”فی الحال تو پگڑی اور کمرے ہی دکھائی دیتے ہیں۔“ گورا ہنسی۔

”اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ کمرے ختم ہوا اور عظمت خاں شروع ہوئے۔“ بنو۔

کہا۔

”یہی تو کمال ہے۔“ ایلی بولا۔

”ہی۔ لالہ جی بلاتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”لالہ جی۔“ ایللی نے لاپرواہی سے دہرایا۔

لالہ جی ان کے ہید ماسٹر تھے۔ وہ عمر میں بچپن کے قریب تھے اور طبیعت کے لحاظ سے ستر لائے ہوں گے۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک سال کے اندر اندر وہ پنشن پانے والے ہیں لہذا وہ نے پہلے ہی پنشن کی مشق شروع کر دی تھی۔ سارا دن باہر دھوپ میں یا اندر کمرے میں رہتے۔ نہ کسی استلو سے بگڑتے نہ کسی کو منہ لگاتے۔ البتہ جب بھی بن آتی لوگوں کی مدد لے تھے۔

ایلی دفتر میں داخل ہوا تو بنو کو لالہ جی کے روہرو کرسی پر بیٹھے دیکھ کر گھبرا گیا لیکن جلد ہی اپنے خود کو سنبھالا۔

”جی لالہ جی۔“ وہ بولا۔

”یہ آپ کے مہمان ہیں۔“ لالہ جی نے بنو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ پھر بنو سے کہنے لگا۔  
”اپنا ذرا دفتر سے باہر یا بیچے میں چلے یہ ابھی آتے ہیں۔“  
بنو اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

لالہ جی نے نگاہیں جھکا لیں اور بولے۔ ”الیاس صاحب! مجھے آپ سے یہ توقع نہ تھی۔“  
— دیکھئے نا عورت کا سکول میں آنا۔ بچوں پر کیا اثر پڑے گا۔ آپ نے بلانا ہی تھا تو گھر پہنچا۔“

”لالہ جی۔“ ایللی نے جواب دیا۔ ”اگر میں بلاتا تو گھر ہی بلاتا۔ اس کا میں سکول میں آتا ہی لبات کا ثبوت ہے کہ نہ تو میں نے اسے بلایا ہے نہ میں اسے جانتا ہوں۔“  
لالہ جی نے آنکھ اٹھا کر غور سے ایللی کی طرف دیکھا اور بولے۔ ”اچھا تو دیکھئے کہ بات کیا ہے۔“

ایللی بیانیچے میں پہنچا تو بنو اس پر یوں جھپٹی جیسے چیل گوشت پر جھپٹی ہے۔

”نہ جانے۔“ وہ بولی۔ ”بنو کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو اسی روز سے تمہارے دوست کی ملا جپتی ہے کتنی ہے۔“ اے بلواؤ۔“

”ارے۔“ ایللی چلایا۔ ”کیا واقعی۔“

”نہ جانے کیا کر دیا ہے اس نے میری بنو پر۔“ بنو کی آواز گلو گیر تھی۔

”فضول۔“ وہ غصے میں چلائی۔

”شانت شانت۔“ ایللی نے کہا۔ تم تو نروان دینے والی ہو۔ سچ پکیوں ہوتی ہو۔“

”دینے والی ہوں۔ لینے والی نہیں۔“

”تو دے دو۔“ وہ اس کی طرف بڑھا۔

ایک ساعت کے لئے وہ تھکی۔

ایللی نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔ اس پر رکھ دو۔“

”کیا؟“

”جو تمہارے پاس ہے دینے کو۔“

وہ غمی۔ ”آپ عجیب باتیں کرتے ہیں۔“

”ان باتوں میں نہ پھنس جانا۔ اونچے بول اندر سے دھول والا معاملہ ہے۔“

”آؤ نا بھی اب۔“ نورانی نے اسے آواز دی۔

”کیوں۔ ہو گئے فارغ۔“

”لا حول ولا قوۃ“ وہ غصے میں پھنکارا۔

”اوہ میرا مطلب تھا“ ایللی نے معذرت کی۔

”بس گھورتے ہی رہے۔“ بنو چلائی۔

ایللی نے غور سے بنو کی طرف دیکھا۔ اس پر نورانی کی نگاہ کا کوئی اثر نہ تھا۔ ”مار لیا میدان

..... اس نے سوچا۔

اگلے روز نورانی دورے پر چلا گیا۔ اور دو ہی دن میں ایللی بالکل بھول گیا کہ اس نے شرا بدھی تھی۔ اور بنو کو تختہ مشق بنایا تھا۔ وہ پھر سے غلام کی ستارے کے پاس جا بیٹھا اور جے جے ونٹی اور کیدارے میں کھو گیا۔

پیاں پڑوں گی ہلنگنا نہ چڑھوں گی پیاں پڑوں گی۔

## غروب و طلوع

چند روز بعد ایک روز جب ایللی نوین جماعت کو تاریخ جغرافیہ پڑھا رہا تھا تو چہرہ اسی آیا۔

وہ تو عام سا آدمی تھا۔ جلو گر تو نہ تھا۔

”چہ نہیں۔ کیا ہوا ہے۔ بے چاری بیمار ہے۔ آپ آئیں نا آج ضرور آئیں ضرور۔“  
 ”آؤں گا۔“ ایلی بولا۔ لیکن حیرت کی وجہ سے اس کا دماغ شل ہو چکا تھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آخر کیوں نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر نورانی۔ لاجول دلا قوت۔“

سکول سے فارغ ہو کر وہ گھر پہنچا۔ دروازے میں ایک خط پڑا تھا۔ اس نے بے خبری میں وہ خط اٹھالیا اور بیشک کی طرف چلا گیا۔ بیشک مغل تھی۔

”ہوں۔ تو ابھی تک دورے سے نہیں آیا۔ لیکن آخر بات کیا ہے۔ نورانی نے کیا کیا ہو گا۔ شاید ٹونا کیا ہو۔ شاید تعویذ لے گیا ہو۔ نگہ میں اتنا اثر نہیں ہو سکتا۔“

اس نے بے خبری میں لفافہ چاک کیا اور خط پڑھے بغیر ٹھٹھنے لگا۔ سکھیا کا یہ اثر تو نہیں ہو سکا۔

”نہیں نہیں“ وہ چلایا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

دفعۃً اس کی نگاہ خط پر پڑی۔ صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔

”میں جاری ہوں ہمیشہ کے لئے جاری ہوں۔ مجھ سے مل جاؤ اللہ کے واسطے۔“ ”شہزاد“  
اس کی پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

نورانی، بنو، بنو، گورا، غلام اور اس کا ستار سب غروب ہو گئے۔ ان کی جگہ ایک چہرہ ظلم ہو

کیا۔ منور چہرہ، ماتھے پر بڑا ساقی، غمناک آنکھیں یاد اس صورت۔

”میں جا رہی ہوں۔“ وہ بولی۔

”لیکن۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ اعلیٰ کو کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

گازی فراٹے بھرتی ہوئی علی یور جاری تھی۔

# بھگوڑے

علی پر پہنچے ہی ایلی نے شور مچا دیا۔ کبھی وہ فرحت کو آوازیں دیتا کبھی رابعہ کو تاکہ اس کی  
 سے متعلق شنوار کو علم ہو جائے لیکن شنوار رابعہ کے چوبارے کو چھوڑ کر اپنے چوبارے میں جا  
 بیٹھا۔ اس لئے اس نے ایلی کی آواز نہ سنی۔ پھر وہ اندھیری گلی کے راستے فرحت کی طرف  
 لگا۔

ایلی نے بہانہ بنایا۔ کہنے لگا۔ ”میرے افسر نے سرکاری کام سے امر تر بھیجا تھا میں نے کہا انداز کے لئے علی پور بھی ہو آؤں۔“

۱۱ باتیں کر رہے تھے کہ ملحقہ مکان سے شور اٹھا۔ کوئی چیخ کر رہا تھا۔

”کون ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”اے ہے۔ صغیر ہے۔“ ہاجرہ بولی۔

”روتا کیوں ہے؟“

”کبھی روتا ہے کبھی ہنستا ہے کبھی سردیوار سے دے مارتا ہے۔“ فرحت بولی۔

”کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔“

”گوئی پردے کی بات ہے کیا؟“

”ہونہ پردے کی —“ فرحت چلائی۔

”تو پھر بتانے میں کیا حرج ہے۔“

شہزاد نے حیرت سے ایللی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اس کے آگے آگے چل پڑی۔

**ب کیا ہے**

جب وہ چوبارے میں پہنچے تو شہزاد کے تینوں بچے سو رہے تھے۔ اس کی تین بڑی لڑکیاں پہ نقہ اور ریحانہ تو پہلے سے ہی گرد چمن کے سکول میں داخل تھیں چونکہ علی پور میں لڑکیوں کا الگ سکول نہ تھا۔ اس لئے شہزاد نے گرد چمن بھیج دیا تھا جو علی پور سے بیس میل کے فاصلے پر تھا اور جہاں وہ بورڈنگ میں رہتی تھیں۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی اور میں بیدی اور ناز کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ تینوں عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ لہذا شام ہی سے سو گئے تھے۔ اس کی ملازمہ جانو ان دونوں اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے لاہور گئی ہوئی تھی۔ ”کھانا کھا لو۔“ شہزاد نے کہا۔ ”میراجی نہیں چاہتا۔ ایک پیالہ چائے کا پلا دو البتہ۔“ ایللی نے جواب دیا۔ وہ چولے پر بیٹھ لہجائے بنانے لگی۔

ایللی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ”ہاجرہ نے بڑی جرات کی ہے آج شہزاد نے کہا۔“ اور تم نے بھی۔ اب کیا ہے۔“ اور پھر مدھم آواز میں گنگنائے لگا۔ ”اب جو کچھ گزرتا ہے جان پر گزر جائے۔“

وہ پھر خاموش ہو گئے۔

ایللی سوچ رہا تھا۔ شہزاد بات کیوں نہیں کرتی۔ ویسے بلا سمجھا ہے۔ لیکن خاموش ہے۔ ”خط لایا تھا۔“ شہزاد نے پوچھا۔ ”ہاں“ وہ بولا۔ ”مجھ سے ملنے آئے ہو۔“

”ہاں“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے پتہ تھا تم آؤ گے۔“ وہ بولی۔

”اچھا؟“ اس نے طنزاً کہا۔

”نہ بھی آتے۔“ وہ بولی۔ ”تو مجھے گلہ نہ ہوتا۔“

”اوہ۔“ وہ پھر خاموش ہو گئے۔

”کمال جا رہی ہو۔“ ایللی نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“

”پھر بھی۔“

بس دیا اب سمجھنے ہی کو ہے۔

”کیا مطلب؟“

”ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ اللہ ماری سپرٹ پی پی کر بھی بھڑا جل گیا ہے۔“ فرحت نے کہا۔

”بس آج نہیں تو کل۔۔۔“ ہاجرہ کی ہنسی نکل گئی۔ ”تو کیوں روتی ہے ایللی۔“ فرحت نے غصے سے کہا۔ ”اے ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میرے بھائی کا بیٹا ہے آخر۔“ ”اچھا تو میں چلتا ہوں۔“ ایللی نے کہا۔

”اے ہے کھانا تو کھالے۔“ فرحت نے کہا۔ ”میراجی نہیں چاہتا۔“ ایللی نے کہا۔ پاؤں کی چاپ سن کر ایللی نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے میں شہزاد کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے اداسی اور تشکر نکل رہے تھے۔ ”کون شہزاد ہے۔“ فرحت بولی۔ ”پہلے تو ناہتی ناہتی دما چوکڑی چاتی آیا کرتی تھی اور اب ایللی کی طرح دبے پاؤں آتی ہے۔“ ”وقت وقت کی بات ہے۔“ شہزاد نے جواب دیا۔ ”یہ ایللی کب آیا؟“

”ابھی آیا ہوں۔“ ایللی نے روکھے انداز سے کہا۔ ”مجھے تو آج ڈر لگتا ہے۔“ شہزاد نے کہا۔

”تجھے اور ڈر۔“ فرحت نے کہا۔ ”وہ ڈر کے زمانے گزر گئے کیا؟“ شہزاد نے آہ بھری۔ ”بیت گئے۔“ وہ بولی۔ ”کس بات کا ڈر ہے تجھے۔“ ہاجرہ نے پوچھا۔

”پڑوس سے خیر کی آوازیں نہیں اٹھ رہیں۔“ وہ بولی۔ ”ہاں وہ تو ہے ہی نہ جانے کس وقت۔“ فرحت رک گئی۔ ”تو ایللی کو لے جا تو اپنی طرف۔“ ہاجرہ نے کہا۔ ہاجرہ کی اس بات پر وہ سب چونک پڑے۔ فرحت نے حیرت سے ہاجرہ کی طرف دیکھا۔

”اور جو کسی کو پتہ چل گیا تو۔۔۔“ فرحت بولی۔ ”تو بھی کمال کرتی ہے ایللی۔“

”ہم کسی کو بتائیں گے تو پتہ چلے گا۔“ ہاجرہ نے کہا۔

فرحت غصے سے لال ہو گئی۔ ”واہ ایللی واہ۔“

”ویسے بھی تو اس نے جانا ہی ہے نا۔“ ہاجرہ چلائی۔ ”ان دونوں کو آج تک تو کوئی روک نہ

سکا۔ اب فضول غصہ چڑھانے سے فائدہ۔“

ایللی اٹھ بیٹھا۔ ”چلو شہزاد۔“ وہ بولا۔ ”میں چلوں گا۔ تمہارے ساتھ۔“

”شاید عیسائی ہو جاؤں۔“

”اس سے کیا ہو گا۔“

”مزدوری کر سکوں گی۔“

”مجھے ساتھ لے چلو“ ایلی نے کہا۔

”اونہوں۔“ وہ بولی۔

”کیوں۔“

”بس نہیں کہہ جو دیا۔“ وہ پھر خاموش ہو گئے۔

”ایک بات پوچھوں۔“ ایلی نے کہا۔

”پوچھ۔“

”کیوں جا رہی ہو۔“

”اب اس گھر میں رہنا ناممکن ہو چکا ہے۔“

”کیوں۔“

”بے عزتی کی زندگی سے بھیک مانگ لینا اچھا ہے۔“

”شریف آیا تھا کیا؟“

”ہاں۔“

”کب آیا تھا۔“

”جس روز تمہیں خط لکھا تھا اسی روز گیا تھا وہ۔“

”کچھ کتا تھا۔“

”بہت کچھ۔“

”کیا؟“

”چھوڑو اس بات کو۔“ وہ پھر خاموش ہو گئے۔

”ادھر کا دروازہ بند ہے کیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”مکہر کا۔“

”فرحت کی طرف کا۔“

”نہیں تو۔“

”ہر آؤ۔“

”ایسا فرق پڑتا ہے؟“ وہ مسکرائی۔

”مزدوری آجائے تو۔“

”میں ہم کچھ کرنے لگ جائیں تو۔“

”کیا ہے۔“ وہ پھر خاموش ہو گئے۔

”ایک وہ خاموش بیٹھے رہے۔ شہزاد نے چائے تیار کر دی۔

”میں رکھ دوں۔“ وہ بولی۔

”نہیں رہنے دو۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”ہاں۔“

”ہاں۔ تم بیوگی۔“

”بیوگی۔“

”شہزاد۔“ وہ بولا۔ ”کیا تم زندگی سے اکتا گئی ہو۔“

”نہیں تو۔“ وہ بولی۔ ”ابھی کہیں۔“

”اب تو وہ تڑپ نہیں رہی۔“

”لوں تو۔“ وہ بولی۔ ”تڑپ تو ہے۔“

”آپھر لو اس کیوں ہو۔“

”لو اس نہیں۔“ وہ بولی۔

”ہاں۔“

”دڑی ہوئی ہوں۔“

”کیسی۔“

”میں شہزادی پڑوسی سے۔“

”مختار سے۔“

”اے۔ روز میرا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے مجھے معاف کر دو تو مرنے لگا۔ ورنہ نہیں۔“

”اگر دو معاف۔“ ایلی نے کہا۔

”نہیں نہیں مانگ۔“

اگر تم بچے چھوڑ جاؤ گی تو تم ان کی جدائی برداشت نہ کر سکو گی۔  
وہ خاموش رہی۔

”ہو بولنا۔“ ایلی نے اسے جھنجھوڑا۔

”میں تمہیں ساتھ لے جانے کے لئے تیار نہیں۔“ وہ بولی۔

”ہاں یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔“

”ہاں۔“ وہ بولی۔

”ایک بات کہوں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”کو۔“

”چلو اس کا فیصلہ نہ تم کرو نہ میں کرتا ہوں۔“

”تو پھر۔“

”دیکھیں قدرت کو کیا منظور ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”وہ کیسے؟“

”اگر پرچیں ڈال لیں۔ ایک پر لکھیں دونوں دوسری پر ایلی تم ایک پرچی اٹھاؤ۔ اگر ایلی

ایلیں چپکے سے چلا جاؤں گا اور اگر دونوں نکلا تو تم چپکے سے میری ساتھ چل پڑنا۔

وہ خاموش ہو گئی۔

”بولو منظور ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔“

دیر کے بعد اس نے آہ بھری۔ چلو ساری عمر جو اٹھیا ہے تو اب کی بار بھی سہی۔“ شہزاد

”تو منظور ہوا۔“ ایلی نے کہا۔

”لیکن میری ایک شرط ہو گی۔“ وہ بولی۔

”کیا؟“

”وعدہ کر کہ اگر ایلی کی پرچی نکل آئی تو تم شادی کر لو گے۔ میرے جانے کے فوراً بعد

ازدگی بھر مجھ سے نہیں ملو گے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”اتنی سخت گیر تو نہیں تو۔“

”عورت ہوں۔“ وہ بولی۔

”اوہ۔۔۔۔۔ اور وہ پھر خاموش ہو گئے۔“

دلفینا شہزاد بولی۔ ”تو وہاں کیوں کھڑی ہے یہاں آجا۔“

ایلی حیران تھا کہ کس سے بات کر رہی ہے۔

فرحت مسکراتی ہوئی دروازے سے نکل کر اندر آ گئی۔ ”میں نے کہا دیکھوں تو کیا کر رہے

ہیں۔“ وہ بولی۔

”یہاں بیٹھ کر دیکھو نا۔“ شہزاد بولی۔ ”چپ کر دیکھنے سے کیا فائدہ۔“

”میں تو حیران ہوں۔“ فرحت بولی۔ ”تم دونوں ہی عجیب ہو۔“

”کیوں۔“ شہزاد نے پوچھا۔

”یوں بیٹھے ہو۔ جیسے صدیوں سے ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے ہو۔“

”وہ تو ہے۔“ شہزاد بولی۔ ”صدیوں سے اکٹھے رہتے ہیں ہم۔ کیوں ایلی۔“

”ہاں۔“ ایلی نے کہا ”صدیوں سے۔“

”اور میں سمجھتی تھی۔“ فرحت ہنسی۔

”تو جوجی چاہے سمجھ تیرا کیا ہے۔“ شہزاد بولی۔

## ایلی یا دونوں

فرحت چند ایک منٹ ٹھہری اور پھر ہمانہ بنا کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔

”دیکھو شہزاد۔“ ایلی اٹھ بیٹھا۔ ”اگر تم نے جانا ہی ہے تو چلو اکٹھے چلیں۔“

”بڑی بدنامی ہو گی۔“

”پھر کیا ہوا۔“

”تم برداشت نہ کر سکو گے۔“

”میری بات چھوڑو۔“ وہ بولا ”میں مرد ہوں۔ بس یہی کچھ برداشت کر لوں گا۔ تم عورت ہو۔“

میری تنخواہ بہت قلیل ہے۔ تم غربت برداشت نہ کر سکو گی۔ تم غربت سے واقف نہیں شہزاد

وہ اٹھی۔ ٹرک سے کاپی کا ورق پھاڑا۔ پسل لی اور لکھنے بیٹھ گئی۔  
 وقتاً نہ جانے اسے کیا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے  
 لی میز پر رکھ دی اور دونوں ہاتھوں میں سر قلم کر رونے لگی۔  
 "شیراز۔" شیراز۔" ایلی نے اسے جھنجھوڑا لیکن وہ جوں کی توں پتھری طرح بیٹھی رہی۔

### نہیں مروں گا

— عین اس وقت ملحقہ کمرے سے شور مچا دیا۔  
 "نہیں نہیں۔ میں نہیں مروں گا۔ نہیں مروں گا۔" صغدر چلا رہا تھا وہ کمرے میں ادھر سے  
 اور ادھر سے ادھر پھر رہا تھا۔  
 "نہیں نہیں نہیں نہیں۔" وہ چلائے جا رہا تھا۔  
 شیراز نے سر اٹھایا اور غور سے سُنے لگی۔  
 "نہی کے ابا نہی کے ابا۔" صغدر کی بیوی اس کی منتیں کر رہی تھی۔ "خدا کے لئے ان  
 لے ہوئے بچوں کے لئے۔"  
 "ہلی جاؤ چلی جاؤ۔" وہ چلانے لگا۔

"ان بچوں پر رحم کرو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔" وہ رو رہی تھی۔  
 "ہلی جاؤ، چلی جاؤ۔ مجھ پر کسی نے رحم نہیں کیا۔ میں کسی پر رحم نہیں کروں گا۔"  
 "گپے آپ پر رحم کرو۔ یہ زہر نہ پیو۔" اس کی بیوی بولی۔  
 "ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔" وہ چیخ رہا تھا۔  
 "خدا کے لئے خدا کے لئے۔" وہ کراہ رہی تھی۔  
 ہر ملحقہ کمرے پر خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔  
 "شیراز۔" ایلی بولا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"  
 "کوئی بھی نہیں۔"  
 "نہی طرف دیکھو۔"

ایلی نے سر اٹھایا۔ اس کی گالوں پر آنسو ڈھلک رہے تھے۔  
 "صغدر رہا تھا۔ نہ جانے صغدر کے متعلق کوئی بات تھی۔ جو شیراز چھپا رہی تھی۔

"میری خاطر ہمیشہ سب کچھ ہوتا آیا ہے۔" وہ بولی۔ "یہ بھی ہو گا۔ جو بھی میں چاہوں گی ہو  
 کے رہے گا۔" وہ مسکرا دی۔

"کیا مطلب؟"  
 "میں ابھی جیتی ہوں۔" وہ بولی "مجھے مزہ نہ سمجھو۔ مجھ میں ابھی کس بل ہے۔" اس کی  
 آنکھوں میں چمک لہرائی۔

"میری خاطر تم بہ بھی کرو گے۔ دیکھ لیتا۔"  
 "اور نہ کروں تو۔"

"تو میرا آخری فیصلہ تم ہی چکے ہو۔"  
 "یعنی جوا نہیں کھیلو گی۔"

"اوہ نموں۔" شیراز نے نفی میں سر ہلایا۔  
 "اچھا۔۔۔" ایلی بولا۔ "مجھے منظور ہے۔"  
 "وعدہ۔"

"تمہاری قسم۔"  
 "مجھے تم پر یقین ہے۔"  
 "لیکن دونوں نکلا تو میری بھی ایک شرط ہو گی۔ تمہیں وعدہ کرنا ہو گا۔" ایلی نے کہہ  
 دیا۔

"اگر بچوں کو ساتھ لے جاؤ گی تو غربت برداشت کرنی پڑے گی اور اگر بچوں کو ساتھ نہ لے  
 جاؤ گی تو ان کا غم نہ کھانا۔ ورنہ تمہاری زندگی تلخ ہو جائے گی۔"

"ہوں۔" وہ سوچنے لگی۔

"میں بتاؤں۔" ایلی بولا۔

"کیا۔"

"تم لڑکیوں سے سچی بات کہہ دنا اور پوچھ لیتا۔ انہیں یہ بھی بتا دنا کہ بھوکوں مرنا پڑے  
 گا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔

"تو پرچیاں لکھ دو۔"



ایلی نے حیرت سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ کیا یہ شہزاد بول رہی تھی۔ نہیں نہیں۔ وہ تو اتنی دل نہ تھی۔ پھر کون بول رہی تھی۔ ایلی کے لئے شہزاد کی شخصیت کا یہ پہلو نیا تھا۔ جس کا وہ آج تک واقف نہ ہوا تھا۔

کچھ دیر لمحہ کمرے پر خاموشی چھائی رہی۔ پھر دیوار پر پھر سے ٹک ٹک ہونے لگی۔  
”کہہ کیوں نہیں دیتی۔“ ایلی بولا۔

شہزاد خاموش بیٹھی رہی۔

”میری خاطر کہہ دو۔“ ایلی نے منت کی۔

”جی نہیں مانتا۔“ وہ بولی۔

”کہہ دیتی ہوں۔ صرف ہونٹوں سے۔“

”تو کہہ دو۔“

شہزاد نے ٹٹک سے تالا اٹھایا اور اسے دیوار پر مارنے لگی۔ ٹھک ٹھک ٹھک

پھر وہ رک گئی۔

مفرد نے پھر دیوار بجائی۔

شہزاد نے پھر تالا دیوار پر مارا۔ ٹھک ٹھک ٹھک

دھننا ”مفرد چلا آیا یہ تم ہو۔ تم ہو۔ بولو۔“

”ہاں“ وہ با آواز بلند بولی۔ ”میں نے معاف کیا۔“

لمحہ کمرے سے نعروں کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی چیخ رہا تھا، ناچ رہا تھا۔ قہقہے مار رہا تھا۔  
”کمانی پھر چڑھ گئی۔ پھر وہی تے کرنے کی آواز اور پھر خاموشی چھائی۔“

دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

تب پرچی لکھوٹ۔“ ایلی نے کہا۔

”ہاں پرچی۔“ شہزاد گویا خواب سے بیدار ہوئی۔

پہلیں لگتے وقت اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ اس نے ہاتھ ہاتھوں سے کانٹھ کے ان دونوں پر زوں کو تھپکایا اور بولی۔ ”اب اٹھاؤ۔“  
”میں نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”تم اٹھاؤ۔“ ایلی نے پرچیوں کو مٹھی میں لے کر بلایا۔

وہ تو بے نیاز تھی۔ کسی بات کو درخور اعتنا نہیں سمجھتی تھی۔ پھر کیا بات تھی۔ جس کی وجہ سے اس کے آنسو نہیں رکتے تھے۔ ایلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”شہزاد۔“ وہ بولا ”آخر بات تو ہے کوئی۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ بولی۔

اچھا تو یہ پرچیوں کو لکھو۔

”لکھتی ہوں۔“ وہ بولی اور ویسے ہی بت بنی بیٹھی رہی۔

لمحہ کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔ صرف لمبے لمبے سانس لینے کی آواز آرہی تھی۔

— دیر تک وہ پھر خاموش بیٹھے رہے۔

لمحہ کمرے سے ٹک ٹک کی آواز آرہی تھی۔ کوئی دیوار بج رہا تھا۔ شہزاد کے کان کھڑے

ہو گئے۔

”دیوار بج رہا ہے کیا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کون ہے۔“ اس نے پوچھا۔

شہزاد نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

ایلی مجھ گیا۔ لیکن مفرد دیوار کیوں بج رہا ہے۔ یہ اسے سمجھ میں نہ آیا۔

”مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔“ مفرد کی مدھم آواز سنائی دی۔

شہزاد خاموش بیٹھی رہی۔

”وہی ہے کیا۔“ ایلی نے پوچھا۔

شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو کہہ دو معاف کر دیا۔“ ایلی نے کہا۔

شہزاد نے برا سامنہ بتایا ”دل نہیں مانتا۔“ وہ بولی۔

”تو جھوٹ موٹ کہہ دو۔“ ایلی نے کہا۔

”جب تک میں نہیں مروں گا۔“ مفرد با آواز بلند چیخنے لگا۔ حتیٰ کہ اسے کمانی کا دھڑکا

”کیا اور کہہ کیوں نہیں دیتی۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ساری عمر جان کنی کے عذاب میں مبتلا رہے۔“ شہزاد بولی۔

”ہی۔“ ایلی نے مشکل سے کہا۔  
”تو آؤ ناوہ سامنے بیٹھے ہیں۔“

ایلی کو مجبوراً ”لالہ جی کے پاس جانا پڑا۔“ آداب عرض۔ ”وہ بولا۔  
”نہتے۔“ وکیل نے جواب دیا اور کتب ایک طرف رکھ دی۔ ”ہوں کیا بات ہے۔“  
”مجھے آپ سے مشورہ کرنا ہے۔“  
”ہوں۔“ وہ حقے کا کش لے کر بولے۔  
”اخوا کا کیس ہے۔“ ایلی نے بعد مشکل کہا۔ پھر وہ گھبرا گیا۔ ”میرا مطلب ہے۔

ایڈیٹ کل۔ یعنی۔“ وہ رک گیا۔ اس کا کھاسو کہ گیا تھا۔  
”کیا کیس ہے۔“ وہ بولے۔

”اگر ایڈیٹ کی جائے تو اس میں قانونی زد کیا ہو سکتی ہے۔“  
”یہ تو کوائف پر منحصر ہے۔“ لالہ جی بولے۔

”میرا مطلب ہے۔“ ایلی نے بعد مشکل کہا ”کیا کوائف ہونے چاہیں؟“  
”یعنی کیا مطلب ہے؟“  
”مطلب ہے یعنی۔“

”دیکھو نوجوان۔“ لالہ جی بولے۔ ”کیا ارتکاب جرم ہو چکا ہے؟“  
”جی نہیں۔“ وہ بولا۔

لالہ جی تھوہ مار کر ہنسنے لگے۔

”کیا تم اس کے بہرو ہو گے۔“ لالہ جی نے پوچھا۔  
”جی۔“ ایلی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کی کی عمر کیا ہے؟“ وہ بولے۔

”میر۔“ ایلی کے گلے میں کچھ پھنس گیا۔ ”معلوم نہیں۔“ وہ بولا۔  
”میر بھی اندازاً۔“

”اگل کے چھ بیٹے ہیں۔“

”نوجوان وہ بولے تمہیں کسی ڈاکٹر سے ملنا چاہئے وکیل

شنراو نے ایک پرچی اٹھائی۔ ”کھولو۔“ وہ بولی۔  
”نہیں تم خود کھولو۔“ اس نے کہا۔

شنراو نے اسے کھولا۔ ”دونوں“ دیکھ کر وہ مسکرائی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔  
عین اس وقت لمحہ کرے میں صفدر کی بیوی کے بین شروع ہو گئے۔  
ایلی چونکا۔ ”کیا مر گیا؟“ وہ بولا۔

”ہی۔“ شنراو نے جواب دیا۔ ”جان چھٹی۔“ لیکن اس کی آنکھوں سے ابھی تک  
آنسو رواں تھے۔

ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ وہ آنسو غم کے تھے یا خوشی کے۔  
”تم اب جاؤ۔“ شنراو بولی۔ ”مرگ پر سارے محلے والے اکٹھے ہوں گے۔“

”اچھا۔“ ایلی نے کہا۔ ”کل میں چلا جاؤں گا۔ انتظام کرنے کے لئے۔ انتظام کر کے واپس  
آؤں گا۔ تم تیار رہنا۔“

شنراو نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”دیر نہ لگنا۔“ وہ بولی۔

”نہیں۔“ ایلی بولا، جلد آؤں گا۔“ وہ دبے پاؤں فرحت کے گھر کی طرف چل پڑا۔

## وکیل میم

لاہور پہنچ کر ایلی سوچنے لگا کہ اسے کیا تیاری کرنی ہے۔ اسے قانون سے چنداں واقفیت نہ  
تھی اور نہ ہی اسے کسی لڑکی کو بھگا کر لے جانے کا تجربہ تھا۔ شنراو نے کئی بار اسے بتایا تھا کہ  
شریف کے ساتھ اگر ایسی واردات ہو جائے تو وہ قانونی طور پر کوئی اقدام نہیں کرے گا۔ میدان  
میں آکر لڑنے کی بجائے شاید وہ خود معدوم ہو جائے گا۔

بہرحال اگر اس نے کوئی اقدام کیا تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ قانونی طور پر وہ کس طرح  
میں آتا ہے۔ ایلی نے کورٹ روڈ پر دو چکر لگائے اور وکلاء کے بورڈ پڑھنے لگا۔ لیکن اس میں اس  
قدر ہمت نہ پڑتی تھی کہ کسی وکیل کی پاس جائے۔

اپنی کوشش کے باغیچے میں ایک معمر وکیل کو بیٹھے دیکھ کر اس نے اندر داخل ہونے کی شہ  
کوشش کی لیکن اس کے قدم رک گئے عین اس وقت وکیل کا منشی آ گیا۔

”کیوں مہاراج۔“ وہ بولا۔ ”آپ لالہ جی سے ملیں گے۔“

”میں نے“  
 ”پھر کیا ہے۔“ ایلی بولا۔ ”مجھے ڈراؤ نہیں۔ مشورہ نہ دو۔ امداد کرو۔“  
 ”جتنی مدد کرو گے کروں گا۔ بشرطیکہ میں قانون کی زد میں نہ آؤں۔“ محمود ہنسنے لگا۔  
 ”چھ بچوں کی ماں ہے وہ کیا۔“ میم نے مسکرا کر پوچھا۔  
 ”جی ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔  
 ”تمہارا رو مینس ہے۔“ اس نے پوچھا۔  
 ”سولہ سال سے۔“ ایلی نے جواب دیا۔  
 ”سولہ سال۔“ اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔  
 ”حرام زادی۔“ محمود غصے میں چلایا۔ ”اس کی آنکھ کی چمک دیکھو۔“  
 ”تم تو خواہ مخواہ بگڑتے ہو۔“ میم نے یوں لاڈ سے کہا جیسے بچی ہو۔  
 ”ابھی رو مینس کی لت نہیں مگنی کیا۔“ محمود نے اسے پکڑ کر گرا لیا اور اونڈھا کر کے اس کے چوڑوں پر یوں کے مارنے لگا۔ جیسے سکول کی بچی کو سرزنش کر رہا ہو۔  
 ”ہائے مری ہائے مری۔“ میم چلا رہی تھی۔  
 ”میرے دوست پر لپٹائی نظریں ڈالتی ہے تو۔“ محمود غرا رہا تھا۔  
 ایلی حیران تھا۔ اس کے ذہن میں میم کا تخیل کچھ اور تھا۔ یہ عجیب میم تھی اور محمود عجیب لڑکا تھا۔ جو میم کا محتاج ہونے کے باوجود اسے یوں پیٹ رہا تھا۔ جیسے وہ اس کی ہاؤس میڈ ہو۔  
 بہر حال محمود سے کوائف طے کرنے کے بعد وہ ڈیرہ آگیا۔

نہ لفظ

ڈیرہ پہنچ کر بھی اس کے کانوں میں محمود کا مشورہ گونج رہا تھا۔ محمود نے کہا تھا۔ ”ایک بات رکھو۔ اپنی ڈیوٹی پر حاضر رہنا۔ روپوش نہ ہو جانا ورنہ مارے جاؤ گے۔“  
 ایلی نے ڈیرہ پہنچ کر اس کے توسط سے ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ تاکہ شہزاد کو وہاں رکھ کر اس انتظام کے باوجود وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔  
 پہلے روز جب وہ غلام کے گھر گیا۔ تو غلام اسے دیکھ کر بولا۔  
 ”کیوں خیریت تو ہے۔“

لالہ جی کی کوٹھی سے نکل کر ایلی نے اطمینان کا سانس لیا ”کچھ پرواہ نہیں۔“ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ ”جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ اور لالہ جی سے ملنے کی کوفت ملانے کے لئے وہ سینا ہل میں جا گھسا۔  
 سینا سے نکل کر جب وہ انارکلی میں جا رہا تھا تو محمود کو دیکھ کر ٹھٹھکا۔ ”ارے تم؟“  
 ”میں یہیں ہوں۔“ محمود بولا۔  
 ”یہاں تبدیلی ہو گئی ہے کیا۔“  
 ”نہیں جھٹی پر ہوں۔“ محمود نے کہا ”لبی جھٹی پر۔“  
 ”کیوں؟“  
 ”یہاں کلچ میں داخل ہو گیا ہوں۔ بی اے کر رہا ہوں۔“  
 ”ارے۔ اور زر۔“  
 محمود ہنسا۔ ”پر ایسا دھن۔“ وہ بولا۔  
 ”کس کا؟“  
 ”اسی کا۔“  
 ”اسی کس کا۔“  
 ”میری میم کا۔“  
 ”ارے۔ کیا وہ تمہاری بن گئی ہے۔“  
 ”شاید نہ بنتی لیکن مشرق پنے اس روز حملہ کر کے اسے اٹھا کر میری گود میں ڈال دیا۔“  
 ”وہ کس طرح۔“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”بھتی عورت ہے۔ ضد میں آگئی۔ بولی یوں ہے تو چلو یونی سسی۔“  
 ”تو وہ میم کہاں ہے آج کل۔“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”میرے پاس ہے۔“  
 ”کہاں؟“

”مکان کرائے پر لے رکھا ہے۔ چلو گھر چلیں۔ تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔“  
 گھر جا کر ایلی نے محمود کو اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔ محمود شہنشاہ گیا۔ ”ارے چھ بچوں کی ماں کو اغوا کر رہے ہو۔ بلکہ وہ تمہیں اغوا کر رہی ہے۔ یار اگر خاندان نے قانونی چارہ جوئی کی تو اندر۔“

”بالکل“ ایلی نے جواب دیا۔  
 ”معلوم تو نہیں ہوتی۔“ غلام نے کہا۔

نہ جانے کیا بات تھی۔ ہر کوئی اس سے یہی سوال پوچھتا تھا۔ کیا واقعی اس کے چہرے پر پریشانی اور تنفر کے آثار اس حد تک نمایاں تھے۔  
 ”ایلیاس بھائی۔“ غلام بولا ”اپنے آپ سے لڑو گے تو بند بند چنلی کھائے گا۔“  
 ”میں کیا اپنے آپ سے لڑ رہا ہوں۔“

”ظاہر ہے۔“ وہ بولا پھر غلام نے پیار سے ایلی کا ہاتھ تھام لیا اور بولا ”بھائی ایک بات کہتا ہوں۔ جو بھی کرتا ہے کر ڈالو۔ سوچو نہیں ورنہ سوچ کا آرا چلتا ہے۔ بری طرح چلتا ہے۔“

ایلی کئی بار چاہتا تھا کہ غلام سے ساری بات کہہ دے، لیکن اس کی زبان گنگ ہو جاتی تھی۔ ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس روز بھی اس نے بات کرنا چاہی لیکن ہمت نہ پڑی اور وہ وہاں سے چلا آیا۔ پھر جب وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا تو نورانی خلاف معمول ایلی کے کمرے میں آ گیا۔

”ایلیاس صاحب۔“ وہ بولا ”معاف کیجئے میں نے دیکھا ہے کہ آپ سخت پریشان ہیں۔“  
 ایلی نے محسوس کیا کہ اسے جھٹلاتا ہے کار ہے۔ ”ہاں ہوں۔“ وہ بولا۔

”میں کوئی مدد کر سکتا ہوں کیا؟“  
 ”نہیں۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”تو پھر؟“

”بات یہ ہے نورانی صاحب کہ میں مستقبل کے متعلق پریشان ہوں۔“ ایلی نے جواب دیا۔  
 ”تو میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔“ نورانی بولا ”ضرور کر سکتا ہوں۔“

”وہ کیسے۔“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”میں علم جفر سے واقف ہوں۔“ نورانی نے کہا ”کیا آپ اپنا سوال مجھے بتا سکتے ہیں۔“

”نہیں“ ایلی نے کہا ”وہ ایک راز ہے۔“  
 ”اچھا۔“ نورانی بولا ”تو آپ نہ بتائیے۔ میری ہدایات پر عمل کیجئے۔“

”وہ کیسے؟“  
 ”اپنا سوال تیرے الفاظ میں لکھ دیجئے۔“ نورانی کہنے لگا ”شرط یہ ہے کہ الفاظ تیرے ہوں نہ تم

سنا کیا میں بی۔ اے کے امتحان میں پاس ہو جاؤں گا۔ جو اسمال ہو گا۔ دیکھئے اس سوال

الفاظ ہیں اور اس کا متن معانی کے لحاظ سے مکمل ہے۔“  
 اس کے بعد نورانی نے ایلی کو ایک لمبا چوڑا عمل بتایا۔ ان الفاظ کو ابجد کے ہندسوں میں

نورانی اسی طرح تیرہ مرتبہ بدلنا تھا اور پھر ان کا مجموعہ نکالنا تھا۔ نورانی بیٹھ گیا اور اس عجیب و

غل میں ایلی کی مدد کرنے لگا۔ جب مجموعہ نکال چکا تو نورانی بولا۔ ”اب ذرا ٹھہریئے۔ میں

استاروں کی پوزیشن دیکھ لوں۔“  
 باہی ایک جملہ آپ لکھیں جس میں پورا مفہوم موجود ہو۔ مجھے بے شک نہ بتائیں۔

ایلی نے تیرہ لفظوں کا جملہ لکھا۔  
 کیا انوار میرے اور شہزاد کے لئے باعث خوشی یا پریشانی ہو گا۔

نورانی باہر نکل گیا اور وہاں کھڑا گویا عجیب عجیب منتر پڑھتا رہا۔ ”مشرقی، اسد، زہرہ، سرطان

بنے کیا کیا نام لیتا رہا۔  
 ہر وہ اندر آگیا۔ ”ستاروں کے لحاظ سے۔“ وہ بولا ”آپ اس مجموعے میں ۲۱۵ جمع کر

گئی۔“ ایلی نے جمع کر کے کہا۔  
 اب آپ از سر نو انہیں حروف میں بدل لیجئے۔“

ایلی نے ایسی ہی کیا اور وہ حیران رہ گیا۔ اس کے سامنے تیرہ الفاظ کا ایک مکمل جملہ بنا ہوا

”فعل آپ کے اور لواحقین کے لئے باعث ذلت و رسوائی ہو۔“  
 ایلیاس جواب دیکھ سکتا ہوں۔“ نورانی نے کہا۔

ایلی نے وہ چٹ جس پر جواب لکھا تھا۔ نورانی کی طرف بڑھا دی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا

ہے پر وہ انہیں اڑ رہی تھیں۔  
 ٹکے الٹوس ہے۔“ نورانی بولا۔

”لیجئے بھی ہے۔“ ایلی نے کہا ”لیکن میرا فعل بدل نہیں سکتا۔“  
 ایلیاس صاحب۔“ نورانی بولا ”میں دوست ہوں ناصح نہیں البتہ اگر کبھی میری مدد کی

نہ چاہئے تو آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔“ یہ کہہ کر نورانی باہر نکل گیا۔

”یہ ہو کے رہے گا۔ ہو کے رہے گا۔ اللہ اچھا کریں گے۔“ حاجی صاحب کی گردن روٹی کے گالے کی طرح لرز رہی تھی۔

”اپنے آپ سے نہ لڑو۔“ غلام مسکرا رہا تھا۔ ”جو کرنا ہے کر ڈالو۔ کر ڈالو۔“

”تم قید ہو جاؤ گے۔“ محمود چلا رہا تھا۔

”تمہیں ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہئے۔“ لالہ جی اسے گھور رہے تھے۔

دھمکی

آٹھ روز کے بعد ایلی لاہور شیشن پر بے تلی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔

شہزاد کی لڑکیوں نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ ہر حالت میں مل کا ساتھ دیں گی۔ انہیں غربت اور بھوک کی تکلیف کا تصور ہی نہ تھا۔

شہزاد کی تیوں بڑی لڑکیاں ہنسوڑ تھیں۔ وہ ہر بات پر ہنستی تھیں۔ ہنسنے چلی جاتی تھیں۔ بات بات پر ان کی مسرت میں یوں اہل آتا تھا۔ جیسے سوڈے میں نمک کی چٹکی ڈال دی ہو۔

سب سے بڑی صبیحہ تھی۔ اس کا چہرہ بے حد معصوم تھا۔ طبیعت میں بلا کی سلوکی تھی۔

لیکن ذہنی چمک نہ تھی۔ نفیسہ اس سے چھوٹی تھی اسکا رنگ سانولا تھا۔ وہ بے حد تیز اور ذہین تھی۔ لیکن بات بات پر ہنسنے میں وہ نفیسہ کی ساتھی تھی۔ تیسری جسمانی طور پر بھی صبیحہ اور

نفیسہ کی طرح رنگین نہ تھی۔ اسے مزاج پیدا کرنا نہیں آتا تھا۔ البتہ بہنوں کی دیکھا دیکھی اس

نے بھی بات بات پر ہنسا سیکھ لیا تھا۔ طے شدہ انتظامات کے مطابق شہزاد نے علی پور سے گردن

لڑکیوں سے ملنے جانا تھا اور پھر گورپتن سے محمود نے انہیں لاہور لے آتا تھا۔ جہاں سے ایلی

انہیں ڈیرہ لے جا رہا تھا۔ ڈیرہ میں ایلی نے خفیہ طور پر ایک الگ مکان ان کی رہائش کے لئے

کرایہ پر لے رکھا تھا۔

ایلی سخت گھبرایا ہوا تھا۔ مگر جب وہ لاہور پہنچے اور ایلی انہیں لے کر ڈیرہ کی گاڑی میں بیٹھ

گیا تو شہزاد کی لڑکیوں کی مسلسل ہنسی نے اس کا فکر دور کر دیا۔

ایلی حیران تھا۔ انہیں خطرے کا احساس ہی نہ تھا۔ شہزاد خاموش تھی۔ لیکن جب ایلی نے

خطرے کا ذکر کیا تو وہ ہنس پڑی۔ وہ بولی۔ ہمارا کوئی کیا بگاڑے گا۔ جہاں جی چاہے گا رہیں گے

جہاں نہیں جی چاہے گا نہیں رہیں گے۔ اب مزید بے عزتی برداشت نہ ہوئی تو چلی آئی۔ لڑکیاں

پیش سے آئی ہیں۔ واپس لینا چاہیے تو لے لے۔“

لیکن اگر اس نے چارہ جوئی کی تو۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہاں اگرے میں بھری پکھری میں جواب دوں گی اسے تم کیوں غم کھاتے ہو۔“ وہ بولی۔

انہیں ڈیرہ میں رہتے ہوئے دس روز ہو گئے۔ لیکن کوئی ایسا واقعہ نہ ہو جو باعث فکر ہو۔

مبارہویں دن محلے کے ایک بزرگ سکول میں آگئے اور ہیڈ ماسٹر کے توسط سے ایلی سے

ایلی کو یہ خیال بھی پیدا نہ ہوا کہ وہ شہزاد کے سلسلے میں آئے ہیں۔ ایلی انہیں اپنے گھر لے

لیجب انہوں نے گھر کو غور سے دیکھنا شروع کیا تو ایلی کا ماتھا ٹھنکا۔

کچھ دیر کے بعد انہوں نے ایلی سے بات کی۔

بولے۔ ”بھئی بات یہ ہے کہ مجھے شریف نے یہاں بھیجا ہے۔“

”شریف نے؟“

”ہاں۔“ وہ بولے۔ شاید تمہیں علم ہو گا کہ شہزاد اپنے تمام بچے لے کر چلی گئی ہے۔“

”چلی گئی ہے؟“ ایلی نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

”یہاں ہم صرف اس لئے آئے ہیں کہ تم سے کہیں کہ تم شہزاد کی مدد کرنا ورنہ خواہ مخواہ

نہیں بڑھ جائیں گی۔ چونکہ شریف کہتا ہے کہ وہ اس بارے میں سخت کارروائی کرے گا۔“

وہ بزرگ ایلی کو دھمکی دے کر چلے گئے۔

جب وہ شہزاد کے پاس گیا اور اس نے یہ قصہ بیان کیا تو وہ ہنس پڑی۔ ”اونہ۔“ وہ بولی ”سخت

الہائی کرنے والے دھمکیاں نہیں دیتے کر گزرتے ہیں۔“

بہر حال اس بزرگ کے آنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایلی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ڈیرہ نہیں رہیں گے

بلکہ روز ہی وہ ایک ماہ کی چھٹی لے کر جملہ لوگوں کو ساتھ لے کر امرتسر چلا گیا۔

بالن

اگر شریف چھٹی لے کر علی پور آگیا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے بنے بنائے گھر میں

نہیں آگئی ہے۔ اس کی بیوی اور بچے تمام اسے چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ تو اس میں ایک عجیب

بلال واقع ہوئی۔ وہ شریف جس نے کبھی محلے میں سر نہ اٹھایا تھا۔ جسے کسی نے اونچی آواز سے

نہ نہ سنا تھا۔ جس کی آواز تک کبھی محلے میں نہ گونجی تھی وہ شریف احاطے کے

نتیجہ یہ ہوا کہ شریف نے شہزاد کی بجائے نابالغ لڑکیوں کے اغوا کا مقدمہ دائر کر دیا۔ پھر نہ انہیں کہیں سے خبر مل گئی کہ ایلی امرتسر میں چھپا ہوا ہے۔ وہ سب لالٹیاں اٹھا کر امرتسر آ

ایلی جو نبی امرتسر پہنچا تو نہ جانے کیا ہوا۔ اس کے چہرے پر پھنسیں نکل آئیں اور پھر سب کہیں۔ ان میں سے پانی رسنے لگا۔ ایلی کو کسی اچھے ڈاکٹر کا پتہ نہ تھا۔ چونکہ امرتسر کا وہ علاقہ میں انہیں مکان ملا تھا۔ بالکل نیا تھا۔ جس سے ایلی واقف نہ تھا۔ لہذا اس نے گھر سے دور باب نہ سمجھا ان کے گھر کے قریب ہی ایک جراح کے دوکان تھی وہ جراح کی پاس چلا گیا۔ ”یہ کیا نکلا ہے مجھے۔“ اس نے جراح سے کہا۔

”یہ اگر بچہ ہے۔“ جراح نے کہا ”میرے پاس اس کا خاص علاج ہے۔“ جراح نے پرانے کا پڑا سا کھڑا جلایا اور جلی ہوئے کپڑے کو ان سوراخوں میں بھر دیا۔ جو ایلی کے منہ پر یوں کے پھونکنے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ ایلی نے آئینہ دیکھا۔ اس کی ہنسی نکل گئی۔ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سرکس کا کارٹون ہو۔

دوکان سے باہر نکلنے لگا تو اس نے دیکھا کہ محلے کے سات آٹھ افراد ہاتھوں میں لالٹیاں اڑ رہے ہیں۔

ایک ساعت کے لئے وہ ٹھٹھکا پھر پتھر بن کر کھڑا ہو گیا۔ قریب آ کر وہ رک گئے پھر ساتھ والے دوکان دار سے کہنے لگے ”شیخ عثمان صاحب آپ ارے محلے کا کوئی شخص تو نہیں دیکھا؟“

”نہیں تو۔“ عثمان نے جواب دیا۔ پھر وہ آگے کی طرف چل پڑے۔ نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ محلے والے اسے تلاش کر رہے تھے۔ اگر اس کا منہ نہ پھٹایا اس پہلی دجیاں نہ لگی ہوتیں تو نہ جانے کیا ہوتا۔

ایلی گھر پہنچا تو گھر کا نقشہ ہی اور تھا۔ وہ سب تاش کی گڈی سامنے رکھے بیٹھے ہوئے تھے۔ شفا رہی تھی۔ صبیحہ اور یحمانہ ہنس ہنس کر دوہری ہوتی جا رہی تھیں۔ اولیس چلا چلا کر نہ لیا اعلان کر رہا تھا۔ ناز تلیاں پیٹ رہی تھی۔ اور بیدی چپ چاپ کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ”گو اللہ کے بندو مجاہدو۔ کچھ خبر ہے۔ محلے والوں کے جتنے امرتسر کا چپہ چپہ چھان رہے ہیں تلاش کر رہے ہیں۔ وہ ہاتھوں میں لالٹیاں اٹھائے ہوئے ہیں۔“

میدان میں اکھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ منہ سے کف جاری تھا۔ وہ چلا رہا تھا۔ محلے والوں کے احساس خودداری کو لٹکار رہا تھا۔ لوگوں کو غصہ دلا رہا تھا۔ اپنی لٹی ہوئی دنیا کا واسطہ دے کر انہیں علی احمد کے گھرانے کی خلاف ابھار رہا تھا۔

شریف کی آواز سن کر محلے کی عورتیں کھڑکیوں میں آگئیں انہوں نے ہاتھ چلا کر شریف کی شرافت کو سراہا۔ جو ظلم اس پر ہوا تھا۔ اس میں رنگ بھر کر شہزاد کے قصے بیان کے اور شریف کو مزید ابھارا۔ اس محلے کے مرد اکٹھے ہو گئے۔ ”ان کا حقہ پانی بند کر دو۔“ کسی نے نعرو بلند کیا۔ ”بند کر دو بند کر دو۔“ وہ نعرو چاروں طرف گونجا۔

عورتوں نے علی احمد کے خاندان کے جملہ لوگوں پر لعنتیں بھیجتا شروع کر دیں۔ مردوں نے لٹھ اٹھا کر لہرائے نوجوانوں نے قسمیں کھائیں۔ ”محلے سے نکل جاؤ۔“ وہ چلائے ”نکل جاؤ۔“

گھر میں ہاجرہ فرحت سیدہ سب سسی بیٹھی تھیں۔ ان کے دروازے پر پتھروں کی بارش ہو رہی تھی۔ ان کے خلاف آوازے بلند ہو رہے تھے۔ لیکن علی احمد اطمینان سے گھر میں بیٹھے روز کا حساب کتاب لکھنے میں مصروف تھے۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ”میں کبھی ہوں یہ ایلی ہی کا کام ہے۔“ ایک بولی۔

”جو جو یہاں ہوتا رہا ہے اسے دیکھ کر ہماری تو آنکھیں پک گئی تھیں۔ گند بچا رکھا تھا اس اللہ کی بندی نے۔“

اعلانہ ملتے تھے وہ کیوں ملے۔ ”بالکل لیکن خاوند نے آنکھیں موند رکھیں تھیں۔ ہم کس منہ سے بات کرتے۔“ ”اے سچ پوچھو تو شریف کی شرافت نے جلتی پر تیل ڈالا۔ ورنہ انہیں اتنی جرات نہ ہوتی کبھی۔“

”وہ کہتے ہیں ناکہ گر باکشتن روج اول۔“ محلے کے اس طوفان نے خوفناک صورت اختیار کر لی۔ علی احمد اور ہاجرہ سے متعلقہ پہلا دشمنیاں جاگ اٹھیں۔ لوگ پرانے انتقام لینے پر آمادہ ہو گئے اور شریف کو خوفناک شور مچا دیئے گئے۔

”کیا مطلب؟“

”بہن تمہارے متعلق خبر اخباروں میں چھپ چکی ہے۔“

”خبرداروں میں؟“

”ہاں۔“ وہ بولا ”اور تم پر نابالغ لڑکیوں کے اغوا کا مقدمہ دائر ہو چکا ہے۔“

ایلی سخت گھبرا گیا۔

”اچھا ہوا تم یہاں آ گئے ہو۔“ شیخ نے کہا ”یہ میرا اپنا محلہ ہے انشاء اللہ تمہیں کوئی زک نہ پہنچے گی۔ میرے بھائی وکیل ہیں۔ چلو ان سے مشورہ کر لو۔“

شیخ رحمان ڈیرہ کے مدرسے میں ایلی کے ہم کار تھے۔ وہ ایک خاموش مزاج شخص تھے اور مدرسے میں اکثر ایلی سے ملا کرتے تھے۔ چپ چاپ ایلی کی باتیں سنا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ ایلی بھی ایک دوسرے سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔

پہلے دو ایک دن تو ایلی شیخ پر شک کرتا رہا۔ شاید یہ شخص ہمدرد بن کر ہمارا بھید لے رہا ہے۔

شاید شریف کا جاسوس ہو شاید۔ لیکن دو دن کے بعد اس کے شکوک رفع ہو گئے اور شک ان کے لئے صحرائیں نخلستان بن گیا۔

شیخ کے بھائی نے ایلی کو مشورہ دیا کہ شہزاد پھری میں جا کر حلیہ بیان درج کروا دے کہ وہ اپنی مرضی سے گھر سے آئی ہے اور اس کی بچیاں جن کی وہ جائز ولی ہے اس کے ساتھ رہتی ہیں۔

پھری کا نام سن کر ایلی کی روح فنا ہو گئی۔ شہزاد ہنس پڑی۔ ”تو اس میں کیا مشکل ہے۔“ وہ ایل۔ ”لو کھلی میں سر دینے والے کیا دھمکیوں سے ڈرتے ہیں۔“ اگلے روز ہی شہزاد نے شیخ کے گھر سے ایک برقعہ منگوایا اور وہ دونوں تانگے میں بیٹھ کر چل پڑے۔ وہ اپنا برقعہ نہیں پہننا چاہتی تھی تاکہ محلے والے اسے پہچان نہ لیں پھری سے کچھ فاصلہ پر ایک پرانا مقبرہ تھا۔ شہزاد نے وہاں ٹمک روکا اور ایلی کو اتار دیا۔ بولی ”جب تک میں نہ لونوں یہاں سے نہ ہلتا۔“ اور خود پھری کی طرف چل پڑی۔

مقبرے کے اندر ایک سپاہی نے اسے لٹاکا ”اے“ وہ بولا ”اوھر آؤ۔“

”جی۔“ ایلی پاس جا کر بولا۔

”کرنے دو تلاش۔“ شہزاد بولی۔ ”ڈھونڈ بھی لیا تو کریں گے کیا۔“

”مجھے ملے تھے۔ ابھی۔“ ایلی نے کہا۔

دفعۃً ان کی نگاہ ایلی کے چہرے پر منطف ہو گئی وہ سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ ”یہ کیا حلیہ بنایا ہے بچا جان۔“

”یہ حلیہ نہ بنا ہوتا تو وہ گھیسٹ کر لے گئے ہوتے۔“ ایلی بولا۔

لیکن وہ سب موقعہ کی نزاکت کو سمجھنے سے منکر تھے انہوں نے ایک اور موقعہ بلند کیا ایلی محسوس کرنے لگا جیسے وہ کسی زندہ تاج اور گنا گناپنی کا جو کر ہو۔

## صحرائیں نخلستان

اگلے روز بارہ بجے کے قریب دروازہ بجلا۔

”یا اللہ یہ کون ہے۔“ ایلی کا دل ڈوب گیا۔

”الیاس صاحب۔“ کسی نے آواز دی۔

ایلی گھبرا گیا۔

شہزاد اٹھ بیٹھی۔ ”میں دیکھتی ہوں کون ہے۔“

”نہ نہ نہ“ اس نے شہزاد کو روکا مگر وہ جا چکی تھی۔ کچھ دیر وہ دروازے میں کھڑی بنام کرتی رہی پھر آکر کہنے لگی ”کوئی ڈیرہ کا ٹیچر ہے کہا ہے میرا نام شیخ ہے تم سے ملنے آیا ہے۔“

”لیکن اسے ہمارے گھر کا علم کیسے ہوا۔“

”یہ نہیں مجھے معلوم۔“ وہ بولی۔

ایلی ڈرتا ڈرتا باہر نکلا۔

”اسلام علیکم۔“ شیخ اسے دیکھ کر چلایا۔ ”بہن بات یہ ہے کہ میں نے کل تمہیں دیکھا تھا

پہلے تو مجھے یقین نہ آیا کہ یہ تم ہو۔ پھر آج میں نے تمہیں پہچان لیا۔ اس لئے ملنے چلا آیا۔“

”لیکن تم یہاں کہاں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”بہن یہ ساتھ والا مکان میرا ہے۔ میں امرتسر کا رہنے والا ہوں نا آٹھ روز سے چھٹی پر ہوں

”شیخ صاحب کیا کسی اور کو بھی علم ہے کہ میں یہاں رہتا ہوں۔“

”بالکل نہیں۔“ وہ بولا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ میں معاملے کی اہمیت کو سمجھتا ہوں۔“



”جھگوڑے ہو تم۔“

”جی۔“ ایلی نے گھبرا کر جھگڑا کر دیا۔

”تم اس عورت کو بھگا کر لائے ہو نا جو ابھی ٹانگے سے تمہیں اتار کر مٹی ہے۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولا

سپاہی نے قہقہہ مارا۔ ”تم جھوٹ بولتے ہو معلوم ہوتا ہے تم نے اسے اغوا نہیں کیا۔

بلکہ وہ تمہیں اغوا کر کے لائی ہے۔“

”جی ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”ہمیشہ عورت ہی اغوا کر کے لاتی ہے۔ لیکن مجرم مرد گردانا

جاتا ہے اور سزا مرد کو ملتی ہے۔“

سپاہی نے پھر قہقہہ لگایا ”سچ کہتے ہو میاں۔“

وہ سپاہی ایلی کا دوست بن گیا۔

”وہ آکلی پکھری گئی ہے نا۔ بڑی جرات ہے اس میں۔“ سپاہی نے کہا۔

”ان سب میں بڑی جرات ہوتی ہے۔“ وہ بولا۔

وہ دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

شہزاد نے پکھری میں حلفیہ بیان درج کرایا۔ لیکن جب وہ باہر نکلی تو آصفی محلے کے ایک

جتنے نے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔ شہزاد یہ دیکھ کر پھر سے مجسٹریٹ کے کمرے میں داخل

ہو گئی۔ کہنے لگی۔

”مجھے دشمنوں سے خطرہ ہے۔ میری حفاظت کا انتظام کر دیجئے۔“ مجسٹریٹ نے وہ سپاہی

ساتھ کر دیئے۔ مقبرے پر جا کر وہ ٹانگے سے اتر گئی۔

محلے والے اس کا پیچھا کر رہے تھے وہ مقبرے میں آگئے۔ سپاہی نے باہر جا کر ان کا راستہ

روک لیا۔ ”کسے ڈھونڈ رہے ہو۔“ وہ بولا۔

”میں ایک عورت اتری تھی۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”وہ تو ادر گئی ہے۔“ سپاہی نے سڑک کی دوسری طرف اشارہ کیا اور وہ ادر چلے گئے۔

”آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔“ سپاہی بولا ”میں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔“

”ہم خود چلے جائیں گے۔“ شہزاد نے جواب دیا۔

”تو تو چلی جائے گی۔ لیکن یہ“ سپاہی نے ایلی کی طرف اشارہ کیا۔ ”جسے تو ساتھ لائی ہے۔“

”ایسوں کو ہی ساتھ لایا کرتے ہیں۔“ وہ بولی۔

### ارم پورہ

سپاہی نے قہقہہ لگایا ”بھئی واہ کیا جوڑی ہے۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

مینہ بھروہ امرتسر میں رہے۔ ایلی باہر نکلتا تو اس کے منہ پر دھجیوں کی سیاہ راکھ تھی ہوتی

اور اس نے اپنے گرد ایک کبیل لپیٹا ہوتا۔ بازاروں میں گھومتے ہوئے کئی بار اس نے محلے والوں

کے گروہ دیکھے تھے اور ڈر کی وجہ سے اس کا دل اچھل کر گلے میں آنا تھا۔ چار ایک بار وہ

پہری بھی گئے تھے لیکن حسب دستور ایلی کو شہزاد نے مقبرے میں چھپا دیا تھا۔

جب ایلی گھر آتا تو گویا نقشہ ہی بدل جاتا۔ وہیں پہنچ کر وہ محسوس کرتا جیسے وہ پلنگ پر آئے

اور ان کی زندگی میں خطرے یا مشکل کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ہو۔

سارا دن وہ بیٹھ کر تاش کھیلتے اور جو ہارتا اسے چور بتاتے۔ اس کے لئے انوکھی سزائیں تجویز

کرتے اور پھر قہقہے لگاتے۔ لڑکیاں ناچ ناچ کر چلتیں بات بات پر ہنستیں۔ مل کر گیت گنگنا تیں۔

بائیاں بجاتے وہ سب قطعی طور پر اس خطرے سے بے نیاز تھے۔ جو ان کے سر پر منڈلا رہا

ادھر شریف کے ساتھیوں نے سارا امرتسر چھان مارا۔ لیکن انہیں ایلی اور شہزاد کے چھپنے کی

کا علم نہ ہو سکا۔ شیخ نے ہر ممکن طریق سے ان کی مدد کی۔ ان کے بھائی نے انہیں قانونی

مدد دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شریف کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور پھر سے اس پر قنوطیت چھا گئی جو

ان کی طبیعت کا بنیادی جزو تھی اور ایک روز وہ چپکے سے روپوش ہو گیا۔ اس پر محلے والے بگڑ

۔ انہیں یہ شکایت تھی کہ جب خود شریف میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے تو ہم کیوں اس کی

دینا بھری دشمنی مول لیں۔ اس لئے وہ بھی میدان چھوڑ کر چلے گئے۔

محلے والوں نے ڈیرہ اخباروں میں جو خبریں ایلی کے متعلق پھیلوائی تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ

غور ڈر گیا تھا۔ سکول کو بدنامی سے بچانے کے لئے اس نے کوشش کر کے ایلی کا تبادلہ کرا

تجہ یہ ہوا کہ اس لمبی رخصت کے دوران ایلی ڈیرہ سے ارم پورہ تبدیل ہو گیا۔ یہ تبادلہ ایلی

کے نعمت غیر متوقعہ تھی۔

ارم پورہ بنیادی طور پر لاہور کے قریب ایک قصبہ تھا۔ لیکن لاہور شہر کے پھیلاؤ کے وجہ

بہ لاہور کی بستی کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اگر وہ ڈیرہ ہی میں مقیم رہتے تو ایلی اپنے

”جی مجھے نہیں علم۔“

”کیا آپ نے گزشتہ دنوں میں اخبار نہیں دیکھے۔“

”جی نہیں۔“

”کیوں۔“

”جی میں چھٹی پر تھا۔“

”آپ نے کس لئے چھٹی لی تھی؟“

”جی تفریح کے لئے۔“

”تو آپ نے کیسے تفریح کی؟“

”گھر بیٹا رہا۔ منہ ہاتھ نہیں دھویا۔ کوئی کام نہیں کیا۔ تاش کھیلا رہا۔“

”ہوں۔“ وہ بولے ”تاش کا کون سا کھیل کھیلتے رہے؟“

”جی چور سپاہی۔“

ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکی۔ لیکن انہوں نے ضبط سے کام لیا۔

”آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ پر اغوا کا الزام ہے۔“

”جی مجھے نہیں معلوم۔“ وہ بولا۔

”ہم جو آپ کو بتا رہے ہیں۔“ وہ غصے میں بولے۔

”کسی عدالت نے مجھے نہیں بتایا۔ بہر حال۔“

”تو آپ کو کوئی سمن نہیں ملا۔“

”جی نہیں۔“

”آپ کبھی میں حاضر نہیں ہوئے۔“

”جی نہیں۔“ ایللی نے کہا۔

”تو وہ خبریں کیوں چھپیں۔“

”جی مجھے معلوم نہیں۔“

”آپ کو علم ہونا چاہئے الیاس صاحب کہ اس خاتون کے شوہر نے مجھے سب باتیں کہیں۔“

”مکمل ہے۔“ وہ بولا ”مجھے اس کا علم نہیں۔“

مکان کو خفیہ نہ رکھ سکتا۔ لیکن لاہور میں اپنے مکان کی جائے وقوع کو سینہ راز میں رکھنا کچھ مشکل نہ تھا۔

اسی وجہ سے ایک ماہ کی رخصت کے بعد ایللی نوکری پر حاضر ہو گیا۔ اس نے ایسی جگہ مکان کرایہ پر لیا جو لاہور کی ایک اور بہتی تھی اور ارم پورہ کی متضاد سمت میں واقع تھی۔

اگرچہ طوفان گزر چکا تھا پھر بھی لکیر ابھی تازہ تھی۔ ایللی ڈرتا تھا کہ نہ جانے کب طوفان پھر سے چلنے لگے۔ اس لئے وہ بے حد محتاط تھا۔ اس کی یہ احتیاط اور اک کی وجہ سے نہیں بلکہ ڈر کی وجہ سے تھی۔ وہ بنیادی طور پر بے حد بزدل واقع ہوا تھا۔

وہ سب مقدمات جو شریف نے ان کے خلاف دائر کر رکھے تھے۔ عدم بیروی کی وجہ سے داخل دفتر ہو چکے تھے۔ لیکن جھگے میں ایللی کی بے حد بدنامی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ افسر اعلیٰ معروف صاحب نے ایللی کے والد کو خط لکھ کر متنبہ کر دیا تھا کہ ان حالات کے تحت وہ ایللی کی امداد کرنے سے قاصر ہیں۔

جب وہ پہلے روز ارم پورہ کے مدرسے میں حاضر ہوا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسے چارج دینے سے انکار کر دیا۔ بولے ”ہم نے آپ کا کیس ڈائریکٹر بہادر کو بھیج دیا ہے۔ جب تک وہ کوئی فیصلہ نہ کریں ہم آپ کو چارج نہیں دے سکتے۔“

چار ایک روز کے بعد ہیڈ ماسٹر نے ایللی کو بتایا کہ مسٹر معروف نے اسے انٹرویو کے لئے بلایا ہے لہذا اسے بڑے دفتر میں جانا چاہیے۔

### معروف اور راغب

مسٹر معروف سے ایللی کا وہ دوسرا انٹرویو تھا۔ چند ایک سال قبل جاوڑا میں وہ انکوائری کرنے آئے تھے اور ایللی اور مسٹر معروف کی بات چیت ہوئی تھی۔ آج پھر وہ مسٹر معروف کے روبرو حاضر تھا۔

مسٹر معروف نے ایک ساعت کے لئے بڑی سنجیدگی سے اسے گھورا۔ نہ جانے کیوں لیکن ایللی مسٹر معروف کو دیکھ کر محسوس کرتا تھا جیسے اس کے روبرو ایک خوش مذاق ریشیلی عورت بیٹھی ہو۔ اس کے دل میں ذرہ بھر خوف پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے خلاف اخباروں میں خبریں نکلی ہیں۔“ معروف بولے۔

رک دھنی ہوئی تھیں تاک یوں ابھری ہوئی تھی جیسے سمندر سے مونکے کی چٹان جھانک رہی  
ایلی نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ وہ معروف سے برعکس قسم کی شخصیت تھے۔  
”آمنی صاحب۔“ وہ بولے ”اگرچہ معروف صاحب نے آپ کو اجازت دے دی ہے۔  
میں نہیں چاہتا کہ آپ میرے سکول میں کام کریں۔“  
”معروف صاحب نے مجھے اجازت نہیں دی۔“ ایلی نے جواب دیا۔  
”کیا مطلب؟“ وہ بولے۔

”معروف صاحب نے فرمایا ہے کہ راغب صاحب کی مرضی کے بغیر ہم کچھ نہیں کریں۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن۔“ وہ رک گئے۔ ”اچھا مجھے اس کا علم نہ تھا۔“  
”معروف صاحب نے صاف کہہ دیا تھا۔“ ایلی نے کہا ”میں اجازت دینے والا کون ہوں کام  
بموجب نے لیتا ہے۔“

”خوب خوب۔“ وہ خوشی سے چلائے ”تو ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ آپ اس مدرسہ میں کام  
کریں گے۔“

”جیسے بھی آپ مناسب سمجھیں۔“ ایلی نے کہا۔  
”دیکھئے ناہم بدنام آدمی کو اپنے سکول میں نہیں رکھ سکتے۔ ہم اپنا ڈسپلن خراب نہیں کریں  
گے۔“

”جیسے آپ کی مرضی لیکن راغب صاحب بدنام آدمی ڈسپلن خراب نہیں کر سکتا۔“  
”آپ کا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ شرارت وہ لوگ کرتے ہیں جن پر شبہ نہ کیا جاسکے۔ یا جن کا اعمال نامہ  
مذکور ان پر حرف نہ آسکے۔ بدنام آدمی تو اپنا جائز تحفظ بھی نہیں کر سکتا۔ وہ تو کالج کے  
نالی طرح ہوتا ہے۔ ذرا ضرب لگی اور ٹوٹ گیا۔“

”ایلی آپ مجھے عقل سکھانے آئے ہیں۔“  
”ہی نہیں۔“ وہ بولا ”مجھ میں تو خود عقل نہیں میں کیا عقل سکھاؤں گا کسی کو۔“  
”کیا مطلب۔“ وہ چلائے۔

”میں عقل ہوتی تو کیا چھ بچوں کی والدہ کو اغوا کر لاتا۔“

”کیا آپ نے اس کی بیوی کو اغوا کیا ہے۔ وہ غصے میں بولے۔  
”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”آپ میرے روبرو جھوٹ بول رہے ہیں۔“  
”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو پھر کوائف کیا ہیں؟“ جج جج بتائیے ورنہ میں سخت کارروائی کروں گا۔“  
”جی حقیقت یہ ہے کہ اس کی بیوی نے مجھے اغوا کیا ہے۔“

معروف صاحب کی ہنسی نکل گئی۔  
”آپ عجیب آدمی ہیں۔“ وہ بولے۔

”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”میں ایک عام آدمی ہوں۔“  
”لیکن آپ ابھی کہہ رہے تھے۔“ معروف صاحب پھر سنجیدہ ہو گئے۔ ”کہ آپ چھٹیوں  
میں تاش کھیلتے رہے۔“

”جج عرض کیا ہے میں نے۔“  
”کس سے تاش کھیلتے رہے۔“

”جی ان سے جنہوں نے مجھے اغوا کیا ہے۔“  
”وہ کون کون ہیں۔“

”جی چھ بچے اور ان کی ماں۔“  
”تو کیا یہ سچ ہے کہ وہ چھ بچوں کی ماں ہے۔“

”جی ہاں۔“

”آپ عجیب بے وقوف ہیں۔ اگر اغوا ہی کرنا تھا تو کسی لڑکی کو کرتے خواہ مخواہ آپ نے  
اتنے بڑی کتبہ کا بوجھ اٹھالیا۔“

”جی کوئی لڑکی مجھے اغواء کرنے کو تیار نہ تھی۔ سوائے اس چھ بچوں کی ماں کے۔“  
”شٹ اپ۔“ معروف نیم غصے نیم مذاق سے بولے۔ ”جا کر چارج لیجئے اور یاد رکھئے۔ اگر  
پھر آپ کی رپورٹ آئی تو آپ کو سہڑ کر دوں گا۔“

معروف کے بعد ارم پورے کے ہیڈ ماسٹر راغب صاحب نے اسے اپنے دفتر میں بلا لیا۔  
راغب صاحب ایک دبلے پتلے جلعے آدمی تھے۔ ان کا چہرہ لمبا تھا مگر کتابی نہیں تھا۔ آنکھیں

”جی ہے۔“

”ارے۔“ وہ چلائے ”کیا واقعی؟“

”تو کیا جو خبریں آپ کے متعلق چھپی تھیں وہ درست ہیں۔“ ایک صاحب نے پوچھا۔

”بالکل۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”وہ جیت سے ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کہیں دو  
بہتر رہے تھے۔ دو ایک تحسین بھری نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے۔“

”تو آپ نے چھ بچوں کی ماں کو اغوا کر لیا۔“ ایک نے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔

”ہائیں۔ ابھی تو آپ کہہ رہے تھے۔“

”خبر تو سچی ہے مگر انداز بیان میں کچھ غلطی رہ گئی ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”کیا؟“

”یہ کہ چھ بچوں کی ماں نے مجھے اغوا کر لیا ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”جی ہی ہی ہی۔“ ایک قہقہہ بلند ہوا۔

ایلی اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کسی بات پر لوگ قہقہہ مار کر ہنس لیں تو بات اپنی سنگینی کھو

اے۔ اس لئے اس نے اس موضوع پر ایک لیکچر دینا شروع کر دیا کتنے لگا ”بھائی مردوں کی

مردوں کی قوم ہمیشہ ظلم کرتی آئی ہے۔ وہ ہمیشہ مردوں کو اغوا کرتی رہیں اور نام بدنام ہوتا

ہے۔ مرد کو مجرم گردانا جاتا رہا۔ مرد جیل جاتا رہا مرد قید کانتا رہا مرد۔ معلوم ہوتا ہے۔

رات ہند کی اغواء کی دفعہ لکھتے وقت مصنف کی بیوی بھی پاس بیٹھی تھی۔ اس ظالم نے ساری

غلط لکھوا دی۔“

”اور عورت کی بات کرتے وقت ایلی یوں محسوس کیا کرتا تھا۔ جیسے بطخ خشکی سے اتر کر پانی

پا پھینکتی ہو۔“

پچھلے روز ہی جملہ اساتذہ کو ایلی سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اور وہ اس کے دوست بن گئے۔

”کی تفریح کی کھنی بجتی اور ایلی کو لے کر کسی مقام پر جا بیٹھتے اور اسے چھیڑ کر اس کی باتیں

کرتے دور دور سے اسے دیکھتے اور مسکراتے اور ہیڈ ماسٹر اسے معروف کا آدمی سمجھ کر اس

اتفاق سے پیش آتے۔“

”تو کیا یہ سچ ہے؟“ وہ بولے۔

”ہاں جی اور یہی میری بے وقوفی کی دلیل ہے۔“

راغب صاحب بوکھلا گئے۔

اگلے روز راغب صاحب نے معروف صاحب سے احکامات کی وضاحت کی درخواست

کرتے ہوئے ٹیلی فون پر انہیں بتایا کہ الیاس آصفی کے بیان کے مطابق انہیں اس بات کا حق دیا

گیا تھا کہ اس امر کا فیصلہ کریں کہ آیا ارم پورہ کے سکول میں الیاس کام کرتے ہیں یا نہیں۔

معروف فوراً بھانپ گئے کہ وہ بات جو انہیں کہنی چاہیے تھی۔ ایلی نے از خود راغب سے

کہہ دی ہے۔ اس بات پر وہ بے حد مسرور ہوئے اور بولے۔ ”یہ ٹھیک ہے راغب لیکن ہمارا

مشورہ ہے کہ آپ الیاس کو اپنے پاس رکھنے پر رضا مندی دے دیں وہ ایک قابل شخص ہے۔

آپ کو کام سے تعلق ہے ناعورتوں کے اغوا سے تو نہیں۔“

نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی نے ارم پورہ میں کام شروع کر دیا۔

## جھوٹ سچ

ایلی نے زندگی میں نئی بات سیکھی تھی۔ وہ سچ کے ذریعے جھوٹ بولتا تھا۔ اس نے تجربے کے

زور پر اس حقیقت کو پایا تھا کہ سچی بات کہہ دی جائے تو سننے والا حیران رہ جاتا ہے۔ اس کے دل

میں نفرت کی بجائی دلچسپی اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور کبھی کبھار احترام بھی۔ اس کے علاوہ کتنے

والے کے دل پر بوجھ نہیں رہتا۔ اور بات کہہ دی جائے تو وہ پھوڑا نہیں بنتی۔ اس میں ہنپ

نہیں پڑتی۔ اکثر اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ سچی بات کو اعلانیہ تسلیم کر لیا جائے تو لوگ سمجھتے ہیں

کہ مذاق کر رہا ہے انہیں یقین ہی نہیں آتا۔ شاید ایلی نے یہ انوکھا طریقہ شنوار سے سیکھا ہو۔

بہر صورت جب اساتذہ اس سے ملے تو اخباری خبروں کی بات چھڑائی۔ ایک صاحب ”خبر“

بولے۔ ”جی ان اخبار والوں کا کیا ہے۔ جو جی چاہتا ہے انہیں شاپ لکھ دیتے ہیں۔ سچ تو ہوتا

ہی لکھتے ہیں۔“ کیوں الیاس صاحب۔“

”پنا تجربہ تو مختلف ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ ایک اور صاحب بولے۔

”مطلب یہ ہے کہ میرے متعلق آج تک صرف ایک خبر چھاپی ہے انہوں نے اور وہ سولہ

ہو چنی کٹ ڈالیں گے۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑتیں۔

ان کی زندگی میں ایک مشکل تھی۔ جو روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

ایلی کی تنخواہ صرف ستائیس روپے تھی۔ ایلی اس زمانے میں جوان ہوا تھا۔ جب پہلی عالمی جنگ کے اثرات رونما ہوئے تھے اور دنیا بھر میں مالی بحران کا دور دورہ تھا۔ بنیادی طور پر ایک ریسرچٹ کا گریڈ اسی روپے سے شروع ہوتا تھا۔ لیکن ایلی بحران کی وجہ سے گورنمنٹ کے ایجنسی کی تنخواہوں میں تخفیف کر دی گئی تھی اور اسی (۸۰) کی جگہ اب پینسٹ روپے کا گریڈ کر دیا گیا تھا۔ لیکن پینسٹ روپے کے گریڈ پر ملازم رکھا جائے اور پینسٹ روپے ایم اے بی بی ایچے جائیں۔ اس لئے ایلی کی تنخواہ پینتالیس روپے سے شروع ہوئی تھی۔ اور اب وہ اس روپے پر رہا تھا۔ ستائیس روپے اتنے بڑے کنبے کے لئے بے حد ناکافی تھے۔ خصوصاً ایلیا کی جو مالی مشکلات کے تصور سے ہی بیگانہ تھا۔

ان کے پاس جو اثاثہ تھا وہ ختم ہو چکا تھا اور اب وہ شدت سے مالی مشکلات کو محسوس لے گئے تھے۔ اس امر کو صرف ایلی ہی محسوس کرتا تھا۔ لڑکیاں اس بات سے بے نیاز واقع نہیں۔ روایتی ملکہ کی طرح وہ سوچتی تھیں کہ غریبوں کو اگر کھانے کو روٹی نہیں ملتی تو وہ اپنی بیوی کیوں نہیں کھاتے۔

بہرحال یہ امر مسلمہ تھا کہ اگر مالی مشکلات کا احساس ان کے گھر میں صدر دروازہ سے داخل ہوا تھا۔ تو عقبی دروازے سے ضرور داخل ہو رہا تھا۔ لاشعوری طور پر جانے بغیر ان کی زندگی ان جلدی تنگی بڑھنے لگی تھی۔

ایلیا ہاں

لاہور میں صرف ایک آدمی تھا۔ جو ان کے مکان سے واقف تھا۔ وہ تھا محمود کبھی کبھار محمود تھاکر ایلی کو میم کی باتیں سناتا اور کالج کے قصے بیان کرتا۔ محمود سترھواں لے پالک ہونے لگا۔ محمود گھر میں یوں رہتا تھا۔ جیسے الف لیلیٰ میں شہزادیوں کے جھرمٹ میں سلطان رہتے۔ ان کو بلانے پر حبشی جلا دہاتھ میں تلووار اٹھائے حاضر ہو جاتا۔ لیکن کبھی کبھار ایلی کو شک پڑتا کہ وہ میں بھی ایک ایلی چھپا ہوا ہے۔ جو ماسٹا بھری گود میں لینے کے لئے بلکتا ہے۔ جسے یہ کہہ کوئی اس کی دیکھ بھال کرے۔ اس کی ناک پونچھے منہ دھوئے اور پھر پیار سے جھڑک کر

آٹھ بچے

سکول میں ہیرو بن کر گھومنے کے بعد وہ سائیکل اٹھا کر چوروں کی طرح گھر کی طرف چل پڑتا۔ جان بوجھ کر لمبے راستے سے گھر جاتا تاکہ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ وہ ریتا کمال ہے کوئی اس کے گھر کا پتہ پوچھتا تو صاف کہہ دیتا ”بھائی گھر کا پتہ نہ پوچھو اور کوئی خدمت متاؤ جو انوار کرتے ہیں وہ گھر کا پتہ مینہ راز میں رکھتے ہیں۔“

گھر پہنچتا تو وہ گھر کے ہنگامے میں کھو جاتا۔

گھر میں وہ آٹھ بچے تھے۔ کبھی کسی نے محسوس نہیں کیا تھا کہ گھر میں کوئی بڑا بھی ہے۔ بڑا گھر میں کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ ماں کیا بڑی بن سکتی ہے۔ جو چھ بچے ساتھ لے کر گھر سے بھاگ آئی ہو۔ وہ مرد کیا بڑا بن سکتا ہے۔ جو چھ بچوں کی ماں کو انوار کر لایا ہو۔ ان حالات میں جو تھوڑی بہت بزرگی اور بڑائی شہزاد اور ایلی میں تھی۔ وہ بھی خارج ہو چکی تھی۔ کس منہ سے وہ عقل و ادراک اخلاق یا سنجیدگی کا ڈھونگ رچاتے اور پھر ان بچیوں کے رویہ جو جوان تھیں۔ صبیحہ تیرہ سال کی تھی۔ نفیسہ بارہ کی اور ریحانہ نو سال کی البتہ ایک بات ضرور تھی۔ شہزاد اور ایلی نے کبھی بڑائی ہاتھ سے جلنے پر افسوس محسوس نہ کیا تھا۔

اگر شہزاد کبھی کبھار لڑکیوں کے شور سے تنگ آجاتی اور چلا کر کہتی ”اے لڑکیو سنی ہو۔“

”امی۔“ نفیسہ ہنستی ”ذرا زور سے بولو تو کچھ سنائی بھی دے۔“

”کانوں میں تیل ڈالا ہوا ہے کیا؟“

”تیل تو نہیں۔“ صبیحہ کہتی۔ ”کانوں پر صرف بل ڈالے ہوئے ہیں۔“

”تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”دل تو اچھا ہے نا امی۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنستیں۔

پھر وہ سب جھرمٹ ڈال امی کے گرد اکھڑی ہوتیں اور ناچتیں گاتیں ہنستیں۔ ایلی کہتا۔

”شور نہ مچاؤ۔ اگر کسی کو ہمارے گھر کا پتہ چل گیا تو۔“

”تو کیا۔“ وہ جواب دیتیں۔ ”یہی ناکہ وہ چٹھی لکھ دے گا ہمیں اور چٹھی رساں چٹھی لے

آئے گا اور ہم پڑھ لیں گے۔“

”اور اگر کسی نے آکر تمہیں چوٹی سے پکڑ لیا تو۔“ ایلی چلاتا۔

سکول بھیج دے ایلی جذباتی طور پر ڈرا ہوا بچہ تھا اور ذہنی طور پر ایک نڈر مفکر۔

ایک روز وہ سب بیٹھے تھے تو محمود آگیا۔ اس کے ساتھ ساری میں لپٹی ہوئی ایک گوری چن عورت تھی۔ جسے اس نے اندر بھجوا دیا۔

”ارے یہ کون ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”یہ بھی ہے۔“ محمود بولا۔

”کوئی نئی پھنسی ہے؟“

پھنسی ہی رہتی ہیں۔ اب ایک کام کرو۔“ محمود بولا۔  
”کیا؟“

”ایک مولوی بلوا دو۔“

”بھئی نکاح پڑھوانا ہے۔“

”اور وہ میم کیا ہوئی؟“

ایلی اوھر اوھر بھاگ دوڑ کر ایک مولوی لے آیا۔

مولوی صاحب پہلے تو محمود کو کٹے پڑھاتے رہے۔ پھر جب ایجاب و قبول کا وقت آیا۔ تو

مولوی صاحب نے کہا۔ ”کیا آپ کو محمود ولد احمد سکھ رام پور کی زوجیت میں آنا قبول ہے؟“

وہ خاتون بولی ”ہام کو منبڑ ہے۔“

اس پر لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

ایلی نے حیرت سے خاتون کی طرف دیکھا۔ ”ارے آپ تو میم ہیں۔“ وہ بولا۔

میم نے کہا ”ڈول ہاں“ ہے میم ناہیں۔“

مولوی کی جانے کے بعد ایلی کے گھر میں ہنگامہ مچ گیا۔ لڑکیاں میم کے ساگ لگنے لگیں۔

اسے چھیڑنے لگیں۔ میم نے جارہی تھی۔ محمود مسکرا رہا تھا۔ شہزاد کی آنکھوں میں سرت کی پھوپھا پڑ رہی تھی۔

محمود اور میم کے نکاح کے چند روز بعد محمود بھاگا بھاگا ایلی کے پاس آیا۔ ”ایلی۔“ وہ بولا

”وہ نہیں آئی!“

”کون نہیں آئی۔“ ایلی نے پوچھا۔

”آج دیک اندھ ہے۔“ وہ بولا ”ہر دیک اندھ پر وہ آیا کرتی ہے۔ بلا ناٹھ لیکن اب کی بار نہیں

ایلی نے قہقہہ لگایا ”تم تو پاگل ہو۔“ وہ بولا ”خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو جیسے وہ بچی ہو۔“  
”تم نہیں جانتے۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”واقعی وہ بچی ہے۔“

”بچی ہے۔“ ایلی ہنسا۔

”ہاں۔“ محمود نے کہا یہ سب بچیاں ہوتی ہیں۔ ان کی عمر نہ دیکھو شکل نہ دیکھو صورت نہ

یہ سب بچیاں ہوتی ہیں اور جہی تک ٹھیک رہتی ہیں جب تک ان پر بچی حاوی رہے۔“

ن گھبرائے مسکایا بات ہے۔“ ایلی بولا ”گھبرانے کی بات تو ہے۔“ محمود نے کہا ”وہ آئی جو

مجھے سمجھ میں نہیں آئی بات۔“

کھین

مجھے بھی نہیں آئی تا! محمود نے کہا ”میرا دل کہہ رہا ہے کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔“

دو روز محمود میم کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہ آئی۔ وہ پھر وہ نئے شرچلا گیا۔ وہاں جا کر اپنا

ٹاہر کھنے بغیر اس نے حالات کا جائزہ لیا معلوم ہوا کہ وہاں موجود نہیں۔ اس پر وہ گھبرا گیا۔

مزید پوچھ گچھ پر اسے معلوم ہوا کہ ایک صاحب اسے ساتھ لے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ

کچھ علم نہ ہو سکا۔

لاہور واپس آکر وہ سیدھا ایلی کے پاس آیا۔ ”غضب ہو گیا۔“ وہ بولا۔ ”وہ نئی شہر میں بھی

ہے۔ کہتے ہیں کوئی گورا صاحب اسے آکر لے گیا ہے۔“

”کیا زبردستی لے گیا ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”جی۔“ وہ بولا ”اسے کوئی زبردستی لے جائے تو اس کے لئے اس سے بڑھ کر رو مینس

ناہیں ہو سکتا۔ یہ سبھی ایسی ہوتی ہیں۔ پہلے روتی ہیں۔ چیختی ہیں چلاتی ہیں پھر غم سے

لو ہو کر لے جانے والے سے چٹ جاتی ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔“

”کس کی بات کر رہے ہو۔“ ایلی نے پوچھا۔

”گورڈ خاموش رہا۔“ ”کیا میموں کی بات کر رہے ہو۔“ ایلی نے پھر پوچھا۔

”گوگوں“ وہ بولا ”عورت عورت ہمیشہ عورت رہتی ہے۔ چاہے وہ میم ہو دکی ہو یا جہنم ہو۔“

”کیا عمر ہوگی؟“

”بہوڑھا ہے۔ لیکن سخت زانی ہے اور شرابی بھی۔“

”ایک بات بتاؤں بابا۔“ ایلی نے کہا اور پھر قدرے توقف کے بعد اس نے چوکیدار سے

”تمہارا صاحب ایک مسلمان عورت کو بھگا لایا ہے۔ نئے شرے۔“

”نہ باہو۔“ وہ بولا ”میں اپنی دیکھی عورت کبھی نہیں آئی یہاں تو میںیں آتی ہیں۔ جوان

می اوجیز سبھی آتی ہیں۔“

”لیکن بابا۔“ ایلی نے کہا ”وہ ہے تو میم مکر مسلمان میم ہے۔“

”یہاں قلعہ مار کر ہٹا۔“

”سچ کہتا ہوں بابا۔“ ایلی نے کہا۔

”نہ بھی۔“ وہ بولا ”میم مسلمان نہیں ہوتی۔ ان میوں کا اسلام سے کیا واسطہ۔“

ایلی نے بابا کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کے ذہن میں میم کا مسلمان ہونا ممکن ہی نہ

اس لئے ایلی کی تجویز ناکام ہو گئی۔

”اچھا۔“ وہ بولا ”بابا ایک کام تو کرو مجھے اس میم کے سامنے لے چلو۔ جو اس وقت صاحب

لے گھر میں ہے۔“

”اونہوں۔“ بابا نے جواب دیا۔ ”گھر میں جانے کی کسی کو اجازت نہیں۔“

”تو چلو باہر سے ہی جھانکوں گا۔“

بابا کو یہ بات بھی منظور نہ تھی۔ بولا ”نہ باہو وہ دیکھ لے یا اسے پتہ چل جائے تو کھا جائے

”ایسا سخت ہے ہو۔“

بہر حال ایلی نے کوٹھی کے باہر دو ایک چار لگائے کوٹھی چاروں طرف سے بند تھی۔ اس

نے کھڑکیوں کے شیشوں سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن اندر دیر پر دے لگ رہے تھے۔

ابھی وہ وہیں کھڑا تھا کہ خاندان کا لڑکا آگیا۔

وہ ایلی کو گھورنے لگا۔

ایلی نے اس سے پوچھا ”کوٹھی میں کوئی ہے کیا؟“

کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

محمود کی بات صحیح نکلی چند ہی دنوں کے بعد اسے ایک خط موصول ہوا جس میں درج تھا۔

”مجھے اچھی سے معلوم ہے کہ تم غنڈوں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتے ہو اور تم نے ایک

برٹش بیٹش خاتون کو عرصہ دراز سے اغوا کر رکھا ہے اور تم نے اسے زبردستی مسلمان کرنے کی

کوشش کی ہے اور دھوکے سے اس کے ساتھ عقد کیا ہے۔ حالانکہ تعزیرات ہند کے تحت

کوئی ہندوستانی کسی برٹش بیٹش خاتون سے شادی نہیں کر سکتا۔ جب تک خاص اجازت ہند

حاصل نہ کرے لہذا تم اور تمہارے دوست دھوکہ دہی اور اغواء کے مرتکب ہوئے ہو اور میں

تمہارے خلاف قانونی چارہ جوئی سے گریز نہیں کروں گا اور اگر تم نے اس خاتون سے دوبارہ ملنے

کی سعی کی تو اپنے اختیارات کو کام میں لا کر میں تمہیں کیفر کروا تک پہنچاؤں گا۔

خط کے نیچے لپے چوڑے دستخط کئے ہوئے تھے۔ نیچے لکھا تھا کیشنر بیجاپور

”ارے۔“ ایلی چلایا ”یہ تو کوئی کیشنر ہے۔“

”یہی تو مصیبت ہے۔“ محمود بولا ”وہ اسے اغوا کر کے لے گیا ہے۔ اس کی مدت سے آرزو

تھی کہ کوئی اسے زبردستی اغوا کر کے لے جائے پھر جب تم ان سب کو لے آئے اور اس نے یہ

قصہ سنا تو گویا جلتی پر تیل پڑ گیا وہ بھی بھڑک اٹھی۔ اس کی یہ خواہش اور بھی چلی اور اب ’ب

یہ ڈار ٹنگینیں نہ جانے اسے کہاں سے مل گیا ہے۔“

محمود سخت گھبرایا ہوا تھا۔

محمود کے کہنے پر ایلی بیجاپور گیا۔ تاکہ وہاں سے کوائف حاصل کرے۔ پہلے تو وہ شر

کا جائزہ لینے میں مصروف رہا۔ پھر اس نے کیشنر کی کوٹھی کا پتہ لگایا اور وہاں پہنچ کر باہر انتظار کرنا

رہا کہ کب کیشنر دفتر جائے تو کوٹھی کے کسی نوکر سے ملے آخر کیشنر کی کار کوٹھی سے باہر نکلے۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ کوٹھی کے آؤٹ ہاؤس کی طرف گیا اور چوکیدار سے ملا۔ چوکیدار

ایک بوڑھا مسلمان تھا۔ اسے دیکھ کر ایلی کی امید بندھ گئی۔ اس نے چوکیدار کو پانچ روپے تمنا

دیئے۔ ”بابا یہ صاحب کس قسم کا آدمی ہے؟“

”توبہ ہے“ بابا نے جواب دیا۔ ”یہ صاحب تو سمجھ کر لو آفت ہے آفت۔“

”کیا سخت مزاج ہے۔“

”اونہوں بابا یہ تو بد ہے بد۔ سارا دن بیٹھ کر شراب پیتا ہے۔ سارا دن۔“





گرد جھڑٹ لگا لیا۔ نفیدہ ٹپچنے لگی۔ صبیحہ کا رہی تھی۔ وہ سب مل کر انہیں چھیڑ رہے تھے۔  
جی کر رہے تھے۔ ان سے مذاق کر رہے تھے۔

اس واقعہ کو ایک سال گزر گیا۔ اب وہ قطعی طور پر آزاد تھے۔ اب انہیں چھپ کر رہنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ سکول میں لوگ بھول چکے تھے کہ ایل کی متعلق اخبارات میں خبریں مچھی تھیں۔ مشر معروف کو یہ امر یاد نہ رہا تھا کہ اس کے خلاف خطوط موصول ہوتے رہے تھے۔ محلے والوں کے دلوں میں ان کے لئے نفرت نہ رہی تھی ایک دو شریف کے رشتہ دار تھے جو ایل کا نام سن کر تیوری چڑھاتے یا نفرت سے منہ پھیر لیتے باقی لوگوں کو ان کے ساتھ کوئی تعلق نہ رہا تھا۔

### روابن الوقت

پھر ایک روز ان کے ہاں علی احمد آگئے۔ شہزاد کے آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ علی احمد ان کے ہاں آئے تھے۔ آتے ہی انہوں نے شور مچا دیا۔ کیوں بھی شہزاد کوئی حقہ وقت بھرو کوئی چائے دے پلاؤ۔ مہمان آئے ہیں۔ ایل اور شہزاد علی احمد کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ ”میں نے کہا۔“ وہ بولے۔ ”جب تو ہم سے آنکھ بھی نہیں ملاتی تھی۔ اب بولو۔“ شہزاد ہنسنے لگی۔ ”اب انتہی ہے۔ جب دیکھ کر تیوری چڑھاتی تھی۔“

”جب کی بات جب کے ساتھ۔“ وہ بولی۔ ”اب کی اب کے ساتھ۔“

”تو تم ابن الوقت ہو۔“ علی احمد نے قہقہہ لگایا ”کہ جب اور اب کا خیال رکھتی ہو۔“

”آپ بھی تو ہیں ابن الوقت۔“ وہ چلانے لگی۔

”وہ کس طرح۔“ علی احمد نے پوچھا۔

”جب آپ کی نگاہ اور ہوتی تھی اب اور ہے۔“

”ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسے۔ ”تو تم نگاہ کو پہچانتی ہو۔ ہی ہی ہی۔ لیکن ہمارے کمال کی جگہ دو دو نا بھی موقع اور محل سمجھتے ہیں کیا کہتی ہے۔“

پھر وہ لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”بائی بائی۔“ وہ چلانے لگے۔ ”یہ تو سب جوان ہو گئی ہیں۔ عورت نے دنیا میں دھاندلی مچا رکھی ہے۔“

”وہ کیسے؟“ شہزاد بولی۔

اس دولت کو پا کر وہ اپنے پرانے کوئے میں کھس گیا اور اس نے اپنی طبعی قنوطیت کا لبہ لاڑھ لیا۔

غم خور کے لئے سب سے بڑی ضرورت ایک ایسے ساتھی کی ہوتی ہے جس سے اظہارِ غم کیا جاسکے اور اپنی محرومیت اور زمانے کے مظالم کا رونا روایا جاسکے اس لئے شریف نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی پرانی زندگی کو یکسر بھول جائے گا اور ایک نیا ورق الٹے گا۔ یہ نیا ورق ایک نئی شادی اور نئی بیوی تھی۔ لیکن ایسی بات اپنے منہ سے کہہ دینا یا شعوری طور پر اس پر سوچنا ایک غم خور کے لئے ممکن نہ تھا۔ لہذا اس نے جلد ہی ایسے حالات پیدا کر لئے کہ اس کی ہمیشہ نے یہی تجویز بھائی کے سامنے پیش کر دی اس پر وہ حیرت سے بہن کا منہ ٹکٹنے لگا ”یہ تم کہہ رہی ہو حمیدی۔“ اس نے ملامت سے بہن کی طرف دیکھا اور مجبور ہو کر بہن کی بات مان لی شادی کے روز وہ بہت رویا جیسے اسے اپنی طبیعت کے خلاف کسی بات پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حمیدی نے نیاز مرحومہ کی بڑی بیٹی رشیدہ بانو سے شریف کا بیاہ کر دیا۔ رشیدہ کے لواحقین کو یہ ڈر تھا کہ کہیں شریف کی بیوی شہزاد اپنے چھ بالکوں کو لے کر پھر سے شریف کے گھر نہ آجائے اس لئے انہوں نے صاف کہہ دیا کہ شہزاد کو طلاق دے دو تو مناسب ہے۔ شریف اعلانِ شہزاد کو طلاق دینے کے حق میں نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شہزاد قانونی طور پر آزاد نہ ہو سکے۔ اس لئے اس نے چوری چوری طلاق نامے پر دستخط کر دیئے اور اس بات کو مخفی رکھا۔

شریف کے گھر ایک نئی بیوی آگئی۔ جس کے سامنے وہ صبح و شام اپنی مظلومیت کا قصہ بیان کر سکتا تھا۔ آپس بھر سکتا تھا۔ چھت کو ٹٹنگی باندھ کر دیکھ سکتا تھا گویا مینڈک کو پھر بچہ بھرا کنارہ مل گیا اور وہ پھر سے اپنے آسٹیاں میں آ بیٹھا۔

محض اتفاق سے اس خفیہ طلاق کی خبر ایل اور شہزاد تک پہنچ گئی۔ اس روز وہ یوں محسوس کر رہے تھے۔ جیسے انہوں نے ایک دوسرے کو پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ جیسے وہ از سر نو عشق میں گرفتار ہو گئے ہوں۔ اگرچہ جہاں تک ظاہر کا تعلق تھا۔ وہ دونوں سمجھتے تھے کہ یہ قانونی نقطہ ایک بے معنی بات ہے۔ وہ دونوں تو عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود وہ بے حد خوش تھے اور ساتھ ہی اس خوشی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

جب وہ دونوں ایک بوڑھے مولوی کے سامنے بیٹھے تو ایل کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ شہزاد پھر سے مونگیا گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ پھر جب وہ گھر واپس پہنچے تو لڑکیوں نے ان کے

”شرط یہ ہے کہ شریف سب کے دروہو قسم کھا کر کہے کہ میں پورے عزم اور استقام سے اس معاملے کی پیروی کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”دیکھو نا شریف ایک سلاوہو قسم کا آدمی ہے اسے دنیا سے لگاؤ نہیں کسی سے دشمنی اس کے دل میں نہیں۔ اس کا کیا ہے کل اس جھگڑے کو چھوڑ

پھر ہسپتال کا ہیٹل اس کے رو برو کھڑا تھا۔ مردہ بچے کی لاش لے جاؤ۔ ”وہ کہہ رہا تھا۔  
 لاش ایلی سوچنے لگا۔ لاش کو کہاں لے جاؤں۔ کیا کروں۔ لاش!!  
 ہیٹل اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ ”ابھی لے جاؤ۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اسی وقت۔ اٹھانے والا ہے  
 ایلی حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔

ملو بند

شہزاد ہسپتال سے واپس آئی تو ایلی اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ یہ وہ شہزاد نہیں تھی۔ جس سے وہ  
 نفرت کرتی تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی شہزاد تھی۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ گل بری طرح چمک  
 رہا تھا۔ ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ ماتھے کا قتل گویا گل ہو گیا تھا۔ اس میں وہ روشنی نہ رہی تھی۔  
 کسی نے دھپ بجا کر اس کی گزشتہ روشنی کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اسے ان طاقوں پر رکھ  
 دیا۔ آنکھوں میں چمک باقی تھی۔ لیکن اس چمک میں باہر کی دھند لکا شامل ہو گیا تھا۔ ناک  
 رات آئی تھی۔ ہونٹ گویا بھینچ گئے تھے۔ دانت نکل آئے تھے۔

اسے ڈسچارج کرتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا تھا اسے اچھی غذا کی ضرورت ہے اچھی غذا اور  
 ٹیم لیکن جب وہ گھر پہنچی تھی تو ان کے ہاں کچھ آٹا اور تھوڑی سی دال کے علاوہ کچھ نہ تھا۔  
 ان کی غربت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ سر پر قرض کا طوار کھڑا ہو گیا تھا۔ بے ادراک کرنے  
 کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن اس سے بڑی مشکل یہ تھی کہ قرض حاصل کرنے کے مزید  
 اثبات بالکل ختم ہو چکے تھے۔

لاہور میں ایلی کے ماموں زاد بھائیوں رفیق جمیل اور خلیق نے اس کی بے حد امداد کی تھی۔  
 اب ابھی تک خان پور میں تھا۔ رفیق لاہور رہتا تھا چونکہ اس کی تبدیلی ہیڈ آفس میں ہو چکی  
 تھی۔ ٹیلیسٹاب ڈاکٹر بن چکا تھا اور اکثر لاہور آیا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ اس کے خالہ زاد بھائی  
 نے ان کے ساتھ بہت ہمدردی کی تھی۔ لیکن انہیں تو آئے دن امداد کی ضرورت رہتی  
 تھی۔ کبھی کبھار کی بات۔ ہوتی تو بھی وقت گزر جاتا۔ روز کی حاجت مندی کا کیا علاج ہو سکتا تھا۔

دوسری مشکل یہ تھی کہ دو لڑکیاں اب جوان ہو چکی تھیں۔ ان میں شہزاد کی سی رنگینی تو  
 تھی۔ لیکن پھر بھی وہ شہزاد کی بیٹیاں تھیں اور اسی گھر میں پل کر جوان ہوئی تھیں۔ لہذا ان کی

تھا۔ کیا یہی اس قصے کا انجام تھا۔ سالہا سال کی تنگ و دو کے بعد جب کہ وہ جیون ساتھی بن چکے  
 تھے کیا قدرت کو یہی منظور تھا کہ وہ پھر جدا ہو جائیں۔ اگر شہزاد کو کچھ ہو گیا تو بچوں کا کیا ہو گا؟ وہ  
 سوچ رہا تھا۔

بیٹے ہوئے لمحات اس کے سامنے پردہ ظلم کی طرح آ رہے تھے۔ جب وہ شہزاد کو پہلی دفعہ  
 بیاہ کر لائے تھے اور ملحقہ ڈبے میں وہ مونگیا گھٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ حنا ملیدہ ہاتھ گھڑی سے نظر  
 کرتے۔ یہ ہے ایلی۔ کسی نے کہا تھا اور دو ٹاگ اس کے سر پر منڈلانے لگے تھے۔

پھر جب وہ کمائی بنا رہی تھی اور ایلی نے محسوس کیا تھا کہ اس کے انگوٹھے پر ایک رنگین  
 بوجھ سا پڑ گیا تھا اور اس کا سر بھن سے اڑ گیا تھا جیسے کسی نے ہوائی کو آگ دی ہو اور ان جلنے  
 میں اس نے وہ حنا ملیدہ ہاتھ تھام لئے تھے اور نہ جلنے جذبے کی شدت میں کیا کہہ دیا تھا۔ ”تم  
 ایلی تم۔“ شہزاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

پھر بند بیٹھک میں اپنے مردانہ پن کی دھماکا جملنے کے لئے وہ سکندر کی طرح حملہ آور تھا  
 اور پھر پورس کی طرح منہ میں گھاس لئے اس کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔

پھر وہ بے نیاز درزن اس کے رو برو بیٹھی تھی۔ جو قریب ہو کر اس سے دور ہو جاتی تھی اور  
 دور ہوتی تو گویا اس کی گود میں آ بیٹھتی۔ وہ اجنبی عورت کی طرح اس کے رو برو کھڑی تھی۔ وہ  
 صفر سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں اور ایلی کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہہ رہی تھی  
 ”تم!“ اس تم میں کتنی دھار تھی۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔

پھر وہ چلا رہا تھا۔ ”تم رذیل کمین عورت ہو۔ آج پھر میرے رو برو آتے ہوئے نہیں  
 شرم نہیں آتی کیا؟“ اور وہ اس کے قدموں میں گر کر کہہ رہی تھی ”ہاں۔“ ہوں۔“ پھر  
 صفر چلا رہا تھا۔ ”میں نہیں مردوں گا میں نہیں مردوں گا۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر  
 دو۔“ اور اب شہزاد آپریشن ٹیبل پر پڑی ایلی سے کہہ رہی تھی۔ ”مجھے معلوم تھا۔ میں تم  
 سے پہلے مردوں گی۔ ہمیشہ سے مجھے اس کا علم تھا۔ میرا دل گواہی دیتا تھا۔ مجھے کوئی غم نہیں صرف  
 میری بچیاں۔“ اس نے آخری ہنسی لی۔ ایلی گھبرا کر چونک پڑا۔ چونکہ دار جاچکا تھا۔ آسمان پر  
 ہلکی ہلکی سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ طوفان تھم چکا تھا۔ نرس اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ ”آپریشن  
 کامیاب رہا۔ تمہیں مبارک ہو۔“ ایلی کو یقین نہیں آتا تھا۔ اس کے دل میں کوئی خوشی پیدا  
 ہوئی اور وہ اسی طرح دیوانہ وار بیٹھا رہا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے۔ کیا

طباع میں وہ گھٹا گھٹا پن نہ تھا۔ محلے کی تمام عورتیں ان کے سحر سے مخدوش تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے شوہر یا بھائی یا بیٹے شہزاد کے گھر جائیں یا ان سے ملیں۔ اس لئے یہ سب لوگ چوری چھپے وہاں آتے تھے۔

ان کے آتے ہی فرش بچھا دیا جاتا اور پھر سب مل کر تاش یا چوٹ کھیلنے بیٹھ جاتے اور کھیل میں وہ سب ہنستے چیتے چلاتے قہقہے لگاتے۔ گیت گنگنائے اور شور مچاتے۔ ایک دھماچوڑی مگی رہتی۔ لیکن ان کے جاتے ہی مالی دقتوں کا احساس بیدار ہوتا اور شہزاد ایک طرف لیٹ کر سو جتی اور آہیں بھرتی۔

لڑکیاں بے "ہنسنے پر مجبور تھیں یا ان کا غنواں شباب انہیں مسکرانے پر مجبور کرتا تھا۔ اس لئے وہ ہنستی رہتی تھیں۔ لیکن ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی بچپن کے بوند باندی شروع ہو چکی تھی۔ غالباً وہ اس احساس کا اظہار صرف ماں کے ساتھ کیا کرتی تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ مغصوم اور افسردہ رہنے لگی تھی۔ شہزاد کو ذاتی طور پر کوئی غم نہ تھا نہ وہ بچپن کے قائل تھی۔ غالباً اسے بیٹیوں کے غم نے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔

ایلی نے آنے سے پہلے بار بار شہزاد سے کہا تھا کہ مالی مشکلات ہوں گی۔ اس لئے سوچ لو کیا تم انہیں برداشت کر سکو گی۔ لیکن ان دنوں شہزاد اس کے اس سوال کو اہمیت نہ دیتی تھی۔ ایلی کو اس بات پر غصہ آتا تھا کہ اب وہ کیوں اکیلی پڑی رہتی ہے کیوں آہیں بھرتی ہے۔ کیوں غم کھاتی ہے۔

شہزاد کو اپنی بڑی لڑکیوں کی تعلیم کا بھی غم تھا۔ جب وہ گروپین سے آئی تھیں۔ تو دونوں نویں جماعت میں تعلیم پا رہی تھیں۔ ان کے دو سال پہلے ہی ضائع ہو چکے تھے۔ پہلے سال تو انہیں کسی سکول میں داخل کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ دوسرے سال میں انہیں نے کئی بار کوشش کی تھی کہ گروپین سے ان کے سرٹیفکیٹ دستیاب ہو جائیں۔ لیکن شریف نے ہیڈ ماسٹرس کو لکھ کر دے دیا تھا کہ جب تک وہ خود ان کے سرٹیفکیٹ طلب نہ کرے۔ سرٹیفکیٹ جاری نہ کئے جائیں۔ لہذا ان کا دوسرا سال بھی ضائع ہو گیا تھا اور شہزاد کو ڈر تھا کہ کہیں تیسرا سال بھی ضائع نہ ہو جائے۔ بوند بوند غم اس کی روح میں سرایت کر رہا تھا۔

**دوپاگل**

پھر ایلی کا تہلولہ شاہ وال ہو گیا اور وہ سب شاہ وال چلے گئے!

شاہ وال ایک بڑا قصبہ تھا جو لاہور سے تیس چالیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ ابھی وہ شاہ پنچ ہی تھے کہ شہزاد پھر بیمار پڑ گئی۔ اسے خون جاری ہو گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے جواب دے دیا۔ "اے لاہور ہسپتال میں لے جائیے۔ لاہور ہسپتال کے ڈاکٹروں نے معائنہ کرنے کے بعد پاکہ مریضہ کا اندرونی جسم مردہ بچے کے زہر کی وجہ سے گل گیا ہے۔ آپریشن ہو گا۔

ایلی نے پوچھا۔ کیا آپریشن کے بعد مریضہ یقینی طور ٹھیک ہو جائے گی۔" ایلی نے پوچھا۔ "یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔" ڈاکٹر بولا۔ "زیادہ امید نہیں۔"

"اوہ۔" ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

جب وہ شہزاد سے ملا تو وہ بولی "میں آپریشن نہیں کرواؤں گی۔"

"کیوں۔" اس نے پوچھا۔

"بے کار ہے۔" وہ بولی۔

"بے کار کیوں۔"

"وہ کہتے ہیں سزا نہ بچلی جھلی تک پہنچ چکی ہے اور خون بند نہیں ہو گا۔" "تو پھر۔"

"مجھے لڑکیوں کے پاس لے چلو۔"

"اچھا۔" ایلی نے سر جھکا لیا۔

جب شہزاد لیڈی ڈاکٹر سے ہسپتال چھوڑنے کی اجازت طلب کرنے گئی تو ڈاکٹر نے صاف کر دیا۔ "بے وقوف مت بنو۔" وہ بولی۔ "اگر تم ہسپتال چھوڑ کر چلی گئی تو زیادہ سے زیادہ لاہور جیو گی۔"

"اور اگر میں ہسپتال میں رہوں تو۔"

"تو تو۔۔۔ تو شاید۔"

شہزاد نے اپنے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھالی۔ ڈاکٹر گھبرا گئی۔ "نہیں نہیں۔" وہ بولی۔

"مجھے کون روک سکتا ہے۔" شہزاد نے کہا اور باہر نکل آئی۔ ڈاکٹر اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

ڈاکٹر نے ایلی کو دیکھ کر شور مچا دیا۔ "اے مسٹر۔ یہ تمہاری مسز دیوانی ہو گئی ہے۔ جان بوجھ کر لڑکی کر رہی ہے۔ اے مسٹر۔"

”کیا کرتا ہے۔“ وہ بولی۔

”چلتے ہوئے تمہیں تکلیف ہوگی۔“ وہ بولا۔

”تکلیف“ — وہ ہنسی۔ ”اب کیا ہے۔“

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”اب کیا ہے۔“

”ایلی۔“ وہ بولی۔

”جی۔“

”ایک بات کہوں۔“

”کہو۔“

”ہانو گے؟“

”ہاں گا۔“

”شروع سے ہی مجھے معلوم تھا۔“

”کیا؟“

”کہ میں پہلے مروں گی۔“

”واقعی؟“

”ہاں۔ جب بھی تم میرے پاس آیا کرتے تھے تو کوئی میرے کان میں کہتا۔ تم پہلے مری جاؤں گی۔“

”اچھا۔“

”ہاں۔“

”کون کہتا تھا؟“

”معلوم نہیں۔ لیکن مجھے معلوم تھا وہ سچ کہتا ہے۔“

”بس اتنا ہی کہتا تھا؟“

”نہیں۔“ وہ بولی۔

”تو؟“

”ایک بات اور کہتا تھا۔“

”وہ کیا؟“

ایلی رک گیا۔ ”یہ عورت پاگل ہے۔“ ڈاکٹر چلائی۔

”ہم دونوں پاگل ہیں۔“ وہ بولا۔

”ارے۔“ ڈاکٹر بولی۔ ”تم تو پڑھے لکھے نظر آتے ہو۔“

”ہاں۔“ ایلی نے کہا ”میں پڑھا لکھا پاگل ہوں۔“

”ارے۔“ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ دونوں پاگل باہر نکل آئے۔ شہزاد نے ایلی کا ہاتھ تھام

لیا۔ بولی۔ ”ایلی۔“

”جان من۔“ وہ بولا۔

”پندرہ دن ہیں۔“ اس کی آنکھ میں مسرت کی چمک تھی۔

”ہاں۔“

”پندرہ دن ہم اکٹھے رہیں گے۔“

”ہاں۔“

”پندرہ دن بہت ہوتے ہیں۔“

”ہاں ہاں۔“ وہ بولا۔

”تم نے کہیں باہر تو نہیں جانا۔“

”نہیں جاؤں گا۔“

”ہم اکٹھے بیٹھ رہیں گے۔“

”بالکل۔“

”اور پھر ہم بیٹھ کر سب باتیں دہرائیں گے۔“

”ہاں۔“

”جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔“

پن۔ درہ۔ دن

اپنی ہی دھن میں پاگل پیدل چلے جا رہے تھے۔

”بابو جی تاکہ چاہیئے۔“ تاکے والے نے قریب آکر پوچھا۔

”تاکے پر چلو گی۔“ ایلی نے پوچھا۔

”کہتا تھا — نہیں بتاؤں گی۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”نہ بتاؤ۔“ وہ بولا۔ ”لیکن تم روتی کیوں ہو۔“

”ہاں روتی ہوں۔“ وہ بولی۔

”اچھا جیسے تمہارا جی چاہے۔“

”اس لئے نہیں روتی کہ پندرہ دن اور ہیں۔“

”تو کس لئے؟“

”وہ جو دوسری بات کہتا تھا۔ اس پر نہ جانے کیوں اس کی دوسری بات سن کر میں ہمیشہ روتی

رہی چھپ چھپ کر روتی رہی۔“

”کیا کہتا وہ ایسی بھی کیا بات ہے؟“

”کہتا تھا — بتا دوں؟“

”تمہاری مرضی۔“

”کہتا تھا۔ تمہارے مرنے کے بعد اس کی زندگی شروع ہوگی۔“

”کس کی زندگی؟“

”تمہاری۔“

”زندگی ختم ہو جائے گی یا شروع ہو جائے گی۔“

”شروع ہوگی۔“ وہ بولی۔

”اس میں رونے کی کیا بات ہے؟“

”مجھے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میں تمہارے راستے کی رکاوٹ ہوں۔“

”وہ کیسے؟“

”اور تمہاری زندگی شروع نہیں ہو سکتی جب تک رکاوٹ دور نہ ہو۔“

”بے وقوف تم رکاوٹ نہیں زندگی ہو۔ تم چلی گئیں تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“

”ج۔“ وہ بولی۔

”تمہاری قسم۔“

وہ مسکرائی۔ ”بس مجھے ایک غم ہے۔ میری بچیاں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے پھر وہ

گاڑی میں بیٹھے ہوئے شاہ وال جا رہے تھے۔ انجن ہو تک رہا تھا۔

”ہن۔ درہ۔ دن — پن۔ درہ۔ دن۔“

دھننا۔ ایلی کی توجہ سامنے بیٹھے ہوئے مسافروں کی طرف منعطف ہو گئی۔

”پندرہ۔“ ”دن۔“ ایک چلا رہا تھا۔ ”صرف پندرہ دن۔“

ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کیا وہ ان کے راز سے واقف تھا۔

”کیوں بھائی۔“ وہ ایلی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”لو تم ہی بتاؤ پندرہ دن بھی کوئی حیثیت

رکھتے ہیں۔“ اس نے چنگی بجا لی۔ ”یوں گئے ہے نا۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا اور پھر اپنے

ہاتھوں کو مخاطب کر کے بولا۔ ”ہم نے تو بس وہی ایک ڈاکٹر دیکھا ہے۔ دو سال میری بیوی میو

ہسپتال میں پڑی رہی۔ دو سال آخر انہوں نے جواب دے دیا اور میں اسے دورا ہے لے گیا اور

اس اللہ کے بندے نے پندرہ روز میں ایسا کر دیا کہ وہ اپنے پاؤں چل کر گھر آئی اور اللہ اس کا

بلا کرے۔ آج ہم ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔“

”کون ہے وہ ڈاکٹر؟ ایلی نے پوچھا۔

”دورا ہے کا ہو میو پیٹھ ہے جی۔“

”کیا نام ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

ڈاکٹر ہاشم

”بھئی واہ۔“ وہ بولا۔ ”تم ڈاکٹر ہاشم کو نہیں جانتے۔“

”جی ڈاکٹر ہاشم کو کون نہیں جانتا۔“ اس کا ساتھی بولا۔

اگلے روز ہی ایلی دورا ہے میں ڈاکٹر ہاشم کے معمل میں بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر ہاشم کا معمل ایک وسیع و عریض صحن پر مشتمل تھا۔ جس کے ایک طرف دو تنگ

گڑوں میں ادویات رکھی تھیں اور دو کمپاؤنڈر بیٹھے تھے۔ دوسری طرف ایک برآمدہ تھا۔ جس

کے پیچھے دو وسیع کمرے میں کتابیں پڑی تھیں۔ تیسری طرف ایک دروازے کے پیچھے ڈاکٹر کا

مکان تھا۔ صحن میں ایک درخت کے نیچے ایک تخت پڑا تھا۔ جس پر ایک پرانا سا کتہ لگا تھا۔ نیچے

ایک سلہ سا گدا بچھا ہوا تھا ایک چھوٹے سے ڈبک کے گرد بہت سی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب شیش۔ ربڑ کی نلکیاں۔ ڈسک پر ایک پرانا قلمدان پڑا تھا۔ یہ ڈبک تخت پر لگا ہوا

قلم لور اس کے پاس ہی کانڈ کی پرچیاں سی پڑی تھیں۔ تخت کے ایک طرف بوسیدہ کالا کمبل



”بے وقوف۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”میں نے سمجھا کہ تم میں سمجھنے کی صلاحیت ہے۔“

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔

”تو پھر مت سمجھو۔“

”جی بہت اچھا۔“

”جاؤ مزے کرو۔ اب کسی دوائی کی ضرورت نہیں۔“ وہ شخص سر جھکائے چل پڑا۔

”ہوں تم۔“ ڈاکٹر کی نگاہ ایک اور شخص پر پڑی۔ ”تم۔“ وہ بولا۔

”جی۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”میرا نام ماجد ہے۔“

ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا ”نام کو میں کیا کروں۔ تمہیں تپ دق ہے نا۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔

”تو جاؤ تمہارے لئے میرے پاس کوئی دوا نہیں جاؤ۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب۔“ وہ بولا۔ ”میں کہاں جاؤں؟“

”تم اللہ کے پاس جاؤ۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”وہاں سکھی رہو گے۔ جاؤ جاؤ جاؤ۔“

وہ شخص مایوس ہو کر چل پڑا۔

”ہوں۔“ ڈاکٹر نے ایلی کی طرف دیکھا۔

”جی میں۔“ ایلی بولا۔ ”میں شاہ وال سے آیا ہوں۔“

”تو کیا مجھ پر احسان کیا ہے۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”میں لوگ حیدر آباد سے آتے ہیں۔“ وہ رک

یا۔

”میسور سے آتے ہیں۔ تم شاہ وال سے آگئے تو کیا ہوا۔“ اس نے دوبارہ کہا۔

ایلی گھبرا گیا۔ ”جی آپ بجا فرماتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”کیا فائدہ ہوا شاہ وال سے آنے کا کیا فائدہ ہوا۔ بے وقوف۔“ ڈاکٹر اسے گھورتا رہا۔

ایلی کو غصہ آ رہا تھا۔

”لو بھائی اس شخص کی طرف دیکھا۔“ ڈاکٹر نے جملہ لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”یہ شاہ

لاسے آیا ہے لیکن بے وقوف مریض کو ساتھ نہیں لایا۔“

”ارے۔“ ایلی حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں۔“ ڈاکٹر کہنے لگا۔ ”اگر تم مریض کو ساتھ نہیں لائے تو کیا میرا منہ دیکھنے آئے ہو۔“

ڈھیر ہو رہا تھا۔

”محن میں کوئی کرسی نہ تھی۔ کتابوں والے کمرے میں بھی بیٹھنے کے لئے فرش کے علاوہ کوئی کرسی یا کاؤچ نہ تھا۔ محن میں لوگ ادھر ادھر زمین پر چوکیں رکھے بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ اور یوں شور مچا رہے تھے۔ جیسے وہ ڈاکٹر کا عمل نہیں بلکہ سٹہ منڈی ہو۔ ڈاکٹر ابھی زنان خانے سے باہر نہیں نکلا تھا۔

دفعۃً زنان خانے کا دروازہ کھلا۔ ایک لڑکا ایک حقہ اٹھائے باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر سب خاموش ہو گئے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک دیوانہ سا آدمی یوں لڑھکتا ہوا آ رہا تھا۔ جیسے کسی نے اسے دھکا دے کر متحرک کر دیا ہو۔ اس نے ایک لمبا سا چنہ پن رکھا تھا۔ نیچے سیاہ جرابیں تھیں ایک پھٹی ہوئی گرگھلی۔

اس کے بال پریشان تھے۔ چہرہ گویا سو جا ہوا تھا۔ آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ تخت کے قریب پہنچ کر وہ رکا۔ اس نے بڑھ کر کھل اٹھا لیا اور اسے اپنے گرو پلیٹ کر تخت پر ڈھیر ہو گیا۔ مجمع پر خاموشی طاری تھی۔

ایک ساعت کے بعد اس نے سر اٹھایا اور مجمع پر اپنی نگاہ ڈالی۔ اس کی نگاہ ایک آدمی پر رکی۔ ”ہوں۔“ وہ بولا۔ ”تم۔“

”جی۔“ وہ شخص بولا۔

”تمہاری بیوی مر گئی ہے کیا؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ وہ شخص بولا۔

”تو اس کا برا حال ہے کیا۔“

”جی نہیں۔“ الٹا وہ رو سخت ہے۔“

”تو پھر تم کیوں آئے ہو۔“ ڈاکٹر نے اسے ڈانٹا۔

”جی دوا لینے۔“

”کیسی دوا۔“

”جی دوائی۔ یعنی۔“ وہ گھبرا گیا۔

”جب وہ رو سخت ہے تو دوائی کا مطلب۔ دوائیاں لینے کا شوق ہے کیا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں نے سمجھا کہ مزید دوائی۔“

”اپنی گھروالی کو اپنی طرح قتل پسند بنائیے نا۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”وہ اپنی طبیعت کی تہی کی وجہ سے بیمار ہتی ہے۔“

”یہ میرے بس کا روگ نہیں۔“ تحصیلدار نے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نا کی بیماری کی تفصیلات سن لیجئے۔“

”نہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”پہلے ہمیں ایسی دوائی دینا ہوگی۔ جس سے ان کی طبیعت بدل جائے۔“

”دوائی سے طبیعت بدل جائے۔“ تحصیلدار نے کہا۔

ڈاکٹر نے قلم نیچے رکھ دیا آپ دوائی کو کیا سمجھتے ہیں لالہ جی۔“ اس نے پوچھا۔

شاید آپ سمجھتے ہیں کہ دوائی صرف پیٹ کا درد دور کرتی ہے۔ کھانسی کو روکتی ہے۔ اسل اند کرتی ہے۔“

”جی ڈاکٹر صاحب۔“ وہ بولے۔

”آپ غلط سمجھتے ہیں اور یہ ایک خوارک دینے کے بعد۔“ ڈاکٹر نے پرچی پر لکھتے ہوئے

کہا۔ ”آپ کو سمجھ میں آئے گا کہ دوائی کیا چیز ہے۔“

”مجھے اجازت ہے کہ ایک بات پوچھوں۔“ امیلی بولا۔

ڈاکٹر نے مڑ کر امیلی کی طرف دیکھا۔

”لالہ جی بھی تو مریض کو ساتھ نہیں لائے۔“ وہ بولا۔

”تو پھر۔“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”تو پھر۔ انہیں کیوں دوائی دے رہے ہیں آپ؟“

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ ”اس کا جواب تمہیں اس وقت دیں گے جب تم مریض کو ساتھ لاؤ گے اب

دوائی کر کے چلے جاؤ۔“ ڈاکٹر نے اسے ڈانٹا اور چپ چاپ صحن سے باہر نکل آیا۔

### کبل کی گٹھڑی

شاہ وال کو واپس جاتے ہوئے امیلی سوچ رہا تھا۔ ایسا ڈاکٹر تو اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ نہ ہی ”کیو“ مین سے اسے کبھی سنا تھا۔ علاج بالشل کے تصور سے ہی وہ بیگانہ تھا۔ عجیب ڈاکٹر تھا لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیسے معلوم تھا کہ وہ مریضہ کو اپنے ہمراہ نہیں لایا۔ شکل و

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔

ڈاکٹر قہقہہ مار کر ہنس بولا۔ ”اچھا تو دیکھو۔“

یعنی اس وقت ایک معزز ہندو داخل ہوا اور دروازے میں ہی ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”نمستے ڈاکٹر صاحب۔“ ڈاکٹر صاحب کی توجہ نووارد کی طرف منعطف ہو گئی۔

”یہ لالہ جی دورا ہے کے تحصیلدار ہیں۔“ قریب سے ہی آوازیں آئیں۔

لالہ جی قریب آگئے۔ وہ ایک معزز اور شریف آدمی نظر آتے تھے اور انداز میں بلا کا قتل تھا۔ جب وہ قریب آئے تو ڈاکٹر نے بغور ان کی طرف دیکھا۔

”لالہ جی۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”مہربانی کر کے تشریف لے جائیں۔“

تحصیلدار نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

”تشریف لے جائیں۔“ ڈاکٹر نے دہرایا۔ ”پھر سے داخل ہوں اور السلام علیکم کہیں۔“

تحصیلدار کھڑے ہو کر ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگے۔

”جب تک آپ ایسا نہیں کریں گے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں آپ کو درانہیں دوں گا۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب۔“ تحصیلدار نے کہا۔ ”میں نے داخل ہوتے وقت ہاتھ باندھ کر آپ

کو نمستے کی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”نمستے کرنے میں کیا برائی ہے؟“ تحصیلدار نے پوچھا۔

”کوئی نہیں۔“

”الٹا اس میں تو بے حد عجز ہے۔“

”جی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں۔ اس میں بہت عجز ہے۔ لیکن اذرا

کرم واپس جائیے پھر داخل ہو کر السلام علیکم کہیے۔ تاکہ میں آپ کو دوائی دوں۔“

اس پر تحصیلدار صاحب مسکرائے اور احاطے سے باہر نکل گئے۔ پھر داخل ہوتے ہوئے

بولے۔

”السلام علیکم۔“

”و علیکم اسلام۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”فرمائیے کس کے لئے دوائی لینا ہے آپ نے۔“

”گھروالی کے لئے۔“ وہ بولے۔

”اچھا۔“ وہ بولے۔ ”تم شاہ والے والے ہو کیا؟“  
”جی۔“

ڈاکٹر نے کبل سے ہاتھ نکالا۔ اس کا سر اور منہ کبل ہی میں لپٹے رہے۔ ”نبض دکھاؤ۔“  
”جھانہ لہجے میں بولا۔ ”اُدھر آؤ مریضہ۔“  
ایلی نے شزاؤ کو گھسیٹ کر پاس بٹھا دیا ڈاکٹر نے اس کی نبض ٹٹولی۔  
”ہوں۔“ ڈاکٹر بولا اور نبض تھامے بیٹھا رہا۔  
”دوسرا ہاتھ۔“ وہ بولا۔

شزاؤ نے دوسرا ہاتھ تھما دیا۔  
دیر تک ڈاکٹر نبض تھامے جوں کا توں بیٹھا رہا۔  
”جسم سے خون جاری ہے نا۔“ وہ بولا۔  
”جی۔“ ایلی نے کہا۔  
”اندر گل گیا ہے۔“

”جی ہسپتال والوں نے یہی کہا تھا۔“  
”ٹھیک کہا تھا۔“ وہ بولا۔

”انہوں نے کہا تھا پندرہ روز اور جئے گی۔“ ڈایا فرام کو گھن لگ گیا ہے۔ ”ایلی نے کہا۔  
”ڈایا فرام کو گھن لگ چکا ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”لیکن یہ کتنے والے وہ کون ہیں کہ پندرہ  
رہے گی۔ وہ کیا خدا ہیں؟“ ڈاکٹر نے غصے میں کہا۔  
ایلی خاموش بیٹھا رہا۔

”بولو۔“ وہ ڈانٹنے لگا۔ ”بولو نا۔ وہ کون ہیں۔ صحت اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے پھر وہ  
تائیں؟“

”جی۔“ ایلی نے کہا۔

”تم مسلمان ہو؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”جی۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”اچھے مسلمان ہو تم۔“ ڈاکٹر نے ایلی کو ڈانٹا اور دفعتاً اپنا منہ کبل سے باہر نکال کر اس  
طرف دیکھا۔ ایلی ڈر گیا۔ ڈاکٹر کی آنکھیں انگارہ سی چمک رہی تھیں۔

صورت کی بھی بات نہ تھی۔ چونکہ دیکھنے میں تو وہ ہمیشہ ہی مریض دکھائی دیتا تھا۔ ہر مل عجب  
ڈاکٹر تھا۔ ایلی کے دل میں بے وجہ یقین پیدا ہوا جا رہا تھا۔ کہ شزاؤ صحت مند ہو جائے گی۔  
جب اس نے شزاؤ سے بات کی تو وہ ہنس پڑی۔

”اب یہ چودہ دن بھی ضائع کر گئے۔“ وہ بولی۔ ”ایک دن ضائع کر آئے ہو۔“  
اکٹھے جائیں گے۔ ایک ہی ڈبے میں بیٹھیں گے۔ ایلی نے کہا۔ ”پھر کیسے دن ضائع ہو گا  
تم سمجھ لینا کہ سیر کرنے جا رہے ہیں۔“

”اور ڈاکٹر کو دینے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔“  
”اللہ مالک ہے۔“ وہ بولا۔ ”کچھ ہو ہی جائے گا۔“

شزاؤ تیار ہو گئی۔ ایلی نے سوچا کہ رات کو سفر ٹھیک نہیں۔ سارا دن سفر کریں تاکہ شزاؤ کو  
تکلیف نہ ہو۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ ڈاکٹر ہاشم شام کے وقت بھی محل میں آتے ہیں یا نہیں۔  
لیکن سوال یہ تھا کہ وہ رات کہاں گزاریں گے۔ چلو شیش پر مسافر خانے میں بیٹھ رہیں گے اس  
نے سوچا اور وہ اسی روز دورا ہے کو روانہ ہو گئے۔

شام کو تین بجے کے قریب وہ دورا ہے پہنچے۔ ایلی شزاؤ کو لے کر سیدھا محل میں پہنچا۔  
محل کا دروازہ کھلا تھا۔ لیکن اندر کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی مریض نہ کیاؤنڈر اس نے شزاؤ کو باہر  
محکم میں بٹھا دیا اور خود ادھر ادھر جھانکنے لگا۔

کتابوں والے کمرے میں کبل کی ایک گٹھڑی سی پڑی ہوئی تھی۔ ایلی مایوس ہو کر محکم میں  
آ گیا۔ اور چپ چاپ تخت پر بیٹھ گیا۔ دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھ رہے۔  
کبل کی گٹھڑی کو حرکت ہوئی۔

”ارے۔“ ایلی چونکا اور پھر اندر چلا گیا۔

ڈاکٹر کبل اوڑھے گٹھڑی بنا پڑا تھا۔

ایلی ڈر رہا تھا کہ کیس بگڑ نہ جائے۔

”کون ہے؟“ ڈاکٹر بولا۔

”جی میں ہوں۔“ ایلی بولا۔

”میں کون؟“

”میں شاہ والے سے مریضہ کو لایا ہوں۔“

”کوئی پرہیز۔“ ایلی نے پوچھا۔

ڈاکٹر ہنسا ”بے وقوف کھانے کو میسر نہیں آتا اور پوچھتے ہیں پرہیز۔ جاؤ۔“ وہ چلایا۔  
 ”ڈاکٹر نے انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔“ پندرہ روز کے لئے تم اس کے خاوند نہیں  
 اور یہ تمہاری بیوی نہیں سمجھے۔“  
 ”جی۔“ ایلی بولا۔

”سہولیس دن کوئی بندش نہیں۔“

ایلی اور شنراؤ باہر نکلے تو وہ حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”یہ ڈاکٹر ہے کیا۔“ شنراؤ نے پوچھا۔

”ہاں ڈاکٹر ہاشم۔“

”مجھے تو پاگل دکھتا ہے۔“ وہ بولی۔

”مجھے بھی۔“ ایلی نے کہا۔ ”لیکن سمجھ لو اللہ نے فرشتہ بھیج دیا ہے۔“

”مجھے تو دھوئگی معلوم ہوتا ہے۔“ شنراؤ نے کہا۔

”نہیں خالی پاگل۔ پگلا پن اور قابلیت ایک ساتھ ملتے ہیں۔“

”قابل آدمیوں کی شکل ایسی ہوتی ہے کیا۔“ شنراؤ نے برا سامنہ بتایا۔ شاہ وال پہنچ کر پندرہ

شنراؤ اور ایلی نے گمن گمن کر کاٹے۔

### امون

سہولیس دن ایلی نے پوچھا۔ ”شنراؤ کیا خون اب بھی جاری ہے؟“

وہ مسکرائی۔ ”نہیں تو۔“ وہ بولی۔ ”کب سے ختم ہو گیا۔“

”تم نے مجھے بتایا نہیں۔“

”میں نے کہا۔ شاید پھر جاری ہو جائے۔“

”تو نہیں ہوا۔“

”کوئی نہیں۔“ وہ بولی۔

”تو وہ دوائی کام کر گئی نا۔“

”ہتہ نہیں۔“ وہ غبی۔

”مسلمان ہوتے ہوئے تم نے ان کے منہ پر تھپڑ نہ مارا۔ کیسے مسلمان ہو تم۔“

ایلی سر جھکائے بیٹھا رہا۔

ڈاکٹر نے کمبل پرے پھینک دیا اور کچھ کسے بغیر باہر نکل گیا۔

ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے آیا وہیں بیٹھا رہے یا باہر چلا جائے۔

نہ جانے ڈاکٹر کیوں باہر گیا تھا۔

وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

”لو۔“ ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔

”ارے۔“ ایلی چونکا۔

”منہ کھولو۔“ وہ بولا۔

ایلی نے منہ کھول دیا۔

”بے وقوف۔“ ڈاکٹر چلایا۔ ”مریض وہ ہے یا تم۔“

ڈاکٹر ہاتھ میں ایک پڑیا اٹھائے کھڑا تھا۔

شنراؤ نے منہ کھول دیا۔ ڈاکٹر نے پڑیا اس کے منہ میں اندر ڈال دی۔ ”جاؤ۔“ وہ بولا اور پھر

ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

”جاؤ۔ چلتے جاؤ اور اچھے ہوتے جاؤ۔“

ایلی حیرانی سے اس کا منہ تک رہا تھا۔

”آپ کی فیس۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے دس کانوٹ نکالا۔

”فیس۔“ وہ بولا۔ ”تم میری فیس دے سکتے ہو کیا؟“

”جی نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”دوائی کی قیمت۔“

”دو آنے۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”دو آنے۔“

ایلی نے گھبرا کر دو آنے نکالے۔

”رکھ دو۔“ وہ بولا۔ ”رکھ دو۔“

ایلی نے دونی رکھ دی۔

”گھر کے لئے دوا۔“ ایلی نے کہا۔

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”جاؤ۔ یہی کافی ہے۔“

ایلی دیران پڑی تھیں۔ کتے بھونک رہے تھے۔ ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے دبے پاؤں چل رہا تھا۔ گھر کے پاس جا کر وہ رک گیا اس نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر جست بر کردہ کھڑکی کے پاس پہنچا۔ پٹ کو آہستہ سے دیا۔ پٹ کھل گیا۔ دبے پاؤں وہ اندر داخل ہو گیا۔ چارپائی پر شہزادہ بنز چادر اوڑھے مشین سامنے رکھے کام کر رہی تھی۔ ایلی نے اسے دیکھ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔ ”چپ۔“ وہ بولا۔

شہزادہ مسکرائی۔

”چائے پلاؤ گی۔“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ساری رات وہ ہاتھ میں ہاتھ دیئے بیٹھے چائے پیتے رہے۔ جب بھی کوئی کھٹکا ہوتا تو وہ دونوں خاموش ہو جاتے۔

”کون ہے۔“ وہ زیر لب کہتا۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ وہ گنگنائی اور پھر باہر نکل جاتی اور کچھ دیر کے بعد پھر اس کے پاس آ جاتی۔

یونہی صبح ہو گئی اور ایلی اسے الوداع کہہ کر کھڑکی سے باہر نکل گیا اور پھر صدر دروازے سے گھر میں داخل ہو کر اپنے بستر پر پڑ کر سو گیا۔

## سراپ

شاہ وال ایک بہت بڑا قصبہ تھا۔ وہاں کا مدرسہ بھی کافی بڑا تھا اگرچہ عمارت پرانی تھی۔ لیکن لائٹ کے ساتھ وسیع و عریض میدان تھے۔ سکول کے قریب ہی بوڈنگ کی عمارت تھی۔ جس میں شاہ وال کے گرد و نواح کے دیہات کے لڑکے رہتے تھے۔ بوڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ کا کواٹر بوڈنگ کی عمارت کے اوپر دوسری منزل پر تھا۔

سکول کے ہیڈ ماسٹر کا نام سراپ تھا۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ جسم گول مثل رنگ گورا اور چہرہ لال کی طرح تھا۔ جس میں اس قدر ہوا بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی کہ سراپ کی آنکھیں لال ہی نہ دیتی تھیں۔ کبھی غلوغ ہو تیں بھی تو جیسے دو لکیریں ہوں اور پھر وہ جلد ہی غروب ہو جاتیں چونکہ سراپ کو بات بات پر ہنسنے کی عادت تھی۔ جب وہ ہنستا تو گوشت کا ایک طوفان چہرے

”ایک بات کہوں۔“ ایلی نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔

”کہو۔“

”مانو گی؟“

”کہو تو۔“

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”پہلے کہو مانو گی۔“

”مانو گی۔“ وہ پیار سے بولی۔

”آج ہمارا اپنی مون ہے۔“ وہ بولا۔

شہزادہ نے مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

”آج ہم پرانے زمانے کی یاد منائیں گے۔“

”کیسی یاد۔“

”جب تم مونیکہ ٹھہری تھیں۔ تب کی یاد۔“

وہ مسکرائی۔

”اب کہاں۔“ وہ بولی۔ ”اب وہ بات کہاں؟“

”اب بھی ہے۔“ اس نے کہا۔

”کیسے؟“

”میرے لئے ہے۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔

شہزادہ نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”یاد ہے وہ زمانہ۔“ وہ بولا۔

”ہوں۔“ شہزادہ ہنسی۔ ”بھول سکتا ہے کیا۔“

ایلی نے زیر لب کہا۔ ”آج میں آؤں گا۔“

شہزادہ نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔

ایلی نے پھر سرگوشی کی۔ ”کھڑکی کھلی رکھنا۔“

شہزادہ بمعنی انداز سے مسکرائی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایلی باہر نکل گیا شام کو وہ ادھر ادھر مٹلتا رہا۔ حتیٰ کہ نوبج گئے۔ پھر وہ سینما میں جا بیٹھا۔ جب وہ فلم دیکھ کر ٹکٹا تو ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ وہ چپ چاپ گھر کی طرف چل پڑا۔ شاہ وال کی

مہر کے اندر زنانے میں وہ ہر وقت صفائی میں مصروف رہتی تھی۔  
 باہر مردانے میں سراب نوجوان طلباء کے جھرمٹ میں راجہ اندر بنے بیٹھے رہتے۔ لیکن  
 اندر میں راجہ کی نسبت رانی کی زیادہ جھلک تھی۔  
 سراب کو دیکھتے ہی لاشعوری طور پر ایلی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان سے کسی قسم کا تعلق روانہ  
 نہ لے گا۔

”شا“ سراب اس سے پوچھتے۔ ”آصفی صاحب آج آپ لیٹ کیوں آئے ہیں۔“  
 ”جی آج کی بات تو نہیں۔“ ایلی جواب دیتا۔ ”میں تو روز لیٹ آتا ہوں۔“  
 ”کیوں لیٹ آتے ہیں آپ۔“ وہ پوچھتے۔  
 ”جی میں نے بہت کوشش کی ہے کہ اس نکتے کو حل کروں۔ لیکن —“  
 ”کیا آپ کا اخلاقی فرض نہیں کہ آپ وقت پر سکول آئیں۔“ وہ بعد مشکل اپنے آپ پر  
 ایلی طاری کر کے کہتے۔  
 ”اخلاقی فرض تو نہیں سراب صاحب۔“  
 ”کیوں۔“

”تو کر ہوں لہذا۔ وقت پر آنا چاہئے۔“

”تو یہ فرض ہوا۔“

”جی اخلاقی فرض تو نہیں نا۔ دیکھئے سراب صاحب آپ میرے افسر ہیں اور میں آپ کا  
 فٹ ہوں۔“ ایلی کہتا۔ ”میرا فرض یہ ہے کہ آپ کو خوش رکھوں۔ اور بس۔“  
 سراب صاحب کے گل سرخ ہو جاتے۔ چہرے پر گوشت کی لہریں چلنے لگتیں اور آنکھیں  
 لہب ہو جاتیں۔

”بہر صورت آپ وقت پر آیا کریں۔“ وہ کہتے۔

”بہت اچھا صاحب۔“

اگلے روز ایلی پھر لیٹ آتا۔

سراب نے سوچا کہ ایلی کو شرمندہ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ انہوں نے خود وقت پر آنا  
 ٹھہر کر دیا۔ آتے ہی وہ ایلی کو تلاش کرتے اور پھر اس کی جماعت میں جا کر خود پڑھانا شروع کر  
 لیتے۔ ان کا خیال تھا کہ ایلی دو ایک روز صورت حالات کا جائزہ لے گا تو شرمندگی محسوس کرے

پر چلتا۔ بڑھتا سنہ۔ آنکھیں کشتیوں کی طرح لہروں میں ڈوب جاتیں۔ لیکن جب کبھی وہ سنجیدہ  
 ہوتا یا جان بوجھ کر غصے میں آ جاتا تو دو بھوری دھاریاں ابھسرتیں حتیٰ کہ وہ کناریں  
 بن جاتیں۔ ان میں دھار پیدا ہو جاتی اور وہ بری طرح سے کانٹے لگتیں۔ ایلی سراب کو مل کر بے  
 حد خوش تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اساتذہ کے درمیان گزرا تھا اور اس نے  
 محسوس کیا تھا۔ کہ اساتذہ زیادہ تر رسمی یا کتابی زندگی بسر کرتے تھے۔ وسعت نظر سے قطعی طور پر  
 بیگانہ تھے۔ چونکہ ان کا مطالعہ محدود تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ زیادہ تر زندگی بچوں میں بسر کرتے  
 تھے۔ ان کی شخصیت رسمی خیالات جذبات اور حرکات کا مجموعہ تھی۔ وہ سب ایک ہی دائرے میں  
 گھومتے تھے اور اپنے خیالات علم اور نظریات کو ناجائز طور پر بے حد اہمیت دیتے تھے۔ ہاتھی  
 دانت کی طرح انہوں نے اخلاقی معیار پال رکھتے تھے۔

ایلی اساتذہ سے آگاہ چکا تھا۔ ان میں نہ تو ذہنی چمک تھی نہ وسعت قلب اور نہ ہی وہ  
 رنگین جذبات سے واقف تھے۔ لیکن ہیڈ ماسٹر تو بالکل ہی ایلی کے لئے ناقابل قبول تھے۔ وہ  
 اساتذہ سے بھی یوں پیش آتے۔ جیسے وہ بچے ہوں۔ مدرسے میں وہ ایک جزیرے کی طرح الگ  
 تھلگ رہتے اور یا اساتذہ کے قریب آتے تو یہ توقع رکھتے کہ وہ ان کی ہر بات کو سراہیں۔ ان  
 کے ہر خیال پر واہ واہ کریں۔

سراب میں خود ستائی کی واضح جھلک تو تھی۔ لیکن ان کی طبیعت میں رنگین کا عنصر مفقود نہ  
 ہوا تھا۔ جسے وہ بڑی محنت سے چھپائے پھرتے تھے۔ اس وجہ سے بڑوں کی نسبت وہ بچوں سے  
 قریب تر تھے۔ ان کے گھر میں نوجوان طلباء کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ وہ انہیں پڑھاتے تھے۔  
 چھیڑتے تھے گھورتے تھے اور پیار کرتے تھے۔

نہ جانے کیوں ایلی نے پہلے روز ہی محسوس کیا گویا وہ ہیڈ ماسٹر نہیں۔ جیسے کسی میم نے  
 زبردستی سوٹ پہن رکھا ہو یا کوئی دلہن شرم و حیا کو بلائے طاق رکھ کر مردانہ لباس میں باہر نکل  
 آئی ہو۔

ان کی بیگم ایک معزز خاندان کی خاتون تھیں۔ نہ جانے کیوں یہ وہم اس کے گلے کا ہار ہو  
 رہا تھا کہ ان کا مکان پاک صاف نہیں۔ لہذا وہ بہت سے طالب علموں کو اکٹھا کر کے گھر کی صفائی  
 میں لگی رہتی تھی۔ فرش دھواتی۔ دیواریں جھاڑتی۔ دروازوں کے تختوں کو پانی سے دھوتی حتیٰ  
 کہ دروازے کی زنجیروں کو پاک کرنے کے لئے ان پر صابون ملتی۔

ن کام ریاض تھا۔ اس کا جسم فرہی کی طرف مائل تھا۔ رنگ کالا تھا اور طبیعت میں حکمرانی کے علاوہ اخلاق، نیکی اور سچائی کی طلب کا جنون تھا۔

دوسرا شخص کپور تھا۔ کپور سینئر انکسٹریچر تھا۔ اس کا قد درمیانہ تھا۔ طبیعت میں بلا کا عجز اور مٹھاس تھی۔ کپور اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے جیتا تھا۔ وہ دوسروں کے لئے جیتا تھا وہ ہر وقت کسی نہ کسی شخص کی جائز یا ناجائز امداد پر کمر بستہ رہتا تھا۔ صبح سویرے گھر سے نکلتا اور پھر رات گئے گھر لوٹتا اور سارا دن کسی نہ کسی حاجت مند کے کام میں مصروف رہتا۔ کوئی اسے پکری لے جاتا تاکہ مقدمے میں اس کی امداد کرے۔ کوئی اسے اپنی بیٹی کی شادی کے جملہ اخراجات سونپ دیتا۔ کوئی کہتا بھائی کپور۔ تھوڑا سا قرض چاہئے۔ کہیں سے انتظام کر دو۔ کوئی اسے یونٹن کے لئے فرمائش کرتا اور اگر کوئی کام نہ ہوتا تو کپور گھر گھر لوگوں سے ملتا "کوئی سیوا دینے صاحب۔" وہ کہتا "میں آپ کا سیوک ہوں۔" ایللی کے لئے ریاض اور کپور دونوں نعت فرماتے تھے۔ وہ دونوں ایللی کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ کپور اسے اوصار سودا دیتا تھا۔ ریاض لڑکیوں کو سرٹیفکیٹ کے بغیر گریڈ سکول میں داخل کرنے کے لئے تک دو دو کر رہا تھا۔ پھر کپور نے ان کی فیس معاف کرانے کا ذمہ لے لیا اور ریاض ان کے لئے کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اسی طرح وہ دونوں ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرتے رہے۔ سراب کو بھی ایللی کے حالات سے بے حد ہمدردی تھی۔ لیکن سراب کی ہمدردی کو عمل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایللی کی جملہ مشکلات مالی نوعیت کی تھیں تنخواہ میں اس کا گزارا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے اس پر قرض کا طوفان لگا رہا تھا۔ اس کے قرض خواہ اوائلی کے لئے تقاضہ کرتے اور ایللی دو دو کر کپور کو بیٹی کی طرف بھیجتا تاکہ اسے کچھ دیر اور انتظار کرنے پر راضی کرے۔ اگلے روز کپورے والا آ جاتا اور ایللی ریاض کی طرف دوڑتا۔

کپور اللہ واسطے کام کرنے کا قائل تھا۔ مگر ریاض طبیعت کا سخت تھا وہ کام تو کرتا تھا مگر ساتھ گھر بھی پلاتا اور اس بات کا مطالبہ کرتا کہ ایللی اس کی عظمت اور نیکی کا اقرار کرے۔ اس کے علاوہ وہ ایللی پر خوش نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آخر یوں کب تک گزارا ہو گا۔ اس کا کوئی عملی تدارک کرنا چاہئے۔ ریاض اور کپور چاہتے تھے کہ ایللی کوئی یونٹن کرے اور اس طرح اپنی آمدنی میں اضافہ کرے۔ لیکن ایللی یونٹن کا قائل نہ تھا۔ اس کی زندگی نظم سے خالی تھی۔ وہ بلاتنہ

گیا۔ لیکن ایللی نے یہ دیکھ کر کہ سراب صاحب اس کی جماعت کو پڑھا رہے ہیں۔ پہلے پریڈ میں آنا ہی بند کر دیا۔ اس پر سراب صاحب بہت سٹ پٹائے اور اساتذہ کی میٹنگ میں انہوں نے اس بات کا تذکرہ کیا بولے۔ "شرمندہ ہونے کی بجائے آصفی صاحب نے پہلے پریڈ میں آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔"

ایللی نے کہا۔ "جناب عالی دراصل بات یہ ہے کہ چونکہ آپ مجھ سے بہتر پڑھاتے ہیں۔ لہذا میرا جی نہیں چاہتا کہ اپنی جماعت کو آپ کے درس سے محروم کروں۔"

سراب صاحب کو جلد ہی پتہ چل گیا تھا کہ الیاس کا برتاؤ باقی اساتذہ سے ہٹ کر ہے۔ اور وہ دل ہی دل میں اس پر خوش تھے۔

ایک روز ایللی سے سراب نے پوچھا۔ "آصفی صاحب آپ کا رویہ باقی اساتذہ کا سامنے کیا وجہ ہے؟"

"وجہ یہ ہے۔" وہ بولا کہ آپ کا رویہ باقی ہیڈ ماسٹروں کا سامنے۔

وہ مسکرائے "کیا فرق ہے؟" وہ بولے۔

"وہ فرق جو سوکھے اور ہرے بھرے درخت میں ہوتا ہے۔"

چند ایک روز تو ایللی باتوں کی مدد سے اپنے قدم جمانا رہا۔ پھر جب اس کی خود اعتمادی بڑھ گئی تو ایک روز جب وہ اکیلے تھے۔ ایللی نے نہ جانے کس بات کے جواب میں اپنے دل کی بات ازراہ مذاق کہہ دی۔ کہنے لگا۔ "سراب صاحب کسی وقت تو میں ایسے محسوس کرتا ہوں جیسے آپ دلہن ہوں۔" دفترا "سراب صاحب میں چھپی ہوئی عورت تمام احتیاط اور ضبط کو توڑ پھوڑ کر باہر نکل آئی۔ اس نے نوج کر اپنے کپڑے پھاڑ دیئے اور برہنہ ایللی کے رو برو آکھڑی ہوئی۔

سراب کے چہرے پر سرخی جھلکی۔ وہ سرخی نہیں جو دوران خون تیز ہونے پر جھلکتی ہے بلکہ وہ سرخی جو دلہن کا گھونگھٹ اٹھنے پر ظاہر ہوتی ہے۔ ایللی حیران رہ گیا۔ اسے اس برہنگی کا خیال نہ تھا۔ توقع نہ تھی۔ وہ گھبرا کر چلا آیا۔ اس کے بعد سراب اور ایللی کے درمیان ایک جلاب سادیواریں بن کر حائل ہو گیا۔ جیسے وہ دونوں کسی راز سے واقف ہوں۔

## کپور اور ریاض

مدرسے میں سراب کے علاوہ دو شخص پیش پیش تھے۔ ایک تو سکول کے دفتر کا کلرک تھا۔



موس کرنے لگا تھا۔

ایلی کے لئے سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ لڑکیاں جوان ہو رہی تھیں۔ ان کے قہقہے گھر سے باہر نشر ہونے لگے تھے۔ ان کی آوازیں سن کر راہ گیر رک جاتے تھے۔ اور کہتے اچھا یہ ہے اپنی صاحب کا گھر جب وہ سکول جاتی تھیں تو راستے میں لوگ خصوصاً نوجوان لڑکے ایک دوسرے کو کہنی مارتے۔ مسکراتے اور کوئی عاشقانہ گیت گنگناتے ہوئے بامعنی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے۔

ان باتوں کو دیکھ کر اس کے دل میں شبہات کا ایک طوفان پیدا ہو رہا تھا۔ ایلی ان لڑکیوں کی مصویت سے واقف نہ تھا۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ ہر لڑکی اپنا آپ نشر کرنے پر فطری طور پر مجبور ہے۔ اسے اس کا شعور نہ تھا کہ لڑکیوں کی مسکراہٹیں کسی ٹھوس مقصد کے شعور سے خالی ہوتی ہیں۔ ان کے قہقہے لوگوں کی توجہ جذب کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن کسی خاص شخص کو بلانے کے لئے نہیں ہوتے۔ وہ اس امر سے ناواقف تھا کہ عنوان شباب میں لڑکی کسی تحسین بری نگاہ کو رو نہیں کر سکتی۔ حالانکہ اس سے اس کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔

ان وجوہات کی بنا پر ایلی کو معصوم لڑکیوں سے شکایات پیدا ہوتی جا رہی تھیں اور یہ شکایات نصاب کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔

اقتصادی مشکلات کی وجہ سے شہزاد میں ایک اداسی اور احساس محرومیت پیدا ہو رہا تھا۔ اس کا وہ رنجین ختم ہو چکی تھی۔ اس کی طبعی شوخی اب محض روایت سی معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ اس کی صحت پہلے کی نسبت بہتر ہو گئی تھی۔ لیکن اس میں وہی تلخی پیدا ہوئی جا رہی تھی۔ جو ایک ایسی عورت میں پیدا ہو جاتی ہے جو کبھی بہت خوبصورت رہی ہو اور جسے احساس ہو کہ وہ اپنا حسن کھو چکی ہے۔ شہزاد کو ایلی کے خلاف کوئی شکایت نہ تھی۔ اسے اب بھی ایلی سے وہی لگاؤ تھا۔ لیکن اس کے اظہار کے موقعے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ وہ جب بھی کوئی بات شروع کرتے تو نہ جانے کیسے وہ بات کسی نہ کسی اقتصادی مشکل پر آ ختم ہوتی اور بات کی رنجین تلخی لمبا دل جاتی۔

کبھی کبھار لاہور سے محمود آ جاتا۔ میم کے چلے جانے کے بعد وہ تنہا رہ گیا تھا۔ لیکن اس کی نصیحت میں بلا کی جاؤ بیت تھی۔ میم کے جانے کا اس پر اثر ضرور ہوا تھا۔ لیکن وہ اس قدر گمراہ نہ تھا کہ اس کی شخصیت کی بنیادوں کو ہلا دیتا۔ ایلی کی دانست میں محمود اذلی طور پر ایک ایسا لڑھکا

مقررہ وقت پر حاضر ہو کر کام کرنے کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ تھی کہ ایلی موت سے گریز کرتا تھا اور ریاض کو یہ بات پسند نہ تھی۔

پکور اور ریاض کے علاوہ شاہوال سکول میں ایک اور شخص بھی تھا جو جو نیر نیر تھا۔ اس کا نام ثناء اللہ تھا۔ ثناء اللہ میں کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی۔ جو ایلی کے لئے جاذب توجہ ہوتی۔ اس کا جسم موٹا تھا۔ منہ سوجا سوجا سا طبیعت میں شوخی یا رنجین کا عنصر نام کو نہ تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک معزز آدمی تھا۔ البتہ اسے افسروں کے خلاف شکایت کرنے کی عادت تھی۔ کسی کو اکیلا دیکھ پاتا تو اسے پکڑ کر زیر لب افسروں کی شکایات کا دفتر کھول لیتا زندگی میں یہ اس کی واحد دلچسپی تھی۔ ثناء اللہ کی ایلی سے راہ و رسم صرف اس لئے ہو گئی کہ ان دونوں کے مکانات ایک ہی محلے میں واقع تھے۔ ایلی سکول سے واپس آتا تو ثناء اللہ آ نکلتا۔

”یہ سراب بڑا حرامی ہے“ وہ ادھر ادھر دیکھ کر زیر لب کہتا۔ ”اس کے کارنامے سنو گے۔ بھائی صاحب تو دنگ رہ جاؤ گے۔ بس اندر کا اکھاڑہ بنا رکھا ہے۔ اس سے مدرسے کے بچوں کے اخلاق تباہ ہو رہے ہیں۔“

تعلیم تو محض بہانہ ہے۔“

”ایلی صاحب پکور کو زیادہ منہ نہ لگاؤ۔ اوپر سے دھرماتما بنا ہوا ہے۔ ویسے اندر سے کڑہند ہے اور بے انتہا متعصب۔ آپ کو علم نہیں۔ آپ تو صرف ظاہر پر جاتے ہیں۔ یہ لالے بڑے چالاک ہوتے ہیں اور یہ جو سیوا سستی شروع کر رکھی۔ اس نے یہ محض دکھاوا ہے۔“

”یہ جو موٹا ریاض ہے نا۔ مدرسے کا سارا پیسہ کھا گیا ہے۔ لیکن ہے اس قدر چالاک کہ کسی کو پتہ نہیں چلے دیا۔ ایک روز بھانڈا بھونے کا تو پتہ چلے گا۔ اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ٹھیک نہیں ورنہ جب بات نکلے گی تو ساتھ دھر لئے جاؤ گے۔“

ایلی کو ثناء اللہ سے قطعہ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نہ ہی وہ اس کی باتوں کو غور سے سنا کرتا تھا۔

لیکن اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ثناء اللہ سے اپنا پیچھا چھڑاتا۔ اس کے برعکس وہ اس کی باتیں سن کر مجبوری سے تعجب بھری آوازیں کہتا۔ ”اچھا تو یہ بات ہے۔“

یا۔ ”کیا واقعی۔“ یا ”ارے ایسا معلوم تو نہیں ہوتا۔“

شاہ وال پنچ کر زندگی میں پہلی مرتبہ ایلی محسوس کرنے لگا تھا کہ سبھی اساتذہ اس کے راز سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ چھ بچوں کی ماں کو بھگا کر لے آیا ہے اور وہ اس بات پر شرم

اس مرتبہ بھی وہ صبح کی گاڑی سے روانہ ہو کر شام کو تین بجے کے قریب دورا ہے پہنچے۔  
 ام کا محل خالی پڑا تھا۔ ڈاکٹر ہاشم اسی طرح کبیل میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا۔  
 ایللی نے اپنی آمد کا اعلان نہ کیا۔ بلکہ شنزاد کو سمجھا دیا کہ تم چپکے سے اپنا ہاتھ بدھا دینا تاکہ  
 انہیں دیکھ لے۔ ایللی ڈرتا تھا کہ کہیں ڈاکٹر اپنے طبعی جنون کی وجہ سے اسے دیکھنے سے انکار  
 کر دے۔

”کون ہے۔“ ڈاکٹر نے آواز سن کر پوچھا۔

”مریضہ۔“ وہ بولی۔

”اس وقت نہیں۔“ وہ بولا۔ ”صبح آئے۔“

”بہت دور سے آئی ہوں۔“ شنزاد نے کہا۔ ایللی خاموش بیٹھا رہا۔

”کتنی دور سے۔“

”شاہ وال سے۔“ وہ بولی۔ ”آج ہی واپس جاتا ہے۔“

”ہوں۔“ وہ بولا۔ ”تو دکھاؤ نبض۔“ ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ کبیل سے باہر نکالا اور وہ شنزاد کی  
 نبض دیکھنے لگا۔ دھتتا ”وہ چونکا۔“ ”اوہ۔“ وہ بولا۔ ”معاملہ تو خراب ہے۔ بہت خراب ہے۔“  
 شنزاد خاموش بیٹھی رہی۔

”بچہ تو گل گیا ہے۔“ وہ بولا۔ ”اور اگر تم بروقت نہ آتے تو۔۔۔۔۔“

”آپ نے پہلے بھی دووائی دی تھی۔“ ایللی بولا۔

”کب؟“

”چھ مہینے ہوئے۔“ وہ بولا۔ ”آپ نے کہا تھا جسم اندر سے گل گیا ہے۔“

”دی ہوگی دی ہوگی۔“ ڈاکٹر چلایا۔ ”لیکن معاملہ پھر بگڑا ہوا ہے۔“ اس نے کبیل سے سر  
 اٹھایا۔ ”یہاں روز مریض آتے ہیں۔“ وہ چلایا۔ ”سینکڑوں آتے ہیں۔ ہمیں کیا یاد رہتا ہے۔ کہ  
 لی کو کیا دووائی دی تھی۔ یہ دیکھو۔“ ڈاکٹر نے اس قالین کا کونہ اٹھایا جس پر وہ بیٹھا تھا۔ اس  
 کے نیچے خطوط کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ”دیکھو۔“ وہ بولا۔ ”یہ سب مریضوں کو خط ہیں۔ ان سب  
 کو ان جواب لکھے۔ خواہ مخواہ خط لکھتے چلے جاتے ہیں۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”میاں۔“ وہ پھر بولا۔ ”ہم کیا خدا ہیں۔ صحت اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے جسے صحت  
 اللہ مطلوب ہوتی ہے۔ ہمارے ہاتھ سے صحیح دوا لکھوا دیتے ہیں۔ ورنہ یونہی اتاپ شاپ دووائی

ہوا پتھر تھا۔ جسے ہر لڑکھن نئی چمک عطا کرتی ہے۔

دورا ہے سے واپس آئے ابھی انہیں دو مہینے ہی ہوئے تھے کہ ایللی کو معلوم ہوا کہ شنزاد امید  
 سے ہے۔ لیکن شنزاد کو شہمت تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ کہہ رہی تھی۔ لاہور ہسپتال والوں  
 نے صاف کہہ دیا تھا کہ بچے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہوا بھی تو مں کے لئے خطرے  
 کا باعث ہو گا۔ لیکن امید کی تمام علامات واضح تھیں۔

”نہ جانے کیا ہے۔“ شنزاد نے کہا۔ ”یہ علامات شاید کسی آنے والی بیماری کا پیش خیر  
 ہوں۔“

## ادھر یا پاگل خانہ

”تم تو خواہ مخواہ شک کرتی ہو۔“ ایللی نے کہا۔

”میری طبیعت تو شکی نہیں۔“ وہ بولی۔ ”شکی تو تم ہو۔“

”پھر مجھے شک کیوں نہیں پڑتا۔“ ایللی نے پوچھا۔

”مجھے کیا معلوم۔“ شنزاد بولی۔

”میں بتاؤں شنزاد۔“ ایللی نے کہا ”چلو ایک بار پھر دورا ہے جا کر ہاشم سے ملیں۔

ہاشم کا نام سنتے ہی وہ گھبرا گئی۔ ”نہ میں نہیں جاتی۔“

”کیوں۔“

”وہ تو دیوانہ ہے۔“

”پڑا ہو میں اس سے مطلب۔“

شنزاد دورا ہے جانے کے لئے تیار نہ ہوئی تو وہ اسے ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے شنزاد کا معائنہ کیا اور پھر مسکرانے لگی۔ ”تمہیں بچہ ہونے والا ہے ظاہر ہے

کہ تم امید سے ہو۔۔۔۔۔ لیکن تمہاری صحت اچھی نہیں تمہیں خوراک کی ضرورت ہے۔“

اب بھی شنزاد کو یقین نہیں آتا تھا۔

چھ مہینے کے بعد وہ پھر بیمار پڑ گئی اور صاحب فراش ہو گئی۔ ایللی گھبرا گیا اور اس کی نشیں

کرنے لگا کہ ایک مرتبہ دروا ہے چلے۔ پہلے تو وہ انکار کرتی رہی لیکن جب تکلیف بہت بڑھ گئی تو

وہ راضی ہو گئی اور وہ دونوں دورا ہے جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

مارے پیٹ میں جو پچھ ہے جو گل چکا ہے۔ انشاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ پچھ معمولی پچھ میں۔ بہت کچھ لے کر آئے گا بہت کچھ عالی ظرف ہو گا۔ فنکار ہو گا سبحان اللہ۔“  
 وہ دھنسا اٹھ بیٹھا۔ ”آؤ تمہیں پڑیا دیں۔“ وہ بولا۔ ”آؤ۔“  
 ”ہاشم سے فارغ ہو کر وہ چپ چاپ سٹیشن پر بیٹھے رہے۔ شہزاد اپنے ہی خیالات میں کھوئی رہی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو۔“ وہ شہزاد سے پوچھنے لگا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ بولی۔

ڈاکٹر کی باتوں پر دھیان نہ دو ایلی نے کہا۔ ”وہ صرف ڈاکٹر ہی نہیں۔ دیوانہ بھی ہے۔ بہت اعلانی بھی ہے۔ روحانیت سے بھی شغف رکھتا ہے۔ عجیب آدمی ہے۔ شاید تم سوچ رہی ہو لڑاتی ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔“  
 ”وہ تو میں دیر سے جانتی ہوں۔“ شہزاد بولی۔

”کیا؟“

یہی کہ تم اکیلے رہ جاؤ گے اور میں چلی جاؤں گی۔ لیکن ایلی ایک بات ہے۔“  
 ”کیا؟“

شہزاد نے اس کا ہاتھ تھام لیا ”میرے جانے سے پہلے کہیں مجھے چھوڑ نہ جانا۔“  
 ”پاکل ہو گئی ہو۔“ وہ بولا

”بس مجھے یہی ایک فکر ہے۔“ شہزاد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں کیا؟“

”ہے۔“ وہ بولی۔ ”لیکن پتہ نہیں کیوں یہ خیال بار بار میرے دل میں اٹھتا ہے۔“

وہ تہقہ مار کر ہنس پڑا۔

جب وہ شاہ وال پہنچے تو شہزاد کی طبیعت پہلے کی نسبت بہتر تھی۔ پھر روز بروز اس کی طبیعت نرم ہوئی گئی۔ حتیٰ کہ وہ صحت یاب ہو گئی۔

صحت یاب ہونے کے بعد بھی وہ اداس رہتی تھی۔ کئی بار بیٹھے بیٹھے جب اس کی نگاہ بڑی لیل پر پڑتی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ دراصل اسے لڑکیوں کا غم کھائے جا رہا تھا۔ لڑکا خیال تھا کہ ان لڑکیوں کے لئے کوئی رشتہ نہیں ملے گا۔ چونکہ وہ اس کی بیٹیاں تھیں۔ کوئی

مل جاتی ہے۔ سب اللہ کی شعبہ بازی ہے کون حکیم ہے اور کون ڈاکٹر سب ڈھونگ ہے ڈھونگ ”وہ پھر خاموش ہو گیا۔

”تم کیا کام کرتے ہو۔“ اس نے ایلی سے پوچھا۔

”جی میں بچے پڑھاتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”تم بچے پڑھاتے ہو۔“ اس نے ایلی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”جی۔“ ایلی نے کہا۔

”تم اس کام کی اہلیت نہیں رکھتے۔“

”جی۔“ ایلی نے کہا۔

”اور تم یہ کام کرو گے بھی نہیں۔“

”جی۔۔۔؟“

”چھوڑ جاؤ گے۔“ ڈاکٹر نے پھر سے اپنا منہ کبل سے ڈھانپ لیا اور اپنی بات جاری رکھی۔

”تمہاری زندگی میں گزرتا ہے۔“ وہ بولا۔ ”ذرا نبض دکھاؤ۔“ اس نے ایلی سے کہا اور اپنا ہاتھ کبل سے نکال کر ایلی کی نبض دیکھنے لگا۔ دیر تک نبض ہاتھ میں پکڑ کر بیٹھا رہا۔

”سب کچھ غلط ہے“ وہ بولا۔ ”سرے سے سب کچھ غلط۔ دل و دماغ اعضاء سب غلط ہیں۔

سب الٹ پلٹ ہو رہا ہے۔ سودا کی طرف مائل ہو۔ صرفا حد تک پہنچ چکا ہے۔ پاگل ہو جاؤ گے۔“ وہ بولا۔ ”یقیناً“ ہو جاؤ گے۔ بچاؤ کی صرف ایک صورت ہے۔“ اس نے کہا ”صرف ایک اگر ادھر نہ پہنچے تو میٹل ہسپتال میں پہنچ جاؤ گے۔ اور وہیں مرو گے۔“

”ادھر کدھر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”وہ بھی ایک سمت ہے۔ ایک ایسی سمت جس سے تم واقف نہیں ہو۔“ ڈاکٹر نے جواب

دیا۔

”تو پھر ادھر پہنچے گا کیا امکان ہو سکتا ہے اگر میں ادھر سے واقف ہی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

ڈاکٹر ہنسا۔ ”وہی پہنچتے ہیں جو واقف نہیں ہوتے۔ بلائے جاتے ہیں۔ اللہ نے بڑے پاکھنڈ

بچا رکھے ہیں۔“ اس نے سر سے کبل پھراتا رہا۔

”تم لڑکی۔“ وہ شہزاد کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تمہارا اس کا ساتھ نہیں چلے گا۔ دیر تک

نہیں چلے گا۔ تمہاری یہ بیماری۔۔۔ تمہیں لے جائے گی۔“ ہاں لے جائے گی۔ لیکن

یلت پر اخلاق اور آواز بہت رسیلی تھی۔ ثناء اللہ کے بیان کے مطابق وہ سکرٹریٹ میں ایک اعلیٰ درجے پر فائز تھا۔

چھوٹا بھائی ضیاء ابھی نوجوان ہی تھا۔ اس نے ایف اے تک تعلیم پائی تھی اور آنکھوں میں دہلی چمک تھی۔

شہزاد اور ایلی ان سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔

”لو۔“ ایلی نے کہا۔ ”تمہارا یہ غم بھی دور ہو گیا۔ صبیحہ کو اچھا رشتہ مل گیا۔“

”اونہوں۔“ شہزاد بولی۔ ”میں خوش نہیں ہوں۔ ایف اے سے کیا ہوتا ہے آج کل لڑکا ہری طرح تعلیم یافتہ نہیں اور جب تک اسے مناسب ملازمت نہ مل جائے میں یہ کام نہیں لائے گی۔“

ہر صورت اس بات چیت کا یہ نتیجہ ہوا کہ صبیحہ اور ضیاء نام زد ہو گئے۔

بہزنگی سے پہلے ایلی ایک روز ثناء اللہ کو مدرسے میں ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا۔ اہی پشتر اس کے کہ اس امر کا فیصلہ ہو میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تمہیں اپنے حالات سے لگ کر دلوں تاکہ ایسا نہ ہو کہ کل تمہیں ان تفصیلات کا علم ہو اور تم ہم سے گلہ کرو کہ ہم نے ہر دعوے میں رکھا۔“ یہ کہہ کر ایلی نے اپنی زندگی کے متعلق اہم باتیں اسے بتا دیں۔

ثناء اللہ غور سے اس کی باتیں سنتا رہا اور پھر مسکرا کر بولا۔ ”میں سب علم ہے۔ آپ نے لائق بات نہیں سنائی۔“

”تو کیا۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”آپ نے یہ سب جانتے ہوئے پیغام دیا تھا۔“

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”ذکاء زندگی بھر بیرونی ممالک میں گھوما ہے۔ وہ ان باتوں کو درخور اعتنا نہ سمجھتا اور چونکہ چھوٹا ضیاء اس کے زیر اثر ہے اس لئے اس کا نقطہ نظر بھی رسمی نہیں ہے۔“

لدا ایک ماہ کے بعد ایک روز شہزاد اور ایلی کو اکٹھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں پہنچ کر دسے کہا۔ ”اب جو یہاں آئے ہیں تو ذکاء اور ضیاء سے مل کر جانا چاہئے۔ انہیں علم ہو گا کہ لاہور آئے تھے اور ملے بغیر چلے گئے تو وہ برا مانیں گے۔“

یہ سوچ کر وہ دونوں انارکلی گئے وہاں سے انہوں نے پھل وغیرہ خریدا اور پھر مل روڈ کی پہل پڑے۔ انہیں صرف یہ معلوم تھا کہ ضیاء اور ذکاء اکٹھے نمبر ۱۱۳ کی کوٹھی میں رہتے

عزیز یا رشتہ دار ان سے شادی کرنے کے لئے تیار نہ ہو گا۔ شہزاد نے اپنے اس خیال کے متعلق ایلی سے بھی کئی بار بات کی تھی لیکن ایلی اس کی بات پر ہنس دیتا تھا۔ ”ابھی سے کیوں فکر کرتی ہو۔“ وہ کہتا۔

”میرے پاس زیادہ وقت بھی ہو۔“ شہزاد جواب دیتی۔

اس پر ایلی چڑ جاتا۔ ”کیا واقعی تم یہ خیال دل میں لیے بیٹھی ہو کہ تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”کیا تمہیں ابھی تک یقین نہیں آیا۔“ شہزاد پوچھتی۔

”پاکل ہو“ وہ چلاتا۔ ”خواہ مخواہ کے فکر لگائے بیٹھی ہو۔“ اسے واقعی اس بات پر غصہ آ جاتا تھا۔ لیکن اس کے غصے نے کبھی لڑائی کی صورت اختیار نہ کی تھی۔

## بھارت سیمٹ

ایک روز ثناء اللہ اپنی بیوی کو ان کے ہاں لے آیا۔ اس کی بیوی بڑی لڑکی صبیحہ کو دیکھتے ہی چلانے لگی۔

”ہائے کتنی پیاری بیٹی ہے۔ تمہاری۔“ اہی واری جاؤں۔ اہی تجھے پیار کروں۔“ اس نے صبیحہ کو اپنے پاس بیٹھایا اور اسے پیار کرنے لگی۔

صبیحہ حیران تھی وہ زیر لب ہنسے جا رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک بیگانہ عورت اس پر اس قدر مفتون کیوں ہوئی جا رہی ہے۔ شہزاد کو بھی حیرت ہو رہی تھی۔

اگلے روز ہی بھانڈا پھوٹ گیا۔ ثناء اللہ اپنے چھوٹے بھائی کا پیغام لے کر آیا۔ ”صبیحہ کو تو ہم نے اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔“ وہ بولا۔ ”میری بیوی تو اسے دیکھ کر اپنا دل دے چکی ہے۔ کل سے اسی کر باتیں کرتی ہے۔ بات بات پر اسی کا تذکرہ اگر آپ ہم غریبوں کا پیغام منظور کر لیں تو بہت کرم نوازی ہوگی۔“

چند ہی روز کے بعد ثناء اللہ نے اپنے دونوں بھائیوں کو شاہ وال بلایا تاکہ وہ ایلی سے مل سکیں۔

اس کا بڑا بھائی ذکاء اللہ شکل و صورت اور بات چیت سے خالص فنکار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاں گیسوؤں کی طرح لمبے تھے۔ چہرے سے خوش مذاقی اور ذہنی چمک واضح تھی۔ گفتگو

## ریتی گن گلی

”آٹا خیا ہے۔“ ایللی چلایا۔ ”یار ہمیں نمبر ۳۳ ملتا ہی نہیں تھا۔ دیر سے تلاش کر رہے

ایلی نے یوں محسوس کیا جیسے خیا چپ چاپ کھڑا اس کے منہ کی طرف دیکھ رہا ہو۔ ایک  
ت کے بعد خیا بولا۔

”اس بلاک کے پچھواڑے میں ہے۔ ہمارا گھر۔“

ایلی اور خیا شہزاد کو ساتھ لے آئے اور خیا انہیں اس بلاک کے پچھواڑے کی طرف  
ایک گول کمرے کے قریب پہنچ کر ایللی نے دیکھا کہ موسیقی بالکل بند ہو چکی ہے اور کمرے  
لٹی بھی نہیں۔

ذکا انہیں بہت تپاک سے ملا۔ ”آپ نے آنے کی اطلاع کیوں نہ دی۔“ وہ بولا۔

”ویسے ہی آئے تھے۔“ شہزاد بولی۔ ”تو ہم نے کہا آپ کو مل لیں۔“

”پھر بھی اطلاع دینا مناسب ہوتا ہے۔“ خواہ مخواہ آپ کو کوفت ہوئی۔ ”ذکا نے  
بات بدلی۔

چند منٹ بیٹھنے کے بعد ایللی اور شہزاد نے اجازت طلب کی۔ ”گھاڑی چلنے میں صرف ایک  
دہر گیا ہے۔“ ایللی نے کہا۔

خیا اور ذکا انہیں تانگے تک چھوڑنے آئے۔

جب وہ اکیلے رہ گئے تو شہزاد بولی۔ ”ان کے گھر تو کوئی بھی عورت نہیں۔“

”ذکا کی بیوی تو مر چکی ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”مجھے یہ بات یاد ہی نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ کوئی عورت ہو گی گھر میں۔“ شہزاد بولی۔

ابھی ان کا تانگہ سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ ایللی تانگے والے سے بولا۔ ”بھئی ذرا ٹھہرنا میں ذرا  
ٹالے آؤں۔“

اور وہ اسی دکان پر سگریٹ خریدنے چلا گیا۔ جہاں سے انہوں نے پتہ پوچھا تھا۔

ہواڑی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بڑے بامعنی انداز سے کہنے لگا۔ ”کیوں بھاجی  
تہیں وہ لوگ۔“

ہیں۔ دیر تک وہ بل روڈ پر گھومتے پھرے۔ لیکن انہیں ۳۳ نمبر کی کوٹھی کا پتہ نہ چلا۔ آخر ایللی  
ایک دوکان پر گیا۔ پان فروش سے پوچھا۔ ”بھائی نمبر ۳۳ کا بنگلہ کدھر ہے۔“

نمبر ۳۳ ہواڑی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے قریب کھڑے ایک آدمی کو آواز دی۔ ”کیوں  
بھاجی۔“ وہ بولا۔ ”بھلا نمبر ۳۳ کی کوٹھی کون سی ہوئی۔“

”۳۳۔“ وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اس پر دو چار آدمی اور آگئے۔

”بھائی صاحب کچھ اتا پتہ دیجئے خالی نمبر سے تو کام نہیں چلے گا۔“ ایک آدمی نے کہا۔

”بھئی ان کا نام ذکا اللہ ہے یہاں سیکرٹریٹ میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔“ ایللی نے جواب  
دیا۔

”ہوں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

”کتنے بھائی ہیں۔“ ایک نے پوچھا۔

”دو بھائی ہیں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”ارے۔“ ایک چلایا۔ ”وہ ناچے تو نہیں کیا۔“

اس پر ان سب نے غور سے ایللی اور شہزاد کا جائزہ لیا۔

”ارے نہیں۔“ ایک بولا۔ ”وہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ بھئی انہیں ملنے تو میسین آتی ہیں۔“

”ناچے۔“ ایللی سن کر مسکرایا۔ ”ناچے کا کیا مطلب۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

”معلوم نہیں جی۔“ ایک شخص بولا۔ ”آپ ان پچھلے بنگلوں میں دیکھیں۔ شاید وہیں  
ہوں۔“

ایلی ان بنگلوں کی طرف چل پڑا۔ شہزاد تانگے میں بیٹھی رہی۔

ساننے بنگلے سے موسیقی کی آوازیں آرہی تھیں۔ بنگلے کے گول کمرے پر بورڈ آؤریاں تھیں۔

”بھارت سیتھ۔“ گول کمرے میں ساز سنگیت کا ریکارڈ چل رہا تھا۔ کس قدر صاف ہواڑی تھی۔

کیسا اچھا باجہ تھا۔ ایللی نے قریب جا کر اندر جھانکا۔ کمرے میں ایک جوان حسین و جمیل لڑکی بیٹج  
رہی تھی۔

”ارے۔“ وہ گھبرا گیا۔ ”کس قدر خوبصورت لڑکی ہے۔ انگریز تو نہیں۔ ہندوستانی معلوم  
ہوتی ہے۔“ ایک ساعت کے لئے وہ کھڑا دیکھتا رہا۔

وہ تھا اس گول کمرے سے ایک نوجوان باہر نکلا۔ ”ارے۔“ وہ خیا تھا۔

ایلی خود حیران تھا۔ شرمیلی گن گلی پڑھ کر وہ خود سوچ بچار میں کھو گیا تھا۔  
کھیل شروع ہوا۔ وہی حسین و جمیل لڑکی جسے ایلی نے گول کمرے میں دیکھا تھا۔ سٹیج پر آ  
ئی۔ اس نے ناظرین کو دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا پھر یورپین فیشن کے مطابق جھکی اور پھر تتلی  
کی طرح محو رقص ہو گئی۔ اس کی حرکات میں لے تھی۔ اعضاء میں ہلا کی چمک تھی اور چہرہ  
تراشوں سے بھرپور تھا۔ ایلی بھول گیا کہ وہ کیوں شو دیکھنے آئے تھے اور انہیں کس بات کا پتہ  
نہیں تھا۔

شرمیلی نے تین سولو ناچ پیش کئے۔ چوتھے ناچ میں اس کے ہمراہ ایک نوجوان تھا۔ نوجوان  
اوپر کمر شہزاد ٹھٹھکی - ”یہ تو مجھے ضیاء معلوم ہوتا ہے۔“ وہ بولی۔  
”ضیاء؟“ ایلی چونکا اسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ ضیاء کون تھا۔ ”وہ ضیاء“ کچھ دیر کے بعد  
ابولا۔ ”نہیں نہیں۔ کہاں ضیاء کہاں یہ لڑکا۔ یہ تو کوئی مدراسی معلوم ہوتا ہے۔“  
چوتھے ناچ کے بعد انڈول ہو گیا اور ذکاء بنس نفیس سٹیج پر آکر ناظرین کا شکریہ ادا کرنے لگا۔  
زلونے ایلی کی طرف دیکھا۔ غصے سے اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔  
اگلے روز شاہ وال آتے ہوئے شہزاد گاڑی میں بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔  
”آخر رونے کا مطلب۔“ ایلی بولا۔  
”کچھ نہیں۔“ وہ کہنے لگی۔

”ناچنا تو ایک فن سمجھا جاتا ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”یہ ناچ کوئی طائفہ ناچ تو نہیں ہے نا۔ پھر  
لیل دل برا کرتی ہو۔“  
”نہیں ایلی۔“ وہ بولی۔ ”وہ میری صبیحہ کو نکالیں گے۔ اس کے شو کریں گے۔“  
”تو کیا ہوا۔“ ایلی نے کہا۔ ”یہ تو بھارت نیٹم ہے۔ بھارت نیٹم تو فن ہے۔ عیب تو  
نہیں۔“

”لیکن لوگ کیا کہیں گے۔“ وہ بولی۔  
”تم تو لوگوں کی پرواہ نہیں کیا کرتی تھی۔“ ایلی نے کہا۔  
”اپنے لئے نہیں کرتی تھی نا۔“ وہ بولی۔ ”لڑکیوں کے متعلق پرواہ کرنی ہی پڑتی ہے۔“  
”تو کیا انہیں جواب دے دو گی۔ منگنی توڑ دو گی۔“ ایلی نے پوچھا۔  
”ہائے تو کیا ناچوں کو دے دوں اپنی بچی۔“ شہزاد نے جواب دیا۔

”جی۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”مل گئے۔“  
”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا بھابی۔“ وہ بولا۔ ”کہ وہی ہوں گے۔“  
”نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”وہ تو پچھلے ہلاک میں رہتے ہیں۔“  
”اجی وہی ہیں نا جو ابھی آپ کو تانگے تک چھوڑنے آئے تھے۔“ پنواڑی بولا۔ ”دو بھائی  
ہیں اور ایک بہن بہت اچھا ناچتی ہے وہ بھائی خود سکھاتا ہے اسے ساری عمر مدراس میں رہا ہے نا  
میں سے سیکھ کر آیا ہے۔“  
بھارت سسٹیم! ایلی کے روبرو گول کمرے کا بورڈ آگیا۔  
”آج ہی شو ہے بھابی۔“ پنواڑی بولا۔ ”اپنے کیپٹل میں ہو گا۔ ہم بھی جا رہے ہیں۔  
دیکھنے کے لئے۔“

ایلی نے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔  
جب شہزاد کو ایلی نے پنواڑی کی بات بتائی تو وہ پنچے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔  
”لوگوں کا کیا ہے۔“ وہ بولی ”خواہ مخواہ ہستان لگاتے ہیں۔ اگر ان کی بہن ہوتی تو کیا وہ  
ہمارے سامنے نہ آتی۔ اتنی دیر ہم بیٹھے رہے ان کے گھر اور گھر کی صورت ہی سے ظاہر تھا کہ  
کوئی عورت نہیں رہتی وہاں۔“  
اس پر ایلی کو وہ لڑکی یاد آگئی جو گول کمرے میں ناچ رہی تھی۔  
”کیا وہی ان کی ہمشیرہ تھی۔ کتنی خوبصورت تھی وہ۔“ ایلی سوچنے لگا۔  
”تو پھر آج کی رات ہم یہی رہ جاتے ہیں۔“ ایلی نے شہزاد سے کہا۔  
”کیوں۔“ وہ بولی۔  
”وہ کہتا تھا آج شام کو ان کا شو ہے اور ان کی بہن ناچے گی۔ چلو آج دونوں شو دیکھیں  
گے۔“

شہزاد اس کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن اس کے بغیر انہیں حقیقت کا پتہ نہیں چل سکتا تھا  
لہذا وہ مجبوری میں ایلی کی بات مان گئی۔  
شام کو جب وہ کیپٹل میں پہنچے تو اشتہار میں لکھا تھا۔ بھارت سسٹیم کا شاہکار شرمیلی گن  
پیش کریں گی۔  
شہزاد چلائے گئی۔ ”ناچ دیکھنے کو اپنا جی چاہتا تھا اس لئے بہانہ بنا کر لاہور رک گئے۔“

ناظم کے چہرے سے ذہانت کے آثار مترشح نہیں ہوتے تھے۔ اس کے خدو خال عام سے لے کے بلوچو یہ احساس دیتے کہ ان کو سمجھنا آسان نہیں۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا سا فرق تھا اندر ہلکا کہ کسی وقت دکھائی نہ دیتا اور نہ محسوس ہوتا لیکن کسی وقت وہ اس قدر شدت سے غم ہوتا جیسے ڈھول بجا بجا کر اپنے وجود کا احساس دلا رہا ہو۔

ناظم سے چار ایک مرتبہ ملنے کے بعد ایلی نے محسوس کیا کہ وہ ایک مجموعہ افساد تھا۔ مثلاً "کے چہرے پر ذہانت کا فقدان تھا۔ اس کے بلوچو وہ اکثر ذہانت بھری بات کرتا اور ایلی حیرانی اس کی طرف دیکھتا۔ ناظم کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ مجلسی آدمی نہیں اور سوسائٹی سے دور پسند کرتا ہے۔ لیکن چند ہی دنوں میں ایلی نے دیکھا کہ بورڈنگ کے تمام لڑکے اس کے گرد رٹ کئے بیٹھے ہیں تمام لڑکے تھوڑے ہی عرصے میں ناظم کے مداح ہو گئے تھے۔ اور اس کے ادا قابلیت کے متعلق سارے سکول میں دھوم مچ گئی تھی۔ اس کے علاوہ ناظم کے چہرے پر ہٹو رہو قسم کی علامات ہر وقت موجود رہتی تھیں جو لوگوں سے میل جول پیدا کرنے میں رکاوٹ رہتیں۔ اس میں ایک واضح جھجک تھی۔ لیکن درحقیقت اس کا دل جذبات کی شدت سے بھرا تھا۔ اسے دیکھ کر شک پڑتا کہ وہ جذبات سے خالی ہے اور حیات سے کورا ہے لیکن حقیقت جذبات اور خصوصاً "شدت اس کے کردار کے بنیادی پہلو تھے۔

بی اے ہونے اور سوٹ پہننے کے بلوچو ناظم کی طبیعت امرتسر کے "بھائی۔" قسم کی تھی۔ بہترین دوست اور بدترین دشمن ہوتے ہیں جو دکھلاوے سے دور بھاگتے ہیں اور کسی کا رعب اٹھ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

ناظم اور ایلی کی دوستی روز بروز بڑھتی گئی اس کی تمام تر ذمہ داری ناظم پر عائد ہوتی تھی۔ روز شام کے وقت وہ ایلی کو آواز دیتا۔ "آصفی صاحب۔" اور پھر اسے ساتھ لے کر باہر نکل لے ایلی سیرو تفریح کا مشتاق نہ تھا۔ اس لئے وہ شامیں گھر پر ہی بسر کرنے کا عادی تھا۔ عام طور پر اہل وقت مطالعہ میں بسر کرتا۔ ناظم زبردستی اسے باہر لے جاتا اور وہ دیر تک گھومتے رہتے۔ ناظم میں دلچسپی محض کتابی قسم کی تھی۔ وہ اس کی شخصیت کے متعلق معلومات حاصل کرنا ہاتھ لگاتا۔ اسے ایسی عجیب و غریب شخصیت سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔

ناظم کو بازار میں کھانے پینے کی بہت عادت تھی۔ مثلاً "وہ سوڈا پینے کھڑا ہوتا تو سوڈے کی بوتلیں پی جاتا کباب کھانا شروع کرتا تو دو درجن کباب کھا جاتا پہلے روز ہی جب اس نے دو

لاہور سے آنے کے بعد شہزاد پر بلاسی چھا گئی۔ ایک تو صبیحہ کی بنی بنائی بات ٹوٹ گئی تھی دوسرے وہ بچے سے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دل کی تموں میں بیضا ہوا غم چڑھا ہٹ اور غصے میں بدل گیا۔ بات بات پر اس کا غصہ جوش میں آ جاتا اور پھر بھوک شیری کی طرح کچار میں بیٹھ کر غراتی رہتی۔ ایلی اس کی اس تبدیلی پر ہیخ پا ہو جاتا ہے۔

وہ دن ان کے لئے نہایت تلخ تھے۔ وہ گھر جہاں ہر وقت دھما چوڑی مچی رہتی تھی۔ تاش اور چوہٹ کی بازی لگی رہتی تھی جہاں لڑکیاں ناچتی تھیں۔ بچے قفقہ لگاتے تھے وہ گھر ویرانے میں بدل چکا تھا۔ حالانکہ ان کی مالی مشکلات کسی حد تک کم ہو گئی تھیں۔ چونکہ ریاض اور کپور کی کوششوں کی وجہ سے ایلی کو بورڈنگ کا سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا تھا اور اب وہ کرایہ کے مکان کو چھوڑ کر سرکاری کوارٹر میں مقیم ہو گئے تھے اس طرح اسے کچھ مالی امداد حاصل ہو گئی تھی۔ ایک تو اسے مکان کا کرایہ نہیں دینا پڑتا تھا اور دوسرے ایک قلیل رقم الاؤنس کے طور پر ملنے لگی تھی۔

ناظم

انہی دنوں ڈائریکٹر تعلیم نے ان کے سکول میں ایک جوئیر کلرک کی آسامی منظور کر دی تھی اور ایک نیا کلرک اس آسامی پر مامور ہو کر وہاں پہنچ گیا تھا۔

وہ ایک نوجوان بی اے تھا۔ اس کا نام ناظم تھا۔ اگرچہ دیکھنے میں وہ نہ تو بی اے نظر آتا تھا اور نہ اسے نظم سے کوئی تعلق معلوم ہوتا تھا۔ چونکہ ناظم شادی شدہ نہ تھا اور شاہ وال میں نوازد تھا اس لئے اسے بورڈنگ میں قیام کرنے کی وجہ سے ایلی اور وہ روزانہ ملا کرتے تھے۔ پہلے روز جب ایلی نے ناظم کی طرف دیکھا تو اسے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ اگرچہ ناظم نے سوٹ پہن رکھا تھا لیکن اس کا سوٹ گویا سوٹ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی شخصیت سوٹ اور بی اے دونوں سے بے نیاز تھی۔ ناظم اے بی کورس کا گریجویٹ تھا۔ جب ایلی کو اس تفصیل کا علم ہوا تو وہ اور بھی حیران ہوا اس کے علاوہ جب اسے یہ علم ہوا کہ ناظم ریاض پڑھانے میں بڑی دسترس رکھتا ہے تو ایلی بالکل ہی کھو گیا۔ شخصیت کو سمجھنے کے متعلق ایلی کو اپنے اندازوں پر بڑا ناز تھا اس کا خیال تھا کہ وہ شخصیت اور کردار کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن ناظم کو دیکھ کر اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا شے ہے۔



علی راجو کے پہلے خاوند سے تھا اور جب وہ علی احمد کے گھر آئی تھی تو اس کی گود میں تھا۔ اور نصیر علی احمد سے تھا۔

نصیر اس زمانے کی پیداوار تھا۔ جب علی احمد بڑھاپے کے اولین دور میں قدم رکھ چکے تھے۔ اس لئے علی احمد نے غیر از معمولی محبت سے پالا تھا۔ اگرچہ یہ محبت خصوصی محبت تھی۔ جس میں علی احمد کی جھلک تھی۔ لیکن اس کے باوجود نصیر کی جسمانی یا شخصیت پھل پھول نہ سکی تھی۔ جسمانی طور پر وہ کمزور تھا اور اکثر بیمار رہتا تھا۔ طبیعت کے لحاظ سے وہ جذباتی کمزور اور نیکی کی طرف مائل تھا۔ وہ بڑوں کا ادب کیا کرتا تھا۔ ماں باپ کا احترام کرتا تھا اور ایللی سے بہت متاثر تھا۔

نصیر کے برعکس شیر علی جسمانی طور پر مضبوط تھا۔ اس کے جسم کے ساخت ہی اس بات کو واضح کرتی تھی کہ وہ آمفیوں میں سے نہیں اور علی احمد کے خاندان سے ہٹ کر ہے وہ بھلا خاموش تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ دل کی بات چھپا کر رکھتا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ بڑا آدمی بنے۔ شیر علی میں جنسی پہلو کی شدت تھی اور اس شدت میں پراسراریت کا عنصر تھا۔

دسویں پاس کرنے کے بعد شیر علی دورا ہے میں ایک ٹیکنیکل کورس کرنے کے لئے چلا گیا تھا اور ایک سال کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد واپس آیا تھا۔

جب وہ واپس آیا تو اس کا قد بہت بڑھ گیا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا۔ جیسے جوان ہونے سے پہلے ہی جوان ہو گیا ہو۔ وہ گھر کی کسی بات میں با آواز بلند دخل نہیں دیتا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ گھر میں اس کی پوزیشن ایسی نہ تھی۔ جیسے ایللی یا نصیر کی تھی یا شاید بھلا۔ وہ بات کہہ دینے کی صلاحیت سے بے گناہ تھا۔ لیکن ایللی محسوس کرتا تھا کہ اس کے دل کی تہوں میں ان کی باتوں کا غماز لگا ہے۔ ایللی کو اس کی شخصیت کا یہ پہلو پسند نہ تھا۔

دورا ہے سے ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد علی پور آتے ہی شیر علی کو ایللی کی پرانی منگیتر ٹھوکی چھوٹی بہن عامرہ سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو خفیہ خط لکھا کرتے تھے اور لب بام کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتے اور اشارے کیا کرتے تھے۔ لیکن شیر علی نے اس کے متعلق کبھی کسی سے بات نہ کی تھی۔

شیر علی کو محلے والے ہمیشہ بیگانہ سمجھتے تھے۔ چونکہ وہ آمفیوں میں سے نہ تھا۔ حالانکہ محلے

درجن کباب کھائے اور اس کے اوپر تین مینھی بوتلیں ہیں تو ایللی گھبرا کر بولا۔ ”کیا ہوا ہے تمہیں ناظم صاحب۔“

”یار۔“ اس نے کہا۔ ”بہت دکھ لگا ہوا ہے آج۔“

”دکھ۔“ ایللی نے حیرت سے پوچھا۔ ”دکھ لگا ہو تو بھوک نہیں لگتی۔“

”مجھے تو بہت لگتی ہے اتنی لگتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ دنیا بھر کی چیزیں پیٹ میں جمویں دوں۔ اندر ایک خلاء پیدا ہو جاتا ہے جو بھرتا ہی نہیں“ ناظم نے جواب دیا۔

”کیا واقعی؟“

”ایمان سے۔“

”عجب بات ہے۔“

”عجیب کہں۔“ وہ بولا یہ تو میرا دستور ہے بچپن سے ہی ایسا ہے۔“

”آج کیا غم ہے تمہیں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”میرا دوست بیمار ہے۔“ ناظم بولا۔

”دوست بیمار ہے؟ کون سا دوست؟“

”آج ہی خط آیا ہے ساری دنیا اندھیر ہو رہی ہے۔“ ناظم بولا۔

”ارے بس اتنی سی بات پر غم ہے تمہیں۔“

”اتنی سی بات۔“ اتنا ناظم نے غصے سے ایللی کی طرف دیکھا۔ ”دوست کی بیماری سے بڑھ کر

اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ کیا دکھ ہو سکتا ہے۔“

ایللی حیران تھا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ ناظم کی آنکھوں کا فرق نمایاں ہوتا جا رہا تھا اور تجربے کی بنا پر ایللی کو علم ہو چکا تھا کہ اس کی آنکھوں کا زاویہ جذبات کی شدت کی وجہ سے بدلتا ہے۔ ایسی صورت میں ناظم سے عقل کی بات کہنا اچھے اثرات پیدا نہیں کر سکتا۔ بہر حال ناظم کے آنے سے ایللی کے دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔

## نصیر اور شیر

پھر ان کے گھر نصیر اور شیر علی آ گئے۔

شیر اور نصیر ایللی کے بھائی تھے وہ دونوں راجو کے بطن سے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ شیر

اس کے سامنے ڈاکٹر ہاشم آکھڑا ہوا۔ ”یہ بچہ۔“ وہ بولا۔ ”بہت کچھ لائے گا۔ بہت کچھ“  
ایلی طرف عالی۔ عالی۔“ ایلی کے کانوں میں ہاشم کی آواز گونج رہی تھی۔  
”عالی۔“ ایلی نے بچے کی طرف دیکھا۔  
”اور تم لڑکی۔“ ہاشم نے شہزاد کی طرف دیکھا۔ ”تم چلی جاؤ گی۔“  
”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ شہزاد نے نگاہیں جھکا لیں۔

ایلی باہر جنگلے میں نکل گیا اور کمری کی طرف دیکھنے لگا۔ شیش پر ایک گاڑی  
کمری تھی۔ پلیٹ فارم پر لوگ ادھر ادھر چل رہے تھے اس کے باوجود ایسے دکھائی دے رہا تھا۔  
جیسے تمام دنیا پر جمود طاری ہو۔ جیسے لوگ نیند میں چل رہے ہوں۔  
عالی کی آمد کے بعد ایلی کے گھر میں ایک نئی دل چسپی پیدا ہو گئی۔ شہزاد کی بد مزاجی دور ہو  
گئی۔ لڑکیاں عالی میں کھو گئیں۔ سارا دن وہ اسے کھلاتیں۔ اٹھائے پھرتیں۔ عالی کے آنے سے  
گھر میں ایک بار پھر زندگی پیدا ہو گئی۔  
ایک مرتبہ شہزاد اور ایلی کو لاہور جانا پڑا۔

### محمود اور نقلیہ

جب وہ لاہور سے لوٹے تو شاہ وال میں محمود ان کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

ان دنوں محمود بی اے کر چکا تھا۔ اب وہ لاہور میں محکمہ تعلیم کے ہیڈ آفس میں پرنسپل  
تھا۔ ایلی محمود سے مل کر ہمیشہ خوش ہوتا تھا۔ وہ پرانے ساتھی تھے اور جب بھی آپس میں ملے  
تھے علم و ادب کے علاوہ نفسیات پر بحث کرتے یا پرانی باتوں کو دہرا دہرا کر ہنسا کرتے۔  
شام کے وقت محمود اور ایلی دونوں سیر کے لئے باہر نکل گئے۔ تو محمود نے بات چھیڑ دی۔  
کنے لگا۔ ”ایلی یار تم ان لڑکیوں کی شادی کیوں نہیں کر دیتے۔ وہ اس گھر میں خوش نہیں  
ہیں۔“

شادی کی بات تو خیر ٹھیک تھی۔ لیکن یہ سن کر وہ گھر میں خوش نہیں ایلی چونکا۔  
”خوش نہیں ہیں۔“ ایلی نے محمود کی طرف دیکھا۔ ”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ خوش  
نہیں۔“

محمود اپنے پر اسرار انداز سے مسکرایا۔ عورتوں کے معاملے میں اس کی شخصیت میں ایک

میں پیشتر لوگ ایسے تھے۔ جنہیں آصفی خاندان سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ کیونکہ بہت سے لوگ  
باہر سے آکر وہاں مقیم ہو گئے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے متعلق کبھی صحیح جائزہ نہ لیا تھا۔  
شیر علی کے رومان کی بات باہر نکلی تو عامہ کی والدہ غصے سے بھوت بن گئی۔ اسے پہلے ہی  
علی احمد کے خاندان کے خلاف شکایت تھی۔ چونکہ ایلی نے اعلانیہ اس کی بڑی بیٹی ثمرہ سے شادی  
کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ دونوں منسوب تھے اور ان کی منگنی بڑی دھوم دھام سے  
ہوئی تھی۔

اب جب اسے علم ہوا کہ شیر علی جان بوجھ کر عامہ کو دیر غلا رہا ہے۔ تو وہ سمجھی کہ شیر علی  
کا مقصد صرف اس کے گھرانے کو بدنام کرنا ہے۔

ایلی کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ راجو سے بات کرنے کے بعد خود عامہ کی والدہ زبیدہ سے ملا  
اور اس نے کوشش کی کہ زبیدہ شیر علی اور عامہ کی شادی پر رضامند ہو جائے اس پر زبیدہ کو  
اور بھی غصہ آیا۔ ایلی کی اتنی ہمت کہ وہ شیر علی کا پیغام لے کر آئے جب کہ اس نے ثمرہ کے  
سللے میں اس سے اس حد تک بد سلوکی کی تھی کہ آخر وہ ثمرہ کو نور علی سے بیاہنے پر مجبور ہو گئی  
تھی۔ حالانکہ ثمرہ اور نور علی میں بیس پچیس سال کا فرق تھا اور نور علی کی پہلی شادی سے ایک  
بیٹی تھی جس کی عمر ثمرہ سے کم نہ تھی۔

نصیر اور شیر علی بہت دیر کے بعد ایلی سے ملے تھے۔ کیونکہ شہزاد اور ایلی تو بن باسیوں کی  
سی زندگی بسر کر رہے تھے اور محلے میں نہیں جاسکتے تھے۔ نصیر بڑی محبت سے ایلی کو ملا شیر علی اپنی  
طبیعت کے مطابق خاموش تھا اگرچہ اس کے انداز میں رسی ادب اور اخلاق بدرجہ اتم موجود  
تھے۔ وہ دونوں دو ایک روز شاہ وال رہے اور پھر واپس علی پور چلے گئے۔

ان کے جانے کے چند روز بعد ایک دن صبح سویرے ہی لڑکیوں نے ایلی کو بچایا۔ ”ایلی کی  
طبیعت اچھی نہیں۔ انہوں نے کہا۔ ایلی شہزاد کی طرف گیا۔ شہزاد نے اٹھنے کی کوشش کی اور  
دھڑام سے گر کر بے ہوش ہو گئی۔ ایلی گھبرا گیا۔ اور اٹھ کر ڈاکٹر کی طرف بھاگا۔ لڑکیاں  
سسم گئیں۔

جب وہ ڈاکٹر کو لے کر آیا تو دیکھا کہ شہزاد چارپائی پر پڑی کراہ رہی ہے اور اس کے پاس  
چارپائی پر ایک بچہ چپ چاپ پڑا ہے۔ لڑکیوں کے پاس ان کی پڑوسن بیٹی مسکرا رہی تھی۔  
ایلی نے غور سے بچے کی طرف دیکھا۔

عجیب سی پراسراریت تھی۔ وہ بات کھل کر نہیں کرتا تھا۔

”انہوں نے مجھے خود بتایا ہے۔“ وہ بولا۔

”خود بتایا ہے۔“ ایلی نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ وہ شرارتے ہوئے بولا۔ ”جب میں کل یہاں پہنچا اور مجھے معلوم ہوا کہ تم گھر نہیں ہو تو تمہاری غیر حاضری میں میں نے تمہارے ہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن۔۔۔“ وہ رک گیا۔

پھر وہ خود ہی بولا۔ ”انہوں نے خود مجھے ٹھہرنے پر مجبور کیا۔ میرا مطلب ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”نو فاول پلے آفسٹ اور پھر رات کو نفیسہ میرے پاس آگئی اور دیر تک بیٹھی رہی۔ روتی رہی۔“ روتی رہی۔ ”ایلی نے پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ انکی زندگی تباہ ہو چکی ہے۔ اور ان کا مستقبل تاریک ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ جلد ان کی شادیاں ہو جائیں تاکہ وہ اپنے اپنے گھر چلی جائیں۔“ محمود نے کہا۔ ”لیکن شہزاد اور میں۔۔۔۔۔ ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

”اونہوں۔“ محمود بولا۔ ”تم دونوں لڑکیوں کے صرف ایک پہلو سے واقف ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ ان کی زندگی کا ظاہری پہلو ہی حقیقت ہے۔“

”تو کیا ان کی زندگی کا کوئی اور پہلو بھی ہے۔“ ایلی نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں۔“ محمود بولا۔ ”اور اسی پہلو کے تحت وہ میرے پاس آئی تھیں۔ صبیحہ اندر دروازے

میں کھڑی رہی اور نفیسہ میرے پاس آ بیٹھی اور وہ دونوں باتیں کرتی رہیں۔“

”تمہیں معلوم ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”صبیحہ کے لئے رشتہ آیا تھا۔“

”ہاں وہ تاپے۔“ وہ بولا۔ ”مجھے انہوں نے سب بتایا تھا۔“

”تو پھر میں کیا کروں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”نفیسہ کا نکاح کر دو۔“ محمود بولا۔

”لیکن کس سے۔“ ایلی نے پوچھا۔

محمود مسکرایا۔ ”تمہارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ میں اس کا تمام خرچہ برداشت کروں گا اور جب تک وہ چاہے گی اسے تعلیم دلاؤں گا۔ اسے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔“

”تم۔۔۔ ایلی نے محمود کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”میں! مجھ پر تم بھروسہ کر سکتے ہو۔“

”لیکن لیکن۔“ ایلی بولا۔ ”کیا وہ رضامند ہو جائے گی۔“

”کون۔“ محمود نے پوچھا۔

”نفیسہ اور کون۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”نفیسہ رضامند ہے۔“ محمود نے کہا۔ ”بلکہ وہ خود چاہتی ہے اور میں اسی کے کہنے پر تم

بات کر رہا ہوں۔“

ایلی کو دھچکا سا لگا۔ اسے محمود کے خلاف شکایت نہ تھی اسے لڑکیوں پر حیرت تھی ”دیکھو۔۔۔“ وہ بولا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ نفیسہ اس بات کی خواہاں ہو اور اگر وہ

ہاں ہے تو شہزاد کو میں منالوں گا۔“

محمود کے جانے کے بعد ایلی نفیسہ کو ایک طرف لے گیا۔

”نفیسہ۔“ اس نے بات شروع کی۔ ”نفیسہ ایک بات بتاؤ مجھے۔“

نفیسہ نے پراسرار نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

”شرمانے کی کوئی بات نہیں۔“ وہ بولا۔ ”جو بھی تمہاری صحیح رائے ہو وہ مجھے بتا دو چونکہ

تمہاری رائے کے بغیر تمہاری رضامندی کے بغیر کچھ نہ کروں گا۔“

نفیسہ نے آنکھیں جھکا لیں۔

”کیا تم چاہتی ہو کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔“

وہ چپ چاپ بت بنی کھڑی رہی۔

”اگر تمہاری شادی محمود سے کر دی جائے تو تمہیں اعتراض تو نہ ہو گا۔“ ایلی نے پوچھا۔

نفیسہ جوں کی توں چپ چاپ کھڑی رہی۔

”جواب دو نا۔“ وہ بولا۔

وہ خاموش رہی۔

”اچھا۔“ وہ بولا۔ ”اگر تم نے کوئی جواب نہ دیا تو میں سمجھوں گا کہ تم رضامند ہو۔“

وہ جوں کی توں خاموش کھڑی رہی۔

”اچھا۔“ ایلی نے کہا۔ ”تو فکر نہ کرو میں کروں گا کہ تمہاری شادی محمود سے ہو

بلکہ فکر نہ کرو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“

ہی تھی۔ ”اگر اپنا بھلا چاہتے ہو“ وہ بولی ”تو ابھی میری بیٹی کو طلاق دلاؤ۔ ورنہ۔“  
 ”تو کیا تم بھی —“ وہ شہزاد کی طرف حیرانی سے دیکھنا لگا۔  
 ”تم نے میری بیٹی کو ایک بد معاش کے ہاتھ بیچا ہے۔“ شہزاد بولی۔  
 ”یہ تم کہہ رہی ہو۔“ ایللی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”ہاں میں کہہ رہی ہوں۔“ شہزاد بولی۔  
 ”تم نے اپنی بیٹی سے پوچھا ہے کیا۔“  
 ”میں سب جانتی ہوں۔“ وہ بولی۔  
 شہزاد کے عقب میں صبیحہ اور رحمانہ کھڑی مسکرا رہی تھیں۔  
 فرش پر عالی بیٹھا کنگنا رہا تھا۔ ”ابو، ابو۔“  
 شہزاد گھر سے باہر نکل گئی۔ وہ بورڈنگ کی طرف جا رہی تھی۔  
 ”غصہ میں نہ آؤ۔“ محمود ایللی کے پاس آکھڑا ہوا۔  
 ”تم جاؤ محمود۔“ وہ بولا۔ تمہارا میاں رہتا ٹھیک نہیں۔ نہ جانے یہاں کیا ہونے والا ہے تم  
 پلے جاؤ۔“

”کیوں۔“ وہ بولا۔

”بات بڑھ جائے گی۔“ ایللی نے کہا۔ ”بہت بڑھ جائے گی اگر تم یہیں رہے تو۔“  
 ”ہوں یہ تو ٹھیک ہے۔“ محمود نے لپک کر اپنا سوٹ کیس اٹھالیا۔  
 ”میں تمہیں اطلاع دوں گا۔“ ایللی نے کہا۔ محمود چپ چاپ گھر سے نکل گیا۔

ایللی صحن میں دیوانہ وار گھوم رہا تھا۔ وہ شہزاد کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ  
 رہا تھا کہ آخر وہ سب یک لخت کیوں بدل گئے تھے۔ آخر کیا وجہ تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے  
 وہ سب کچھ جو ہو رہا تھا۔ ایک سوچے سمجھے پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔ لیکن کیوں؟ وہ سوچ رہا  
 تھا اس کا مقصد کیا تھا؟ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔

باہر محلہ سنسان پڑا تھا۔

دور کتے بھونک رہے تھے۔

کمرے میں لڑکیاں کانا پھوسی کر رہی تھیں۔

اس شام وہ بغور نفیسہ کی حرکات و سکنات کو دیکھتا رہا اور اس نے محسوس کیا کہ غیر خوش  
 تھی۔

اسی رات جب ایللی نے شہزاد سے بات کی تو وہ مجزومنی بولی۔ ”کیا ہر تنہو خیرا کے لئے میری  
 ہی لڑکیاں رہ گئی ہیں۔“ ایللی نے التڑتا اسے حالات سے آگاہ نہ کیا تاکہ نفیسہ کی شکایت کا پلو نہ  
 نکلے۔

ایللی کو محمود اور نفیسہ کی شادی سے قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اس سلسلے میں صرف اس  
 لئے کوشش کر رہا تھا کہ نفیسہ چاہتی تھی کہ وہ محمود کی ہو جائے۔ ایللی نے شہزاد کو سمجھایا بجھایا اور  
 رضامند کر لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز محمود کا نفیسہ سے نکاح ہو گیا۔

محمود ایللی کے گھر میں دس روز نفیسہ کے ساتھ رہا پھر اس نے نفیسہ کو زلتے بورڈنگ ہاؤس  
 میں داخل کرا دیا چونکہ نفیسہ کا مطالبہ تھا کہ اسے بورڈنگ میں داخل کرا دیا جائے تاکہ وہ  
 بورڈنگ میں محنت کر سکے اور دسویں پاس کر لے۔

جب دسویں کا امتحان ہو چکا تو محمود نفیسہ کو لینے کے لئے آگیا اس نے اسے لاہور کالج میں  
 داخل کرانے کے جملہ انتظام کر رکھے تھے۔

جب ایللی نفیسہ کو بورڈنگ سے لینے گیا تو نفیسہ نے آنے سے انکار کر دیا۔ پھر سکول کی  
 استائیاں اکٹھی ہو گئیں اور وہ ایللی کو برا بھلا کہنے لگیں۔ ان کی باتوں سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ  
 سمجھتی تھیں کہ نفیسہ کی شادی زبردستی کی گئی تھی۔

ایللی حیران تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ غصے کی وجہ سے اس کا ذہن شل ہو چکا تھا۔  
 اس نے شور مچا دیا حتیٰ کہ سکول کی عزت کے خیال سے انہیں نفیسہ کو باہر بھیجنا ہی پڑا۔  
 ایللی نے اس کا بازو تھام لیا اور اسے سمجھانے لگا۔ ”یہ کیا حماقت ہے نفیسہ! تمہاری شادی ہو چکی  
 ہے تم دس روز اکٹھے رہ چکے ہو اور اب — لیکن یہ شادی تو تمہاری رضامندی سے کی گئی  
 تھی۔“ نفیسہ نے چلتے چلتے زور سے جھکا مارا اور ہاتھ چمڑا کر بورڈنگ کی طرف بھاگی۔

طلاق

جب وہ گھر پہنچا تو شہزاد یوں کھڑی تھی۔ جیسے شیرینی کچھار میں کھڑی ہو وہ غصے سے کانپ

ایلی اندر چلا گیا۔ اس نے سوٹ کیس میں اپنے کپڑے بند کئے اور پھر سوٹ کیس اٹھا کر باہر آیا۔ ”آئیے۔“ وہ استانی سے کہنے لگا۔ ”میں آپ کو بورڈنگ تک چھوڑ آؤں۔“  
شہزاد نے ایک مرتبہ حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ ایلی خالی دھمکی

دے رہا ہے۔  
”طلاق تمہیں مل جائے گی۔“ ایلی نے دہرایا۔ ”خرج بھی ملتا رہے گا۔ حسب توفیق۔“  
”لیکن آپ جائیں گے کہاں۔ اس وقت۔“ استانی نے پوچھا۔  
”میں ایسے گھر میں نہیں رہ سکتا جہاں اپنی مرضی سے شادی کرنے کے باوجود دس دن کے

الوداع طلاق مانگی جائے۔“ ایلی نے جواب دیا۔  
شہزاد دونوں بازو کولہوں پر رکھ کر صحن میں کھڑی ہو کر ایلی کو گھورنے لگی۔  
”ایسا نہ کیجئے۔“ استانی نے کہا۔

”تو کیا یہاں رہ کر بے عزتی کی زندگی بسر کروں۔“ وہ بولا۔  
”اب تو عزت والے بن بیٹھے ہو۔“ شہزاد چلائی  
”لڑنا بیکار ہے۔“ وہ بولا۔ ”صرف ایک بات پوچھتا ہوں کیا تم طلاق مانگتی ہو۔ تم چاہتی ہو  
نفیسہ طلاق لے لے۔“

”چاہتی۔“ وہ غرائی۔ ”میں دیکھوں گی کہ کیسے نہیں ہوتی طلاق“ اس کی کیا وجہ ہے۔“ ایلی  
پوچھا۔

”تمہیں اس سے کوئی تعلق نہیں۔“ وہ غرائی۔

”اچھا۔“ وہ بولا۔ ”مجھے کوئی تعلق نہیں تو خدا حافظ۔“ ایلی باہر نکل گیا۔  
”ابو۔“ علی سوتے سوتے جاگ پڑا۔ ”ابو۔“ وہ رو رہا تھا۔ ایلی بھاگ رہا تھا  
اسے ڈر تھا کہ کہیں عالی کی چینیں سن کر وہ واپس جانے پر مجبور نہ ہو جائے۔ ابو ابو  
ایک ہلکی ہو تک رہی تھی۔

ابو۔ ابو ریل نہ جانے کدھر جا رہی تھی۔ وہ ہاتھوں میں سر دبائے چپ چاپ ڈبے میں بیٹھا

پلنگزی پر عالی بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ اس کا منہ ایلی کی طرف تھا۔  
دفعۃً شہزاد داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ نفیسہ تھی اور سکول کی ایک اویز عمر کی  
استانی۔

ایلی انہیں چپ چاپ دیکھتا رہا۔  
شہزاد خاموش تھی۔ نفیسہ آتے ہی لڑکیوں کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ انہوں نے  
اندر سے کنڈی لگالی۔

استانی بولی۔ ”بہتر یہی ہے کہ آپ لڑکی کا فیصلہ کرا دیں۔“ اس کا روئے غن ایلی کی طرف  
تھا۔

”آپ سمجھتی ہیں کہ لڑکی کی شادی زبردستی کی گئی ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”لڑکی یہی کہتی ہے۔“ وہ بولی۔

”اور وہ ٹھیک کہتی ہے۔“ شہزاد بولی۔ ”لڑکی کو دھوکے سے چھانسا لیا گیا ہے۔“

”لڑکی کو میرے سامنے بلا کر پوچھ لیجئے۔“ ایلی نے استانی سے کہا۔

”وہ سامنے نہیں آئے گی۔“ شہزاد دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر ایلی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”کیوں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”بس نہیں آئے گی۔“ وہ غرائی۔

”کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔“ ایلی نے استانی سے کہا۔ ”میں نے یہ رشتہ لڑکی کی نشا کے

مطابق کیا ہے۔ بلکہ اس کے اشارے پر کیا ہے۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔“

”بالکل غلط ہے۔“ شہزاد بولی۔ ”بالکل غلط۔ یہ شادی ایک سازش تھی۔ بہتر یہی ہو گا کہ

فورا اسے طلاق دلا دی جائے۔“

”ورنہ۔“ ایلی بولا۔

”ورنہ میں طوفان کھڑا کر دوں گی۔“ شہزاد چلائی۔

”ہوں۔“ ایلی بولا۔ ”طلاق مل جائے گی لیکن ہمارا آپس میں کوئی سبب بندھ نہیں رہے گا۔

تمہیں منظور ہے۔“

اس نے پوچھا۔

”منظور ہے۔“ شہزاد نے جواب دیا۔

”نکٹ تو نہیں۔“ وہ بولا۔

”کہاں جاتا ہے۔“ بابو نے پوچھا۔

”شاہوال سے آیا ہوں۔“ وہ بولا۔

”جاتا کہاں ہے۔“ بابو چلایا۔

”یہ گاڑی کہاں جائے گی۔“ ایللی نے پوچھا۔

”پورے تعجب سے ایللی کی طرف دیکھا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کہاں جاتا ہے۔“

”مجھے۔“ وہ بولا۔ مجھے تو کہیں بھی نہیں جاتا۔“

اس کے ہمراہی مسافر تفتہ دار کرہنس رہے تھے۔

”تو گاڑی پر سوار کیوں ہوئے۔“ بابو بولا۔

”پتہ نہیں۔“ ایللی گویا اپنے آپ سے کہنے لگا۔

”کراریہ نکالو۔“ بابو نے کاپی کھولتے ہوئے کہا۔

ایللی نے جیب ٹٹولی۔ اس کی جیب میں صرف سات روپے آٹھ آنے تھے۔

”میرے پاس صرف یہ ہیں۔“ ایللی نے کہا۔

بابو نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ”کیا ہے تمہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

بابو اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ”تم عادی بے کٹے نظر نہیں آتے۔“

”جی نہیں۔“ ایللی بولا۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”اچھا تو پھر اگلے شیش پر اتر جانا۔“

”جی اچھا۔“

بابو نے اپنی کاپی بند کر لی اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایللی پھر اپنے خلا میں کھو گیا۔

اگلے جنکشن پر بابو نے اسے پھر جھنجھوڑا۔ ”چلو اترو۔“ وہ بولا۔

ایللی نے سوٹ کیس اٹھایا اور پلیٹ فارم پر اتر گیا۔

”اب کہاں جاؤ گے۔“ بابو نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”والہاں شاہوال کیوں نہیں جاتے۔“

## انجام

### کہاں جاؤں

ایللی چپ چاپ گاڑی کے ڈبے میں بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے باہر اندھیرے کو گھور رہا تھا۔ اس دن ایک وسیع خلا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسے کچھ بھی یاد نہ رہا تھا۔

شہزاد کو خدا حافظ کہنے کے بعد وہ بلا سوچے سمجھے شیش کی طرف چل پڑا تھا۔ آدمی رات عالم تھا۔ اس وقت وہ ریلوے شیش کے سوا کہاں جا سکتا تھا۔ اس لئے ان جانے میں وہ ادھر چلا دیا۔ اور وہاں پہنچ کر پلیٹ فارم کے بیچ پر بیٹھ گیا۔

پھر نہ جانے کب گاڑی آگئی اور نکٹ لئے بغیر سوچے سمجھے بغیر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی اور وہ بت بنا بیٹھا رہا۔

اس نے شانے پر دباؤ محسوس کیا۔ وہ چونکا۔ پاس ایک وردی پوش ابو کھڑا تھا۔ ایللی نے اب کی طرف دیکھا۔

نکٹ بابو نے کہا: ”نکٹ۔“

”نکٹ۔“ ایللی نے تعجب سے دہرایا۔

اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ ریل گاڑی میں بیٹھا ہے۔

”ہاں نکٹ۔“ ایللی نے پھر دہرایا اور جیب ٹٹولنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اسے یاد آیا کہ اس کے پاس تو کوئی نکٹ نہیں ہے۔

”ارے الیاس بھائی ہیں۔“ اسے یقین نہ آتا تھا کہ الیاس اسے ملنے راجواڑے آیا ہے۔  
 بنی داہ۔“ وہ چلانے لگا۔ ”یہ تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے حد۔  
 یہ خیال بھی نہ تھا کہ کسی روز الیاس آئیں گے۔ بڑی مریانی کی بڑی عنایت ہے۔“  
 دیر تک خلیق چلاتا رہا۔ اظہار خوشی کرتا رہا۔ پھر دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ ایلہ وہ ایلہ  
 نہ جانے کیا بات ہے۔

”لیکن۔“ وہ چلایا۔ ”خیریت تو ہے۔“

”ہاں۔“ ایلہ نے جواب دیا۔

”کوئی بات تو نہیں۔“ خلیق نے پوچھا۔

”کوئی بات نہیں۔“ ایلہ نے ناامیدی اور مایوسی سے کہا۔

”آپ کی طبیعت تو اچھی ہے۔“ وہ بولا۔

”ہاں۔“ ایلہ نے جواب دیا۔

ایلہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی آمد کی وجہ نہیں بتائے گا۔ ایلہ کو خلیق پر پورا اعتماد تھا۔ وہ  
 بات سے پورے طور پر واقف تھا کہ خلیق کے دل میں ایلہ کے لئے محبت ہے اور اس محبت  
 کا احترام کا عنصر شامل ہے اور خلیق کسی واقعہ پر بھی ایلہ سے بدظن نہیں ہو سکتا۔ پھر نہ جانے  
 کیا بات چھپانا چاہتا تھا کہ وہ شنواؤ سے قطع تعلق کر کے چلا آیا ہے۔ اسے یہ بات کہنے کی  
 ات نہ پڑتی تھی۔ شاید وہ محسوس کرتا تھا کہ اس نے ارتکاب جرم کیا ہے۔

خلیق سمجھ گیا کہ کوئی بات ہے جس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا اور دیکھی ہے۔ چپ لگی ہے۔  
 کے بعد وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے کوئی بات نہ ہو۔ جیسے وہ کچھ سمجھا ہی نہ ہو اور ایلہ کا دل  
 لسنے کے لئے اس نے ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں۔

”الیاس صاحب۔“ وہ بولا۔ ”ایسی اچھی جگہ ہے یہ راجواڑہ کہ کیا بتاؤں۔ تاریخی اہمیت کا  
 ہے۔ اگرچہ چھوٹا سا ہے لیکن مطالعہ کے لئے لاجواب شہر ہے۔“  
 پھر وہ ایلہ کو شہر لے گیا۔

”یہ دیکھئے یہ راجواڑے کے محلات ہیں۔ منہدم ہو چکے ہیں پھر بھی واضح آثار ہیں اور یہ  
 تو ہے اس کے نیچے منوں سونا اور چاندی ہے اور نہ جانے کیا کیا۔ حکومت یہ آثار کھودنے پر

ایلہ نے نفی میں سر ہلادیا۔

پھر وہ پلیٹ فارم پر ایک بیچ پر جا بیٹھا۔ باو اسے دور کھڑا دیکھتا رہا۔ گاڑی چل پڑی۔ ایلہ  
 جوں کا توں بت بنا بیٹھا رہا۔ یہ دیکھ کر باو پھر سے گاڑی پر چڑھ گیا۔

دیر تک ایلہ وہیں بیٹھا رہا۔

بچے کے رونے کی آواز سن کی ایلہ چونکا۔ ذہن میں حرکت سی ہوئی۔

”ابو ابو ——— عالی اس کی طرف ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا۔

پھر دھندلکے سے ایک شکل ابھری: ”تم نے میری بیٹی کو بیچا ہے۔“ کوئی چلائی۔

ایلہ نے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے سینے میں کناری سی بھونک دی ہو گھبرا کر اٹھ بیٹ  
 اور چائے کے شال پر کھڑا ہو کر چائے پینے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہاں جاؤں میں؟ کہاں جاؤں؟

اس کے روبرو محمود آکھڑا ہوا۔ ”اونہوں۔“ وہ بولا۔ ”غصے میں نہ آؤ۔“

”محمود۔“ کسی نے اس کے کان میں کہا۔ ”محمود جو ہے۔“

”اونہوں۔“ ایلہ نے نفی میں سر ہلایا۔

علی پور۔ رفتی۔ خانپور ——— اس کی کانوں میں آوازیں آنے لگیں لیکن وہ نہ تو علی پور  
 جانے کے لئے تیار تھا نہ لاہور نہ خانپور۔

”کہاں جاؤں۔ کہاں جاؤں؟“ گاڑی ہوکتی ہوئی پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی۔

ایلہ کی توجہ گاڑی کی طرف منعطف ہو گئی۔ صبح کا وقت تھا۔ سردی زوروں پر تھی۔ گاڑی  
 کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ اندر دھندلی دھندلی بتیاں جھلما رہی تھیں۔ مسافر کمبلوں اور چادر  
 میں لپٹے انگوٹھ رہے تھے۔

دفعتاً اس کی نگاہ گاڑی کی پلیٹ پر پڑی: ”راجواڑہ پہنچر۔“

”راجواڑہ۔“ اس نے محسوس کیا جیسے وہ نام مانوس ہو۔ وہ سوچنے لگا۔ ڈاکٹر خلیق اس کے

روبرو آکھڑا ہو:

”الیاس صاحب۔ کبھی میرے پاس راجواڑہ آؤ۔“ وہ مسکرایا۔

”ہاں۔“ ایلہ کو یاد آیا۔ اس کا ماموں زاد بھائی خلیق راجواڑے کے ہسپتال میں نوکر تھا۔ ایلہ

چپکے سے باہر نکلا۔ اس نے راجواڑے کا ٹکٹ خریدا۔ اور پھر سے اندر آکر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

**بوندا باندی**

ایلہ کو دیکھ کر خلیق حیران رہ گیا۔



۔ زہنی حالت شدید بحران کی غماز ہے۔

### بیل سنگھ

راجواڑے میں پہلا وہ واقعہ جس نے ایللی کی توجہ کو خارجی دنیا کی طرف منعطف کیا راجپل متعلق تھا۔ راجپل سنگھ ایک قوی پیکل سنگھ تھا۔ وہ راجواڑے کی ایک بستی میں رہتا تھا۔ ایک روز جب ایللی اور خلیق شام کے وقت کواڑے سے باہر میدان میں بیٹھے تھے تو راجپل آگیا۔ آتے ہی وہ لڑکھایا، مگر اور پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ بیل اڑی ہوئی تھیں اور وہ مشکل سے سانس لے رہا تھا۔

خلیق گھبرا کر اٹھ بیٹھا: ”کیوں کیا بات ہے۔“ وہ چلایا۔

راجپل بیٹھا لے لے سانس لے رہا تھا اس نے ڈاکٹر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

”تم بیمار ہو کیا؟“ ڈاکٹر نے اس کی نبض ٹٹولتے ہوئے کہا۔

”اومسوں۔“ راجپل نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”اچھا بھلا ہوں ڈاکٹر۔“ وہ بولا۔

”تو پھر بات کیا ہے۔“

راجپل نے اشارہ کیا۔ ”ابھی بتاتا ہوں۔“

دیر تک وہ باتوں میں سر تھاے بیٹھا رہا۔

”ڈاکٹر۔“ وہ کچھ دیر کے بعد بولا۔ ”میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔“

”وہ تو کسی کی زندگی کا بھی نہیں۔“ خلیق ہنسا۔

”نہیں ڈاکٹر۔ یہ اور بات ہے۔“ راجپل بولا۔ ”بات یہ ہے کہ ایک نایک راج نامی

نے کلٹ کر چھوڑے گی۔“

”نامی“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”ہاں۔ میں نے مکتی سے ایک راج اس کے زکو مار دیا۔ وہ دونوں نمر کے کنارے کھڑے

نے پراگئی اوٹ میں تھی سو مجھے دکھائی نہ دی۔ دکھائی دے جاتی ڈاکٹر تو میں انہیں کچھ نہ کہتا۔

اگر اور نامی اکٹھے ہوں تو انہیں کچھ نہ کہنا چاہئے۔ جو ایک مرجائے تو دوسرا بدل لے بغیر نہیں

موت لے اکیلا ناگ ہو چاہے نہ ہو یا مادہ جو چاہے کرو۔ چاہے وہ مرجائے چاہے جھنجھی ہو جائے۔

ایلی بات نہیں۔

غور کر رہی ہے اور یہ دیکھتے یہ پرانے بانٹ ہیں۔ مغلیہ وقت کے کسی زمانے میں یہاں گورنر رہتا تھا۔ بڑے ٹھانڈے تھے اس زمانے میں راجواڑے کے۔ بے حد زرخیز جگہ ہے نا اس لئے اسے بانٹتے تھے یہاں کہ اسے باغ بستی کہتے تھے۔ یہ نام تو اب رکھا گیا ہے۔ پہلے اسے باغ بستی کہا جاتا تھا۔ یہاں ہر قسم کا میوہ آتا تھا۔ بس ایک ہی وقت ہے یہاں سانپ بست ہیں۔“

ایلی خلیق کی باتیں سنے بغیر ہوں ہوں کتا رہا اور بانٹ دیکھے بغیر بہت خوب کہہ دیا۔ دراصل ایللی راجواڑہ میں ہوتے ہوئے راجواڑہ میں نہ تھا۔ وہ ان دنوں کہیں بھی نہ تھا۔ نہ شاہوال میں نہ کہیں اور۔ اس کے ذہن میں وہی خلا پھیلا ہوا تھا۔ یوں محسوس کرتا تھا جیسے کوئی خواب میں چل پھر رہا ہو۔ نگاہ میں چاروں طرف ایک دھند لکا چھایا ہوا تھا۔ گرد و پیش اس دھندلکے میں اوٹھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ چیزوں میں وضاحت نہ تھی۔ حرکات بے جان اور غم آلود دکھائی دیتی تھیں جیسے سلوموڈنٹ فلم چل رہا ہو۔ بازاروں میں دوکان دار اوٹھتے دکھائی دیتے تھے۔ راہ گیر چلتے نہ تھے بلکہ لڑھکتے تھے۔ آہستہ آہستہ بے جان بے عزم طبعی طور پر ایللی کے غم کے کوائف ہی مختلف تھے۔ شدت غم میں اس کا ذہن خلا میں بدل جاتا۔ دھندلا چاروں طرف دھند لکا چھا جاتا۔ پھر غم بوند بوند اس کے دل کی گہرائیوں میں گرتا۔ بوند بوند۔ بوند بوند۔ اور وہ بوند باندی لگی رہتی۔ دنوں، ہفتوں، مہینوں۔

ایلی کو صرف ایک ڈر تھا کہ کہیں خلیق راجواڑہ میں اس کی آمد کے متعلق کسی کو خبر نہ کر دے۔ اگر اس نے خبر کر دی تو مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ شزاو اسے مٹانے نہیں آئے گی لیکن ممکن ہے لوگ اسے سمجھانے کے لئے آجائیں۔ وہ راجواڑے میں صرف اس لئے آیا تھا کہ کسی کو خیال بھی نہ آئے گا کہ وہ راجواڑے میں ہے۔ اس نے کپور کو بھی کوئی خط نہ لکھا تھا تاکہ شاہوال میں کسی کو علم نہ ہو کہ وہ راجواڑے میں مقیم ہے۔ اس نے اپنی چھٹی کی عرضی سراب کے نام بھیج دی تھی۔ جس میں ایک خط ملفوف کر دیا تھا کہ اس کی تنخواہ اس کے گھر شزاو کو بھجوا دی جائے۔ یہ عرضی اس نے آر ایم ایس میں پوسٹ کی تھی۔

خلیق ہر وقت ایللی کے ساتھ رہتا تھا۔ جب وہ ہسپتال جاتا تو ایللی کو ساتھ لے جاتا۔ اسے اپنے کمرے میں بیٹھاتا۔ اس کی جملہ ضروریات کا خیال رکھتا اور اگر اسے کسی مریض کو دیکھنے کے لئے جانا ہوتا تو بھی ایللی کو ساتھ لے جاتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایللی کو اکیلے چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں چونکہ چند ہی روز میں خلیق کو یقین ہو چکا تھا کہ ایللی کی کیفیت معمولی سے بہت کمزور

”ہوں۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”تو پھر۔“

”پھر کیا۔ میں نے موقع پا کر ایک لٹھ مار دی۔ نروہاں چت ہو گیا۔ اب جو دیکھتا ہوں ڈاکٹر تو بوٹے کی اوٹ میں مدین ناگنی ہے۔ بس اسے دیکھتے ہی پسینہ آ گیا۔ بس ڈاکٹر۔ وہ روج اور آج کا روج ہے۔ جب باہر جاؤں تو مجھے پتہ ہوتا ہے کہ ناگنی دور نہیں۔ کہیں پاس ہی ہے۔ خبردار رہتا ہوں۔ لاشی بنا باہر نہیں جاتا۔ ایک لمٹ کے لئے بے خبر ہو جاؤں تو سمجھ لو معاملہ کھتم ہو گیا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد بولا:

”دن کے سے تو کوئی بات نہیں۔ ناگنی چلاک ہے تو اپنے باجوؤں پر جی جو رہے۔ جو پاس آئے گی تو چھوڑتا میں بھی نہیں۔ پر رات جو باہر جاتے تو سمجھ لو پھر وہ مجھے شرمینے نہیں دے گی۔ آج کچھ دیر ہو گئی تھی۔ قدم قدم پر میرے ساتھ رہی وہ۔ میں بھاگ۔ وہ بھی بھاگی۔ بس سمجھ لو گرد کی مہربانی ہے جو سلامت پہنچ گیا ورنہ آج کوئی صورت نہیں تھی پہنچنے کی۔“ وہ لمبے سانس لینے لگا۔

”تو میں اس بات میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”بس ایک بات ہے۔“ وہ بولا۔ ”دو سلاخیاں اس سرے کی دید مجھے صرف دو سلاخیاں۔“

”سرے کی۔“ ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں۔ وہ جو کمپنی والوں کے پاس سرمہ ہے سانپ کے کاٹنے کا۔“

”سرمہ ہے۔“ ایلی نے حیرت سے پوچھا۔ ”سانپ کے کاٹنے کا سرمہ۔“

”ہاں بابو۔“ راجپال بولا۔ ”جس کو ناگ کاٹ جائے یا کیرا سوگت جائے اس کی آنکھ میں

سرے کی سلاخی لگا دیتے ہیں۔ بس سارا جہر بھسم ہو جاتا ہے۔“

”ارے۔ کیا یہ سچ ہے“ ایلی نے خلیق سے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ خلیق نے جواب دیا۔

”بالکل سچ ہے ڈاکٹر ارجی۔“ راجپال بولا۔

”تو پھر تم کمپنی والوں سے کیوں نہیں مانگتے۔“

”وہ نہیں دیتے بابو جی۔ وہ نہیں دیتے۔ ڈاکٹر انہیں کہیں تو شاید دے دیں۔ میرے کہنے

پر نہیں دیتے۔“ راجپال نے کہا۔

”اچھا۔“ ڈاکٹر بولا۔ میں ان سے کہوں گا۔ تم کل پتہ کرنا۔“

راجپال کی بات پر پہلی مرتبہ ایلی کا وہ غلاوٹ گیا۔ راجپال کی بات نے اس کی تمام توجہ کو ہار لیا۔ اس کے دل میں بیسیوں سوالات پیدا ہوئے۔ کیا واقعی بارہ زکا انتقام لیتی ہے؟ کیا وہ ان کا چچا کرتی ہے۔ کیا سانپ بھی سوپنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور چالاکی سے وار کرتے ہیں کیا سانپ کے کاٹنے کا علاج سرمہ بھی ہو سکتا ہے۔

مدد کیرا

”سانپوں کی زندگی بے حد پراسرار ہے“ خلیق نے کہا۔

”ہاں“ وہ بولا۔ ایلی کو باجرہ کا واقعہ یاد آ گیا۔

یہ ان دنوں کی بات تھی۔ جب ایلی علی پور میں شارٹ ہینڈ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس دن میں وہ بیشتر وقت شنزاد کے چورے میں بسر کیا کرتا تھا۔

ایک روز باجرہ نیچے تہ خانے میں اتر گئی اور دیر تک وہاں رکھی ہوئی چیزوں کو ٹھیک ٹھاک لٹا رہی تہ خانے میں وہ دوسرے چوتھے روز جایا کرتی تھی۔ انہوں نے گھر کا کٹھ کبار دیں دیکھا تھا۔

باجرہ تہ خانے سے واپس آ کر سیدھی شنزاد کی طرف گئی۔ نہ جانے اسے کیا کام تھا۔ وہ کوئی باقی کر رہی تھی کہ دفعتاً اس نے اپنی شلواریں کوئی حرکت محسوس کی اور اپنا ہاتھ ادھر بٹایا۔ پھر باجرہ نے ایک لمبی چیخ ماری اور دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔ ایلی اور شنزاد حیرانی سے باہر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چیخ سن کر راجہ اور جانو بھاگی بھاگی اوپر آئیں۔

وہ سب باجرہ کی طرف لپکے۔

”ہائیں۔“ وہ حیران رہ گئے۔ باجرہ کا منہ نیلا ہو چکا تھا۔ جیسے کسی نے نیلی سیاہی انڈیل دی

بہند ہی منٹوں میں سارا محلہ اٹھا ہو گیا۔

”کیا ہوا۔ کیا ہوا۔“ محلے والیاں چلانے لگیں۔

”ہے۔ یہ تو نیلی ہو گئی۔“ ایک بولی۔

”لیکن ہوا کیا ہے بن؟“

”کیا پتہ کیا ہوا ہے۔ بس ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی ہے۔“

ہر کارنگ سیاہ ہو چکا تھا اور اس کے جسم کا گوشت گویا اہل رہا تھا۔ عین اس وقت ایک سپیرا  
ایماں چڑھ کر اوپر آگیا۔

”کس کو کاٹنا ہے کیڑے نے۔“ وہ بولا۔

ایلی نے حیرانی سے سپیرے کی طرف دیکھا۔ اب یہ کیا کرے گا۔ وہ سوچ رہا تھا۔  
سپیرے کی نگاہ باہرہ پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ایک وحشت بھری مسکراہٹ چمکی۔ ہاں  
۔۔۔ وہ دیوانہ وار چلایا۔ اس نے اپنی منجھی نیچے پھینک دی۔ ”آج تو منہ کیرا کے درسن ہو  
ہے۔ ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔“ وہ چلانے لگا۔

سب سسم کر پیچھے ہٹ گئے۔

”کوئی سونٹا دو۔“ وہ بولا۔

”جاؤ۔ دودھ سکی اور کلی مرج کا انتخاب کرو۔ یہاں کوئی نہ رہے۔ گرد چاہے تو آج دودھ  
اودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

سپیرے نے سب کو چوبارے سے باہر نکال کر اندر سے کنڈی لگا لی اور بیٹھ کر نہ جانے کیا  
یاجتر منتر پڑھنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوئی تھی۔ سامنے دودھ کا بھرا ہوا برتن تھا۔ وہ بار  
رو سوئی سے باہرہ کو چھوٹا۔ اور پھر چند ایک مرتبہ چھونے کے بعد سوئی کو دودھ میں ڈال دیتا۔  
لافت عجیب سی آواز پیدا ہوتی جیسے آگ میں سرخ کئے ہوئے لوہے کو پانی میں ڈالتے ہیں تو  
پا ہوتی ہے۔ کوئی دو گھنٹے تک وہ باہرہ کی لاش کے پاس بیٹھا وہی عمل دہراتا اور منتر پڑھتا رہا  
۔۔۔ پھر دفعتاً ایک لمبی چیخ سنائی دی۔ ایسی ہی چیخ جیسی باہرہ نے بے ہوش ہوتے وقت  
لٹی تھی۔ چیخ سن کر وہ سب بھاگ کر کھڑکیوں میں آکھڑے ہوئے۔ باہرہ کارنگ سیاہ سے نیلا  
ہونکا تھا۔ ہلکا نیلا۔ اور وہ حرکت کر رہی تھی۔

سپیرا چلا رہا تھا۔ آہاہا۔۔۔ گرد کی دیا سے منہ کیرا کا بھوشن مل گیا۔ آہاہا۔۔۔ ”سامنے پڑا ہوا دودھ  
اکڑو سیاہ ہو چکا تھا۔ سپیرے کے ہاتھ کی چھری بھی اگلے سرے سے جلی جلی دکھائی دے رہی  
تھی۔“

آگ دیوی

چار ایک گھنٹے کے بعد باہرہ نے آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے اسے اٹھا کر اندر چار پائی پر

”ہے۔ وہ تو نیلی پڑ چکی ہے۔ سانپ سنبولے نے تو نہیں ڈسا۔“

”پتہ نہیں۔“ شنزاد بولی۔ ”ہم نے تو نہیں دیکھا۔“

”ہے۔ ابھی تو آئی تھی تمہ خاٹے سے۔“ فرحت روتے ہوئے بولی۔

ایک نے بڑھ کر باہرہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ کچھ لوگ ڈاکٹر کی طرف بھاگے۔ کچھ دیر  
کے بعد ڈاکٹر آگیا۔ وہ مریضہ کو دیکھ کر رک گیا اور دور ہی سے دیکھنے لگا۔

”کیا ہوا؟“ وہ بولا۔

”کچھ پتہ نہیں۔“

”جیج مار کر گر پڑی اور پھر نیلی ہو گئی۔“

”ہوں۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”بہت زہریلا سانپ معلوم ہوتا ہے۔ کس نے دیکھا ہے کیا؟“

”نہیں۔“ سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

”ٹانگ نکلی کرو۔“ ڈاکٹر چلایا۔

انہوں نے باہرہ کی شلوار کے پائینچے اوپر کر دیئے۔ بائیں ٹانگ پر کچھ جگہ یوں ابھری ہوئی  
تھی۔ جیسے پھوڑا نکلا ہوا ہو۔ ڈاکٹر نے ایک تیز چاقو سے وہ پھوڑا کاٹنا چاہا لیکن چاقو کٹتے ہی پھوڑا  
یوں کٹ گیا جیسے کیلا ہو۔ ڈاکٹر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

”ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔“ وہ چیخنے لگا۔ ”کوئی مریضہ کے جسم کو نہ چھوئے۔ اٹھو اٹھو۔“ وہ  
اس عورت سے مخاطب ہوا جو باہرہ کا سر گود میں رکھے بیٹھے تھی۔ ”اٹھ بیٹھو ورنہ زہر تمہیں بھی  
چڑھ جائے گا۔“

اس عورت نے ڈر کر باہرہ کا سر نیچے دھکیل دیا۔ اور خود اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کے  
دھڑ میں سکت نہ رہی تھی۔ اس پر لوگوں کی توجہ باہرہ سے ہٹ کر اس کی طرف متعطف ہو  
گئی۔ چار عورتوں نے اسے اٹھایا اور اندر چار پائی پر ڈال دیا۔

ڈاکٹر بولا: ”اسے فوراً دفن دو۔ ورنہ کچھ دیر کے بعد اس کا جسم پھٹے گا اور جہاں جہاں چھینے  
پڑیں گے وہاں وہاں زہر پینچے گا۔ لے جاؤ لے جاؤ۔“ وہ چلایا۔ ”سب چلی جاؤ۔ مریضہ کے پاس  
کوئی نہ ٹھہرے۔“

ڈاکٹر کے جانے کے بعد سب عورتیں بھاگ گئیں۔ صرف شنزاد، فرحت، رابعہ، ایلی اور جانو  
رہ گئے۔ وہ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ انہیں سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کریں۔

مجھے کیا ہوا۔ پھر جب میں ہوش میں آئی تھی تو بھی میں نے محسوس کیا تھا جیسے کسی نے لٹھے سے سر پر دے ماری ہو۔“

ہاجرہ بالکل صحت مند ہو گئی۔ اس کے بعد کئی ایک سال تک اگر اسے کوئی بھڑیا کوئی زہریلا در کاتا تو محالہ مر جاتا اور ہاجرہ کے جسم پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

پھر ایک روز ان کالی مرجوں کے دان کے اثر کا راز بھی کھل گیا جو سپیرے نے شہزاد کو بطور زہریلی تھیں اور جن میں سے شہزاد نے صرف دو تین چبائی تھیں۔

ایک روز شہزاد کی انگلی پر بھڑکٹ گئی۔ شدت درد سے بلبل اٹھی۔ اتفاقاً اس نے وہ انگلی میں ڈال لی۔ دھشتا درد عتاب ہو گیا۔ وہ بے حد حیران ہوئی۔ اس کے بعد نہ تو انگلی سوجی اور ہی درد ہوا۔

پھر ایک روز ریحانہ کو بھڑنے کاٹا تو شہزاد نے آزمانے کے لئے اس جگہ اپنا لب لگا دیا۔ بلانہ کو فوراً آرام آ گیا۔ پھر دھشتا اسے خیال آیا کہ شاید ان کالی مرجوں کا اثر ہوا اور وہ بوس کرنے لگی کہ اس نے ساری مرجیں کیوں نہ کھائیں۔

ایلی کو وہ سب واقعات یاد آ گئے۔ اس کی نگاہ تلے شہزاد آکھڑی ہوئی۔ اس کی پیشانی پر وہ لڑا شربی قلیوں روشن تھا جیسے دیا جل رہا ہو۔ سپیرا رک گیا میری طرف دیکھ لڑکی۔“ وہ بولا۔

زے ماتھے پر تو نند بندی ہے۔ تو تو آپ ناگ دیوی ہے۔“

پھر شہزاد شاہوال کے گھر میں کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے ہوئے تھے۔

نئی کی بندی گل ہو چکی تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں۔

”میں دیکھوں گی کس طرح تم اسے طلاق نہیں دلاتے۔“

یہ شہزاد اس شہزاد سے کس قدر مختلف تھی۔

شاید وہ محض ایک رنگیلی محبوبہ تھی۔ اس میں بیوی بننے کی صلاحیت نہ تھی۔ ایلی سوچ رہا تھا اس روز پہلے دن اس نے شہزاد کے متعلق سوچا تھا۔ ورنہ جب سے وہ راجاؤں سے آیا تھا اگر اسے شہزاد کا خیال بھی آتا تو اس قدر دکھ محسوس ہوتا کہ وہ اس خیال کو دل کی اقامت گہرائیوں میں ڈالتا۔ اس روز رات کو سونے سے پہلے اس کا جی چاہتا تھا کہ چیخ کر رو دے لیکن غلیظ کی قدری مانع تھی۔ اس لئے اس نے چپکے چپکے چند آنسو بہائے۔ ہر صورت وہ جو اس پر اثری تھا ٹوٹ گیا اور وہ ذہنی خلا سمٹ کر تپید ہو گیا۔

ڈال دیا۔ سپیرا اپنی گھڑی سنبھال رہا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ پھر اس نے بچی سے ایک بڑی سی ڈبیہ نکالی اور دو لکڑیوں کی مدد سے ہاجرہ کی ٹانگ کا وہ پھوڑا اٹھا لیا۔ جسے ڈاکٹر نے قبضی سے کاٹا تھا۔ سپیرے نے گوشت کا وہ ٹکڑا جو ابھی تک سیاہ تھا اٹھا کر ڈبیہ میں ڈال لیا۔

”تمہاری کیا خدمت کریں؟“ ایلی نے باہر نکل کر سپیرے سے کہا۔

”تم کیا سیدھا کرو گے باپو۔“ وہ بولا۔

”پھر بھی۔۔۔“ ایلی نے کہا۔

”اونسوں۔“ سپیرا مسکرایا۔

”کچھ تو لے لو۔“ شہزاد نے پانچ ایک دس دس کے نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

”لڑکی تمہیں تو صرف بڑھیا کا جیون ملا ہے پر مجھے گرد کئی دیا سے ساری جیون ہستی مل گئی ہے۔ تمہیں کیا پتہ یہ کتنی بڑی دولت ہے۔“ اس نے اپنی ڈبیہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں اب چلتا ہوں۔“

دھشتا وہ رک گیا۔ ”اے لڑکی۔“ وہ بولا۔

”کیا ہے۔“ فرحت نے کہا۔

”تو نہیں۔“ وہ بولا۔ ”یہ جو دوسری والی ہے۔ ذرا منہ میری طرف کرو۔“

شہزاد نے سپیرے کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ شہزاد کے ماتھے کے تل پر پڑی۔ ”آہ۔“ وہ بولا۔

”تیرے تو ماتھے پر نند بندی ہے۔ تو تو آپ ناگ دیوی ہے۔ یہ لے کیا یاد کرے گی کہ سپیرے نے کیا دان کیا تھا۔“ اس نے ایک اور ڈبیہ سے چند سیاہ مرجیں نکالیں اور شہزاد کے ہاتھ پر رکھ کر بولا: انہیں کھالے۔ ابھی کھا۔“

شہزاد نے نفرت سے ان گندی مرجوں اور سپیرے کے غلیظ ہاتھوں کی طرف دیکھا اور پھر جھپکتے ہوئے دو مرجیں منہ میں ڈال لیں۔

سپیرے کے جانے کے بعد اس نے باقی مرجیں پھینک دیں۔

ہاجرہ رو بہ صحت ہونے لگی۔ سپیرے کے کہنے کے مطابق ایک ہفتہ تک وہ اسے دودھ اور کھی پلاتے رہے۔

جب وہ تندرست ہوئی تو خود ہی کہنے لگی: پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ اس روز بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے یوں محسوس کیا تھا جیسے کسی نے ایک لٹھ میرے سر میں دے ماری ہو۔ پھر پتہ

نہ کیا کیا جاسکتا تھا۔ ہم نے ناگ تیل بھی لگا دیکھا۔ کچھ افادہ نہ ہوا۔ پھر مجھے سرمہ یاد آیا میں ایک چلو اسے بھی آزما دیکھو۔ سو جنب میں نے ان کی آنکھوں میں ایک سلائی لگا دی۔ سلائی نے کی دیر تھی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ درد گویا کافور ہو گیا۔ اس روز ہمیں سمجھ میں آیا کہ یہ تو بے کام کی چیز ہے۔ سو جنب ہم نے کمیٹی کی طرف سے ڈونٹی پڑادی کہ کسی شخص کو بچھو یا ہپ کٹ لے تو وہ ہمارے پاس پہنچ جائے صاحب بیسیوں مریض آئے اور ایک ایک سلائی لانے کے بعد یوں اپنے پاؤں پر چل کر گھر لوٹے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

”تو کیا اب بھی آپ کے پاس وہ سرمہ ہے۔“ خلیق نے پوچھا۔

”وہ نہیں۔“ حافظ صاحب بولے۔ ”ختم ہو گیا۔ شاید ایک آدھ سلائی نکل آئے۔ ابی ڈاکٹر صاحب ہم نے حکیم محمود علی کو کئی ایک خط لکھے“ تاکہ اور شیشیاں بھیجے لیکن تمام خط ڈی ایل او کیڑے واپس آ گئے۔ ڈاکٹروں نے ان پر تحریر کیا ہوا تھا کہ ایسے نام کا کوئی شخص بھائی دروازے پر رہائش نہیں رکھتا۔ لہذا خط واپس کئے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ حکیم محمود علی صاحب کیا دے اور ان کا مطلب کیا ہوا۔ ہم نے بڑی تحقیق کی لیکن بے فائدہ۔“

خلیق نے پھر راجپال کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ حافظ صاحب بولے:

”ہاں وہ ہمارے پاس بھی آیا تھا لیکن دوئی پہلے ہی دے دینا یہ چیز ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ البتہ اگر سانپ اسے ڈس لے اور وہ یہاں پہنچ جائے تو میرا خیال ہے ایک سلائی سرمہ تو لڑی آئے گا۔“

چار ایک روز بعد شام کے آٹھ نو کے قریب راجپال کے بازار میں شور مچ گیا۔

راجپال آ رہا ہے۔ راجپال آ رہا ہے۔“

جب وہ قصبے میں داخل ہوا تو اس کا منہ سوچ چکا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نہ بٹہ وہ کتنی دور سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس کی ہمت ختم ہو چکی تھی۔ دیر تک وہ فصیل دیوار سے لہ لہ کر کھڑا رہا۔ پھر اک عزم سے دوڑنے لگا۔ لالہ رام داس کی دکان پر وہ تھکی کی طرف جھپٹا اور ہانگی پینے لگا۔ اتنے میں اس کے گرد بھیڑ لگ چکی تھی۔ لوگوں چاروں طرف سے دوڑ پڑے۔ ایک آدمی حافظ صاحب کے پاس پہنچ گیا تھا۔ دوسرا ڈاکٹر کے پاس۔ سبھی پینے کے بعد راجپال کے باہر ہمت کر کے بھاگنا شروع کیا لیکن چند ہی قدم اٹھانے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں میں ہاتھ رکھ لیا اور پھر چکر کھا کر دھڑام سے بازار کے عین وسط میں ڈھیر ہو گیا۔ اتنے میں حافظ

## ماہہ کا انتقام

اگلے روز چائے سے فارغ ہو کر وہ دونوں کمیٹی کے سیکرٹری کے گھر چلے گئے۔ راجپال کی میڈیکل کمیٹی کے سیکرٹری کا نام حافظ عبد المجید تھا۔ وہ چالیس برس کے ہوں گے۔ قدرتی طور پر وضع داری کے جملہ نشانات واضح تھے۔ انداز میں روایات پرستی کی واضح جھلک تھی۔ وہ احتیاط سے چلتے۔ احتیاط سے بات کرتے اور احتیاط سے سوچتے تھے۔ خلیق نے کچھ دیر بعد مطلب کی بات چھیڑی۔ بولا:

”حافظ صاحب۔ کیا آپ کے پاس سانپ کے کاٹے کا سرمہ ہے یعنی —۔“ خلیق نے اپنی بات کی وضاحت کرنے کے لئے کچھ اور کہنا چاہا۔

”ہاں ہاں“ حافظ صاحب بولے۔

”حیرت ہے۔“ خلیق بولا۔ ”کہ سرمہ لگانے سے سانپ کے زہر کا اثر دور ہو جائے۔“

”ابی صاحب۔“ وہ بولے۔ ”ساری بات ہی عجیب ہے۔ دراصل ہوا یہ کہ آج سے چار سال پہلے ہمیں حکومت کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس کے ساتھ ہی حکیم محمود علی کا ایک اشتہار منقوط تھا۔ اشتہار میں اس سرمے کے متعلق مرقوم تھا کہ اس کی سلائی لگانے سے سانپ یا بچھو کا زہر یا تو اثر نہیں کرتا اور اگر اثر ہو چکا ہو تو دور ہو جاتا ہے۔ گورنمنٹ نے خط میں لکھا تھا کہ ہم اس سرمہ کو خریدنے کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔ چونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سرمہ کا اثر فوری ہوتا ہے اور اسے استعمال کرنے سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ لہذا ہسپتالوں، سکولوں اور کمیٹی گھروں کو یہ سرمہ خریدنا چاہئے۔“

”آپ جانتے ہی میں ڈاکٹر صاحب۔“ حافظ صاحب بولے۔ ”کہ ایسے سرکاری خط آیا ہی کرتے ہیں۔ میں نے سمجھا کہ ویسے ہی حکیم محمود کا کاروبار چلانے میں مدد دینا مقصود ہے۔ چونکہ ساری بات ہی مہمل تھی بھلا آنکھوں میں سرمہ لگانے کو سانپ کے کاٹے سے کیا تعلق۔“

”بالکل بالکل۔“ خلیق ہنسنے لگا۔

”ہے نا“ حافظ صاحب بولے۔ ”تو صاحب ہم نے گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دو شیشیاں خرید لیں اور وہ عرصہ دراز تک گھر جوں کی توں پڑی رہیں۔“

”ایک رات دو بجے کے قریب بیگم صاحب جو انھیں تو انہیں سانپ نے کاٹ لیا۔ اب اس

”ایلیاس بھائی۔ تم کہیں۔ آؤ آؤ۔“ دھنستا وہ رک گیا۔ ”لیکن نہیں۔ یہیں نہیں۔ کوئی بن دیکھ نہ لے۔“ ٹھہرو میں ابھی آیا۔“

کپور چند منٹ کے بعد باہر نکلا۔ ”آؤ آؤ۔“ وہ بولا۔ ”باہر جا کر بات کریں گے۔“ اور وہ ایلچی چپ شیش کی طرف چل پڑے۔ دھننگ روم میں بیٹھ کر کپور ایلچی پر برس پڑا:

”تم نے یہیں سے جانے میں بڑی شدید غلطی کی ایلچی۔ تم نے میدان خالی چھوڑ دیا۔ نتیجہ ہوا کہ تمہاری بیوی نے وہ واپس لایا۔ تمہارے خلاف اس قدر زہر اگلا کہ شاہوال کا ہر ہلکار اسے خلاف ہو چکا ہے۔ ہر شخص کی ہمدردی ان کے ساتھ ہے۔ پولیس کے افسروں نے حکم دیا ہے کہ تمہیں حراست میں لے لیا جائے۔ مجسٹریٹ تمہاری بیوی کا قہقہہ سن کر اتنا متاثر ہوا کہ اس کے آنسو نکل آئے۔ سراب تمہارے خلاف ہو چکا ہے۔ ڈپٹی کمشنر تمہارے حق میں ہیں۔ سارے شہر میں تمہارے خلاف آگ لگی ہوئی ہے۔ اگر لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا۔ تو وہ تمہیں مار دیں گے۔ ان سب کو یقین ہو چکا ہے کہ تم نے اپنی بیٹی کا سودا کیا تھا۔ اور اس کی اور ہاکی ماں کی مرضی کے خلاف زبردستی اس کی شادی کر دی تھی۔ اور پھر تم بھاگ کر پش ہو گئے۔ اس سے ان کا یقین اور بھی پکا ہو گیا۔

”کیا تمہارا بھی یہ خیال ہے۔“ ایلچی نے کپور سے پوچھا۔

”میری بات چھوڑو۔ میرا کیا ہے۔“

”میں تمہیں حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔“ ایلچی نے کہا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں چاہئے تھا کہ جانے سے پہلے بتاتے۔ اب کیا فائدہ اب تو ملک سے نکل چکا ہے۔ تمہاری گھر گھر رسوائی ہو چکی ہے۔ لوگ اور اہل کار تمہیں بد معاش سمجھتے ہیں۔ تمہارے پڑوس میں جو اے۔ ایس۔ آئی رہتا تھا وہ ان کی امداد کر رہا ہے۔“

”عد ہو گئی۔“ ایلچی نے کہا۔

”عد سی حد ہوئی ہے۔“ کپور کہنے لگا۔ ”حتیٰ کہ ریاض بھی مخالف پارٹی میں شامل ہو چکا۔ صرف ناظم کو تم سے ہمدردی ہے لیکن وہ بھی کھلے بندوں اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔“

”اوہ۔ تو پھر ہو گا کیا۔“ ایلچی نے پوچھا۔

”پھر بھی تم تاریخ پر تو یہیں آؤ گے ہی۔“ کپور نے کہا۔

”کیسی تاریخ۔“ ایلچی نے پوچھا۔

صاحب بھی عین موقع پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے سرے کی ایک سلائی اس کی آنکھوں میں ڈالی۔ راجپال کا جسم یوں ترپنے لگا جیسے بجلی کا شٹ لگ گیا ہو۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور وحشیانہ انداز سے نعرہ لگایا: ”واہ گرو۔“

ایلچی نے اس وقت محسوس کیا جیسے اس پر بھی سانپ کے کانے کا اثر ختم ہو گیا ہو۔ اس کا بھی جی چاہتا تھا کہ زور سے نعرہ لگائے۔ ”واہ گرو۔“

اگلے روز خلیق نے دیکھا کہ ایلچی کی پرانی شخصیت پھر سے استوار ہو گئی ہے اور اس کا وہ ذہنی جود ختم ہو چکا ہے تو اس نے بات چھیڑی۔

”شکر ہے اب آپ کی طبیعت پہلے کی نسبت بہتر ہو گئی ہے۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”صورت حال بڑی خطرناک تھی۔“ ایلچی نے کہا۔

”اچھا۔“ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”آخر بات کیا تھی؟“

”مجھے بتانے میں تو کوئی خرچ نہیں۔“

## رسوائی

ایلچی کا قصہ سننے کے بعد خلیق خاموش ہو گیا۔ غالباً وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس لمبی چوڑی داستان کا یہ انجام نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سال ہا سال دکھ اور تکلیفیں سننے کے بعد اتنی سی بات پر انہیں جدا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ خلیق کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔

خلیق طبعاً کہنے والا شخص نہ تھا۔ وہ خاموشی سے محسوس کرنے کا عادی تھا۔ اس نے بعد مشکل آنسو پی لئے اور بولا: ”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ اپنے معاملات کو بہتر سمجھتے ہیں۔“

پندرہ روز راجواڑے ٹھہرنے کے بعد ایلچی خلیق سے رخصت ہو گیا۔ وہ ایک ایسی گاڑی میں سوار ہوا جو رات کے ایک بجے شاہوال پہنچتی تھی۔ شاہوال پہنچ کر وہ سیدھا کپور کے گھر گیا۔ حالات کو جاننے کے لئے وہ کسی اور کے پاس نہ جا سکتا تھا۔ ریاض سے وہ گھبراتا تھا۔ ناظم سے ملنا مشکل تھا۔ اور بورڈنگ میں جانا مناسب نہ تھا۔ اسے ڈر تھا کہ لڑکے اسے پہچان لیں گے اور پھر آپس میں باتیں کریں گے۔ کپور اسے دیکھ کر گھبرا گیا:

”تمہارے خلاف دو مقدمے درج ہو چکے ہیں۔“ کپور بولا۔

”اوہ۔“ ایلی بولا۔

”خبردار رہتا جب بھی تم آؤ گے کسی نہ کسی بہانے تمہیں حوالات میں بند کر دیں گے اور ہم میں سے کوئی شخص اس بارے میں کھلم کھلا تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔“

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ راجپال ہو اور اسے مادہ نے ڈس لیا ہو۔

”ہم تو بس یہی ایک کام کر سکتے تھے سو ہم نے کر دیا۔“ کپور نے کہا۔ ”سراب صاحب تمہارے خلاف محکمے میں رپورٹ کرنے والے تھے۔ میں نے ہاتھ جوڑے، میں نے کہا کہ ایسا نہ کیجئے۔ وہ کہنے لگا کہ ہم اسے یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ یہ تو بلکہ اچھا تھا۔ چونکہ یہاں تمہارا رہنا ممکن نہیں رہا۔ سو بھائی۔ میں نے ان سے کہا کہ رپورٹ نہ کیجئے میں ویسے ہی اس کا تباہ کرادوں گا۔ سو میں ایک روز کے لئے لاہور چلا گیا اور لوگوں سے مل ملا کر میں نے تمہارا تباہ کرادیا ہے۔“

”کس جگہ۔“ ایلی نے پوچھا۔

”قاضی پور۔“ وہ بولا۔ ”وہاں کا ہیڈ ماسٹر شریف آدمی ہے اور وہ جگہ لاہور کے قریب ہے۔“

”تو میں یہاں چارج کیسے دوں گا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“ کپور نے کہا۔ ”ہم سب ٹھیک کر لیں گے۔“ اس نے جیب سے ایک کانٹہ نکالا۔ ”یہ لو۔“ ”یہ تمہارا آرڈر ہے اور اس پر ہم نے لکھ دیا ہے کہ تمہیں یہاں سے فارغ کر دیا گیا ہے۔ میری رائے ہے کہ سیدھے قاضی پور جا کر ڈیوٹی سنبھال لو۔ اگرچہ رہے تو معاملہ اور زیادہ بگڑ جائے گا۔“

کپور سے جدا ہونے کے بعد ایلی گویا بالکل تنہا رہ گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ اکیلا ہے۔ بالکل اکیلا۔ اور کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کا ساتھ دے۔ ایک بار پھر وہ فکر میں ڈوب گیا۔ لیکن اب کی بار اس کا ذہن خالی نہیں تھا۔ اس میں بیسیوں سوال ابھر رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا اور گاڑی قاضی پور کو جا رہی تھی۔

**کوڑھی**

قاضی پور پہنچ کر وہ سیدھا ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر پہنچا۔ اس نے وہ آرڈر ان کے سامنے

پکڑ دیا اور کہنے لگا:

”مدرسے میں حاضر ہونے سے پہلے میں آپ کو اپنے حالات سے واقف کرنا چاہتا ہوں۔“

اتنی سی تمہید کے بعد اس نے اپنی روداد مختصر طور پر انہیں سنادی۔

”ہوں۔“ اس کا قصہ سن کر انصاری صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ ظاہر تھا کہ وہ ایلی کے لئے

ایک ہمدردی محسوس نہیں کر رہے تھے۔ لیکن آصفی صاحب ”وہ بولے۔“ میں اس بارے میں

پکی کیا مدد کر سکتا ہوں۔“

”آپ میری یہ مدد کر سکتے ہیں کہ کچھ دیر کے لئے مجھے برداشت کر لیں۔“ ایلی نے کہا۔

”کیا مطلب۔“

”مجھے یہاں اپنے سکول میں رہنے دیں۔“

وہ نہنے۔ ”اچھا۔“ وہ بولے۔ ”تو آپ شوق سے ہمارے مدرسے میں کام کریں۔ لیکن

ای صاحب! ایسی گڑبڑ سے مجھے بہت وحشت ہوتی ہے۔“

قاضی پور پہنچ کر ایلی کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ وہ باتیں جن سے وہ لوگوں کی توجہ جذب کیا

لانا ختم ہو گئیں۔ اپنے ارد گرد اساتذہ کی بھیڑ لگانے کی بجائے وہ جان بوجھ کر ان سے دور

بلد جماعت میں پھیل گئے۔ باتیں کرنا بھی چھوٹ گیا۔ وہاں بھی خاموش رہتا اور پڑھانے میں کوئی

تغیر نہ لیتا۔

اسے شاہوال سے دلخراش خبریں آ رہی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اتنا بڑا معاملہ

ان کی خلاف کیوں قائم کیا جا رہا ہے۔ آخر شنوار کا مقصد کیا تھا۔ اس نے جو احتجاج کیا تھا اس کی

چونکی غلط بات پر استوار نہ تھی۔ شنوار اچھی طرح جانتی تھی کہ اس نے نفیسہ کی شادی

بیت کی بناء پر نہیں کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایلی نے اسے سچا نہیں تھا۔ پھر وہ کیا چاہتی تھی۔

بالکل کا مقصد ایلی کو رسوا کرنا تھا۔ یا ڈرا دھمکا کر اپنے تابع کرنا تھا۔ لیکن اس کی جرات ڈر کے

بے پر استوار تھی۔ جوں جوں خطرہ بڑھتا جاتا اور بچاؤ کی کوئی صورت دکھائی نہ دیتی توں توں وہ

لڑھکتا جاتا تھا۔

پولیس اور کورٹ اس کے لئے خطرناک مقامات تھے۔ اس وقت اس کے سر پر قید کا خطرہ

لڑھکتا جاتا تھا۔ قید ہو چکا تھا۔ قید ہو جاؤں گا تو کیا



ہوا۔ وہ سوچا۔ لیکن ڈر کی وجہ سے کسی کے تابع نہیں ہوں گا۔

جب اسے اپنی رسوائی کا خیال آتا تو وہ دل موس کر رہ جاتا۔ اس کے دل پر نہیں گنتی۔ شہزاد نے اچھا نہیں کیا۔ وہ سوچا۔ پھر اس کی نگاہ میں وہ پولیس آفسر آ جاتا جو شہزاد کے پردوس میں رہتا تھا۔ شہزاد اس کے قریب آ بیٹھتی اور آنسو بہاتی۔ لڑکیوں اس کے گرد منڈلاتیں۔ ہنستیں، قہقہے لگاتیں اور معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتیں۔ اہلی کو دھچکا لگتا۔ شہزاد سے اسے ایسی توقع نہ تھی۔ قاضی پور کا وہ زندہ اہلی کی زندگی کا بدترین دور تھا۔ وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس کے دل میں کامل یقین تھا کہ سبھی اس سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ ہیڈ ماہر جس کے رو بہ اس نے خلوص سے تمام واقعات ہمدردی حاصل کرنے کے خیال سے دہرائے تھے وہ بھی اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ شاہوال میں اس کے خلاف ایک طوفان چا ہوا تھا۔ آصفی محلے میں لوگ اس کے خلاف آوازیں بلند کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ اس کے دوست اور رشتہ دار بھی اعلان یہ اس کے خلاف ہو چکے تھے۔

اس کے مکان پر وجہت برستی تھی۔ وہ مکان جو قاضی پور میں اسے رہنے کے لئے ملا تھا بہت وسیع تھا۔ اس میں کئی ایک کمرے تھے اور اس کا جملہ سالن ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا۔ اس کے پاس نہ کوئی بستر تھا نہ چارپائی۔ خوش قسمتی سے وہ گرمیوں کے دن تھے ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ مکان میں مالک مکان کا ایک ٹوٹا ہوا تخت پوش پڑا تھا جس پر رات کو پڑ کر سو رہتا۔ سارا دن بھی وہ اسی تخت پوش پر بیٹھا سوچتا رہتا۔

دو مرتبہ اس کے نام شاہوال سے سمن آچکے تھے۔ مدرسہ کے دفتر شاف کی مہربانی سے ان کی تعمیل نہ ہوئی تھی۔ لیکن اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایک روز اسے شاہوال جانا ہی پڑے گا۔

تیسری مرتبہ جب سمن آئے تو ساتھ ہی ایک اور مصیبت رونما ہوئی۔ اس روز جب وہ صبح جاگا تو اس کے دونوں ہاتھوں پر اور بازوؤں پر ایگزیماس کے چھالے نکل آئے تھے۔ ایسی ہی پھنسیاں جو امرتسر میں اس کے چہرے پر نکلی تھیں۔ جب وہ پھنسیاں پھٹ گئیں اور اس کے ہاتھوں کی جلد اتر گئی۔ ہاتھوں کے زخموں سے پانی بہنے لگا۔ اس نے حیرت سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پھر وہ گاڑی میں بیٹھا سمن کی تعمیل کرنے شاہوال جا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بیکار ہو

تھے۔ ان پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اور اس نے دونوں بازو اوپر اٹھار کھے تھے۔ وہ سوچ رہا اس کی نگاہوں تلے سارا شاہوال پلیٹ فارم پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں بنے تھے۔ ان کے پیچھے پولیس والے ہتھکڑیاں اٹھائے کھڑے تھے۔

”کلٹ پلو کلٹ۔“ ریلوے کا ایک وردی پوش ٹی ٹی اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔

اہلی چونکا۔ اس نے بڑی بے بسی سے ٹی ٹی کی طرف دیکھا۔ کلٹ اس کی جیب میں تھا لیکن کے ہاتھ بیکار تھے۔ وہ کلٹ نکال نہ سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”بے کلٹا ہے۔“ پلو مسکرایا۔

”جی نہیں“ وہ بولا۔

”تو پھر دکھاؤ۔“

اس نے اپنی جیب ٹی ٹی کی طرف کر دی۔ ”اس جیب میں ہے۔“

ٹی ٹی نے مخدوش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

ایک ہرلای مسافر نے بات سمجھ کر اہلی کی جیب میں سے کلٹ نکالا۔

”کیا ہوا ہے تمہارے ہاتھوں کو۔“ ٹی ٹی نے پوچھا۔

”جی ایگزیماس ہے۔“

جانا بھائی

اس کے قریب بیٹھے ہوئے مسافر یہ سن کر پرے ہٹ گئے جیسے وہ کوڑھی ہو۔ شاہوال کا دوران تھا۔ صرف چند ایک مسافر تھے۔ وہ جلدی سے اترا اور چپکے سے شیشن سے باہر آیا۔ اس نے ایک ویران راستہ اختیار کیا تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔ پکھری پہنچ کر وہ مجسٹریٹ کے کمرے کے باہر چند دیہاتیوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

اس کا کوئی جانا پہچانا نہ تھا۔ پھر وہ آواز کا انتظار کرنے لگا۔ دوپہر ہو گئی لیکن اسے آواز نہ آیا۔ ایک پولیس والا دور کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ اہلی سمٹ کر بیٹھ گیا۔ وہ دیہاتی جو اس کے پاس بیٹھے سب جا چکے تھے۔ دروازے کے سامنے وہ اکیلا تھا۔ پولیس والا کیا تو اس نے گھبراہٹ لہائی۔ ضرور کوئی بات ہے۔ اس نے سوچا۔ پھر پکھری کے پیادے سے ملا۔

ایلی نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ اسے قطعاً نہ جانتا تھا۔

”اسے لے جاؤ۔“ کرسی پر بیٹھے ہوئے افسر نے کہا۔

پای نے ایلی کا بازو پکڑ لیا۔

”لیکن۔“ نووارد اسے ایس آئی نے کہا۔ ”میں جوان کا ضامن ہوں۔“

انہوں نے حیرت سے اسے ایس آئی کی طرف دیکھا۔

ایلی خود حیران کھڑا تھا۔

”آپ اس معاملے میں نہ آئیں مجید صاحب۔“ افسر نے اسے ایس آئی سے کہا۔

”یہ میرے بھائی ہیں۔“ مجید بولا۔

ایلی نے پھر حیرت سے مجید کی طرف دیکھا ”بھائی۔ اس نے تو کبھی مجید کو دیکھا بھی نہ تھا۔“

”میں ان کی ضمانت دوں گا۔“ مجید بولا۔

”آپ سرکاری افسر ہیں آپ ضمانت نہیں دے سکتے۔“ افسر نے مجید سے کہا۔

اسے ایس آئی نے اپنی بیٹی کھولی اور افسر کے سامنے میز پر رکھ دی۔ ”یہ لیجئے اپنی نوکری۔“

اعلیٰ الطمینن سے کہنے لگا۔ ”اب تو میری ضمانت منظور کیجئے گا نا۔“

ایلی بت بنا کھڑا تھا۔ وہ مجید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اسے میں ایک خوش شکل آدمی داخل ہوا۔ وہ سب منسوبانہ انداز سے کھڑے ہو گئے۔

”آخاہ۔“ نووارد چلایا۔ الیاس صاحب ہیں۔ آئیے الیاس صاحب۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا

ہے۔“ اس نے ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کمرے سے نکل گیا۔ باہر جا کر اس نے ایک تانگے کو اشارہ

کیا۔ ایلی کو تانگے میں بٹھا کر وہ خود بھی سوار ہو گیا اور تانگہ چل پڑا۔ کچھ دور جا کر تانگہ رکا۔

برقعہ پوش عورت پنج پر بیٹھی تھی۔ خوش پوش شخص نے اشارہ کیا۔ وہ عورت آکر ایلی کے

ہاتھ لگائی اور تانگہ پھر سے روانہ ہو گیا۔

اس روز عجیب واقعات ہو رہے تھے۔ وہ مجید کون تھا؟ وہ اس کی ضمانت کیوں دے رہا تھا؟

”فوش پوش شخص اسے کیوں لے آیا تھا؟ کمال لے جا رہا تھا؟ اور وہ برقعہ پوش کون تھی؟“

انہا اور گھن

جب تانگہ شہزاد کے مکان کے پاس رکا تو ایلی چونکا۔ اسے وہ تو شہزاد برقعہ پہنے اس کے

”شہزاد بیام الیاس کی باری کب آئے گی۔“ اس نے پوچھا۔

”تم کون ہو۔“ وہ بولا۔

”میں الیاس ہوں۔“

پیادے نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر وہ قلعہ مار کر ہٹا۔ ”اپنی باری پر حاضر نہیں

ہوتے اور پھر پوچھتے ہیں۔“

”لیکن مجھے تو آواز نہیں پڑی۔“

”تمہارے تو وارنٹ بھی نکل چکے ہیں۔“ وہ بولا۔

”کیوں بھی۔ کیا بات ہے۔“ وہی پولیس والا آگیا۔ ”کون ہو تم؟“ اس نے ایلی سے

پوچھا۔

الیاس آصفی۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”صاحب۔ ذرا ادھر آئیے۔“ پولیس والا چلایا۔“

ایک انپکٹر نہ جانے کہاں سے آگیا۔

”ادھر آؤ۔“ انپکٹر نے ایلی کو گھور کر دیکھا۔ ”ادھر آؤ ہمارے ساتھ۔“

وہ اسے ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔ وہاں ایک پولیس افسر کرسی پر بیٹھا تھا۔ انہوں

نے زیر لب کچھ باتیں دہرائیں۔ پھر وہ افسر کہنے لگا: اسے حوالات میں بند کر دو۔“

”کس لئے؟“ ایلی نے بھد مشکل کہا۔

”وجہ بعد میں بتائیں گے۔“ انپکٹر نے کہا۔

”میں نے کیا جرم کیا ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔“ انپکٹر نے بولا۔

کرسی پر بیٹھے ہوئے افسر نے ایلی کی طرف دیکھا اور بولا: ”تمہارے ورائٹ ہیں۔ یا تو ابھی

پانچ ہزار کی ضمانت کراؤ ورنہ حوالات جاؤ۔“

”کہاں ہے تمہارا ضامن۔“ انپکٹر نے پوچھا۔

ایلی نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا۔

وہ اسے لے جانے لگے تو پولیس کا ایک اور اسے ایس آئی داخل ہوا۔ ”السلام علیکم۔“ وہ

ایلی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”آصفی صاحب۔ آپ یہاں کہاں؟“

نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ تم نے میری بچی کو ایک بد معاش کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔“  
 انسپکٹر نے پھر اشارہ کیا: آپ فی الحال نہ بولیں۔“ اس نے شہزاد سے کہا۔  
 ”یہ سب الزام ہیں۔“ ایلی بولا۔

”چٹو الزام ہی سہی۔“ نصیب نے کہا۔ ”لیکن واقعات کا رخ ایسا ہے کہ آپ پر جرم ثابت ہو جائے گا۔ قانون آپ کے حق میں نہیں۔“  
 ”نہ ہو۔“ ایلی نے کہا۔

”آپ کو سزا ہو جائے گی۔“ وہ بولا۔  
 ”ہو جائے۔“ ایلی نے کہا۔

”آپ کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔“  
 ”مجھے اس کی پرواہ نہیں۔“ ایلی بولا۔  
 ”وہ تو ڈھیٹ ہے۔“ شہزاد چلائی۔

”آپ خاموش رہئے۔“ نصیب نے کہا۔

آپ سوچ لیں الیاس صاحب۔“

”میں نے سوچ لیا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”دیکھئے۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“

شہزاد نے نفرت سے اونہہ کہا۔

”آپ کو چاہئے کہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔“ نصیب بولا۔

دفترا“ ایلی کو نہ جانے کیا ہوا کہ لمحہ گھر سے لڑکیوں آوازیں سن کر یا شاید شہزاد کی نفرت بھری ”اونہہ۔“ سن کر وہ بالکل نڈر ہو گیا۔

”دیکھئے انسپکٹر صاحب مجھے معلوم ہے کہ مجسٹریٹ اور پولیس کے افسران لوگوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہر قدم آپ کے مشورے سے اٹھایا جا رہا ہے۔ مجھے علم ہے کہ ڈائریکٹر شکایات پہنچ رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں قید کر لیا جاؤں گا۔ میں یہ سب کچھ بلاتا ہوں۔ لیکن آپ کو علم نہیں کہ میں نے جو کچھ کیا وہ کیا جو ایک باعزت خاوند کے شایان ثناء ہے۔“

”باعزت خاوند۔“ شہزاد چلائی۔

پاس بیٹھی تھی۔ اور وہ خوش پوش خوبصورت جوان ضرور اس کا پڑوسی پولیس والا انسپکٹر تھا۔ وہ ایلی کو اپنے گھر میں لے گیا۔ شہزاد نے برقعہ اتار دیا۔ اس کے چہرے سے نفرت اور غصہ ہٹ رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے کولہوں پر رکھ لئے اور وہ اسی طرح ایلی کے درہوتن کر کھڑی ہو گئی جس طرح اس روز کھڑی تھی جب وہ اپنے گھر سے نکلا تھا۔

انسپکٹر نصیب نے مسکرا کر شہزاد کی طرف دیکھا۔ اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”دیکھئے الیاس صاحب۔“ وہ بولا۔ ”بہتر یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے کوئی سمجھوتہ کر لیں ورنہ اس کے نتائج آپ کے حق میں بے حد نقصان دہ ثابت ہوں گے۔“

ایلی خاموش بیٹھا رہا۔

”آپ کو غم ہونا چاہئے۔“ نصیب بولا۔ ”کہ شاہوال کے لوگ اور حاکم سب آپ کے اس فعل پر لعنت بھیج رہے ہیں اور مجسٹریٹ علی قلی خاں نے تو اعلان کر دیا ہے کہ آپ کو اندر کر دے گا۔“ نصیب خاموش ہو گیا۔

ایلی جوں کا توں بیٹھا رہا۔

”آپ کے ڈائریکٹر کو تمام تفصیلات معلوم ہیں اور آپ نوکری سے برطرف ہونے والے ہیں۔“ وہ پھر خاموش ہو گیا۔

”آپ کا ان لوگوں کو ان کے گھر سے نکال کر یوں بے یار و مددگار چھوڑ جانا ایک قبیح فعل ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”بے یار و مددگار تو میں ہوں۔“ ایلی نے کہا۔

نصیب مسکرایا: ”جو لوگ ایسے فعل سرزد کرتے ہیں ان کے عزیز اور دوست بھی ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ اس لئے میں بلا در رعایت آپکو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ان کے ساتھ سمجھوتہ کر لیں۔“

”میرا ان سے کوئی جھگڑا نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو پھر آپ انہیں کیوں چھوڑ گئے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔

”یہ طلاق کا مطالبہ چھوڑ دیں۔ لڑکی اپنے گھر جا بے تو میں واپس گھر آ جاؤں گا۔“ ایلی نے

جواب دیا۔

”تمہیں لڑکی کو طلاق دینی پڑے گی۔“ شہزاد غرائی۔ ”تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ تم

ہے تھے۔  
 ”میں صبح سے تمہارے ساتھ ہوں۔“ ناظم بولا۔ ”جب تم گاڑی سے اترے تھے۔ پھر جب  
 مغموم کرپانے قلعے کے راستے پھری گئے تھے اور پھر علی قلی کی عدالت کے باہر زمین پر بیٹھے  
 رہے تھے۔ میں سب دیکھ رہا تھا۔“

”لیکن یار۔“ ایلی نے کہا۔ ”وہ مجید کون تھا۔ اس نے توحہ کر دی۔“  
 ناظم تہقیر مار کر ہنسا۔ ”وہ میرا یار ہے۔ میں نے ہی اسے بھیجا تھا ورنہ انہوں نے تمہیں  
 مار کرنے کی سیکم مکمل کر رکھی تھی۔“  
 ایلی نے حیرت سے ناظم کی طرف دیکھا۔

”دیکھتے کیا ہو۔“ وہ بولا۔ ”ہم امرتسرے یار ہوتے ہیں۔ ریاض پکڑ اور سراب کی طرح  
 ہوتے نہیں ہوتے بوندے ڈر گئے۔ پیچھے ہٹ گئے۔“ اس نے غصے میں سنک گھرائی۔  
 ”مجھے بھی مشورہ دیتے تھے کہ آگے نہ بڑھنا ورنہ آٹے کے ساتھ گھن بھی پس جائے گا۔  
 میں گھن ہوں گھن۔“ وہ کھڑا ہو کر چلانے لگا۔ ”مجھے پسینے والا آئے تو میرے سامنے۔“ وہ سڑک  
 پر کھڑا دیوانہ وار چلا رہا تھا۔ اور لوگ رک کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سامنے سکول کے  
 طلباء بھیڑ لگائے کھڑے تھے۔ اساتذہ کمروں سے جھانک رہے تھے۔  
 سراب کا چہرہ سمٹ رہا تھا۔ دو بھوری آنکھیں ابھر رہی تھیں۔ پکڑ سر جھکائے کھجا رہا تھا۔  
 ریاض خاموش کھڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

ابو۔ ابو

قاضی پور پہنچ کر ایلی ایک بار پھر بے چارگی اور بے بسی میں کھو گیا۔ وہ دیران مکان، ٹوٹا ہوا  
 تخت وہی دیران سکول جہاں لوگ اسے درخور اعتنا نہ سمجھتے تھے اور اساتذہ نفرت سے اس کی  
 رف دیکھتے تھے۔ وہی غربت جو اس روز سے اس کی سرپریوں سوار تھی جیسے جزیرے کا پڑھلا۔  
 ایک بار اس کے بعد اسے تاریخ پر شاہوال جانا پڑا۔ لیکن اب ہر یار ناظم اس کے ساتھ ہوتا  
 ا۔ اور ناظم کے دوست اے ایس آئی کی امداد سے حاصل تھی۔

علی قلی خاں مجسٹریٹ نے اسے عدالت میں اعلانیہ ڈانٹا لیکن اس کے خلاف کچھ نہ کر سکا  
 ر تمام مقدمات عدم پیروی کی وجہ سے داخل دفتر ہو گئے چونکہ شہزاد اپنی بچیوں کو لے کر لاہور

”میں حق بجانب ہوں۔“ ایلی نے کہا۔ ”مجھے ان لوگوں کے خلاف غصہ نہیں۔ میں پیشہ  
 انہیں خراج دوں گا۔ ہر طرح سے مدد کروں گا۔ لیکن میں ان کے ساتھ نہ رہوں گا۔ جب تک  
 یہ لوگ باعزت لوگوں کی طرح اس نکاح کا احترام نہیں کریں گے۔ آج اگر لڑکی اپنے خلوئے کے  
 پاس چلی جائے تو کل میں از خود اپنے گھر آ جاؤں گا۔“  
 ”ہوں۔“ نصیب سوچ میں پڑ گیا۔

”اور رسوائی، قید اور ملازمت سے برطرفی کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔“ ایلی نے کہا اور اٹھ کر  
 چل پڑا۔

”الیاس صاحب۔ الیاس صاحب۔“ نصیب نے آوازیں دیں لیکن وہ نصیب کے گھر سے  
 باہر نکل چکا تھا۔

اندر شہزاد چیخ رہی تھی: ”اس کے مزاج ٹھیک نہ کئے تو میرا نام بھی شہزاد نہیں۔ میں  
 دیکھوں گی کیسے نہیں دیتا طلاق!“

باہر محلے میں لوگ کلڑیوں میں کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ عورتوں نے ہونٹوں پر انگلیاں  
 رکھی ہوئی تھیں۔ بچے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ راہ گیر اسے رک کر دیکھتے تھے۔ لیکن اسے اس  
 وقت کسی کا ڈر نہ تھا۔ کسی کی پرواہ نہ تھی۔ وہ سینہ تانے چل رہا تھا۔ وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ  
 اسے ہاتھوں پر کوڑ چل گیا ہے۔

محله سے باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ سامنے سکول کے باہر ناظم کھڑا ہے۔

”ارے تم۔“ ایلی چلایا۔ ”تم کہاں۔“

ناظم کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں کا فرق بے حد نمایاں تھا۔ اس نے ہاتھ میں ہانک سنک  
 اٹھائی ہوئی تھی۔

ایلی کو دیکھ کر اس نے چار ایک گلیاں دیں:

”تم اکیلے نہیں ہو۔“ وہ چلایا۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں دیکھوں گا یہ کیا کرتے  
 ہیں۔ ان کی ایسی کی تہی۔“ اس نے ہانک سنک جھلاتے کہا۔ اور پھر مگلی دے کر بولا: ”انہوں نے  
 تمہیں اکیلا سمجھا ہے کیا۔ میں جان دے دوں گا جو میرے یار کو کسی نے انگلی سے چھوا بھی تو۔  
 پولیس افسر ہیں تو پڑے ہوں۔ ہم بھی غنڈے ہیں۔“ اس کے منہ سے تھوک کے فوارے چل

آگنی تھی۔ اس کی والدہ نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ شاہوال چھوڑ کر لاہور آجائے۔ اس کے جانے کے بعد اس کے حمایتی افسروں نے ایللی کی مخالفت چھوڑ دی تھی۔

پھر ایللی کو معلوم ہوا کہ شنراؤ نے محمود سے مل کر نفیسہ کی طلاق حاصل کر لی ہے۔ اس پر ایللی کو بالکل تعجب نہ ہوا۔ چونکہ محمود نے بارہا اسے خط لکھے تھے جن میں اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اس کی خاطر جھڑانہ بڑھائے۔ چونکہ ان حالات میں اسے نفیسہ کو طلاق دینے میں کوئی اعتراض نہ تھا چونکہ وہ نفیسہ کی مرضی کے خلاف اسے اپنے گھر میں رکھنے کے حق میں نہ تھا۔ لیکن جب اس نے یہ سنا کہ نفیسہ کا نکاح شیر علی سے ہو گیا ہے تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ تو کیا یہ سب فسو شیر علی کا چلایا ہوا تھا اور اس کے اپنے بھائی نے شنراؤ کو اس بات پر ابھارا تھا۔ ایللی کو یہ خبر سن کر اس قدر تکلیف ہوئی کہ اس کا دل زندگی سے بالکل اچھٹ ہو گیا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ تنہا شخص ہے۔ ایک سوکھا ہوا درخت جو صحرا میں اگا ہوا ہے۔ اور ارد گرد چاروں طرف ریت ہی ریت ہے۔ ریت اور دیرانی۔

لیکن کبھی کبھار اس دیرانے سے آواز آتی۔ ”ابو ابو۔“ اور ایللی دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا۔

ایللی کا جی چاہتا کہ چوری چوری شنراؤ کے گھر جائے اور کسی سے ملے بغیر کسی کے جانے بغیر عالی سے ملے اور اسے کہے:

”عالی! تم تو جانتے ہو۔ تم تو گواہ ہو کہ اس میں میرا قصور نہیں۔ انہوں نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ تمہیں تو علم ہے جیسی تم مجھے بلاتے ہو۔ ابو ابو پکارتے ہو۔ کوئی اور میرا نام نہیں لیتا۔ صرف تم ہو عالی۔“

## آخری بار

دو ایک مرتبہ وہ چوری چوری لاہور گیا بھی تھا۔

شام کے جھینپے میں وہ اس مکان کے باہر انتظار کرتا رہا تھا۔ اور جب ایک بچہ گول منول سا بچہ باہر نکلا تھا تو ایللی نے دوڑ کر ایک بڑا سا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ لفافے کو دیکھ کر عالی سہم گیا تھا لیکن مٹھائی اور پھل دیکھ کر اس کی آنکھ میں چمک لہرائی تھی۔ اور پھر ایللی اس سے بات کئے بغیر وہاں سے بھاگ لیا تھا۔

ایک مرتبہ جب ایللی ایک بڑا سا لفافہ اٹھائے وہاں کھڑا تھا تو شنراؤ عالی کو اٹھائے ہوئی اور لہنتی ہوئی سامنے آکھڑی ہوئی۔ وہ شنراؤ کو دیکھ کر گھبرا گیا۔

”لے لو عالی۔“ وہ بچے سے کہہ رہی تھی۔ ”اپنے ابو سے لفافہ لے لو۔“ عالی حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ایللی نے لفافہ بڑھا دیا اور چلنے لگا۔

”آؤ۔“ وہ بولی۔ ”چائے کا پیالہ پی لو۔“

”ایللی جوں کا توں کھڑا رہا۔“

”آ جاؤ اب کیا ہے۔“ وہ کھانتے ہوئے بصد مشکل بولی۔ ”اب تو کھیل ہی ختم ہو گیا۔“

ایللی چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑا۔

شنراؤ کو دیکھ کر ایللی کو نہ جانے کیا ہوا۔ اس نے بیڑہ کر شنراؤ کے کندھے پر سر رکھ دیا اور اس کی چٹخیں نکل گئیں۔ شنراؤ اسے تھپکنے لگی۔

ایللی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ میں گویا کسی مردے کا ہنجر تھا۔ ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ اور گوشت گویا تھا ہی نہیں۔ وہ بار بار کھانسی تھی۔

”اب کیا رونا ہے۔“ وہ بولی۔

”کیوں۔“ وہ چلایا۔

”اب کمانی ختم ہو گئی۔“ وہ بولی۔

”کیا ہوا ہے تمہیں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”ٹی بی ہے۔“ شنراؤ نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”دوائی پیتی ہو۔“

”دوائی۔“ وہ ہنسی۔ ”اب تو صرف چند روز اور ہیں۔“

ایللی کے دل پر ایک چھری سے چل گئی۔

”تو کیوں کہاں ہیں؟“ اس نے بات بدلی۔

”اوہر گئی ہیں نفیسہ کی طرف۔“ وہ کھانتے ہوئے بولی۔

”اور تم آگئی ہو۔“

اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔ ”وہ ہوں بھی یہاں تو آگئی ہوں۔“ وہ بولی۔

”ہں۔“ وہ بولا۔

”میرا خیال تھا۔“ وہ کہنے لگی لیکن اسے کھانسی چھڑ گئی۔

”کیا خیال تھا۔“ ایللی نے پوچھا۔

”کہ تم بدل گئے ہو۔“

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”تمہارے ساتھ میں کبھی نہیں بدل سکتا۔“

”ج۔“ اس نے ایللی کا ہاتھ دیا۔ ”پھر مجھ سے اس قدر ضد کیوں کی۔“

”وہ اور بات تھی۔“ وہ بولا۔ ”میرے دل نے اس بات کو گوارا نہ کیا لیکن میرے دل میں

مارے لئے کبھی غصہ یا نفرت پیدا نہیں ہوئی۔“

”ج۔“ اس نے پوچھا۔

”تم بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔“ وہ بولا۔

”چلو چھوڑو اس بات کو۔“ وہ بولی اور کھانسنے لگی۔

وہ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

”کیا کرتی ہو آجکل۔“ اس نے پوچھا۔

”کیا کرتا ہے۔ پڑی رہتی ہوں۔“

”سارا دن۔“

”ہں۔“ ڈاکٹر نے اٹھنے بیٹھنے سے منع کر رکھا ہے۔“

”پھر تم باہر کیوں آتی تھی۔“

”جی چاہتا تھا آخری بار لموں۔“

”کیا واقعی۔“ اس نے پوچھا۔

”ہں۔“ وہ ہنسی۔ ”دعائیں مانگتی تھی کہ ایک بار تم آؤ۔“

”میں تو آتا ہی رہتا تھا۔“

”مجھے پتہ نہ چلتا تھا۔“ وہ کھانسنے لگی۔

”ہوں۔“

”پھر جب عالی لفافہ لاتا تو پتہ چلتا۔ پر تم جا چکے ہوتے۔“

”اور اب کی بار۔“ ایللی نے پوچھا۔

”ہوں۔“ وہ خاموش رہا۔

”اب اکیلے پن کے سوا کیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”اب تو —۔“

”شہزاد۔“ وہ بولا۔

”ہں۔۔۔۔۔۔“ وہ کھانسنے لگی۔

”تم نے ایسا کیوں کیا۔ کیوں؟“

”چھوڑو اب۔“ وہ بولی۔ ”جو ہوتا تھا ہو گیا۔“

”بڑا ظلم ہوا۔“ وہ بولا۔

”ہں۔ ہو گیا بس۔“

”چلو میں تمہیں دورا ہے لے چلوں۔“ ایللی نے کہا۔

”بے کار ہے۔“ وہ بولی اور کھانسنے لگی۔

”کیوں۔“

”کیا فائدہ۔“

”شاید تم صحت مند ہو جاؤ۔“

”اب کیا فائدہ۔“ وہ بولی۔

”کیوں۔ صحت اچھی ہو جائے تو —۔“

”تو کیا ہو گا۔“ اسے پھر کھانسی چھڑ گئی۔

ایللی اس کی بات سن کر کانپ گیا۔

”کیا حرج ہے۔“ وہ بولا۔ ”چلو تو۔“

”نہیں۔“ وہ بولی۔ ”اب میں نہیں جاتی۔“

”ضد کرتی ہوتا۔“ وہ بولا۔

”چھوڑو اب ان باتوں کو۔ اتنی دیر کے بعد ملے ہو۔ کوئی اور بات کرو۔“

”صرف ایک ہی بات ہے میرے پاس۔“

”کیا؟“

”کہ آج بھی تم میرے لئے وہی شہزاد ہو جو پہلے تھی۔ وہی سبز گھڑی۔“

”ج۔“ اس نے ایللی کا ہاتھ تھام لیا۔

”جاگ پڑے۔“ شہزاد بے بسی سے مسکرائی۔  
 ”تم نہیں سوئیں کیا؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”اب تو دیر ہو گئی۔“  
 ”یعنی۔“ اس نے پوچھا۔  
 ”دیر سے سونا چھوٹ گیا۔“ وہ کھانسنے لگی۔  
 ”کیوں؟“  
 ”نیند نہیں آتی۔“  
 ”ساری رات بیٹھی رہتی ہو۔“  
 ”ہاں۔“  
 ”وقت نہیں گزرتا۔“  
 ”باتیں یاد آتی ہیں۔“  
 ”کوئی؟“  
 ”ایک ایک۔“ اسے پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔  
 ”اچھا۔“ وہ بولا۔ ”میں آ جاؤں گا۔“  
 ”کہیں۔“ اس نے پوچھا۔  
 ”تمہارے پاس۔“  
 ”ج۔“  
 ”ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ ”آج جا کر چھٹی لے آؤں ایک مہینے کی۔“  
 ”ایک مہینے کی؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”ہاں۔ اکٹھے رہیں گے۔“  
 ”اچھا۔“ اس نے ایلی کا ہاتھ دلیا۔ کب تک مل جائے گی؟“  
 ”ہفتے کے اندر۔“  
 ”ہفتہ۔“ اس نے برا سامنہ بنایا۔ اسے پھر کھانسی چھڑ گئی۔  
 ”کیوں؟“ ایلی نے پوچھا۔  
 ”ہفتہ نہیں۔“ وہ بولی۔ ”جلدی۔“

”پتہ نہیں“ وہ بولی۔ ”سوئی ہوئی تھی۔“  
 ”پھر؟“  
 ”پھر ایسے ہوا جیسے کسی نے مجھے جھنجھوڑا۔“  
 ”کس نے؟“  
 ”پتہ نہیں کسی نے میرے کان میں کہا۔ مل لو۔“  
 ”ہوں۔“ ایلی سوچ میں پڑ گیا۔  
 ”میں نے عالی کو اٹھالیا اور باہر نکل آئی۔“  
 ”تم سے تو چلا بھی نہیں جاتا۔“  
 ”نہیں جاتا۔“ وہ بولی۔ ”پر تم سے ملنا تھا اس لئے۔“  
 ایلی نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے گل پر رکھ لئے۔ وہ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔  
 ”تو تم مجھے بھوکی نہیں آج تک۔“ ایلی نے کہا۔  
 ”نہیں۔“ وہ بولی۔  
 ”ان دنوں تو بہت غصہ تھا۔“  
 ”تھا۔ لیکن یہ بھلا مجھے بھولنے دیتا ہے۔“  
 ”کون؟“  
 ”یہ عالی۔“ وہ کھانسنے ہوئے بولی۔  
 ”عالی؟“  
 ”ہاں۔ سارا دن بیٹھا ابو کرتا رہتا ہے۔“  
 ”مجھے دیکھ کر سہم جاتا ہے۔“  
 ”پتہ نہیں۔ گھر میں ابو کرتا ہے۔“  
 ”ہوں۔“ وہ بولا۔  
 پھر کھانسنے لگی اور پھر خون تھوکا۔  
 ساری رات دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ صبح کے قریب ایلی کی آنکھ لگ گئی۔ جب  
 بیدار ہوا تو سات بجے تھے۔  
 ”شہزاد۔“ وہ بولا۔



اس روز اس نے محسوس کیا کہ قاضی پور کے سکول کی عمارت بت بڑی اور خوبصورت اور لمبھے پارک بڑے سلیقے سے بنایا گیا تھا اور گراؤنڈ میں سفید کے درخت بت درخت لگتے تھے۔

سکول میں آدمی چھٹی ہو چکی تھی۔ اساتذہ حسب معمولی باغیچہ میں بیٹھے تھے۔ پہلی مرتبہ انداز کے پاس جا کھڑا ہوا۔

”آئیے آئیے الیاس صاحب“ ایک صاحب نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔

”آپ تو الگ تھلگ رہتے ہیں۔“ دوسرے صاحب بولے۔

”کبھی صورت ہی نہیں دکھائی۔“ تیسرے صاحب بولے۔

آپ جیسی صورت ہو تو مجھے بھی دکھانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہو۔“ ایلی نے کہا۔

انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگے۔

”وہ صاحب۔“ ایک صاحب کہنے لگے۔ آپ تو بولنے لگے۔“

”میرا قصور نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ موسم ہی ایسا ہے۔“

”تو آپ فیدر کا ک ہیں۔“ دوسرے صاحب نے کہا۔

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

اس روز دیر تک وہ اساتذہ سے باتیں کرتا رہا۔

شام کو وہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملا اور چھٹی کی درخواست پیش کر دی۔

”دیکھئے الیاس صاحب۔“ انصاری بولے۔ ”میں ایک ماہ کی چھٹی تو منظور نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر کر کے لاہور بھجوا دیتا ہوں۔ منظور ہو جائے تو آپ شوق سے چھٹی پر چلے جائیے۔“

”اب تک منظور ہو جائے گی۔“ اس نے پوچھا۔

”ایک ہفتہ لگے گا۔“ وہ بولے۔ ”کم از کم۔“

”ممت خوب۔“

جب وہ گھر پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ اسے چند ایک چیزیں خرید کر گھر میں رکھنی بہرہ خواہش ایلی نے اس شدت سے محسوس کی کہ وہ اسی وقت بازار چلا گیا تاکہ پتہ لگائے

”اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔ اب جاتا ہوں۔“

”اچھا۔“ شنراو نے بیٹھنے کی کوشش کی۔ ”اگر جانے سے پہلے کوٹھے پر چھوڑ آؤ۔“

”کیا مطلب۔“ ایلی نے کہا۔

”میں میزہیاں نہیں چڑھ سکتی۔ دھوپ میں بڑی رہوں تو آرام رہتا ہے۔“

”اٹھا کر لے چلوں۔“

”ہاں۔“ وہ بولی اور کھانسنے لگی۔

ایلی نے اسے دونوں بازوؤں سے اٹھا کر اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ وہ یوں اس کی چھاتی سے

چٹنی ہوئی تھی جیسے کوئی بچہ ماں کی چھاتی سے چٹا ہو۔

”آؤں گا۔“ وہ بولا۔ ”تو روز تمہیں کوٹھے پر لے جایا کروں گا۔“

”ہاں۔ دھوپ میں مجھے آرام رہتا ہے۔“ وہ بولی۔

”اگٹھے دھوپ میں بیٹھا کریں گے۔“

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”پر جلدی آتا۔“

ایلی اسے چارپائی پر لٹانے لگا تو شنراو کا سر پٹنگ کے پائے سے ٹکرا گیا۔

”اوہ۔“ وہ بولا۔ ”تمہیں چوٹ آئی ہے۔“

”اچھا ہوا۔“ وہ بولی۔

ظاہر تھا کہ شنراو کو بے حد چوٹ لگی ہے۔

”مجھ سے غلطی ہوئی۔“ ایلی نے کہا۔

”اچھا ہوا۔“ وہ بولی۔ ”تمہارے ہاتھوں چوٹ آئی ہی تھی مجھے۔“

”کیوں۔“

”بس۔ اچھا ہی ہوا۔“ وہ کھانسنے لگی۔

وہ دیر تک اس کا سر ہاتھوں سے مٹا رہا اور پیار سے اسے دبا تا رہا۔ وہ بڑی محبت سے اسے

دیکھ رہی تھی۔

”اچھا میں اب جاتا ہوں۔“ وہ بولا۔

شنراو نے چپ چاپ اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

قاضی پور پہنچ کر وہ سیدھا سکول پہنچا۔

نے وہ خط ہاتھ میں تھام لیا اور بدستور ہیڈ ماسٹر صاحب سے باتیں کرتا رہا۔ "انصاری  
ے حالات میرے بس میں نہیں۔ کچھ ایسی الجھنیں ہیں۔ میں کوشش ضرور کروں گا۔"

"ارے بھائی۔" انصاری بولے۔ "اس تار کو پڑھ لو پہلے۔"  
"تار۔" ایللی نے ہاتھ کے لفافے کی طرف دیکھا۔  
اس نے جلدی سے تار کھولا۔

"کیوں۔ خیریت تو ہے؟" ہیڈ ماسٹر نے پوچھا۔  
"جی۔" ایللی چونکا۔ وہ پھر کھو چکا تھا۔ اس نے تار ہیڈ ماسٹر کے ہاتھ میں تھما دی۔  
ماقتہ

"شہزاد کل رات فوت ہو گئی۔ جنازہ صبح نو بجے ہو گا۔"  
ماسٹر نے گھڑی گیارہ بج رہی تھی۔  
گردو پیش پر دھندلکا چھا چکا تھا۔  
انصاری کے ہونٹ مل رہے تھے۔

بانیچے میں ایک بڑے سے پتنگ پر ایک لاش پڑی تھی۔  
پاس ہی ایک بچہ دونوں ہاتھ اٹھائے چلا رہا تھا۔ "ابو۔ ابو۔" پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگے چلا  
بارہا تھا

"اب کیا ہے۔ اب کیا ہے۔" لاش منہ سے چلا رہا تھا کہ وہی تھی راستے کی رکاوٹ۔  
ایل ہونک رہی تھی۔ انجن چینیں مار مار کر رو رہا تھا۔  
تنگے والے چلا رہے تھے۔

پھر بہت سے لوگ دروازے اور کھڑکیوں میں کھڑے اسے گھور رہے تھے۔  
"وہ آگیا۔ وہ آگیا۔"  
"ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔"  
"اب آیا تو کیا آیا۔"

یہ ہو کے رہے گا۔ "حاجی صاحب مسکرا رہے تھے۔  
"تم آگئے۔" شہزاد اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کہ آیا اسے چند ایک چیزیں کراہی پر مل سکتی ہیں۔ دیر تک وہ بڑے بازار میں گھومتا رہا۔  
"کیا فر۔" پھر کراہی پر دیتے ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔" لڑکے کے والد نے کہا۔ "آپ فرمائیے آپ کو کیا چاہیے۔"  
رات کو دیر تک وہ مکان میں فرنیچر کی چند چیزیں سجا رہا اور پھر سو گیا۔ اس روز گویا اس کی  
دنیا ہی بدل ہوئی تھی۔

ایللی کے بدلے ہوئے رویے کو دیکھ کر تبسمی حیران تھے۔  
جماعت میں وقت کاٹنے کی بجائے اس نے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ نویں جماعت کے لڑکے  
تو اس کے دو ایک سبق سن کر بے حد خوش ہوئے تھے۔

اساتذہ بھی اب اس میں دلچسپی لینے لگے حتیٰ کہ انصاری صاحب نے بھی اس تبدیلی کو  
محسوس کیا تھا۔ انہوں نے ایللی کو بلا کر اس سے بات بھی کی تھی۔ بولے:

"الیاس صاحب۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی لمبی چھٹی کو ملتوی کر دیں۔"  
ایللی نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔

"دیکھئے نا۔" انصاری بولے۔ "امتحانات بالکل قریب ہیں۔ اگر آپ چھٹی پر چلے گئے تو نتیجہ  
پر برا اثر پڑے گا۔"

"جی۔" ایللی نے کہا۔ "لیکن مجبوری ہے۔"

"آخر آپ کس لئے چھٹی لے رہے ہیں۔"

"جی میری بیوی بیمار ہے۔"

"آپ انہیں یہاں کیوں نہیں لے آتے۔" انصاری نے کہا۔

"جی وہ بہت بیمار ہے۔"

"اگر میں موٹر کا انتظام کر دوں تو۔"

"شاید۔" ایللی نے کہا۔ "شاید یہ ممکن ہو۔"

"آپ کوشش کریں گے۔"

"جی۔" وہ بولا۔ "کروں گا۔ اگر ممکن ہو اتو۔"

ابھی وہ ہیڈ ماسٹر سے بات کر رہا تھا کہ ڈاکیر آگیا۔ اس نے ایک لفافہ سا اٹھایا ہوا تھا۔

"جی۔" وہ بولا۔ "الیاس آصفی۔"

”ابو۔ ابو۔“ دو ننھے ننھے ہاتھ اس کی طرف بڑھے۔

ایلی نے ایک بچے کو سینے سے چمٹا لیا۔

پھر وہ جا رہا تھا۔ نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔

چاروں طرف قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔

ایک بڑی سی قبر سامنے آگئی۔ اس پر تازہ پھول پڑے ہوئے تھے۔

وہ قبر پھیلنے لگی۔ پھیلتی گئی۔ حتیٰ کہ سارا قبرستان اس کی لوٹ میں آ گیا۔

پھر وہ ابھرنے لگی۔ ابھرتی گئی زمین سے آسمان تک پھیل گئی۔

”تم آگئے۔“ ایک جانی پہچانی آواز آئی۔

پھر ایک سیلاب امنڈ آیا۔ پانی ہی پانی۔ وہ قبر اس پانی میں بہہ گئی پھر وہ بچوں۔

پھر وہ بچوں کی طرح بلبلاتا کر جنھیں مار رہا تھا۔ اس سیلاب میں ڈوب رہا تھا۔

دھنسا۔ اس کی نگاہ اس بچے پر پڑی جو اس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ ”ابو۔ ابو۔“

وہ اٹھ بیٹھا جیسے دھنسا۔ اسے سارا مل گیا ہو۔ جیسے زندگی میں پھر سے مفہوم پیدا ہو گیا ہو۔

”عالی عالی“ — اے کوئی جنموڑ رہا تھا۔

اسے عالی کو اس سیلاب سے پہچانا تھا۔

پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔

”ابو۔ ابو۔“ ریل گاڑی چیخ رہی تھی۔ ”ابو۔ ابو۔“

سامنے شہزاد کھڑی مسکرا رہی تھی۔

## پاکستان

ایک چھوٹا

میں نے کی چھٹی گزارنے کے بعد گویا اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک نیا آدمی ابھر آیا تھا۔ ایسا آدمی جسے اپنے ماضی سے نہ لاگ تھا نہ لگاؤ جو اپنی گزشتہ زندگی پر نہ تو شرم محسوس کرتا نہ نہایت ہوئے واقعات کو ذہن میں دہرانے کا شوق رکھتا تھا۔ اسے اپنے گزشتہ افعال پر پشیمانی نہیں تھی نہ ہی وہ اس پر فخر کرتا تھا۔ جو بیت چکا تھا۔ وہ اپنے گزشتہ عشق کو حماقت نہیں سمجھتا تھا۔ اب بھی عشق کی عظمت کا اعتراف تھا۔ وہ حماقتوں کی اہمیت کا معترف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان نکلنے اس کی زندگی میں رنگ پیدا کیا ہے۔ وہ حماقتیں فطری تھیں انسانیت بخش تھیں۔ وہ دہرانے کا بھی شوقین نہ تھا۔ اس کی گزشتہ زندگی اس کے مستقبل پر تاریک سایہ نہیں اڑی تھیں۔

یہ محض حسن اتفاق تھا کہ اس کی گزشتہ زندگی کے پھوڑے اور پھینسیوں نے اس کی شخصیت کو دار، خیالات، محسوسات پر کوئی داغ نہ چھوڑا تھا۔ اسے اس حسن اتفاق کا تس سے احساس تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی گزشتہ زندگی سے عشق لگا کر بیٹھ جاتا اور شریف طرز باقی زندگی آپس بھرنے اور چھت کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے میں بسر کر دیتا اپنی گزشتہ زندگی کو قاتل نفیرین قرار دے کر من نہ کر دم شامہذر بکنیسیہ کا پرچارک بن جاتا۔

اسے یہ بھی احساس تھا کہ یہ زاویہ نگاہ اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ نہیں اس لیے اس نے کچھ بھی تو نہ کیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ گزشتہ زندگی سے اخذ کیے گئے لاگ یا لگاؤ سے

صاحب کے رد برو اظہار کیا تھا۔

روتین

قاضی پور سے ایلی کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ اور اب وہ گروتین میں مقیم تھا۔ گروتین ایک چھوٹا ڈھسورت سا قصبہ تھا۔ اس میں دو ایک کشادہ سڑکیں تھیں جن پر جنگلے خور کالنج بنے ہوئے دو ایک تنگ و تاریک بازار تھے شہر کے باہر چند ایک صاف ستھری آبادیاں تھیں کچھ حصہ گھٹا ہوا تھا جیسے پرانے شہروں میں ہوتا ہے۔ گروتین میں طرز کسن اور طرز جدید دونوں پہلو موجود

بازاروں میں بھیڑ تھی سول لائنز نمائندے میں خوبصورت ویرانی تھی۔ ایلی کو ویرانی پسند ہے۔ اور اس کا مکان بھیڑ اور ویرانی بھرے علاقوں کے سقم پر تھا۔ گھر میں عالی تھا اور ایلی کی ماں۔ اب ایلی اکیلا نہیں رہ سکتا تھا اس لیے کہ عالی سے الگ رہنا تکلیف دہ تھا۔ چونکہ اس کو اپنی تمام تر محبت عالی پر مرکوز کر دی تھی۔ اس محبت میں بیٹریا کا عنصر نہ تھا۔ پھر بھی اس کی ہر توجہ عالی پر مرکوز تھی غالباً گزری ہوئی تنہی کو بھلانے کے لیے اس نے عالی کا سارا لے لیا

عالی ایک بھرا سا لڑکا تھا۔ اس کے نقوش موٹے تھے۔ چہرے پر بے حسی چھائی ہوئی تھی۔ ایک خاصی حد تک بے ربط تھیں۔ اس کے خدوخال میں قطعی طور پر شہزاد کی جھلک نہ تھی۔ ہاجرہ کا ایلی کے پاس رہنا ناگزیر تھا۔ چونکہ چار سال کے بچے کو پاس رکھنا ایلی کے لیے ممکن نہ تھا وہ اکیلا نہ تو اس کی دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ اور نہ اسے گھر میں اکیلا چھوڑ کر خود نوکری کے اضواء کر سکتا تھا۔

ایلی نے پھر سے مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ زندگی میں اس نے پہلی مرتبہ بلا واسطہ کتاب اٹھائی تھی اس سے پہلے اس نے کئی مرتبہ شدت سے مطالعہ کیا تھا۔ لیکن اس کی حیثیت محض فرار کی تھی۔ تلخ واقعات کو بھولنے کے لیے اس نے کئی بار کتاب کا سارا لیا تھا۔ لیکن اب پہلی بار اس نے کتاب کے لیے مثبت شدت سے محسوس کی تھی۔

سارا دن یا تو وہ پڑھتا اور یا غلطی سے کھیتا رہتا اور پھر اس کا جی چاہتا کہ شام کو کسی طرف لہ جائے اور پھر کسی غلام کے پاس جا بیٹھے۔ اور ستر کی لرزشیں اسے چاروں طرف سے گھیر

”ابو۔ ابو۔“ دو ننھے ننھے ہاتھ ہیں لیکن اسے یہ علم نہ تھا کہ یہ نعمت کس کی دین ہے۔

ایلی نے ایک بچے کو۔ سے وہ ابھی تک بچہ تھا۔ ذہنی طور پر اس کی پختگی اور بڑھ گئی تھی۔ پھر وہ جا رہا تھا۔ حظ سے زندگی نے اسے کچھ نہ سکھایا تھا۔ ذہنی لحاظ سے ہر تجربہ ہر مشاہدہ اس چار۔ میں ایک نئی کلی بن کر رہ جاتا تھا۔ اور اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا تھا۔

زندگی کے دریا کے بہاؤ کی منجھاد گزر چکی تھی۔ اب وہ پایاب پانی میں چل رہا تھا۔ لیکن پایاب پانی میں پہنچ کر الیاس آصفی نے دفعتاً محسوس کیا کہ وہ آزاد ہے۔ قطعی طور پر آزاد۔ اپنی انہی بندشوں سے آزاد اس کی آنکھوں سے ذاتیات کے چشمے اتر گئے تھے۔ اب وہ دنیا کو دیکھ سکتا تھا۔

دنیا بے حد وسیع تھی۔ مگر وہ بلا کی وسعت اور اسی پیدا نہیں کر رہی تھی۔ اس میں ایک عجیب سی عظمت تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ دوسروں کو دیکھا۔ اس کے رد برو سینکڑوں ایلی تھے جو جذبات کے بھنور میں ڈبکیں کھا رہے تھے۔ وہ انہیں قاتل نفیرن نہیں سمجھتا تھا۔ ان کا مذاق نہیں اڑاتا تھا۔ اسے ان سے ہمدردی تھی اس کے دل میں ان کی عزت تھی۔

ایلی میلے سے واپس آ رہا تھا۔ لیکن جو میلے کو جا رہے تھے ان پر خندہ زن نہ تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ بھرپور شوق سے میلے کو جانا بھی ضروری ہے۔ اور بے لاگ لگاؤ وہاں سے لوٹنا بھی ضروری ہے۔

اس کے خیال میں محبت ایک عظیم تجربہ تھا۔ اور اس عظیم تجربے کے چار ضروری دور تھے۔ پہلا یہ کہ شدت سے محبت کرے دوسرے اسے محبت میں عظیم کامیابی حاصل ہو یعنی سخت پر بیٹھے اور مور چھل کرائے۔ تیسرے یہ کہ محبوب اس کی تذلیل کرے اور دھکا دے کر سخت سے نیچے پھینک دے ذلت اور رسوائی چاروں طرف سے اسے گھیر لیں اور چوتھا یہ کہ وہ عشق کامیابی تذلیل اور رسوائی سب سے بے نیاز ہو جائے۔ بے لاگ بے لگاؤ۔

اس کا یہ نظریہ جسمانی عشق کے متعلق تھا۔ افلاطونی یا روحانی عشق کے تخیل سے واقف ہی نہ تھا۔ افلاطونی عشق تو محض ایک قصہ تھا۔ البتہ روحانی عشق کے وجود سے وہ منکر نہ تھا۔ لیکن اسے کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ روحانی عشق کا مطلب کیا ہے۔ ایک انسان کس طرح اللہ سے محبت کر سکتا ہے۔ اس نے کئی ایک مرتبہ مرشد کا نام سنا تھا۔ لیکن بیعت اور مرشد کے متعلق ابھی تک اس کے وہی خیالات تھے جن کا کسی زمانے میں دلی کی جامع مسجد میں اس نے

باوجود اس کا سحر عظیم تھا۔

اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ عورت ایک کمزور اور بے بس مخلوق ہے۔ اور اس کی پست میں گمرائی نہیں۔ اس کی شخصیت عظمت سے خالی ہے۔ قدرت کی طرف سے وہ تخیل پر رہے۔

شاید اسی وجہ سے اسے ان دو لڑکیوں سے قطعاً ”دلچسپی پیدا نہ ہوئی بلکہ اس نے سوچا کہ وہ اس کی آزادی میں مغل ہو رہی تھیں۔ اس لیے اس نے کوشش کر کے اپنا مکان بدل لیا۔ اور وہ لڑکے کو نے پر ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے۔

رنگی

پہلے روز ہی رات کے وقت اس کے کان کھڑے ہوئے کوئی شخص طبلہ بجا رہا تھا۔ پھر کسی نے گانا شروع کر دیا۔ اسے غلام یاد آ گیا۔

اگلے روز شام کے وقت ایللی نے پھر طبلہ کی آواز سنی۔ وہ چپکے سے گھر سے باہر نکل گیا۔ زہب ہی پڑوس میں ایک بیشک سے طبلہ بجانے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے دور کھڑے ہو کر ہنگ کی طرف دیکھا۔

ایک خوش پوش نوجوان سوٹ پہنے ہو لگائے فرش پر بیٹھا طبلہ بجا رہا تھا۔ اس کا لباس ’زاورت تھا۔ انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ارستو کریت ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس کے ہارے میں ہلاکی جاوہیت تھی اس کی شخصیت سے مٹھاس کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔

ایللی قریب چلا گیا۔

”آئیے آئیے۔“ وہ مسکرایا ”بیٹھے۔“

”نہیں نہیں۔“ ایللی بولا۔ ”آپ شغل جاری رکھیے میں یہیں سے سنوں گا۔“

”آئیے بیٹھے۔“ وہ بولا ”آ بھی جائیے۔“ وہ پھر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ بے حد دلنواز

”اب آ بھی جائیے۔“

ایللی اندر داخل ہو گیا۔

دیر تک وہ طبلہ بجاتا رہا۔ ایللی چپ چاپ سنتا رہا۔

لیں اور وہ ان میں ڈوب جائے۔

ایللی کے کردار کی شدت اگرچہ بہت کم ہو چکی تھی پھر بھی وہ مٹھاس بھرے تاثرات کا مٹھن تھا ایسے تاثرات جو اس کی شخصیت کے کونوں کو تراش کر ہموار کر دیں۔ بچی کچی تخیلوں کو سمیٹ لیں۔ اس کے نزدیک موسیقی سے بڑھ کر کوئی چیز نہ تھی۔ جو اسے سکون سے ہم آہنگ کر سکتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی شخصیت میں لے پیدا کرے۔ پھر دفعتاً اسے خیال آیا کیوں نہ میں طبلہ بجانا سیکوں۔

اس نے اس سلسلے میں تحقیق کی۔ لیکن ہر جگہ سے اسے ایک ہی جواب ملا۔ سارے گرد و پن میں صرف ایک ہی فرد تھا جو طبلہ بجانے اور رنگینی محفل کے لیے مشہور تھا۔ اور غالباً اسی وجہ سے سب لوگ اسے رنگی کہتے تھے۔

رنگی کسی سرکاری دفتر میں انسپٹر تھا۔ ایللی کو یقین نہ آتا تھا کہ کوئی انسپٹر طبلے میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ اس لیے اس نے انسپٹر سے ملنے کا خیال ہی ترک کر دیا۔ اسے ایک بڑے عمدے دار سے راہ ور ربط پیدا کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی۔

گرد و پن میں جو مکان انہیں ملا اس کے پڑوس میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت اور دو لڑکیاں رہتی تھیں وہ وقت بے وقت ان کے گھر آ جاتی تھیں۔ اور بے حجابانہ ایللی کی طرف دیکھ کر پراسرار طور پر مسکراتی رہتیں۔

ایللی نے پہلے تو ان سے دور رہنے کی کوشش کی۔ وہ گھر میں داخل ہو تھیں تو ایللی کمرے میں کھس جاتا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے کمرے میں پہنچ جاتیں تو وہ باہر صحن کی طرف بھاگتا۔ ایک روز جب وہ صحن کی طرف جانے لگا تو بڑی لڑکی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ اور باہمی انداز سے مسکرانے لگی۔ ایللی کو اس کی مسکراہٹ بہت بری معلوم ہوئی۔ اب وہ ان جمیلیوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اسے عورت میں وہ خصوصی دلچسپی نہ رہی تھی جو کسی زمانے میں محسوس کیا کرتا تھا۔ جوانی میں وہ عورت سے ڈرتا تھا۔ اس لیے اس کی طرف بری طرح کھنچا جاتا تھا۔ ڈر اور دلچسپی۔ عورت اس کے دل میں یہ دو جذبات پیدا کرتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ عورت کو اس نے بے حد اہمیت بخش رکھی تھی۔

پھر عورت کے متعلق اس کے خیالات تخیلی سے بھر گئے۔ وہ بے وفا تھی، اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ مردوں کو کھلونا بنا کر ان سے کھیلتی تھی وہ ایک سنہرا جیل تھی۔ لیکن اس

پھر اس نے طبلہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور بولا ”لہجے میں ذرا ستالوں۔ اجازت ہے؟“  
وہ یوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا جیسے عرصہ دراز سے اسے جانتا ہو۔  
”آپ کو اس میں دلچسپی ہے کیا؟“ اس نے طبلہ کی طرف اشارہ کیا۔  
”سننے کا شوق ہے۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”یہ تو کھن کا رس ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”جس کے کھن میں رس ہے اس کی روح میں مٹھاس ہے۔“  
”جی ہاں۔“ ایللی نے جواب دیا۔ ”کھن میں رس نہیں لیکن روح میں مٹھاس پیدا کرنے کی آرزو ہے۔“

”سب رنگ رس کا کھیل ہے۔“ وہ بولا۔

”آپ کی تعریف؟“ ایللی نے پوچھا۔

”مجھے رنگی کہتے ہیں۔“

”رنگی؟“

”ہاں نظر آکتے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”بے رنگ ہوں نا اس لیے۔“

”بے رنگ ہیں آپ۔“ ایللی نے کہا۔ ”ایسا اچھا طبلہ بجاتے ہیں۔“

”اومٹوں۔“ وہ بولا۔ ”زندگی صرف کردی لیکن سمجھ لیجئے کھودی۔ بات پیدا نہیں ہوئی۔“

”نہیں ہوئی۔“

”بالکل نہیں ہوئی۔“ وہ بولا۔ ”رس پیدا نہیں ہوا۔ صرف ڈب ڈب کرنا سیکھ لیا ہے۔“

صرف فارم روح نہیں شور ہے دھڑکنیں نہیں۔“

ایللی حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس قدر رنگین شخصیت۔ اس کی ہر بات میں

رنگ تھا رس تھا۔ انداز بیان میں، چھوٹی چھوٹی حرکت میں۔ نگاہ میں، تکلم میں، گروہن کے صحرا

میں وہ پہلا نخلستان تھا۔

رنگی پھر سے طبلہ بجانے میں مصروف ہو چکا تھا۔ طبلہ بجاتے ہوئے اس کی بیشک بھی

عجیب تھی چھاتی نکلی ہوئی۔ سر اٹھا ہوا۔ کتنا وقار تھا اس بیشک میں ایللی اس کی طرف غور سے

دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً وہ مسکرایا۔ ”تکلیف نہ ہو تو ذرا آگے سے ہٹ جائیے۔ ذرا اوھر کو۔“ انہیں

ہٹ ہوتی ہے اس لیے کہتا ہوں۔“ رنگی پھر مسکرایا۔

”کسے تکلیف ہوتی ہے؟“ ایللی پوچھا

”شرمیتی کو۔“ وہ مسکرایا۔

شرمیتی وہ حیران تھا۔ لیکن مزید بات پوچھنے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔

کچھ دیر رنگی اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر آپ ہی آپ مسکرا کر بولا۔ ”شب بخیر شب بخیر جائیے۔“

لام فرمائیے۔“ اس کا روئے خطاب ایللی کی طرف نہ تھا۔

**شرمیتی**

”ارے۔“ ایللی حیران تھا کہ وہ کس سے بات کر رہا ہے اس نے دروازے سے باہر دو ایک

دور کھا تھا۔ لیکن باہر گھٹا ٹپ اندھیرا تھا۔

”معاف کیجئے گا صاحب۔“ رنگی ایللی سے مخاطب ہوا۔ ”شرمیتی آ جاتی ہیں تو مجھے انہیں

لا کر پڑتا ہے۔ اکثر آتی ہیں۔ مطالبہ یہ ہے کہ دروازے کے سامنے بیٹھو۔ روشنی منہ پر

ہے۔ دروازے میں کسی کو کھڑا ہونے نہ دو ہم تو احکامات کے پابند ہیں۔“

”کون ہے وہ؟“ ایللی نے پوچھا۔

”ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”اپنے مہمانوں میں سے ایک ہے۔ اپنی زندگی ان مہمانوں کی نگاہ کرم

کے سمارے بیت رہی ہے۔“

رنگی سے مل کر ایللی ساری رات بیٹھا سوچتا رہا۔ رنگی میں کس قدر جلاہیت تھی۔ کتنا رنگین

لہذا تھا۔ ایللی نے پہلے روز ہی محسوس کیا گویا وہ رنگی کے بے حد قریب ہو بہت قریب۔

اس کے بعد اس کا معمول ہو گیا کہ مدرسہ سے آ کر ایک پیالہ چائے پیٹ میں انڈیل کر وہ

اگلی کے پاس جا بیٹھتا۔ رنگی کی شخصیت سے رنگ کے چھیننے اڑتے اور بھگ بھگ جاتا۔

”ایللی صاحب۔“ تیسرے ہی روز رنگی نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ شرمیتی کے چائنسز تباہ

کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ دروازے سے ہٹ جائیے نا۔ انہیں دیکھ کر اپنا شوق پورا کرنے

بھیجتے۔“

ایللی نے مڑ کر دروازے سے دیکھا۔

دور سے ایک بڑی سی کوٹھی کی چار دیواری پر ایک رنگ دار گٹھا سا رکھا ہوا تھا۔ ”لومٹوں

”ہاں۔“ بڑی ذلیل چیز ہے یہ انسپکٹری۔ دم گھٹتا ہے۔“

تو یہ وہی انسپکٹر تھے جنہیں ملنے سے ایللی ہچکچاتا تھا۔

”جی چاہتا ہے۔“ رنگی بولا ”کہ آج ہی استعفیٰ دے دوں، پر گزارہ گزر کیسے ہو گا۔ دال روٹی سے بھی جواب مل جائے گا۔ مجبور ہوں۔“

رنگی کی شخصیت میں رنگ اور رس کے علاوہ عجیب تضاد تھے۔ ”بمعا“ وہ ایک محبوب تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس میں عشق کرنے کے لیے بے پناہ تڑپ تھی۔ عشق میں وہ ایک بمخوار تھا جو پھول پھول بیٹھ کر رس چوستا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں واضح نسائیت کی جھلک تھی۔ لیکن جسم مردانہ خصوصیات کا حامل تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں ایک عظیم مرد کی جھلک تھی۔ کردار میں بھی مردانہ رنگ تھا۔ تیسری بات یہ تھی کہ وہ پیدائشی ارسنوکریٹ تھا مگر اس کے خیالات اور جذبات میں عوام سے بے پناہ ہمدردی تھی اور وہ خود کو ہمیشہ عوام میں سمجھتا تھا۔ اور آخری بات یہ تھی کہ اسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔ بہر حال زندگی کی بے پناہ شخصیت نے ایللی کو جذب کر لیا اور وہ گھرے دوست بن گئے۔

## رضی

پھر ایک روز رضی آگیا۔

رضی رنگی کا دوست تھا لیکن اس میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔

رضی اوچڑ عمر کا آدمی تھا۔ بدن فریبی پر مائل تھا۔ چہرے پر اکتاہٹ برس رہی تھی۔ بال سفید ہو رہے تھے۔ اس کی طرف دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ اپنی زندگی بیت چکا ہو اور اب کنارے پر بیٹھ کر نظارہ کر رہا ہو۔ گزشتہ زندگی کی جھلک اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھی۔

رضی کی آنکھیں بھری بھری تھیں جیسے نہ جانے کیا کیا جذب کر چکی ہوں۔ ان میں ایک دیا آبلو تھی۔ ایک شوخ و شنگ دنیا جیسے ان آنکھوں سے کبھی رنگ کی پچکاریوں کے فوارے نکلے ہوں جیسے وہ کبھی سرخ چیونٹیوں کے مسکن رہی ہوں۔ وہ بلائنگ پیپر اب بھی بھرے ہوئے تھے لیکن اب نہ تو ان میں تلخی تھی نہ شدت۔ مٹھاس کی پھلجڑی چل رہی تھی۔ مسکراہٹ اس مٹھاس کو ہوا دیتی تھی۔

”ان سے ملیے یہ میرے نئے دوست ایللی ہیں، نام تو الیاس آصفی ہے۔ لیکن مجھے ایللی پسند

یہ فاول ہے۔“ رنگی بولا۔ ”اوسر اعلانیہ دیکھنا فاول ہے۔ ہاں اندر بیٹھ کر چھپ کر شوق سے دیکھئے۔ میرے سارے دوست دیکھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ شرمیلیتی یہ سمجھیں کہ ان کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ حالانکہ میرے بھی دوست جانتے ہیں اور شرمیلیتی جانتی ہے کہ وہ جانتے ہیں۔ اور چھپ چھپ کر اسے دیکھتے ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتی ہیں کہ اس راز کو صرف ہم دونوں جانتے ہیں وہ خود اور میں۔ کیا پیارا دھوکا ہی۔ ساری شرم۔ بتل ہی پیارے دھوکے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان پیارے دھوکوں کا ایک جھگٹھا لگا رہے۔ اور میں اس میں ڈوبا رہوں۔“ ایللی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ وہ ایللی کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ”میں انہیں دیکھوں آپ مجھے دیکھیں۔“

کچھ دیر تک وہ دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ ”لیجئے“ شرمیلیتی چلی گئیں غالباً، پتا جی آگئے۔“

”وہ کون ہیں ان کے پتا جی؟“

رنگی نے جھرجھری لی۔ ”پتا جی وہ ہیں جو چاہیں تو مجھے تین سال کے لیے اندر کر دیں۔“

”یعنی۔“ ایللی نے حیرت سے پوچھا۔

”مجسٹریٹ ہیں غالباً اور روز دعائیں مانگتے ہیں کہ میں کبھی ان کے پنجے میں پھنس جاؤں۔“

”ارے۔“ وہ چلایا۔ ”میں آپ سے باتیں کرنے میں وقت گنوا رہا ہوں اور اوسر وہ انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ دوڑ کر باہر نکلا اور بیٹھک سے باہر کھڑا ہو کر دوسری سمت دیکھنے لگا۔

ایللی جو کاتوں بیٹھا رہا۔

کچھ دیر کے بعد رنگی داخل ہوا وہ مسکرا رہا تھا۔

”یہ کون تھے؟“

”اپنے ایک مہربان دوست ہیں۔ اپنی زندگی میں اور ہے ہی کیا۔ انسپکٹری کی بک بک۔“

”ہو

ہٹنے لگا۔

”انسپکٹری؟“ ایللی نے رنگی کی طرف دیکھا۔

”نو کری لور کیا۔“ وہ بولا

”تو کیا آپ انسپکٹر ہیں؟“



”نہیں۔“ رضی نے جواب دیا۔ ”النا اب تو ملخص ہی ملخص ہے۔“ اس نے ایک ملخص بھری مسکراہٹ چمکائی۔  
 ”رنگی تو مصروف کار ہے۔“ ایللی نے کہا۔  
 ”اچھا ہے۔“ رضی بولا۔ ”جو مصروف ہے وہ مصروف ہے۔“  
 ”نصیحت کرنے کو جی نہیں چاہتا کیا؟“ ایللی نے پوچھا۔  
 رضی پھر ہنسا۔ ”لوگوں نے ہمیں بہت کی تھیں۔“  
 ”کیا۔“

”۔“

”پھر۔“

”وہ اپنا وقت ضائع کرتے تھے۔ ہم نہیں کرتے کیوں کریں۔ یہ سب بھگوان کی لیلیا ہے۔“  
 رضی مسکرایا اور پھر جھوٹی آواز میں گانے لگا۔  
 ”گردھر کی مرلیا باجے رے — مدھون میں راوہکل ناچے رے۔“  
 گردھر کی مرلیا باجے رے۔“

ایللی کے لیے یہ ایک نیا نظریہ تھا۔ کتنا رنگین تھا۔ کتنا پیارا تھا۔  
 ساری رات وہ سوچتا رہا۔ اور گردھر کی مرلیا۔ باجی رہی۔ مرلیا کے بول فضا میں گونج رہے تھے۔ اس کی تنخیں ان سروں میں دھوئی جا رہی تھیں۔ شنراو کے ماتھے کی بندی چمک رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ بھی گردھر کی ایک راوہکل ہو۔ اس کے دل میں نہ محبت تھی نہ نفرت۔

انشاء اللہ

ایک روز جب ایللی چپ چاپ اداس بیٹھا تھا تو باہر بولی ”ایللی۔“  
 ”کیوں اہل!۔“ اس نے اہل کی طرف دیکھا۔  
 ”تجھے چھٹی مل سکتی ہے۔ کیا؟“  
 ”کیوں نہیں۔“  
 تو چار دن کی چھٹی لے لے۔“ وہ بولی۔

ہے۔ ایللی رضی اور رنگی کیا بگڑی ہے۔“  
 ”یہ وہ رضی ہیں۔“ رنگی نے ایللی سی کہنے لگا ”جو اس مردے میں جان ڈالتے ہیں۔“ اس نے طلبے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”ہاں تو رضی صاحب آج کچھ ہو جائے۔“ رنگی نے اپنی ستار رضی کی طرف بڑھا دی ”آج تو رضی ایمان سے آگ لگا دو۔ آگ آگ۔ چاروں طرف شعلے اٹھیں۔ اپنے مہربان بھی کیا یاد کریں گے۔ انہیں بھی پتہ چلے کہ تڑپ کے کتے ہیں۔“  
 رضی مسکرایا۔ اور کچھ کہے بغیر اس نے ستار بجانی شروع کر دی۔ رنگی نے طلبہ اٹھایا۔  
 رضی گانے لگا۔ اے ری عالی پیابن۔“  
 اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ آکٹاہٹ بھری اداسی پھیل رہی تھی۔ وسعتیں اور بڑھ رہی تھیں۔ خلا قریب تر آ رہا تھا۔ خاموش دیران خلا۔  
 ”اے ری عالی پیابن۔“

ایک روز جب رضی اور ایللی اکیلے تھے تو شرمیتی آگئیں۔

”آپ بھی درشن کر لیں۔“ ایللی نے رضی سے کہا۔  
 رضی مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں عجیب سی بے نیازی تھی۔  
 ”آپ کو دلچسپی نہیں۔“ ایللی نے پوچھا۔  
 ”بہت بے حد۔“ رضی مسکرایا۔  
 ”تو پھر؟“

”تھی — اب نہیں۔“ وہ بولا۔ ”پہلے راہ چلتی سے تھی۔ چاہے راہ چلتی ہو۔ یا منڈیر پر کھڑی ہو۔ کہیں ہو۔ کہیں ہو۔“  
 ”کیسی ہو۔“ ایللی نے دوہرایا  
 ”ہاں۔“ رضی نے کہا۔ ”ہر عورت حسین ہوتی ہے۔ ہر عورت۔“  
 ”کیا واقعی۔“

”ہاں۔“ رضی بولا ”لیکن اب تو سب بیٹیاں بن گئیں ہیں۔ کوئی عورت رہی ہی نہیں۔“  
 ”کیوں۔“ ایللی نے پوچھا۔  
 ”بھرا میلا دیکھ لیا۔ بس ہم بھرا میلا چھوڑنے کے قائل ہیں۔“ رضی مسکرایا۔  
 ”کوئی تلخی رکھو بن گئی کیا؟“ ایللی نے پوچھا۔

نواٹھا کر لایا جاتا ہے

”سبحان اللہ۔“ وہ مسکرائے۔

”شادی کا نام نہیں لیتا۔“ وہ زیر لب بولی۔

”وقت کی بات ہے۔“

”کوئی لڑکی بھی ملے۔“ ہاجرہ نے کہا۔

”پہلے ہی خیال میں رکھا ہوتا تو آج بات کی شکل ہی اور ہوتی۔“ حاجی صاحب مسکرائے۔

ایلی ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ لیکن اسے سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

حاجی صاحب کی باتیں بے حد سادہ تھیں اس کے باوجود وہ انہیں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ ہاجرہ مکرار ہی تھی ظاہر تھا کہ سمجھ رہی تھی۔ لیکن عجیب بات تھی کہ ہاجرہ تو سمجھ لے اور وہ نہ سمجھ سکے۔

اس روز ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ایسی باتیں بھی ہیں جنہیں سمجھنے کے لیے ذہن کے علاوہ کسی اور قابلیت کی ضرورت ہے۔ مگر وہ قابلیت کیا تھی اس کے پاس ایسا کوئی جواب نہ مل سکا۔

بہر حال ایک بات تو مسلم تھی کہ حاجی صاحب کی ہر بات میں خلوص تھا۔ وہ پیر نہیں تھے۔ معج مرشد تھے یا نہیں اس کے بارے میں وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا لیکن ان میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

حاجی صاحب دراصل اپنے کسی مرید کی سفارش کرنے کے لیے علی پور آئے تھے۔ وہ مرید خود دہلی جا کر انہیں ساتھ لایا تھا۔ وہ آصفی محلے کا فرد نہ تھا۔ اور حاجی صاحب اس کے گھر ٹھہرے تھے۔

دو ایک مرتبہ وہ آصفی محلے میں آئے تھے تاکہ لوگوں سے مل سکیں۔ آصفیوں کی مسلح فوجوں کے باوجود انہوں نے ان کے پاس ٹھہرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اندریں ملات ان کا وہاں رہنا مناسب نہیں۔

حاجی صاحب کے اس مرید نے اپنے مکان میں ایک کمرہ ان کے لیے خالی کرا دیا تھا۔ کہ وہ ہلالمیٹن سے رہ سکیں۔

ان دنوں رمضان شریف کے دن تھے حاجی صاحب سے ملنے کے لیے رفیق اور یوسف بھی

”کیوں ملے۔“

”سنا ہے دہلی سے حاجی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ چل کے انہیں ملیں۔“

ایلی علی پور جانے کا خواہشمند نہ تھا کیونکہ جب بھی وہ وہاں جاتا تو محلے والیاں اس پر انگلیاں اٹھاتیں کہتیں اے ایلی دیکھ لیا تو نے ان باتوں کا انجام بس آخر دھول ہی اڑتی ہے۔ بوڑھے اسے دیکھ کر تیوری چڑھ جاتے تھے۔ نوجوان سرگوشیاں کرتے۔

لیکن حاجی صاحب کا نام سن کر وہ تیار ہو گیا اور وہ چار روز کے لیے علی پور چلے گئے۔ حاجی صاحب ایلی کو دیکھ کر مسکرائے۔ ”آئیے الیاس صاحب۔“ وہ بولے۔ ”بسم اللہ۔ خیریت تو ہے۔ ویسے تو اچھے ہیں آپ؟“

”جی شکریہ۔“ وہ بولا۔

”کیسے وہ طوفان گزر گیا نا۔“

”جی۔“ ایلی نے کہا۔

”جن طوفانوں کو چلنا ہوتا ہے چل کے رہتے ہیں۔“ وہ بولے۔

”جی ہاں۔“

”اللہ تعالیٰ نے آپ پر کرم کیا۔“ وہ بولے۔ ”آپ بھگتے نہیں۔“

ایلی کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس لیے وہ خاموش رہا۔

”ہر چیز کا وقت مقرر ہوتا ہے۔“ حاجی صاحب مسکرائے۔

”کیوں ہیشیرہ صاحب۔“ وہ ہاجرہ سے مخاطب ہوئے۔ ”وقت سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”جی۔“ ہاجرہ بولی۔ ”اب تو وقت آ گیا نا۔“

انشاء اللہ آئے گا۔“ وہ بولے۔

آئے گا؟“ ہاجرہ نے دوہرایا۔

”زیادہ دیر نہیں۔“ وہ بولے۔ ”دھوپ نکلنے سے پہلے بادلوں کو صاف کرنا ہوتا ہے۔ محفل نکلنے سے پہلے صفائی ہوتی ہے۔ فرش بچھایا جاتا ہے۔ گھبرائیے نہیں ہیشیرہ صاحبہ اللہ کے فضل سے اچھا ہو گا۔“

”ابھی تو دہلی حال ہے۔“ وہ زیر لب بولی۔ ”ایک قدم نہیں اٹھایا۔“

”ہوں۔“ وہ مسکرائے۔ ”کوئی چل کر آتے ہیں۔ کوئی تلاش کرنے کے بعد پہنچتے ہیں کسی

اب کی بار آپ نے ہم سے کچھ پوچھا نہیں۔“

”جی۔“ ایلی نے ان کی طرف دیکھا۔

”دلی میں تو آپ نے ہم سے بڑی باتیں پوچھی تھیں۔“

”جی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”وہ مرہم کی بات یاد ہے آپ کو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔ ”وہ زمانے گئے مرہم کی بات پوچھنے والے۔“

”ہاں۔“ وہ بولے۔ ”یہ زمانہ بھی گزر جائے گا۔“

”جی۔“ وہ بولا۔

”انشاء اللہ بہتر زمانہ آئے گا۔“

”جی۔“ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کے

”وہ پریشانی تو نہیں رہی تا۔“

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔ ”پیشانی بھی نہیں۔“

وہ مسکرائے۔ ”پیشانی بھی لگاؤ کی دلیل ہوتی ہے۔“

ایلی نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ نفسیات کا وہ باریک نقطہ ایک سادہ آدمی سے سن کر اسے حیرت ہوئی۔

”تو آپ آزاد ہو گئے۔“ حاجی صاحب بولے۔

”جی آوارہ ہوں۔“

”آوارگی۔“ وہ بولے ”کبھی منزل کی طرف بھی لے جاتی ہے۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولے۔ ”لیکن کوئی منزل ہو بھی۔“

”کبھی منزل خود راہی کے سامنے آ جاتی ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”یہاں سبھی راہی ہیں۔“

”کی کو منزل کا شعور ہے کسی کو نہیں ویسے راہی سبھی ہیں۔“

”منزل کو کرنا کیا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”سبحان اللہ۔ اچھا خیال ہے۔“ وہ بولے

ایلی نے پھر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ عجیب مرد ہے اس کی بات رد بھی کرو تو بھی

آئے ہوئے تھے۔ یوسف نے اتنی لمبی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ رفیق پکا نمازی تھا۔ دونوں روزے رکھتے تھے۔ لیکن ایلی نے کبھی روزہ نہ رکھا تھا۔ صبح آٹھ دس بجے کے قریب وہ تینوں حاجی صاحب کی طرف چلے جاتے اور سارا دن ان کے ساتھ باتیں کرتے رہتے۔ پھر تین چار بجے کے قریب وہاں سے گھر آ جاتے۔

ایلی رفیق اور یوسف کی باتیں سن کر حیران ہوتا تھا۔ یوں باتیں کرتے اور مسئلے مسائل پوچھتے جیسے کوئی بڑے مولانا ہوں۔

ان کی باتیں سن کر ایلی کو وہ دن یاد آ جاتے جب وہ تینوں مل کر جلیل کی طرف جایا کرتے تھے۔ اور جلیل مست آنکھیں بنا کر اس لڑکی کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ جو اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں جھاڑو دیتے ہوئے باہر گلی میں نکل آتی اور ساری گلی میں جھاڑو دینے لگتی تھی۔ اس وقت بار بار رفیق کھڑکی سے باہر جھانکتا اور اس کے منہ سے ”سی سی۔“ کی آواز آتی۔ جیسے اسے بہت کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہو۔ باہر صحن میں یوسف قلابازیاں لگاتا اور بندروں کی طرح ناچتا۔

اب وہ دونوں معزز سے بنے بیٹھے تھے اور شرع کے مسائل پر بڑی سنجیدگی سے بحث کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ جلیل تو بالکل ہی نمازوں اور وظائف میں کھو گیا تھا۔ نہ جانے لوگ کیسے بدل جاتے ہیں۔ ایلی سوچتا۔

ایلی محسوس کرتا تھا کہ ذہنی طور پر وہ وہی ایلی ہے جو اس زمانے میں تھا۔ اس کے خیالات بالکل وہی تھے۔ ان کی بنیاد اور تانے بنے میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس کے خیالات کی لکیریں کچھ اور پھیل گئی تھیں لیکن ان کے پھیلاؤ کی سمت وہی تھی۔ رخ وہی تھا۔

ایلی کا بھی جی چاہتا تھا کہ وہ حاجی صاحب کی دنیا کی ایک بھٹک دیکھے۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرے لیکن جانے بغیر وہ آنکھیں بند کر کے آئین کسے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ حاجی صاحب کی عزت کرنے لگا تھا کیونکہ ان میں خلوص تھا اور وہ ناصح نہ تھے، بلند تر ہستی نہ تھے۔ مرشد نہ تھے۔ مسند پر نہیں بیٹھے تھے بلکہ ان سب کے قریب بہت قریب۔ حتیٰ کہ ایلی محسوس کرتا تھا کہ وہ اس کے قریب تھے حالانکہ وہ خود ان سے بہت دور تھا۔ کوسوں دور۔ ان میں انسانیت تھی۔ برابری کا احساس تھا۔ اور ان کے دل میں ہر شخص کے لیے ہمدردی تھی۔

رہتی رہی پھر رفیق سے کہنے لگی۔ ”بے ہوش نہ ہو تو چارہ کیا کرے۔“

”کیوں اماں۔“ یوسف نے پوچھا۔ ”بات کیا ہے۔“

”اے تین دن سے یہاں پڑا ہے یہ اور نہ سحری نہ افطاری۔“

”کیا مطلب۔“ ایلہی نے پوچھا۔

”گھر والا تو کام پر رہتا ہے اسے کیا خبر کہ مہمان کی کیا حالت ہے۔“ بڑھیا نے کہا۔ ”اور گھر لی کہتی ہے۔ میں تو نہ بھیجوں گی کھانا۔ میں کیا نوکر ہوں کہ اس کے دوستوں کی خدمت کرتی ہوں۔“

”کیوں۔“ رفیق نے پوچھا۔

”بس ضد اور کیا۔ بڑی بد مزاج ہے۔“

ایلہی یہ سن کر حیران رہ گیا چار روز سے وہ روز وہاں سارا سارا دن گزارتے تھے لیکن حاجی صاحب نے ان سے نہیں کہا تھا کہ وہ سحری اور افطاری کے بغیر روزے رکھ رہے ہیں۔ اور پھر یہ بھی تھا کہ وہ اپنے کام سے وہاں نہیں آئے تھے بلکہ مرید کی سفارش کرنے آئے تھے جس کی بی انہیں بھوکوں مار رہی تھی۔

اس روز وہ تینوں افطار کے وقت وہیں رہے۔ رفیق اور یوسف افطار کے لیے کچھ پھل لے آئے اور انہوں نے حاجی صاحب کی منتیں کیں کہ وہ آصفی محلے میں جا کر ٹھہریں مگر انہوں نے ٹکار کر دیا بولے ”یہ ٹھیک نہیں جن کے ہاں میں مہمان ہوں وہ برا مانیں گے ان کا دل دکھے گا۔“ ایلہی اس بڑھے کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ بڑا انسان تھا۔

پوٹ

جب ایلہی گردن واپس پہنچا اور رنگی سے ملا تو اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس بیٹھا ہے

”یہ مانی ہے۔“ رنگی بولا۔ ”ویسے میرا بھتیجا ہے لیکن ہر بات میں مجھ سے چار قدم آگے بچ۔“ وہ مسکرایا۔

مانی ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کا رنگ رنگی کی نسبت بہت گورا تھا خدوخال ستواں تھے جسم موزوں تھا۔ بال ہتھکھریالے تھے اور طبیعت میں لالہ لالی پن اور ساتھ ہی محبوبانہ بے نیازی

سبحان اللہ کہتا ہے۔

”انشاء اللہ وہ دن بھی آئے گا۔“ حاجی صاحب بولے۔

”کون سا دن؟“ ایلہی نے پوچھا۔

”آئے گا ضرور آئے گا۔“ وہ بولے ”ہم تو شاید نہ ہوں گے۔“ وہ مسکرائے۔

اسی شام چار بجے کے قریب جب حاجی صاحب لیٹے ہوئے تھے اور رفیق یوسف اور ایلہی آپس میں باتیں کر رہے تھے تو نہ جانے کس بات پر انہوں نے حاجی صاحب کی رائے پوچھنے کے لیے انہیں پکارا

حاجی صاحب چپ چاپ پڑے رہے۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

”سو گئے ہیں۔“ رفیق نے کہا۔

”ارے یہ ان کے دانت تو دیکھو۔“ ایلہی نے کہا۔

وہ سب حاجی صاحب پر جھک گئے۔ حاجی صاحب کے دانت یوں نکلے ہوئے تھے جیسے مقل ہو گئے ہوں۔

”ارے۔“ ایلہی چلایا ”یہ تو بے ہوش پڑے ہیں۔“

رفیق نے انہیں جھنجھوڑا لیکن وہ جوں کے توں پڑے رہے۔

وہ سب گھبرا گئے۔

رفیق نے ان کے منہ پر پانی کے چھنٹھے دیئے۔

حاجی صاحب کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی لیکن وہ پھر بے ہوش ہو گئے۔ رفیق ڈاکٹر کی طرف بھاگا۔

ڈاکٹر نے آکر ٹوٹیل لگائیں اور پھر ایک بوتل سکھائی۔

حاجی صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔

جب وہ ان کے منہ میں دوا اٹھانے لگے تو حاجی صاحب نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ کہ انہیں کچھ نہ دیا جائے۔ غالباً وہ روزہ توڑنے کے حق میں نہ تھے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”مریض کو بے حد نقاہت ہے۔“ ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ڈاکٹر کے آنے پر کسی ایک محلے دار پیشک میں آ گئے اور مریض کی صحت کے متعلق پوچھنے لگے۔ وہ مرید جس کے حاجی صاحب مہمان تھے کارخانے میں کام پر گیا ہوا تھا۔ اس کے گھر سے ایک بوڑھی عورت آکر حاجی صاحب

تھی وہ نہایت اطمینان سے بیٹھا ہوا پکاراگ گنگنا رہا تھا۔

”آپ سے مل کر مسرت ہوئی۔“ مانی نے کہا اور پھر اس کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر گیت گنگنا نے اور شرمیلیتی کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

”آپ کالج میں ہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ وہ بولا ”اب تو نوکری کرتے کرتے بوڑھا ہو گیا۔“

”کیا ملازمت کرتے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔

”نوکری کیا ہے۔“

”پوسٹ ہوں۔“ اس نے بے پرواہی سے کہا۔

”پوسٹ۔“ ایلی نے حیرت سے دوہرایا۔ ”نظمیں لکھتے ہیں کیا؟“

”نظمیں لکھتا ہوں ڈرامے سنیج کرتا ہوں۔ شوکا اہتمام کرتا ہوں سبھی کچھ۔“ اس نے بے پرواہی سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

”لا جواب نوکری ہوئی نا۔“ ایلی نے کہا۔

”بے کار۔“ وہ بولا۔ ”بیگم آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہے۔ لڑکیاں مسکاتی ہیں صاحب

گھورتا ہے۔ کسی روز جان سے مار دے گا۔“

”تم تو روتے ہی رچے ہو۔“ رنگی مسکرایا۔

”رونق سے کون منکر ہے۔“ مانی بولا۔ ”رونق کا تو میں بھی قائل ہوں۔“

”تو پھر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”جان کا روگ نہ بنیں تو۔“ مانی نے کہا۔

”نہ بناؤ۔“ رنگی بولا۔

”کون بتاتا ہے، زبردستی بنتی ہیں۔“ مانی نے بے نیازی سے کہا۔

اتنے میں شرمیلیتی آگئی۔ رنگی دروازے کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”لو بھئی۔“ وہ بولا۔ ”اب تو

خاموش ہو جاؤ۔ شرمیلیتی پہلے ایکٹ کا پسلا سین شروع ہو گیا۔“

”یار۔“ مانی بولا۔ ”یہ تو کچھ بھی نہیں۔“

”تمہیں کیا پتہ یہ ظالم تو جے جے ہے۔“ رنگی نے جواب دیا۔

”جے جے تو نہیں خالی دنتی ہی ہے۔“ مانی نے کہا۔ ”البتہ وہ دوسری والی پتلی جو ادھر رہتی ہے۔ وہ ہے کچھ کچھ۔“

”وہ وہ تو شنراوی ہے شنراوی۔“ رنگی نے کہا۔

”شنراوی تو نہیں خیر۔“ مانی بولا۔ ”خاصی ہے۔“

”شنراوے کو جو بھی میسر ہو وہ شنراوی ہوتی ہے۔“ رنگی مسکرایا۔

”شنراوہ تو جھک مارتا رہتا ہے۔“ مانی ہنسا اور پھر دھوپ میں بیٹھ کر گیت گنگنا نے لگا۔

ایلی اس کی باتیں حیرانی سے سن رہا تھا۔ عجیب لوگ تھے۔ ذہنی چمک تھی۔ رنگینی تھی اور جوانی بھی۔

ایلی ہمیشہ ان شخصیتوں کو پسند کرتا تھا جن میں ذہنی چمک ہو جو رسمی خول سے آزاد ہوں۔ لیکن حال میں وہ سوچنے لگا تھا کہ صرف ذہنی چمک ہی کافی نہیں۔ وہ حاجی صاحب تھے ان کی شخصیت میں اس قدر ہی جاذبیت کیوں تھی۔ پھر وہ غلام تھا۔ ذریہ والا غلام۔ آخر وہ کون سی بات تھی جو ان میں بلا کی جاذبیت پیدا کر رہی تھی۔ ان میں ذہنی چمک قطعی طور پر مفقود تھی۔ رنگین باتیں یا رنگ کی پیکاریاں نہیں تھیں۔ پھر وہ شخصیتیں دوسرے کو گود میں کیوں لے لیتیں تھیں۔ وہ جاذبیت اس ذہنی چمک کی جاذبیت سے کہیں زیادہ پر اثر تھی بے شک ذہنی چمک میں اٹھان تھی۔ پھیلاؤ نہیں تھا۔ وسعت نہیں تھی۔

کبھی کبھی وہ محسوس کرتا کہ رضی میں بھی پھیلاؤ ہے، وسعت ہے۔ اگر مانی اور رنگی کی باتوں میں رنگینی تھی تو رضی اور غلام کی خاموشی رنگین تھی۔ رنگی میں گرفت تھی رضی میں پیار بھری گود تھی۔ مانی چاند کی طرح ہر رنگ میں چمکتا تھا۔ کبھی ہلال بن جاتا کبھی چاند لیکن رضی مسلسل سورج تھا جس میں سے ہر وقت شعاعیں نکلتی تھیں اور گرماتی تھیں۔

مانی اور رنگی کی گفتگو صرف لڑکیوں تک ہی محدود نہ رہتی تھی کبھی وہ راگ و دیا پر بحث پھیر لیتے اور مختلف راگوں کے تاثرات پر گرجویشی سے باتیں کرتے۔ سیاست میں ان کی لچکی محض اخباری قسم کی تھی۔ ایلی خود سیاست میں کورا تھا۔ اسے سیاسی مسائل سے قطعی طور پر لگاؤ نہ تھا۔

گفت

گردپتن میں ایلی کا مرکز رنگی کی بیٹھک تھی۔ مدرسے سے فارغ ہو کر وہ سیدھا گھر جاتا اور

چند ایک منٹ رسمی طور پر وہاں ٹھہر کر عالی کو اٹھا کر رنگی کی بیٹھک میں پہنچ جاتا۔  
عالی کے ذہن پر ایک خوف طاری رہتا تھا۔

پہلے ایک روز ناگاہ ابو گھر چھوڑ گیا تھا اور وہ اپنی امی کے ساتھ اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ ابو کہاں گیا اس کے بعد اس کی امی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اور ابو نہ جانے کہاں سے آ گیا تھا۔ اور اسے اٹھا کر نہ جانے کہاں لے آیا تھا۔ اسے امی اور ابو کا یہ بکھیرا سمجھ میں نہ آیا تھا۔  
جب بھی امیلی گھر سے باہر نکلتا تھا تو عالی گھبرا جاتا۔ اسے یہ ڈر لاحق ہو جاتا کہ شاید وہ لوٹ کر نہ آئے اب تو گھر میں امی بھی نہ تھی۔ ابو چلا جائے گا تو کیا ہو گا۔ گھر میں ہاجرہ تو تھی لیکن عالی کو ہاجرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی ہاجرہ کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔

عالی کا یہ خوف امیلی کے لئے بہت بڑی مشکل تھی وہ باہر نہ جاسکتا تھا۔ سکول جانے میں اسے بے حد دقت ہوتی تھی۔ عالی رونے لگتا۔ اور امیلی کے دل پر نہیں سی لگتی۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ دو ایک مرتبہ امیلی نے اسے سکول لے جانے کی کوشش کی تھی۔ ایک بار وہ ساتھ چلا بھی گیا لیکن وہ وہاں اس پریشان حال رہا۔ اس بھیڑ میں ابو کا بھی ہونا نہ ہونے کے برابر تھا۔

سکول سے آنے کے بعد بہر حال امیلی اسے ہر وقت ساتھ رکھتا تھا۔ اور رنگی کی بیٹھک میں تو وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ اس پر رنگی ہنستا۔ ”یہ باپ اور بیٹا بھی عجیب ہیں۔ جہاں ایک ہو گا، دوسرا بھی قریب ہی ہو گا کہیں۔ امیلی اور عالی کیا جوڑی ہے۔“

وہ دونوں بیٹھ ستار سنتے۔ رضی گانا سنتے اور مانی اور رنگی کی محبتوں اور یارانوں کے قصے سنتے حتیٰ کہ رات کے دس گیارہ بج جاتے۔ پھر وہ گھر لوٹتے تو ہاجرہ چپ چاپ بیٹھی ہوتی۔ امیلی کو ہاجرہ پر ترس آتا تھا۔ وہ بیچاری بڑھاپے میں پھر سے قید میں پڑ گئی تھی۔

ایک روز ہاجرہ نے ڈرتے ڈرتے بات چھیڑی بولی۔ ”امیلی زندگی کس طرح بسر ہو گی۔“  
”کیا بات ہے امی؟“

”دیکھو نا۔“ وہ بولی۔ ”آخر میں ساری عمر تو تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“  
”تو پھر؟“

”تم شادی کر لو بیٹا، ورنہ یہ لڑکا کس طرح پلے گا۔“

”تو کر دو۔“ امیلی نے بے پروائی سے کہا۔

ہاجرہ کا خیال تھا کہ امیلی شادی کے نام پر بدک جائے گا۔ شاید وہ ساری عمر دوسری شادی کے لیے تیار نہ ہو گا۔ امیلی کے منہ سے یہ بات سن کر وہ حیران رہ گئی۔

”تمہیں کوئی اعتراض نہیں نا۔“ اس نے پوچھا۔

”ہو جائے تو بھی اعتراض نہیں۔ نہ ہو تو بھی نہیں۔“

”تو کہاں کرو گے؟“

”کیس بھی۔“ وہ بولا۔

”مکے والے تو نہیں دیں گے اپنی لڑکی۔“

”ظاہر ہے۔“ وہ بولا

”تو کیس سے خود ہی تلاش کر لو نا۔“

”نہ امی۔“ وہ بولا۔ ”یہ جستجو مجھ سے نہ ہو گا۔“

”تو تمہاری پسند کیسی ہو گی؟“

”کوئی بھی ہو منظور کر لو گے؟“

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”صرف ایک بات ہے۔“

”وہ کیا؟“

”جس روز اس نے عالی سے بدسلوکی کی میں اسے گھر سے نکال دوں گا۔“

”ہاجرہ ہنس پڑی۔“ اے تم اپنے دوست سے کیوں نہیں کہتے۔“

”کس سے۔“ وہ بولا۔

”اس رنگی سے۔“

”میں تو نہ کہوں گا۔“

”تو پھر میں کہوں۔“ ہاجرہ نے کہا۔

”کہہ دیکھو۔“

”یہ تو اچھے لوگ دیکھتے ہیں۔“

”ہاں اچھے ہیں۔“

”شاید کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈ دیں۔“

”شاید۔“ وہ بولا۔ اور پھر عالی کو اٹھا کر رنگی کی طرف چلا گیا۔

”ہیائت برا نہیں مانتی۔“ ایللی نے مانی سے پوچھا۔  
 ”بہت۔“ مانی بولا۔ ”کڑھتی ہے۔ لیکن بھی گلاب کے ساتھ کانٹے تو ہوں گے۔“  
 ”وہ بھی تو ٹھیک ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”ہاں۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”ٹھیک کی کیا بات ہے۔ وہ ہم سب کی محبوبہ ہے۔ جگت  
 بوبہ ہے۔ ہم سب اسے پیار کرتے ہیں۔ تم بھی کرو گے۔ اسے بغیر پیار کرنے کے کوئی نہیں رہ  
 ملک وہ میری محبوبہ ہے سسلی ہے۔ رازدان ہے۔ اور وہ میری ماں ہے ماں۔ آؤ ہم چل کر اس  
 ے عشق لڑائیں۔“ مانی اندر جا کر ٹھیک کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ”ماں۔“ وہ بولا۔ ”ہم تو  
 پا ہو گئے۔“

”کیوں۔“ وہ بولی۔

”بس برباد ہو گئے۔“

”وہ مسکرائی۔“

”کوئی خاطر میں نہیں لاتی۔“

”تنت۔“ اس نے مذاق سے منہ بتایا۔

”اچھی ماں کسی ایسی لڑکی کا پتہ دو کہ مزا آ جائے۔ بے حد خوبصورت ہو۔ رنگیلی ہو۔

لہذا ہو — تمہاری طرح۔“ پھر وہ دفعتاً چلایا۔

”یہ ہمارا ایللی ہے اس کی بات بنا دو کہیں۔“

”کیسی بات؟“

”اسے اچھی سی بیوی دلا دو۔“

”اچھا۔“

”بس یہ کام کرو۔“ ساتھی تلاش کر دیتا۔ بیوی نہیں۔“ مانی نے کہا۔

”بیوی کیوں نہیں؟“

”بیوی بڑی بھدی شے ہوتی ہے۔“ وہ بولا۔

”پھر لوگ کیوں کرتے ہیں؟“

”الو کے پٹھے ہیں۔“ وہ بولا۔

”اور تم۔“

ایللی کا رنگی کی بیوی سے ملنے کا اتفاق یہ ہوا کہ اسی روز جب چائے کا وقت ہوا تو فیراز  
 محمول بیٹھک میں چائے پینے کی — بجائے رنگی اسے گھر کے اندر زنانے میں لے گیا۔ اور  
 وہی ٹھیک سے اس کا تعارف کرا دیا۔ ٹھیک کو دیکھ کر ایللی گھبرا گیا۔

ٹھیک خوبصورت تھی اس میں ایک عجیب سا وقار تھا۔ نگاہ بے نیازی سے لبرز تھی۔  
 منوں میں رنگی کی جھلک تھی۔ ٹھوڑی میں دلی ہوئی انبساط تھی۔ جوانی تھی۔ بے تکلفی تھی۔  
 ایللی اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر حیران نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ٹھیک میں رنگی اور رضی کی  
 میزب دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس میں وہی برداشت تھی جو رضی اور غلام میں تھی وہی  
 ہلا تھی اور اس کے باوجود نہایت کی تمام تر رنگینی اور شوخی بھی تھی۔ یہ متضاد خصوصیات  
 بیک جگہ کیسے اکٹھی ہو سکتی ہیں وہ حیران تھا۔

ٹھیک کو دیکھ کر ایللی کو رنگی کی شہریتوں پر غصہ آنے لگا۔ رنگی کیوں جھک مار رہا تھا۔  
 یوں پھول پھول اڑ رہا تھا۔ جب کہ اس کے اپنے گھر میں ہمار آئی ہوئی تھی۔ بلکہ ایک روز اس  
 نے رنگی سے اشارہ ”یہ بات کہہ بھی دی۔ رنگی کا چہر خوشی سے متا اٹھا۔ وہ بولا۔ ”دیکھنا ٹھیک  
 قہقہہ میری زندگی کی ہمار ہے۔ اس کے بغیر دنیا سونی ہے جہی تو مجھے اس سے اس قدر عشق ہے  
 کہ نہ عشق۔“

ایللی کے ہونٹوں پر طنز پر مسکراہٹ دیکھ کر رنگی چلایا۔ ”تمہیں یقین نہیں آیا کیا۔ ٹھیک میری  
 روح کی روشنی ہے جسم کی بات چھوڑو۔“

”اور یہ جو فن فیراں ہیں تمہاری۔“ ایللی نے پوچھا۔

”جی ان کی کیا حیثیت ہے۔“ رنگی نے کہا۔ ”اگر ٹھیک کو زکام ہو جائے اور اگر ان تمام

فیروزیوں کا بھرتا بیا کر کھلانے سے اس کا زکام دور ہو سکتا ہو تو میں ذرا تامل نہ کروں۔“

رنگی بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا، لیکن ایللی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح متضاد  
 میں کیے جا رہا تھا عین اس وقت مانی نے شور مچا دیا۔ ”بھئی اوھر کی بھی خبر لو۔ کب سے بچاری  
 سوپ میں کھڑی ہے۔ تمہارے لیے۔“

”تھلی ہے کیا؟“ رنگی اچھل کر بولا۔

”ہاں ہاں۔“ مانی چلایا۔

رنگی نے دو چھلانگیں ماریں اور بیٹھک سے باہر نکل گیا۔



”میں بھی ہوں۔ الو کا پٹھا۔“  
 ”کیوں ہو؟“ وہ ہنسی  
 ”میں باپ نے بنا دیا بس۔“  
 ”نہ بننے۔“  
 ”زبردستی بنا دیا۔ اب کہیں ایللی کو الو کا پٹھا نہ بنا دیتا۔ خیال رکھنا۔“  
 ”ہے۔“ رنگی چلاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ”میری پیاری کو دق نہ کرو۔“  
 گھٹ رنگی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔  
 ”بس تمہارے بغیر میرا دم نکلتا ہے۔“ رنگی نے پیار سے گھٹ کی طرف دیکھا۔ ”ہم تو برس  
 تمہارے بغیر یتیم ہو جاتے ہیں۔“  
 ”اچھا۔“ وہ مسکرائی اور وہ ایک دوسرے میں کھو گئے۔

## پاک بابا

ایک صبح ہاجرہ بولی آج میں نے خواب میں پاک بابا کی زیارت کی۔  
 ”پاک بابا؟“ ایللی نے تعجب سے پوچھا۔  
 ”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا۔“  
 ”کیوں؟“

”دیر سے ان سے ملنے کا ارادہ کر رہی ہوں۔“

”تو پھر۔“

”جانتا ہی نہیں ہوا۔“

”کیوں۔“

”بس جھنجھٹوں میں پڑ رہی۔“

”ہوں۔“ ایللی بولا۔

”حاجی صاحب کیا پاک بابا کی زیارت کر آؤں۔“ میں نے حاجی صاحب سے پوچھا تھا۔

”تو وہ کیا کہنے لگے۔“

کہنے لگے ”اللہ کے بندوں کی خدمت میں حاضری دینا اچھا ہوتا ہے۔“ میں نے پوچھا تو

پاک بابا امرتسر علی پور سڑک پر ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر ایک بہت  
 بڑی پگڑی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پگڑی باندھی ہوئی نہ ہو بلکہ گٹھا سا بنا کر سر پر رکھ  
 لی ہو۔ اس کے جسم پر ایک لمبا سا چنڈ لٹکتا تھا۔  
 ایک درخت کے نیچے ایک چھوٹا سا بستر، ایک مٹی کا پیالہ۔ ایک لوٹا۔ اور ایک تھالی پڑی  
 تھی۔ یہ بابا کا جملہ سامان تھا۔ اسے کبھی کسی نے بیٹھے نہ دیکھا تھا۔ ہمیشہ سڑک پر ادھر سے ادھر  
 لہرے ادھر گھومتا رہتا۔ چھاتی ابھری رہتی، گردن اٹھی رہتی۔ اسے دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا  
 تھا جیسے نولین جہاز کے تختے پر گرد و پیش کا جائز لے رہا ہو۔  
 پھر وہ نماز پڑھنے میں مصروف ہو جاتا۔ لیکن نماز پڑھنے کے لیے وہ سڑک سے ہٹ کر

قرب ہی کھیتوں میں چلا جاتا تھا۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ واپس سڑک پر آ جاتا۔ بابا کو کبھی کسی نے سوتے، اٹھتے یا کھاتے پیتے نہ دیکھا تھا۔

اللہ سے بیاہ

ریتی پور کے گاؤں میں ایک روز جب لوگ مسجد میں گئے تو بابا وہاں بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا اور اس کا مختصر سا سالن جس میں ایک چھوٹا سا بستر بھی شامل تھا۔ حجرے میں رکھا ہوا تھا۔ گاؤں والوں نے سمجھا کہ مسافر ہے۔ شاید سستانے کے لیے وہاں رک گیا ہے۔ دو ایک روز تو لوگ سے ساگ روٹی بھیجتے رہے۔ تیسرے روز ریتی کا نمبردار غصے میں آگیا۔ کہنے لگا۔ ”دیکھ بابا یہ مسجد ہے۔ اللہ کا گھر ہے۔ ہوٹل یا سرائے نہیں ہے۔ تو اب اپنا راستہ لے۔ یہاں ڈیرہ جمنا غلط ہے۔“ چوتھے روز وہ پھر مسجد میں گیا۔ تو بابا جوں کا توں بیٹھا تھا۔

نمبردار کو طیش آگیا۔ اس نے بابے کا سالن اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ اور دھکے دے کر مسجد سے باہر نکال دیا۔

بابے نے اپنی پگڑی سر پر رکھی سالن اٹھایا۔ اور ریتی پور کی مسجد سے دس پندرہ قدم کے فاصلے پر جا کر سڑک پر بیٹھ گیا۔

اسی شام نمبردار کی بھینس بیمار پڑے بغیر مر گئی۔ سارا گاؤں حیران تھا کہ بھینس کو کیا ہوا۔ کچھ لوگ کہنے لگے ”تم نے بابا کے ساتھ بدسلوکی کی تھی۔ یہ اس کا نتیجہ ہے۔“

نمبردار غصے میں چلانے لگا۔ ”میں نے کیا برا کیا تھا۔ کیا شریعت کے خلاف بات کی تھی۔ سیدھی بات ہے میاں کہ مسجد اللہ کا گھر ہے۔ وہاں جا کر نماز پڑھو۔ میلاد کرو۔ عبادت کرو اور اگر کوئی مسافر ہو تو بے شک دو دن کے لیے وہاں ٹھکانہ بھی کر لے۔ پر یہ کیا ہوا کہ اسے گھر بنا کر بیٹھ جائے۔“ نمبردار نے بھینس کی موت کو بابا کی بدعا کا نتیجہ سمجھنے سے صاف انکار کر دیا۔

اگلے روز جب وہ حویلی میں گیا تو ایک اور بھینس مری پڑی تھی۔ ”ارے۔“ وہ سر ہٹام کر بیٹھ گیا۔ آٹھ روز میں جب اس کی تینوں بھینسیں بے وجہ مر گئیں تو وہ گھبرا گیا اور اس نے گاؤں میں کھڑے ہو کر لوگوں کی منتیں کیں ”میں تباہ ہو گیا۔“ یہ کیا مصیبت آپڑی ہے مجھ پر؟ خدا کے لیے میری مدد کرو۔ ضرور یہ اس بابا کی بدعا ہے۔ مجھ سے بھول ہو گئی۔ میری توبہ ہے؟ میں اس کے پاؤں پڑنے کے لیے تیار ہوں مجھے اس سے معافی لے دو، ورنہ تباہ ہو جاؤں گا۔“

وہ سب مل کر بابا کے پاس گئے۔ لیکن بابا چپ چاپ بے نیازی سے سڑک پر ٹھٹھا رہا جیسے ان لوگوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہو۔ دیر تک وہ چیخے چلاتے رہے لیکن بابا اپنی ہی دھن ادا کر رہا تھا۔

اسی شام وہ پھر بابا کے پاس گئے۔ انہوں نے منتیں کیں۔ کہ وہ پھر مسجد میں آ بیٹھے۔ وہ گاؤں میں ایک مکان دینے کے لیے تیار تھے۔ اس کی خدمت کرنے کے لیے بے تاب تھے بلکہ وہ گاؤں والوں کو معاف کر دے۔ لیکن بابا نے ان کی طرف دھیان نہ دیا۔

پھر اگلے روز انہوں نے گاؤں کے وارے میں بیٹھ کر مشورہ کیا۔ ہر کسی نے اپنی اپنی تجویز دی۔ لیکن دو لے چار کی بات سب کو پسند آئی۔ اور انہوں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک آدمی سڑک پر جا بیٹھا کہ بابا پر نگاہ رکھے۔ گاؤں کے دس ایک آدمی وضو کر کے انتظار باٹھ رہے۔ جب بابا نماز پڑھنے کے لیے کھیت میں گیا اور نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب گئے اور بابا کے پیچھے قطار بنا کر نماز پڑھنے لگے۔

جب بابا نماز پڑھ کر فارغ ہوا اور اس نے پیچھے دیکھا کہ گاؤں والے اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں تو وہ چلانے لگا۔ ”جاؤ جاؤ۔ اٹھو میرے پیچھے مت بیٹھو۔ تم نے اللہ سے بیاہ نہیں کیا۔“ گاؤں والوں میں سے ایک بولا۔ ”ہم تمہارے پیچھے نماز پڑھنا نہ چھوڑیں گے۔ جب تک ہمیں معاف نہ کرو۔“

”مت پڑھو، مت پڑھو۔“ بابا چلایا۔ ”تم نے اللہ کے ساتھ بیاہ نہیں کیا۔“

”تو کہہ دو گاؤں والوں کو معاف کیا۔“ وہ بولے۔

”اللہ معاف کرے گا۔“ وہ بولا۔ ”جاؤ جاؤ۔“

”اللہ نہیں کرے گا۔ جب تک تم نہ کرو۔“ گاؤں والوں نے کہا۔

”جاؤ جاؤ۔“ بابا بولا۔ ”میں کون ہوں۔ میں کچھ نہیں میں کچھ نہیں۔ جاؤ۔“

”چاہے تم کچھ نہیں۔“ گاؤں والوں نے کہا۔ ”جب تک تم یہ نہ کہو گے کہ جاؤ معاف کیا تمہیں جائیں گے۔“

”بابا اٹھ بیٹھا۔ وہ کھیتوں میں گھومنے لگا۔“ پگے پگے ٹنگ کرتے ہیں۔ ٹنگ کرتے ہیں۔“

لٹاوا لے دیں بیٹھا رہے۔

”جاؤ۔ جاؤ۔“ بابا بار بار ان کے قریب آ کر چلاتا۔

”اچھا کیا۔“ وہ بولا۔ ”اچھا کیا۔“

”باجی یہ میرا بیٹا ہے۔“ وہ ایللی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”ادھر آ ایللی۔ ادھر آ۔ بابا کے

ماننے۔“

ایللی اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔

بابا نے ایللی کی طرف دیکھا۔ غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”تمہارا بیٹا ہے۔“ دفعتاً وہ بولا۔

”جی بابا۔“ ہاجرہ بولی۔

”تمہارا بیٹا ہے۔ تو پھر میں کیا کروں۔“

”دعا کریں آپ۔“ وہ بولی۔

”میں کون ہوں۔“ وہ چلایا۔ ”میں کون ہوں کہ دعا کروں۔“

”آپ اللہ والے ہیں۔“ ہاجرہ بولی۔

”اللہ اپنے کام آپ جانے۔ وہ سب جانتا ہے۔ اللہ اپنے کام آپ کرے وہ سب کرتا ہے

ن کون ہوں۔“

”آپ اللہ والے ہیں۔“ ہاجرہ نے پھر دوہرایا۔

”بھئی اللہ کے ہیں۔ میں بھی ہوں پھر میں کیا کروں۔“ پھر وہ اٹھ بیٹھا اور وہیں کھیت میں

لو کاٹنے لگا۔

”وہ سب کرتا ہے۔ وہی کرتا ہے کون کرتا ہے پھر کون کرتا ہے۔ وہی جانے۔ اسی کے کام

داؤنی جانے۔ میں کیا کروں۔“ دیر تک وہ میں کیا کروں کی رٹ لگاتے ان کے سر پر منڈلاتا

پھر وہ ایللی کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”کیا نہیں کیا؟۔۔۔“ بابا چلایا۔ ”کیا نہیں کیا؟ جب تم نے ڈیرہ میں ڈیرا لگایا تو حضرت

لغور نے تم پر ترس کھایا اور تم کو حفاظت میں لیا تھا، نہیں لیا تھا؟“

ایللی نے ڈیرہ کا نام بابا کے منہ سے سن کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا نہیں کیا اس نے۔“ بابا چلا۔ ”وہ پھر چکر کاٹنے لگا۔ واپسی پر وہ پھر ایللی سے رو برد کھڑا ہو

بد

”کو معاف کیا۔“ وہ جواب دیتے۔ بابا پھر گھونسنے لگتا۔ ”میں کون ہوں میں کون ہوں۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔“

دیر تک وہ یوں ہی چلاتا رہا۔ پھر بولا۔ ”جاؤ معاف کیا جاؤ جاؤ۔ اللہ سے بیاہ کر لو۔ سب اللہ سے بیاہ کر لو جاؤ۔“

اس کے بعد انہوں نے کئی بار کوشش کی کہ بابا گاؤں میں آ رہے لیکن بابا نے ان کی بات نہ سنی اور وہیں سڑک پر گھومتا رہا۔

بابا کی یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ارد گرد کے علاقے کے لوگ بابا کے پاس

آنے لگے۔ لیکن جلد ہی ان سب کو معلوم ہو گیا کہ بابا نہ بیٹھے گا نہ بات کرے گا۔ لہذا لوگوں

نے آ آ کر بابا کو سلام کرنا شروع کر دیا۔ بات کرنی ممکن نہ تھی مگر وہ سلام تو کر سکتے تھے اور رسم

اس قدر عام ہو گئی کہ سڑک پر چلتی ہوئی بسیں، لاریاں اور موٹریں بابا کے ڈیرے کے پاس آ کر

رک جاتیں ڈرائیور انجن بند کر دیتے اور پھر از سر نو گاڑی شارٹ کر کے چل پڑتے یہ ان کی

سلامی تھی۔

برائیں رک جاتیں۔ بینڈ انگریزی نیشنل انتھم بجاتے اور سلام کے بعد خاموشی سے پھر

چل پڑتے راگبیر رک جاتے۔ سلام کرتے اور پھر چل پڑتے۔

اور بابا اتنی بڑی پاگ سر پر رکھے سڑک پر ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر چکر لگاتا رہتا۔ اس

کی چھاتی ابھری ہوتی۔ گردن تنی ہوتی۔ سر اوپر کی طرف اٹھا ہوتا۔ اور وہ ادھر ادھریوں دیکھتا

جیسے جہاز کا کپتان ہو۔ حالات کا جائزہ لے رہا ہو اور جہاز کو کھینچ کر پار لے جانے کے متعلق

ملاحوں کو احکامات صادر کر رہا ہو۔“

## میں کیا کروں

جب ہاجرہ اور ایللی وہیں پہنچے تو بابا کھیت میں بیٹھا نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ ہاجرہ چپکے سے

بابا کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگی۔ ایللی عالی کو اٹھائے قریب ہی بیٹھ کر تنکے سے زمین

کریدنے لگا۔

نماز سے فارغ ہو کر بابا نے مڑ کر دیکھا۔ ”تم نے اللہ سے بیاہ کیا ہے؟ وہ چلایا۔

”کیا ہے باجی۔“ ہاجرہ نے جواب دیا۔

بچ رہا تھا۔

بابا پھر آگیا۔ ”پھر میں کیا کروں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم وہاں جاؤ نہ جاؤ۔ جہاں تمہارا بھائی ہے۔ دور بہت دور۔ رومی ٹوپی والا بڑھا بیٹھا ہے۔ وہ تم ایسوں سے پیٹ لے گا۔ کنویں کے پاس۔ مسجد کے پاس ندی کے پاس۔ وہ بڑھا بڑا جبر دست ہے اور اس کا بالکا وہ لبا ہی لبا اور اونچے قد والا دونوں بیٹھے ہیں جہاں تم نے پہنچنا ہے۔ جاؤ۔ جاؤ۔ وہ چلایا۔ ”میں کیا کروں۔ جاؤ جہاں تم نے جانا ہے ان سے ہو کر پھر تم نے وہاں پہنچنا ہے۔ جہاں تمہارا بھائی لکھا ہے بیس سے ہو کر جانا ہے۔“ اس نے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ ”جاؤ جاتے کیوں نہیں جاؤ۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں۔“

دھنکا۔ ”بابا کو غصہ آگیا۔ ”جاؤ جاؤ جاتے کیوں نہیں جاؤ۔“ اس نے ہاجرہ اور ایللی کو دھمکایا۔

”اس کو بھی بے جاؤ۔“ اس نے عالی کی طرف دیکھا۔ ”اس کو جو گل گیا تھا۔ پیٹ میں گل گیا تھا۔ اسے بھی لے جاؤ۔ جاؤ۔ جاؤ وہ غصے میں چلایا۔

”نہیں جاتے، نہ جاؤ نہ جاؤ۔ تم جانو بڑھا جانے میں کیا کروں، میں کیا کروں۔“ یہ کہتا ہوا بابا سڑک کی طرف چل پڑا۔

وہ تینوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ ہاجرہ کے چہرے پر عجز اور انکار کے تو دے لگے ہوئے تھے عالی ایللی کا منہ تک رہا تھا۔ اور ایللی خاموش بیٹھا تھا چاروں طرف سے دھند لکا اس پر یورش کر رہا تھا۔

دھندلکے میں کھڑی شہزاد مسکرا رہی تھی۔ ”جاؤ۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”رکاوٹ تو دور ہو نا۔“ حاجی صاحب کا سر ہل رہا تھا۔ ”آئے گا وقت ضرور آئے گا۔“ وہ مدھم آواز میں گنگنا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے انہوں نے اسی سرے کی سلامتی لگا رکھی تھی۔

غلام مسکرا رہا تھا۔ اللہ ہی اللہ۔ اللہ ہی اللہ اس کی ستار سردھن رہی تھی۔

”اے ری عالی بیابن۔“ رضی کی آنکھوں سے مٹھاس بھرے ہتھینے اڑ رہے تھے۔ پیا پیا لک چینی ہوئی اڑے جا رہی تھی۔

اس دھندلکے میں ایک بڑھا میلی سی رومی ٹوپی پہنے فضا کو گھور رہا تھا۔ اس کے قریب ایک

اور تم کو وقت پہ وہاں سے نکال دیا۔ اور تمہیں بچنے کنٹرے میں جگہ دی۔ نہیں دی کیا؟“ چٹا کنڈرا۔ ایللی کو امر ترسیاد آگیا۔

”اور پھر تمہارا منہ کالا کر دیا۔ اور تم چلتے پھرتے رہے اور لوگ چلتے پھرتے رہے۔ اور تم ان کو دیکھتے رہے اور وہ تمہیں دیکھتے رہے۔ پر انہوں نے تمہیں نہ دیکھا۔“

کیا نہیں کیا؟ کیا نہیں کیا؟ پھر وہ دیوانہ وار چکر کاٹتا رہا۔ کہتے ہیں نہیں کیا۔ نہیں یا تو نہیں کیا کروں۔ چلو نہیں کیا۔ پھر تم کون ہو کہنے والے نہیں کیا۔ سب کچھ کیا سب کچھ کیا۔ کیا نہیں کیا۔ پھر وہ ایللی کے روبرو آکر کھڑا ہوا۔ ”کیا نہیں کیا۔“ وہ چلایا۔ ”پھر تمہیں داتا کے قدموں میں جگہ دی۔ نہیں دی کیا؟“ وہ بولا۔ ”بولو۔ دی۔ دی۔ وہ دینے والا ہے۔ ہم کون ہیں۔ ہم کون ہیں وہی سب کچھ ہے۔ سب کچھ دینے والا۔ اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔“

بابا پھر ایللی کے روبرو آکھڑا ہوا پھر بولا۔ ”جھنڈے شاہ نے تمہاری حفاظت کی۔ تم پر ترس کھلایا۔ تمہیں بچایا۔ رحمت ہوگی اللہ کی بس اسی کی رحمت یہی چیز ہے۔ ہم کیا ہیں۔ ہم کیا ہیں کہتے ہیں کیا نہیں کیا پگ پگ۔“ وہ پھر چکر کاٹنے لگا۔

## بڑھا اور لبا

”اور اور۔“ وہ رکا۔ ”اس نے تمہارا بھائی لکھ لیا۔ نہیں لکھا؟ تم نے نہیں لکھوایا۔ تم نے کہا کہ تم اس سے بیاہ نہ کرو گے۔ نہ کرو نہ کرو۔ پھر کیا ہے؟ اس کا کیا؟ وہ تو اپنی رحمت سے بلاتا ہے۔ نہ جاؤ۔ نہ جاؤ پھر کیا ہے؟ اس پر بھی تمہارا بھائی لکھ لیا۔ لکھ لیا۔“

وہ پھر چکر کاٹنے لگا۔ ”خود اندھے ہیں خود اندھے۔ اور کہتے ہیں۔ کچھ نہیں کیا۔ پھر میں کیا کروں۔ کیا کروں ہیں۔“

وہ پھر آکھڑا ہوا۔ ”اس بڑھے نے سب کچھ بتایا نہیں بتایا کچھ بولا۔ اس نے تمہارا بھائی لکھا ہے وقت کی بات ہے۔ وقت پر ہوتا ہے وقت پر نہیں ہوتا۔ اس بڑھے نے کہا وقت آئے گا۔ تم نے پرواہ نہ کی۔ اندھے ہیں اندھے اندھے ہی اندھے۔“ وہ پھر چکر لگانے لگا۔

ایللی حیرت سے اس بڑھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے حاجی صاحب کھڑے تھے۔ ہاجرہ سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ سامنے سڑک پر لوگ کھڑے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ بابا نے بھی کسی کو پاس نہ بٹھایا تھا۔ وہ ہاجرہ عالی اور ایللی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عالی اگلیوں سے لکیریں

ہر ایمان کو استوار نہ کرتی تھی۔ نہ ہی اس کے دل میں خدا یا مذہب کے لیے جذبہ پیدا کرتی۔  
رنہ نہ ہی وہ ایسے لوگوں کو اللہ والے تسلیم کرنے پر تیار تھا جن سے ایسی طاقتوں کا ظہور ہوگا۔  
تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ وہ بے حد ڈر پوک تھا لیکن اللہ پر اس کا ایمان ڈر کی بنیاد  
قائم نہ تھا

اللہ کا تخیل جو اس کے دل میں قائم ہوا تھا وہ جمیمہ کی فلکیات ہلڈین کھلے کے  
بائس کا بجز۔“ سے متعلق مضامین برٹنڈرسل کے فزکس سنٹیانا کے جذبات کاؤٹ  
بہین کے مشاہدات اور ایچ۔ جی ولز کی سائنس فکشن کتابوں سے اخذ کیا گیا تھا۔

ڈر کی بجائے اس کا دل اللہ تعالیٰ کی عظمت کے جذبات سے معمور تھا اسے اللہ کے بندوں  
ہاقتوں کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ اور ہوتا بھی تو اسے ان سے کوئی سروکار نہ تھا۔ چونکہ اسے  
لہ کی طلب نہ تھی احترام تھا فقط احترام۔ ویسے وہ اللہ کی محبت سے کورا تھا۔ اللہ سے محبت کا  
ال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اللہ سے محبت صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے۔ جب وہ اپنی  
لی اٹھا کر نیچے اتر آئیں۔ اسے بجائیں اور کائنات ماحول میں راہنما کی طرح نچے اور ان  
املی کے سحر تلے بوئے آگ آئیں بھول کھل جائیں اور کوئل چلائے پیو پیو۔

ہندویت اور عیسائیت کے مطابق اللہ کی محبت کا تخیل اس کے لیے قابل قبول تھا۔ اسلام  
لے مطابق تو صرف اللہ ہو اللہ ہو تھا۔ عظمت عظمت عظمت۔ محبت کا سوال پیدا ہی نہیں  
رہا تھا۔ اور اس بے پناہ عظمت کا اسے کچھ احساس تھا۔ جو اس نے مغربی علماء کی تحریروں  
لے اخذ کیا تھا۔ اسلام سے نہیں۔

لہذا معجزات کو خاطر میں لانا یا اللہ کے ان بندوں کے سامنے جھکتا بے کار تھا۔ ایللی کی ذہنی  
اے بے حد مستحکم اور محفوظ تھی۔

لیکن اس کی جذباتی دنیا ذہنی خیالات سے دور اپنے ہی رنگ میں بہتی تھی۔  
شاید اسی لیے اسے شعریوں سے محبت تھی چونکہ شعریوں کے زیر اثر مرلی اٹھائے کٹ  
سے نیچے اتر آئے۔ اور پگھٹ پر اسے گھیر لیتے۔ اس کی ذہنی چوڑیاں ٹوٹ جاتیں۔ اس کے  
ٹکی مگر پھوٹ جاتی اور وہ اس ٹوٹ پھوٹ سے بے نیاز ہو کر رادھکل بن کر نکلتا۔

لیکن یہ روی ٹوٹی والا بڑھا اور دراز قد کون تھے۔ جو اس کی پرائیویٹ زندگی میں خواہ مخواہ  
لے چلے آ رہے تھے۔ لاجول ولا قوت عجیب بات تھی کہ وہ لاجول پڑھتا بھول جاتا۔ اس کا دل

اونچا لمبا دیلا پتلا انسان چپ چاپ بیٹھا تھا۔ کنواں اڑیاں اٹھائے ان کی طرف جھانک رہا تھا۔ ٹوٹی  
ہوئی مسجد کے مینار گم صم کھڑے دیکھ رہے تھے چھوٹے چھوٹے درخت بالوب کھڑے تھے۔  
جب ایللی گرد پتن پہنچا تو وہ دھند لکا بدستور قائم تھا۔

اس کے بعد ایللی کے احساسات میں نہ جانے کیا ہوا۔ جب بھی وہ رضی مانی اور رگی کے  
پاس بیٹھا ہوتا اور رضی کوئی نہ کوئی راگ چھیڑتا۔ گھمری رے اے ندیا۔“

تو اس کے روبرو ایک وسیع میدان پھیل جاتا۔ گہری ندی کے قریب ایک کنواں ابھر آتا اور  
پھر پاس ہی ایک مسجد سفید چادر اوڑھے آبیشتی اور ایک مختصر سی چادر دیواری کے اندر سفید  
ٹائیلوں پر روی ٹوٹی اوڑھے ایک بڑھا اپنے ہی دھیان میں مگن بیٹھا ہوتا۔ پاس ہی دراز قد با  
اوب کھڑا ہوتا۔

”پون چلت پڑتا۔“ رضی گویا آپس بھرتا۔ ”وہی دنیا۔“ وہ چادر میں لپیٹی ہوئی مسجد اپنا آپ  
سمیٹی۔ دور ہوا سیٹیاں۔ بجاتی۔ دستیں اور پھیل جاتیں۔ کائنات انگڑائی لیتی پتے سرگوشیاں  
کرتے درخت جھکتے ندی اور گہری ہو جاتی۔

ایللی رضی رگی اور مانی کے درمیان بیٹھ کر بھی اسی منظر میں کھویا رہتا۔  
”لو شریستی آگئیں۔“ رگی مسکرایا۔

ایللی کی نگاہ تلے ایک نیلی روی ٹوٹی ابھری۔

”کیا بونا سا قد تھا۔“ مانی تتلی کو دیکھ کر مسکرایا۔

ایک بونا ایللی کی نگاہوں میں ابھرتا۔ اور پھر دراز قد ایللی کی طرف دیکھتا۔ اور پھر باگ بیا  
چینٹ۔ ”جاؤ۔ چلے جاؤ تم جانو اور وہ جانیں۔ میں کون کون ہوں۔“

اور حاجی صاحب کا سر جھولتا۔ ”اللہ کا کرم ہے جس پر ہو جائے۔“

باگ بابا نے نہ جانے ایللی کو کیا کر دیا تھا۔

لیکن ایللی کا ذہن جوں کا توں تھا۔ وہ ایک مضبوط قلعے کی طرح اس کے گرد حصار کیے ہوئے  
تھا۔ یہ ٹھیک ہے۔ بابا نے اس کے ماضی کے متعلق اتنی ساری باتیں بتادی تھیں۔ ضرور بابا میں  
کوئی طاقت کام کر رہی تھی۔ لیکن ایللی سوچتا اس شعبہ بازی سے مجھ سا سمجھدار آدمی کیسے متاثر  
ہو سکتا ہے۔ شعبہ بازی ایللی کو حیران کن ضرور کرتی تھی اسے شعبہ بازی سے چنداں دلچسپی نہ  
تھی۔ معجزات یا اس قسم کی غیر مرئی طاقت اس کے لئے حیران کن ضرور تھی۔ لیکن وہ اس

تھے۔ اور اپنی تمام تر زندگی میں کوئی مقام حاصل نہ کر سکے تھے۔ اس لیے عادی طور پر وہ اپنی اہمیت ان دوستوں سے اخذ کرتے تھے۔ جنہیں کوئی نہ کوئی مرتبہ حاصل تھا۔ ایللی ان کی اس عادت سے پورے طور پر واقف تھا لیکن اس میں اس قدر فراخ دلی نہ تھی کہ ان کی اس چھوٹی سی کمزوری کو برداشت کرتا۔

ان کے منہ سے اپنے دوستوں کی عظمت کا تذکرہ سن کر وہ جل کٹ جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ علی احمد کا کوئی دوست نہیں۔ لوگ صرف ان کی بذلہ سبکی کی وجہ سے ان سے ملتے اور ہمیں ہانکتے تھے۔ دراصل وہ علی احمد کے لیے کچھ کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس کی وجہ علی احمد کی اپنی طبیعت تھی۔ چونکہ وہ بڑے آدمیوں کو ہوا دینے کے قائل تھے۔ ان کا ادب لحاظ ملحوظ خاطر رکھتے۔ وہ کسی بڑے آدمی سے برابری کے احساس سے نہیں مل سکتے تھے۔

بہر صورت ایللی میں اس قدر وسعت قلب نہ تھی کہ علی احمد کی اس چھوٹی سی خوشی میں ان کا ساتھ دیتا۔

”دیکھئے ابا جان۔“ وہ بولا۔ ”آپکے دوست آج تک میرے لیے کچھ نہ کر سکے چھوڑیئے اس بات کو۔“

اس پر علی احمد کو غصہ آگیا۔ غصہ تو آتا ہی تھا۔ چونکہ ان کا اپنا بیٹا ان کی تمام تر اہمیت کو یوں یک قلم رد کر رہا تھا۔

”اگر معروف صاحب ڈائریکٹر نہ ہوں۔“ وہ جلال میں کہنے لگے۔ ”یا تم میرے بیٹے نہ ہو تو تم ایک روز بھی اپنی نوکری پر قائم نہیں رہ سکتے۔“

”آپ کا مطلب یہ ہے تاکہ انہوں نے آپ کی وجہ سے میرے خلاف شکایات پر کوئی ایکشن نہیں لیا۔“ ایللی نے کہا۔

”بالکل۔“ وہ بولے۔

”یہ میں تسلیم کرتا ہوں اور شکر گزار ہوں۔“ ایللی نے کہا۔ ”لیکن ان کی امداد مثبت قسم کی نہیں۔“

”کیا مطلب۔“ علی احمد بولے۔

”انہوں نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ صرف نوکری پر بحال رکھا ہے۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”اجی میاں۔“ علی احمد چلائے۔ ”اگر وہ نہ ہوں تو تم ایک دن کے لیے بھی نوکری نہیں کر

احترام سے بھر جاتا۔ اور پھر نہ جانے کون مرلی چھیڑ دیتا اور کائنات ناپنے لگتی۔

## خاموش عزم

پھر ایللی باجرہ اور عالی چند ایک روز کی رخصت پر علی پور چلے گئے۔

علی پور ایللی کے لیے ایک ویرانہ تھا۔ نہ وہاں اس کا دوست تھا۔ نہ کوئی دلچسپی شہزادے چوہارے کو دیکھ کر اسے ہلکی سی اداسی محسوس ہوتی تھی۔ اور بس۔ محلے والوں کے دلوں میں ابھی تک اس وقت کی یاد باقی تھی۔ اگرچہ محلے والیاں اسے ہنس کر بلاتی تھیں لیکن جلد ہی کسی کے منہ سے زمانہ ماضی کی کوئی بات نصیحت کے رنگ میں نکل جاتی۔

گھر میں علی احمد اسی مطمئن سے رہتے تھے۔ وہ بات بات پر گھروالوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرتے اور راجو یا شمیم کو طعنے دیتے رہتے۔

شمیم کی دونوں بیٹیاں جوان ہو چکی تھیں۔ بڑی دسویں جماعت پاس کر چکی تھی۔ اور اب کسی مدرسے میں معلمہ تھی۔ چھوٹی لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔

راجو کا بیٹا شیر علی لاہور میں اپنی بیوی کے پاس رہتا تھا۔ نصیر کالج میں تعلیم پاتا تھا۔ اس کے علاوہ علی احمد کے دو بیٹے اور تھے۔ وزیر اور کبیر وہ دونوں مدرسے میں پڑھتے تھے۔ جب سے علی احمد نے پنشن پائی تھی ان کی زندگی میں خاصی تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ وہ سارا دن گھر بیٹھے رہتے اور اپنے رجسٹروں میں کچھ لکھتے رہتے۔ نصیر وزیر اور کبیر سے ان کا رویہ قطعی طور پر مختلف تھا۔ چونکہ اب وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور باپ کی بجائے دادا بن گئے تھے لہذا وہ ہر وقت اپنے بیٹوں کو اپنے پاس بٹھائے رکھتے اور انہیں اپنے خیالات کے انجیکشن لگاتے رہتے۔

ایللی علی پور پہنچا تو علی احمد نے حسب معمول بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ گردن پتھن کے متعلق پوچھنے لگے۔

”کیوں بھئی۔“ تمہارا جی لگ گیا وہاں۔ بڑا اچھا مدرسہ ہے۔ خوبصورت شہر ہے۔“ پھر معروف صاحب کی بات چل نکلی بولے ”دراصل تم کیرئیر کے لحاظ سے خاصے بد قسمت واقع ہوئے ہو۔ ورنہ محکمہ تعلیم کے سبھی افسر اپنے دوست ہیں اگر تمہارے خلاف شکایات نہ ہوتیں تو نہ جانے ان کی مدد سے تم کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔“

اپنے اثر و رسوخ پر ناز کرنے کی علی احمد کی پرانی عادت تھی۔ وہ خود بڑے عمدے پر نہ پہنچ

”نوکری تلاش کرنے آئے ہو۔“ محمود بولا۔ ”تو میرانی کر کے تلاش کرو۔ میں بھی اس محکمے سے آتا گیا ہوں۔“

محمود نے بات مذاق میں ٹال دی۔ اب ایللی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے کس طرح کو شش کرے۔ اتفاق سے اس کی توجہ میز پر پڑے ایک اخبار کی طرف منعطف ہو گئی۔ اس نے ورق گردانی شروع کر دی۔ وہ چونک پڑا۔ اخبار میں لکھا تھا ایک نئے محکمے کے لیے چند آسامیاں پر کرنے کے لیے گریجویٹوں کی ضرورت ہے۔

”یہ دیکھو۔“ اس نے محمود سے کہا۔ ”تم تو کہتے تھے نوکری ڈھونڈنے سے ملتی نہیں۔“

محمود ہنسا۔ ”خالی تو بیسیوں ہوتی ہیں روزانہ لیکن ملتی نہیں۔“

”میں عرضی دوں گا۔“ وہ بولا

”دینے کا کیا مطلب ہے۔“ محمود چلایا۔ ”انہوں نے تو لکھا ہے کہ عرضی لے کر خود آ جاؤ۔

وہاں سینکڑوں سفارشی ہوں گے۔ تمہیں کون پوچھتا ہے۔“

ایللی نے عرضی لکھی اور اسے لے کر خود اس محکمے میں جا پہنچا۔

محکمہ کا ڈائریکٹر ایک نوجوان ہندو تھا۔ اس نے ایللی کا بغیر جائزہ لیا۔ ”ہوں۔“ وہ بولا۔

”تو آپ الیاس آصفی ہیں؟“

”جی۔“ ایللی نے کہا۔

”اور آپ محکمہ تعلیم میں ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”کتنی نوکری کر چکے ہیں آپ محکمہ تعلیم میں۔“

”پندرہ سال۔“

”پندرہ سال کافی لمبا عرصہ ہے۔“

”جی۔“ وہ بولا۔

”لیکن آپ اس نوکری کو چھوڑنا کیوں چاہتے ہیں؟“

ایک ساعت کے لیے ایللی نے سوچا اور پھر فیصلہ کر دیا کہ وہ اسے سچی بات بتائے گا۔ بولا۔

”جناب محکمہ تعلیم میں میرے والد کا اثر و رسوخ ہے۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔“ وہ بولا۔

سکتے۔“ ایللی کو غصہ آ گیا بولا۔ ”یعنی آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھ میں اتنی قابلیت ہی نہیں کہ اوٹنی سی نوکری بھی کر سکوں۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”میاں تم اپنی قابلیت کے زور پر اوٹنی سے اوٹنی نوکری بھی نہیں کر سکتے صرف میری وجہ سے تم اتنے بڑے عہدے پر فائز ہو یہ سنا تم نے نصیر کی ماں کیا کہا ہے ہم نے۔ کیا کہتی ہے۔ کیا غلط کہا ہے۔ ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”یہ ایللی کیا نوکری کرے گا۔ اپنے بل بوتے پر۔ وہ ہم ہی تھے جو بغیر کسی کی مدد کے کسی واسطے کے اتنے سال نوکری کی اور عزت سے کی۔ کیا کہتی ہے۔“

ایللی کے دل میں ایک عزم بیدار ہو رہا تھا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا وہ خاموش عزم تقویت پکڑا گیا۔ ایللی کی تمام تر انا گویا احتجاج میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی وہ ایک مظلوم حبشی کی طرح تن گئی تھی۔ حبشی کی آنکھیں اپنے خاؤں سے باہر نکل آئی تھیں۔ گویا سو جا ہوا تھا۔ بازو تنے ہوئے تھے۔ توڑ دو توڑ دو۔ یہ زنجیر توڑ دو۔ اس کے جسم کے بند بند سے نعرے بلند ہو رہے تھے۔

ایللی نے اب تک اپنی اہمیت شنراؤ سے اخذ کی تھی۔ اسے وہ محبوبہ حاصل تھی جس کے لیے آصفی محلے کے تمام افراد چشم براہ تھے۔ لیکن اب اس کی موت کے بعد ایللی کے لیے کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر وہ اپنی اہمیت کو استوار کر سکتا تھا۔ علی احمد کی اس سرسری بات نے ایللی کی توجہ کو اس بات کی طرف منعطف کر دیا تھا۔ اسے اپنی قابلیت پر بڑا ناز تھا۔ وہ جملہ اساتذہ کو کمتر سمجھتا تھا۔ اس کی دیرینہ خواہش تھی۔ کہ اساتذہ کے جھرمٹ سے نکل جائے۔ ان کی زندگی کھوکھلی تھی۔ ان کی شخصیتیں بناوٹی اور رسمی تھیں۔ انہوں نے اخلاقیات کا خول پہن رکھا تھا۔ ان کا علم کتابی تھا۔ ہڈر، فکر کی ان میں صلاحیت نہ تھی۔

ایللی کا ارادہ پختہ ہوتا گیا۔ کہ وہ محکمہ تعلیم کو چھوڑ دے گا۔ جہاں اعلیٰ افسر علی احمد کے دوست تھے۔ وہ اپنا راستہ خود پیدا کرے گا۔

## رام گوپال

چند ایک روز کے بعد ایللی لاہور چلا گیا۔

لاہور میں اس نے محمود سے بات کی۔ ”یار کوئی نوکری تلاش کرنے آیا ہوں۔ میری مدد کرو۔“ وہ بولا۔ ”میں سکول کی نوکری نہیں کروں گا۔“



”جی۔“ ایلی نے کہا۔

”تو آپ وہ محکمہ چھوڑنا کیوں چاہتے ہیں؟“

”میں ایسے محکمے میں نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ جہاں بلا واسطہ اپنے بل بوتے پر ترقی حاصل نہ سکوں۔“

”کیوں۔“ ڈائریکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”کیا آپ کو معلوم ہے۔“ ڈائریکٹر نے کہا۔ کہ یہ آسامی جس کے لیے آپ نے درخواست ہے مستقل نہیں۔“

”جی۔“ وہ بولا۔

”اس میں پشش نہیں۔“

”جی۔“ وہ بولا۔

”آپ کی پندرہ سال کی نوکری بے کار جائے گی۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”معاف کیجئے گا۔“ وہ بولا۔

”میں آپ کو یہ آسامی دے کر آپ کا نقصان نہیں کرنا چاہتا۔“

”معاف کیجئے گا۔“ ایلی نے کہا۔

”میرا فائدہ اور نقصان میں بہتر سمجھتا ہوں۔“

”اچھا۔“ ڈائریکٹر نے کہا۔ ”تو آپ امتحان میں شامل ہو جائیے۔“

”امتحان۔“ ایلی نے دوہرایا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔

”ہم انڈیو پولیس گے۔ اگر آپ پاس ہو گئے تو میں آپ کا کیس رکنڈ کر دوں گا۔“

انڈیو کے بعد ڈائریکٹر نے ایلی کو بلایا۔ اور ایک ٹائپ شدہ کانڈ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

آفر ہے۔“ وہ بولے۔ ”اگر آپ کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ منظور ہے۔ تو آپ مجھ سے

کر سکتے ہیں۔ لیکن تب جب آپ یہاں جائن کرنے کے لیے آئیں۔“

”آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں بے حد شکر گزار ہوں۔“ ایلی نے جذبہ کی

ت سے انک انک کر کہا۔

”میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔“ ڈائریکٹر نے کہا۔

”میں تو سمجھتا ہوں۔“ ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

”آپ غلط سمجھتے ہیں۔“

”اتنے میں ایک چہرہ اسی کچھ کانڈات لے کر آ گیا۔

”ذرا ٹھہریے۔“ ڈائریکٹر نے ایلی سے کہا۔

”تشریف رکھیے۔ ایک منٹ۔“

کانڈات پر دستخط کر کے وہ ایلی کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں نے آپ پر احسان نہیں کیا۔“ وہ بولا۔ ”ان بچوں پر احسان کیا ہے جنہیں آپ

بھاتے ہیں۔“ ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ بچوں کو پڑھانے کے لیے بے حد ناموزوں ہیں۔“ وہ بولا۔ ایلی کی سمجھ میں نہیں آ

ہا تھا۔ کہ کیا کہے۔

”یہ درست ہے۔“ وہ بولا۔ ”کہ آپ ان میں فکر کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔ یہ بھی ج

ہے کہ آپ ان میں تحقیق کی سپرٹ بیدار کرتے ہیں۔“

”جی میں ———“ وہ گھبرا کر بولا۔

”سن لیجئے۔ ڈائریکٹر نے کہا۔

ایلی خاموش ہو گیا۔

”لیکن آپ کی تعلیم ان کے لئے سم قاتل ثابت ہوتی ہے۔ اور تمام دنیا حریف بن کر ان

کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔“ وہ رک گیا۔

پھر مسکرا کر بولا۔ ”آپ کی تعلیم کی وجہ سے میری زندگی میں بہت مشکلات پیدا ہوئیں۔

بلکہ میری بیشتر مشکلات کی وجہ آپ ہیں آپ۔“

ایلی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

ڈائریکٹر بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایلی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرا نام رام گوپال ہے۔ میں

آپ کا شاگرد ہوں۔

ڈائریکٹر نے تپاک سے ایلی سے ہاتھ ہلایا۔

ایلی کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔

کر اس نے پہلی مرتبہ شہزاد کو یاد کیا۔ شہزاد کی یاد اب اس کے ذہن میں گزشتہ تلخیوں سے بے تعلق تھی۔ جب بھی شہزاد کی یاد آتی تو وہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھتا اور اس کے دل میں عجیب سی خوشی پیدا ہوتی۔

لاہور میں اس کاموں زاد بھائی رفتی تھا۔ پھر فرحت بھی وہیں تھی۔ چونکہ اس کا خاوند اجمل لاہور کے ایک دفتر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اور حکومت کی وساطت سے انہیں مادھو محلہ میں ایک مکان مل گیا تھا۔ جہاں وہ رہتے تھے۔ ایللی فرحت کے پاس ٹھہرا تھا۔ اور ایک بار پھر اسے بھرے گھر میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ فرحت نے ایک بڑا سا کمرہ ایللی عالی اور ہاجرہ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔

ہاجرہ سے جب فرحت نے سنا کہ رنگی اور مانی ایللی کی شادی کے لئے کوئی رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں تو اسے بہت خوشی ہوئی۔ فرحت کو ایللی کی زندگی سے بے حد دلچسپی تھی۔ لیکن اس نے ایللی اور شہزاد کے تعلقات کے کبھی اچھی نگاہ سے نہ دیکھا تھا۔

ابھی ایللی کو لاہور آئے چند ایک روز ہی ہوئے تھے کہ مانی اور رنگی لاہور آ گئے۔ رنگی کے لئے لاہور ایک عظیم نعمت تھی۔ وہ وہاں آ کر بے حد خوش ہوتا تھا۔ اس لئے کہ خوبصورت اجمل اس کے نزدیک سب سے بڑی نعمت تھی۔ لاہور میں لباس تھا جو انی تھی۔ رنگ تھا۔ شوخی تھی۔ اور رنگی کے لئے یہی بہشت تھا۔

دو روز وہ اکٹھے سڑکوں پر گھومتے رہے۔ راگ دیا کی باتیں کرتے رہے۔ پتی اور شرمستی کے قصے دہراتے رہے۔ جب رنگی اور مانی جانے لگے تو دفعتاً رنگی بولا ”ایللی تمہارے لئے ایک ایسی بیوی تلاش کی ہے۔ جس کا جواب نہیں۔ وہ تمام خصوصیات اس میں ہیں جن کی تمہیں اشد ضرورت ہے شکل و صورت سے تو تم بے نیاز ہو۔ باقی رہی طبیعت تو جتناب ایسی نیک لڑکی ہمارے قصبے میں تو ہے نہیں کوئی۔ اور اس کا باپ ایک لاجواب مرد ہے۔ اس قدر شدت کی انفرادیت شاید ہی کسی میں ہو۔ جو منہ سے کہہ دیا پھر کی لکیر سمجھ لو۔ اور دیانتداری کی تو حد نہیں کوئی۔ بات کا پکا قول کا پورا اور رسمیات سے بیگانہ بالکل بیگانہ۔ وہ لوگ آکر تمہیں دیکھ لیں گے جیسے عام طریقہ ہے اور یہ بھی محض رسم ہے چونکہ لڑکی نکمت کی بچہن کی سہیلی ہے وہ اسے ذاتی طور جانتی ہے۔ بہر حال بات یہی سمجھو۔

”دیکھو بھائی۔“ ایللی نے کہا ”چاہے جو جی چاہے کہ میرے مرضی کے متعلق کوئی بات چسپا

”یہ بھی صحیح ہے۔“ رام گوپال بولا۔ ”میں نے آپ سے پایا بھی بہت کچھ ہے۔ بہت کچھ۔“

ایللی کے استغنیٰ پر اک شور مچ گیا۔ لالہ جی نے جوان کے ہیڈ ماسٹر تھے اپنا سر پیٹ لیا۔ وہ کو بار بار سمجھاتے کہ پندرہ برس کی نوکری کو یوں ٹھوکر مار کر چلے جانا عقل مندی نہیں۔ لہذا بھی حیران تھے۔ علی احمد نے سنا تو فوراً ایک خط لکھا۔ ”برخودار ایسی حماقت نہ کرنا ورنہ کی بھر بچھتاؤ گے۔ تمہیں مسٹر معروف سا افسر اعلیٰ کیس نہیں ملے گا۔ اس محکمے کو نہ چھوڑو۔ محکمہ تعلیم کا وزیر بھی میرا پرانا لنگوٹیا ہے۔ ایسی آسانیاں کیس دستیاب نہ ہوں گی۔“

لیکن ایللی نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔

صرف رضی رنگی اور مانی تھے۔ جنہوں نے اس کی ہمت بندھائی۔

رضی نے کہا۔ ”بھئی دانہ پانی کی بات ہے۔“

رنگی بولا۔ ”یار میں بھی اس محکمے کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ لیکن آج تک بات نہیں بنی۔ وہاں کے تو میرے لئے بھی کوشش کرنا۔“

”بڑا چھاکیا تم نے۔“ مانی بولا۔ ”شبلاش اپنا راستہ خود بناؤ۔ چاہے ناکامی ہی کیوں نہ ہو۔“ لاہور میں ایللی کی زندگی یکسر بدل گئی محکمہ بدلنے کی وجہ سے ماضی کی تمام تلخیاں گویا اس نامہ اعمال سے دھل گئیں۔ محکمہ تعلیم میں اس کے افسران اور رفقاء کار کسی نہ کسی حد اس کے گزشتہ کارناموں سے واقف تھے۔ اس کی ہر بات کا مضمون اس کی گزشتہ زندگی کے پود کے حوالے سے اخذ کیا جاتا تھا۔ اس کے خیالات اور جذبات بلا واسطہ کوئی حیثیت نہ دیتے تھے۔

اس محکمے میں وہ ماضی کے حوالے سے قطعی آزاد ہو گیا۔ اس کے علاوہ یہاں اس کے بہادر خیالات اور دکھلاوے کے تقدس سے بے نیاز تھے اگرچہ وہ مڈر ہو کر سوچ نہ سکتے تھے لیکن خیالات کے خلاف ان میں بغض نہ تھا۔ محکمہ تعلیم کو چھوڑ کر ایللی نے محسوس کیا جیسے وہ کچھ بڑے جوہر سے نکل کر دریا میں آپہنچا تھا۔ وہاں روانی تھی وسعت تھی اور جود نام کو نہ تھا۔

نئے محکمے میں آکر چند ہی روز اس نے محسوس کیا جیسے وہ پرانا ایللی نہ تھا۔ جیسے بچی ہوئی رنگی محض ایک خواب ہو۔

”میں نے کہا تھا۔“ شہزاد آکر مسکراتی۔ ”تمہاری زندگی پھر سے شروع ہوگی۔“ لاہور پہنچ

کر نہ رکھنا ایسا نہ ہو کہ بعد میں کہیں ہم سے دھوکا کیا گیا۔“

”یہ بات تم ہم پر چھوڑ دو۔“ مانی بولا۔

”نہیں یا یہ غلط ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”تم ہمارے رشتہ داروں اور برادری والوں کو نہیں جانتے۔“ مانی نے کہا۔ ”بے حد غلط

لوگ ہیں۔ پشت در پشت دو کانداری کرتے رہے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر روپیہ تک محدود ہے جس کے پاس روپیہ ہے وہ برا آدمی ہے۔ سب لکیر کے فقیر ہیں۔ ہریات قابل قبول ہے جس میں سے رسم کی بو آتی ہو۔ نئی بات الحاد ہے۔ نیا چین قابل تف ہے۔“ مانی شدت میں نہ جانے کیا کہتا گیا۔ رنگی مسکرا رہا تھا۔

ایللی سوچ رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ جس قصبے نے رنگی نکت اور مانی جیسے کروار پیدا کئے ہوں۔ وہ قصبہ ازلی طور پر رنگ سے خالی ہو یا زندگی سے محروم ہو ضرور مانی بڑھا کر بات کر رہا تھا۔ چونکہ مانی میں تو توازن مفقود تھا۔ اس میں جذبہ تھا۔ خلوص تھا خود پسندی کی دلی دلی جھلک تھی اور بے پناہ جرات تھی۔

شادی کے متعلق ایللی اب سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کا قائل نہ رہا تھا۔ زندگی میں بہت سی باتیں جو اس نے سوچ سمجھ کر کی تھیں ان کا انجام اچھا نہ ہوا تھا۔ عورت کے متعلق تو اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ چاند کی طرح ایک مخصوص پہلو آپ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ اور عورت میں کئی ایک پہلو ہیں۔ متبسم پہلو۔ متذبذب پہلو ”مجھے کیا“ اور وہ پہلو جس کے تحت شزاو نے اس شرابی کے متعلق کہا تھا۔ ”نہیں میں اسے معاف نہیں کروں گی۔ میرے سامنے بلک بلک کر گھٹ گھٹ کر مرے۔“

عورت کو پرکھنا ایللی کے خیال کے مطابق ناممکن تھا۔ عورت میں یہ صلاحیت تھی کہ سال با سال اپنا ایک مخصوص پہلو پیش کرے وہ سالہا سال تبسم پہلو پیش کر سکتی تھی کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں کتنی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر وہ ضرورت محسوس کرے تو تبسم ہی دکھائی دے گی۔ اور جب وہ سمجھے کہ اب ضرورت نہیں رہی تو حالات کے تقاضے سے بے نیاز ہو کر گھورتا شروع کر دے گی۔ یا بے پروائی اور بے نیازی کا جامہ اوڑھ لے گی۔ اس لئے عورت کو جانچنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا ایللی سمجھنے لگا تھا شادی ایک جوا ہے۔ چاہے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھیلو یا آنکھیں بند کر کے اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس نے یہ خواہش محسوس نہ کی

تھی کہ ہونے والی بیوی کو ایک نگاہ دیکھ لے یا ہاجرہ کو بھیج کر اس کے ذریعے معلومات حاصل کرے۔

### نامن پور

نامن پور ایک پرانا قصبہ تھا۔ جولاہور سے تقریباً ”تیس میل کے فاصلے پر واقع تھا نامن پور مغلوں کے زمانے میں آباد ہوا تھا۔ قصبے پر مغلوں کی سرشت تھی قصبے کے گرد چھوٹی اینٹ کی بنی ہوئی چار دیواری تھی۔ جس میں آٹھ دروازے کھلتے تھے۔ چار دیواری کے اندر تنگ و تاریک گلیوں اور چھوٹے چھوٹے تنگ گلی نما بازاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان تنگ گلیوں کے ارد گرد اونچی اونچی چوٹے کی عمارتیں تھیں حویلیاں تھیں۔ ادھر گئے زبوں کا احاطہ تھا ادھر سیدوں کا ہلی طرف دیوانوں کا۔

قصبے کے شمال مغرب میں ہندوؤں کا سینٹہ کنبہ آباد تھا۔ جن کی وجہ سے نامن پور مشہور تھا بٹوں کا یہ کنبہ نامن پور کا قدیم ترین کنبہ تھا۔ نامن پور کے گرد و نواح کے کھیت انہیں کی لیت تھے۔ سینٹہ حسین تھے، متحمل مزاج تھے اور دولت کی حفاظت کرنا جانتے تھے۔ سینٹوں کے بعد نامن پور کے نو مسلم مشہور تھے وہ سب دییش تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے۔ ان کا پیشہ بارت تھا۔ اور وہ قدیم زمانہ سے دو کانداری کرتے آئے تھے۔ ان دییشوں کی کئی ایک گوتیں ان پور میں آباد تھیں مثلاً ”کاپر تھے ناروج تھے ہنگا تھے چالیہ تھے۔ نامن پور اور اس کے جوار کے قصبوں اور شہروں میں ان کی دوکانیں تھیں۔ جنہاں وہ چھوٹے چھوٹے کاروبار کرتے۔ ان کا چند ایک لوگ ہندوستان کے دور و دراز کے شہروں میں جا کر پنجاب کی منسوعات بیچتے تھے۔ ایک ماہ شہروں کے چکر لگاتے اور پھر نامن پور میں لوٹ آتے تاکہ اگلے چکر کے لئے اشیاء اکٹم کریں۔

ان میں سے گنتی کے لوگ تعلیم یافتہ تھے۔ جنہوں نے کاروبار چھوڑ کر ملازمت اختیار کر لی لان کی تعداد بہت کم تھی۔

چالیہ گوش کے دییشوں کا سب سے بڑا گھرانہ آصف کا تھا۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود مف صاحب فکر تھے۔ اس کے فکر میں انفرادیت تھی۔ اور یہ انفرادیت صرف فکر کی حد تک طرز تھی۔ وہ سوچتے تھے اور اسے فوراً عمل میں لانے کے قائل تھے۔ فکر کی اس علوت کی

وجہ سے انہوں نے زندگی میں چند ایک اصول مرتب کئے تھے جن پر شدت سے پابند ہونے کے باوجود وہ اس بات کا احساس رکھتے تھے کہ زندگی اصول سے زیادہ اہم ہے۔

نامن پور میں لوگ آصف کی عزت کرتے تھے اور ان پر اعتماد رکھتے تھے۔ ہندو اپنی امانتیں آصف کے سپرد کر دیتے دیش اپنے جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے آصف کو بیچ بنانے پر خوشی محسوس کرتے لیکن آصف کے اپنے گھر میں ان کے خیالات کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ان کی بیوی کو ان کی رائے مشورے یا فیصلے پر قطعی اعتماد نہ تھا۔ گھر میں ہر بات پر انھیں جھاڑ جھٹ ہوتی تھی۔ جسے وہ سر جھکا کر سننے کے عادی ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے خیال اور رائے پر قائم رہتے اور وہی کرتے تھے جو ان کے خیال میں درست ہوتا۔

آصف نے زیادہ تر زندگی جنوبی ہندوستان کے ایک شہر میں گزاری تھی۔ جہاں ان کا ایک اعلیٰ قسم کا ہوٹل تھا۔ جس میں بڑے بڑے اہل کار اور یورپین آکر ٹھہرتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے وہ دوسروں کی بات غور سے سننے کے عادی ہو چکے تھے ان کی طبیعت میں اخلاق تھا تحمل تھا۔ اگرچہ اس کے ساتھ ہی وہ دہم کی بیماری میں مبتلا تھے۔ جو کافی شدت اختیار کر چکی تھی۔

تین بیٹوں کے علاوہ آصف کی ایک بیٹی بھی تھی۔ جس کا نام بلند بخت تھا۔ بلند بخت نے چند ایک جماعتوں تک مدرسہ میں تعلیم پائی تھی اور پھر آصف نے اسے مدرسہ سے اٹھالیا تھا چونکہ دستور کے مطابق نامن پور کے لوگ بچیوں کو زیادہ پڑھانے کے قائل نہ تھے۔ آصف خود تو تعلیم کے حق میں تھے ممکن ہے ان کی بیگم نے زبردستی بلند بخت کو کتب سے اٹھالیا ہو۔

بلند بخت ابھی عنفوان شباب میں ہی تھی کہ اسے ایک قریب رشتہ دار کے بیٹے سے منسوب کر دیا گیا۔ اور جلد ہی بڑی دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔

لڑکے نے دولہا بننے سے پہلے بار بار اپنے والدین کو کسلا دیا تھا کہ اس کی شادی نہ کی جائے چونکہ وہ شادی کے قائل نہیں۔ لیکن والدین نے اس کی بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ شاید وہ یہ سمجھتے رہے کہ لڑکا ویسے ہی اچکا پاتا ہے اس کے ذہن پر عورت کا ڈر حاوی ہے۔ آہستہ آہستہ مانوس ہو جائے گا۔ یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس سالن کو دیکھ کر جو آصف جیز کے مشتاق تھے لڑکا چاہے قاتل ہو یا نہ ہو۔ سالن پر قبضہ جمانے کے تو وہ قاتل تھے۔ لہذا انہوں نے لڑکے کی بات نہ سنی۔

بلند بخت شب عروسی میں دولہا کا انتظار کرتی رہی۔ دولہا کے والدین اسے ڈھونڈتے رہے۔

آخر بات نکل گئی کہ دولہا غائب ہے۔ بلند بخت نے سنا تو اسے ایک دھچکا لگا۔ اس کی حیات منجمد ہو گئی۔ نسائی تقاضوں کے راستے مسدود ہو گئے۔ نسائی ایک زبردست بیچاں سے ٹکرائیں اور حیات کا وہ فیروزہ ہمیشہ کے لئے اڑ گیا۔ جو اس کی نسائی زندگی میں تحریک پیدا کر سکتا تھا۔ اگلے روز اس کے والدین بلند بخت کو اپنے گھر لے گئے۔

پہلے تو مہوم سی امید باقی تھی۔ کہ شاید دولہا کسی روز گھر واپس آجائے پھر جوں جوں وقت گزر گیا مہوم سی گہری ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ سات سال گزر گئے۔

دیش لوگوں میں طلاق کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان کے نزدیک طلاق کا لفظ گالی کے مترادف تھا۔ وہ اسے منہ پر لانے والا برداری میں ہمیشہ کے لئے اپنی عزت کھو دیتا تھا۔ لہذا بلند بخت کی دوسری شادی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

بلند بخت نعمت کی سہیلی تھی اور نعمت رنگی اور مانی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے یا شاید نفرتی طور پر نامن پور کی عورتوں سے ہٹ کر تھی۔ ہاجرہ کی بات سن کی اسے فوراً بلند بخت کا خیال آیا تھا۔ رنگی نے اس بات میں اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ اور مانی عملی طور پر اس سلسلے میں کوشش کرنے کے لئے بے تاب ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے مل کر برداری میں بات چلا دی۔ اور کچھ حیرت کچھ تعجب اور عورتوں کے ناک بھوں چڑھانے کے بعد بلند بخت کو طلاق ہو گئی۔ ایک مختصر سی رسم کے بعد بلند بخت کا ایللی سے عقد ہو گیا۔ اور وہ ایللی کے گھر آ گئی۔ اور ایللی نے دیکھا کہ اس کے گھر ایک لاش پڑی ہے اور زندگی بھر اسے ایک لاش اٹھائے پھرنا ہے۔

بلند بخت کو دیکھ کر ایللی کو ایک دھچکا لگا۔

اگرچہ وہ اس بات پر مصر تھا کہ کسی نو جوان لڑکی سے اس کی شادی نہ کی جائے۔ بظاہر وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی بیوی حسین نہ ہو۔ رنگین نہ ہو۔ اس وقت اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ شدت بھری زندگی بسر کرنے کے بعد وہ تھک چکا تھا۔ آکتایا ہوا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش سکون و اطمینان تھا۔ اس کے علاوہ اسے یقین تھا کہ وہ عالی کے لئے شادی کر رہا ہے۔ اگر اس کے گھر میں حسین و جمیل بیوی آگئی تو ممکن ہے وہ اپنی بیوی میں اس حد تک کھو جائے کہ قریب ہی عالی بے توجہی کی گود میں پڑا بلکتا رہے اور اسے خبر بھی نہ ہو کہ وہ بلک رہا ہے۔ رو رہا ہے۔ پریشان حال ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود بلند بخت کو دیکھ کر ایللی کو ایک دھچکا لگا۔

لیکن جلد ہی اس نے جواز پیدا کر لیے شاید یہی مناسب تھا کہ بلند بخت اس کی بیوی بنے۔  
 جیون ساتھی نہ بنے۔ ورنہ عالی تنہا رہا جاتا۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ  
 ضرور اس میں قدرت کا ہاتھ ہے۔

دقت یہ تھی کہ بلند بخت اس گزشتہ سانحہ کی وجہ سے بالکل ہی مایوس ہو چکی تھی۔

بلند بخت کے خیالات بے حد پاکیزہ تھے لیکن یہ پاکیزگی رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑی  
 ہوئی تھی۔ اس کے شانوں پر سر نہیں بلکہ ایک پھوڑا تھا جس میں مسلسل درد رہتا تھا۔ اس کی  
 سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ خاوند اس سے دور رہے بلند بخت کی آمد پر ایللی نے ایک مکان  
 کرائے پر لے لیا اور ایللی اور عالی فرحت کا گھر چھوڑ کر اپنے گھر میں منتقل ہو گئے۔

## مشکلات

ایللی کو سیاست سے قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی۔ اخبار تو وہ پڑھتا تھا لیکن سیاسی خبروں کے  
 متعلق اسے دلچسپی نہ تھی۔ صرف سرخیاں پڑھ کر مطمئن ہو جاتا۔

جب ہندوستان کی آزادی کی آواز بلند ہوئی تو ایللی کو بے حد خوشی ہوئی تھی وہ چاہتا تھا کہ  
 اس کا ملک آزاد ہو جائے۔ اور کوئی بیرونی طاقت اس ملک پر مسلط نہ رہے۔ ایللی کے دل میں ان  
 مجاہدوں کے لئے احترام تھا جو آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ ہندوستان کے لیڈروں پر ناز کرتا  
 تھا۔ مثلاً "مہاتما گاندھی پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح۔ اس کے باوجود اس نے کبھی کسی  
 سیاسی مجلس میں حصہ نہ لیا تھا۔ اور نہ ہی ان محبوب لیڈروں کو کبھی دیکھا تھا۔ حالانکہ اس زمانے  
 میں سیاسی بیداری بڑھ چکی تھی۔ اور لوگوں کے دلوں میں سیاسی جذبہ یوں لہریں لے رہا تھا کہ  
 ذاتی مسائل بھی پس پشت پڑ چکے تھے۔

پاکستان کے قیام کا سوال ان دنوں پیش پیش تھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی دھوم مچی ہوئی  
 تھی یوپی کے مسلمان پاکستان کے لئے سردھڑکی بازی لگائے بیٹھے تھے علی گڑھ یونیورسٹی میں علم و  
 ادب کی جگہ سیاست کا ایال آیا ہوا تھا۔

لیکن ایللی اس جھگڑے سے بالکل بے گانہ تھا۔ وہ پاکستان کے حق میں نہ تھا۔ وہ پاکستان کے  
 خلاف بھی نہ تھا۔ اس نے کبھی اس مسئلے کو اہمیت ہی نہ دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کو  
 آزادی مل جائے۔ اور لوگوں کی اور ملک کی اس میں بہتری ہے تو پاکستان کا قیام عمل میں آ

جائے۔ بہر حال وہ ہر اس بات کا طرف دار تھا۔ جو عوام اور ملک کی بہتری کے لئے تھی۔ لیکن وہ  
 یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ملک کی بہتری کس بات میں ہے۔

پنجاب کے مسلمان پاکستان کے حق میں تھے۔ اس وجہ سے کبھی کبھار اس کے دل میں بھی  
 پاکستان کے لئے جذبہ پیدا ہوتا۔ لیکن وہ جذبہ محض وقتی ہوتا۔ یا کبھی کبھار بیٹھے بیٹھائے اس کے  
 روبرو دھرم سالہ کا سکول ابھرتا۔ چھٹی جماعت کا لڑکا رام لال اس کے سامنے آکھڑا ہوتا۔ "رام  
 لال مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔" ایللی کہتا۔ "رام لال کی گردن جھک جاتی اور وہ چپ چاپ جوں کا  
 توں کھڑا رہتا۔ "رام لال۔" ایللی چلاتا۔ "تم سے کیا کہہ رہا ہوں۔" جی میرا دھرم بھرشت ہو  
 جائے گا۔" رام لال جواب دیتا۔ "بے وقوف لڑکے۔" ایللی ہنستا۔ "اگر تم میرے ہاتھ کا پانی پیو تو  
 دھرم بھرشت ہو گا۔ اگر تم مجھے پانی لا دو تو تمہارا دھرم کیسے بھرشت ہو سکتا ہے۔" رام لال اسی  
 طرح گردن جھکائے کہتا۔ "جی میرا دھرم بھرشت ہو جائے گا۔"

پھر اس کے روبرو دھرم سالہ کا پڑوسی آکھڑا ہوتا۔ "جی میرا نام رام دین ہے۔"

"رام دین؟"

"جی میں بھگوان کی دیا سے مشلمان ہوں۔"

"مشلمان۔"

"جی جی۔"

پھر ایللی کی نگاہ میں رام دین کی کنیا ابھرتی۔ وہ چونکا۔ وہ پوتر گوبر کا ڈھیر کارنس پر دھری ہوئی  
 مورتیاں۔

"جی میں مشلمان ہوں۔" رام دین چلاتا۔ اور پھر تمام ہندوستان کے مسلمان اس کے  
 سامنے قطار باندھ کر کھڑے ہو کر چلائے۔ "جی میں بھگوان علی ہوں۔ جی میں کرشن اللہ ہوں۔ جی  
 میں غلام گرد ہوں۔ ہم مشلمان ہیں۔" وہ چلائے۔ "پاکستان زندہ باو پاکستان زندہ باو۔" اس کے  
 دل میں کوئی نعرے لگتا۔ لیکن جلد ہی ایللی چونکتا۔ "نہیں نہیں" وہ چلاتا۔ اگر رام لال اس قدر تنگ  
 خیال واقع ہوئے ہیں کہ کسی کو پانی پلانے سے ان کا دھرم بھرشت ہو جاتا ہے۔ یا وہ اپنے  
 درمیان رہنے والے اکے دے مسلمان کو رام دین بنا دیتے ہیں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ  
 ہندوؤں کے خلاف ایسے بغض پال کر میں بھی رام لال بن جاؤں۔ نہیں نہیں وہ چلاتا۔ ان باتوں  
 پر ہندوؤں کے خلاف تعصب پال لینا اچھا نہیں۔

انہوں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ بازار میں ایک آنکھ کھڑا تھا زمین پر تانگے والے کی لاش بچ رہی تھی۔۔ پاس ہی ایک ہندو بڑھیا چلا رہی تھی۔ اے تمہیں بھگوان کا ڈر نہیں کیا بیچارا مجھے بچا بچا کر لایا تھا۔ کتنا تھاں جی میں لے جاتا ہوں چاہے میری جان جائے پر تم پر کوئی انگلی نہ اٹھائے گا۔ ہائے جالمو یہ کیا کیا تم نے۔“ وہ رو رہی تھی بین کر رہی تھی۔

فرحت گھبرا گئی اجمل باہر دورہ پر گیا ہوا تھا۔ گھر میں صرف عورتیں اور بچیاں تھیں۔ اکیلا اہلی انہیں سنبھال نہیں سکتا تھا۔ اہلی کا اپنا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ نہ جانے انہیں جانا چاہیے یا نہیں مگر ہے وہ وہیں گھر میں محفوظ ہوں۔ لیکن شام پڑ چکی تھی۔ اور پھر رات کے وقت نہ جانے کیا ہو۔ اسے اسی وقت ایک فیصلہ کرنا تھا۔

یعنی اس وقت دروازہ بجا۔

اہلی گھبرا گیا۔ شاید وہ آگئے۔ شاید انہوں نے بلہ بول دیا ہے۔

”کون ہے؟“ اس نے دروازہ کھولے بغیر پوچھا۔

”میں ہوں۔ مانی۔ کھولو جلدی۔“

”مانی ———“ اہلی مانی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

جلوس کو دیکھ کر مجھے فوراً بہن فرحت کا خیال آیا مانی اندر داخل ہو کر چلانے لگا۔

”چلو چلو۔“ وہ چلایا۔ ”آ جاؤ آ جاؤ۔ سب آ جاؤ ڈرو نہیں۔“

”لیکن اہلی بولا۔“ باہر وہ سب کھڑے ہیں۔ اگر ———“

مانی سن کر چلایا۔ ”ان کی ایسی جیسی۔ لالے وہ کیا بگاڑیں گے ہمارا۔ چلو میسرہ۔“

”لیکن ٹھہرو وہ سونا دے دو مجھے۔ بس ٹھیک ہے چار پانچ کو مارے بغیر تو نہیں مروں گا تم۔ جب تک تم انہیں نکال کر لے جانا۔ آ جاؤ آ جاؤ۔“ وہ خوشی میں چلایا۔ وہ سب چل پڑے۔

چوک میں ہندوؤں کے جمختوں نے ان برقعہ پوش عورتوں کی طرف دیکھا۔

مانی نے لٹھ لہرائی اور نعرہ لگایا۔

وہ آپس میں کھسک پھرنے لگی۔

مانی لٹھ لہرائے جا رہا تھا۔ ”جاؤ چلتے جاؤ۔“ وہ اہلی کی ہمت بڑھا رہا تھا۔

ایک نوجوان ان کی طرف بڑھا۔

اگرچہ اسلام کے اصولوں کا وہ مداح تھا اور فلسفہ مذہب کے مطابق اسلام کی عظمت کا قائل تھا۔ لیکن یہ احساس محض ذہنی تھا۔ جس کا عکس اس کے جذبات پر نہیں پڑتا تھا۔

ایک روز جب وہ لاہور کی مال روڈ پر گھوم رہا تھا تو دفعتاً ”ایک شور بلند ہوا۔ وہ رک گیا۔ ل روڈ پر ٹہلنے والے سبھی لوگ چونک پڑے۔ ہندو اور سکھوں کا ایک جم غیر مال روڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں تنگی تلواریں تھیں جنہیں وہ لہرا رہے تھے۔ عورتیں سر پیٹ رہی تھیں۔ بین کر رہی تھیں۔ وہ سب اسمبلی چیمبر کی طرف بھاگ رہے تھے اور پاکستان مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔

اس جلوس میں ایک شدت تھی اشتعل تھا۔ ایک وحشت تھی جس میں تشدد کی واضح ہشمت تھی لوگ حیرت سے اس دوڑتے ہوئے تشدد بھرے مجمع کو دیکھ رہے تھے۔ پھر دیکھنے والوں کے دلوں میں ایک خوف ابھرا اور وہ اپنے اپنے گھر کی طرف بھاگے۔ اہلی چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔

”اجی صاحب میری بیٹی تو ہندوؤں کے محلے میں رہتی ہے۔“ کوئی اس کے قریب کہہ رہا تھا۔

”یہ تو ہمیں میں چنگاری ڈالنے والی بات ہے۔“

”ظاہر ہے کہ سمجھ بوجھ پلان کے مطابق ہو رہا ہے۔“

”نہ جانے کس وقت خون کی ندیاں چل لگیں۔“

”بھئی میں جا کر بیٹی کی خبر لیتا ہوں۔ حالات نازک ہیں۔“

حالات نازک ہیں۔ حالات نازک ہیں۔ اہلی کے سر پر ہتھوڑے سے چل رہے تھے دفعتاً

اسے فرحت کا خیال آیا۔ ارے فرحت بھی تو مادھو پورہ میں رہتی ہے جہاں ہندوؤں کا گڑھ ہے

وہ بے سوچے سمجھے مادھو پورہ کی طرف بھاگا۔

مادھو پورہ کے بڑے بازار میں لوگ یہاں وہاں گروہوں میں کھڑے تھے ان کے تیور اچھے نہ تھے۔

پیشانیوں سے تشدد بھرے ارادے ظاہر ہو رہے تھے ہر آتے جاتے کو مخدوش اور مشکوک

نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اہلی آنکھ بچا کر چوہا بے پر چڑھ گیا۔

”چلو فرحت۔“ ”اوہ بولا“ ”یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں چلو میرے گھر چلو۔“

ابھی وہ تیار ہی نہ ہوئے تھے کہ نیچے بازار میں شور مچ گیا۔ پکڑ لو۔ پکڑ لو۔ جانے نہ پائے۔

مانی نے ایک چنگاڑ ماری۔ ”مولا علیؑ“ اور لاشی تمھانے لگا۔  
وہ گھبرا کر پرے سرک گئے۔

”جلدی چلو جلدی چلو۔“ ایلی عورتوں کو ہانک رہا تھا۔

”آ جاؤ آ جاؤ۔“ ایک بوڑھا تانگے والا چلایا ”آ جاؤ۔“ اس نے برقعہ پوش عورتوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اللہ اپنا فضل کرے۔“ وہ بھول چکا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور ہندو محلے میں کھڑا چلا رہا ہے۔

پھر وہ سب تانگے میں سوار تھے۔ اور تانگہ بھاگ رہا تھا۔

”اجی صاحب۔“ بڑھا کہہ رہا تھا۔ ”سارے شہر میں چھری چل رہی ہے۔ سڑکوں پر لاشیں پڑی ہیں۔ خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ آگ لگ گئی ہے شہر میں۔ اللہ اپنا فضل کرے انہوں نے سوائے شیروں کو جگایا ہے۔ ہمیں لکارا ہے انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ اللہ فضل کرے۔ اللہ فضل کرے۔“

### پاکستان زندہ باد

اس جلوس کے بعد شہر میں ایک طوفان آگیا۔ چھرا گھونپنے کی وارداتیں شروع ہو گئیں۔ محلوں میں جانا خطرناک ہو گیا۔ حتیٰ کہ سڑکوں پر چلنا بھی خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ ایک روز جب ایلی شام کے وقت گھر آ رہا تھا تو مزگ کے نوجوان چھو کرکوں نے اسے روک لیا۔

”اے او۔“ ایک نے لکار کر کہا۔

ایلی نے ان کی لکار کی پرداہ نہ کی۔

”پکڑ لو۔ پکڑ لو۔“ وہ چلائے۔ انھوں نے اس کی سائیکل روک لی۔

ایلی کو غصہ آگیا۔ غالباً اس لئے کہ وہ مسلمان تھا اور مسلمان محلے میں پکڑا گیا تھا۔

”اے کون ہے تو؟“ ایک لڑکے نے چلا کر کہا۔

”مجھے اس سے کیا۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”میں کہتا ہوں یہ ہندو ہے۔“ ایک بولا۔

”پھر تجھے کیا تکلیف ہے۔“ ایلی چلایا۔

”پکڑ لو پکڑ لو۔“ وہ سب اس کی طرف بڑھے۔

”بڑے مجاہد بنے پھرتے ہو۔“ ایلی چلانے لگا۔ ”اللہ اور محمدؐ کی خدمت کر رہے ہو نا۔“

”اے مسلمان ہے یہ۔“ ایک بولا۔

”نہیں نہیں بچنے کے لیے اللہ کا نام لیتا ہے۔“ دوسرا بولا۔

”کلمہ پڑھ ایک چلانے لگا۔

”اللہ کا نام نہ لیتا تو اب تک ڈھیر ہوتا۔ میرا ہاتھ رک گیا۔“ ایک غنڈہ بولا۔

ایلی نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کمانی دار چاقو ہے۔

اس روز ایلی نے محسوس کیا کہ وہ مسلمان تھا۔ سیاسی خیالات کا سوال نہ تھا۔ مسلم لیگی اور کانگریس کا سوال نہ تھا۔ یہ سوال نہ تھا کہ آیا وہ اسلام سے واقف ہے۔ آیا وہ شریعت کا پابند ہے یہ سوال نہ تھا کہ آیا رام دین سا مسلمان ہے یا محمد علی سا۔ سوال صرف یہ تھا کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو۔ اس روز جب وہ مادھو پورہ سے باہر نکلے تھے تو ہندوؤں کے گروؤں کے گروہوں نے بھی یہ نہ سوچا تھا کہ آیا وہ نیشنل نقطہ نظر کے حامل تھے۔ یا مسلم لیگی۔ آیا وہ پاکستان کے حق میں تھے یا پاکستان کے قیام کے خلاف تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ صرف مسلمان تھے۔ تانگے والے کے پیٹ میں چھرا گھونپنے وقت بھی ہندو بڑھیا کے چلانے کے باوجود انہیں یہ احساس نہ ہوا تھا کہ تانگے والا ہندو ماتاجی کو مسلمان غنڈوں سے بچا بچا کر مادھو پورہ میں لایا تھا۔ اور اس نے ماتاجی کو یقین دلایا تھا کہ وہ ماتاجی کو بچانے کے لئے اپنی جان تک دے دے گا۔ چاہے وہ ماتاجی کو بچا کر لایا تھا۔ چاہے ہندوؤں کی خدمت کی تھی — لیکن وہ مسلمان تھا اس لئے انہوں نے اس کے پیٹ میں چھرا جھونک دیا تھا۔

ایلی نے محسوس کیا کہ وہ مسلمان ہی نہیں وہ بذات خود پاکستان ہے۔ چاہے وہ پاکستان کے حق میں تھا۔ یا خلاف چاہے وہ اسلام سے بیگانہ تھا چاہے وہ مذہبی تعصب سے بے نیاز تھا۔ وہ بذات خود پاکستان تھا۔ اس کے دل میں کوئی چلا رہا تھا پاکستان زندہ باد۔

### بالادب

ایلی کے تمام تر خیالات درہم برہم ہو رہے تھے۔ اس کا ذہن گویا از سرنو ترتیب پا رہا تھا۔ پرانے خیالات کی اینٹیں اکھڑی جا رہی تھیں۔ نئی اینٹیں نہ جانے کہاں سے آگئی تھیں اور اس



ٹوپی والا کھڑا تھا جس کے ساتھ دراز قد تھا دونوں داتا سے اس کی سفارش کر رہے تھے۔  
اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ داتا صاحب سے کیا کہے۔ دفعتاً حاجی صاحب آگئے ان کا  
سر روئی کے گالے کی طرح مل رہا تھا۔ ”وقت آئے گا وقت آئے گا۔“  
وہ دبی دبی زبان سے کہہ رہے تھے۔  
”تمہاری نئی زندگی شروع ہوگی“ شہزاد مسکرا رہی تھی۔ ”نیا بیون۔“  
”وہی کرنے والا ہے وہی کرنے والا ہے۔“ پاک بابا چلا رہا تھا پھر ایل کی نگاہوں تلے ایک  
کنواں ابھر آیا۔ اس کے قریب ہی سفید چار اوڑھے ایک مسجد چپ چاپ آ بیٹھی۔ پھر ایک چار  
دیواری ابھری تھی اور اس چار دیواری کے اندر ایک قسمہ روشن ہو گیا۔  
داتا مسکرا رہے تھے۔

### پریتیمیاں

جب وہ واپس آ رہا تھا تو راستے میں ناظم کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ ناظم اسے دیکھ کر یوں  
کھل گیا ہے۔ جیسے مٹھاس کی وجہ سے خروڑہ پھوٹ جاتا ہے۔ ”میں تمہارے دفتر سے آیا  
ہوں۔“ وہ بولا۔ ”مج سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔“ ”مج سے۔“  
”تم یہاں کیسے؟ ایل نے پوچھا۔  
”میرا تالوہ ہو گیا ہے یہاں۔“ وہ بولا۔ ”بڑے دفتر ہیں۔“  
”اچھا۔“  
”اب میرے ساتھ چلو۔“ وہ بولا۔  
”ارے کہاں؟“  
”بس آ جاؤ۔ آ جاؤ شاید وہ مل جائے۔“ ناظم بولا۔  
”کون مل جائے؟“  
”بھئی وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“  
”کون انتظار کر رہی ہے۔“  
”تم آؤ تو۔“ وہ بولا۔  
”پھر بھی۔“ ایل نے اس کی منت کی۔ ”میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ لیکن کچھ بتاؤ تو

من میں آپ ہی آپ لگی جا رہی تھیں۔  
اسی روز شام کو دفتر سے آتے ہوئے وہ ان جانے میں اندر کھلی کی طرف گھوم گیا۔ حالانکہ  
ادھر کوئی کام نہ تھا۔ اور ان دنوں بے کار گھومنے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا چونکہ شہر میں  
زی کی وارداتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اور ادھر ادھر گھومنا خطرے سے خالی نہ تھا۔  
کچھ دیر وہ اندر کھلی میں گھومتا رہا پھر سرکلر روڈ کی طرف چل پڑا اور آخر کار اس نے دیکھا کہ  
صاحب کے مزار کے باہر کھڑا ہے۔  
داتا کے مزار پر وہ کئی مرتبہ گیا تھا چند ایک بار وہ مزار کے اندر بھی داخل ہوا تھا لیکن جب  
ر جاتا تو اس کی توجہ ان عورتوں کی طرف منعطف ہو جاتی جو بن سنور کر داتا کے دربار میں  
ہوتی تھیں۔ اور وہاں پہنچ کر اپنی نمائش کرنے کے خیال سے ادھر ادھر گھوما کرتی تھیں ہیرا  
کی طوائفیں ان دنوں داتا کی بڑی متوال تھیں۔ کیوں نہ ہوتیں۔ وہاں جانے سے ان کا  
حباب وسیع تر ہوتا تھا۔  
یہ درست ہے کہ ایل عورتوں کو دیکھنے کی غرض سے وہاں کبھی نہ گیا تھا۔ لیکن وہاں پہنچ کر  
نے عورتوں کے سوا پھر وہاں ملنے تھے جو طوائف کی طرح اپنی نمائش کرنے میں مصروف  
تھے مزار کی جالی کے گرد کھڑے لوگوں کو ہاتھ اٹھائے دیکھ کر ایل کے ہونٹ نفرت سے بڑھ  
تے ضعیف الاعتقاد لوگ۔!

اس روز داتا صاحب کے مزار کے باہر اس کے خیالات کا رنگ کچھ اور ہی تھا۔  
پاک بابا سامنے محراب کے نیچے کھڑا تھا۔ ”کیا نہیں کیا۔ کیا نہیں کیا۔“ وہ چلا رہا تھا۔ ”سب  
کیا سب کچھ کیا۔ کیا نہیں کیا۔ اور تمہیں داتا کے قدموں میں لا کھڑا کیا۔ کیا نہیں کیا کس  
تمہاری حفاظت نہیں کی۔ مادھو پورہ سے کس نے نکالا۔ مزنگ میں کس نے بچایا۔ وہی  
نے والا ہے وہی سب کچھ کرتا ہے۔ میں کیا ہوں۔ میں کیا ہوں۔“ وہی کرنے والا  
”  
ایل محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خود نہیں آیا ہو بلکہ اسے بلایا گیا ہو اور اندر داتا اس کا انتظار کر  
ہوں۔ وہ سر جھکائے جا رہا تھا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس وقت وہ یہ نہیں محسوس کر  
تا کہ وہ مجرم ہے یا گنہگار ہے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ خوش نصیب ہے اور اسے شاہ کے  
میں کھڑے ہونے کا موقع ملا اس کا سر جھک گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ نگاہوں تلے روئی

”ناظم صاحب آپ کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔“ پریتیاں طنزہ انداز سے مسکرائی۔  
 ”ان کا حسن ظن ہے۔“  
 ناظم نے غصے بھری نگاہ ڈالی۔

### آئیڈیا

”مجھے ایک آئیڈیا کی تلاش ہے۔“ پریتیاں بولی۔  
 ”جی۔“ وہ بولا۔  
 ”ممکن ہے آپ میری مدد کر سکیں۔“  
 ”اس وقت شاید یہ ممکن نہ ہو۔“ ایللی نے جواب دیا۔  
 ”کیوں۔“ وہ بولی۔  
 ”اس کی ایک وجہ ہے۔“

”اچھا۔“ وہ بولی۔ ”گزشتہ دو روز سے میں چار ایک اصحاب سے ملی ہوں لیکن بات نہیں  
 بنی۔“

”کیا وہ لوگ آپ سے ملے تھے۔“ ایللی نے پوچھا۔  
 ”ہاں ہاں وہ مجھ سے ملے تھے۔“  
 ”اور وہ آپ کو آئیڈیا نہیں دے سکے؟“  
 ”بالکل نہیں دے سکے۔“  
 ”وجہ ظاہر ہے۔“ ایللی نے کہا۔  
 ”کیا مطلب۔“ وہ بولی۔ ”میں سمجھتی نہیں۔“

”دیکھئے شرمیتی۔“ ایللی نے کہا۔ ”آپ موجود ہوں تو کوئی دوسرا آئیڈیا نہیں آتا۔“  
 پریتیاں کے چہرے پر رنگ پھیل گیا۔ ایک چمک لرائی۔ ”کیا مطلب؟“ وہ بولی۔  
 ”مطلب یہ۔“ ایللی نے کہا کہ ”آپ مرکز بن جاتی ہیں۔“  
 ”عجیب بات کی ہے آپ نے۔“ وہ مسکرائی اور پہلی مرتبہ طنز و تحقیر کے بغیر اس کی طرف  
 دیکھا۔

”دراصل ”وہ بولی۔“ مجھے اپنے نئے فلم کے لئے ایک آئیڈیا چاہئے۔“

”جی۔“  
 ”بھئی وہ آندھرے فلم کمپنی کی مالک ہے۔“  
 ”ارے اسے مجھ سے کیا کام؟“  
 ”میں نے کہا تھا اس معاملے میں میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ البتہ میرا ایک دوست ہے  
 ۔“

”تو اس نے کہا مجھے اس سے ملا دو۔“  
 ایللی حیران تھا ناظم کیسی باتیں کر رہا ہے۔  
 ”اب اس سے بات کر لو چل کر۔“ ناظم مسکرایا۔  
 ”لیکن کس سلسلے میں۔“ ایللی نے چڑ کر کہا۔  
 ”بھئی اسے اپنی فلم کے لئے ایک آئیڈیا چاہئے۔“ وہ بولا۔  
 ”آئیڈیا۔“ ایللی کا ذہن اس وقت بالکل خالی تھا۔  
 ناظم زبردستی اسے بریگیٹسٹا ہوٹل میں لے گیا۔ جہاں پریتیاں ٹھہری ہوئی تھی۔  
 وہ نے اندر اپنا کارڈ بھیجا اور انتظار کرنے لگے۔

کچھ دیر کے بعد پریتیاں نے انہیں اندر بلا لیا۔  
 وہ ایک بنی سنوری ہوئی مینار عورت تھی۔ جیسے چینی کی گڑیا ہو۔ ان کے روپرو بیٹھے ہوئے  
 لمبی ادارے کی مالکہ کم دکھائی دیتی تھی۔ عورت زیادہ ایللی کی طرف دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر  
 ساقسم لہرایا۔ جس میں طنز کی جھلک تھی۔  
 ”آپ الیاس آصفی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”جی ہاں۔“ ایللی نے جواب دیا۔  
 ”کیا آپ کو فلم سے دلچسپی ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”دیکھتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”صرف۔“  
 ”فلم سازی سے واقفیت ہے کیا؟“ وہ بولی۔

”جی نہیں۔“  
 ”فلمی کہانی کبھی ہے کبھی؟“  
 ”جی نہیں۔“

آپ کو پانچ سو روپیہ ماہوار دے سکتی ہوں۔“

ناظم خوشی سے جھوم اٹھا۔

”میری رائے مانیں تو یہ آفر منظور کر لیجئے۔“ پریتماں نے کہا۔ ”آپ کی آمد کا کرایہ میرے ذمے رہا۔“ اس نے سو سو کے پانچ نوٹ بڑے سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔

”جب بھی آپ کا جی چاہے آجائیے۔“ وہ نہایت دلنوازا انداز سے مسکرائی۔

”ہم آپ کا انتظار کریں گے۔“

پریتماں کی آفر نے ایللی کی زندگی میں پہل پیدا کر دی۔ اسے یہ خیال بھی نہ تھا کہ فلم میں کام کرنے کا موقع ملے گا۔ پانچ سو۔ اسے یقین نہیں آتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ملاقات محض ایک خواب تھی۔ ابھی اس کی آنکھ کھلے گی اور وہ دیکھے گا کہ وہ کانڈ جو پریتماں نے اسے دیا تھا ایک سادہ ورق ہے۔

ناظم اسے اکسا رہا تھا:

”خمس جانا چاہئے۔ فوراً چلے جانا چاہئے۔ بمبئی کے سٹوڈیو میں کام کرنے کا چانس ہاتھ سے گنوانا عقلمندی نہیں۔“

مانی اس کے ساتھ جانے پر تیار تھا۔ وہ یونٹ کی نوکری سے استعفیٰ دے چکا تھا چونکہ اسے انجینئر اعلیٰ کی بیگم اور بیٹیوں سے وحشت ہونے لگی تھی۔

مانی نے ایک سکیم مرتب کر لی تھی۔ ایک ناشر سے معاملہ طے کر لیا تھا کہ بمبئی جا کر وہ اعلیٰ بیگم پر ایک فلمی رسالہ جاری کرے گا۔

بلند بخت اس آفر اور اس کے نتائج سے متعلق بے پروا تھی۔ اسے احساس نہ تھا کہ ایسی آفر کا مطلب کیا ہے؟

ہاجرہ خوش تھی: ”ہاں ہاں چلے جاؤ۔ سنا ہے بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ اگر کام چل نکلا تو بڑی تنخواہ پاؤ گے۔“

ایللی تیار ہو گیا۔

اس نے بلند بخت کو نامن پور بھیج دیا۔ ہاجرہ اور عالی کو علی پور چھوڑا۔ ان دنوں تقسیم کی بات زبان زد غلق تھی۔ پنجاب کے مسلمانوں کو خطرہ تھا کہ کیس لاہور ہندوستان کا حصہ نہ بن جائے کیونکہ علی پور ضلع گورداسپور میں واقع تھا اور گورداسپور میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس

”کس قسم کا آئیڈیا۔“

”میں عورت اور مرد کی زندگی کا کمپیوٹ کرنا چاہتی ہوں۔“

”آپ کا مطلب ہے موازنہ۔“ ناظم نے کہا۔

”ہاں ہاں۔“ وہ بولی۔ ”موازنہ۔“

”تو کیجئے۔“ ایللی نے کہا۔ ”آئیڈیا تو آپ کے پاس موجود ہے۔ آئیڈیا تو آپ ہی کا ہوا۔“

اس نے پھر ایللی کی طرف دیکھا بولی۔ ”لیکن کسی طریق سے اسے پیش کیا جائے؟“

”اس میں تو کوئی مشکل نہیں۔“ ایللی نے کہا۔

”مثلاً۔“ وہ بولی۔

”مثلاً۔“ ایک ساعت کے لئے اس نے توقف کیا۔ ”دنیا میں تبدیلی جنس کے واقعات تو

ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ایک لڑکی کے خیالات اور جذبات پیش کیجئے۔ پھر لڑکی کی جنس تبدیل کر

دیجئے اور بحیثیت مرد اس کے خیالات اور جذبات پیش کیجئے۔“

”واہ واہ اکیسلنٹ۔“ وہ اچھل پڑی۔ ”واہ آصفی صاحب۔“

ناظم نے فخر سے آندھ کو ایللی کی طرف دیکھا۔

”ایک صورت اور بھی ہے۔“ ایللی بولا۔

”کسے۔“ وہ پھر سے بیٹھ گئی۔

”ایک ڈاکٹر تبدیلی جنس کا راز پالیتا ہے۔ پھر وہ باری باری عورت اور مرد بن کر جیتا ہے۔“

تفریحاً۔۔۔ اس طرح موازنہ بہتر ہو گا۔“

”بہت خوب۔“ وہ بولی۔

”پھر اسے ایک مشکل میں ڈال دیجئے۔ اور اسے فیصلہ کرنا پڑے کہ آیا اسے بیٹہ کے لئے

عورت بن کر جینا ہے یا مرد۔“

”اکیسلنٹ۔“ وہ مسکرائی۔

اس کے بعد دیر تک وہ بیٹھے چائے پیتے رہے۔

چائے کے دوران میں پریتماں نے اپنے بیگ میں سے ایک فارم نکالا۔ اس کے نیچے

دستخط کئے اور ایللی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”یہ آفر ہے۔“ وہ بولی۔ ”جب بھی آپ چاہیں میرے سٹوڈیو میں آجائیں۔ فی الحال میں

”بے کار ہے۔ کھلونے۔“ حاجی صاحب نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

ایلی نے پھر ان خوبصورت عمارتوں کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ تلے گتے کے رنگدار ڈبے  
اور سجا کر رکھے ہوئے تھے۔ سڑک پر چلتی ہوئی خوبصورت عورتیں گویا کپڑے کا دکانوں کی  
دھڑوز سے بھاگی ہوئی پتلیاں تھیں۔

اس نے سمندر کی طرف نگاہ دوڑائی۔

سمندر نے بڑھ کر اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

سامنے مغرب میں افق پر ایک رومی ٹوپی ابھر رہی تھی۔

اس روز جب وہ رات کو اپنی جائے قیام پر پہنچا تو وہ سوچ رہا تھا۔ حاجی صاحب کے خیال  
آکر اس کے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ عجیب بات تھی۔ اس عظیم الشان شہر کو اور  
خوبصورت عورتوں کو بدل دیا تھا۔ یہ کیا جادو ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا نقطہ نظر انسان کے  
ذہن کی بات نہیں۔ یا ایک عام سا آدمی اتنی طاقت رکھتا ہے کہ وہ کسی کے زاویہ نظر کو بدل  
رکھ دے۔ زندگی بھر تنکے تنکے چن کر جو آشیاں بنایا تھا اسے ایک نگاہ سے تاراج کر دے۔ یہ  
طاقت تھی۔ ایلی سوچ رہا تھا۔

حاجی صاحب نے اپنا کاروبار جس کی شانیں کلکتہ، بمبئی اور دہلی میں تھیں یک قلم چھوڑ دیا  
آخر کیوں۔ کیا یہ ان کا اپنا فیصلہ تھا یا ایسے ہی کسی مرد خدا نے ان کا زاویہ نظر بدل دیا تھا۔  
ایلی کو اس سوال کا کوئی جواب نہ سوجھتا تھا۔ شاید ان عالموں کے پاس اس کا جواب تھا ہی  
ماجن کے علم و فکر پر اس نے اپنے ذہنی نظریوں کی بنیاد استوار کی تھی۔ برٹریڈ رسل کھڑا  
ہا رہا تھا۔

دو گھنٹہ ”وہ مسکرایا:

”چچہ روتا ہو۔“ وہ بولا۔ ”تو اس کی توجہ کسی اور طرف کر دو۔ وہ خاموش ہو جائے گا۔“

دوستو دسکی مسکرا رہا تھا: ہم سبھی بچے ہیں۔“

دوستو دسکی کہہ رہا تھا: اگر انسان میں بچے کا عنصر نہ ہو تو وہ عفریت بن کر رہ جائے

ایلی سوچ رہا تھا کہ کیا وہ سبھی بچے تھے۔ کیا نقطہ نظر اور زاویہ نگاہ قدرت کی دین تھی۔ کیا  
یہ نگاہ میں معمولی تبدیلی اتنا عظیم فرق پیدا کر سکتی تھی۔ اس کے رو بہ پاگ بابا کھڑا چلا رہا تھا:  
ماکن ہوں۔ کوئی بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔“

لئے علی پور ایک محفوظ مقام تھا۔ ہاجرہ اور عالی کو علی پور چھوڑنے کے بعد وہ واپس لاہور پہنچا اور  
اپنی اسانی سے استغنے دے کر مائی کو ساتھ لے کر بمبئی روانہ ہو گیا۔

بمبئی

بمبئی کو دیکھ کر ایلی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اتنا بڑا اتنا خوبصورت شہر اس نے کبھی  
نہ دیکھا تھا۔ چند روز وہ بے وقوفوں کی طرح سر اٹھا اٹھا کر ان سربنک عمارتوں کو دیکھتا رہا۔  
عمارتوں کی عظمت سمندر کی وسعت اور بھیڑ کے تسلسل کو دیکھ کر اس کی اپنی حیثیت ختم ہو چکی  
تھی۔ وہ اپنے آپ کو بے حد حقیر سمجھ رہا تھا۔ پریتیاں کو آئیڈیا دینے سے جو اس میں خود  
مستادی اور فخر پیدا ہوئے تھے، بمبئی پہنچ کر صابون کے بلبلیوں کی طرح اڑ گئے۔

دوسرے روز شام کے وقت جب وہ میرن ڈرائیو کے قریب ایک باغیچے میں بچ پر بیٹھا ہوا  
تھا تو دو گھنٹہ ”اس نے محسوس کیا جیسے اس کے رو بہ حاجی صاحب کھڑے تھے۔ ان کا سر مل رہا  
تھا۔ آنکھیں روشن تھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔“  
”یہی بچ تھا وہ۔“ وہ بولے۔

”بچ۔“ ایلی نے دہرایا۔

”اسی بچ پر بیٹھے تھے ہم۔“ وہ مسکرائے۔

ایلی کو یاد آ گیا — ”ہاں جب سرمہ لگا کر وہ گھر سے نکلے تھے تو —“ ان  
نوں وہ بمبئی ہی میں مقیم تھے۔

یہ کہہ کر حاجی صاحب اس کے قریب آ بیٹھے۔ انہوں نے مسکرا کر ایک راہ گیر حسینہ کی  
طرف دیکھا۔ وہ حسینہ ان کے قریب آ بیٹھی۔ وہ دیوانہ وار حاجی صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔  
پھر ایک اور طرحدار عورت وہاں آ بیٹھی۔ پھر ایک میم آگئی۔ وہ تینوں حاجی صاحب کی  
طرف یوں دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اپنا آپ ان کی بھیجت چڑھا رہی ہوں۔

پھر وہ اٹھ بیٹھے اور ایلی کے رو بہ آ کھڑے ہوئے:

”بیکار ہے۔“ وہ بولے۔ ”بے کار۔ سب بے کار ہے۔“

انہوں نے نفرت سے عورتوں کی طرف دیکھا اور چل پڑے۔ ایلی چونکا۔ اس نے گردو  
پیش پر نگاہ دوڑائی۔

اردائیں ہوتی تھیں لیکن کبھی کبھی سول لائسنز کے علاقے میں بھی کوئی واردات ہو جاتی اور کچھ رے کے لئے وہ علاقہ ویران دکھائی دیتا۔ پھر جلد ہی لوگ اسے بھول جاتے اور پھر سے آمد و رفت رونق ہو جاتی۔

ایلی خوف کے مارے کبھی ہندو علاقوں میں نہیں گیا تھا۔ سول لائسنز میں گھومتے ہوئے بھی ماہر خوف مسلط رہتا۔ لیکن مانی بے نیاز تھا۔ اس نے چلتے ہوئے کبھی اپنے ارد گرد نہ دیکھا۔ وہ اپنی ہی دھن میں چلے جاتا۔ چلتے ہوئے کوئی گیت گنگنا تا رہتا۔ ایلی کو اس کی بے پروائی پر آ جاتا اور وہ ہر وقت مانی سے بحث کرتا۔ اسے گھورتا۔

ابھی انہیں بمبئی پہنچے دو ماہ ہی گزرے تھے کہ پیریتماں کے نگار خانے کے دروازے پر ایک وارداتیں ہو گئیں۔ غنڈروں نے دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ کہ وہ نگار خانے کو آگ دیں گے چونکہ پیریتماں کا خاندان مسلمان تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نگار خانہ بند کر دیا گیا۔

اس کے بعد مانی اور ایلی کی تمام تر توجہ فلمی برچے کی طرف مبذول ہو گئی۔ جو وہ شائع کرنے کا منصوبہ لے کر آئے تھے۔ مانی انٹرویوز میں مصروف تھا چونکہ وہ بے دھڑک ہر علاقے جاسکتا تھا اور لوگوں سے مل سکتا تھا۔ اس سلسلے میں ایلی کا خوف سدراہ تھا۔

ماچھ مینے گزر گئے۔

### یو پاکستان

اگست سنٹالیس میں مانی کے پبلشر نے انہیں بلا بھیجا تاکہ وہ چند امور کا تقصیبہ کرے۔ اس بلاؤے پر ایلی مسرور تھا چونکہ اس کا جی چاہتا تھا کہ عالی سے ملے۔ اسے خیال تھا کہ اس کی غیر حاضری پر متعجب ہو گا۔ سوچتا تھا کہ پہلے ابو چلا گیا۔ پھر ای چلی گئی اور ابو آئے اور اب دونوں نہ جانے کیوں اسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ مانی انٹرویوز کے چکر میں ایسا تھا کہ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ لاہور جائے۔ اسے فلمی زندگی سے بے حد دلچسپی تھی۔

تاروں، تانہوں اور فلساؤں سے مل جل کر اس نے اپنی ایک حیثیت پیدا کر لی تھی۔ اس نے ایلی کے ساتھ لاہور جانے پر رضامند نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایلی لاہور جا کر بات چیت طے

ایلی کے دل میں عجیب و غریب خیالات تھے۔ کسی وقت تو اس کی وحشت اس حد تک بڑھ جاتی کہ وہ خود کو کانٹا کا بیٹا مارفیس سمجھنے لگتا۔ پھر وہ سوچ میں پڑ جاتا۔ کیا میں پاگل ہو رہا ہوں۔ اس خیال پر وہ بالکل گھبرا جاتا۔

بمبئی میں ایلی کے دھندلکے میں صرف مانی دھوپ کی ایک شعلہ تھی۔ مانی میں زندگی تھی۔ چمک تھی۔ جوش تھا۔ شوق تھا۔ اس کے نقطہ نظر میں صحت تھی۔ بے پروائی تھی۔

وہ بمبئی کو شوق سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ میں خوبصورت عمارتیں گتے کے ڈبے نہ تھے۔ حسین عورتیں درزیوں کے ماڈل نہ تھے۔ اس کی نگاہ میں عورتیں عورتیں تھیں اور اس قدر حسین بھی نہ تھیں کہ انہیں دیکھ کر وہ اپنی حیثیت کھو دیتا۔ حسین عورتیں — خوب تھیں۔ اچھی خاصی تھیں — اس قابل تھیں کہ ان سے دل ہلایا جائے۔

مانی جوان تھا۔ اس کی طبیعت میں بلا کی رنگینی تھی۔ وہ اپنی حیثیت کو کمتر نہیں سمجھتا تھا اور عملی طور پر کچھ کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ اس میں جھجک نہ تھا۔ ایلی کبھی جوانی سے واقف نہ ہوا تھا۔ احساس کمتری کا مارا ہوا۔ زندگی کی راہ پر تھکا ہارا ہوا۔ مرکزیت تئیں کی وجہ سے اس کی طبیعت ڈر اور گھبراہٹوں سے لٹی پڑی تھی۔ اس کے جذبات اور ذہن میں قطعی طور پر ہم آہنگی نہ تھی۔

مانی اور ایلی کو بمبئی میں رہنے کے لئے ایک ایسی جگہ ملی جہاں شاعر اور مصنف رہتے تھے۔ ایلی کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اسے ادیبوں کے ساتھ رہنا پڑا تھا۔ وہ عجیب لوگ تھے۔ بات کرنے سے پہلے سوچتے نہ تھے۔ بات کرنے کے بعد بھی انہوں نے کبھی نہ سوچا تھا۔ کہ اس بات کا کیا اثر ہوا ہے۔ وہ اثر یا رد عمل سے بے نیاز تھے۔ انہیں یہ خیال نہ تھا کہ دوسرا کیا کہے گا۔ کہ سوچے گا۔ آیا اسے بات بری لگے گی۔ وہ دوسروں کے احساسات سے بے گانہ تھے۔ دل کی بات کو چھپانے کے قائل نہ تھے۔ وہ خود شعوری سے بے گانہ تھے۔ ایلی نے محسوس کیا کہ وہ زندگی سے ہم آہنگ ہیں۔ ان میں ہماؤ ہے۔ رکاوٹ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ خود پسند ہیں۔ اپنی اہمیت کے چراغ جلانے کے شوقین ہیں اور دنیا کو اپنے مقابلے میں دیکھتے ہیں۔

ان دنوں بمبئی میں بھی ہندو مسلم فسادات جو بن رہے تھے۔ چھرا گھونپنے کی وارداتیں عام تھیں۔ اس کے علاوہ آتشزدگی کی وارداتیں بھی ہوتی تھیں۔ مسلمان اور ہندو علاقوں میں اندھ

رسم تاجپوشی کا اعلان تھا۔ اس روز ابے معلوم ہوا تھا کہ اس کی قلمرو کہاں سے کہاں تک ہو گی۔ لیکن وہ خوش نہ تھا۔ ایک ان جانی اداسی اور پریشانی اس پر مسلط تھی جیسے اسے یقین نہ ہو کہ اس کی قلمرو اسے مل جائے گی۔ وہ مضطرب تھا۔ بے حد مضطرب۔

دفترا "حاجی صاحب اس کے رو برو آکھڑے ہوئے۔ ان کی گردن مل رہی تھی۔

"وقت آئے گا۔" وہ مسکرائے۔ "انشاء اللہ۔" وہ بولے۔

پاک بابا چلانے لگا: "وہی کرنے والا ہے۔ وہی کرتا ہے۔ اسی کا کام ہے۔ وہی جائے۔ میں کون ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔"

پھر ایک رومی ٹوپی ابھر رہی تھی۔ ابھر رہی تھی۔ ان کے پیچھے کنواں گڑگڑا رہا تھا۔ سفید چادر میں لپٹی ہوئی مسجد سجدے میں پڑی تھی۔

رومی ٹوپی والے نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ اس پر پھیلتی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھ کر دروازہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

"الحمد للہ۔ الحمد للہ۔" مدھم سی سرگوشی ابھری۔

ریڈیو نے سرسکوت توڑ دی۔

طلبل بجنے لگا۔

جیسے دور بہت دور ایک دل دھڑک رہا ہو۔

وہ مدھم دھڑکن قریب آ رہی تھی۔ اور قریب۔ اور قریب۔

"ہم ریڈیو پاکستان سے بول رہے ہیں۔"

اعلان ایلی کے بند بند میں گونجا۔

پھر دھڑکن بن کر اس کے دل کی گھڑائیوں میں اتر گیا۔ اس کا سر بھن سے اڑ گیا۔ جیسے کسی نے بارود کو آگ دکھادی ہو۔

پھر اس کے بدن پر چوٹنے رینگ رہے تھے۔ چوٹنے ہی چوٹنے۔

پھر کسی نے اس کے سر پر تاج رکھ دیا۔

"پاکستان زندہ باد۔" کوئی چلایا۔

انکے رو برو دنیا بھر کے مسلمان قطاروں میں کھڑے تھے اور ہر مسلمان کے سر پر تاج تھا۔

کر لے۔ جب تک وہ خود بھی میں کام جاری رکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی لاہور آ گیا۔

ابھی ایلی نے لاہور میں قدم رکھا ہی تھا کہ لاہور اور امرتسر کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ

منقطع ہو گیا۔ گاڑیوں کی آمد و رفت ختم ہو گئی۔ بسوں کا چلنا موقوف ہو گیا۔

ایلی نے اس خبر کو سن کر خصوصی پریشانی محسوس نہ کی۔ ہاجرہ عالی فرحت اور علی احمد کے

کتبے کے تمام افراد علی پور میں محفوظ تھے اور علی پور محفوظ ترین مقام تھا البتہ لاہور کے متعلق

مسلمان پریشان تھے اور ریڈ کلف ایوارڈ کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔

لاہور شہر میں دیرانی چھائی ہوئی تھی۔ سڑکیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں

میں چپے بیٹھے تھے۔ رات کے وقت گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیتیں اور پھر موت کی سی

خاموشی چھا جاتی۔ پھر کسی مجمع کا شور و غل بلند ہوتا۔ لوگ چنگھاڑ چلاتے چیختے اور پھر خاموشی چھا

جاتی۔ صبح سڑکوں پر یہاں وہاں دکھائی دیتیں۔ انہیں دیکھ کر اپنے قدم راہ گیر اور تیز کر

دیتے تھے۔ سپاہی واردات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر منہ موڑ لیتے جیسے اندھا علم ہی نہ ہو کہ کیا

ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کی بے تابی بڑھ رہی تھی۔ بڑھتی جا رہی تھی کہ ۱۳۔ اگست کا دن قریب آ رہا

تھا۔ اس روز پاکستان کا قیام عمل میں آنے والا تھا اور ایوارڈ کا اعلان ہونے والا تھا۔

اس شام شہر پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بازار سنسان پڑے تھے۔ سڑکیں دیران

تھیں۔ لوگ گھروں میں سسے ہوئے بیٹھے تھے۔ بازاروں میں مسلح فوج ہاتھوں میں مشین گنیں

لئے گھوم رہی تھی۔ سڑکوں پر فوجی ٹرک کھڑے تھے۔

ایلی ریڈیو کھول کر بیٹھا تھا۔

گھڑی نے بارہ بجادیا۔ ایلی کا دل دھک سے رہ گیا۔ بارہ بجے اعلان ہونے والا تھا۔

آج وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ اعلان اس کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہو۔ جیسے آج اس کی

قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہو۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ وہ مذہبی تعصب سے بلند و بالا ہے۔ وہ

بھول چکا تھا کہ قیام پاکستان سے بے گانہ ہے۔ وہ ہندوستان اور عوام کی بہتری کے فلسفے کو

فراموش کر چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ بذات خود پاکستان ہے اور اس روز حدود ملے ہوئے

والی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ ایک بادشاہ ہو اور پاکستان کے قیام کا اعلان دراصل اس کی

ریلوے سٹیشن ویران پڑا تھا۔ چند ایک لوگ پلیٹ فارم پر بیٹھے ادکھ رہے تھے۔ دیر تک وہاں گھومتا رہا۔ گھومتا رہا۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا۔ ”باو جی باو جی۔“ وہ وردی والے باو کو دیکھ کر بولا۔ ”باو جی باو جی۔“ امر تر کو گاڑی جائے گی کیا؟

باو رک گیا اور چونکے ہوئے انداز سے بولا: گاڑی؟

”جی۔“ ایلی نے کہا۔ ”امر تر گاڑی جائے گی کیا؟“

”اوہ۔“ باو چونک کر بولا۔ ”مطلب ہے گاڑی۔“

”جی ہاں۔“ ایلی بولا۔ ”امر تر کو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”گاڑی نہیں جائے گی۔“

”نہیں جائے گی؟“

باو نے سر ہلادیا۔ اس کی آنکھیں پر غم تھیں۔

دو روز وہ ریلوے سٹیشن اور بسوں کے اڈوں پر گھومتا رہا۔ بسوں والے اس کے سوال کا جواب نہیں دیتے تھے۔ کوئی بھی اس کے سوال کا جواب نہیں دیتا تھا۔

”میں تمہیں کر گیا دوں گا۔ جو مانگو گے دوں گا۔“ وہ چلاتا۔

وہ اس کی طرف ٹکٹنی باندھ کر دیکھتے اور سر ہلادیتے۔

بسوں کے اڈے سے وہ پھر سٹیشن پر جا پہنچا۔

حتیٰ کہ ایک روز گاڑی آگئی۔

”یہ گاڑی امر تر جائے گی۔“ وہ چلایا۔

”باو نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔“ یہ امر تر سے آئی ہے۔“

”کیا یہ واپس جائے گی؟“ وہ چلایا۔

باو نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”جا کر دیکھ لو۔“

ایلی گاڑی کی طرف بھاگا۔ شاید گاڑی اسے بتا سکے۔

وہ ڈبے کی طرف لپکا۔

ڈبے میں چاروں طرف خون کے چھینٹے لگے ہوئے تھے۔ سرخ گٹھریاں ادھر ادھر پڑی

تھیں۔

اگلے روز جب اسے معلوم ہوا کہ ضلع گورداسپور ہندوستان میں شامل ہو گیا ہے۔ تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

اسے یقین نہ آتا تھا: ”یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ؟“ وہ آپ ہی آپ چلا رہا تھا۔ ”نہیں۔“ یہ نہیں ہو سکتا۔ کیسے ہو سکتا ہے یہ؟

پھر وہ باہر نکل گیا۔ نیچے بازار میں دکانوں پر کھڑے لوگ گورداسپور، گورداسپور چلا رہے تھے۔

کنز پر حلوائی دودھ کے کڑا ہے میں چمچ ہلاتے ہوئے آپ ہی آپ گنگنا رہا تھا: ”پر بھائی جی گورداسپور کا کیا ہو گا؟“

پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگے جا رہا تھا۔

”بھوں بھوں۔“ کار پیچ رہی تھی۔ وہ رک گیا۔

”کیوں جی۔“ ڈرائیور نے سر نکالا۔ ”گورداسپور کا کیا بنا۔“

”کیا بنا۔“ ایلی نے دہرایا۔

”وہاں میرے بچے ہیں۔“ ڈرائیور نے ایک عجیب سی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

کار چل پڑی۔ اس کے پیچھے عالی بیٹھا تھا۔ ”ابو۔“ وہ ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا۔ ”ابو۔“

”ابو۔“ پھر بہت سے لوگ اس کے گرد آکھڑے ہوئے۔

”کون ہے تو باو۔“ وہ چلائے۔ وہ غنڈے تھے۔

ایلی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”کہاں جا رہا ہے تو؟“ وہ اسے گھورنے لگے۔

”علی پور۔“ وہ بولا۔ ”وہاں میرا بچہ ہے۔ میری ماں ہے۔ میرے بھائی ہیں۔“

وہ پیچھے ہٹ گئے۔

”پیدل جائے گا۔“ ایک لڑکا چلایا۔

”اے ہٹ جا۔“ کس نے ترائخ سے لڑکے کے منہ پر تھپڑ مارا۔ ”جانے دے۔“ غنڈہ



ایلی کی چیخ نکل گئی۔

”یہ گاڑی امرتسر سے آئی ہے۔ یہ گاڑی امرتسر سے آئی ہے۔“ چاروں طرف شور مچ گیا۔ پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگا جا رہا تھا۔

پھر اسے معلوم ہوا کہ علی پور ٹرک لے جانے کے لئے اسے دفتر سے پر مٹ حاصل کرنا ہے۔

جب وہ پر مٹ دفتر پہنچا تو وہیں بہت بھیڑ تھی۔ لوگ دیوانہ وار دفتر کے گرد گھوم رہے تھے۔

سارا دن وہ وہیں گھومتا رہا لیکن کسی نے اس کی بات نہ سنی۔ جب دفتر بند ہو گیا تو وہ ایک دکان کے سامنے چلانے لگا:

”پر مٹ لینا ہے؟“ بابو نے پوچھا۔

”جی۔“

”کہاں کا؟“

”جی علی پور کا۔“

”ہوں۔ ٹرک ہے تمہارے پاس۔“

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔

بابو قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”تو پر مٹ کس کالو گے؟“

”لیکن۔۔۔۔۔۔“ ایلی بولا۔

”بھائی صاحب۔“ بابو کہنے لگا۔ ”پہلے ایک ٹرک حاصل کرو جو ادھر جانے کے لئے تیار ہو۔“

”میں یہاں آکر پر مٹ لو۔ اور علی پور لے جاؤ۔ ایسے غم نہ کھاؤ۔ علی پور ابھی تک محفوظ ہے۔“

پھر کئی ایک دن وہ ٹرکوں کے پیچھے گھومتا رہا۔ ادھر جانے کے لئے کوئی ٹرک رضامند نہ ہوتا

”بھائی صاحب۔ امرتسر کی طرف جانے میں جان کا خطرہ ہے۔ سارے ٹرک کو آگ لگا دیتے

ہیں وہیں امرتسر میں تو خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔“

آخر اسے ایک ٹرک مل گیا۔

”دیکھو بابو۔“ ٹرک والا بولا۔ ”جتنے دن کھڑا ہے سو روپیہ فی روز ہو گا اور جس روز پر مٹ

مل گیا دو سو جانے کا اور دو سو آنے کا یعنی چار سو لگے گا۔“

ایلی نے محسوس کیا کہ پر مٹ حاصل کرنے سے پہلے اسے روپیہ کا انتظام کرنا ہے۔ لاہور

میں اس کے گرد وحشت ناک مناظر تھے۔ مکانات جل رہے تھے۔ سڑکوں پر خون کے چھینٹے

پڑے ہوئے تھے۔ لوگ گھڑیاں اٹھائے ہوئے آرہے تھے۔ عورتیں چیخ رہی تھیں۔ امرتسر سے

آئے ہوئے لوگ اشتعال بھرے نعرے لگا رہے تھے لیکن وہ ان مناظر سے بیگانہ تھا۔ اس کی

آنکھوں تلے عالی دونوں ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا۔ ہاجرہ کے چہرے کی جھریوں پر آنسوؤں کے

قطرے بہہ رہے تھے۔

صبح سویرے وہ پر مٹ کے دفتر میں جا پہنچا۔ سارا دن وہیں دھکے کھاتا اور پھر جب دفتر بند ہو

جاتا تو ٹرک والے کے لئے سو روپیہ اکٹھا کرنے کی دوڑ دھوپ میں لگ جاتا۔

چھ دن گزر گئے۔ وہ ٹرک والے کو چھ سو روپیہ ادا کر چکا تھا۔ اب اس پر مایوسی اور ناامیدی

چھا چکی تھی۔ پر مٹ دفتر میں وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔

اس کے دل میں کوئی رو رو کر تھکا ہوا بچہ بلک رہا تھا۔

## ہولڈ آپ

پھر کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے شیر علی کھڑا تھا۔

”آپ یہاں۔“ وہ بولا۔

اس نے شیر علی کو پہچان لیا۔ ”تم یہاں؟“ اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں یہاں ملازم ہوں۔“ وہ بولا۔

”اور وہ سب۔ وہ۔۔۔۔۔۔“ ایلی نے پوچھا۔

”وہ سب علی پور ہیں۔“ شیر علی بولا۔

”پر مٹ نہیں ملا۔“ ایلی نے مایوسی بھرے انداز سے کہا۔

”مجھے ایک ٹرک مل گیا ہے۔“ شیر علی بولا۔ ”آج ہی محکمہ والوں نے دیا ہے۔“

”مل گیا ہے۔“ ایلی چلایا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں مل گیا ہے۔ صرف ایک بندوق والا سپاہی اور ایک ڈرائیور۔“

”اوہ.....“ ایلی اٹھ بیٹھا۔

اسی روز وہ فوجی ٹرک میں بیٹھے علی پور جا رہے تھے۔

ٹرک کے پردے بند تھے۔ ڈرائیور گاڑی چلاتے ہوئے زیر لب قرآن کی آیات پڑھ رہا تھا۔ سپاہی نے بندوق کی ٹالی پردے سے باہر نکال رکھی تھی۔ اور وہ سڑک کا جائزہ لے رہا تھا۔ شیر علی چپ چاپ ڈرائیور کے پاس بیٹھا تھا۔ ایلی ٹرک کے اندر پچھلی سیٹ پر گھومری بنا ہوا اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

”اللہ اپنا فضل کرے۔“ ڈرائیور چلایا۔ ”بسم اللہ۔“ اس نے ایک سیلیر کھولتے ہوئے کہا۔ ”ہم امرتسر میں داخل ہو رہے ہیں۔ ذرا دھیان سے کوئی باہر نہ جھانکے پردے کے پیچھے نہ گولی سے بچاؤ نہ ہو گا۔“

”روکنا نہیں۔“ سپاہی بولا۔ ”چاہے کچھ بھی ہو۔“

”روکنا۔“ ڈرائیور بولا۔ ”ہم چالیس کی سپیڈ پر چلیں گے۔ چاہے کوئی بھی سامنے ہو۔“

”اللہ مالک ہے۔“ سپاہی بولا۔

ٹرک جھول رہا تھا۔ ربڑ کے گیند کی طرح اچھل رہا تھا۔

دور بہت سے لوگ چلا رہے تھے۔ نعرے مار رہے تھے۔ لمبی سنسنی خیز چیخیں سنائی دے تھیں۔

وہ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ دقت ریک رہا تھا۔

دھنستا ”سپاہی چلایا۔“ وہ دیکھو۔ ریل کی پنز کی دونوں طرف سکھوں کے جتھے ہیں۔“

”وہ دیکھو۔“ وہ پھر چلایا۔ ”وہ درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔“

”اندھے ہو گئے ہیں اندھے۔“ ڈرائیور بولا۔ ”یہ سکھ۔“

”سر پر خون سوار ہے۔“ سپاہی نے کہا۔

”لیکن ریل کی پنز پر کیوں۔ سڑک پر کیوں نہیں۔“ شیر علی نے پوچھا۔

”ضرور کوئی بات ہے۔“ سپاہی نے کہا۔

پھر سپاہی اور ڈرائیور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ شیر علی اور ایلی خاموش بیٹھے تھے۔

”لو چار میل رہ گیا علی پور۔“ ڈرائیور بولا۔

”چار میل۔“ سپاہی بولا۔ ”ڈرا روکو۔“ وہ چلایا ”روکو۔“

”پاگل ہو گئے ہو۔“ ڈرائیور بولا۔

سپاہی نے بندوق کی ٹالی ڈرائیور کی طرف پھیر دی۔ ”میں کتنا ہوں۔ روکو۔ سنا تم نے۔“ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آواز تھرا رہی تھی۔ ”روکو۔“ گاڑی رک گئی۔ سپاہی نے بندوق اٹھائی اور باہر چھلانگ لگاتے ہوئے بولا۔ ”میرا انتظار کرو۔ میں ابھی آیا۔ جانا نہیں۔“ اور وہ بھاگتا ہوا درختوں میں غائب ہو گیا۔

ڈرائیور نے بے بسی سے ایلی اور شیر علی کی طرف دیکھا۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ ایلی کے ذہن میں وہی خلا کھول رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ عالی کی چیخیں مدھم پڑ چکی تھیں۔ اس کی شکل دھندلا گئی تھی۔ ہر چیز پر دھندلا کچھائے جا رہا تھا۔

”یہ تو سمجھو ہو لڈ آپ ہو گیا۔“ ڈرائیور بولا۔

انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ سپاہی انہیں چھوڑ کر کیوں چلا گیا تھا۔ کہاں چلا گیا تھا۔ کہیں وہ سکھوں کے ساتھ تو نہیں مل گیا تھا۔ ان کو یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے جانا۔ ایسی جگہ جہاں چاروں طرف دشمن تھے۔

”چلو لے چلو۔“ شیر علی نے ڈرائیور سے کہا۔ ”اب تو علی پور قریب ہے۔“

”اونہوں۔“ ڈرائیور بولا۔ ”اس کو یہیں چھوڑ جائیں۔ وہ مسلمان ہے بھی۔ کیسے

چھوڑ جائیں۔“

سامنے ایک ویران گاؤں تھا۔ گاؤں کے دو ایک مکان جلے ہوئے تھے۔ ان میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

اس کے ارد گرد کچھ سائے سے حرکت کر رہے تھے۔ دھنستا ”ڈرائیور اٹھا۔ اس نے لوہے کی دو بڑی بڑی سلاخیں اٹھائیں۔

”یہ لو۔“ وہ بولا۔ ایک سلاخ ایلی کے ہاتھ میں تھادی۔ ”یہ لویہ۔“ اس نے ایک کوٹنے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے پردے سے باہر نکال رکھو۔“

پھر اس نے دوسری سلاخ شیر علی کے ہاتھ میں تھادی۔ ”وہ سمجھیں گے کہ بندوقوں کی ٹالیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں پینچلے کہ ہم نیتے ہیں۔“

”جو اللہ کو منظور ہو گا وہی ہو گا۔“ اس نے ٹرک کی جالی مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لی۔ ”انشاء اللہ دو چار کو مار کر مر س گے۔“

نے کہا۔ مہاجر گاڑی کو اللہ کے حکم سے پچاؤں گل فورس کا صاحب انگریز ہے۔ میں نے سیلوٹ مارا۔ میں نے کہا حضور ریل کی پٹری پر رفوچی گاڑی کو سکموں کے جتنے روک کر مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں۔

”گاڑی تو ابھی آئی ہی نہیں۔“ ایللی بولا۔

”تمہیں کیا معلوم ہو۔“ سپاہی بولا۔ ”ایسا نہ کہتا تو وہ سپاہی کیسے بھیجتا جو یہ کہتا گاڑی آنے والی ہے تو کون سنتا میری بات۔“

”تو پھر؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”صاحب ابھی سوچ رہا تھا کہ جو انوں نے سن لیا اور وہ حکم ملنے سے پہلے ہی رفلٹس لے کر بھاگے۔ وہ سب آ رہے ہیں سکموں کے جتنے بھاگ رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو گاڑی بچ جائے گی۔“

”انشاء اللہ۔“ ڈرائیور بولا۔

”اگر ہم پر یہاں حملہ ہو جائے۔“ شیر علی نے پوچھا۔

”یہاں تو صرف تین مرتے۔“ سپاہی بولا۔ ”وہاں تو سینکڑوں کی بات تھی۔“

”اللہ مالک ہے۔“ ڈرائیور بولا۔

ایللی نے حیرانی سے سپاہی کی طرف دیکھا۔ ”اور اگر تمہیں گولی مار دیتے تو؟“ اس نے پوچھا۔

”ایک نہ ایک دن مرنا ہی ہے ہاں۔ مار دیتے۔“ وہ مسکرایا۔ ”اپنا کیا ہے۔ ایک نہ ایک دن گولی سے ہی مرنا ہے۔ پر وہ مسلمان رفوچی کی گاڑی۔“ وہ رک گیا۔

ایللی کی نگاہ سے گویا ایک پردہ سا ہٹ گیا۔

علی پیچھے ہٹ گیا۔

اس کی جگہ بیسیوں چھوٹے چھوٹے بچے اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ انہوں نے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا ابو ابو۔ بیسیوں آوازیں بلند ہوئیں۔ سینکڑوں بوڑھی عورتیں اس کی طرف امید بھری نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔

جاؤ جاؤ

انہوں نے محلے پر آخری نگاہ ڈالی۔

دیر تک وہ بیٹھے رہے۔ صدیاں بیت گئیں۔

”وہ آ رہے ہیں۔“ خردار۔ ”ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔“ خاموش۔

سامنے چار سکھ ہاتھوں میں لٹھ اٹھائے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ٹرک کے قریب آکر وہ گئے۔

”قریب آئیں تو گولی مار دو۔“ ڈرائیور چلایا۔ گولی مار دو سارجنٹ۔ ”وہ چلایا۔“ ایللی نے کہا۔

”سارجنٹ۔“ ڈرائیور چیخنے لگا۔ سنتے ہو سارجنٹ۔

یہ سن کر سکھ بھاگ گئے۔

ڈرائیور ہنسنے لگا۔ ”بزدل بھڑے۔“ وہ بولا۔ ”ڈر گئے۔“

ایللی کی پیشانی پسینہ میں شرابور تھی۔

دو گنا دور سے سپاہی کی آواز سنائی دی۔ ”آگیا گریاں آگیا۔ اللہ اکبر۔“ اس نے نعرہ دیا۔ ”وہ بدوق اٹھائے بھاگا آ رہا تھا۔“ اللہ ہو اکبر۔ ”اس کا نعرہ دور تک گونج رہا تھا۔“ چلو چلو۔

ٹ کرو۔ ”وہ قریب آکر بولا۔ ”وہ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔“

ٹرک چل پڑا۔

”کیا بات تھی؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”کیا تھار پورٹ کرنے۔“

”کہاں گیا تھا۔“

”بائڈری فورس کا ہیڈ کوارٹر ہے یہاں۔ وہاں گیا تھا۔“

”کہاں ہے ہیڈ کوارٹر۔“

”یہاں سے تین میل دور۔“ سپاہی نے کہا۔ ”وہ سامنے اس جھنڈ سے پرے۔“

”کیوں گئے تھے۔“

”میں نے سوچا۔ یہ سکھ جو ریل کی لائن پر کھڑے ہیں۔ ضرور رفوچیوں کی گاڑی آنے والی تو میں نے سوچا مسلمانوں کی ساری گاڑی کٹ جائے گی۔“

”تو پھر۔“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”پھر مجھے پتہ تھا کہ یہاں بائڈری فورس فرنیچر فورس کی ہے۔ سب مسلمان ہیں اس لئے میں

وہ آصفی محلے کو بیٹھ کے لئے چھوڑ رہے تھے۔

حملہ ویران پڑا تھا۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ دیواریں چپ چاپ استوار تھیں۔

محلے کا میدان خالی پڑا تھا۔ کچھ لوگ جا چکے تھے۔ کچھ اداں کھڑے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ محلے والوں کی زبانیں گویا تلو سے چٹ گئی تھیں۔ ان کی قوت گویائی آنکھوں میں ڈوب رہی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے علی احمد کی گھرانے کو جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

ایلی نے آخری نگاہ ڈالی۔ اوپر چوبارے میں شہزاد کھڑی تھی۔ پھر وہ سب ٹرک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ علی احمد چپ چاپ سر کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے نہ جانے کدھر دیکھ رہے تھے۔

ہاجرہ کا چہرہ بھیانک ہو رہا تھا۔ عالی حیرانی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ شمیم اور اس کی بیٹیاں چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ صرف راجو کے چہرے پر ہمت اور امید کی جھلک تھی۔ نصیر دانتوں میں تنکا چلا رہا تھا۔ اب ہاتھ مل رہی تھی۔ فرحت کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ اس کے بچے سے ہوئے بیٹھے تھے۔

ٹرک چلے جا رہا تھا۔

ریل کی سڑک کے دو رویہ فوجی بندوقیں لئے کھڑے تھے۔

دفعتاً "سپاہی چلایا: "اللہ اکبر"

سب سپاہی کی طرف دیکھنے لگے۔

"رفوچی گاڑی۔ رفوچی گاڑی۔" وہ بچوں کی طرح تالیاں بجا رہا تھا۔

انہوں نے پردہ اٹھا کر دیکھا۔

سامنے ریل کی پٹری پر مسلمانوں کی پہلی رفوچی گاڑی آرہی تھی۔ اس کے ساتھ لوگ یوں چپے ہوئے تھے جیسے گڑ پر چوہ ٹپیں۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ جیسے اس عظیم بوجھ تلے ہو تک رہی ہو۔

"اور گریاں۔" سپاہی چلانے لگے۔ "آج اگست کا آخری دن ہے۔"

ڈرائیور نے سپاہی کی طرف تعجب سے دیکھا۔ پھر وہ بولا:

"کل مسلمان ہائیڈری فورس یہاں سے چلی جائے گی۔"

"چلی جائے گی۔" علی احمد بولے۔

"اور اور۔" ڈرائیور بولا۔ "چلی جائے گی تو۔۔۔۔۔"

"سنکھ دھاندلی بچا دیں گے۔" سپاہی نے جواب دیا۔

"اور علی پور کا کیا بنے گا؟"

"وہ تو ہائیڈری والوں کی وجہ سے بچا ہوا تھا۔" سپاہی بولا۔

"مگر دہشت تو صاف ہو گیا۔" ڈرائیور نے کہا۔

ایلی نے جھرجھری لی۔

ایک بھیانک خاموشی چھا گئی۔

"ارے بھائی۔" ڈرائیور نے ایک چیخ سی ماری۔

بسمی ڈرائیور کی طرف دیکھنے لگے۔

ٹرک رک گیا۔

وہ سب سم گئے۔ شاید حملہ ہو گیا۔ شاید ٹرک خراب ہو گیا۔

سپاہی نے علی کا نعرہ مارا اور بندوق اٹھائے باہر چھلانگ لگا دی۔

وہ پردے ہٹا کر دیکھنے لگے۔

سڑک پر یہاں وہاں لاشیں پڑی تھیں۔ چاروں طرف خون کے چھینٹے اڑے ہوئے تھے اور

ان کے درمیان پاگ بیا چھاتی نکالے گردن اٹھائے بے پروائی اور بے نیازی سے ادھر سے ادھر

اور ادھر سے ادھریوں ٹپ رہا تھا جیسے جہاز کا کپتان ارد گرد کا جائزہ لے رہا ہو اور جہاز کے ملاحوں

کو احکامات جاری کر رہا ہو۔

"بابا۔۔۔۔۔" ڈرائیور چلایا۔

سپاہی بابا کو دیکھ کر بھونچکا رہا گیا۔

"بابا۔" ڈرائیور پھر چلایا۔

بابا دور نہ جانے کہاں دیکھ رہا تھا۔

"آؤ باؤ چلیں۔" سپاہی چلایا۔ "پاکستان چلیں۔"

بابا نے سپاہی کی طرف دیکھا۔ "چلیں۔" وہ بولا۔ "سب نے چلے جانا ہے۔ سب نے۔" وہاں

تو جاؤ۔ جانا ہے تو جاؤ۔ جس نے جانا ہے جائے۔"

"تم آ جاؤ بابا۔" ڈرائیور چلایا۔

بابا اپنی ہی دھن میں چلا رہا تھا: ”جانا ہے تو جاؤ۔ چلے جاؤ۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں۔ وہی کرنے والا ہے۔ وہی کرتا ہے۔ وہی مارتا ہے وہی زندہ کرتا ہے۔“

”لیکن بابا۔“ سپاہی چلایا۔ ”وہ تمہیں مار دیں گے۔“

”مار دیں گے۔۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔۔“ بابا کے ہونٹوں پر ہنسی آگئی۔ ”وہ کہاں ہیں۔ کہاں ہیں وہ کہاں ہیں وہ۔ کوئی بھی تو نہیں صرف وہی ہے۔ صرف وہی۔ یہاں وہاں ہر جگہ ہر جگہ اور کون ہے؟“

”اسے زبردستی اٹھاؤ۔“ ڈرائیور چیخنے لگا۔ ”اٹھاؤ۔ ٹرک میں ڈال دو۔“

بابا نے ایک غضب ناک نگاہ سپاہی پر ڈالی۔

”مت کرو۔ مت کرو۔“ ہاجرہ بولی۔ ”بابا کو کچھ نہ کہو۔“

بابا نے ایلچی کی طرف دیکھا۔ ایلچی نے جبک کر سلام کیا۔

### حضور حضور

بابا نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور ٹرک کے قریب آکھڑا ہوا:

”بولو کیا نہیں کیا۔ کیا نہیں کیا۔“ وہ چلایا۔ ”سب کچھ کیا سب کچھ کیا۔ کہاں کہاں حفاظت

نہیں کی۔ کہاں کہاں خیال نہیں رکھا۔ کیا نہیں کیا۔ کیا نہیں کیا۔ بولو بتاؤ۔“

”وقت آگیا ہے۔ وقت آگیا ہے۔“ وہ پھر بولنے لگا۔ ”جاؤ جاؤ۔ تم جاتے کیوں نہیں۔

وقت آگیا۔ دور دور۔ جاؤ جاؤ۔ مسجد کے پاس کنوئیں کے پاس دونوں بیٹھے ہیں۔ اللہ نے معاملہ

اس کے ہاتھ میں دے دیا وہ جس کے ہاتھ میں چاہے دیدے۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں۔ وہ

جانے اور وہ جانے۔ وہ دینے والا وہ لینے والا۔ جاؤ جاؤ۔“

ڈرائیور نے ٹرک شارٹ کر دیا۔ سپاہی بے حد کر اوپر چڑھ گیا۔

”آ جاؤ بابا۔“ سپاہی آخری مرتبہ چلایا۔

بابا نے قریب ہی سے ایک لاشی اٹھائی اور دوسری طرف منہ پھیر کر اسے لہرانے لگا۔

”ہٹ جاؤ۔۔۔۔۔۔ ہٹ جاؤ۔“ اور پھر لاشی پھینک کر ہنسنے لگا۔ ”مجھے کیا ہے مجھے کیا ہے۔

کرنے والے تم ہو۔ تم جانو۔ میں کیا ہوں۔ میں کیا ہوں“ وہ چلا رہا تھا۔

ٹرک روانہ ہو چکا تھا۔

دلفت!“ ایلچی کے روبرو حاجی صاحب آکھڑے ہوئے۔ ”وقت آئے گا۔ وقت آئے گا۔“ وہ سترائے۔ ”الحمد للہ۔ اللہ اچھا کرے گا۔ وقت آئے گا۔

شہزاد کھڑکی سے چلا کر بولی: ”میں رکاوٹ تھی۔ میں دور ہو گئی۔ میں دور ہو گئی۔

دلی کا عالم مولوی ہنس رہا تھا۔ ”سب اس کا پر تو ہے۔ سب اس کی شعبہ بازی ہے۔ وہ بڑا

شعبہ باز ہے۔ سب اسی کا کھیل ہے۔ وہ بڑا کھلاڑی ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”خبردار۔“ ڈرائیور چلایا۔ ”امر ترس آگیا۔ کوئی باہر نہ جھانکے۔ کوئی آواز نہ نکالے۔“

”اللہ مالک ہے۔“ سپاہی بولا۔

ایلچی چونک پڑا۔

اس نے سامنے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔

سامنے چوک میں ایک فوجی کھڑا تھا۔

”اگر اس نے روکا۔“ سپاہی بولا۔ ”تو رکنا نہیں۔“

”جو اللہ کرے۔“ ڈرائیور نے ٹرک تیز کر دیا۔

چوک میں کھڑے فوجی نے رکنے کا اشارہ کر دیا۔

”جاؤ جاؤ۔“ دور سے پاک بابا کی آواز سنائی دی۔

”تواخ۔۔۔۔۔۔“ ایک آواز سی سنائی دی۔

چوک میں کھڑا فوجی ڈھیر ہو کر گر پڑا۔

ایلچی نے دھڑکتے ہوئے دل سے سامنے دیکھا۔

”جاؤ جاؤ۔ چوک میں۔“ پاک بابا چلا رہا تھا۔ ”سڑک سے نہیں۔ کھیتوں سے۔ کھیتوں

سے۔“

ڈرائیور نے ٹرک سڑک سے اتار کر کھیتوں میں ڈال دیا۔

”نیا جیون۔ نیا جیون۔“ کھڑکی میں شہزاد گنگنا رہی تھی۔

”آئے دو۔“ رومی ٹوپی والا کھیتوں میں ہاتھ دیئے کھڑا تھا۔

”راستے کی رکاوٹ تو میں تھی۔“ شہزاد

”آئے دو۔ آئے دو۔“ دراز قد اشارے کر رہا تھا۔

ٹرک دوڑ رہا تھا۔ دوڑ رہا تھا۔

## علی پور کا ایلی

(ڈاکٹر محمد احسن فاروقی)

”آ جاؤ۔ جاؤ۔“ پیسوں کی آواز چاروں طرف گونج رہی تھی۔  
 ”حضور حضور۔“ ہارن خوشی سے چیخ رہا تھا۔  
 ”پاکستان۔ پاکستان۔“ ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

”علی پور کا ایلی۔“ کے پہلے ایڈیشن کی ہر جلد کے ساتھ ایک چھپی گئی ہوئی ملتی تھی۔ جس پر لکھا ہوتا تھا۔ ”اسے آدم جی انعام بھی ملا۔“ اور کچھ ہی عرصہ بعد اس کے بابت ابن انشاء صاحب نے کہا۔ ”اسی لئے مشہور ہے کہ اس پر آدم جی انعام نہیں ملا“ اور جملہ کا یہ حصہ اس کے ہر ایڈیشن کے ساتھ چھپا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب ۱۹۶۱ء کا آدم جی انعام ملنے والا تھا تو یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اس ناول کو انعام ملنا چاہیے یا ملے گا یا ضرور ملے گا۔ مگر انعام ”تلاش باراں۔“ کو دیا گیا۔ مولوی عبدالحق بقید حیات تھے اور میں ان کی خدمت میں بیباک تھا۔ ان کے ناول کے سلسلے میں ذوق پر مجھے کبھی اعتماد نہیں ہوا۔ جب پہلا آدم جی انعام ”خدا کی بستی۔“ کو دیا گیا تو میں نے مولوی صاحب سے کہا تھا۔ ”آپ نے ترازو بٹے سے تول کر انعام دیا ہے۔“ اور ان سب کتابوں کو جو مولوی صاحب کے کمرے میں ایک پٹنگ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ دیکھ کر اٹھادہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا۔ ”آخر ان سب کتابوں سے تو وزن میں یہ سب سے بھاری ہے۔“ مولوی صاحب ہنس دیئے تھے۔ پھر آئندہ سال ”تلاش باراں۔“ کو انعام ملنے کے بعد میں ان کے پاس گیا۔ وہ قریب المرگ تھے۔ مگر باتیں کرتے تھے میں نے کہا۔ ”اب کی انعام دینے کے سلسلہ میں ”علی پور کا ایلی۔“ اس قدر زیادہ بڑی کتاب تھی کہ ترازو ہی ٹوٹ گئی لہذا اس کا وزن نہ ہو سکا اور اس کم وزن کی کتاب ”تلاش باراں۔“ کو آپ نے انعام دے دیا۔“ مولوی صاحب تھوڑی دیر کے بعد غش میں آ جاتے تھے۔ کہہ نہیں سکتا کہ انہوں نے یہ بات پوری کی یا نہیں۔ مگر میں یہ سب ہی سے کہتا رہا۔ یہ عجیب واقعہ تھا کہ ایک ناول کی سب سے بڑی

مفصل لکھنے کی ٹھان لی ہے جو ۱۹۴۷ء سے اب تک وجود میں آئی ہیں اور جو ہماری ٹول نگراری میں ایک نیا بلکہ ناول کے اصل معنوں میں پہلے دور کے نقوش جما رہی ہیں۔ میری رائے ہے کہ ”علی پور کا ایل“ ان آدھے درجن ناولوں میں ہے جو ہمیشہ اہم مانی جاتی رہیں گی۔

ممتاز مفتی صاحب ناول کا واضح شعور رکھتے ہیں اور اس لئے ان کے سلسلے میں انعام کی کوئی اہمیت نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ انعام تو پیشتر ایسے لوگوں کو ملتا ہے۔ جن کو ناول کا کوئی شعور نہیں ہوتا اور وہ اپنی ناول کے بابت یہ نہیں بتا سکتے کہ اس میں ہے کیا۔ برخلاف اس کے مفتی صاحب انکار کے ساتھ فرماتے ہیں۔

”اپنی دانست میں میں نے ناول بلکہ ایل کی سرگزشت لکھی تھی۔ مقصد تھا کہ ایل کی شخصیت کا ارتقاء پیش کروں۔ اس لئے چند ایک بظاہر غلیظ تفصیلات پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ایل ایسا کروار ہے جو مشاہدات کے سمندر میں ڈبکیں کھاتا ہے۔ لیکن جب کنارے لگتا ہے تو پنچھی کی طرح پر جھڑ کر پھر سے جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔“

بہر حال اردو ادب میں کوئی طویل کہانی ایسی نہ ملے گی۔ جس کی تفصیلات براہ راست زندگی سے اخذ کی گئی ہوں اور چٹاؤ کے بغیر ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہوں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب آپ جیتی ہے۔

(پیش لفظ، طبع ثانی)

پس لفظ طبع ۱۹۶۱ء میں وہ پہلے ہی فرما چکے تھے۔

----- یہ روداد ہے۔

ایک ایسے شخص کی جس کا تعلیم کچھ نہ بگاڑ سکی۔

جس نے تجربے سے کچھ نہ سیکھا۔

جس کا ذہن اور دل ایک دوسرے سے اجنبی رہے۔

جو پلا پروان چڑھا اور باپ بننے کے باوجود بچہ ہی رہا۔

جس نے کئی ایک محبتیں کیں لیکن محبت نہ کر سکا۔ جس نے محبت کی بھلجھڑیاں اپنی انا کی تسکین کے لئے چلائیں لیکن سپردگی کے عظیم جذبے سے بیگانہ رہا اور شعلہ جوالا نہ پیدا کر سکا۔

جو زندگی بھر اپنی انا کی دھندلی بھول، صلیوں میں کھویا رہا حتیٰ کہ بالآخر نہ جانے کہاں سے

تعریف یہ ہو کہ ”اسے آدم جی انعام ملا“ اور دوسری کی تعریف یہ کی جائے کہ اسے ”آدم جی انعام نہیں ملا۔“ انعام ملنا یا نہ ملنا بے معنی ہو گیا اور ایک حد تک جن ناولوں کے بابت یہ کہا جائے کہ انہیں انعام ملا یا نہیں ملا وہ بھی بے معنی ہو گئیں۔ اس بنا پر ”مجھے علی پور کا ایل۔“ سے ایک مہم ساقصوب ہو گیا اور میں اسے بھی ایسی چیز ماننے لگا جو میرے پڑھنے کے قابل نہیں ہے۔ اس قصب کو ختم ہوئے بھی عرصہ گزر گیا۔ پھر ایک دن جمیل صاحب کے یہاں اس کا وہ ایڈیشن رکھا ہوا دیکھا جو ”ہماری لائبریری۔“ کے سلسلہ کا ہے۔ ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری سے بھی بہت ہی واقف تھا۔ اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ میں نے یہ طے کیا کہ ”علی پور کا ایل۔“ کو ضرور پڑھ کر دیکھوں گا اور جمیل صاحب سے کتاب عاریتاً لے لی۔ پڑھنا شروع کیا تو اس میں ایسا محو ہوا کہ دن دن بھر اور رات میں کافی دیر تک پڑھتا رہا۔ ساتھ لئے لئے پھر اور کراچی کی بسوں میں دفنوں میں جہاں بھی ذرا سا وقت مل گیا۔ اس کی طرف رجوع ہو گیا کتاب مضنیم تھی اور جلد بہر یک جب میں نے اسے جمیل صاحب کو واپس دیا تو اس کے بلا مبالغہ آٹھ الگ الگ ٹکڑے ہو چکے تھے۔ کچھ لوگوں نے اسے میرے ہاتھ میں دیکھ کر تعجب سے یہ بھی کہا۔ ”اتنی موٹی کتاب پڑھ رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”چھوٹی یا موٹی کی مجھے کوئی پرواہ نہیں یہ کتاب حد سے زیادہ دلچسپ ہے اور میرے لئے میں غیر ادبی یا ادب سے گری ہوئی کتاب نہیں پڑھتا اور یہ مجھے آج کی سب ادبی کتابوں سے زیادہ دلچسپ معلوم ہو رہی ہے جلد سے جلد ختم ہو جائے گی۔“ غرض اس کتاب کو ایک ہلکی قسم کی نفرت سے میں نے شروع کیا مگر یہ میرے لئے دلچسپ اور قابلِ وقعت ہوتی گئی اور آخر میں اس مثل پر پوری اتری کہ جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ مشفق محمد طفیل ایڈیٹر ”نقوش۔“ نے اس کا ”فسانہ آزاد۔“ سے مقابلہ کیا اور ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا ”علی پور کا ایل۔“ اور ”فسانہ آزاد۔“ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آخر الذکر ناول کے میدان میں پہلا ڈنگا ہوا قدم ہے اول الذکر اس میدان کے ادب میں پورے طور پر تسخیر کا نشان ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”اس پر ایک مفصل مضمون لکھ ڈالئے۔“ میں نے اسے پھر پڑھا اور اس پر مضمون لکھنا شروع کیا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ رسالہ نقوش سو گیا ہے۔ مجھے بھی نیند آگئی اور وہ رہ گیا۔ مگر اب جب اس تصنیف کو مقبول ہوئے بارہ برس ہو گئے ہیں اسے پھر پڑھا اور اس پر مضمون لکھ ڈالنے ہی کا فیصلہ کیا۔ نقوش نہ معلوم کب نکلے گا مگر مضمون کو تیار رہنا چاہیے۔ لکھنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے اب ان تمام ناولوں پر



خصوصیات پیدا ہونا لازمی تھیں اور انہیں مفتی صاحب نے نہایت فراخ دلی سے پیدا ہونے دیا۔ اول یہ کہ تجربوں کا ڈھیر لگتا چلا گیا اور اس میں سے انہوں نے چننے کی کوشش نہیں کی۔ ناول کو آج کا انتخاب اور ارتقاء کے اصولوں کے ماتحت لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی تفصیلات غائب ہو جاتی ہیں اور بہت سی سکڑا کر رکھی جاتی ہیں۔ قاری کو ناول نگار کے اشاروں سے خود بہت کچھ اپنی طرف سے شامل کر لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح ناول فنکار اور صاحب ذوق دونوں کی تخیل کے ساتھ ساتھ چلتے رہنے سے بنتی ہے۔ وہ اکثر لوگوں کے لئے مبہم اور مشکل بھی ہو جاتی ہے اور بیشتر لوگ مبہم اور مشکل بھی ہو جاتی ہیں۔ مفتی صاحب اس کے قائل نہیں ہیں اور ہر اس معاملے میں بھی وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ناول نگاروں کے ساتھ ہیں جو تفصیلات کو زیادہ سے زیادہ واضح طریقہ پر پیش کرنے کے قائل تھے۔ اور زندگی کا واضح سے واضح نقشہ پیش کرتے تھے۔ اس لئے ”علی پور کا ایل“ میں ہمیں جدید فنکاری سے انکار بلکہ اختلاف ملتا ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پرانا طریقہ اب بھی کتنا زور دار ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس وجہ سے اس کی ضخامت بڑھ گئی ہے۔ جس پر کچھ لوگوں کو اعتراض ہے ناول کے سلسلے میں ہمارے یہاں کوئی واضح نظریہ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ اسی تصنیف کو ناول کہتے ہیں جو کم از کم ایک ہزار صفحوں کا ہو مگر زیادہ تر لوگ ضخامت سے ٹھنڈے جاتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ناول حد سے حد چار سو صفحوں کی ہو۔ ”علی پور کا ایل“ کی ضخامت زیادہ تر لوگوں پر بار ہے۔ میں اسے ایک قسم کی بدذاتی سمجھتا ہوں اصل میں ضخامت مواد اور فن پر مبنی ہوتی ہے اور مفتی صاحب کا جو مواد ہے اور جس طرح وہ اسے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ اتنی ضخامت گھیرے بغیر وہ ہی نہیں سکتا تھا جتنی کہ ناول کی ہے۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ مفتی صاحب بغیر سوچے سمجھے روائی کے ساتھ ناول سرسراتے گئے ہیں اور انہیں فنکاری سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ سب تفصیلات اور طوالت کیا محض لاپرواہی کی وجہ سے ہے یا اس کے پیچھے کوئی مستقل فنی صورت چھپی ہوئی ہے اور ہے تو وہ کس حد تک دلکش ہے۔

تیسرے یہ کہ تخلیق کار کی حیثیت سے وہ تمام قوت کردار نگاری پر صرف کرنا چاہتے ہیں اور خاص طور پر ناول کے ہیرو اور اسی کی حد سے زیادہ نارمل نوعیت کو دائمی حقیقت بنا دینا چاہتے ہیں۔ جدید ناول نگاری کے سلسلے میں بھی باقی ہے۔ اور بالکل واقعاتی کردار پیش کرنے کے

یک کرن چکی اور اسے نہ جانے کدھر کو لے جانے والا ایک راستہ مل گیا۔

اس داستان کے بیشتر واقعات اور مرکزی کردار حقیقت پر مبنی ہیں۔ باقی کردار حقیقت اور سانسہ کی آمیزش ہیں۔ حقیقت سے گریز کی وجہ میرا معجز ہے اور ان کرداروں کی عظمت کو اجاگر کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ لہذا انسانی رنگ شامل کر کے میں نے اپنے معجز کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔“

ظاہر ہے کہ دو پیش لفظوں میں جو کچھ نہیں ملتا ہے اسے باقاعدہ تنقید ہی کہا جاسکتا مگر وہ ممتاز مفتی صاحب کے ناول کے سلسلے میں شعور کا ضرور اندازہ دیتا ہے اور اس میں سے حسب میل خاصی باتیں سامنے آتی ہیں۔

اول یہ کہ وہ مستقل واقعیت پسند ہیں۔ وہ اپنا مخصوص تجربہ پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح کہ وہ بالکل صحیح رہے۔ یہ بات ہمیں ناول کی بنیاد تک لے جاتی ہے۔ اٹھارویں صدی میں ناول کی ابتدا کرنے والوں کے سامنے بھی یہی مخصوص مقصد تھا اور یہی مقصد آج بھی تمام ادبی ناول نگاروں کا ہوتا ہے۔ مگر وقت کے ساتھ اس مقصد میں اور بھی مقاصد شامل ہو گئے۔ خاص طور سے بیسویں صدی میں تجربہ یا زندگی کے حالات کو نظریہ یا تخیل کے اثر سے بدل کر پیش کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسی سے ناول نگار مفکر کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ اور ناول متاثر کرنے کے علاوہ ذہنی بحث کا مواد بہم پہنچاتی ہے۔ مفتی صاحب اس جھنجھٹ میں نہیں پڑ رہے ہیں۔ وہ نہایت غیر جانبداری سے ایک سرگزشت ایک روئند کو بے کم و کاست بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ ہمارے یہاں ناول کا ارتقا عجیب رہا ہے۔ ابتدا کے ناول نگار اسے فسانہ سمجھ کر بہت سے فرضی، خیالی اور مبالغاتی چیزیں اس میں داخل کرتے رہے اور آج کل کے ناول نگار جدید تجربوں کی راہ پر چل کھڑے ہوئے۔ اس لئے ہمارے یہاں ایسی ناول جسے ناول کا NORMA کہا جائے ڈھونڈھے نہیں ملتی۔ مفتی صاحب اس فارم اس ”خالص ناول“ کی راہ پر چل رہے ہیں اور ”علی پور کا ایل“ اپنے نام سے ہی اور پھر مواد سے بھی زندگی کی اس طرح ترجمانی ہے جیسی واقعیت پسندوں اور قدریت پسندوں نے کی تھی۔ جدید دور میں اس راہ پر چلنا اور قدم میں لغزش نہ آنا بھی ایک کمال ہی کے دائرے میں آتا ہے اور ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ اسے کہاں تک حاصل کر سکے ہیں۔

دوسرے یہ کہ واقعیت پورے طور پر ہٹکنار رہنے کی کوشش سے اس ناول میں ”

بجائے اشارت وغیرہ پر عمل کرتی ہے۔ مفتی صاحب اس کے بھی خلاف ہیں اور ان کی وہ راہ ہے جو ”دون کا ہونے۔“ سے شروع ہو کر ”چوک پیچہ۔“ تک چلی آتی ہے اور آج بھی سوسرٹ نام وغیرہ کی راہ ہے۔ غرض اس معاملے میں سبھی وہ ناول نگاری کے تمام الجھاؤں کو الگ کر دیتے ہیں۔ ضخامت اور وسعت کے لحاظ سے اس کتاب میں کردار کا ابھرتا اور نئے نئے کردار کا ہر موڑ پر سامنے آتے رہنا لازمی ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ کس قدر زندہ ہیں اور کیسے مل جل کر ایک دنیا تخلیق کرتے ہیں اور یہ دنیا کس حد تک دلکش ہے۔ پھر ناول کا مرکزی کردار ایلی سب سے زیادہ مصنف کی توجہ کا مرکز ہے۔ اس کے بات چند بنیادی باتیں وہ پیش لفظ ہی میں کہہ دیتے ہیں۔ یہ باتیں نہایت معمولی ہیں مگر معمولی ہونے ہی کی وجہ سے تعجب انگیز بھی اور اسی مثل کی مصداق ہیں کہ حقیقت مجاز سے زیادہ تعجب انگیز ہوتی ہے۔ غرض یہ ناول صاف صاف طور پر اس قسم کی ناول ہے جسے کرداری ناول کہا جاتا ہے اور اس کی کامیابی بالکل آخر کار اس کے ہیرو کی تخلیق کی کامیابی بالکل سے وابستہ ہونا چاہئے اور اگر ایلی دیانے ناول نگاری کے ان کردار میں سے ایک ٹھہرتا ہے جس کو حقیقت سے زیادہ حقیقی اور ایک معاشرے کا مکمل نمائندہ کہا گیا ہے تو ناول کو عظیم درجہ میں جگہ دینا ضرور ہو جاتا ہے۔

غرض ہم اس ناول کو یہ جان کر اور مان کر شروع کرتے ہیں یہ ناول کی بنیاد۔ روح یا سیدھی ضرور راہ سے ہٹنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان جدید ضروری یا غیر ضروری آلائشوں سے پاک ہے جو تجربہ کی طرح تھوپی جا رہی ہیں۔ ہمیں پیش لفظوں میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کچھ لوگ اسے ناول کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جن کی رائے کو کوئی خاص وقعت نہیں دینا چاہئے۔ یہ لوگ ناول میں رومان دیکھنا چاہتے ہیں اور ”علی پور کا ایلی۔“ میں بس اسی حد تک ہے جتنا کہ ایلی کے کردار سے ممکن تھا۔ اس کو رنگ دینا واقعیت سے ندراری کے مترادف ہوتا اس لئے مفتی صاحب نے رومانی رنگ چڑھانے سے گریز کیا۔ اس لئے عام ناولوں کو پڑھنے والے اسے غیر دلچسپ کہیں گے۔ مگر میں نے پڑھ کر دیکھا ہے اور بہت سے لوگ میرے ہم رائے ہیں کہ اس میں بے پناہ دلچسپی ہے۔ ویسی دلچسپی بھی جیسی ناول کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے ڈھونڈتے ہیں اور ویسی دلچسپی بھی جو جیسی ایک فرد کے دنیا سے کشمکش سے خاص طور پر عشق بازی کی کشمکش سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں ایک مسلسل عشقیہ قصہ بھی ہے۔ جو بڑے جزئیات کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ اور بڑے دلکش کردار کے مختلف پہلو دکھاتا ہے۔ ایلی اور

شہزاد کا عشق بڑی عجیب حقیقت ہونے کی وجہ سے اچھا خاصا رومانی ہے اور اس میں رخنوں کو اور اس کے نتیجوں کو ہم بڑی دلچسپی سے نکتے ہوئے دیکھنے کے منتظر رہتے ہیں۔ لاہور میں ایلی کا ایک اور عشق چلتا ہے اور وہ بھی بڑا دلچسپ ہو جاتا ہے ایک اس وجہ سے کہ وہ اپنی جگہ پر عجیب ہے اور دوسرے اس وجہ سے کہ وہ ایلی کی شہزاد کی طرف توجہ کو ختم نہیں کرتا پھر جب ہمیں ایلی سے شروع ہی سے دلچسپی ہو جاتی ہے کہ ہم اسے ناول کے سلسلے کے تعصبات سے ذہن کو خالی کر کے پڑھیں تو زندگی کا جو منظر یہ پیش کرتی ہے۔ وہ حد سے زیادہ دلچسپ ہو جائے گا۔ اور ضخامت ہماری دلچسپی کی راہ میں کسی طرح حائل نہ ہوگی بلکہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ یہ اور بھی ضخیم ہوتی تو اچھا تھا۔

(۲)

مفتی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں زندگی کی تفصیلات ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہیں۔ ڈھیر کا لفظ (بے ترتیبی کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر کسی ڈھیر پر غور کیجئے تو اس میں ایک ترتیب ضرور نظر آئے گی۔ یہ ترتیب انسان کی دی ہوئی تو کسی طرح نہ ہوگی مگر قدرت نے انسان کے ڈھیر کئے ہوئے مواد سے ایک ترتیب ضرور پیدا کر دی ہوگی۔ اناج کے ڈھیر کو دیکھئے اس کی ایک چوٹی ہوگی اور سارا مواد اس سے شروع ہو کر ایک مثلث کی شکل ضرور اختیار کر گیا ہو گا۔ ”علی پور کا ایلی۔“ بھی اسی قسم کی ترتیب قدرتی ترتیب رکھتا ہے۔ اس کی ابتدا ایلی یا الیاس کے گھر کا سین سب میں پہلے سامنے لاتا ہے۔ باپ علی احمد دو مائیں ایک سگی ماں ہاجرہ اور ایک سوتیلی صفیہ صاف صاف ایک دوسرے سے مختلف اور اپنی جگہ پر منفرد ہیں۔ ایلی کو بچہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ مگر وہ ان میں سے ہر ایک سے ایک خاص رد عمل رکھتا ہے۔ علی احمد مستقل کردار ہے۔ وہ ایلی کو ملازم کی طرح سمجھتے ہیں اور ایلی ان کی آواز سن کر دھک سے رہ جاتا ہے۔ اور ان کا حقہ بھرنے لگ جاتا ہے۔ ہاجرہ بھی ایک ملازمہ کی طرح ہے جو قناعت اور رواداری سے زندگی گزار رہی ہے اور وضع دار اور حسین صفیہ کے حکم پر چل رہی ہے ایلی صفیہ سے نفرت کرتا ہے اور گھن کھاتا ہے مگر اس کے حکم پر چلنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس طرح وہ ماحول پورے طور پر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ جو ایلی کے کردار کے سلسلے میں بنیادی ہے۔ ناول کی یوں ابتدا بڑی معنی خیز اور فنی لحاظ سے بڑی مناسب ہے۔ علی احمد اور ایلی جو تمام داستان پر حاوی رہیں گے پوری انفرادیت کے ساتھ سامنے آ جاتے ہیں اور ایلی کا عورتوں کی طرف رد عمل

بالکل غلط ہو گا کہ ناول کا کوئی خاص فارم نہیں ہے۔ ناول زندگی کی طرح بے ہیئت ہے مگر اس پر مصنف نے ایک فارم عائد ضرور کیا ہے۔ یہ عام طور سے جو فارم ناولوں میں نظر آتے ہیں ان سے مختلف ہی نہیں بلکہ ان کا متضاد ہے مگر غور کرنے والوں پر روشن ہو جاتا ہے کہ یہ بالکل نئی چیز ضرور ہے اور مفتی صاحب کا شعور واو کے قابل ہے کہ انہوں نے فارم کو بھی خوبی سے چھپایا ہے یا مواد بھی وہ اسی خوبی سے چھپ گیا ہے کہ ناول نگاری میں ایک بالکل نئی اور اچھوتی ہیئت کا اضافہ ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس ہیئت کو قدم بقدم طے کرنا ایسا طویل عمل ہو گا کہ تنقید بھی کتاب کے برابر ضخیم ہو جائے گی۔ ہر چھوٹی سرخی ایک دلچسپ واقعہ سامنے لاتی ہے اور بڑی سرخی ان کا ایک مستقل ترتیب میں آ جانا دکھائی ہے۔ واقعات نئے اور دلچسپ ہیں اور ہر ایک سے یا تو کوئی نیا کردار ابھرتا ہے یا جانا پہچانا ہوا کردار کوئی نئی چھب دکھاتا ہے۔ تفصیل سے ہٹ کر ہم دیکھتے ہیں تو علی احمد۔ ایلی اور کچھ آگے چل کر شہزاد کے قصے پلانوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ علی احمد کے معاشقوں کے قصوں کا تار جس سے ایلی ضمنی طور پر وابستہ ہے ایک دلچسپ لیکر بناتا ہے۔ پھر ایلی اور شہزاد کے عجیب و غریب معاشقوں کا پلاٹ اس طرح آتا ہے کہ وہ ناول کا مرکزی پلاٹ ہو جاتا ہے۔ مگر اصل پلاٹ ایلی کی سرگزشت کا ہے۔ یہ ناول کو علی پور سے باہر لے جاتا ہے۔ لاہور اور امرتسر کے واقعات اس میں شامل کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کا وہ علاقہ جو علی پور کو مرکز مان کر اور امرتسر کو حد مان کر دائرے میں بلایا جاسکتا ہے۔ ناول کا ماحول ہے۔ ایلی دلی اور بمبئی کی بھی خبر لیتا ہے مگر جہاں بھی جائے یہ ماحول اس کے ساتھ ہے اور ساتھ نہیں تو اس کے دل اور اس کے کردار میں رچا بسا ہے۔ پنجاب اور اس کا وہ مخصوص حصہ جسے علی پور کہتے ہیں۔ ایک واقعاتی مگر نئی اور عجیب کائنات کی طرح پوری ناول پر حاوی رہتا ہے۔ اور مختلف بلکہ گونا گوں قصوں اور کردار کو ایک اتحاد میں لاتا ہے۔ اس طرح اس وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے مواد میں ایک تنصیل اتحاد صاف طور پر موجود نظر آتا ہے۔ ناول کی سرخی ”علی پور کا ایلی۔“ نہایت سادہ۔ نہایت سیدھی۔ سہل اور اردو میں سرخی دینے کی رسم کو دیکھتے ہوئے نہایت درجہ بلکہ ممکن حد تک بے مزا ہے مگر یہ انگریزی اور یورپی ناولوں کی سرخیوں سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

اور ان کی طرح بغیر کسی دکھاوے کے اول مواد کے ہر ہر جزو میں پردہ ہوئی نظر آتی ہے۔

جو داستان کی بنیادی چیز ہو گا پورے طور سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ہاجرہ کو وہ میروین اور صفیہ کو وہ ولن سمجھتا ہے اور علی احمد کے ہر حکم پر چلنے کو تیار ہے۔ علی احمد اس سے محبت کرتے ہیں جو اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ کھانا کھاتے وقت گوشت کی بوٹی اسے دو انگلیوں سے اٹھا کر دیتے ہیں۔ یہ محبت بڑے خاص قسم کی گوشت کی بوٹی دو انگلیوں سے اٹھا کر دیتے ہیں۔ یہ محبت بڑے خاص قسم کی گوشت کی بوٹی دو انگلیوں سے اٹھا کر دیتا ایسا پیار ہے جو ثابت کرتا ہے کہ علی احمد کا خاص رجحان تو اپنے کلام کی طرف ہے یا پھر عورتوں سے تعلق پیدا کرنے میں ہے مگر وہ ایلی کی طرف باپ کے فرائض اور باپ کی محبت کے تقاضے پورے کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ بہر حال ابتدا ایک فوکس ہے جس میں ساری ناول دکھائی دے گئی ہے اور اس سے علی پور کی طرف گریز اور اس کا مناسب بیان نہایت قدرتی ہے۔ اس کا آصفی محلہ ایک چھوٹی سی دلکش دنیا ہے اور اس کے بادشاہ اور ملکہ علی احمد اور صفیہ کے نقوش اور بھی گہرے کر کے سامنے لائے جاتے ہیں۔ فرحت بھی دبے پاؤں اس گھر میں آ جاتی ہے۔ صفیہ اور ہاجرہ کے آپس میں تعلقات انوکھا انتقام اور نرالا امتحان کے واقعات کے ذریعہ روشن ہو جاتے ہیں۔ پہلا باب ”مرد و پیش۔“ اسی طرح مکمل ہو جاتا ہے۔ ہر باب کی ایک سرخی ہے اور اس کے ہر حصہ کی ماتحت سرخی ہے جو مارجن میں چھپی نظر آتی ہے۔ ظاہر یہ تاثر ہوتا ہے ناول کی قاشیں اور اس پر چھوٹی قاشیں کر دی گئی ہیں، مگر یہ سب قدرتی اور منطقی تسلسل سے جڑی ہوئی ہیں۔ سرخیوں پر سرخیوں کا استعمال وضاحت میں اور دھیان لگا رہنے میں خاص مدد کرتا ہے۔ کتاب ایک ڈھیر ہے اور معمولی ڈھیر بھی نہیں بلکہ بڑے ساز کے قریب بارہ سو صفحوں کا چوڑا اور اونچا ڈھیر ہے۔ اک پہاڑی کئے مگر اس پر جانے کا راستہ چکر کا سہی مگر صاف ہے۔ ہر چوٹی اور موڑ پر نشان کے تختے لگے ہوئے ہیں اور سفر کرنے والے کی راہنمائی کرتے ہیں اور ہر ہر گوشے کی نوعیت کا علم بہم پہنچاتے ہیں۔ ”علی پور کا ایلی۔“ قدرتی طور پر ایک بے شکل پہاڑی ہے مگر مفتی صاحب نے پورے شعور کے ساتھ اور فنکارانہ اُچھ اور جدت کے ساتھ اس پر چلنے والے کے لئے ہر ہر قدم پر دلچسپ راہبر کے فرائض ادا کئے ہیں۔ بے خیالی میں یہ مان لیتا ممکن ہے ناول کا کوئی اسٹریکچر نہیں ہے مگر غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ایک بے ہتھم ڈھیر کو ناول نگار نے نہایت درجنوں چھوٹے حروف میں لکھی ہوئی سرخیاں ایک عظیم ڈھیر کو جو قدرت کا بنایا ہوا ہے انسان کے ذہن نشین کرانے اور مواد کو ایک فارم دینے میں خاص طور پر مدد ثابت ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ کتنا

اتحاد کا تاثر اسی سے شروع ہوتا ہے اور سارا مواد اس سے اہل کر نکلتا ہوا اور تمام میں پھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایلی جو بنیادی طور پر علی پور ہی کا ہے ایک طرف علی احمد سے متعلق ہے اور ان کی تمام دلچسپیوں میں ایک مبصر کی طرح شریک ہے پھر اس کی اپنی بھی دلچسپیاں اور مصروفیات ہیں۔ اسے تعلیم حاصل کرنا ہے اور ملازمت پر آنا ہے۔ اور اس سلسلے میں وہ واقعات کا منفرد مرکز نظر آتا ہے۔ اس کا خاندانی گھر ہے اور اس میں اس کے عزیز ہیں۔ جن سے بھی اس کے تعلقات ہیں مگر اس کی سب سے خاص دلچسپی اپنے ایک عزیز کی بیوی اور اپنے سے کافی بڑی چھ بچوں والی شہزاد سے ہو جاتی ہے۔ شہزاد بھی اپنی جگہ پر بڑی دلکش اور زندہ دل عورت ہے اور ایلی کے اس عشق کا قصہ ناول کا سب سے زیادہ دلچسپ پلاٹ ہو جاتا ہے۔ کسی پر اسرار اصول کے ماتحت ناول کو عشقیہ قصہ ہی مانا جاتا ہے اور عام ناول میں روایتی عشق کے واردات اور ایک معشوق کے لئے دو عاشقوں میں کش مکش سے ہی سارے قصے کی تعمیر ہوتی ہے۔ ممتاز مفتی کو جیسے کسی روایتی امر سے کوئی تعلق نہیں ہے ویسے روایتی عشق بازی بھی ان کے دائرے سے خارج ہے۔ ایلی اور شہزاد کے عشق میں ایک ہر بات حد سے زیادہ حقیقی ہے مگر ہم اسے بجا اور پر غلوص عشق ضرور کہیں گے۔ یہ عشق ناممکن بھی کہا جاسکتا ہے۔ اور لوگوں کی نظروں میں بہت زیادہ مضحک بھی ہو سکتا ہے مگر اس کی واقعیت میں ایسا زور اور ایسی عظمت ہے کہ ہم اس کے مظاہرے پر ایک عجیب - غریب دنیا میں کھو جاتے ہیں اور آخر میں اسی کو ناول کا حاصل اور ممتاز مفتی کا اہم ترین تجربہ مان لیتے ہیں۔ اس قصہ کے مدارج بہت ہیں اور بہت دلچسپ ہیں۔ مگر ان میں سے بہت ہی خاص کا ذکر کر کے ہم اس کی اہمیت نوعیت اور جدت کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایلی کی زندگی میں شہزاد اس کے ایک قریب عزیز کی دولہن کی طرح داخل ہوتی ہے اور علی پور کے آصفی محلہ کے سب سے خاص مکان یا محل میں آکر رہنے لگتی ہے۔ وہ ایلی سے کافی بڑی ہے اور پھر جلد ہی چھ بچوں کی ماں ہو جانے کی وجہ سے اس سے اور بھی دور ہو جاتی ہے۔ مگر دونوں کا دل قریب ہے۔ شہزاد اس کی طرف ایسی توجہ دکھاتی ہے۔ جیسے کوئی چاہنے والی بھلاؤں چھوٹے دیور کی طرف دکھائے اس معاملے میں اگر عشق بھی آ جاتا ہے تو وہ پاک قسم کا ہے۔ دونوں کا تعلق جنس سے بالاتر ہے۔ ایلی کے جنسی رجحان کو وہ یہ کہہ کر روکتی ہے کہ وہ اسے دوسری عورتوں کی طرح نہ سمجھے۔ ایلی اس کی طرف آکر پلنگ پر پڑا رہتا ہے۔ اسے مشین چلاتے ہوئے یا اور کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ اس کے بازوؤں پر ایلی کی خاص نظر رہتی

ہے۔ شہزاد بھی جب دیکھو ”چھن سے۔“ اس کی طرف آ جاتی ہے۔ اس مبسم مگر دلچسپ محبت میں جنس داخل ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ایک دفعہ جب شہزاد سلمان کی الگ کوٹھری میں ہے تو ایلی اس پر حملہ کر دیتا ہے مگر ناکامیاب رہتا ہے۔ اس سے ان دونوں کے تعلقات میں فرق نہیں آتا اور آگے چل کر ایک دن طے ہو جاتا ہے کہ ایلی شہزاد کو بھگالے جائے گا۔ وہ اس کام کے قانونی پہلو پر ایک مشہور وکیل سے رائے لیتا ہے۔ اور وکیل یہ سن کر کہ محبوبہ چھ بچوں کی ماں ہے۔ ایلی کو کسی دماغ کے ڈاکٹر سے رائے لینے کا مشورہ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عشق میں دماغی خلل کو بہت کچھ دخل ہے۔ شہزاد ایلی کے ذہن میں بس جاتی ہے اور ہر وقت اس کے تصور میں ”چھن سے۔“ آ جاتی ہے۔ وہ لاہور میں تعلیم کی غرض سے آکر رہتا ہے اور قریب کے گھر میں رہنے والی ایک اونچے خاندان کی لڑکی سے اس کی پینگ کافی بڑھتے ہیں۔ اس لڑکی کو سائیکل پر لئے ہوئے وہ لاہور کے مختلف مقامات پر جاتا ہے۔ دونوں بہت قریب آ جاتے ہیں اور یہ بھی امکان نظر آتا ہے کہ دونوں کی شادی ہو جائے مگر اس عشقیہ معاملے کے دوران بھی شہزاد اس کے تصور میں آتی رہتی ہے۔ ایلی کی ماں اس کی ایک جگہ معافی کی رسم بھی پوری کر دیتی ہے۔ مگر اس سے بھی ایلی کی شہزاد کی طرف توجہ میں کوئی فرق نہیں آتا علی احمد جس کا خاص مشغلہ عورتوں سے لگاؤ کرتے رہتا ہے ایلی کو رنڈیوں سے بھی متعارف ہونے کا موقعہ دیتا ہے۔ اور ایلی کو ایک رنڈی پھانس لینے کی بھی ناکام کوشش کرتی ہے۔ ایلی خود بھی ایک دن ایک گندے رنڈی خانہ کی گندگی میں کود ہی پڑتا ہے۔ مگر آخر میں ایسا کچھ ہوتا ہے کہ ایلی اپنی تعلیم ختم کر کے اسکول کی ملازمت پر آتا ہے اور شہزاد سے اس کی شادی ہو ہی جاتی ہے۔ دونوں کی زندگی بڑی خوشگوار نظر آتی ہے مگر آگے چل کر شہزاد کو اپنی پہلے شوہر کی لڑکی کی غلط شادی کی بنا پر ایلی کی توجہ اپنے شہزاد سے لڑکے عالی کی طرف رہتی ہے۔ وہ بہیئ میں صحافی کی حیثیت ملازم ہوتا ہے اور جب تقسیم ہند کے سلسلے میں لاہور میں فسادات ہوتے ہیں تو ”عالی عالی۔“ کرتا ہوا لاہور بھاگ آتا ہے۔

یہ خاص پلاٹ کا بہت ہی زیادہ مختصر خلاصہ ہے اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے پلاٹ معاون کی طرح شامل ہوتے رہتے ہیں۔ علی احمد کے نمین کا سپاہی بن کر متعدد معاشقے کرنے کا ایک طویل قصہ ہے۔ ایلی کے تعلیم اور اس کے بعد ملازمت حاصل کرنے کا بھی ایک الگ پلاٹ ہے۔ اس کے مختلف عزیزوں کے بھی قصے ”نمنا“ ساتھ ہو جاتے ہیں۔ ہر پلاٹ مناسب تفصیل

کے پہنچ جاتی ہوئی دکھاتی ہے۔ فسانہ آزاد کو اگر اس سے مقابلہ میں لایا جاسکتا ہے۔ تو تضاد کے لئے یعنی یہ واضح کرنے کے لئے کہ محض ناول نما فسانہ اور صحیح معنوں میں ناول کے درمیان کیا فرق ہے ”علی پور کا ایل۔“ کے بعد شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ناول اپنے پورے رنگ و روپ کے ساتھ اردو ادب میں کھب گئی۔ مفتی صاحب اس کے لئے داستان سرگزشت، ڈھیر وغیرہ کے الفاظ استعمال کریں۔ یعنی نقاد کی حیثیت سے اس کی بابت ناول کا لفظ استعمال کرنے سے پہچانیں مگر ان کے اندر جو فن کار ہے وہ تنقیدی شکوک سے بالاتر ہے۔ اور اس کی موج خرام بنے گل کترے ہیں اور ایک بالکل نیا انفرادی اور دلکش چمن ایجاد کر دیا ہے۔

(۳)

مفتی صاحب کی تخلیقی قوت کا سکھ ان کے افسانوں ہی سے جم چکا تھا مگر ”علی پور کا ایل۔“ اس کے بڑے پیمانہ پر عمل اور کامیاب عمل کی مثال سامنے لاتا ہے۔ تخلیق قصہ گوئی کے ذریعہ بھی ظاہر ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا خاص میدان باوجود کچھ جدید ناول نگاروں کے سخت اختلاف کے کردار نگاری ہی رہا۔ ”علی پور کا ایل۔“ میں ہر جگہ کردار امنڈتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی منفرد زندگی کا واضح اور دلکش نقش ضرور چھوڑ جاتا ہے مگر ناول نگار کی عظیم تخلیقی قوت کا بیان بظاہر تین لافانی کردار کے ذریعہ خاص طور پر ہوتا ہے اور یہ کردار پہلو بدلتے۔ ارتقا کرتے حقیقت سے ہمکنار رہتے ہوئے حقیقت سے زیادہ حقیقی ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اردو ادب میں ان کا کوئی ثانی نہیں نظر آتا۔

علی احمد کا کردار سب میں پہلا سامنے آتا ہے اور پوری ناول پر ایک مستقل نہ بدلنے والے شخص کی طرح چھایا رہتا ہے۔ اس کی زندگی کی ہر دلچسپی مقرر ہو کر ایک خاص ٹھپہ کی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے کام میں چوکس ہے۔ اس کے ابا عام طور پر ایک چٹائی پر بیٹھے ڈیسک پر رکھے ہوئے رجسٹر میں لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ وہ نمیش اتار کر بیٹھا کرتے تھے اور ان کی دھوقی میلی ہونے کے علاوہ پھٹی ہوتی تھی اور اس کے پلوؤں کو اوہر اوہر سر کے رہنے کی عادت تھی جو ایللی پر بے حد گراں گزرتی تھی۔

اس عالم میں وہ ہمیشہ بیٹھے نظر آتے ہیں اور بیٹھے بیٹھے آواز لگاتے ہیں۔ ”ایللی حقہ بھر دو۔“ حقہ بھی اس کے کردار کا ایک حصہ ہے اور پھر ان سب سے زیادہ دلچسپی عورتوں میں ہے ان کی ایک بیاہتہ بیوی ہاجرہ ایللی کی ماں ہیں۔ جو اب محض نوکرانی ہو کر رہ گئی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ

کے ساتھ سامنے آتا رہتا ہے۔ ہر سلسلے میں ڈرامائی سین بڑی مناسب اور موزوں مکالموں کے ساتھ سامنے آتے رہتے ہیں۔ کتاب کی ضخامت میں اضافہ رہتا ہے مگر کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی جملہ کیا لفظ بھی بلا ضروری ہے اور اسے ناول سے خارج کر کے ناول کو بہتر فارم دیا جاسکتا ہے۔ بنیادی طور پر ناول کرداری قسم کی ہے یعنی اس کا مقصد اہل فرد کو مختلف واقعات سے گزرتے ہوئے دکھانا ہے مگر اس میں ڈرامائی ناول یعنی ایسی ناول کے جو مختلف لوگوں کے درمیان کشمکش دکھائے اور وقت کے ساتھ اس کشمکش کے درجہ طے ہوں۔ عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں اور یہ کہتے ہی بنتا ہے کہ یہ ناول زور کے ساتھ ڈرامائی بھی ہے۔ مقامات بھی بدلتے ہیں مگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ علی پور اور اس کا آصفی محلہ اور اس میں بھی ایللی کا خاندانی محل ایک سنج ہے اور اسی پر سارا قصہ دکھایا جا رہا ہے۔ امرت سر، لاہور اور دوسرے مقامات پر کچھ ضمنی سین ضرور دکھائے گئے ہیں مگر یہ مرکزی اسٹیج سے اس قدر متعلق ہیں کہ اتحاد تاثر میں کسی طرح فرق نہیں آتا۔ آخر میں قاری کے تصور میں جو دنیا رہ جاتی ہے اس میں علی پور اس کے خاص قسم کے مکانات۔ آصفی محلہ اور اس کے خاص محل کے رہنے والے بڑے دلکش طریقہ پر زندہ نظر آتے رہتے ہیں۔ اتحاد کے ساتھ تو تنوع کو ہم آہنگ کرنے کی بڑی اچھی مثال قائم ہوتی ہے۔ مفتی صاحب فنکاری سے زیادہ زندگی کی طرف متوجہ ضرور ہیں اور اس کو اہمیت دیتے ہیں اور ناول کو ایک ڈھیر کہہ دینے میں کوئی سکی محسوس نہیں کرتے مگر ان کی ناول شاید لاشعوی اور قدرتی طور پر مواد کو اس طرح سینٹی اور ایک مستقل شکل یا ہیئت میں تبدیل کرتی جاتی ہے کہ ان کی غیر معمولی فنکارانہ صلاحیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ضخامت ڈراوینے والی چیز ضرور ہے۔ اور بیشتر ضخیم ناولوں کا مواد ناول نگاروں کی گرفت سے نکل ہی جایا کرتا ہے اس لئے سطحی نظر رکھنے والے لوگ ضخامت اور بے ترتیبی کو ہم سننے سمجھتے ہیں۔ ”علی پور کا ایللی۔“ ایسے کلیوں کی صاف رو ہے۔ اتنے وسیع مواد کو ترتیب میں لے آتا۔ ایک مستقل فارم کا تاثر دینا اور دلچسپی کو قائم رکھنا ہی وہ کمال ہے جو مفتی صاحب کو ناول نگاروں کی صف اول میں کھڑا کر دیتا ہے۔ طفیل صاحب نے ضخامت میں لطف پیدا کرنے کا خیال کرتے ہوئے ”علی پور کا ایللی۔“ کا سرشار کے فسانہ آزاد سے مقابلہ کیا ہے۔ ”علی پور کا ایللی“ فسانہ آزاد کا سا جنگل کا جنگل ضرور سامنے لاتا ہے مگر اس جنگل کی ایک بڑی اہم اور فنکارانہ ترتیب بھی ہے جو فسانہ آزاد ایسی بے نکانہ بیڑوں کو بہت پیچھے چھوڑ آتی اور اردو ناول کو ایک کڑبڑ جھالے سے ایک دلکش تعمیر میں ارتقا کر

ہیں اور ہمیں یہ محسوس کرا دیتے ہیں کہ ان کی زندگی کے سب ہی انسانی پہلو میں اور ہرگز کر یکچہر نہیں کے جاسکتے مگر ان کی جنسی زندگی کے مناظر ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ہر ایک مغرور، نیا اور نہایت درجہ دلچسپ اور ان کے کردار کی تمام زندگی اس بات میں سمٹ آتی ہے۔ عورت دیکھتے ہی یہ نین کا سپاہی کس طرح زندہ ہو جاتا ہے۔ کس ہوشیاری سے عورت کو تسخیر کر کے اپنے مخصوص کمرے میں لے جاتا ہے۔ یہ کمرہ ایک قلعہ ہے جس میں پکارے جانے پر بھی ایلی کو داخل ہوتے ہوئے براڈر لگتا ہے کیونکہ وہاں ہر دقت رجسٹر پر علی احمد کے قلم چلتے رہنے کے علاوہ کسی جنسی حرکت کے ہوتے رہنے کا بھی امکان ہے جس کو راز میں رکھنا رسم دنیا ہے۔

غرض علی احمد کا سارا قصہ اور اگر سارا نہیں تو اس کا اہم ترین اور دلچسپ ترین حصہ ان کی مختلف عورتوں کو دون کو بٹے کی طرح تسخیر کرنے کے واقعات کا احاطہ کرتا رہتا ہے۔ یہ واقعات بہت ہیں اور ہر ایک کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے ان میں سے کسی کا اقتباس کرنا طول عمل ہے اور ان کا خلاصہ کرنے سے ان کی زندگی ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ان میں ایلی بھی اسی طرح شریک نظر آتا ہے۔ جیسے ڈون کو بٹے کے سات ساکو پازا مردانیر کے یہ دونوں کردار یورپ کی تمام ناول نگاری میں ڈکنس کے سربیکو اور سام ویلر تک ماحول کے حساب سے روپ بدل بدل کر آتے رہے ہیں۔ مفتی صاحب کے دھیان میں بھی وہ آفاقی اور دائمی ٹائپ ہیں اور ”علی پور کا ایلی۔“ میں وہ علی احمد اور ایلی کے ذریعہ پنجاب کے اس علاقے سے متعلق ہو کر جو ناول کا مخصوص ماحول ہے پیش ہوتے ہیں۔ علی احمد ہر قسم اور ہر طبقہ کی عورت کے آتے ہی ڈون کو بٹے کی طرح اپنا بھلا تان کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ایلی ساکو پازا کی طرح اس کی بیدلی سے مدد میں مصروف نظر آتا ہے۔ گھریلو لڑکیاں جیسے سارا صبورہ و نندار عورتیں جو بیویاں بن کر رہنا چاہتی ہیں اور رہ جاتی ہیں۔ کیسیاں جو وقتی تعلق ہی کو کافی سمجھتی ہیں۔ ایک ہندو عورت جو علی احمد سے تعلق تو کر لیتی ہے مگر اس کے یہاں کا پانی نہیں پیتی اور ایلی کو اس کے لئے کنوئیں سے پانی نکال کر ایک بوتل میں بھر کر لانا پڑتا ہے۔ سب ہی ان کے دائرے میں آتی ہیں اور ان سے دم کے دم میں تسخیر ہو جاتی۔ اپنے سے رشتہ کی عزیز کی جوان بیوی شہزاد بھی ان کی توجہ کا مرکز ہو جاتی ہے اور وہ اس سے جس طرح لطف لیتے ہیں اس کا منظر بھی عجیب ہے وہ کھل کھلا کھل کھلا گلوٹ کی ہنسی ہنستے ہیں اور شہزاد کا نام لیتے جاتے ہیں۔ خیر ان کا وار خلل جاتا

ایک بنی ٹھنی بیوی صفیہ ہیں جو زیادہ تر ان کے کمرے کی زینت رہتی ہیں۔ مگر صفیہ ان کے بے پناہ جنسی رجحان کی ایک مثال ہے ورنہ

”دادا کی دفات کے بعد علی احمد نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ باہر کو ہمیشہ کے لئے آلو چھیلنے اور آنا گوندھنے پر مامور کر دیا اور خود کمرہ مت باندھ کر اپنے جذبہ تسخیر کو مطمئن کرنے چل نکلے۔ وہ اپنی ا۔ ستادہ چال۔ ابھری ہوئی چھاتی۔ فراخ پیشانی اور رنگین متبسم نگاہوں سے مردانہ وار تسخیر کرتے پھر ٹھیلے میں ڈان کو بٹے کی سی پر جوش لڑائی لڑنے کے بعد اس میدان کارزار کی دہلیز پر بچے کی طرح اس امید پر گر پڑتے کہ انہیں کوئی شفقت بھرا ہاتھ تھپک تھپک کر سلا دے گا۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت جنگجو سورما ٹین کے سپاہی اور دودھ پیتے بچے کی دلچسپ آمیزش سے بنی تھی اور چونکہ ان کا جنسی پہلو شخصیت کے جملہ پہلوؤں پر حاوی تھا اس لئے یہ آمیزش درحقیقت ان کی تمام تر زندگی کا تار و پود تھا۔ ٹین کا سپاہی جنگجو سورما۔“

علی احمد اس صفت کے تمام تر بندے ہونے کی وجہ سے یک طرفہ کردار یا کرسی کچر بھی کہا جاسکتا ہے۔ حالانکہ ان کی زندگی کے اور بھی پہلو ہیں۔ وہ ایلی کے محبت دار باپ ہیں اور اس کی ترقی کے لئے اپنی بساط بھر سب کچھ کرتے ہیں۔ وہ گھر کے اپنی حد تک اچھے خاصے منظم بھی ہیں اور عام انسانی فرائض کی ادائیگی میں کوئی خاص کوتاہی نہیں کرتے ہیں۔ مگر زیادہ تر ان کا ٹین کے سپاہی والا پہلو ہی سامنے آتا رہتا ہے اور بڑی دالمانہ دلچسپی کے ساتھ وہ عورتوں کی فتح پر فتح حاصل کرتے ہیں۔ ایسے ہیرو کی طرح مصروف نظر آتے ہیں۔ جس کا ایک اور ایک ہی مقصد حیات ہو۔ ان میں مجلسی زندگی کی جملہ صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ انہیں لکھنے سے عشق تھا عشق۔ یہ عشق گھر کا حساب اور پیدائش اور موت کی تاریخوں کے نوٹ کرنے پر محدود تھا۔ ایک جزل رجسٹر کے علاوہ وہ گھر سے متعلق ہر فرد کا ایک رجسٹر کھولے ہوئے تھے۔ پھر ان کے کردار میں روپے پیسے کی احتیاط کا پہلو بے حد اہم تھا۔

حتیٰ کہ وہ عورت پر روپیہ خرچ کرنے کے قائل نہ تھے اور ان کا خیال تھا کہ عورت کو تسخیر کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز وعدے ہیں روپے کا تصرف نہیں۔ ان کا ایمان تھا کہ عورت کی خوشی حقیقت سے تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ محض تخیل سے وابستہ ہے اور اسے روپے پیسے جیسی ٹھوس چیز سے کیا تعلق۔

ان کے کردار پورے طور پر پہلو دار (ROUND) کرنے کی مفتی صاحب کو شش کرتے



آتے ہی وہ ہر شخص کے لئے حسن و ناز کا عجیب کرشمہ ہو جاتی ہے۔ مگر ایلی اس سے سب سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔ جسے اس کے حسن کی ہر ہر ادا رومانیت کا مظاہرہ نظر آتی ہے۔ اس کی چال چہم سے آجائے۔ اس کا دوپٹہ اوڑھنے کا انداز اس کے ماتھے پر قل۔ اس کے گورے گورے کھلے بازو۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سبک مرمر کے پیر۔ اس کا لگاؤ اس کی بے نیازی۔ وہ چیز جسے محلے والے بے شری کہتے ہیں۔ اور اس کی بے پناہ ذہانت جس کی بنا پر وہ سب کے باوجود ایلی سے شوخی کرنے کا ہمانا نکال لیتی ہے بار بار بیان ہوتا ہے اور یہ سب ایک سچے عاشق کے نقطہ نظر سے جس کی بنا پر اس میں حد درجہ کا حسن بچنے لگتا ہے۔ مفتی صاحب شہزاد کو دنیا کی حسین ترین چیز کی طرح پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایلی کے تاثرات ہی کی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ شہزادے انہیں خود ویسا ہی دل تعلق ہے۔ جیسے ایلی کو تھا۔ وہ ساری ناول ان کے تجربہ کی چیز ہے ہی مگر اس تمام تجربہ میں جس چیز نے ان کے دل کو سب سے زیادہ چھوا ہے اور جس چیز نے ان کے تخیل کو سب سے زیادہ آتیا اور روشن کیا ہے وہ شہزاد یا شہزاد کی طرح کی کوئی محبوبہ ہے۔ ایلی کے شہزاد سے بڑھتے ہوئے تعلقات کی نفسیاتی تحلیل اس طرح ہوتی ہے کہ قاری کو وہ اپنا خود کا حال معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہی کردار نگاری کا کمال ہے اور ان تمام معاملات میں حد سے زیادہ واقفیت کے ساتھ جو رومانی پیچیدگی تعجب پیدا کرتی رہتی ہے اس کے انکشاف میں مفتی صاحب کردار نگاری کے اعلیٰ ترین وجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ کتاب کے وہ مقامات جن میں شہزاد چہم سے آجاتی ہے عجیب طرح روشن اور دلکش ہو جاتے ہیں۔ ان کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور تکرار کے باوجود ان کا لطف کم نہیں ہوتا۔ شریف کی اجازت سے پہلے پہلے ایلی کو چائے پر بلائے آتا۔ پھر اکیلے میں ایلی سے بے باک لانا۔ مختلف ملاقاتوں میں ایک وقت اتنا قریب اور اس وقت اتنا دور ہو جانا عجیب کرشمہ قدرت کی طرح آنکھوں کے سامنے پھرتا رہتا ہے۔ ایلی کے عشق میں جسمانی محبت کو دخل نہیں ہے۔ ایسی محبت سے اسے اپنے باپ کے معاشقوں کی وجہ سے نفرت ہو چکی ہے۔ اور قاری بھی شہزاد کے جسمانی تاثرات کے باوجود اسے آسانی چیز ہی کی طرح چاہنے لگتا ہے۔ وہ اسے قبول بھی کرتی ہے مگر نالتی بھی ہے۔ وہ اسے ستاتی بھی رہتی ہے۔ اس کے گالوں کو سلواتی ہے۔ اس کے چٹکی بھی لے لیتی ہے۔ مگر وہ شادی شدہ عورت ہے اور اپنے کو پسپا نہیں ہونے دیتی۔ ناول کا وہ سین جس میں ایلی بند بیٹھک میں چھپا بیٹھا ہے اور یہ انتظار کر رہا ہے۔ شہزاد وہاں آئے تو اس پر حملہ آور ہو شہزاد

مگر ان کی جنسی فطرت ایسی خوبی سے سامنے آ جاتی ہے کہ جس کی مثال ملنا نامکن ہے۔ مفتی صاحب نے جس تفصیل سے اور جتنے جزئیات کے ساتھ ان کے حالات بیان کئے ہیں وہ کردار نگاری کے لئے بڑے ضروری ہیں۔ خاص طور سے مزاحیہ کردار نگاری کے لئے ٹیکسپیر نے فلاساف کو پورے طور پر جمانے کے لئے ایک نہیں تین تین ڈرامے لکھے۔ ڈکنس نے پکوک کو پر اثر بنانے کے لئے ہزار صفحے کے قریب کالے کئے۔ ہمارے یہاں سرشار کا خوبی بھی اب تک اردو کا سب سے زیادہ مزاحیہ کردار اسی وجہ سے ہے کہ وہ ہزار و صفحوں پر بار بار آتا ہے۔ علی احمد خوبی سے تو کم ہی جگہ گھیرتے ہیں اور اس سے کہیں زیادہ پہلودار اور واقعاتی ہیں۔ وہ اپنے ماحول کے عظیم مضحک نمائندہ ہیں اور آفاقی مزاح کے بھی نمائندہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اردو ناول نگاری میں ان سے بہتر مزاحیہ کردار اب تک نہیں پیش ہوا تو غلط نہ ہو گا۔

”علی پور کا ایلی۔“ کا کردار نگاری میں دو سرا اہم شاہکار شہزاد ہے۔ یہ حسن جوانی اور زندہ دلی کی صورت ہے اور حسین عورت کی بیباکی اس میں عجیب و غریب کرشمہ دکھائی ہے۔ اس کا سب میں پہلے ذکر شریف سے اس کی شادی کے سلسلے میں آتا ہے۔ اس نے شریف پر تھیلی میں بند مینڈک پھینکا شریف بیان کرتا ہے۔

واقعی وہ شہزادی ہے۔ اسم با سمنی ہے۔ مجھے چھپ چھپ کر دیکھنے کے بعد ایک روز وہ مکان کی دلیز سے باہر آگئی اور میرے روبرو اس نے ایک مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت کر دیا۔  
— اس نے مینڈک کو ایک تھیلی میں ہی رکھا تھا اور جب میں سو رہا تھا تو وہ تھیلی میرے منہ پر پھینک دی اور ڈر کر اٹھ بیٹھا اور وہ ہنسنے لگی۔

اور پھر ایلی کی نگاہوں تلے ایک شوخ حسینہ آکھڑی ہوئی اور پھر شادی میں رخصتی کے بعد ریل کے ڈبے میں ایک مونگیا گھڑی اسے دکھائی دیتی ہے۔

”مونگیا گھڑی میں جنبش ہوئی دو سفید خون میں بھیکے ہوئے ہاتھ ایلی کی طرف لپکے تازہ خون کی لوکا ایک رپلا آیا۔ ایلی بھاگنے کی سوچ رہا تھا۔ کہ گھٹسری کے پٹ کھل گئے دو گلابی جھیلیں جھلکیں جن میں سیاہ گلاب ابھر رہے تھے۔ مٹلی ہیر ہونیاں رینگ رہی تھیں۔ اور بالاخر ایک چمکدار تبسم اور ایلی یوں کھڑا تھا جیسے پتھر کا بن چکا ہو ڈبے کے دوسرے لوگ جھملا کر معدوم ہو چکے تھے۔

شہزاد کی کردار نگاری اس کے دوسرے لوگوں پر تاثر کے ذریعہ ہوتی ہے۔ آصفی محلہ میں



”ایلی پاگل نہ بنو۔“ ایک بار پھر مرمریں جسم کے اس تودے میں حرکت ہوئی ”پاگل نہ بنو۔“ مدھم آواز میں مبہم سا احتجاج دیکھ کر وہ اور بھی بھڑکیا۔

دھپ — ایک ہوائی سی چھوٹ گئی اور معا” گرد و پیش تاریک ہو گئے۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ڈوب گیا ہو چاروں طرف اندھیرا تھا۔ گھور اندھیرا۔ خفت ناکامی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ خود ساختہ وحشت کا سارا ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ وہ دیوانگی ختم ہو چکی تھی اور اس کے عقب میں معصیت اور شکست کے منفی احساسات کا ریلا اڑا آ رہا تھا۔ ایلی نے محسوس کیا۔ جیسے اس کے منہ میں گھاس کا ٹکڑا ہو۔ وہی تنکا جو پورس اپنے منہ میں لے کر سکندر کے حضور میں حاضر ہوا تھا۔

اس نئی خفت کو مٹانے کے لئے ایلی مایک بار پھر آگے بڑھا اور دیوانہ وار شہزاد کے بند بند چومنے لگا۔ اور بالاخر تھک کر بچے کی طرح اس کے قدموں میں سر رکھ کر گر پڑا۔ ”مجھے تم سے محبت ہے شہزاد مجھے تم سے۔“

اپنے پاؤں پر آنسوؤں کے قطرے محسوس کر کے شہزاد اٹھ بیٹھی اور اس کا بازو ایلی کی طرف بڑھا اور اسے تھکنے لگا۔

اس کیفیت میں کتنا اطمینان تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے ماں کا ہاتھ سرنش کرنے کی بجائے معاف کر دینے کے بعد تھپک رہا ہو۔

ماں کا ہاتھ عجیب نفسیاتی اشارہ ہے۔ شہزاد عورت کے تمام منصب بڑی پیچیدگی کے ساتھ ادا کر رہی ہے۔ وہ ماں بھی ہے۔ بیوی بھی اور محبوبہ بھی۔ معشوقانہ انداز پوری بیباکی کے ساتھ اس میں شروع ہی سے دکھائی دیتے رہے۔ وہ ایک شخص کی قانونی بیوی بھی ہے اور بچہ پیدا کرنے میں زرخیز بھی کسی جاسکتی ہے۔ مگر ایلی کی طرف اس کا رجحان مادرانہ بھی ہے۔ ہمارے معاشرے کے لوگ عورت کے بابت دھڑے اچھی یا بری رائے دے دینے کے عادی ہیں۔ مفتی صاحب ان لوگوں سے کس قدر بالاتر ہیں اور عورت کی پیچیدہ اور غیر فطرت کا کتنا زبردست مشاہدہ رکھتے ہیں۔

شہزاد کا رویہ متضاد سوالات ایلی کے دل میں لاتا ہے اور ہم بھی ان سوالات میں پڑ کر تعجب کے عالم میں آ جاتے ہیں۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا شہزاد ایلی سے محبت کرتی ہے۔ اس سلسلے میں وہی معاملہ سامنے آتا ہے کہ نہ اعتبار مجھے ہے نہ اعتبار انہیں۔ مگر یہ صاف ہے کہ شہزاد کی اس

کو پورے طور پر سامنے لے آنے کا کمال ہے۔  
دروازہ کھلا شہزاد اندر داخل ہوئی۔

ایلی بجلی کی تیزی سے اپنی جگہ سے نکلا اور لپک کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ شہزاد نے ڈر کر ایک ہلکی سی چیخ ماری۔

کنڈی لگانے کے بعد وہ شہزاد کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

ایک ساعت کے لئے وہ گھبرا گئی مگر اسے پہچان کر مطمئن ہو کر بولی۔ ”تم یہاں۔“ ایلی کی خاموشی اور اس کے وحشت بھرے انداز کو دیکھ کر وہ از سر نو گھبرا گئی۔ ”یہ سب کیا ہے؟“ وہ بولی ”تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

ایلی جواب دیئے بغیر اس کی طرف بڑھا۔

”پاگل ہو گئے ہو کیا۔“ وہ زیر لب چلائی۔

وہ سمجھتی تھی کہ ایلی اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دراصل وہ اپنی شدید کمزوری کی خفت مٹانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے اور اپنا اصلی روپ چھپانے کے لئے اس نے شیر کی کھال پہننے کی مضحکہ خیز کوشش کی ہے۔

”خدا کے لئے۔“ وہ چلائی۔ ”ہٹ جاؤ۔ یہ کیا دیوانگی ہے۔“

”وہ چپ چاپ آگے بڑھتا گیا۔“

”ضرور تم پاگل ہو گئے ہو۔“ وہ بولی۔ ”تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔“

”ہاں۔“ — ایلی نے بھیانک آواز میں جواب دیا۔ ”نہیں ہوں۔“

”ایلی کوئی سن لے گا۔ دیکھ لے گا۔ پاگل نہ بنو۔ وہ چلائی ”پاگل نہ بنو۔“

ایک رتکین دھند کا ایلی کے قریب تر آ گیا اور قریب اور وہ دیوانہ وار اس کی طرف بڑھتا گیا۔ اس کے ہونٹ شہزاد کا خون چوسنے کے لئے جو تک کی طرح آگے بڑھے۔ ہاتھ بازو، منہ سر جسم وہ دیوانہ وار اس کے جسم کا ایک ایک حصہ چوسنے لگا۔ پہلے تو شہزاد نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی پھر وہ تھک کر۔ ہار کر ایک لاش کی طرح میز پر گر پڑی۔

بھیانک خاموشی طاری ہو گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کی وحشت ختم ہوئی جا رہی ہو۔ اس نے دیوانہ وار بھی میں نیا ایندھن دھیلنے کی کوشش کی۔ چرا چرا۔ ریشی کپڑے کے پھٹنے کی آواز آئی۔

پہلے ہی مار ڈالا۔ فلا بیر نے میدم بواری کے ساتھ بھی یہی کیا۔ مگر مفتی صاحب بالکل رومانی فنکار نہیں ہیں۔ وہ کامل ر۔ لمٹ ہیں۔ وہ اس حسین مجسمہ کو رفتہ رفتہ مٹا بھی دکھاتے ہیں اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ فنکار کو کچھ چیزیں چھوڑ بھی جانا چاہئے۔ بہر حال جس حسن و خوبی سے انہوں نے شہزاد کو پر اثر بنایا ہے وہ ان کے تجربہ کا اور اس کو نہایت کامیابی سے پیش کرنے کا حق ہے۔ اردو ناول نگاری کی وہ سب سے زیادہ حسین اور واقعیاتی ہیروئن ہو جاتی ہے۔ وہ پنجاب کے حسن و کرم کا اشارہ ہے۔ وہ ہر کرشمہ ساز عورت کا اشارہ ہے۔ وہ میکشپرس کی کلیوہا ترا کو مگر کی میلانات۔ ٹولسٹوئے کی انا۔ فلا بیر کی ایماء اور ہر عظیم ہیروئن کے ساتھ برابر کا مقابلہ کرتی ہے۔ اردو کی بساط ہی کیا ہے — وہ ہماری ناول نگاری میں سب سے بڑا فنی شاہکار ہے۔

(۴)

مگر ناول کی ریڑھ کی ہڈی۔ روح رواں اور جان ایلی ہے اور مفتی صاحب اسی کی طرف خاص طور سے متوجہ ہیں۔ دوسرے کردار اس کے ضمن میں آتے ہیں اور اس کی طویل اور وسیع سرگزشت کی سطح پر چھوٹے چھوٹے نقوش بنا کر چلے جاتے ہیں۔ ان نقوش میں علی احمد شہزاد کے نقوش زیادہ حصہ گھیرتے ہیں۔ ایلی کے کردار واضح کرنے کے لئے ہی ساری ناول لکھی گئی اور اس کو مفصل طور سامنے لانے کے لئے پوری ناول کے خلاصے کی ضرورت ہے۔ اسی کے بابت پیش لفظوں میں مفتی صاحب نے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی رائے میں ایلی ایسا کردار ہے تمام تجربے اور تعلیم کے باوجود نہیں بدلتا۔ جس کے خیالات اور جذبات میں ہمیشہ کشمکش رہی جس کی بنا پر وہ اپنا کوئی کردار نہ بنا سکا۔ دوسرے الفاظ میں وہ ہر اخلاقی اور نفسیاتی معیار سے بالکل بے کردار شخص ہے مگر پھر بھی وہ مستقل حقیقت ہے۔ اسے پنجاب کے اس خطہ کا نمائندہ کہا جاسکتا ہے جس کا مرکز علی پور ہے اور جس کا دائرہ امرتسر اور لاہور تک بھی جاتا ہے۔ وہ دلی اور بمبئی میں بھی مقیم رہتا ہے مگر اپنی مخصوص پراسرار صنعت نہیں کھوٹے۔ لیلہ پنچھی جو پانی میں ڈبکیں لگاتا ہے مگر پرچھاڑ کر پھر جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے۔ شاید بلکہ یقیناً ایسے لوگ کسی خاص جغرافیائی علاقہ سے مخصوص نہیں کئے جاسکتے۔ شاید بلکہ یقیناً ہر شخص کے اندر باوجود شدید اختلاف کے ایک ایلی چھپا ہوا رہتا ہے۔ وہ معمولی نہایت ہی معمولی ہستی ہے اور اسی لئے نہایت درجہ معمولی ہے۔ ہمارے تصور میں ایک معمولی انسان ہے مگر یہ معمولی انسان کہیں

زمانے میں جب ایلی چھٹی لے کر علی پور آتا ہے اور شریف بھی آ موجود ہوتا ہے حرکات سے محبت نکلتی ہے اور وہ اسے بڑی ذہانت سے بیباکی کے روپ میں چھپاتی رہتی ہے۔ وہ ایلی کو ڈھونڈھنے جاتی ہے۔ اور اسے گھیسٹ کر لے آتی ہے۔ اپنے شوہر کے سامنے ایک فرضی مجذوبہ کی باتیں کرتی ہے جن کا اشارہ اپنی طرف ہوتا ہے۔ وہ اس پردے میں صاف صاف عشق کا اظہار کرتی ہے۔ اور اکیلے میں اس کی تصدیق بھی کر دیتی ہے۔ گھر میں اور محلہ میں ہر ایک کو شبہ ہے کہ وہ ایلی سے عشق لڑا رہی ہے۔ اور وہ اس عشق کو کبھی بیباکی میں اور کبھی زکوت کی باتوں میں چھپا لیتی ہے۔ اس کا چھم سے آجانا۔ اس کا چھن سے آجانا قیامت ہے۔ وہ وارفتہ بھی ہو جاتی ہے مگر اپنے کو سنبھالے رہتی ہے۔ وہ اپنے میاں کی افرنگی سے نفرت کا اظہار بھی کرتی ہے اور ایلی سے محبت کا بھی۔ اس کی محبت میں جنس کا مقام بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ اپنے کو اس سے بالاتر سمجھتی ہے اور پاک عشق کرنا چاہتی ہے۔ اس کے میاں سے ایلی رقاقت محسوس کرتا ہے۔ تو اسے سمجھاتی ہے کہ جسمانی تعلق کچھ نہیں ہے۔ کئی بار وہ کہہ دیتی۔ ”تم مجھے سمجھ گیا ہو۔“ تم مجھے نہیں سمجھتے۔ حقیقت میں وہ ایسا راز حیات ہے جس کو سمجھنا مشکل ہے مفتی صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے۔ مگر وہ ایسا کرشمہ ہے۔ جسے انہوں نے محسوس کیا ہے اور وہ ہمیں محسوس کرانے میں پورے کامیاب ہیں۔ ایلی اس کے پاس سے چلا جاتا ہے۔ دوسری غورتوں کی طرف متوجہ ہوتا رہتا ہے مگر وہ اس کے دل و دماغ میں ایسی بس گئی ہے کہ چھن سے تصور میں آ جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ بھی کامیاب زندگی گزار رہی ہے۔ گھر کے ہر کام میں فرد ہے اور دھڑا دھڑپے بھی ہو رہے ہیں۔ ایلی سے ملاقات ہوتی رہتیں ہیں۔ کبھی نیاز اور آخر میں اس چھ پنچوں کی ماں سے کنوارا ایلی شادی کر لیتا ہے۔ ایلی نوکر ہے اور وہ اس گھر کی ہی نہیں دل کی بھی شہزادی بنی رہتی ہے۔ شادی کے بعد وہ دھیمی پڑتی جاتی ہے۔ سخت بیمار بھی ہوتی ہے مگر ہومیوپیتھ کی دوا سے مرنے سے بچ جاتی ہے۔ مگر اپنی شریف سے لڑکی کے بارے میں اس کا ایلی سے جھگڑا ہوتا ہے۔ وہ بالکل دوسری چیز ہے ایلی اس سے الگ بھی ہو جاتا ہے۔ اور ہمارا دل بھی اس کی طرف سے پھر جاتا ہے۔ آخر میں وہ دق ہو کر مر جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قیامت کے حسن پر پانی پھر گیا۔ شہزاد کے ارتقاء کے سلسلے میں مجھے ناول نگار کی حیثیت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس کے آخری دور کا کردار نہ دکھایا جاتا تو حسن اور خوبی کی مکمل تصویر ہمارے تخیل پر ثبت رہتی۔ ٹولسٹوئے نے انا کارینہ کو اس درجہ پر پہنچنے سے

ڈھونڈے نہیں ملتا اس لئے اسے ٹایاب کہہ دیتے ہیں۔ ایلی وہ ٹایاب معمولی انسان ہے۔ مفتی صاحب کو وہ مل گیا ہے اور اسے انہوں نے صفحہ ناول پر اتار دیا ہے۔ ناول کا شروع ہی سے یہ مقصد رہا کہ ناول انسان کی شکل دکھائے۔ میلڈنگ نے ٹوم جونس میں ایسا ہی کردار پیش کیا جو تمام ناول نگاروں کے لئے آج بھی ماڈل ہے۔ مفتی صاحب نے بھی ایلی میں ایسا کردار پالیا ہے شاید وہ خود ایلی میں اور ساری سرگزشت ان کی آپ بیتی ہے۔ ان میں ادیب کی اعلیٰ صلاحیتیں بھی ہیں جو ایلی میں نہیں ہیں مگر ان کی نظر اپنی ان صلاحیتوں پر ہے جو نہایت معمولی نہایت عام ہیں اور جن میں پنجاب کا ہر آدمی ہندوستان کا ہر آدمی اور دنیا کا ہر آدمی ان کا حصہ دار ہے۔ دوسرے ناول نگار جب اپنے کو اپنی ناول میں پیش کرتے ہیں تو اپنی مخصوص صلاحیتوں کو سامنے لاتے ہیں یا انکساری میں اپنے کو اصلیت سے گرا کر پیش کر دیتے ہیں۔ مفتی صاحب کو نہ بردھانے سے سروکار ہے نہ گھٹانے سے۔ ان کے ذاتی تجربہ سے جو آدمی محض آدمی نکلتا ہے وہ ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ عموماً بڑا آدمی اور اس کا کوئی بڑا کام سنسنی پیدا کر کے عام آدمی کے لئے دلچسپ ہو جاتا ہے۔ ایلی میں کوئی بھی بڑائی چھو کر بھی نہیں گزری اور نہ اس نے کوئی بڑا کام ہی کیا۔ وہ نہایت معمولی گھر میں پیدا ہوا۔ نہایت معمولی ماحول سے زندگی بھر گزرتا رہا۔ احساس کمتری کے سوا اسے کوئی احساس نہیں ہوا۔ قوت ارادہ کا تو اس کے اندر سوال ہی نہیں اٹھتا۔ زمانے کے اثرات اسے جیسے بہاتے گئے وہ بہتا رہا۔ ٹوم جونس راسکل ہے مگر تجربہ اسے ہیرو بنا ہی دیتا ہے۔ جرمن ناولوں میں جنہیں ROMAN BUILDING کہا جاتا ہے ایک معمولی لڑکا ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا نظر آتا ہے اور آخر میں غیر معمولی مقام حاصل کر لیتا ہے۔ ایلی یوں بھی ارتقاء نہیں کرتا۔ وہ ڈبکی لگانے کے بعد پر جھاز کر ویسے کا ویسا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کسی قسم کی قدردانوں سے سروکار نہیں جو وہ اپنے کو بہتر بنائے۔ وہ مٹی میں گڑا ہوا پودا ہے جس کا قد اور سن مٹی اور پانی کے اثر سے بڑھ جاتا ہے مگر جس میں ذہنی یا اخلاقی شعور یا رجحان آنے کا سوال نہیں۔ باپ کا زور اگر نہ ہوتا تو وہ تعلیم بھی نہ حاصل کرتا۔ بسر اوقاف کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ ملازمت بھی نہ کرتا۔ اگر وہ جائدار نہ بنایا گیا ہوتا تو وہ جیتا بھی نہیں۔ وہ ایسا آدمی ہے جس کو ہم چھوٹے ہی بڑا گھٹیا کہہ دیں گے مگر وہ اس حد سے زیادہ گھٹیا پن کی وجہ سے نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔

مفتی صاحب کے ہم وطنوں سے یعنی لاہور اور امرتسر کے جوار کے لوگوں سے ملنے تو ان

میں ہر شخص ہر شریف خاندان اوسط طبقہ کا فرد ایلی معلوم ہو گا۔ ایک قصباتی ماحول کے ایک خاص گھر میں پلا ہوا۔ والد معمولی ملازمت پر رہے ہوں گے مگر مستعد اور کام میں چوکس ہوں گے جس کی وجہ سے اس کی زندگی ایک معمولی دھڑے پر لگ گئی ہو گی۔ بچپن کھیل میں یا گھر کے معمولی کام بدلتی سے کر آنے میں گزرا ہو گا۔ زبردستی اسکول اور کالج بھی گیا ہو گا۔ اور کسی نہ کسی طرح تعلیم پٹا کر معمولی ملازمت پر بھی آگیا ہو گا۔ رسمی طور پر اس کی سنگتی اور شادی بھی ہو گئی ہو گی۔ اگر اس میں غیر معمولی بات ہو گی تو وہ اس کی عورتوں کی طرف توجہ سے نمایاں ہو گی مگر یہ بات بھی غیر معمولی نہ کہی جاسکے گی کیونکہ اس کے خاندان میں ہر شخص اور اس کے ساتھیوں میں ہر شخص کو اسی کی طرح کی جتنی دلچسپی رہی ہو گی۔ عشق و حسن کا معیار اگر پست نہیں تو اعلیٰ بھی نہیں ہو گا۔ زندگی سے لگاؤ بھی جبلی سطح کا ہو گا اور اس میں ان خاص جذبات کے زور کی کوئی گنجائش نہ ہو گی جو اعلیٰ انسانیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسے ہم اچھا آدمی نہیں کہہ سکتے تو برا بھی نہیں کہیں گے۔ اس میں خود غرضی بھی واجبی واجبی ہو گی۔ وہ ایک گھٹیا سا معلوم ہو گا جو زمین پر اپنا جسم بڑھاتا گھٹاتا ہوا نظر آئے گا۔ وہ اچھائیوں اور برائیوں میں پڑنے کا برابر اہل اور نااہل ہو گا۔ ہم خالص جذباتی EVERYMAN کی تصویر ہے۔

اس کے حالات بھی ایسے ہی معمولی ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ ان شہریوں اور ان قصبوں اور ان گھاؤں سے مخصوص ہیں جہاں ایلی جاتا ہے۔ اس کی لاتعداد مردوں اور عورتوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ان میں وہ سب سے مختلف اور اس طرح مختلف نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر شخص کے ساتھ تو لے جا رہا ہے اور اس کا وزن سب سے کم نکل رہا ہے اور ناولوں کے ہیرو اس لئے دلچسپ ہوتے ہیں کہ وہ وزن میں سب سے کچھ نہ کچھ زیادہ ضرور نکلتے ہیں۔ ایلی کی دلچسپی ہی ہے کہ وہ ہر کام میں نااہل ثابت ہوتا ہے اور ہر شخص سے ہر بات میں کم نظر آتا ہے۔ یہ ایک عجیب راز ہے جس کو مفتی صاحب نے دریافت کر لیا ہے۔ اور اس کی بنا پر ہم ایلی کو حد سے زیادہ دلچسپ پاتے ہیں۔ اس کی باتیں حماقت میں مگر ہم کو ان پر ہنسی نہیں آتی۔ نہیں وہ ہر گز احمق نہیں ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا کوئی خاص تاثر بھی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی ہم اسے سپاٹ نہیں کہہ سکتے۔ اس میں بے پناہ سادگی ہے اور خلوص ہے۔ وہ محترم بازی کر ہی نہیں سکتا۔ وہ کسی کو برا نہیں سمجھتا۔ وہ مردم شناس بھی نہیں ہے مگر کسی کے دھوکے میں بھی نہیں آتا۔ شہزاد کے سلسلے میں اس کے اندر ڈھلاہٹ کے باوجود ایک عزم اور

کردار نگاری کے سلسلے میں بیسویں صدی سے پہلے ہی کی راہ پر چل رہی ہے مگر غور سے دیکھنے کی ایسی ضرورت نہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جدید ناول کی طرح یہ مرکزی کردار کی اندرونی زندگی کو بھی ہر قدم پر سامنے لاتی ہے۔ ظاہرہ واقعات کے ساتھ ساتھ ایلی کی اندرونی دنیا بھی سامنے آتی رہتی ہے۔ شروع ہی سے اس کا اپنی سوتیلی ماں صفیہ کی طرف رد عمل اور اس کے مندی لگے ہوئے ہاتھوں سے اسے نفرت کا بھی تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ شنزاد کا عشق ایلی کی اندرونی یا ذہنی کشش کا اظہار ہے وہ گوگو کا عالم وہ یقین اور بے یقینی کا چکر جو اس کے دماغ میں چل گیا ہے پوری نفسیاتی تخیل کے ساتھ بیان ہوتا رہتا ہے۔ شنزاد اس کے سر پر بری طرح سوار ہوتی ہے۔ اور جب وہ دوسری عورتوں کی طرف بھی متوجہ ہے اور ان سے عشق بھی لگا ہوا ہے۔ تو بھی شنزاد چھن سے اس کے سامنے آتی رہتی ہے۔ اس کی اندرونی اور بیرونی دنیا میں ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہیں اور اس کی کردار نگاری اس طرح وہ سطحوں پر کردار نگاری کی مثال ہے جیسی جدید ترین ناولوں میں خاص طور پر "تیس جو افس" کی "جولیس" میں کہتی ہے۔ مفتی صاحب INTERNAL MONO LOGUC کے فن سے بھی واقف ہیں اور اسے بھی بڑی چابک دستی سے برتتے ہیں۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے جدید نفسیات کو افسانہ سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس سلسلے میں کمال پر ایلی کے کردار کو واضح کرنے میں پہنچے ہیں۔ مر جانے کے بعد بھی شنزاد ایلی کے لئے ایک زندہ حقیقت ہے جو اسے جگہ جگہ پر دکھائی دیتی ہے۔ جب وہ تقسیم کے نتیجے میں ترک وطن کر کے بھاگ رہا ہے۔ تو اس کے تصور میں شنزاد اسی طرح آتی ہے۔

شنزاد کھڑکی سے چلا کر بولی۔ "میں رکاوٹ تھی۔ میں دور ہو گئی۔" وہ بولی۔ "ایلی نیا جیون جیو۔ نیا جیون جیو۔"

شنزاد کے بعد اس کی محبت کا ظاہری مرکز اس کا شنزاد سے لڑکا عالی ہو جاتا ہے۔ وہ بھی میں یہ سن کر کہ گورو اس پور ہندوستان میں آگیا۔ پاگل سا ہو جاتا ہے۔ ہزار جتن کرتا ہے کہ امرتسر اور علی پور پہنچ جائے۔ تمام کوششیں ناکامیاب ہوتی ہیں۔ وہ تھک جاتا ہے۔

اس کی آنکھوں تلے عالی دونوں ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا۔

پر مٹ دفتر میں وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ "عالی عالی۔" اس کے دل میں کوئی رو رو کر تھکا ہوا بچہ بلک رہا تھا۔

استقلال آ جاتا ہے اور وہ اس سے ہر مخالفت کے باوجود شادی کر لیتا ہے یوں تو اسے دل پھینک کہہ سکتے ہیں مگر شنزاد سے اس کی محبت میں استقلال ہے۔ وہ کسی سے جھگڑتا نہیں مگر شنزاد ہی سے اس کا جھگڑا ہو کر رہتا ہے شنزاد سے عشق اور آخر میں شنزاد سے جھگڑا ہی اسے جذباتی سطح پر نہایت درجہ معمولی رویہ کے انسان سے اوپر لے آتے ہیں۔ آخر میں اس کے ملاقاتیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور اس کی "ذہن" قسم کے لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں جن میں وہ کچھ زیادہ مستقل کردار دکھائی دیتا ہے۔ اس کے مذہب کے بابت مفتی صاحب بتاتے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ وہ بے حد ڈرپوک تھا لیکن اللہ پر اس کا ایمان ڈر کی بنیاد پر قائم نہ تھا۔

اللہ کا تخیل جو اس کے دل میں قائم ہوا تھا۔ وہ جنہیں خنیزن کی فلکیات ہائوس کپلے کے سائنس کا مجر، سے متعلق مضامین برٹریڈرسل کے فزیکس سیتا کے جذبات کاؤنٹ کر۔ مکین کے مشاہدات اور ایچ۔ جی ویلز کی سائنٹیفک فکشن کتابوں سے اخذ تھا۔

ڈر کے بجائے اس کا دل اللہ تعالیٰ کی عظمت کے جذبات سے معمور تھا۔

ہندویت اور عیسائیت کے مطابق اللہ کی محبت کا تخیل اس کے لئے قابل قبول تھا۔ اسلام کے مطابق تو صرف اللہ ہو اللہ ہو تھا، عظمت عظمت عظمت عظمت محبت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا اور اس بے پناہ عظمت کا اسے کچھ کچھ احساس تھا۔ جو اس نے مغربی علماء کی تحریروں سے اخذ کیا تھا اسلام سے نہیں لیکن اس کی جذباتی دنیا ذہنی خیالات سے دور اپنے ہی رنگ میں بستی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایلی ویسا معمولی نہیں ہے جیسا کہ وہ اپنی سرگزشت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی دنیا بھی ہے اور وہ جدید ترین خیالات سے ہم آہنگ بھی ہے مگر وہ ایسی واقعاتی دنیا میں ہے جہاں وہ محض انسان ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ ایلی کی اور اس دنیا کی ذہنی اور کرداری سطح ایک ہے۔ اس لئے وہ نمائندہ اور نارمل انسان ہے۔ آخری دور میں وہ معمہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں خیال آتا ہے کہ کب وہ معمہ نہیں تھا۔ سب سے بڑا معمہ یہی ہے کہ ہر چیز صاف اور معمولی ہو مگر پھر بھی وہ ہمیں ہر قدم پر تعجب میں ڈالے اور معمہ سے زیادہ معمہ ہوتی جائے۔ ایلی اپنی تمام سادگی کے باوجود اور سادگی کی وجہ ہی سے ایسی ہی چیز ہے۔

سطحی نظر سے دیکھنے پر یہ محسوس ہو گا کہ یہ ایلی کی ظاہری سرگزشت ہے اور اس طرح

اور اسی طرح اپنے زور سے پڑھنے والے کو پسا کر دیتی ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ وہ فنکاری میں ناکامیاب ہیں ان کا کوئی مقصد نہیں ہے اور وہ فضول کی بکواس کا ایک ڈھیر لگائے ہیں۔ مگر ان کی ناول کا منظر ہمیں یہ کہنے سے روک دیتا ہے بلکہ منہ بند کر دیتا ہے اور ہم اس کے خلاف کچھ کہنا نادرانی مان لیتے ہیں۔ یہ ناول ہے۔ اس معنوں میں ناول نہیں جو ایک دلچسپ قصہ سنا کر ہمیں محفوظ کرتی ہے بلکہ اس معنے میں ناول کہ یہ ایک زندگی کی اور ایک گروہ کی زندگی کی مکمل تصویر ہے اور یہ تصویر خاص طور پر ایک مرکزی کردار کے ضمن میں لائی گئی ہے۔ اس میں وہ پھیلاؤ ہے اور جزئیات کی طرف وہ توجہ ہے جس کے برتنے میں روسی ناول نگار سب سے آگے ہیں۔ اس میں زندگی کا سا چڑھاؤ اور اتار ہے اور قصہ ہیرو کے بچپن سے شروع ہو کر ایک نئی زندگی کے آغاز تک جاتا ہے، اس کی کوئی نئی بندھی ہیئت نہیں ہے مگر وہ وسیع ہیئت کا تاثر ضرور دیتا ہے۔ یہ ایک عظیم دریا کی طرح ہے جس کا خراج ایللی کا گھر ہے اور پھر وہ پھیلتا ہوا آصفی محلے، علی پور، امرتسر، لاہور تک جاتا ہے۔ وہ سارا خطہ جو گرداسپور سے لے کر لاہور تک ہے اس کی وسعت میں آ جاتا ہے۔ پھر یہ بھی تک پھیل کر سمندر کو بھی اپنے میں ملا لیتا ہے۔ اس کی سطح پر کثرت سے انسان پھیلے نظر آتے ہیں۔ جتنی وسعت بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی انسانوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے۔ کچھ انسان مرکزی ہو جاتے ہیں اور بار بار آتے رہتے ہیں۔ یہ ایللی کے قریبی عزیز ہیں۔ سب سے زیادہ ایللی خود ہے جس کو ہم اس سیلاب میں ہر جگہ ڈبکی کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس کو اس کا شناور کہنے کو جی چاہتا ہے مگر وہ شناور کی سی طبیعت اور مقصد نہیں رکھتا۔ وہ ہا چلا جاتا ہے سب لوگوں کی طرح کا ہے مگر سب سے مختلف ہے۔ وہ فرد بھی ہے مگر اس کی انفرادیت کی حد متعین نہیں ہو سکتی اور ہم اسے ہر جگہ اور ہر وقت محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ ناول میں بس وہی وہ ہے اور شناور تک اس کے ذہن کی پیدوار ہے۔

”یہ محسوس ہوتا ہے کہ مفتی صاحب اور ایللی ایک ہی شخص اور مفتی صاحب کے جاننے والے یہ تصدیق کرتے ہیں کہ ”علی پور کا ایللی۔“ ایک خود نوشتہ سوانح ہے۔ مگر میں سوال کرتا ہوں کہ کیا ممکن ہے؟ یہ کتاب تاریخ نہیں ناول ہے اور ناول میں اس کا مصنف اپنے کو ضرور پیش کرتا ہے مگر وہ پورا کا پورا اپنے کو اتار نہیں سکتا۔ نام بدلنے سے اور تخیل کے دائرے میں آنے سے مصنف خود دو سرا آدمی ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایللی اور مفتی صاحب ایک نہیں ہو سکتے اور ایللی تاریخ کا فرد نہیں بلکہ تخیل کی تخلیق ہے اس لئے اس کی سرگزشت کتنا ہی واقعات کا

بہر حال ناول کے آخری صفحات میں یہ دوہری کردار نگاری بڑی فراوانی سے نمایاں ہے اور ناول کا خاتمہ یوں ہوتا ہے:- حضور حضور — ایللی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

مفتی صاحب نے پیش لفظ میں اپنے فن کی طرف کوئی خاص اشارہ نہیں کیا۔ ناول میں ایک جگہ وہ دوستو فسکی کے ”برادر کارمازوف۔“ کا ذکر کرتے ہیں اور ہم کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کی کردار نگاری دوستو فسکی سے گہرے طریق پر متاثر ہے۔ ایللی کے کردار میں دوستو فسکی کے فن کا والہانہ پن اور فن سے بے نیازی ہے مگر وہ اپنے کردار کی تحلیل نفسی میں جدید ناول نگاروں کے لئے ماڈل ہے۔ مفتی صاحب بھی اس ماڈل پر چلنے میں پورے کامیاب ہیں۔ اور یہ کامیابی کسی ملک کی ناول میں بھی عظیم ہو سکتی ہے۔ اردو ناول نگاری میں تو یہ ایک مستحکم جھنڈا گاڑ دیتی ہے۔

(۵)

مجھے محسوس ہوا کہ اس ناول پر تنقید کرنے میں تنقید کے پر جل ہی نہیں گئے بلکہ جل کر راکھ ہو گئے اور وہ راکھ بھی اڑ گئی۔ اس کا رخ و اقصیت کی طرف ہے جو ناول کی جان اور و اقصیت بھی یہاں انگریزی اور فرانسیسی والے سے زیادہ روسی ناول کی تفصیل اور جزئیات میں گہری دلچسپی کے ساتھ برتی گئی ہے اور پھر جدید و اقصیت کی پیچیدگی یا پیچیدہ عالموں سے دلچسپی کا بھی خیال رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے ناول کا ضخیم ہو جانا لازمی تھا اور اس دور میں ضخیم ترین ناول ہو بھی گئی ہے۔ مگر مفتی صاحب نے جو کمال دکھایا ہے اسے جانچتے وقت تمام اصول ٹوٹ جاتے ہیں اور پھر بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ایک فن اپنی پور زندگی کے ساتھ موجود ہے اور اپنا تخیل اثر جماتا چلا جاتا ہے۔ یعنی اس ناول میں وہ جادو ہے جو سرچڑھ کر بولتا ہے۔ میٹھو آر نڈ کا سب سے اہم اصول یہ تھا کہ ادب کو زندگی پر تنقید ہونا چاہیے۔ مگر ٹولسٹو کی ”انا کارینا۔“ پر مضمون میں اسے اپنا اصول توڑتے ہوئے اس کی تعریف میں یہ کہا کہ یہ تنقید حیات نہیں ہے بلکہ ہو ہو حیات ہے۔ مفتی صاحب کی و اقصیت نگاری اور نفسیات نگاری کے بابت بھی ایسا ہی کچھ کہہ دینا پڑتا ہے۔ یہاں زندگی کا نقشہ نہیں ہے جس کے حدود ناپے جا سکیں۔ جس کے تاثرات کے صحیح یا غلط ہونے کا اندازہ لگایا جاسکے۔ یہاں زندگی ہے زندگی ہی ہے اور مکمل زندگی ہے۔ مفتی صاحب اسے ”ڈھیر۔“ کہتے ہیں مگر یہ محض ڈھیر نہیں ہے اس میں ترتیب ہے مگر وہ ترتیب ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ وہ ہو ہو زندگی کی طرح ہے

اس ناول کے مختلف حصوں میں بیانات میں جو بہت کم ہیں اور مکالموں میں جو بڑی فراوانی سے لائے گئے ہیں زبردست ڈرامہ نگاری کا شعور نظر آتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کی قوت اور اس میں مشق مسلم ہے اور بیان طویل چیز کو ربط دینے میں بھی کامیاب ہیں۔ وہ کسی فن کے تعلق نہیں ہیں مگر فن ان کے سامنے ہاتھ باندھے نظر آتا ہے اور وہ اس کا احترام کرتے ہوئے جدھر چاہتے ہیں ادھر اس کی باگ موڑ دیتے ہیں۔ وہ صرف ایک اصول کے قائل ہیں جو حافظ کے اس شعر سے ادا ہوتا ہے۔

ورہیں آئینہ طوطی منہم داشتہ اند آئچہ استاد ازل گفت ہلای گویم

مگر وہ ایسی طوطی ہیں جس کو استاد ازل نے ناول نگار ہونے کی صلاحیت دی ہے اور پھر شعور اور مشق سے اس صلاحیت کو آگے بڑھا کر وہ اس مقام پر آگئے ہیں۔ وہ بے ساختگی سے اور ظاہرہ بے پردہی سے لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے تجربہ کا دریا امنڈتا چلا آ رہا ہے اور وہ اسے بغیر زور لگائے ہوئے فن میں تبدیل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ فن اپنی قدرتی جگہ لئے ہوئے ہے اور انگلی کے سیلاب میں ایسا چھپ گیا ہے کہ اس کی طرف توجہ جانا ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ فنکاری مشکل کام ہے اور اس میں کامیابی کی داو دی جاسکتی ہے مگر فن کو چھپانا مکمل ہے اور مفتی صاحب اس مکمل پر پہنچ گئے ہیں۔ سطحی نظریہ یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ ”علی پور کا ایلی۔“ میں کوئی فن نہیں اور اس کے مصنف نے فن سے بے نیازی کا اعلان بھی کر دیا مگر غور کی نظروں کو یہاں وہ فن نظر آئے گا جو بہت اوپر چلا جاتا ہے اور حقیقت کو اس طرح سامنے لاتا ہے جہاں فن کا ربول اٹھے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

آخر میں میں اس بات پر واپس آتا ہوں کہ ”اے آدم جی انعام نہیں دیا گیا۔“ ممکن ہے کہ اس بات پر پبلک سے شکایت ہو مگر اس سے انعام دینے والوں کی تالی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مصلحتوں کے ماتحت انعام دیتے ہیں اور اس کتاب کو کسی مصلحت سے انہوں نے انعام نہیں دیا ہو گا۔ اس بات کو طے کرنے والے ”نقاد۔“ ہوں گے اور میں ان کو یہی نہیں بلکہ ان کے اچھے اچھوں کو ناول پر تنقید کرنے کا نااہل قرار دے چکا ہوں۔ وہ ناول کا کوئی ذوق نہیں رکھتے اور اسے کچھ لگے بندھے اصولوں سے جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ”علی پور کا ایلی۔“ کے ایسے اور بیٹل شاہکار کو کیسے محسوس کر سکتے ہیں اور عام طور پر بھی

نقشہ ہو مگر وہ زندگی کی ایک نظریہ حیات کے مطابق اور ایک فنی نظر کے مطابق تعمیر ضرور ہے۔ علی پور کے آصفی محلہ کی سماجی اخلاقی قدریں ہیں۔ ان کا مذہب عالم اسلام ہے جو ہندوئیت اور تصوف سے متاثر ہے۔ ایلی اس مذہب پر اٹھایا جاتا ہے۔ مگر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہاں سے بالاتر ہو گیا ہے۔ وہ توہمات میں عقیدہ کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اسلام کا دینی درجہ پر اسے کوئی علم نہیں ہے مگر جدید یورپین فلسفیوں سے اس نے عظیم تصور خدا حاصل کر لیا ہے۔ وہ خدا کے ساتھ اخلاقی قدریں وابستہ نہیں کرتا مگر اس کی عظمت کا احساس رکھتا ہے۔ اس کے والد عورتوں کے شائق ہیں۔ وہ ان کی عیاشی کو دیکھ رہا ہے اور اسے عورت سے جسمانی تعلق سے نفرت ہو جاتی ہے۔ شہزاد کے حسن کا وہ گرویدہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں اعلیٰ عشق اور پست عشق کے درمیان کشمکش ہوتی ہے۔ اور وہ شوہر والی چھ بچوں کی ماں سے شادی کر رہی لیتا ہے۔ اس کا ادب کی طرف دھیان ہے اور وہ اعلیٰ ترین شاہکار سے دلچسپی لیتا ہے اور آخر میں وہ صحابی ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں پیش کرتا مگر فلم زدوں سے وابستہ نظر آتا ہے۔ اس میں احساس کسری کے باوجود ہمت اور استقلال بھی آ جاتا ہے۔ اسے سیاست سے کوئی غرض نہیں ہے مگر پاکستان بننے پر وہ خوش ضرور ہوتا ہے۔ اسے اپنے وطن سے لگاؤ ضرور ہے مگر وہ پاکستان میں آ جانے کو نیا جیون سمجھتا ہے۔ اس کے ذریعہ کوئی مستقل نظریہ حیات اس طرح سامنے نہیں آتا کہ خواہ مخواہ کو ٹھونس ٹھانس معلوم ہو مگر اس کا ایک جدید نظریہ حیات ضرور ہے۔ اس میں وقت ارادہ کی کمی صاف صاف نمایاں سہی مگر وہ اپنے ارادے کا پکا بھی ہے اسے اپنی طرح پر جو کچھ کرتا ہے وہ کر گزرتا ہے اور اپنے ماحول کی خلاف ورزی کی کوئی پردا نہیں کرتا۔ بات یہ ہے کہ اس کے نقطہ نظر کو مفتی صاحب نے بالکل خارجی کر دیا ہے اور کہیں تجریدی نہیں ہونے دیا۔ اس کے واقعات اور عمل نقطہ نظر سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ واقعات ہی واقعات دکھائی دیتے ہیں اور نظریات بالکل چھپ جاتے ہیں یہ ڈرامہ نگاری اور ناول نگاری کی حد ہے۔ ٹیکسپر کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کردار کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس سے کوئی واضح نقطہ نظر نکال لینا ناممکن ہے۔ مفتی صاحب نے ایلی کو بھی اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اپنا اور اس کا نقطہ نظر بالکل چھپانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

اسی طرح وہ تحقیق کے سلسلے میں بھی ہر فن کاری سے اپنی بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ناول کو ایک ڈھیر کر دیتے ہیں یعنی فنکارانہ ترتیب۔ انتخاب ارتفع سے منہ موڑ لیتے ہیں مگر



## مصنف کا نوٹ

اگرچہ علی پور کا ایلی ناول کی شکل میں لکھی گئی ہے لیکن دراصل یہ ممتاز مفتی کی خود نوشت آبِ بیتی کا پہلا حصہ ہے۔ اس کتاب کی واحد خوبی ہے کہ اس میں ہر واقعہ سچ سچ بیان کر دیا گیا ہے۔ اخلاق، ادب، روایت اور کلچر سے بے نیاز ہو کر۔ عبادتِ آرائی سے پاک بناوٹ سجاوٹ سے بے نیاز مجھے یقین تھا کہ اس کتاب کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہو سکتی، لیکن زبان دانوں اور ناقدوں نے اسے شرفِ قبولیت بخش دیا۔ یہ ان کی کرم نوازی ہے۔ اب اس خود نوشت کی تصدیق کے لئے مجھ پر لازم ہے کہ میں کتاب کے اہم کرداروں کے اصلی نام پیش کر دوں تاکہ حقائق کے متعلق تحقیق میں آسانی ہو۔

مصنف کے آبِ شیخ فیروز ولی اور احمد راست قلم کے قلمی کتابوں سے اخذ شدہ کوائف

شہرِ بنالہ پاک و ہند برصغیر میں تقریباً ۷۶ طول بلد اور ۳۲ عرض بلد پر ۱۸۶۵ء مطابق ۸۶۹ھ ہلولِ لودھی کے دورِ حکومت میں آباد ہوا سولہویں صدی عیسوی میں نواب شمشیر خان ۳ کروڑی ناظم علاقہ ماجھ دو آبہ جالندھرنے بنالہ میں مستقل رہائش اختیار کی اور اس شہر میں عالیشان لمارات، خوبصورت باغات وسیع تلاب تعمیر کئے اور یوں شہر کو فروغ ملا۔ خاندان مغلیہ کے دورِ حکومت میں بنالہ کو پرگنہ کی حیثیت حاصل تھی اور اس کا انتظام ایک کروڑی منصب دار کے سپرد شد سکھوں کے زمانے میں راجہ رنجیت سنگھ کی بیوی مستب کور کی ولیدہ سدا کور نور مہاراجہ شیر

نقاد کسی نئے راہ کو سمجھنے کے اہل نہیں ہوتے بروست نے اپنی عظیم اور ضخیم ناول کے بابت کہا ہے۔ ”مجھے اس کی قدر کرنے کی نقاد سے کوئی امید نہیں ہاں ان صاحبانِ ذوق سے امید ہے جو بجائے اصولوں کے اپنے ادبی پرنیک لیتے ہیں۔“ ”آلار شر سے دو تان بارود۔“ کی ضخامت سے لوگ ڈر گئے ہمارے نقاد بھی اس کی ضخامت کی شکایت کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے شکایت کی ان سے مل کے کہا۔ ”آپ کو پڑھنے کا شوق تو ہے ہی نہیں ورنہ ضخامت اس کے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہوتی۔“ اصل بات یہی ہے کہ ہمارے پروفیسر نقاد کے لئے ادب لگائے بندھانے کا سودا ہے اور وہ جو طالب علم نکال رہے ہیں وہ بھی ان کے سے ہوتے ہیں۔ ”علی پور کا ایلی۔“ کو وہ مقبولیت بھی حاصل ہے جو آج دوسری ناولوں کو ملی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی جائے گی اور اس سے لوگ ناول کے آشنائے راز ہوتے جائیں گے۔ ممکن ہے کہ یہ ناول نگاری کے سلسلے میں ماڈل ہو جائے کیونکہ یہ اس سب آلائش سے پاک ہے جو فن و فکر کے بہانے ناول سے وابستہ کی جا رہی ہے۔ میں نے ایک کتاب ”ناول کیا ہے؟“ پچیس برس پہلے لکھی تھی۔ اس وقت تک ”علی پور کا ایلی۔“ وجود میں نہیں آئی تھی۔ اب اگر کوئی شخص مجھ سے یہ سوال کرے تو اس کا جواب میں یہ دوں گا ”علی پور کا ایلی کو پڑھ ڈالو معلوم ہو جائے گا کہ ناول کیا ہے۔ کیا ہونا چاہیے کہ وہ عظیم ناول کے دائرے میں آجائے۔“ حقیقت یہ ہے کہ کسی ناول میں ناول کی روح نہایت آزادی سے وسیع اور عظیم سفر طے کرتی نظر آتی ہے۔ اس دور کی ناولوں میں یہی اس کی انفرادی صفت ہے۔



سنگھ عرصہ تک بٹالہ میں سکونت پذیر رہے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ اکثر موقعوں پر بٹالہ آکر نواب شمشیر خاں کے بنوائے ہوئے تلاب کے قریب کئی روز متواتر قیام کرتے۔ برطانوی راج میں بٹالہ کافی عرصہ تک ضلع کا صدر مقام رہا اور بعد میں حکومت نے ضلع کا صدر مقام بٹالہ سے گورداسپور منتقل کیا اور بٹالہ کو تحصیل بنادیا۔

آزادی برصغیر اور تقسیم صوبہ پنجاب کے وقت ۱۹۴۷ء میں بٹالہ شہر کی آبادی پچاس ہزار سے تجاوز کر چکی تھی، شہر بٹالہ کی جنوبی فصیل میں دروازہ کلاں ہے جسے تقسیم پنجاب تک بڑا دروازہ یا ہاتھی دروازہ بھی کہا جاتا تھا۔ اس دروازہ کے اندر کچھ فاصلہ پر شہر میں شہل کی جانب ایک قلعہ نما محلہ منٹیاں تھا، جسے عام شیخاں حویلی بھی کہتے تھے۔ یہ محلہ ستمبر ۱۹۴۷ء تک خاندان منٹیاں بٹالہ کی اقامت گاہ رہا اور تقسیم ملک کے بعد اس کا نام چٹوڑ گڑھ رکھا گیا ہے۔

ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے دور حکومت میں بٹالہ میں چار درویش وارد ہوئے۔ چاروں عرب نژاد بزرگ ایران سے اپنے عقائد کی حفاظت کی خاطر ہندوستان آئے۔ ان کے قافلہ میں ایک مرزا غیاث بیگ بھی تھے۔ جن کے اس سفر کے دوران ایک لڑکی تولد ہوئی جس کا نام مرالہا رکھا گیا اور جو بعد میں نور جہاں کے لقب سے ملکہ جمائیکر بنی۔ یہ چار بزرگ بٹالہ میں مقیم ہوئے اور باقی قافلہ آگے دہلی کی طرف چل دیا۔ ان بزرگوں میں سے ایک فقیر منٹاں اور درویش صفت بزرگ نے شہر سے باہر شہل مشرق کی جانب ایک میل کے فاصلہ پر گوشہ نشینی اختیار کی اور مصروف عبادت ہوئے۔ ان کی وفات پر وہیں ان کا مقبرہ بنا جیسے جیسے کہا جاتا ہے۔ دوسرے بزرگ وزیر صاحب شہر کے دروازہ کلاں کے باہر جنوب کی سمت تقریباً ”اڑھسے میل کے فاصلہ پر گوشہ نشین ہوئے اور ان کی وفات کے بعد وہیں ان خانقاہ زیارت گاہ خاص و عام بنی تیسرے بزرگ شہر کے جنوب مشرقی حصہ (اندرون نصیرالحق دروازہ) میں سجادہ نشین ہوئے اور ان کی اولاد میں تھوریہ سلسلے کے کئی خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاء اللہ ہوئے۔ چوتھے بزرگ شیخ فیروز دلی بن شیخ ہملول بن شیخ جلال تھے۔ شیخ فیروز دلی کے بٹالہ پہنچنے ہی قاضی عبداللہ خطیب ان کی عظمت اور قابلیت سے متاثر ہوئے اور انہیں اپنے ہمسایہ میں ایک مسجد کے قریب رہنے کی دعوت دی اور ملازمت حاکم کی ترغیب دلائی بلکہ شیخ فیروز دلی کی خواجہ معین تک رسائی کرائی۔ جس سے شیخ فیروز دلی کا تقرر فوراً روزنامہ نرسنگ پر ہو گیا۔ شیخ فیروز دلی

مسجد کے نزدیک اولین رہائش گاہ اور قریبی علاقہ کے گرد ۱۵۸۹ء میں ان کے تیسرے صاحبزادے شیخ فتح اللہ صدی نے فصیل کھینچ کر محلہ منٹیاں کی بنیاد رکھی۔

۱۹۱۹ء میں ایک اور نظریہ فروغ پایا کہ شیخ دلی بن شیخ ہملول (ہملو) بن شیخ جلال (جلو) بن دود بن نادر بن لکڑ بن جیل بن ہانسل بن پل بن شاہ کلوچر قوم راجپوت موضع بوہ پرگنہ ہیست پور پٹی سے خضر خان گورنر لاہور کے ہاتھوں موضع بوہ کی جٹائی کی وجہ سے اپنے موروثی علاقہ سے کئی سو گاؤں ہمیش چھوڑ چلے اور موضع گوندوال اور موضع رائے پور سے ہوتے ہوئے بٹالہ پہنچے تھے۔ باقی تفصیلات میں البتہ کوئی فرق نہیں۔ شاید کوئی تحقیق طلب ان نظریات کی کمتی کو سلجھائے۔ جب کہ ہر دو نظریات بے کم و کاست خاندان منٹیاں کے اجداد کے بارے میں یہاں راقم ہیں۔

شیخ فیروز دلی کے دوسرے فرزند شیخ احمد فیروز ۱۵۵۳ء میں شیخ فیروز دلی کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ کا اسم مبارک سلیم خاتون تھا۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی شیخ محمد دلی کی عمر دوا تین سال تھی۔ آپ نے بٹالہ میں ہوش سنبھالا، مسجد کی قیوت اور والد کے علمی ذوق اور مشاغل کے درمیان اپنے بڑے بھائی شیخ دلی محمد (تاریخ پیدائش ۱۵۵۲ء) اور چھوٹے بھائیوں مسی شیخ فتح اللہ (تاریخ پیدائش ۱۵۵۸ء) اور شیخ نعت اللہ (تاریخ پیدائش ۱۵۶۸ء) کے ساتھ احسن تربیت پائی۔ خود منشی طبیعت تھے۔ بچپن میں تبدیلی وطن کی صعوبت برداشت کی جس نے عمر بھر کے لیے محنت اور کاوش کی عادت ڈال دی۔ رقوم ثلث، نسخ، تعلیق، نستعلیق و سیاق اور خط شکستہ میں کمال حاصل کیا اور جدت پسند طبیعت نے ان میں غنی اختراعات پیدا کیں۔ ادھر خاندانی روایت کے تحت فنون حرب میں ایسی استعداد حاصل کی کہ مغل اور افغان آپ کی تیر اندازی کی تعریف کرتے۔ آپ بیس سال کی عمر میں نواب وزارت پناہ قاضی علی سلطان کے سرخط نویس مقرر ہوئے پھر روزنامہ پر ترقی پائی۔ اور دو بیستی منصب پایا۔ نواب جانیوس الزبانی حکیم ابوالفتح اور حکیم ہام گیلانی جیسے نامور بزرگوں کے مقرب رہے۔ اور تقریباً ”تینتیس سال کی عمر ۹۹۹ھ میں دیوان پرگنہ شہر کوٹ اور پرگنہ فاربرہ مقرر ہوئے۔ ۱۰۰۴ھ میں خواجہ طاہر محمود والد خواجہ عماد الدین اور نواب آصف صفات آصف خاں کی وساطت سے دربار اکبری پہنچے اور بادشاہ کے دہن مبارک سے ”راست قلم۔“ کا لقب پایا۔ اکثر امراء نے آپ کو مبارک دی۔ اس وقت آپ کے چھوٹے بھائی شیخ فتح اللہ شاہی تخت کے پاس نواب آصف خان کی مسند کے عقب میں کھڑے

